اس شخص کی کامیابی . . .
اس شخص کی زندگی میں یہ ایک اہم موقع ہے۔ اسکی کوششوں سے ملک میں اناج کی زیر کاشت زمین کا رقبہ ۲۶ کروڑ ۱۰ لاکھ تک بڑھ چکا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان اپنی پہلی پانچسالہ پلان کی مقررہ حد سے پہلے ہی ۴۰ لاکھ ٹن سے بھی زائد اناج پیدا کر چکا ہے۔ شاید اس شخص کو پتہ نہ ہو کہ اس نے کتنا حیرت انگیز کام کیا ہے اور یہ بھی کہ ٹریکٹر کی پشت پر ایک زبردست عملہ ہے جس کا کام یہ دیکھنا ہے کہ ٹریکٹر ہر وقت کام میں لگے ہیں۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں اور خصوصاً ان دور دراز مقامات پر جو کاشت کے قابل ہیں فیول آئل اور لبریکنٹس پہنچا کر ہم اس شخص کے اہم کام یعنی ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کے واسطے اناج پیدا کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ برماشیل اب اس ملک میں نئی طرز کے پٹرولیم کیمیکل انسیکٹیسائڈز (کیڑے مکوڑے مارنے کی دوائیں) فروخت کرنے لگی ہے۔ اور فصل کو کیڑے مکوڑوں کے حملوں سے بچانے میں کسان کی مدد کر رہی ہے۔
فصل کا بچاؤ
آلڈرین، ڈائلڈرین اور اینڈرین جدید اقسام کے انسیکٹیسائڈز (کیڑے مکوڑے مارنے کی دوائیں) ہیں جنہیں برماشیل پٹرولیم سے بناتی ہے۔ ان کا نقصان دہ کیڑے مکوڑوں پر امتحان کیا جا رہا ہے اور خطرناک ٹڈیوں کے خلاف آلڈرین تو پہلے ہی کام میں لایا جا رہا ہے۔
برماشیل . . .
ہندوستان کی زندگی
کا ایک حصہ ہے

صنعتی ترقی کا ایک ریکارڈ

مودی انڈسٹریز۔ مودی نگر

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

کشمیر نمبر

ایڈیٹر۔ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ بال مکند عرش ملسیانی

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں۔ چھ روپے پاکستان میں چھ روپے (پاکستانی)
غیر ممالک سے :- دس شلنگ یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ:- ہندوستان میں۔ آٹھ آنے پاکستان میں۔ آٹھ آنے

ترتیب

جوش ملیح آبادی

فضائے کاشمر

زہے فضائے کاشمر، بہشتِ حسنِ جاوداں
ترانہ ریز و مے چکاں، شگوفہ بار و گل فشاں

ہر ایک سنگ اک صنم ہر ایک خار اک جناں
ہر ایک پیچ و خمِ دھنک، ہر ایک جادہ کہکشاں

زمیں پہ سُرخ بادلے، فلک پہ موجِ پرنیاں

وفورِ آب و رنگ میں، ہجومِ برگ و بار میں
فضائے لالہ کار میں، ہوائے کوہسار میں

تموّجِ سرور میں، تلاطمِ بہار میں
بہشتِ شاخسار میں، چنار و دیودار میں

طیور مست و پرفشاں کبھی یہاں کبھی وہاں

نیا تصوّرِ طرب ہر اک جواں اُمنگ میں
نواگری سرور میں، قلندری ترنگ میں

مذاقِ غنچہ خشت میں، مزاجِ پنبہ سنگ میں
ہزار مے کدوں کی رو سبو کے ایک ڈھنگ میں

فضائے شوخ و شنگ میں رواں دواں گلابیاں

فضائیں اضطراب میں، گھٹائیں پیچ و تاب میں
سُروں کی رو رباب میں کہ مے رگِ شباب میں

کہانیاں حباب میں جوانیاں سحاب میں
شکارہ موجِ آب میں اور آب موجِ خواب میں

کہ مست جوں شراب میں فسانہ بار و نغمہ خواں

پیغامات

شری یوراج کرن سنگھ صدر ریاست جموں و کشمیر

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آپ "آج کل" کا سالنامہ کشمیر نمبر شائع کر رہے ہیں۔ قدرت نے وادیٔ کشمیر اور جموں میں کئی ایک جگہوں کو وہ دل فریب نظارے، فرحت بخش آب و ہوا اور بیش بہا قدرتی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے کہ مجموعی طور پر شاید ہی دنیا کے کسی اور ایسے خطے کو یہ سب باتیں میسر ہوں۔ اگر مغربی نقطۂ نگاہ اور معیار سے دیکھا جائے تو بھی اس ملک میں ترقی کے لئے کافی گنجائش ہے۔ لیکن ریاستی و مرکزی گورنمنٹ ہر وقت اس طرف رجوع ہیں کہ اس ملک میں بھی وہ آرام و آسائش میسر ہو، جس کا یہ مستحق ہے اور یہاں کے بسنے والے اور سیر و سیاحت کے لئے آنے والے ان ترقی و تمدن سے ہر طرح مستفید ہو سکیں۔ یہاں کی دستکاری، علم و ہنر کو بھی دنیا میں ایک اعلیٰ درجہ حاصل ہے اور ہر چند ان فنون میں بھی ہر طرح سے ترقی ہو رہی ہے تاکہ ان کی شہرت و مقبولیت موجودہ زمانے میں بھی قائم رہے۔

گورنمنٹ ہر سال نئی نئی تدابیر عمل میں لا رہی ہے جس سے سیاحوں کو یہاں کا نے ٹھہرنے اور سیر و سیاحت میں ہر طرح سہولت ہو۔ اور یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس وقت بھی اقتصادی اور آرام و آسائش کے لحاظ سے ہندوستان کی [illegible] میں کشمیر کو ایک بے مثال درجہ حاصل ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے اس سالنامے سے سیاحوں کو اس خوبصورت وادی کی نسبت اطلاعات بہم پہنچیں گی جس سے کہ اس کی مقبولیت میں اور بھی اضافہ ہو۔

بخشی غلام محمد پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

مسرت کا مقام ہے کہ رسالہ "آج کل" کشمیر نمبر شائع کر رہا ہے۔ امید ہے کہ رسالے کا یہ شمارہ "نیا کشمیر" کی تعمیر کا آئینہ دار ہوگا اور ریاستی عوام کی جاگیرداری اور سامراجیت کے خلاف اولوالعزمانہ طویل جدوجہد کا غماز ہوگا۔

ہم کشمیر کے حسین و جمیل چہرے سے غربت اور مفلسی کا پردہ اٹھانے کی جدوجہد میں سرگرم عمل ہیں۔ اس کے لازوال حسن میں چاندنی سے نکھرے ہوئے آبشار، سونا اگلنے والے لہلہاتے کھیت، ہنستے دیکھتے ہوئے مرغزار [illegible] زندگی بخش رنگ بھر پائے گا۔ جب "نیا کشمیر" کی تعمیر مکمل ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے تحت ایک باقاعدہ عرصے سے جدوجہد جاری و ساری ہے ہم بے پناہ عزم اور مادر ہند کی بھرپور امداد کی بدولت منزل مقصود کی جانب تیز گام ہیں۔

کشمیر صدیوں کی غلامی کے بعد نئی کروٹ لے رہا ہے۔ اس کی سیاسی، اقتصادی [illegible] پسماندگی کی گہری چھاپ پڑی تھی لیکن آج زندگی کے تمام شعبوں میں [illegible] انسانیت کے تقاضے [illegible] اور ترقی کے لئے سرزمین کشمیر پر ایک عظیم جنگ جاری ہے [illegible] جنگ کامیاب بنانے میں اخبارات و رسائل ایک اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ [illegible] رسالہ "آج کل" یہ قومی فریضہ انجام دیتے [illegible] کے تئیں ایک اہم خدمت انجام دینے کا فخر حاصل کر پائے گا۔ [illegible]

خواجہ غلام محمد صادق وزیرِ صحت و تعلیمات ریاست جموں و کشمیر

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ادارہ "آج کل" ماہ اگست میں "کشمیر نمبر" شائع کر رہا ہے۔

اُردو کا کشمیر سے قریبی تعلق رہا ہے۔ اور اب یہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس زبان کو موجودہ سطح پر لانے والے نامور اشخاص میں کئی ایک مقتدر کشمیریوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ اردو زبان جس کلچر اور تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے اُس تہذیب اور کلچر کے ساتھ اس خطے کا گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لئے یہ ایک محض اتفاقی امر نہیں کہ اردو پچھلے ساٹھ ستر سال سے یہاں کے دفتروں میں رائج ہے اور یہاں کے تعلیمی نظام میں اس کو ذریعۂ تعلیم کا درجہ دیا گیا ہے۔ اُردو کو کشمیر میں یہ درجہ دلانے کے لئے کئی تاریخی، تمدنی اور ثقافتی وجوہ تھیں۔ انھیں وجوہ کا تقاضا تھا کہ اس زبان نے یہاں کی کلچرل زندگی میں ایک مخصوص جگہ حاصل کی ہے۔

جہاں تک اس کی ادبی اور ثقافتی حیثیت کا تعلق ہے۔ کشمیر وسطی ایشیا اور ہند کی روایات کا ایک سنگم ہے۔ اور یہاں کی عوامی زندگی میں آج بھی انھیں دو تہذیبی لہروں کا ایک دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔ اور اسی امتزاج کا نتیجہ ہے کہ ماضی قریب میں کشمیر نے غیر مذہبی سیاسیات کو قائم کرنے کے لئے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو ملک بھر میں اپنی مثال آپ ہے۔

مجھے امید ہے کہ "آج کل" کا "کشمیر نمبر" ہمارے قومی کردار کے اسی پہلو کو اُجاگر کرے گا۔ اور جوش ملیح آبادی صاحب اور رسالہ "آج کل" کے ادارے کے دیگر افراد "کشمیر نمبر" میں اس خطۂ زمین کے قدرتی مناظر کے علاوہ یہاں کی عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرنے کی کما حقہ کوشش کریں گے۔

ڈاکٹر سید محمود منسٹر وزارتِ خارجہ حکومتِ ہند

یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ "آج کل" کا کشمیر نمبر نکال رہے ہیں۔ "آج کل" نے پچھلے چار سال سے آج تک اردو ادب کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

ہندوستان کی ریاست کشمیر نے اقتصادی، تعلیمی اور ثقافتی میدان میں کافی ترقی کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خاص نمبر اپنی اور کشمیر کی روایات کے شایانِ شان ہوگا۔

ہز ہائینس نواب سید محمد رضا علی خاں بہادر نواب رام پور

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ رسالہ "آج کل" کا "کشمیر نمبر" نکالا جا رہا ہے۔ کشمیر کی ہندوستان میں ہمیشہ ایک خصوصی جگہ رہی ہے۔ اس کے دلکش مناظر، اس کی صحت مند آب و ہوا، اس کے قدرتی ذرائع اور اس کی تاریخی اہمیت سے کون ناواقف ہے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ ہندوستان کی ترقی پسند جمہوریت میں رہ کر کشمیر کے عوام نہایت تیزی سے ترقی کر سکیں گے اور اس مشہور اور خوش نما دیس کا شمار دنیا کے بہترین اور سب سے آگے بڑھے ہوئے خطوں میں ہونے لگے گا۔ ہندوستان کے باقی لوگوں کو کشمیر کے حالات زیادہ اچھی طرح جاننا چاہئیں تاکہ وہ کشمیر کے عوام کو ترقی کے راستے پر چلنے میں پوری مدد دے سکیں۔ کشمیر کی ترقی سے باقی دیس کی ترقی ہوگی اور سارے ہندوستان کی ترقی میں کشمیر کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن ممبرِ پارلیمنٹ و جنرل سیکرٹری جمعیۃ علماءِ ہند

تقسیمِ ہند کے نتیجہ میں ریاست کشمیر کی ایک عجیب پوزیشن ہو گئی تھی۔ یہ کشمیری عوام کا حق تھا کہ وہ ہند یونین یا پاکستان کسی ایک کے ساتھ اپنا تعلق قائم کریں، لیکن پاکستان نے زور اور طاقت کے بل بوتے کی رائے کا رُخ اپنی جانب پھیرنا چاہا۔ ایسے نازک وقت میں کشمیر نے ہند یونین سے مدد چاہی۔ چنانچہ حکومت ہند نے بروقت مدد کی اور کشمیر کو پاکستان کی دستبرد سے بچا لیا۔

واقعات کی بس یہی نوعیت تھی جو ہند یونین اور پاکستان کے درمیان ایک باہمی نزاع اور طویل کشمکش کی شکل اختیار کر گئی۔ بین الاقوامی عدالت "یو، این، او" نے بھی پاکستان ہی کو حملہ آور قرار دیا۔ حکومت ہند بہر حال اپنے اس نقطۂ نظر پر مضبوطی سے قائم رہی کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ خود کشمیری عوام کا حق ہے — یہاں تک کہ کشمیر کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی بیٹھی اور اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر ہند یونین کے ساتھ وابستگی کے حق میں اپنا دستوری اور قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔

یہ فیصلہ خود کشمیر کے باشندوں کا فیصلہ ہے اور آج کی مہذب دنیا میں اس فیصلے کو آئینی و دستوری پوری طاقت حاصل ہے۔

میں ملک و وطن کے رشتے سے بھی اور اس نقطۂ نظر سے بھی [illegible]

آج کل دہلی (کشمیر نمبر)

کی ایک ریاست کا ہندیونین سے مستقل الحاق خود کشمیر اور ہندیونین کے مسلمانوں کے سیاسی اور اخلاقی موقف کے لئے بھی بہت مددگار ہوگا۔ اس فیصلے کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی کو صحیح سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ یہ اقدام مستقبل میں کشمیر اور ہندیونین دونوں کے لئے بہت مفید اور موزوں ثابت ہوگا۔

میں آج کل کے کشمیر نمبر کے ذریعے سے کشمیری بھائیوں اور بہنوں کے لئے اپنی اور جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے نیک خواہشات اور جذبات خلوص و محبت پیش کرتا ہوں۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کوچہ چیلان دہلی

بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر اور ان کے ساتھیوں نے اُن حالات میں کشمیر کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ کشمیر کے حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی اور دو سال کے اندر کشمیر کے حالات کو ہر طریقے سے بہتر بنا دیا اور وہاں کے عوام کی بیش بہا خدمت کی۔ اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ انھیں اپنے نیک ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے۔

جناب عبدالقیوم انصاری وزیر پبلک ورکس، پبلک ہیلتھ بہار

کشمیر ہمیشہ سے دنیا بھر کے لئے مرکزِ نگاہ بنا رہا ہے اور آج بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنتِ ارضی کے بسنے والوں کی اپنی زندگی ہمیشہ دوسروں کے استحصال کا شکار رہی ہے۔ کشمیری عوام کبھی مطمئن اور خوش نہ رہے۔ حالانکہ اس زمین نے بہت بڑے بڑے انسان پیدا کئے۔ آج کے ہندستانی کلچر کی ساخت و پرداخت میں کشمیریوں کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

لیکن آج کا کشمیر پہلے سے بہت مختلف ہے۔ اس میں نئی زندگی اور نیا جوش ہے۔ وہ ہر قسم کے استحصال کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں۔ اور ہندوستان کی سیکولر جمہوریت کی اعلیٰ روایتوں کو قبول کر کے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر رہے ہیں۔ کشمیر نے چند برسوں میں سیکولرزم اور جمہوریت پسندی کی ایک ایسی مثال پیش کی ہے جو سارے ہندستان کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ کشمیری عوام ساری مشکلوں پر قابو پائیں اور ملک کی ترقیاں [illegible] جمہوریت کے لئے نمونہ بنیں۔

[illegible]

شریمتی رامیشوری نہرو مشیر وزارت بحالیات حکومت ہند

کشمیر جنت نظیر سب کے دلوں کو جیتنے اور اپنی طرف کھینچنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس خطۂ زمین پر جو بھی ایک بار جاتا ہے اُس کے دل میں اس کی یاد ہمیشہ کے لئے بسی رہتی ہے۔ جیسا جوبن اور حسن قدرت نے اس کی چوٹیوں، پہاڑیوں اور وادیوں کو دیا ہے ویسا ہی یہاں کے باشندوں کے ہاتھوں میں خوبصورت چیزیں بنانے کی قابلیت دی ہے۔ یہاں کی کاریگری دنیا میں مشہور ہے۔ چاندی، لکڑی، پیپر ماشی اور سوزن کاری کا سامان جتنا اچھا یہاں تیار ہوتا ہے آج کسی دوسری جگہ ملنا دشوار ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اپنی صنعت و حرفت کے ذریعے سے کشمیر ایک دن دنیا کے بڑے سے بڑے ملکوں کا مقابلہ کر سکے گا۔ یہ اور اس کے باشندے ترقی کریں یہی میری دلی خواہش اور دعا ہے۔

نواب احمد سعید نواب آف چھتاری

یہ معلوم ہو کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آج کل اردو میں آپ خصوصی طور پہ کشمیر کے متعلق مضامین و نظمیں اگست کے نمبر میں چھاپیں گے۔

کشمیر کا مستقبل میرے خیال میں بہت ہی درخشاں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کی اعانت کے ذریعے سے کشمیر کو نہ صرف ہندوستان کا بہترین ٹکڑا بنایا جا سکتا ہے بلکہ ایشیا کا خوبصورت ترین حصہ کشمیر ہی ہو سکتا ہے جہاں سیاح اور ناظرین دور دور سے آکر لطف اندوز ہوں گے اور اس سلسلے میں اہلِ کشمیر کو جو مالی منافع ہوں گے اُن کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں وہ ظاہر [illegible] اہلِ کشمیر کو خود اس کا احساس اور اعتراف ہے۔ خدا کرے کہ کشمیر [illegible] اور اہلِ کشمیر ترقی کے منازل تیز رفتاری سے طے کریں۔

مسٹر سادات علی خاں ممبر پارلیمنٹ، پارلیمنٹری سیکرٹری وزارت خارجہ

صدیوں جبر و استحصال کا شکار کشمیری عوام [illegible] آج ایک نئے [illegible] دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خاص نمبر جو کشمیر سے متعلق مضامین، نظموں اور ادبیات کے لئے وقف ہے اہلِ کشمیر [illegible] سیکولر جمہوریت کا پیغام ہے [illegible] کشمیر اور ہندوستان [illegible] ہیں اور مجھے امید ہے کہ وحدت [illegible]

[illegible]

میں آج کل دائرہ ادبیات کے ادارے کو اس قابلِ تحسین اقدام کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بیگم اعزاز رسول صاحبہ ممبر پارلیمنٹ

مجھے بہت خوشی ہے کہ "آج کل" کا سالانہ نمبر اس مرتبہ "کشمیر نمبر" ہوگا۔ حسنِ اتفاق سے میں آج کل کشمیر میں ہی ہوں اس لئے پہلگام کی سرسبز وادی سے یہ پیغام بھیجنے میں اور بھی زیادہ مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ کشمیر کے خطے پر قدرت نے بہت فیاضی اور بلند حوصلگی سے کام لیا ہے۔ یہاں کے کوہسار اور دریا، مرغزار اور چشمے، یہاں کے پھل اور پھول، یہاں کے باد و بہار غرضیکہ اس سرزمین کی ہر چیز اپنی خوبصورتی اور نوعیت میں یکتا ہے۔ یہاں کی تعریف شاعروں، مصنفوں، سیاحوں، مصوروں اور ہر قوم و مذہب کے لوگوں نے اپنی اپنی طرز میں کی ہے اور آئندہ کریں گے۔ یہاں کے لوگوں نے اپنی محنت اور مشقت، اپنی صنعت و حرفت سے اور بھی چار چاند لگا دئے اور اُن کی بنائی ہوئی خوبصورت چیزیں یہاں کے قدرتی مناظر کی طرح دیکھنے والوں کے دل اور دماغ کو تازہ کرتی ہیں۔ ہندوستان اور کشمیر کے بہت قدیم تعلقات ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زمانے اور اس سے بہت پہلے کشمیر ہندوستان کا ہی ایک حصہ رہا ہے۔ یہاں کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں جاکر ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہوئے، ملازمتیں کیں اور مختلف شعبہ جات زندگی میں حصہ لیا اور اپنی ذہانت اور قابلیت سے وہاں کی معاشی، تمدنی اور سیاسی زندگی میں اپنا ایک خاص درجہ پیدا کیا۔ ہندوستان سے لوگ سیر و سیاحت کی غرض سے بہت بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ہندوؤں کے بڑے تیرتھ اور مسلمان بزرگوں کے بڑے مزار ہیں جن کی زیارت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں زائرین جوق در جوق آتے ہیں۔ یہاں کے بنے ہوئے سامان کی نکاسی اور فروخت زیادہ تر ہندوستان میں ہی ہوتی ہے۔ چناں چہ پہلے تو امرتسر کی منڈی مشہور تھی۔ اب اس کے علاوہ کلکتہ، بمبئی، دہلی اور ہندوستان کے اور بڑے شہروں میں کشمیر کا سامان بذریعہ امپوریم اور مختلف ذرائع سے فروخت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے پھل اور پھول تک بذریعہ ہوائی جہاز وہاں جاتے ہیں اور منڈیاں حاصل کرتے ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو جو مالی امداد پہنچتی ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ اس کے علاوہ پچھلے چند سالوں میں سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور بڑے بڑے تعمیری کاموں کے سلسلے میں کشمیر کو ہندوستان کی طرف سے جو مالی امداد پہنچتی ہے اور جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے لئے ذرائع روزگار مہیا ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پنج سالہ پلان کے سلسلے میں بھی گورنمنٹ آف انڈیا کشمیر کی اُسی طریقے سے مدد کرے گی جس طرح اپنے ہاں کی اور ریاستوں کی۔ اس تمام عظیم الشان امداد پہنچنے کے بعد بخشی غلام محمد وزیرِ اعظم کشمیر کی قابلیت اور اولو العزمی اور مستعدی کی وجہ سے صحیح طریقے سے امید کی جا سکتی ہے کہ چند ہی سال میں کشمیر کا اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی نقشہ بالکل بدل جائے گا۔ اُن کے تدبر کا سب سے بڑا ثبوت سخت ضرورت کے وقت میں کشمیریوں کو ارزاں اور کافی مقدار میں اشیاء خوردنی کا مہیا کیا جانا کہلایا جا سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے آج غریب سے غریب کو بھی پیٹ بھر کر کھانے کو مل رہا ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ تعداد میں سکولوں کا کھولا جانا، اسپتالوں کا قائم ہونا۔ زراعت کے لئے پانی اور آسانیوں کا مہیا ہونا۔ تجارت اور روزگاری کے اسباب پیدا کرنا یہ سب اُن کی اور اُن کی گورنمنٹ کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ مگر ان تمام اسکیموں کی کامیابی کا دار و مدار ہندوستان سے دیرینہ تعلقات قائم رہنے پر منحصر ہے۔ اس کا احساس یہاں کی دستور ساز اسمبلی نے صحیح طریقے پر کیا اور ہندوستان کے ساتھ رشتہ و ارتباط اور تعلقاتِ دیرینہ کو قائم رکھنے کا جو مبارک فیصلہ کیا وہ صرف ایک تاریخی واقعہ پر ہمیشہ ثبت لگائے جانے کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ میری دُعا ہے کہ یہ رشتہ تا ابد قائم رہے اور کشمیر ہندوستان کے زیرِ سایہ شاہراہِ ترقی پر تیزی سے گامزن ہو۔

سرمایے کے بیٹوں کی ہوئی خوئے کماں بند — جاگیر پرستوں پہ ہوئی راہِ اماں بند
محکومیٔ مجبوری کب سے تھی زباں بند — صدیوں کی غلامی کے ہیں کس دیوِ گراں بند
کاٹے گی جو یہ بند وہ شمشیر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے
(عرش ملسیانی)

اس صفحے کی تصویریں خاص کشمیر نمبر
کے لئے موصول ہوئی ہیں

شری یوراج کرن سنگھ
صدر ریاست جموں و کشمیر

بخشی غلام محمد
پرائم منسٹر جموں و کشمیر

خواجہ غلام محمد صادق
وزیر صحت و تعلیم جموں و کشمیر

بادام کے شگوفے

تن مرگ

شیش ناگ جھیل

پہاڑوں کا سنتری چمر کا درخت

ڈاکٹر محمد اشرف

مذہبی رواداری

کشمیری تہذیب کی نمایاں خصوصیت

ہندستانی تاریخ میں مذہبی رواداری کی روائیتیں کم و بیش ہر خطے اور ہر ملت میں پائی گئی ہیں۔ کشمیر کے متعلق البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ مذہبی رواداری کشمیری تہذیب کا لازمی جزو اور کشمیری تاریخ کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے اور یہ روایتیں ہر دور اور ہر عہد میں مسلسل ملتی ہیں۔ بعض خارجی اثرات کے تحت کبھی کبھار یہ بھی ہوا ہے کہ مذہب کے غالب رجحان یا حکومت وقت نے مذہبی اقلیتوں کو دبانے یا اپنے مذہبی عقاید کو تھوپنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس میں ان جارحانہ رجحانوں کو کامیابی بھی ہوئی ہے مگر پھر تھوڑے دن بعد کشمیر کے روائتی مزاج نے بدستورِ سابق مذہبی رواداری کی روایتوں کو قائم کر لیا ہے اور "ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے" کا زرّیں اصول ایک سنگ بنیاد کی حیثیت سے کشمیر کی سماجی عمارت میں جیسے اشوک اعظم کے زمانے میں موجود تھا آج بھی ہے اور آیندہ کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ برابر قایم رہے گا۔

آیئے اس حقیقت پر ذرا تفصیل سے غور کریں۔ آپ کو غالباً علم ہوگا کہ کشمیر کم و بیش ہزار برس تک بدھ مت بلکہ مہایان کا گہوارہ رہا ہے اور بدھ مت کے بڑے بڑے اماموں اور مجتہدوں میں کشمیریوں کا پایہ بڑا بلند ہے یا یوں ہم آج تاریخ کو چھوڑ کر بدھ مت کے ماننے والے کشمیر میں نہیں ملتے۔ اس کی وجہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ برہمن روایتوں کے علاوہ ہن بادشاہوں سے لے کر گیارھویں صدی تک سب حکمرانوں نے بدھ مت کو رد کرنے بلکہ مٹانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اگر آپ ظواہر سے نظر قطع کریں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کشمیر کے مذہبی رجحان کا غالب عنصر آج بھی بدھ مذہب ہے جسے اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یہ کہہ کر بیان کیا تھا کہ ع

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے

سنسکرت کے بڑے عالموں میں کم از کم دو کشمیری عالم مجھے معلوم ہیں جنھوں نے بارھویں صدی میں گوتم بدھ کی سیرت کے واقعات نظم کئے اور گوتم بدھ کو وشنو کا اوتار مانا۔ میری مراد شو سوامی اور کشیمندر سے ہے جن کی تصانیف میں کپھن ابھیودیہ اور اودان کلپ لتا علی الترتیب گوتم بدھ کی عظمت ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں اور گوتم بدھ کی پرستش کا چلن نیلمت پران یعنی چھٹی صدی عیسوی سے سمجھئے کہ جاری ہے بلکہ برہمن دور کے بڑے بڑے مید بدھ آثاروں پر اسی لئے بنائے گئے کہ مخلوق کی نگاہ میں یہ مقامات بدھ مذہب کے استوپ اور وہاروں سے وابستہ تھے۔

بہر نوع آٹھویں صدی عیسوی سے بدھ مت کا زوال اور برہمنوں کا عروج شروع ہوا مگر برہمنیت نے کشمیر کی فضا میں شیوی فلسفے اور انسانیت پرستی کا جامہ پہنا اور بھگتی کے جذبے کو اُبھارا جس کے بڑے بڑے اماموں میں ابھنو گپت اور اُن کا مکتب نمایاں شمار کیا جاتا ہے۔ میں اس وقت ترک فلسفہ اور کشمیر کے شیوزم کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا مگر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیری فلسفے کے رجحانات یکسر فرقہ پرستی اور تنگ نظری سے پاک ہیں اور کشمیری شیوزم کا ماننے والا کسی مخصوص مذہب کی جکڑ بند کا پابند نہیں ہے۔ وہ خالصاً موحد اور ہمہ اوست کا قایل اور جملہ فرقوں اور مذہبوں سے بالاتر انسانیت کی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے چنانچہ برہمنیت کے زوال اور اسلام کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ بعض مؤرخوں کے نزدیک یہی کشمیری فلسفہ اور شیوزم کا نقطۂ نظر ہے۔ دراصل فلسفے کا یہ رجحان پُرانے بدھ مذہب کے انسانی نقطۂ نظر اور مہایان کی بھگتی کا عکس ہے۔

کشمیر کا اسلامی دور چودھویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور آج کشمیریوں کی بہت بڑی اکثریت (غالباً ۹۵ فیصدی) مسلمان ہے جس کا ایک عنصر شیعہ مسلمانوں کا

مسلمانوں کے بیشتر معابد پرانے مندروں کے آثار پر قائم ہوئے اور اسی سلسلے میں ایک خوش خلق ہندو شاعر نے ایک حسین شعر کہہ کر ایک تاریخی حقیقت واضح کر دی کہ اسلام بتوں کو مٹا سکتا تھا مگر بدھ مت اور برہمن عہد کی روایات کو مٹانے میں ناکام رہا۔ شاعر نے کہا ؎

ببیں کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

اسلامی عہد کی دو خصوصیتیں بہت نمایاں ہیں ایک آثار پرستی جس کا اقبال کو شکوہ تھا اور دوسری ریشی صوفیوں کا گروہ جن کی خانقاہیں اور مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ کشمیری آثار پرستی کی سب سے مشہور نشانی حضرت بل کی درگاہ ہے جس کی زیارت کے لئے وادی کے ہر گوشے سے زائرین ہر سال لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ آپ اگر ذرا غور فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ تمام گوتم بُدھ کی آثار پرستی کی برکت ہے جس کی تفصیل آپ کو ہیوان سانگ کے سفرنامے میں مل جائے گی۔ گوتم کے بالوں کی پرستش کے لئے نیپال میں، استوپ مسلمانوں کے آنے سے بہت پہلے قایم ہو چکے تھے اور گوتم کے دانت اور بودھ ستوا کے متعدد آثار کی پرستش سارے ترکستان میں جاری تھی۔ چنانچہ جب مسلمان وسط ایشیا سے کشمیر میں وارد ہوئے تو اسلام کے پردے میں یہ سب مقدس وراثت اپنے ہمراہ لائے اور کشمیر کی بُدھ مت آشنا مخلوق نے اسی لئے اسلام کا خیر مقدم کیا۔ کشمیری مسلمانوں کے دوسرے مذہبی عقائد کا مطالعہ بھی اس اعتبار سے غیر معمولی دلچسپ ہے۔

ریشی صوفیوں کا گروہ جس کے سردار اور بانی حضرت نورالدین ریشی جیسے بزرگ اور فرشتہ صفت انسان تھے دراصل شیوی ریاضت کا نمونہ اور اسلام کے ابتدائی تصورات سے بالکل جداگانہ ہے۔ ریشی اسلام کے عام عقیدہ (لا رهبانية فی الاسلام۔ اسلام میں رہبانیت منع ہے) کے خلاف نہ صرف یہ کہ مجرد رہتے اور غاروں میں زندگی گزارتے تھے بلکہ اُن کے نزدیک کسی ذی روح کو ایذا پہنچانا حرام تھا۔ یوں سمجھیے کہ وہ اہنسا کے اصول پر عامل تھے جو بدھ مت اور جین مذہب اور دوسرے ہندو صوفیاء کا بنیادی عقیدہ تھا۔ مگر بایں ہمہ ریشیوں کا اثر اس درجہ غالب تھا کہ ایک پٹھانی حکمراں کو اپنی خود مختاری کی حمایت کے لئے حضرت نورالدین کا نام اپنے سکے پر نقش کرانا پڑا۔

ان تمام تاریخی روایتوں سے جو ضمیر کشمیر میں بنا اُس کا تقاضا تھا کہ کشمیر حضرت نورالدین کے پہلو بہ پہلو للتہ عارفہ کو جگہ دیتا جو خالصتاً شیوی فلسفے کی عالم اور یوگ پر عامل تھیں اور جنھیں ہر کشمیری للہ بید۔ اور للہ مائی کے محبوب نام سے پکارتا ہے۔ پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ کبیر اور نانک سے کچھ پہلے گوتم بُدھ کی متابعت میں للہ اور نورالدین نے کشمیریوں کو خود اُن کی زبان میں مخاطب کیا اور کشمیری زبان کے عالم اس کی ابتدا ان دونوں محترم ہستیوں کے مقولوں سے کرتے ہیں

کشمیری روایت میں للہ نے نورالدین کو دودھ پلایا تھا اور شیوی عقاید پر عامل ہوتے ہوئے وہ حضرت سیّد محمدؒ ہمدانی کی معترف تھیں۔ للہ کے زمانے تک ہندوؤں کے اکثر آثار مسمار ہو چکے تھے مگر اُن کے کلام میں اس پر توجہ کرنے کی بجائے اگر کسی چیز کا عکس ہے تو وہ خود پرستی اور خود غرضیوں کی شکایت ہے جو برہمن اور برہمنیت کا جزو بن چکی تھیں۔ بالفاظ دیگر مارتنڈ یا اونتی سوامی کو دوبارہ زندہ کرنے کی بجائے للہ نے ایک شاعر کے الفاظ میں صرف یہ کہا کہ ؎

یا رب ز سیلِ حادثہ طوفاں پدید باد
بت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

کشمیر کی ان تاریخی روایتوں کی برکت ہے کہ کشمیری پنڈت سنسکرت کے ساتھ فارسی اور عربی کے بڑے عالم ہوئے ہیں اور نوروز منانے کی رسم کشمیری پنڈتوں میں آج بھی جاری ہے۔ مسلمانوں میں بھی روایتاً چار خلفاء کے ساتھ ساتھ بارہ اماموں کا احترام پایا جاتا ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں نورالدین، للہ، شاہ ہمدانی اور جملہ صوفیا اور سنتوں کا ادب کرتے ہیں۔ دراصل کشمیری ہندو اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایک مخصوص تہذیب کے مالک اور وارث ہیں۔ یہاں ۱۹۴۷ء میں جب پاکستانی "مجاہد" اسلام کے نام پر حملہ آور ہوئے تو صرف کشمیر وہ خطہ ہے جہاں بلا امتیاز مذاہب سب ہندو، مسلمان اور سکھوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور مجھے یقین ہے کہ مذہبی رواداری کی ان روایتوں کی حمایت میں آئندہ جب کبھی کشمیریوں کی آزمائش کا وقت آئے گا وہ اس امتحان میں پورے اُتریں گے ✣

بشر کے قلب میں ہے مسجدِ شاہِ ہمداں — جس سے ہر دیدۂ مسلم میں ہے نورِ عرفاں
کہ درخشاں ہے ہر اک سمت کلامِ یزداں — خانۂ دل کو ضیا بخش چراغِ ایماں

(پنڈت بالارام شرفی)

عبدالباقی

یہ وُہ چمن ہے جس میں خزاں کا گذر نہیں

زندہ دلوں کے جذبے کی قسم! ہمیں ناز ہے کہ یہ جنت کشمیر جو حُسن کی جاگیر ہے، ہندوستان کو ملی۔ ہمیں فخر ہے کہ ماضی اور حال کے حسین خوابوں کی تعبیر حسن جہانگیر کے رُخ تاباں کا سرمایۂ تزئین تعمیر کے خاکوں کا آب و رنگ — کشمیر، ہمارا ہے، اور ہم اس کے ہیں۔ بودھوں کی شرافت کا نقش ثانی۔ شیرشاہ کے پرواز شہنشاہی کا عقاب ثانی۔ جہانگیر اور نورجہاں کے تصورات کا "شالامار جہانی" اور نہرو، آزاد اور قدوائی کی جمہوریت کی تصویر آسمانی — ہماری ہے اور ہم اس کے ہیں۔

جموں و کشمیر کے اندر بعض تخریب پسند عنصر کی سرگرمیاں سامراج کے بازو مضبوط کر رہی ہیں، اور عوام کو جمہوری اور صالح سیاست سے دُور رکھنا چاہتی ہیں۔ جموں و کشمیر کی پُوری قومی تحریک کے تمام بنیادی محرکات اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ سامراج دشمن تحریک ہے۔ کشمیر کے نئے پروگرام یعنی "نیا کشمیر" کی بنیاد سامراج دشمن ہے، اور وہ منصب داری، جاگیرداری، سامنت شاہی سے یارانہ قایم نہیں کر سکتی۔ جو غیر ملکی طاقتیں کشمیر کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں اور جن کی آج بھی یہ کوشش ہے کہ جموں و کشمیر غلامی کے شکنجے میں کس دیے جائیں۔ اور جنگ کا اڈہ بنائے جائیں، وہ جموں و کشمیر اور ان کے عوام کی دشمن ہیں، اور کشمیر والوں کی ہمدردیاں اُن کے ساتھ نہیں ہو سکتیں۔

کشمیر والوں کی ہمدردیاں ہمیشہ ان لوگوں کے لئے وقف رہی ہیں جو آزادی اور خودمختاری کی لڑائی لڑتے ہیں۔ کشمیر والے ان تمام عناصر کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ جو عوام کی آزادی اور مساوات کے حامی ہیں، اور دوسرے ملکوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ وزیر اعظم ہند، پنڈت نہرو، اور وزیر اعظم چین مسٹر چو۔ این۔ لائی نے پچھلے دنوں اپنے مشترکہ بیان میں پانچ سنہری اصول پیش کئے۔ (۱) ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور خودمختاری کا احترام۔ (۲) ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت (۳) برابری کے تعلقات اور باہمی امداد (۴) ایک دوسرے کے بارے میں غیر جارحانہ رویہ۔ (۵) مختلف نظاموں کا پُرامن وجود۔

بین الاقوامی سیاست کے یہ پانچ اصول دنیا میں قیام امن اور آزادی انسان کی بنیاد بن سکتے ہیں، اور اصولوں کی روشنی میں ہمیں ہمیشہ عالمگیر سیاست کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ان اصولوں کی تصدیق روس نے بھی کی ہے، اور دنیا کی دوسری بڑی بڑی طاقتیں بھی اگر امن عالم کی آرزومند ہیں تو ان اصولوں کو زمانہ کا رہنما بنائیں گی۔

بین الاقوامی کھچاؤ تو شاید کم ہو گیا ہے، لیکن ابھی آسمان پر عالمگیر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اس لئے جموں و کشمیر والوں کو اس واقعہ کا اعلان کر دینا چاہیئے کہ اُن کی تمام صلاحیتیں قیام امن عالم کے لئے وقف ہوں گی۔ تمام نوع انسان امن چاہتا ہے۔ کیونکہ امن انسانیت کی بقا کی پہلی شرط ہے۔ لیکن جموں و کشمیر کے لئے امن ایک فوری مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے کشمیر کی قومی زندگی کا سوال براہ راست متعلق ہے۔ مفاد پرست بیرونی طاقتیں جموں و کشمیر اور لداخ کو فوجی اڈہ بنانا چاہتی ہیں۔ اس لئے امن اور جنگ کا سوال کشمیر والوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ سوال آزادی اور خودمختاری سے براہ راست وابستہ ہے۔

عالمگیر امن تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں بھی جنگ ہو گی دنیا کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس لئے کشمیر والوں کو ان تمام کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے، جو جنگی دیوتاؤں کو زمین کی سات تہوں کے نیچے دفن کرنے کے لئے ہو رہی ہیں۔ پنڈت نہرو نے کوریا میں صلح کی کوششیں کیں۔ ہائیڈروجن بم اور دوسرے تباہ کن ہتھیاروں کے خلاف آواز بلند کی۔ جنوب مشرقی ایشیا

میں فوجی معاہدوں کی مخالفت کی۔ امریکن صدر نے ہندوستان کو فوجی امداد کی جو پیش کش کی تھی اُسے ٹھکرا دیا۔ ہند چینی کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی — بینڈونگ کانفرنس میں ایشیا افریقہ کے امن پسندوں کا ایک محاذ قائم کیا، اور اس طور پر امن عالم کے مقصد کی تائید کی۔ انھیں کی رہنمائی میں کولمبو کانفرنس نے جنگ بازوں کو للکارا کہ وہ اب ایشیا کے معاملات میں مداخلت بے جا کرنا چھوڑ دیں۔ پنڈت نہرو کے اقدامات نہ صرف ہندوستان والوں کی امن پسندی کا محکم اعلان ہیں بلکہ کشمیر والوں کی امن پسندی کا بھی اعلان ہیں۔ اس لئے کہ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔

داخلی سیاست یا قومی سیاست کے میدان میں "نیا کشمیر" کشمیر والوں کا بنیادی پروگرام ہے۔ اور اس میں کشمیر کے سماجی اقتصادی نظام کا نقشہ تفصیل سے مرتب کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان سے الحاق کر کے کشمیر نے اس نظام کی تعمیر کے لئے بنیادیں بھی قائم کر دی ہیں۔ اس لئے کشمیر والے اب ریاست کے اندر اپنے دوستوں اور دشمنوں کو اس کسوٹی پر جانچیں گے کہ کون ہمارے پروگرام کا اور اس پروگرام سے پیدا ہونے والی الحاق کی پالیسی کا حامی ہے۔ اور کون اس پروگرام اور پالیسی کی عملاً مخالفت کرتا ہے۔

یقین ہے کہ کشمیری عوام نعروں کے فریب میں نہ آئیں گے، اور ہندوستان کے وہ لوگ جو کشمیر کی قومی تحریک کے ہمدرد ہیں کشمیر والوں کی ترقی پسندانہ تحریک اور تعمیری اقدامات کی تائید کریں گے۔ شر پسندوں کی حوصلہ افزائی کے معنی یہ ہوں گے کہ جمہوری تحریک کا ایک بہت بڑا تجربہ جو مسلم اکثریت کے علاقے میں ہو رہا ہے بے نتیجہ ہے۔ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق صرف ایک سیاسی واقعہ نہیں ہے، بلکہ بیسویں صدی کی جمہوری تحریکات کا ایک عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے۔ اور اس کی کامیابی ایشیا، افریقہ کے نئے دورِ سیاست کی کامیابی ہے۔ بینڈونگ کانفرنس میں اگر معانی کا رنگ بھرنا ہو تو کشمیر اور ہندوستان کے رشتے میں ریشمی گرہ میں لگانا ترقی پسندوں کا کام ہے۔

قطعاتِ تاریخ

چودھری مہیش نے ڈل کے کنارے ایک باغ تعمیر کیا۔ اس کا نام چودھری باغ تھا۔ اِس باغ سے اپنے گھر کے باغ کو ایک پل کے ذریعے ملایا تھا۔ اِس پل کے دو قطعاتِ تاریخ ذیل میں مندرج ہیں۔

بست تاریخِ ایں خجستہ اساس
بانیِ پُل مہیش شنکر داس

مادۂ تاریخ شد مصرعۂ پیراستہ
بادپُلِ چودری قایم و آراستہ

(نشاط باغ کی تاریخ یہ ہے)

چوں باغِ نشاط شد شگفتہ! — از یاسمن و ریان و گل ھا
خورشیدِ جہان و آصفِ دہر — گسترد بساط و خور و گل ھا
در گوشش نسیم گفت سالش — گل زار نشاط و عیش دل ھا

(درشنی باغ کا مادۂ تاریخ کتنا لاجواب ہے۔ صرف لفظِ باغ سے تاریخ نکلتی ہے)

شاہ گل گشت باغ بنمودہ
باغ تاریخ باغ فرمودہ

پریم ناتھ دَر

کشمیری شخصیت

وادیٔ کشمیر میں وارد ہوتے ہی آدمی کی تمام قوتیں اسیر ہو جاتی ہیں۔ بانہال کی سُرنگ سے نکلتے ہی جب یکایک ایک دنیا بدل جاتی ہے۔ اُس کی تمام قوتیں فوراً اُن جانے اثرات کے ماتحت ہو جاتی ہیں۔ اور دیکھتا ہوا آدمی وہی کچھ دیکھ لیتا ہے جو اُس کے محدود نظر میں سما سکے۔ اِس لا بدل اور بے انتہا ضیافتِ نظارہ میں آدمی نہ صرف خواہشِ انتخاب کھوتا ہے بلکہ سطح کی لذّتوں میں اُسے قابل دیا۔ گہرائیوں کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ مثلاً آدمی پہاڑ پر چڑھتا ہو، ایک ایک پتھر کا جائزہ لے رہا ہو، پتھر میں سے اُگے ہوئے پھُولوں کا۔ حاشئے کاٹتے ہوئے پانی کا، دُور سے بلاتی ہوئی برف کا، پاس سے پھسلاتے ہوئے اشجار کا، سرمارتے ہوئے آبشار کا، نئے نیلے آسمان کا، اُسے اکثر اُس ہم جنس کا دھیان نہیں رہتا جس نے اُس کی وہاں تک رہنمائی کی، اُسے قدرت کے بھید بتائے، چڑھتے ہانپتے اُسے سہارا دیا، اور خوبصورت قدرت کے گونگے مُنہ میں اپنی میٹھی بولی ڈال کر اُسے حقیقی زندگی بخشی۔ قدرت کے حسین مظاہر کی مجموعی تخلیق جو کشمیر کا انسان ہے اُس کی شخصیت قابلِ مطالعہ ہی نہیں، بلکہ اُن گہرائیوں میں سے ایک ہے جن کو دیکھے سمجھے بنا آدمی کشمیر کے بھرپور حُسن کے صرف چند سطحی پہلو دیکھ کے لوٹ آتا ہے۔

کشمیری کا قد گلے سے لے کر گھٹنوں تک "پھرن" کے پھیلاؤ میں چھپا رہتا ہے۔ مہمان نوازی کے پشتینی جذبے میں اُس کی گردن جھکی رہتی ہے۔ اُس کی نظروں میں ہر وقت صلح کا ایک نرم نرم پیغام ہوتا ہے۔ امن کے لئے ایک درخواست ہوتی ہے۔ وہ سینہ زوریوں پر مسکراتا بھی ہے اور دیکھنے والا لوٹ بات نکال کر لکھتا ہے کہ کشمیری ڈرپوک ہے، بُزدل ہے۔ لیکن یہ وہی کشمیری ہے جس کی عظمت کے اندازے ہزاروں سال پُرانے آثار سے ملتے ہیں۔ اُن تمام ذریعوں سے ملتے ہیں جو دُنیا کے مورخوں کو نتیجوں پر پہنچا دیتے ہیں، اور ادھر صرف بارہ سو سال پُرانی بات ہے کہ اِس جھکی جھکی نظروں والے کا ایک جنگ چاروں طرف کے سلسلہ ہائے کوہ کو پھاڑتا پھاندتا اپنی پھرن پوش، قد آور اور کرتب جوانوں کے لشکر سے پنجاب، قنوج، تبت اور بدخشاں کو فتح کرتا ہوا سکندرِ اعظم کی طرح آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس نے بنگال کو بھی مغلوب کیا۔ لکھی ہوئی تاریخ کے اوّلین نسخوں میں اِس امر کے ثبوت دئے گئے ہیں کہ 'للتادتیہ' کے فاتحانہ کوچ سے پہلے ہی ہر ملک میں کشمیر کی برتری کا اثر تھا، اور ہر ملک میں کوئی نہ کوئی کشمیری موجود تھا، جو صرف اپنے بڑے دل کو لے کر دُور دُور کے ملکوں میں اسی کشمیری برتری کی نمائندگی کرنے گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی ملکوں میں لوگوں نے 'للتادتیہ' کی فوجوں کا استقبال کیا، اور شاہی مقابلوں کو بے اثر بنا دیا۔ تاریخ سے اس طرح کی کئی اور مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً آج سے صرف پانچ سو سال پہلے مشہور بادشاہ زین العابدین نے کشمیر میں پہلی بار توپیں بنوا کر اور ایک زبردست لشکر لے کر پنجاب اور تبت کو پھر سے فتح کیا، اور اگر سامنے کھڑے کشمیری کو تاریخ کی دھندلی مثالوں کی مدد سے پرکھنا معمولی آنکھوں والے کے لئے مشکل ہو

تو آدمی نوٹ بک نکالنے سے پہلے اُس کشادہ بازو اور سفید سے کی طرح جھکے ہوئے آدمی کو کم از کم اُس بڑے ناٹک کے پس منظر میں دیکھ سکتا ہے۔ جو ٹیلی ہوئی دنیا میں ابھی ابھی اُس نے کھیلا ہے۔ ابھی پچیس سال کی بات ہے جب شاہی حکومت سے اُس نے اپنے حقوق طلب کئے۔ غلط سمجھنے والوں نے اُس وقت اُس کی مانگ کا مذاق اڑایا تھا۔ انھوں نے اس کی شخصیت کا اندازہ نہیں لگایا تھا جس میں سب کچھ قربان کرنے کا مادہ تھا، گولیوں کے مقابلے میں پہاڑ جیسا سینہ پھیلانے کی قوت تھی اور پہاڑی نالوں ہی کی طرح مشکل راستوں پر آگے بڑھنے کا اشتیاق تھا۔ اٹھارہ سال کی متواتر کشمکش کے بعد کشمیری ارادے نے فتح پائی اور پہاڑوں کی گود میں بھی لوک راج قائم ہوا، اور اس کی فتح ابھی مکمل ہوئی بھی نہیں تھی جب کشمیری کے گھر بار پر ایک نئی مصیبت باہر سے حملہ آور ہوئی۔ اس حملے کے اندازے ایسے تھے کہ وہی پہلا معمولی آنکھوں والا یہ کہہ اُٹھتا کہ کشمیری فوراً رام ہو جائے گا۔ حملہ کو رحمت پکارے گا، ایک غلامی سے چھٹکارا حاصل کر کے دوسری کو اپنائے گا۔ اور وہی اپنی گردن جھکائے گا، لب کھولے گا، اُسی رسیلے لہجے میں حملہ آوروں سے بھی کہے گا "حضور ادھر آئیے"! لیکن جس قوت مقابلہ، دلیری اور آزاد خیالی کا ثبوت کشمیری نے اُس وقت بھی دیا، اُس کی مثال تواریخ میں ملنا مشکل ہے۔

درحقیقت کشمیری نے ہمیشہ سے اپنی زندگی کو اپنی ایک پرانی کہاوت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

"ژرین گھتھ نہ سُود" زیادہ باتوں میں فائدہ نہیں۔
"ژرین گگرائن نہ رود" زیادہ گرجنے میں بارش نہیں۔
"ژرین ڈانگن نہ دود" گائے زیادہ رنبھائے تو دودھ نہیں۔

یعنی کشمیری ٹھوس نتیجوں کی قدر کرتا ہے اور ڈینگ مارنے کو بچپن سمجھتا ہے۔ لیکن اُس کی خاموشی اِس اشتہاروں کے زمانے میں کئی لوگوں کو عجیب لگتی ہے۔ مثلاً حال کی اس حقیقت کو کئی لوگ کہانی سمجھتے ہیں۔ کہ کشمیر کے سرکاری کالجوں میں بھی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ کہ کشمیر میں زمین کا مالک وہی ہو سکتا ہے جو زمین پر ہل چلائے کہ اگر وہاں شہر کی کسی سڑک کو کشادہ کرنا ہے، مکانوں کی مد طرفہ قطاریں اُٹھائی جاتی ہیں، تو اِس نقشوں، فائلوں کے زمانے میں کوئی اور نہیں کشمیر کا وزیر اعظم آپ موٹر میں نوٹوں کی تھیلیاں لئے ہوئے خزانچی، انجینئر، نقشہ نویس، میونسپل پریزیڈنٹ، پبلک ورکس کے بڑے افسر سبھوں کی رہنمائی کرتا ہوا اُسی سڑک پر آ کھڑا ہو جاتا ہے، اور چند گھنٹوں میں سڑک کے کنارے ناپنے والے اینٹ اینٹ کو ناپ دیتے ہیں، نقشے والے لکیر کو کھینچتے ہیں۔ اینٹ پتھر اور لکڑی کو آنکا جاتا ہے۔ پیسے پیسے کا حساب ہو جاتا ہے۔ فائل گھوم گھوم کر لوٹتے ہیں۔ کاغذ کھل کھل کر بند ہو جاتے ہیں اور مکان والے کو مکان کے دام ملتے ہیں۔ حاجت مند کو شاید چار پیسے زیادہ اور پیسے والے کو شاید وہی چار پیسے کم۔ سُننے والا یقین نہیں کرتا۔ کرے تو کیسے کرے؟ اخبار میں نہ یہ خبر چھپی، نہ بخشی غلام محمد کی کوئی تصویر جس میں وہ سڑک کے کنارے دفتر کھولے بیٹھے ہوں۔

کشمیری نے رنگوں کے سب سے بڑے مرکز کشمیر میں، خود قدرت کے موقلم سے، ایک دانائی اپنی شخصیت میں جذب کر لی ہے کہ حسن رنگوں کی تیزی میں نہیں، بلکہ اُن کی ہم آہنگی میں ہے کہ پھول وہی ہیں جو اپنی بے ترتیبی میں اُگیں جنگل کی سادگی میں، سادگی میں عظمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کا ترکھان، وہاں کا کسان، وہاں کا کلرک، افسر، پنڈت، ملّا، دوکاندار، مال دار، موسیقی کار، جو کوئی پگڑی پہنتا ہے اُس کا رنگ بلا امتیاز سفید ہوتا ہے۔ مگر جب کشمیر کا وہی کاریگر ریشم کے دھاگوں کو ہاتھ میں لیتا ہے، یا رنگدار کاغذ کے ٹکڑوں کو، تو رنگ کی کاریگری کے وہ نمونے تیار ہو جاتے ہیں، جن کو دیکھ کر ذوق والا اور بد ذوق دونوں واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زین العابدین جیسا بڑا شاہ (بڈشاہ) معمولی سادہ کپڑے پہنا کرتا تھا، جبکہ اُس کے پاس ایسے قبا تھے جو اُس زمانے کی دنیا میں شاہکاروں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ پھر یہی وجہ ہے کہ آج کل کا عام کشمیری اُبلے ہوئے کشمیر کے میٹھے چاول اور ساتھ کشمیر کا مشہور ساگ (ہاک) کھاتا ہے۔ ایسا ساگ جس میں سوائے تیل۔ نمک اور مرچ کے کچھ بھی نہیں پڑتا۔ (یہ اور بات ہے کہ کشمیر کا وہ ساگ بھی جنت ہی کی ضیافت ہے) لیکن جب وہی کشمیری مہمانوں کو گھر بلاتا ہے تو اُس مہمان کو یقیناً کئی ایسی نئی لذتوں کا چسکا ڈالتا ہے کہ پھر عمر بھر اُسے اپنا کھانا پھیکا لگتا ہے۔ قدروں کی اس پہچان میں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے پریزیڈنٹ خواجہ غلام محمد صادق اپنے جدی مکان اور اپنے پرانے محلے

میں رہتے تھے جب سری نگر میں اُن کے لئے محل خالی کئے جا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نیرہ اُم جنشی بر شہرسے دن اور عید کو اپنے محلے میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ جا کے اُسی طرح مناتے ہیں جس طرح ہر معمولی کشمیری مناتا ہے۔

لیکن کشمیری شخصیت کا سب سے بڑا پہلو اُس کی یہ روایتی سمجھ ہے کہ دین دھرم فرد کے اپنے ایمان کی بات ہے کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آتا، نہ دوسرے کے ایمان کو بگاڑ سکتا ہے۔ ریشیوں فقیروں کی اس وادی میں ہزاروں سال پہلے بھی یہی بات تھی، اور اب بھی وہی بات ہے۔ تاریخ سے للتا دتیہ کی مثال لیجئے یا زین العابدین کی، دونوں کی بے انتہا طاقت تھی۔ دونوں جو چاہتے کر سکتے تھے۔ لیکن للتا دتیہ جیسے فاتح اعظم نے اپنے ہندو دھرم کے باوجود اس وقت کے "نئے مذہب" بدھ مت کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ اُس کے پھیلانے کے ذریعوں کی مدد کی۔ بڑے بڑے وہار بنوائے، اور دونوں دینوں کے عالموں کو اکٹھا کر کے حصول علم کی خاطر اُن کی بحثیں سنیں۔

اسی طرح زین العابدین نے ایسے ماحول میں کشمیر کا تخت سنبھالا تھا، جس میں وہ فرشتہ بھی ہوتا تو بگڑی ہوئی بات کو سنبھال نہ سکتا۔ لیکن وہ فرشتے سے بھی بڑا کشمیری انسان تھا۔ اُس نے کشمیری روایت کے ٹوٹے ہوئے دھاگے اِس ہوشیاری کے ساتھ پھر سے جوڑے کہ کشمیر کی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک بددماغ کی حکمرانی میں کشمیر پر اجنبی سائے آئے تھے، اور تقریباً ایک فرقے کے فرقے کو ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے صرف گیارہ گھر باقی رہ گئے تھے —
جب وہ تخت پر بیٹھا تھا، دیکھتے دیکھتے نہ صرف بھاگے ہوئے لوٹ آئے تھے، بلکہ کشمیر اپنی فضا میں پھر سے بس گیا تھا اور ظلم و تفریق کے جتنے ذریعوں نے تباہی مچائی تھی اُن سے چوگنے نئے ذریعوں نے امن و آشتی، علم و فن، محبت و عزت کی پرانی بنیادوں کو پھر سے اتنا مستحکم کیا کہ آج سینکڑوں برس بعد بھی کشمیری کی سمجھ میں دُوئی کا فلسفہ نہیں آتا۔
اِس بارے میں کشمیر کی کہانی نرالی رہی ہے۔ ہندو عارفوں اور مسلمان صوفیوں کی باتوں میں عام لوگوں نے کبھی فرق نہیں سمجھا، نند رشی (شیخ نور الدین) کو آج تک دونوں ہندو مسلمان مانتے آئے ہیں۔ لل دید (مشہور ہندو عارفہ) کے واکھ آج تک دونوں ہندو مسلمانوں کی زبان پر ہیں کشمیر کی کئی جگہیں آج تک بھی ایسی ہیں جہاں ایک طرف مسلمان نماز میں سجدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ہندو اپنے دیوتاؤں کی پوجا۔ کشمیری کے بڑے دل کو چھوٹی باتوں نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ ہندو مسلمانوں کی دُنیا میں وہ ایک جگہ ہے جہاں غلام محمد پنڈت اور شیو جی ملا نام کے پڑوسی رہتے ہیں، جہاں ایک ہی ذات کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ جہاں ہندو دلہن کے ساتھ اُس کا مسلمان "دودھ باپ" یا اُس کی مسلمان "دودھ ماں" جاتی ہے۔ اُس کے زیوروں کی دیکھ بھال کے لئے اُس کو نئے گھر کے آداب سکھلانے کے لئے، اور نئے گھر میں اُس کی آسائشوں کا خیال رکھنے کے لئے۔

کشمیری ہندو ہے یا مسلمان، وہ یہ بات بھلا نہیں سکتا کہ سب ایک جیسے کشمیری ہیں ؎

حضرت آدمس زِی گبر   اَکھ وٹ آ دین نہ بیہ تھم

حضرت آدم کے دو ہی بیٹے تھے، ایک نے قہر کو پسند کیا ایک نے احسان کو۔

یہ ہے کشمیری شخصیت کا وہ بڑا پہلو جس کے مطالعے سے ایک بہت بڑا جھگڑا دُنیا سے مٹ سکتا ہے۔ کیونکہ تبھی ناواقفوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ کشمیری اپنے سیاسی فیصلوں یا اپنے سماجی اور اقتصادی تجویزوں میں مذہب کے دخل کو کیوں غلط کہتا ہے۔

کشمیری شخصیت کے یہ تمام پہلو شاید اُس کے زرخیز دماغ اور جدت خیال ہی کے پرتو ہیں۔ اور صدیوں سے جنت ارضی کی آب و ہوا میں پنپتا ہوا کشمیری صدیوں ہی سے اپنے حدود اربعہ سے دُور دُور تک کے خیالوں کی رہنمائی کرتا ہے فلسفیوں، مہا پنڈتوں، ویدوں، شاعروں کو جانے دیجئے۔ صدیوں پرانی تاریخ ہی کو لکھنے والے کلہن کو لیجئے۔ اُس کی لکھی ہوئی "راج ترنگنی" اِس طرف کی دُنیا میں لکھی ہوئی اولین سلسلہ وار تاریخ کا پہلا نسخہ ہے۔ ایسی خوبصورت نظم میں لکھی گئی ہے کہ ادبی نقاد اسے شاہکار کی حیثیت دیتے ہیں۔ لیکن کلہن کی شخصیت نہ تو شاعری کی بنا پر نرالی پکاری جا سکتی ہے نہ تاریخ نویسی کی بنا پر۔ کشمیری جدت اِس بات کی ہے کہ دنیا میں شاید وہ پہلا مورخ تھا جس نے صرف راجوں، شہنشاہوں کی درباری سازشوں جنگوں اور اُن کے پریم ناٹکوں ہی کو تاریخ کا موضوع نہیں سمجھا، بلکہ اُس نے انسانی زندگی کے ہر درجے اور ہر شعبے کا خاکہ اچھی تفصیل کے ساتھ

کھینچا۔ تاریخ نویسی کے اس ڈھنگ کی جسے عالم نیا پکارتے ہیں، آج کل بڑی قدر و قیمت ہے اور کلہن کی شخصیت کا اندازہ جو حقیقت میں کشمیری شخصیت ہی ہے پوری طرح جبھی لگایا جا سکتا ہے جب آدمی یہ بات ذہن میں رکھے کہ راج ترنگنی آج سے قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل لکھی گئی ہے، اور سوچے کہ اس زمانے میں تاریخ نویسی کی یہ تعریف جو دورِ جدید ہی کی نئی روشنی سمجھی جاتی ہے کلہن کے دماغ میں کیسے آئی۔ اس کی تاریخ نویسی کا یہی پہلو تعجب خیز نہیں بلکہ یہ بھی کہ اس نے للتادتیہ جیسے بڑے حکمران کے جیتے جی اس کی کئی خامیوں کو درجِ تاریخ کیا، اور اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وجہ تب بھی یہی تھی اور اب بھی یہی ہے کہ کشمیری فطرت سے نئے خیالوں کا رہنما ہی نہیں بلکہ حق پرست بھی ہے۔ وہ شخص پرست یا فرقہ پرست نہیں۔ انسانیت پرست ہے، آزاد خیال ہے اور نڈر بھی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک کے کارناموں کا کوئی ایسا شعبہ نہیں دکھائی دیتا جس میں کشمیریوں کے نام نہ چمکتے ہوں۔ کشتی کا اکھاڑہ دیکھئے وہاں بھی وہ دکھائی دے گا۔ سیاست کا میدان دیکھئے۔ وہاں بھی وہ دکھائی دے گا۔ انتہا پسند فلسفہ پڑھیئے، وہ پڑھانے آئے گا۔ اعتدال کا راستہ پوچھئے، رہنمائی وہ کرے گا۔ دسترخوان پہ بیٹھئے، بہترین کھانے وہ کھلائے گا۔ شوقین لباس چاہیئے تو وہ بہترین پہنائے گا۔

درحقیقت کشمیری شخصیت کے کئی پہلو ہیں، جو موقع ملنے پر نکھر آتے ہیں، امکانات کو مزید دئے جائیے، اور پھر دیکھتے جائیے کہ کشمیری شخصیت کیسے اور کہاں کہاں ابھرتی ہے۔ ہندوستان کے وسیع میدانوں میں، کروڑوں قدر دانوں کے بیچ میں، کشمیری نے ہمیشہ سے انھیں موقعوں کو پایا ہے، اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کالیداس (کہتے ہیں وہ بھی کشمیری تھے) اقبال، چکبست، سرشار، حشر، سپرو، نہرو، ان کا ذکر تو خیر روز بروز ہوا ہی کرتا ہے، میرے دل میں چھوٹے سے چھوٹے کشمیری کا خیال آتا ہے جو اپنی لاثانی کاریگری کے نمونے لئے ہندوستان کے لاکھوں میلوں میں گھوم گھوم کر اپنے کروڑوں مداح بناتا پھرتا ہے۔ فن کے ہتھیاروں سے لاکھوں کی قوتِ انتخاب اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ اور کشمیر کو ایک بار دیکھنے کی تڑپ ہر دل میں پیدا کرتا ہے ——— لیکن بڑی بات یہ ہے کہ پہاڑوں کی اس ان مول شخصیت کو پہچاننے والے ہندوستان کے میدانوں میں ہمیشہ سے موجود تھے، اور اگر خدانخواستہ لاعلم، بدذوق یا متعصب لوگ اس شخصیت کے گرد ہوتے تو اس کی کہانی بھی اس ان مول رتن جیسی ہوتی جو بن مانسوں کے پاس پڑا ہو۔

اس سے نہیں اچھا کوئی گلزار اسے دیکھ
اس سے نہیں اونچا کوئی دربار اسے دیکھ
اس سے نہیں بہتر کوئی دیدار اسے دیکھ
اس سے نہیں بڑھ کر کوئی شہکار اسے دیکھ
فطرت نے جو کھینچی ہے وہ تصویر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے

ملنے کو تو مل جائے گی سرسبز زمیں بھی
گل پوش مکاں اور گل اندام مکیں بھی
کم یاب نہیں حسن زمانے میں کہیں بھی
دنیا میں بہت نقش ہیں دلکش بھی حسیں بھی
جو خامۂ قدرت کی ہے تحریر یہی ہے
فردوسِ زمیں جنتِ کشمیر یہی ہے

(عرش ملسیانی)

دینا ناتھ مست کشمیری

کشمیر کی میراں - عارفہ للی ایشوری

گرچہ کشمیر کی مجذوب نچارن عارفہ للی ایشوری اور راجستھان کی کرشن پجارن عارفہ میراں بائی کے زمانۂ حیات میں کم و بیش دو صدیوں کا فرق ہے یعنی للی سنہ ۱۳۳۰ء سے سنہ ۱۳۹۰ء تک اور میراں بائی سنہ ۱۵۰۵ء سے سنہ ۱۶۲۹ء تک بقیدِ حیات تھیں۔

لیکن ان دونوں کے فلسفۂ وحدانیت اور عشقِ الٰہی کی تعلیمات کی حقیقی بنیاد یکساں ہے۔ اگر فرق ہے تو زبانوں اور طرزِ بیان کا۔ اگر للی کا فلسفہ بڑی حد تک گہرا اور ادق ہے تو میراں کا اتنا ہی رسیلا اور جذب و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ للی کے دوہوں، واکوں اور بانی پر محبت کے ساتھ غور و خوض کرنا پڑتا ہے۔ میراں کے گیت تو سیدھے دل میں اتر کر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ بھگت کبیر اور گرو نانک دیو کی بانیوں کو بھی اگر نظر میں رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ للی اور میراں بھی عشق و عرفان اور وحدت و توحید کی اسی شاہراہ پر گامزن تھیں، گو زمانہ سفر ان سب کا مختلف ہے۔

للی اور میراں دونوں کی زندگیوں میں کئی باتیں یکساں پائی جاتی ہیں۔ دونوں کے ماں باپ ایشور میں گہرا اعتقاد رکھتے تھے، دونوں ہی اکلوتی بیٹیاں تھیں۔ دونوں میں ایشور بھگتی اور دھارمک خیالات بچپن سے ہی پائے جاتے تھے۔ دونوں کو مندروں اور ٹھاکرداروں میں جانے اور پوجا پاٹھ کرنے میں بڑا سرور اور سکون ملتا تھا۔ دونوں کی شادیاں ہوئیں لیکن اُن کے نزدیک دنیا میں دھندے اور گھر کے جنجال روحانی معراج اور عشقِ الٰہی کے مقابلے میں ہیچ اور بے سود تھے۔

للی اور میراں دونوں سسرال بھی گئیں اور وہاں رہتی بھی تھیں لیکن ویسے ہی جیسے ایک کنول کا پھول کیچڑ اور پانی میں رہتے ہوئے بھی لت پت نہیں ہونے پاتا۔ وہ دونوں دنیا کو معرفت اور حق شناسی کا درس دینے آئی تھیں، وہ اپنے اس مشن میں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ آج ہندوستان بھر میں کوئی گھر نہیں جہاں میراں کے گیت لوگوں کو وجد و حال میں نہ لاتے ہوں۔ گراموفون ریکارڈوں اور ریڈیو اسٹیشنوں سے اُن کے بھجن اور کرشن کے پریم میں ڈوبے ہوئے گیت نشر ہوتے رہتے ہیں، گویا آج بھی میراں زندہ ہے۔

یہی حال للی کے دوہوں اور گیتوں کا ہے۔ کشمیری زبان جاننے اور بولنے والا کوئی بھی ایسا شخص نہیں جسے للی کے زبان بھرے دوہے گیت اور بانیاں یاد نہ ہوں۔ حالانکہ ان دونوں کو اب اس دنیا سے عالمِ جاودانی کو سدھارے ہوئے قریب چھ سو اور چار سو برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے للی آج بھی کشمیر کے پُر بہار جنگلوں، ندی نالوں، امرت جیسے میٹھے چشموں، شہروں اور بستیوں میں گھوم پھر رہی ہے، اور اپنے بھجنوں اور گیتوں کے ذریعے شو بھگتی کے پریم پیالے پلا رہی ہیں۔

حالات

للی سری نگر سے چند میل کے فاصلے پر پاندریٹھن کے ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ شاید ہی وہ کبھی پوجا پاٹھ میں مگن رہتی۔ اُس نے اپنے باپ سے کچھ سنسکرت بھی سیکھی جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچی تو گیان دھیان میں زیادہ دل لگانے لگی۔ اُس نے ...

شیو فلاسفی اور گیتا وغیرہ کی تعلیمات پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ وقت گزرتا گیا اور دستور کے مطابق للی کی شادی پاندرینٹھن میں ایک برہمن کے گھر ہوئی۔ یہ جگہ سری نگر سے ۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن فطری طور پر للی کو شادی بیاہ کے بندھنوں میں پڑنے سے کوئی رغبت نہ تھی۔ سسرال میں وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ پوجا پاٹھ میں صرف کرتی۔ یہ بات اس کی ساس کو ناگوار گزرنے لگی۔ وہ تو للی کو گھر بار چلانے کے لئے لائی تھی، نہ کہ پوجا پاٹھ کے لئے۔ رفتہ رفتہ اُس نے للی کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اُس نے اُس کا کھانا بھی کم کر دیا۔ اُسے باسی کھانا دیتی۔ اور اُس کی تھالی میں ایک سِل بٹہ رکھ کر اس پر بھات بکھیر دیتی جس سے معلوم ہوتا۔ کہ تھالی بھری ہوئی ہے۔ اس طرح برسوں تک وہ چند لقموں پر زندگی بسر کرتی گئی۔

ایک دن اتفاق سے پنگھٹ پر گاؤں کی دوسری عورتوں نے للی سے پوچھا آج تو تمہارے گھر میں خوب ضیافتیں پک رہی ہیں۔ بڑی دھوم کی دعوتیں ہیں۔ للی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ہنڈ مارن کٹ کٹھ ... ل ثِرلہ نہ میلہ دٹھ

گھر میں پلاؤ پکیں یا ہرن اور بھیڑ بکریاں ذبح ہوں میری قسمت میں تو وہی سِل بٹہ ہے۔

یہ بات للی کے سسر تک پہنچی اس نے ایک دن للی کی تھالی کو دیکھا تو اُس میں سچ مچ ہی سِل بٹہ تھا، اور اُس پر تھوڑے سے بھات کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ سسر کو بڑا صدمہ ہوا اور اُس نے اس خرابی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن ساس بھی کب ٹلنے والی تھی۔ اُس نے للی کو اور بھی دق کرنا شروع کر دیا۔ اور اُس کی زندگی اجیرن ہونے لگی۔

اُدھر للی کی طبیعت کی بناوٹ پہلے ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ تپ اور تیاگ کو گھر اور گرہست پر ترجیح دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور اُس وقت کے ایک بڑے سنت ہیا نند سے گرو اُپدیش لیا۔ عرفان و معرفت کی راہ پر گامزن ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ للی کے تیاگ اور تپ کا چرچا ساری وادی میں پھیل گیا۔ لوگ اُس کی روحانی عظمت کے قائل ہونے لگے۔ للی اب کشمیر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں اپنے معبود حقیقی کی تلاش اور اپنی روح کی پیاس بجھانے کے لئے پھرتی رہی۔ جہاں پہنچتی لوگ اُس کے درشنوں اور اُپدیش کے لئے جمع ہوتے۔ للی شعر کہتی اور اُسے گاتی۔ اور منتر کا تی ہوئی لوگوں کو بھگتی کے نشے میں چور کر دیتی۔ اُس نے جو کچھ کہا اُسے اُس زمانے میں کسی نے قلم بند نہیں کیا۔ اور یہ فخر اس صدی میں یورپ کے محققین کو حاصل ہونا تھا۔ چنانچہ جب کشمیر میں بھی انگریزوں کے قدم کھلے بندوں پہنچے تو انگریز علماء نے کشمیری علم و ادب کے خزانوں کی تلاش شروع کی۔ اور کئی کتابیں لکھیں۔

سر جیورڈ ٹمپل اور سر گریرسن، دو عالم انگریزوں نے للی ایشوری کے متعلق تحقیق کا کام جاری کیا، اور اُن کے اقوال گیتوں اور دوہوں کو جمع کیا۔ لوگوں نے جو کچھ اُنہیں سینہ بسینہ یاد تھا اُسے قلم بند کیا، اور انگریزی میں ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ ان کے بعد تحقیق کا یہ کام پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ لیکن اس دوران میں کشمیر کے مشہور عالم اور مصنف پنڈت آنند کول صاحب بامزئی نے تحقیق کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔

اگر یہ انگریز عالم اس طرف توجہ نہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ آج للی کی عرفان بھری بانیوں کا کسی کو علم بھی نہ ہوتا۔

للی ایشوری نے ستر برس سے زیادہ عمر پائی اور کشمیر کے ایک مشہور تاریخی قصبہ بجبہاڑہ میں عالم فنا کو لبیک کہا۔ جو سری نگر سے ۲۵ یا ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب للی کا آخری وقت آیا تو اُس نے اپنے بھگتوں کو اشاروں کنایوں سے آگاہ کر دیا تھا کہ اب وہ جسمانی طور پر اُن سے الگ ہونے والی ہے۔ اور ایک دن صبح سمادھی کی حالت میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

لل بو دراییس لو لرے ... ژانڈان لوسُوم دین کیہو راتھ
وُچھوم پنڈت پنن گرے ... سو بہ ميہ روٹم نیچھتر تہ ساتھ

ترجمہ:- میں للی اسے ڈھونڈنے کے لئے پریم میں کھوئی ہوئی گھر سے نکل پڑی۔

دنوں پر دن اور راتوں پر راتیں گزرتی گئیں اور آخر میں نے وہ پنڈت (ایشور) اپنے ہی گھر (دل) میں ملا۔ یوں میری زندگی کی ساعت نیک اور ماحصل حیات تھا میرے ستارے میرے حق میں تھے۔

دمہ دمہ کورمس دمن ہالے ... پرزلیوم دیپ تہ نتے یم زاتھ
اندرم پرکاش نیبر ڈیو ٹھسیم ... گٹ روٹم تہ کرمس میہ تھپہ

میں اُس کی یاد میں اپنے پرانوں کی آہوتی دیتی رہی اور لمحہ لمحہ اُسی کا جاپ تپ کرتی رہی۔ آخر ایک دن آیا جب میرا باطن روشن ہوا اور اندر کی روشنی سے باہر بھی روشنی پھیلی میں نے گھپ تاریکی کے عالم میں اُسے پا لیا اور تاریکی ہی میرے لئے روشنی کا منبع بنی۔

دیو وٹا دیور وٹھا ... پیٹھ بوند ہیوے اک ولیا

پۆز اکس کرکھ ہتو بٹا   کرمنس تہ پۆزنس سنگٹا

دیوتا کی مورتی بھی پتھر کی ہے۔ دیو مندر بھی پتھر کا ہے۔ اے پنڈت تو کس کی پوجا کر رہا ہے۔ دیکھ تو اپنے من اور پَوَن یعنی سانس کو متحد کر۔ ایسے لوگ سے ہی تو اُس دیوتا کو پا سکے گا۔ وہ تو تیرے ہی اندر ہے مندر میں نہیں۔

رازہ ہنس اوسکھ سۆدکھ کٹو یہ   کُس تا نیہ ژولۆیکھ تھام ہیتھ
گرٕ گوٚبت تے گرٕ ہُٹ گولو یہ   گرٕ دول چولو پھیلہ پھل ہیتھ

کبھی تو راج ہنس تھا، اور اسی کی طرح چہکتا اور موتی چگتا تھا لیکن اب گو نگا کیوں ہو گیا ہے۔ گھراٹ (چکی) تو رُک گیا ہے اور گھراٹ کا منہ بھی بند ہو گیا ہے۔ پسنہارا تیرے دانے لے کے چل دیا ہے۔ اب تو کیا کرے گا؟

کیا تجھے اب بھی اُس کی یاد نہیں آئے گی جو پسنہاروں کا پسنہارا ہے؟

اتھ مہ ترا ون خرٕ با   لوکہ ہنز گنگہ داری کھیِیہ
تت کُس داری تھز با   یتہِ نفس کرتل پیِیہ

تو اپنے گدھے کو کھلا مت چھوڑ۔ یہ دوسروں کے کیسر (زعفران) کے کھیتوں کو کھا جائے گا۔ وہاں اپنی پیٹھ کس کو ننگی کرنی پڑے گی، جہاں ننگے جسم پر تلواروں کی کاٹ سہنی پڑتی ہے۔ یعنی تو اپنے دل کو اور اپنے نفس کو قابو میں رکھ۔ دوسروں کو نقصان پہنچائے گا تو تجھے بھی اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دوسرے کا نقصان اصل میں تیرا اپنا نقصان ہے۔

کیتھن رنیہ چھیہ شیہج یوٚ نیی   کینژن رنیہ چھیہ برہ پیٹھ ہو تِمَی
نیرکہ نیبر تہ زنگ کھیِیَی   کینژن رنیہ چھیہ اُدل تہ بدل
کینژن رنیہ چھیہ زدل ژھیبی

کچھ لوگوں کو تو ٹھنڈے گھنے سائے والے چنار کی جیسی بیویاں ملی ہوئی ہیں۔ ایسے لوگ سکھی ہوتے ہیں۔

بعض کو راستے میں کاٹنے والی کتیا جیسی بیویاں ملی ہیں۔ باہر نکلتے ہی ٹانگیں کاٹ کھاتی ہیں۔

کچھ لوگوں کے حصے میں اُبل بے جوڑ عورتیں آئی ہیں۔ اُن کی زندگی بھی اکثر ہے۔ اور بعض کو تو ایسی بیویاں ملی ہیں جیسے کسی جھونپڑا پر گھاس پھونس کی چھت ہو جس میں چھید ہی چھید ہوں اور پانی برسے تو ٹپکے، دھوپ آئے تو مصیبت ایسے گھر میں سکھ کہاں۔

جل ہا مالِ لۆ سۆ یہ نہ پکان پکان   ہریہ لۆ سو یہ نہ والکان سیمرد

چندرمہ لو سو یہ نہ مران تہ زیوان   منش لو شو یہ نہ نیندا کران

جس طرح دریا اور ندیاں بہتے بہتے نہیں تھکنے پاتیں۔ سورج بھی پہاڑوں پر چڑھتے اُترتے نہیں تھکتا، چاند بھی ڈوبتے اُبھرتے نہیں تھکتا، اُسی طرح انسان ایک دوسرے کی غیبت اور عیب جوئی کرتے کرتے کبھی نہیں تھکتا۔

ژانڈان لوسوم پان پانس   چھیہ ہیتہ گیا تس وات نہ کانہہ
لے کرمس واٹرس سے خانس   بھر بھر بانہ تہ چوان نہ کانہہ

میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتی ڈھونڈھتی تھک گئی۔ لیکن میں اس گیان کو حاصل نہ کر سکی یعنی اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔ اور پھر میں جھٹ خانے کی طرف گئی جہاں جام جام بھر بھر کر رکھے تھے اور پینے والا کوئی نہ تھا۔

شنیس تہ رَوس اتھ کُس رٹے   کُس ہیک رٹتھ واو
نیس پانژ یندرے ژٹتھ ژلے   سو یہ ریش گٹہ رو

اس خلا اور سورج کو کون پکڑ سکتا ہے۔ ہوا کو مٹھی میں کون بند کر سکتا ہے۔ حواس خمسہ پر کون قابو پا سکتا ہے، جو یہ باتیں کر سکے وہ اندھیرے میں سورج کو پا سکتا ہے۔

آم پنہ سدرس ناوِ چھس لمان   کت بوزِ دے میون مت دِ یہ تار
آمین ناکین پونیہ زن شرپان   ژو چھس بران گھرہ گچھ آر

میں اپنی کشتی کو کچے دھاگے سے کھینچ رہی ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرا شنبھو میری سن لے گا اور میری ناؤ کو پار لگا دے گا؟

جس طرح کچے پیالوں میں پانی بھرنے سے وہ پیالے ٹوٹ پھوٹ اور گھل جاتے ہیں، وہی میرے دل کی حالت ہے۔ کیا وہ شنبھو نہیں جانتا کہ میں اصلی گھر میں پہنچنا چاہتی ہوں۔

کُنیر بوزکھ کُنہ نہ رو زکھ   کُنیرن کورنم ہشیا کار
کنیر آستھ مدن ہند جنگ گم   سو یہ میہ سنگ گوم کرتی تنگ

اگر تم اپنے آپ کو اکیلے اور سب سے الگ تھلگ سمجھوگے تو جان لو کہ تم کبھی تنہا نہ رہوگے۔ مجھے تو اپنے اکیلے اور تنہا ہونے نے ساری دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ یعنی میری وحدت نے مجھے کثرت میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن جب میں اپنے سے دوسروں کو بیگانہ سمجھنے لگی تو دوئی اور غیریت پیدا ہوئی، اور اس سے دنیا میں جھگڑے، لڑائیاں اور جنگ ہونے لگی۔

سبھ ہند شکارکا وُکیا زانے   ہنکھ کیا زانے پت وہ وہ

ژانگیچ پدوی بش کت زانے   مچھ کت زانے پانپر گت

کوتے شیروں کی طرح شکار کرنا نہیں جانتے۔
بانجھ عورت اولاد کے درد کو نہیں جان سکتی۔
چیڑ کی لکڑی چراغ کے مرتبے کو کہاں پہنچ سکتی ہے۔[1]
اور مکھی پروانے کی طرح چراغ پر اپنی جان نچھاور نہیں کر سکتی۔

شیل سنے مان چھیہ پوتیہ کرنجے   مچھ یم روٹ چلہ وُن واؤ
ہوستن مس والہ گنڈے   بتہ پیس تگے شوا وہ نہال

دنیاوی جاہ و دولت اور عزت و آبرو کے پیچھے دوڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ٹوکری میں پانی بھرنا۔ یا تیز رفتار ہوا کو ہاتھوں میں تھامنا یا ہاتھی کو کسی بال سے باندھنا جو یہ باتیں کر سکے گا وہ بے شک مال و دولت سے نہال ہو جائے گا۔

اڈان آیہ تہ گچھان گچھے   پکن گچھے دین کیہو راتہ
یورہ آیہ تور گچھن گچھے   کینہ نتہ کینہ منہ کیا

ہم اس دنیا میں ازل سے آئے ہیں اور ابدی ہیں۔ یہاں دن رات سفر میں ہی رہنا ہے۔ چلنا چلنا اور پھر چلنا۔
جہاں سے آئے وہیں جائیں گے۔ اور تو جو یہ کہتا ہے کہ یہ سب ہیچ ہے تو کیا تو نہیں جانتا کہ کچھ نہ ہونا بھی تو کچھ ہوتا ہے۔

ہاسا بول پرنم سا سا   میہ کھید نہ ہیئیے من ہا سا
یہ دے شنکر بھگتی آ سا   مل کتہ پیہ مکرس سوا سا

ہزار بار کوئی میری ہنسی اُڑائے۔ لیکن میرا من میلا نہیں ہوگا۔
اگر میں شنکر کی بھگت اور پُجارن ہوں تو مجھے ان باتوں سے کیا۔
میرا ضمیر روشن ہے۔ کیا آئینہ سانس کی نمی سے میلا ہو جاتا ہے۔
وہ نمی مٹ جائے گی، اور آئینہ پھر آئینہ ہے۔

[1] دیہاتی لوگ چیڑ کے درخت کی تیلیں بنا کر اُن سے چراغ کا کام لیتے ہیں۔

قطعاتِ تاریخ

(خسرو خاں نے باغ "فیض بخش" کی تاریخ کہی۔ مادۂ تاریخ "مسرت گاہِ شاہی" سے ۱۰۴۲ ہجری = ۱۶۳۳ء کا سال نکلتا ہے)

چو باغ فیض بخش از حکم شاہی   ابر باغ ارم گشتہ مباہی
فرح بخش از کمالِ اختارش   چو گل بر فرق خود دادہ قرارش
ازیں او کاشمر فخر جہاں است   کہ در روے گلشن شاہ جہاں است
پئے تاریخ سالش صبح گاہی   خرد گفتا مسرت گاہ شاہی

(باغ فیض بخش شالامار باغ کے دوسرے حصے کا نام ہے، اس کے بارے میں کشمیر کے مغل گورنر ظفر خاں نے یہ برجستہ شعر کہا ہے)

ہست اگر در عالم عیش و طرب خلد بریں؛
فیض بخش است و فرح بخش است بر روئے زمیں؛

(عیش آباد سال تعمیر ۱۰۳۰ ہجری (۱۶۲۱ عیسوی)

عیش آباد روضۂ شاہی!   از جہانگیر شہ چو یافت نظام
بہر تاریخ آں سروش بگفت   عیش آباد گلشن آرام

ساغر نظامی

کشمیر

اے مجسم بہار کیا کہنا

اے سراپا نگار کیا کہنا

ہے ترے مس سے خزاں بھی بہار — اے عروسِ بہار کیا کہنا

تیری دھرتی زمینِ لالہ و گُل — تیری مٹی میں نغمۂ بلبل — باغ و صحرا و بام و در اک پھول — منظر و شاہد و منظر اک پھول

جملۂ غنچگی، نگارِ شگفت — مولدِ بوئے گُل، دیارِ شگفت — پتہ پتہ ہے داستانِ بہار — ذرہ ذرہ ہے قصہ خوانِ بہار

وادیاں نغمہ ریز و گُل بکنار — چوٹیاں دوش پر لئے گلزار — لالہ زاروں کی نوجوانی ہے — آبشاروں کی راجدھانی ہے

خس و خاشاک بھی جہانِ بہار — خاک ہے تیری آسمانِ بہار — یہ صنوبر، یہ سرو، یہ لالہ

یہ سپیدوں کے پیڑ سر بہ فلک — مسکراتے ہوئے ستاروں تک — یہ فضا، یہ چنار، کیا کہنا

پھول ہی پھول اور مہک ہی مہک — رنگ ہی رنگ اور دمک ہی دمک — پتی پتی ہے بربطِ فردوس

شعلہ در رنگ رنگ کی یہ بہار — چھوٹ رہے ہوں فضا میں جیسے انار — نغمۂ شاخسار کیا کہنا

از چمن تا بہ دامنِ صحرا — ایک سیلاب ہے شگوفوں کا — اے مجسم بہار کیا کہنا

اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے — اک شبِ ماہ مسکراتی ہے — یہ روپہلی زمیں سنہری ریت — لہلہاتے ہوئے یہ دھان کے کھیت

[illegible] پھول — بن گئے ہیں فلک پہ تارے پھول — ڈل میں امواج کی یہ تابانی — موتیوں کا نچوڑ ہے پانی

آب میں یہ سرمئی کے تھالے   چاند کہیے کہ چاند کے ہالے
ہر نفس ابر کے بدلتے روپ   چھاؤں کی گود میں غنودہ دھوپ
دھوپ کی گود میں خنک سائے   اور سایوں میں عکس پھولوں کے

یہ حبابی دھواں فضاؤں میں
یہ گلابی غبار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

دُور تک چیڑ کے گھنے جنگل   ایک رمز ایک علم ایک غزل
چوٹیوں پہ یہ سُرخ وزنّیں گھاس   دودھ سی برف جیسے نرم کپاس
نہیں اے دل یہ برف کے ٹکڑے   جڑ دیئے ہیں کسی نے آئینے
انعکاسِ شفق کا دیکھ کمال   آئینوں پر چھڑک دیا ہے گُلال
رُخِ قدرت سے اُٹھ گیا ہے نقاب   مسکراتا ہے زندگی کا شباب

موتیوں کی سڑک ہے یا جہلم
کہکشانِ بہار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

اس حقیقت کو اے نگاہ نہ بھول   ہے گُلِ زعفراں خزاں کا پھول
یہ کرن پھول گوشِ فطرت کا   گم شدہ چاندنی کا آویزہ
یا کسی زندگی کا یہ جھمکا   مستیٔ رقص میں زمیں پہ گرا
یا فسوں پھول بن کے پھوٹا ہے   یا جنوں رنگ بن کے بپرا ہے
یا کرن نور کے گلاس میں ہے   یا مہک مادّی لباس میں ہے
پھوٹتی ہیں زمیں کے سینے سے   نیلگوں تتلیاں پرے کے پرے
یا یہ شمعیں عدم کی محفل کی   حسرتیں ہیں زمیں کے دل کی

ہر گُلِ زعفراں خزاں کا پھول
اس خزاں کی بہار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

اسی موسم میں سبز سبز چنار   اوڑھ لیتے ہیں چادرِ گُلنار
اپنی پہلی بہار کھوتے ہیں   کچھ سے کچھ یہ چنار ہوتے ہیں
سبز پتوں کا حُسن ڈھلتا ہے   کیسری روپ میں مچلتا ہے
سبز سے زرد، زرد سے لعلیں   لالہ رُخ آتشیں و شعلہ جبیں
سُرخ پتوں سے لالہ زار زمیں   لال مخمل کا جیسے ہو قالیں
اور اس میں جڑے ہوں بیش و کم   کوہِ نور و زمرّد و نیلم
یوں دہکتا ہے سرخیوں کا سہاگ   جیسے وادی میں لگ رہی ہو آگ
آگ ہی آگ بام و در میں آگ   آگ ہی آگ بحر و بر میں آگ

۲۳ گل وہلی (کشمیر نمبر)

اگست ۱۹۵۵ء

آب میں کوہ پر، شجر میں آگ　　آگ نظارے میں منظر میں آگ

ہر چنار ایک مشعلِ کہسار

مشعلِ کوہسار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

اے سراپا نگار کیا کہنا

اور اس زرنگار وادی میں　　اس مجسّم بہار وادی میں

اس سراپا نگار سے نازک　　اس عروسِ بہار سے نازک

ایک مخلوقِ نور بستی ہے　　دلِ غلمان و حُور بستی ہے

نکہتِ گُل نے جس کو پالا ہے　　رنگ و بو نے جسے نکھارا ہے

چاندی ہے جس کا آئینہ خانہ　　چاندنی جس کی زلف کا شانہ

رُوئے گُل پر نکھار ہے جس سے　　زندگی پُر بہار ہے جس سے

ہیں قدم بوس جس کے سرو و چنار　　یہ عروجِ چمن یہ پیرِ بہار

ہے جو شامِ بہار کی تنویر　　اس شفق سے گندھا ہے ان کا خمیر

ہم جلیسِ صبا، ندیمِ بہار　　ہمدمِ کارگاہِ لیل و نہار

محفلِ رنگ و بُو کے یہ شاعر　　یہ طلسماتِ نُور کے ساحر

ذہن میں اک خزانۂ جوہر　　دل میں مصروف ان گنت آذر

اُنگلیاں ان کی مانی و بہزاد　　ان کی پوروں میں تیشۂ فرہاد

جسے کہتے ہیں جنّتِ شدّاد　　اُنگلیوں کے خطوط میں آباد

ان سے تخلیق نے سند پائی　　ناز کرتی ہے ان پہ صنّاعی

ان کے سینے نہیں دفینے ہیں　　اختراعات کے خزینے ہیں

ساقی و جام و بادہ و مُل ہے　　ایک انبار لالہ و گُل ہے

جوشِ مستیٔ بہار و کیف و نمو　　نقش و نور و خطوط و رنگ و بُو

دیکھنے میں یہ خستہ جان سے ہیں

لالہ و گُل کے خاندان سے ہیں

کبھی ایماں فروز ان کا وجود

کبھی یزداں شکار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

اہلِ کشمیر یہ ہیں اہلِ نظر　　ہے یہ فردوس تر پس منظر

ان سے سرو، ان سے دیودار و چنار　　ان سے گُل ان سے باغ، ان سے بہار

جھومتے ابر پھوٹتے چشمے　　ساری بے تابیاں ہیں ان کے لئے

کوہساروں میں رات دن جھرنے　　ساز چھیڑے ہوئے ہیں ان کے لئے

ان کے سرسبز جونپڑوں کے لئے　　رات لاتی ہے دیپ تاروں کے

ڈل کے سینے پہ روشنی کے ایاغ — مسکراتے ہوئے کنول کے چراغ
سب یہ روشن ایاغ بُجھ جائیں — ہر کنول کے چراغ بُجھ جائیں
رنگ و بُو کے وطن میں نُور نہ ہو — یہ نہ ہوں تو چمن میں نور نہ ہو
اک دھڑکتا ہُوا ضمیر ہیں یہ — ساقیٔ بزمِ کاشمیر ہیں یہ
تُند شعلوں کا پیچ و تاب ہیں یہ — تابشِ رُخِ انقلاب ہیں یہ

عزم پرواز اور نفس شاہیں
ہر نظر شعلہ بار کیا کہنا

اور لبوں پہ بجائے نغمۂ ساز
نعرۂ کارزار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

جو صدا سازِ نہر سے اُٹھی — روحِ کشمیر کا ترانہ بنی
بزمِ کشمیر میں جلائے گئے — ہند کی شمع کے اُجالے نے
برف کی گود میں شرر مچلے — سنگ میں تلملا اُٹھے شعلے
موم میں ایسے ڈھلنے لگا آہن — بجلیوں سے اُلجھ پڑے خرمن
قلبِ کشمیریاں دھڑک اُٹھا — جذبۂ بے نشاں بھڑک اُٹھا
توڑ دیں بے کسی نے زنجیریں — چُور کیں زندگی نے زنجیریں

ٹکڑے ٹکڑے کئے جوانی نے
رسن و طوق و دار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا

ہو کے بے تاب موجِ گنگا نے — بار ڈالے گلے میں جہلم کے
ایک دھارا ہے اور اک سنگم — مشترک ہے جنوں، وفا محکم
ایک بنیادِ شوق ایک نظام — ایک مقصود اور ایک عوام
ایک جام و سبُو کے متوالے — ایک جہدِ حیات کے پالے
ایک اصول ایک عزم ایک خیال — ایک ساز ایک نغمہ ایک جمال
ایک درد، ایک آہ ایک فغاں — ایک بحر، ایک موج، اک طوفاں
آگ ہے ایک دو دلوں میں دبی — ایک دونوں کے ہیں جلی و خفی
ہے یہ بندھن اصول کا ابدی — توڑ سکتا نہیں اسے کوئی
وقت کا کوہِ نور حسن کا خراج — تُو ہے وہ فرقِ ایشیا کا تاج

اک چمن اک نسیم ایک سمن
اک خزاں اک بہار کیا کہنا

اے مجسّم بہار کیا کہنا
اے سراپا نگار کیا کہنا

چندر گپت ودیالنکار

تین دن

اصل کہانی ہندی میں ہے اردو ترجمہ باکمال مصنف کے شکریے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یہ کہانی افسانے کے بین الاقوامی مقابلے کے لئے لکھی گئی تھی۔ ہندوستان بھر کی کل کہانیوں کے مقابلے میں اس نے پانچویں نمبر کا انعام پایا۔

آج صبح سے پہلے مجھے کہاں معلوم تھا کہ جنت مجھ سے صرف کچھ ہی گھنٹوں کے فاصلے پر ہے۔ پہلے بھی میں کتنی بار کشمیر آیا ہوں۔ مگر مجھے خیال بھی نہ تھا کہ سری نگر سے صرف پچیس میل دور ہی جنت کا ایک ٹکڑا موجود ہے۔ میرے میزبان کا یہ وسیع باغ اور اس سے کچھ ہی دور مانس بل کی یہ نہایت خوبصورت جھیل تھی بلندی اپنے جوبن پر ہے، اور یہ وسیع باغ ہزاروں لاکھوں نازک خوشبودار اور خوش نما پھولوں سے لدا سا پڑا ہے۔ باغ کے باہر ہر طرف اونچے اونچے ٹیلے ہیں، جن پر مونگے کے رنگ کی نئی گھاس پھوٹ رہی ہے۔ مانس بل جھیل کے ایک طرف اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں جن کی چوٹیاں ابھی تک برف سے ڈھکی پڑی ہیں۔ جھیل کے شفاف پانی میں ایک طرف تو ان براق پہاڑیوں کا، اور دوسری طرف بے شمار پھولوں سے لدے ہوئے اس سرسبز جنگل کا عکس جھلملاتا رہتا ہے جو لگاتار بلند ہوتا گیا ہے۔

کتنا فرق ہے میری شاعری اور یہاں کی زندگی میں۔ وہاں ہر وقت بے دلی سے مسکرانا، دن بھر میں بیسیوں نئے آدمیوں سے ملنا، اور دن رات سرکس کے بانکے کی طرح چوکنا رہنا جیسے وہ تار پر سائیکل چلاتا ہے، اور سرکس کے تمام تماش بینوں کی نگاہ اس کی طرف لگی رہتی ہے۔ لیکن یہاں آکر انسان یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فطرت کی گود میں آپہنچا ہے۔

کل رات جب میں یہاں پہنچا تو پھولوں کی خوشبو سے بھری ٹھنڈی ہوا نے میرا خیر مقدم کیا تھا۔ صبح جب میں اٹھ کر باہر آیا تو یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ اٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ چاروں طرف قدرتی نظارے بکھرے پڑے ہیں۔ میں چپ چاپ بنا کسی سے کچھ بھی پوچھے اکیلا ایک طرف کو نکل گیا۔ میرے میزبان بہت سمجھدار آدمی ہیں۔ میرے آرام کا انھوں نے پورا انتظام تو کر دیا، مگر وہ میرے سامنے نہیں آئے۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے اونچے نیچے میدانوں پر میں اکیلا آگے بڑھتا چلا گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف بہت دور۔ آسمانی بلندیوں پر اڑتی ہوئی ابابیلوں کی قطاریں اس سناٹے کو کبھی کبھی توڑ دیتی تھیں لیکن ان کا موسیقی آمیز چہچہانا کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ خوبصورتی سے بھرپور اس نئی دنیا میں میں اکیلا آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ اجنبی علاقہ جیسے کسی ہمدم دیرینہ کی طرح مجھے اپنی طرف پکار رہا تھا۔ آج جو کچھ بھی میں دیکھ رہا تھا وہ سب میرے لئے نیا تھا لیکن میری روح بآواز بلند پکار رہی تھی کہ برف سے لدی ہوئی پہاڑی چوٹیوں کو پھولوں سے لدے ہوئے ان جنگلوں کو اور ارد گرد کی ہر چیز کو اپنے سینے میں عکس کرتی ہوئی جھیل کو میں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں اور ایک مدت سے جانتا ہوں۔

نہ جانے کس قدر گھوم پھر کر جب میں اپنے میزبان کے باغیچے میں واپس آیا تو سورج آسمان کے اوپر آپہنچا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے میزبان باغبانی کے کچھ اوزار لئے ایک بہت ہی خوش نما درخت کی دیکھ بھال میں مشغول ہیں۔ ایک بہت سادہ مسکراہٹ کے ساتھ میرے میزبان نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرا حال چال پوچھا۔ قریب کے اس درخت کو جب میں نے ذرا غور سے دیکھا

تو میرے تعجب کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس درخت کا تنا تو ایک ہی تھا، لیکن اوپر جا کر یہ تنا تین حصوں میں منقسم ہو گیا تھا اور ان تینوں پر مختلف قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ میرے میزبان نے اپنے اس محبوب درخت سے میرا تعارف کرایا۔ یہ خوبانی کا درخت تھا۔ اب اس پر سیب، آڑو، اور خوبانی تینوں پھل لگتے ہیں۔

میں نے کہا "آج کیا آپ اس خوش قسمت درخت پر کسی چوتھے پھل کی قلم لگا رہے ہیں؟"

میرے میزبان نے کہا "میرے یہاں چار پھل دینے والا بھی ایک درخت ہے لیکن آج کل تو قلم لگانے کا موقع ہی نہیں ہے"

میں نے کہا "تو قلم لگانے کا بھی موسم ہوتا ہے"

میرے میزبان نے کہا "قلم لگانے کا نہ صرف موسم ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو قلم لگاتے وقت درخت کے مُوڈ کا بھی دھیان رکھتا ہوں"

میں نے کہا "درختوں کا مُوڈ؟"

انھوں نے کہا "درخت تو خیر درخت ہی ہیں، اور ان میں لا انتہا قوت برداشت ہوتی ہے۔ مگر میرا تو خیال ہے کہ اگر مُوڈ اور ماحول کا خیال رکھا جائے تو انسان میں بھی قلم لگائی جا سکتی ہے۔"

میں نے دوہرایا "انسان میں بھی قلم؟"

میرے میزبان نے کہا "جی ہاں انسان کے نفسیات میں بھی اگر مُوڈ اور ماحول کا خیال رکھا جائے تو قلم لگائی جا سکتی ہے"

یہ بات آگے نہیں بڑھی اور ہم لوگ کھانے کے کمرے کی طرف چلے گئے، دوپہر کے کھانے کے بعد میں کچھ دیر سویا۔ اور چائے کے بعد پھر سیر کے لئے نکل گیا۔ جب میں سیر سے واپس آیا تو رات ہو گئی تھی۔ رات کی خاموشی میں میں نے دیکھا کہ میرے میزبان کی وہی کار جس پر میں کل رات اس وقت یہاں آیا تھا آج پھر پورچ میں کھڑی ہے اور اس میں سے ایک اور صاحب اتر رہے ہیں۔

میرے میزبان بھی کتنے مزہ دار آدمی ہیں۔ انھیں نہ جانے کہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے دوست کو کب ان کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس نئے مہمان سے میرا تعارف کرایا "تم نے میرے اس دوست کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یہ ہیں ڈاکٹر آنند کمار کتنی ہی کتابوں کے مصنف"

آنند کمار کی کچھ کتابیں میں نے پڑھی تھیں اور مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ ایک نوجوان سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تعجب مجھے یہ دیکھ کر ہوا کہ ڈاکٹر آنند کمار بہت ہی غمگین سنجیدہ اور کھوئے کھوئے سے دکھائی دے رہے تھے۔ گویا وہ اپنا سبھی کچھ گنوا کر یہاں آئے تھے۔

ماحول میں اُن کے ساتھ ہی ایک اداسی سی چھا گئی تھی۔ میرے میزبان بھی خاموش تھے۔ ڈاکٹر آنند کمار کے منہ میں تو زبان ہی نہیں تھی۔ اس وقت کسی ناواقف سے واقفیت پیدا کرنے کے مُوڈ میں نہیں تھے۔ اسی لئے میں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات کو کھانا بھی میں نے اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا۔ رات کے سناٹے میں میں نے سُنا میرے میزبان ستار پر بہت ہی درد بھری راگنیاں چھیڑ رہے ہیں۔ گویا وہ جان بوجھ کر ڈاکٹر آنند کمار کو اور بھی زیادہ رُلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آنند کمار کا حال تو وہ خود جانے۔ چاندنی سے ڈھکے ہوئے جنّت کے اس گوشے میں درد بھری راگنیاں سُن کر میری آنکھوں کے کونے بھی خود بخود بھیگ گئے تھے۔

دوسرا دن

صبح اُٹھا تو میں نے پایا کہ میرا دل اور جسم دونوں بہت صحت مند ہو گئے ہیں۔ ایسا جان پڑا جیسے ایک زمانے سے میں اس پُرفضا دنیا میں رہتا آیا ہوں۔ میں اکیلا چستی کے ساتھ مانس بل کی طرف بڑھنے لگا جھیل کے کنارے میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا شکارا بندھا ہوا ہے۔ کالج کے دنوں میں میں اپنی کشتیاں چلانے والی ٹیم میں رہا تھا۔ وہ شوق مجھ میں جاگ اٹھا اور یہ شکارا لے کر میں جھیل کے اندر کی طرف بڑھتا گیا۔ جھیل میں کچھ ہی دوری پر کنول کا ایک بڑا کھیت سا تھا۔ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں کھلی ہوئی یہ پیلی پیلی کنولنیاں نزاکت اور خوبصورتی کا مجسمہ جان پڑتی تھیں۔ میں نے اس کھیت کا ایک چکر لگایا اور بیسیوں پھول اپنے شکارے میں بھر لئے۔ اس کے بعد میں نے شکارے میں اپنے کپڑے اُتار دیئے اور جھیل کے صاف پانی میں جی بھر کے تیرا۔

گھر واپس آیا تو آج کل سے بھی زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ میرے میزبان ڈاکٹر آنند کمار کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ آنند کمار بھی اس وقت بہت غمگین نظر نہیں آ رہے تھے۔

آج اپنے میزبان سے ڈاکٹر آنند کمار کی اُداسی کا سبب معلوم ہوا۔ سبب ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔ قریب پانچ سال ہوئے اپنے ہی کالج میں سائنس کی ایک طالب علم سینیٹ کے ساتھ آنند کمار کی جان پہچان ہوئی تھی۔ یہ جان پہچان بڑھتے بڑھتے باہمی کشش بن گئی۔ وقت نے گویا چپ چاپ ان دونوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سی دیا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے جذب و کشش کا سرچشمہ بن گئے۔

پچھلے سال سینیٹ کے مدعو کرنے پر ڈاکٹر آنند کمار اس کے گھر پر بھی

گئے تھے۔ جینٹ کے ماں باپ ان کو مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ جینٹ اور آنند کمار کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ جینٹ کے ماں باپ کو ان کی شادی کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نہ جانے کتنے قسم کے عہد و پیمان کئے۔ دونوں کی دنیا جیسے سمٹ کر ایک دوسرے تک ہی محدود ہو گئی۔

کچھ ہی دن ہوئے کہ آنند کمار نے اپنے سب دوستوں کو اس بات کی اطلاع دے دی کہ بسنت کے موقعے پر وہ جینٹ سے شادی کر رہے ہیں۔ میرے میزبان کے پاس بھی ان کی یہ اطلاع دعوت نامے کی صورت میں آئی تھی۔

یکایک نیلے آسمان سے بجلی گری۔ جینٹ کے والد کا خط انھیں ملا کہ ان کا خاندان کسی غیر عیسائی کے ساتھ اپنی جینٹ کی شادی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں، اپنے بڑے لڑکے کو بھیج کر جینٹ کو اُنھوں نے اپنے پاس واپس بلا لیا۔ آنند کمار کی پریشانی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ انھوں نے کتنی ہی دلیلیں دے کر جینٹ کے والد سے یہ اصرار کیا کہ اُنھیں اس معاملے میں اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ وہ کتنے ہی برسوں سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شادی کے بعد بھی جینٹ عیسائی ہی رہے گی۔ اس بات کا بھی انھوں نے یقین دلایا، ایک خط اُنھوں نے جینٹ کو بھی لکھا تھا۔

لیکن جینٹ کے والد اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اُنھوں نے لکھا کہ آنند کمار کو بھی عیسائی ہو جانا چاہیئے تبھی یہ شادی ہو سکتی ہے۔ بیچارے آنند کمار جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب انھوں نے کیا۔ مگر جینٹ کے والد متفق نہ ہوئے۔ آنند کمار کو عیسائیت سے کوئی بیر نہ تھا۔ مگر شادی کی خاطر عیسائی ہو جانے کو وہ تیار نہیں تھے۔ شادی کی خاطر مذہب کی تبدیلی اُنھیں انسانیت کی توہین معلوم ہوتی تھی۔

پچھلے ہفتے آنند کمار کو جینٹ کا خط ملا جس میں اس نے صاف لکھ دیا تھا کہ وہ اپنے والدین اور اپنے خاندان کو ناراض نہیں کر سکتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کی خاطر آنند کمار عیسائی ہو جائیں۔ اس لئے اچھا ہی رہے گا کہ دونوں ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لئے بھول جائیں۔

جذباتی آنند کمار کے لئے یہ بہت بڑی چوٹ تھی۔ میرے میزبان سے وہ کبھی کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتے تھے۔ انھیں سبھی کچھ معلوم تھا۔ اسی لئے انھوں نے تار دے کر آنند کمار کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

اور میں تو ان باتوں میں ایک دم کورا ہوں۔ چاہے اندر کتنا ہی طوفان اٹھے لاکھ کوشش کرنے پر بھی ہمدردی کا ایک لفظ بھی میرے گلے سے باہر نہیں نکل پاتا۔ آج شام ہم تینوں ایک ساتھ سیر کرنے گئے گھنٹوں تک گھومتے پھرے، لیکن جو کچھ بیت چکا تھا، اس کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مناظر فطرت کی آغوش میں آنند کمار کے دُکھی دل کو تسلی مل رہی ہے۔

سیر سے واپس آئے تو آدھی رات ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے میری روح کو اس وقت کوٹھی کے پورچ میں اپنے میزبان کی کار کو موجود دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اوہ کل اور پرسوں کی طرح ٹھیک اسی وقت اور ٹھیک اس جگہ میرے میزبان کی کار کھڑی ہے اور کسی کا سُوٹ کیس اور دیگر سامان اُتارا جا رہا ہے۔

میرا تو کیا، میرے میزبان کے تعجب کا بھی ٹھکانا نہ رہا جب کار سے ایک عورت اُتر کر ان کی طرف بڑھی۔ لمحہ بھر تعجب سے دیکھنے کے بعد چیختی سی آواز سے اُنھوں نے پکارا "اندرا تم یہاں کہاں!"

اندرا آگے بڑھ کر چپ چاپ میرے میزبان کے پاس پہنچی۔ میرے میزبان نے اسے بازوؤں میں لے کر پریشان لہجے میں کہا "تم امریکہ سے کب لوٹیں اندرا۔ اجیت کہاں ہے۔ تم نے تو اپنے آنے تک کی اطلاع مجھے نہیں دی۔ بیٹی کیا بات ہوئی؟"

میرے میزبان کے کندھے پر سر ڈال کر اندرا دھیرے سے بولی: "چاچا جی!" اور اس کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

چاندنی میں میں نے دیکھا کہ اس خوبصورت دوشیزہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ میرے میزبان نے پوچھا "اجیت کہاں ہے؟" اُن کے لہجے سے بہت پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

اندرا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ شاید ہم دونوں کے سامنے وہ کچھ کہہ نہ سکتی ہو۔ یہ سوچ کر آنند کمار اور میں چُپ چاپ اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ ماحول یکایک بہت درد انگیز ہو گیا تھا۔ رات کا وہ گہرا سناٹا وہ خاموش چاندنی اور پھولوں کی خوشبو سے معطر ٹھنڈی ہوا اس یاس انگیز منظر کو اور بھی یاس انگیز بنا رہی تھی۔

تیسرا دن

میرے میزبان میرے بچپن کے دوست ہیں۔ وہ جب کبھی راجدھانی میں آتے ہیں تو میرے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ میں پہلی ہی بار ان کے یہاں آیا ہوں۔ اپنے اس میزبان کو میں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ باغبانی کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت ہی ٹھہری ہوئی اور سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔ میں ہمیشہ سے انھیں متانت

کا ثبوت مانتا رہا ہوں کسی نے انھیں اپنا توازن کھوتے نہیں دیکھا بکل رات انھیں بھی توازن کھوتے دیکھ کر قدرتی طور پر مجھے بہت دکھ ہوا۔

آج معلوم ہو گیا کہ اندرا کی کہانی جتنی دکھ بھری ہے اتنی ہی آدمی کے لئے شرمناک بھی ہے۔

مختصر طور پر قصہ یہ تھا کہ بھولی بھالی اندرا پچھلے تین برسوں سے جس نوجوان پر بے حد یقین کرتی رہی وہ بہت بڑا دھوکے باز نکلا۔ پچھلے سال تعلیم کا بہانہ کر کے میرے میزبان سے کافی روپیہ لے کر اجیت امریکہ چلا گیا تھا۔ تین مہینے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ اس کے ایک امریکی دوست برادیل میں پچاس ہزار روپے میں اسے ایک بہت بڑا فارم دلا سکتے ہیں۔ اس لئے اندرا کو چاہیئے کہ وہ اپنے چاچا سے روپے کا انتظام کر کے امریکہ چلی آئے۔ اجیت کو معلوم تھا کہ اندرا کے لئے اس کے چاچا نے پچاس ہزار الگ رکھا ہوا ہے۔ کتنے ارمانوں کو لے کر اندرا آج سے صرف چند ہفتے پہلے امریکہ گئی تھی، اور کس ٹوٹے دل سے وہ آج واپس لوٹی ہے۔ پردیس میں سب کچھ گنوا کر بھولی بھالی اندرا کو یہ سمجھ آئی کہ اجیت اندرا کو نہیں اس کے پیسے کو چاہتا تھا۔

کسی کو اطلاع دئے بنا آج شام جب اندرا سری نگر پہنچی تو اپنے چاچا کے پاس آنے کے لئے ٹیکسی کا انتظام کر رہی تھی کہ اس کے چچا کے ڈرائیور کی نگاہ اس پر پڑ گئی جو کچھ ضروری چیزیں لینے سری نگر آیا تھا۔

اندرا کی آپ بیتی جان کر میرا دل یاس اور ناامیدی سے بھر آیا۔ اوہ! انسان کتنا بڑا حیوان بن سکتا ہے۔ اندرا کے لئے میرے دل میں گہری ہمدردی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ درد مجھے اپنے میزبان کے اداس چہرے کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

صبح میں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ سیر کے لئے چلیں۔ وہ چپ چاپ میرے ساتھ چل دئے۔ یوں نہ مجھے زیادہ بولنے کی عادت ہے اور نہ میرے میزبان کو۔ مگر آج صبح کی سیر کے چار پانچ گھنٹوں میں میں نے نہ جانے کتنی بکواس کی ہو گی۔ میں نے دنیا بھر کا مذاق اڑایا۔ ماجد علی کے اپنے دوستوں کی ہنسی اڑائی، اور سب سے بڑھ کر خود اپنا مذاق بھی اڑایا۔ دنیا کی کچھ قوموں کے بارے میں بے وقوفی کے جو قصے مشہور ہیں وہ سب نئے سے نئے قصے میں نے اپنے بارے میں سنائے۔ مگر میں جانتا تھا کہ میری کوئی چال اس لئے کارگر نہیں ہو رہی ہے کہ میرے میزبان کے دل کے دکھ کی تھاہ ہی نہیں تھی۔ وہ میری بات سن کر مسکراتے تو تھے لیکن اس مسکراہٹ میں ان کا درد اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ اتنی بڑی شکست شاید ہی کبھی میرے پلے پڑی ہو۔ اس نئی الجھن کے سامنے میں آنند کمار کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔

ہم دونوں سیر سے لوٹے تو دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ میری بے کار کی کوشش میں ہماری سیر نہ جانے کتنی لمبی ہو گئی تھی۔

ہم دونوں سیدھے کھانے کے کمرے میں پہنچے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے جب بیرے نے اسے کھٹکھٹایا تو ہمیں قدرتی طور پر تعجب ہوا لیکن کمرے کے اندر جاتے ہی ہم نے جو کچھ دیکھا اس سے ہم دونوں کے تعجب کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اپنی زندگی میں اتنا خوشگوار تعجب شاید ہی مجھے کبھی ہوا ہو۔ میرے میزبان اور میں نے دیکھا کہ اندرا اور آنند کمار کھانے کی میز پر پاس پاس بیٹھے ہیں۔ ان کے چہروں پر دکھ یا یاس کا سایہ تک نہیں ہے۔ اور وہ اتنے منہمک ہو کر آپس میں باتیں کر رہے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ انھوں نے دروازے کی کھٹکھٹاہٹ نہیں سنی بلکہ ہمارے کمرے کے اندر چلے آنے تک کا انھیں احساس نہیں ہوا۔ بیرے نے بتایا کہ وہ دونوں صبح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ پہلے وہ چپ تھے، اس کے بعد بیرے نے ان دونوں کو صبح صبح روتے ہوئے سنا تھا، اور اب کوئی تین گھنٹے سے آپس میں باتیں کرنے میں مشغول ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر خوشی مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ میرے میزبان کے پُرجلال چہرے سے تعجب کے آثار لمحہ بھر میں غائب ہو گئے، اور اس پر خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دیوتاؤں کی طرح سے میرے میزبان کی زبان سے صرف یہی الفاظ نکلے "لیجئے' قلم لگ گئی"

میں سمجھ گیا، جیسے وہ کہنا چاہتے ہوں "دیکھا تم نے ایک ہی دکھ سے دکھی دو انسانی دلوں میں قدرت کس آسانی سے قلم لگا دیتی ہے۔ تاکہ کائنات سونی نہ ہونے پائے۔ تاکہ ان کی دنیا سے دکھ اور تکلیف دور ہو جائیں اور خوشی کا اضافہ ہو۔

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را
نہاد است در دامنِ کوہسارے (اقبال)

مرزا عارف بیگ

کشمیری زبان

علمائے لسانیات کی رائے میں کشمیری زبان ایک بہت قدیم زبان ہے - اور زبانوں کی طرح اس نے بھی غیر زبانوں کا اثر قبول کیا ہے - کشمیر چونکہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے مختلف ممالک کے لوگوں کو کھینچتا رہا ہے - کشمیری زبان بھی اپنی وسعت اور لچک میں ممتاز رہی ہے - اس زبان کی پہلی تحریری شہادت اس کتبے سے ملتی ہے - جس کا ذکر مشہور جرمن مصنف بُولر نے کیا ہے - اس نے ۱۸۷۵ء میں لاہور کے عجائب گھر میں ایک پتھر کا کتبہ دیکھا تھا - یہ رانی دِیدا کے زمانے کا لکھا ہوا تھا - رانی دِیدا کشمیر کی حکمران رہی ہے - اس کا عہدِ حکومت سنہ ۹۸۰ء سے سنہ ۱۰۰۳ء تک رہا ہے - اس کتبے کی عبارت کا ذکر بُولر صاحب نے نہیں کیا ہے - صرف اتنا لکھا ہے - کہ یہ کشمیری زبان میں لکھا گیا تھا - اور اس میں رانی کا فرمان درج تھا - اس واقعہ کے کوئی دو سو برس بعد کشمیر کے شہرۂ آفاق مؤرخ کلہن نے راج ترنگنی لکھی - اس تاریخ میں آج کل کے مروّجہ کشمیری زبان کے تین محاورے درج ہیں - اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے - کہ کلہن کے زمانہ (راج ترنگنی کی تاریخ تصنیف ۱۱۴۹ء ہے) میں بھی کشمیری زبان بولی جاتی تھی -

مذکورہ دو شہادتوں کے علاوہ متعدد یورپی مصنفوں اور چند ہندی محققوں کی رائے میں بھی کشمیری زبان بہت ہی پرانی زبان ہے -

کہا جاتا ہے - کہ اسرائیلیوں کا ایک گروہ اپنے وطن سے بھاگنے کے بعد دشوار گزار مسافت طے کر کے کشمیر میں آج سے دو ہزار برس پہلے وارد ہوا - یہ لوگ یہیں آبسے - چونکہ اس زمانے میں کشمیر کے مقامی باشندوں کے مقابلے میں یہ لوگ زیادہ متمدن تھے - اس لئے آسانی سے کشمیریوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے - ڈاکٹر مرزا احمد عزیز کاشمیری کی تحقیق کے مطابق حضرت عیسےٰ بھی صلیب سے بچ کر اپنی بچھڑی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں کشمیر آئے تھے اور زندگی کے باقی ایام یہیں گزارے - اسرائیلیوں کی رسم کے مطابق مُردے مشرق مغرب کی سمت میں دفن کئے جاتے ہیں - کشمیر کے متعدد قصبوں اور دیہاتوں میں بیسیوں قبریں آج بھی ایسی ملتی ہیں - جن کی سمت مسلمانوں کی قبروں کے برخلاف مشرق مغرب ہے - صدیوں ان لوگوں کے طرزِ زندگی ان کی زبان - ان کی بود و باش، ان کے عادات و خصائل نے کشمیریوں پر گہرا اثر ڈالا - اور بالآخر یہ لوگ مقامی لوگوں میں مدغم ہو گئے -

ان لوگوں کی زبان عبرانی تھی - آج کل کی کشمیری زبان میں عبرانی زبان کے درجنوں الفاظ موجود ہیں - چند الفاظ جو اپنی اصلی عبرانی صورت و معنی میں کشمیری زبان میں مل کر کشمیری ہی گئے ہیں - ذیل میں درج کئے جاتے ہیں -

عبرانی	ترجمہ	کشمیری	ترجمہ
اَز	اس وقت	اَز	آج
تقر	تولنا	تقرہ	ترازو
طہرہ	میرے تئیں پاک کرنا	طہرہ	چاولوں کی خیرات جس سے انسان پاک ہوتا ہے
ذرم	اقبال	ذرم	اقبال
ہُو	وہ	ہُو	وہ

عبرانی	ترجمہ	کشمیری	ترجمہ
نِیْ	اٹھاکے لے جا	نِ	لے جا
نقطیٗ	نفرت کر	نکہٕ ہت	نفرت
لول	محبّت	لول	محبّت

اِن الفاظ کے علاوہ کئی عبرانی ذاتیں جن کا بائیبل میں ذکر ہے ۔ آج کل خالص کشمیریوں کی ذاتیں تصوّر ہوتی ہیں ۔ ان میں سے چند ذاتیں یہ ہیں ۔ پال ۔ بٹ ۔ ڈانگر ۔ ڈار ۔ ذرؔ ۔ ڈوم ۔ گنگر ۔ گنائی ۔گانی ۔کاک کنزرو ۔ کار ۔ کوترو ۔ لاوتے ۔ ماگرے ۔ شورا ۔ نایک ۔ دارکوٗ

یہ ذاتیں کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں میں اب تک اپنی اصلی صورت میں رائج ہیں ۔

اِس گروہ کے محققوں کی رائے میں کشمیر کی وجہ تسمیہ کشپ رشی کا "کشپ مرّ" نہیں ہے ۔ بلکہ ان کا خیال ہے ۔کہ مذکورہ اسرائیلیوں نے ہی کشمیر کو کشمیر کہا ہے ۔ ایک جماعت کہتی ہے ۔کہ ان ہی لوگوں نے کشمیر کو سب سے پہلے "کشیر" کہا ۔ کہتے ہیں "کا" عبرانی میں "مانند" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے "شیرؔ" شہر شام کو کہتے ہیں۔ "کاشیر" یا "کشیر" یعنی "شام کے مانند شہر" ۔ دوسری جماعت کی رائے میں اسرائیلیوں نے مقامی کشمیریوں کو حلال خور نہیں پایا ۔ اور یہ جملہ استعمال کیا۔ "اُس چھ کاشیر" یعنی ہم حلال خور ہیں۔ "کاشر" حلال خور کو کہتے ہیں ۔ اسرائیلی چونکہ الہامی مذہب کے پیرو تھے ۔ ذبح کیا ہوا گوشت کھاتے تھے ۔ اصل کشمیری باشندے ان دنوں الہامی مذہب نہیں رکھتے تھے ۔ اس لئے وہ "کاشیر" یعنی حلال خور نہیں تھے ۔ "کشیر" (کشمیر) اسی لفظ "کاشر" سے نکلا ہوا ہے یعنی حلال خوروں کے رہنے کی جگہ ۔

سنسکرت زبان نے بھی ہزاروں برس کشمیری زبان کو گود میں لیا۔ سنسکرت ہندوستان کی بیشتر زبانوں کی ماں ہے ۔ لیکن کشمیری زبان کے متعلق اب یہ رائے زور پکڑ رہی ہے ۔کہ اس نے سنسکرت سے جنم نہیں لیا ہے ۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔کہ سنسکرت نے عبرانی زبان سے کہیں زیادہ گہرا اور پائیدار اثر کشمیری زبان پر ڈال دیا ہے ۔

سنسکرت ہی سے کشمیری زبان کے اکثر فعل اور اسم اخذ ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں مصنفوں نے آج تک کشمیری کو سنسکرت کی ایک شاخ تصوّر کیا ہے ۔ہم یہاں چند فعل اور اسم درج کرتے ہیں جو صاف ظاہر کرتے ہیں ۔کہ اُن کا مصدر سنسکرت ہے ۔

کشمیری	معنی	سنسکرت	کشمیری	معنی	سنسکرت
پگھ	جاڈ	پچھنہ	وازہ	پکانے والا	واج
رنْی	پکانا	رندی	مندچھ	شرمندگی	مندکھش
وکھنُ	اُٹھنا	اتتھان			

ہندوستان کے مختلف صوبوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر سنسکرت کی خدمت کی ہے ۔کشمیر نے بھی اس زبان کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے ۔ یہاں صدیوں اسی زبان میں تعلیم و تربیت کا چرچا رہا ۔ دُور دُور سے طالب علم یہاں کے علماء اور فضلاء سے فیضِ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے رہے ۔

کہا جاتا ہے ۔ چینی زبان نے بھی کشمیری زبان پر خاصا اثر ڈالا ہے چین کے ساتھ کشمیر کے تجارتی تعلقات رہے ہیں ۔ چونکہ چینی زبان کا براہِ راست کشمیر میں دخل نہیں رہا ہے ۔ اس لئے ہمارے خیال میں اس کا محدود اثر رہا ہوگا ۔

کشمیری زبان کو رُوسی زبان نے بھی چند الفاظ عطا کئے ہیں ۔ جن میں "سماوار" قابلِ ذکر ہے ۔ سماوار لفظ کو کشمیریوں نے اتنا اپنایا ہے کہ گمانِ غالب ہوتا ہے ۔کہ کہیں روس ہی نے تو کشمیر سے "سماوار" کو نہیں لیا ۔ بہرحال خیال کیا جاتا ہے ۔سماوار روس ہی کی ایجاد ہے ۔ اور لفظ بھی اُسی زبان کا ہے ۔

سنسکرت زبان کا زور للہ عارفہ کے زمانے تک جاری رہا۔ للہ کا کلام سنسکرت الفاظ سے بھرا پڑا ہے ۔

شیخ نور الدینؒ للہ کے ہمعصر تھے ۔ ان کے یہاں بھی شلوک اور واکیہ میں ہی کلام پایا جاتا ہے ۔ حضرت شیخ سے ہی للہ کی کشمیری زبان کا انقلاب رُونما ہوتا ہے ۔ سنسکرت الفاظ کی جگہ فارسی اور عربی زبان نے لینا شروع کیا ہے ۔ رفتہ رفتہ ہمارے زمانے تک حالت یہ ہوگئی ۔ کہ اگر آج للہ ہماری زبان سنیں گی ۔ تو اپنے آپ کو غیر کشمیریوں میں محسوس کریں گی ۔

کشمیری زبان نے فارسی عربی کے سامنے اپنا دامن پھیلا دیا ۔ ہزاروں سید ۔ ہزاروں سیاح ایران اور دوسرے فارسی بولنے والے علاقوں کے لوگ کشمیر

مین تبلیغ یا سیاحت کی غرض سے آئے ۔ مگر یہاں کی آب و ہوا نے ایسا مسحور کیا ۔ کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے ۔ یہ لوگ کشمیریوں سے علم وفضل تہذیب و تمدن مین فائق تھے ۔ مذہبی راہنمائی کا سہرا بھی انھیں کے سر تھا ۔ اس لئے ہر لحاظ سے ان کا اثر و رسوخ غالب تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ کشمیری زبان نے فارسی اور عربی کے متعدد الفاظ بلا پس و پیش قبول کئے ۔ اُدھر سے حکومت بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آئی ۔ جن کی مادری زبان فارسی تھی ۔ سرکاری اور کاروباری زبان بھی فارسی ہی ہو گئی ۔ شاعروں اور ادیبوں نے فارسی کو ہی اپنے خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ جانا ۔ نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ چند صدیوں میں اس بہتات سے فارسی عربی کے الفاظ کشمیری زبان میں داخل ہو گئے ۔ کہ شبہ ہوتا ہے ۔ کہ کہیں کشمیری زبان کا ماخذ فارسی ہی تو نہیں ہے ۔

زندگی کے ہر شعبہ میں فارسی الفاظ نے اثر کیا ۔ شعر و شاعری عدالتی کارروائی ۔ شادی بیاہ جہاں نظر جاتی ہے ۔ فارسی زبان کا غلبہ دکھائی دیتا ہے ۔ ذیل کے چند الفاظ جو زبان زد عوام ہیں ۔ اس بیان کی تائید کرتے ہیں ۔

دل ۔ دلبر ۔ دلدار ۔ دلنواز ۔ دلگیر ۔ زلف ۔ خال ۔ حُسن ۔ جمال دیدار ۔ دُنیا ۔ دین ۔ ستمگر ۔ ظالم ۔ کمان ۔ ابرو ۔ رخسار ۔ مرض ۔ غرض مریض ۔ عشق ۔ شوق ۔ ذوق ۔ معشوق ۔ استغاثہ ۔ مستغیث ۔ مدعی مدعا علیہ ۔ دعوے ۔ منصف ۔ نکاح ۔ طلاق ۔ قلم ۔ دوات ۔ استاد وغیرہ

پٹھانوں کے عہد کے بعد کشمیر پر پنجابی مسلط ہوئے ۔ پنجابیوں کے بعد ڈوگروں کا دور آیا ۔ یہ دونوں دور علمی و ادبی لحاظ سے کشمیر کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتے ۔ ان دونوں دوروں میں فارسی کا زور کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا ۔ لیکن دور حاضرہ تک اس کی تلافی نہیں ہو سکی ۔ پنجابی اور ڈوگری زبانوں میں علمی و ادبی کارنامے بہت کم ہیں ۔ یہ دونوں زبانیں فارسی اور عربی زبانوں کے بالمقابل علمی و ادبی سرمایہ سے عاری ہیں ۔ اس لئے یہ دونوں زبانیں کشمیری کو زیادہ متاثر نہیں کر پائیں روزمرہ کی بول چال کے چند الفاظ کے علاوہ کچھ اور زیادہ کشمیری زبان ان سے نہیں لے سکی ۔

اردو پنجابیوں کی ہی وساطت سے کشمیر پہنچی ۔ اس لئے اس پر نمایاں چھاپ پنجابی زبان کی رہی ۔ ویسے اردو نے بھی فارسی کی طرح گھر گھر حکومت کی ۔ کشمیری زبان پر نمایاں اثر ڈالا ۔ ان تینوں زبانوں کے الفاظ بھی کافی تعداد میں کشمیری زبان نے اپنائے ہیں ۔

کشمیری	
ہتھکڑ	ہتھکڑی
بیڈ	بیڈی
چال وچلن	چال ۔ چلن
ڈر	ڈر
ڈرد	ڈرد
موڈ	موڑ
پیٹھ	پیٹ
پیٹھ	پیٹی
کھول	کھولو
تول	تولو وغیرہ

اردو کے دوش بدوش انگریزی زبان شاہی زبان کی حیثیت میں اپنا سکہ جماتی رہی ۔ زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو گئی ۔ خواندہ اور ناخواندہ سب ہی تا بوپا لیا ۔ ہوٹلوں ۔ سینماؤں ۔ کلبوں ۔ سکولوں ۔ کالجوں عدالتوں میں اسی زبان کا دور دورہ رہا ۔

بیسیوں محاورے ۔ سینکڑوں الفاظ بڑی بے تکلفی سے کشمیری زبان نے اپنائے ۔ چند الفاظ اور محاورے جو عام بول چال میں مستعمل ہیں ۔ ملاحظہ فرمایئے ۔

انگریزی	کشمیری
اپیل	اپیل
وارنٹ	وارنٹ
جج	جج
ہائی کورٹ	ہائی کورٹ
کیس	کیس
ٹکٹ	ٹکٹ ۔
بائیسکل	بائسکل

انگریزی	کشمیری	ترجمہ
ماسٹر	ماشٹر	
سکول	سکول	
Not to care a bit	کیرٹبٹ نہ کرن	پروا نہ کرنا
Grain (Electric)	گرین آئیس نہ	ذرا بھی اندیشہ نہ ہوا

المختصر کشمیری زبان بہت قدیم زبان ہے - اور ہزاروں برس سے ایک دریا کے مانند بہتی چلی جا رہی ہے - چھوٹی بڑی ندیوں کے شفاف اور گدلے پانی کو اپنے اندر سموتی آگے بڑھتی جا رہی ہے - اس وقت اس کی ابتدائی ہیئت - اس کی اصلیت - اس کے ماخذ کا کھوج لگانا اتنا دشوار ہے - جتنا ایک دریا کے دہانے کے قریب کی رفتار یا پانی سے دریا کے منبع وغیرہ کا پتہ لگانا ہے - دریا کے ساحلوں کی وجہ سے دریا کی شکل و صورت قائم رہتی ہے - اسی طرح کشمیری زبان باوجود تغیرات اپنی صرف و نحو کے ساحلوں کے اندر رہ کر اپنی انفرادیت قائم رکھ سکی ہے -

---

غلام نبی خیال

غزل ——— کشمیری

اصل

۱ - بچھس ماتنگ کرن ژیتن حیاتکہ پاٹے لالو
ژھن ہندنیو دوتلن کرتھین ژلہ دائے لالو

۲ - پتوس ردنان نزئتھ چھو وتستگ حق تہ باطل
کوت تان تعیکہ نادہ سرزل سوپنچ مگہ مائے لالو

۳ - کری کیاہ بیم راتنگ مرہ چھہ دتھ ذن جوانی
بہارس ڈوڈھ تراو یا ژھری گگرائے لالو

۴ - گلاکس آسیہ ہے ماونس منز داغ یدُ دَ سے
گلابک پاٹھ رٹہ ہے کنڈین منز جائے لالو

۵ - یمو خونس پسینس کنوی کرکر جکھن تو گ
تمن نن بونہ شہلاہ چھہ تابن کرائے لالو

۶ - پچھس اوسس بوِیدوے دولابن پننی منز
مگر ویتھ چھ انزبن زمانکہ نیائے لالو

۷ - دلو منشر نفر یتھ ذنکہ کرو مرہم تمسی
دو یہ یس روز لدون چھونکن منز کرائے لالو

۸ - یچھو سوزتنگ ادبر چھیتی دلن شیہجار چھیراو
چھہ ظاہر چانہ زلفن پیغ اتھ ژھائے لالو

۹ - پدین زوگیش پکہ پکہ منزل چھس لیکن
خیالاہ یتن عاشق چھو بے پروائے لالو

[?] کل مرلی (کشمیر [?])

ترجمہ

۱ - اے مرے دوست! اب وہ وقت آ رہا ہے کہ کل کے پس ماندہ لوگ پھر سے زندگی کو سنوار دیں گے اور اُن کے بازوؤں میں مردانہ قوت کا خون لہریں مارے گا -

۲ - آخر کو زمانے کا سپید و سیاہ عیاں ہو کے رہتا ہے - ذرا تو ہی بتا کہ کب تک سونے کا ملمع پیتل کو تابناک بنائے رکھے گا -

۳ - مرے نادان دوست! تو پھر سے ماضی کے غیظ و غضب کو پیشِ نظر لاتا ہے جبکہ تو جوان ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ برجستہ گلستان تہی دست بجلیوں سے برباد ہو جائے

۴ - گُلِ لالہ کے سینے میں داغ نہیں ہوتا اگر وہ بھی گلاب کی طرح خاروں میں اپنا مسکن بنا لیتا -

۵ - جو لوگ خون پسینہ ایک کر کے اپنی روٹی حاصل کریں ان کے لئے کڑکتی دھوپ بھی چنار کے ٹھنڈے سایہ کا کام دیتی ہے -

۶ - مرے ساقی! اگرچہ کل تک میں اپنے ہی حادثات میں گم تھا مگر اب وہ وقت آ رہا ہے کہ مجھی کو زمانے کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا ہے -

۷ - آ مرے ہمدم! کہ اپنے رنج و غم کو بھول کر ان کی مرہم پٹی کریں جو ہمیشہ مصائب کے زخموں کو برداشت کرتے رہے -

۸ - بہار کے بادل دیکھ کر سوختہ دلوں میں ایک ٹھنڈک سی پیدا ہوتی ہے اے مرے محبوب! شاید ان بادلوں پر تمہاری ہی زلف کا سایہ پڑا ہے جبھی تو یہ اتنے ٹھنڈے ہیں -

۹ - پاؤں میں چلتے چلتے سوراخ پیدا ہو گئے اور منزل بھی ابھی دور ہے لیکن تمہارا عاشق خیال ہر ایک مصیبت سے بے پروا آگے بڑھتا جا رہا ہے -

جیا لال ناظر

کشمیریوں کی زندگی عادات اور رسم و رواج

کشمیر کئی تمدنوں اور معاشروں کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کئی تہذیبوں کے سفینے ڈوبے اور زندگی کے نئے دھارے پھوٹ بہے۔

تاریخی دور سے بہت پہلے یہاں ناگ اور پشاچ قوم کے لوگ آباد تھے۔ وہ جفاکش، درمیانہ قد اور خوبصورت تھے۔ پہاڑی ڈھلانوں اور ٹیلوں میں ان کی بستیاں تھیں۔ جنتر منتر کا استعمال یہ لوگ جانتے تھے۔ سرد آب و ہوا میں رہنا انھیں پسند تھا۔ وادیٔ کشمیر میں جب گرمی کا زور بڑھتا تھا یہ لوگ اپنا مال مویشی لے کر گریز کی وادی اور دوسرے پہاڑی دروں میں اپنا نشیمن بناتے تھے جب آریہ قوم کے قبیلے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے گلگت کے درے سے ہو کر وادیٔ کشمیر میں آباد ہوئے تو ناگوں اور آریوں میں کئی معرکے کے رن ہوئے۔ آخر ایک صلح نامے کی رو سے قرار پایا کہ آرین گرمیوں کا موسم وادی میں بسر کریں اور ناگ اور پشاچ اپنی گرمیاں پہاڑی دروں اور شمالی پہاڑوں کے دامن میں گزاریں۔ سردیوں میں آرین کشمیر کو چھوڑ کر بھمبر، گجرات اور جموں کے علاقوں میں اپنی اوقات بسر کریں اور وادیٔ کشمیر کو ناگ قوم کے لئے چھوڑ دیا کریں۔ مدتوں تک اس عہد نامے پر عمل ہوتا رہا۔ ان دنوں کشمیر میں گھنی برف گرتی تھی اور آرین نسل کے لوگ کشمیر میں صرف گرمی کا موسم گزارتے تھے۔ ایک دفعہ جب یہ لوگ جاڑوں کا موسم گزارنے کے لئے پنجاب جانے کی تیاری کر چکے تو ایک گھرانے کا مالک چندر دیو نامی سن رسیدہ اور معمر ہونے کے باعث نقل مکان کرنے سے معذور رہا۔ گھر والوں نے اس کے لئے تمام سامان خورد و نوش جمع کیا اور اسے کشمیر میں چھوڑ کر چل دئے ادھر سے ناگ جب پہاڑوں سے اتر کر کشمیر میں وارد ہوئے۔ تو انھوں نے چندر دیو نامی برہمن کو دیکھ لیا۔ وہ اسے اپنے راجہ نیل ناگ کے پاس لے گئے۔ نیل ناگ نے برہمن کی زبانی آرین نسل کے لوگوں کی قابل رحم حالت سُن لی۔ اس نے ایک کتاب برہمن کے حوالے کی اور کہا کہ تم لوگ اس کتاب میں دی ہوئی ہدایات پر عمل کرنے سے ناگوں کو اپنا دوست پاؤ گے۔ اس کتاب کا نام بعد میں نیلمت پُران مشہور ہوا۔ کشمیری رسم و رواج کی کہانی اسی پُران سے شروع ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ ناگ، پشاچ اور یکھش قومیں آرین نسل کے لوگوں کے ساتھ گھل مل گئیں۔ اور کشمیریوں کا ایک مشترکہ معاشرہ وجود میں آیا۔ کشمیری چشموں اور سوتوں کو مقدس مانتے ہیں۔ کشمیری زبان میں چشمے کے لئے لفظ ناگ استعمال ہوتا ہے۔ ویری ناگ۔ کوکر ناگ۔ کونسر ناگ۔ اننت ناگ مشہور چشمے ہیں اور کشمیری ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ کشمیری گھرانوں میں اب تک یہ رسم چلی آتی ہے کہ وہ بچہ جننے والی گائے کا دودھ دو ایک روز کے لئے چشموں اور دریاؤں کو بھینٹ کرتے ہیں۔ بکروال اور گوجر لوگ جب گرمی کے موسم میں کونسر ناگ کے کناروں پر اپنے ڈیرے ڈالنا شروع کرتے ہیں تو ایک بکرا ذبح کر کے چشمے میں بطور نذر بھینٹ کرتے ہیں۔ ناگ قوم کے لوگ جیسا کہ پہلے بتایا گیا۔ جنتر منتر کے قائل تھے۔ وہ جانوروں کی قربانی کو آفات سماوی اور ارضی سے نجات کا ذریعہ بھی مانتے تھے۔ یہ رسم کشمیریوں کی زندگی میں اب تک قائم ہے۔ گھر میں بچوں کو۔ جوانوں کو یا بوڑھوں کو اگر کوئی عارضہ لاحق ہوتا ہے تو مستورات چُپ چپاتے یا اعلانیہ قربانی کا اہتمام کرتی ہیں۔ دیہات میں بیماریوں سے چھٹکارا پانے کا واحد ذریعہ

جانوروں کی قربانی ہے۔

بچوں کو آسیب اور نظرِ بد سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے کنڈوری کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ بچہ جب دس گیارہ دن کا ہوتا ہے تو اسے ذبح شدہ بکرے کی گرم گرم کھال میں سے گزارا جاتا ہے۔ گوشت پکا کر مولویوں اور پنڈتوں کو کھلایا جاتا ہے۔ دودھ پیتا بچہ جب بھی بیمار پڑتا ہے تو ماں کنڈوری کی رسم ادا کرنے پر زور دیتی ہے۔ بعض جگہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لڑکے یا لڑکی کی شادی سے ایک روز پہلے ان کی جان کی حفاظت کے لئے کنڈوری کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

اشوک کے زمانے میں (۲۷۲ء ق م سے ۲۳۱ء ق م تک) بدھ دھرم کشمیر کا سرکاری مذہب بنا۔ بدھ مت کو کشمیر کی آب و ہوا راس آئی۔ یہاں پر ہی ہین یان اور مہایان فرقوں کے فلسفے نے آخری صورت اختیار کرلی۔ ناگ سین نے ملندہ پانسہ میں دئے ہوئے فلسفی روایات کو تشکیل دی اور اشوگھوش اور ناگ ارجن نے مہایان کے مادرک فلسفے کی باریکیاں لوگوں کے سامنے رکھیں۔

بدھ مت نے کشمیریوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ عدم تشدد پر کاربند رہنا کشمیریوں کی زندگی کا شعار بنا۔ اہنسا کا اصول عام کشمیریوں کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ مذہبی رواداری کی شاندار روایات کشمیریوں کی میراث میں داخل ہیں۔ کشمیری کچھ بھی ہو وہ قاتل اور قزاق نہیں بن سکتا ہے۔ آپسی بھائی چارہ کی جو درخشاں مثال کشمیریوں نے ۱۹۴۷ء میں قائم کی اس کی نظیر ڈھونڈے سے بھی دنیا کی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ قومی یگانگی اور یک جہتی سے کشمیریوں کا خمیر اٹھا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

کشمیر پر زمانہ ماقبل میں چینیوں کا بھی عمل دخل رہا ہے۔ چینیوں کے بعد یونانی بھی کشمیر میں آباد ہوئے ہیں۔ سری نگر میں ایک بڑا محلہ لچھ ترلی اس وقت بھی آباد ہے۔ اس کا اصلی نام میچھ سر تھا۔ کشمیری یونانیوں کو ملیچھ نام سے پکارتے تھے۔

ایک روایت ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک فرقہ کشمیر میں آباد ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے فرقے کے بعد وسط ایشیا کے ترک اور تاتاریوں نے کشمیر پر اپنا قبضہ جمایا۔ کشمیر مہاراجہ کنشک کا گرمائی صدر مقام رہا ہے۔ ساکا، سی تھی ین، پہلوی، پارتھی اور ہُن قوموں نے بھی کشمیر میں بود و باش اختیار کی ہے۔ ۱۳۳۹ء میں اسلام کشمیر پہنچا۔ میر سید علی ہمدانی نے اسلام کی تعلیمات کا پرچار کیا۔ میر شمس الدین عراقی نے شیعہ فرقہ کے عقاید کی تبلیغ کشمیر کے طول و عرض میں کی۔ ۱۵۵۶ء میں کشمیر اکبر اعظم کی عملداری میں شامل ہوا۔ مغلوں نے کشمیر کو خوب رونق بخشی اور مغلوں کے تمدن اور معاشرے کا اثر کشمیریوں کی زندگی پر صدیوں تک پڑتا رہا۔ ۱۷۵۳ء میں مغلوں کے بعد کشمیر پر افغانوں نے قبضہ جمایا۔ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر فتح کیا۔ ۱۸۴۶ء میں کشمیر ڈوگروں کے ہاتھ بک گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کشمیر انگریزوں اور دوسرے مغربی اقوام کی تفریح گاہ بن گیا۔

یہ ہیں کشمیر کی تاریخ کے دھندلے سے نقوش۔ کشمیر مختلف قوموں اور بادشاہوں کا تختۂ مشق بنا رہا ہے۔ وقت وقت پر نئی تحریکیں یہاں ابھریں اور زندگی کے نظریے بھی ان تحریکوں کی روشنی میں بدلتے گئے۔ نو وارد لوگ اپنے ساتھ اپنا تمدن اور معاشرہ بھی لے آئے اور اس کا ردِ عمل عام کشمیریوں کی زندگی پر برابر ہوتا رہا۔ مختلف الخیال عقائد کے لوگوں نے شعوری طور اپنے خیالات کی اشاعت کی کشمیری فطری طور پر وسیع القلب واقع ہوئے ہیں وہ حق کے جویا ہیں۔ آتش پرستوں کو جب ایران سے بھاگنا پڑا تو وہ سینکڑوں کی تعداد میں کشمیر چلے آئے۔ ملا محسن فانی جو غنی کشمیری کا استاد مانا جاتا ہے گبر اور آتش پرست خیالات کا حامی تھا۔ مارتنڈ کا مندر بھی بعض مؤرخوں کی نظر میں اگنی ہوتری ہندوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب یا عقیدہ لیجئے۔ اس کے ماننے والے کسی نہ کسی وقت کشمیر میں ضرور موجود تھے۔ جب کسی ملک کی حالت یہ ہو۔ تو وہاں کے لوگ بڑی حد تک ذہنی طور پر آزاد ہوتے ہیں۔

عادات ۔ طبعی ماحول نے بھی کشمیریوں کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا ہے کشمیر میں مناظرِ قدرت کی چار سو جلوہ آرائی ہے۔ کشمیر کا چپہ چپہ مہمان نواز ہے۔ کشمیری بھی فطرتاً مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ آپ غریب سے غریب کشمیری گھرانے میں اجنبی کی حیثیت میں داخل ہو جائیے نمکین چائے کی ایک آدھ پیالی سے ضرور آپ کی خاطر تواضع کی جائے گی۔ چائے ہر وقت کے لئے مخصوص ہے۔ کشمیریوں کی سماجی زندگی سماوار کے محور کے گرد

گھومتی ہے۔ اگر کھانے کا وقت ہو تو تناول ماحضر سے ہی آپ کی خاطر مدارت کی جائے گی۔ اُبلے چاول اور کرم کا ساگ تو کشمیریوں کی روزمرہ کی خوراک ہے۔ وہ آپ کو بھی اس دعوتِ شیراز میں شرکت کی دعوت دیں گے۔

کشمیری بالعموم خود دار واقع ہوئے ہیں۔ کشمیری بھوکوں مرے گا لیکن دستِ سوال کسی کے سامنے نہیں پھیلائے گا۔ ہر سال ہزاروں کشمیری مزدوری کی تلاش میں ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارتے ہیں۔ وہ گندے سے گندہ کام کریں گے۔ بوجھ اُٹھائیں گے۔ نالیاں اور بدر رَو صاف کریں گے۔ لیکن بھیک نہیں مانگیں گے۔ وہ پیدل چلنا پسند کریں گے۔ لیکن ریل یا ٹانگے کا کرایہ لوگوں سے مانگ کر حاصل نہیں کریں گے۔

کشمیری اپنی مفلوک الحالی اور تنگ دستی کا گلہ کسی سے بھی نہیں کرتا۔

کشمیری صابر اور قانع ہے۔ تسلیم و رضا کا وہ پابند ہے۔ وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہر مصیبت جھیلتا ہے۔ کشمیر میں صوفی اور مہاتما ہزاروں کی تعداد میں ہو گزرے ہیں۔ ان کی تعلیم اکثر و بیشتر یہی تھی کہ آدمی کو خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ ہر ایک کشمیری مقدر کا قایل ہے کشمیری صدیوں تک دوسروں کا غلام رہا ہے۔ اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ اپنی طرف سے اس نے ہر مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر مدتوں تک کارگر ثابت نہ ہوئی۔ مشکلوں نے اسے آہنی شکنجے میں کسا ضرور مگر اس کا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ توکل نے اس کی آس بندھائے رکھی۔

کشمیریوں کے جنسی رجحانات اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔

کشمیری جاہ طلب ہے۔ زر پرست نہیں۔ اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔

کشمیری اپنے آقا۔ لیڈر۔ حکومتِ وقت اور آئین کا وفادار ہے۔ ایاز و محمود کا قصہ تو ہر کشمیری کی داستان وفا ہے۔

کشمیری میں تخلیقی قوتیں موجود ہیں۔ مگر وہ نقالی سے زیادہ کام لیتا ہے کشمیری کی نقل اصل کو بھی شرمندہ کرتی ہے۔

کشمیری مذہب کا پابند ہے مگر وہ جنونی نہیں ہو سکتا۔ کشمیریوں نے مذہب کے نام پر لوٹ مار اور غارتگری کبھی نہیں کی ہے۔

کشمیری پرلے درجے کا زمانہ شناس ہے۔ فضا کی ٹو باس سے بھی وہ بھانپ جاتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔ دنیا کا کوئی بھی شخص اُسے اس میدان میں ہرا نہیں سکتا ہے۔

کشمیری ٹوہ لینے میں اُستاد ہے۔ دوسروں کے خیالات کا جائزہ لینا اس کا فطری مشغلہ ہے۔

کشمیری عموماً دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز کے اصول پر کام کرتا ہے۔

کشمیری بُت گڑھنے میں پوری مہارت رکھتا ہے۔ بُت پرستی کا وہ دلدادہ نہیں۔ سیرت کو صورت پر ترجیح دینے کا وہ عادی ہو چکا ہے۔

کشمیری پیر پرست تو ضرور ہے مگر اس میں بھی وہ حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ کشمیری اپنے اور پرائے میں تمیز برتتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ پرائے اس کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ پرایوں کی دلجوئی کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس کی آنکھیں بالعموم آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں زمین کی طرف وہ نہیں دیکھتا۔ اس فطری خاصیت نے کشمیریوں کو وقت وقت پر مجبور کیا ہے کہ وہ غیروں کو اپنوں پر ترجیح دیں۔ شیخ یعقوب صرفی نے مغلوں کو کشمیر آنے کی دعوت دی تاکہ چکوں کا خاتمہ ہو۔ میر مقیم کنٹھ نے افغانوں کو کشمیر بلایا تاکہ اس کے ہم وطن بھائیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو۔ بیربل در نے سکھوں کو کشمیر دلایا لیکن کشمیریوں کو نہیں۔ کشمیری اچھے کھانوں کا شوقین ہے مگر پیٹو نہیں۔ گوشت کم کھاتا ہے سبزیاں زیادہ۔ امیر گھرانوں میں بھی سبزیاں زیادہ پکتی ہیں۔ گوشت کم

کشمیری فطرۃً انقلاب پسند ہے۔ مگر انقلاب پیدا کرنے کے لئے وہ بھوک ہڑتال سے کام لینا جانتا ہے۔ تشدد سے نہیں۔ عدم تعاون اور بھوک ہڑتال سے کشمیریوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت وقت وقت پر کام لیا ہے۔

کشمیری خواتین "بچہ پرست" ہیں۔ کشمیری بحیثیت شوہر نیک واقع ہوئے ہیں۔ کشمیری بالعموم منشی اشیا سے پرہیز کرتے ہیں۔ شراب نہیں پیتے جُوا نہیں کھیلتے۔ بدکاریوں سے کوسوں دُور رہتے ہیں۔ دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر ان کا دل پسیجتا ہے۔ یہاں تک کہ مرد بھی رو پڑتے ہیں۔

کشمیریوں کو خون خرابے سے بے حد نفرت ہے وہ دل سے امن کے پرستار ہیں۔ کشمیریوں کو داستان سرائی کا کافی ذوق ہے۔ کئی کئی گھنٹے وہ اس میں صرف کرتے ہیں۔ دنیا میں داستانوں کا ابتدائی نمونہ جو پنچ تنتر کے نام سے مشہور ہے کشمیر میں ہی تیار ہوا ہے

کشمیری کا فلسفۂ حیات داخلیت پر مبنی ہے خارجیت پر نہیں

شاید اسی باعث وہ افواہ باز ہے ۔ افواہ شکن نہیں ۔ کشمیری زینہ کدل گزٹ کو سرکاری گیزیٹ کے مقابلے میں زیادہ مستند اور معتبر سمجھتا ہے

کشمیری میں وطن پرستی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ وہ وطن سے باہر جانا پسند نہیں کرتا ۔ گھر کی آدھی کو باہر کی ساری پر ترجیح دیتا ہے ۔ کشمیری خواہ صدیوں سے وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوا ہو ۔ پھر بھی اس کا دل وطن میں اٹکا رہتا ہے ۔ شام غربت میں بھی وہ صبح وطن کے خواب دیکھتا ہے اور زبان حال سے پکارتا ہے کہ کشمیر دیگر ہیچ ۔

کشمیری بامروت ہے ۔ کسی حال میں بھی اس کی آنکھوں کا پانی مرنے نہیں پاتا ۔ کشمیری شتر کینہ نہیں ۔ وہ وقت کے ساتھ بدلنا جانتا ہے مگر وہ ابن الوقت نہیں ۔

کشمیری ظاہرا طور پر فردیت کا قایل ہے سماج کا نہیں ۔ لیکن خطرے کے وقت اس کا سماجی جذبہ شدت کے ساتھ ابھر پڑتا ہے ۔ اور وہ اپنے تئیں سماجی کاوشوں اور مصروفیتوں میں لگا دیتا ہے ۔

یوں تو تمام قوموں کا فلسفۂ حیات دو لفظوں میں مضمر ہے یہ دو لفظ ہیں آج اور کل ۔ اگر کہیں غم روزگار ہے تو کہیں غم جاں ۔ کہیں مادیت پر زور ہے تو کہیں روحانیت اور الٰہیات پر ۔ کشمیری آج اور کل کو دو لفظ نہیں سمجھتا وہ تو دونوں کے حسین امتزاج میں یقین رکھتا ہے ۔ آج کل میں کوئی حرف علت نہیں اس لئے نہ کوئی معطوف ہے اور نہ معطوف علیہ دونوں ایک ناقابل فسخ اور ناقابل تقسیم وحدانیت کو ظاہر کرتے ہیں ۔

رسم و رواج ۔ کشمیریوں کے رسم و رواج بھی اسی حقیقت پر مبنی ہیں ۔ کشمیری خود اپنی ہستی کو بھی نشانِ راہ سے تعبیر کرتا ہے ۔

کشمیریوں کی سماجی ۔ اقتصادی اور مذہبی زندگی رسم و رواج کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے ۔ غمی شادی کی رسمیں گو ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو بنیادی باتوں میں دونوں کی رسمیں ایک جیسی ہیں ۔ اور تو اور مذہبی رسمیں ادا کرنے کا طریقہ بھی دونوں کے ہاں ایک جیسا ہے ۔ مسلمان مذہبی رسموں کے موقعوں پر قرآن خوانی کرتے ہیں اور ہندو وید خوانی سے کام لیتے ہیں ۔ لیکن قرأت کے اعتبار سے دونوں ایک جیسے معلوم پڑتے ہیں ۔ ہندو جو ویدوں کے منتروں کا اچارن کرتے ہیں ایسے معلوم پڑتا ہے کہ وہ خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھ رہے ہیں ۔ مسلمان اگر کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں تو دور سے سننے پر ایسے معلوم پڑتا ہے جیسے کوئی للی ایشوری المعروف للہ عارفہ یا نورالدین ولی کے شلوک قرأت کے ساتھ سنا رہا ہے ۔ شہروں میں اگر تھوڑا سا فرق پایا بھی جائے دیہات میں قرآن اور بید خوانی میں ذرا بھی فرق نہیں پایا جاتا ہے ۔

کشمیریوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں ۔ رشتہ داروں کے ہاں اخروٹ ۔ انڈے یا روٹیاں بھیجی جاتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ تولید سعید کا مژدہ آیا ہے ۔ تمام رشتہ دار مبارک باد دینے کے لئے دوڑے چلے آتے ہیں ۔ مہمانوں کی خاطر کیچھے ۔ باقرخانیاں اور بھنا ہوا یا پکا ہوا گوشت لڑکے والوں کے ہاں بھیجتے ہیں ۔ کئی قدامت پسند لوگ اب بھی سونٹھ ۔ ہلدی اور بڑے بڑے بتاشے جو میدہ کہلاتے ہیں لڑکے والوں کے ہاں بھیجتے ہیں ۔

زچہ کو پانچویں یا چھٹے روز ایسے گرم پانی سے نہلایا جاتا ہے ۔ جس میں کئی گھنٹوں تک جڑی بوٹیاں ابالی گئی ہوں ۔ لڑکی والے نوزائیدہ بچے کے لئے کپڑے ۔ کھلونے اور زیور بھیجتے ہیں ۔ بچے کا نام مولوی یا پنڈت کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد رکھا جاتا ہے ۔ نام تقویم یا جیوتش کی رو سے تجویز کیا جاتا ہے ۔ ہندو بچوں کا جنم پتر یا زائچہ تیار کراتے ہیں ۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی اب اپنے بچوں کے زائچے تیار کرواتے ہیں ۔ لیکن مسلمانوں میں یہ رواج ابھی عام نہیں ہوا ہے ۔

مسلمانوں کے ہاں دوسری بڑی رسم ختنے کی ہے ۔ تمام رشتہ دار جمع ہو کر نائی کو صدقہ دیتے ہیں ۔ نائی ایک چادر بچھاتا ہے یا کوئی خالی برتن رکھ لیتا ہے ۔ تمام رشتہ دار باری باری نقدی ہاتھ میں لے کر بچے کے سر پر سے ہاتھ گھما کر چادر پر یا برتن میں ڈالتے ہیں ۔ اس طرح نائی ایک روپے سے لے کر چار پانچ سو روپے تک نقدی بٹورتا ہے ۔ اب تو "ختنہ سرجنوں" کے ہاتھوں ختنہ کرایا جاتا ہے ۔ نائیوں کو اب کوئی نہیں پوچھتا ۔ دیہات میں ٹوکرے کے نیچے ایک مرغی رکھی جاتی ہے ۔ ختنے کی رسم ادا کر چکنے کے بعد نائی اس مرغی کو گھر لے جاتا ہے ۔ اور اسے پالتا ہے ۔ نائی کو بچے کے پرانے کپڑے بھی بطور صدقہ دئے جاتے ہیں ۔

ہندوؤں کے ہاں دوسری بڑی رسم یگیہ اوپویت یعنی گایتری یا جنیو پہنانے کی ہے ۔ یہ رسم ۸ سے ۲۴ گھنٹوں میں ادا کی جاتی ہے ۔ بچے کا برہمچاری کی طرح سارا سر منڈا جاتا ہے اور گیروے رنگ کا ایک لمبا چولا پہنایا جاتا ہے ۔ تمام

رشتہ دار اس کو بخشش دیتے ہیں۔ اور اس طرح پنڈت جی ۵۰ سے لے کر ایک ہزار تک روپے بٹور لیتے ہیں۔ سارا دن چائے۔ دودھ۔ شکرپاروں مٹھائیوں پوریوں اور پکوڑوں سے مہمانوں کی خاطر مدارات کی جاتی ہے۔ رشتہ داروں کو پہننے کے لئے نئی پوشاکیں ملتی ہیں۔ مسلمان بھائی بھی ختنے کے موقعے پر اپنے رشتہ داروں خویش و اقربا میں بھڑکیلی پوشاکیں بانٹتے ہیں۔

دونوں کے ہاں کئی روز تک رات کو راگ رنگ کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔

شادی کی رسم دونوں کے ہاں ایک جیسی ہے۔ پہلے تو یہ رسمیں بہت سادگی کے ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ لیکن اب یہ رسمیں اسراف کی حد سے نکل کر دیوالیہ بنانے کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں نکاح خوانی کے موقعے پر لڑکے والے لڑکی کے لئے کئی قیمتی جوڑے، پارچات کے اور سونے کے کئی قیمتی جڑاؤ زیور بھیجتے ہیں۔

ہندو جس دن شادی کی بات ٹھہراتے ہیں یعنی ایک دوسرے کو اپنا سمدھی بنانے کا وعدہ دیتے ہیں۔ اس دن کو واچ بندھن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس روز لڑکی والے لڑکے والوں کے ہاں مٹھائی۔ پھل سونے کی انگوٹھی۔ بائیسکل۔ فونٹن پین۔ ریڈیو اور نقدی جس کی تعداد ۱۰۱ سے ۲۷۰۰ روپے تک ہے لڑکے کے لئے قیمتی سوٹ کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ بلکہ اس روز لڑکے کو کوئی ٹریننگ دلانے کے لئے بھی رقم چکائی جاتی ہے۔

اس فضول خرچی کے خلاف ناراضگی کا جذبہ روز بروز زور پکڑ رہا ہے اور اصلاح کی کئی اسکیمیں اس وقت ہندوؤں کے زیر غور ہیں۔

شادی کی تاریخ سے دس پندرہ روز پہلے مکانوں کی لپائی کرائی جاتی ہے اور گھر میں ہر روز رات کو عورتیں مل بیٹھ کر گاتی ہیں۔ یہ رسم دونوں قوموں کے ہاں مشترکہ ہے۔

تمبکناری (کشمیری ڈھولکی) اور گھڑوں کے ساتھ زیر و بم کے ساتھ گانے گائے جاتے ہیں۔ اور کئی نقلیں بھی کھیلی جاتی ہیں۔ شادی سے ایک دو روز پہلے حنا بندی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ دولھا اور دلھن اپنے اپنے گھروں میں ہاتھوں اور پیروں کو مہندی سے رنگتے ہیں۔ تمام رشتہ داروں کو دونوں گھرانوں میں حسب مقدور ضیافت دی جاتی ہے۔

مسلمانوں کے ہاں برات رات کو آتی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں حسب مہورت چاہے دن ہو یا رات۔ دونوں کے ہاں براتیوں کی دعوت میں بڑا اہتمام برتا جاتا ہے۔ ہندو براتیوں کو دلیشنو بھوجن کھلاتے ہیں۔ سلونے ۱۵ سے ۲۰ تک مقرر ہیں۔ اب تعداد سات تک گھٹانے کی تجویز ہے۔ مسلمانوں کے ہاں براتیوں کی ضیافت میں گوشت استعمال ہوتا ہے۔ گوشت کی دس بارہ پلیٹیں ہر براتی کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔ سبزی کی بھی ایک دو پلیٹیں پیش کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں آرائش اور سجاوٹ کا اہتمام شاہانہ ہوتا ہے ہر ایک کام خاموشی کے ساتھ سرانجام پاتا ہے۔ بولنے کی بجائے اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر اتنا شور ہوتا ہے کہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ جس کسی کو دیکھو گلا بیٹھا ہوا ہے اور پریشان نظر آتا ہے۔ ایک طرف پھیرے ڈالے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف وہابیوں اور عورتیں سیکڑوں کی تعداد میں گا رہی ہیں۔ تیسری طرف ریڈیو لاؤڈ سپیکر کے ساتھ بول رہا ہے۔ شادی کی رسم ادا ہونے کے بعد دولھا۔ دولھن کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور دوسرے تیسرے روز دولھن گھر کو لوٹتی ہے۔ کئی مسلم گھرانوں میں دولھا میاں دولھن کے ہاں سات دن تک ٹھہرتا ہے اور ہر روز ضیافت کا انتظام ہوتا ہے۔

غمی کی رسمیں بھی کشمیریوں کی ایک جیسی ہیں۔ گھر میں موت واقع ہو جائے تو ڈھائی روز تک گھر میں کھانا نہیں پکتا۔ کھانے پکانے کا انتظام رشتہ داروں کے ذمے رہتا ہے۔ مرنے والوں کے نام پر غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور کپڑے بانٹے جاتے ہیں

دیہات میں زمیندار لوگ فصلوں سے متعلق بھی کئی رسمیں ادا کرتے ہیں نہاری یعنی زردہ تقسیم کرنے کا رواج دونوں قوموں کے ہاں ایک جیسا ہے۔ فصل کے لئے زمیندار ہل جوتے گا۔ بیج بوئے گا۔ نلائی کرے گا۔ گوڈائی کرے گا۔ فصل کاٹے گا تو گھر میں صبح سویرے زردہ پکا کر لوگوں میں تقسیم کرے گا۔

گرمیوں میں ہر رات کسی نہ کسی گاؤں میں "بچہ نغمہ" یا "بھانڈ جشن" ہوتا رہتا ہے۔ گوڈائی یا نلائی کرتے وقت مرد اور عورتیں دونوں ایک ساتھ لوک گیت گاتے ہیں۔ جس کی ترنم ریز گونج فضا میں دور تک سنائی دیتی ہے۔

عید کے موقعے پر دوشیزائیں اور نوجوان عورتیں ایک دوسرے کے کندھوں پر باہیں ڈال کر دو قطاروں میں کھڑے ہو کر لوک گیت

گاتی ہیں ۔ پاؤں کی چاپ سے زیر و بم کا کام لیتی ہیں ۔ وہ گیت گاتے گاتے آگے اور پیچھے کو جھکتی اور ہلتی رہتی ہیں اور مست ہو کر گاتی ہیں ۔ اسے کشمیری زبان میں رف یا روہر کہتے ہیں ۔

رمضان کے مہینے میں ۔ عید کے موقعوں پر ۔ شادی بیاہ کی تقریبوں پر فصلی تہواروں کی راتوں کو کشمیر راجہ اندر کے اکھاڑے کا نمونہ پیش کرتا ہے عورتیں ہر موضوع سے متعلق گیت گاتی ہیں ۔

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

عرشؔ ملسیانی

نگاروں کا دیس

آبشاروں بہاروں نظاروں کا دیس
وادیوں ندیوں کوہساروں کا دیس

سربسر نغمہ چشموں کی یہ سرزمیں
سربسر سبزہ یہ سبزہ زاروں کا دیس

درحقیقت ہے فردوسِ روئے زمیں
انتخابِ جہاں، یہ بہاروں کا دیس

لالہ کاری ہے فطرت کی، ہر باغ میں
یہ حسیں دیس ہے لالہ زاروں کا دیس

گیت گاتی ہوئی ندیوں کی زمیں
شور کرتے ہوئے آبشاروں کا دیس

جنگلوں کی سکوں بخش دل کش زمیں
مُہر بر لب حسیں کوہساروں کا دیس

یہ سیہ چشم رعنا غزالوں کا گھر
یہ حسیں مہ جبیں ماہ پاروں کا دیس

یہ پہاڑوں کا اُونچی چٹانوں کا گھر
یہ درختوں کی لمبی قطاروں کا دیس

چیڑ، کیکل اور اخروٹ کی سرزمیں
دیوداروں سفیدوں چناروں کا دیس

تُند موسم کے حملوں کی آماجگاہ قُدرتی گھاٹیوں کے حصاروں کا دیس

ساز بجتے ہیں گاتے ہیں جھرنے یہاں ہے یہی زمزموں کا ملاروں کا دیس

سُرخ پھُولوں سے پیراستہ سرزمیں سبز پتّوں سے پُر شاخساروں کا دیس

رُوئے دریا پہ اِک تیرتی زندگی کشتیوں ہاؤس بوٹوں شکاروں کا دیس

جن کو طوفاں کی تُندی کا کچھ ڈر نہیں ان نڈر مانجھیوں پُختہ کاروں کا دیس

زعفراں کے زر افروز کھیتوں کا گھر یہ زمرّد بھرے مرغزاروں کا دیس

جو وطن کی محبّت میں قُرباں ہُوئے ان جیالے جری جاں نثاروں کا دیس

جن کو دہقان کے غم نے غم گیں کیا ان حقیقت نگر غم گُساروں کا دیس

آج محنت کشوں کا سہارا ہے یہ جس کو کہتے تھے سب بے سہاروں کا دیس

اب تو جاتا ہے یہ تک ہوائی جہاز اب نہیں یہ خیالی غُباروں کا دیس

مسکنِ خُلق اور آشتی کی زمیں عظمتِ مُلک کے پاسداروں کا دیس

مل کے بھارت سے جس کو مُرادیں ملیں

مُحترم مُغتنم کامگاروں کا دیس

گلپوش سحر اور حسیں شام کا منظر اسپانِ سبک سیر و سبک گام کا منظر

خاموش مکانوں کے در و بام کا منظر ٹھہری ہوئی اک گردشِ ایام کا منظر

سرمایۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر

(عرش ملسیانی)

عمل - این، سی، بھٹاچاریہ

چوپانوں کا ایک کنبہ

دھان کے کھیت

کشمیری زندگی کا سرمایۂ حرارت کانگڑی

ر کا ایک عام منظر

مشہور صوفی شیخ نور الدین (ایک پرانی تصویر سے)

ڈوگرہ نقاشی کا ایک نادر نمونہ

ایک گوجر لڑکی

لدّاخ کا دارالخلافہ لیہہ

عمل- شری این سی بھٹّاچاریہ

گھنشیام سیٹھی

کشمیر کی جھیلیں

اقرند ـــ باموم بتی کی ہلکی سی لَو میں تمھیں لکھ رہا ہوں۔ رات ہُوئے بہت دیر ہوگئی ہے گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ قلم کیوں نہیں جاتی، کیوں نہیں ختم جاتی۔ کمرے میں ہلکی روشنی ہے اور بھاری پُرانا فرنیچر۔ جو گزرے ہوئے چنچل لمحوں کی یاد کی طرح اُداس پڑا ہے۔ باہر اندھیرا ہے اور ستارے ہیں۔ چیڑ کے درختوں پر لہراتی ہوئی ہوا سرسراتی ہے۔ ۹۰۰۰ فٹ کی بلندی پر کھڑے 'کنگ وٹی' کے ڈاک بنگلے میں بالکل خاموشی ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں، کہیں کوئی شور نہیں۔ میں یہاں ہوں مگر میرا دل وہاں ـــ دُور کونسر ناگ کی چاندنی میں تیرتی ہوئی جھیل میں ہے۔ اُس جھیل میں جہاں مچلتی ہوئی اُبھرتی لہریں اور منجمد ساکت اور بھیانک گلیشیر بھی کچھ ہیں۔

منزل اتنی کٹھن تھی، راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ جھیل کو دیکھنے کا سارا جذبہ ہی سرد پڑ گیا تھا۔ شوپیاں تک تو سری نگر سے گاڑی آتی ہی ہے اُس کے بعد کا سارا سفر گھوڑوں پر یا پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔ 'کنگ وٹی' کا یہ پلیٹو اس سفر کی آخری منزل ہے۔ لیکن جب جھیل آنکھوں کے سامنے اُمڈ آئی تو جو دیکھا وہ عظیم تھا ـــ قلم اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ ایک عجب سماں بندھا تھا۔ جہاں ہم تھے وہاں کی سلیٹی اور سیاہ چٹانوں پر کہیں کہیں سبز کائی اُگ آئی تھی۔ کونسر ناگ کے پانیوں میں شاذ ہی سبز رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ جھیل ہمیشہ بادلوں کے گھیرے میں رہتی ہے اس لئے ۱۴۰۰۰ فٹ کی اونچائی پر واقع اور ۱۶۰۰۰ فٹ بلند پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی اس جھیل کے پانی کے رنگ میں دودھیا نیلاہٹ گھلی رہتی ہے ـــ 'کنگ وٹی' سے جب جھیل کی طرف بڑھیں تو راستے کے فلک بوس پہاڑ کے ڈھلانوں پر کہیں کہیں پھول بھی ہیں ـــ اور بکثرت، مگر نظر کو جو چیز پکڑتی ہے وہ پھول نہیں، رنگ نہیں مگر ریکھائیں ہیں ـــ اونچائی، نچائی، گہرائی اور کٹائی ہے۔ جھیل کے کناروں پر گدیوں کی بھیڑوں کے ریوڑ کے ریوڑ دیکھے۔ یہ لوگ جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے وہیں شاہی ناگ کے علاقے میں رہتے ہیں اور گھاس کی تلاش میں اِدھر اُدھر پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کے باڑے، اُن پر چپٹے پتھروں کی چھت! یہ تھے اُن کے گھر، جن میں جھک کر گھسا اور گھس کر لیٹا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ دُنیا کے نت نئے جھمیلوں سے الگ مادیت کے چکر سے بری، دُنیا میں رہتے ہوئے بھی دُنیا میں نہیں رہتے۔ ان کے سروں پہ قدرت کا آنچل ہے۔ جنگلی جڑی بوٹیاں کھا کر، جھیل کا پانی اور بکریوں کا دودھ پی کر یہ لوگ زندہ رہتے ہیں۔ چاول اور روٹی تو شاذ ہی اُن کے ہاں پکتے ہیں۔

تمھیں تو ہندوؤں کے شاستروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ (کتنا بیباک بالادی ناول پڑھ پڑھ کر تمھیں وہ سب بھول چکا ہوگا، اس لئے اب یاد کرا رہا ہوں) اس جھیل کے بارے میں ایک کہانی ہے۔ اس جھیل کے بارے میں ـــ جس کے منبع اور نکاس کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا! جس کی گہرائی آج تک کوئی نہیں ناپ سکا۔ ایک بار جب بھسماسُر نے دنیا میں تباہی مچا رکھی تھی تب بھگوان وشنو کی نہتائی میں جمیل عورت کا روپ بھرنا پڑا تھا۔ بھگوان کی اس چھبی کو دیکھ کر راکشس کی حرص میں

---

[1] کشمیر میں گدیوں کو گوجر بھی کہتے ہیں۔

نشا ہی بچا گئیں، اور وہ ان کا پیچھا کرنے لگا۔ تھک کر بھگوان نے ذرا سانس لینے کو پاؤں جہاں رکھا جہاں آج یہ جھیل واقع ہے۔ راکشس کے آنے پر جب بھگوان نے اپنا پاؤں ہٹایا تو چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آنے لگا ——— اور کونسر ناگ پہنچ کر تو میں واقعی قائل ہو گیا ہوں کہ اگر سچ مچ کسی فرشتے کو اپنا پاؤں زمین پر رکھنا پڑا ہوگا ——— تو یہی وہ جگہ ہوگی۔ پھر وہ راکشس کیسے مرا، یہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ اور اگر بھول گئی ہو تو یہ پڑھنے سے پہلے وہ سب پھر یاد کر لو۔ کیونکہ کشمیر کی ہر ایک جھیل کے پیچھے ایک کہانی ہے جس کا آدھار ہمارے شاستر ہیں۔

ہمارے شاستروں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہزاروں صدیاں گذریں جب کشمیر کی ساری وادی ستی سر نامی ایک بڑی جھیل میں چھپی ہوئی تھی اور ماہرین ارضیات بھی اس کی تائید کر چکے ہیں۔ اُن کے بیان کے مطابق زلزلوں اور دوسرے آتش فشانی اثرات کی وجہ سے پہاڑوں، چشموں، دریاؤں اور جھیلوں نے آج کی شکل اختیار کر لی ہے ثبوت کے طور پر ان ماہرین نے دو ہزار فٹ کی بلندی تک آبی جانوروں کی ہڈیاں برآمد کی ہیں اور ہمارے شاستروں کے مطابق جانتی ہو ستی سر کو سکھا کر وادی کی شکل دینے والا آدمی کون تھا ——— مہرشی کیشپ ——— یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کشمیر کو کیشپ پور اور کیشپ مر بھی کہا جاتا تھا۔ یونانی اسے کسپیریا کے نام سے پکارتے رہے اور ۶۳۰ عیسوی میں جو چینی سیاح کشمیر کے راستے ہندوستان پہنچے انھوں نے کشمیر کو کیا۔شی۔می۔لو کے نام سے بیان کیا ہے۔

کشمیر میں جھیلوں اور چشموں کی فراوانی ہے لیکن ہم لوگوں کے لئے شاید نہیں ہیں۔ ہم تم برسوں کشمیر میں رہے لیکن جھیلوں، پہاڑی نالوں اور چیڑ اور بلوط کے جنگلات میں دل بہلاوے کا کوئی سامان ہو سکتا ہے یہ ہم کبھی نہیں جان سکے۔ زیادہ سے زیادہ ہماری پہنچ تھی بھی (اور ہے بھی) تو ڈل تک۔ مگر سچ کہتا ہوں ارجمند یہ جھیلیں آنکھوں کے سامنے کھلی ہوں تو ڈل کو دیکھنے کی بھی طبیعت نہیں کرے گی۔ اُس کا دامن تو حریص اور مادہ پرست انسان نے داغدار کر دیا ہے، لیکن یہ جھیلیں ابھی تک قدرت کی گود میں ہیں۔ شاید یہ ابتدا سے آخر تک ایسی ہی بنی رہیں گی۔ پھر یہی ایک کونسر ناگ تو نہیں ہے، گنگابل، شیش ناگ، تار سر، مار سر، الپتھر، وشنو سر اور گاڈ سر وغیرہ نہ جانے کتنی جھیلیں ان پہاڑوں کے دامن میں جھلملا رہی ہیں جن کو دیکھ کر قدرت کی کاریگری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

پہلگام تو تمہارا دیکھا ہوا ہے۔ وہاں سے ۱۲ میل دور تک بیک اتنی ہی بلندی پر دو ننھی ننھی جھیلیں تارسر اور مارسر واقع ہیں۔ شاید یہ کبھی ایک ہی جھیل رہی ہوں لیکن آج انھیں ایک چھوٹا سا پہاڑ دو حصوں میں تقسیم کئے ہوئے ہے۔ ایک طرف جھیل سے نکل کر بہتا ہوا پہاڑی نالہ، تیز سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا، آسمان میں شرد کے ٹکڑوں کی طرح اڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے، گھاس میں سے ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ کر میں دیر تک آدھے میل کی تارسر کو دیکھتا رہا۔ جانتی ہو یہ پہاڑی نالہ لدروٹ میں پہنچ کر لدر دریا ہو جاتا ہے اور پھر کل کل کا شور مچاتا، پتھروں سے ٹکراتا، کناروں کو کاٹتا پہلگام میں جا نکلتا ہے۔ مارسر کی شفاف اور بلوری جھیل سے بھی ایک ایسا ہی نالہ نکلتا ہے، جو ڈاچی گام کی طرف جا نکلتا ہے اور ہاروان پہنچ کر ایک خوبصورت جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہاروان ——— جو سرینگر کا واٹر ورکس ہے سرینگر میں نل کے نیچے بیٹھے یا پیاس بجھاتے یا کسی اتوار کو ہاروان کے باغ میں پک نک کرتے کبھی تمہیں خیال آیا ہے کہ ہاروان کی اس جھیل کی اتنی لمبی کہانی ہو سکتی ہے۔ پہلگام سے یہ جھیلیں دو دن کا راستہ ہیں۔ پچھلے کسی خط میں میں نے تمہیں کولائی گلیشیر کے متعلق بتایا تھا ——— پہاڑوں کا یہ وہی سلسلہ ہے جس میں کولائی، لدر، آڑو وغیرہ جگہیں واقع ہیں۔ مگر میں تمہیں یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں جبکہ میں جانتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ تم پہلگام تک ہی آ سکتی ہو۔ آگے آنے کو تمہارا من ہی نہیں ہوگا۔

لدر کی اس وادی کے دوسرے پہاڑی سلسلے میں شری امرناتھ کی مقدس یاترا کے راستے میں شیش ناگ کی مشہور و معروف جھیل پڑتی ہے۔ ۱۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع یہ دودھیا پانی کی جھیل شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ جھیل کے پانی کی یہ رنگت دیکھنے والے کو حیران و ششدر کر دیتی ہے ——— آخر یہ رنگت آئی کہاں سے۔ جھیل کا پانی تین طرف کھڑے فلک گوش برفیلے پہاڑوں سے آتا ہے۔ پہلگام سے یہاں پہنچنے میں گھوڑے پر ایک دن اور پیدل دو دن عام طور پر صرف ہوتے ہیں راستہ دشوار گزار ہے لیکن مناظر اتنے دل نشیں ہیں کہ مدتوں اُن کی یاد ہی دل کو تڑپاتی رہے گی۔

مجھے ٹھیک یاد ہے پہلگام میں ایک بار تم نے دو تین ہفتے گزارے تھے لیکن وہ سب کے سب کلب میں یا چاٹ کی دوکانوں پر یا آوارہ کے ناول پڑھتے پڑھتے گزرے ہوں گے۔ پہلگام سے اوپر چلو تو قدرت کی کتاب کے ورق تمہارے سامنے کھلتے جائیں گے۔ شیش ناگ کی جنوب مغربی ڈھلانوں کو پوش پہاڑ کہتے ہیں۔ پہاڑوں پر پھیلی ہوئی گھاس میں نے دیکھی ہے۔ سرمئی اور سلیٹی پتھروں کی دراڑوں میں سے جھانکتی ہوئی سبز کائی بھی میرے لئے نئی چیز نہیں تھی لیکن یہاں صرف گھاس ہی نہیں تھی بلکہ حدِ نظر تک ——— میلوں تک پھیلے ہوئے پھول ہی پھول ———

کا سیمہ، پوشتنشلہ، سلوشلاپ، ربن مونی، بٹرکپ، جنگلی گلاب اور کئی ایسے جن کے ہندستانی یا Botanical نام کوئی نہیں جانتا ۔ پیلے، لال، گلابی، نیلے، آسمانی قرمزی، عنابی ۔ چھپٹی رنگوں کی ہولی سی مچی ہوئی تھی ۔ اور ہوا کے جھونکوں سے اُن کی کومل ننھی ننھی ڈنٹھلیں ہل ہل جاتی تھیں جیسے ہوا سے ٹھٹک ٹھٹک کر اپنا کوئی بھید کہہ رہی ہوں ۔ جنگلی گلاب کی سدشیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ قسم قسم کا جنگلی گلاب، سُرخ، زرد، سفید، آبی، سیاہی مائل ۔۔۔ ہوا کا ہر جھونکا اپنے ساتھ ایک نئی خوشبو لاتا ۔ کبھی کلیوں سے، کبھی پھولوں سے ۔ پہاڑوں میں اس طرح کے پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے ۔۔۔ دیکھے ہیں لیکن اتنے اور ایسے نہیں ۔ پھولوں کی شوخی اور معصومیت ۔ اور جھیل کی گمبھیرتا نے دل پر نہ جانے کیسا اثر کیا ۔ یہیں آ کر سوامی ودیکا نند نے کہا تھا ۔ "It is all worship here"

جھیل کے ٹھنڈے یخ پانی میں یاتری آ کر نہاتے ہیں ۔ جانتی ہو کیوں ؟ کہتے ہیں کہ ناگراج کشنگ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ یہیں رہتے ہیں اس لئے اس جھیل میں نہانے سے گناہ دُھل جاتے ہیں ۔ تیسرے پہر جھیل کے اُس پار جانے کا ارادہ تھا ۔ جدھر برف کی دیوار بنا ہُوا "سنتری نما" پہاڑ کھڑا ہے ۔ لیکن دوپہر کی جھپکی کے بعد دیکھا، بادل کا ایک بڑا سا سفید ٹکڑا جھیل کے ایک کنارے کی طرف سے سانپ کی طرح پھن اُٹھائے چلا آ رہا ہے اور اُس کی بے ڈول گُنجلک ڈھیرے ڈھیرے ساری جھیل پر پھیلتی جا رہی ہے ۔۔۔ اور سچ مچ ہی کچھ دیر کے بعد دیکھا تو وہ ساری جھیل پر چھا گیا تھا ۔۔۔ اور پھر اُس کا پھن شاید دریجن کے درے کی طرف اُٹھا ۔۔۔ پھر یکایک بارش آ گئی ۔ بادل کا ٹکڑا جب گھاٹی سے اُمڈ کر آیا تو اُس کی شکل کافی واضح تھی ۔ مگر جھیل پر آ کر وہ بکھرنے لگا تھا، بادل کی بجائے ایک دھند کی طرح ۔۔۔ جھیل کو ڈُلاتا ہُوا ۔

آج تم بتاؤ راجندر ! یہ ڈلار کیا ہوتا ہے ؟ قدرت کا سوچا دُلار آج میں پا رہا ہوں ۔ لیکن پھر بھی میں آج بے چین ہوں ۔ سوچتا ہوں کاش ! تم بھی قدرت کی یہ جھلکی دیکھ سکتیں ۔ ہم کبھی کبھار ملتے ہیں ۔ ایک آدھ بار تنہائی کا مزا بھی لے چکے ہیں ۔ تب بھی میں ہمیشہ بے چینی محسوس کیا کرتا ہوں ۔ لیکن اُس دن کی بے چینی میں ایک نیا درد ایک نئی کسک تھی ۔

ایک یورپین سیاح کے سفرنامے سے مجھے معلوم ہُوا ہے کہ وہ طلوعِ سحر کے منظر کو دیکھنے کے لئے اکتوبر میں (جب اس جھیل پر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ تازہ برف بھیانک کھائیوں کو ڈھک دیتی ہے) اس جھیل پر پہنچا ۔ کیونکہ اُس نے اپنے کسی دوست سے اس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا ۔ اصل میں دیکھا جائے تو سیاحت کا اصلی لُطف یہی لوگ حاصل کرتے ہیں ۔ ہمیں تو باہری رنگ روپ اور چھبکے سے پیار ہے ۔ رات کو میں دیر سے سویا تھا لیکن صبح ساڑھے چھ بجے خورشیدِ سحر کے درشنوں کے لئے نکل گیا ۔ رات کا تارا ڈوب گیا ۔ پھر مشرق کی طرف روشنی بڑھ گئی ۔ وادیجن کی سب سے اُونچی چوٹی پر روشنی کی شعاعیں ٹکرانے لگیں ۔ میں نے جھیل کی طرف دیکھا ۔ ہلکی ہلکی پھوار میں جھیل بھیگ رہی تھی ۔ آسمان کی طرف دیکھا یکایک تارے دُھندلے پڑ گئے تھے ۔ برف کی دیوار کا رنگ بدل گیا تھا ۔ پہلے گلابی تھا اب تیز روپہلا ہو کر جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا ۔ آس پاس کی ہر ایک چیز چمک اُٹھی تھی ۔۔۔ پھر رنگ بدلتے رہے ، یہاں تک کہ سب کچھ پگھلے ہوئے تانبے کے رنگ میں رنگا گیا ۔۔۔ تب ایک گھومتی ہوئی سنہری گیند کی شکل میں خورشیدِ سحر کے دیدار ہوئے اور پھر جھیل کی نیلاہٹ میں امرناتھ، کیلاش، وادیجن اور بھیروں کی چوٹیوں کا چمکتا ہوا عکس لہرا اُٹھا ۔ میری آنکھیں چُندھیا گئیں ۔ میں یہ نظارہ تمہیں بھی دکھانا چاہتا ہوں ۔

ہرمکھ کا پہاڑ تو تمہارا دیکھا ہُوا ہوگا ۔۔۔ نزدیک سے نہیں تو بھی صدرسے کالج کی گراؤنڈ سے تو تم نے دیکھا ہی ہوگا ۔ یا شاید برابر دیکھتی ہو اور تمہیں پتہ ہی نہ ہو کہ یہ ہرمکھ کا پہاڑ ہے اور اپنے سلسلۂ کوہ میں ایک بڑی خوبصورت اور کافی بڑی جھیل گنگابل کو سموئے ہوئے ہے ۔ ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع اس جھیل کے رنگ بھی ایسے ایسے بدلتے رہتے ہیں جیسے جیسے سورج اپنی دن کی مسافت طے کرتا ہے ۔ جب سورج ہرمکھ کی چوٹی پر سے جھانکتا ہے تو یہ سبز ہو کر لہراتی ہے اور جب مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے برفیلی چوٹیوں پر چمکتا ہے تو جھیل کے پانی کی رنگت روپہلی ہو جاتی ہے ۔ اور جب دُھند میں لپٹا ہوا ہرمکھ اداس ہو جاتا ہے تو جھیل کا رنگ بھی ہرمکھ جیسی مٹیالی مشابہت پیدا کر لیتا ہے ۔ یہ جھیل تین اطراف سے برف پوش پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے ۔ یہاں اکتوبر میں گنگا اشٹمی کا میلہ لگتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں جب ہردوار کی گنگا تک پہنچنا کشمیریوں کے لئے ناممکن تھا اسی گنگا کو چھوٹی گنگا مان کر سب کام چلا لیا جاتا تھا ۔ البتہ کونسرناگ، تارسر، مارسر اور شیش ناگ میں اِکّا دُکّا سیاحوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے ۔ لیکن یہاں کوئی غریب الوطن نظر نہیں آیا ۔۔۔ گوجر تک نہیں ۔ شاید اس لئے کہ راستہ بڑا جان جوکھوں کا ہے اور درمیانی پڑاؤں پر بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے ۔ یہاں کی خاموشی بڑی ڈراؤنی ہے ۔ یوں تو شیش ناگ میں بھی خاموشی کا غلبہ تھا ۔

لیکن وہ خاموشی بڑی پیاری اور دل کش تھی

خیر! کہتے ہیں ہرمکھ پر بیٹھ کر شیو نے تپسیا کی تھی اور شیو ہمیشہ خاموشی ہی پسند کرتے ہیں۔ ترنگوں سے دیکھیں تو ہرمکھ کی چوٹی یوں نظر آتی ہے جیسے شیو سمادھی میں ہوں – اور پس منظر میں برفیلی چوٹیاں جگ مگ جگ مگ کرتی آدھے چاند کا منظر پیش کرتی ہیں۔

باقی جھیلوں کی طرح اس جھیل کی بھی ایک کہانی ہے (بلکہ دو) ایک اُس سادھو کی جو کبھی چوٹی پر نہیں پہنچ سکا اور دوسری ایک ساتھی کی جو گنگابل کو وادی میں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ اس کوشش دوران بھی پا چکا تھا لیکن آدھے راستے کے بعد ہی وہ دروان کی ایک فقرہ توڑ بیٹھا اور گنگابل کی یہ جھیل اُس کے آتے آتے وہیں رُک گئی، جہاں آج یہ واقع ہے۔ بڑے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ اصل گنگابل تو ہرمکھ کے دو تہ سینے میں تھی (اور وہاں تک پہنچنا اب ممکن نہیں ہے) گنگابل تک پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ یہ راستے گنڈ، بانڈی پورہ اور وانگل سے نکلتے ہیں — وانگل کا راستہ کم دشوار ہے اور کئی سیاح اسی راستے سے گنگابل کی راہ لیتے ہیں۔ دشنوسر، کشن سر اور نندکل تین خوبصورت جھیلیں راستے میں پڑتی ہیں اور لگ بھگ ۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ ان میں سب سے خوبصورت نندکل ہے۔ دور سے یہ دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے کیونکہ اس کے پانی کے دو رنگ ہیں۔ پہاڑ کی طرف کا حصہ گہری سبز رنگت لئے ہوئے ہے اور دوسرے کی طرف نیلا اور شفاف ہے۔

کشمیر کے پہاڑی سلسلوں میں ہر طرف جا بجا کئی حصے ہیں جہاں سے انسان کا گزر شاذ ہی ہوتا ہے — اس لئے نہ جانے اور کتنی ایسی جھیلیں گمنامی میں چھپی پڑی ہیں۔ ایسی ایک جھیل الپتھر بھی ہے جسے سب سے پہلے ایک گوجر نے دریافت کیا تھا۔ یہ جھیل گلمرگ سے لگ بھگ ۹ میل دور ۰۰۰ ۱۳ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور عموماً یہاں سیاحوں کی تواضع برف، بارش یا اولوں سے ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر لوگ کھلن مرگ (گلمرگ اور الپتھر کے درمیان ایک جگہ جہاں کاسمک رے کی لیبارٹری قائم ہے) سے ہی لوٹ آتے ہیں کیونکہ آگے کڑی چڑھائی پر قدم رکھنا پڑتا ہے اور گھوڑوں کو چھوڑ کر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ کیونکہ چڑھائی کی اُٹھان سیڑھیوں کی طرح ہے۔ الپتھر بھی کوئی بہت بڑی جھیل نہیں ہے۔ تقریباً ایک مربع میل کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے یہاں سے نانگا پربت کی چوٹی بالکل صاف نظر آتی ہے —— تو یہ ہیں پہاڑی جھیلیں، جو تمہاری دیکھی ہوئی نہیں ہیں اور جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ (نہ جانے اور کتنی ہوں گی جو میں نہیں دیکھ سکا) اسی لئے میں نے ان کے بارے میں اتنا کچھ کہا ہے۔

اب رہیں میدانی جھیلیں، تو ان میں کشمیر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور ان میں سے اکثر تمہاری دیکھی ہوئی ہوں گی۔ ڈل تو میں ہمارے اور تمہارے پڑوس میں ہی ہے۔ ہم تم اس کی سطح پر تیرتے رہے ہیں (میں بھول گیا ہوں کہ تمہیں تیرنا آتا بھی ہے یا نہیں) اسی جھیل پر کئی بار ہم نے کشتی چلانے کے مقابلے کئے ہیں۔ کئی بار اس میں ڈوبے ہیں اور ڈوب ڈوب کر اُبھرے ہیں۔ اتنی بلندی پر بیٹھ کر مجھے میدانوں کی بات کرنے میں کچھ جھجک اور تھوڑی اُلجھن سی ہو رہی ہے – لیکن اب بات چل نکلی ہے (اور شاید تمہیں بُرا بھی لگے) تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ ڈل کے متعلق بھی تمہاری معلومات قابلِ رحم ہی ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں یہی پتہ ہوگا کہ پانچ میل لمبی اور تین میل چوڑی یہ جھیل شفاف پانی کی بڑی خوبصورت جھیل ہے اور اس کے کناروں پر مغل بادشاہوں نے نشاط، شالامار، چشمہ شاہی اور نسیم وغیرہ باغات لگائے اور وہاں باغات میں خوبصورت بارہ دریاں تعمیر کرائیں۔ اس میں سینکڑوں ہاؤس بوٹ ہیں جن میں سیلانی آکر رہتے ہیں اور زندگی کا ایک نیا تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ ایک نیا جدید ڈھنگ کا ہوٹل (ریستوران) کھلا ہے، ایک نیا پارک بنا ہے – لیکن تم نے یہ کبھی غور نہیں کیا ہوگا کہ ڈل میں کھڑے چار چناروں میں گھرے جو دو جزیرے ہیں اور اُن میں جو دو بارہ دریاں ہیں اُن کا خالق کون ہے؟ تم نے کبھی چاندنی راتوں میں آکر کنول اور للی کی بہار نہیں دیکھی ہوگی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہشت کی تمام بہاریں اور خوشبوئیں زمین پر بلکہ پانی میں اُتر آئی ہیں۔ تیرتے ہوئے کھیت تم نے جا بجا ڈل کی سطح پر دیکھے ہوں گے۔ لیکن یہ نہیں سوچا ہوگا کہ کیا واقعی یہ تیر رہے ہیں۔ جھیل پر تیرتے ہوئے ان کھیتوں کی جن کی پیداوار سارے سرینگر کی سبزیوں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے، بھی ایک کہانی ہے۔ پانی کے نیچے ہمیشہ سرسبز رہنے والے پودوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر سطح پر اکٹھا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اُس پر پہلے چکنی مٹی کا لیپ اور پھر اُس لیپ پر مٹی اور کھاد کی تہیں جمائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتا دوں، اس میں کم محنت نہیں ہوتی بلکہ ماتھے کا پسینہ بہہ کر پاؤں تک آ جاتا ہے۔ ان تیرتے ہوئے کھیتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی آسانی سے لے جایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ کشمیر کی ہر ایک جھیل سے ایک کہانی یا ایک سے زائد کہانیاں ضرور وابستہ ہیں۔ ڈل کے بارے میں سب سے مشہور کہانی اُس شہزادے کی ہے جو نادر اور بیش قیمت موتیوں کی تلاش میں کشمیر آیا تھا لیکن ایک صبح کنول کے پتوں پر گرے ہوئے شبنم کے قطروں کو دیکھ کر اپنے ملک کو لوٹنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور پھر آخری دم تک کشمیر میں ہی رہا۔

جھیل کے بیچوں بیچ واقع جن دو جزیروں کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان میں ایک بدنصیب شاہزادے دارا شکوہ کی آرام گاہ تھی۔ وہ اپنے کشمیر کے دورانِ قیام میں اپنے خیمے یہیں گاڑتا تھا۔ اُس وقت ڈل کے کنارے کے باغوں اور ان جزیروں کا جاہ و جلال ہی اور تھا۔

سرینگر کے اکثر میلے اس جھیل کے کناروں پر لگتے ہیں۔ لوگ ان میلوں میں ندرُو کے پکوڑے، سنگھاڑے اور تیل کے پراٹھے کھاتے ہیں۔ ایک بار میں نے تمہیں ایک سِکھ خاتون کو ندرو کے پکوڑے کھاتے ہوئے دکھلایا تھا — اُس کے کھانے کا ڈھنگ ایسا تھا کہ تمہاری ہنسی ہی بند ہونے میں نہیں آ رہی تھی — ایسے موقعوں پر یوں لگتا ہے جیسے پکاڈلی میں کھڑا کوئی ہندوستانی مرمرے چبا رہا ہو۔ غروبِ آفتاب کے وقت ہر اتوار کو جب ہنسا اور کشتیاں اور ڈونگے ڈولتے ہوئے شہر کی جانب بڑھتے ہیں تو انتہائی دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ ڈوبتا ہوا سورج — ڈل اور جھیل کا سنگم — شکاروں کے پردوں کی سرسراہٹ — اور مختلف شکاروں میں سے آ رہی مختلف زبانوں کی موسیقی — مجھے ٹھیک سے یاد ہے ایسی ہی ایک اداس شام کو میں نے تم سے "بھیگ رہی برسات کہ ہم تم بھیگے" والا گیت سُنا تھا۔ آج میں پھر وہی گیت سننا چاہتا ہوں۔ اور ڈل کے کسی اداس گوشے میں — جانتی ہو آج ڈل میں کئی اداس گوشے ایسے بھی ہیں جو کبھی بڑی ریل پیل سے رہتے ہیں۔ آج بھی ہر برس مارچ کے مہینے میں حضرت بل اور شالامار کے درمیان واقع 'تل بل' کے اداس اور تنہا گوشے میں کنول کے پھولوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے ایک میلہ لگتا ہے۔ لیکن اب وہ پہلی سی چہل پہل وہاں نہیں ہوتی اور اس گوشے کی تنہائیاں اور بھی زیادہ واضح ہو گئی ہیں۔ اس گوشے میں کنول کے پھولوں کی اتنی بہتات ہے کہ سطح پر کنول کے سبز پتوں کا ایک خوش نما قالین سا بچھ گیا ہے اور اس پر بطخیں اور دوسرے آبی جانور اور پرندے بھاگتے پھرتے ہیں۔

ولر کا نام تو تم نے سُنا ہی ہوگا یا جغرافیے کی کتاب میں پڑھا ہوگا کہ ۱۲ میل لمبائی میں پھیلی ہوئی یہ "سمندر نما" جھیل ایشیا میں بہت بڑی جھیل ہے۔ انسان[۱] اس جھیل کے دیو جیسے پھیلے ہوئے پانی پر نظریں جمائے اس کے کنارے گھنٹوں عالمِ محویت میں گزار سکتا ہے۔ اس بھیانک جھیل کے چاروں طرف لمبی گھاس اور بید کے جنگل ہیں۔ گھاس کے جنگلوں میں شکاری آبی پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کے شوقین بھی اس جھیل میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ مچھیرے اس جھیل میں دُور دُور تک مچھلی پکڑنے کے لئے بڑے بڑے جال اور ہلکی ہلکی کشتیاں لے کر جاتے ہیں لیکن کئی بار اچانک طوفان آ جاتا ہے اور یہ لوگ پھر کبھی نہیں لوٹ سکے۔ اس سلسلے میں جھیل کا سب سے خطرناک علاقہ 'موت کھون' ہے۔ یہاں پانی کی گہرائی بے اندازہ ہے۔ اور اکثر بعد دوپہر یہاں طوفان آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہوا ہرمکھ کی طرف سے بابا شکر دین کی زیارت گاہ کی طرف چلتی ہے۔ سیاحوں کے لئے دو بجے کے بعد اس جھیل میں اُترنا منع ہے۔ کیونکہ جھیل میں ہوا چلنے پر سمندر کی طرح بھیانک لہریں اُٹھتی ہیں۔ بید کے جنگلوں سے سری نگر میں ۴۳ لاکھ مکعب فٹ لکڑی جلانے کے لئے سپلائی کی جاتی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں ریاست نے جھیل کے کنارے کی ۸۰۰۰ ایکڑ زمین کو بید کی کاشت کے موافق بنانے کی اسکیم تیار کی تھی۔

اس جھیل میں بادبانی کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ جب ہوا چلتی ہے تو اُسی سمت میں چلنے والی ان کشتیوں کی رفتار ۵۰ میل فی گھنٹہ تک ہو جاتی ہے لیکن ان میں بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کبھی یہاں (جہاں یہ جھیل آج واقع ہے) راجہ اشوگھوش نے ایک شاندار شہر آباد کیا تھا۔ لیکن رشی دردا سا کی بددعا سے یہ غرقاب ہو گیا۔ سلطان زین العابدین نے ۱۵ویں صدی عیسوی میں جھیل کے درمیان ایک جزیرہ 'زین لنک' تعمیر کرایا تھا۔ یہ جزیرہ اور اس کی ٹوٹی پھوٹی بارہ دری اس جھیل میں آج بھی یادِ رفتگاں کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔

کشمیر کے تمام سیلابوں کو یہ جھیل بڑی آسانی سے سمیٹ لیتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں جب سیلابوں نے وادی میں تباہی مچادی تھی اور سرینگر کے بھی کئی حصے سیلاب کی زد میں آگئے تھے اور کروڑوں روپیوں کا نقصان ہو گیا تھا، تب ولر نے بپھرے ہوئے جہلم کو اپنے بڑے پیٹ میں سمو لیا تھا۔ وادی میں ایک ہنگامہ برپا تھا لیکن ولر کے کنارے رہنے والوں کو سیلاب کا علم تک نہیں تھا۔ پانی کی سطح ذرا اونچی ہوئی اور بس! اب سیلابوں کی روک تھام کے لئے جو نئی اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں اُن کا بھی سب سے بڑا سہارا ولر کا یہی Reservoir ہی ہے۔

میدانی جھیلوں میں ایک اور جھیل بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ ہے مانس بل۔ یہ ڈل جہلم اور ولر کے درمیانی علاقے میں ہے۔ دو میل لمبی اس گدلے پانی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس کی گہرائی بے اندازہ ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ ایک آدمی تمام عمر رسی بٹتا رہا اور جب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تو اُس تمام رسی کو دو تین کشتیوں میں بھر کر مانس بل کے درمیان لے گیا۔ پھر رسی کے ایک سرے کو اُس نے جھاڑی

---

[۱] یہ رقبہ لگ بھگ ۱۵ مربع میل کے قریب ہے۔

پتھر سے باندھ کر پانی میں چھوڑ دیا — ساری رسی ختم ہو گئی لیکن پانی کی تھاہ نہیں ملی — نہ جانے اس کہانی میں کتنی سچائی ہے - لیکن ہاں میں نے بھی دیکھا ہے کہ یہاں نہاتے ہوئے لوگ جھجکتے ہیں اور ان علاقوں میں بھی جہاں اس جھیل کا پانی قدرے صاف ہے جھانکنے پر نیلو فر آبی پودے نہیں نظر آتے۔

میں سوچتا ہوں - میں نے کافی جھیلیں دیکھی ہیں - مگر شاید کچھ اور بھی ہوں، جو رہ گئی ہوں - لیکن تم نے کشمیر میں رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھا - اب ان کو دیکھنے تک ان کی یاد کو دل میں سموئے رکھو۔

تمہارا

حسن نعیم

وادیٔ کشمیر کے نام

وادیٔ حُسن میں کب جانے گذر ہو میرا؟
کتنے نادار قدم پہنچے نہ منزل کے قریب
کتنے پتوار نے دم توڑا ہے ساحل کے قریب
سرخرو دیکھئے کب عزمِ سفر ہو میرا؟

سُن رہا ہوں کہ خزاں کش ہیں بہاریں اس کی
ہر روش پر ہیں نئے طور سے گُل محوِ خرام
زعفراں زار ہے تخیّل کے سجدے کا مقام
ڈل کی موجوں کو بہت دیر میں آیا ہے قرار

سالہا روئے ہیں فرقت میں تری گنگ و جمن
دھان کے کھیت تری یاد میں لہرائے ہیں
کارخانوں پہ جدائی کے گھنے سائے ہیں
باوفا ہو کے جئے پھر بھی نگہبانِ وطن

تجھ کو ہم جنّتِ شدّاد نہ ہونے دیں گے
نکہتوں کو تری برباد نہ ہونے دیں گے

کشمیری لال ذاکر

وادی کا گیت

جب بھی تمھارا خط آیا ہے میرے کانوں میں وہ کشمیری گیت گونج اُٹھا ہے جس کا مطلب کچھ اس طرح سے ہے۔

ڈل کی لہریں اور کنول کے پھول گواہ ہیں کہ میں نے رات بھر تمھارا انتظار کیا ہے۔ کشتی میں اکیلی بیٹھی میں نے چاند سے کئی بار کہا کہ وہ کاٹھ کی کھڑکی سے تمھیں اشارہ کرکے بُلا دے۔

میرا باپ دور جنگل میں لکڑیاں لادکر شہر گیا ہے۔ صبح لوٹے گا۔ تم آ جاؤ۔ لیکن تم نہیں آئے۔

اب سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے سے پربھات کا اُجالا جھانکنے لگا ہے۔

میں جا رہی ہوں۔
ڈل کی لہریں اور کنول کے پھول میرے گواہ ہیں۔
اُن سے پُوچھ لینا۔

میں وطن سے بہت دُور ہوں لیکن اپنی حسین وادی میں کھلے بے شمار رنگا رنگ پھولوں کی مہک میرے ذہن میں محفوظ ہے اور جب کبھی ماضی کا کوئی لمحہ یاد آتا ہے تو وہ اس مدماتی دوشیزہ کی طرح آنکھیں ملنے لگتی ہے جو ایک حسین خواب دیکھتے دیکھتے اچانک ہی جاگ جائے۔ ان ست جھرنوں کا سنگیت میرے تصوّر میں زندہ ہے جن کی خشک پھواروں میں میں نے زندگی کے ابتدائی سال گزارے ہیں۔ ان پگڈنڈیوں کے گھماؤ جن پر سے میں گزرا ہوں میرے جیون کے گلے میں باہیں ڈال کیوں جھومتے ہیں جیسے کسی کے عنبریں گیسو شانوں پر پھیل جائیں اور آنکھیں کسی ڈھلتی ہوئی شام کے تصوّر میں کھو جائیں۔

اس گیت سے میری زندگی کے کتنے ہی حسین لمحے وابستہ ہیں۔ میرا سارا ماضی اس سے بندھا ہے۔ جب کبھی تمھارا خط آتا ہے۔ میرے ذہن میں اس گیت کے بول گونج اٹھتے ہیں۔

مجھے وہ لمحے یاد ہیں جب تم نے پہلی بار اس گیت کے بول گنگنائے تھے وہ پورنیما کی ایک خوبصورت رات تھی۔ ہم سب شنکر اچاریہ کی پہاڑی پر کھڑے تھے۔ اس طرف شاہی محلات میں جلتی ہوئی روشنیاں کھڑکیوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ادھر نیچے پہاڑ کی تلہٹی میں بسا گاؤں اپنے پاس کے وسیع قبرستان کو چھوتا ہوا ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح آرام کر رہا تھا۔ ڈل کا نیلا نیلا پانی تھا اور اس کی سطح پر تیرتے ہوئے شکارے تھے۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے گھرا ہوا یہ سارا ماحول بڑا طلسم انگیز لگ رہا تھا۔ کچھ دیر اس ماحول کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس بڑے سے سفید چبوترے پر بیٹھ گئے جس کے متعلق مختلف کہانیاں کہی جاتی ہیں۔ شام نے تھرموس کھولی اور سبز چائے کی ہلکی ہلکی خوشبو باہر نکلی۔ سبز چائے جسے تم خود بنا کر لائی تھیں۔ اس کی گلابی رنگت کتنی پیاری ہوتی ہے اسے میں اب بھی نہیں بھولا۔ اب میں سبز چائے نہیں پیتا مختلف قسم کے بلینڈ پیتا ہوں۔ پر اب تک کسی بھی بلینڈ کو مستقل طور پر نہیں اپنا سکا۔ سبز چائے کا لطیف سرور ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔

شام تمھارا کزن تھا اور دہلی سے تم لوگوں کو ملنے آیا تھا۔

ہم پانچ آدمی تھے۔ تم۔ تمھاری ایک دوست کنیز جس کا تھا رات

دن کا ساتھ تھا۔ وہ کسی مجسٹریٹ کی لڑکی تھی اور تمھارے ہی ساتھ میوزک لیسنز لے رہی تھی۔ شام تھا۔ تمھارا چھوٹا بھائی پیران تھا اور میں تھا۔ شام نے ٹوکری میں سے پیالیاں نکالیں اور ایک پیالی لا کر مجھے دی۔ میں نے وہ پیران کو پکڑا دی۔ اس نے کنیز کے آگے سرکا دی اور کنیز نے اس خوب صورت پھول دار پیالی کو تمھارے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"جلا دیا کم بخت" تم نے ناراضی سے کہا اور کنیز ہنس دی اور پھر شام اور پیران اور میں ہنسے۔

چاندنی میں اونگھتی ہوئی اس خاموشی میں ہمارے قہقہے تحلیل ہو گئے

"جلی تم ہو ہی کب' ابھی تو جلاتی ہو۔ کنیز بولی۔

"بہت زبان کھل گئی ہے تمھاری"۔ تم نے جھڑک دیا

شام پیالیاں بھر بھر کر ہمیں دیتا جا رہا تھا۔ اس کی پوری توجہ ہماری طرف نہ تھی۔

"زبان ہی کھولی ہے' راز تو نہیں کھولا۔ کنیز نے قہقہہ لگایا۔ شام چونک پڑا اور میرے ہاتھ کی پیالی چھلک گئی اور تم جھینپ گئیں۔ پیران بالکل کشمیریوں کی طرح سڑ سڑ کر کے چائے پی رہا تھا۔

"دیدی بہت اچھا گاتی ہیں شام جی"۔ پیران نے جیسے اب تک کچھ نہ سنا تھا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اور جانے اپنی سوچ کے کس موڑ پہ پہنچ کر اُس نے یہ بات کہی تھی۔

"واقعی بہت اچھا گاتی ہے"۔ کنیز بھی اب موضوع کو بدلنا چاہتی تھی۔ موضوع آپ سے آپ بدل گیا۔

"تو ایک گانا ہو جائے نہ"۔ شام نے فرمائش کی

"آج کل یہ کشمیری گانے سیکھ رہی ہے"۔ کنیز نے کہا

"کوئی کشمیری گانا سناؤ۔ دوسرے گانے تو سنتے ہی رہتے ہیں" میں نے کہا۔

شام نے تائید نہ کی۔ اُسے شاید عام گانے ہی پسند تھے۔

اور پھر تمھاری آواز فضا میں ہرائی جیسے کوئی شعلہ اندھیرے میں لپکا ہو اور اس کی حرارت سے تاریکی میں زندگی کی لہریں دوڑ گئی ہوں خوبصورت مترنم آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑوں کی چوٹیاں گا رہی تھیں۔ پہاڑیوں کی یہ چوٹیاں جن کے سینوں پر اس وادی کی تاریخ کندہ تھی۔ جنھوں نے اشوک کے دربار کی عظمت اور تقدیس اور سادگی دیکھی تھی اور بدھ کے انسان دوستی کے نغمے گائے تھے جنھوں نے تاتاریوں کی تنی ہوئی شمشیروں سے گہرے زخم کھائے تھے اور خون کے چھینٹوں سے اپنے سرخیلے دامنوں کو رنگا تھا جنھوں نے مغل شہنشاہوں کو ایک ایک ہر۔ ایک ایک پھول۔ ایک ایک پتھر کو سینے سنوارتے اور تراشتے دیکھا تھا اور جنت کی تعمیر کے خوابوں کی سندرتا محسوس کی تھی۔ جنھوں نے احمد شاہ ابدالی کی آمد پر خوف سے بھاگتے ہوئے لوگوں کے چہروں پر اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھی تھیں اور انھیں اپنے سینے سے لگا کر تحفظ کا وچن دیا تھا۔

تمھاری آواز گونج رہی تھی۔

مانجھی کی غریب لڑکی رات بھر اپنے محبوب کا انتظار کرتی جا رہی تھی۔ ڈل کی لہریں اور کنول کے پھول اس کے گواہ تھے۔

پہاڑوں کی چوٹیاں گا رہی تھیں۔

وادی کا حُسن گا رہا تھا۔ اس کی عظمت گا رہی تھی۔ اس کی رفعتیں جُھوم رہی تھیں۔

گیت ختم ہو گیا

چاندنی کا سیلاب جیسے تھم گیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں گنگ ہو گئی تھیں اور پھر ہم شنکر آچاریہ کی پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ بل کھاتے ہوئے راستے پر جنگلی پھولوں کی ہلکی ہلکی باس تھی اور تمھاری ساڑھی کے پلو کی سرسراہٹ تھی اور کنیز کی چوڑیوں کا چھنا کا تھا۔ پیران تھا' شام تھا' میں تھا اور نیچے قبرستان میں شکستہ قبروں کے گڑھے تھے اور سوسن اور نرگس کے پھولوں کے افسردہ چراغ تھے۔

اور گاؤں گہری نیند سو گیا تھا اور قبرستان کی حدیں اس کے مکانوں کو چھو رہی تھیں۔

زندگی اور موت گلے مل کر سو رہی تھیں۔ اسی طرح جیسے بھرپور چاندنی کے اس طلسمی ماحول میں رات اور دن ہم آغوش ہو کر اونگھ رہے تھے

تمھارے پھیپھڑے کمزور ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں کی یہی رائے تھی۔ کہتے ہیں گانے والوں کے پھیپھڑے کمزور نہیں ہوتے۔ پھر تمھارے کیوں ہو گئے تھے؟ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان باتوں کا علم اور

تجربہ ہے۔ اچھی بھلی جوانیاں کیسے دق ہو جاتی ہیں میں جانتا ہوں۔ انسان کے جسم اور ذہن کی تندرستی اس کے ماحول سے قائم رہتی ہے۔ ماحول کی گھٹن اور اُمس اور قید ایک تندرست انسان کو دنوں میں بیمار کر ڈالتی ہے ان قیدوں کو سنگیت کی اُڑان بھی پار نہیں کر سکتی۔ انھیں بیڑیوں نے تمھیں جکڑا تھا، تمھارے ذہن کو مروڑا تھا اور تمھیں بیمار بنا ڈالا تھا۔
تمھیں جن پابندیوں سے چڑ تھی وہی تم پر ٹھونسی جا رہی تھیں تم آزاد رہنا چاہتی تھیں اور تمھارے گھر والے تمھیں قید کرنا چاہتے تھے۔ تمھاری تقدیر کو شام کے ہاتھ سونپا جا رہا تھا جو تمھیں کسی بھی طرح گوارا نہ تھا۔ تمھارے ہونٹ خاموش رہے لیکن تمھارے اندر بغاوت کی جوالا بھڑکتی رہی اور آخر اس نے تمھیں جھلس ڈالا۔ تمھارے دائیں پھیپھڑے پر جو داغ تھا اس کا کارن دق نہیں تھی۔ وہ آگ تھی جو تمھارے اندر سلگتی تھی۔ آزاد رہنے اور زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کی تمنا تھی جس نے تمھارا سینہ چھید ڈالا تھا۔

تم نے اپنی مخالف قوتوں کو ہرایا لیکن کھلی جنگ کا اعلان کر کے نہیں ان پر ایک ڈائنا میٹ پھینک کر جس نے تمھیں بھی زخمی کر دیا تھا۔ تم نے آزادی حاصل کی تھی لیکن مرتی ہوئی غلامی کی ایک جلتی ہوئی مہر تمھارے سینے پر مُرتسم تھی۔
اور تم اس مہر کی جلن کو بھولنے کے لئے بٹوت آئی تھیں۔ سرینگر سے بٹوت آنے میں بظاہر کوئی تک نہ تھی۔ لیکن تم نے بٹوت ہی کو چُنا تھا کچھ مہینے سکون سے گزارنے کے لئے۔ اس لئے کہ میں قریب تھا۔ تمھارے پاس آ سکتا تھا۔ تمھاری دیکھ بھال کر سکتا تھا۔

تم نے بٹوت سے میل بھر ادھر چیڑوں سے گھرا ہوا ایک دیہاتی گھر کرایے پر لیا تھا۔ جب سے دق کے مریضوں نے کثرت سے وہاں جانا شروع کیا تھا۔ بٹوت کے لوگوں نے اپنے مکان کرایے پر دینے چھوڑ دئے تھے۔ مریض اچھے ہو کر چلے جاتے تھے لیکن اپنے پیچھے جراثیم کا ایک تیز زہر چھوڑ جاتے تھے جو ان کچے مکانوں کی دیواروں میں سرایت کرتا ہوا ان میں رہنے والوں کے جسموں میں سما جاتا ہے۔ ان کے پھیپھڑے داغدار ہو جاتے تھے جنھیں کرائے میں حاصل کئے ہوئے چند سکے کسی بھی طرح ٹھیک نہ کر سکتے تھے۔

لیکن تمھیں مکان مل ہی گیا تھا اور وہ بٹوت کی سب سے زیادہ خوبصورت جگہ پر واقع تھا۔
میں جب بس سے اُترا تو اس مکان کو پہچاننے میں مجھے کچھ دیر نہ لگی لیکن جب تمھیں دیکھا تو پہلی نظر میں نہ پہچان پایا۔ گارے اور پتھر کی بے جان ماڑی تو میں نے پہچان لی لیکن تمھیں نہ پہچان نہ سکا۔ تم کو جس کی زندگی کی ہر سانس مجھے چھو کر گزرتی تھی۔
تم بے حد کمزور ہو گئی تھیں۔ تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا مدھم سا اُجالا شام کے اس دھندلکے میں مجھے نظر نہ آیا۔ ورنہ اس اُجالے نے میری راتوں کو دن کی روشنی بخشی تھی۔
پہچاننا مشکل ہو رہا ہے کیا؟ تم نے دالان میں لگی چارپائی پر سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں" میں نے اٹیچی کیس نیچے رکھتے ہوئے جواب دیا۔
تمھاری ماں پاس کھڑی تھی۔ تمھارا بھائی یہاں قریب کھڑا تھا۔
میں تمھاری پائنتی بیٹھنے لگا تو تم نے روک دیا۔
یہاں نہ بیٹھئے۔
"کیوں"
"میں خطرناک مریض ہوں" تم نے مُسکرانے کی کوشش کی
میں نے دیکھا تمھارا نوکر سامنے طاق میں رکھے چراغ کو روشن کر رہا تھا۔

لالٹین کی روشنی تمھیں پسند نہیں۔ تم ضرورت پڑنے پر چراغ ہی جلایا کرتی ہو یا پھر موم بتیاں۔ چراغ کی روشنی میں تمھارا چہرہ مسکراہٹ کے باوجود اُداس لگ رہا تھا۔
"اس کا انتظام میرے پاس ہے" میں نے اپنے اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کیا جس میں تمھارے لئے دوائیاں رکھی تھیں۔
"ڈاکٹر لوگ بغیر دوائیوں کے نہیں آتے نا" تم یہاں بولا
"کئی ڈاکٹر آئے ہیں بھیا"
"میں ان میں سے نہیں ہوں"۔ میں نے جواب دیا
تمھارا علاج شروع ہو گیا۔
تم بہت اچھی ٹائپ کی مریضہ ہو۔ بیمار لوگ تو گھر والوں کا ناک

میں دم کر دیتے ہیں۔ تم تو بس بستر پر خاموش پڑی پڑی پڑھتی رہتیں۔ شام کو تھوڑا سا گھوم آتیں اور پھر یہاں سے ستار سنتیں۔ کبھی کبھی مالک مکان کی جوان لڑکی ٹوکری میں تازہ سبزیاں اور پھل لے آتی لیکن ہمیشہ دور ہی بیٹھتی۔

"تم اتنی دور کیوں بیٹھتی ہو رجو"؟ تم نے ایک بار اس سے پوچھا۔

"ماں نے ایسا ہی کہہ رکھا ہے"

"تمہارا جی بھی نزدیک آنے کو نہیں چاہتا"؟

"چاہتا ہے" اس نے پل بھر کی خاموشی کے بعد کہا

"تو آؤ میرے پاس" تم نے کہا

اور رجو سمٹی ہوئی تمہارے بستر کے قریب آ گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ اُبھر آیا تھا۔ وہ بُری طرح گھبرا رہی تھی

"تمہاری سبزیاں بہت اچھی ہوتی ہیں" میں نے رجو سے کہا۔

"جی" وہ بولی۔ اس کی نظریں کچے دالان پر گڑی تھیں جو اسی دن گوبر سے پوتا گیا تھا۔ گوبر کا کھردرا پن ابھی تک قائم تھا۔

ہاتھوں کے پھرانے ہوئے سے نشان ابھی تک نظر آ رہے تھے

"تمہارے پھل بھی اچھے ہیں"

"جی"

"تمہارا مکھن بھی اچھا ہے"

"جی"

"تم بھی بہت اچھی ہو رجو" تم نے یہ کہہ کر مجھے اپنی بات کی اہمیت کا احساس کرایا تھا۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ تمہاری نگاہ میں طنز تھا۔ جو آنکھیں جھکائے دالان سے باہر نکل کر کھیتوں کی سیڑھیاں اترنے لگی۔

میں تمہیں گھمانے کے لئے جاتا تو تھوڑی ہی دور جا کر ایک باولی کے کنارے بٹھا دیتا۔ پرانے زمانے کی پکی باولی کے پانی سے اٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی خنکی بڑی پیاری لگتی تھی۔

ایک روز ہم سیر کو جا رہے تھے تو ہمارے کانوں میں ایک پہاڑی گیت کے بول پڑے۔ گیت کی پُر سوز اُٹھان چیڑ کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا میں کھو کر بڑی سُندر لگ رہی تھی۔ ہم دھیرے دھیرے باولی کی طرف بڑھے۔ کوئی عورت گا رہی تھی اور کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی اس لئے اُسے ہماری آہٹ کا احساس نہ تھا۔ گیت کی لے گونج رہی تھی۔

تمہارے ہجر کے داغ اتنے گہرے ہیں کہ باولی کا پانی بھی انھیں نہیں اتار سکتا۔

میرے محبوب اب میں انہیں اپنے آنسوؤں سے اُتار رہی ہوں۔

میرا کرتہ اور میری اوڑھنی دونوں میلے ہیں۔

کونسا لباس پہن کر تمہیں ملنے جاؤں گی۔

تم خود ہی کیوں نہیں آ جاتے میرے محبوب۔

اب تو بہار آ گئی ہے۔

جانے کیسے اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ وہ رجو تھی۔ ہمارے مالک مکان کی لڑکی۔ وہ اَدھ دُھلے کپڑے اُٹھا کر جانے لگی۔

"جا کیوں رہی ہو رجو"؟ تم نے پوچھا

"تم کسی سے پیار کرتی ہو"؟

"تمہارا چاہنے والا پردیس میں ہے"؟

"تمہیں اس کا انتظار ہے"؟ وہ خاموش رہی۔ اس نے کسی بھی بات کا جواب نہ دیا۔

"میں تمہارے باپو سے کہوں"؟

تمہاری یہ بات سنتے ہی وہ ادھ دُھلے کپڑوں کا بوجھ اُٹھا کر چل دی۔ گیلے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے اپنے کپڑے بھی گیلے تھے۔ اس کی سوسی کی سُتھن (شلوار) بالکل بھیگ رہی تھی۔ قدم بڑھانا مشکل تھا۔ پر وہ رُکی نہیں، چلی ہی گئی۔ اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ صابن کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باولی کے پانی میں گھل رہے تھے اور ہلکا ہلکا جھاگ پانی کی سطح پر اُبھرنے لگا تھا۔

جب تم ہٹوت سے واپس جانے لگیں تو تم نے ایک پارٹی دی۔ اس میں وہ سب تھے جنھوں نے بیماری کے دوران تمہاری خدمت کی تھی۔ رجو کو تم نے خاص طور سے بُلایا تھا۔ اس سے تم نے وہی باولی والا گیت سُنا اور اسے اپنی ایک قمیص اور شلوار اور دوپٹہ دیا اور کہا کہ وہ کپڑے تم نے استعمال نہیں کئے تھے اس لئے ان میں جراثیم کا زہر نہ تھا۔ اسے جراثیم سے بہت ڈر لگتا تھا۔

رجو جانے لگی تو تم نے کہا۔

"اپنے بیاہ میں مجھے بلاؤگی نا"؟

"ہاں" اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں کا انگوٹھا کچے دالان کو کُرید رہا تھا۔

"میرے بیاہ میں آؤگی تم"؟

تمھارے اس سوال کا جواب اس نے نہیں دیا۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا۔ جانے اس کا کیا مطلب تھا!

میں ہنس دیا۔ تم بھی ہنس دیں اور وہ شرما کر تہ کیے ہوئے کپڑوں کو سنبھالتی چلی گئی۔

تم گنگنا رہی تھیں۔

تم خود ہی کیوں نہیں آجاتے میرے محبوب۔

اب تو بہار آگئی ہے۔

آج تمھارا خط آیا ہے

تم پہلگام میں ہو۔ تمھاری ماں تمھارے ساتھ ہے کیپٹن پران سکندر آباد سے دو ماہ کی چھٹی لے کر تمھارے پاس آیا ہوا ہے۔ شام کی شادی دہلی میں کسی سکول مسٹرس سے ہوگئی ہے۔

اور تم نے مجھے بُلایا ہے۔

تمھارے اس بلاوے میں تمھاری ماں اور تمھارا بھائی دونوں شریک ہیں۔ وہ دونوں چاہتے ہیں کہ میں اپنی حسین وادی میں واپس آجاؤں۔ اس کے پھول اور جھرنے اور پہاڑ میرا انتظار کر رہے ہیں۔

ایک چاندنی میرا انتظار کر رہی ہے۔

ایک گیت میرا انتظار کر رہا ہے

اور میرے ذہن میں دو گیت گونج رہے ہیں جن میں ایک عورت اپنی آنکھوں میں زندگی بھر کا درد سموئے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے۔

ان دو گیتوں کے سنگم پر یہ پرچھائیں سی کیسی اُبھر رہی ہے یہ ایک روشنی سی کیا چمک رہی ہے۔ یہ ایک نغمہ سا کیا دھڑک رہا ہے۔

ایک نیا گیت جنم لے رہا ہے نو۔ نیا اور انوکھا اور مختلف قسم کا۔ کیسر کی کیاریوں میں کھڑی ایک آزاد کشمیری لڑکی اپنی نرم شیریں آواز میں گا رہی ہے۔

پورے چاند کی رات ہے۔

زعفران کے نیلے نیلے پھول کھلے ہیں۔

آؤ میرے محبوب ان پھولوں کو چنیں۔

یہ ہماری محنت اور قربانیوں کے پھول ہیں۔

آؤ ہم انھیں اپنی محبت کی جھولیوں میں بھر لیں۔

تم آؤ۔ یہ کھیت تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔

گیت کے بول میں نے لکھ ڈالے ہیں۔ اس کی دُھن تم نکالنا اور پھر پورنیما کی ایک حسین رات کو پام پور کے ان زعفران زاروں میں تم اور میں دونوں مل کر گائیں گے اور کیسر کی کیاریوں کی مالک وہ آزاد کشمیری لڑکی بھی ہمارے ساتھ آواز ملائے گی۔

پہاڑوں کی چوٹیاں گونجیں گی

چاندنی جھومے گی

اور اس کی آواز اس کا محبوب سُنے گا اور اپنے روشن مستقبل کا جھومر لے کر آئے گا اور کانپتے ہاتھوں سے اس کے ماتھے پر سجا دے گا۔

اور آکاش کی وسعت میں تیرتا ہوا چاند انھیں سلام کرتا ہوا زعفران زاروں پر سے آگے نکل جائے گا۔

اللہ اللہ ہے کیا حُسنِ چمن پانی میں | سبزہ و لالہ و گل سرو و سمن پانی میں
کیسے کیسے ہیں عمل افروز نظارے اس میں | کہ پانی میں چمن پانی میں بن پانی میں
تودۂ سیم ہے یہ فلک کے خزانے ہیں نہاں | برف کہسار ہے یا عکس فلک پانی میں
اک طرف کوہ پہ ہے تختِ سلیماں قائم | اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں

(چوہدری خوشی محمد ناظر)

نندلال واتل

کشمیر کے توسیعی منصوبے

جمہوریۂ ہند کے ایک حصّہ کے طور پر جموں و کشمیر میں بھی پنج سالہ منصوبے کے تحت تعمیر و ترقّی کا کام جاری ہے۔ جاگیردارانہ نظام کی مکروہ نشانیاں —— بے کاری، بیماری، پس ماندگی اور جہالت —— سُرعت سے مِٹتی جا رہی ہیں، اور ایک "نیا کشمیر" بتدریج لیکن یقینی طور پر اُبھر رہا ہے، جس میں تمام لوگوں کو ترقّی کرنے اور آگے بڑھنے کے لئے یکساں موقعے میسّر ہوں گے۔

ابتدا میں جموں و کشمیر کے لئے جو منصوبہ مرتب کیا گیا تھا وہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک کی مدّت کے لئے تھا۔ جب اس کے متعلق مرکزی منصوبہ بندی کمیشن اور ریاستی سرکار کے نمایندوں میں بات چیت ہوئی تو فیصلہ یہ ہُوا کہ اس منصوبے کو کل ہند منصوبہ کا جزو بنایا جائے۔ چناں چہ ابتدائی منصوبہ میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور اس کو رُو بہ عمل لانے کے لئے تیرہ کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی۔ اس میں سے سات کروڑ روپے ہند سرکار نے دینے منظور کئے اور تین کروڑ روپے کی رقم ریاستی حکومت کے ذمّے رکھی گئی۔ اس کے علاوہ ہند سرکار نے بانہال میں سرنگ بنانے کی اسکیم کے لئے تین کروڑ روپے دینے منظور کئے۔

ابتدائی مرحلوں میں اس منصوبے کو رُو بہ عمل لانے کی رفتار سُست ہی رہی۔ اس کے کئی وجوہ ہیں جن کی تفصیل میں پڑنا طوالت کا باعث ہوگا۔ اگست ۱۹۵۳ء میں وزارتی تبدیلی رُونما ہوئی۔ اس تبدیلی کے بعد جہاں ملک کے کئی مسئلے حل ہوئے، وہاں پنج سالہ منصوبے کو رُو بہ عمل لانے کی رفتار بھی تیز کی گئی۔ علاقائی کنونشن بُلائے گئے جن میں عوام کے مشورے سے توسیعی کاموں کی فہرست مرتب کی گئی اور بعد میں ان فہرستوں کی موجودگی میں پنج سالہ منصوبے میں کچھ اور اضافے کئے گئے۔ چناں چہ مرکزی سرکار کے ذمّہ جو رقم تھی وہ سات کروڑ روپے سے ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ۵۴ ہزار روپے تک اور کشمیر سرکار کے ذمّہ جو رقم تھی وہ تین کروڑ روپے سے تین کروڑ ۴۰ لاکھ ۱۵ ہزار روپے تک پہنچ گئی۔

بجلی گھر بنانے کے منصوبے

عہدِ حاضرہ میں بجلی کو جو اہمیّت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے جموں و کشمیر میں بھی بجلی پیدا کرنے کی اسکیموں کی طرف خاص توجّہ دی گئی ہے، خصوصاً اس لئے کہ سری نگر اور جموں میں جو بجلی گھر پہلے ہی سے چالو ہیں وہ اب بوسیدہ ہو چکے ہیں اور برقی رَو کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے یکسر ناکافی ہیں۔ پنج سالہ منصوبے میں بجلی کی اسکیموں کے لئے ۲ کروڑ ۴۵ لاکھ ۱۹ ہزار روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔

سندھ ویلی ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم پر پچھلے چھ سال سے کام جاری ہے۔ اور اس دوران میں اس کے مکمّل ہونے کی اُمید ہے۔ یہ بجلی گھر گاندربل میں تعمیر کیا جا رہا ہے اور سری نگر سے صرف چودہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے لئے ایک دس میل لمبی نہر بنائی گئی ہے جس کا پانی ۳۶۲ فٹ کی بلندی سے گرایا جائے گا۔ دو جنریٹر لگائے گئے ہیں، جو چھ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کریں گے۔ رفتہ رفتہ یہ بجلی گھر پندرہ ہزار کلوواٹ تک بجلی پیدا کر سکے گا۔ موجودہ اندازے کے مطابق یہ بجلی پچیس سال تک کے لئے کافی ہوگی۔

اس بجلی گھر کو مکمّل کرانے کے لئے ہند سرکار کے بھیجے ہوئے ماہرین بھی مدد دیتے رہے ہیں۔ حتّیٰ کہ ہندوستانی فوج نے بھی اس کو مکمّل کرانے میں کافی امداد دی ہے۔ اس نے بجلی گھر کے لئے بھاری مشینیں لانے میں مدد دی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو دیگر ذرائع سے ان مشینوں کو گاندربل تک پہنچانے میں کم از کم چھ مہینے لگتے۔

ہندوستانی فوج کو ان مشینوں کے لئے راستے میں کچھ عارضی پل بنانے پڑے اور مشینیں لانے والے جوانوں کو کبھی کئی کئی میل پیدل چلنا پڑا، صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں ان مشینوں کو سڑک کے کنارے پر موجود بڑے بڑے پتھروں سے نقصان نہ پہنچے۔

بجلی گھر کی نہر کا پانی ضائع نہیں ہوگا۔ اس سے ایک تو تین ہزار ایکڑ زمین کی آبپاشی ہوگی اور دوسرے اس نہر کو ہارون تک لایا جائے گا جس سے سری نگر کے لوگوں کو پینے کا پانی مہیا کرنے کا مسئلہ حل ہوگا۔

جموں کو جوگندر نگر کے بجلی گھر سے بجلی مہیا کی گئی ہے۔ یہ اسکیم دسمبر ۱۹۵۴ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس کے لئے پٹھان کوٹ سے جموں تک ستر میل لمبی ہیوی ٹرانسمیشن لائن لائی گئی ہے جو ۶۶ ہزار وولٹس کے لئے ہے۔ اس سے انجام کار پانچ ہزار کلوواٹ بجلی کی بہم رسانی کا بندوبست ہوگا۔ اس اسکیم کو مکمل کرنے پر ۳۵ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ اس سے جموں شہر کے علاوہ کٹھوعہ سے لے کر جموں تک کے علاقے کو بجلی مہیا کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کنڈی علاقے میں رہنے والے لوگوں کو پینے کا پانی مہیا کرنے کے لئے نل کنوئیں کھودے گئے ہیں۔ ان نل کنوؤں سے لوگوں کو کس قدر سہولت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ انھیں گندے تالابوں کا پانی پینا پڑتا تھا اور عموماً کئی کئی میل سے پانی لانا پڑتا تھا۔

ادھم پور میں برقی رو مہیا کرنے کے لئے ایک اسکیم ہاتھ میں لی گئی ہے، جس پر سات لاکھ ستاسی ہزار روپے کے خرچ کا اندازہ ہے۔ اسی طرح وادیٔ کشمیر کے بعض علاقوں میں بھی بجلی مہیا کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

آب پاشی کی توسیع

جموں و کشمیر خوراک کے لحاظ سے خود کفیل نہیں۔ موجودہ حکومت نے خوراک کی کمی کو دور کرنے کے لئے جو تجویزیں مرتب کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مزید زمین زیر کاشت لائی جائے اور اس غرض کے لئے آب پاشی کے وسائل کو فروغ دیا جائے۔ ۱۹۵۴ء کے آخر تک مندرجہ ذیل نئی نہریں مکمل کی گئیں اور ان سے کل ۳۵ ہزار ایکڑ زمین کو پانی مہیا ہوا۔

(۱) سینل کنال حصہ اول (۲) زینہ پورہ کینال (۳) ڈہلی کنال حصہ اول (۴) ادھم پور کنال اور (۵) ایسٹ کشمیر ویلی پروجیکٹ۔

آب پاشی کے سلسلے میں موجودہ حکومت نے جو اہم ترین اقدام کیا وہ لفٹ اریگیشن کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی ڈیزل آئل سے چلنے والے پمپوں کے ذریعے سے دریائے جہلم کا پانی ایسی جگہوں پر پہنچایا جاتا ہے جو دریا کی سطح سے کافی بلندی پر واقع ہیں۔ اس اسکیم کے تحت چار ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین سیراب ہوئی ہے اور شالی کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) پدگام پورہ پروجیکٹ تین ہزار ایکڑ (۲) بارسو ننداپورہ پروجیکٹ تین سو ایکڑ (۳) دلینہ پروجیکٹ چار سو ایکڑ (۴) للدوہ پروجیکٹ چار سو ایکڑ۔

لفٹ اریگیشن اسکیم کامیاب رہی ہے اور ہند سرکار کی وزارتِ زراعت و خوراک کے ماہرین نے اسے کافی سراہا ہے۔

وادیٔ لولاب میں آب پاشی نہروں اور ندی نالوں سے نہیں ہوتی۔ موجودہ حکومت نے وہاں تالاب بنائے ہیں جن میں بارش کا پانی جمع ہوا کرے گا۔ پچھلے سال کے آخر تک وہاں اس قسم کے آٹھ تالاب بن چکے تھے۔

سیلابوں کا انسداد

کشمیر میں وقتاً فوقتاً سیلاب آتے رہتے ہیں۔ جن سے فصلوں کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ پچھلے چند سال کے اندر پے در پے سیلاب آئے جن سے کافی نقصان ہوا۔ اس سے کوئی سیلاب روک اسکیم ہاتھ میں لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہند سرکار نے بھی اس سلسلے میں مدد دی۔ چناں چہ ایک جامع اسکیم مرتب کی گئی ہے جس سے جہلم کا پانی سنگم سے کچھ نیچے ایک نئی نہر کے ذریعے سے جھیل وُلر میں ڈالا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وادیٔ کشمیر ہمیشہ کے لئے سیلاب کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گی۔ اس اسکیم پر کل اڑھائی کروڑ روپے کے خرچ کا اندازہ کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے، اب صرف دو حصے مکمل کرنے باقی ہیں۔ پہلے حصے کی تکمیل میں ستر میل لمبے بند تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس اسکیم کو مکمل کرنے کے لئے مشینیں بھی استعمال کی جا سکتی تھیں، لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ مزدور ہی یہ کام کرتے ہیں جس سے بے کاری کا مسئلہ بھی کافی حد تک حل ہو چکا ہے۔ گذشتہ موسم سرما میں ہزاروں لوگ اس کام پر لگے رہے اور انھیں ان مہینوں میں بے کار نہیں رہنا پڑا۔

صنعت و حرفت

اگرچہ پچھلے پنج سالہ منصوبے میں زیادہ توجہ زراعت ہی پر مرکوز رکھی گئی ہے لیکن صنعت و حرفت خصوصاً گھریلو دستکاریوں کو فروغ دینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی گئی۔ سلک اور اون کے سرکاری کارخانوں کو وسعت دی

گئی ہے اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ کیا گیا اور ان کو بونس بھی دیا گیا۔

پانپور میں جوائنری مِل قائم کی گئی۔ ریاست میں اپنی قسم کا یہ پہلا کارخانہ ہے اور اس پر تیس لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے۔ اس کارخانے میں دروازے، کھڑکیاں اور اسی قسم کا تیار مال بنا کرے گا اور عمارتی لکڑی کو خام صورت میں برآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کارخانے میں تقریباً ۳۵ لاکھ روپے سالانہ کی مالیت کا سامان تیار ہوا کرے گا۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کام شروع کرانے کے لئے بھی رقمیں منظور کی گئی ہیں:-

(۱) جموں میں گھریلو دستکاریاں شروع کرانے کے لئے پانچ لاکھ روپے۔

(۲) کشمیر میں قالین، پٹو اور نمدے بنانے کے لئے آٹھ لاکھ روپے۔

(۳) کشمیر میں ٹینری قائم کرنے کے لئے دس لاکھ روپے۔

یہ کام شروع کئے گئے ہیں اور انھیں سرعت کے ساتھ وسعت دی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ پشمینہ بُننے کی پُرانی صنعت کو فروغ دینے کے لئے لداخ میں پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے پشمینہ سنڈیکیٹ قائم کیا گیا ہے۔

جموں و کشمیر میں تیار ہونے والی صنعتی اشیاء کو باہر کی منڈیوں میں فروخت کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک ایمپوریم قائم کیا گیا ہے۔ جس کی شاخیں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ ایمپوریم نے اب اپنی نگرانی میں پیداواری مرکز بھی قائم کئے ہیں جہاں معیاری قسم کا مال تیار کیا جاتا ہے۔

کشمیر میں دوا سازی کا کام بھی کافی وسعت پکڑ چکا ہے۔ اس سلسلے میں ریجنل ڈرگ ریسرچ لیبارٹری نے اس وقت تک کافی ترقی کی ہے اور یہاں ہر قسم کی دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ فارسٹ انڈسٹری کو بھی فروغ مل چکا ہے۔

رسل و رسائل

کشمیر ایک پہاڑی ملک ہے۔ لہٰذا یہاں سڑکوں کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ پنج سالہ منصوبے کے تحت اس طرف خاص دھیان دیا گیا ہے۔ اس وقت تک کئی نئی سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ نئی پُرانی سڑکوں کی مرمت کی گئی اور کئی نئے پُل بھی بنائے گئے۔ ان کاموں کے لئے منصوبے میں ۲ کروڑ ۷۳ لاکھ ۳۱ ہزار روپے کی رقم مخصوص رکھی گئی ہے۔

رسل و رسائل کے سلسلے میں سب سے بڑا کام بانہال ٹنل پروجیکٹ ہے۔ بانہال کارٹ روڈ وہ شاہراہ ہے جو کشمیر کو بیرونی دنیا سے ملاتی ہے۔ یہ شاہراہ بانہال کے پہاڑ سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور نو ہزار فٹ کی بلندی پر اس میں ایک سُرنگ بنائی گئی ہے۔ سردی کے موسم میں یہ سُرنگ برف باری کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے اور ٹریفک بند ہو جاتا ہے۔ سردی کے ایام میں صرف ہوائی رستے کے ذریعے سے کشمیر آنا اور یہاں سے باہر جانا ممکن ہوتا ہے۔ اس دقت کو دُور کرنے کے لئے بانہال میں سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک اور سرنگ بنانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ یہ سرنگ اڑھائی میل لمبی اور بائیس فٹ چوڑی ہوگی۔ سری نگر سے یہ نئی سرنگ ۵۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور پہاڑی کے دوسری طرف ۷۳ ویں میل پر یہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سُرنگ ایشیا میں اپنی قسم کی سب سے بڑی سرنگ ہوگی۔ اس کے مکمّل ہونے سے سری نگر اور جموّں کے درمیان کی مسافت میں سولہ میل کی کمی ہوگی اور یہ سڑک سال بھر کھُلی رہا کرے گی۔ یہ پروجیکٹ مرکزی حکومت کے محکمہ پبلک ورکس کی نگرانی میں مکمل کیا جا رہا ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق سرنگ کی کھدائی کا کام کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ کھدائی کا کام پہاڑوں کے دونوں طرف سے شروع ہو چکا ہے۔ مارچ ۱۹۵۶ء تک پائلٹ ٹنل مکمل ہو جائے گی اور مسافر پیدل اس کو عبور کر سکیں گے۔ ۱۹۵۷ء میں لاریاں اور موٹریں اس کو عبور کرنا شروع کریں گے۔ اس اسکیم کو مکمّل کرانے پر تین کروڑ روپے کے خرچ کا اندازہ کیا گیا ہے۔ کھدائی کا کام جرمنی کی ایک کمپنی کے سپرد کیا گیا ہے۔ بانہال ٹنل نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ اس سے کشمیر اور بیرونی دُنیا کے درمیان سال بھر کھُلی رہنے والی سڑک تیار ہو جائے گی بلکہ اس سے ہند اور کشمیر کے درمیان قائم ہوا رشتہ اور زیادہ اُستوار ہو جائے گا اور عوام کی نفسیات پر بھی اس کا خوش گوار اثر پڑے گا۔

دیہات سدھار

ہندوستان کے دوسرے حصّوں کی طرح کشمیر میں بھی آبادی کا بیشتر حصّہ دیہات میں رہتا ہے۔ اس لئے دیہات سدھار کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے۔ اجتماعی ترقی کی منصوبہ بندی اور قومی توسیعی سروس کے تحت اس وقت تک دیہات سدھار کا جو کام ہوا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ دیہات میں جگہ جگہ سڑکیں تیار کی جا رہی ہیں، کنوئیں اور تالاب بن رہے ہیں۔ مویشیوں کی پرداخت کے کام کو وسعت دی جا رہی ہے۔ طبّی امداد اور تعلیمی سہولتوں کو بڑھاوا دیا جا رہا

لہ۔ حال ہی میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ بالمقابل دو سُرنگیں بنیں گی تاکہ آمد و رفت الگ الگ راستے سے ہو سکے۔ (ادارہ)

ہے۔ اس سلسلے میں میراں بہن کے "گاؤبل" کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ آپ نے اپنا ہیڈ کوارٹر ہری گڑھ سے کشمیر میں منتقل کیا ہے اور گنگن میں ایک مرکز قائم کیا ہے۔ انگلستان سے اعلیٰ نسل کی گائیں اور بیل لائے گئے ہیں۔ اور مویشی دھن کو بڑھانے میں عوام کی ہر طرح سے مدد کی جا رہی ہے۔ میراں بہن نے اس مرکز کا نام "گاؤبل" رکھا ہے۔

ان توسیعی اسکیموں پر عمل درآمد کرنے سے کشمیر میں رہنے والے لوگوں میں ایک نئی حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ اس لگن اور دلچسپی سے کام کر رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ جو کام ہو رہا ہے اُن کی بہتری اور بھلائی کے لئے ہو رہا ہے جس میں انھیں بھی حصّہ لینا چاہیئے۔ وادیٔ لولاب میں پانی کے تالاب بنانے کے کام میں مردوں کے علاوہ عورتوں نے بھی حصّہ لیا۔ اور یہ بات ناقابلِ یقین دکھائی دیتی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں نے زیادہ کام کیا اور زیادہ اُجرت کمائی۔ ایک مرد جہاں روزانہ چودہ آنے سے لے کر ایک روپے تک کماتا تھا وہاں ایک عورت روزانہ ایک روپے سے اٹھارہ آنے تک کماتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عورتوں نے الگ کام کرنے پر زور دیا۔ اور جب بخشی غلام محمدؐ وزیرِ اعظم جموں و کشمیر نے اس کی وجہ پوچھی تو اُن عورتوں نے جواب دیا کہ مرد حقّہ پیتے اور نسوار لینے میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ اسی طرح سڑکیں اور نہریں بنانے میں بھی عوام سرکاری اہل کاروں کے ساتھ سرگرمی سے تعاون کر رہے ہیں۔

تعمیری کام جس وسیع پیمانے پر انجام دئے جا رہے ہیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ کشمیر میں اس وقت پرائیویٹ کاموں کے لئے مزدور ترکھان اور گل کار ملتے بھی نہیں۔ ساتھ ہی ان کی اُجرتوں میں بھی معقول اضافہ ہُوا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان تعمیری کاموں کے انجام دینے میں اس وقت قریباً اسی ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں۔

تعمیری کاموں کے متعلق عوام کے جوش و خروش کی عکّاسی بخشی غلام محمدؐ صاحب نے اُس تاریخی تقریر میں کی ہے جو انھوں نے گزشتہ اکتوبر میں جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کی۔ انھوں نے کہا :-

"ہم دریاؤں کا رُخ موڑیں گے تاکہ اُن کے پانی کو آب پاشی کے لئے استعمال کیا جا سکے اور یہ بے قابو ہو کر ہمیں سیلابوں کا شکار نہ بنائیں، ہم پہاڑوں کا سینہ چیریں گے اور چیر کر ان ہی سے راستے بنائیں گے۔ ہم میں ہمّت جوش اور ولولہ ہے۔ کوئی کام ایسا نہیں جسے ہم انجام نہیں دے سکتے۔ ہمیں "نیا کشمیر" تعمیر کرنا ہے، ایک ایسا نیا کشمیر جو جمہوریۂ ہند کے ایک حصّے کے طور پر ترقّی اور خوش حالی کی مثال ہوگا۔"

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان اسکیموں کو روبعمل لانے کے لئے انتظامیہ مشینری کو بھی تبدیل کیا گیا ہے اور دفتری طوالت کو بہت حد تک کم کیا گیا ہے۔ وزیرِ اعظم خود ہر جگہ جاتے ہیں، مزدوروں اور انجینیروں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور عوام میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر یہ نہ بتایا جائے کہ موجودہ وزارت غذائی مسئلہ حل کر کے تعلیمی فیس پہلی جماعت سے لے کر یونیورسٹی تک معاف کر کے کسانوں سے غلہ کی جبری وصولی منسوخ کر کے شرحِ آبیانہ کم کر کے کسٹم ڈیوٹی منسوخ کر کے اور سیاسی غیر یقینی صورتِ حال ختم کر کے عوام کا اعتماد حاصل کر چکی ہے اور اس سے توسیعی اسکیموں کے روبہ عمل لانے کے لئے فضا سازگار بن گئی ہے۔

اچھابل

اچھہ بل اور کوہسار — ہوش رُبا جو ئبار

لالہ و گل بے شمار — جلوہ گہِ حُسنِ یار

باغ ہے یہ سحر کار — بلکہ ہے جنّت نگار

جائیگہ انتظار — قدرتِ پروردگار

مرزا کمال الدین شیدا

پی۔ این۔ کے۔ بامزئی

کشمیر

جغرافیائی جائزہ

۸۴۴۵۰ مربع میل پر مشتمل جموں اور کشمیر ریاست ۲۵ ، ۳۲ اور ۵ ، ۳۵ عرض البلد شمالی اور ۳۰ ، ۷۳ اور ۳۰ ، ۸۰ طول البلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ ریاست انڈین یونین کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اختصار کے خیال سے اسے عام طور پر صرف کشمیر کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں جموں کا علاقہ لداخ، بلتستان وغیرہ بھی شامل ہیں۔

جغرافیائی حیثیت کی بدولت کشمیر کو ہمیشہ فوجی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پاکستان، روس اور چین کے علاقوں کے ساتھ اس کی حدیں ملتی ہیں۔ وسطی ایشیا سے آنے اور وسطی ایشیا کو جانے والے قافلے صدیوں سے اس علاقے میں سے گزر کر جاتے رہتے ہیں۔ کشمیر کی سرزمین میں جغرافیائی، نسلی اور دیگر کئی قسم کے تنوع پائے جاتے ہیں۔ اس کی مٹی، اونچائی، ارضیاتی ڈھانچے، آب وہوا، نباتات اور لوگوں میں دلچسپ تضاد پایا جاتا ہے۔ اس موہنی دنیا کے ان مختلف پہلوؤں نے اس کی تاریخ پر جو کہ بہت پرانی ہے گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور اسے مجموعی طور پر بوقلموں اور گوناگوں بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر جموں اور اس کے ساتھ والے میدانوں میں گرم ملکوں کی سی آب وہوا ہے، اور لداخ اور بلتستان ایسے علاقوں میں قطب شمالی کی سی سردی ہے۔ تاہم خاص کشمیر کی وادی گرمی اور سردی کی اس انتہائی کیفیت سے مبرا ہے۔ یہاں معتدل آب وہوا ہے جو کہ خوشگوار اور تقویت بخش ہے۔

بہرحال یہ معتدل فضا اور زرخیز زمین اس خطے کے باسیوں کے لئے ایسی نعمتوں کا باعث ثابت نہیں ہوئی جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں۔ کیونکہ شمال کے پہاڑی علاقے میں رہنے والوں اور جنوب کے گرم میدانوں میں رہنے والوں نے اس شاداب اور خوشگوار زمین پر ہمیشہ بری نظر ڈالی ہے۔ اور کشمیر کی تاریخ کا کافی حصہ ان جانبازوں کے کارناموں کا ریکارڈ ہے جنہوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔

قدیم وقتوں سے کشمیر میں بسنے کے لئے لوگوں کی دیرینہ خواہش تھی۔ جہاں اشیائے خوردنی کی ارزانی اور بہتات پنڈت آنند کول کی تصنیف "کشمیری پنڈت" میں ایک سنسکرت قول سے ظاہر ہوتی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"کاش ہم کشمیر چلے جائیں، جہاں ہمیں کھانے کے لئے اچھی خوراک مل سکتی ہے"

عہد ماضی میں کافی عرصے تک یہ وادی علم اور کلچر کا اہم مرکز رہی ہے۔ آب وہوا اور زمین کی زرخیزی بہت حد تک اس کے لئے ذمہ دار ہے۔ یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جہاں لوگوں کے پاس کافی کھانے کے لئے ہے اور اچھی آب وہوا ہے۔ وہاں لوگ آرام کے طویل لمحات میں ذہنی تحقیق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کشمیر کے باشندے سانپ کے پجاری تھے اور براہمنوں کے آباد ہونے کی وجہ سے انہوں نے پوجا کا یہ طریقہ رفتہ رفتہ چھوڑ دیا۔ یہ تبدیلی بغیر کسی تلخی یا جبر کے عمل میں آئی تھی۔ بعد ازاں دوسری صدی (قبل از مسیح) میں بدھ مت عظیم مذہب بن گیا۔ اور بودھ فلاسفی اور خیالات سے کشمیر بہت حد تک متاثر ہوا تھا۔ ناگ ارجن ایسے صاحب علم یہاں آباد ہوئے اور وادی کشمیر کو اپنے علم کا مرکز بنایا۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ

اور او کانگ نے کشمیر کے مطالعے اور اس کے تمدنی ورثے کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے کشمیر کی طرف رجوع کیا۔ پھر چودھویں صدی کے بعد کشمیر میں اسلام مذہب کا ظہور ہوا، اور حسب معمول فراخ دل کشمیریوں نے اس کے مبلغوں کا خیر مقدم کیا۔ حضرت شاہ ہمدان اور ہندو اور اسلامی فلسفے کا امتزاج پیش کرنے کے لیے للیشوری اور شیخ نورالدین ایسے عظیم صوفی میدان میں آئے۔ ہندو اور مسلمان آج بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔

آب و ہوا کی طرح ریاست کی آبادی میں بھی فرق ہے۔ اس کے باشندوں کی تخصیص اندازاً اس طرح ہو سکتی ہے۔ بنہال کے راستے میں جموں سے ادھم پور تک ڈوگرے ہیں۔ بھمبر سے پیر پنچال درہ تک چبلی ہیں، اور وہاں سے آگے چل کر بنہال درے تک کشتواڑ، بدرواہ وغیرہ کے پہاڑی لوگ ہیں۔ پیر پنچال اور بنہال دروں کے پار اور کل کشمیر وادی میں کشمیری رہتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے بلتی اور لداخی قبیلے رہتے ہیں۔ لارفی کی اپنی علیحدہ زبان اور بولی ہے۔ اُس کا خاص طرز کا لباس، نسلی اور جسمانی وضع قطع اسے ڈوگروں سے ممیز کرتی ہے۔ اسی طرح ڈوگروں کی بھی زبان، لباس کا طریقہ اور دیگر کئی باتیں خاص طرز کی ہیں۔ بالکل اسی طرح کشمیریوں اور پہاڑیوں کی اپنی علیحدہ خصوصیات ہیں جو انھیں دوسرے طبقوں سے جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ لداخ اور بلتستان کے لوگ تورانی نسل سے اور باقی لوگ آریہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

علاقے کی طرح ریاست کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ ریاست کے مختلف حصوں کی اپنی خاص زبان ہے اور ہر زبان اپنی تاریخ کا نچوڑ ہے۔

ان اختلافات کے باوجود کشمیری تاریخ کے مختلف مراحل ہیں۔ تمدنی وابستگی کی بنا پر ایک قوم کی حیثیت سے زندہ ہے۔ اس وادی کے ہر ایک خطے نے ریاست کے تمدنی خزانے میں بہترین اضافہ کیا ہے۔ بسوہلی اور گندھارا سکول آف آرٹس کی ترقی میں کشمیریوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اور لداخ کی یادگار عمارتوں کے فن تعمیر کے مختلف اسالیب اُن عظیم الشان ادوار کے ضامن ہیں جن میں سے ریاست گزری ہے۔ کشمیر کے قدرتی حسن کا اثر مصوری اور دیگر صنعتوں میں بہت نمایاں ہے۔

جموں اور کشمیر ریاست پنجاب کے انتہائی شمالی میدانوں کے ہموار ٹکڑوں سے شروع ہوتی ہے۔ شروع کے اس خطے کی جغرافیائی وضع قطع وہی ہے جو کہ پنجاب کی ہے۔ یہ ٹکڑا کچھ زیادہ لمبا نہیں ہے۔ میدانی علاقے کا کچھ فاصلہ طے کرنے کے فوراً ہی بعد متوازی پہاڑوں کی بلند چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ پہاڑیاں سمندر کی سطح سے ۲۰۰۰ فٹ سے لے کر ۴۰۰۰ فٹ کی بلندی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس خطے کے مشرق میں دریائے راوی اور مغرب میں دریائے جہلم بہتے ہیں۔ دو چھوٹے دریا توی اور ابھہ بھی اسی میں سے گزرتے ہیں۔

جموں کا ضلع اس علاقے میں سب سے بڑا ضلع ہے۔ جموں شہر سمندر کی سطح سے ۱۲۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک پہاڑی ڈھلوان پر واقع ہے۔ نکیلے کلس والے چھوٹے اور بڑے مندر اس شہر کی نمایاں خصوصیات میں شامل ہیں۔ سردی کے موسم میں ریاست کا دارالحکومت سری نگر کی بجائے جموں ہو جاتا ہے۔

یہ علاقہ معدنیات کا خزانہ ہے۔ کوئلے کی کانیں کافی عرصہ ہوا دریافت کی جا چکی ہیں۔ ایلومینیم کی دھات، تانبا، جست اور سکے وغیرہ کی دریافت نے کوئلے کی اور زیادہ اہمیت بڑھا دی ہے۔

اسی طرح سنہ ۱۹۲۵ء میں راجوری کے علاقے میں بھی لوہا دریافت کیا گیا تھا۔ لوہا دریائے چناب کے داہنے کنارے پر ستہ گاؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ریاست کا دوسرا قدرتی حصّہ درمیانی پہاڑی علاقے کے نام سے موسوم ہے۔ اس ٹکڑے کی بلندی سمندر کی سطح سے ۴۰۰۰ فٹ سے لے کر ۱۲۰۰۰ فٹ تک ہے۔ اس علاقے کے شمال میں یہ مقامات ہیں۔ بدرواہ، کشتواڑ، پاڈر، وغیرہ وغیرہ۔ کشتواڑ اور بدرواہ میں ریاست کے بہترین جنگلات ہیں جو چیڑ، دیودار، صنوبر، شاہ بلوط وغیرہ سے بھرے پڑے ہیں۔ مکئی، چاول، باجرہ، جو اور گندم، اس علاقے کی بڑی بڑی فصلیں ہیں۔ ان فصلوں کا انحصار زیادہ تر بارش پر ہے۔ لیکن چاول کی پیداوار کے لئے یہ بارش کافی نہیں ہے۔ اگر آبپاشی کے ذرائع ریاست کے اس حصّے میں پورے طور پر میسر آ جائیں تو یہ علاقہ مالا مال ہو جائے۔

پھلوں کے درخت مثلاً سیب، ناشپاتی، شہتوت، آڑو، خوبانی وغیرہ بھی یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اس جگہ کے لوگ ہندو اور مسلمان دونوں خوش رو ہیں، اور نہایت سادہ گھریلو زندگی بسر کرتے ہیں۔

پہاڑوں سے گھرے ہوئے سرد علاقے میں رہنے کی نسبت سے لوگ اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ کشتواڑ کی بھیڑیں اور بکریاں اپنی عمدہ اور ملائم اون کے لیے بہت مشہور ہیں۔ اس خطے کے پہاڑوں اور وادیوں میں بھیڑ بکریاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لوگ لمبے ڈھیلے پائجامے اور کوٹ پہنتے ہیں۔ اپنی کمر کے گرد وہ ایک اونی پیٹی باندھ لیتے ہیں، جو انھیں سخت محنت کے لیے جس کے وہ عادی ہیں چست اور پھرتیلا بنا دیتی ہے۔ یہاں کی عورتیں بھی محنت کش ہیں۔ ایک اونی چغہ

پائجامہ اور کرکے گرد اونی پیٹی اُن کا لباس ہوتا ہے۔

گوجر ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے۔ جو پہاڑوں پر مویشیوں کو پالتا ہے، اُن لوگوں کا کوئی مستقل گھر نہیں ہے۔ کشمیر کے پہاڑوں پر بھی گوجر پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ لمبے، مضبوط اور محنت کش ہوتے ہیں۔ کشمیر کے گوجروں کی زبان کشمیری اور راجستھانی زبان کی ملی جُلی شکل ہے۔

وسطی پہاڑوں سے ہم بلند پہاڑوں کے علاقے میں آتے ہیں۔ ایک سبز طشت سے مشابہ وادیٔ کشمیر ان پہاڑوں کی لپیٹ میں ہے۔ ریاست کے اس نگار ہیں حصّے کے سلسلہ ہائے کوہ کی وسیع حدود جنوب اور جنوب مغربی سمت میں ۸۰۰۰ فٹ سے لے کر ۱۵۰۰۰ فٹ تک اونچے پہاڑ پیر پنجال سے شروع ہوتی ہیں۔ اس صف میں بنہال بھی شامل ہے جو ۹۲۰۰ فٹ اونچا ہے۔

پیر پنجال سے ذرا آگے شمال کی طرف ۱۴۰۰۰ فٹ بلند سبزہ زار "توش میدان" اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس پہاڑی سرزمین کی چراگاہوں پر خوش باش گلہ بان بالعموم آتے جاتے رہتے ہیں۔ شمال مغربی سمت سے اور آگے قاضی ناگ نظر آتا ہے، جہاں "مارخور" کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہ ۱۲۲۱۵ فٹ بلند ہے اور برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ اس کے ڈھلان گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ وادی کے جنوب میں ۱۰۳۲۹ فٹ بلند امرناتھ اور کولاہائی کی چوٹیاں اسی سلسلۂ کوہ سے اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی صف میں جگہ جگہ خوش نما جنگلی پھول، جنگلی گلاب۔ پوست اور ہلکے رنگوں کے پھول اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ شمال مشرق میں ہرمکھ پہاڑ واقع ہے۔ ۲۶۶۳۰ فٹ اونچے نانگا پربت کی بلند قامت چوٹی آغازِ آفرینش سے وادی کے پہرے دار کی حیثیت سے کھڑی ہے۔

یہ پہاڑ ریاست کو بے مثل دلکشی عطا کرتے ہیں، اور اس قدرتی حسن کے اعتبار سے کشمیر سوئیٹزرلینڈ سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

کشمیر جھیلوں، دریاؤں اور پھولوں کی سرزمین ہے۔ تازہ پانی کی جھیلوں اور پہاڑی جھیلوں کے لئے کشمیر تمام دُنیا میں مشہور ہے۔

دل لُبھانے والے پہاڑوں کے پس منظر کے بالمقابل وادی میں وُلر جھیل، ڈل جھیل اور مانس بل جھیل واقع ہیں۔ وُلر جھیل ہندوستان میں تازہ پانی والی سب سے بڑی جھیل ہے۔ بارہ میل سے زیادہ لمبی اور پانچ میل چوڑی یہ جھیل دامنِ کوہ میں سری نگر کی مشرقی سمت میں واقع ہے۔ مشرق میں ڈل جھیل دامنِ کوہ میں سری نگر کی مشرقی سمت میں واقع ہے۔ یہ جھیل ۴ میل لمبی اور ۲½ میل چوڑی ہے۔ پہاڑی پس منظر کا عکس اس کی خاموش وسعتوں پر پڑتا ہے اور درختوں سے ملفوف یہ جھیل بے پناہ حسین نظر آتی ہے۔ مانس بل جھیل تمام ریاست کی جھیلوں میں سے گہری جھیل ہے۔ اس کا ہریالا اور نیلا پانی مناظرِ قدرت کا رنگین آئینہ ہے۔

ان جھیلوں کے علاوہ جو پہاڑوں سے نیچے بہتی پگھلتی برف کی ندیوں سے پانی حاصل کرتی ہیں، کشمیر میں گلیشیر، ورنہ پہاڑی جھیلیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیر کی وادی پہاڑوں اور جھیلوں کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ دریائے جہلم اپنے ہموار راستے پر چکر لگاتا ہوا اناج کے کھیتوں میں ہو کر سری نگر کے وسط سے گزرتا ہوا نکل جاتا ہے جس کے بعد پہاڑوں کے خوفناک دروں میں سے سرپٹ بہتا ہوا پنجاب کے میدانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

وادی کے باشندے کشمیری کہلاتے ہیں۔ اور آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کشمیریوں کے چہروں کے نقوش بہت تیکھے ہوتے ہیں۔ جسمانی لحاظ سے یہ لوگ کافی لمبے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ کچھ محققین کا یقین ہے کہ کشمیری یہودی قوم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مجموعی حیثیت سے کشمیریوں میں آریوں کی وضع قطع نمایاں ہے۔

مسلمان اور برہمن وادیٔ کشمیر کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ہیں۔ کشمیری عورت کے حسن کی قدیم زمانے سے ستائش کی جا رہی ہے۔ اس وادی کی زبان کشمیری ہے۔ ماہرین کے نزدیک کشمیری زبان کی بنیاد "داردک" ہے۔

کشمیریوں کا لباس ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ ہوتا ہے جس کو فرن کہتے ہیں۔ پھیلاؤ اور طرز میں عورتوں کا فرن مردوں سے علیٰحدہ ہے۔ مردوں کے سر کا لباس پگڑی ہے۔ گو نوجوان طبقہ ننگے سر رہنے یا ٹوپی پہننے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہندو عورتوں کے سر کا لباس مسلم عورتوں سے مختلف ہے۔ وہ اپنی کمر کے گرد سوتی سربند کا ٹکڑا باندھتی ہیں، جو اُنھیں چُست اور پھرتیلا رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس لباس کو مغلوں نے رواج دیا تھا۔

کشمیر ایک زراعتی ملک ہے۔ دستکار، جولاہے اور بہت قلیل تعداد میں وہ لوگ ہیں جو دفاتر اور دیگر اداروں میں ملازمت کرتے ہیں۔ کشمیر کا ہنر اور فن تمام دنیا میں مشہور ہے۔ کشمیری شال۔ لکڑی پر کھدائی۔ چاندی اور تانبے کا کام عمدہ مذاق اور فن کے معیار کو اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں۔ ان

اشیا پر پھولوں یا جانوروں کی نقش و نگاری یہاں کے قدرتی ماحول سے متاثر ہے۔ کشمیری مشاق خوش نویس تھے اور مغل دربار میں اس فن کے لئے بہت مشہور تھے۔ صرف آرٹ ہی نہیں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کشمیریوں نے معرکتہ الآرا خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ مثال کے طور پر ادب کی دنیا میں ریاست نے ادیب، شاعر اور فاضل اشخاص پیدا کئے ہیں۔

چاول کشمیریوں کی خاص خوراک ہے۔ اس کے علاوہ وادی میں دھان، گندم، مکئی اور جَو پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی تجارت برآمد کا بڑا حصہ پھل ہیں۔ گاؤں میں شہتوت کے پتوں سے ریشم کے کیڑوں کو پالا جاتا ہے۔ کشمیر سلک فیکٹری اپنے ریشمی تار کے لئے مشہور ہے۔ چھوٹی فیکٹریاں اور گھریلو صنعتیں، قالین، نمدے، گبے، بید کی ٹوکریاں اور کرسیاں تیار کرتی ہیں۔

وادی سے پرے، لداخ، لاماؤں کا گھر، بلتستان، اور داردستان کے علاقے ہیں۔ یہ تمام پہاڑی علاقہ ہے، اور اس کی اونچائی سمندر کی سطح سے ۸۰۰۰ فٹ سے لے کر ۲۵۰۰۰ فٹ کے درمیان ہے۔ یہ وہ جگہ ہے، یہاں قطب شمالی کے علاقے کی سی سردی محسوس ہوتی ہے۔ انتہائی آب و ہوا اور کم پیداوار کی بنا پر آبادی بکھری ہوئی ہے۔ پہاڑوں کی رکاوٹ کی وجہ سے یہ علاقہ باقی تمام ریاست سے الگ تھلگ ہے اور سڑک کے ذریعے سے رسل و رسائل آسان نہیں ہے۔ اب ہوائی جہازوں کی رسائی نے لداخ، اور اس علاقے کے دیگر حصوں کو ریاست کے دارالخلافے اور ہندوستان کے بھی زیادہ قریب کر دیا ہے۔

لداخ کی آب و ہوا بہت شدید ہے۔ راتیں بہت سرد اور دن بہت گرم ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کا رُخ ہواؤں کے بالکل سامنے ہے۔ لہٰذا بارش نہیں ہوتی۔ لداخی زیادہ تر کم بلندی والی زمین کو کاشت کرتے ہیں۔ جو کہ زرخیز ہے۔ گندم، جو، گھوڑوں اور مرغیوں کے کھانے کا اناج، مٹر، سرسوں کے بیج۔ لوبیا، شلغم وغیرہ یہاں پیدا ہوتے ہیں۔

لیہہ، لداخ کا دارالخلافہ ہے۔ یہ وسطی ایشیا سے تجارت کا ایک اہم مرکز ہے۔ جنگلی بکریاں پہاڑوں کی بلندیوں پر پائی جاتی ہیں۔ اُن کی اُون عمدہ اور نرم ہوتی ہے۔ اور اسی سے کشمیری شال بنتے ہیں۔

لداخ کے لوگ تبتی نسل سے متعلق ہیں۔ یہ لوگ سادہ ہیں۔ بر خود غلط نہیں ہیں۔ خوش باش اور مہمان نواز ہیں۔ لمبا اور ڈھیلا اونی کوٹ۔ روئی کی تہ والی ٹوپی جو سر کے علاوہ کانوں اور گردن کو بھی ڈھانپتی ہے، اُن کے لباس میں شامل ہے۔

یہ لوگ نمدے والے جوتے پہنتے ہیں۔ اگرچہ عورتوں میں ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کا رواج وہاں قائم ہے۔ لوگ عورتوں سے تعظیم کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ انہیں سماجی آزادی حاصل ہے۔

لداخی دھرم کے لحاظ سے بودھی ہیں۔ خانقاہوں کو "گُمپا" کہا جاتا ہے۔ اور یہ چھوٹی اور بڑی گمپائیں تمام لداخ میں پائی جاتی ہیں۔ ان مندروں کا فنِ تعمیر قابلِ دید ہے۔ مشہور ہمیس ناچ بہت دلچسپ ہے اور لوگ بہت زیادہ تعداد میں اسے دیکھتے ہیں۔

اس علاقے کا ایک اور حصہ سندھ کی پہاڑی وادی ہے۔ جسے بلتستان کہا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۲۲۵۰۶ مربع میل ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کو بلتی کہا جاتا ہے۔ آب و ہوا سے قطع نظر جو کہ سردیوں میں شدید سرد اور گرمیوں میں خشک اور گرم ہوتی ہے۔ یہ بھی ہمالیہ کی دوسری وادیوں کی طرح دلآویز ہے۔ برف باری اتنی شدید نہیں ہوتی جتنی کشمیر کے دوسرے علاقوں میں ہوتی ہے۔ گرمیوں میں دن گرم اور راتیں سرد ہوتی ہیں۔ جو پہاڑ اس کے شمال اور مشرق کی طرف ہیں، دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بلتی، تبتی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سادہ اور تصنع سے مبرا زندگی بسر کرتے ہیں۔ زیادہ تر یہ لوگ اَن پڑھ ہیں۔ یہ محنت کش اور ہمتی لوگ کم منزلوں اور چپٹی چھتوں والے گھروں میں رہتے ہیں۔ یہاں کے دیہاتی گائے اور جنگلی بیل کی نسل سے دوغلا "زو" نام کا ایک جانور پالتے ہیں۔ عقیدے کے لحاظ سے لوگ مسلمان ہیں۔ شیعہ طبقہ برتری رکھتا ہے۔

پولو، بلتستان کا قومی کھیل ہے۔ یہ موسیقی اور ڈھول کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں بلتستان کے لمبے اور تنگ راستے پولو کے لئے بہترین کھیل کے میدان ہیں۔

بلتستان کی معیشت کا بہت بڑا جزو اس کے پھل ہیں۔ سکردو میں پھلوں کی پیداوار لداخ سے زیادہ ہے۔

خوبانی، سیب، ناشپاتی، انگور، خربوزہ یہاں زیادہ تر اُگتے ہیں۔ خوبانی اور نیزہ شکہ (انگور کی ایک قسم)، دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں، اور غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔

برف کا تیندوا، لال ریچھ، پہاڑی بکرا وغیرہ وغیرہ شکار یہاں بکثرت ملتے ہیں۔ (انگریزی سے ترجمہ۔ مترجم منموہن تلخ)

دیوندر ستیارتھی

بنسری کہتی ہے

ایک کشمیری لوک گیت

بنسری کہتی ہے - ایک ایسا کشمیری لوک گیت ہے جسے گیتوں کے کسی بھی بین الاقوامی انتخاب میں آسانی سے جگہ مل سکتی ہے - اس گیت کی پکار بہت کچھ اس افسانے کی اس کہانی میں بیان کئے گئے گیت سے ملتی ہے جس کا ترجمہ برٹش مفد 'گرشلا گرل' کے عنوان سے پیش کیا ہے - الف لیلے کی اس کہانی میں بنسری کی بجائے رینا اپنا رونا روتی ہے - اس کہانی میں مریم جب علی نورالدین سے تھیلہ لے کر اسے کھولتی ہے اور اسے جھاڑ کر دیکھتی ہے تو کاٹھ کے تیئیس ٹکڑے نکل کر گر پڑتے ہیں - پھر جب مریم ان تیئیس ٹکڑوں کی چولیں آپس میں جوڑ کر دیکھتی ہے کہ یہ تو ہندوستانی رینا ہے - تو وہ اپنی کلائیوں سے کپڑا ہٹا کر اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتی ہے اور اس پر جھک جاتی ہے جیسے ماں اپنے ننھے پر جھک جاتی ہے اور اپنی انگلیوں سے اس کے تاروں کو جھنجھنانا شروع کر دیتی ہے - رینا رونے لگتی ہے بلکہ اپنی جنم بھومی کی یاد میں اس کے آنسو تھمائے نہیں تھمتے - اسے اس پانی کی یاد آتی ہے جسے پی کر وہ بڑی ہوئی - اس دھرتی کی یاد آئی جہاں اس نے جنم لیا اور بڑی ہوئی - اسے وہ بڑھئی یاد آیا جس نے اسے تراشا ' رنگ ساز یاد آیا جس نے اسے چمکایا - وہ بیوپاری یاد آئے جنھوں نے اسے پردیس میں جلنے والے نال کے ساتھ لادا - وہ جہاز یاد آیا جو اسے سمندر کے پار لے آیا - وہ روتی چلاتی اور پکار کرنے لگی - جیسے واقعی یہ لڑکی اس سے اس کی آپ بیتی سننے کے لئے بیتاب ہو رہی ہو اور وہ اب اپنے گیت میں ہر بات کا جواب دئے جا رہی ہو۔

بنسری کہتی ہے کا کشمیری عنوان ہے 'ونہ بتر کتھ' [بنسری کی کتھا] یہ کشمیری لوک گیت پہلے پہل آرل شائن نے اپنی مشہور کتاب 'حاتمس ٹیلز' کے لئے ۱۸۹۶ء میں حاتم نامی ایک کشمیری کسان سے سن کر قلمبند کیا تھا بدقسمتی سے شائن کی کتاب کے مسودے سے کچھ حصہ ضائع ہو گیا تھا - چودہ برس بعد جب شائن نے دوبارہ کشمیر کا دورہ کیا اور حاتم سے اس کے گاؤں میں جا کر ملاقات کی اور اپنے ادبی دوبارہ شائع کے نتیجے سے اسے وہ 'ونہ بتر کتھ' والا گیت دوبارہ سنانے کو کہا - تو شائن کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ حاتم نے اپنے گیت میں ایک بھی لفظ ادھر ادھر نہیں ہونے دیا -

اب اس کشمیری لوک گیت کا جائزہ لیجئے -

اصل کشمیری	ترجمہ
[۱] بمہ یس دود تس چھوہ پانس تہ ننان	[۱] بیمار آدمی اپنے درد کو خود ہی بتا سکتا ہے
نئے ہند دود نئے چھ پانسے تہ دنان	بنسری کا درد بنسری خود کہتی ہے -
[۲] نئے چھ وہان یار صاحب چھوہ کرنے	[۲] بنسری کہتی ہے خدا ایک ہے
دے لڑکہ نش پانس چھوہ بیونے	خدا اپنے کو غصے سے الگ رکھتا ہے
[۳] نئے چھ وہان یار صاحب مناجات	[۳] بنسری کہتی ہے خدا پاک ہے
پانس کن چھوہ مشتاق دوہ تہ رات	وہ اپنا ہی مشتاق ہے دن رات
[۴] حمد کرزہ تس خدائس کن پرہ	[۴] اس خدا کی حمد پڑھنی چاہیئے
پیدہ کرن تہ محمد میزبان	جس نے محمد جیسا میزبان پیدا کیا
[۵] یار صاحبن سیت دیتنس سامان	[۵] خدا نے اس کے ساتھ سامان دئے
شعد یار چھس سیت سیت غربان	یار دوست اس کے ہمراہ زیب دیتے ہیں
[۶] نور تسندہ پیدہ کرن آدم	[۶] اس کے نور سے آدم پیدا ہوا -

اصل کشمیری	ترجمہ
[۲۸] نئے چھ دیان نیستان میون کیاہ زِیہہ	[۲۸] بنسری کہتی ہے میرا نیستان کتنا سندر ہے
زانیہ کماہ تتھ ما نیہ بُذ تھ بے خبر	کوئی بے خبر اس کا مطلب کیا سمجھے گا
[۲۹] نئے چھ دیان نیستانچ لیس چھ زان	[۲۹] بنسری کہتی ہے نیستان کی جسے خبر ہو
زانہ سو ئے ییس آسہ ووت منزلہ مکانؐ	اسی کو خبر ہوگی جو لا مقام کو پہنچ گیا ہو
[۳۰] نئے چھ دیان کیاہ چھ دِپن تر مثنوی	[۳۰] بنسری کہتی ہے یہ مثنوی بھی کیا خوب کہی گئی ہے
زانہ سوئے ییس آسہ پھیوژ عشق چھیپہ	وہی سمجھ سکتا ہے جس پر عشق کی گونا ٹپکی ہو
[۳۱] نئے چھ دیان مدرس کا پیاہ چھوان	[۳۱] بنسری کہتی ہے یہ میٹھی شراب قسمتی لوگ پیتے ہیں
صدر بل نئے بحان چھوتئی دنان	صدر بل میں سبحان ہی بنسری کی لے سُناتا ہے

یہ گیت یقیناً صوفی نظریے کا حامل ہے۔ اس کے برعکس الف لیلیٰ کی کہانی میں دینا کا گیت دنیا کے عشق و محبت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے میں ایک پیڑ تھی ——— بلبل کا
بس کے بیٹے میں اپنا گھاس جیسا ہرا سر جھکا دیتی تھی
بلبل میرے لئے روتی تھی اور میں سمجھتی تھی اس کا رونا
اس کے رونے میں ہی پڑھ لیا سب لوگوں نے میرا راز
مگر ہمارے کلہاڑے کی چوٹوں سے مجھ کاٹ گرایا
اور [جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں] مجھے ایک پتلی دینا میں بدل ڈالا
پر جب انگلیاں میرے تار چھیڑتی ہیں نہ بتاتی ہیں۔
کیسے میرے صبر کے باوجود انسان نے مجھے مار ڈالا
اس لئے جب ناز کے ساتھ میرے لا پاسنتے ہیں
موم کی طرح الگ ہوتے ——— جیسے بہکے ہوئے شرابی ———
اور اللہ ہر کسی کو میرے لئے نرم بنا دیتا ہے
اور اونچے سے اونچے مقام پر ہے میری پہنچ
خوشی سے مجھے کرتے تقاضا ہیں ———
نازنین اور حور صفت کنیزیں
ہرنی ایسی آنکھوں والیاں!
یا اللہ! عاشق کی خوشی میں خلل نہ پڑے
بے رحم عاشق کو معاف نہ کرنا جو بے دردی سے بھاگ گیا ہو۔

اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ مثنوی مولانا روم کا آغاز بھی بنسری کی کہانی سے ہوتا ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند ——— وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ——— از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ——— تا بگویم شرح دردِ اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش ——— باز جوید روزگارِ وصل خویش
من بہ ہر جمعیتے نالاں شدم ——— جفتِ خوش حالاں و بد حالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من ——— از درونِ من نجست اسرارِ من
سِرِ من از نالۂ من دور نیست ——— لیک چشم و گوش را آں نور نیست
آتش عشق است کاندر نے فتاد ——— جوشش عشق است کاندر مے فتاد
ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید ——— ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید
نے حدیث راہ پر خوں می کند ——— قصہ ہائے عشقِ مجنوں می کند

ترجمہ:-

تو بنسری سے سُن کس طرح حکایت بیان کرتی ہے۔
اور جدائی کی شکایت کرتی ہے۔
جب سے مجھے نیستان سے کاٹ ڈالا ہے۔
اس وقت سے میری آواز پر مرد و زن روتے آئے ہیں۔
میں چاہتی ہوں کہ میرا سینہ فراق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔
تاکہ میں اشتیاق کے درد کی شرح بتا سکوں۔
ہر آدمی جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے
اپنے وصل کے دنوں کی تلاش میں پھرتا ہے۔
میں ہر محفل میں روتی رہی۔
خوشحال اور بدحال لوگوں کی صحبت میں گھومتی رہی
ہر آدمی اپنے گمان سے میرا دوست بن گیا۔
اس نے میرے باطن کے راز کو نہ پایا۔
میرا راز میرے رونے سے دور نہیں ہے۔
لیکن کسی کی آنکھ اور کان میں وہ نور نہیں ہے۔
یہ عشق کی آگ ہے جو بنسری کے اندر رکھی گئی ہے۔
یہ عشق کا جوش ہے جو بنسری کے اندر رکھا گیا ہے
بنسری کی طرح کا زہر اور تریاق کس نے دیکھا ہے۔

بنسری کی طرح دوست اور مشتاق کس نے پایا ہے۔

بنسری خون سے بھرے ہوئے (عاشق کے) راستے کی حکایت بیان کرتی ہے۔

مجنوں کے عشق کے قصے بیان کرتی ہے۔

اس تقابلی مطالعے سے کشمیری لوک گیت کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اگرچہ "بنسری کہتی ہے" پر صوفی رنگ غالب ہے۔ لیکن ہم اس گیت کو اس رنگ سے الگ کرکے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جو لوگ یہ گیت گاتے ہیں، یقیناً وہ اسے اپنی روزمرہ کی زندگی کے سلسلے میں ڈھال کر گاتے ہیں۔ اور جب وہ بنسری کا گیت گاتے ہیں تو بنسری کی پکار میں ان کی اپنی زندگی کا درد بول اٹھتا ہے جس میں ان کی عشق و محبت کی داستان کے ساتھ غم روزگار بھی ابھر آتا ہے اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں کوئی بھی لوک گیت نہ صرف جنتا کے دل و دماغ کی غمازی کرتا ہے بلکہ دکھ درد اور آشا نراشا کی پگڈنڈی پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ جب کشمیر کا کوئی مزدور اپنی جنم بھوم سے دور غم روزگار کے سلسلے میں مزدوری کرنے آتا ہے تو وہ بنسری کے گیت میں خود ہی بنسری کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ اس وقت بنسری اپنی بانس باڑی کی یاد میں آنسو نہیں بہاتی۔ بلکہ وہ شخص بنسری کے علاوہ خود ہی اپنی جنم بھوم کی یاد میں کھو جاتا ہے۔

نغمۂ فردوس

ادھر اک وارثِ اورنگِ اکبر	جلوسِ خسروی فرما رہا تھا
شہِ جم جاہ نور الدین جہانگیر	شکوہِ بزمِ جم دکھلا رہا تھا
ادھر نور جہاں کا جلوۂ حسن	در و دیوار کو چمکا رہا تھا
فروغِ عارضِ مہر النسا سے	جمالِ یوسفی گہنا رہا تھا
وہ حسن و عشق کا مغلی مرقع	زمانے کو دکھایا جا رہا تھا
ادھر محو نوا سرمست مطرب	سرودِ آسمانی گا رہا تھا
وہ تارِ چنگ پر ربط کی تڑپ سے	رگِ جاں میں لہو دوڑا رہا تھا
وہ تھی دربار کی شان آشکارا	کہ بندوں کو خدا یاد آ رہا تھا
یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا	سروشِ غیب یہ فرما رہا تھا

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

[illegible] ناظر

میر غلام رسول نازکی

غنی کاشمیری

کشمیر کی یہ ایک خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ اس کا زاویۂ فکر و نظر زندگی کے ہر شعبہ میں بہت وسیع رہا ہے اور اس نے کبھی تنگ دامانی اور تنگ نظری سے کام نہیں لیا یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں جو بھی نئی چیز آئی ہے۔ اگر اس میں خوبیاں تھیں تو کشمیر نے نہ صرف اس کو اپنایا۔ بلکہ اس کو ترقی دیکر اوجِ بامِ عروج پر پہنچایا۔ چنانچہ جب ہم کشمیر کی تاریخ کے مختلف ادوار پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ کشمیر نے جس نئی تہذیب کو دیکھا اس کو اتنا اوج عطا کیا کہ خود وہ لوگ بھی حیران رہ گئے۔ جو اس تہذیب کو لے کر کشمیر آئے تھے۔ کشمیر میں جب اسلام آیا تو اس میں جو خوبیاں تھیں وہ کشمیر نے فوراً قبول کیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں میں علم و فضل، جوشِ حریت، خودداری اور تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کا زبردست جذبہ موجود تھا۔ چنانچہ انھیں چیزوں نے کشمیر کو متاثر کیا اور یہاں کی اکثریت مسلمان ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان تمام خصائل کو کشمیر نے اپنا لیا جو اس دور کے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھے۔ اس دور کے کشمیر پر نظر ڈالنے سے صاف واضح ہوگا کہ کشمیر میں علم و فضل، ہنر اور صنعت، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے اعلیٰ نمونے کشمیر نے پیدا کئے۔ مسلمانوں کے کشمیر آتے ہی یہاں فارسی اور عربی زبانوں کا پرچار ہوا۔ عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی اور فارسی سرکاری زبان۔ اس کے علاوہ کشمیر کا فارسی زبان کے ساتھ جو گہرا رابطہ رہے وہ یہ ہے کہ کشمیر میں سب سے پہلے اسلام کی مشعل کو فروزاں کرنے والے جناب امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ ایران کے ایک شہر ہمدان کے رہنے والے تھے۔ آپ کی مادری زبان فارسی ہی تھی بلکہ وہ اس زبان کے بہت بڑے بلند پایہ عالم، شاعر اور محقق بھی تھے۔ چنانچہ کشمیر میں حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس وقت بھی نہ صرف بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے بلکہ تبرکاً اس کا ورد بھی کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے کشمیر کو ایک ایسی تہذیب دی جس کے لئے کشمیر ان کا ممنون رہے گا۔ یہ تہذیب ایران و عرب کی تہذیب کا ایک دلفریب امتزاج تھی۔ کشمیر آ کر اس میں مقامی رنگ بھی چمکا اور یہ شراب آتشہ ہوکر دنیا والوں کے فکر و نظر کی حرارت کا باعث بن گئی

فارسی کشمیر آئی تو زندہ رہی۔ نہ صرف زندہ رہی بلکہ کشمیر کے شاداب اور زرخیز دماغوں نے اس کو وہ وسعت اور ترقی دی کہ خود ایران بھی حیران ہوا کہ یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ اس زبان میں کشمیر نے وہ عظیم المرتبت ادیب، مؤرخ شعرا اور نثر نگار پیدا کئے۔ کہ خود ایران کے چوٹی کے قلم کاروں کو بھی ان کی عظمت کا لوہا ماننا پڑا۔ تعجب یہ ہے کہ فارسی کشمیر میں مسلمانوں کے ساتھ آئی مگر کشمیر کے ہندوؤں نے اسے اس طرح اپنایا کہ خود مسلمان بھی اس کا مقابلہ بہت کم کر سکے۔ دیری اور بعدوانی اس کا چند درخشندہ مثالیں ہیں جن کو ہماری تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ شعراء میں سے جو شخص خاص طور پر علم و ادب کے مطلع پر آفتاب عالم تاب بن کر چمک رہا ہے۔ اور جس کی ضیا پاش کرنوں سے فارسی ادب کا سارا احول تابناک ہے۔ وہ کشمیر کا مفلوک الحال گمنام اور جوانمرگ ملا زادہ ہے جس کا نام محمد طاہر اور تخلص غنی ہے۔ جس نے فارسی ادب کے دامن میں وہ انمول ہیرے جڑے ہیں جن کی قیمت دنیائے ادب کے کسی خزانے میں نہیں مل سکتی۔ جیسا کہ میں ابھی اشارۃً عرض کر چکا ہوں۔ غنی نے گمنامی میں زندگی بسر کی اور باوجود تحقیق و تفتیش آج تک اس کی زندگی کے حالات منظر عام پر نہ آ سکے سوائے اس کے اس کا سال وفات معلوم ہے اور آج جب قوم آزاد ہے ان

لک اپنے جوہر یا سخن کو تیغ جلاوے کرتا ہے تاکہ جلانا چاہتا ہے وہ اس کا وہم وقت تک نہیں سنا سکتی کیونکہ ان کے انتقال کی تاریخ کہیں محفوظ نہیں اصل میں غنی کی گمنامی کی ذمہ دار اس کی طبع بے نیاز ہے جو نام و نمود سے خائف اور ریا سے بہت ڈرتی تھی۔ اس نے کسی بادشاہ کی مدح سرائی میں اپنا جوہر لطیف برباد نہیں کیا۔ اس زمانے میں جب بادشاہوں کے درباروں تک پہنچنا ہی سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا اس نے اپنی جبین نیاز کسی کے آستانۂ ناز پر جھکنے کی مذموم کوشش نہ کی بلکہ جب اس کی پیش کش کی گئی تو اسے انتہا درجے کے استغنا اور بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ اور دونوں جہانوں کے بادشاہ کے آستانے کو چھوڑ کر مطلق العنان بادشاہوں کی چوکھٹ پر جھکنے سے صاف انکار کر دیا۔ غنی کے مزاج کا یہی رنگ ان کے کلام میں ہر وقت جھلکتا نظر آتا ہے ؎

گدا چوں یافت روزی خویش را واند سلیمانے　　　برائے مورِ لنگ آسیا تخت رواں باشد

یا

کاسۂ خود پر مکن زنہار از خوانِ کسے　　　داغ از احسانِ خورشید است بر دلِ ماہ را

یعنی اپنے کاسۂ گدائی کو اوروں کے لقموں سے نہ بھرو۔ اس سے تم ان کے ممنونِ احسان ہو جاؤ گے۔ چاند کے پاس اپنا نور نہیں وہ سورج سے اکتساب نور کرتا ہے اور دنیا دیکھتی ہے کہ اس احسان مندی سے اس کے دل پر ایک داغ ہے جو رہتی دنیا تک نہیں مٹے گا۔

اور اسی استغنا و بے نیازی کے اعتبار سے ملا محمد طاہر نے اپنے لئے غنی تخلص پسند کیا۔ اور اسی وجہ سے ان کے حالات خود ان کے ہم عصروں پر بھی ظاہر نہ ہو سکے۔ غنی کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ جن موضوعات پر فکر سخن کرتا ہے وہ اس دنیا کے ساتھ اور ہماری روزمرہ زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہ سوئی اور دھاگے سے سینکڑوں ڈرامائی معانی پیدا کر سکتا ہے۔ وہ چرخ و پکھ، پیدا اور پانی، قلم اور روشنائی، ہلال اور بدر، ناخن اور بند ناخن، کان اور آنکھ کے باہمی تعلق سے ایسے ایسے لطیف معانی تخلیق کرتا ہے کہ انسان کے فکر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور باتوں باتوں ہی میں وہ ان پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے کہ مذاق سلیم داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مقامی سے جب ہم غنی کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ پہلا آدمی ہے جس نے بادشاہوں کی مدح سرائی کے عوض عوام کی محرومیوں اور مایوسیوں کو محسوس کیا اور اس کے خلاف ایک خاموش احتجاج بھی کیا۔ زمانے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کا کھلے الفاظ ہی میں اعلان کر دے۔ اس لئے اس نے سر دلبراں کو حدیث دیگراں میں بیان کر دیا۔

کدام باز ندانم درآشیاں بندی است　　　کہ ہست جمع پر کاہ بالِ مرغاں را

معلوم نہیں کونسا شاہباز گھونسلا بنانے کی فکر میں ہے کہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے پر نوچے جا رہے ہیں۔ اور ان کو شہباز کے گھونسلے میں تنکوں کی بجائے لیا جاتا ہے۔ ایک اور شعر سنئے۔ ایک محکوم و مجبور اور لٹے ہوئے کسان کی حالت پر اس کو منطبق کیجئے تو دیکھئے کہ یہ کتنی واضح اور دردناک تفسیر ہے اس کی محرومی اور مایوسی کی۔

روزیٔ ما می شود آخر نصیبِ دیگراں　　　طالع برگشتہ ہمچوں آسیا داریم ما

ہمارا رزق اوروں کی نذر ہو جاتا ہے اور اس رنگ میں میری اور چکی کی قسمت ایک جیسی ہے۔ وہ بھی آٹا پیستی ہے تو اوروں کی خاطر میں بھی کام کرتا ہوں تو اوروں کے لئے۔

غنی کے ہاں اس قسم کے اشعار کی کوئی کمی نہیں اور حقیقت میں لوگ جانتے ہیں کہ یہ استحصال اور جبر کے خلاف ایک دل دوز چیخ ہے۔ اور اس اعتبار سے غنی موجودہ دور کے ترقی پسند احساسات کے موجد اول ہیں۔

غنی کے کلام کے تمام محاسن پر ایک سرسری نظر ڈالنا اور اس سے نمونے کے طور پر تھوڑا سا کلام بھی لے لینا اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں البتہ اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ غنی پر کچھ لکھنے والے کے لئے ایک مشکل یہ ہے کہ غنی کے کلام سے کونسا حصہ انتخاب کیا جائے کیوں کہ غنی کا سارا کلام انتخاب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دولت سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہ ہو کہ آج ہم اس پر رشک کر رہے ہیں مگر اس کا کلام اسے دو وقت کی روٹی بھی فراغت اور اطمینان، عزت اور خودداری کے ساتھ میسر نہ کرا سکا ؎

فیضِ معنی بہ مردِ سخن گو نمی رسد
از نافہ بوئے مشک بہ آہو نمی رسد

تتمہ۔

نئی دہلی کے ایرانی سفارت خانے سے ایک رسالہ انگریزی میں "ایران امروز" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یکم اپریل ۱۹۵۵ء کے شمارے میں غنی کاشمیری کے حالات اور کلام درج ہیں۔ انھیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

تاریخ ملا طاہر از قبیلۂ اشلۂ او شاگرد ملا محسن فانی بود - ارباب سخن معتقد اند کہ در سراسر کشمیر و ہند کسی بخوبی او شعر نگفتہ است - بیان اشعارش را میرزا محمد علی صائب تبریزی کہ خود نیز از بزرگان شعرای قرن یازدہم ہجری است جمع آوری نمودہ است - اشعار وے ساندہ زمعا ہنا رجیبت است - غنی ہمیشہ از شہرت طلبی گریزان بود و این مطالب را در اشعار خود ذکر نمودہ است -

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

سال وفات غنی ۱۰۷۹ ہجری است و یکی از معاصرین وی تاریخ وفات وی را چنین نوشتہ است

از قوت غنی گشت کہ وہ غمگین
ہر کس شدہ در ماتم او خاک نشین
تاریخ وفاتش ار پرسند بگو
پنہان شدہ گنج ہنری زیر زمین

غنی در کلام مصنوع استاد است یعنی شاعر در مصرعہ اول دعواے را پیش میآورد و در مصرع دوم در تائید دعوائے خود دلیل ذکر می کند

غزل

جاں را بکوئے دوست رواں میکنیم ما یعنی کہ کار عشق بجاں میکنیم ما
مطرب گر آرزوئے تو فریاد ما بود مانند نی بدیدہ فغاں میکنیم ما
نتواں چو زاہد از رہ خشکی بکعبہ رفت کشتی بہ بحر بادہ رواں میکنیم ما
مارا چو شمع مرگ بود خامشی غنی اظہار زندگی بہ زباں میکنیم ما

ایرانی شعرا میں صائب کا درجہ بہت ممتاز ہے بالخصوص تمثیلیہ شاعری میں لیکن روایت یہ ہے کہ صائب خود اس ضمن میں غنی کا معتقد تھا - یہ مقولہ مشہور ہے کہ غنی نے اپنا کلام سنایا تو ذیل کے شعر پر صائب نے بےخود ہو کر کہا تھا کہ اس شعر کے عوض اپنا پورا دیوان دینے کے لئے تیار ہوں ؎

حسن سبزے بہ خط سبز مرا کرد اسیر دام ہم رنگ زمیں بود گرفتار شدم

صائب نے غنی کے کلام کو تضمین بھی کیا ہے مثلاً

ایں جواب آں غزل صائب کہ می گوید غنی
یاد ایامے کہ ریگ حقوق ما سر پوش داشت

روایت ہے کہ صائب کا ایک مصرع — کہ از لباس تو بوئے کباب می آید — بیاض میں درج تھا - کسی نے غنی سے پہلا مصرع لگانے کو کہا تو غنی نے فوراً شعر کی تکمیل کر دی ؎

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

صائب نے پہلا مصرع سنا تو پھڑک گیا اور کہنے لگا کہ پورے دیوان کے مصرع ہائے ثانی خود لکھتا اور ہر شعر کا پہلا مصرع غنی سے کہلواتا تو لطف آجاتا - تمثیلیہ شاعری میں غنی کے مرتبے کو بعد کے شعراء نے بھی تسلیم کیا ہے - گرامی مرحوم ایک شاعر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

چناں تمثیل را دادہ رواجے کہ از فکر غنی گیرد خراجے

اب غنی کے کلام کا نمونہ دیکھئے -

عشق بر یک فرش بنشاند گدا و شاہ را سیل یکساں مے کند پست و بلند راہ را
بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را
بود در اضطراب از اہل عالم ہر کہ کامل شد طپیدن در میان جملہ اعضا قسمت دل شد
غنی از دولت دنیا نگردد عیب کس زائل کہ از نتواند از روئے محک بردن سیاہی را
نیست شہرت طلب آں کس کہ کمالے دارد ہرگز انگشت نما بدر نباشد چو ہلال
فیض حق بہ مرد سخن گو نمی رسد از نافہ بوئے مشک بہ آہو نمی رسد
در کمند بستن مضمون رنگیں لطف نیست کم دہد رنگ ار کسی بند و حنائے بستہ را
منگیں دست ہر کہ بہ ظاہر ملائم است پنہاں درون پنبہ نگر پنبہ دانہ را
جاں بہ لب از ضعف نتواند رسید من بزور ناتوانی زندہ ام
سعی بہر راحت ہمسائگاں کردن خوش است بشنود گوش از برائے خواب چشم افسانہا
نمی باشد مخالف قول و فعل راستاں باہم کہ گفتار قلم باشد ز رفتار قلم پیدا

غنی ہوس جاہ و دولت سے بیگانہ فقر و فاقہ میں مست رہتا - گھر کے اندر ہوتا تو باہر سے تالا لگا دیتا - گھر سے نکلتا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا لوگوں نے پوچھا تو اس نے کہا کہ مکان میں خود غنی ہی ایک متاع عزیز ہے - وہ نہیں تو دروازے کو تالا کیوں لگایا جائے - اقبال نے واقعہ فارسی میں نظم کیا ہے -

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر نوا سنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشت چو رفت از سرا تختہ را واگزاشت
یکے گفتش اے شاعر دل رسے عجب دارد از کار تو ہر کسے

بباغ چہ خوش گفت مردِ فقیر — فقیر و بہ اقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دیدار یاران رواست — دریں خانہ جُز من متاعی کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش — متاعی گرانست درخانہ اش
چو آں محفل افروز درخانہ نیست
تہی تو ازیں ہیچ کاشانہ نیست

آخر میں غنی کا وہ مشہور شعر ملاحظہ فرمایئے جو جہاں مرحوم کو بہت پسند تھا ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

(عرش ملسیانی)

مرزا کمال الدین شیدا

ملکۂ کوہسار

کوہساروں سے جو اتراتی ہوئی آتی ہوں میں — جنگلوں میں بستیوں میں ناچتی گاتی ہوں میں
کوہ زادی ہوں ہیں میرے پاسباں چیل و چنار — مہ جبیں ہوں ملکۂ کوہسار کہلاتی ہوں میں
آکے برفانی پہاڑوں سے برہنہ سیم تن — شرم کے مارے پگھل کر آب ہو جاتی ہوں میں
میرے پہلو میں نہاں ہے اک دلِ پر اضطراب — اس کو اک گہوارۂ سنگیں میں بہلاتی ہوں میں
دل ہی دل میں اک خلش محسوس کرتی ہوں ضرور — سنگریزوں سے برابر سر کو ٹکراتی ہوں میں
ہے مری افتادگی میں سربلندی کا مقام — اوڑھ کر اک چادرِ فوارہ اتراتی ہوں میں
آبشاروں میں نغمہ ریزی ہے مِری فردوس گوش — مل کے دہقاں زادیوں سے لوریاں گاتی ہوں میں
گاؤں میں ہنگامہ ہائے زیر و بم میرے بلند — بستیوں میں جا کے پھر خاموش ہو جاتی ہوں میں
محفل آرائی ہے میری باغِ شالامار میں — جوئباروں لالہ زاروں میں نظر آتی ہوں میں
آ رہی ہوں آبشاروں کو لئے تارِ رباب — اپنے نغموں سے ہر اک محفل کو گرماتی ہوں میں
چومتی ہے ہر کلی رخسار جھک جھک کر مرے — سبزۂ خوابیدہ سے آ کر لپٹ جاتی ہوں میں
یہ جوانی ہے مری خالص فسونِ پیچ و خم — مست ناگن کی طرح دن رات بل کھاتی ہوں میں
اس جگہ اے ملکۂ ہندوستاں نور جہاں — تیری صحبت یاد آتی ہے تو گھبراتی ہوں میں
ہاں مہادیو سے نکل کر دشت پیمائی کے بعد — جھیل ڈل کے بیکراں پانی سے مل جاتی ہوں میں

جھاڑیوں میں سے گزر کر کشتِ دہقاں سینچ کر
باغِ آصف سے اچھل کر ڈل میں کھو جاتی ہوں میں

(ماخوذ)

سید محمد شفیع

کشمیر کی دستکاریاں

کشمیر کی دستکاریاں اپنی خوبصورتی، نزاکت اور عمدگی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کے کاریگر اپنی خداداد قابلیت اور رومانی ماحول کی وجہ سے فن کاری کے بے مثل نمونے قدیم ایام سے بناتے آ رہے ہیں۔ اور سیاحوں اور اعلیٰ مذاق رکھنے والے فن کاروں کی داد حاصل کر چکے ہیں۔ کشمیر کے شال تو مدت سے یورپ اور ہندوستان میں ہر دل عزیز ہو گئے ہیں، اور اس وقت تک کشمیری شال جیسی بے نظیر چیز کسی اور جگہ نہیں بن سکی ہے۔

کشمیر کی اہم دستکاریاں یہ ہیں۔

شال بافی۔

دو سو سال قبل یہ دستکاری بام عروج پر تھی۔ فرانس اور انگلینڈ کے اونچے گھرانے میں کشمیری شال کا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ تمام اونچے طبقے کی خواتین شال اوڑھنے میں فخر کرتی تھیں، اور تقریباً ۲۰ ہزار کھڈیاں (کرگھے) اس وقت کشمیر میں اس صنعت میں لگی ہوئی تھی۔ اب یہ صنعت سستے مشینی کپڑوں کے مقابلے کی وجہ سے ترقی معکوس کر رہی ہے۔ پھر بھی اس وقت سالانہ تقریباً دس ہزار شال برآمد ہوتے ہیں۔ اب اگرچہ اس قسم کے زیادہ شال نہیں بنائے جاتے ہیں۔ جو قدیم ایام میں بنتے تھے پھر بھی کشمیری شال کے کپڑے کی ملائمت، اور اس پر سوئی سے کی ہوئی باریک گل کاری، خوش نما رنگوں کی آمیزش، دنیائے فن میں اسے ممتاز حیثیت عطا کئے ہوئے ہے۔ ان شالوں میں کام آنے والی اون (یعنی پشم) لداخ اور چان تھانگ علاقے سے سری نگر میں درآمد ہوتی ہے۔ اور سری نگر کی عورتیں اس کو چرخے پر کاتتی ہیں، اور وہ خاص جولاہے جو اس کام کے ماہر ہیں کھڈیوں پر بہت احتیاط سے بنتے ہیں۔ سری نگر میں تقریباً اس وقت پانچ ہزار اشخاص شال بافی، اور اس کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں کشمیر میں شالوں کے علاوہ اب سستے قسم کے اونی شال بھی بنائے جاتے ہیں، جو ہر سال بہت بڑی تعداد میں برآمد ہوتے ہیں۔ اس شال کے لئے مشینی تار استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن پشمینے کے مقابلے میں یہ سخت کم گرم اور کم پائیدار ہوا کرتے ہیں۔ اس کے لئے تار جاپان سے آتا ہے لیکن اب امرتسر میں بھی یہ تار بننے لگا ہے۔ اس شال کی تیاری میں تقریباً تین چار ہزار لوگ کام کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بنگال کشمیری شال کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ کچھ مربع شال وسط ایشیا کے ممالک میں بھی برآمد کئے جاتے ہیں۔ پشمینے کے مفلر، مربع رومال اور چھوٹے شال یورپ اور امریکہ بھی جاتے ہیں۔ دو تین سال سے کلو شال بھی رائج ہو گئے ہیں۔ جو مقابلتاً سستے بھی ہیں، اور خوبصورت بھی۔ حکومت نے اس صنعت کو اور زیادہ فروغ دینے کے لئے پشمینہ اون سستے داموں مہیا کرنے کے انتظامات کئے ہیں۔ اور اس سال حکومت نے ایک لاکھ روپے بطور Subsidy ادا کئے۔ شال بافی کے علاوہ کشمیر میں کھڈیوں پر اونی کپڑا اور لوئیاں بنتی ہیں۔ کھڈیوں پر بنا ہوا اونی کپڑا سوپور، پانپور، اور سری نگر میں تیار ہوتا ہے، اور لوئیاں تقریباً ہر گاؤں میں کسان لوگ اپنی ضروریات کے لئے بنتے ہیں۔ البتہ باندی پورہ جو جھیل وُلر کے کنارے ایک مشہور قصبہ ہے۔ بھاری لوئیوں کے لئے مشہور ہے۔

آج کل دہلی (کشمیر نمبر)

گاندھی آشرم اور کھادی بورڈ کی شاخیں بھی کشمیر کے مختلف مقامات پر اونی کپڑا اور لوئیاں بنواتے ہیں۔ حکومت نے بھی اس صنعت کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے دو سنٹر ایک سری نگر میں اور ایک سوپور میں کھولے ہیں۔ اور مستقبل قریب میں دو اور سنٹر کھولنے کا ارادہ ہے۔ کشمیری لوئی بہت گرم اور پائدار ہوا کرتی ہے، اور دس پندرہ سال کے استعمال کے بعد اس کا کوٹ اور پھرن یا بچھونے کا گبہ بنایا جاتا ہے۔ سائنس کا یہ اصول کہ مادہ غیر فانی ہے، کشمیری لوئی پر صادق آتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ساری وادی کشمیر میں تیرہ ہزار کھڈیاں شہر، قصبوں اور دیہات میں ہیں جن پر اونی، ریشمی اور سوتی کپڑا ہاتھ سے بُنا جاتا ہے۔ سوتی کپڑا اب بہت کم بنتا ہے۔ کیونکہ خام مال یعنی سوتی دھاگہ احمد آباد سے منگانا پڑتا ہے اور مشینی کپڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ پھر بھی سری نگر میں نظام خانیار کچھ کھڈیاں، دیہاتی لوگوں کے استعمال کے لئے کچھ سوتی کپڑا بنتی ہیں۔ کہیں کہیں گاؤں میں بھی اپنی خانگی ضروریات کے لئے کسان لوگ سوتی کپڑا بُنتے ہیں۔

کھڈیوں پر ریشمی کپڑا بُننے کی صنعت

کشمیر میں ریشمی دھاگہ مشین کے ذریعے نکالنے کی صنعت ساٹھ ستر سال سے قائم ہے۔ ایک زمانے میں تقریباً چار لاکھ پونڈ ریشمی دھاگہ تیار ہوتا تھا لیکن اب شہتوت کے درختوں کی کمی، اور یورپ سے منگائے ہوئے بیج کی خرابی کی وجہ سے دھاگے کی پیداوار میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ پھر بھی پونے دو لاکھ پونڈ کے قریب ریشمی دھاگہ تیار ہوتا ہے جس میں سے ایک لاکھ پونڈ سے اندر ریاست میں رہنے والے جولاہوں کو کم دام پر فروخت کیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کا ریشمی کپڑا کھڈیوں پر تیار کریں۔ اس وقت سری نگر میں تقریباً دو ہزار کھڈیوں پر ریشمی کپڑا بنتا ہے۔ جس میں Tabby کپڑا بہت مشہور ہے۔ کاریگروں نے کپڑے کے مختلف اقسام بنائے ہیں جس میں سے کچھ مشینی کپڑے سے بھی بہتر ہیں۔ اس کپڑے پر چھینٹ بنانے کا بھی ایک پرائیویٹ کارخانہ ہے، جہاں پر بلاک پرنٹنگ ہوتی ہے۔ کھڈیوں پر تیار کیا ہوا تقریباً پندرہ لاکھ گز ریشمی کپڑا ہر سال ریاست سے برآمد ہوتا ہے۔

مشکا سلک بنانے کی بھی کوشش کی گئی تھی لیکن چونکہ یہ مہنگا تیار ہونے لگا تھا، اس لئے اس کو بند کر دیا گیا۔ یہ صنعت صرف شہر سری نگر میں ہی قائم ہے، اب دیہات میں یہ کم رائج ہے۔ جو ریشمی دھاگہ خانگی ضروریات کو پورا کرنے کے بغیر بچ جاتا ہے، حکومت اس کو ہندوستان میں اچھے داموں فروخت کرتی ہے۔ حال ہی میں کھڈیوں پر ریشم بننے والے جولاہوں نے ایک انجمن قائم کی ہے، جو اس صنعت کو درپیش آنے والی مشکلات حکومت کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے، اور حکومت اس انجمن کو اس صنعت کے سلسلے میں کافی اہمیت دے رہی ہے، اس میں قریب قریب سب جولاہے شامل ہیں۔ حکومت کوشش کر رہی ہے کہ کمخواب اور مخمل وغیرہ قیمتی کپڑے بھی ریاست میں تیار کئے جائیں۔

قالین بافی

یہ صنعت بھی شال بافی کی طرح کشمیر میں صدیوں سے قائم ہے، اور بہت شہرت حاصل کر چکی ہے۔ جناب میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ ایران سے کچھ کاریگر اپنے ساتھ لائے تھے، اور تب سے یہ صنعت یہاں قائم ہوئی ہے، تقریباً اسی سال سے اس صنعت کو انگریزی کارخانہ داروں کی وجہ سے کافی وسعت ہوئی۔ سب سے پہلا کارخانہ جس میں وسیع پیمانے پر اور ڈھنگ سے قالین بنائے جانے لگے سی۔ ایم ہیڈ کا تھا۔ اس کے بعد چند اور کارخانے انگریزوں نے کھولے، اور آج یہ صنعت تقریباً ایک ہزار جولاہوں کا ذریعہ معاش ہے۔
قالین ایرانی طرز اور ڈیزائن کے بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً اردبیل۔ کاشان اصفہان بخارا وغیرہ۔ ان ڈیزائنوں کے علاوہ گل کاری اور قدرتی مناظر والے قالین بھی بنائے جاتے ہیں۔ قالین بننے کا کام ہاتھ سے ہی خاص کھڈیوں پر ہوتا ہے۔ جس مقدار میں فی مربع انچ گانٹھیں KNOTS ہوں، اس کے لحاظ سے مختلف قسمیں متعین کی جاتی ہیں۔ اور جس قدر زیادہ گانٹھیں ہوں، قالین اسی قدر زیادہ مضبوط اور قیمتی ہوتا ہے۔ گو سب قالین اونی دھاگے سے ہی بنائے جاتے ہیں، جن میں دو ہزار گانٹھیں فی مربع انچ پڑتی ہیں۔ کچھ کارخانہ داروں نے پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کے بڑے سائز کی تصویریں بھی قالین میں بنی ہیں۔ جو اصلی تصویروں کے بالکل ہو بہو بن گئے ہیں۔ قیمتی قالین زیادہ تر یورپ اور امریکہ کو برآمد ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے سے مرزاپور میں بنائے ہوئے قالینوں کی وجہ سے کشمیری قالین کم بکنے لگے تھے لیکن چونکہ پائداری (پھول کاری) اور خوش نما ڈیزائن جو کشمیری قالینوں میں ہوتا ہے مرزاپور کے قالین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے صاحب نظر خریدار کشمیری قالین کو ہی، چاہے مقابلتاً وہ مہنگا ہی کیوں نہ پڑے، ترجیح دیتے ہیں۔ اس وقت بھی کارخانہ داروں کے پاس اس قدر آرڈر ہیں کہ وہ پورا نہیں کر سکتے۔ اس صنعت کو مزید ترقی

دینے کے لئے گورنمنٹ نے سری نگر میں ایک کارخانہ حال ہی میں کھولا ہے۔ جہاں ایک دو ماہ کے بعد کام شروع ہوگا۔ اس کارخانے میں بہتر ڈیزائن پکے رنگ اور بہتر اونی دھاگے کا استعمال ہوگا۔

گبہ سازی

چونکہ قالین ایک ایسا فرش ہے جو امیر ہی بچھا سکتے ہیں۔ اس لئے درمیانی طبقے اور عوام کے استعمال کے لئے گبہ بنایا جاتا ہے۔ اس میں مختلف اقسام ہیں ایک وہ جو قصبہ اننت ناگ میں پرانی لوئیوں کو کاٹ کر اور جوڑ کر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے اوپر اونی یا سوتی دھاگے سے پھول کاری کی جاتی ہے۔ جس سے نہ صرف گبہ خوبصورت بن جاتا ہے بلکہ پائدار بھی ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی گبہ سب سے کم قیمت والے قالین سے بھی سستا ہوتا ہے اور تیس چالیس سال تک کام آ سکتا ہے۔ یہ صنعت زیادہ تر قصبہ اننت ناگ میں ہی قائم ہے۔ تقریباً چار گھر اس صنعت کے ساتھ وابستہ ہیں، اور چار لاکھ روپیہ کے گبے سالانہ فروخت ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال تمام کشمیری گھرانوں میں بھی ہوتا ہے۔ شملہ، دہرہ دون اور دیگر سرد مقامات میں یہ خاص طور پر فروخت کیا جاتا ہے۔

نمدہ سازی

نمدہ بھی ایک سستی اونی فرشی چیز ہے۔ یہ صنعت چینی ترکستان سے ریاست میں درآمد ہوئی ہے۔ دس پندرہ سال پہلے تک چینی ترکستان سے اونی نمدے درآمد ہوتے تھے۔ جن پر کشمیر میں اونی دھاگے سے گل کاری کی جاتی تھی۔ بعد میں تجارتی راستہ بند ہونے کی وجہ سے یہ نمدے آنے بند ہو گئے۔ اور کشمیر میں ہی یہ صنعت ترقی کر گئی۔ پچھلی جنگ میں لاکھوں کی تعداد میں یہ نمدے امریکہ برآمد ہوئے۔ نمدے کے مختلف اقسام ہیں۔ سب سے اعلیٰ قسم وہ نمدے سمجھے جاتے ہیں جو خالص اون کے بنے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں ۷۰ فی صدی اون اور ۳۰ فی صدی سوت ہو۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں ۵۰ فی صدی اون اور ۵۰ فی صدی سوت ہو۔ عام سائز ۴ × ۶ ہوتا ہے۔ لیکن دیگر سائز مثلاً ۴ × ۳ - ۳ × ۲ - ۹ × ۶ اور ۱۲ × ۹ بھی آرڈر کے بموجب بنائے جاتے ہیں۔ گل کاری میں شجر حیات Tree of Life بہت ہر دل عزیز ہے۔ اکثر گل کاری کے نمونے امریکہ اور یورپ سے ہی آتے ہیں۔ اس وقت تقریباً سات آٹھ سو کاریگر اور دیگر متعلقہ تاجر لوگ اس صنعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک دو سال سے اگرچہ یہ کام بہت مدھم ہو گیا تھا لیکن اب اس سال سے دساور میں پھر مانگ بڑھ رہی ہے اور تاجروں کے پاس آرڈر آنے لگے ہیں۔ اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے گورنمنٹ نے بھی اسی سال ایک کارخانہ کھولا ہے۔ جہاں مقررہ معیار کے مطابق نمدے بنائے جائیں گے۔ اون اور سوت کی ملاوٹ کی مقدار پر پابندی لگانے کے لئے نمدہ کوالٹی ایکٹ بھی نافذ کیا گیا ہے۔

اخروٹ کی لکڑی کا کام

یہ صنعت بھی کافی عرصے سے کشمیر میں رائج ہے۔ اخروٹ کی لکڑی اپنی پائداری اور قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے چوبکاری کے لئے نہایت موزوں پائی گئی ہے۔ اور چونکہ اخروٹ کے درختوں کی کشمیر میں بہتات ہے، اس لئے یہ صنعت بہت ترقی کر گئی ہے۔ اس لکڑی کا فرنیچر نہایت صاف اور خوبصورت ہوتا ہے۔ ڈبے۔ فوٹو فریم، سگریٹ کیس، لیمپ سٹینڈ۔ ٹرے وغیرہ سامان بنتے ہیں جن پر بڑی مہارت سے گل تراشی کی جاتی ہے۔ انگریز اس سامان کو خاص طور سے پسند کرتے ہیں۔ سری نگر میں چھوٹی بڑی تقریباً ڈھائی سو دوکانیں یہ سامان فروخت کرتی ہیں۔ اور دو ہزار کاریگر اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے اس سال ایک Seasoning Kiln لگا رہی ہے جس میں بہت قلیل عرصے میں سٹیم کے ذریعے سے لکڑی خشک کی جائے گی۔ تاکہ اس خشک لکڑی سے بنی ہوئی چیزیں گرم علاقے میں ٹیڑھی نہ ہوں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سالانہ پانچ لاکھ روپے کی لکڑی کی اشیاء برآمد ہوتی ہیں، اور ہندوستان کے علاوہ یورپ امریکہ، فرانس اور جنوبی افریقہ جاتی ہیں۔

پیپر ماشی

یہ صنعت بھی ایران سے درآمد ہوئی ہے۔ ردی کاغذ اور چیتھڑوں کو پیس کر ملایا بنایا جاتا ہے۔ جس کو سانچے میں ڈال کر مختلف چیزیں مثلاً پوڈر بکس، سگریٹ سٹ، بسکٹ رکھنے کا ڈبہ۔ دیوار پر لٹکانے کے لئے آرائشی ٹرے وغیرہ بنائی جاتی ہے۔ پھر اس کو دھوپ میں سکھا کر اس کے اوپر سفید رنگ چڑھایا جاتا ہے، اور اس کے اوپر مختلف پختہ رنگوں سے باریک برش کے ساتھ اس فن کے ماہر نقاشی کرتے ہیں اور اس نقاشی کے اوپر وارنش کیا جاتا ہے۔ تاکہ اگر یہ چیزیں پانی میں بھی گر جائیں یا تیز دھوپ میں رکھی جائیں تو خراب نہ ہونے پائیں۔ اس فن کے ماہر سری نگر میں پانچ سو کے قریب ہیں۔ ایک لاکھ روپے تک کا یہ

سامان برآمد ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ چیزیں یورپ اور امریکہ جاتی ہیں۔ سیاح لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور شاید ہی ایسا کوئی سیاح ہوگا جو پیپر ماشی کی کوئی نہ کوئی چیز اپنے ساتھ نہ لے کر جاتا ہو۔ سری نگر میں اس کی متعدد دوکانیں ہیں۔ اور سارے ہندوستان میں اس صنعت کا مقابلہ نہیں۔ پچھلے سال امریکہ کے کچھ تاجروں نے پوری دوکانوں کی دوکانیں تھوک پیمانے پر خرید لیں۔

مندرجہ صدر صنعتوں کے علاوہ کشمیر میں چاندی کا سامان بنانے کا کام۔ ولو (بید) کی ٹوکریاں اور بکس وغیرہ بنانے کا کام۔ امبرائیڈری۔ جام اور مربے بنانے کا کام۔ بار کاٹنے اور پتھر کا سامان بنانے کا کام۔ چمڑے کا سامان بنانے کا کام۔ شہد بنانا۔ فر کا کام۔ چھری کانٹے اور دیگر صنعتوں کا کام ہوتا ہے۔ ان میں بھی صدہا لوگ کام کرتے ہیں۔ کشمیر کی آبادی کا اکثر حصہ صنعتی کاموں میں ہی مصروف ہے، اور حکومت ان تمام صنعتوں کو آگے بڑھانے کی فکر میں ہے۔

قطعۂ تاریخ

(شالامار باغ یا باغ فرح بخش ۱۶۱۹ عیسوی میں شاہِ جہاں گیر کے حکم سے مکمل ہوا۔ قطعۂ تاریخ ذیل میں درج ہے)

شنیدم شاہ روشن دل جہاں گیر زعشرت شد چو رونق بخش کشمیر
چو شد دامانِ دریا جلوہ گاہش بسوئے شالیمار افتاد راہش
فضائے دید چوں روئے عروساں سزاوارِ عمارات و گلستاں
بطبعش روحِ روح افزا اثر کرد گران خوابی دماغش را خبر کرد
بگفت ایں دشتِ رنگیں روئے خوراست زما سرسبزی ایں جا ضروراست
دراں ایامِ شاہِ ہفت اقلیم کہ بر سر دارد از خورشید دیہیم
سر و سر کردۂ شاہزادگاں بود دراں شاہزادگی شاہ جہاں بود
پئے اتمامِ ایں منزل قدافرخت برائے خویش کارے پیش انداخت
ازیں چندیں صفا در کار او شد کہ شاہی ایں چنیں سرمایہ او شد
زنہر و آبشار و حوض و فوار ز دیوار و عمارت نخل و گلزار
بہشتے در جہاں شد آفریدہ چنیں باغے فلک ہرگز ندیدہ
کنوں آمد زفیضِ خاک و آبش فرح بخش از شہِ عالم خطابش

چو شد آراستہ باغِ فرح بخش بحکم حضرتِ ظلِ الٰہی
شہنشاہِ شہاں شاہ جہانگیر کہ مشہوراست از مہ تا بہ ماہی
پے تاریخ ایں گلزار دیاں!
خرد فرمود "فرحت گاہِ شاہی"

نوٹ :- نونہال بے بی شو ماہ فروری [illegible] میں منعقد ہوگا۔ صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

کشمیر کی دستکاریاں

سوزن کاری

پیپر مشی کے نمونے

لکڑی میں کٹائی کا کام

یش شرما
ڈوگری زبان کے نوجوان شاعر

ساز کشمیر

مہجور مرحوم
کشمیر کے مشہور عوامی شاعر

کشمیر کا مستقبل — کشمیر کے نونہال

حافظ علی بہادر خاں

انڈیا اور کشمیر

انڈیا اور کشمیر کا تعلق اتنا قدیم ہے جتنا قدیم ہمالیہ پہاڑ ہے جس کے زیرِ سایہ وادئ کشمیر حسن و لطافت کے خزانے لٹا رہی۔ عہدِ تاریخ سے قبل تہذیب و تمدن کے ریلے وسط ایشیا اور چین و تبت کی راہ سے آتے رہے۔ اور کشمیر میں ان کا امتزاج ہوتا رہا۔ تاریخ اس تمدن میں بار بار نئے عناصر سموتی رہی اور متعدد و مختلف اثرات نے مل کر ایک تمدن پیدا کیا جو اپنے خاص اجزا کے اعتبار سے وہی ہے جسے دنیا ہندوستان کا تمدن مانتی ہے اور جس کے بعض پہلوؤں پر ہم اس مقالے میں ایک سرسری نظر ڈال رہے ہیں۔ آج ہندوستان کو کالیداس، کلہن، مٹ آچاریہ جیسے شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں پر فخر ہے لیکن یہ سب کشمیر کی مردم خیز زمین کی پیداوار ہیں۔

آثارِ قدیمہ پرانے گیتوں۔ دھارمک روایات اور پرانی تاریخی شہادتوں سے مسیح سے ڈھائی ہزار سال قبل کے واقعات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ۱۱۸۴ء ق۔م سے تو منظم و بالترتیب سوانح کلہن کی مشہور کتاب راج ترنگنی میں اس طرح قلمبند ہیں گویا کہ وہ ہندوستان ہی کی تاریخ ہے۔ مذہب، زبان شعر و ادب، تہذیب و تمدن اور قومی کلچر کے تمام مظاہر ہندوستانی ہیں۔

مسیح سے ڈھائی سو برس قبل ہندوستان کے مشہور راجہ اشوک نے کشمیر فتح کیا اور سری نگر بسایا جو موجودہ سری نگر کے قریب ہی تھا یہ دیوی لکشمی کے نام پر تھا۔ سری نگر سے مطلب لکشمی نگر ہی ہے۔ سری نگر ہی نہیں خود کشمیر کے نام کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر قبل تاریخ کے دور سے ہی ہندوستان کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ رکھتا ہے۔ کہتے کہ جہاں وادی کشمیر ہے وہاں قدیم زمانے میں ایک جھیل تھی جس کے اردگرد کی آبادی پر ایک راکشس جل دیو بہت ظلم کرتا تھا۔ یہ عفریت خونخوار ہزاروں انسانوں کو لقمہ بنا چکا تھا۔ آخر رشی کشیپ نے جل دیو سے مقابلے کا فیصلہ کیا اور فتح کی شکتی پیدا کرنے کے لئے ایک ہزار برس تپسیا کی۔ جب مقابلے کے لئے پوری شکتی پیدا ہو گئی تو جل دیو جھیل کی گہرائیوں میں جا چھپا اور وقت بے وقت پانی کے اندر سے نکل کر حملہ کیا کرتا تھا۔ پھر وشنو نے کشیپ کی مدد اس طرح کی کہ بارہ مولا کے قریب پہاڑ میں ایسا سوراخ کر دیا جس میں جھیل کا تمام پانی بہہ کر غائب ہو گیا لیکن جل دیو پھر بھی جنگل میں چھپ گیا۔

اب روایات میں یہ ہے کہ پاروتی اسی جھیل میں سیر کرنے آتی تھی وہ مینا بن کر چونچ میں ایک کنکری لائی اور جہاں جل دیو چھپتا تھا وہاں پہنچ کر وہ کنکری اس کے سر پر ڈال دی اس کنکری نے جل دیو کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی کنکری بڑھ کر ہری پربت بن گئی ہے اس طرح یہ وادی کشیپ کے تصرف میں آئی۔ جس نے اسے ازسرِ نو آباد کیا۔ ابتدا میں یہ "کشیاپ ماڑ" کہلاتی تھی رفتہ رفتہ کثرتِ استعمال سے "کشیاپ ماڑ" کشمیر ہو گیا۔

ان روایات کی تاریخی حیثیت کتنی بھی کمزور ہو لیکن ان سے یہ حقیقت ضرور ثابت ہوتی ہے کہ انڈیا اور کشمیر کا تعلق بہت پرانا ہے۔ نہ صرف کشمیر اور سری نگر کے نام اس تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ کشمیر کی متعدد

پہاڑیاں اور ندیاں بھی ایسی ہی روایات کے ساتھ مشہور ہیں۔

اشوک کے زمانے میں بدھ دھرم کشمیر کے باشندوں میں مقبول عام تھا۔ لیکن بعد میں شیو کے ماننے والوں کا زور ہو گیا۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے ۶۳۱ء سے ۶۴۳ء تک کے جو حالات لکھے ہیں ان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس وقت شیو کے ماننے والے بہت تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہی سری نگر کا موجودہ شہر راجہ پرورسینا نے بسایا۔

اس زمانے کے کشمیر کے راجاؤں میں للتادتیہ (۶۹۹ - ۷۳۶ ء) بہت ممتاز تھا۔ اس نے قنوج تک فتح کر کے تمام شمالی ہند پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ افغانستان اور وسط ایشیا بھی اس کے دائرہ اقتدار میں آ گئے تھے۔ اس راجہ کی یاد شمالی ہند اور کشمیر کے لوگوں کے دلوں میں زمانۂ دراز تک قائم رہی۔ البیرونی نے جب ہندوستان کا دورہ کیا تو اس نے پایا کہ لوگ للتادتیہ کی برسی مناتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں لوگ بدھ دھرم اور وشنو دھرم کے ماننے والے تھے۔ البیرونی نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور اس کی کتابیں اس زمانے کے حالات پر اہل علم کے نزدیک زبردست تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے ثابت ہے کہ کشمیر انڈیا سے الگ کوئی ملک نہیں تھا اور بدھ مت اور وشنو مت کے لوگ صلح اور رواداری کے ساتھ رہتے تھے۔

اوو کانگ ایک اور چینی سیاح نے اس زمانے کے حالات لکھے ہیں اس کے سوانح سے ۷۵۹ء سے ۷۶۳ء تک کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے اس نے بھی کشمیر کے تہذیب و تمدن کا نہایت اعلیٰ تصور پیش کیا ہے۔

مذکورہ بالا حالات میں سے بعض صرف روایات و توہمات پر مبنی ہیں اور بعض کی تاریخی حیثیت ہے۔ لیکن جو صرف توہمات کی پیداوار ہیں ان سے بھی قدیم زمانے کے باشندوں کے رجحانات و میلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر انڈیا کا ایک جزو تھا۔ جس پر اس حیثیت سے غور کرنا ممکن نہیں گویا کہ وہ انڈیا سے الگ کوئی علاقہ ہو۔

سب سے آخر میں کشمیر کے تہذیبی و تمدن پر اسلام کا اثر شروع ہوا۔ ۱۳۲۰ء سے اسلامی اقتدار کا آغاز ہوتا ہے جبکہ راجہ نے اسلام قبول کر لیا اور صدر الدین کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ لیکن اس سے قبل ہی اسلام کشمیر میں آ چکا تھا۔ وسط ایشیا میں ایک ایسا بادشاہ تخت اقتدار پر آیا جس نے مسلمانوں پر بہت مظالم کئے۔ ان مظالم سے تنگ آ کر بعض مسلم سردار اور روحانی پیشوا بھاگ کر کشمیر میں پناہ گزین ہوئے جہاں انھوں نے اسلامی اصولوں کی تبلیغ کی۔ ان میں شاہ میر اور سید علی ہمدانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسلام کے ساتھ وسط ایشیا اور ایران کا کلچر بھی آیا جو سابق کلچر کے ساتھ مل کر ایک نئی حیثیت میں نمودار ہوا۔ فارسی اور سنسکرت کے ادب و شاعری کا ٹکراؤ نیا رنگ لایا اور ایک دوسرے میں سمانے کے بعد کشمیر کے علمی خزانوں کو مالا مال کر دیا۔

ابتدائی دور کے مسلم بادشاہوں میں زین العابدین کا نام تاریخ میں یادگار رہے گا۔ جس نے سنسکرت اور عربی دونوں کے ماہرین کی سرپرستی کر کے دونوں زبانوں کے لٹریچر کے ترجمے کروائے اور کشمیر کے علمی مرتبے کو بہت بلند کر دیا۔

اسلامی دور سے قبل کشمیر ہندوستان کا ایک جزو تھا اس کا ثبوت صرف دھارمک روایات اور سنسکرت کی تاریخوں ہی سے نہیں ملتا ہے بلکہ خود اسلامی تاریخیں بھی یہی حقیقت ثابت کرتی ہیں۔ ان تاریخوں سے دو واقعات نقل کئے جاتے ہیں جو اس مسئلہ پر حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چچ نامہ سندھ کی تاریخ کے بعض نہایت اہم پہلو پیش کرتا ہے۔ اس کے مصنف علی کوفی نے جو عرب تھا اور سندھ میں آباد ہو گیا تھا اپنی کتاب میں خود محمد بن قاسم کے خاندان کے لوگوں سے وہ خط و کتابت حاصل کی جو سندھ کے راجہ داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان ہوئی تھی۔ اس میں ایک خط راجہ داہر کا شامل ہے جس کا حسب ذیل اقتباس قابل غور ہے۔

"تجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ دیبل کے شہر پر جو تیرا قبضہ ہو گیا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں وہ ایسا شہر ہے جہاں صرف صناع اور تاجر رہتے ہیں نہ وہ مضبوط قلعہ ہے نہ وہاں ایسی فوج ہی تھی کہ جنگ میں قابل ذکر ہو۔ اگر وہاں ایک بھی قابل ذکر جنگ آزما ہوتا تو تیرا نشان بھی نہ رہتا۔ اگر میں رائے چیپا (راجہ داہر کا بیٹا تھا) کو بھیجتا جو دنیا کا بہترین فاتح ہے اور جو زبردست ترین دشمنوں سے بھی انتقام لے سکتا ہے یا اگر میں راجہ کشمیر کو روانہ کر دیتا جو بڑا تاجدار ہے اور جس کے آگے ہند کے بڑے بڑے تاجداروں نے سر جھکایا ہے اور ایران و توران بھی جس کے زیر اقتدار ہیں۔ جس کے حلقۂ اقتدار کو بڑے بڑوں نے اپنے گلے میں ڈالا ہے جس کے پاس ایک سو ہاتھی کا گروہ ہے اور خود سفید ہاتھی پر سواری کرتا ہے۔ جس کے سامنے نہ گھوڑا ٹھہر سکتا ہے:

انسان اس پر دباؤ ڈال سکتا ہے"۔

یہ خط راجہ داہر نے محمد بن قاسم کو دیبل کی فتح کے بعد لکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کشمیر انڈیا کی راجدھانیوں کا ہی ایک جزو تھا۔ دوسرا ثبوت اسلامی تاریخوں میں محمود غزنوی کی ایک جنگ کے حالات سے ملتا ہے۔

مشہور مسلم مؤرخ گردیزی نے سلطان محمود غزنوی اور راجہ ترلوچن پال کی جنگ میں "فوجِ کشمیر" کے مقابلے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس فوج کا کمانڈر انچیف تنگا تھا جس نے ترلوچن پال کی طرف سے محمود غزنوی کا سخت مقابلہ کیا اور پہلے دن محمود غزنوی کو شکست بھی دی۔ لیکن دوسرے روز شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ تاریخ گردیزی کے اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کوئی علیحدہ ملک نہیں تھا "فوجِ کشمیر" کی اس جنگ کا حال کلہن کی تاریخ میں بھی ہے۔

غرضیکہ کشمیر میں بدھ مت، ہندو دھرم، مذہب اسلام تینوں کا اثر یکے بعد دیگرے آیا اور اس کی علمی و ثقافتی ترقیاں جاری رہیں۔ مسلمانوں کے راجپوت (چک خاندان) مغل، پٹھان حکومت کرتے رہے۔ ۱۸۱۹ء سے سکھوں کا اقتدار ہو گیا۔ پھر ۱۸۴۶ء سے ڈوگرہ راج شروع ہوا۔ جس کو جدید انقلاب نے ختم کر کے جمہوری نظامِ حکومت قائم کر دیا۔

گزشتہ ایک صدی میں کشمیر کے عوام کی اقتصادی، تعلیمی، ثقافتی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ علم اور کلچر کے میدان میں ان کی قیادت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سیاسی مسائل میں ان کی کوئی آواز نہیں رہی تھی اور سماجی حیثیت سے ان کی ترقی مسدود ہو چکی تھی کہ ہندوستان کی لیڈرشپ نے نئی جدوجہد کی راہ کھول دی اور نیشنل کانفرنس جموں و کشمیر کے پولیٹیکل جہاد نے دنیا کو ایک نئے کشمیر سے دوچار کر دیا۔ اس انقلاب میں پنڈت نہرو کی قیادت نے جو رول ادا کیا اس سے قائدینِ کشمیر کو بہت بڑی مدد ملی۔ لیکن انڈیا اور کشمیر کے اس دیرینہ تعلق کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت ہوا۔ جب پاکستانی حملے نے یکایک کشمیر کو بربادی و موت سے دوچار کر دیا۔ آزادی، مال و عزت ایسے خطرے میں پڑے کہ وہاں کے مہاراجہ اور عوام دونوں کو انڈیا سے امداد کی اپیل کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس وقت جبکہ قبائلی شمشیروں کے آئینے میں جلوۂ مرگ نظر آ رہا تھا اور عورتوں کی عصمت تک محفوظ نہ تھی نہ صرف مطلق العنان مہاراجہ نے انڈین یونین سے مضطربانہ درخواست کی بلکہ نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ بذاتِ خود دہلی پہنچے اور اہل کشمیر کی طرف سے الحاق و امداد کی اپیل کر کے انڈین یونین کو راضی کر لیا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کشمیر اور انڈیا کے دیرینہ اور اٹوٹ تعلق پر سب سے زیادہ بلند بانگ اور بے لاگ اعلانات خود شیخ عبداللہ نے کئے تو ان کے بعد کے رویہ پر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں فرمایا "ہمارا اور ہندوستان کا سیاسی مزاج بالکل ایک ہے اور اسی وحدتِ فکر نے اس دوستی کے تعلق کو حق بجانب ثابت کیا۔ جو ہندوستان اور کشمیر کے درمیان قدیم سے قائم ہے"۔ دوسرے موقعہ پر عید کے براڈکاسٹ میں ۲۲ رجون ۱۹۵۰ء کو شیخ عبداللہ نے فرمایا "ہم نے ہندوستان کے ساتھ جو رشتہ باندھا ہے وہ کسی جذباتی رَو میں بہہ کر نہیں بلکہ یہ قدم ہم نے کافی سوچ سمجھ کر اور غور و خوض کے بعد اٹھایا ہے کیونکہ ہم دونوں کا آدرش ایک ہے اس لئے اس آدرش کو حاصل کرنے کے لئے ہم دونوں کا رشتہ بھی ایک ہے"۔ اس قسم کے دلائل پیش کرنے کے بعد شیخ صاحب جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ ان کے اپنے الفاظ میں پڑھئے "جو عناصر ہم دونوں کے اس رشتہ کو کمزور کرنا چاہتے ہیں وہ نہ صرف انسانیت کے پاک اصولوں سے غداری کر رہے ہیں بلکہ اپنے دیش کی آزادی کے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں"۔ یہی وہ دیرینہ تعلق تھا جس کی حفاظت کے لئے کشمیر کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات تقاضا کر رہے تھے اور انہیں تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق اور ان کے دیگر رفقا نے نفسیاتی دور میں وہ مؤثر اور فوری اقدامات کئے جنھوں نے کشمیر کو ایک بڑے حادثے سے بچا لیا اور جو ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ انڈیا اور کشمیر کے دیرینہ تعلق میں جو کوئی کمزوری ہونے لگی تھی اسے بخشی اور ان کے ساتھیوں نے از سرِ نو مضبوط کر دیا ؎

ہاتھ رکھ کر میرے سینے پہ جگر تھام لیا
تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

ویدراہی

ڈوگری شاعر
یش شرما

یش شرما پہلے ہندی میں کوِتا کرتا تھا۔ وہ اُس حُسنِ فطرت اور حُسنِ نسوانیت کا دلدادہ تھا جو ٹیگور کے گیتوں کا خاصہ ہے۔ ہندی کے شاعروں میں بچن اُس کا محبوب شاعر رہا۔ بچن کی مدھوشالا اور مدھوبالا کا وہ متوالا تھا۔ انگریزی شاعروں میں سے کیٹس کی شاعری نے بھی اُس پر اپنا اثر ڈالا۔

مجھے اب تک وہ زمانہ یاد ہے جب کالج کے تمام لڑکے اُسے جامن کے گھنے سایوں میں گھیر لیتے اور پھر جب یش اپنے سُریلے گلے سے گاتا ؎

میں پیپل کا پیڑ اکیلا کی   کھڑا اکیلا گنگا تٹ پر

تو سب اس طرح بے خود ہو جاتے کہ پنچھی اور چلاتی گھنٹی کی آواز بھی کوئی سُن نہ پاتا۔ سب پر ایک وجد طاری ہو جاتا اور بے خود ہو کر جھوم جھوم اُٹھتے۔

لیکن بہت جلد اُس کی توجہ ڈوگرہ کے لوک گیتوں نے اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ جموں کے اُس علاقے کا رہنے والا ہے جہاں کی سر سبز پہاڑیوں نے آج سے دو تین سو برس پہلے اپنی گود میں ایسے ایسے مصوّر پیدا کئے جن کی فنی تخلیقات آج بھی ایک عالم سے اپنا لوہا منواتی ہیں۔ سر سبز پہاڑیوں پر بسا ہوا بسوہلی کا گاؤں جس کے ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریائے راوی اور دوسری طرف شوالک پربتوں کے دل فریب سلسلے ہیں۔ یش شرما کافی دیر وہاں رہا ہے۔ وہاں کے لوک گیتوں میں فطرت کا تمام حُسن کھنچ کر آ گیا ہے۔ اِن پران گیتوں نے بہت زیادہ اثر کیا ۱۹۴۷ء کے بعد کی بات ہے۔ ڈوگروں کے دیش نے بھی بیداری کی انگڑائی لی۔ اُسے اپنی پُرانی عظمت کا احساس ہوا۔ عالمگیر جنگوں میں تو ڈوگرہ جوان ساری دنیا پر اپنی بہادری کا سکہ جما چکے ہیں۔ اب اپنے کلچر کی طرف متوجہ ہونے کی بھی ایک تحریک نے جنم لیا۔

اِس تحریک نے نوجوان شاعر یش شرما کو قایل کر لیا، اور جب اُس نے اِتنی سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا تو تحریک کا ایک ایسا حصہ بن گیا کہ اس کے بغیر کوئی بھی تقریب نامکمل رہتی۔ مجھے اب تک ۱۹۵۱ء کا بسنت اُتسو یاد ہے۔ ڈوگری سنستھا کی طرف سے ڈوگرہ آرٹ کی ایک نمائش اور ڈوگری مشاعرے کا بھاری پیمانے پر اہتمام تھا۔ لیکن دو دن پہلے ہی سب کو مشاعرے میں ایک ایسے خلا کا احساس ہو رہا تھا جس کے ہوتے مشاعرے کا رنگ جمنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ کیونکہ عوام کا چہیتا گیت کار یش شرما اُس وقت بسوہلی میں تھا۔ تار پر تار دیئے جانے لگے میری آنکھوں کے سامنے اب تک وہ منظر گھومتا ہے۔ سب کے چہروں پر مایوسی کے آثار نمایاں تھے جیسے ہر کوئی یش کا منتظر تھا۔ مشاعرے کا اعلان ہو چکا تھا۔ عین وقت پر یش شرما پہنچا، اور جب اُس نے اپنی نظم "بنجارہ" سُنائی تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ایک ایک بند کئی بار سُنایا گیا، اور پوری نظم کی بار بار فرمایش ہوئی۔ محفل پر سحرِ حلال کام کر گیا۔

نظم "بنجارہ" یش شرما کی عشقیہ شاعری کے تمام اہم عناصر کی حامل ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری کی اِسے نمائندہ نظم کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ موسیقی، روانی، جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہاؤ، حقیقت بیانی، عشق کی کشش کے ساتھ ساتھ ایک والہانہ جذبہ۔ قافیے سے ایک حد تک بغاوت۔ اس نظم کی اہم خصوصیات ہیں۔ ذرا سنیئے۔

"اگر میں بنجارہ بن کر گھومتا پھرتا تمہارے گاؤں آ نکلا تو کیا تم چوڑیاں

چڑھانے کے بہانے میرے پاس آؤ گی ؟

میرے پاس سُرخ چوڑیاں، خوبصورت ہار اور کانٹے ہوں گے۔

لیکن میں زیادہ دیر کہیں ٹھہر نہیں سکوں گا۔ آج یہاں، کل وہاں، پرسوں شہر اور ترسوں کسی گاؤں۔ بس اسی طرح گھومنا پھرنا میرا کام ہوگا۔ چھوٹے بڑے سب میرا نام جانتے ہوں گے۔ کیا تو بھی کبھی بُھولے سے میرا نام لے گی ؟

چوڑیاں چڑھانے کے بہانے میرے پاس آئے گی ؟

میری محبوب۔ آ! جُدا ہونے سے پہلے ایک ساتھ اُن دِنوں کو پیچھے مُڑ کر دیکھ لیں، جن کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم ایک ساتھ ہنسے، کھیلے اور روئے ہیں۔

شام کو سہیلیوں کے ساتھ تیرا پانی بھرنے کے لئے جانا، اور قدم قدم پر یہ سوچنا کہ یہیں کہیں میرے سجن ہوں گے، اور اگر کہیں دُور کوئی نظر آیا تو بس سہیلیوں کے ہاتھ ایک نیا کھیل آ گیا۔ کسی نے کُہنیوں کے ٹھوکے دئے۔ کوئی اشاروں اشاروں میں پوچھتی ہے، وہ تمھارے کیا لگتے ہیں ؟

لیکن تم کیا کہتیں ؟

کس کس کو منع کرتیں ؟

وہ چھیڑ اور اس چھیڑ پر تمھارا شرما جانا مجھے اب تک یاد ہے۔

تمھارے گاؤں جب میں بنجارہ بن کر آؤں گا تو تم سوچو گی کیا میں وہی ہوں جس کے ساتھ تم گُڈے گُڈی کا بیاہ رچایا کرتی تھیں، اور جس کے ساتھ بچپن کے اَن گنت کھیل کھیل کر تم جوانی کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئیں، اور جس کے ساتھ تم نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں تمھاری رادھا ہوں اور تم میرے سلونے شام ہو۔

میری آواز سُن کر تم بنا اپنی ساس کو بُوچھے چُپ چاپ ڈیوڑھی کے باہر آ کھڑی ہو جاؤ گی۔ چوڑیاں چڑھانا تو دُور کی بات رہی، اُس وقت کیا اتنا بھی نہیں پوچھو گی کہ پردیسی تمھارا کیا حال ہے ؟"

اس نظم کے پس منظر میں ایک بہت بڑی ٹریجڈی صاف نظر آ رہی ہے، لیکن اس ٹریجڈی کا اس قدر کامیابی سے نظم کا روپ دھارن کر لینا دراصل ایک علیحدہ بیک گراؤنڈ رکھتا ہے۔ ڈوگرہ گیتوں میں ایک شدید قسم کی یاسیت اور گھٹن ہے۔ محبوب کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر مر جانا بیشتر لوک گیتوں کا مضمون ہے، اور یہ کوئی روائتی شے نہیں۔ ایک حقیقت ہے۔ ڈوگرہ پہاڑی نوجوانوں کو ایک زمانے سے روزی کمانے کے لئے میدانوں میں آنا پڑتا ہے۔ اور خوفناک جنگلوں میں اپنے آپ کو جھلسا دینا پڑتا ہے۔ لیکن اُن کے پیچھے اُن کی محبوباؤں کا کیا حال ہوتا ہے۔ اُس کے جواب میں ایک پہاڑی ٹپہ سنئے :

چن ماڑا چڑیائی پہاڑ ریاسی آ تھوڑا تھوڑا تاپ چڑھا بڑی کے دواسی آ

"چاند ریاسی کے پہاڑوں پر نمودار ہو رہا ہے۔ اے میرے چاند مجھے تھوڑا تھوڑا تاپ ہونے لگا ہے، اور اُداسی بے حد بڑھ گئی ہے :"

اسی لئے میں نے کہا کہ جدائی میں مرجانا پہاڑوں کی روائت نہیں حقیقت حال ہے۔ یش شرما نے "بنجارہ" میں بندے ٹکے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ تو صحیح معنوں میں شاعر ہے۔ اُس کا کام دیکھنا، محسوس کرنا اور بیان کرنا ہے — بقول شخصے فن کار کبھی سوچتا بھی ہے تو غیر ارادی طور پر۔ سامنے بھی دیتا ہے تو ضمناً۔ کسی چیز کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو ضمناً۔ اس کی تمام زندگی کا مقصد ان دو پر ہے کہ وہ دیکھے اور محسوس کرے"۔ یہ مقولہ یش شرما پر سو فی صدی پُورا اُترتا ہے۔ وہ جب کسی فن پارے کی تخلیق کرنے لگتا ہے اور اُس کا دماغ رنگینیوں اور سرمستیوں میں شرابور رہتا ہے تو متانت کے دامن کو ہرگز نہیں چھوڑتا۔ پڑھنے والوں کے سامنے وہ بہشتی مناظر بھی لے آتا ہے۔ لیکن باتوں باتوں میں ایسی بات بھی کہہ جاتا ہے، گویا آسمان پر اُڑتا ہوا کوئی زمین پر آ رہا ہے۔ لیکن ایک دھچکے کے ساتھ نہیں بلکہ اس طرح کہ معلوم بھی نہ ہو۔ اس بات کے ثبوت میں میں اُس کی نظم "میلہ" سے دو بند پیش کرتا ہوں۔

کُسے چوڑیئیں دی ہٹی دی گُسے گھیری اجا کوئی سیسہ کنگھی صابنے دا پوچھدی آ بیا

کوئی آکھدی اے بھائی آبہ گھٹ پیسے لا کوئی دُور ناگے دیکھی دکھی ہڑے ٹھنڈے سا

"کسی کو چوڑیوں کی پڑی ہے کسی کو گھیروں کی تمنا ہے۔ کوئی شیشہ کنگھی اور صابون کا بھاؤ پوچھ رہی ہے۔ کوئی دوکاندار سے قیمت کم کرنے کی ضد کر رہی ہے اور کوئی ان سب سے الگ دُور ہی سے یہ سب کچھ دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھر رہی ہے :"

یش شرما رخسار و گیسو سے پرے ہٹ کر بھی خوبصورتی تلاش کر لیتا ہے۔ اُس کی نظر صرف پھولوں پر ہی نہیں جاتی، کانٹوں میں بھی اسے ایک تیکھے حُسن کا احساس ہوتا ہے۔ شہروں سے دور میلوں ٹھیلوں میں آئے ہوئے دیہاتیوں کی سادگی، الھڑپن اور معصومیت سے اُسے عشق ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر کہا، ان کی غریبی کا دردناک پہلو بھی اُس کی نظروں سے بچ نہیں پاتا۔ اپنی طرف سے وہ غیر ارادی طور پر اس کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہی حقیقت بیانی اُس کی شاعری کا سب سے زیادہ خوبصورت پہلو ہے۔ اسی نظم کا دوسرا بند ہے :

بتھیں شامیں آئی ڈوانگ، سریں بنے دے منارے
کتے بھانگڑے دا جور، کتے ہاسے تے گڑاکے
کسے کھادی دی لئے رُبی، کوئی بُھلے دا اے بھاکے
اج کوری اے مجال جیہڑا نچنے ہا ٹھاکے

" ہاتھوں نے کیلوں جڑی مضبوط ٹھیں ہیں۔ سروں پر بڑے بڑے صافے ہیں۔ کہیں بھانگڑہ ناچ اپنے پورے زوروں پر ہے۔ کہیں ہنسی اور قہقہوں کی بہا ہے۔ کسی کو روٹی نصیب ہوتی ہے اور کوئی خالی پیٹ ہے۔ لیکن آج کسی میں اتنی ہمت ہے جو ان میں سے کسی کو بھی ناچنے سے روک سکے "

یش کو اپنے ڈوگرے دیش سے بے حد پیار ہے۔ یہاں کے پہاڑوں، ندیوں نالوں، سبزہ زاروں اور اُن بنجر علاقوں سے جہاں لوگ پانی کی بُوند بُوند کو ترستے ہیں۔ یش بے حد پیار کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ ایک بنجارے کی طرح گاؤں گاؤں گھومتا رہا ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ تبھی تو وہ اپنی ایک طویل نظم دیش میں لکھتا ہے ؎

اُچڑیئیں دھاریں، ہٹا میں، کھیتریں چہ اُنگھدے
جتیاں نو ہاراں میری اکھیں اگے آؤندیاں
اپنا گے دیش گی لبھدا اے اندے بچ
دنا بھرا آ گھوتاں پرائیاں نئیں بجھو تدیاں

" اونچی پہاڑیوں، ڈھلانوں اور کھیتوں میں سے گذرتے ہوئے جتنے لوگ مجھے دکھائی دیتے ہیں اُن سب میں مجھے اپنے دیش کی جھلک ملتی ہے، اُن کی صورتیں ذرہ بھر مجھے بیگانی معلوم نہیں ہوتیں "

یش کا قلم اس کے عزیز وطن کی خوبصورتی کو بیان کرنے میں پورا پورا ساتھ دیتا ہے ؎

شاں شاں کردے جے بگہدے ن ناڑ دے کُتے!
کُتے چھیل لگدی اے کھیتریں دی سیلتن!
بڑا گے سہانا سماں ہوئی جندا، جت بیلے
رُکھیں دی ایں ٹیسٹن دے پچھے چڑی پوئے چن۔

اس دھرتی پر کہیں "شاں شاں" کرتے ہوئے چشمے اور کہیں کھیتوں کی ہریالی من موہ لیتی ہے، جب جنگلوں کے پیچھے سے چاند نمودار ہوتا ہے تو ایک سماں بندھ جاتا ہے "

یش ہر وقت شاعری نہیں کرتا۔ وہ لکھنے سے زیادہ دیکھنے اور محسوس کرنے میں وقت صرف کرتا ہے، اور جب تک نفس مضمون کو وہ اپنے "انا" سے ہم آہنگ نہیں کر لیتا وہ کچھ نہیں کہتا۔ صرف گنگناتا ہے۔ اور پھر گنگناہٹ آہستہ آہستہ گیت میں بدل جاتی ہے۔ پھر گیت اُس کے منہ سے نکل کر زبان زد عام ہو جاتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا نام بھی۔

یش شرما پیدائشی گیت کار ہے۔ وہ جب گیت تخلیق کرنے کے لئے گنگنانا شروع کرتا ہے تب اس دھرتی پر نہیں ہوتا۔ کہیں ست رنگی پینگوں پر ہلورے لے رہا ہوتا ہے۔ اُس وقت گیت کار اور گیت ——— دو چیزیں نہیں ایک ہی چیز کے دو نام ہوتے ہیں۔

وہ ڈوگری تہذیب کو اپنے گیتوں میں سمو لینا چاہتا ہے۔ وہ ڈوگرہ لوگوں کے دلوں کی تمام دھڑکنیں اپنے گیتوں میں بسا لینا چاہتا ہے۔ اُسے ڈوگرے بے حد پیارے ہیں۔ ڈوگرہ لوگوں سے بے حد محبت ہے تبھی تو اُس نے کہا ہے ؎

ہور کوئی لالسا نئیں ہور کوئی اچھیا نئیں   بس میرا دیس میری اکھیں چہ سمائی جا

" میری اور کوئی آرزو نہیں۔ کوئی تمنا نہیں۔ بس میرا دیس میری آنکھوں میں سما جائے "

در بابِ کشمیر

خورد گندم آدم از جنت کشیدندش بروں ——— من کہ خوردم آش جو یابم بکشمیرم رساں
از شاہِ جہانگیر دم نزع چو جستند ——— یا خواہش دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ
صبح در باغِ نشاط و شام در باغِ نسیم! ——— شالمار و لالہ زار و سیرِ کشمیر است و بس

آج کا کشمیر

آج صد رشکِ بہارِ گلستاں کشمیر ہے
ذرّہ ذرّہ کہہ رہا ہے آسماں کشمیر ہے

نوجوانانِ وطن کی رگ رگ میں ہے خونِ رنگ و بو
آج گویا رنگ و بو کا کارواں کشمیر ہے

جبکہ جنّت سے ہے بڑھ کر اس کے پھولوں کی بہار
کس لئے پھر ہم کہیں جنّت نشاں کشمیر ہے

جس میں ہیں مسرور ہندو اور مسلماں شادہیں
عرصۂ گیتی میں وہ بزمِ اماں کشمیر ہے

صنعت و حرفت، زراعت بڑھ رہی ہے پے بہ پے
آج ہر مشکل میں گویا کامراں کشمیر ہے

شہر میں، دیہات میں، تعلیم کا چرچا ہے عام
آج گویا علم و حکمت کی دکاں کشمیر ہے

دیکھتا ہوں جس گھڑی اظہار میں کشمیر کو
دل یہ کہتا ہے دلِ ہندوستاں کشمیر ہے

(اظہار ملیح آبادی)

اے وادیٔ لولاب

انی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
رغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب — اے وادیٔ لولاب

ر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
یں بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب — اے وادیٔ لولاب

یں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب — اے وادیٔ لولاب

(اقبال)

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

(چکبست لکھنوی)

اس شمارے کے لکھنے والے

ڈاکٹر محمد اشرف - راج باغ - سری نگر - مشہور تاریخ دان

مولانا عبدالباقی - ایڈیٹر ہفتہ وار پیام وطن دہلی - مشہور صحافی اور ادیب

پریم ناتھ در - ۵ ویسٹرن ایکسٹینشن قرولباغ نئی دہلی - اردو کے ممتاز افسانہ نگار

دینا ناتھ مست - ۶ - ای بلاک کناٹ پلیس نئی دہلی - کشمیر کے مشہور شاعر اور صحافی۔

ساغر نظامی - ۱۳۶ ساؤتھ ایونیو نئی دہلی - اردو کے مشہور شاعر

چندر گپت ودیا النکار - ۲ پٹودی ہاؤس نئی دہلی - ہندی کے مشہور افسانہ نگار - آج کل ہندی کے ادارے کے سیکرٹری

مرزا عارف بیگ - سپیشل آفیسر منسٹری آف ڈویلپمنٹ جموں اینڈ کشمیر سرینگر - کشمیری زبان کے نامور شاعر اور ساہتیہ اکاڈمی کے ممبر

جیا لال ناظر - عالی کدل - سری نگر کشمیر - ثقافت کشمیر کے محقق اعلیٰ

گھنشام سیٹھی - سیٹھی برادرز سری نگر کشمیر - ہندی اردو اور پنجابی کے ایک نوجوان ادیب

کشمیری لال ذاکر - گورنمنٹ ہائی اسکول گوڑگانوں - اردو کے مشہور افسانہ نگار

نند لال واتل - ہفتہ نامہ خدمت سری نگر کے ایڈیٹر

ملک - ایس کے ہامزئی - ۸/۹ روپ نگر دہلی - انگریزی ماہ نامہ کشمیر کے ایڈیٹر

دیویندر ستیارتھی - ۱۰۰ بیرڈ روڈ نئی دہلی پبلیکیشنز ڈویژن میں ہندی کے ایڈیٹر

میر غلام رسول نازکی - سی آئی ڈی سری نگر - سرینگر کے مشہور اردو شاعر اور ادیب

سید محمد شفیع - ڈپٹی ڈائرکٹر انڈسٹریز - جموں اینڈ کشمیر سری نگر

حافظ علی بہادر خاں - ہفتہ وار "عہد جدید" دہلی کے ایڈیٹر

وید راہی - سہ روزنامہ "نیر جموں" جموں کے ایک نوجوان ادیب

اظہار ملیح آبادی - ۰۰/۱ مال روڈ دہلی - اردو کے نوجوان شاعر

رعایتی ٹکٹ

جو لوگ موسم گرما میں میدانی علاقے کی گرد اور گرمی سے بچنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے پہاڑوں پر چند دن آرام کرنا نہایت ہی پرلطف ہے۔ کشمیر سے اوٹاکمنڈ اور آبو روڈ سے شیلانگ تک ہندوستان کے پہاڑی مقامات ہر سیر کرنے والے کی حیثیت اور مذاق کے مطابق مناظر قدرت، خوش گوار آب و ہوا اور آسائش مہیا کرتے ہیں۔

ہندوستانی ریلوں نے یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے پہاڑی مقامات کے لئے رعایتی ٹکٹ جاری کئے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

کرایہ۔ واپسی ٹکٹ کے لئے ایک طرف کا پورا اور ایک طرف کا نصف کرایہ۔

درجہ۔ پہلے، دوسرے، تیسرے اور سرونٹ کلاس کے لئے رعایتی ٹکٹ مل سکتے ہیں۔

مُدت استعمال۔ سفر شروع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ تک۔

یہ ٹکٹ۔ ہندوستان کے ہر اسٹیشن سے ذیل کے مقامات تک مل سکتے ہیں۔ شملہ، سولن، دھرم پور (پنجاب) دیرہ دون، پٹھان کوٹ، کاٹھ گودام، اوٹاکمنڈ۔ کوڈائی کنال روڈ، آبو روڈ، کونور، دارجلنگ، اگر سیونگ، شیلانگ، پاپیریا، کوٹ گری آوٹ ایجنسی (میٹو پالیم۔ ریلوے اسٹیشن سے ریل کے سفر کے لئے ایک طرف کا پورا، اور ایک طرف کا نصف کرایہ۔ سڑک کے سفر کے لئے دونوں طرف کا پورا کرایہ)

واضح رہے کہ ٹکٹ انھیں اسٹیشنوں سے جاری کئے جائیں گے، جہاں سے فاصلہ سفر ۱۵۰ میل یا اس سے زیادہ ہوگا۔

یہ رعایتی ٹکٹ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک جاری ہوتے رہیں گے۔

ریاست جموں و کشمیر کو جانے والے اصحاب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا متعلقہ حکام سے ریاست میں داخل ہونے کی پرمٹ پہلے حاصل کرلیں

پوری تفصیلات قریب کے اسٹیشن ماسٹر سے مل سکیں گی۔

ناردرن ریلوے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ ——— نمبر ۲

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے ڈاک،
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے ڈاک،

ستمبر ۱۹۵۵ء

سرورق - نئی دہلی میں عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ - جس کی مرمت حکومت ہند کے اہتمام سے ہو رہی ہے - رحیم فارسی کے علاوہ ہندی کے مشہور شاعر اور شاعر نواز تھے -

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

کوثر قریشی

وادیٔ کشمیر

اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

تو پیکرِ جنّت ہے کہ جنّت تری تصویر

کلیوں کے یہ انبار یہ پھولوں کے خزانے
راتیں تری فطرت کے مہکتے ہوئے گیسو

یہ زندۂ جاوید بہاروں کے فسانے
جبیں تری اک ساحرِ فن کار کا جادو

جھرمٹ میں چناروں کی یہ رقصِ مہ و خورشید
درّے ترے شاداب تو چشمے ترے زرّار

پشتوں[ل] کی چہکار یہ جھرنوں کے ترانے
آتی ہے تری خاک سے فردوس کی خوشبو

آئینۂ ڈل میں یہ ترے حُسن کی تنویر
سنگیت کی لہروں پہ ہے قائم تری تعمیر

اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

موسم ترا پُرکیف ، فضائیں تری دھانی
یہ آبِ ولر اور یہ جہلم کے کنارے

اک نغمۂ دل کش ترے چشموں کی روانی
گُل ریز یہ طوفان ، اگھر بار یہ دھارے

گلمرگ و پہلگام کے گُل پوشش یہ منظر
ریشیوں کے یہ استھان یہ ولیوں کے مزارات

یہ مستی ہی مستی یہ جوانی ہی جوانی
یہ قصر یہ ایوان یہ مناد یہ منارے

ہے اوجِ ثریا سے بھی اونچی تری تقدیر
فردوس کی حوروں کے حسیں خواب کی تعبیر

اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

ل کشمیر کا ایک خوش نما پرند

یہ تری زمیں لعل و جواہر کا ہے معدن
تقدیس کا، تہذیب کا، تخلیق کا مخزن
وہ شیفتگیٔ حسنِ تخیل ترے افکار
تاریخ کا حاصل ہے ترا علم ترا فن
جادے ترے منزل ہیں تو مٹی تری اکسیر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

آراستہ ہر گل سے ترا صحنِ چمن ہے
ہر رخ میں ترے عارضِ تاباں کی کرن ہے
مولد ہے تو ہر شخصیتِ[1] خاص وطن کا
تو روحِ وطن حضرتِ ٹیپو[2] کا وطن ہے
ہیں انور[3] و اقبال و بخاری[4] تری تفسیر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

اُگلے تری مٹی نے وہ موتی[5] وہ جواہر[6]
تقدیرِ وطن آج بھی ہے جن سے منور
پیدا کیے وہ فلسفی و شاعر و فن کار
ہیں اہلِ نظر جن کے کمالات پہ ششدر
ہے مایۂ سرسید[7] و انشا[8] تری جاگیر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

اجمل[9] کے حکیمانہ تدبر میں تری شان
تو ہند کے پہلو میں ہے سرچشمۂ یونان
ہے حالی[10] و چکبست[11] کے افکار سے ظاہر
مضمر ہے تری خاک میں شیراز کا عرفان
اور شیکسپیئر ساز ترے حشر[12] کی تحریر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

مضرابِ افق اور یہ ترا سازِ گلستاں
ہوتی ہے نسیمِ[13] سحری جس پہ غزل خواں
ہیں دیدہ و دل تیری جوانی سے ضیاباں
سپرو[14] کی ذہانت میں ترا حسنِ نمایاں
اے نورِ وطن نورِ جہاں نورِ جہانگیر
اے وادیٔ کشمیر، مری وادیٔ کشمیر

---

[1] خواجہ غلام محمد صاحب مصنف انقلابِ کشمیر کی معلومات کے مطابق ہندوستان کی متذکرہ عظیم شخصیتیں "خاکِ کشمیر" کے نام سے منسوب ہیں۔
[2] شہیدِ وطن سلطان ٹیپو
[3] حضرت انور شاہ صاحب محدث
[4] امیرِ ملت حضرت عطا اللہ شاہ بخاری
[5] پنڈت موتی لال نہرو
[6] پنڈت جواہر لال نہرو
[7] سر سید احمد خاں بانی علی گڑھ یونیورسٹی
[8] حضرت انشاء اللہ خاں انشاء
[9] حکیم محمد اجمل خاں
[10] مولانا حالی
[11] پنڈت برج نرائن چکبست
[12] آغا حشر کاشمیری
[13] دیا شنکر نسیم
[14] محسنِ اردو سر تیج بہادر سپرو

یہ دولتِ یکجہتی نہیں تیرے جگر بند[1]
یکتائے جہاں ہیں ترے شہ زور و ہنرمند
مظہر تری قوت کے ہیں گونگا[4] و امامی[5]
ہیں رستم و سہراب سے بڑھکر ترے فرزند
صدیقیہ[6] و گاما[7] تری چلتی ہوئی شمشیر
اے وادیٔ کشمیر، مری وادیٔ کشمیر

یہ دورِ جواں ہے ترے ایثار کا حاصل
ہستی ہے تری جرأتِ پیکار کا حاصل
ہر سمت یہ تنظیم و ترقی کی اُمنگیں
حاصل ہیں ترے جذبۂ بیدار کا حاصل
یہ تیرا نیا عزم نئی کوششِ تعمیر
اے وادیٔ کشمیر، مری وادیٔ کشمیر

لوٹا کئے برسوں تجھے دولت کے پرستار
لیکن نہ ہوا کم ترا سرمایۂ ایثار
ہر چند حوادث کے اُٹھے حشر بلاخیز
بدلی نہ کسی حال تری غیرتِ خوددار
فطرت ترے بیٹوں کی ہے ناقابلِ تسخیر
اے وادیٔ کشمیر مری وادیٔ کشمیر

آیا ہے تری زندگیٔ نو کا زمانہ
آزادیٔ جمہور کا گائے جا ترانہ
وہ دورِ غلامی کی روایات بدل کر
ترتیب دے خود اپنی حقیقت کا فسانہ
تو آج ہے خود اسپِ سیاست کی عناں گیر
اے وادیٔ کشمیر، مری وادیٔ کشمیر

یہ ترے لئے ہر دشتِ دل آزا سے گزرے
ہر جادۂ خوں ریز و شرربار سے گزرے
ان تیرے جواں سال شہیدوں کو سلامی
ہنستے ہوئے جو عرصۂ پیکار سے گزرے
ٹھوکر سے جگاتے ہوئے سوئی ہوئی تقدیر
اے وادیٔ کشمیر، مری وادیٔ کشمیر

تو ہند کی پیشانیٔ عظمت کا ہے جھومر
تجھ سے ہے نئے ہند کی تقدیر منوّر
تو ہند کے ماتھے پہ ہے وہ گوہرِ شبتاب
اک ایک کرن جس کی جوابِ مہ و اختر
اور ہند کی عظمت ہے تری خوبیٔ تقدیر
اے وادیٔ کشمیر، مری وادیٔ کشمیر

۱۔ ڈاکٹر ایم، ایس رائے ۲۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ۳۔ مولانا مظہر علی اظہر ۴۔ گونگا پہلوان ۵۔ رستمِ ہند امام بخش پہلوان ۶۔ صدیقیہ پہلوان ۷۔ رستم زماں گاماں پہلوان

(ڈاکٹر) سلامت اللہ

جمہوریت اور بنیادی تعلیم

آج ہم یہ بہت معمولی بات سمجھتے ہیں کہ ہر بچے کے لئے ریاست کی طرف سے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک زمانے میں اس کا تخیل بھی ممکن نہ تھا۔ ابھی کچھ بہت دن نہیں ہوئے جب کہ ہمارے ایک قومی رہنما اور محب وطن کو مرکزی مجلس قانون ساز میں لازمی تعلیم کے بل کی حمایت کرتے ہوئے نہایت پُر درد لب و لہجہ میں کہنا پڑا تھا " جنابِ والا! میں جانتا ہوں کہ آج کا دن ختم ہونے تک میرا بل نامنظور ہو جائے گا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا اور میں اس وجہ سے بددل بھی نہیں ہوں گا ...... میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے اور میں کہتا بھی رہا ہوں کہ ہم موجودہ نسل کے ہندوستانی صرف یہ امید کرسکتے ہیں کہ اپنے ملک کی خدمت اپنی ناکامیوں سے کریں۔ وہ لوگ جن کو یہ سعادت حاصل ہوگی کہ وہ اپنی کامیابیوں سے دیس کی سیوا کرسکیں، ہمارے بعد آئیں گے ...... مگر جناب والا! ہماری کوششوں کا جو بھی حشر ہونے والا ہو، ایک بات بالکل صاف ہے۔ ہمیں یہ محسوس کرنے کا حق ہے کہ ہم نے اپنا فرض پورا کردیا ہے اور جہاں فرض کی پکار صاف ہو، کوشش کرکے ناکام ہونا بہتر ہے بہ مقابلہ اس کے کہ بالکل ہاتھ پیر ہی نہ ہلائے جائیں۔"

گوپال کرشن گوکھلے نے ۱۹۱۲ء میں لازمی تعلیم کے لئے جو تجویز پیش کی تھی اس میں صرف ۶ سے ۱۰ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے تعلیم کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ بھی نامنظور کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے کی اور آج کی حالت میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ہندوستان کے موجودہ دستورِ اساسی میں جو ۱۹۵۰ء سے ہمارے یہاں آئین کی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ دفعہ ۴۵ میں درج ہے۔ " ریاست کوشش کرے گی کہ اس دستور کے شروع ہونے سے دس سال کے اندر چودہ سال تک کے تمام بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔"

تعلیم سے متعلق ریاست کے رویّے میں جو یہ غیر معمولی تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے۔ یہ تقاضا ہے اس نظامِ زندگی کا جو ہم اپنے دیس میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے سو سال میں ہندوستانیوں نے آزادی اور خوش حالی کے لئے جو جد وجہد کی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی واضح ہوتی گئی ہے کہ ہماری سماجی زندگی کی تعمیر کس نہج پر ہوگی۔ اس سلسلے میں جمہوریت کو آدرش کے طور پر اپنایا گیا ہے اور جمہوریت کا قیام اس وقت تک ڈانواں ڈول رہے گا، جب تک دیس کے سبھی بسنے والے تعلیم اور تہذیب کی دولت سے مالامال نہ ہوں۔ چنانچہ سب کے لئے تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کا مطالبہ جمہوریت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ دور میں تمام لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اب طریقِ پیداوار کو اس وقت تک بخوبی استعمال نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کام کرنے والے پڑھے لکھے نہ ہوں۔ غالباً ازمنہ وسطیٰ میں شہنشاہ اکبر یا شاہجہاں اَن پڑھ ہونے کے باوجود بہت کامیابی سے اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرسکتا تھا۔ لیکن آج جدید کارخانے کا معمولی مزدور یا سائنسی طریقے سے کھیتی باڑی کرنے والا کسان صرف اسی صورت میں اپنا کام ٹھیک طرح انجام دے سکتا ہے جب کہ اس میں کم سے کم اپنے کام سے متعلق ضروری ہدایات کو پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت ہو۔ یعنی اس دور میں پیداوار کا انحصار زیادہ سے زیادہ کام کرنے والوں کی تعلیم پر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ پیداوار کے استعمال اور کھپت کے لئے بھی آج ہر شخص کے لئے پڑھنا لکھنا ضروری ہو گیا ہے تاکہ وہ اخبارات اور اشتہارات کو دیکھ کر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکے۔ چنانچہ لازمی تعلیم کا نعرہ پہلی بار انسانی تاریخ کے اس دور میں سنائی دیتا ہے جب کہ انقلابِ فرانس کے بعد نظامِ سرمایہ داری کے ماتحت نئے طریقِ پیداوار کی داغ بیل پڑتی ہے۔ بہرکیف آج پیداوار کو بڑھانے کے لئے بھی لازمی تعلیم کی ضرورت ہے۔

اس طرح سے دیکھئے تو بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم جمہوری زندگی کی شاہ راہ پر ایک بہت بڑا قدم ہے، جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ ۷ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک کے تمام لڑکے اور لڑکیوں کی مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ریاست کو کرنا چاہیئے

اس لئے کہ جمہوری نظام کا دار و مدار با خبر اور مہذب شہریوں پر ہے، جو اپنی زندگی کی تعمیر اور تنظیم کے لئے سوجھ بوجھ اور دسٹگرپن کے ساتھ جماعتی ادارے قائم کر سکیں اور چلا سکیں۔ جو اپنی انفرادی صلاحیتوں کو پورے طور پر اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ جماعتی زندگی کے حسن کو نکھار سکیں، جو اپنی جبلّت یکّی کرنے کا راز جماعت کی نجات میں ڈھونڈ سکیں۔ ایک ایسے سماج میں جہاں تعلیم کی سہولتیں صرف چند لوگوں کو میسّر ہوں، سب کو نہ ہوں، جماعتی زندگی سکڑ کر رہ جاتی ہے، اس لئے کہ اس کی ترقی میں سب کی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا موقع نہیں ہوتا۔ اس طرح نہ صرف وہ لوگ جو تعلیم سے محروم رکھے جاتے ہیں، گھاٹے میں رہتے ہیں، بلکہ پورا سماج بھی مجموعی حیثیت سے نقصان اٹھاتا ہے۔ لہٰذا لازمی تعلیم جمہوریت کی پہلی شرط ہے اور اگر یہ ضروری ہے کہ ہر شخص تعلیم سے فائدہ اٹھائے تو یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم مفت ہو، تاکہ سبھی لوگ بغیر کسی مالی دشواری کے اسے حاصل کر سکیں۔ اس لحاظ سے بنیادی تعلیم صحیح معنوں میں جمہوریت کی آئینہ دار ہے۔

مفت اور لازمی تعلیم کا ایک جمہوری پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے دیس میں گاؤں اور شہر کی تہذیبی زندگی میں جو ایک ناخوشگوار فرق پیدا ہو گیا ہے، اسے مٹایا جائے، سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ساتھ گاؤں کی دولت سمٹ سمٹ کر شہروں میں آگئی ہے۔ ٹیگور کے قول کے مطابق "گاؤں عورت کی مانند ہے" جس کے حسن اور توانائی کے سرچشمے، شہر کے رنگ روپ کی آبیاری کرتے کرتے خشک ہو گئے ہیں۔ اور اب گاؤں ایک بدصورت بڑھیا کی طرح بے کیف اور غیر دلکش ہو کر رہ گیا ہے۔ گاؤں کی تہذیبی زندگی کو سنوارنے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں بھی کم از کم ابتدائی تعلیم کا اتنا ہی اچھا انتظام ہو جیسا کہ شہر میں ہے۔ بنیادی تعلیم کی اسکیم کا منشاء یہی ہے کہ آٹھ سال کی لازمی تعلیم کا معیار گاؤں اور شہر دونوں جگہ کے مدرسوں میں یکساں ہونا چاہیئے۔ اس طرح گاؤں کی تہذیبی سطح کو اونچا اٹھانے میں مدد ملے گی اور یہ بھی جمہوریت کی طرف ایک قدم ہوگا۔

تعلیمی اعتبار سے ہمارے دیس میں ایک اور چیز جمہوریت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ لوگ جن کو نیچ جات یا اچھوت کہا جاتا ہے، بڑی حد تک تعلیم سے محروم رکھے گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو نام نہاد اونچی جماعت کے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے پر اگر آئینی نہیں تو سماجی پابندیاں ضرور رہی ہیں۔ بنیادی تعلیم اس ناانصافی کو بھی مٹانا چاہتی ہے اور تمام بچوں کے لئے جات پات کے امتیاز کے بغیر مدرسے کے دروازے کھولنے پر اصرار کرتی ہے۔

اسی طرح ہمارے سماج میں ہاتھ کے کام اور ذہنی کام میں جو فرق روا رکھا جاتا ہے وہ بھی جمہوریت کے حق میں مُضر ثابت ہو رہا ہے۔ معمولاً ہاتھ کے کام کو ذہنی کام سے گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابھی چند سال پہلے تک تعلیم کے معنی صرف یہ تھے کہ آدمی فقط لکھنا پڑھنا سیکھ جائے اور اسے جسمانی محنت مشقت کا کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں اکثریت اُن بچوں کی ہوتی تھی جن کے گھروں میں جسمانی محنت کے کام کو بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور جو یا تو اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو ذہنی کام کے ذریعے سے اپنی روزی کماتا ہے یا جو اپنی جائداد اور سرمائے کے بل بوتے پر خود بغیر کچھ کام کئے ہوئے فارغ البالی کی زندگی گزارتا ہے۔ ان حالات میں محنت کش طبقے کے بچے عام طور پر تعلیم کی نعمت سے محروم رہتے تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے جب تعلیم کو جمہوری زندگی کی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ اس مقصد کو بنیادی تعلیم نے اس طرح پورا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدرسے میں ایسے عملی کاموں کو خاص جگہ دی ہے، جن سے کوئی نہ کوئی سماجی ضرورت پوری ہوتی ہے۔

ہاتھ کے کام یا کارآمد کام کی بنیاد پر ہی جمہوری نظامِ زندگی کی عمارت بنائی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جو زندگی کی تمام مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں نکمے اور نکھٹو اور جونکوں کی طرح زندگی بتانے والے طبقے موجود ہوں، صحیح معنوں میں جمہوری نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت محض ایک سیاسی تصور نہیں ہے کہ تمام لوگوں کو ملک کے سیاسی نظام میں مساوی حقوق حاصل ہوں۔ جمہوریت کا تصور پوری زندگی پر حاوی ہوئے ہے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو جمہوریت کا اصول یہ ہونا چاہیئے۔ "جو بوئے گا وہی کاٹے گا، جو کام نہ کرے گا وہ کھائے گا بھی نہیں۔"

جمہوریت کے اس مفہوم کے پیشِ نظر ہمیں بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے کارآمد کام کی عزت پیدا کرنی ہوگی اور یہ محض وعظ و تلقین یا کتابی تعلیم کے ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان کی تعلیم میں کام کو اہمیت دی جائے اور انھیں اس کی سماجی قدر و قیمت کا احساس عملی طور پر دلایا جائے۔ اس طرح ہاتھ کے کام کی طرف بچوں میں جو رجحان پیدا ہوگا وہ ذہنی اور جسمانی کام کے مصنوعی اور غلط امتیاز کو ختم کرنے میں مدد دے گا۔ بنیادی تعلیم میں حرفے یا دستکاری پر جو زور دیا گیا ہے۔ اس سے جمہوریت کے اس بنیادی

اصول کی پیروی ہوتی ہے۔

جمہوریت کا قومی تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق ہے کسی ملک میں جمہوری نظام کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا جائے۔ تہذیب و تمدن کا سب سے اہم آلۂ کار زبان ہے۔ لہٰذا وہ تعلیم جو جمہوریت کے مقاصد کو پورا کر سکتی ہے، لازمی طور پر مادری زبان کے ذریعے سے دی جانی چاہیئے۔ چنانچہ بنیادی تعلیم میں اسے ایک اصولی حیثیت دی گئی ہے کہ بچے کی تعلیم کا ذریعہ اس کی مادری زبان ہونا چاہیئے

بنیادی نصاب تعلیم کی ترتیب اور تدریس میں یہ چیز ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیئے کہ اس کے ذریعے سے بچوں میں آٹھ سال کے اندر وہ تمام بنیادی قابلیتیں ابھار کر اور رجحانات پیدا ہو جائیں جو ایک جمہوری سماج کے قائم کرنے اور مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور شہری ذمے داریوں کو نبھانے کی قابلیت ہے۔ دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں بنیادی مدرسے میں اس کے زیادہ امکانات ہیں۔ اس لئے کہ یہاں تعلیم کا مرکز ہاتھ کا کام اور دوسرے سماجی مشغلے ہیں۔

غرض بنیادی تعلیم ایک جمہوری نظامِ زندگی کی داغ بیل ڈالنے اور اسے پروان چڑھانے میں مدد دے سکتی ہے۔ لیکن اس وقت بنیادی تعلیم کے سامنے ایک خطرہ ہے، جس سے تمام جمہوریت پسندوں کو آگاہ ہونا چاہیئے۔ مختلف صوبوں میں بعض بظاہر معصوم اسکیمیں پیش کی جا رہی ہیں جو تعلیم کی جمہوری شکل و صورت کو بگاڑ دیں گی۔ یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ لازمی تعلیم کی ۶ سے ۱۴ سال کی مدت میں مختلف قسم کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ جو سرپرست اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کر سکتے ہیں انھیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو بنیادی مدرسے کی بجائے کسی مڈل اسکول، ہائی اسکول یا پبلک اسکول میں داخل کرا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غریبوں کے بچے جو خود خرچ کر کے نہیں پڑھ سکتے وہ بنیادی مدرسے میں تعلیم حاصل کریں گے جہاں ہاتھ کے کام کے ذریعے سے تعلیم ہوگی اور امیروں کے بچے حسبِ دستور دوسرے اسکولوں میں نظری اور کتابی تعلیم حاصل کرتے رہیں گے۔ اس سے ایک طرف تو یہ نقصان ہوگا کہ ذہنی اور جسمانی کام کا فرق قائم رہے گا اور ہاتھ کے کام کو ذلیل اور گھٹیا سمجھا جاتا رہے گا، جو جمہوریت کے حق میں مضر ہے اور دوسری طرف بنیادی مدرسے کو موزوں اور کافی ساز و سامان اور قابل اُستادوں سے لیس کرنے سے غفلت برتی جائے گی اور وہاں تعلیم کا معیار نیچا رہے گا اس لئے کہ موجودہ سماج میں جو صاحب اقتدار طبقہ ہے اور جس کی آواز میں زور ہے وہ اپنے بچوں کو دوسری قسم کے اسکولوں میں تعلیم دلوائے گا۔

اس خطرے کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ اس بات پر اصرار کیا جائے کہ لازمی تعلیم کی مدت کے دوران میں سب بچوں کے لئے ایک ہی مشترکہ مدرسہ ہوگا۔ یعنی بنیادی مدرسہ۔ اس کے علاوہ اس مدتِ تعلیمی کے لئے کسی اور قسم کے مدرسے کا وجود ممکن نہ ہوگا۔ تاکہ ریاست اپنے ان تمام تعلیمی وسائل کو بنیادی تعلیم کی ترقی کے لئے استعمال کر سکے جو مفت اور لازمی تعلیم کے لئے وہ مہیا کر سکتی ہے۔ بنیادی تعلیم جمہوریت کو صرف اسی صورت میں تقویت پہنچا سکتی ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ بھارت میں سب سے زیادہ ربڑ، ٹراونکور کوچین میں پیدا ہوتا ہے۔ کل رقبہ زیر کاشت کا ۵۰ فی صدی اس ریاست میں ہے

۲۔ اور مدراس کا درجہ دوسرا ہے جہاں رقبہ زیر کاشت کا ۱۲½ فیصدی ہے۔ باقی ماندہ ۲½ فیصدی رقبہ میسور اور کورگ میں ہے۔

۳۔ آل انڈیا کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ نے مشہور و معروف ڈھاکہ کی ململ پھر سے تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۴۔ حکومتِ ہند ۵۶-۱۹۵۵ء میں میٹرک کے بعد کی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کے لئے نابینا طالب علموں کو محدود تعداد میں سو سو روپے کی مالیت کے وظائف دے گی۔

ڈاکٹر گیان چند

داستانوں کے فروغ وزوال کے اسباب

فنونِ لطیفہ بھی اپنے مادّی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اُردو ادب کی صنفِ افسانہ پر یہ مقولہ جس حد تک صادق آتا ہے اُس قدر دوسری اصناف پر نہیں۔ آغاز داستان سے نذیر احمد و سرشار، پریم چند اور کرشن چندر تک ایک ایسی رَو ہے جس میں معاصر زندگی کے سماجی اور ذہنی تغیرات فلم کی طرح منعکس ہیں۔ غدر سے پہلے داستانیں ہی لکھی جا سکتی تھیں، اور غدر کے بعد ناول اور جدید افسانے ہی پسند کئے جا سکتے تھے۔ داستانوں کے فروغ و زوال میں ملک کے سیاسی اور معاشی حالات کا زبردست ہاتھ تھا۔

اُردو کی تقریباً تمام داستانیں انیسویں صدی میں لکھی گئیں، جو فارسی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ اُن میں سے بیشتر اٹھارویں صدی کی تصنیف ہیں۔ ملک کی جو سیاسی موت انیسویں صدی میں واقع ہوئی اس کی علامات اٹھارویں صدی میں نمودار ہونے لگی تھیں۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ملک شطرنج کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کے بعد سے غدر تک ایک جاں کنی۔ کربِ نزع کی داستان ہے۔ سیاسی بے بسی سے ذہنوں میں پستی آگئی۔ قومی کردار گر گیا۔ حکومت کے اختیارات بدیسیوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے تھے۔ اس لئے ہندوستانی حکمرانوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنے کے سوا اور کوئی فریضہ نہ رہا تھا۔ تساہل کی وجہ سے خالی ذہن عیش پرستی کی طرف راغب ہوئے۔ ماحول کے ساتھ پرجا بھی رنگی گئی۔ ایک دفعہ ہی بود و ماند، فنون و حرفت، سب میں نیا جمال آیا۔ چراغ خاموش ہونے سے پہلے بھڑکا۔ طبقۂ بالا کی عارضی اور سطحی خوش حالی نے تہذیب میں نیا رنگ بھرا۔ لکھنؤ کی سلطنت نئی تھی، زیادہ شاداب تھی۔ وہاں عیش پرستی کی نئی نئی قسمیں ایجاد ہوئیں۔ دلّی میں محمد شاہ رنگیلا اور لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ جیسے خوش باش، سرمستِ ازل حاکم ہوئے۔

داستانوں کے فروغ میں ایک فراری جذبہ کارفرما تھا۔ اُن کی دُنیا تلخیوں سے پناہ دیتی تھی۔ اِس میں پہنچ کر بے بسی اور بے طاقتی سے رہائی مل جاتی تھی۔ ہیرو اور اس کے ساتھیوں کی فتح داستان کے شائقین کی فتح تھی۔ دست و پا کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ تھی۔ تخیل سب ہفت خواں طے کر کے رکھ دیتا تھا۔ داستان کے ہیرو میں وہ تمام اوصاف جمع کر دئے جاتے تھے، جن سے سننے والوں کے منہ میں پانی بھر آتا۔ کاش وہ بھی ایسے ہوتے، ان کی تمام آرزوئیں داستانوں کی دُنیا میں موجود تھیں۔ عشق کے معاملے، وصل کے محاکاتی بیان، غیر معمولی شجاعت۔ قابلِ رشک حُسن، یہاں کیا کچھ نہ تھا، وہ اِس حسین خواب میں کھو جاتے۔ شیخ چلّی کی طرح خیال ہی خیال میں دولت و عشرت دنیا حاصل ہو جاتی تھی۔ امارت کے لوازم میں ایک داستان گو بھی ہوتا تھا، جو رات کو داستان چھیڑ کر اپنے مُربّی کے دماغ کو لوریاں دیتا تھا۔ کامل فن داستان گو جدھر نوّاب صاحب کا رجحان دیکھتا اسی سمت واقعات کا رُخ پھیر دیتا تھا۔ نوّاب صاحب کو معلوم ہوتا، گویا خود اُنھوں نے یا اُن کے کسی نائب نے مہم سر کر لی۔ اسی نشے میں حضور خواب کی دنیا میں تشریف لے جاتے، اور وہاں بھی شاید پریوں کی تسخیر کرتے رہتے۔ وہ بھی کیا زندگی تھی۔

اگلے زمانے میں ما فوق الفطرت پر واقعی اعتقاد تھا، جن و پری، اور جادو ٹونے کے منکر کم تھے، اور معتقد زیادہ۔ رؤسا کے علاوہ عوام کو بھی یہ بیانات اس لئے پسند آتے تھے کہ ان میں سامعین کی طرح کے گوشت و پوست کے آدمی کیا کیا کارنامے نہ کر لیتے تھے۔ وہ سوچتے کاش ہمیں ذرا سا جادوگر کا سا سحر آ جائے تو ہم یہ کریں اور وہ کریں۔ انھیں بھی الہ دین کے چراغ یا ہوا پر اُڑنے والے غالیچے کی تلاش ہوتی۔ کاش کوئی جادو کی چھڑی مل جائے تو دنیا میں غلغلہ برپا کر دیا جائے۔ پریوں کی کہانیوں کا زہریلا اثر

اچھی اچھی سنجیدہ عقلوں کو بیمار کر دیتا تھا۔ داستانوں کا مطالعہ افیون کا کام کرتا تھا۔ پڑھنے والوں کا دماغ ذہنی عیاشی کا شکار ہو جاتا تھا۔ ذہنی عیاشی عملی عیاشی سے زیادہ مُضر ہوتی ہے۔

اٹھارھویں صدی میں شمالی ہند میں شاعری تو زور پکڑ چکی تھی لیکن نثر کا رواج خال خال تھا۔ اس صدی میں اُردو فارسی کی جگہ نہ لے سکی تھی۔ پُوری صدی کی نثر کی کائنات دہ مجلس۔ تراجم قرآن اور نوطرز مرصع تک محدود ہے۔ ان میں محض آخری کتاب ادب آفرینی کی غرض سے لکھی گئی۔ ادبا اردو نثر میں کتابیں کیوں لکھتے۔ اس وقت تک علمیت اور قابلیت کی نمود کے لئے فارسی معیاری زبان تھی۔ شاعری کے میدان میں تو اُردو نے جگہ بنالی، لیکن نثر میں وہ فارسی سے پست ہی سمجھی جاتی تھی۔ اُردو کے شعرا کے تذکرے فارسی میں لکھے۔ غالب جیسا اردو کا شاعر تقریباً ۱۸۴۷ء تک فارسی میں خط لکھتا تھا۔ شاعری کی سرپرستی تو بادشاہوں اور نوابوں نے کی۔ نثر نگاروں کو کون نوازتا۔ جسے ادب کا شوق ہوتا وہ نظم میں طبع آزمائی کرتا۔ نثر کا رجحان اس وقت ہوا جب کہ دانایانِ کلکتہ نے داستانیں ترجمہ کرا کے نثر کی پیش روی کی۔

فورٹ ولیم کالج نو وارد انگریز حکام کو ہندوستانی سکھانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ کالج کے قیام سے پہلے اُردو نثر میں سناٹا تھا۔ نصاب کے لئے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ نئی کتابیں لکھانے کی بجائے دوسری زبانوں سے تیار مسالہ لینا زیادہ سہل سمجھا گیا۔ انگریزوں کو محض زبان سکھانا تھی، ہندوستانی علوم میں تو تربیت دینا نہ تھی۔ اس کے لئے افسانوں سے زیادہ موزوں کیا ہو سکتا تھا۔ کالج میں افسانوں کے علاوہ دوسرے علوم کی کتابیں بہت کم لکھی گئیں۔ یہ داستانیں عام طور سے سادہ اور رواں زبان میں لکھی گئیں۔ دس پندرہ سال تک جب ادیبوں نے افسانوں میں تو تیں صرف کیں تب نثر سے حقارت اور جھجک جاتی رہی، اور نثر میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا۔

غدر سے پہلے کے نثری ادب پر داستانوں کا غلبہ ہے۔ اس کے بہت سے وجوہ ہیں۔ نثر لکھنے والوں کا نصب العین قابلیت کی نمود تھی۔ وہ زباں دانی کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ میر امن نے باغ و بہار میں زبان ہی کو اپنا طرۂ فخر مانا ہے۔ کلکتہ کے تراجم زبان ہی کی غرض سے کرائے گئے۔ مثلاً فسانۂ عجائب

اور اُس کے مقلدین متلاشیِ الفاظ ہی پر نازاں ہیں۔ ادبیت دکھلانے کا موقع فسانے سے زیادہ اور کہاں مل سکتا ہے۔ علوم کے فقدان کا دوسرا سبب یہ تھا کہ علمی تصانیف کے لئے زیادہ علم و فضل کی ضرورت تھی۔ اس عہد میں خلاقی اور مدارج عنقا تھی۔ علوم کی ترقی اس عہد میں ہوتی ہے جب ملک کو سیاسی اطمینان حاصل ہو۔ قوم میں واقعی خوش حالی اور امن ہو۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں طبقۂ بالا میں بظاہر شادابی کا ملمع نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر وحشت بار دوش جذبات بھرے ہوئے ہیں۔ عوام میں اضمحلال ظاہر تھا، خواص میں پنہاں، انیسویں صدی کے آشفتہ مغزوں کو یہ سکت کہاں کہ وہ مستند خشک دقیق کتابیں پڑھ کر اُن کی تہ سے گوہر نکالتے۔ ادیبوں میں غور و فکر کی صلاحیت سلب ہو چکی تھی۔ قومی کردار میں زوال آنے کی وجہ سے وہ تن آسان اور سہل پسند ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک سادہ صنعت کی طرف توجہ کی اور وہ بھی فارسی سے منتقل کر لی تاکہ انھیں اسلوب نگاری کے علاوہ کوئی زحمت نہ کرنی پڑے۔

داستانوں کی تصنیف کی ایک اور وجہ تھی۔ یہ ہر دل عزیز صنعت تھی۔ ادیبوں کو عوام و خواص دونوں سے داد لینا تھی۔ اہلِ ثروت کو فلسفہ و تاریخ و منطق سے کیا کام۔ اس عہد کے سماج کے چند مشاغل ملاحظہ کیجئے۔ بٹیر بازی، پتنگ بازی، کبوتر بازی، شاہد بازی، سادہ لوح نواب، طرارے علم معاد، افیون گھل رہی ہے۔ پونڈے پر چا تو تیز ہو رہا ہے، فقرہ بازی چل رہی ہے۔ بے پر کی اُڑائی جا رہی ہیں۔ دیوان خانے میں اہلِ طرب بھی موجود ہیں۔ اس فضا میں وہ سنجیدگی کہاں جس میں تخلیق علم ہو۔ افیون کے ساتھ داستانِ امیر حمزہ کا نشہ ہی سماں باندھ سکتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ افسانے وہیں زیادہ مقبول ہوتے ہیں جہاں لوگ زیادہ تن آسان ہوتے ہیں۔ داستانوں کا موضوع اس سوسائٹی کے فکر کے عین مطابق تھا۔ داستانوں میں واقعی افیون کی ترنگ پوشیدہ تھی۔ سیاسی اقتدار کے نکل جانے سے سوسائٹی مفلوج ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی حکومت کا نشہ موجود تھا۔ گزشتہ عظمتیں خواب صبح گاہی کی طرح حافظے سے فراموش نہ ہوئی تھیں۔ پندار سلطان بود کا تفوق موجودہ بے نوائی کو آسودہ کئے ہوئے تھا۔ یہ جذبہ داستانوں میں بھرپور طریقے پر ظاہر ہوا، ان میں ایسی بادشاہتوں اور ایسی شان و شوکت کا بیان تھا جو ان تنک مایوں کے اسلاف کو بلکہ تاریخ کے عظیم المرتبت سلاطین کو بھی میسّر نہ تھیں۔

غدر کے بعد رام پور میں کثرت سے داستانیں لکھی گئیں۔ یہ سب کی سب درباری داستان گویوں نے لکھیں۔ رام پور میں ملوکیت کا طلسم شکست نہ ہوا تھا، اور وہی جاگیردارانہ ماحول باقی تھا۔ لکھنؤ میں نول کشور پریس میں داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کے اردو ترجمے چھاپے گئے — امیر حمزہ کے ترجمے دراصل ترجمے نہ تھے۔ مترجموں نے محض کردار فارسی سے لے کر اپنے طور پر دفتر کے دفتر تصنیف کر دئے تھے۔ امیر حمزہ کے سلسلے کی یہ کتابیں اُردو داستان گوئی کا شاہکار ہیں۔ پریس والوں کا مقصد تجارت تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ ناظرین اس موضوع کو پسند کرتے ہیں تو انھوں نے دیو و پری، سحر و طلسم کے دفتر کے دفتر تخلیق کرا دئے۔ پریس تو پسندِ عام اور تخلیقِ فن کے درمیان محض ایک واسطہ تھا۔

جس طرح غزل اور شاعری نے مشاعرے کے ذریعے عوام تک رسائی پائی اور ہر دل عزیزی کا خلعت حاصل کیا، اسی طرح داستانوں نے داستان گوئی کے دوش پر اشتہار پایا۔ داستان گوئی کا رواج سب سے زیادہ لکھنؤ میں تھا، اور اس سے کم رام پور میں۔ داستان گو اپنے فن پر پوری طرح قادر ہوتے تھے۔ ہر طرح کے بیانات میں تفصیل کے دریا بہا دیتے تھے اور سننے والوں کا مجمع ہر فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کے فلک شگاف نعرے بلند کرتا تھا۔

داستان لکھنے والوں نے کثیر مقدار میں اُردو کا نثری ادب دیا۔ اسالیبِ نگارش دئے۔ دلی و لکھنؤ کی معاشرت کے مرقعے پیش کئے، اور اس کے ساتھ ساتھ دلچسپی میں کہیں فرق نہ آنے دیا۔

داستانوں کا دور تقریباً ایک صدی تک رہا۔ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آخری ربع سے ان کا دور ختم ہو گیا۔ اگرچہ لکھنؤ کے عوام میں اس وقت بھی داستانِ امیر حمزہ مقبول رہی لیکن خواص کا رجحان اُدھر سے ہٹ چکا تھا۔ ادب پر اُن کی گرفت ختم ہو چکی تھی۔ جب نذیر احمد نے پہلا ناول لکھا اُسی وقت داستان کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ داستان کے زوال کے اسباب بہت روشن ہیں۔ ہر زبان میں اوّل مافوق الفطرت رومانوں کا رواج رہتا ہے۔ آخر میں حقیقت پرست ناول قابض ہو جاتے ہیں۔ جو قوم جتنی جلد سیاسیات، معاشیات، فلسفہ، عمرانیات اور سائنس کے موجودہ تخیلات کو گرفت میں لا سکی اس میں اسی وقت سے محیر العقول قصوں نے ناول کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں مافوق الفطرت داستانوں کا خاتمہ پیش تر ہو گیا۔ ہندوستان میں ایسا غدر کے بعد ہوا۔

غدر صرف ایک سیاسی انقلاب نہ تھا۔ وہ ایک بڑے سماجی اور ذہنی انقلاب کا بھی پیش خیمہ تھا۔ انگریزی زبان کے ذریعے قوم کو مغربی علوم، مغربی خیالات و تفکرات سے واقفیت ہوئی۔ سائنس نے توہم پرستی کا قلع قمع کر دیا۔ اسی دور میں ہماری شاعری میں اصلاح کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا۔ آزاد و حالی نے نیچرل شاعری کی وکالت کی۔ انجمنوں کے ذریعے منظم کوششوں نے شاعری کا چہرہ ہی بدل دیا۔ افسانے کے میدان میں اس طرح منظم تو نہ کی گئی لیکن افراد نے زمانے کی ذہنیت کو سمجھا، اور اس کا ساتھ دیا۔ بدلتے زمانے نے داستان کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارے ابتدائی ناول نگار مثلاً نذیر احمد اور سرشار، انگریزی سے واقف تھے۔ مغربی علوم، مغربی ادب اور سائنس کے اثر سے اہلِ ملک نے دیکھا کہ یہ دیو و پری، سحر و طلسم کیا خرافات ہے، ان سب پر تخیل کا زور دکھانا، جھوٹ بولنے میں بازی لگا کر مقابلہ کرنا ہے۔

داستانوں کی دُنیا ہماری دُنیا نہیں ہے۔ عمرو، لقا، بختیارک اور افراسیاب کردار نگاری کے بہترین نمونے سہی، لیکن دنیا میں ایسے اشخاص کہاں ہوتے ہیں۔ قصے کے کردار جب ہم جیسے ہوں گے تب ہمیں ان کی خوشی سے خوشی اور تکلیف سے تکلیف ہوگی۔ داستانوں کے واقعات بھی مصنوعی ہوتے ہیں۔ یہ دماغ کو ایک سراب کی سیر کرا دیتے ہیں۔ حقیقت سے دور پھینک کر زمانے کا مقابلہ کرنے کی قوت سلب کر دیتے ہیں۔ داستانوں کی دین بے عملی ہے! ان میں عشق اور تعیش کی بہت افراط ہے۔ زندگی کے دوسرے رُخ۔ دوسرے واقعات۔ دوسرے جذبات کی پیش کشی نہیں۔ اسی وجہ سے دوسرے ڈھنگ کے افسانے لکھے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ لکھے گئے۔

غدر کے بعد قوم پر یاس و اضمحلال چھا گیا تھا۔ مسلمانوں کی حالت خاص طور پر پست تھی۔ اُن کے ساتھ زیادہ دار و گیر ہوئی تھی۔ حکومت کے نکلنے کا گھاؤ۔ اوپر سے فاتحوں کی نمک پاشی۔ ایسے میں عیش و عشرت کی داستانیں کیوں کر بہلاتیں۔ یہ بے وقت کی بھیرویں تھیں۔ جہاز طوفان کے تھپیڑے کھا رہا تھا، اس گھڑی شہنائی سننے کا کسے یارا تھا۔ حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی۔ اب رنگین پردے جنتِ احمقاں نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ کب تک سراب میں کھوئے رہتے۔ داستانوں میں خواب کی دنیا تھی۔ جب نیند اُچاٹ ہو گئی وہ دنیا اور وہ کیف آگیں خواب بھی باطل ہو گئے۔ خیالی جاہ و حشم کے

افسانوں کا اندرونی خول نظر آگیا۔ اپنی حالت کا جائزہ لینے کی خواہش پیش ہوئی۔ اصلاحی اور افادی ادب کی مانگ کی گئی۔ دُوربین نگاہوں نے حقیقت نگاری کو پسند کیا جس کا نتیجہ اوّلین ناول تھے۔ ناولوں میں ہم عصر زندگی کے عکس پیش کئے گئے۔ اُن کے کردار قرونِ وسطیٰ میں نہیں رہتے تھے۔ بلکہ انیسویں صدی کے آخر کے ہندوستان میں کلیم، ظاہردار بیگ، ابن الوقت، مبتلا، آزاد۔ بھولے نواب سب ہم عصر تھے۔ یہ ہر جگہ کامراں نہیں ہوتے تھے۔ انھیں دنیا کے غموں سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مولوی نذیر احمد نے اس ابتلا کا درماں مذہب و اخلاق تجویز کیا۔ منشی رتن ناتھ سرشار نے ناکارہ پُرتصنع نمائشی تہذیب کا مذاق اُڑایا۔ مغرب والوں سے مقابلہ کرکے اُن کی معاشرت کی برتری دکھائی۔ نوابوں کے ساتھ داستانوں کی دنیا بھی کوچ کر گئی۔

ناول کی آمد سے پہلے ہی داستان کے خلاف دوسرے رجحانات میدان میں آچکے تھے۔ میری مراد سرسیّد کی تحریک سے ہے۔ اس دور کے تمام انشاپرداز بے واسطہ یا بالواسطہ سرسیّد سے مستفیض تھے۔ سرسیّد نے معاشرت، مذہب، منطق اور دوسرے علوم میں مُلّائی کی جگہ نئے دور کی رُوح پھونکنے کا ذمّہ لے لیا۔ اُن کی سماجی خدمات محتاجِ بیان نہیں۔ ہم فی الحال اُن کے ادبی کارنامے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ وہ ایک تحریک کے بانی ہیں۔ اُردو نثر میں سرسیّد سے پہلے داستانوں کے علاوہ ایک بھی ادبی کتاب نہ تھی۔ تاریخ و مذہب کی چند بے رس کتابیں تھیں تو وہ ادب سے کوسوں دُور تھیں۔ فسانۂ عجائب کے طرزِ تحریر کا ڈنکا بج رہا تھا۔ سرسیّد کو علمی مضامین تحریر کرنے کی ضرورت ہوئی۔ یہ طرح طرح کے علمی مباحثوں میں کُود پڑے۔ جہاں سیدھے سادے علمی اسلوب سے کام لیا گیا۔ اس طرح کام کے موضوعات پر لکھنے کا رواج ہو گیا۔ سرسیّد اور اُن کے ساتھیوں نے تاریخ اور تنقید کے شہ پارے پیدا کئے۔ اس علمی رجحان نے داستانوں کو بالکل مزخرفات قرار دے دیا۔ اسے پیروئ مغربی کہیئے یا زمانے کی رفتار۔ اگر انگریز نہ آتے تب بھی یہ تبدیلی رونما ہوتی۔ اگر مغل سلطنت رہتی تب بھی نئی لہر رُکے نہ رکتی جس وقت انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تھا اردو داستانوں کا تمت بالخیر لکھا جا چکا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں قوم کی رگوں میں سیاسی بیداری کا لہو دورہ کرنے لگا، گو آہستہ آہستہ لوگ مصروف رہنے لگے۔ فرصت کسے کہ ضخیم داستانیں پڑھ سکے۔ انیسویں صدی کے آخر میں تو لوگوں کے پاس پھر بھی کچھ وقت رہتا ہوگا۔ لیکن بیسویں صدی میں تو ناول پڑھنے کی فرصت بھی کم خوش نصیبوں کو ہے۔ اسی لئے مختصر افسانوں نے اتنی جلد ادب پر قبضہ کر لیا۔ اب کسے دماغ کہ داستانِ امیر حمزہ یا بوستانِ خیال پڑھ سکے۔ تقریبًا چالیس سال سے ان کا کوئی نیا ایڈیشن نہیں نکلا، نہ اب کبھی نکلنے کی توقع ہے۔ مختصر داستانوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی اہمیت محض ادب کی وجہ سے ہے، قصّہ کی وجہ سے نہیں۔ انھیں صرف ادب کے طالب علم ہی پڑھتے ہیں۔ عوام کے مذاق کو بازاری جاسوسی ناولوں نے گرفت میں لے لیا ہے۔ پسندِ عوام کے لحاظ سے داستانوں کی گدّی جاسوسی ناولوں ہی کو ملی ہے۔ داستانیں بیسویں صدی کے دماغ کو مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔ ان کی اہمیت آثارِ قدیمہ کی سی ہے جس طرح عجائب گھروں میں قدیم اشیاء ٹوٹے ہوئے بُت سنبھال کر رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح داستانوں کو ادبی یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہر ادبی تخلیق کا اپنا دور ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے دور میں اس شکل میں وجود میں نہیں آسکتی۔ خالص دوری، آفاقی اور مطلق قدریں بھی دراصل اتنی مطلق اور دوری نہیں ہوتیں۔ انھیں بھی رُوحِ عصر سے چھٹکارا نہیں۔ داستانیں ایک خاص نظام، ایک خاص معاشرت، ایک خاص ذہنیت کی مخلوق تھیں۔ جیسے ہی وہ نظام وہ ذہنیت ختم ہوئی داستانیں بھی ختم ہوگئیں۔ داستانوں کی مقبولیت و زوال کے اسباب اور کہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک مخصوص نظام کی شادابی کے ساتھ داستانیں پھلیں پھولیں۔ اس نظام کے ساتھ یہ بھی ختم ہوگئیں۔ ادب ہم عصر زندگی کا آئینہ ہے۔

رقص و رنگ

چہک رہی ہیں بلبلیں، لہک رہی ہیں ڈالیاں
تھرک رہی ہیں فرشِ گُل پہ شوخ حسن والیاں

نواگروں کی تال پر بجا رہی ہیں تالیاں
کھنک رہی ہیں چوڑیاں جھمک رہی ہیں بالیاں

ہر اک کمر کے لوچ میں کماں ہے کتارہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے اُٹھو کہ نوبہار ہے

جوشؔ

گوپی چند نارنگ

اُردو نظم کا مستقبل

آزادی کے بعد اُردو ادب میں جو نئے رجحانات پیدا ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ادبی فضا میں پھر سے غزل کی گونج سُنائی دینے لگی ہے۔ نظم سے بے توجہی کی شکایت عام ہے۔ آخر اس کے وجوہ کیا ہیں، اور اگر اُردو شاعری کا یہ رجحان باقی رہا تو نظم کے آئندہ امکانات کیا ہیں؟ اصل یہ ہے کہ کسی بھی زمانے پر سچی اور صحیح تنقید اس زمانے سے گزر چکنے کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔ مسائلِ حاضرہ پر تنقید کرنا مشکل بھی ہوتا ہے اور خطرناک بھی۔ پھر بھی اُردو شاعری کے اس نئے رجحان کی حقیقت جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ صرف یہی راستہ ہے جس پر چل کر ہم اُردو نظم کے مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

اُردو نظم کی پشت پر لگ بھگ ایک صدی کے ارتقا کی داستان ہے۔ ایسا سوچنا کہ اُردو میں نظم کی ابتدا حالی کے زمانے سے شروع ہوئی، اُردو ادب سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ یہ درست ہے کہ اُردو شاعری غزل کے پروں سے اڑنا شروع ہوئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے نظم کا وجود ہی نہ تھا۔ نظم اس زمانے میں قطعوں، شہر آشوبوں، اور مثنویوں کی شکل میں پنپ رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب ہماری تہذیب کا سابقہ مغربی تہذیب سے ہوا، اور دیسی زبانوں پر مغربی تعلیم و ادب کا اثر پڑنے لگا تو نظم نے نیا چولا بدلا۔ حالی اور آزاد کے ہاتھوں اسے نیا آب و رنگ عطا ہوا، اور نظم کی اصطلاح ان معنوں میں استعمال کی جانے لگی جو اس سے آج لئے جاتے ہیں۔ حالی کے پیروؤں میں اسمٰعیل میرٹھی، خوشی محمد ناظر، شوق قدوائی، سرور جہان آبادی، چکبست اور کیفی کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ شاعر جس نے نظم کو غزل کا حریف بنا دیا، اقبال تھا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے نظم کی دنیا میں صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے ایک انقلاب شروع ہوا۔ اس انقلاب کے آہنگ میں جوش کی آواز سب سے بلند تھی۔ انقلابی شاعری کے جلو میں جو نئی نسل پروان چڑھی اُس میں ہیئت پرست بھی تھے۔ رومانی شاعر بھی اور وہ بھی جو ترقی پسند کہلاتے تھے۔ جوش کے ساتھ ساتھ مجاز، جذبی، فیض، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، سردار جعفری، وامق، مخدوم، تاباں، ساحر اور کیفی اعظمی نے نظم کے فروغ میں بڑا حصہ لیا۔ اختر شیرانی اور ساغر نظامی کی شاعری کا اس دور میں خاص مقام ہے۔ میراجی اور راشد نے ہیئت میں جو تجربے کئے اس سے آزاد نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ مجموعی طور پر یہ زمانہ نظم کے شباب کا زمانہ تھا۔ ان دنوں ہمارا قومی شعور بیدار ہو رہا تھا، اور ہماری تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جگر اور یگانہ کی وہ آوازیں جو انھوں نے غزل کے معترضین کے خلاف بلند کیں، صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ اور شاعری کا رجحان نظم کی طرف رہا۔ لیکن آزادی کے بعد یہ رنگ بدلنے لگا اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد پھر غزل کی طرف لوٹ آئی۔

موجودہ دور میں نظم سے جو بے توجہی پیدا ہو چلی ہے۔ اور غزل کا جو سیلاب سا آگیا ہے اس کی نوعیت سمجھنے کے لئے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی پس منظر کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد شروع ہونے والی شاعری کے تیور اور آن بان باغیانہ ہے۔ یہ ہمارے اس زمانے کی ذہنی زندگی کا عکس ہے۔ سیاست کی طرح شاعری کے سامنے بھی ایک منزل تھی، ایک نصب العین تھا آزادی حاصل کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی شاعری کا لب و لہجہ انقلابی ہے۔ اس میں ایک زور شور اور للکار ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد قائم نہیں رہ سکتی تھی تقسیمِ ہند کے بعد اس "انقلاب" کا رنگ جو ہمارے شاعروں کا محبوب موضوع تھا، پھیکا پڑ گیا۔ اس کے یک لخت بعد فسادات کا موضوع سامنے آیا۔ یہ جاندار تو تھا، لیکن اس کی اپیل عارضی اور وقتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۹ء تک ہندوستا

کی سیاسی تحریکوں کی رفتار کم پڑ گئی، اور ذہنی سطح پر ایسی اتھل پتھل ہوئی کہ بعض نظریے یک سر بدلنے لگے۔ اس کا اثر فن کار کے ذہن پر بھی ہوا۔ نظم گو شاعروں نے خود کو ایک دوراہے پر کھڑا پایا۔ انقلاب، آزادی، فسادات اور امن کے موضوع اب بے جان محسوس ہونے لگے۔ معاشرتی اور سماجی مسائل کو نظم کا موضوع بنایا جا سکتا تھا، لیکن یہ موضوعات نسبتاً گمبھیر ہیں اور ان پر قلم اُٹھانے کے لئے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے، اور ایک ایسے دور میں جب نظریاتی ثبات قایم نہ ہوا ہو۔ ایسے موضوعات کے بارے میں کوئی جچی تلی رائے پیش کرنا سہل کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں نظم کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا سکتی۔

آزادی کے آٹھ دس سال بعد کا عرصہ ایک عبوری نوعیت رکھتا ہے۔ آج کل کے زمانے کی حالت یہ ہے کہ رات کا اندھیرا ختم ہو گیا ہے، اور آفتابِ تازہ کے سامنے آنے کا ابھی انتظار ہے۔ ویسے تو زندگی کا ہر لمحہ Transitional ہوتا ہے، لیکن ادبی اعتبار سے یہ دوریوں بھی اہم ہے کہ آزادی کے بعد کچھ قدریں تو یک سر مسمار ہو گئی ہیں، اور نئی ابھی بن نہیں سکی ہیں۔ کچھ موضوع ایسے ہیں جو پہلے بھی ہمارے سامنے تھے، اور اب بھی ہیں۔ مثلاً معاشی بدحالی اور سماجی تفرقات۔ لیکن جن زاویوں سے ہم پہلے انھیں دیکھتے تھے وہ بدل گئے ہیں۔ اشتراکیت نے پہلے جو روشنی دکھائی تھی وہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایٹمی طاقت کی تباہ کاریوں اور بربادیوں کا احساس آئے دن بڑھ رہا ہے۔ جس کا ایک اثر یہ ہے کہ سماجی اور معاشرتی سطح پر بھی تشدد کا استعمال ناپسند کیا جانے لگا ہے۔ پنج سالہ پلان کی کامیابی اور دنیا کی کونسلوں میں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی عزت نے ہمارے شاعروں کے اندازِ فکر پر بھی اثر ڈالا ہے۔ وہ خود کو ایک گومگو کی حالت میں پاتے ہیں۔ زمانوں کے رجحانات کلنڈر کی تاریخوں کی طرح نہیں بدلا کرتے۔ اُن کو بدلنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ نئے ہندوستان کا واضح تصور سات سال گزرنے پر بھی ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تمام زمانے میں فن کار کو ایک خاص ذہنی انتشار کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ معاشی بدحالی اور زندگی کی عام خستگی نے اس بے مقصدیت اور ذہنی پراگندگی کو اور بھی اُبھارا ہے جس کا اثر اعلیٰ نظموں کے فقدان کی صورت میں ظاہر ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد سے ہندوستان کی ذہنی زندگی ایک ولولے اور ہیجان کا منظر پیش کرتی ہے۔ آزادی کا جذبہ ہمارے دلوں میں اُبلنے لگا تھا۔ دار و رسن کی طلب نے "کار و بارِ عاشقی" کا بازار سرد کر رکھا تھا۔ شیخ سعدی کا ایک شعر ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب انسان کے سامنے کوئی فوری ضرورت ہوتی ہے تو مادے اور ہیجان کی ساری توانائیاں اس کے پورا کرنے کی طرف لگ جاتی ہیں۔ نظم اس وقت ایک نہایت اہم فوری جذبے کی ترجمانی کر رہی تھی، اور وہ تھا حصولِ آزادی۔ یہی وجہ ہے کہ جوش نے غزل کی صنف کو "غیر جمہوری اور بیکار" قرار دیا، اور کلیم الدین احمد نے اسے "نیم وحشی صنفِ سخن" کہہ کر مردود ٹھہرایا۔ یہ لوگ ایسا کہنے میں حق بجانب بھی تھے۔ غزل میں ان مسائل کے حلیف ہونے کی سکت نہ تھی، جو اس وقت قوم کو درپیش تھے۔ غزل کے حق میں یہ زمانہ ایک بحران کا تھا۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد جب سامراجی قوتوں کو اُکھیڑ پھینکنے کی فوری ضرورت ایک حد تک پوری ہو گئی، تو وہ خواہشیں جو پچھلے کئی سالوں سے سینوں میں دبی چلی آئی تھیں، جاگ اُٹھیں۔ ظاہر ہے کہ جب دبی ہوئی خواہشیں پھڑک اُٹھتی ہیں، تو ان کی شدت معمول سے زیادہ ہوتی ہے۔ غزل کی موجودہ گرم بازاری کی ایک وجہ ہمارے شاعروں کا ذہنی ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے۔ نظم سے بے توجہی کی نفسیاتی وجہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ غزل کا موجودہ احیا ایک قسم کا فرار ہے۔ وہ اسے شاعروں کی ادبی تن آسانی اور سہل نگاری پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا ماننے میں ہمیں تامل ہے۔ یہ کہنا کہ غزل لکھنا آسان ہے اور نظم لکھنا مشکل، درست نہیں۔ اصل شے شعریت ہے، اور غزل میں اچھے شعر کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا نظم میں۔ یہ کہنا کہ آج کے دور میں غزل فن اور شعور کی کٹھن ذمہ داریوں سے گریز کے طور پر کہی جا رہی ہے، حقائق سے دور ہوگا۔ اس کی اس وجہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ہمارے شاعروں کا نفسیاتی ردِ عمل ہے، جو بدلے ہوئے سیاسی خیالات کا نتیجہ ہے۔

نظم کے آئندہ امکانات پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا لازمی ہوگا کہ ہندستانی تہذیبی زندگی میں نظم اور غزل دونوں کا کیا مقام ہے، اور ان دونوں میں سے کس کی عوامی اپیل زیادہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ غزل کی جڑیں بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں دور دور تک ہماری تہذیبی زندگی میں پیوست ہیں۔ ہمارے جمالیاتی احساس کے جن تقاضوں کو غزل پورا کر سکتی ہے نظم نہیں۔ غزل کا ہندستانی موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ ہندوستان کی جن زبانوں میں غزل کا رواج ہے، اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں کشمیری، پنجابی، پشتو، سندھی، ہندی، مرہٹی اور بنگالی۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما کا بیان ہے کہ بھوج پوری میں بھی غزل کا فارم اپنایا گیا ہے۔ گجراتی زبان میں تو غزل کے علاوہ اب کوئی چیز مقبول ہی نہیں۔ غزل چوں کہ ہماری تہذیبی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہے، اس کی عوامی اپیل نظم کی نسبت زیادہ ہے۔

غزل کے جان دار ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پچھلے چند سالوں سے غزل کے فارم میں نہایت خوشگوار تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اب غزل محض شیرب دیوانگی نہیں رہی۔ یہ درست ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال اور جذبہ رکھتا ہے۔ لیکن آج کی غزل میں عموماً ایک فضا نظر آئے گی۔ اس میں خیالات کا ارتقا نہیں۔ لیکن احساسات کا ایک باطنی تسلسل ملے گا۔ غزل میں اب انفرادی جذبات اور مجرد تصورات کی جگہ اجتماعی احساسات آ رہے ہیں۔ ایک طرف تو روائتی تشبیہوں اور پرانے استعاروں کا نیا اور شگفتہ استعمال ہے، اور دوسری طرف نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش ہے۔ جو روزمرہ کی زندگی سے حاصل کی گئی ہیں۔ ایسے اشعار اس قدر عام ہیں کہ یہاں اُن کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فیض کی غزلوں کی اشاعت بھی غزل گوئی کے رجحان کی ایک محرک ہے۔ یہ بات کچھ اتنی غلط بھی نہیں۔ فیض کے فن میں ماضی کا احترام، حال کا احساس اور مستقبل کی روشنی ہے۔ اس نے اپنی غزلوں میں "صحن رنگین" اور "غارت گل چیں" کا ذکر اس انوکھے ڈھنگ سے کیا ہے کہ غزل کی محبوبیت بڑھ گئی ہے، اور نئی پود نے اس کی تقلید کو ایمان بنا لیا ہے۔

یہ درست ہے کہ غزل کی روایت کا رشتہ ہندوستانی زندگی سے جڑا ہوا ہے، اور یہ گہری عوامی اپیل بھی رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود غزل اردو شاعری کی آبرو کی تنہا وارث نہیں۔ بقول ایک ادیب کے اس میں لپٹی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ملیں گی۔ ایک آئینہ نہیں ملے گا۔ یہ وجہ ہے کہ تسخیر، تعمیر اور تخلیق کے جس دور سے ہم آج گزر رہے ہیں اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کی بھی ضرورت ہے۔ غزل میں حقیقتوں کا منطقی ادراک پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اظہار کے لئے نظم ہی موزوں ہے۔ آج شاعری صرف راز دردل سے رشتہ رکھنے کا نام نہیں رہا۔ اس لئے آئندہ زمانے میں نظم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا لیکن ہمیں آل احمد سرور کے اس بیان کو تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ اردو شاعری کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے، غزل سے نہیں۔ غزل کے ارتقا یافتہ فارم کو سامنے رکھتے ہوئے اس بیان کی صداقت پر شبہ کیا جا سکتا ہے ..... جدید تمدن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اب انفرادی جذبے کی جگہ اجتماعی جذبہ لے رہا ہے۔ فرد کی طرح جماعت بھی جذبہ اور تخیل رکھتی ہے۔ اس کی بھی سخت شعوری اور لاشعوری خواہشیں ہوتی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کا اظہار غزل کے اشعار میں نہ ہو۔ اچھے غزل گو شاعروں نے اسلوب اور موضوع کی تبدیلی کے باوجود تغزل کی بنیادی حیثیت برقرار رکھی ہے۔ غزل جو پہلے صرف ذاتی محبت کے جذبے کی ترجمان تھی اب اس میں سماجی خیر کا جذبہ بھی آ رہا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سماجی خیر کا یہ جذبہ انفرادی آزادی کو پنپنے دے گا، اور فرد اپنی اہمیت برقرار رکھ کے جماعت میں اپنی تکمیل کا سامان کر سکے گا تو غزل میں ایک گہرا توازن پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح مستقبل قریب میں غزل اور نظم دونوں کو اپنا اپنا مقام مل جائے گا۔ آنے والے دو چار سالوں میں اگر دنیا میں امن برقرار رہا اور ہماری قومی ترقی جاری رہی تو موجودہ دور کا ذہنی انتشار بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اور نئی راہیں جو ابھی اُبھر رہی ہیں روشن تر ہو جائیں گی۔ تب نظم سے موجودہ بے توجہی کم ہو جائے گی۔ اس کے بعد نظم کے سامنے گہرے اور جامع معاشرتی اور سماجی مسائل ہوں گے جن کی اپیل وقتی نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ان مسئلوں کے نظم کرنے کے لئے زیادہ خبر و نظر اور بصیرت و بصر کی ضرورت ہوگی۔ یہ تبھی ممکن ہے جب عمل کے طریق کار متعین ہو جائیں اور فن کار کے ذہن میں نظریاتی اُلجھنیں باقی نہ رہیں۔ اس طرح جب نظم میں حقیقی طور پر جدید تمدن کے فکر و فن کی بصیرت پیدا ہو جائے گی تو اعلیٰ نظم پھر سے لکھی جانے لگے گی۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو شاعری کا مستقبل نہ صرف غزل سے وابستہ ہے نہ نظم سے، بلکہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے۔

کوثر چاند پوری

جنم

تھوڑے دنوں ہی میں بسنتی کی ساری جوانی اور خوبصورتی اس کے بڑھے ہوئے پیٹ میں سما گئی اس کے ابھرے ہوئے گالوں پر جو بیر بہوٹیاں سی رنگینی محسوس ہوا کرتی تھیں وہ اب غائب ہو چکی تھیں۔ اور ان کی جگہ چھائیوں کے نشان ابھر آئے تھے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی اور ان میں پھیلا ہوا موتیے کی شاخوں کا جال شیشم کے پیڑ پر پھیلی ہوئی اکاس بیل کی مانند پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں کا گلابی رنگ بھی پھیکا ہو گیا تھا وہ تھوڑی دور چلنے ہی میں ہانپ جاتی اور لمبے لمبے سانس لینے لگتی۔ مگر ان سب باتوں کی موجودگی میں بھی بخشی کی محبت اسی طرح جوان تھی۔ اس کی چھاتی میں اب بھی وہی انگارے دہک رہے تھے جو بسنتی کی پہلی نگاہ نے سلگا دیئے تھے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بسنتی کی دوشیزگی کو اس نے اپنے پیروں سے روندا ہے اس کی رعنائی بھی اسی کی باہوں میں مچلتے مچلتے کہیں غائب ہو گئی ہے بسنتی کے گالوں پر رنگینی ہوئی بیر بہوٹیوں کو اسی نے سکھا دیا ہے اور اسی نے اس کے وجود کو اتنا بوجھل اور بھدا کر دیا ہے۔ محبت جب گلے مل جاتی ہے اور اس کے اتصال سے کوئی پودا پھوٹ نکلتا ہے تو عورت ہی ٹوٹے میں رہتی ہے۔ اسے اپنی نسوں کا لہو نچوڑ کر اس پودے کی پیاس بجھانی ہوتی ہے۔ بخشی پہلے پہلے تو بسنتی کو ساتھ لئے اپنے ٹھکانوں میں گھومتا رہا اور جن گھروں میں وہ پکارے بغیر داخل نہ ہو سکتا تھا ان کی ڈیوڑھیوں پر وہ آپ ٹھہر جاتا اور بسنتی اندر جا کر ٹٹیاں جھاڑ آتی۔ وہ پہلے جھاڑو دیتی' پھر گھر میں کوئی اگالدان ہوتا تو اسے مانجھتی۔ سب سے آخر میں ٹٹی جھاڑتی اور جس وقت سر پر میلے کا ٹوکرا رکھے اور پیٹ پر اڑسے ہوئے دوپٹے میں باسی روٹیاں بھرے وہ باہر آتی۔ بخشی کی منتظر آنکھوں میں چمک سی آ جاتی اور پٹھوں میں زندگی کی رَو دوڑ جاتی۔ وہ اکڑوں بیٹھے بیٹھے ایک دم زمین سے کھڑا ہو جاتا اور جلدی سے بول اٹھتا۔

اری اتنی دیر' وہ تو کھڈیاں ہی ہیں جہاں کی ٹٹی ہیں۔

کون دو چار گھنٹے لگا دئے میں نے۔ وہ ہانپتے ہوئے کہتی۔

میرے لئے تو اتنی دیر ہی بہت ہے تو نہیں جانتی میں ایک منٹ بھی تجھ سے الگ نہیں رہنا چاہتا۔

کیوں جھوٹ بول رہے ہو وہ ہنس کر کہتی پندرہ منٹ تو ابھی اکیلے کھڑے رہے ہو۔

اور جب ہی تو چھاتی دھڑک رہی ہے میری!

چلو زیادہ باتیں نہیں بناتے۔

ٹھیک بارہ بجے وہ دونوں نیم کے نیچے سے میلے کے بھرے ہوئے ٹوکرے سر پر اٹھا کر دھیرے دھیرے سڑک پر چلنے لگتے اور بخشی پیچھے مڑ کر دیکھتا تو بسنتی منہ پر گھونگھٹ ڈالے ہوتی اور اس کی چھاتی لمبے لمبے سانس کھینچتے وقت نیچے اوپر ہوتی رہتی وہ پوچھتا

اب کیوں گھونگھٹ ڈال رکھا ہے تو نے سڑک پر تو کوئی بھی نہیں چل رہا۔

اور تم جو دوڑ رہے ہو مرے آگے آگے۔ بسنتی مسکرا کر جواب دیتی مجھے اور کسی سے کیا لینا ہے میں تو اپنے آدمی ہی سے منہ چھپاتی ہوں۔

اور بخشی کی روح ناچ اٹھتی۔ اس کے کانوں میں جلترنگ سا بجنے لگتا اور سر پر رکھے ہوئے ٹوکرے کا تعفن نہ جانے احساس سے کہاں تک بھاگ جاتا اس کا جی چاہتا اسی جگہ سڑک پر بیٹھ جائے اور ایک ہاتھ بسنتی کے گلے میں ڈال کر دوسرے ہاتھ سے اس کا گھونگھٹ الٹ دے اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھے۔

اب کہاں گیا وہ گھونگھٹ ؟

لیکن وہ مشرق سے ابھرے ہوئے سورج کی گرم کرنوں کو دیکھ کر سوچنے

گئی اتنا اونچا ہو گیا سورج اور جس وقت ہم نے کام شروع کیا تھا تو یہ پورب میں کھڑے ہوئے پیڑوں کی شاخوں میں لٹکا ہوا تھا - اور اب تو شاید بارہ بھی بج چکے - رل کا بھونپو چیخنے ہی والا ہوگا - اسی وقت اس کے اندر سے کوئی بول اٹھتا - بخشی محبت کے وقت محبت اور کام کے وقت کام - اگر تم سر کا بوجھ اتار کر یہاں بیٹھ گئے تو جانتے ہو انجام کیا ہوگا - رشید خاں ڈرائیور موٹر لے کر اڈے سے چل دے گا اور پھر تمھیں جرمانہ بھگتنا پڑے گا - شہر کے آس پاس یہ گندگی زیادہ دیر نہیں رکھی جا سکتی - وہی گندگی جسے تم اپنے ٹھکانوں کے ایک ایک گھر سے اکٹھا کر کے لاتے ہو خود ٹھکانے والوں ہی کو دیکھو - ٹٹی صاف کرنے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی ہے تو کیسے کیسے بگڑتے ہیں -

بخشی تمھیں روٹیاں لگتی جا رہی ہیں -

میں دیکھ رہا ہوں جب سے بیاہ ہوا ہے تیرا دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے -

اکیلا تھا تو کہا کرتا تھا ذرا بیاہ ہو جانے میرا، پھر دیکھنا کیسا وقت پر کام کرتا ہوں اور جب سے بیاہ ہوا ہے تو اور بھی ڈوب گیا اور یہ تیری رانی ——— اس کے ہاتھوں میں تو ہر وقت جیسے مہندی لگی رہتی ہے مہندی -

جب ہی تو اگالدان کو چھوتے ڈرتی ہے - اس کا مطلب بالکل صاف ہے بخشی ——— تمھارے سر پر لدی ہوئی گندگی بڑی خراب ہے - یہ پیٹ میں رکتی ہے تو تکلیف دیتی ہے، ٹٹی میں پڑی رہتی ہے تو لوگ تمھیں دق کرتے ہیں اور موٹر کے اڈے پر رکھی رہ جاتی ہے تو تمھارے اوپر جرمانہ کرا دیتی ہے اور اس وقت بخشی سوچتا اس کا پیشہ بہت خراب ہے - نہایت گندہ، وہ اپنے لئے تو خیر اسے زیادہ بُرا نہیں سمجھتا تھا مگر یہ بسنتی، یہ اس کی سب سے زیادہ پیاری ہستی جسے تین سال کی مصیبتوں کے بعد نہ جانے کتنے آنسو بہا کر وہ اپنی بیوی بنا سکا ہے - وہ بھی اپنے سر پر یہی گندگی لئے پھر رہی ہے - وہ مہندی رچے ہوئے ہاتھوں سے اگالدان مانجھنے پر مجبور ہے - ٹھکانے کی عورتیں روز اس سے شکایت کرتی ہیں -

بخشی دیکھ آگے سے یہ تیری رانی نہ آئے ہمارے گھر میں -

سارا کچرا یہیں چھوڑ جاتی ہے -

دیدہ لگا کر کام ہی نہیں کرتی -

ارے یہ تو اپنے میکے جانا چاہتی ہے ایسے لگتا ہے جیسے ہر وقت اس کا جی وہیں پڑا رہتا ہے -

——— کتنا بُرا ہے میرا پیشہ - میرے سر پر بھی گندگی کا ٹوکرا ہے اور بسنتی کے سر پر بھی یہی گندگی لدی ہوتی ہے - دنیا کی سب سے زیادہ ناپاک اور غلیظ چیز اور پھر اس میں سیٹھ جی کے پیٹ کی گندگی بھی ہے - شیخ جی اور امرت لال کانسٹبل کے پیٹ کی بھی - سیٹھ جی سود کھاتے ہیں - شیخ جی نے اپنے بھتیجوں کی جائداد دبا رکھی ہے اور منشی امرت لال جی رشوت سے اپنا سارا دھندا چلاتے ہیں - اور میں ان سب کا میلا اٹھاتا ہوں اور تو اور ان ٹوکروں میں شیخ جی کی بیمار بہن کا میلا بھی ہے - اس کا پاٹ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی تیز دواؤں سے دھویا جاتا ہے - نہ جانے وہ کیوں دھلواتے ہیں اسے اتنی تیز دواؤں سے - شاید اسے کوئی بہت بُری بیماری ہے کوئی کہہ رہا تھا وہ زچگی ہی میں بیمار ہو گئی تھی - اور اب تو اسے آنتوں کی دق ہے مگر بسنتی کو دیکھو کہ وہ اس کا پاٹ دھوتی ہے اور اس کے پیٹ کی گندگی کو سر پر اٹھائے پھرتی ہے ——— کتنا بُرا پیشہ ہے میرا ؟ اسی وقت رل کا بھونپو چیخ اٹھتا اور بخشی تیز تیز چلنے لگتا اور اس کی نسوں میں دوڑتے ہوئے لہو کے اندر ابھی ابھی جو پریم کی گرمی آ گئی تھی وہ ٹھنڈی سی پڑ جاتی - محبت کے وقت محبت - کام کے وقت کام کے اصول سے اس کے پاؤں جلدی جلدی اٹھنے لگتے - تب بسنتی بہت پیچھے رہ جاتی - اس کی پنڈلیوں میں اینٹھن سی ہونے لگتی - ویسے تو چوبیس گھنٹے ہی کمر اور پنڈلیوں میں درد رہتا تھا پر اتنا بوجھ اٹھا کر دوڑنے سے ایسا لگتا جیسے پنڈلیوں میں کوئی چاقو چبھو رہا ہو اور جب بخشی بہت آگے نکل جاتا تو وہ گھونگھٹ الٹا کر اسے دیکھتی - وہ سر پر ٹوکرا رکھے کولھے مٹکاتا اور دونوں ہاتھ ہلاتا سڑک پر دوڑ رہا ہوتا - بسنتی کی لمبی پلکوں سے ڈھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیر آتے ——— وہ سوچتی یہ بھی کوئی جیون ہے - سر سے پاؤں تک میلے میں دبا ہوا جھڑکیوں، گالیوں اور ڈانٹوں میں چھپا ہوا - باپ کے یہاں بھی جیون کا دھارا یوں ہی بہتا رہا تھا اور اب پتی کے گھر بھی - اور تو اور پریم کا وہ سوت بھی اب اس میلے میں دب کر رہ گیا جو کئی برس پہلے بخشی کے دل میں پھوٹ پڑا تھا اور پھر اس کے اپنے سینے میں بھی بھونچال سا گونجنے لگا تھا - دھیرے دھیرے آنسوؤں کی گرم دھاریں اس کے گالوں پر بہنے لگتیں اور جب ایک ہاتھ سے وہ بھیگی آنکھوں کو

مل کر پھر بخشی کی طرف دیکھتی تو وہ اسی طرح کولھے مٹکاتا' ہاتھ ہلاتا آگے
آگے بھاگ رہا ہوتا اس وقت اسے بیتا سمے یاد آجاتا ۔ یہی بخشی جو اس
میلے کا ٹوکرا سر پر رکھے کولھے مٹکاتا اس کے آگے آگے جا رہا ہے ٹھیک
تین سال پہلے ایک شادی میں اس کے گاؤں گیا تھا اس وقت کھیتوں
میں گیہوں کے پودے اُگ رہے تھے اور جگہ جگہ ان کے بیچ سارس کے
جوڑے ٹہلتے دکھائی دیتے تھے ۔ بخشی کا لال کوٹ اور زین کی سفید پتلون
پہنے سر میں آڑی مانگ نکالے مُنہ پر چکنائی ملے پگڈنڈی پر اس کے سامنے
آگیا تھا ۔ وہ پانی بھرنے ندی پر جا رہی تھی ۔ بخشی اسے دیکھتے ہی ٹھٹک
گیا تھا ۔ دیر تک دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے تھے پھر وہ راستہ چھوڑ کر
کھیت میں کھڑا ہو گیا تھا ۔ اس کی نگاہیں بسنتی کے احساس کو گدگدا رہی تھیں
اور ایک بار تو ایسا لگا تھا جیسے شریر کے سارے پٹھے جھنجھنا اٹھے ہوں
بدن میں اس سرے سے اُس سرے تک ایک شعلہ سا لپک گیا ہو ۔ نہ جانے
اس کے پٹھوں کے فولادی جال کو جس پر کسی نے انگلی تک نہ رکھی تھی ایک دم
کسی نے جھٹک دیا تھا ۔ جال کے تاروں کی جھنجھناہٹ بھیجے تک جا پہنچی
تھی ۔ دوسری مرتبہ بخشی کو اس نے تب دیکھا تھا جب وہ گھوڑے کے
پیچھے پیچھے چل رہا تھا ۔ گھوڑے پر دولھا سوار تھا اس کے آگے
باجہ بج رہا تھا ۔ وہ شام کا وقت تھا سورج کافی تھک آیا تھا اور اس
کی کرنیں نیم کی شاخوں سے چھن کر بخشی کے چکنے منہ پر پڑ رہی تھیں بسنتی
گاؤں کی مہترانیوں کے جھرمٹ میں ایک طرف چھپی کھڑی تھی ۔ لیکن
بخشی کی آنکھوں نے جلد ہی اسے ڈھونڈ لیا تھا اور پھر اس کے کنوارے
چہرے پر بالکل اسی طرح جم گئی تھیں جیسے سورج مکھی کے ادھ کھلے پھول
پر آفتاب کی کرنیں جم جاتی ہیں ۔ ذرا دیر بعد ہی بخشی گاؤں سے چلا گیا
تھا ۔ اور اسی وقت بسنتی نے دیکھا تھا کہ گیہوں کے پودے زمین کے
اوپر آگئے ہیں ان کی سبزی گہری ہو گئی ہے اور دو سارس کا ایک
جوڑا آگے پیچھے رینگ رہا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت بخشی
اور وہ سڑک پر چل رہے ہیں ۔ مگر سارس کے اس جوڑے کے سر پر کوئی
بوجھ نہ تھا اور ہم دونوں کے اوپر میلے کے ٹوکرے رکھے ہوئے ہیں ۔ کتنا
فرق ہے آدمی اور سارس میں ۔ اور ان کی محبت میں اور ان کے جیون
میں — اور پھر بسنتی دیکھ رہی تھی کہ گیہوں کے پودے بڑھ رہے تھے

بالکل اسی انداز سے ان کے دلوں میں محبت کی بیلیں پھیلتی گئی تھیں بخشی
اب ہر ہفتے گاؤں میں آجاتا اور اتوار کا دن وہیں گزارتا ۔ ایک دن
اسی پگڈنڈی پر وہ پانی کے گھڑے سر پر رکھے آرہی تھی کہ بخشی نے
سامنے سے آکر اس کا راستہ روک لیا ۔ اور منہ اس کے کان کے پاس
لا کر کہا ۔

یہ گھڑے تو بہت بھاری ہیں !

اور اس نے ایک عجیب سی آس کی گرمی میں اس طرح بخشی کے چمکتے
ہوئے چہرے کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کے جیون کا بوجھ ہلکا کر دیگا ۔

پھر تمھیں کیا ؟

میں پوچھتا ہوں تم کب تک اٹھاتی رہوگی پانی کے یہ بوجھل گھڑے

جب تک جیتی رہوں گی' — ان گھڑوں کا بوجھ اور میلے سے بھرے
ہوئے ٹوکروں کا بوجھ ہی تو لکھا ہے ہم بھنگیوں کی لڑکیوں کے بھاگ میں ۔

اور اس وقت بخشی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے تھے ۔
جیسے بسنتی نے کوئی بڑا سا پتھر اس کی چھاتی پر دے مارا ہو اور اسے روتا
دیکھ کر بسنتی کا جی چاہا تھا کہ ابھی ندی میں ڈوب کر جان دے دے اس نے
ایک ایسے شخص کو رلایا ہے جس سے اندر ہی اندر وہ محبت کرتی ہے جس کا
پیار جنگل کی آگ کے مانند اس کی رگوں میں پھیلتا جا رہا ہے اور پھر ایک
اندھیری رات میں ہی بخشی ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے آ کھڑا ہوا تھا ۔

بسنتی میں مر جاؤں گا' مجھے بچا لو ۔

وہ چونک گئی تھی اس روز پہلی بار اس نے ایسا محسوس کیا تھا جیسے
چاند اور سورج دونوں اس کے پیروں پر آپڑے ہوں اور وہ بھنگی کے پیٹ
سے پیدا نہ ہوئی ہو بلکہ کسی دیوی نے اسے جنم دیا ہو' وہ لڑکی نہ ہو سچ مچ
رانی ہو ۔ اس وقت چھوٹے ہونے کا کوئی احساس بھی اس کے اعصاب پر
باقی نہ رہا تھا اس نے اپنے سر پر جواہرات اور موتیوں کا ایک تاج رکھا
محسوس کیا تھا ۔

کیا بات ہے کیا زہر کھا لیا ہے تم نے ؟

کھایا نہیں بسنتی کسی نے کھلا دیا ۔

کس نے ؟ — نام بتاؤ مجھے اس کا میں اسے ٹھکانے بھیج
دوں گی ۔

اس کا نام ہے بسنتی !

بسنتی نے زہر کھلا دیا تمھیں ؟

ہاں -

وہ کیونکر ؟

اس سوال پر بخشی نے اپنا ماتھا اس کے پیروں پر رکھ دیا تھا اور اسے یوں لگا تھا جیسے وہ سامنے چھوٹی سی ہوئی کھجور سے بھی بڑی ہو گئی ہے اس کا سر آسمان کے ستاروں سے جا ملا ہے - اس نے کسانوں کو اکثر زمیندار کے پیروں پر جھکتے دیکھا تھا اس کا خیال تھا زمیندار دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہوتا ہے مگر اس وقت تو زمیندار سے بھی بڑی تھی -

اچھا بالکل ٹھیک ہے بخشی !

اور پھر تھوڑے ہی دن بعد اس کا اور بخشی کا بیاہ ہو گیا تھا. شادی کے بعد اب تک کئی مرتبہ بخشی نے اس کے پاؤں چھوئے تھے اور اب بخشی ایسا کرتا تو اسے یوں لگتا جیسے وہ بڑی نہیں بہت چھوٹی ہو گئی ہے - اور وہ یہ زمانہ تھا جب کوئی زمیندار بھی باقی نہ رہا تھا اسے اور بھی سب سے بڑا ہونا چاہیئے تھا، لیکن وہ بخشی کو جیت کر بہت چھوٹی ہو گئی تھی - اب بخشی اس کی نگاہ میں سب سے بڑا آدمی تھا - چاند سورج سے بھی بڑا ہمالہ سے بھی اونچا —— اسی وقت بسنتی کو سیٹھ جی کی ٹٹی یاد آ گئی جسے کئی دن سے وہ جھاڑ رہی تھی اور اس کا جی چاہا کہ ٹوکرا یہیں ڈال کر بھاگ جائے کسی ایسی جگہ جہاں کوئی ٹٹی نہ ہو، کسی سیٹھ جی یا پنڈت جی کی ٹٹی بس وہ ہو اور اس کا بخشی - لیکن اس کی دنیا بہت محدود تھی اور اس میں جگہ جگہ ٹٹیاں تھیں، سیٹھ، پنڈت اور شیخ جی تھے ' اب جو گھونگھٹ الٹ کر اس نے دیکھا تو بخشی اڈے پر پہنچ چکا تھا اور جلد ہی وہ اپنا ٹوکرا وہاں رکھ کر بسنتی کی طرف بڑھا تاکہ اس کا ٹوکرا اپنے سر پر رکھ لے اور جس وقت وہ قریب آیا - بسنتی رو رہی تھی -

اری رو کیوں پڑی -

تم آگے کیوں چلے گئے تھے مجھے اکیلا چھوڑ کر ؟

اسی لئے کہ جلدی سے لوٹ کر تیرا بوجھ اپنے سر پر رکھ لوں -

نہیں میں آپ ہی اپنا بوجھ اٹھاؤں گی - میں تم سے بھی آگے جانا چاہتی ہوں تمھیں یہیں چھوڑ کر میں چلی جاؤں گی تم بہت برے ہو اس وقت بسنتی کی آنکھوں سے وحشت سی ٹپک رہی تھی نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی - اور اسے کیا ہو گیا تھا -

اچھا بسنتی تو ہی آگے چلی جا -

اور کیا جاؤں گی نہیں -

چند روز بعد بخشی اکیلا ہی ٹھکانے جھاڑتا پھر رہا تھا اور جب سیٹھ جی کے دروازے پر اس نے آواز لگائی

مہتر آ رہا ہے ٹٹی جھاڑنے

تو بڑی سیٹھانی نے پوچھا -

مہترانی کہاں گئی ؟

بخشی چپ ہو گیا اور سیٹھانی سمجھ گئیں کہ بسنتی کو نواں مہینہ لگ چکا تھا ضرور اس کے بچہ پیدا ہوا ہے یا ہونے والا ہے بخشی جلدی جلدی سب کاموں سے نمٹ کر گھر آیا تو پھوس کی جھونپڑی سے بسنتی کی چیخیں ابل رہی تھیں اس کا کلیجہ پھٹنے لگا اس نے دوڑ کر اندر جانا چاہا مگر اس کی بھاوج بھوری نے روک کر کہا -

اندر مت جائیو بخشی

کیوں، کیا بات ہے ؟

بات کیا ہوتی، وہی بات ہے جو تیرے جنم پر ہوئی تھی - آج تیرے بچے کا جنم ہے -

ٹھیک ہے، بخشی ہنس پڑا مگر اندر سے اس کا دل رو رہا تھا نہ جانے کیوں، بسنتی کی چیخیں اس کا دل توڑے دے رہی تھیں -

اور کون ہے بھابی اندر ؟

کوئی نہیں بس کلو کی دادی ہے - میں رامو دائی کو لائی تھی ابھی پر اس نے بہو کا شریر چھونے سے انکار کر دیا - وہ کہتی ہے اپنی ہی برادری کی دائی بلاؤ - اور تجھے معلوم ہے کلو کی دادی جیسی بھی ہے - پر دائی تو کہلاتی ہے -

اور جو کوئی اڑچن ہو گئی بھابی —— پھر کیا ہو گا -

ہو گا کیا بس بچہ ہی ہو گا -

میں تو بسنتی کی ان چیخوں سے ڈر رہا ہوں بھابی

کیوں ؟

مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں بسنتی آگے نہ چلی جائے ۔

ایسے میں کہاں جائے گی وہ

رامو نے بسنتی کو کیوں نہیں چھوا تیں اس کے آگے روپیوں کا ڈھیر کر دیتا بھابی ۔

جانتے نہیں بخشی ہم مہتر ہیں —— بھنگی —— میلا اٹھانے والے لوگ رامو ہمیں نہیں چھو سکتی ۔

کیوں نہیں چھو سکتی بھابی ۔ ہم تو میلا اٹھائیں سب کا پھر رامو کیوں بچتی ہے ہم سے ۔ وہ سب کے یہاں بچے جناتی پھرتی ہے رات دن ۔

تو نہیں جانتا بخشی سب کا دھرم ایک نہیں ہوتا

—— مگر اب سب کا دھرم ایک ہوگا ۔ رامو کو مہترانی کا شریر چھونا پڑیگا جب میں سب کی ٹٹی صاف کروں گا تو وہ بھی سب کے بچے جنائے گی ۔

اور ایک دم بسنتی کی چیخیں ختم گئیں ۔ بخشی نے بھودی بھابی کے منہ کی طرف دیکھا وہ دوڑ کر اندر چلی گئی اور بخشی کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بسنتی مر گئی اس کا بچہ بھی مر گیا —— بخشی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین سے اگتے ہوئے گیہوں کے پودے سوکھ گئے ہوں اور کھیتوں کے درمیان دور بھاگتے سارس کے جوڑے بچھڑ گئے ہوں اس کا جیون اندھیرا ہو گیا تھا اور وہ تارا ڈوب گیا تھا ۔ جس سے اس کی زندگی میں دئے جھلملانے والے تھے ۔

نذیر بنارسی

بیوہ

دُنیا کی ہر خوشی سے کنارا کیے ہوئے
مجبورِ زندگی کا سہارا لیے ہوئے

چہرے کی زردیوں سے خزاں آشکار ہے
ہے تو بہار ہی مگر اُجڑی بہار ہے

اظہار ہو رہا ہے یہ حالِ تباہ سے
شوہر کی لاش دیکھ چکی ہے نگاہ سے

اپنے پتی کی دل میں محبت لیے ہوئے
بیٹھی ہے آج چوڑیاں ٹھنڈی کیے ہوئے

رُخسار کے وہ رنگ گئے تازگی گئی
مُرجھا کے پھول رہ گئے خوشبو چلی گئی

بالوں کی مست مست گھٹا اب نہ چھائے گی
بھولے سے بھی نگاہ نہ بجلی گرائے گی

جیون کے کورے کونے میں سُونا پڑا ہے اب
دل کی جگہ پہ دل نہیں دل کی چتا ہے اب

دل کو وہ غم ملا ہے کہ دل داغ داغ ہے
لاکھوں چراغ ہو کے بھی گھر بے چراغ ہے

بیٹھی تھی کل جو گھر میں سہاگن بنی ہوئی
کیا بھاگ ہے وہی ابھاگن بنی ہوئی

ہمجولیوں میں جانے کے قابل نہیں ہے
دُنیا کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں ہے

بیوہ کو اپنے پاس بٹھاتا نہیں کوئی
اس مُفلسی کا ناز اُٹھاتا نہیں کوئی

وہ بل ہی اب نہیں ہے جو ابرو پہ بل پڑے
کچھ کہہ دیا کسی نے تو آنسو نکل پڑے

ساتھ اپنے اپنی آنکھ کا تارا لیے ہوئے
بیوہ ہے بیوگی کا سہارا لیے ہوئے

سورج ہوا غروب اندھیرا سا چھا گیا
بیوہ کے چھپ کے رونے کا پھر وقت آ گیا

ہر پھیر کے پھر نگاہ پڑی سونی سیج پر
آنسو بھر آئے آنکھ میں اور جھک گئی نظر

آنچل سے اپنا زرد سا چہرہ چھپا لیا
چہرہ چھپا کے آنکھ سے آنسو گرا دیا

چہرہ چھپا کے روئی کہ بٹیا نہ دیکھ لے
معصوم میرے غم کا تماشہ نہ دیکھ لے

بارش میں ندیاں تو چڑھیں اور اُتر گئیں
روتے ہوئے غریب کو عمریں گذر گئیں

مخلوق کی خدائی ہے خالق کے راج میں
معیارِ زندگی کا یہی ہے سماج میں

سحر عشق آبادی

ناشکرے

سردیوں میں سیکڑوں کا ہل ٹھٹھر جاتے ہیں لوگ
گرمیوں میں خامے پاگل ہو کے مر جاتے ہیں لوگ

برشکال آتے ہی کتنے ہیضہ کر جاتے ہیں لوگ
موسموں کے ساتھ ہی اکثر گذر جاتے ہیں لوگ

سرد و گرم و تر ہواؤں سے اُنھیں آتا ہے غش
کون سا موسم ہے وہ جس پر نہیں کرتے اش اش

سردیوں میں گرم سامان ہوں گدّے نرم صاف
دو انگیٹھی ہوں اک اندر ایک سیپرن لحاف

ابر باراں میں دم منزل ہو گھر کی بے شگاف
اور ساقی بے تکلف ہو کوئی سلمائے قاف

گرمیوں میں خس کے پردوں میں ہو برقی بادکش
خلد بن جائے جو ایسے میں ہو کوئی برف وش

دورِ موسم پر جو ہو فرزندِ حوا نکتہ چیں
اُس کو جنت میں بھی کچھ تسکین ہو سکتی نہیں

جو بغاوت کرتے ہیں آئینِ حق سے ملحدیں
دور وہ جا کر رہیں رب کی حکومت سے کہیں

موسمی پھل پھول سبزی اور دیگر نعمتیں
سوچ اے غافل کہ تجھ پر ہیں یہ کس کی رحمتیں

سردیوں کے شیفتہ قطبین میں جا کر رہیں
شائقِ باراں چراپونجی میں ڈیرے ڈال دیں

گرمیوں کے مجنوں افریقہ کے صحرا میں بسیں
سحرؔ عشق آباد ہر موسم میں شکرِ حق کریں

عقلِ کل کی اہلِ دانش کو شکایت کچھ نہیں
اور ناشکروں کے دل میں قدرِ نعمت کچھ نہیں

سعادت علی خاں

گولکنڈہ

اگر کوئی سیاح گول کنڈہ کے قلعے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھے تو اس کی نظریں سب سے پہلے بالاحصار سے ٹکرائیں گی۔ بالاحصار کی اس بلندی سے قطب شاہی بادشاہوں نے آندھرا دیس میں ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ بلند اور عظیم الشان محلوں کے پاس ہی مسجد اور مندر کی تعمیر اس تمدن کی آئینہ دار ہے۔ یہ تمدن ایسا تھا جس میں ترکستان اور ایران کے شان و شکوہ کے ساتھ تلنگانہ کی سندرتا اور کوملتا بھی تھی۔ تلنگانہ کے نظر فریب مناظر، دل کش تالاب اور حسین پہاڑیاں اور اُن کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت اور ان کھیتوں میں گونجنے والے دل کش گیت، ان سب نے قطب شاہیوں کے دلوں کو موہ لیا اور ان کے دلوں میں رس اور مٹھاس بھر دی۔

دلوں کے اِس رس اور مٹھاس سے ایسا تمدن اُبھرا جس میں ایرانی نغموں کا سحر بھی تھا اور دکھنی گیتوں کا رس بھی۔

گول کنڈہ کی سلطنت کو ختم ہوئے ڈھائی سو سال ہو چکے۔ مگر آج بھی قطب شاہوں کے تمدنی نقوش سرزمین دکن پر ثبت ہیں، اور اُس دور کی یاد دلاتے ہیں۔ جب دکن کی سرزمین آپس کے میل جول کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔

گول کنڈہ کا بانی سلطان قلی قطب شاہ، بہمنی سلطنت کے آخری دور میں ایران سے دکن آیا، اور اپنی قابلیت اور ذہانت سے گول کنڈہ کا صوبہ دار بنا۔ جب بہمنی سلطنت ختم ہوئی تو اُس نے گول کنڈہ میں قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بہمنی بادشاہوں نے بھی دکھنی رسم و رواج اور تمدن و معاشرت کو اپنا لیا تھا۔ مگر قطب شاہی تمدن پر مقامی رنگ اس درجہ غالب آگیا کہ نصف صدی کے بعد گول کنڈا ایک آندھرا راج دھانی بن گیا۔ قطب شاہوں نے تلنگانہ کو اپنا گھر بنا لیا، اور آندھرا کی معاشرت کو اپنا کر ایرانی وضع قطع چھوڑ کر مقامی لباس اور طور طریق اختیار کئے۔ انھوں نے تلگو زبان کی سرپرستی ہی نہیں کی، بلکہ خود تلگو سیکھی، اور اس میں شاعری کی۔ تلگو کے علاوہ صدیوں کے میل جول سے دکن میں جو نئی زبان "دکھنی" بن رہی تھی قطب شاہیوں نے اس کی ترقی میں دل کھول کر حصہ لیا۔ گول کنڈہ کی علم نوازی کے ساتھ اس کی دولت و ثروت کی شہرت دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی، اور گول کنڈہ کے ہیرے ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ دُنیا کے مشہور ہیرے کوہ نور کو گول کنڈہ ہی کی چٹانوں نے اُگلا تھا۔ ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں سے تجارتی کارواں اور سیاح گول کنڈہ آنے لگے۔ فرانسیسی سیاح برنیر اور ٹیونیر نے اپنے سفرناموں میں گول کنڈہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "گول کنڈہ میں علم و فضل کی قدر اور دولت و ثروت کی بہتات ہے۔ یہ ایک متمدن ترین ملک ہے۔"

گول کنڈہ کی تاریخ کا زریں دور ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد میں ابراہیم کو وجیا نگر کے راجہ رام راج کے یہاں پناہ لینی پڑی۔

راجہ رام راج نے ابراہیم کی غیر معمولی آؤ بھگت کی، اور سات سال تک اسے اپنی پناہ میں رکھا۔ جنوبی ہند کی اس عظیم الشان سلطنت میں رہ کر ابراہیم نے تمدنی بصیرت حاصل کی، اور وہیں گول کنڈہ کی سلطنت کو ایسی بنیادوں پر قائم کرنے کا عزم کیا۔ جن میں ایران اور تلنگانہ کا حسین ملاپ ہو۔ وہیں وہ تلگو زبان اور تلگو ادب سے روشناس ہوا۔ ابراہیم قطب شاہ نے نہ صرف تیلگو سیکھی بلکہ اس پر ماہرانہ عبور حاصل کیا۔ تلگو ادب کے آسمان پر اس وقت جو تارے جھلملا رہے تھے، ابراہیم کی توجہ اور سرپرستی سے تابناک ہو گئے۔ اس دور میں تلگو کے مشہور شاعر گنگا دھر نے اپنی کتاب

Thapati Samavarano Pakhyanam

لکھی، ابراہیم کے عہد میں پٹن چرو کے صوبے دار امیر خاں کے دربار میں تلگو کے ایک اور مشہور شاعر Ponnaganti Telegnarya کی قدر و منزلت ہوئی۔ اس کی کتاب Yayathi Charitri کا تلگو ادب میں اب بھی ایک ممتاز مقام ہے۔

ابراہیم قطب شاہ کے فیض سے جہاں علم و ادب سرشار ہوئے اُس کی حُسنِ نظر نے تلنگانہ کے فطری مناظر کو حسین ترین بنا دیا۔ تلنگانہ کے کئی تالاب ابراہیم کی یادگار ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر حسین ساگر ہے جو اب بھی حیدرآباد اور سکندرآباد کے بیچ بیچ ان دونوں شہروں کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ موسیٰ ندی کا پہلا پُل جو پُرانے پُل کے نام سے اب بھی شہر حیدرآباد میں موجود ہے۔ دو محبت بھرے دلوں کی دھڑکن اس کی تعمیر کا باعث ہوئی۔ دو بچھڑے دلوں کو ملانے کے لئے موسیٰ ندی کے کنارے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے مل گئے۔

یہ پُل ابراہیم کے بیٹے شہزادہ محمد قلی اور چچلم کی رقاصہ بھاگ متی کے فسانۂ عشق کی اوّلین یادگار ہے۔ ابراہیم کے عہد میں موسیٰ ندی کے دوسرے کنارے پر، جہاں اب شہر حیدرآباد ہے، ایک چھوٹا گاؤں چچلم آباد تھا۔ چچلم کی رقاصہ بھاگ متی نے شہزادہ محمد قلی کا دل موہ لیا، اور وہ اس کا اتنا گرویدہ ہو گیا کہ رات اور دن وہ بھاگ متی ہی کے تصوّر میں رہنے لگا۔ ابراہیم کو خبر ہوئی تو اس نے شہزادے کو محل کی چار دیواری میں نظر بند کر دیا۔ عرب، ایران، آرمینیا اور ترکی کی حسین دوشیزائیں محل میں رکھی گئیں۔ تاکہ شہزادے کا دل بہلے۔ ایک رات اس زور کی بارش ہوئی کہ شہزادے نے محل کی بلندیوں سے دیکھا چچلم کا کہیں پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ موسیٰ ندی میں باڑھ آگئی تھی، وہ رات کے اندھیرے میں محل سے بھاگ نکلا، اور تنہا گھوڑے پر سوار چچلم کی طرف دوڑا۔ موسیٰ ندی کی طغیانی کی پرواہ کئے بغیر، شہزادے نے اپنا گھوڑا طوفانی لہروں کے حوالے کر دیا، اور صحیح و سلامت ندی پار کر کے بھاگ متی تک جا پہنچا۔ صبح بادشاہ کو خبر ہوئی تو اُس نے موسیٰ ندی پر پُل کی تعمیر کا حکم دیا، اور اس طرح موسیٰ ندی کے کنارے پر شہزادہ محمد قلی کی محبت کا نقش امرٹ ہو گیا۔

ابراہیم کے بعد جب محمد قلی تخت نشیں ہوا تو اُس نے چچلم کی جگہ بھاگ متی کے نام پر شہر بھاگ نگر کی بنیاد رکھی، اور بعد میں یہی شہر حیدرآباد کہلایا۔ شہر کے قلب میں اُس نے چار مینار کی سی عظیم الشان عمارت تعمیر کی، اور اس میں مسجد کے ساتھ ایک مندر بھی بنوایا۔

ابراہیم قطب شاہ نے گول کنڈہ کے چمن میں ملے جُلے تمدّن کے جو پھول کھلائے تھے وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مہک اُٹھے، اور ساری فضائیں اُن کی خوشبو سے عطر بیز ہو گئیں۔ اُس نے تاتاری لباس کے بجائے جو اُس کے آبا و اجداد پہنتے آئے تھے، دکنی لباس پہنا۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی، پوستین اور یا تاقی قبا کے بدلے ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنا۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ڈالے، اور ڈاڑھی مُنڈھائی، جو بالکل تلنگانہ کی طرز تھی۔ سب سے بڑھ کر محمد قلی نے اس زبان کو ترقی دی جو صدیوں کے میل جول سے دکن میں بن رہی تھی۔ یہ دکنی زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی آئینہ دار تھی، اور جو گول کنڈہ کے تمدّن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ محمد قلی نے نہ صرف اس زبان کی سرپرستی کی بلکہ فارسی کے بجائے دکنی کو اپنایا، اور اس زبان میں شعر کے ایسے پیکر تراشے جن کا حُسن اب تک ماند نہیں پڑ سکا۔ اُس نے دکنی میں پچاس ہزار شعر کہے۔ اور تیلگو میں بھی ایک دیوان چھوڑا۔ اس کی شاعری کا موضوع اس کی زندگی کی طرح زنگارنگ ہے۔ اس کا تخیل سرزمین تلنگانہ کی طرح شاداب اور رنگین ہے۔ جگہ جگہ اس نے اپنی شاعری میں تلگو کے لفظ استعمال کئے ہیں۔

محمد قلی کی شاعری پُرشکوہ محلوں اور بلند ایوانوں میں بند نہ رہ سکی، وہ محل کے شان و شکوہ کو چھوڑ کر عوام کے ساتھ کھلے میدانوں میں نکل آتی ہے، جہاں وہ عوام کے رنج و غم اور خوشی و مسرت میں اُن کی ساتھی بن جاتی ہے۔ عیدوں، تہواروں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج پر اُس نے بیسیوں نظمیں لکھیں ہیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعرِ اعظم کا دل عوام کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا، اور اُس نے عوام کی زندگی کو اپنی زندگی میں سمو لیا تھا۔ یہ اس کا فیضِ نظر تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی اسی جوش عقیدت کے ساتھ محرّم مناتے تھے، اور دکن کی سرزمین پر اب بھی اس کی جھلکیاں باقی ہیں۔ محمد قلی کی بصیرت نے یہ جان لیا تھا کہ سرزمین ہند پر ایک ملا جُلا تمدّن ہی زندہ اور پائندہ رہ سکتا ہے، اور اس نے آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے اس تمدّن کو معراج پر پہنچا دیا تھا، وہ عیدین کے علاوہ نوروز، بسنت اور مرگ (بارش کا پہلا دن) کی تقریبیں

پرجشن مناتا، اوران موقعوں پر وہ عوام کے ساتھ مل کر خوشی کا اظہار کرتا۔
نوروز پر وہ کہتا ہے: "نورانی نوروز نور کے جلوؤں کے ساتھ آیا اور سارا چمن چاند کی طرح جگ مگ کر رہا ہے۔ چمن میں بلبلیں ایسی دکھائی دے رہی ہیں جیسے حسینوں کی آنکھوں میں تل۔"
ایک بار عید اور نوروز مل کر آئے تو محمد قلی نے کہا: "نوروز اور یومِ عید آپس میں بھائی بہن کا صیغہ پڑھ کر ایک ہو گئے ہیں، اور عید کی دوہری خوشیاں اپنے ساتھ لائے ہیں۔"
محمد قلی نے بارش کے آغاز کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کیونکہ دکن میں بارش کا موسم ہی بہار کا موسم ہے۔ جس روز میرگ لگتا وہ بڑی دھوم دھام سے مجلس آرائی کرتا۔ شاہی محلوں میں زمرّدی رنگ کی مسندیں بچھائی جاتیں اور ہر طرف خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جاتا۔
برسات کی آمد پر وہ کہتا ہے۔
"بارش کا موسم آیا، اور کلیوں کا راج شروع ہو گیا۔ کیوں کہ اب ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔"
"زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھی، اور آنکھ میں کانچ کے رنگ کا سرمہ پہن لیا۔"
"ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں بلکہ زمرّد کی لگنوں میں شبنمی تیل کی شمعیں جل رہی ہیں۔"
جب بسنت کا موسم آتا اور گول کنڈہ کے حسین سبزہ زاروں میں بسنتی پھول کھل اٹھتے تو محمد قلی کی زندگی بھی جھوم اٹھتی۔ گول کنڈہ کے وسیع میدان ایک پُرکیف منظر میں بدل جاتے۔ جہاں محمد قلی سب کے ساتھ جشن میں شرکت کرتا۔
بسنت کے سوانگت میں محمد قلی کے دھڑکتے دل کی آوازیں شعر کے روپ میں اس طرح گونج اٹھتیں۔

شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لایا بسنت — نین تیلی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت
سبز سارے نور تن کسوت کئے ہیں رنگ رنگ — سرو کی مینا میں بھی شبنم کی مے پایا بسنت
سارے پھولوں تیں بسنت کا پھول بھائی کیا — گُل پیالہ بن کے خدمت کے لئے آیا بسنت
موتی اور یاقوت کے گھر گھر میں انبار لگے — ہر گدا کو مثلِ خاقاں کر کے دکھلایا بسنت

قلعۂ گول کنڈہ کے پاس نئے قلعے میں جو پُر فضا تالاب اور وسیع مرغزار ہے وہاں اب بھی بسنت پر ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ اس طرح بسنت کے شیدائی محمد قلی کے جشن کی یادگار اب بھی مناتے ہیں۔
محمد قلی نے شادی بیاہ کی رسموں پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ مہندی، سانچق، جلوہ یہ سب اس کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ جلوے کی نظم تو اب بھی دکن میں شادیوں کے موقعے پر گائی جاتی ہے۔
محمد قلی کا عہد گول کنڈہ کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ جہاں میر مومن اور مرزا محمد امین جیسے باکمال اور صاحبِ تدبّر اس کی درباری زینت بنے تو امیر راؤ اور دھرما راؤ جیسے دکھنی سورما اس کی سلطنت کی ترقی کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئے۔
محمد قلی کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد محمد قطب شاہ نے عنانِ سلطنت سنبھالی تو ملک میں ہر طرف خوش حالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔ محمد قلی نے جو تمدّنی ورثہ چھوڑا تھا، محمد قطب شاہ نے اسے سینے سے لگائے رکھا۔ اس دور میں دکن کا گوشہ گوشہ علم و ادب کی جوت سے جگمگا اٹھا۔ محمد قطب شاہ کو تعمیری ذوق بھی ورثے میں ملا تھا۔ حیدرآباد میں مکّہ مسجد اس کی یادگار ہے۔
قلعہ گول کنڈہ میں تالاب نما کٹورا حوض کے کنارے، جو اب بھی عہدِ ماضی کی یادگار کے طور پر باقی ہے، شاعروں، ادیبوں، اور انشاء پردازوں کے جمگھٹے لگتے ——، اور حوض کے آس پاس کے سبزہ زار علم و ادب کے چرچوں سے گونج اٹھتے۔ اس طرح کٹورا حوض کے گوشے کئی شعری حلقوں میں بٹ گئے۔ کٹورا حوض کا مغربی حلقہ ملّا وجہی کے نام سے منسوب تھا۔ وجہی، محمد قلی کے دربار کا ملک الشعراء، دکھنی کا سب سے بلند پایہ شاعر اور ادیب ہے۔
محمد قطب شاہ کے عہد میں وجہی کی جگہ غواصی نے لے لی، کٹورا حوض کا جنوبی گروہ غواصی کے نام سے منسوب تھا۔ ان دو استاد شاعروں کے علاوہ طبعی، قطبی اور ابن نشاطی گول کنڈہ کی محفلِ ادب کی زینت تھے۔ وجہی کی سب رس اور قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، ابن نشاطی کی پھول بن اور طبعی کی بہرام و گل اندام اب بھی دکھنی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔
محمد قطب شاہ کے بعد اس کے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل حکمراں احمد نگر اور بیجاپور کے بعد گول کنڈہ کو اپنانے کی فکر میں تھے۔

اس دور میں حیات بخشی بیگم کی شخصیت گول کنڈہ کی تمدنی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاتون محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی۔ محمد قطب شاہ کی بیوی اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھی، اور ماں صاحب کے نام سے مشہور تھی۔ حیدرآباد میں ماں صاحب کا تالاب اسی کی یادگار ہے۔

حیات بخشی بیگم کی ایک اور یادگار پانچویں محرم کا لنگر بھی ہے، جو حیدرآباد شہر اور حیدرآباد کے گاؤں گاؤں میں صدیوں تک جاری رہا۔ اور عوام ہر سال محرم میں یہ لنگر مناتے رہے۔ ایک مست ہاتھی جس پر عبداللہ قطب شاہ سوار تھا جنگلوں میں بھاگ نکلا۔ کئی دن تک عبداللہ قطب شاہ کی کوئی خبر نہ ملی تو حیات بخشی بیگم نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں منت مانی "اے امام شہید مظلوم، آپ کی لونڈی کے جگر کا ٹکڑا اگر خیرو خوبی سے لوٹ آئے تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے پہلے چالیس من سونے کی زنجیر بنواؤں گی، اور مست ہاتھی کے پاؤں میں لنگر کر کے آپکے غلام سلطان عبداللہ کی کمر میں باندھ کر قلعہ گول کنڈہ سے حسینی علم تک پاپیادہ لے جاؤں گی۔"

عبداللہ قطب شاہ جب صحیح سلامت لوٹ آیا تو حیات بخشی بیگم نے یہ منت پوری کی۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل کئی بار گول کنڈہ کی دیواروں تک چڑھ آئے اور اسے ہر بار صلح کر لینی پڑی۔ گول کنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کا دور ان ہنگاموں سے پُر رہا۔ تانا شاہ کے عہد میں تلنگانے کے امیروں کو بڑے بڑے عہدے ملے۔ اس دور میں مادنا اور اکنا گولکنڈہ کی سیاست پر چھائے رہے۔ آخر ۱۶۸۶ء میں مغل حملہ آور سیلاب کی طرح گول کنڈہ کی دیواروں سے ٹکرا گئے۔ مگر یہ دیواریں اتنی مضبوط ثابت ہوئیں کہ آٹھ مہینے تک محاصرہ کرنا پڑا۔ پھر بھی ابوالحسن اور اس کے جاں بازوں کے عزم و ہمت میں ذرا سی کمی نہ آئی۔ اس محاصرے سے تنگ آکر مغلوں نے گولکنڈہ کے ایک سپہ سالار سے سازش کر لی، اور اُس نے مغل فوجوں کو ایک چور دروازے کی راہ قلعہ میں داخل کر لیا۔ ابوالحسن کے جاں نثار اس پر بھی تلواریں سونت کر سامنے آگئے۔ ابوالحسن کے باہمت سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے تو شجاعت اور وفاداری کی مثال قائم کر دی، اور چند جاں بازوں کے ساتھ اس مغل سیلاب میں کود پڑا، اور زخموں سے چُور چُور ہو کر بھی مغلوں کی اطاعت نہ کی۔ گول کنڈہ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ مگر مغل شہنشاہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر گول کنڈہ میں عبدالرزاق لاری سا ایک بھی اور سپہ سالار ہوتا تو گول کنڈہ کبھی فتح نہ ہوتا۔ تقریباً دو سو سال تک نئے نئے تمدن کو پروان چڑھا کر گول کنڈہ کی حکومت ختم ہو گئی۔ مگر اُس نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا ہے وہ اب بھی اس ملک کے لئے سرمایۂ امتیاز ہے۔

محمد قلی قطب شاہؒ

بسنت

پیاری کے مکھ میانے کھیلیا بسنت (میں) — پھولاں جوں نچھر کے چھڑکیا بسنت (سے)
بسنت یاس جیوں جیوں چھوری بند ہے — جو ابھر کے ہراں سوں آیا بسنت
جوبن حوض میں نور تن رنگ بھرے — بسنت راگ گا و سہایا بسنت
زنگانید میانک بند گلسری — گلے گل لڑاں سوں دکھایا بسنت

نوی بالی کونلی کدم میں بیسے — پرت پیالے بھر بھر پلایا بسنت (محبت کے)
بسنت کی خماری نین میں بھری — ہنڈولے نین دل ڈلایا بسنت
نبیؐ صدقے میں ہوں محمدؐ غلام — نوی رت سیتی رت ملایا بسنت

آر، اُوچِل

مترجم: مَنی تبسم

مدّنا ـــــــ کنڑ زبان کا عظیم شاعر

۱۸۹۲ء تک کنڑ کی پانچ کلاسیکی تخلیقات "سومیشور اشتکا" "کنڑ بھارت" "توروے راماشن" "جیمنی بھارت" اور "چنا بسوا پُران" کے سوا کنڑ ادب میں شاید ہی کسی ادبی تصنیف سے لوگ واقف تھے۔ جنوبی کنڑ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کنڑ ادب کی تمام خوبیاں اور نزاکتیں گر سوپی شانتیا اور پارتی ستیا کی یکشگناؤں میں اکٹھا ملتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اڈیپی اور منگلور میں بی وینکٹ چار کے ناولوں کو بھی تھوڑی بہت مقبولیت حاصل تھی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ پُرانوں کو خاص طور سے پڑھنے اور سننے کے شائق تھے اور کسی دوسری ادبی صنف کی کوئی قدر نہیں ہوتی تھی۔ اُس سرزمین میں جہاں کی روایتیں ایسی ہوں اور اک ایسے زمانے میں جب کہ پُرانے خیالات نئے تصورات کے پَنپنے میں شدت سے مزاحم ہو رہے ہوں ظاہر ہے کہ شاذ ہی کوئی ادیب کسی غیر معروف ادبی صنف کو اپنانے کی جراٴت کر پاتا تھا۔ بالخصوص جب کہ ان کاوشوں کا کوئی مادّی فائدہ بھی نہ تھا۔ ایسے ماحول میں مدّنا نے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔

یہ کرناٹک کے لئے ایک المیہ ہے کہ مدّنا جو ایک ہائی اسکول میں ڈرل ماسٹر تھا، کنڑ ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ بن کر بہت ہی قلیل مدّت کے لئے جگمگا سکا۔ کرناٹک کا یہ عظیم شاعر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۱ء تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ اُسے کرناٹک کے عوام کا وہ پیار اور اُن کی وہ تعظیم حاصل نہیں ہو سکی جس کا وہ حقیقت میں مستحق تھا۔ اہلِ کرناٹک اب اپنی ناقدری کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ادب عوام کی زندگی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اگرچہ ادب کی یہ توجیہہ نئی نہیں ہے لیکن کنڑ ادب میں اس دریافت کا سہرا مدّنا کے سر ہے۔ جب ہم قدیم کنڑ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ادیب یہ پیش بینی نہیں کر سکے کہ عام آدمی بھی اُن کا قاری ہو سکتا ہے۔ اچھا ادب اسی وقت پروان چڑھ سکتا ہے جب ادیب اور قاری کے درمیان یگانگی اور دوستی کے تعلقات اُستوار ہوتے ہیں۔ اپنی ذکاوت اور غیر معمولی بصارت کے سبب مدّنا اس حقیقت کو جان گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ یا تا حزوہ کنڑ عوام کی مسرتوں اور تمناؤں کا مستقل سرچشمہ بن گیا۔

کنڑ کے بڑے ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ مدّنا کی "رامیشو میدھا" سے کنڑ ادب کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں ایک قدیم اور مشہور اور قدیم رزمیہ کہانی کو پیش کیا گیا ہے لیکن اس کا طرزِ تحریر بالکل ہی جداگانہ ہے۔ "چامپو" کی رسیلی شاعری جو کنڑ قاری کے جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ مدّنا کے ہاتھوں میں پہنچ کر اس کا رنگ دوبالا ہو گیا۔ جیسے سونے پر سہاگہ چڑھا دیا ہو۔

"رامشو میدھا" کی غیر معمولی شہرت کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نثر میں لکھی گئی ہے۔ اس کی منظر نگاری جاندار اور فلسفۂ حیات کی پیش کش کا انداز عام فہم اور سلیس ہے۔ اور چوں کہ اس کا طرز قدیم کنڑ نثر سے ملتا جلتا ہے، اس لئے وہ پنڈتوں میں بھی اُتنا ہی مقبول ہوئی جتنا کہ عام لوگوں میں۔

دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح مدّنا بھی کبھی کبھار اپنی مہارتِ زبان کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے۔ ایک دفعہ جب وہ بلیغ اور ادق زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا تو اس کی بیوی منورما نے اسے ٹوک کر، اسی کے مانند برجستہ لیکن کسی قدر آسان ادبی طرز میں اس کا مذاق اڑانے لگی۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ آیا حقیقی زندگی میں بھی اس کی بیوی نے اس سے ایسے سوالات کئے تھے یا نہیں لیکن حقیقت میں یہ بات درست ہے کہ نئے ادب اور نئے سماج کی تخلیق کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے۔

"منورامے" کے کردار کو پیش کرنے سے مدّنا کا کیا مقصد تھا۔کیا وہ صرف ایک وفادار بیوی کی تصویر ہے؟ ان سوالوں کے جواب کے لئے خود "رامیشومدھا" کا مطالعہ ضروری ہے۔جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب مدنا رام کے سیتا کو چھوڑ دینے کا واقعہ سناتا ہے تو منورامے اسے ٹوک دیتی ہے۔جیساکہ عام طور سے رام کو "سیتا رام" کہا جاتا ہے مدنانے بھی یہی الفاظ رام کے لئے استعمال کئے۔اس پر منورامے نے اعتراض کیا کہ وہ "سیتارام کیونکر کہلا سکتے ہیں جب کہ سیتا ان کے ساتھ نہیں رہی۔

شیرینی اور لطافت میں مدنا کی نثر بھی ابتدائی دور کی کنڑ شاعری کو مات کرتی ہے۔

مدنا انسانی نفسیات کا ماہر نبّاض تھا۔ اس کی ایک مثال مندرجہ ذیل واقعہ سے مل سکتی ہے جو اس نے بیان کیا ہے۔ایک دفعہ جب سیتا جھولا جھولتے ہوئے اپنی سہیلیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھی اس نے درخت کی ٹہنی پر ایک چڑیا کو دیکھا کہ اپنے بچے کو دانہ کھلا رہی ہے۔اس منظر سے سیتا کے مادرانہ جذبات اس حد تک اُبل پڑے کہ اسے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا اور وہ سوچنے لگی کہ وہ مسرت اسے نصیب نہیں جس سے اس وقت وہ چڑیا لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پھر وہ بیان کرتا ہے کہ جب چڑیا نے سیتا کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنی کمتری اور بے عزتی کا احساس ستانے لگا۔

یہاں ایک ایسی عورت کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے جسے ماں بننے کی شدید آرزو ہے۔اس واقعہ کے بعد وہ اپنی سہیلیوں سے اس مسئلے پر بات چیت کرتی ہے۔ایسے موقع پر انسانی تخیل جن نشیب و فراز سے گزرتا ہے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔

کنڑ ادیب متری ماستی لکھتے ہیں۔قارئین یہ محسوس کرتے ہیں کہ مدنا بلاشبہ نہ صرف کنڑ بلکہ دنیا کی کسی زبان کے صفِ اول کے شعراء میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔فطرت کی منظرکشی میں کالی داس یا شیکسپیر سے وہ کسی طرح پیچھے نہیں۔

کنڑ میں اس کے اندازِ بیان اور زبان کی خوبیوں کو انگریزی زبان کے ادیبا کرسکن، ورڈ کنس کے اسٹائل کی خوبصورتی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

"راماپتا بھشکا" اور "ادھٹا راماٹو" مدنا کی دوسری تخلیقات ہیں۔ جن میں اول الذکر کی عبارت مقفیٰ ہے اور جابجا اس میں استعارے اور تشبیہات استعمال کی گئی ہیں۔ اصل "ادھٹا راماٹو" سنسکرت کی تصنیف ہے۔اسے کنڑ میں منتقل کرتے وقت مدنانے مذہب سے محبت اور خدا کے ایقان پر بہت زور دیا ہے۔ مزید براں مدنانے سنسکرت رزمیہ کو جوں کا توں نہیں پیش کر دیا ہے بلکہ اس میں بھی اس کا منفرد رنگ نمایاں ہے۔

مدنا ایک محبِ وطن شاعر تھا۔آج بھی اس کی یکشگناؤں (رومانیہ نظموں) "کمار وجے" اور "رتنا دلی کلیاں" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ الفاظ کے چناؤ کا حسن، شعریت اور "کمار وجے" کے ناقابلِ فراموش رزمیہ مناظر اس کی یکشگناؤں کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس کی یہ یکشگنائیں پنڈتوں سے وہ خراجِ تحسین حاصل نہ کرسکیں جو اس کی تخلیق "رامشومدھا" کو حاصل ہوا تھا۔

اگر یہ کہیں تو صرف ایک بے جا تعلّی ہوگی کہ ایک عظیم سرزمین نے اس بلند مرتبہ شاعر کو جنم دیا۔ کیوں کہ اس کی زندگی آج کے کسی اوسط کنڑ ادیب کی زندگی کی طرح نہایت معمولی تھی۔ اگر ادب سے ہماری محبت ہمارے ادیبوں کی زندگی کے لئے کارآمد نہیں ہوسکتی اور انھیں معمولی سا فائدہ بھی نہیں پہنچا سکتی تو پھر ہمیں بھی جنوبی کرناٹک کے شاعر کے ہم زبان ہو کر یہ کہنا پڑے گا کہ "کرناٹک میں پیدا ہونا ہی پڑے تو کوئی شخص شاعر بن کر جنم نہ لے"۔

نذرِ وطن

ترا طریق مداوا ہے دردِ عالم کا | جہانِ تازہ کرشمہ ہے سعیِ پیہم کا
نظر نواز ہے انداز تیرے پرچم کا | فضا میں نور فشاں ہے پیام گوتم کا

سیاہ دورِ غلامی خیال و خواب ہے آج
بلند عظمتِ انساں کا آفتاب ہے آج

(وحید)

آر۔ ایس۔ بگل

ایٹم کیوں؟

ایٹم کا نظریہ انسانی فطرت کی ایک گہری مانگ کو پورا کرنے کے لئے اختیار کیا گیا۔ اس نظریے کا آغاز مشاہدہ، تجربہ یا حواس پر باہر سے پڑتے ہوئے اثرات میں نہیں بلکہ اس فطرتی مانگ میں ہے۔ ایٹم کی طرف انسان کی توجہ بیرونی مجبور کن واقعات نے نہیں بلکہ اس اندرونی مانگ نے پھیری۔

ارتقار کے دوران میں جب انسان نے سیدھا کھڑے ہونے کی طرز اختیار کی تو اس کی آنکھیں سطحِ زمین سے بہت حد تک اوپر اٹھ گئیں۔ ان کی سمیٹ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ اس کشادگیٔ نظر سے پیدا ہوئی پہلی آگاہی جو اسے ہوئی وہ تھی دنیا کے تغیر و تبدل کی۔ اس نے دیکھا کہ دنیا ایک روانی ہے۔ ہر شے یہاں کی آنی جانی ہے۔ موسموں کا چکر۔ آندھی۔ طوفان، زلزلہ، بارش، سیلاب، طغیانی، بخارات، بادل، نباتات اور حیوانات بھی بُری طرح اس دور کی گرفت میں دکھائی دئے۔ پیڑوں کا اگنا، ان پر جوبن آنا۔ خوبصورت اور رنگا رنگ۔ پرندوں کا چہچہانا۔ پھر خزاں کی آمد دلکش پھولوں کا مرجھانا۔ جھڑ جانا۔ گل سڑ جانا۔ پرندے خاموش اور سارا جوبن روپوش۔

ہم جنس انسانات کا بھی یہی حال نظر آیا۔ پیدائش، بچپن، جوانی بڑھاپا، موت سب دَورِ زمانہ کے مختلف پہلو دکھائی دئے۔ دل کی دھڑکن میں گزرتے وقت کی جھنکار سنائی دی۔

اس دَورِ زمانہ کا نہایت مایوس کن پہلو یہ ہے کہ جتنی کوئی شے زیادہ قیمتی، افضل یا قابلِ قدر ہے اتنی ہی نازک۔ عارضی اور ناپائیدار ہے۔ سیلاب اور خشک سالی سے گھاس نہیں بلکہ گیہوں تباہ ہو جاتی ہے۔ جاڑے یا لُو سے کیکر نہیں بلکہ گلاب مرجھا جاتا ہے۔ پھول خوشبو سے بھرپور مجسم تازگی۔ خالص جمال۔ پاکیزگی، روح افزائی مرجھا جاتے ہیں کملا جاتے ہیں۔ شدتِ گرمی یا سردی سے۔ یا بُری طرح چھونے سے لیکن کچھ نقصان نہیں پہنچتا بیر کی جھاڑی کو یا سرکنڈے کو۔ ایک نازک، تیز حسن، زود رنج حسینہ بُری طرح نقصان کھا جاتی ہے ذرا بد سلوکی سے دنگہ فساد سے۔ ہلکی سے ہلکی بیماری سے، کھو بیٹھتی ہے اپنے نازک چہرے کی نفاست کو۔ لیکن ایک کالی کلوٹی۔ بدشکل، فربہ جسم، تبدیلی اثرات سے بے خبر۔ اثر پذیری سے خالی عورت ان سب نقصانات سے بری ہے۔ ایک چٹان دورِ زمانہ کی پامالی سے بہت حد تک آزاد ہے۔ لیکن انسانی خلقت کی شان بُری طرح اس کی گرفت میں ہے۔ یہ ہے دورِ زمانہ کا نہایت مایوس کن اور دل شکن پہلو۔ اور یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی ٹریجڈی

ہر کھیل چند روزہ۔ ہر عمل تبدیلی۔ ہر شے ساخت اور تباہی کا چکر۔ غرض کوئی چیز پائیدار نہیں۔ کچھ قائم مستقل نہیں۔ پھر زندگی کا سہارا کیا؟ امیدوں کا ٹھکانہ کیا؟ اس آگاہی سے پیدا ہوئی افسردگی نے زندگی کا لطف بگاڑ دیا۔ پائیداری کی مانگ دل کو ستانے لگی۔ یہ مانگ انسانی فطرت کی بنیادی خصلت ہے۔ اس مانگ کو پورا کرنے کے لئے۔ اور اس مانگ سے پیدا ہوئے دلی تناؤ کو دور کرنے کے لئے پائیداری کی تلاش شروع ہوئی۔ اس تلاش میں دنیا بھر کے چوٹی کے فلاسفروں نے عظیم الشان نظام کھڑے کئے۔ وہ نظام جس پیمانے پر تجویز کئے گئے اور ان کی تعمیر میں جس پُراسرار منطق اور باریک بینی سے کام لیا گیا اُسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ایٹم کا نظریہ اس تلاش کا ایک نتیجہ ہے۔ محققوں نے پائیداری ایٹم میں پائی۔ یا یوں کہو ایٹم پائیداری سنبھالنے کے لئے گھڑے گئے۔ وہ مجسم ہمیشگی۔ امٹ غیر متبدل۔ ہمیشہ یکساں۔ ناقابلِ تقسیم۔ نہ وقت چھو سکے۔ نہ دَورِ زمانہ کچھ فرق ڈال سکے۔ سب خاصیتوں میں ایک

محض شکل اور حجم میں مختلف۔

اگر دنیا کی ہر شے ایٹم سے بنی ہوئی ہے اور ایٹم مجسم ہمیشگی ہے تو یہ تغیر و تبدل کیوں؟ کال یا وقت کیوں؟ ٹھہراؤ کی بجائے رفت کیوں اس کی وجہ ہے ایٹموں کی بنتی اور بگڑتی ہوئی ترتیب۔ بدلتے ایٹم نہیں۔ بدلتی ہے ان کی بندش۔ ان کی ترکیب۔ دنیا کی روانی کا راز ہے ایٹموں کی بنتی اور بگڑتی ہوئی۔ بندھتی اور کھلتی ہوئی۔ جڑتی اور ٹوٹتی ہوئی الجھتی اور سلجھتی ہوئی تنظیم۔

حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ اور اہم تجربہ کیا گیا ہے۔ ایک شیشے کی امتحانی نلی میں تھوڑا سا پانی اور تین گیسیں (ہائیڈروجن، امونیا اور میتھین) ڈال دی گئیں۔ (امونیا ایک ایٹم نائٹروجن اور تین ایٹم ہائیڈروجن کا مرکب ہے۔ میتھین ایک ایٹم کاربن اور چار ایٹم ہائیڈروجن کا مرکب ہے) اس نلی کو بجلی کی ایک مخصوص روشنی کے زیر اثر ایک ہفتہ کے لئے رکھا گیا چند دن بعد یہ آمیزش رنگین بن گئی۔ جب اس نلی کے نو منظم مرکبات کو کیمیائی طریقہ سے دیکھا گیا تو کئی طرح کے امینو ایسڈ پائے گئے۔ (امینو ایسڈ ایسے تیزاب ہوتے ہیں جو ان مرکبات میں پائے جاتے ہیں جن کو لے کر ہی حیات ظہور پذیر ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے) یہ تجربہ بتاتا ہے کس طرح ایک مخصوص تنظیم بے جان ایٹموں کو حیاتی مرکبات میں بدل سکتی ہے ان مرکبات کو لے کر ہی نباتاتی اور حیواناتی دنیا ظہور میں آتی ہے۔ ان کو لے کر ہی پھول اور پھل کی دنیا، چہچہاتے پرندوں اور دبی اوصاف کی دنیا موجود ہے۔ ان مرکبات کی تنظیم ٹوٹ جانے پر ان جاندار ہستیوں کی موت ہو جاتی ہے۔ گل جاتی ہیں۔ سڑ جاتی ہیں۔ سادہ سے سادہ مرکبات میں تحلیل ہوتی ہوئی پھر انھیں ایٹموں میں بکھر جاتی ہیں جن کو لے کر جاندار ہستی بننے کا عمل شروع ہوا تھا۔ اس طرح ساخت اور تباہی کا چکر پورا ہوتا ہے۔

بہت کچھ ہوا۔ بہت کچھ بنا۔ حیرت انگیز چیزیں وقوع میں آئیں اس چکر نے عجیب و غریب کرامتیں دکھائیں۔ فرش کو عرش کر ڈالا۔ اس دنیا کو ظہور کا شرف بخشا۔ سچ پوچھو تو یہ لیلا۔ یہ تماشہ۔ یہ کھیل ایٹموں کا سنگت ناچ ہے۔ وہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن ان کو کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیشہ فاعل لیکن کبھی مفعول نہیں۔ سب کچھ بنانے اور بگاڑنے والے لیکن خود بننے اور بگڑنے سے بالاتر۔ بے لاگ بے داغ۔ دورِ زمانہ کی بنیاد لیکن دورِ زمانہ سے آزاد۔ خود بے عمر لیکن دوسروں کو عمر دینے والے۔

ایٹم کا نظریہ دورِ زمانہ کو اُڑا دینے کے لئے نہیں بلکہ دورِ زمانہ میں قیام مستقل پانے کے لئے اختیار کیا گیا۔ دور اور قیام میں کیا تعلق ہے؟ وقت اور ہمیشگی میں کیا رشتہ ہے؟ بے ثباتی اور پائیداری کس طرح بندھے ہوئے ہیں؟ یہ فلسفہ کے گہرے سوال ہیں۔ اس تحریر کے بعد ہم کو اکثر ان پر بحث کرنی ہوگی۔

حکومتِ کچھ کو مرکزی حکومت کی اِمداد

حکومت ہند نے "زیادہ خوراک اگاؤ" کے پروگرام کے ماتحت ریاست کچھ کو ۵۶-۱۹۵۵ء کے لئے ۲ لاکھ ۵، ہزار روپے کی امداد دی ہے۔ مذکورہ بالا رقم میں سے ۲۵۰۰۰۰ روپیہ ان ۸۵۰ نل دار کنوؤں کی تعمیر کرنے پر صرف کیا جائے گا جو ریاستی حکومت سال رواں میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرنا چاہتی۔ مؤخر الذکر رقم میں مزدوری شامل نہیں ہے۔ ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپے کی باقی ماندہ رقم ریاست میں آبپاشی کے چھوٹے چھوٹے کاموں مثلاً پشتوں وغیرہ پر خرچ کی جائے گی جن کی اصل لاگت ۵ لاکھ روپے ہے۔ اس اسکیم کے ماتحت پروجیکٹوں کی تکمیل پر کاشتکاروں کو لاگت کا ۲۵ فیصدی بطور سرکاری امداد دیا جائے گا۔

علاوہ ازیں حکومت ہند نے آبپاشی کے زیر تعمیر چھوٹے چھوٹے کاموں میں سرکاری امداد دینے کی غرض سے ۹،۵۰ روپے کی پیشگی رقم بھی منظور کی ہے۔

فاضل کاشمیری

کشمیر

سبزہ زارن، کوہسارن، شالہ مارن ہند وطن
(کشمیر سبزہ زاروں - کوہساروں اور شالماروں کا وطن ہے)

گلستان جنت بداماں، گل ہراں تے گل فشاں
گلعذارن، ماہ پارن، بالہ یارن ہند وطن

ترجمہ: کشمیر ایک گلستاں ہے - ایک رنگیں خیاباں - اس کے دامن میں باغ رضواں پل رہا ہے (اس کی سرزمین ایک آسمان ہے) جہاں سے ہرآن پھلجھڑی لگ رہی ہے .... واہ رے گلہاری! اے گلرخوں، ماہ لقاؤں اور تیکھے بالموں کی جائگاہ (تعریف کے تمام تر معنی تیرے لئے وقف ہیں)۔

سبزہ زارن پیٹھ رنگیں دنیا بساون چھوی ژہ پار
سنبلن تے نرگسن تے لالہ زارن ہند وطن

ترجمہ: اے ذی ہوش! معلوم ہے تمھیں کہ اپنے شوق و محبت کی دنیا کہاں کے سبزہ زاروں میں بسائیگے - سب سے نیاری اور رنگین دنیا! ہاں یاد رکھو یاد رکھو کہ یہ تمناؤں کی دنیا سنبل و نرگس کے وطن اور گل لالہ کی آرامگاہ میں بسیگی -

جایہ جائے کوثر و تسنیم جاری چھوی نخواں
جوئبارن، تیز آرن، آبشارن ہند وطن

ترجمہ: بہشت میں ایک آبجو کوثر ہے اور ایک تسنیم - لیکن یہاں تو جگہ جگہ پر ان سے برتر نہریں اور شیریں چشمے ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ کشمیر بجائے خود جوئباروں آبشاروں اور ندی نالوں کا ہی ایک وطن ہے

بلبلن - ہارین - ثرین - طوطلن تہ بیہ دیگرن جلی
کدہرن - پازن - نہ بیہ آسمان شکارن ہند وطن

ترجمہ: بلبل اور مینا - طوطے اور گوریہ - ابابیل اور نیل کنٹھ - سیاہ گوش اور شہباز، رفیع اور بلند پرواز چہکتے اور خوش آواز پرندوں کا وطن ہے -

لولہ سان چھہ نین تہ پردین انھنک مس باگراں
گلشنن تے جنگلن - گامن شہارن ہند وطن

ترجمہ: کس پریم سے اور کس چاہ سے اپنوں اور پرایوں میں بلا امتیاز رنگ و رشتہ بھر بھر کے جام محبت انڈیلتا جاتا ہے - حسین محبت کے رنگیں جام ... یہ ایسے ہی ساقی کا حصہ ہے جو سر سبز جنگلوں سے گھرے ہوئے دیہات اور گلزاروں سے بھرپور شہروں کو لئے ہوئے جھومنے والا ساقی کشمیر ہے -

ہر طرف کنز کنز چھو سانین دشمنن سینہ سپر
بائلن تے دیوزارن - دیودارن ہند وطن

ترجمہ: اپنے عشاق کا اپنی - نڈر اور جری - بہادر اور قوی - دشمن سے لوہا لینے والا ... یہ چمن کے لئے آتش نظر اور امن عالم کی خاطر سینہ سپر ... ہمدم دیوزار - دیوداروں کا ہرا دل لئے رہتا ہے -

مختلف فرقن سکھن - ہندن مسلمانن ہندین
دوستانن - میلہ ثارن - بھائی چارن ہند وطن

ترجمہ: اخوت کا علمبردار - برادری اور برابری کی ضمانت - ہندو مسلم اور سکھ کے بھائی چارے کا نشان اور دوستی اور یگانگی کا وطن ہے -

گو سو شخصی راج نے بیہ تاج تے باج و خراج
باجدارن ہند نیہ مت تاجدارن ہند وطن

ترجمہ: باج و خراج تخت و تاج اور شخصی راج کے خاتمے کا فرمان جہاں سے جاری ہوا - وہی دیش ہے کشمیر کا - جہاں کا مزدور اب خود اپنی تقدیر ہے اور جس ملک کی رعایا خود راعی ہے - یہاں کی ترقی اور یہاں کے عروج میں اب سامراجیت حائل نہیں -

چھوی کتھن معنی نوے مطلب نوے مقصد نوے
فاضلا چانین نوین اشعارن اشارن ہند وطن

ترجمہ: آج کی بات بات میں نئے مطالب ہیں - ایک ایک مطلب کئی ایک معنی کا حامل ہے - ایسا تو ضرور ہوگا اور بالکل ضرور - کیونکہ یہ سخن فاضل کے اشعار و اشارات کے وطن کشمیر سے گونج اٹھے ہیں -

عزیز کاشمیری

مقدّس سرزمین

کشمیر متحدہ ہند کے شمال میں سب سے بڑی ریاست تھی - اس کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل ہے جس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ سرحدی اضلاع پر مشتمل ہے جہاں بہت کم آبادی ہوتی ہے - ۱۹۴۱ء کی مردم شماری اگرچہ وثوق کے ساتھ قابل اعتبار نہیں ہے - پھر بھی اس کے مطابق ریاست کی مجموعی آبادی ۴۰،۲۱،۶۱۶ ہے - جن میں ۳۱،۰۱،۲۴۷ مسلمان، ۸۰۹۱۶۵ ہندو، ۶۵۹۰۳ سکھ، ۴۰۶۹۶ بودھ اور ۴۰۶۰۵ دیگر اقوام کے لوگ ہیں -

کشمیر اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں کی وجہ سے تمام دنیا میں لازوال شہرت کا مالک ہے - اس سرسبز و شاداب ریاست میں پانی کی بہتات ہے - خوشگوار اور زندگی بخش آب و ہوا' خوبصورت مناظر اور اونچے پہاڑوں کی بدولت یہ ریاست جنت ارضی کہلاتی ہے - یہ نبیوں کی سرزمین اور مقدّس وادی ہے - چنانچہ پنڈت ہرگوپال صاحب تاریخ گلدستہ کشمیر کے صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں -

"ہر ایک ملک میں یہ خطہ بے نظیر مشہور ہے - اور سب قومیں اس کو بہشت نظیر کہتی ہیں - ہنود اس کو زمین کا سر اور آنکھیں کہتے ہیں - اس کے برابر کسی ملک کو متبرک نہیں سمجھتے - ان کا قول ہے کہ ان کے تمام تیرتھ یہاں موجود ہیں - ایک شلوک کے معنی پاتال میں جو تیرتھ ہیں یا زمین پر جو ہیں' بہشت میں جو ہیں وہی سب کشمیر دیس میں ہیں ...."

کشمیر کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے - یہاں پھلوں اور پھولوں کی کثرت ہے - جگہ جگہ چشمے اور آبشار ہیں - وادی کے ارد گرد چاروں طرف سربفلک پہاڑ ہیں - عہد شاہجہان کے مشہور شاعر حاجی محمد خان شہاری نے ۱۰۲۰ ہجری میں کشمیر کی تعریف کی ہے

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر | کہ سر بر زد بہشت از خاک کشمیر
چہ کشمیر آبروئے ہفت کشور | نگاہ از دیدن او تازہ و تر
چہ کشمیر آب و رنگ باغ و بستان | اسیر بہ نہالش صد گلستان
سوادش سرمۂ چشم بہار است | بہشت دعوی شیریں آب لا راست

نباشد شرم بلطافت گر عشان گیر | عجاز آید بطوف کوہ کشمیر
نسیم فیض این روح الدر آباد
ز اعجاز از مسیحا میدہد یاد

(مثنوی اقدس کا شہدی صفحہ ۲۷ مطبوعہ ۱۳۲۳ ہجری)

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے کشمیر کے متعلق کہا ہے ؎

ذوق فنا نیافتی ورنہ در نظر | رنگیں تر از بہار بود جلوہ خزاں

اسی طرح ؎

از شاہ جہانگیر دم نزع چوں پرسند
با حسرت دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

شہزادی زیب النساء دختر عالمگیر اورنگ زیب کا شعر ہے ؎

در مذہب عشاق دم از عشق روا نیست | مرغے کہ ہوائے خوشش کشمیر ندارد

حضرت مولانا جامیؒ نے فرمایا ہے ؎

یکے گفتا کہ در اقصائے کشمیر | ز شیریں نباشد ہیچ تقصیر
مقام خوب رویاں آں زمین است | بخوبی رشک فردوس زمین است

ایک اور شاعر نے کہا ہے کہ ؎

کشمیر مگو رشک پری خانہ چین است | فی الجملہ بہشتیست کہ بر روئے زمین است

شاعر مشرق علامہ اقبال خود کشمیری تھے - فرماتے ہیں ؎

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر | دلم ز خاک حجاز و نوا ز شیراز است

کشمیر کی رنگینی اور دلاویزی کے متعلق آپ نے کہا ہے -

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر | سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج | صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز | بستہ بچہرۂ زمین برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بآب جو تپید | خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بتار ساز زن بادہ بساتگیں بریز | قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

ڈال ڈال کے پات

چراغ حسن حسرت —————— کرشن چندر

نام ہے چراغ حسن حسرت، دوست احباب پیار سے لپ حسن حسرت کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ محفل چاہے کتنی سونی اور ویران کیوں نہ ہو۔ یہ اپنی شگفتہ مزاجی، خوش کلامی اور بذلہ سنجی سے اس میں اُجالا کر دیتے ہیں۔ اصلی وطن کشمیر ہے۔ لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے ہندوستان کے اصلی باشندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا پورا نام مولانا چراغ حسن حسرت المعروف سندباد جہازی ہے۔ لیکن اپنے مضامین کے ساتھ صرف "سندباد جہازی" لکھتے ہیں۔ اور اسی نام سے اردو دُنیا میں مشہور ہیں۔ ویسے بھی تو مضامین کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ قد و قامت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے اچھے خاصے "جہازی" ہیں۔ اس تن و توش کو دیکھ کر اکثر شاعر لوگ انہیں پہلوان سمجھ لیتے ہیں اور پہلوان لوگ شاعر۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔

حسرت ہندوستان بھر میں گھومے ہیں۔ اور اگر سندباد جہازی کے سات سفروں کے تذکرے کی طرح حسرت بھی اپنا سفرنامہ مرتب کریں۔ تو ایک الف لیلہ سی دلچسپ کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن حسرت صاحب کو سیگریٹ پینے سے کبھی اتنی فرصت نہیں ملتی۔ کہ وہ اس امر کے حسن و قبح پر کبھی غور کر سکیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ انہیں پبلشروں، کانگرسیوں اور مسلم لیگیوں سے سخت نفرت ہے۔ ان کے خیال میں یہ لوگ سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ اور سوائے اس کے کہ یہ لوگ ایک غریب ادیب کے سگریٹ ہتھیا لیں اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔

حسرت صاحب کے مراسم گو بڑے بڑے آدمیوں سے ہیں لیکن ان کی آزادی کا یہ عالم ہے کہ ان بڑے بڑے آدمیوں پر بھی طنز کرنے سے نہیں چوکتے اور اپنے ذاتی مراسم کو صحافی ذمہ داریوں کے درمیان حائل نہیں ہونے دیتے۔ اسی جرأت رندانہ نے انہیں دنیا کی ابلہ فریبیوں سے بچا رکھا ہے۔ وہ خود نہایت صاف گو ہیں اس لئے دوسروں کی چالاکیوں پر طنز کرنے میں انہیں خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

حسرت کے مزاج میں تلوّن بہت ہے وہ ہمیشہ ایک اخبار میں کام نہیں کر سکتے۔ ایک مکان میں نہیں رہ سکتے۔ ایک شہر میں ایک صوبے میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لیکن ۴۵ سال کی عمر تک وہ ایک ارادے پر مستقل مزاجی سے کاربند رہے۔ وہ ارادہ یہ تھا کہ شادی نہیں کریں گے ان کی والدہ ان کے دوست احباب مجبور کرتے رہے۔ لیکن اُنھوں نے شادی نہ کی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے جو خیال آیا۔ تو شادی کے لئے ہاں کر دی۔ شادی اس لئے کہ سگریٹ چھوٹ جائیں گے۔ لیکن شادی کے بعد نہ سگریٹ چھوٹے .... اور نہ .... شادی۔ اور اب تو انہیں اپنا ننھا لڑکا سگریٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

لاہور میں انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ عرب ہوٹل کے قہوہ خانے میں بسر کیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ عرب ہوٹل لاہور کی بین الاقوامی شہرت محض حسرت کے طفیل تھی۔ تو بے جا نہ ہو۔ لاہور کا یہ چھوٹا سا ہوٹل سندباد جہازی کی کرمفرمائی سے آج اچھا خاصا دارالادب بنا ہوا ہے اور لاہور آکر تو ہندوستان کا ہر ایک ادیب جہانگیر کا مقبرہ دیکھ چکنے کے بعد سیدھا عرب ہوٹل کا رُخ کرتا ہے۔ اسی ہوٹل کے مرمریں میز پر قہوے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور تلخ قہوہ پر ہندوستان کے اردو اخباروں پر بہترین کلاسی مضامین لکھے گئے ہیں۔ اور میں نے تو یہ سنا ہے کہ مالک عرب ہوٹل نے حسرت صاحب سے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ جہاں جائیں گے عرب ہوٹل کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

حسرت کی زندگی کا روشن ترین پہلو اس کی آزادی ہے جس بات

وہ صحیح سمجھتا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اپنی صحافتی زندگی میں میرا خیال ہے کہ اس نے ایک بار بھی اپنے ضمیر کو دبانے کی کوشش نہیں کی۔ اور ہمیشہ اپنی رائے کا کھلے اور بے باکانہ لہجے میں اظہار کر دیا ہے اس لئے اس کی صحافتی زندگی میں مد و جزر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ وہ انفرادیت کا پجاری ہے۔ اور جو اس انفرادیت کے راستے میں حائل ہو وہ اسے قطعاً اچھا نہیں سمجھتا چاہے وہ اس کا کتنا ہی عزیز ترین دوست کیوں نہ ہو۔

(منقول از ہمنس) ۱۹۳۹ء

چراغ حسن حسرت —————— ظہیر بابر

۔۔۔ تاثیر مرحوم حسرت صاحب کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مگر بعض امور پر اختلاف ہو گیا اور روزنامہ "مغربی پاکستان" اور "امروز" کے صفحات پر شعروں کی جنگ چھڑ گئی۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی ہونے لگی۔ ایک دوسرے کے نظریات پر چوٹیں ہوئیں۔ اب دوست حلقے اس "جنگ" سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ اسی زمانے میں یہ احساس ہوا کہ شعر کے معاملے میں بھی حسرت صاحب کی طبیعت میں کتنی روانی ہے۔ اور وہ کس سلیقے سے اپنی بات کہنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے دوسری اخباری ذمہ داریوں کے باوجود دن میں دو دو نظمیں کہیں۔ اس "جنگ" میں حسرت صاحب کا پلہ بھاری رہا مگر کچھ عرصہ بعد تاثیر صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اور یہ تفریحی "لڑائی" بھی حسرت صاحب کے لئے رنج کا باعث بن گئی۔ دوست کی دائمی جدائی کے علاوہ انہیں یہ دکھ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز دوست سے یہ لڑائی کیوں مول لی۔ اور اگر یہ گلے پڑ بھی گئی تھی تو اس کے بعد وہ تاثیر مرحوم سے ملے کیوں نہیں۔ تاثیر کے جنازے پر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ "امروز" میں تاثیر مرحوم کے انتقال پر سب سے زیادہ سوگ منایا گیا۔ حسرت صاحب نے جی کھول کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے حسرت صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اس سے پہلے مجھے ان کی نرم دلی کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب ان کے بڑے صاحبزادے کی گمشدگی کی اطلاع ملی تھی۔ ان دنوں کراچی سے "امروز" جاری ہوا تھا۔ حسرت صاحب بھی کراچی میں مقیم تھے۔ لاہور سے یہ اطلاع ملی کہ دو تین دن سے ان کا صاحبزادہ گم ہے اور اب تک تلاش کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ حسرت صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ لکھنا پڑھنا سب بھول گئے ہم میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ حسرت صاحب اپنے بچوں سے اتنا پیار کرتے ہیں یا وہ اس حد تک نرم دل ہیں۔ ان کی پریشانی دیکھ کر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ "حرف و حکایات" کے کالم کے بارے میں پوچھے مگر وہ خود کہنے لگے کہ اب تو شاید حرف و حکایات کا کالم کبھی نہ لکھا جا سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ چند روز بعد ان کا صاحبزادہ مل گیا اور اخبار نویس طبقے کو "حرف و حکایات" کے کالم کا زیادہ دنوں انتظار نہ کرنا پڑا۔

حسرت صاحب کی بعض کمزوریاں بڑی دلچسپ ہیں۔ جس روز حسرت صاحب کا موڈ خراب ہوتا۔ یا وہ کسی بات پر برہم ہوتے تو ادارتی عملے کی میٹنگ میں انہیں بطور حربہ استعمال کرتے۔ مثلاً میٹنگ کے باقاعدہ آغاز سے قبل کوئی ملایا کا ذکر لے بیٹھا کیونکہ حسرت صاحب ملایا کے بہت بڑے مداح ہیں۔ بات نہ چلی تو دوسرے نے کشمیر کی گل پوش وادیوں کی بات چھیڑ دی۔ اگر ناکامی ہوئی تو کسی نے کلکتہ یا مولانا آزاد کا نام لے دیا حسرت صاحب نے توجہ نہ کی تو اس روز سے حرف و حکایات کے کسی دلچسپ حصے کے متعلق کسی محفل کی رائے پیش کر دی۔ اگر یہ تمام حربے بے سود ثابت ہوئے تو ہر ایک ہوشیار ہو گیا کہ آج کچھ سننا ہی پڑے گا۔ بعض اوقات کوئی خاص بات ہی نہ ہوتی لیکن عموماً حسرت صاحب کسی بہت بڑی کوتاہی پر ہی ٹوکتے۔ بات ہو یا نہ ہو ہر فرد اسے سننے پر مجبور تھا محض اس لئے نہیں کہ حسرت صاحب ایڈیٹر تھے بلکہ اس لئے کہ وہ بزرگ مددگار اور صحیح معنوں میں انسان تھے۔ ان کی برہمی ہمیشہ عارضی ہوتی تھوڑی دیر بعد محفل اپنے رنگ پر آ جاتی۔

پچھلے دنوں حسرت صاحب اچانک بیمار پڑ گئے۔ ان کے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کی پریشانی کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی۔ مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان کے نکتہ چیں بھی اداس تھے۔ صحافتی اور ادبی حلقوں میں ان کی علالت پر تشویش ظاہر کی جا رہی تھی اس کی وجہ محض ان کی بذلہ سنجی اور علمیت نہیں بلکہ اس میں خود ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے ان کے نظریات سے بہتوں کو اختلاف ہوگا۔ مگر ان کی ذات سے وہی نفرت کر سکتا ہے جو انہیں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو یا جس کے دل میں کسی کے لئے بھی جگہ موجود نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی صحت بحال ہو گئی۔ بہر حال مجھے نہ جانے کیوں اس وقت بھی جب ڈاکٹر بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے یہ یقین تھا کہ زندگی اتنی بڑی دولت سے آسانی کے ساتھ دست بردار نہیں ہو سکتی۔ (قومی آواز)

کلامِ حسرت مرحوم

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں — زلف کی رخسار کی باتیں کریں
ان کے کوچے میں جو گزرے ہیں کبھی — سایۂ دیوار کی باتیں کریں
پھول برسائیں بساطِ عیش پر — روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں
نقدِ جاں لے کر چلیں اس بزم میں — مصر کے بازار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست — اے غمِ یار تیری عمر دراز
زلف برہم جھکی ہوئی نظریں — گردنِ ناز میں کمندِ نیاز

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

ان سے پہلی سی ملاقات گئی — وہ جو اک بات تھی وہ بات گئی
رات کی بات کا مذکور ہی کیا — چھوڑیئے رات گئی، بات گئی
اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے
ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

خواب

ساقی جاوید

یہ تصور کے دیئے بجھتے ہوئے جلتے ہوئے — ایک افسانے میں لاکھوں حادثے ڈھلتے ہوئے
یہ کسی آذر کی صنعت یہ کسی مانی کا فن — آتشیں سا میکدہ شعلہ فشاں سی انجمن
دامنِ تخئیل سے اٹھتا ہوا سا اک دھواں — ایک گلستاں میں ٹھہرا ہوا سا کارواں
عکس ہائے روز و شب اک آئینہ خانے میں ہیں — جانے کتنی محفلیں اس ایک ویرانے میں ہیں
نقش ہائے زیر و زبر بنتے بھی ہیں مٹتے بھی ہیں — زینے کے ہر پیچ ہاں بڑھتے بھی ہیں گھٹتے بھی ہیں
بام و در بھی چلمنیں بھی، سرمئی آنچل بھی ہیں — کھیت بھی پگھٹ بھی ہیں جھیلیں بھی ہیں بادل بھی ہیں
مشعلیں بجھتی بھی ہیں بھڑک کر دئے جلتے بھی ہیں — قافلے رکتے بھی ہیں اہلِ سفر چلتے بھی ہیں
ہمتیں جلوے دھندلکے آگ، سناٹے شباب — جانے کتنی داستانوں پر ہے اک بنیادِ خواب
لو وہ دیکھو خواب کی سرحد نظر آنے لگی — تیرہ رو مہتاب کی سرحد نظر آنے لگی
لو حدودِ نغمہ و مستی میں داخل ہو گئے — ہم کسی محبوب کی بستی میں داخل ہو گئے
ہم کسی شبنم ادا کے مہماں بن جانے کو تھے — کتنے افسانوں کے ہم عنوان بن جانے کو تھے
ہم کسی کے دیس کا سنگیت سننے آئے تھے — ہم کسی لالہ کدے میں پھول چننے آئے تھے
ہم کسی کے آتشیں رخسار چھونے ہی کو تھے — عنبریں انفاس کی رفتار چھونے ہی کو تھے
آندھیاں چلنے لگیں طوفان سے اٹھنے لگے — سینکڑوں شعلے ہر اک ایوان سے اٹھنے لگے
جل اٹھے دار و رسن بھی گنبد و مینار بھی — معرکے شاہی محل بھی، رزم کے بازار بھی
لے خوشا گیتی کہ خونیں انقلاب آنے لگا — اک پیامِ تازہ لے کر آفتاب آنے لگا
صبح کے منبر سے وہ دینے لگا کوئی اذاں — "وقت لینا چاہتا ہے ایک خونی امتحاں"

ایک سیلِ عشق، اک جوشِ جنوں درکار ہے
اس فسانے کے لئے تھوڑا سا خوں درکار ہے

(نگار)

پھول کا تحفہ

نوشتہ:- قاضی جسیم الدّین   ترجمہ:- امجد سعدی

رابندر ناتھ ٹیگور، اور قاضی نذرالاسلام کی طرح قاضی جسیم الدّین بھی اردو داں حلقہ کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ قاضی جسیم الدّین بنگالی زبان کے منفرد شاعر ہیں جنھوں نے بنگال کے گاؤں کی زندگی کو بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ منظوم کیا ہے۔ اور ان کی اسی انفرادیت نے انھیں شہرت کی اس بلندی پر پہنچا دیا ہے جس کے وہ مستحق تھے اور ان کی یہی خصوصیت انھیں دوسرے تمام بنگالی شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔

قاضی جسیم الدّین کی اب تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں "ناکشی کا نتھارا ماٹھ" اور "سوجن بادیار گھاٹ" قابلِ ذکر ہیں —— "ناکشی کا نتھارا ماٹھ" کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے جسے مسز ملفورڈ نے "دی فیلڈ آف دی ایمبرائڈرڈ کوئلٹ" کے نام سے کیا ہے۔ "ناکشی کا نتھارا ماٹھ" پڑھنے کے بعد جسیم الدّین کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور جیسے عظیم شاعر نے کہا ہے ——

—— "جسیم الدّین کے خیالات، ان کے الفاظ، اور الفاظ کی شیرینیت سب کچھ نئے ہوتے ہیں۔"

اے حسیں، نازک و گُل رنگ بدن، دوشیزہ
پھول کا تحفہ بھی گر کوئی تمھیں دے تو نہ لو
پھول سے کر تمھیں پھر پھول ہی دینا ہوگا
پھول تم دے نہ سکیں پھول کے بدلے ہیں اگر
پھول سی جاں تمھیں اک روز گنوانی ہوگی

پھول کا تحفہ بڑے پیار سے دینے والے
تمھیں گمراہ بھی، ملعون بھی کر جاتے ہیں
اپنی بیمار محبت کا تمھیں کر کے شکار
تحفۂ تلخی و بدنامی بھی دے جاتے ہیں
اس لئے نازک و گُل رنگ بدن دوشیزہ
پھول کا تحفہ بھی گر کوئی تمھیں دے تو نہ لو

اے حسیں، نازک و گُل رنگ بدن دوشیزہ
تم وہ خوشبو ہو فضا جس سے معطّر ہو جائے

پھول سے تم کسی حالت میں نہیں ہو کمتر

کیسے ممکن ہے کہ بس ایک ہوا کا جھونکا
پھول کی ڈالی کو اس طرح سے لرزا جائے
پھول سب ٹوٹ کے ڈالی سے زمیں پر آجائیں

پھول کا بوجھ اُٹھائے تو جبیں بھی لرزے
کانپ اُٹھے یہ زمیں اور ہوائیں تھم جائیں
پھول کی خوشبو کا بس ایک معطّر جھونکا
سونگھ کے بھونرا بھی دیوانہ و بیخود ہو جائے

تم بھی اک پھول ہو، گُل رنگ بدن دوشیزہ
اور یہ ٹھیک نہیں پھول کا تحفہ لے کر
اُن کے بہلاوے کے پھندے میں پھنسو۔ کھاؤ فریب
پھول سے پھول بہل جائے یہ کب ممکن ہے

ڈاکٹر سری کمار

بنگالی ادب

دَورِ قدیم

اگرچہ بنگالی زبان نے طویل اور مختلف تبدیلیوں اور مرحلوں سے گزر کر ہی موجودہ شکل اختیار کی ہے لیکن بنگالی ادب ایک ہی زقند میں بلوغ کو پہنچ گیا تھا۔ "چریا پد" غالباً دسویں صدی میں لکھا گیا اور اگرچہ وہ ہندو اور بدھ تخیلات کا مرکب تھا لیکن خیالات اور صحیح طرزِ تحریر کے لحاظ سے وہ حیرت انگیز طور پر پختہ اور جامع تھا۔ اس میں روحانیت کو ایک بلند مقام دیا گیا ہے اور اس جہانِ فانی کی ناپائیداری کو دردمندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نجات کے لئے عبادت کے متعلق رسوم اور مقدس کتابوں کو عبث و بے سود قرار دیا گیا ہے۔ طرزِ تحریر، تشبیہہ اور پروازِ تخیل کے اعتبار سے یہ نظمیں مکمل اور بہت بلند پایہ ہیں۔ ان میں عمیق مذہبی محسوسات پیش کئے گئے ہیں۔

وشنو ادب

اگرچہ بنگالی ادب کی ابتدا شاندار طریقے سے ہوئی لیکن اس کے بعد تقریباً تین صدیوں تک وہ کلی طور پر ایک ویران صحرا کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم فتوحات کے بعد بنگال میں عوام کی تخلیقی قوت ماند پڑ گئی اور خیالات کے اظہار کے لئے انھیں کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔ ادب کے لحاظ سے یہ زمانہ بنجر تھا۔ البتہ بارھویں صدی کی جے دیو کی تصنیف "گیتا گووند" رسیلے گیتوں سے بھرپور ہے جس کا کوئی دوسری کتاب مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس سے ایک بات صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عوام کے مذہبی جذبات میں تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ اور وہ کرشن اور رادھا کی پرستش میں مگن تھے۔

تین صدیوں کی خاموشی کے بعد جب بنگالی ادب پھر سے منظرِ عام پر آنے لگا تو وہ نئی صورتوں میں ظہور میں آیا۔ اولاً سری چے تنیہ کے جذبات کی موجوں سے وشنو روایت کو تقویت حاصل ہوئی اور دوسرے رامائن اور مہابھارت کی عظیم رزمیہ نظموں کا ترجمہ کیا گیا۔ تیسرے منگل کاویہ جس میں نئے دیوتاؤں کا پرجوش سواگت کیا گیا۔ اس کے بعد ودیاپتی شاعر ودیاپتی نے نقد و نظر اور روحانیت سے ملے جلے جذبات کو ایک نئے روپ میں پیش کیا اور نامکمل نظم سری کرشن کیرتن کا مصنف بارو چانڈی داس سوز و گداز اور شعریت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ شاعر تصور کیا جاتا تھا البتہ اس کے مذاق میں اوچھاپن ضرور تھا۔

سری چے تنیہ

قرونِ وسطیٰ کے ادب اور زندگی کے لحاظ سے ۱۴۸۶ء میں سری چے تنیہ کا ظہور ایک اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بنگال میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں ملتا جو عوام کی زندگی اور جذبات پر سری چے تنیہ کے برابر اثر انداز ہوا ہو۔ انھوں نے بنگالیوں کے دلوں میں جذبات کے تار کو چھیڑا اور انھیں آسمان کی بلندیوں پر لے گئے۔ اس کے بعد بنگالی ادب کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس میں متواتر جذبات کا رنگ بھرا جاتا رہا جو "پداولی" سے صاف ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ چے تنیہ اور ان کے ساتھیوں کی سوانح عمریاں بھی کوئی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ ان تاریخی رجحانات سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوا اور وہ ذہنی توسیع میں مدد و معاون ثابت ہوئے۔ کرشن داس کویراج کی تصنیف "چے تنیہ چرت امرت" وشنو دھرم کے متعلق معلومات اور تصورات کے اعتبار سے "انسائیکلوپیڈیا" قرار دی جا سکتی ہے۔ فی الحقیقت یہ فلسفہ، عبادت اور نظم کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ اس میں وفا اور شعائر کی جھلک پائی جاتی ہے اور روحانی خیالات کو ایسے دلکش پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے جس

سے افسانہ وجد میں آجاتا ہے ۔ بہر حال اس سے چے تنیہ کی زندگی کے پیچھے حالات کا پتہ چلتا ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ چے تنیہ محبت کا سرچشمہ تھے اور انسانوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے ۔

اٹھارویں صدی تک مقدس کتابوں اور رزمیہ نظموں کے بے شمار ترجمے کئے گئے لیکن ان میں سے کرتی باس کی "رامائن" اور کاسی رام داس کی "مہابھارت" لاثانی شہرت رکھتی ہیں ان میں دھارمک کتابوں کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ ان میں عوام کی طرز زندگی اور شعار کی ترجمانی کی گئی ہے اور خیالات کو ایسے درد مندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ بدترین مجرم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ ان میں سری چے تنیہ کی محبت اور خلوص کی جھلک عیاں ہے ۔

منگل کاویہ

منگل کاویہ میں بنگال کی مذہبی زندگی کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بنگالی قوم مختلف فرقوں اور عناصر کا مجموعہ ہے ۔ ان میں بعض تو آرین زمانہ سے بھی پہلے کے قبائل شامل ہیں ۔ جنھوں نے اپنی رسوم کو برابر قائم و برقرار رکھا اگرچہ بعد میں ان میں آرین رنگ بھر گیا ۔ "منگل کاویہ" "دھرم منگل" "منسا منگل" اور "چاندی منگل" کے تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ جن میں علی الترتیب ہندو اور بدھ مذہبوں کا ملاپ ۔ ناگ دیوتا کی پرستش اور قدیم قبائل کی طرف سے چاندی کی پرستش کا اظہار کیا گیا ہے ۔ ان میں سے ایک بات مشترک ہے یعنی ان سب میں قدیم زمانے کی گھریلو زندگی کی جھلک پائی جاتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ غلیظ اور گندے رہتے تھے ایک مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں اور خانگی جھگڑے زندگی کا معمول تھے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت کی غیر متزلزل وفاداری ۔ شجاعت وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے

قرونِ وسطیٰ کے عظیم ترین شاعر مکند رام کا طنز ۔ حقیقت پسندی اور ظرافت کے اعتبار سے چوسر کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔ ان صاف اور واضح رجحانات کے علاوہ دیگر مذہبی اور روائتی نظموں میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ۔ ان میں سے "گوپی چند" اور "پنا دتی" کے گیت قابل ذکر ہیں ۔ جن میں یوگ اور نجات کے طریقوں کی وضاحت کی گئی ہے ۔ ان میں بعض جگہوں پر مافوق الفطرت کارناموں ۔ دنیا سے تیاگ اور دنیا کی ناپائداری کو بے ڈھنگے انداز میں بیان کیا گیا ہے مثلاً "سونا" میں شوجی کو ایک مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا گیا ہے اور انھیں ازدواجی جھگڑوں کا دائمی شکار بتایا گیا ہے ۔ "میمن سنگھ" میں بھی گیت شامل ہیں جن میں عشق کی داستانیں اور فرقوں کے سماجی رسم و رواج درج ہیں ۔ ان میں تشبیہ اور تصورات کا یہ عالم ہے کہ جذبات کی رو دل سے بہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں دھارمک اور غیر دھارمک دونوں قسم کے گیتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ان میں زیادہ تر دیہاتی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے ۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان میں خشک مزاجی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے ۔ "باؤل" گیت ہندوؤں اور مسلموں کی مشترکہ پیداوار ہیں جن میں مذہبی کتابوں کی رسمی پابندیوں سے ہٹ کر دلی جذبات کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ "سکتا پد دلی" سے تغزل کا رنگ ظاہر ہوتا ہے جس میں ماتا کی پرستش کو مقدس درجہ دیا گیا ہے اور اس کے برعکس اگرچہ دوسری جگہ کالی ماتا کو ایک خوفناک صورت میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس سختی کے پیچھے محبت اور نرمی کارفرما ہے ۔

بھارت چندر

قرونِ وسطیٰ کے بنگالی ادب کا سلسلہ بھرت چندر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے جو چنڈی منگل کا پرستار تھا بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ موجودہ زمانے کا پیشرو تھا ۔ اس کی تصنیف "آنند منگل" میں دلی پرستش کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے اور شاعر طنز پر آتر آتا ہے اور سماج پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہے شاعر موصوف کی طرز تحریر ڈرائیڈن اور پوپ سے ملتی ہے ۔ اس کے الفاظ چیدہ اور مہذب ہیں ۔ وہ فی الحقیقت دانش مندی کا مرقع ہے ۔ اس میں کالی ماتا سے اخلاقی اور سماجی قوانین کی خلاف ورزی کے سلسلے میں پناہ کی درخواست کی گئی ہے ۔ علاوہ ازیں اس میں زندگی کے مناظر پیش کئے گئے ہیں ۔ فی الحقیقت اس کی تصنیف قدیم اور جدید زبانوں کے سنگم کی مظہر ہے جس میں مستقبل کی پیشین گوئی پائی جاتی ہے ۔

مالک رام
ع-م

نئے مطبوعات

مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو

از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۹۰ مجلّد۔ کتابت، طباعت، کاغذ اعلیٰ۔ قیمت چار روپے۔ آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی۔

اُردو زبان کے آغاز پر بہت کم کام ہوا ہے۔ سب سے پہلے گریرسن نے اپنے شہرۂ آفاق "ہندوستان کا لسانی جائزہ" میں جہاں ہندوستان کی دوسری زبانوں سے متعلق تحقیق کی، وہیں اُردو، اس کی مختلف شکلوں اور دوسری بولیوں سے اس کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی۔ لیکن اس کتاب کو چھپے ہوئے بھی نصف صدی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اس کے بعد مدتوں اس موضوع پر کسی نے مزید تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اُردو" اور اس کے تھوڑے دن بعد حافظ محمود شیرانی مرحوم نے "پنجاب میں اُردو" لکھی۔ خود اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی دو کتابیں تھیں۔ دونوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُردو کے آغاز کا شرف ان صوبوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ اُردو، ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی، تو ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا، کہ یہ دونوں قومیں پہلے کہاں یکجا ہوئیں، اور جب اس مسئلے کو ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ہر خطے میں اختلاط بیک وقت یا کم و بیش وقفے سے مسلسل جاری رہا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں عرب تاجر ہندوستانی بندرگاہوں میں آ جا رہے تھے۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں مسلمان فاتح سندھ میں پہنچ چکے تھے۔ دسویں صدی کے اواخر میں افغانستان سے محمود غزنوی کی افواج پنجاب اور دہلی تک پہنچیں۔ یہ ماننے کی بات نہیں، کہ ان سب واقعات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ دراصل یہیں سے اس زبان کی داغ بیل پڑی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کا خمیر بیک وقت دکن، گجرات، مدراس، سندھ اور پنجاب میں اٹھایا گیا، اور کوئی ایک خطہ نہیں بلکہ سارے کا سارا ملک اس زبان کا جنم بھوم ہے۔

یہ تو ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو لسانیاتی ہے۔ اس پر اور بھی کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ پروفیسر ژول بلاک کے دو ایک مضمون اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا مقالہ "ہندوستانی لسانیات" اور بس۔ پس ضرورت تھی کہ ایک تفصیلی کتاب ایسی لکھی جائے جس میں ان دونوں پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کی جائے۔ اوّل یہ کہ اردو کے ماخذ کیا ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے نشو و نما اور ارتقا میں کن زبانوں اور بولیوں نے حصہ لیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی زیرِ نظر کتاب اسی خلا کو پورا کرتی ہے۔ مصنف نے اس میں ہندوستان کی دوسری زبانوں خصوصاً راجستھانی، برج، پنجابی اور دکنی سے اُردو کے تعلقات دکھائے ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ جیسا کہ عام خیال ہے، اردو، برج سے نہیں نکلی، نہ یہ اس کی ارتقائی شکل ہے بلکہ یہ اس قدرتی اقتضا کا نتیجہ تھی جو دُنیا کی تمام زبانوں کی زندگی میں ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے، اردو پیدا ہوئی کیونکہ اس وقت تمام حالات اس کی پیدائش کے لئے جمع ہو گئے تھے۔

کسی تحقیقی کام میں بھی کوئی کتاب حرفِ آخر کا درجہ نہیں رکھتی۔ کیونکہ نئے مواد کے دریافت ہو جانے پر لازمی طور پر بعض مسلمہ نظریات کو بدلنا یا ان میں ترمیم کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے یہ تو عین ممکن ہے کہ زیرِ نظر کتاب اس موضوع پر آخری فیصلے کا درجہ نہ رکھتی ہو، لیکن جب تک نیا مواد منظرِ عام پر نہیں آتا، یہ کتاب اس مسئلے میں سند مانی جائے گی۔ کتاب کی قیمت چار روپے زیادہ ہے۔

(مالک رام)

رسالے:-

معارف (سلیمان نمبر)

صفحات ۴۰۰۔ قیمت چار روپے۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

سید سلیمان ندوی مرحوم، اُردو زبان کے محسنوں میں سے تھے۔ اگرچہ

ان کی تعلیم تمام تر دینی اور مذہبی تھی لیکن انھوں نے اپنی قلمی فتوحات کا دائرہ اپنی موضوعات تک محدود نہیں رکھا، جو صرف مذہبی حلقے کا شغل ہے۔ بلکہ انھوں نے دینی مسائل پر بھی جو کتابیں لکھیں، ان میں بھی ادبی پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ غیر مذہبی طبقہ بھی انھیں اسی ذوق و شوق سے پڑھتا ہے جیسے مذہبی طبقہ۔

سید سلیمان نومبر ۱۹۵۳ء میں کراچی میں فوت ہوئے۔ وہ دار المصنفین اور شبلی اکاڈمی کی روح رواں تھے۔ وہ اس کے بانیوں میں سے تھے، اور جب تک وہ اس جگہ رہے، اس کے صدر نشین رہے۔ معارف ان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ قدرتی طور پر معارف کا فرض تھا کہ اپنے بانی اور مرحوم ایڈیٹر کی خدمت میں اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرتا۔ چنانچہ زیر نظر خاص نمبر مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ۱۹ مضمونوں پر مشتمل ہے مضمون سب کے سب یا تو دار المصنفین کے حلقے کے اصحاب قلم حضرات نے لکھے ہیں یا مرحوم کے احباب نے۔ انھیں سیرت و سوانح، فضائل و کمالات، علمی و دینی کارنامے، سلوک و تصوّف اور متفرق مضامین کے پنجگانہ عنوانوں کے تحت تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آخر میں قطعات و تاریخی مادے ہیں یہ نظم کا پہلو کچھ کمزور رہا۔

جب تک سید سلیمان مرحوم کی مفصل سوانح عمری شائع نہیں ہوتی، یہ خاص نمبر اس موضوع پر ماخذ کا کام دے گا۔ (مالک رام)

نقوش (منٹو نمبر)

صفحات ۳۸۲۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

ادارہ فروغ اردو ۱۱ مال روڈ۔ لاہور

نقوش کو خاص نمبر نکالنے کا خاص سلیقہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس کا شخصیات نمبر نکل چکا ہے۔ اب یہ ضخیم نمبر سعادت حسن منٹو کی یاد میں نکالا گیا ہے۔ منٹو اردو کے صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ بعض ثقہ اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ حلقوں میں انھیں فحش گو اور عریاں نگار کہا جاتا تھا، اور ممکن ہے کہ جوانی کی ترنگ میں مرحوم کا قلم کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ پھسل بھی گیا ہو۔ لیکن مجموعی طور پر اس سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے اردو کے افسانوی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا، اور ہم ان کے احسان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

منشی پریم چند سے پہلے ہمارے ہاں مختصر افسانے کا عدم وجود برابر تھا۔ پریم چند نے نہ صرف افسانے لکھنا شروع کئے۔ بلکہ وہ اس میدان میں اتنے کامیاب ہوئے کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی اس سے بڑھ کے کیا لکھے گا۔ لیکن پائے گدا کی طرح قلم ادیب بھی لنگ نہیں، اور دنیائے ادب بھی ملک خدا سے کم وسیع نہیں۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں نے نئے نئے تجربے کئے، اور مزید مطالعہ اور غور و فکر سے اپنے لئے نئی راہیں نکال لیں۔ ان میں منٹو کا بہت بلند مقام ہے۔ انھوں نے نفسیات کا مطالعہ کیا، اور اپنے نتائج کو قلم بند کر دیا۔

زیر نظر نمبر میں مرحوم کے ۲۰ مختصر افسانچے ایسے ہیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے۔ پھر ان کی مطبوعہ چیزوں کے دس انتخاب ہیں۔ ان کے بعد تنقیدی مضامین کا حصہ ہے۔ جس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، وقار عظیم وغیرہ نے اس کے فن اور مقام پر بحث کی ہے سب سے آخر میں بعض دوستوں نے اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا ہے، جو انھیں مرحوم کی صحبت میں پیش آئے۔ اس میں عصمت چغتائی کا مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مجموعی طور پر یہ نہایت کامیاب اشاعت ہے، اور منٹو پر مستقل لکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (مالک رام)

ترانۂ دل

مجموعۂ کلام جناب دل شاہ جہاں پوری، ناشر شفیق حسن خاں محلہ ہاتھی تھان۔ شاہ جہاں پور۔

قیمت فی جلد غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب۔

اعتبار الملک جناب دل، امیر مینائی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں۔ ملک کے اکابر، ادبا اور شعرا سبھی نے آپ کی قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے۔ قریب قریب بیس برس پہلے آپ کا کلام اس سے قبل "نغمۂ دل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ زیر تبصرہ مجموعے میں وہ کلام بھی شامل ہے جو ۱۹۳۲ء سے اس وقت تک کا کلام افکار تازہ کے تحت شامل کتاب ہے۔ موصوف کا سن اس وقت اسّی سال کے قریب ہے۔ اس کے پیش نظر آپ کا یہ شعر آپ ہی کی زندگی کی عکاسی کر رہا ہے۔

کہاں وہ رنگینیٔ تبسم کہاں وہ رعنائیٔ تکلم
جو دن میں خوابِ خیال لے دل انھیں پہ آنسو بہا رہا ہوں

نغمۂ دل کا معرکتہ الآرا مقدمہ علامہ نیاز فتح پوری نے تحریر فرمایا تھا، اور دل صاحب کو دل کھول کر دادِ سخن دی تھی۔ آج سے ۴۰ سال پہلے انشا کی مشہور زمین "یار بیٹھے ہیں" میں دل صاحب نے کتنا اچھا شعر فرمایا تھا۔

نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ
اسی دھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

ہمیں اُمید ہے کہ یہ مجموعہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ ان اشعار کو پڑھئے اور اندازہ لگائیے کہ ایک اچھا غزل گو غزل کے پردے میں نکاتِ زندگی بیان کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔

جانبِ دیر و حرم کان لگے رہتے ہیں — کاش پردے ہی سے سنتے تری آواز کہیں
کیا جانے کس خیال سے چھوڑا یہ حالِ زار — مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا
ہر دم ہے اسی محوِ تغافل کا تصور — عشق اور کسی کام کے قابل نہیں رکھتا
جہاں دل غرق ہوتے ہیں جہاں لاشیں ابھرتی ہیں — انھیں موجوں کو بحرِ عشق کا ساحل سمجھتا ہوں
اسی سلسلے میں گزر گئے کئی دورِ منزلِ عشق کے — کبھی رہنما کی خبر نہیں کبھی رہنما کی تلاش ہے
اس امید پہ منتظر ہوں کسی کا — قیامت کی آمد بہت معتبر ہے

(ع۔م)

حرفِ تمنا

حضرتِ میکش اکبرآبادی کا مجموعۂ کلام بعنقت سے بیوہ کٹرہ۔ آگرہ کے پتے سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔ قیمت تین روپے۔ جلد پوش نہایت حسین و جمیل، کتابت و طباعت اعلیٰ۔ کتاب $\frac{17 \times 27}{8}$ کے ۲۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

میکش صاحب تخلص کے میکش اور فطرت کے تائب ہیں۔ لیکن طبیعت وہ تیغِ آب دار ہے جس میں شوخی، بذلہ سنجی اور خوش مذاقی کے جوہر ہیں۔ بزمِ تاج آپ ہی کے پری تمثال افکار سے نگار خانۂ چینی ہوئی ہے۔ فیضانِ سخن کا نور دوسروں کو کم پہنچاتے ہیں۔ اس لئے انھیں شمعِ بیرونِ خانہ بننا مقصود نہیں۔ شمعِ اندرونِ خانہ تو آپ ہیں ہی۔ آپ نے قریب قریب گوشہ گیری اختیار کر کے خود اپنے ہی آستانۂ پاک پر کافوری شمعیں جلائی ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ تنگ نائے فلسفہ سے ذرا باہر نکل کر آپ نے اشاعتِ کلام کی طرف توجہ تو کی اور مشیتِ ایزدی کے باوجود یہ دعویٰ تو کیا۔

میں شاہدِ حقیقت حُسنِ مجاز ہوں — چاہوں تو لاکھ حُسن بنا دوں نگاہ سے

بڑی رسیلی غزلیں اور لطیف نظمیں اس مجموعے کی زینت ہیں۔ رباعی، قطعہ، مسدس وغیرہ ہر صنفِ سخن میں میکش صاحب نے دادِ سخن دی ہے۔ صبح کے عنوان سے ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھئے آگرہ ہے کہ لکھنؤ۔

اُٹھا غبارِ اُفق سے وہ آیا سوارِ صبح
فوجِ شعاع لے کے بڑھا تاجدارِ صبح
ہنس کر طیورِ صبح سے بولی بہارِ صبح
نغموں کے ہار کیجئے نذرِ نگارِ صبح
کشتی گُل پہ لے کے کٹورا گلاب کا
شبنم چلی دُھلانے کو مُنہ آفتاب کا

میکش صاحب زہد و اتقا کے قائل ضرور ہیں لیکن اُن کا دل طرح دار وں پر مائل نظر آتا ہے۔ غزل ہو یا نظم یہ اپنے دل کے بھید کھول کر رکھ دیتے ہیں ؎

اور اک راگِ غم دل کا سناؤں تجھ کو — گونجتا ہے تری نظروں میں ابھی سازِ نوہ
وہ آئے وہ جھانکا وہ جھجکے وہ بھاگے — تصور تماشا بنا جا رہا ہے
میں جان لیتا مجھی میں نہیں ہی جرأت ہو — وہ ایک بار نظر ہی کو آشنا کرتے
تھی جنوں آمیز اپنی گفتگو — بات مطلب کی بھی لیکن کہہ گئے

(ع۔م)

نسیمِ عرفاں بھگوت گیتا منظوم

منور لکھنوی اُردو کے مستند شاعر اور ادیب ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمے کا میدان آپ کا ہی نہیں آپ کے خاندان کا خاص میدان ہے۔ آپ کے باکمال والد ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی نے رامائن، مہابھارت اور شاہد راجستھان ایسی ضخیم کتابوں کے ترجمے اردو نثر میں کئے۔ خود منور صاحب کالی داس کی مشہور نظم کمار سمبھو اور تعلیماتِ گوتم بدھ "دھمپد" کا ترجمہ اردو نظم میں کر چکے، اور ملک سے دادِ سخن پا چکے ہیں۔ نسیم عرفاں بھی گیتا کے منظوم ترجموں میں جن کی تعداد ایک درجن کے قریب ہوگی ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس ترجمے پر سر تیج بہادر سپرو، آصف علی، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر بھگوان داس، ڈاکٹر سید انصار، جسٹس سید سلیمان نے مہرِ قبولیت ثبت کی تھی۔ یہ دوسرا ایڈیشن امید ہے پہلے ایڈیشن کی طرح مقبول ہوگا۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ آدرش کتاب گھر،

علمی خانہ ۔ دہلی (ع ۔ م)

بنگال میں اُردو

مصنف: وفا راشدی ۔ یہ کتاب مشرقی و مغربی بنگال میں اُردو زبان و ادب کی ابتداء سے ۱۹۵۰ء تک کی مکمل تاریخ ہے ۔ ناشر: مکتبۂ اشاعتِ اُردو، حیدرآباد (پاکستان) قیمت فی جلد پانچ روپے ۔ کتاب میں چند ادیبوں اور شعراء کی تصویریں بھی شامل ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے ہی کتاب کو دلچسپ ہونا چاہئے ۔ یہ اُس خطے میں زبانِ اُردو کی مقبولیت کی داستان ہے، جہاں کی یہ زبان نہیں ۔ تاریخی اعتبار سے بھی کتاب کا مطالعہ مفید ہے ۔ وفا راشدی صاحب کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے ۔ (ع ۔ م)

ذوقِ ادب اور شعور

سید احتشام حسین صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ ادارۂ فروغِ اُردو ۳۷ ۔ امین آباد پارک لکھنؤ نے شائع کیا ہے ۔ قیمت تین روپے ۔

اس مجموعے میں ۱۶ تنقیدی مضامین شامل ہیں ۔ مصنف کے تنقیدی کمالات کا یہ پانچواں مجموعہ ہے ۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ یہ مضامین ذوقِ ادب اور شعور کی بیداری کا مظہر بھی ہیں، اور موجب بھی ۔ غالباً سب مضامین مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں ۔ اُردو تنقید کا ارتقاء آخری مضمون ہے اور حقیقت میں یہ مضامین اردو تنقید کی ارتقاء کا ایک بدیہی ثبوت ہیں ۔ (ع ۔ م)

ساقی جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء

شاہد احمد صاحب مدیر ساقی نے اپنے کمالِ جدت کی ایک اور یادگار مثال پیش کی ہے ۔ ساقی کا یہ ضخیم خاص نمبر، ۵۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ محمد حسن عسکری شاہد صاحب کے معاون اور خالد حسن قادری اس شمارے کے مرتب ہیں ۔ قیمت پانچ روپے ۔ ملنے کا پتہ ۔ منیجر رسالہ ساقی ۔ کراچی (پاکستان)

لکھنے والوں میں، سالک، وقار عظیم، ابو اللیث صدیقی، عبادت بریلوی، شوکت سبزواری، خواجہ احمد فاروقی، مدن گوپال، موہن سنگھ دیوانہ اور کتنے ہی نامور ادیب شامل ہیں ۔ جوبلی نمبر میں ادب اور اس کے مختلف اصناف کی پچیس سال کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اُردو زبان، صحافت، ناول، ڈرامے، افسانے، تنقید، شاعری، رسائل، خطوط نویسی، عورتوں کے ادب، بچوں کے ادب، کے پچیس سال کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو، گجراتی، بنگالی، ہندی، مراٹھی، عربی، فارسی، جاپانی، روسی، امریکی، مشرقِ وسطیٰ اور معاشیات کے پچیس سال پر سیر حاصل مضامین شاملِ اشاعت ہیں ۔ آخر میں پچیس منتخب افسانے درج ہیں ۔ نازک خیالوں کی اس انجمن میں شاہد بجائے خود ایک انجمن نظر آتے ہیں ۔ اور اسی عنوان سے "شاہد ایک انجمن ہے" ـــ صادق الخیری نے بہت کچھ حق باتیں بے کم و کاست کہہ ڈالی ہیں ۔ شاہد صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں ۔ یہ شمارہ خریدنے اور بڑی حفاظت سے رکھنے کا ہے ۔ (ع ۔ م)

موصولات

ناول ۔ کشمکش ۔ منظر سلیم کی تصنیف قیمت ڈھائی روپے ۔ کتابی دنیا ۔ لکھنؤ

" زینب ساحرہ ۔ وحشی محمود آبادی کی تصنیف، قیمت تین روپے ۔ ادارۂ فروغِ اُردو ۔ لکھنؤ

" معمار ۔ مائل ملیح آبادی ۔ قیمت چار روپے ۔ ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

بے نام گلیاں ۔ از کلام حیدری ۔ افسانوں کا مجموعہ ۔ قیمت دو روپے چار آنے
ملنے کا پتہ ۔ ملک کتاب گھر رانچی ۔ بہار

نئی غلامی ۔ ادجر دین بالڈون ۔ پبلشرز، سدھار رتھا پبلیکیشنز لمیٹڈ ۳۵ فیض بازار دہلی ۔ قیمت ایک روپیہ (اُردو ترجمہ)

سرود بقا ۔ مصنف ڈاکٹر عشرت انور ۔ ورڈز ورتھ کی مشہور انگریزی نظم Ode to Immortality کا اردو نظم میں ترجمہ ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ (۱/۸)
ملنے کا پتہ ۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور ۔ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

یادگارِ حسین ۔ اجمیر کے مشاعرہ "بزمِ سلام" کا انتخاب ۔
ملنے کا پتہ ۔ ایس سلام حبابی ۔ منیجر خواجہ پریس جھالرہ درگاہ معلّٰی اجمیر شریف

اچھی نظمیں ۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ از افسر مشتاق ۔ قیمت [illegible] ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ

راکھی ۔ ڈرامہ ۔ از شجاعت علی سندیلوی ۔ قیمت [illegible]

رُباعیات نوری ۔ (حصّہ اوّل) طلباء کے لئے ۔ از نور اللہ محمد نوری ۔ قیمت [illegible]
ملنے کا پتہ ۔ ۱۱۶ بیت الامان جام باغ دار الشفا حیدرآباد دکن

بچوں کا آج کل

اظہار ملیح آبادی

بھُوت

اسکول سے اکیلا اک دن میں آ رہا تھا
اک خوف میرے دل پر رہ رہ کے چھا رہا تھا

تھے جتنے میرے ساتھی آگے نکل چکے تھے
آکاش پر دیئے سے ہر سمت جل چکے تھے

رہ رہ کے اس طرح کچھ بڑھنے لگا اندھیرا
دل خوف سے تھا لرزاں ہر اک قدم پہ میرا

تالاب کے کنارے بیٹھی تھیں چند گائیں
پگڈنڈیاں تھیں جتنی کرتی تھیں سائیں سائیں

برگد کا راستے میں اک پیڑ تھا پرانا
جیسے ہی اُس کے نیچے میں خستہ حال پہنچا

شاخیں کسی نے اُس کی اس زور سے ہلائیں
میں نے تو مارے ڈر کے آنکھیں وہیں جھکائیں

آواز اک بھیانک کچھ اس طرح سے آئی
بستہ ٹپک کے میں نے اک جست سی لگائی

بن دیکھے دائیں بائیں میں بھاگتا تھا سرپٹ
محسوس ہو رہی تھی اک بھوت کی سی آہٹ

کچھ دُور جا کے میرے دل میں خیال آیا
اس طرح تو نہ ہوگا اپنا کبھی گزارا

اس راستے سے مجھ کو ہے روز آنا جانا
اس طرح بھاگنے سے ہو جاؤں گا دوانا

دل نے کہا کہ چل کر دیکھو کہ بھوت کیا ہے
آخر وہ میرے پیچھے کس واسطے پڑا ہے

یہ سوچتے ہی فوراً اُس جا پلٹ کے آیا
برگد کے پیڑ کو پھر میں نے بغور دیکھا

اور ہو گیا دوانا میں تو ہنسی کے مارے
شاخوں کی اوٹ میں کچھ بندر اُچھل رہے تھے

اُس دن سے میرے دل پہ یہ کھل گئی حقیقت
آئے نہ خوف دل میں باقی رہے جو ہمت

رتن سنگھ شاہی

عقل مند لڑکا

رام دین پردیس جاتے ہوئے تیل سے بھرا ہوا ایک کنستر اپنے پڑوسی کے پاس امانت رکھ گیا۔ اسے پردیس گئے ہوئے دو برس ہو گئے۔ اس کے پڑوسی نے ضرورت پڑنے پر کنستر میں سے کچھ تیل نکال کر استعمال کر لیا۔ اور یہ خیال کیا کہ اب رام دین کا کچھ پتہ نہیں وہ کہاں ہے۔ اب وہ اپنا کنستر بھی بھول گیا ہوگا۔ اس طرح جب بھی اسے ضرورت پڑتی کنستر میں سے تیل نکال بیٹھا۔ ایک روز تیل نکالتے وقت اس میں سے ایک اشرفی نکلی جسے دیکھ کر پڑوسی بہت حیران ہوا۔ جب اس نے کنستر کو اُلٹا کیا تو اشرفیوں کا ڈھیر برآمد ہوا۔ اب تو وہ بہت خوش ہوا۔ اشرفیوں کو اپنے قبضہ میں کیا اور بازار سے تیل لا کر کنستر میں بھر دیا اور اسی طرح بند کر کے رکھ دیا۔ چند ماہ بعد رام دین بھی آ گیا تو پڑوسی نے کنستر اس کے حوالے کیا۔ رام دین خوشی خوشی کنستر گھر لے آیا لیکن جب اُسے اُٹھایا تو اشرفیاں نہ پا کر بہت گھبرایا۔ دوڑا دوڑا پڑوسی کے پاس گیا اور بولا۔

رام دین ۔ میرے پڑوسی کنستر میں تیل کے علاوہ پانچ سو اشرفیاں تھیں جو تم نے نکال لی ہیں۔ خدا کا واسطہ ہے میری اشرفیاں دے دو۔

پڑوسی ۔ کنستر میں تیل ہی تھا۔ اشرفیوں کے متعلق میں بالکل نہیں جانتا

اب تو رام دین کے ہوش اُڑ گئے۔ سیدھا بادشاہ کے حضور میں گیا اور فریاد کی۔ بادشاہ یہ ماجرا سن کر بہت حیران ہوا۔ کیونکہ پڑوسی بادشاہ کے روبرو بھی اشرفیوں سے انکاری تھا۔ اور یہ مقدمہ کسی طرح نہ سلجھتا تھا۔ رام دین کے محلے میں عزیز نامی ایک لڑکا رہتا تھا۔ اگرچہ وہ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ مگر بڑا ہی ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ اس نے بھی جب یہ سُنا تو رام دین کی مدد کے لئے تیار ہو گیا اور بادشاہ کے پاس گیا۔ اور کہا کہ وہ اس مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ عزیز کے کہنے کے مطابق رام دین اور پڑوسی کو بلوایا گیا۔ پڑوسی نے اب بھی اشرفیوں کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا جس پر عزیز نے شہر سے چند تیل نکالنے والے تیلی بُلوائے اور اُن سے کہا کہ وہ کنستر والے تیل کو دیکھیں اور بتائیں کہ یہ کتنے عرصہ کا ہے۔ تیلیوں نے تیل کو دیکھا اور پھر چکھ کر کہا۔

تیلی ۔ (ایک زبان ہو کر) جناب یہ تیل بالکل تازہ ہے۔

عزیز ۔ مگر رام دین نے تو تیل دو برس کا بھرا ہوا ہے۔

تیلی ۔ جناب یہ تیل ہرگز دو برس کا نہیں ہے۔ اتنے عرصے کے تیل کا تو ذائقہ بگڑ جاتا ہے اور وہ کڑوا ہو جاتا ہے لیکن اس تیل کا ذائقہ نہیں بگڑا۔ اس لئے یہ تیل تازہ ہی ہے۔

چنانچہ عزیز نے تیلیوں کو رخصت کیا اور پڑوسی سے کہا کہ تو واقعی چور ہے۔ سچ سچ بتا دے۔ تونے کنستر یں سے نہ صرف تیل ہی نکال لیا بلکہ اشرفیاں بھی نکال لیں اور پھر تازہ تیل لا کر بھر دیا۔ اب تو پڑوسی کی چوری سب پر ظاہر ہو گئی۔ اور اس نے اس کا اقرار بھی کر لیا اور پھر رام دین سے معافی بھی مانگ لی۔ بادشاہ سے بھی اپنی

غلطی کی معافی چاہی اور رام دین کی اشرفیاں بھی اسے واپس لوٹا دیں۔ بادشاہ عزیز کی ذہانت پر بہت خوش ہوا۔ اور اپنے خزانہ سے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ عزیز جلد ہی پڑھ لکھ کر عالم فاضل ہو گیا اور بادشاہ نے اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔

پیارے بچو! اس کہانی میں تم نے یہ پڑھا کہ کس طرح ایک غریب والدین کا عقلمند لڑکا اپنی لیاقت سے ترقی کر گیا اور وزیر بن گیا۔ اس لئے تم سب کو بھی کوشش اور محنت سے تعلیم حاصل کرنی چاہئے اور عزیز کی طرح ترقی کرنی چاہیئے۔

حسن الدین عثمانی

پہیلیاں

۱۔ کالی اس کی وردی دیکھی اس کی چال۔ ہر گھر میں ایسا پھرے جیسے کوتوال

۲۔ چار کھڑے چار پڑے ایک ایک کے منہ میں دو دو بھرے

۳۔ چار کھڑے بہشت بھرے چور تکیں لے نہ سکیں

۴۔ شیخ تھا شہزادہ تھا اچھلتا ہوا جاتا تھا
جو نہ بوجھے اس کا دادا تھا

۵۔ بازار جانا تو چار چیزیں لانا۔ کھانے کو حلوا پینے کو شربت
لونگوں کا گچھا۔ بکری کا چارہ

۶۔ ہری تھی من بھری تھی نو لاکھ موتیوں سے جڑی تھی
راجہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی

۷۔ اگل کھوٹا بگل کھوٹا کاٹے دکھی دودھ میٹھا

۸۔ بڑے جتن سے ہم نے بنائی تاگا اس میں گرہ لگائی
ہاتھ صنم کے بھیجی تم کو گر پہنچی ہو تو لکھو ہم کو

۹۔ رنگ بادامی شکل میں ونڈے
اُبال کر ان کو کرتے ہیں ٹھنڈے
چھلکے ان کے اتارے جاتے
دال مسالہ خوب بناتے

جوابات:۔

۱۔ کوا۔ ۲۔ چارپائی۔ ۳۔ گنے کا تھن۔
۴۔ مینڈک۔ ۵۔ تربوز۔ ۶۔ بھٹا۔
۷۔ سنگھاڑہ ۸۔ پہنچی۔ ۹۔ آلو۔

محمد اسلم خواجہ

بلّی کی میاؤں کو کون پکڑے گا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں۔ جہاں بعض لوگ بیٹھے ہوئے شیخی مار رہے ہوں مثلاً اس طرح "ہم اپنے دشمن اور مخالف کی اصل ہی کیا سمجھتے ہیں، وہ ہے کیا چیز۔ اس کی حقیقت ہی کیا ہے، ہمارے سامنے آئے تو ہم اُسے نیچا کر دیں گے۔ یوں ذلیل کریں گے۔ شکست دیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اور عین اُس وقت اگر کوئی شخص پاس سے بول اُٹھے کہ یہ تو سب کچھ آپ کر لوگے۔ مگر یہ بتاؤ کہ "بلّی کی میاؤں کو کون پکڑے گا"۔ مطلب یہ ہے کہ ظالم اور دشمن جس وقت سامنے آگیا تو کمزور آدمی کے لئے محض اس کا خوف اور دہشت ہی ہوش حواس کھونے کے لئے کافی ہے۔ اور اُس وقت سوائے بھاگنے اور فرار ہونے کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔

اس مثل کے متعلق آپ نے یہ کہانی غالباً بارہا سُنی ہوگی کہ ایک بلّی تھی اس نے چوہوں کو بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ روزانہ آٹھ سات کو شکار کرتی اور نوش جان کر جاتی، آخر سخت مجبور ہو کر چوہوں نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا اور سب کی یہ رائے طے پائی کہ اس ظالم بلّی کو ہلاک کر دیا جائے تاکہ اس مصیبت سے نجات ملے۔

چار دلیر اور منچلے چوہے تیار ہوئے۔ ان میں ایک بولا "میں لپک کر بلّی کے ہاتھ کو چمٹ جاؤں گا، اور ناخن کتر ڈالوں گا۔ تاکہ وہ پنجوں سے پکڑنے کے قابل ہی نہ رہے"۔ دوسرا چوہا بولا "کہ میں ناک پکڑ لوں گا"۔ تیسرے نے کہا "کہ میں کان پکڑ کر گھسیٹ لوں گا"۔ چوتھے نے کہا "کہ میں گردن پر جا بیٹھوں گا اور کان پکڑ کر کتر ڈالوں گا"۔ دو تین تیار ہوئے کہ ہم دُم پکڑے رہیں گے۔ تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔

جب تمام چوہے اس طرح سرگرم سخن تھے اور ہر ایک بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا تو ایک بوڑھا چوہا الگ خاموش بیٹھا تھا۔ چوہوں نے اسے چُپ دیکھ کر کہا کہ جناب بھی اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ بوڑھے چوہے نے کہا "تم سب نے خوشی خوشی یہ تجویز تو کر لی اور اس بات پر اظہار مسرّت بھی کر رہے ہو اور اپنے خیال میں ہر ایک نے بلّی کا ایک ایک عضو بھی بانٹ لیا ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میں سے "بلّی کی میاؤں کو کون پکڑے گا۔ اور اس کے لئے کونسا بہادر چوہا تیار ہوا ہے"۔

اتفاقاً اس وقت کسی کونے سے بلّی کی میاؤں کی آواز آئی جسے سنتے ہی تمام چوہے نہایت بدحواسی کے ساتھ اپنے اپنے بِلّوں میں جا چھپے، نہ کسی نے بلّی کے سر کو پکڑا، نہ ٹانگوں کو، تمام منصوبے اور تجویزیں سب ادھوری رہ گئیں۔ اور اتنا بڑا جلسہ ایک آن کی آن میں ختم ہو گیا۔

آغا سہیل

ربڑ کی کہانی

تمھارے ربڑ کے کھلونے، گیندیں اور جوتے اتنے خوبصورت اور ہلکے کیوں ہیں؟ تمھاری سائیکلوں اور موٹروں کے پہیوں میں جو ربڑ لگا ہوا ہے یہ کہاں سے آیا؟ تم ڈرائینگ، نقشہ اور جامیٹری و سائنس کی شکلیں بناتے وقت ربڑ کا بار بار استعمال کرتے ہو یہ کہاں سے آتا ہے؟ کیا تم نے کبھی سوچا؟

آؤ آج تمھیں ربڑ کی کہانی سنائیں۔

جب کولمبس کا جہاز ہندوستان کی بجائے امریکہ پہنچ گیا اور اس نے امریکی بچوں کو نرم نرم چھوٹی چھوٹی گولیوں سے کھیلتے دیکھا تو وہ یہ گولیاں انگلستان لے گیا۔ وہاں کسی نے کچھ لکھا ہوا اس سے مٹایا تو اس کا نام (Rubber) یعنی "مٹانے والا" پڑ گیا۔

ربڑ سونے اور چاندی کی دھاتوں کی طرح زمین کی کانوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ نہ کسی جانور کی کھال سے تیار ہوتا ہے حقیقت میں یہ ایک درخت کے دودھ سے بنتا ہے۔ یہ درخت جس کا نام اب "ربڑ کے پیڑ" پڑ گیا ہے۔ دکھنی امریکہ اور افریقہ کے گھنے اور تاریک جنگلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے ربڑ کے پیڑ ملایا، برما اور سیلون کے گھنے جنگلوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ربڑ کے پیڑ گھنے اور لمبے ہوتے ہیں۔ ان کی لمبائی پچیس ۲۵ فٹ سے چالیس فٹ تک ہوتی ہے۔ جن جنگلوں میں یہ پیڑ اُگتے ہیں وہ اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ سورج کی ایک بھی کرن زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔

انھیں جنگلوں میں وہ لوگ رہتے ہیں جو ربڑ نکالتے ہیں۔ آؤ اب ہم بتائیں ان درختوں کے دودھ سے ربڑ کیونکر بنایا جاتا ہے۔

ان درختوں کے تنوں اور موٹی شاخوں میں دودھ بھرا رہتا ہے۔ ان تنوں اور شاخوں میں کلہاڑی سے بڑے بڑے چھید کرکے بالٹیاں لٹکا دی جاتی ہیں۔ ان بالٹیوں میں دھیرے دھیرے دودھ جمع ہوتا رہتا ہے۔ خشک ہو جانے پر یہی دودھ بالائی (ملائی) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اب ربڑ کو ٹھوس اور سخت بنانے کے لئے ایک دوسرا طریقہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طریقہ کے بعد ربڑ اس قابل ہوتا ہے کہ اس سے مختلف چیزیں بنائی جائیں۔

لکڑی کی آگ پر مٹی کی تہہ رکھ کر ربڑ کے دودھ کو ایک چادر کی صورت میں اس تہہ پر پھیلا دیتے ہیں۔ اس پھیلی ہوئی

چادر پر مٹی کی دوسری تہہ جماتے ہیں اور اس تہہ پر بھی دودھ پھیلا کر مٹی کی تہہ جما دیتے ہیں - یہ تہیں اس وقت تک جماتے رہتے ہیں جب تک دودھ ختم نہ ہو جائے - ربڑ کے ٹھوس بن جانے پر پانی کی مدد سے مٹی کی تہیں ہٹا ڈالتے ہیں اور پھر اس ٹھوس ربڑ کو بازاروں میں فروخت کر دیا جاتا ہے -

یہاں سے یہ ربڑ اُن کارخانوں اور فیکٹریوں میں جاتا ہے جہاں اس سے مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں - آج ربڑ کا استعمال اتنا زیادہ اور عام ہو گیا ہے کہ ہر شخص تھوڑی یا بہت مقدار میں ربڑ ضرور استعمال کرتا ہے - ہمارے جوتے، کھلونے سائیکل اور موٹروں کے ٹائر، ٹیوب، ہمارے لکھنے کے قلموں کے ٹیوب، برساتیاں، بچوں کے بستر اور ہزاروں چیزیں اسی سے بنتی ہیں -

---

لطیفے

ماسٹر - رشید! کوئی دو واقعات ایسے بتاؤ جو ایک وقت میں ہوئے ہوں

رشید - میرے ابا اور اماں کی شادی ایک وقت میں ہوئی تھی -

ماسٹر - (ہنس کر) کوئی اور ....

رشید - جس وقت آپ مریں گے اسی وقت آپ کی بیوی بیوہ ہو جائیگی

امی جان - یہ کھیر کی پلیٹ کس نے صاف کی ؟

راشد - کھیر تو میں نے صاف کی تھی مگر پلیٹ کا حال نہیں معلوم ....

اُستاد - اگر میں ایک کتاب ۲ روپے ۴ آنے ۶ پائی میں خرید کر ایک روپیہ ۶ آنے ۹ پائی میں بیچ دوں تو مجھے نفع ہوگا یا نقصان ؟

شاگرد - جی! روپیوں میں نقصان ہوگا اور آنے پائیوں میں نفع -

مخمور بدخشی

معلومات

کس کی عمر کتنی ہے	سال
(۱) گھریلو چوہا	۳½
(۲) خرگوش	۵ سے ۷
(۳) بھیڑ	۱۲
(۴) بلّی	۱۳
(۵) مُرغی	۱۴
(۶) بکری - تیتر - کُتّا	۱۵
(۷) کبوتر	۲۰
(۸) مور	۲۴
(۹) گائے	۲۵
(۱۰) گھوڑا	۲۷
(۱۱) بلبل	۲۸
(۱۲) شہتوت - چکوا	۳۰
(۱۳) شیر - اونٹ - گوریلا - چمپانزی	۴۰
(۱۴) ابابیل - ہنس - گدھ	۵۰
(۱۵) طوطا - بگلا	۶۰
(۱۶) کوا - باز - مگرمچھ	۱۰۰
(۱۷) راج ہنس - ہاتھی	۱۵۰
(۱۸) کچھوا - بڑ	۳۰۰ سے ۴۰۰
(۱۹) دیل مچھلی - چنار	۴۰۰ سے ۵۰۰

لاجپت رائے

ریل گاڑی کی سیر

ایک گاؤں میں ایک بوڑھا کسان رہتا تھا جس نے کبھی گاڑی کی سیر نہیں کی تھی - ایک دفعہ وہ اپنی لڑکی کو ملنے کے لئے روانہ ہوا - اس نے سر پہ ایک گٹھڑی دھر لی جس میں وہ لڑکی کے لئے کچھ مٹھائی اور کپڑے لے جا رہا تھا - وہ بہت خوش تھا کیونکہ اب اسے پہلی مرتبہ گاڑی کی سیر کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا تھا - سٹیشن پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک کھڑکی کے سامنے چند آدمی کھڑے ہیں اور ٹکٹ لے رہے ہیں -

یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا جہاں صرف ایک ہی بابو سب کام سر انجام دیتا تھا - گاڑی آنے سے پہلے وہ ٹکٹ بیچتا اور بعد میں دروازے پر کھڑا ہو کر اترنے والے مسافروں سے ٹکٹ واپس لیتا تھا -

بوڑھے آدمی نے ٹکٹ بابو کے پاس پہنچ کر شاہپور کا ایک ٹکٹ مانگا - بابو جانتا تھا کہ اس کسان نے پہلے کبھی سفر نہیں کیا اس نے سوچا کہ بوڑھے سے کچھ دل لگی کر لے - بابو نے پوچھا - "مردانہ ٹکٹ چاہیئے یا زنانہ" بڈھا جھٹ سے بول اٹھا - "مردانہ"

جب سب مسافر ٹکٹ لے چکے تو بکنگ کلرک نے کھڑکی کو بند کر دیا اور گیٹ پر آ کر دوسری ڈیوٹی سنبھالی - وہ ہر ایک آدمی سے ٹکٹ لیتا اور پنچ کر کے واپس کر دیتا - جب اس بوڑھے کی باری آئی تو بابو نے کہا - "بابا! یہ ٹکٹ تو تم نے زنانہ لے لیا"۔ بوڑھے نے جواب دیا - "بابو جی - یہاں سے تو جانے دو گاڑی میں میں خود بندوبست کر لوں گا" - بابو نے کہا - "اچھا بابا جیسے تمھاری مرضی - لیکن خیال رکھنا کہیں پھنس نہ جانا"

تھوڑی دیر بعد گاڑی چھک چھک کرتی سٹیشن پر آ پہنچی - جس میں سے ایک گارڈ اور ایک ٹکٹ چیکر نیچے اترے - بابو ٹکٹ چیکر کے پاس گیا اور اس بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا - ٹکٹ چیکر مسکرانے لگا -

جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو ٹکٹ چیکر بھی لپک کر اسی ڈبے میں آ دھمکا جس میں کہ بوڑھا کسان سوار ہوا تھا - اس کے دیکھتے ہی کسان نے گٹھڑی کھولی اور ایک لال دوپٹہ نکالا - وہ دوپٹہ اوڑھ کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی گنوار عورت بیٹھتی ہے - گھونگٹ بہت لمبا - پاؤں سیٹ کے اوپر - یہاں تک کہ جسم کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ پڑتا تھا -

ٹکٹ چیکر ہر ایک سے ٹکٹ دیکھتا ہوا اس کے پاس

پہنچا اور کہنے لگا ۔ "بی بی جی ۔ ذرا ٹکٹ دکھانا"۔ بوڑھا جو کہ اب عورت بنا ہوا تھا منہ سے کچھ نہ بولا ۔ اس نے ہاتھ باہر نکال کر ٹکٹ دکھایا ۔ ٹکٹ چیکر نے جب ٹکٹ دیکھا تو کہا "بی بی جی ! یہ تو مردانہ ٹکٹ ہے ۔ آپ کو اس ٹکٹ پر سفر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ۔

بوڑھے نے فوراً ہی دوپٹہ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا ۔ "میں کون سا زنانہ مسافر ہوں ؟ میں بھی تو آپ کی طرح پورا مرد ہوں !

بوڑھے کی یہ بات سُن کر سب ہنسنے لگے ۔

مُفید اور کارآمد چٹکلے

ترپھلے کا چورن گھی اور شہد میں ملا کر رات کو کھانے سے امراضِ چشم میں فائدہ ہوتا ہے ۔

پیاز کا رس نکال کر پلانے سے بچّوں کے پیٹ کے کیڑے مرجاتے ہیں ۔ اگر بچّوں کو بدہضمی ہوجائے تو پیاز کے رس کی دو چار بوندیں پلانی چاہئیں ۔

اگر بچّوں کو سردی لگ جائے اور بار بار چھینکیں آتی ہوں تو پان میں کڑوا تیل لگا کر پھر سینک کر بچّے کی چھاتی پر لگانے سے سردی جاتی رہتی ہے ۔

کافور اور زنجبیل دونوں ہم وزن لے کر پیس لیں اور جب کبھی دانتوں یا مسوڑھوں میں تکلیف ہو اس کو مل لیں ۔ درد دُور ہوجائے گا ۔

بڑ کا دودھ اور پسی ہوئی ہلدی منہ پر لگانے سے منہ کی چھائیاں اور دھبّے دور ہوجاتے ہیں ۔

ارجمند بانو

ہتھیلی پر بال

ایک مرتبہ اکبر بادشاہ نے دربار میں بیٹھے ہوئے اپنے وزیر وظریف بیربل سے پوچھا کہ بتاؤ بیربل میری ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہیں ـــــ ؟ بیربل نے جواب دیا جہاں پناہ ! مجھے اتنے انعام واکرام عنایت فرماتے ہیں کہ انہیں دیتے دیتے حضور کی ہتھیلیوں پر بال نہیں ہوسکے ـــــ اکبر نے پھر پوچھا تو تمھاری ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہیں ؟

بیربل نے جواب دیا کہ جہاں پناہ کے انعامات واکرامات لیتے لیتے میرے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر بال نہ ہوسکے ۔

اکبر یہ جواب سُن کر کچھ دیر تک خاموش رہا ۔ پھر مُسکرا کر پوچھا ۔ مگر دوسرے نوکروں اور درباریوں کی ہتھیلیوں پر بھی تو بال نہیں ہیں ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟

بیربل نے برجستہ جواب دیا کہ "جہاں پناہ جب مجھے بے حد انعامات اور اکرامات عنایت کرتے ہیں دوسرے لوگ اسے دیکھتے رہتے ہیں اور وہ مجھے اتنے انعام پانے پر ہاتھ مل کر رہ جاتے ہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہتھیلیوں پر بھی بال نہیں ہوسکے۔

اکبر اس جواب کو سُن کر بہت خوش ہوا ـــــ اور بیربل کو اتنا انعام دیا کہ وہ بھی خوش ہوگیا ۔

لطیفہ: باپ ۔ ایک روپے کا نوٹ لوگے کہ دو اٹھنّیاں ؟
بیٹا ۔ ابا جان ۔ ایک اٹھنّی اور تھوڑا سا نوٹ دیجئے

بھارت کے مستقبل میں روپیہ لگائیے
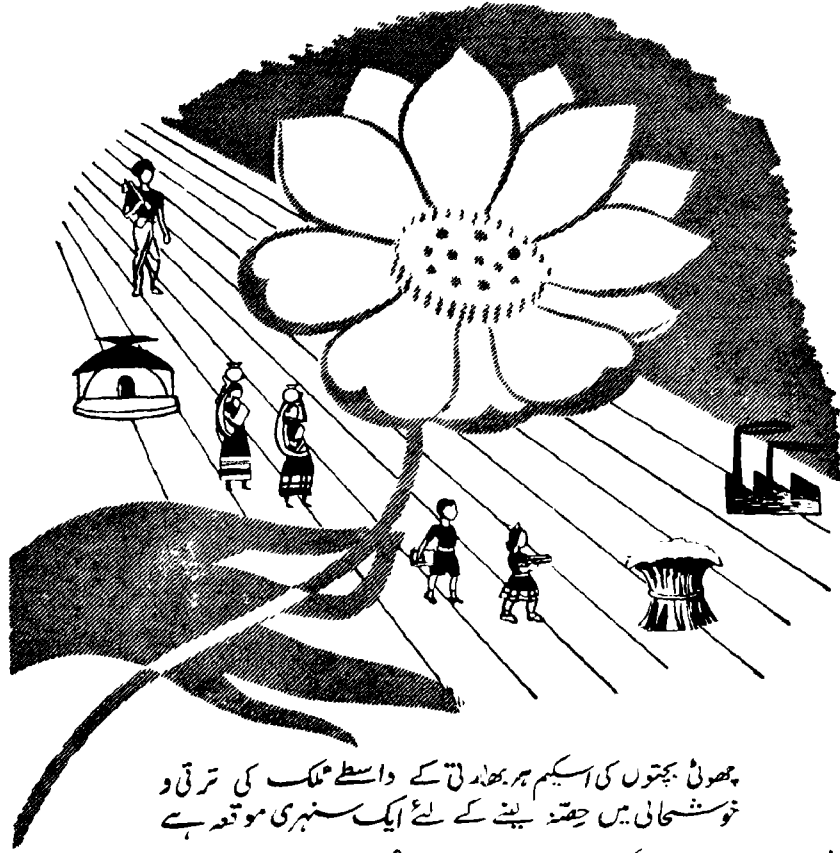
چھوٹی بچتوں کی اسکیم ہر بھارتی کے واسطے ملک کی ترقی و خوشحالی میں حصہ لینے کے لئے ایک سنہری موقعہ ہے

آپ اپنی بچتوں کو اِن ضمانت شُدہ مدوں میں لگائیے

۱۲ - سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ
۱۰ - سالہ ٹرژری سیونگز ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ
۱۰ - سالہ نیشنل پلان سرٹیفکیٹ
۱۵ - سالہ اینوٹی سرٹیفکیٹ
پوسٹ آفس سیونگز بنک ڈیپازٹ

بھارت سرکار کی

چھوٹی بچتوں کی اسکیم

بھارت کی ترقی کے ساتھ
اپنی بچت بڑھائیے

AC.35/45

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لِسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں ۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں ۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے ۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔"

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں ۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے ۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں ۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں ۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی ۔"

ممتاز حسین

" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے ۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ داروں کو ۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس ملک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے ۔"

اشفاق حسین

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے ۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے ۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے ۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے ۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے ۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں ۔ بچوں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے ۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی	قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

ترتیب

بچّوں کا آج کل

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر ——— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ ——— نمبر ۳

سالانہ چندہ ——— ہندوستان میں :- چھ روپے
پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

بیرونِ ممالک سے ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ ——— ہندوستان میں :- آٹھ آنے
پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

اکتوبر ۱۹۵۵ء

سرورق :- شمس العلماء خواجہ حسن نظامی جو یکم اگست ۱۹۵۵ء کو انتقال فرما گئے۔
آپ سے متعلق جمیل مہدی کا مضمون صفحہ ۳ تا صفحہ ۷ پر درج ہے۔

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ — دہلی

س۔ ا عشرت

طلوعِ سحر

"زمانے کے انداز بدلے گئے
نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے"

اُلٹ دی محبت نے خونیں بساط
ہر اک سمت رقصاں ہے رُوحِ نشاط
ہُوا ختم آخر اندھیروں کا راج
لیا نُور نے ظلمتوں سے خراج
قدم ظلم کے لڑکھڑانے لگے
جو روتے تھے وہ مُسکرانے لگے
اُٹھے ہیں کہ بدلیں نظامِ حیات
ملا شادمانی کو حُکمِ ثبات
جل اُٹھے محبت کے زرّیں چراغ
مسرّت سے بھرنے لگے ہیں ایاغ
اُٹھے ہیں کہ ظلمت کا منہ موڑ دیں
جو ٹوٹے تھے رشتے وہ پھر جوڑ دیں
نئی آشتی ، کامرانی نئی
نئی ہے سحر ، زندگانی نئی
بچھاتے تھے ہر سمت جو زر کے دام
ہیں ان نفع خوروں پہ نیندیں حرام

نہ بھڑکے گی فرقہ پرستی کی آگ
لُٹے گا نہ بازار میں اب سُہاگ
بدی پہ نہ ہوگی نگاہِ کرم
مٹا دیں گے دھرتی سے ظلم و ستم
نہ کوئی لگائے گا انساں کے دام
بدل دیں گے تقدیر بھوکے عوام
نہ سرمایہ داری نہ سرمایہ دار
بڑھا دیں گے انسانیت کا وقار
جبینوں میں رقصاں ہے عزمِ جواں
جو چاہیں بدل دیں نظامِ جہاں
اُلٹ دی زمانے کے رُخ سے نقاب
نہ دیکھے گا کوئی لڑائی کے خواب
کوئی پست ہوگا نہ کوئی بلند
ستاروں پہ ڈالیں گے بڑھ کر کمند
نئے گیت ہیں اور نئے ساز ہیں
یہی کامیابی کے انداز ہیں

جمیل مہدی

خواجہ حسن نظامی

(ایک ادیب)

یکم اگست کو اتوار کے دن خواجہ حسن نظامی اس دنیا میں نہیں رہے، انھوں نے اس جہان کا سفر شروع کر دیا، جہاں کا سفرنامہ وہ کبھی نہ لکھ سکیں گے۔ جہاں سے وہ کبھی پلٹ کر نہ آسکیں گے۔ ہر انسان کا، خواہ وہ کیسا ہی بلند ہمت، بیش قیمت، شہزور، اور طاقت ور ہو، یہی انجام ہے، کہ وہ موت کے سرد اور بے رحم ہاتھ کے سامنے بے بس ہو جائے۔ ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی زندگی، گنگناتی ہوئی زندگی خاموش اور بے حرکت جسد میں تبدیل ہو جائے۔ سرد ہو کر مٹی میں مل جائے۔

انسان بہر حال فانی ہے، جسے موت سے رستگاری نہیں، اُسے بے نام و نشان ہو جانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی، لیکن انسان کا کردار لافانی ہے، اور انسان کی یہی چیز ایسی ہے جس کے سامنے موت بھی عاجز ہو کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔

خواجہ صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا، جب تک وہ زندہ تھے اُن کی موت کا دھڑکا اور تشویش اُن کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی، اُنھوں نے اپنے آپ کو فنا کی آغوش میں دے دیا تو وہ ابدی اور لازوال ہو گئے۔ اب ان کا نام نسلوں تک اور ان کا کام ہمیشہ انسانوں کے ساتھ رہے گا ——— خواجہ صاحب کی زندگی، بڑی جد وجہد، رستاخیز، کشمکش اور نبرد آزمائی کی زندگی ہے۔ وہ اس دور کی زندگی ہے جہاں حسن ساتھ ساتھ چھوڑ دیتا ہے، اور سنگین حقائق راستہ روک لیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں یک رنگی اور یکسانیت نہیں ہے۔ وہ بڑی رنگا رنگ، پہلو دار اور بھرپور شخصیت تھے۔ بالکل سورج کی مانند جس سے نکلنے والی کرنیں یک رنگ ہونے کے باوجود بوقلمونی اور لاتعداد رنگ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہیں۔

وہ صوفی تھے، درویش تھے، مترجم قرآن تھے، صحافی اور ادیب تھے، تاجر اور پیر تھے۔ اتنے پہلو جب کسی ایک ذات میں گڈمڈ ہو جائیں تو بڑی مشکلات کا سامنا ہو جاتا ہے۔ ان پہلوؤں کو چھانٹنے، الگ الگ کرنے اور پرکھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اُن کی شخصیت اوّل سے آخر تک تجربہ رہی انھوں نے زندگی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس کے ساتھ نبرد آزمائیاں کیں۔ کاوے کاٹے، سمجھوتے کئے، وہ ہارے کبھی نہیں۔ دل برداشتہ کبھی نہیں ہوئے، زندگی کے ساتھ اُن کی مکمل مفاہمت تھی۔ ان کی شخصیت بنیاد سے چھت تک خود اُن کی تعمیر کردہ تھی۔ اس کی ایک ایک اینٹ انھوں نے اپنے ہاتھ سے رکھی تھی۔ اس وقت سے کہ وہ ایک معمولی انسان کی مانند کتابیں فروخت کر کے گزارہ کرتے تھے، اس وقت تک کہ ان کی نگاہ کے اشارے پر ملک بھر کے فیصلے ہونے لگے، وہ اپنے معمار آپ تھے۔ ایسی شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔

خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی بڑے سنگلاخ، بڑے صبر آزما اور بڑے حوصلہ فرسا حالات میں بسر ہوئی لیکن انھوں نے کبھی ضبط اور ہمت کا توازن اور استقلال کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اسی زندگی سے سبق حاصل کیا، ایک نقاد کی نگاہ پیدا کی، اپنی سمت اور راستے کا تعین کیا۔ ان کی اس زمانے کی زندگی ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ وہ ہمیشہ اسی زندگی کے تجربے سے، اس کے دئے ہوئے سلیقے سے فائدہ حاصل کرتے رہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو آگ اور شعلوں میں جلنے کے بعد راکھ کے بجائے فولاد بن کر باہر نکلتے ہیں۔

میر نے کہا تھا۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا میر کا طور یاد ہے ہم کو

لیکن خواجہ صاحب نامرادانہ زیست کے قائل نہیں تھے۔ یہ نامرادانہ زیست جو انھیں اپنے خاندان سے، اور اُن کے دور کو اپنے پچھلے دور سے ورثے میں ملی تھی، انھیں کبھی پسند نہیں آئی، اُنھوں نے اسے کامراں اور بامراد زندگی کے روپ میں ڈھالنے کے لئے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے، بڑی ذہانت اور جدوجہد سے کام لیا، اور بالآخر ایسی پائدار بنیاد کھڑی کردی کہ انھیں زندگی بھر کے لئے اطمینان ہوگیا۔

تصوّف اور ادب کے میدان اُن کی جولاں گاہ تھے۔ لیکن ان دونوں میدانوں کو انھوں نے کھیتوں میں تبدیل کرنا کبھی پسند نہیں کیا بلکہ اپنی بہتر صلاحیتوں سے کام لے کر زندگی گزارنے کے لئے دوسری سمتوں میں کوشش کی۔ وہ مدّت العمر قلمی مزدور نہیں بنے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں رسمیت اور ہلکاپن داخل نہیں ہوسکا۔ اسی لئے اُن کے قلم میں شگفتگی، اخلاص کی گرمی اور وہ سفاک تاثیر آخر تک برقرار رہی جو عظیم ادب کی تشکیل کرتی ہے۔

خواجہ صاحب کا قلم بڑا سحر طراز تھا، وہ اس دور کے ان ساحروں میں سے ایک تھے جن کے بغیر اردو کی ادبی اور شعری تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، اور جن کی تعداد سات یا آٹھ سے متجاوز نہیں ہے۔ ان کا نام داغ، اقبال، محمد حسین آزاد، شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں آپ بیتی۔ سفرنامے۔ روزنامچے، خطوط، افسانے، مغلیہ سلطنت کے زوال اور انحطاط کی داستانیں، کرشن جی کی سوانح عمری، قرآن کا ترجمہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ ان کے ہاں زبان اور خیال کے علاوہ شاذ ہی کوئی نئی چیز نظر آتی ہے۔ لیکن اسلوب اور کہنے کا انداز ایسا ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں "مصورِ فطرت" بن گئے تھے۔ ایک فنی کی سب سے بڑی عزت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل بن جائے۔

اُن کی تحریر میں محمد حسین کا سا جوش و خروش، مدوجزر اور رزمیہ انداز بھی نہیں تھا۔ وہ شبلی کی مانند بھاری، گمبھیر اور متانت سے بھرپور [illegible] نہیں تھی۔ نہ ہی ابوالکلام کی نثر کا جلال اور پہاڑوں سے گرتے ہوئے جھرنے کا مبہوت کردینے والا نغمہ اس کے اندر پایا جاتا تھا، لیکن وہ پھر بھی اردو کے بہت بڑے نثر نگاروں میں سے ایک تھے۔ ان کی تحریر میں کیفیات، حلاوت، شیرینی اور سوز کا ایسا امتزاج تھا جو سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر جاتا تھا۔ اپنی اس تحریر کے متعلق خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

" اگر کوئی شخص تنقید کی نظر سے میری کتابوں کو دیکھے گا تو اس کو ایک حیرت خیز بات محسوس ہوگی کہ میں نے بہت محدود الفاظ سے یہ سب کام کئے ہیں۔ یعنی میری زبان پر گنتی کے چند الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ انھیں سے میں نے کام لیا اور ہر قسم کے مضامین ادا کئے۔ الفاظ کی وسعت میرے ہاں نہیں ہے۔ اور حافظہ درست نہ ہونے کے سبب مجھ کو مقررہ و معلومہ الفاظ کے سوا ادائے مطلب کے وقت اور کوئی لفظ یاد نہیں آتا اور میں اپنے ہی محدود الفاظ سے ہر مطلب ادا کردیتا ہوں" (آپ بیتی)

اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے جو الفاظ اپنی تحریروں میں استعمال کئے ہیں ان کی تعداد حیرت ناک حد تک کم ہے۔ لیکن اسٹائل کی ندرت اور لہجے کی بے ساختگی اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ وہ جو بات کہتے ہیں حشو و زوائد سے پاک اور براہِ راست ہوتی ہے۔ انھوں نے سیکڑوں دعائیہ شذرے لکھے صحافتی مضامین تحریر کئے۔ کافی ضخیم کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں لیکن ان کا لہجہ کبھی پست و بلند نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ کہیں دور بجتی ہوئی بانسری کی آواز کی مانند، اضطراب انگیز، یکساں اور دل نشین رہتا ہے۔ ان کی تحریر میں وہ افسردگی ہے جو کہر آلود فضاؤں میں عبادت خانوں پر نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اطمینان بھی ہے جو عبادت گذاروں کے دلوں میں دکھائی دے سکتا ہے۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن عوام میں ان کی شہرت غدر دہلی کے واقعات اور بیگموں اور شہزادوں کے مصائب کی داستانوں کے ذریعے ہوئی، ان کے اس قسم کے مضامین بڑے دردناک، بڑے پُرسوز اور اثر انگیز ہیں۔ اس کا باعث وہ رومان ہے جو تباہی اور تاراجی کی داستانوں کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس رومان نے ہماری کتنی ہی ادبی شخصیتوں کو عظیم اور لافانی بنایا ہے۔ کتنی ہی تخلیقوں کو حیاتِ جاودان بخشی ہے۔ انیس کے مراثی، حالی کا مسدّس اور اقبال کا شکوہ سب اسی رومان کے باعث مشہور اور مقبول ہوئے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کو بھی انقلاب ۱۸۵۷ء کے ردِ عمل پیاس کے باعث پھیلنے والے عام تہلکہ پر، دلّی کی بکھرتی ہوئی، برباد ہوتی ہوئی آٹھ آٹھ آنسو

ہوتی ہوئی معاشرت پر حکمراں خاندان کی عبرت ناک اور جگر پاش تباہی پر لکھی ہوئی داستانوں نے عوام میں محبوب اور مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ غدر دہلی کے افسانے اور بیگمات کے آنسو، وہ کتابیں ہیں جو آج سے دس پندرہ سال پہلے تک تقریباً ہر گھر میں دکھائی دے سکتی تھیں۔ ان کی یہ شہرت، یہ مقبولیت کچھ زیادہ قابلِ وقعت اور ٹھوس نہ ہوتی، اگر اس کی بنیاد محض ایک قدرتی موت مرتے ہوئے تکلیف سے چیختے اور بلبلاتے ہوئے سماج کی منظر کشی اور نمائندگی پر ہوتی۔ مصائب اور آلام سے بھرپور زندگیوں کے افسانے رحم اور عبرت کے جذبات انسانوں کے دلوں میں ضرور پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ تأثر، غمگینی کا یہ احساس، رحم کا یہ جذبہ دیرپا نہیں ہوتا جبکہ اس کی کوئی سمت بھی نہ ہو، کوئی صحت مند نتیجہ بھی نہ ہو۔ اسی لئے ایسی انشا شخصیت کو دلکش ضرور بنا دیتی ہیں، ہمیشگی نہیں بخش سکتیں۔ لافانی نہیں بنا سکتیں۔

اگر خواجہ صاحب بھی محض "غدر دہلی" کے باعث پیدا شدہ تباہی اور شہزادوں اور بیگموں کی تاراجی اور بربادی کی داستانیں لکھنے پر ہی اکتفا کرتے تو اُن کا نام تب بھی باقی رہتا لیکن انھیں وہ عظمت اور ہمہ گیری کبھی حاصل نہ ہو سکتی جو ایک فن کار کو عظیم اور ناقابلِ فراموش بنا دیتی ہے۔ انھوں نے مرثیہ اور ماتم سے الگ ہٹ کر جو مضامین لکھے ہیں ان کی شخصیت ان ہی سے تعبیر ہوتی ہے۔ ان سے پہلے اُردو کے پاس آنکھ ضرور تھی۔ دوربین نظریں اور دُشا...سے کی طاقت بھی تھی، لیکن خوردبین نہیں تھی۔ یہ خوردبین اُردو کو خواجہ صاحب نے عطا کی۔

انھوں نے عظیم اور بھاری موضوعات کو نہیں اپنایا، بلکہ ایک حد تک اُن سے اغماض برتا ہے۔ وہ بڑے بڑے موضوعات کی جانب توجہ کرنے کے بجائے بڑی حد تک اُن سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ اُن کی نظر آنسو، لیمپ، مٹی کے تیل، دیا سلائی، کھٹمل، ہچکی، مچھر، اُلّو، مکھی، اوس، لالٹین، جھینگر، فٹ بال، پسینہ، سوئی اور چھڑکاؤ کی گاڑی جیسے حقیر بے حقیقت اور نظری موضوعات پر ٹھہرتی ہے، وہ اُن پر طبع آزمائی کرتے ہیں، اور طبع آزمائی کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

اُن کے فکر و ذہن کے بعید تر گوشے تک تصوف اور معرفت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس لئے ان کی تحریر پر بھی اوّل سے آخر تک تصوف اور روحانیت کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی موضوع ہو، کوئی بات ہو، کوئی مرحلہ ہو، وہ اس صوفیانہ روش کو ترک نہیں کرتے۔ ان کے بیشتر موضوعات کی بنیاد خیالی ہے، اس لئے وہ اس میں نکتے پیدا کرنے میں کامیاب بھی خوب ہو جاتے ہیں۔ مچھر، اُلّو، مکھی، جھینگر، چھڑکاؤ کی گاڑی اور کھٹمل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

انھیں پیش پا اُفتادہ مضامین کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ماحول کے اثرات اور زمانہ کی دھڑکنیں سنائی نہیں دیتیں۔ ترکانِ احرار، گاندھی جی، شاہ جامع، دربارِ دہلی، کانپور کا ہنگامہ، شیخ سنوسی اور ایسی ہی دو چار شخصیتیں اور واقعات اُن کے مضامین میں سے نکال دئے جائیں تو ان کا زمانہ متعین کرنے میں مستقبل کے مورخ کو بڑی دشواری پیش آ سکتی ہے۔ (سفرنامے ان کے علاوہ ہیں۔)

وہ جس دور میں پیدا ہوئے، وہ تصادم، کش مکش اور رسہ کشی کا عہد تھا۔ پورا ایک دور ختم ہو رہا تھا، دوسرے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ایک تہذیب مر چکی تھی، دوسری پیدا ہو رہی تھی۔ ایک معاشرہ دم توڑ چکا تھا، دوسرا جنم لے رہا تھا۔ اس لئے اُن کے ذہن میں بھی اسی ٹکراؤ، اسی کش مکش اور اسی چپقلش کے اثرات دکھائی دیتے ہیں جس سے ذہنوں کے باہر کی دنیا بھری پڑی تھی۔ ان کی تربیت میں، وراثت میں ملی ہوئی ذہنیت، ایک سال خوردہ لیکن بکھرا جاگیردارانہ نظام کے تقاضے، اس کی برکتیں، اس کی نحوستیں سب شامل تھیں، انھوں نے آنکھ کھول کر آٹھ سو سالہ عظمت کے ایک محل کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا، اس کی ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر خون کے چھینٹے بھی دیکھے۔ ان کے سامنے عیش اور سرمستی کے محل کا پھاٹک بند ہو گیا، اور جہنم کے دروازے کھل گئے۔ اس لئے عیشِ رفتہ کے واپس آ جانے اور متاعِ گم گشتہ کے حاصل کرنے کی تمنا ان کی قدرتی تمنا تھی۔ وہ اُن کی تمنا نہیں تھی پورے ماحول کی تمنا تھی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔

لیکن اپنی ذہنی بصیرت اور فہم کے ذریعے وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ زمانے کا تیز گھومتا ہوا پہیہ انسانی ہاتھوں سے نہیں روکا جا سکتا، ایک گرتی اور لحظہ بہ لحظہ منہدم ہوتی ہوئی عمارت تھمیوں کے سہارے پائدار نہیں بن سکتی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ انسانوں کی نظریں اب لہلہاتے ہوئے نرم سبزہ زاروں، جھومتے اور مسکراتے ہوئے نازک پھولوں سے خیالی تازگی حاصل کرنے کے بجائے زمین کی اس خودرو اور قدرتی پیداوار کی جانب متوجہ

ہیں، جو زیادہ دیر تک عمل اور جد و جہد کی ستیزہ کاری میں ٹھہر سکے۔ حقائق کا سامنا کرنے، ان سے آنکھ ملانے کا یہ جذبہ ان کے ہاں بہت سی جگہوں پر ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی بہتر مثال اس ٹکڑے سے سمجھی جا سکتی ہے۔

"کیکر کی چھال مفید ہے جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں، اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑیاں جلنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو تو گلقند کھاؤ۔ ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ۔ مر جاؤ تو قبر پر چڑھاؤ اور بھی کوئی کام اس منحوس وجود سے نکلتا ہے۔

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کمہلا اور مرجھا جاتا ہے، اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے، اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلے میں دیر تک زندہ رہے۔

(گلاب تمہارا کیکر ہمارا)

بدلتے ہوئے زمانے کا یہ عرفان، اس کی سمت پہچاننے کا یہ ثبوت اور بھی کتنی ہی جگہ ملتا ہے لیکن ان کا ذہن تبدیلیوں کا، جاگیردارانہ نظام کی شکست کا، اک نئے اور فاتح دور کے تقاضوں کا صحیح طور پر مشاہدہ کرنے کے باوجود اسے ہشاش بشاش ہو کر قبول کرنے۔ اس کا استقبال کرنے کے متعلق پس و پیش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن میں وہ مشرقیت اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ موجود تھی جو اپنی بہتر صفات اور قابل قدر انسانی خصوصیات کے باوجود وضعداری کی اتنی پابند ہے کہ اس کے تحفظ میں پہاڑوں سے ٹکرا جانا کھیل سمجھا جاتا ہے۔

انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک گرجتے ہوئے انقلاب کی خوں آشامیاں دیکھی تھیں۔ ایک معاشرت کو دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی سسکیاں اور کرب انگیز چیخیں سنی تھیں۔ کرگھوں اور چرخوں کی مدھم آوازوں کے بجائے ان کے سامنے ہی سامنے عفریت پیکر مشینوں کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی تھی، ایک سلطنت کا جھلملاتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا تھا۔ اس کے بجائے یہاں کے آسمان پر ایک ایسا آفتاب چمک اٹھا تھا جو اس وقت کی دنیا میں کہیں غروب نہ ہوتا تھا۔ لباس، تعلیم، رسم و رواج اور سماج میں جو انقلاب آیا تھا وہ سب ان کے سامنے تھا۔ اس کے کئی گوشوں کو خود انھوں نے گوارا بھی کیا تھا۔ لیکن وہ جس دور میں پیدا ہوئے تھے اس کی محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتے تھے۔ اُسے یاد کرنے اور آنسو بہانے سے بھی گریز کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ مغلیہ سلطنت کی بربادی اور مغلیہ خاندان کے افراد کے مصائب سے بھرپور داستانوں میں جو تاثیر ہے جو کرب ہے، الفاظ کے خول میں گھٹی ہوئی جو چیخیں ہیں وہ اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔ یہ جذبہ کسی انقلاب یا بغاوت کے احساس اور خواہش کی پرورش نہیں کرتا، جھلاہٹ اور غیظ و غضب کی بھی پیدا نہیں کرتا۔ اس کی بنیاد محض ماتم اور آنسوؤں پر ہے۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے، وہ تبدیلیوں اور انقلاب کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا بھی چاہتے ہیں۔ لیکن وضعداری سے مجبور ہیں۔ زمانے کا مشاہدہ، اس کے خدوخال اور مستقبل کا تصور ان کے ہاں اتنا صاف اور واضح ہے۔

"چند دن کی بات ہے، دنیا کے سرکش دولت مند تباہ و برباد ہونے والے ہیں، ان میں وہی سلامت رہیں گے جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں یا محنت سے بزرگوں کا روپیہ بچاتے ہیں اور جائز کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ باقی سب کا زوال آنے والا ہے۔"

(آپ بیتی)

یہ اُن کے بہتر ذہن اور بصیرت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے آنے والے زمانے کے تیور نہ صرف واضح طور پر دیکھ لئے بلکہ انھیں واضح طور پر بیان بھی کر دیا۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک طویل اور لمبے عرصے کی طبقاتی جد و جہد اب آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا اختتام سرمایہ داری کی شکست اور عوامی طاقتوں کی فتح کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ لیکن ان کی رائے میں غریبوں کا یکبارگی فروغ پسندیدہ نہیں ہے، ان کی خواہش یہ ہے۔

"یورپ میں سوشلزم اور بالشویک تحریک کا غلغلہ مچا ہے، اس کا اثر تمام دنیا میں پھیلے گا۔ کیونکہ دنیا امیروں کے مظالم اور خود غرضیوں سے عاجز ہو گئی ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ اثر پیدا ہو تو میرے اس مشاہدے کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ

ادنیٰ اقوام کو ایک دم اعلیٰ درجے میں ہرگز نہ لایا جائے بلکہ رفتہ رفتہ، درجہ بدرجہ ان کو بڑھانا مناسب ہوگا ——
موچیوں کو شائستہ موچی بناؤ، وہ تحصیلداری کے قابل ہرگز نہیں ہیں۔ دھوبی کو تعلیم یافتہ دھوبی رکھو یا گھاٹ کا افسر بنا دو۔ میونسپل کمیٹی کا چیرمین اس کو فوراً نہ کر دینا چاہیئے!"

(آپ بیتی)

ان کی یہ تحریریں ۱۹۲۸ء یا اس کے لگ بھگ سالوں کی ہیں۔ اس زمانے میں انقلاب کا دھارا آج کی مانند تیز اور تند نہیں تھا۔ اس میں سستی اور آہستہ روی تھی۔ انھوں نے اس زمانے میں اس کا اتنا ساتھ بھی دے دیا یہ ان کے خلوص اور دیانتداری کا ثبوت ہے۔

ان کی تحریریں، ان کے مضامین میں جو خوبصورتی تھی، جو ندرت اور بے ساختگی تھی، جو دلکشی اور گھلاوٹ تھی، جو سادگی اور پرکاری تھی، اس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جو رچاؤ تھا، تخاطب کی جو ہمہ گیری تھی، وہی اپنی جگہ اتنی اہم اور بیش قیمت ہے کہ اس کی موجودگی میں انقلاب کا اتنا ساتھ بھی بے حد غنیمت معلوم ہوتا ہے، جب کہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے اس زمانے کے معاصر زمانہ اور ماحول تبدیلیوں سے قطعی دامن کشاں اور بے پروا تھے۔ انھوں نے زبان کی ہی اتنی خدمت کی ہے کہ ان کے نام کو، ان کی خدمات کو اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رکھا جائے گا۔

ان کے مضامین کا نصب العین، آزادی اور انقلاب نہیں ہے۔ سماج اور معاشرت کی فائندگی اور تنقید بھی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں مقصدیت نہیں ہے۔ وہ اوّل تا آخر انشا پرداز نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تحریریں عظیم ادب کے درجے میں داخل ہیں، ان کا مطمح نظر اوّل سے آخر تک تصوّف ہی تصوّف ہے۔ اسی تصوّف کی تبلیغ کو ان کا مقصد بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا تخاطب اتنا ہمہ گیر اور آفاقی ہے کہ وہ کسی ایک مذہب یا کسی ایک فرقے تک محدود ہونا نہیں چاہتا۔ اسے کسی ایک فرقہ یا مذہب تک محدود کیا بھی نہیں جا سکتا۔ انھوں نے جس چاؤ، جس خلوص، جس دلچسپی اور عقیدت کے ساتھ رسول صلعم امام حسینؓ اور حضرت نظام الدینؒ محبوب الٰہی کا تذکرہ کیا ہے، اسی چاؤ، اسی خلوص، اسی عقیدت اور اسی والہانہ جوش کے ساتھ کرشن جی کی بھگتی کے گن بھی گائے ہیں۔ جس جذبے کے ماتحت میلاد نامہ اور محرّم نامہ لکھا ہے، اسی جذبے کے ماتحت کرشن بیتی بھی لکھی ہے۔ انھیں ایک مشترکہ اور شریف تہذیب اور ایک مشترکہ زبان ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے صرف اس تہذیب کی حفاظت کی جو صدیوں کے میل جول اور نسلوں کے اختلاط سے عالمِ وجود میں آئی تھی۔ بلکہ اسے اور زیادہ سنوارنے میں، اور زیادہ تابناک اور دلکش بنانے میں اپنی بہتر صلاحیتوں کو صرف بھی کیا ہے، انھوں نے اتنی آسان، سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے جسے بے تکلّف ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی زبان کے معیار کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ان کا اتنا عظیم احسان ہے جو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بحیثیت انسان اُن کی شخصیت بڑی قدآور اور عزیمت و استقلال سے بھرپور شخصیت ہے۔ انھوں نے دوستوں کو ہمیشہ نفع پہونچایا، اور دشمنوں سے کبھی نفرت نہیں کی، ان کی زندگی خود بڑی سنگلاخ گھاٹیوں سے نکل کر کھلے میدان میں آئی تھی۔ اس لئے وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولے کہ انسان کا سر چاہے آسمان سے جا لگے لیکن اس کے پیر زمین پر رہنے چاہئیں۔ ان کی پوری زندگی رزم اور ہنگاموں میں بسر ہوئی، ہمیشہ وہ مخالفتوں کے طوفانوں اور دشمنوں اور حاسدوں کے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے سامنے ہی سامنے ان کے کئی شاگرد ان کے مقابلے میں اپنے جھنڈے لے کر آ گئے۔ کتنے ہی لوگوں نے خود اُن کے کہنی مار کر آگے نکل جانے کی کوشش کی لیکن ان کی پیشانی پر کبھی میل نہیں آیا۔ انھوں نے شائستگی، تہذیب، رکھ رکھاؤ، شرافت، سنجیدگی اور محبت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حالی نے غالب کی وفات پر کہا تھا۔

اس کے مرنے سے مر گئی دلّی

لیکن خواجہ صاحب کی وفات نے اس مری ہوئی دلّی کی آخری نشانی بھی ختم کر دی۔ وہ دلّی کی رفتہ تہذیب کا ایسا نمونہ تھے، جو ان کے بعد اب کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا۔ لیکن اُن کا نام اور ان کا کام ایسا ہے کہ وہ ہندوستان کے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، اور آنے والی نسلیں احترام اور عزّت کے ساتھ انھیں یاد رکھیں گی۔

اعظم حسین اعظم

لکھنؤ کی موجودہ غزل

اردو شاعری میں دہلی اور لکھنؤ کے امتیازات کو بہت زیادہ اُچھالا گیا ہے۔ مقام اور ماحول کے اعتبار سے کچھ الگ الگ خصوصیات ضرور ہیں مگر ان کے بیان میں بڑے مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور بہت غلط فہمی پھیلائی گئی ہے۔ اس ساری بحث میں زیادہ تر لکھنؤ کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ مسلسل پروپیگنڈے کے نتیجے میں دو باتیں عام طور پر مسلم سمجھی جانے لگی ہیں۔ ایک یہ کہ لکھنؤ کی شاعری محض مانگ چوٹی لحد و تربت کی شاعری ہے۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ والوں کو نظم سے کوئی ربط نہیں ہے یعنی محض سطحی غزلیات ہی لکھنؤ کا ادبی سرمایہ ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے آخر الذکر بات تو بالکل ہی غلط اور خلاف واقعہ ہے بلکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ لکھنؤ کے ادبی سرمایہ کا انتہائی گرانقدر جزو نظم ہے۔ اردو ادب میں لکھنؤ کی نظم ہی نے وہ وزن اور وقار پیدا کر دیا ہے جس کی بدولت اسے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کی ادبیات کے روبرو بصد فخر و مباہات پیش کیا جا سکتا ہے۔ دبیر، اُنس، مونس، نفیس، اوج، رفیع، دولھا، تعشق، رشید، عارف، وحید، ماہر، کامل، دیا شنکر نسیم، شوق، عزیز، ظریف اور متعدد ممتاز شعرائے لکھنؤ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ جو نظم گو تھے اور جن کی مسلسل نظموں نے لکھنؤ کی شاعری کے خزانہ میں خاصا اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ اکبر الہ آبادی بھی شاعری میں لکھنؤ اسکول کے آدمی کہے جائیں گے جن کی نظموں کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس وقت بھی سرزمین لکھنؤ پر ملّا، خبیر، شاعر، قاسم، شدید، سرورش طباطبائی، نہال، شارب، عمر انصاری، قربہ، فیرقند، فضل، ماچس، مجنوں وغیرہ نظم گو شعرا موجود ہیں۔ نیز شمیم کرہانی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، علی جواد، سُرور، احتشام، مجاز، فراق، انجم، وامق، راہی اور کئی اور یوپی کے ترقی پسند نظم گو اگر کسی اسکول سے متعلق کہے جا سکتے ہیں تو وہ لکھنؤ اسکول ہی ہے۔ لیکن شروع سے آخر تک کے کل ناموں سے قطع نظر کر کے اگر صرف اتنا کہا جائے کہ لکھنؤ نے انیس، صفی، چکبست اور جوش کے سے چار نظم گو پیدا کئے تو بھی اردو ادب میں چار چاند لگا دینے کے لئے کافی ہیں اور انہیں چاروں کے دم قدم سے اردو ادب دنیا کے بہترین ادبوں میں شمار ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور کوئی شہر ہندوستان کا جہاں اتنے اور ایسے بلند پایہ نظم گو پیدا ہوئے ہوں۔ انصاف کی زبان پر اس سوال کا جواب نفی میں ہے یعنی انصاف اس باب میں لکھنؤ کی عظمت اور برتری کے اثبات پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے یعنی یہ کہ لکھنؤ کی شاعری محض مانگ چوٹی لحد و تربت کی شاعری ہے۔ تو یہ بات اس سے غلط ثابت ہے کہ لکھنؤ میں اتنے ذی مرتبت نظم گو شعرا پیدا ہوئے جن کی بے پناہ شاعری لکھنؤ کی شاعری کا جزو ہے۔ البتہ اس قول میں اس حد تک صحت ضرور ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی ایک صنف یعنی غزل کا معیار چند قرنوں تک پست رہا جبکہ رعایت لفظی، ضلع جگت اور دوسری مصنوعی باتوں پر زور دیا گیا۔ اور امانت کے سے شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن لکھنؤ کی غزلیہ شاعری کا پورا ریکارڈ خراب نہیں ہے۔ اور اس دورِ انحطاط میں بھی سید انشا اور خواجہ آتش کے سے فطری شاعر اور بلند پایہ غزل گو پیدا ہوئے۔ جن کے اشعار آج بھی اردو غزل کی جان ہیں اور اس عارضی دورِ انحطاط کے بعد تو رسوا، نظم، نظر، صفی، عزیز، ثاقب، آرزو، امید، ناصری، بیخود، یگانہ، ناطق، آسی، اثر، سراج کے سے ماہرین فن اُبھرے۔ جنہوں نے یہاں کی غزل کی کایا پلٹ دی اور اس کا معیار بہت بلند کر دیا۔ ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، مانی جائسی، نشور واحدی، اختر تلہری، حرم محمد آبادی، محشر الہ آبادی، شفیق جونپوری بھی

زبان وغیرہ کے اعتبار سے لکھنؤ اسکول ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ بحیثیت مجموعی لکھنؤ کی غزل بھی اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے ۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ صفی، آرزو، عزیز وغیرہ ہم سے پہلے لکھنؤ کی غزل کا معیار خاطر خواہ حد تک بلند نہیں تھا اور اس میں زیادہ تر سطحی باتیں کہی جاتی تھیں ۔

لکھنؤ کی غزل اس وقت کس منزل میں ہے ۔ یہ جاننے کی خواہش فطری طور سے پیدا ہوتی ہے ۔ لہٰذا ہم اس مضمون میں اس سوال پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں ۔ ہمارے پیش نظر خاص طور پر لکھنؤ کے موجودہ نوجوان شعرا ہیں جن میں سے بعض خاصے ابھر چکے ہیں اور بعض ابھر رہے ہیں اور جن سے آئندہ توقعات وابستہ ہیں ۔ لکھنؤ میں اس وقت چند سن رسیدہ اساتذہ موجود ہیں جو حسب استعداد بہت کچھ کہہ چکے ہیں ۔ ان حضرات کے کلام میں بھی کم و بیش عصریت پائی جاتی ہے مگر ہم اس وقت ان کے بعد کے نوجوان طبقہ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جس کی شاعری اپنی آخری منزل پر نہیں پہنچی بلکہ ابھی آگے بڑھتی جا رہی ہے ۔ میں یہاں ایسے پندرہ شعرا کے نمونۂ کلام پیش کرتا ہوں ۔ لکھنؤ میں ان کے علاوہ بھی متعدد نوجوان شاعر موجود ہیں جن کے افکار ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہیں ۔ مگر نہ تو سب کے کلام محدود وقت میں حاصل کر سکتا تھا اور نہ ایک مضمون کے اندر سب کے تذکرے کی گنجائش تھی اس لئے ان نوجوانوں کا ذکر نہیں ہو سکا ۔ انشاء اللہ آئندہ ان نوجوان شاعروں پر بھی حسب موقعہ مضمون لکھوں گا ۔ اس کا مجھے ابھی سے خیال ہے ۔ فی الحال لکھنؤ کی موجودہ غزل کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے ان پندرہ شعرا کے کلام کے نمونے پیش کر دینا کافی ہوگا ۔ یہ نمونۂ کلام انفرادی تعارف کے لئے نہیں پیش کئے جا رہے ہیں بلکہ ان کے مطالعہ سے بحیثیت مجموعی جو تاثر قائم ہوتا ہے اس پر زور دینا مقصود ہے ۔

جب ہم لکھنؤ کے ان نوجوان شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو چند باتیں خاص طور پر محسوس ہوتی ہیں مثلاً لکھنؤ کی غزل سے لحد و تربت کے یاس پرورانہ تصورات رقیب و غماز کے فرسودہ تخیلات اور ہجر و وصل کے پیش پا افتادہ تذکرے یکلخت ترک کئے جا چکے ہیں ۔ اب لکھنؤ کی غزل میں انسانی نفسیات کی پائیدار قدروں کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی بے چینیوں اور سماجی کشمکشوں کی جھلک بھی ملتی ہے ۔ قومیت کے ترانوں وطنیت کے نغموں کی دھیمی دھیمی صدائیں بھی سنائی دیتی ہیں اور انسانیت کی عالمگیر فریادوں کی لہریں بھی متحرک پائی جاتی ہیں ۔ آپ لکھنؤ کے ان نوجوان شاعروں کی غزلیں سنیں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ یہ لوگ اپنے ماحول اور اپنے زمانے پر نظر رکھتے ہیں، غور و فکر سے کام لیتے ہیں، انفرادی و اجتماعی حالات سے اثر قبول کرتے ہیں مگر اپنے میں یاسیت نہیں پیدا ہونے دیتے بلکہ خود بھی رجائیت پسند ہیں اور دوسروں کو بھی رجائیت پسندی کا پیغام دیتے ہیں ۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں زندگی کی تڑپ اور عصریت کی روح ہوتی ہے ۔ ان نوجوان شاعروں میں سے اکثر و بیشتر محنت کش طبقہ سے اور بعض اوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے یہاں روان عصری مسایل پر احساس کی بڑی شدت ہے مگر وہ لکھنؤ کی شعری تربیت گاہ میں تربیت پا چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ غزل کیا ہے اس لئے وہ غزل کہتے وقت غزل کے مزاج کو باقی رکھتے ہیں اور اس کے حدود میں رہتے ہوئے مختلف مسائل پر اظہار رائے کرتے ہیں ۔ وہ صحیح معنوں میں ترقی پسند ہیں ۔ البتہ نہ ان کی پیشانی پر ترقی پسندی کا لیبل لگا ہے اور نہ وہ اپنے کلام کو پروپیگنڈہ لٹریچر ہونے دیتے ہیں ۔

ان پندرہ شعرا میں سے چند اپنی عمر کے اعتبار سے دوسرے نوجوان شعرا سے بڑے یعنی نسبتاً سن رسیدہ ہیں مگر ان کی شاعری روبہ ترقی ہے اور ان کے ذہن پر بڑھاپا طاری نہیں ہوا ہے ۔ نیز ان کے متعلق جرائد میں بہت کم لکھا گیا ہے اس لئے ہم نے ان کو بھی اس نوجوان طبقہ میں شامل کیا ہے ۔ ہم نے جس خلوص نیت سے یہ انتخاب کیا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں پوری امید ہے کہ ہماری یہ پیش کش موجودہ ادب اردو کے لئے مفید اور اہل ذوق کے لئے دلچسپ و لطف افزا ثابت ہوگی ہم نے ناموں کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے ۔ آئیے اب ہم ان کو آپ سے ملائیں ۔

اختر لکھنوی

مرزا سجاد علی خاں اختر بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی لکھنؤ کے قدیم شاہی گھرانے سے ہیں ۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلکتہ اور دوسری جگہ کے صیغۂ تعلیمات میں مختلف عہدوں پر رہے اور اب ایک عرصہ سے

گورنمنٹ ماڈل منٹو سوری اسکول رام پور کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ مرزا سجّاد علی خاں بچوں کی تعلیم کے ماہر خصوصی تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کی سرکردگی میں رام پور کا یہ اسکول ملک کا ایک مثالی اور معیاری اسکول ہوگیا ہے۔ وہ بڑے عملی انسان ہیں مگر قدیم لکھنوی تمدن کی آغوش کے تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے شعر و ادب سے بھی خلقی لگاؤ رکھتے ہیں۔ زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں جو بہت پرزور اور بڑی آب و تاب کی ہوتی ہیں۔ خیالات میں بلندی اور تازگی ہوتی ہے۔ انداز بیان اچھوتا اختیار کرتے ہیں۔ ان کی یہی بلندیٔ فکر اور ندرت بیان ان کی غزل میں بھی موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

محبت ماورائے امتحاں

تری گردش عبث اے آسماں ہے — محبت ماورائے امتحاں ہے

راہ و منزل

مری راہیں سطورِ عزمِ پیہم — مری منزل حدیث کارواں ہے

امید ہی امید

اسی امید پہ دن کٹ رہے ہیں — قفس سے دو قدم پر آشیاں ہے

بارِ خاطر نہیں اصلا مجھے کانٹوں کی روش — آبلے دیں گے گواہی کہ سبک گام ہوں میں

قوت ارادی کی کارفرمائی

مجھ کو گر کشمکشِ ضبط کا یارا ہو جائے — موجِ گرداب سے کہہ دوں تو کنارہ ہو جائے

ہر ایک سے محبت

ہم نے یہ سوچ کے کانٹوں سے نباہی آخر — خارِ دامن سے جو الجھے تو ہمارا ہو جائے

توضیح عشق و ابہام حسن

عشق توضیح محبت پہ تلا بیٹھا ہے — حسن ہر بات میں مبہم ہے خدا خیر کرے

خطرے میں بھی جمالیاتی پہلو

کل جو کوندی تھی تو کھڑکے تھے چمن کے پتے — آج تو تابش پیہم ہے خدا خیر کرے

افسر لکھنوی

سید نواب افسر لکھنو کے ایک قدیم معزز گھرانے کی بہت ہی سنجیدہ و فہمیدہ، لائق و فائق ہستی ہیں۔ فن پر استادانہ دسترس رکھتے ہیں، ادبی سرگرمیوں میں زندگی بسر کی۔ انجمن معین الادب وغیرہ کے عہدہ دار رہے اور بڑے بڑے ادبی اجتماعات اور مشاعروں میں قابل لحاظ حصہ لیا۔ نثر کی تحریر میں بھی ادبیت ہوتی ہے اور شعر کا معیار تو نمایاں طور پر بلند ہوتا ہے۔ صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ کتابوں کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ امین آباد میں شائننگ بکڈپو کے نام سے ان کی دوکان بہت زمانہ سے قائم ہے جس میں زیادہ تر اسکول کالج کی درسی کتابیں بکتی ہیں۔ دوکان پر ملازمین کے علاوہ خود بھی بیٹھتے ہیں۔ اور گاہکوں سے بڑی شائستگی و شیریں کلامی سے پیش آتے ہیں جو ان کے اعلیٰ تمدن و تہذیب کا ثبوت ہے۔

شعر میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور ستھرے انداز بیان کے ساتھ ساتھ بلند مضامین حسن و خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ طبعاً خاموش اور متین ہیں۔ شہرت عام کی ذرا بھر خواہش نہیں رکھتے اس لئے ان کا کلام جس قدر معروف و مشہور ہونا چاہئے اتنا ابھی نہیں ہے۔ یقین ہے کہ ایک دن ان کے کلام کی بلند حیثیت ہر ادبی حلقہ میں مسلم ہو کر رہے گی۔ ان کے چند شعر سنئے۔

ہر قدم پر ایک نیا رہزن

ہر قدم پر کارواں کو اک نیا رہزن ملا — اور ہر رہزن امیر کارواں بنتا گیا

عزم قوت عمل بڑھاتا ہے

ہے شرط عزم کی جب عزم دل بڑھاتا ہے — تو آندھیوں میں نشیمن بنایا جاتا ہے

بہار پر تنقیدی نظر

بہار کا تو زمانہ ضرور ہے لیکن — یہ دیکھئے کوئی غنچہ بھی مسکراتا ہے

اتحاد خطروں کو دور کر دیتا ہے

راستے سے موت کے خطروں کو ہٹ جانا پڑا — زندگی جب زندگی سے آشنا ہونے لگی

امید ساز و برگ زندگی

اک خلش امید کی رہتی ہے مایوسی میں بھی — اس خلش کو ساز و برگ زندگی کہتے ہیں ہم

دورِ تازہ دورِ گزشتہ سے بہتر ہے اگرچہ ہنوز حسب معیار نہیں

نمودِ صبح سے شب کی وہ تیرگی تو گئی — یہ اور بات کہ سورج میں روشنی کم ہے

اسیر دام یا اسیرِ غلط فہمی

یہ عالم تھا کہ جیسے کامیابِ مدعا کوئی — تہہِ دام آنے والا آہ کتنا بے خبر آیا

مصیبتوں سے قوت عمل میں اضافہ

جلا کر بجلیوں نے وسعتِ جہدِ عمل بخشی — کیا تھا کم نگاہی نے اسیر آشیاں ہم کو

کائنات کا ذرہ ذرہ بمنزلۂ دیر و حرم

جھک گئی خود بخود جبیں دردل سے ابھرا آستاں　　ایسی بھی منزلیں ملیں دیر و حرم کے درمیاں

جمود و بے حسی پر ملامت

جہد بقا کی منزلیں اور جمود بے حسی　　بھاگ رہی ہے زندگی ٹھہرا ہوا ہے کارواں

دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنا غلط ہے

طوفاں کا بچا دیں بھی طوفاں ہیں ڈھونڈھئے　　ساحل کہاں ہے چھوڑ دیئے ساحل کی آرزو

امین سلونوی

امین احمد امین قصبہ سلون ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے آئے اور یہاں صحافتی زندگی اختیار کی۔ رسالہ "نظر" لکھنؤ کے کئی سال تک مدیر رہے اور "ہمدم" اودھ اخبار" کے صیغۂ ادارت میں دو سال تک کام کرتے رہے۔ وہ ہفتہ وار "سرپنچ" کے بھی عرصہ تک مدیر رہے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں اردو کی ایک خبر رساں ایجنسی انڈیپنڈنٹ نیوز سروس کے نام سے قائم کی جو آج تک ترقی پذیر حالت میں ہے۔ امین نے شروع ہی سے لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور ادبی جلسوں، مشاعروں میں پیش پیش رہے۔ بہار مرحوم کے بعد قابلہ لکھنوی اور امین سلونوی ہی نے شعر کی ادبی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ امین نے اردو شعر و ادب کی خدمت اس درجہ کی کہ اب بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اردو کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ امین سلونوی نو عمری ہی سے شعر کہتے ہیں اور عبدالباری آسی مرحوم کے قدیم ترین شاگردوں میں ہیں۔ انھوں نے غزل کو "سخن با معشوق گفتند" کے بجائے "سخن بہ دنیا گفتند" اس وقت بنایا جبکہ بہت کم لوگوں نے اس قسم کا دلیرانہ اقدام کیا تھا۔ امین سلونوی کے کلام میں عصریت نمایاں ہے اور ان کی شاعری کا پس منظر زیادہ تر ملکی حالات ہیں۔ شعر میں مغز ہوتا ہے اور زبان بہرحال غزل ہی کی ہوتی ہے۔ چند شعر سنئے۔

دنیا کی خوشی کے لئے زندگی

سہیں گے جورِ زمانہ خود آگہی کے لئے　　جئیں گے اور ابھی دنیا تری خوشی کے لئے

زندگی کی دعا مانگنے والے

جو ہست و بود کے اسرار سے نہیں واقف　　وہ مانگتے ہیں دعا اپنی زندگی کے لئے

خاموش انقلاب

بہار اور یہ خاموش انقلابِ چمن　　اداس غنچے ترستے ہیں اک ہنسی کے لئے

موسم گل کو چیلنج

یوں تو تقدیرِ جنوں بے سر و سامان ہے ابھی　　آئے تو موسمِ گل ایک گریبان ہے ابھی

محبت کی بادشاہی

محبت کر رہی ہے بادشاہی　　مودب ہے غرورِ کج کلاہی

اہلِ تباہی نفسِ مطمئن

ادھر کچھ مضطرب ہیں اہلِ ساحل　　یہاں ہیں مطمئن اہلِ تباہی

ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح

ہجومِ برقِ بلا سے بچا نہ لے دامن　　چمن کی خیر منا آشیاں تلاش نہ کر

اہلِ غرض کے درمیان رہ کر بے غرض

زمانہ ہے ہوئے ہم آشنا ناآشنا ہو کر　　رہے اہلِ غرض میں بھی دلِ بے مدعا ہو کر

گناہ کی قیمت

مجبور تھا میں جرمِ وفا کے لئے امین　　مجھ سے مرے گناہ کی قیمت نہ پوچھئے

بربادی کے بعد بھی دنیا کی آرزو

مجھ کو برباد کر چکی دنیا　　مجھ کو دنیا کی آرزو ہے ابھی

طاقتِ برداشت

اس کو کہتے ہیں طاقتِ برداشت　　چپ ہوں اور تابِ گفتگو ہے ابھی

ذکی لکھنوی

منے آغا ذکی لکھنوی پہلے فٹ بال کے کھلاڑی تھے بعد میں شعر کہنے لگے اور آرزو لکھنوی مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ بڑے زندہ دل، بے تکلف اور احباب نواز ہیں مگر طبیعت میں آن بان بھی بہت ہے۔ اگر مشاعرہ میں کوئی بات خلافِ مزاج ہو جاتی ہے تو ناگواری کا مظاہرہ ضرور کر دیتے ہیں۔ ان کی فطرت آزاد کسی محل پر نہیں رکتی۔ وقف حسین آباد کے دفتر میں ملازمت کرتے ہیں اور فرائضِ منصبی سے جو وقت بچتا ہے وہ شعر گوئی اور شعر خوانی میں صرف ہوتا ہے۔ زبان کا لطف لئے ہوئے ہلکے پھلکے شعر کہتے ہیں جن میں مزا اور کیف ہوتا ہے۔ مشاعروں میں اصرار سے بلائے جاتے ہیں اور کلام بہت پسند کیا جاتا ہے۔ چند شعر ان کے پیش ہیں:

ہجر کی رات ختم ہونے کا افسوس

ہجر کی رات ختم ہو کے رہی　　جس کا ڈر تھا وہ بات ہو کے رہی

حاصلِ کائنات محبت

یہ محبت جو آپ نے بخشی　　حاصلِ کائنات ہو کے رہی

شغلِ گلکاری کے تیور

گریبان و دامن کو بھی دیکھ لینگے　　ابھی شغلِ گلکاری آستین ہے

بجلیوں سے محبت

تنکا تنکا مرے نشیمن کا　　بجلیوں پر نثار ہو کے رہا

زینتِ کارواں

زینتِ کارواں راہِ وفا　　ایک مشتِ غبار ہو کے رہا

زمانہ مرعوب ہو گیا

ترے در کی جستجو تھی نہ پڑی اسی سے ہمت　　کئی مرتبہ بڑھا تھا مجھے روکنے زمانہ

باغبان کا کھیل

اسیرِ رنگ و بو ہم کو بنا کر صحنِ گلشن میں　　ہمارے بال و پر سے کھیلتا ہے باغباں اب تک

قربانی کی حوصلہ مندانہ پیشکش

چمکتے برقِ باراں کی نہ گھبرائیں چمن والے　　کہ باقی ہے گلستاں میں ہمارا آشیاں اب تک

سالک لکھنوی

سالک لکھنوی بہت بڑے عالم و خطیب شمس العلما مولانا سید سبط حسن صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ادبیت ان کو ورثہ میں ملی ہے۔ شاعری فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جس محفل میں قصیدہ پڑھتے ہیں اس محفل کو لوٹ لیتے ہیں۔ جس مشاعرہ میں غزل سناتے ہیں اس مشاعرہ میں ممتاز و نمایاں رہتے ہیں۔ بہت پُر گو اور خوش فکر ہیں۔ کلام میں رنگینی اور بیان میں جاذبیت ہوتی ہیں۔ بے شمار شعر کہے ہیں اور خوب خوب کہے ہیں۔ معیارِ کلام بلند ہے اور غزل کی زبان میں گوناگوں مطالب ادا کر جاتے ہیں۔ لکھنؤ کے بہت سے نوجوان شاعر ہوٹلوں میں ملتے ہیں ان میں سالک شاید سب سے زیادہ ہوٹل کی نشست کے عادی ہیں جہاں ان کے قدردان اور شاگرد انھیں گھیرتے رہتے ہیں۔ چائے اور سگریٹ کا مشغلہ جاری رہتا ہے اور شعر و ادب کی باتیں ہوتی رہتی ہیں ان کے چند اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہو جیے۔

سینۂ طوفاں کو چاک کر دیا۔

تنہا ساحل ہی نہیں سینۂ طوفاں بھی ہے چاک　　بن کے نشتر کہیں ڈوبا کہیں اُبھرا ہوں میں

مرد اولوالعزم اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کہیں نہیں جھکتا۔

ہر قدم چاہتی تھی اڑ کے چھوئے گردِ مراد　　اور دامن کو سمیٹے ہوئے گزرا ہوں میں

قومی تحفظ اور دفاع کے لئے کچھ سخت جاں بنائے قوم کا وجود بھی ضروری ہے

نام ہی سے ہے خلش اہلِ چمن کو ورنہ　　پھول میں جس کی حفاظت میں وہ کانٹا ہوں میں

ساغر کی کھنک میں رند کے لئے والہانہ کشش

کھنک جاتے ہیں جب ساغر تو پہروں کان بجتے ہیں　　ارے توبہ بڑی توبہ شکن آواز ہوتی ہے

مجبوروں کو شکستہ خوردگی دور کرنے کی ترغیب

سرنگوں ہو کر نہ بیٹھ اے نو گرفتارِ قفس　　کچھ نہ کچھ تو مشورہ کر فطرتِ آزاد سے

اسیری اس بات کا ثبوت ہے کہ اسیر میں قوتِ پرواز موجود ہے

نہیں پڑتی کمند اس پر جسے اڑنا نہیں آتا　　اسیری خود رہینِ منتِ پرواز ہوتی ہے

اہلِ محبت یا فنکار کے اٹھ جانے کے بعد اس کی قدر

آج سنتا ہے عالم میں تو ہے میری تلاش　　کل اسی دنیا کو شکوہ تھا مری فریاد سے

جوانی یا گھنگھور گھٹا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے جوانی کی سرگزشت　　گھنگھور اک گھٹا تھی جو آئی نکل گئی

ذمہ داروں کی غفلت اور بے پروائی

نسیمِ صبح یہ احساس باغباں کو کہاں　　چمن سے دور کہیں بوئے گل پریشاں ہے

بلندیٔ خیال اور لطفِ زبان کا امتزاج

کیوں کسی اور طرف رُخ کرے سیلابِ بلا　　میری کشتی کو ضرورت بھی ہے طوفانوں کی

بزمِ نشاط و کیف کا یادگار موقع

جا بجا صحنِ گلستاں میں سحر کو ساقی　　مئے پڑی ملتی ہے چھلکے ہوئے پیمانوں کی

ناخدا کون ہے اس کی تشریح نہ کرنے ہی میں خیریت ہے

ڈوبنے والے سفینوں کی نظر پڑی گئی　　ناخدا چھپ نہ سکا آڑ میں طوفانوں کی

سرورش طباطبائی

سرورش عسکری طباطبائی گریجویٹ اور سینیر گورنمنٹ آڈیٹر ہیں۔ نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے عزیز ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے شعر کہتے ہیں۔ شاعری کا ملکہ اور سلیقہ خدا داد ہے ابھی نوجوان ہیں۔ مگر کلام میں ندرت و اثر کے ساتھ ساتھ بڑی پختگی ہے۔ زیادہ تر رومانی شاعری کرتے ہیں۔ ان کی جمالیاتی نظمیں اور عشقیہ غزلیں خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے کلام میں خاصا تفکر ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی لطافت

کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار سے ذوقِ سلیم محظوظ ہوتا ہے اور ادبی پیاس بجھتی ہے۔ چند اشعار آپ بھی سنئے۔

مسلسل جہد البقا

ایک اک انجام ہے بنیادِ صد آغازِ نو — کشمکش سے زندگی کی کوئی چھٹ جائیگے کیا

غور و فکر کی عادت

ہم ہیں اور وابستگیٔ زلفِ احساس و خیال — اپنے ہی دام بلا سے آپ گھبرائینگے کیا

نبردِ حیات

اجل سے زیست کو دست و گریباں کر دیا ہم نے — سفینے کو حریفِ موجِ طوفاں کر دیا ہم نے

عوام کی قربانی سے خواص کی زینت

بنایا خونِ دل کو شوخیٔ رنگِ تہہ عارض — نظر کو طرۂ گیسوئے تاباں کر دیا ہم نے

اہلِ سرمایہ کو غریبوں کی خدمت پر مجبور کیا جانا

ضیائے عشرتِ صبحِ چمن تھے تم قیامت کی — کہ تم کو رونقِ شامِ غریباں کر دیا ہم نے

دبے کچلے عوام کو بیدار اور سرگرمِ عمل کرنا

جو تہہ آسودہ و نا آشنائے لذتِ رم تھیں — وہیں ڈوبی ہوئی موجوں کو طوفاں کر دیا ہم نے

عدمِ تشدد اور حق و ایثار کی طاقت کا انقلاب انگیز اثر

مزاجِ دہر بدلا جبر کی فطرت بدل ڈالی — ہواؤں کو چراغوں کا نگہباں کر دیا ہم نے

علم، انصاف و خوشحالی پھیلانے کی کوشش

سوادِ جہل، ظلماتِ ستم، شامِ سیہ بختی — جہاں بھی تیرگی دیکھی چراغاں کر دیا ہم نے

بے حسی اجل کی مترادف ہے

یہ بے حسی تو مترادف اجل کی ہے یا رب — سکونِ دل نہ سہی ذوقِ اضطراب تو دے

بعض ہستیاں اپنے زورِ علم و عمل کی بدولت اپنے زمانے سے آگے نکل جاتی ہیں

تھک گئے شوق کی وادی میں تگ و دو کرتے — شہپرِ وقت، مرے بازوِ پرواز کے ساتھ

رفیقِ کار کی اعانت یا تائیدِ غیب

روحِ کونین سے آتی ہے صدائے لبیک — کس نے آواز ملائی مری آواز کے ساتھ

روٹھی ہوئی آواز کی بے اثری

سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا — اب پکارا کرو روٹھی ہوئی آواز کے ساتھ

شارب لکھنوی

شارب لکھنوی فنِ طب بھی حاصل کر رہے ہیں اور وکٹوریہ اسٹریٹ پر دواؤں کی دکان بھی رکھتے ہیں اپنے چھوٹے سے کاروبار کے سلسلے میں نہ صرف سارے شہر لکھنؤ بلکہ کانپور اور دوسرے شہروں کا بھی چکر لگاتے رہتے ہیں — آپ انھیں ہمیشہ جہد البقا میں سرگرم پائینگے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری ہے۔ نظم، غزل، قصیدہ سبھی کچھ کہتے ہیں۔ مشاعروں میں مقاصدوں میں برابر مدعو کئے جاتے ہیں شعر پڑھتے ہیں اور کامیاب پلٹتے ہیں ان کے تیر کبھی خالی نہیں جاتے۔ گو ما رنگ، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، زمانہ ذرا فراغت دیتا تو صورت دلکش و مرعوب کن ہوتی۔ مگر اس پر تو گردِ افکار کی تہیں جمی رہتی ہیں۔ کوئی دوسرا کم ہمت ہوتا تو تھک کر بیٹھ جاتا۔ مگر شارب ہر حال میں آگے بڑھتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کلام سنئے۔ کتنی تازگی، کیسی رعنائی اور کس قدر امنگ ہے۔

بلند حوصلگی کے تیور

یا کامیاب ہو کے زمانے کو جیت لو — یا اس طرح مٹو کہ کہیں پر نشاں نہ ہو

راہ میں ہر کوئی مخل رکتے نہیں ہیں اہلِ دل — ملتے رہیں گے راہزن چلتے رہینگے کارواں

یادِ خدا کے متعلق تنقیدی تاثر

صبح ال کے ہمیں سمجھائیں تو کیا، دنیا کی صدائیں آئیں تو کیا

اس کی تو صدا آتی ہی نہیں ہم جس کو پکارا کرتے ہیں

انسان کا جذبۂ تعمیر نا قابلِ فنا ہے

سونا نہ ہوگا گلستاں ہمتِ دل ہے جواں — گرتی رہیں گی بجلیاں بنتے رہینگے آشیاں

نہ صرف غم بلکہ خوشی بھی امتحاں کی حیثیت رکھتی ہے

غم ملے یا خوشی ملے جیسی بھی زندگی ملے — وہ بھی ہمارا امتحاں یہ بھی ہمارا امتحاں

اپنے ارادہ پر اعتماد

ارادہ خود بنا لیتا ہے منزل — میں کیوں پوچھوں مری منزل کہاں ہے

انوکھی آزادیٔ تقریر

سی کے لب دے گئی آزادیٔ تقدیر مجھے — یعنی اک اور پہنا گئی زنجیر مجھے

مصنف اور دفاع

کاش اس وقت بھی دنیا مرے ہمراہ چلے — جب قلم رکھ کے اٹھانا پڑے شمشیر مجھے

اس شعر میں شاعر نے "اٹھانا پڑے" کہہ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کے یہاں جنگ کا تصور صرف دفاعی نوعیت سے ہے لہٰذا اس شعر کے متعلق یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں جنگ کی ترغیب دی گئی ہے۔ شاعر تمام تر امن و امان کا حامی ہے مگر حقیقی امن و صلح چاہتا ہے، امن و صلح کے نام سے

جنگ کے جو بیج بوئے جا رہے ہیں وہ ان کا سختی سے مخالف ہے۔ شارب کے ذیل کے اشعار سے ان کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔

سائنس کی ترقی کے باوجود امن سوزی

ہم دنیا کی آگ بجھانے کا ٹھ کے سے آئے ہیں مندر   لیکن یہ خود بھول گئے ہیں آگ لگی ہے گھر کے اندر

تاج بھی ہم چھین لیتے ہیں ایسے باغی ایسے خود سر   سجدے بھی کرتے جاتے ہیں یا دولت کی چوکھٹ پہ

اس عالم میں کشتی دنیا امن کا ساحل پائیگی کیونکر   ہونٹوں پر ہے ساحل ساحل لاکھوں طوفاں دل کے اندر

پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی پھر لاکھوں نے انکھیں حالی   جو دنیا کے کام نہ آئیں ان پھولوں سے خار ہیں بہتر

علما رسوؤں کا پہچاننا مشکل ہے

ایسا چڑھا ہے مکر کا پانی مشکل ہے ذہنوں کی نورانی   یہ بھی سمجھنا اب مشکل ہے کون ہے رہزن کون ہے رہبر

عمر انصاری لکھنوی

عمر انصاری لکھنؤ کے قدیم باشندے ہیں۔ انھوں نے کاروباری ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ بزرگوں کا رجحان بھی تھا کہ تھوڑا پڑھ کر تجارت میں لگ جائیں مگر عمر انصاری کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی خواہش کے مطابق لکھنؤ یونیورسٹی سے بی لے اور (اردو فارسی میں) بی لے آنرز کی اسناد حاصل کیں۔ عمر انصاری کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ کتب و رسائل میں اشعار بڑی دلچسپی سے پڑھتے اور خود بھی شعر کہنے کی کوشش کرتے۔ رفتہ رفتہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اُجاگر ہوتی گئیں اور طبیعت کی ایک خاص لطافت اور مضامین کے تنوع سے تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شاعری کو قبول عام حاصل ہونے لگا۔ سب سے پہلے عزیز لکھنوی مرحوم کے ایک شاگرد رشید لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے۔ رشید لکھنوی کے قبل از وقت انتقال پر خود عزیز لکھنوی سے استفادۂ سخن کرنے لگے۔ عزیز لکھنوی کے بعد عبدالباری آسی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ چنانچہ آسی ہی کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عمر انصاری کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف لکھنؤ اور نواح لکھنؤ بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں انھیں نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بلایا جاتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ عرصہ سے بہ سلسلۂ کاروبار وہ بمبئی میں مقیم ہیں اور وہاں ایشین پکچرز کے پروپرائٹر اور متعدد فلموں کے پروڈیوسر ہیں۔ اپنی ان تجارتی مشغولیتوں کی بنا پر انھوں نے مشاعروں کی شرکت کم کر دی ہے۔ وہ آج بھی لکھنؤ کی مرکزی انجمن فردوس ادب کے نائب صدر ہیں۔ عمر انصاری کو صحافت نگاری سے بھی خاصا شغف رہا اور انھوں نے متعدد جرائد کی ادارت بھی کی۔ وہ ایک نکتہ سنج ادیب اور واقف فن شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں بھی اہمیت رکھتی ہیں اور غزلیں بھی۔ کلام میں پختگی اور خیال و بیان کی گوناگوں خوبیاں ہوتی ہیں۔ انھوں نے بہت سے نام نہاد ترقی پسند شاعروں سے کہیں پہلے عصری مسائل پر اپنے اشعار میں تاثرات پیش کرنا شروع کر دئے تھے مگر کلام کا شعری معیار کبھی گرنے نہیں دیا۔ خاص کر غزل کو حدود غزل کے اندر باقی رکھتے ہوئے اس کے دامن مفاہیم میں وسعت پیدا کی۔ ان کی ٹھوس ادبی خدمات آج کی شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

محبّت کی نشو و نما

وہ محبت جو نشاطِ دل و جاں ہوتی ہے   کھیل کر آگ کے شعلوں میں جواں ہوتی ہے

دنیا کا نظام بہتر ہونے کی علامت

ہاں اسی طرح بگڑتا ہے زمانہ کا نظام   جب سنورنے پہ کبھی زلفِ جہاں ہوتی ہے

نبرد حیات سے جان بچانا کیسا

بلاتی ہیں موجیں کہ طوفاں سے کھیلو   کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

ذہنی ارتقا جاری ہے اور انٹیلیجنسیا مستقبل کے خاکے تیار کر رہی ہے۔

عروج انگڑائی لے رہا ہے زوال راہ میں ڈال رہا ہے   خیال آگے پہنچ چکا ہے نگاہ دنیا بدل رہی ہے

آغوش طوفان میں موج سکون

سمجھ رہا ہے جہان دور سے جسے طوفاں   اسی کے گود میں سوئی ہوئی ہے موج سکوں

فرائض زندگی کا احساس

تمام عمر اس اک خیال میں گزری   کہ زندگی کے فرائض سے زندگی کم ہے

دائمی مسرت کی فطری آرزو

خوشی کی ایک تجلی بھی دائمی نہ ہوئی   تڑپ تڑپ کے رہی برق روشنی نہ ہوئی

حیاتِ جاوداں کا راز ذوقِ عمل میں ہے

کوئی ذوقِ عمل پیدا تو کر لے زندگانی میں   حیاتِ جاوداں بھی ہے اسی دنیائے فانی میں

ظاہری خطروں سے ڈرنا غلط ہے

بڑا دھوکا دیا ہم کو گلستاں کی ہواؤں نے   بنا لیتے تو بنا لیتے ہم اپنا آشیاں اب تک

زمانے کی تنگ دلی

زمانہ ہے کہ مجھ کو لائقِ تعزیر کہتا ہے — خطا میری بس اتنی ہے کہ جینا چاہتا ہوں میں

مقابلے کا حوصلہ

راہ خود بڑھ کے بتاتی ہے نشانِ منزل — چلنے والا بھی تو ہو گردشِ ایام کے ساتھ

سائنس دانوں کی تباہ کن قوتِ ایجاد پر تنقید

چند ناداں کہ جنھیں اہلِ خرد کہتے ہیں — انھیں دیوانوں نے دیوانہ بنا رکھا ہے

نادر تشبیہہ

یوں سہکتا ہوا اس بزم میں جا پہنچا ہوں — جیسے مے پی کے کوئی خلد میں داخل ہو جائے

اچھوتا استعارہ

یادگارِ شبِ مہتاب و شبِ جلوۂ دوست — اک چراغ آج بھی پلکوں پہ جلا رکھا ہے

والہانہ محبت

جوابِ تیرے تبسم کا اور کیا دوں میں — مرا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

عمل کے لئے خلوص شرط ہے

سجدہ ہو بے خلوص تو سجدہ بھی ہے گناہ — لغزش میں ہو خلوص تو لغزش نماز ہے

مستقبل سے امید

چند افسردہ سی کلیوں کو لئے دامن میں — راستہ دیکھ رہا ہوں میں بہار آنے کا

فیروز نظامی

فیروز نظامی کا آبائی وطن بریلی ہے مگر یہ نو عمری ہی سے لکھنؤ میں رہے اور اب بھی سرزمینِ شعر و ادب ان کا وطن ہے۔ صدر بازار میں گھڑیوں کی دوکان ہے۔ پیشے کے اعتبار سے تاجر ہیں مگر ذہن و دماغ ذوق و رجحان کے لحاظ سے شاعر اور صرف شاعر ہیں۔ ادبی سرگرمیوں میں وقت گزرتا ہے۔ آج کل بھی انجمن فردوسِ ادب کے شعبۂ نظم کے سکریٹری ہیں۔ عبدالباری آسی مرحوم کی زندگی میں ان سے اصلاح لیتے تھے۔ چنانچہ انھیں کے حلقۂ تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مگر نظم گوئی کا ذوق بڑھ جانے کی وجہ سے جوش ملیح آبادی کے ساتھ ان کی عقیدت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور اب جوش ملیح آبادی سے رجوع کررہے ہیں۔ فیروز ایک بلند خیال و نغز گو شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کا پایہ اونچا ہے۔ ان کے قطعات و رباعیات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ فیروز غزلیں خوب کہتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں تازگیٔ فکر بھی ہوتی ہے اور بلندیٔ نظر بھی۔ چند شعر نمونتاً پیش ہیں:-

بہار بھی امتحان کی حیثیت رکھتی ہے

ہے آمدِ بہار بھی فصلِ خزاں کے بعد — اک امتحان اور ہے اس امتحاں کے بعد

راہِ وفا میں قربانی کا اثر زبردست طاقت بن کر قائم رہتا ہے

وفا تو مٹ گئی لیکن وفا کا نام باقی ہے — یہ اک طاقت حریفِ گردشِ ایام باقی ہے

شدتِ غم سے جنوں اور جنوں میں سلب گریہ

جنوں میں اشک فشانی نے ساتھ چھوڑ دیا — لگی جو آگ تو پانی نے ساتھ چھوڑ دیا

جنوں کے کارِ خیر

وہ کارِ خیر ہوئے ہیں مرے جنوں سے کہ آج — خرد کے رخ پہ پسینہ سا آیا جاتا ہے

غمِ سود و زیاں سے دور رہنے کی برکت

گزرا جو اک نفس غمِ سود و زیاں سے دور — اتنے میں ہم نکل گئے کون و مکاں سے دور

واعظ کی واماندگیٔ فکر و عمل

مرا غم جستجو تک، تیرا غم لفظ و بیاں تک ہے — جہاں سے ہم چلے واعظ تری منزل وہاں تک ہے

مصلحت اور ناتوانی میں فرق ہے

اے وقت امتیاز کہ ہم کشتگانِ غم — ہیں مصلحت نواز مگر ناتواں نہیں

وہ راستہ جو سیدھا ہے مگر عام نہیں

قیدِ خرقہ نہیں، پابندیٔ احرام نہیں — راستہ عشق کا سیدھا ہے مگر عام نہیں

دل کے ویرانے

یہ دنیا بارہا اجڑے تو بس جانے کا امکان ہے — مگر یارب مشیت دل کے ویرانوں کا کیا ہوگا

محاذِ جبر میں شبخوں

محاذِ جبر میں ہے آج پھر شبخوں کی تیاری — خداوندا محبت کے نگہبانوں کا کیا ہوگا

ذات پر جمہور کو ترجیح

کچھ اشک بچ رہیں گے تو پھر اے دلِ تباہ — تیرا بھی غم کروں گا غمِ دیگراں کے بعد

بہار کی حقیقت

اچھا تو کیا بہار اسی شے کا نام ہے — مشکل سے چند پھول کھلے ہیں خزاں کے بعد

قرار لکھنوی

قرار لکھنوی آرزو مرحوم کے اک شاگرد وقار مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ خود بھی آرزو سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں۔ ایک مقامی اسکول میں طلبا کو درس دینے کے بعد سارا وقت اضافۂ معلومات اور سخن طرازی کی کاوشوں میں صرف کرتے ہیں۔ خیالات میں پاکیزگی اور فکر میں بلندی ہے کلام کا معیار اونچا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بکثرت نظمیں، غزلیں، قصیدے

قطعے، رباعیاں کہی ہیں۔ اشعارِ غزل کے نمونے درج ذیل ہیں :۔

پندارِ عاشقی اور خلوصِ نیت

خلافِ پندارِ عاشقی ہے قیودِ دیر و حرم بھی سہنا — خلوصِ نیت ہے سلامت کہاں ترا سنگِ در نہیں ہے

سکون سے بے نیازی

سکون سے بے نیاز ہو جا کہ ہے حوادث میں عکسِ ساحل
کہاں یہ موجیں نہیں مقابل کہاں یہ طوفاں کا ڈر نہیں ہے

دورِ کائنات

وہ زندگی ہے عکسِ فریبِ حیات کا — جس زندگی میں درد نہیں کائنات کا

حادثات کا احترام

آغوشِ کشمکش میں سنورتی ہے زندگی — کیوں کر نہ احترام کروں حادثات کا

استقلال و اخلاص سے کردار میں اثر انگیزی پیدا ہوتی ہے

ہوائیں ان کے کہنے سے کہیں رُخ بھی بدلتی ہیں
کہ جن کی نیتیں خود وقت کے سانچے میں ڈھلتی ہیں

مصیبتوں میں کھڑے رہنے والوں کو مسرت کا حق ہے

انھیں کلیوں کو حق ہے لذتِ و لطفِ بہاراں کا — جو کلیاں ابتدائے عمر سے کانٹوں میں پلتی ہیں

طوفاں کے سر پر چلنے والی کشتیاں

اُمنگیں دل کی کیوں کر ہنس نہ دیں موجوں کی شورش پر
یہ ہیں وہ کشتیاں جو سر پہ طوفانوں کے چلتی ہیں

سکونِ طوفاں کا پیش خیمہ

یہ دریا کا وقتی سکوں کہہ رہا ہے — کوئی موج ، بھر کی طوفاں اُٹھائے

قسمت پرستی یا قدامت پرستی

وہ فرضی نام ہے فکرِ بشر کی حدِ آخر کا — بہ تقلیدِ قدامت جس کو قسمت کہتے ہیں

وقت بدل جانے کا نتیجہ

اب تو اربابِ خرد وقت بدل جانے سے — مشورے لیتے ہیں اکثر ترے دیوانے سے

محشر لکھنوی

سید محمد اصغر نام ، تخلص محشر۔ لکھنؤ کے ایک قدیم باوقار خاندان کے فرد ہیں۔ مشہور ڈرامہ نگار مہدی حسن احسن مرحوم اور منے مرزا اختر مرحوم ان کے اعزائے خاص میں سے تھے۔ منظر لکھنوی بھی محشر کے عزیز قریب ہیں جو اس وقت لکھنؤ کے اساتذہ میں ہیں اور جن کا کلام زبان کے اعتبار سے خاص طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ محشر کمسنی ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ انھوں نے مستقل طور پر کسی کی شاگردی نہیں کی۔ شروع میں کچھ کلام احسن اور منظر کو دکھایا۔ مگر بعد میں مطالعۂ کتب سے فن شاعری کے متعلق براہ راست معلومات اتنی کافی حاصل کر لیں کہ کسی کو شعر دکھانے سے بے نیاز ہو گئے۔ انھوں نے فارسی کے امتحانات دبیر کامل وغیرہ پاس کئے۔ نیز انگریزی میں انٹر میڈیٹ کیا۔ اسناد کا تذکرہ تو یونہی آ جاتا ہے ورنہ حقیقتاً انسان کے علم کی وسعت اسناد پر منحصر نہیں اور نہ اسناد سے اس کے علم کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ محشر کی علمیت بھی مولۂ بالا اسناد کے حدود سے آگے ہے۔ وہ آئی ۔ آر کالج سندیلہ میں نو سال سے لیکچرر ہیں۔ سندیلہ محض ایک قصبہ ہے جس میں مستقلاً رہنے سے محشر کو وہ شہرت نہیں حاصل ہوئی۔ جو کسی مرکزی شہر میں رہنے سے حاصل ہوتی۔ پھر بھی محشر کے کلام میں وہ لطافت وہ نفاست وہ کشش اور وہ دل پذیری ہے کہ جس کی وجہ سے اس وقت بھی محشر دُور دُور تک معروف و مشہور ہیں۔ کلام کے ساتھ ساتھ محشر کا پڑھنا بھی بہت دل کش ہے۔ با فہم و صاحبِ ذوق سامع ان کے اشعار سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ سناتے ہی جائیں۔ تغزل میں تنوع اور جمالیاتی رنگ پیدا کرنے میں محشر مشاق ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔

شمع کے جلنے اور روشنی دینے میں فرق

وہ زندگی جو رنج و الم دے خوشی نہ دے — اک شمع ہے کہ جلتی رہے روشنی نہ دے

بیخودی کے فرسودہ تصور سے بیزاری

میں اس کو چاہتا ہوں حدود حواس میں — اے جستجوئے دوست مجھے بیخودی نہ دے

جستجو چراغِ راہ

منزل کی ہے تلاش تو کیسے چراغ راہ — وہ جستجو ہی کیا ہے جو خود روشنی نہ دے

انسان کی منزل دنیاوی دلچسپیوں سے کہیں بلند ہے ۔

خدا جانے آیا تھا کس جستجو میں — گلستاں نے اُلجھا دیا رنگ و بُو میں

زندگی مسلسل آزمائش

ہماری زندگانی اک مسلسل آزمائش تھی — جہاں ثابت قدم دیکھا وہیں سے امتحاں بدلا

ساتھیوں کی تنگ نظری

چمن والے کچھ ایسا امتیازی فخر کرتے ہیں — کہ جیسے فرق انہیں کے خون سے رنگِ گلستاں بدلا

بجلیوں سے آشیاں کی تبدیلی

قفس سے آشیاں تبدیل کرنا بات ہی کیا تھی
ہمیں دیکھو کہ ہم نے بجلیوں سے آشیاں بدلا

عیش کے بعد تکلیف کا شکوہ کیوں

ایک سی حالت کس کی رہی ہے ایسی اُمیدیں جھوٹی ہیں
مجھ کو خزاں کا غم کیا ہو جب میں نے بہاریں لوٹی ہیں

رہبروں کی لوٹی ہوئی راہیں

رہزنوں کا شکوہ ہی کیا ہے وہ تو نمایاں رہزن ہیں
اُن راہوں کا رونا ہے جو راہبروں نے لوٹی ہیں

ترکِ وطن کر جانے والوں کی یاد

مرے ہم صفیر جن سے تھی حسین بہارِ گلشن
یہیں آشیاں بناتے تو کچھ اور بات ہوتی

غنچوں سے خزاں میں مسکرانے کی فرمائش

مرے دیدہ زیب غنچو تمہیں فصلِ گل مبارک
جو خزاں میں مسکراتے تو کچھ اور بات ہوتی

طلوعِ مہرِ نو

یہ طلوعِ مہرِ نو ہے کہ بڑھا دی درِ ظلمت
مجھے دن کی آرزو تھی شب تار کیا کروں میں

سوسائٹی کی جھوٹی پابندیاں

فریبِ دہر غالب آ چلا ہے راست گوئی پر
مری آواز بھی پابندِ محفل ہوتی جاتی ہے

معراج لکھنوی

معراج الحسن معراج مشہور و ممتاز شاعر سراج لکھنوی کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ گھر پر اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی اور انگریزی میں ہائی اسکول پاس کیا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل یوپی کے دفتر میں ملازم ہیں۔ شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے۔ پھر حصولِ فن کا خیال پیدا ہوا تو عروض کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ کتب و رسائل برابر زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔ ادبی مذاق پاکیزہ اور مطمحِ نظر بلند ہے۔ شعر اپنے دل کی اُمنگ سے کہتے ہیں۔ طبیعت میں پیداوار ہے۔ اشعار میں صحیح تغزل اور عصری تقاضوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ آئندہ کے لئے بہت کچھ توقعات اُن سے وابستہ ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

وہ تعمیر فضول ہے جس کے مقابلہ میں تخریب کا پلہ بھاری ہو

ایسی تعمیرِ تجلّی سے اندھیرے اچھے
سیکڑوں تارے فنا ہوں تو سحر ہوتی ہے

انسان کو اس کے حوصلے کے مطابق ملتا ہے

دونوں ہی مقصد ہیں اب ذوقِ نظر تیرا
یا نغمۂ عشرت ہے یا آہِ سحرگاہی

تری اپنی کوششوں پہ ہے مدارِ رنج و راحت
یہی زندگی ہے شبنم یہی زندگی شرارا

مقصد کو محدود نہ کرنا چاہئے

کیوں دیدہ و دل تیرے مجروحِ تعین ہیں
منزل کا تصور ہی منزل سے ہے گمراہی

بلانے کا حسین بہانا

یہ ایک رات کہاں تک شریکِ غم ہوگی
تم آ نہ جاؤ کہ تاروں کی زندگی کم ہے

تغزل و نفسیات کا امتزاج

دفعتاً تجھ کو جو دیکھا تو یہ دل کانپ اٹھا
میں یہ سمجھا تھا کہ میں بھول چکا ہوں تجھ کو

محبت عین زندگی

میں نے چاہا تھا کہ میں ترکِ محبت کر دوں
زندگی خود ہی محبت ہے مجھے ہوش نہ تھا

مستقبل کی اُمید

کبھی دیکھنا اُٹھے گا یہی پردۂ تبسم
ہے ضرور کوئی منزل پسِ کارواں انجم

جہدِ مسلسل ماورائے شکست بنا دیتی ہے۔

رخِ گل سے شبنم نوحہ خواں جو اُڑی تو خود ہی تھی آفتاب
وہی ماورائے شکست ہیں جو مذاقِ جہد میں ڈھل گئے

دار و رسن کی طرف سے خیر مقدم

چند نالے جو کبھی تا بہ دہن آ پہنچے
پیشوائی کو مری دار و رسن آ پہنچے

غیرتِ اربابِ جنوں کو مہمیز

توڑ دے اب تو قفس غیرتِ اربابِ جنوں
طنز کرتے ہوئے گلہائے چمن آ پہنچے

معزز لکھنوی

معزز لکھنوی مشہور غزل گو شاعر ماچس لکھنوی کے بڑے بھائی ہیں مگر بہت ہی سنجیدہ اور متین۔ احباب کی خاطر سے جوشوں میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں پھر بھی کلام کا وزن خراجِ تحسین وصول کر لیتا ہے۔ شعر سمجھ کر کہتے ہیں، اور ادبی حلقوں میں ان کا کلام پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ چند شعر سنئے۔

تعمیر پر تخریب پسندوں کا ہنگامہ

تمہیدِ حشرِ نو تھی تعمیرِ آشیاں کی
بجلی گری فلک سے فتنے اُٹھے زمیں سے

حوادث سے ٹکر

یا رب وقارِ ہمتِ انساں کی خیر ہو
بڑھتے ہیں اس طرف سے حوادث اِدھر سے ہم

معیارِ نفسِ مطمئن

دیکھ کر معیارِ نفسِ مطمئن کچھ سوچ کر
ذوق نے تخلیقِ غم میں کر لیا شامل مجھے

ڈوبنے والوں کو ساحل ملتا ہے

غم پہ بنیادِ حصولِ مدعائے شوق تھی
ڈوب کے دھارے پہ حاصل ہو گیا ساحل مجھے

مستقبل کی آواز جو ہنوز مؤثر نہیں ہوئی

آتے آتے راستہ کترا گیا حسنِ رسوخ
رہ گیا آواز دے کر میرا مستقبل مجھے

افراطِ غم بطور عنایتِ خاص

اے معز زیہ بھی تقسام ازل کی ہے عطا
غم بقدرِ ظرف سب کو اور کچھ فاضل مجھے

تنقید کی افادیت

بے ذاتیات اگر ہو کچھ تبصرہ معز ز
ہوتی ہے فکر پختہ گفتارِ نکتہ چیں سے

نہال لکھنوی

نہال لکھنوی غلام حسین کے پُل اور کشمیری محلہ کے نکڑ پر اسٹیشنری کی چھوٹی سی دوکان لئے بیٹھے رہتے ہیں اور اس دوکان میں خاموشی سے مطالعہ وشعر گوئی کا مشغلہ جاری رکھتے ہیں۔ استاد الاساتذہ حکیم جلال لکھنوی کے نواسے ہیں مگر بظاہر کوئی رعب و جلال نہیں ہے۔ نہ دنیاوی حیثیت مرعوب کن ہے نہ جسمانی حیثیت۔ مگر شعر گوئی کی قوت خدا داد ہے بہت ہی خوش فکر و خوش گو ہیں۔ غور و فکر کے عادی' زمانہ کی نبضوں کو پہچاننے والے' عصری تقاضوں کو سمجھنے والے اور آگے بڑھتے رہنے کی ضرورت تسلیم کرنے والے۔ خیال و عمل دونوں ہی میں ترقی پسند ہیں۔ مگر انتہا پسند نہیں ہیں۔ چنانچہ کلام میں بھی خوشگوار اعتدال پایا جاتا ہے۔ نظم و غزل دونوں ہی اچھی کہتے ہیں۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے

پیغامِ استقلال و ترغیبِ پائیداری

حیاتِ شبنم و عمرِ تبسمِ گل معلوم
وہ نقش بن کہ زمانہ جسے مٹا نہ سکے

سوسائٹی میں عدمِ مساوات

عجب روش ہے عجب انتظامِ گلشن ہے
کوئی تو خوب ہنسے کوئی مسکرا نہ سکے

انقلاب کی نفسیاتی علامت

تمہید ہوگی یہ بھی کسی انقلاب کی
بیگانہ پا رہے ہیں بشر کو بشر سے ہم

مذہب پرستی سے اجتناب مگر خوش اسلوبی کے ساتھ

تسلیم احترامِ زمینِ حرم مگر
منسوب کر چکے ہیں جبیں ان کے در سے ہم

انصاف و استحقاق کے خلاف امور

کیا کہا جائے اسے وقت کی خوبی کے سوا
دھوپ گلشن میں اور چھاؤں بیابانوں میں

ظلم کا عبرت انگیز ردِ عمل

بیگنا ہوں کے نشیمن کی تباہی کے بعد
بجلیاں ٹھوکریں کھائیں گی گلستانوں میں

شورشِ طوفانِ مستقبل سے کھیل

حسبِ منشا بڑھ کے دنیائے نگاہ و دل سے ہم
کھیلتے ہیں شورشِ طوفانِ مستقبل سے ہم

ایثار و قربانی کا بول بالا

آغوش میکدہ میں نہ صحنِ چمن میں ہے
وہ زندگی جو دامنِ دار و رسن میں ہے

آفتاب کی پہلی کرن اور شبنم و گل

کیونکر بتائیں شبنم و گل بے زبان ہیں
جو بات آفتاب کی پہلی کرن میں ہے

انسان باوجود ترقی کس منزل پر ہے

انسان اس ترقیٔ ذہنی کے بعد بھی
وہ آفتاب ہے جو ابھی تک گہن میں ہے

اولوالعزمی سے تکلیف جھیل لے جانے کے بعد راحت کا استحقاق

چمن انکا بہاراں کی جو ویرانوں میں رہتے ہیں
انہیں کا حق ہے ساحل پر جو طوفانوں میں رہتے ہیں

انسانیت کی آزمائش

محبت نام ہے انسانیت کی آزمائش کا
یہ وہ اونچے تخیل ہیں جو دیوانوں میں رہتے ہیں

حسنِ انسانی کا نکھار

نکھرتا ہے انہیں کے ہر عمل سے حسن انسانی
بدردِ دیگراں جو لوگ زندانوں میں رہتے ہیں

ہزار لکھنوی۔

محمد صاحب بہار لکھنو کے شعرا میں بہت مشہور و ہر دلعزیز تھے۔ انجمن "بہارِ ادب" انھیں کے نام پر قائم ہے۔ سید حسن ہزار انہیں بہار مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور بہت خوش گو شاعر ہیں۔ پہلے زخمی عابدی سے اصلاح لیتے تھے ان کے جنگ پر چلے جانے کے بعد آسی لکھنوی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ہزار اپنے معاصرین میں کافی مشہور ہیں۔ مشاعروں میں برابر مدعو کئے جاتے ہیں اور بہت کامیاب رہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سچا دوست نہیں ملتا

یا کوئی دوست زمانے میں نہیں ہے باقی
یا مجھے تجربۂ عالم ایجاد نہیں

معشوق سے انتقام مگر کیسا؟

انھیں کرنا پڑا میری وفا کا احترام آخر
اسی دنیا میں لے لیتی ہے قدرت انتقام آخر

موجِ غم یا موجِ نسیم

خندۂ گل ہے جو زخمِ جگری ہے اے دوست
موجِ غم موجِ نسیمِ سحری ہے اے دوست

فردوسِ خیالی

تیری فردوسِ خیالی ہو مبارک تجھ کو ۔۔۔ مری جنت مرے دامن کی تری ہے اے دوست

دل کی منزل

راندۂ کفر نہ منت کشِ دیں ہوتا ہے ۔۔۔ قلب آئینۂ عرفان و یقیں ہوتا ہے

برہمی میں بھی حسن

برہمی ان کی مزا دیتی ہے ہر دن مجھ کو ۔۔۔ بات جیسی بھی ہو انداز حسیں ہوتا ہے

چاند کی آغوش میں تارا

ان کے دامن پہ مرا اشک کہاں سے آیا ۔۔۔ دے دیا چاند کی آغوش میں تارا کس نے

وقت کا اداس چہرہ

پھریں گی جب تری نظریں تو حشر کیا ہوگا ۔۔۔ ابھی سے وقت کا چہرہ اداس ہے اے دوست

تقدیر پہ ہمت کو ترجیح

انقلابات سے میں کھیل رہا ہوں اب تک ۔۔۔ میری ہمت پہ نظر کر، مری تقدیر نہ دیکھ

قصور اپنا ہی ہے

نہ تو رہزن پہ نہ راہوں پہ ہنسی آتی ہے ۔۔۔ اپنی کج فہم نگاہوں پہ ہنسی آتی ہے

ذاتی مصلحتیں

خود مری مصلحتیں ہیں مجھے مانع ورنہ ۔۔۔ آج چاہوں تو ارادوں میں ثبات آ جائے

ہندوستان کا عظیم المرتبت محبِ وطن اور مدبّر

"سردار پٹیل نے ایک عظیم مدبر ہماری قوتوں کے ایک بے مثل سالار اور پارٹی کے ناظم پختہ اور شاندار منتظم اور سب سے زیادہ ہندوستان کے اتحاد اور سالمیت کے ایک معمار کی حیثیت سے جو خدمات سرانجام دیں، وہ حالیہ تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جن کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے کوئی مقام ایسا نہیں جس پر وہ پہنچے اور اسے اپنی عدیم النظیر چمک دمک سے منور نہ کیا ہو۔ سرگرمیٔ عمل کا کوئی میدان ایسا نہیں جس میں وہ پہنچے اور اسے اپنے خصوصی تعاون و امداد سے نوازا نہ ہو۔ یہ خوبیاں ایسی ہیں جو ہم سب کو عزیز اور قابلِ عزت ہیں اور ایسے کارنامے ہیں جن کے ہم ہمیشہ ممنون و شکرگزار رہیں گے۔ لیکن ان سب کے باوجود ہمیں سردار پٹیل کے انسانی قدروں کے احساس اور خوش طبعی کی عادت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ سردار پٹیل اپنی خوش مزاجی کے ذریعے سے تیرہ و تاریک ماحول کو بھی روشن بنا دیتے تھے اور ان کے مذاق کی راست بازی اور پیش بینی اکثر الجھنوں کو تلوار کی مانند صحیح طور پر اور تیزی کے ساتھ کاٹ ڈالتی تھی۔

اگرچہ سردار پٹیل بظاہر سخت معلوم ہوتے تھے لیکن اپنے پہلو میں ایک نرم اور محبت بھرا دل بھی رکھتے تھے وہ اپنے ہمدردوں اور ساتھیوں سے نہ صرف ایک رہبر دوست اور فلسفی جیسا برتاؤ اختیار کرتے بلکہ ان کے ہم پلہ ہونے کے باوجود جب موقع آ پڑتا تھا تو وہ ان کے سیوک کی حیثیت سے روزمرہ کے معمولی کام بھی سرانجام دیتے تھے ان کے متعلق اپنا ایک خیال قائم کرنے کے بعد وہ ان کے ظرف کے مطابق اپنا اعتماد اور حسن ظن بھی ان کو سونپ دیتے تھے اور اس اقدام سے ایک باہمی اعتماد اور یقین کا ایسا ماحول پیدا ہو جاتا تھا جس کے ذریعے سے ان سب کو ایک جماعت میں ڈھال لیتے تھے اور اس طرح وہ ان سے بہترین خدمات حاصل کر لیتے تھے۔ وہ کام لینے کے معاملے میں بہت سخت تھے اور ہر ایک سے باز پرس کرتے تھے خواہ کیسا ہی اعلےٰ مقام رکھتا ہو۔ ایسا کرنے میں وہ حسب ضرورت ان کی تعریف بھی کرتے اور موقع کے لحاظ سے ان کی اصلاح سرزنش بھی کرتے تھے انہیں عظیم انسانی اوصاف کی بدولت وہ ان لوگوں کی لامحدود وفاداری اور بے پناہ محبت کے مالک بن گئے تھے۔"

(مرارجی ڈیسائی)

تنویر احمد علوی

قلوپطرہ

اے عروسِ نیل اے شہزادیٔ مصرِ قدیم
اے نمودِ پاستاں اے نغمۂ سازِ کہن
اے شبستانِ شہی کی مایۂ کیف و نشاط
اے بساطِ عشرتِ ماضی کی شمعِ انجمن

وہ ترے اجداد کی تمکنت وہ شاہانہ شکوہ
تیری بزمِ ناز میں تبدیل ہو کر رہ گیا
مصریوں کا آرٹ اور یونانیوں کا فلسفہ
جامِ صہبا میں ترے تحلیل ہو کر رہ گیا

وہ ترا عہدِ حسیں وہ طنطنہ وہ رعبِ حسن
وہ ترے قدموں پہ سجدے وہ ترے در کو سلام
آدمی اور اس طرح اورنگ و افسر کا اسیر
زندگی اور اس طرح آدابِ شاہی کی غلام

وقت کے طوفان سے کرتے رہے اٹھکھیلیاں
عظمتِ اہرام کے سائے میں تیرے تخت و تاج
جن کی ٹھوکر سے ہُوا پامال شاہوں کا غرور
حسن نے تیرے لیا اُن ہاتھوں سے بھی خراج

وہ ترا جشنِ حکومت وہ ترا شاہی جلوس
فوجِ مردانِ وغا پریوں کا لشکر بن گئی
وہ حریمِ قیصری وہ خلوتیں، وہ دادِ عیش
مسندِ اسکندری پھولوں کا بستر بن گئی

گرمیٔ آغوش سے تیری کبھی سیزر کا دل
اس طرح پگھلا کہ اشکِ چشمِ حیرت بن گیا
اور کبھی انطونیو کے سینۂ سفاک میں
روح کا شعلہ تری داغِ محبت بن گیا

وہ تری نظارہ سوزی وہ تری تمثالِ ناز
محرمِ آبِ رواں کی دل کشی ملبوس میں
جس طرح شیشہ میں چھلکے مستیٔ موجِ شراب
شمع ہو جس طرح عریاں پردۂ فانوس میں

تیرے ہونٹوں کی گلابی تیری آنکھوں کا خمار
ہاں وہ مے مینا گدازی جس کا حاصل بن گئی
ایک زہریلی مگر معصوم ناگن کی طرح
تیرے بوسے کی حلاوت زہرِ قاتل بن گئی

اور وہ طرزِ محبت وہ ترا حسنِ فریب
دام میں اپنے تو خود ہی قید ہو کر رہ گئی
دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کے واسطے
تو بنی صیاد لیکن صید ہو کر رہ گئی

نیلسن

ماسکو کے پھول

پردھان منتری شری جواہرلال نہرو کا ماسکو میں بہت شاندار استقبال ہوا تھا۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال مسٹر نیلسن نے ماسکو سے آج کل کے لئے ارسال کیا ہے۔ ادارہ ان کا شکرگزار ہے۔

ماسکو سوویت یونین کی راجدھانی، دُنیا کے مزدوروں کی یاترا بھومی، صدیوں پرانے اونچے اونچے میناروں پر چمکتے ہوئے سُرخ ستاروں کی سرزمین، فلک بوس عمارتوں، فراخ سڑکوں، خوبصورت ریلوں، سرسبز و شاداب باغوں اور ٹیپ امن خوش وخرم باسیوں کا یہ شہر آج ایک بار پھر اپنی پوری اور انوکھی رعنائی کے ساتھ دل و دماغ کی گہرائی میں کچھ اس طرح اُتر گیا کہ زندگی میں پھر بھلایا نہ جا سکے گا۔

میرا قیام ماسکو میں پچھلے تین سال سے ہے۔ یہ تین سال ماسکو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان تین سالوں میں ماسکو کے رہنے والوں نے بہت سے انوکھے اور غیر معمولی واقعات کی شہادت دی ہے۔ ان تین سالوں میں جہاں انھوں نے اپنے غم اور خوشی کا نباہ کیا وہاں دوسرے ممالک کے غم اور خوشی کو بھی اپنے دل میں جگہ دی۔ غیر ملکوں میں سے جن ممالک نے یہاں کی جنتا کا دل جیتا ان میں سب سے بلند ستارہ ہندوستان کا ہے۔ ان تین سالوں میں یہاں کے باشندوں کے دلوں میں ہندوستان کی عزّت اور محبت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی اور آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو ستارہ افق پر چمک رہا تھا وہ اپنے پورے عروج پر ہے۔

تین سال پہلے کی بات ہے کہ ہندوستان کے نام اور جغرافیائی حالت سے ان کو ضرور واقفیت تھی مگر ہندوستانی صورتوں سے یہ لوگ ناآشنا تھے۔ ہماری تہذیب اور رہن سہن کے طریقوں سے بھی ان کو زیادہ واقفیت نہ تھی۔ انھیں دنوں کا ذکر ہے کہ ان کے سامنے ہندوستان کی دھندلی مگر اپنی تصویر ایک فلم کی صورت میں آئی جو یہاں کے فلم سازوں نے انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کے دنوں میں ہندوستان کے قیام میں بنائی تھی۔ فلم رنگین تھی جس نے ہندوستان کی رنگین فضا کے ساتھ ایک حد تک انصاف کیا۔ ڈاکومنیٹری فلم ہونے کے باوجود بھی یہ فلم دوسری فلموں کے مقابلے میں زیادہ مدّت تک چلتی رہی۔

انھیں دنوں ماسکو میں انٹرنیشنل والی بال مقابلہ ہُوا۔ میچوں میں حصّہ لینے کے لئے دوسرے ممالک کی ٹیموں کے ساتھ ہندوستان سے بھی دو ٹیمیں آئیں۔ دینامو سٹیڈیم کے باہر غیر ممالک کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی بھیڑ ہی بھیڑ نظر آتی تھی۔ سٹیڈیم کا آدھا حصّہ اس قدر پُر تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ غیر ممالک کی ٹیمیں اپنے اپنے جھنڈے اُٹھائے میدان میں داخل ہو رہی تھیں۔ لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کیں۔ اور پھر یکایک پورا سٹیڈیم ایک غیر معمولی جوش اور خوشی کے فلک بوس نعروں سے گونج اُٹھا۔ زوردار تالیوں کے شور میں ہندوستان کی ٹیم اپنے جھنڈے کو بلند کئے میدان میں داخل ہوئی۔

جوں جوں وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے تالیوں اور پُرجوش نعروں سے ان کا سواگت کیا جاتا تھا۔ شور ختم ہوا کھلاڑی اپنی جگہ کھڑے تھے تقریروں کے بعد اسکولوں کے معصوم بچّوں نے ہر ایک ٹیم کے کپتان کو پھولوں کے گلدستے دئے۔ آخر میں دو گلدستے بچ گئے۔ بچّے کھڑے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھے اور دونوں گلدستے ہندوستانی ٹیم کے کپتان کی طرف بڑھا دئے۔ ایک بار پھر تالیوں کے شور میں کپتان نے وہ مسکراتے ہوئے پھول لے لئے۔

یہ آج سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ان تین سالوں میں ماسکو والوں کے پھول خوشی اور محبت سے مہکتے ہوئے ہندوستانیوں کی طرف بڑھتے رہے۔

اور انھیں پھولوں کے بارے میں خواجہ احمد عباس نے ماسکو کے ہوائی اڈے پر جب وہ یہاں فلم ڈیلیگیشن کے لیڈر کی حیثیت سے آئے تھے، کہا تھا۔ "یہ محبت اور دوستی کے وہ پھول ہیں جو کبھی مرجھا نہیں سکتے۔"

اور آج.....

آج ماسکو والوں نے ایک ایسے پھول کو اپنے درمیان دیکھا جس کی خوشبو سے ہندوستان، ایشیا بلکہ ساری دنیا مہک رہی ہے۔

۷۔ جون ۱۹۵۵ء دن کے ساڑھے چار بجے ہندوستانی سفارت خانے کا عملہ سنٹرل ایرپورٹ کی جانب روانہ ہوا۔ کاریں شہر کے درمیانی حصے کی طرف بڑھیں۔ اور جب ہم ماسکو کے تجارتی مرکز سے گذرتے ہوئے گورکی اسٹریٹ میں داخل ہوئے تو ہماری آنکھوں نے عجیب نظارہ دیکھا۔ ماحول میں ایک تہوار کی سی جھلک تھی۔ یہ سڑک کافی چوڑی ہے اور دونوں جانب آٹھ آٹھ دس دس منزلہ مکانات ہیں۔ جہاں جہاں شہری سڑکیں اس سڑک میں آکر ملتی ہیں وہاں پُرکشش اور فراخ اسکوائر ہیں۔ جن میں ماسکو کے بانی شہزادہ یوری دولگا روکی، مشہور شاعر پشکن اور یکتائے روزگار ناول نویس گورکی کے بُت کھڑے ہیں۔ ان بُتوں کے سائے میں سڑک کے دونوں جانب ایک انسانی دریا موجیں مار رہا تھا جس کا بہاؤ ہوائی اڈے کی جانب تھا۔ ہوائی اڈہ یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے ہاتھ میں پھول لئے خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ کاریں گورکی اسٹریٹ سے گذرتی ہوئی مایاکوسکی اسکوائر پر پہنچیں۔ پورا اسکوائر جنتا سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں طرف لوگ کھڑے تھے اور سڑک پر سوائے کاروں اور سواریوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سڑک پر چھائے ہوئے لال نشان نظر آتے تھے جن پر روسی اور ہندوستانی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ "ہندوستان کے پردھان منتری جواہر لال نہرو کا سواگت"۔ جوں جوں ہم لوگ بڑھ رہے تھے سواریوں کی زیادتی کی وجہ سے رفتار سُست ہوتی جا رہی تھی۔ گورکی اسٹریٹ ختم ہوئی اور کاریں خوبصورت اور سرسبز لینن گراڈ کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں پھول ہاتھوں میں اور اشتیاق آنکھوں میں لئے پیڑوں کے سائے میں انتظار کر رہے تھے۔ ہوائی اڈے کے دروازے پر سوائے بھیڑ کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

ہم لوگ ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ ابھی ایک گھنٹہ اور باقی تھا مگر سواگت کی سرگرمیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ بھارتی اور سوویت جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ہنروجی کے سواگت کے لئے ماڑی بینڈ اور گارڈ آف آنر کے سپاہی باقاعدہ کھڑے تھے۔ سینما کے کیمرے ہر آنے والے کی طرف رُخ کرتے اور عکس اُتارنے میں مصروف ہو جاتے۔ ہوائی اڈے پر کیمرہ مین اور اخباروں کے نمائندے اپنی اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ دوسرے سفارت خانوں کے نمائندے اور سرکردہ لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے بچے اپنی خوش نما وردیاں پہنے ہاتھوں میں پھول لئے گا رہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں بھی پھول تھے اور نگاہیں اپنے محبوب پھول کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھیں۔

پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر کالی کالی فرلیس کاریں ہوائی اڈے میں داخل ہوئیں اور سب کی نظریں اُن کی سمت اٹھ گئیں۔ سب خاموش تھے۔ یکایک تالیوں کا شور اُٹھا۔ کیمرہ مین حرکت میں آئے۔ سامنے سوویت یونین کے ناخدا اور لیڈر چلے آ رہے تھے۔ بلگانن، ۔۔ اوولوف، مالینکوف، میکائن، سوبروف اور خورشچیف آگے بڑھے۔ بھارت کے راج دوت منتری کے پی، ایس مینن نے ان کا سواگت کیا۔ اب سب کی نظریں آسمان کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ انتظار کی یہ چند ساعتیں زیادہ لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ انتظار میں صرف ہمیں نہ تھے۔ بلکہ ماسکو کی شاہراہوں پر کھڑے لاکھوں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے اشتیاق آمیز آنکھوں سے آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے۔

اور پھر آسمان کی فضاؤں میں چڑھتے ہوئے سورج کی طرح چمکتا ہوا ہوائی جہاز نظر آیا۔ ہوائی جہاز جو سب کی نظروں کا مرکز تھا، ہوائی جہاز جس میں ہندوستان کا دل اور دماغ تھا، وہ ہوائی جہاز جس میں ہمارا محبوب اور پیارا جواہر لال نہرو تھا۔

جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ اور پھر آہستہ آہستہ مقررہ جگہ کی طرف بڑھا۔ جہاز کو سیڑھی لگائی گئی۔ فوجی بینڈ نے استقبالیہ موسیقی بجانی شروع کی۔ کیمرہ مینوں کے کیمرے اور ہر آنکھ جہاز کی کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ تالیوں کا شور اُٹھا جہاز کا دروازہ کھلا اور سامنے گاندھی ٹوپی، بھورے رنگ کی شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنے ایک سیدھا سادا انسان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس ادا سے کھڑا مسکرا رہا تھا جو صرف اس کی اپنی ہے۔ پردھان منتری نیچے اُترے۔ ان کے پیچھے شریمتی اندرا گاندھی، شری این آر پلے اور شری عظیم حسین اُترے۔ سوویت پردھان منتری بلگانن نے بڑھ کر سواگت کیا اور دوسری معزز شخصیتوں سے تعارف کرایا۔ بچوں نے دوڑ کر ہنستے ہوئے پھول دئے اور پھر پھولوں کا ایک

انبار لگ گیا۔ جس کو ایک دو نہیں بلکہ ہم سب ہندوستانی اُٹھائے ہوئے تھے۔
فوج کے کپتان نے آگے بڑھ کر ننگی تلوار کی سلامی دی اور معزز مہمان کا عزت افزا الفاظ سے سواگت کیا اور گارڈ آف آنر پیش کیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہندوستان کا قومی ترانہ پوری شان و شوکت سے بجایا جارہا تھا اور پھر سوویت قومی ترانہ فضا میں پھیل گیا۔ سوویر اعظم نے گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا۔ معائنے کے بعد دوسرے ملکوں کے سفیروں سے تعارف کرایا گیا۔
جس طرف بھی رُخ ہوتا تھا تالیوں اور خوشی سے لبریز نگاہوں سے سواگت ہوتا۔ میکروفون پیش ہوا۔ ہر شخص خاموش تھا۔ ماسکو اور دوسرے شہروں میں لوگ ریڈیو کے پاس جمع تھے۔ پردھان منتری نے فرمایا:۔

"میرے دل میں بہت دنوں سے یہاں آنے کی خواہش تھی جو بہت دنوں کے بعد پوری ہوئی اور میں یہاں ایک یاتری کی صورت میں آیا ہوں اور آپ لوگوں کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے اس پُر محبت سواگت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

رپورٹروں کے قلم پوری تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ تقریر ختم ہوئی۔ فوجی بینڈ بجنا شروع ہوا۔ سپاہی مارچ کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ کاریں آنی شروع ہوئیں نہرو جی اور پردھان منتری بلگانن ایک کھلی ہوئی کار میں سوار ہوئے اور تالیوں کے شور میں مُسکراتے ہوئے رخصت ہوئے۔
پردھان منتری جا چکے تھے۔ سب لوگ رخصت ہو رہے تھے مگر ہمارے ہاتھوں میں پھول تھے۔ وہی محبت اور عقیدت کے پھول۔ سامنے بچے کھڑے تھے ہم لوگوں نے پھول ان سب میں تقسیم کردئے۔ ہوائی اڈے سے باہر آئے۔ وہ سڑک جس پر ایک وقت میں ایک ساتھ برابر برابر چھ کاریں چل سکتی تھیں، انسانوں سے اس قدر بھری ہوئی تھی کہ صرف ایک کار اور وہ بھی آہستہ آہستہ گذر سکتی تھی۔ جنتا جس نے اپنی عقیدت اور محبت کے پھول ہندوستان کے پردھان منتری پر نچھاور کردئے تھے اب بھی مشتاق تھی کہ کوئی ہندوستانی چہرہ نظر آجائے۔ ہر گذرنے والی کار کی کھڑکیوں کو خوب غور سے دیکھا جاتا۔ اور جب ہم لوگ آگے بڑھے تو تالیوں کا طوفان کانوں سے ٹکرانے لگا اور کھلے ہوئے شیشوں میں سے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ خوش آمدید کے نعرے ہر طرف سے فضا میں بکھرنے لگے۔ جہاں جہاں سے ہم لوگ گذرے جوان، معصوم اور بوڑھے چہرے ہماری طرف اُٹھتے ہوئے نظر آئے جن میں محبت تھی انسانیت تھی۔
ہم اس انسانی اور پھولوں کے دریا کو عبور کرتے ہوئے سفارت خانے پہنچے۔ ہم پھر اسی چار دیواری کے اندر تھے جہاں سے تین گھنٹے پیشتر روانہ ہوئے تھے۔ مگر ہاتھوں میں پھول تھے اور دل و دماغ اُن کی خوشبو سے معطر۔
یہ سچ ہے کہ ڈالیوں سے ٹوٹے ہوئے پھول مرجھا جاتے ہیں۔ ان کی خوشبو اور تازگی معدوم ہو جاتی ہے۔ لیکن جو پھول محبت عقیدت دوستی اور امن کی نشانی ہوتے ہیں ان کی خوشبو اور تازگی زندہ جاوید ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ پھول کبھی مرجھا نہیں سکتے۔

"آج کل" کا کشمیر نمبر —————— علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

"آج کل" کا کشمیر نمبر دیدہ زیبی اور دلفریبی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اتنے متنوع مضامین اس میں جمع ہو گئے ہیں کہ حیرانی ہے کس کو امتیازی خصوصیت دی جائے۔ روایت، تاریخی کوائف، جغرافی حالات، صنعت اور دستکاری کی کیفیت، لسانی واقفیت کا بالمقابل گوشوارہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کا ذکر کیا جائے۔ میری رائے میں افادیت اور آرٹ کی نظر سے بھی یہ نمبر بے نظیر ہے۔ یہ معیار صحافت میں ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔ ادارہ کے مستحسن مساعی اور دقت نظر داد تحسین کے قابل ہے ؂

عابد رضا بیدار

ایک خط

اگست ۱۹۰۴ء سے شیخ محمد اکرام مخزن کو اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ترتیب دیتے تھے۔ مخزن اپریل ۱۹۰۱ء سے نکلا۔ ۴ مئی ۱۹۰۴ء کو سر عبدالقادر نے ہندوستان چھوڑا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء تک وہ انگلستان سے یہ "تصویر"[1] بھیج چکے تھے۔

شیخ محمد اکرام نے ۱۷ ستمبر کو یہ خط لکھا۔ مکتوب الیہ کون ہے یہ آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ اپنے خط میں انھوں نے لکھا ہے "..... تصویر چھپوا کر بھیجی ہے جس میں آپکی تصویر بھی ہے اور نواب محسن الملک مولانا شبلی اور خواجہ حالی اور مسٹر آرنلڈ یہ صاحبان اس گروپ میں ہیں۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ان لوگوں کے علاوہ جن کے نام آ گئے کسی کے نام ہے اور یہ کسی، مولانا نذیر احمد ہو سکتے ہیں یا نواب وقار الملک۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ یہ ان دونوں میں سے کوئی ایک۔

شیخ محمد اکرام ۱۹۰۸ء سے "عصمت" نکالنے لگے۔ مخزن کے ادارے سے وہ ستمبر ۱۹۰۸ء میں علٰحدہ ہو گئے۔ وہ عصمت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہی زیادہ مشہور ہیں۔ مخزن میں ان کے کچھ مضامین شائع ہوئے تھے۔ جو اردو میں Essay Writing کے اولیں نمونوں میں سے ہیں۔ عنوانات سے ان کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے: "قناعت"۔ "تصویر"۔ "دوپٹہ"۔ "ٹوپی"۔ "دستار"۔ "کوٹ"۔

17.9.04.

مخدومی۔

السلام علیکم۔

رسالہ مخزن تو آپ کی نظر سے گذرتا ہے۔ مگر یہ شکایت ہے کہ آپ نے کبھی قلمی معاونت نہیں فرمائی۔

شیخ عبدالقادر صاحب نے ولایت سے ایک تصویر چھپوا کر بھیجی ہے جسمیں آپ کی تصویر بھی ہے اور نواب محسن الملک مولنا شبلی اور خواجہ حالی اور مسٹر آرنلڈ یہ صاحبان اس گروپ میں ہیں۔ یہ تصویر اکتوبر کے مخزن کے ساتھ نکلیگی یہ خواہش ہے کہ سب صاحبان ایک آدھ مضمون بھی عنایت فرماویں۔ جو انکی تصویر کے ساتھ شائع ہو۔ اسطرح رسالہ کی دلچسپی اور بھی بڑھ جائیگی۔ مولنا شبلی صاحب نے تو ایک مضمون عنایت کیا ہے۔ اگر آپ بھی ایک مختصر سا مضمون مخزن کے رنگ کا تحریر فرماویں تو بیحد باعث عنایت ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ آپ ضرور اس عرض پر توجہ فرمائینگے۔

نیازمند

شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر

[1] تصویر صفحہ ۲۵ پر ہے

محمد عبدالقادر ادیب

مارشل بُلگانن

سوویٹ سپریم کی پریسیڈیم کا صدر نشیں روس کی مملکت کا مقتدر حاکم اعلیٰ ہوتا ہے جو عام طور پر صدر سوویٹ روس سمجھا جاتا ہے۔ مارشل ورو شلوف ایک جہاں دیدہ انسان ہیں جن کی عمر ۷۴ سال ہے۔ جو آج کل رُوس کی پریسیڈیم کے صدر نشیں ہیں۔

مملکت روس کی عاملہ کا حاکم اعلیٰ وزراء کی کونسل کا صدر نشیں ہوتا ہے جو عام طور پر وزیر اعظم کہلاتا ہے۔ موجودہ وزیر اعظم روس مارشل بلگانن ہیں جو چار بڑوں کی کانفرنس میں رُوس کی نمایندگی کر چکے ہیں۔ سوویٹ روس کی مقتدر اعلیٰ جماعت کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی سمجھی جاتی ہے۔ اس پارٹی کے ممتاز لیڈر مسٹر نکیتا کروشیف ہیں جو سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ عہدہ وزارت کے عہدۂ جلیلہ کے مساوی نہیں سمجھا جاتا لیکن کروشیف نہ صرف ایک ممتاز قائد کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ہیں بلکہ ملک کے ترجمان بن گئے ہیں۔ جہاں تک صلحناموں اور معاہدات پر دستخط کرنے کا تعلق ہے مارشل بلگانن کے قلم کو جنبش ہوتی ہے لیکن جہاں تک پالیسی کا تعلق ہے کروشیف ہی ترجمان کی حیثیت سے آگے بڑھتے ہیں۔

مارشل بلگانن میں دو باتیں ایسی ہیں جو توجہ کے لائق ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے عاملانہ خدمات کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا اور ایک کامیاب عہدہ دار تسلیم کئے گئے۔ مارشل بلگانن کی عمر ۶۱ سال ہے۔ کروشیف سے صرف ایک سال بڑے ہیں لیکن ستر سال کے معمّر انسان دکھائی دیتے ہیں سفید پوش طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کریملن کے لیڈروں میں سب سے زیادہ مہذب اور نہایت ہی با اخلاق ہیں۔ انھیں اپنی رنگت اور داڑھی پر ناز ہے۔ ۱۹۱۷ء میں بالشویک تحریک میں شامل ہوئے۔ چیکا (خفیہ پولیس) میں کام کیا۔ اس وقت جبکہ روس کی صنعتیں دم توڑ رہی تھیں، کاردان اور لائق منیجر کی خدمات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی بلگانن نے ایک کامیاب منیجر کی حیثیت سے شاندار کارنامے انجام دئے۔ انھوں نے ترقی کے کاموں میں سرعت پیدا کی۔ ان کا کارنامہ ترقیاتی اسکیم کے لئے نمونہ سمجھا جانے لگا اور ماسکو کو روس کا صنعتی شہر بنا دیا۔ پہلے پہل کاگنیف کے تحت کام کیا بعد میں کروشیف کے۔ دونوں مقامی اعلیٰ افسر سمجھے جاتے تھے۔ مسلسل کامیابیوں نے انھیں اسٹیٹ بنک کا صدر بنا دیا حالانکہ مالیات سے انھیں دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ خدمت نہایت اہم اور ذمہ دارانہ ہوتی ہے۔ لیکن بلگانن نے نہایت خوش اسلوبی سے اس فرض کو انجام دیا۔ دو سال بعد سنٹرل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس سال بیریا اور مالنکوف پولٹ بیورو کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ مارشل بلگانن ترقّی کرتے ہوئے کابینہ کی قیادت سے نکل کر اسٹالن کے حلقۂ خاص میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد ان کا ربط فوج سے ہو گیا۔

بلگانن نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے منتظم ہیں بلکہ کامیاب پارٹی لیڈر ہیں۔ انھوں نے جنگ کے دوران میں ماسکو کو بچانے کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ اس وقت فوج کی کمان ژوکوف کے ہاتھ میں تھی۔ بلگانن کی فوجی خدمات کے پیش نظر مارشل ورو شلوف کی جگہ انھیں سوویٹ مسلح افواج کا حاکم بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ورو شلوف کے بجائے مارشل بلگانن کو جنگی کیبنٹ کا رکن بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں پولینڈ میں لبلین حکومت کے قیام کی ذمہ داری انھیں سونپ دی گئی۔ وزارت دفاع کے عہدے کو بھی آپ نے سنبھالا۔ جو براہ راست اسٹالین کے تحت تھا۔ آپ پولٹ بیورو کے رکن ہو گئے۔ اُسی سال بیریا اور مالنکوف پورے ممبر بن گئے۔ وزارت دفاع کا عہدہ اسٹالین کے اعتماد کا بیّن ثبوت تھا لیکن اس کے باوجود بلگانن نے تمام جنگی افسروں کو اپنے اعتماد میں رکھا جس کی وجہ یہ ہے کہ آج ژوکوف نے مارشل بلگانن کے تحت وزارت دفاع کو لینے سے انکار نہیں کیا۔

یہ اس شخص کی زندگی کی کہانی ہے جو اعلیٰ قابلیت اور غیر معمولی فراست کا مالک ہے۔ یہ اس شخص کی تاریخ ہے جو غیر معمولی قوت و اقتدار رکھتا ہے۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کی قیادت کے زیر اثر پالیسی میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بلگانن نہایت وسیع القلب انسان ہیں۔ ان میں سمجھوتے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ ہر قسم کے لوگوں سے مفاہمت کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ پیشہ ور لیڈروں تک بھی اپنا فیصلہ منوانا جانتے ہیں

فضا ابن فیضی

کائنات

تحقیق کے پہلے:۔

روش روش پہ خموشی تھی، جو بار خموش — نسیم و نکہت و نزہت کے آبشار خموش
غمِ سکوت میں ڈوبا ہوا تھا لحنِ ساز ابھی — کہ پرفشاں نہ تھی روحِ نیاز و ناز ابھی
افق سے دور کہیں آفتاب سوتا تھا — اداس چاند مقدر کو اپنے روتا تھا
نہ ربطِ خاص تھا کچھ برگِ گل کو شبنم سے — یہ زخمِ دل ابھی ناآشنا تھے مرہم سے
کرن سے سینۂ شبنم میں ارتعاش نہ تھا — صدف پہ اپنے گہر کا مقام فاش نہ تھا
تھا جن کا ایک تبسم بہارِ خلد بریں — ہنوز وہ گل و لالہ نہاں تھے زیرِ زمیں
نگاہِ فیض تجلی سے تھی ابھی محروم — کلی کو رازِ شگفتن ابھی نہ تھا معلوم
لہو ہنوز نہ دوڑا تھا نبضِ امکاں میں — کوئی سحر نہ تھی بیدار خاورستاں میں

نہ ایسا فرقِ مراتب دن اور رات میں تھا
بس ایک چاکِ گریبانِ کائنات میں تھا

تحقیق کے بعد:۔

فضائے ارض و سما جلوہ آفریں اتنی — یہ کائنات تو پہلے نہ تھی حسیں اتنی
ذرا سی بھی جو ستاروں نے آنکھ جھپکائی — خمِ افق سے جبینِ سحر جھلک آئی
ہر ایک ڈوبی ہوئی نبض میں لہو آیا — زمیں پہ نیرِ اعظم نے نور برسایا
خود اپنے زخموں کا منہ چومنے لگے مرہم — کرن کی لَو سے دھڑکنے لگا دلِ شبنم
یہ آب و گل کے مہکتے ہوئے صنم خانے — چلی ہے موجِ ہوا نکہتوں کو بہلانے
چمن میں قافلۂ سبزہ و نسیم آئے — فروغِ نور سے نابود ہو گئے سائے
سرور و کیفیت و رنگ و بو کے میخانے — چھلک پڑے ہیں دماغ و نظر کے پیمانے
ارم طراز ہے دشت و جبل کی ویرانی — نوا فروش ہے خاموشیوں کی طغیانی

ضمیرِ کوکب و مہتاب تیرہ ناک نہیں
کہ آب و گل کے گریباں میں کوئی چاک نہیں

کرتار سنگھ دُگل

اُوپر کی منزل

کسی شہر کی سول لائنز میں ایک کوٹھی کی اُوپر کی منزل کا کمرہ۔
کمرے کی کھلی کھڑکی میں ادھیڑ عمر کا ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس کھڑکی سے سامنے کی سڑک دکھائی دیتی ہے، کوٹھی کا گیٹ دکھائی دیتا ہے، پڑوس کی کوٹھی کا آنگن اور برآمدہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی دیر ریلوے اسٹیشن سے گاڑیوں کے آنے جانے کی آوازیں بھی سُنائی دیتی رہتی ہیں۔

کھڑکی میں کھڑا آدمی قہقہے لگا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہنسی کی وجہ کوئی بات ہے جو اس کے نوکر نے اسے ابھی ابھی بتائی ہے۔

جب پردہ اُٹھ رہا ہوتا ہے تو نوکر کی صرف پُشت ہی دکھائی دیتی ہے جو پورا پردہ اُٹھنے پر چھپ جاتی ہے۔

مرد ہنستا ہی جا رہا ہے۔ ایک ایسی ہنسی جو طنز سے نفرت میں بدل جاتی ہے۔ پھر نفرت سے جیسے زہر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مرد۔ (زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے)
میم صاحبہ اسٹیشن گئی ہیں
(ہنستا جاتا ہے)
میم صاحبہ اسٹیشن گئی ہیں
اپنے محبوب کو وداع کہنے کے لئے
(ابھی تک ہنس رہا ہے)
محبت خود چل کر گئی ہے
اپنی تمناؤں کی قربانی دینے کے لئے
(ایک دم ہنسی روکتے ہوئے)
میم صاحبہ اسٹیشن گئی ہیں
آخری بار اپنے متوالے نینوں سے
کسی پرائے مرد کی پلکوں تلے
سپنے جگانے کے لئے
میم صاحبہ اسٹیشن گئی ہیں
آخری بار ایک بیوی کے ہونٹوں کو
کسی پرائے مرد کے لمس سے ناپاک کرنے کے لئے
میم صاحبہ اسٹیشن گئی ہیں
جیسے کسی ڈال پر کوئی گھونسلا بنائے
اور نیچے سے ڈال ٹوٹ جائے
جیسے خود اندھیرا کسی دل کی تیرگی سے کانپ اُٹھے
جیسے کوئی راستے سے بھٹکا تھا
کسی بند گلی میں آکر رُک جائے

مرد۔ (غصے سے ہونٹوں کو بھینچے اور کاٹتے ہوئے)
میم صاحبہ اسٹیشن گئی ہیں
کیونکہ آج اُس کے دل کا راجہ
جا رہا ہے، دُور، بہت دُور
جہاں تڑ تڑ گولیوں کی بارش ہوتی ہے
جہاں بموں کے بادل آکر پھٹتے ہیں
اور خون کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں
جہاں موت کی جھنکار
افسر اور ماتحت میں فرق نہیں جانتی
جہاں موت مُنہ کھولے کھڑی رہتی ہے
ان کے لئے جن کے گھر کوئی رونے والا نہیں

اور اُن کے لئے
جن کی راہوں میں
ان کے پڑوسیوں کی بیویاں
اپنے خاوندوں کو اپنے بچوں کو چھوڑ کر
آنکھیں بچھائے رہتی ہیں
دل لگائے رہتی ہیں

مرد۔ (بھرائی ہوئی آواز میں)
کبھی ایسا بھی ہوا ہے
دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے
کہ کوئی پینتیس سال کی بیوی
پھر سے عشق کرنے لگ جائے
کبھی ایسا بھی ہوا ہے
کہ کوئی تین بچوں کی ماں
کسی پرائے مرد کے لئے پاگل ہو اُٹھے۔
کبھی کسی نے یہ بھی سُنا ہے
کہ پندرہ سال ایک چھت کے نیچے رہ کر
کوئی یوں آزاد ہو جائے

مرد۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر)

راجی۔
تم نے مجھے تب نہ چھوڑا
جب ایک وقت ہمارے پاس کھانے کے لئے ہوتا تھا
اور دوسرا وقت
تم مجھ سے باتیں کرکے کاٹ لیتی تھیں
جب تمہاری سُوکھی چھاتیوں میں دودھ نہیں ہوتا تھا
اور اپنے بچوں کو
تم لوریاں گا گا کر بہلاتی تھیں
لوریاں، جن میں
تو اُس کے باپ راجہ کے گُن
گا کر نہیں تھکتی تھیں

جب آنکھوں سے اچانک پھوٹ نکلے آنسوؤں کو
تو ہنس ہنس کر مجھ سے چھپاتی تھی
بار بار اپنے ہونٹوں پہ
مسکراہٹیں کھلاتی تھی
میرے ماتھے پر تو ایک شکن بھی نہیں دیکھ سکتی تھی

راجی!
تم نے مجھے تب نہ چھوڑا
جب پلنگ پر پڑا میں ہڈیوں کا
ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا
ڈاکٹر تمھیں کچھ کہتے تھے، مجھے کچھ کہتے تھے
جب کوئی میرے پاس نہیں پھٹکتا تھا
میری گندی چادروں کو
تو دھوتے نہیں تھکتی تھی
میرے گیلے کپڑوں کو تو بدلتے نہیں اوبتی تھی
میرے مُرجھائے سوکھے ہونٹوں کو جب تو چومتی تھی
میری ہڈیوں کی ٹھٹھری کو جب تو دلراتی تھی
میری سوکھی بے جان باہوں کو جب تو اُٹھا اُٹھا کر
اپنی آنکھوں سے لگاتی تھی
رات بھر جاگ کر تم نے
میری تیمارداری کی
تم نے بلک بلک کر بھگوان سے
میری صحت کی بھیک مانگی

راجی!
تم نے مجھے تب نہ چھوڑا
جب آدھی آدھی رات کو میں گھر لوٹتا تھا
جب میرے انگ انگ سے بدبو آتی تھی
وہ بدبو جو ایک مرد میں سے آتی ہے
جب کوئی مرد
اپنی عورت کا حق مار کر گھر آتا ہے۔

جب میرے ہونٹوں پر سے
ابھی وہ نشان نہیں مٹے ہوئے ہوتے تھے
کسی پرائی عورت کے بوسوں کے نشان
جب میری آنکھوں میں
فریب ہوتا تھا، جھوٹ ہوتا تھا
اور تو کھڑکی سے کھڑی ہو کر
میری باٹ دیکھتی تھی
نشے میں ڈگمگاتے میرے لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دے کر
مجھے ٹیکسی میں سے تو نکال لاتی تھی

مرد۔ (آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگتے ہیں)

اور اب جب میں کوٹھیوں کا مالک ہوں
اور اب جب میں تین بچوں کا باپ ہوں
اور اب جب میں
پیاز کے چھلکے تک سے پرہیز کرتا ہوں
تو مجھے اب چھوڑ گئی
اب جب میں شراب نہیں پیتا
کہ اس کے نشے میں کوئی اپنا غم غلط کر سکے
اب جب میں کسی پرائی عورت کی طرف
آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا
کہ سوچوں تیری نا انصافی کا میں کبھی تجھ سے بدلہ لوں
اب جب کہ میرے پھولوں جیسے کومل بچے
میرے قدموں کی بے چینی کو، جب تو گھر نہیں ہوتی
ہکے بکے دیکھتے رہتے ہیں
تو اب چلی گئی
جب مسافر کے پاس اور چلنے کی سکت نہیں رہتی
جب راہ گیر سستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے
جب کسی کا گیت سننے کو جی چاہتا ہے
پلکوں پر پلکیں جیسے تھک کر گر پڑتی ہیں
تو اب چلی گئی

جب ہماری بچی
ہو بہو تیری جیسی نکل آئی ہے
ہو بہو تیری طرح ہنستی ہے
ہو بہو تیری طرح چلتی ہے
تو اب چلی گئی
جب اُسے ضرورت ہے راہوں کی
راستوں کی جن کو وہ اپنائے
تو اب چلی گئی
جب رات کو پل پل میری آنکھ کھل کھل جاتی ہے
جب اس گھر کی دیواریں تک
تمہاری راہ تکتی ہیں
جب ہر صبح سرا ٹیلیفون
تمہارے لئے ہی آتا ہے
جب کلیاں کھلتی ہیں
نازک اُنگلیوں کے لئے
تو اب چلی گئی
جب پھل آ گئے ہیں ان پودوں پر
جن کو تو نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا

مرد۔ (اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے)

آج ڈیڑھ برس ہو گیا
اس کمرے کے روشن دان ویسے کے ویسے بند ہیں
ہمارے اس سونے کے کمرے میں
کبھی کوئی ہنسی کی آواز نہیں سنائی دی
ست دھرم اور انصاف کا
کبھی چرچا نہیں ہوا
آج ڈیڑھ برس ہو گیا ہے
مجھے ایسا لگتا ہے
جیسے میں کسی ویرانے میں بھٹک رہا ہوں
پیڑ ہیں جن پر پتے نہیں

ڈھوپ ہے جس میں گرمی نہیں
ٹھنڈ ۔ ٹھنڈ ۔ ٹھنڈ
سردیوں میں کنواری پگڈنڈیوں پہ کہرے کی ٹھنڈ
ڈھوروں کے کھروں سے کچلے کیچڑ کی ٹھنڈ
پھول جیسے خوشبو کے بنا
لمس جیسے بے جان
مسکراہٹ بجھی بجھی ، پھیکی پھیکی

مرد ۔ (خیالوں میں جیسے کھو جاتا ہے)

بسنت کا دن تھا
جب اس سال
وہ فوجی کپتان
ہمارے پڑوس میں آکر رہا
اس کھڑکی میں کھڑے
میں اور میرے بچوں کی ماں
کتنی دیر دیکھتے رہے ۔ دیکھتے رہے
رم جھم پھوار پڑ رہی تھی
کیچڑ کیچڑ کیچڑ تھا چاروں طرف
جہاز جیسی
ایک لدی پھندی لاری آئی
اور موٹے موٹے بوٹوں والے فوجی اردلی
اس میں سے صندوقوں اور ٹرنکوں کو
اس تیزی سے اٹھانے اتارنے لگ گئے
جیسے کوئی اون کے ریشم کے لفافے
اٹھا کر اندر لے جاتا ہے
بات بات پر اردلی کپتان کو سلام کرتے ،
اور منہ میں سلگتا سگار منہ میں تھامے
وہ برآمدے میں ٹہلتا رہا
کھڑکی میں کھڑے ہم دیکھتے رہے دیکھتے رہے
ہوا تیز ہوگئی
سرد پڑ گئی
بار بار میری بیوی کا آنچل
ڈھلک ڈھلک پڑتا
شال میں سے جالی دار دوپٹہ
وہ بار بار سر پہ اوڑھتی
اور بار بار وہ سرک سرک جاتا
پھر میں نے کھڑکی بند کرلی
کھڑکی میں نے بند کرلی
اور مجھے اپنے سونے کا کمرہ ایسا لگا
جیسے سگار کی دھیمی دھیمی خوشبو سے بھر گیا ہو ۔
اس شام وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی تھی
دبے پیر پیچھے سے آکر میں نے اسے چوما
مجھے ایسا لگا جیسے سگار کی بو
سلاری کی ساری اس کے ہونٹوں پہ جمی ہو
میرا منہ سگار کے ذائقے سے لبالب بھر گیا
وہ دن ، اگلا دن ، اس سے اگلا دن
اور پھر ہر روز
مجھے سگار کی دھیمی دھیمی خوشبو آتی
چادروں میں سے ، تکیے میں سے ، کتابوں میں سے
پانی میں سے ، پلیٹوں میں سے
اس کے بالوں میں سے
اس کی مسکراہٹوں میں سے ، شوخیوں میں سے ،
مجھے سگار کی دھیمی دھیمی خوشبو آتی
ہمارے پھولدانوں میں لگے پھولوں میں سے ۔
میں بار بار کھڑکیوں کے پردے گراتا
دروازے بند رکھتا
لیکن سگار کی وہ دھیمی خوشبو
جیسے میرے گھر میں گھسی چلی آ رہی ہو
میں لاکھ اگربتیاں لالا کر جلاتا

پر سب بے کار۔ سب فضول
اور پھر ایک دن
اس کے منہ کی طرف میں دیکھتا رہ گیا
وہ کہنے لگی،
سگرٹ کا بھی کیا پینا
کوئی پیئے تو سگار پیئے
اور میری اُنگلیوں میں سے میرا سگرٹ
پتہ نہیں کب پھسل کر نیچے جا گرا
ہمیں تب ہی معلوم ہُوا
جب فرش کا قالین سُلگنے لگا تھا
میرے تن من میں جیسے آگ سی لگ گئی
اور وہ بار بار کہتی
اس کے جہیز کے قالین کا ستیاناس ہو گیا تھا
اور پھر اسے پڑوس میں آدھی آدھی رات تک
نشے میں دھت لوگوں کا ہنسنا اچھا اچھا سا لگنے لگا
گلاسوں کا ٹوٹنا اچھا، اچھا سا لگنے لگا
بدمست لڑکھڑاتے بہک رہے لوگوں کو
آدھی آدھی رات تک
کھڑکی میں کھڑی وہ دیکھتی رہی، دیکھتی رہی
اور پھر وہ تھکی تھکی سی رہنے لگی،
اُلجھی اُلجھی سی رہنے لگی
اُس کی آنکھوں میں ایک خوف ایک ڈر
جیسے کوئی ہِرنی کھائی پھاندتے ہوئے محسوس کرتا ہے
وہ کھڑکی میں کھڑی ہوتی تو کھڑی ہی رہتی
ساڑیوں کو نکالتی پہنتی
پھر اُتار کر اندر رکھ دیتی
کتنی کتنی بار شیشے کے سامنے بیٹھتی
ایک ٹک دیکھتی رہتی
اور پھر ایک رات

جب میں تھکا ہارا گھر لوٹا
ہمارے سونے کے کمرے میں
پیلی زرد، چوروں کی طرح وہ اکیلی کھڑی تھی۔
جیسے پرائے کھیت میں چر رہی کوئی گائے
کھیت کے مالک کی طرف دیکھتی ہے،
مجھے اس نے دیکھا
اور وہ پلنگ پر جا گری
پھوٹ پھوٹ کر اس کے آنسو بہنے لگے
وہ روتی گئی روتی گئی
رو رو کر اُس کی ہچکی بندھ گئی
میں اس سے کیا پوچھتا
وہ مجھے کیا بتاتی
بےبس بے زبان میں اس کے پاس بیٹھ گیا
میں نے کوئی شکایت نہیں کی
میں نے اسے بُرا نہیں کہا
اس کی آنکھیں بار بار جیسے مجھ سے کہہ رہی تھیں
تو مجھے کوستا کیوں نہیں
پھٹکارتا کیوں نہیں
میں گم سم ایک ٹک
اسے مچھلی کی طرح تڑپتا دیکھتا رہا
ساری رات وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی
رات بھر میں ہکا بکا دیکھتا رہا
یہ کوئی آنچل سے گرے بیر تھوڑے تھے
جن کا کچھ بگڑا نہیں تھا
وہ رات اور آج کا دن
پھر اس نے کبھی
میری آنکھوں سے آنکھ نہیں ملائی
ایک گھر میں بستے
ایک چھت کے نیچے رہتے

ہم ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہوگئے
اور پھر میں نے کیا کیا نہیں دیکھا
میرے اندر کے خاوند نے
کیا کیا نہیں برداشت کیا
میرے اندر کے باپ نے
کیسے اپنے آپ کو مار لیا
اس کے ناخنوں کی پالش کے رنگ بدل گئے۔
اس کے ہونٹوں کی سُرخی کا رنگ
اور کا اور ہوگیا۔
ساری عمر سنبھال سنبھال کر رکھے
اپنے بالوں کو اس نے کٹوا دیا۔
اس دن جب میں نے پہلی بار
اس کے کٹے ہوئے بال دیکھے
ساری رات میں سو نہیں سکا۔
کسی سے کسی کا باغ چھن جائے
باغ چھن جائے
اور کوئی فریاد نہ کرے
اور کسی بیل کو یاد کر کے
کوئی رونے لگ پڑے
آخر میں نے اپنے آپ کو سمجھا دیا۔
اور جب میں سمجھانے لگا
تو میں نے کس کس بات کے لئے
اپنے آپ کو نہیں سمجھایا
میز پہ بیٹھے
اگر کوئی چھری میرے ہاتھ میں ہوتی
تو میری اُنگلیاں اینٹھنے لگتیں
میرا انگ انگ
کبھی گرم ہوتا کبھی ٹھنڈا ہوتا
میرے ہونٹ لہولہان ہو کر رہ جاتے

کئی اندھیری راتوں میں
اکیلا اپنے کمرے میں ٹہلتا
میرے ہاتھ میری جیب میں پڑے
سات گولیوں والے ریوالور کو سہلاتے رہتے
سپنوں میں کئی بار
میں نے اپنے ہاتھوں کو لہو سے لت پت دیکھا
کئی بار میں نے عورت کی کمزوری کے بیان دئے
کئی بار میں پھانسی کے تختے پر لٹکا
بند کمرے کی دیواروں سے
ٹکریں مار مار کر
میں کئی بار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
میں بے کار
دُور گہرے آکاش میں انصاف ڈھونڈھتا رہا
اُونچی چوٹیوں پر کئی بار چڑھ کر
میں نے سوچا میرا پیر پھسل جائے!
کئی بار میں نے کنوؤں میں جھانکا
کہیں مجھے چکر آ جائے
ندی کی لہروں نے
بار بار مجھے کنارے پر پھینکا
ہر بار ہنستی
جھاگ چھوڑ کر چلی جاتیں
میرے بچے
کئی بار میری چھاتی کے ساتھ آ لگتے
میرے اندر صرف باپ کے پیار کو پا کر
بار بار اپنی ماں کو
میری آنکھوں میں ڈھونڈتے رہتے
میرے نوکر بھاگ بھاگ کر
میرے کام کرتے۔

اور ان کی بدتمیزی
ایک گولی کی طرح میرے سینے میں آکر لگتی۔
پڑوسی باتوں باتوں میں
اگر میری بیوی کی بات کرتے
تو بھی مجھے بُرا لگتا
اگر بات نہ کرتے
تو بھی مجھے بُرا لگتا
کلب میں گلی میں اور دفتر میں
لوگ کتنی کتنی باتیں کرتے
مجھے اُن کی ہر اَن سُنی بات
لاکھ بار سُنی محسوس ہوتی
کئی بار لوگوں کو دھوکا دیتے ہوئے
میں اپنے آپ کو دھوکا دینے لگتا۔
مجھے اپنی سوجھ بوجھ پر
شک ہونے لگتا۔
مجھے لگتا جو کچھ میں سُن رہا ہوں
وہ ٹھیک نہیں
شاید وہی ٹھیک ہے
جو کچھ میں سُننا چاہتا ہوں

رد۔ (دُور اسٹیشن سے انجن کی سیٹی کی آواز
ایک سیٹی کی آواز کے بعد ایک اور سیٹی کی آواز)

اسٹیشن پہ انجن سیٹی دے رہا ہے
چلنے کے لئے بے چین ہو رہا ہے
کوئی فریاد اسے نہیں روک سکتی۔
کوئی گڑگڑاہٹ اسے نہیں ٹھہرا سکتی۔
تو پیچ کر کے جائے گا
چیخیں کر کے جائے گا

رد۔ (گاڑی کے چلنے کی آواز سُن کر مرد پھر ہنسنا
شروع کر دیتا ہے اور ہنستا ہی جاتا ہے)

چلی گئی!
گاڑی چلی گئی!
پھنکارتی ہوئی دھڑاتی ہوئی
روندتی ہوئی کسی کے ارمانوں کو
گاڑی چلی گئی!
دُور ۔ بہت دُور
جہاں سے سندیس آتے ہیں
تو چھپائے ہوئے
خط آتے ہیں
تو جھوٹے کئے ہوئے
جہاں سینے تک کو کھول کر
تلاشی لی جاتی ہے
دل کے ہر کونے کے بھید
لاکھ بار پڑھے جاتے ہیں
لاکھ بار جانچے جاتے ہیں
اور پھر کہیں پاس ہوتے ہیں۔
جہاں ہر انسان کی قیمت
یا مرسکنے کے ترازو پر تولی جاتی ہے
یا مار سکنے کے گز سے ناپی جاتی ہے۔
جہاں سے جو لوٹتے ہیں
ان کو محبت کرنے کا ڈھنگ
پھر سے سیکھنا پڑتا ہے
جہاں سے جو لوٹتے ہیں
دھیمی آواز میں اُن سے بولا نہیں جاتا۔
جہاں سے جو لوٹتے ہیں
مسکراہٹیں بجھ چکی ہوتی ہیں
ہنسی مر چکی ہوتی ہے
ان کے ہونٹوں پر۔
جھلسے ہوئے چہرے۔

پھٹی ہوئی آنکھیں۔
جھڑی ہوئی اُنگلیاں۔
ٹوٹے ہوئے بازو۔
پگلی ہوئی ٹانگیں۔
ٹھسے ہوئے کندھے۔
جھکی ہوئی کمریں۔
گھائل چھاتیاں۔
گولیاں ٹھنڈی پڑیں
سوئی ہوئی جن کے پٹھوں میں
(کوٹھی کے باہر موٹر آکر رکتی ہے)

مرد۔ آگئی!
آج ادپجے لیے مارل نہیں بجائے گئے
جن کو سن کر
نوکر بھاگے ہوئے جاتے تھے
کوٹھی کا گیٹ کھولنے کے لئے۔
خود ہی موٹر سے نکل آئی ہے
اکیلی!
آج اس کے ساتھ مرد نہیں کوئی
جو اس کے لئے موٹر چلائے
وہ اُترے اور اس کے لئے بچھ بچھ جائے
خود اپنے ہاتھوں سے گیٹ کھول رہی ہے۔
اب اسے پتہ چلے گا
جو ریت کی دیوار کھڑی کرتے ہیں
ساری عمر خاک چھانتے ان کی بیت جاتی ہے
اب اسے پتہ چلے گا
کیسے دانتوں سے کھولی جاتی ہیں وہ گانٹھیں
جنھیں کوئی خود اپنے ہاتھوں سے لگاتا ہے۔
اب اسے پتہ چلے گا
کیسے عورت

اپنے مرد کے ساتھ ناانصافی کرکے
بھٹکتی ہے اس دُنیا میں
خراب ہوتی ہے اس دنیا میں
اب جب کہ وہ اپنے بچوں کے لئے
پرائی ہوگئی ہے
اب جب کہ وہ اپنے مرد کے لئے
مر چکی ہے
اب جب کہ وہ چلا گیا ہے
دُور۔ بہت دُور
جس کے لئے اس نے سب کو چھوڑا۔
اب یہ رویا کرے گی
رات بھر تاروں کو گن گن کر۔
اب یہ سسکیاں بھرا کرے گی
ادھ کھلی کلیوں کو دیکھ دیکھ کر
جنھیں توڑ توڑ کر کوئی
اس کے بالوں میں سجایا کرتا تھا۔
اب کھانے کو دوڑے گا
اس کو اس کا سونا پڑوس۔
پڑوس جس کے آنگن میں چیتھڑے بکھرے پڑے ہیں
کاغذ اُڑ رہے ہیں
ہوا کھڑکیوں کو کبھی کھول جاتی ہے
کبھی بند کر جاتی ہے
(موٹر پھر چلتی ہے اور کوٹھی میں آتی ہے)

مرد۔ ایں!
آج تو موٹر کو خود
گیرج میں رکھنے جا رہی ہے!
گیرج کے باہر موٹر کو روک کر
گیرج کا دروازہ کھول رہی ہے!
پھر موٹر میں بیٹھ گئی ہے!

موٹر گیرج کے اندر لے گئی ہے!
اب گیرج کے بھاری دروازے
اپنی ساری طاقت لگا کر بند کر رہی ہے!
اور اب آ رہی ہے ادھر۔
کیسے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے!
جیسے بدن میں بوند بھر خون نہیں!
پھٹی پھٹی آنکھیں۔
بکھرے ہوئے بال۔
ویران ماتھا۔
ہلدی کی طرح پیلے رخسار۔
سوکھے نیلے ہونٹ۔
گن گن کر قدم رکھ رہی ہے۔
فکروں میں ڈوبی ہوئی۔
خیالوں میں غرق
کانپتے ہاتھ۔
ڈگمگاتے پاؤں۔
یہ تو نہیں بچے گی!
(ایک دم گھبرا کر)
ایں گری!
پرع گئی
پتھر کے ٹکڑے سے ٹھوکر کھا کر
کیسے اوندھی ہو گئی تھی!
یہ تو نہیں بچے گی!
یہ تو نہیں بچے گی!!
میرے بچوں کی ماں مر جائے گی!
مر جائے گی؟
یہ تو ہجر کی چوٹ نہیں سہہ سکیگی۔
راجی تو نے پیار کیا
تو کیسے ساری کی ساری قربان ہو گئی۔

تیرا محبوب چلا گیا ہے؟
تو اسے اتنا چاہتی تھی!
اور اب تو اکیلی ہے؟
تو اب نہیں بچے گی؟
تو مر جائے گی راجی؟
سسکتی ہوئی تڑپتی ہوئی!
نہیں!
نہیں!!
نہیں!!!
تجھے ساتھی کی ضرورت ہے۔
تجھے ہمدرد کی ضرورت ہے۔
تجھے ہمراز کی ضرورت ہے۔
میں تجھے نہیں مرنے دوں گا۔
میں تجھے نہیں مرنے دوں گا۔
یہ گھر تیرے لئے کھلا ہے۔
یہ باہیں تیرے لئے پھیلی ہیں
یہ پھول تیرے لئے مہکے ہیں
(پھولوں کو پھولدان سے نکالتے ہوئے)
تو آجا میری جان
پندرہ سال سے تیرے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہا۔
پندرہ سال کی یہ ساتھ
مجھ سے بڑھ کر تیرا ساتھی کون ہو سکتا ہے
مجھ سے بڑھ کر تیرا ہمدرد کون ہو سکتا ہے
مجھ سے بڑھ کر تیرا ہمراز کون ہو سکتا ہے
(سیڑھیوں پر عورت کے چڑھنے کی آواز)
مرد۔ تو سیڑھیاں چڑھ رہی ہے؟
تو آجا
تو اوپر آ رہی ہے
تو آجا

محبت کی ایک اور منزل بھی ہوتی ہے
تو آجا!
تو چڑھ آ!
یہ پھول تیرے ہیں
اوس کے اچھوتے موتی تیرے ہیں
تاروں کی دھیمی دھیمی لو تیری ہے
تو آجا!
(سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ)
مرو جیسے اپنے جھٹکے
تو نے سب جوڑ کے بند کر لئے ہیں

کوئی بات نہیں ہے۔
میں تو کھنڈر میں بھی جوت جگا سکتا ہوں
کمل کی پتی پر
بیڑی کیچڑ کی چھینٹ
میں تجھے لاکھ پانیوں میں دھوؤں گا۔
تو آجا!
تو آجا!!
تو آجا!!!
(سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دے
رہی ہوتی ہے کہ پردہ گرتا ہے)
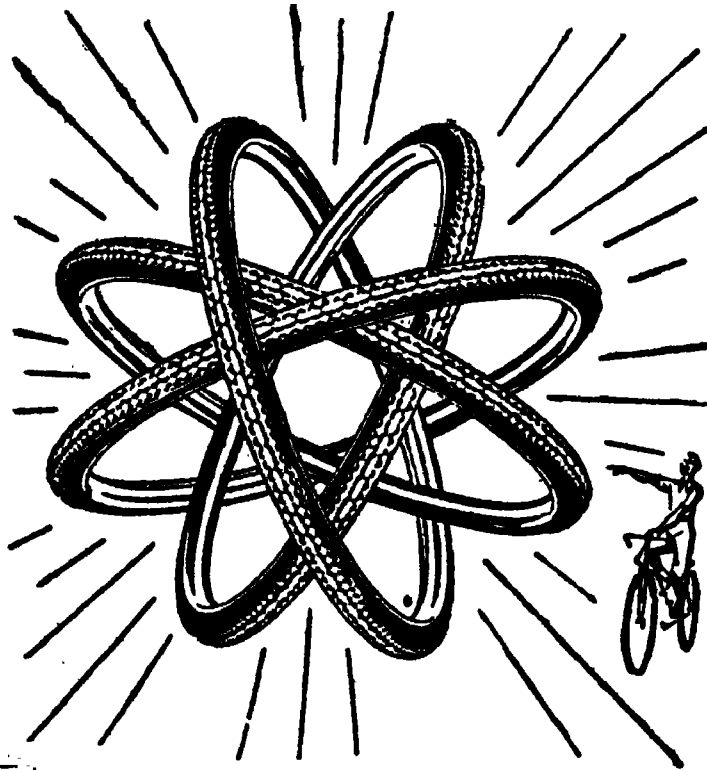
شعر و سخن

برسات وہ دیکھو آ ہی گئی

شاہیں غازی پوری

ساون کا مہینہ آتے ہی آکاش پہ بدلی چھا ہی گئی
اُڑتے ہوئے بادل کے رتھ میں برسات کی دیوی آ ہی گئی
بدمست پپیہوں کے من میں اک بجلی سی لہرا ہی گئی
برسات وہ دیکھو آ ہی گئی

بستی پہ ترانے گونج اُٹھے اور جام لنڈھائے گھٹاؤں نے
ڈالی پہ کوئلیا کوک اُٹھی بکھرائے گیت ہواؤں نے
چندا نے چھپایا مُنہ اپنا راتوں کی دُلہن شرما ہی گئی
برسات وہ دیکھو آ ہی گئی

گھنگھور بدریا چھائی ہے اب بھاگ کھلے دہقانوں کے
ہر سمت صباحت پھیل گئی من بہلے انسانوں کے
سبزوں میں لہک بیدار ہوئی دھرتی پہ جوانی چھا ہی گئی
برسات وہ دیکھو آ ہی گئی

رم جھم کی صدائیں آتی ہیں ساون کی اندھیری راتوں میں
گنگا جمنا چڑھ جاتی ہیں شاہیںؔ ایسی برساتوں میں
برکھا جو ہوئی تب پیڑوں کے سب پتوں کو نہلا ہی گئی
برسات وہ دیکھو آ ہی گئی

غزل

چندر پرکاش شاد

کس نے مرے سکوت سے آواز دی مجھے
محسوس ہو رہی ہے خود اپنی کمی مجھے

کیوں آج تیری آنکھ سے آنسو چھلک پڑے
راس آ رہی تھی اب تو مری خامشی مجھے

کیا کیا فریب کھائے ہیں میرے خلوص نے
کیا کیا اُمید تیری محبت سے تھی مجھے

خود بھی بھٹک گئی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ
گمراہ کر گئی ہے مری زندگی مجھے

خود کو بھی دیکھتا ہوں میں شک کی نگاہ سے
ہے جان سے عزیز تری دوستی مجھے

کتنی الم نواز ہے تنہائی حیات
اب تو کھٹک رہی ہے تری یاد بھی مجھے

میری کسی ادا میں قرینہ نہ آ سکا
ہستی کے حادثات نے فرصت نہ دی مجھے

غزلیں

محمد عطاء الرحمن خاں عطاء

جان و دل نذرِ وفا کرنا پڑا
حقِ اُلفت تھا ادا کرنا پڑا

جب بہاروں میں شرابی تا زگی
اپنے زخموں کو ہرا کرنا پڑا

کب تلک کھاتے فریبِ آگہی
دل کو وحشت آشنا کرنا پڑا

ہائے رے جبرِ محبت کا کمال
جو کبھی کرنا نہ تھا، کرنا پڑا

ان کی مرضی کو مقدم جان کر
خونِ حسرت بارہا کرنا پڑا

دل کو بخشا سوز و گداز
اے غمِ تیری عمر دراز

عشق و ہوس میں رشتہ کیا
ایک حقیقت، ایک مجاز

بیش نہیں ہے دل کی قیمت
ایک نگاہِ لطف نواز

اس کا چھپانا کیں نہیں ہے
راز اور وہ بھی اُن کا راز

غزل

زیدی بلگرامی

آرزو کا جب کھلونا کھو گیا
دل بہت مچلا، مچل کر سو گیا

اس خزاں پروردہ گلشن کی بہار
ابر جس پہ آ کے پہروں رو گیا

ہو گئی مدت نہ جانے کیا ہوا
نامہ بر کھویا کہ نامہ کھو گیا

زندگی جھوٹے جھلاتی ہے مجھے
لے کے وہ اک کروٹیں دل سو گیا

آرزو، ارمان، حسرت، شوق، یاس
بس انھیں آبادیوں میں کھو گیا

جان زیدیؔ اس کے جانے پر نثار
بوئے گل بن کر چمن سے جو گیا

غزل

جیمنی سرشار

چھپ چھپ کے تم گئے ہو نہ جانے کہاں کہاں
مشہور ہیں تمہارے فسانے کہاں کہاں

ڈالی گئی شباب کے تاروں پہ بھی کمند
ڈھونڈیں گے لوگ تم کو نہ جانے کہاں کہاں

اے عندلیب! ابھی ہے قفس تک معاملہ
لے جائیں گے تجھے یہ ترانے کہاں کہاں

اہلِ خرد سمجھ نہ سکیں گے جنوں کی بات
پہنچے ہیں لوگ اس کے بہانے کہاں کہاں

مسجد میں، خانقاہ میں، کعبے میں، دیر میں
ڈھونڈا ہے تجھ کو تیرے دِوانے کہاں کہاں

تیرے اسیر کرنے کو اے طائرِ حیات
پھیلائے دام دستِ قضا نے کہاں کہاں

شیومورتی تیواری

اقبال کا فلسفہ

" بنی نوعِ انسان کا یہ احساس دن بدن ترقی کرے گا کہ زندگی کو سمجھنے اور آلام و مصائب میں تقویت حاصل کرنے کے لئے ہمیں شاعری کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ شعر کے بغیر سائنس نامکمل معلوم ہوتی ہے۔ اور شاعری ان چیزوں کی جگہ لے رہی ہے جنھیں ہم مذہب اور فلسفے سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب کہ ہم خود حیرت کریں گے کہ ہم نے اب تک مذہب اور فلسفے پر اتنا اعتماد کیوں کیا۔ جتنا زیادہ ہمیں مذہب اور فلسفے کے کھوکھلے پن کا احساس ہوگا اتنا ہی زیادہ ہم علم کی روحِ رواں یعنی شعر و شاعری کی قدر کریں گے!" (میتھیو آرنلڈ)

ا

اقبال کے فلسفے پر مضمون لکھتے وقت مجھے کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اہلِ مغرب کو یہ بات مہمل لگے کہ کسی شاعر کے سر فلسفہ منڈھا جائے اہم ہندوستانیوں کو اس میں کوئی چیز خلافِ فطرت نظر نہیں آتی۔ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کا ادراک و احساس جغرافیائی حد بندیوں کا تابع ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی مہمل نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی شاعر فلسفی ہو یا کوئی فلسفی شاعر ہو۔ اس کے برعکس ہماری روایات کے مطابق یہ امر باعثِ تعجب ہوگا کہ کسی شاعر کا کلام کسی خاص فلسفے کا حامل نہ ہو۔ کم از کم ہم اسے شاعر ماننے میں ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔ شاعر کا لفظ انگریزی لفظ پوئٹ Poet سے زیادہ وسیع اور گہرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کی ذات میں سخن سنجی فلسفہ اور پیغمبری کا اجتماع ہوتا ہے۔ اقبال صحیح معنوں میں شاعر، فلسفی اور پیغمبر تھے۔ اور اس لئے ان کے فلسفے کے متعلق کچھ کہنا نہایت موزوں ہوگا۔

لیکن پھر بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا اقبال کا اپنا کوئی خاص فلسفہ ہے جس معنی میں کہ عرفِ علم میں یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے؟ یقیناً ان کا اپنا ایک فلسفہ تھا جن معنوں میں یہ لفظ اصل یونانی زبان میں مستعمل ہے، اور ان کا اپنا Weltarchauung تھا، جو جرمنی زبان میں فلسفہ کا مرادف ہے۔ ایک عالم گیر ادراک یا تخیل کائنات۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اصطلاحی معنوں میں ان کا کوئی فلسفہ تھا یا نہیں۔ حقیقی معنوں میں فلسفے کا لازمی جزو منطق کی عمارت نہیں۔ بلکہ وہ باطنی تجربہ ہے جس پر یہ عمارت قایم ہوتی ہے۔

اگرچہ فن کی ایک صنف ہوتے ہوئے شاعری کا یہ کام نہیں کہ فلسفے کے متعلق ہمیں کچھ بتائے تاہم شاعری اس وقت تک اپنے مقصد کی تکمیل نہیں کر سکتی جب تک وہ ایک فلسفیانہ بصیرت کی ترجمان نہ ہو۔ شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیں زندگی کا مطلب سمجھائے، اور ہمارے سامنے حقیقت کی مکمل تصویر کھینچے۔ اگر شاعری پیکرِ الفاظ کے ذریعے سے ابدی حقائق کو جلوہ گر نہ کرتی تو مسرت و نشاط کا سرچشمہ کیسے بنتی۔ ہیگل کے الفاظ میں شاعری کا مقصد یہ ہے کہ ایک خوش ترتیب کائنات کے انتہائی نصب العین کے تخیلی نقوش الفاظ کی شکل میں پیش کئے جائیں۔ ارسطو نے کہا ہے کہ شعر سب سے زیادہ فلسفیانہ تحریر ہے، کیونکہ اس کا مقصد حقیقت کا اظہار ہے۔ حقیقی معنوں میں وہی شخص شاعر کہلائے جانے کا مستحق ہے جسے ہر ایک جزو میں کُل دکھائی دے، اور جو اس کُل کی صورت کو اپنے اشعار میں بیان کر سکے۔ جیسا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں "شاعر کے تخیل اور فلسفی کے ذہن میں کائنات کے جمال اور نظام کی دوبارہ تخلیق ہوتی ہے۔ شاعر کے کلام میں نظامِ حیات کی ہم آہنگی کا راگ سُنا جا سکتا ہے۔"

حقیقی شاعری جذبہ اور تخیل کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ جذبہ اور احساس محض صوتی اظہار کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ فلسفیانہ داخلیت کی طرح بے زبان ہوتے ہیں۔ ورڈز ورتھ اسی نکتے کو بیان کرتا ہے جب کہ

وہ کہتا ہے کہ سکون کی حالت میں احساسات کے تصور کو شاعری کہتے ہیں۔ ایک سچے شاعر کی نگاہ میں روحانی کوائف اتنے ہی سادہ فطرتی اور حقیقی ہوتے ہیں جتنے کہ عام لوگوں کی نظر میں سمندر یا دھوپ کے نظارے۔

اعلیٰ شاعری بھی حقیقت عینیت کے جلال کے ساتھ اور عینیت حقیقت کی وضاحت کے ساتھ دکھائی دیتی ہے، اور ہمیں واقعی ایک اعلیٰ درجے کی حقیقی شے حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ٹینی سن نے کہا ہے۔ شاعری امر واقعہ سے زیادہ حقیقت کے قریب ہوتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری ایک عینی تصور یا حقیقی فلسفے کی ترجمان ہو۔ اس فلسفیانہ تصور کے بغیر اعلیٰ شاعری کا وجود ممکن نہیں۔

اپنشد کے مصنف سب کے سب شعرائے حکیم تھے۔ فارسی کے بڑے شاعروں میں سے اکثر صوفی اور اہلِ معرفت تھے، جن کا مقصدِ حیات اسی روحانی کمال کو حاصل کرنا تھا، جہاں روح دنیوی لذتوں سے کنارہ کش ہو کر فنا فی المراقبہ ہو جاتی ہے۔ ابدیت ان شاعروں کی دامِ نگاہ میں ہوتی ہے۔ فلسفی بتاتا ہے کہ نظامِ کائنات عقل پر مبنی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ جمال سے لبریز ہے۔ فلسفہ دنیا کو ہوش و خرد سے منطبق کرتا ہے۔ شاعری احساس سے۔ فلسفہ بدنظمی اور لغویت کو برداشت نہیں کرسکتا۔ شاعری بدصورتی اور فطرت اور سماج سے بیزاری کی روادار نہیں۔ شعر مہکیلے پھول کی طرح سونگھنے اور مٹھائی کی طرح چکھنے کے لئے ہے یا ایک ایسا شربت ہے جس کا ذائقہ انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ شعر پڑھانے کی چیز نہیں ہے، یہ اپنی خوبی کا خود ثبوت ہے۔ اپنی صداقت کا خود شاہد ہے۔ شاعر استدلال سے نہیں وجدان سے کام لیتا ہے۔ حقیقت احساسات کے راستوں سے انسانی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ شاعری کے ذریعے فلسفہ منزلِ حیات میں قدم رکھتا ہے Plutarch کے قول کے مصداق کہ شعر ہمیں رموزِ حکمت سے آشنا کرتا ہے۔ اقبال کی تصنیفات نے ہمارے سامنے روحانی زندگی کے امکانات کی راہیں کھولی ہیں۔ اُن کے نغمے قومی ترانے بن گئے ہیں جن کے الفاظ میں حیات کا سانس ہے، اور جن کے خیالات میں زندگی کی حرارت محسوس کی جاسکتی ہے۔ اقبال کے الفاظ فردوسِ گوش ہیں، اور اُن کے افکار دل میں اثر کر جاتے ہیں، اُن کا کلام چراغ کی طرح دماغ کو روشن کرتا ہے، نغمے کی طرح خون میں جوش پیدا کرتا ہے، اور روحانی ترنم کی طرح دل کو مسحور کرتا ہے۔ شاعر خدا کو روحِ جمال تصور کرکے اس کی عبادت کرتا ہے، اور فلسفی اسے عین حقیقت سمجھ کر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ فلسفہ معبدِ صداقت ہے۔ شاعری درگاہِ حسن۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعر اگر فلسفی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ایک حقیقی شاعر کے لئے فلسفی ہونا اور ایک حقیقی فلسفی کے لئے شاعر ہونا ناگزیر ہے۔

۲

اقبال لازمی طور پر ایک شاعر ہیں فلسفی نہیں۔ تاہم ان کے کلام سے اُن کے فلسفیانہ عقائد مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے اشعار سے ہم یہ پتہ چلاسکتے ہیں کہ اُن کی روح اپنے ماحول سے کس طرح متاثر ہوئی، اور زندگی سے متعلق اُن کا کیا نظریہ ہے۔ ہمیں ان کی نظموں میں اُن کی شخصیت کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہ نظمیں اُن کی روح کی ترجمان اور ان کے شاعرانہ شعور کی مظہر ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

اُن کی دوسری تصنیفات میں بھی اُن کے ذہنی مسلک سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ اسرارِ خودی، تشکیل جدید الٰہیات اسلام اور چند دیگر مقالوں میں انھوں نے اپنے حکیمانہ افکار کو وضاحت سے بیان کیا ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک زبردست مفکر تھے۔ یورپ میں قیام کے دوران میں انھوں نے جدید مغربی فلسفے کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں فلسفۂ عجم پر اُن کی بصیرت افروز کتاب شائع ہوئی۔ اس وقت انھوں نے بقول نکلسن اپنا ایک جداگانہ فلسفیانہ مسلک تعمیر کیا۔ سردار اقبال علی شاہ نے انھیں موجودہ دور کا سب سے بڑا مفکر قرار دیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ان سے انڈین نیشنل کانگریس میں صدارت فرمانے کی التماس کی گئی۔ لیکن صحت خراب ہونے کے باعث انھوں نے اظہارِ معذرت کیا۔ پروفیسر اے۔ آر۔ واڈیا لکھتے ہیں، "جس سال کہ کانگریس کا اجتماع میسور میں ہونا قرار پایا تھا، راقم الحروف اور پروفیسر رادھا کرشنن دونوں کو اس بات کا اشتیاق تھا کہ ڈاکٹر اقبال کانگریس کی صدارت فرمائیں۔ چنانچہ ہم دونوں ان سے ملے۔ اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اقبال صحت خراب ہونے کی بنا پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی زندگی اور سرگرمیوں کے متعلق اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ لیکن اس امر سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر تھے، اور

اس سے بھی زیادہ بڑے فلسفی تھے اور کانگریس سے ان کا تعلق اس سنستھا کی عزت افزائی کا باعث ہوتا۔[1]

۳

اقبال کے افکار پر رومی ابن العربی اور دوسرے اہل تصوف کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ لیکن ان کے خیال میں اسلام نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ انسان کی خودی مکمل طور پر ذات باری میں ضم ہو جاتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خودی جو تجربے کا ایک محدود اور معین مرکز ہے، کوئی خیالی چیز نہیں۔ خودی کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔[2] اسرار خودی میں اقبال نے فلسفۂ خودی کو عام فہم اور دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ اسلوب بیان میں نظم و ترتیب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اقبال بذات خود ایک عنیت پسند ہیں، جن کے افکار کا Balfour Rashdall Howison Schiller اور نٹیگیر کے خیالات سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ خودی کا نظام کائنات کا مولد و منشا ہے، اور سب افراد کی حیات کا دوام استحکام خودی پر موقوف ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی ست   ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالم پندار کرد

(اسرار خودی ۱۲ء)

اقبال Bosanquet کی نسبت McTaggart کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی رائے میں کائنات ایک مکمل کل نہیں ہے۔ اسے حقیقت کاملہ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ہمیشہ تکامل کی منزلیں طے کرتی رہتی ہے۔ اس میں نام کو بھی جمود نہیں ہے۔ Bergson کے بعد اقبال ہی ایک ایسے مفکر ہوئے ہیں جنھوں نے حقیقت کو خالص امتداد تصور کیا ہے، وہ فرماتے ہیں "ہماری ہستی کے ذریعے سے جو تسلسل زمان ظاہر ہوتا ہے اس کی بصیرت افروز تفسیر سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بنیادی حقیقت خالص امتداد ہے جس میں فکر حیات اور مقصد کے باہمی امتزاج سے ایک اساسی وحدت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہم اس وحدت کو صرف ایک شکل میں تصور کر سکتے ہیں۔ اور وہ ہے وحدت خودی، ایک ہمہ گیر محسوس خودی جو ہماری ساری انفرادی حیات و فکر کا اصلی منبع ہے۔[3] اقبال فرماتے ہیں کہ وقت اصلی حقیقت کا ایک جزو لاینفک ہے۔[4]

چنانچہ یہاں انہیں McTaggart سے اختلاف ہے، جو وقت کے وجود کو غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔ "لیکن حقیقی زمان وہ مسلسل زمان نہیں ہے جس کے لئے ماضی حال اور مستقبل کے امتیازات لازمی ہوں۔ بلکہ وہ خالص مرور ہے۔ یعنی تغیر بغیر تواتر جس کی طرف McTaggart کے استدلال میں خفیف سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔"[5] یہاں تک اقبال Bergson کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ لیکن Bergson نے جو فکر پر سخت نکتہ چینی کی ہے اسے اقبال تسلیم نہیں کرتے Bergson فکر ایک مکان آفریں سرگرمی تصور کرتا تھا، جو وجدان کی ضد ہے۔ اس کی رائے میں وجدان ہی حقیقت کی اصلی ماہیت کو منکشف کر سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ بظاہر خیال تخلیق مکان کرتا ہے اور صرف میکانکی مقولات کو استعمال کرتا ہے۔ تاہم اس کے لئے کچھ ایسے گہرے لمحات بھی ہوتے ہیں جب کہ یہ میکانکی دائرے سے نکل کر ہمارے تجربے کے عناصر کا امتزاج کرتا ہے۔ اقبال، غزالی اور کانٹ Kant دونوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں، کیونکہ وہ[6] یہ محسوس کرنے سے قاصر ہیں کہ خیال علم کے ہر فعل میں اپنی محدودیت کے دائرے سے باہر جاتا ہے۔"[7]

اقبال یہ ثابت کرنے کی بہت کوشش کرتے ہیں کہ اصلی حقیقت کو پانے کے لئے دنیا کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے فکر کا دنیا سے تعلق ہے، اور اصل حقیقت کو پانے کے لئے دنیا کو ترک کرنے کی ضرورت ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ فکر کو بھی ترک کرنا پڑے گا۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فکر نہیں بلکہ وجدان اصلی حقیقت کو ہم پر منکشف کرتا ہے لیکن اقبال یہ امر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ نہ دنیا کو ترک کرنے کی ضرورت ہے نہ فکر کو۔ غزالی، کانٹ Kant، برگسان Bergson اور دیگر مفکرین نے یہ غلطی کی کہ فکر کے ایک گہرے پہلو پر نظر نہیں ڈالی۔ اقبال

---

[1] The Indian Philosophical Congress Silver Jubilee Commemoration Volume I. P. 8 (1960)

[2] اسرار خودی (انگریزی ترجمہ نکلسن) XVII

[3] Reconstruction of religious thought in Islam P. 75

[4] Ibid P 77   [5] Ibid P. 79

[6] یعنی غزالی اور کانٹ

[7] Ibid P. 8

لکھتے ہیں کہ "جہاں فکر اپنی گہرائی کے لمحات میں ایک ایسے باطنی لامکان میں پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی خود نما گردش میں مختلف محدود تصورات محض چند لمحوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنی حقیقی فطرت کے اعتبار سے خیال کوئی جامد شے نہیں بلکہ یہ ایک فعّالی چیز ہے۔ ٹھیک اس بیج کی طرح جو ازل سے اپنے اندر ایک درخت کی بنیادی وحدت کا حامل ہوتا ہے خیال اپنی باطنی لامحدودیت کو وقت کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ پس خیال اپنی فعّالی خود نمائی کی رُو سے کامل بالذات ہوتا ہے اور مادی بصارت کے سامنے مسلسل مخصوص تعینات کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے، جسے صرف متلازم اشارات کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قرآن کے اشارے میں یوں کہیں گے کہ کل علم ایک طرح کی لوح محفوظ ہے جس میں علم کے سارے غیر متعین امکانات حقیقتِ حال کی شکل میں موجود ہوتے ہیں اور جو مسلسل زمان میں متواتر مجرد تصورات کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں، اور ایسے اتحاد کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جو ان میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔[1]"

پس اقبال اس امر کے معتقد ہیں کہ فکر حقیقت تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے حقیقت کی تردید نہیں کرتا، جیسا کہ بریڈلے **Bradley** نے صورت اور حقیقت **Appearance & Reality** عنوان کے مقالے میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقل اور وجدان دو متضاد چیزیں نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہے۔

اقبال ہمیں بتلاتے ہیں کہ خودی دو پہلو رکھتی ہے، ایک خارجی اور دوسرا داخلی، اور اقبال انھیں مؤثر اور قدر آفرین کے نام سے پکارتے ہیں۔ مؤثر پہلو وہ ہے جس میں خودی خارجی دنیا کی چیزوں کے ساتھ ربط قائم کرتی ہے اور ایک ماہر نفسیات خودی کے اسی پہلو کا مطالعہ کرتا ہے اور قانون تلازم خیالات کے الفاظ میں اس کی تفسیر کرتا ہے۔ خودی کے قدر آفریں پہلو سے البتہ ہمیں حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں "گہرے مراقبے کی حالت میں جبکہ مؤثر خودی معطل ہو جاتی ہے، ہم اپنی خودی کی گہرائی میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور اس کے تجربے کے اندرونی مرکز تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس منزل پر شعور کی مختلف کیفیات ایک دوسرے میں منضم ہو جاتی ہیں۔

---

۱ Op. Cit

قدر آفرین خودی کی وحدت اس تخم کے مانند ہوتی ہے جس میں اس کی گذری ہوئی پشتوں کے تجربے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ تجربے باوجود اپنی گوناگونی کے ایک وحدت سے عبارت ہوتے ہیں، اور ہر تجربہ کل میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مؤثر خودی کے برعکس قدر آفرین خودی کی نوعیت کیفی ہوتی ہے۔ اس میں جو تغیر اور حرکت موجود ہوتی ہے وہ غیر منقسم ہوتا ہے، اور اس میں زمانی تواتر نہیں ہوتا۔ قدر آفرین خودی کا زمان ایک آنِ واحد ہے جس کو عقلی یا مؤثر خودی خارجی عالم سے تعلق رکھنے کے باعث مسلسل منفرد آنات میں پیش کرتی ہے۔ جیسے ایک دھاگے میں موتی پروئے ہوئے ہوں۔ یہ خالص زمان ہے جس میں مکان کے سبب سے کوئی نقص پیدا نہ ہوا ہو۔[1]"

اقبال کی نگاہوں میں انتہائی حقیقت ایک انا ہے: "صحیح معنوں میں اسی چیز کا وجود حقیقی ہے جو بلا واسطہ اپنی حقیقت سے آشنا ہو۔[2] اور اپنے شعوری تجربے کی مماثلت سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات ایک آزاد تخلیقی حرکت ہے۔[3] انا سے تو انا ہی پیدا ہو سکتی ہے حقیقی انا انائی وحدتوں یا انائی مرکزوں کی شکل میں کارفرما ہوتی ہے۔" مادہ کے ذرّہ کی میکانکی حرکت سے لے کر انسانی انا میں خیال کی آزاد حرکت تک کائنات کی ہر شے انائے اعظم کا جلوۂ خود نمائی ہے۔ قوتِ الہٰی کا ہر ایک ذرہ خواہ اسے مادی دنیا میں کتنی ہی ادنیٰ حیثیت حاصل کیوں نہ ہو، ایک انا کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن اس انانیت کے اظہار کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اس عالمِ ہستی میں ابتداء سے انتہا تک ہمیں انانیت کا بلند آہنگ سُر سنائی دیتا ہے، اور یہ سُر انسان کی ذات میں نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔[4] لیبنز **Liebniz** اور میکٹاگارٹ **McTaggart** کی طرح اقبال کا عقیدہ ہے کہ دنیا سرتا سر ایک روحانی شے ہے، اور خودی یا اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال کی رائے میں یہ انائیں ذاتِ باری سے نکلی ہیں، اور ان کی زمانی ابتدا ہے۔[5] اور اسی بنا پر اقبال کے نظامِ فکر میں خدا کو جتنا اونچا درجہ حاصل ہے

---

۱ Ibid P. 65 ۲ Ibid P. 100 ۳ Ibid P. 69
۴ Ibid P. 99 ۵ Ibid P. 108

لیبنز Liebniz اور مکٹگارٹ McTaggart کے ہاں نہیں، اقبال حقیقت کے مدارج کے بھی معتقد ہیں۔

اقبال کے خیال میں بغیر سیرت یعنی یکساں طرز عمل کے خودی کا تصور ممکن نہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہم نے دیکھا کہ قدرت خالص مادیت کا انبار نہیں جو خلا میں قایم ہو۔ یہ واقعات کا ایوان ہے۔ ایک منظم طرز عمل جو اس اعتبار سے اساسی خودی کا جزو لاینفک ہے۔ فطرت کا ذاتِ الٰہی سے وہی تعلق ہے جو سیرت کا انسانی خودی سے۔ قرآن مجید کے دل کش الفاظ میں فطرت اللہ کا لباس ہے۔ انسانی نقطۂ نظر سے اسے موجودہ صورتِ حال میں انائے کل کی تخلیقی سرگرمیوں کی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ اپنی ترقی پذیر حالت کے ایک خاص لمحے میں یہ محدود ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ ذات جس کا یہ جزو لاینفک ہوتی ہے سرگرم تخلیق رہتی ہے۔ اس لئے یہ بھی افزائش کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس معنی میں بیکراں ہوتی ہے کہ اس کے اظہار کی کوئی قطعی حدود معین نہیں کی جاسکتیں۔ یہ بیکراں بالقوت ہوتی ہے، بالفعل نہیں[1]۔ حقیقت ایک تخلیقی ترقی پذیر حرکت ہے جس کی سرگرمی مادے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ تاریخ فلسفے میں مادہ اور ذہن کے مسئلے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ہر فلسفی نے اپنے اپنے طریق پر اس کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مفکرِ اعظم ڈیکارٹیز Decartes جسم اور جان کی تقسیم بین الاثنین کا قائل تھا۔ لیکن اقبال کے فلسفے میں ذہن اور مادے کے ثنویہ کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ زمانِ قدیم سے اب تک ہندوستانی عینیت پسندوں نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ مادہ اور روح میں کوئی حقیقی مخاصمت ہے۔ اقبال یہ سوال کرتے ہیں کہ مادہ کیا ہے[2]۔ اور خود ہی جواب دیتے ہیں: "ادنیٰ درجہ کی اناؤں کی ایک بستی ہے جن کا تلازم اور تفاعل پیچیدگی کی ایک حد پر پہنچنے کے بعد محدود زندگی اور ایک اعلیٰ درجے کا شعور پیدا کرتا ہے[3]۔ انھوں نے جسم اور ذہن کے تعلق کو بھی اسی انداز سے بیان کیا ہے۔ اقبال متوازیت کو تسلیم کرتے ہیں نہ تفاعیت کو۔ وہ کہتے ہیں: "تجربوں کا نظام جسے ہم روح یا انا کہتے ہیں درحقیقت افعال کا بھی نظام ہے۔ اس سے روح اور جسم کی تفریق ملتی نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ انا کی برت آمد اور بے ساختگی ہے۔ وہ افعال جن سے جسم مرکب ہوتا ہے بار بار سرزد ہوتے رہتے ہیں[4]۔ مطلب یہ ہوا کہ روح یا انا تخلیقیت کا دوسرا نام ہے۔ یہ محض آگے کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن اس حرکت کا ایک خاص ڈھنگ اور طریقہ ہے جس کے مطابق یہ افعال اپنے آپ کو دوہراتے رہتے ہیں، اور اس کو جسم کہتے ہیں۔ بس ہم دیکھتے ہیں کہ درحقیقت جسم اور روح اور مادہ اور ذہن میں کوئی فرق نہیں ہے، اور ویدانتی مسالک بھی اس نظریہ کے قائل ہیں۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پہنچتے ہیں کہ مادہ روح سے مختلف نہیں ہے، اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مادے سے احتراز نامناسب بلکہ ناممکن ہے۔ اقبال لکھتے ہیں: "حقیقت دراصل یہ ہے کہ مکان و زمان کے اعتبار سے روح مادہ ہے۔ وہ وحدت جسے ہم انسان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس صورت میں جسم ہوتی ہے جبکہ ہم اس کو مادی دنیا کے ساتھ مناسبت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، اور جب ہم اس کو عمل کے بنیادی مقصد اور عینیت کے لئے عمل پیرا دیکھتے ہیں تو یہ ذہن یا روح معلوم ہوتی ہے[5]۔

اگرچہ تمام دنیا ارواح سے مرکب ہے اور روح اساسی سے پیدا ہوئی ہے۔ تاہم اقبال وحدتِ وجود کے عقیدے کے مخالف تھے۔ جب حقیقت کو خود نما کہنے میں خدا کے لئے روشنی کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے تو اقبال کی رائے میں اس کا مقصد خدا کی مطلقیت کو بیان کرتا ہے، نہ کہ اس کو ہرجائی کہنا، کیونکہ خدا کو ہرجائی ماننا وحدتِ وجود کے قائل ہونے کا مرادف ہے[6]۔ خدا کی ذات مکانی لامحدودیت کے معنوں میں لامحدود نہیں ہے۔ اس کی لامحدودیت "اس کی تخلیقی سرگرمیوں کے لامحدود پوشیدہ امکانات پر مشتمل ہے اور کائنات ان ہی سرگرمیوں کا ایک جزئی اظہار ہے[7]"

اقبال ایک اعتبار سے عقیدۂ اصلاح و ترقی کے قائل تھے، اور ساتھ ہی انھیں بدی پر انسان کے غلبے کا کامل یقین تھا[8]۔ یہ فیصلہ کن فتح انسان کو خود حاصل کرنی پڑے گی، اور اس کے لئے اسے ہمہ تن مصروف رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اسے کامیابی کا یقین ہونا چاہیئے۔ اس کی کامیابی کی بیّن دلیل یہ ہے کہ ہر چیز کا ظہور ذاتِ الٰہی سے ہوا ہے، اور دنیا بھی خدا کے

---

[1] Ibid P. 76-77 [2] Ibid P. 147 [3] Ibid

[4] Ibid P. 146 [5] Ibid P. 216 [6] Ibid P. 89

[7] Ibid P. 90 [8] Ibid P. 113

طرزِ عمل کا ایک رُخ ہے۔ یہ اصلاحیت Meliorism

ولیم جونز، William Jones کے عقیدۂ ترقی و اصلاح سے متعلق ہے۔ موصوف الذکر کا خیال ہے کہ نیکی اور بدی کی طاقتیں ایک مسلسل پیکار میں جُٹی ہوئی ہیں، اور خدا قادرِ مطلق اور لامحدود نہیں ہے۔ پس بدی کی طاقتوں پر فتح پانے کے لئے خدا ہماری مدد کا محتاج ہے۔ لیکن اقبال کے فلسفے کی رُو سے انسان ایک خدا کی مدد نہیں کرتا، بلکہ اپنی جیسی لافانی اور زبردست قوّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ نام نہاد قوائے شر درحقیقت خدا کے ثانی نہیں ہیں، کیونکہ دنیا ان اناؤں پر مشتمل ہے، جو ذاتِ الہٰی سے نکلی ہیں۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کے لئے نئی ہو۔ پس اقبال کے خیال میں شر کا وجود مجازی ہے اور وہ ایک پیکرِ خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

نظریۂ اصلاحیت کی حمایت سے اقبال کا مقصد غالبًا یہ ہے کہ انسان دُنیا کے شر کو لاعلاج سمجھ کر یا یہ سوچ کر کہ دنیا کی اصلاح کرنا خدا کا کام ہے اور اس لئے دنیا یقینًا خود بخود ٹھیک ہو جائے گی، عمل سے بیگانہ نہ ہو جائے۔ ہندوستان کے فلسفیوں میں سے کسی نے عدمِ عمل جمود اور کاہلی کی اتنی خدمت نہیں کی ہے جتنی اقبال نے۔ عہدِ حاضر کے تقریبًا سب ہندوستانی مفکرین مثلًا رادھاکرشنن، ٹیگور، گاندھی، آربندو گھوش، تلک اور سوامی ویویکانند وغیرہم دنیا کی طرف منفی رویہ اختیار کرنا قابلِ ملامت سمجھتے ہیں لیکن اقبال ان چند اہلِ فکر میں سے ایک ہیں جنھوں نے اس ملامت کے اظہار اور ترغیبِ عمل اور مادّی دنیا کی تسخیر کی اہمیت کو بیان کرنے میں غلو سے کام لیا ہے۔

آربندو گھوش کا عقیدہ ہے کہ کوشش شرط ہے۔ ہر انسان فوق البشر بن سکتا ہے۔ یہ فوق البشر انسان دنیا اور اپنے نفس پر حکومت کرتا ہے۔ لیکن اس فوق البشر انسان کو برنارڈ شا Bernart Shaw اور نٹشے Nietzsche کے فوق البشر انسان سے الگ اور ممتاز سمجھنا چاہیئے۔ آربندو کا فوق البشر انسان سے الگ اور ممتاز سمجھنا چاہیئے۔ آربندو کا فوق البشر انسان مادہ سے احتراز نہیں کرتا، فطرت سے دور نہیں بھاگتا۔ اس کے برعکس وہ مادہ اور فطرت کی تسخیر اور اس پر تصرف کرتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ مادہ سے مفر کہاں۔ مادہ تو خدا کی قوت کا مظہر ہے۔ اقبال مندرجہ ذیل ابیات میں اسی خیال کی تشریح کرتے ہیں۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است   بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائب حق ہمچو جانِ عالم است   ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است

از رموزِ جزو و کل آگہ بود   در جہاں قائم بامر اللہ بود

(اسرارِ خودی صفحہ ۴۹)

یہ خلیفہ فی الواقع ایک قسم کا فوق البشر انسان ہوتا ہے، جو خدا کی طرف سے سارے عالمِ فطرت پر حکومت کرتا ہے، اور یہ امر کہ وہ خدا کے نام پر جہاں بانی کے فرائض سرانجام دیتا ہے اس بات کا ضامن ہے کہ وہ انانیت اور خود غرضی کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔ وہ جس طرح دُنیا پر حکومت کرتا ہے اسی طرح اپنی ذات پر بھی تسلط برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ اقبال لکھتے ہیں۔

نفس تو مثلِ شتر خود پرورست   خود پرست و خود سوار و خود سرست

مرد شو آور زمامِ او بکف   تا شوی گوہر اگر باشی خزف

(ایضًا صفحہ ۴۶)

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔

گر شتر بانی جہانبانی کنی   زیبِ سر تاجِ سلیمانی کنی

(ایضًا صفحہ ۴۸)

لیکن فوق البشر بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی سیرت کو مستحکم کرے اور سرگرمِ عمل رہے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار   با مزاجِ او بسازد روزگار

گر نسازد با مزاجِ او جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں

(ایضًا صفحہ ۵۵)

لیکن اسے آسمان کے ساتھ جنگ آزمائی کی ضرورت نہیں۔ انسان کا مقصد خود غرضی پر مبنی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات کا حاکم مطلق العنان ہوتا ہے، وہ ماورائے انانیت ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی اس کے لئے مصروفِ عمل رہنے کی ضرورت ہے۔

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات   لذتِ تخلیق قانونِ حیات

(ایضًا صفحہ ۵۴)

لیکن ہم خود غرضی سے کیسے نجات پا سکتے ہیں؟ ہم کس طرح اپنی فطرت پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ کیا اس کا طریقہ پورے طور پر تفویضِ ذات ہے؟ کیا عشقِ حقیقی ایسے تفویضِ ذات کا مطالبہ کرتا ہے! اقبال نفیِ ذات کے خیال کے مخالف ہیں۔ وہ نفیِ ذات کی بجائے اثباتِ ذات بلکہ استحکامِ ذات

کی تعلیم دیتے ہیں: "انسان جسمانی اور روحانی اعتبار سے ایک کامل بالذات مرکز ہے۔ لیکن ابھی اسے انفرادی کمال کا درجہ حاصل نہیں ہوا ہے۔ جتنا وہ خدا سے دُور ہوگا اتنی ہی اس کی انفرادیت ناقص ہوگی، کامل ترین انسان وہ ہے جسے ذاتِ الٰہی سے قرب کامل حاصل ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہستی ذاتِ باری تعالیٰ میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ ذاتِ الٰہی کو اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے۔[1]

اثباتِ ذات کے تصوّر کو اتنا پھیلایا ہے کہ اس کا دامن جذب خدا کے عقیدے سے جا ملا ہے۔ اب تفویضِ ذات کی کیا گنجائش باقی رہی۔ جیات ایک جاذب کن عمل ہے جس میں ذاتِ الٰہی بھی جذب ہو جاتی ہے۔

خیر و شر کی تفسیر بھی اسی جذب کن عمل کی روشنی میں کرنی چاہیئے۔ "خیر وہ ہے جو شخصیت کو مستحکم بنائے۔ شر وہ ہے جو اسے کمزور کرے۔"[2] پس ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کچھ لوگ یہ تلقین کرتے ہیں کہ ہمیں تفویض کلی کے عمل سے اپنی ہستی کو ذاتِ باری میں جذب کر کے اس کا جزو بنانا چاہیئے۔ اقبال کی تعلیم کے مطابق خدا کو اپنی ہستی میں جذب کرنے کے بعد جب ہماری اثباتِ ذات اور ادعائے خودی کی تکمیل ہو جائے گی تو ہم ذاتِ خدا میں شریک ہو جائیں گے۔ یہ واقعی ایک خطرناک نصیحت ہے، اور بہت کم لوگ صحیح طریقے پر اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس سے بہ آسانی یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ انسان خود غرضی اور خود پروری کے ذریعے سے ہی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا لیکن بہت کم لوگ ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اقبال کو اس امر کا احساس تھا کہ ہند و عقلیت اور مسلمانوں کے عقیدۂ وحدت الوجود نے لوگوں کی صلاحیتِ عمل سلب کر لی ہے اور ان کے دل میں ضعف اور نفس کشی سے پیدا ہونے والا صبر و رضا کا مادہ جسے غلطی سے صبر و قناعت کے نام سے پکارتے ہیں پیدا کر دیا جاتا ہے، اقبال ادعائے خودی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اس پر خود پروری کا شبہ ہوتا ہے۔ گویا اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خدا کو بھی مغلوب کرنا چاہیئے۔ لیکن اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا، کیونکہ وہ کہتے ہیں۔

از رموزِ زندگی آگاہ شو   ظالم و جاہل زغیر اللہ شو

(اسرارِ خودی صفحہ ۵۷)

چنانچہ اقبال نے خدا کے متعلق ہمارے فرض اور اس کے ذریعہ خدا کی افضلیت کا بار بار اعادہ کیا ہے۔[1] تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کے کلام میں ادعائے خودی کی اہمیت کو بہت زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہو سکتا ہے کہ تسلیم و رضا اور جمود کی پیدا کردہ خرابی کے سدِّ باب کے لئے اقبال نے ایسا کیا ہو۔ اپنے ادعائے خودی کے مسئلہ کی مناسبت سے اقبال ایک پُر زور اور جارحانہ عشق کے اصول کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہمیں خدا سے عشق کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے ہم اپنی ہستی خدا کے سپرد نہیں کرتے۔ بلکہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں عشق میں قوتِ اتحاد ہوتی ہے، لیکن ہم اس کے ذریعے خدا کی وحدت میں شریک نہیں ہوتے، بلکہ خود خدا کو اپنی وحدت میں شریک کر لیتے ہیں۔

اگر ہمیں اپنی ہستی کا اثبات کرنا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم یہ کہہ کر اپنی خواہشات کو ترک کر دیں کہ ان کا تعلق جسم سے ہے روح سے نہیں۔ اقبال ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہم اپنی مادی طبیعت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار   تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

(ایضاً صفحہ ۱۶)

آرزو صیدِ مقاصد را کمند   دفترِ افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد   شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

(ایضاً ۱۷-۱۶)

زندگی صید افگن و دامِ آرزو   حسن را از عشق پیغامِ آرزو

(ایضاً صفحہ ۲۷)

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں اقبال اس اصول کی حمایت نہیں کر رہے کہ انسان کو اپنی ہر خواہش پوری کرنی چاہیئے۔ یہاں انھوں نے خدا

---

[1] Introduction to Asrar-i- Khudi P. XIX

[2] Ibid P. 22

[1] Ibid P. 22

متعلق ہمارے فرائض کو بیان کیا ہے اور قدرتی طور پر ہماری خواہشات ان فرائض کے حسب حال ہونی چاہئیں۔ انھوں نے جو خواہشات کو اتنے[1] آسمان پر چڑھایا ہے اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ آخرت پرستی اور عالم مادی سے فرار کی تعلیم کے اثر کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔

اثباتِ ذات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش میں مصروف رہیں، اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ مادے پر تصرف کرکے اُسے اپنی ذات کا جزو بنایا جائے۔ ع

غیر او پیداست از اثبات او (ایضاً صفحہ ۱۲)

اثباتِ خودی کی تاکید نے اقبال کے فکر پر انفرادیت کی چھاپ لگائی ہے۔ اگرچہ خدا کی اطاعت اور مکمل ضبطِ نفس کے تصور نے اس انفرادیت کو بہت معتدل بنا دیا ہے۔ اقبال نے رومی کا نظریہ کہ انسان کا ارتقا مادے سے ہوا ہے اختیار کیا ہے، اور اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ انسان کی بقائے دوام اس کی ذاتی کوششوں پر منحصر ہے۔ وہ فرماتے ہیں "اگر انسان خود پیش قدمی نہ کرے۔ اگر وہ اپنی ہستی کی لطافتوں اور گہرائیوں کی نشوونما نہ کرے، اگر وہ ترقی پذیر زندگی کے اندرونی تقاضوں کو محسوس کرنا بند کردے تو اس کا نفس، پتھر کی طرح سخت ہو جائے گا۔ اور اس پر بیجان مادے کی طرح جمود طاری ہو جائے گا۔"[2] جیسا کہ ہم آربند و گھوش کے فلسفے میں دیکھتے ہیں رومی کا عقیدہ ہے کہ مادہ منازل ترقی طے کرکے نباتات کی شکل اختیار کرتا ہے، اور زیادہ ارتقا کے بعد حیوانات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور پھر مراحل ترقی میں سے گزرنے کے بعد ذہن بن جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مادے کا ارتقا بشریت کی منزل پر پہنچنے کے بعد رُکتا نہیں۔ انسان کو اور زیادہ بلندی کی طرف بڑھنے کی ضرورت ہے اور اپنی ذاتی کوششوں سے اپنی ہستی کو وجودِ باری میں ضم کر دینا چاہیئے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ قعرِ پستی میں گر پڑے اور دوبارہ بیجان مادہ بن جائے، اور از سرِ نو مدارجِ ترقی طے کرنے کی کوشش کرنی پڑے۔

اقبال کا عقیدہ ہے کہ "بقائے دوام ہمارا ذاتی حق نہیں ہے ہمیں اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انسان اس کا امیدوار ہے"[2] روح کی حیاتِ جاوید عطیۂ ایزدی نہیں ہے۔ یہ ایک مقام فوز و فلاح ہے۔ قیدِ وجود سے آزاد ہونا ہی کائنات کی تخلیق کی غرض و غایت ہے۔ اس وادی میں روحیں گھڑی جاتی ہیں۔

۴

اگرچہ اقبال کا روئے سخن اہلِ اسلام کی طرف ہے۔ لیکن ان کے پیغام سے دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی اتنے ہی مستفید اور مستفیض ہو سکتے ہیں۔ ابتداً ہندو اور مسلمان دونوں انھیں عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن بعد میں ان کی حمیتِ دینی میں غیر مسلموں کو فرقہ پرستی کا رنگ دکھائی دینے لگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن کے فلسفے کو اور بھی زیادہ وسیع مقبولیت حاصل ہوتی۔ اور ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کو ایک لڑی میں منسلک کرنے کا سہرا ان کے سر بندھتا۔ بہرحال ان کے دینی نظریات سے قطع نظر ان کے افکار فلسفیانہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

۵

اگرچہ اقبال کو مقدم حیثیت شاعر کی اور ثانوی حیثیت فلسفی کی حاصل ہے۔ تاہم فلسفۂ زمان و مکان اور حقیقت کی ماہیت میں ان کو گہری بصیرت حاصل تھی۔ ان کے کلام میں جابجا زور اور تاکید نمایاں ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے فلسفۂ اثبات ذات کو کافی منظم طور پر ترتیب دیا ہے، اور اس وقت ایشیا کی تمام قوموں کو اس فلسفے کی ضرورت ہے۔ ان کی حیثیت شخصی ہی نہیں بلکہ اطلاقی بھی ہے۔ اس اطلاقیت کے باوجود انھوں نے انسانی خودی کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی دلی کوشش کی ہے۔ ان کا فلسفہ دینی ہے لیکن انھوں نے فلسفے کو دین کا خادم نہیں بننے دیا۔

بڑے آدمیوں کے متعلق بہت کچھ کہا سنا جاتا ہے لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں صحیح طور پر سمجھا نہیں جاتا۔ اقبال کا بھی یہی حشر ہوا۔ اُن کو سمجھنے کی متعدد کوششیں ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں: کیونکہ شاعر کے کلام کا لوگ جو مطلب چاہیں نکال لیں۔ میں پیشین گوئی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ بالآخر اقبال کی تصنیفات کا فکرِ انسانی پر کیا اثر ہوگا! اقبال کے متعلق کہا گیا ہے کہ "وہ اپنے زمانے کا انسان ہے۔ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ نیز یہ کہ اسے اپنے زمانے سے کوئی اتفاق نہیں لیکن اس قدر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ ان کا کلام عارفانہ اور ان کا فلسفہ اطلاقی ہے، انھیں دنیا کے شاعروں اور فلسفیوں کی صف میں ایک مستقل مقام حاصل ہوگا۔

[1] The reconstruction of religious thought in Islam P. 16 [2] Ibid

وقار احمد رضوی

گذشتہ شب

دیارِ مصر کے نامور ادیب اور عظیم فن کار استاد مصطفٰے لطفی المنفلوطی کے ایک افسانوی مضمون "البعوض والانسان" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ منفلوطی دنیائے ادبِ عربی میں مصرِ جدید کا سب سے بڑا اور مشہور ادیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ مصر کے شہر منفلوط کے ایک مؤقر خانوادۂ قضاۃ میں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوا۔ جامع ازہر میں تکمیلِ تعلیم حاصل کی، اور اس کے بعد بلادِ مصریہ کے مفتیٔ اعظم علامہ شیخ محمد عبدہ المصری کے آدب علم و ادب سے خوشہ چینی کی۔ ۱۹۰۸ء سے "المؤید" میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اور بہت جلد اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ مشرقی رجحاناتِ فکر، عالمی انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ فطرت نگاری اور کیفیاتِ قلبیہ کی حقیقی ترجمانی اُن کے فن کے اجزائے ترکیبی ہیں حقیقت سے عشق اُن کے آئینۂ فہم و ادراک کا وہ جوہر ہے جس نے اُن کو آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بنا کر چمکایا۔ اپنے فن کی اس اہم خصوصیت کے متعلق مقدمۂ "النظرات" میں انھوں نے خود اپنے نظریۂ ادب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میرے نزدیک بہترین ادیب اور بہترین شاعر وہ ہے جو اپنے قلبی احساسات اور مطالعۂ فطرت کے تاثرات کو بے کم و کاست پیش کر دے، اور اس کمال کے ساتھ کہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ گویا ان کیفیات کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ یا اُنھیں مجسّم کر کے اُن کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔"

لیکن افسوس کہ ایشیا کی اس عظیم شخصیت کو قضا و قدر کے ہاتھوں نے ہم سے بہت جلد چھین لیا۔ (منفلوطی کا انتقال غالباً ۳۲-۱۹۳۳ء کے درمیان ہوا) اور آج بھی جب کہ اُن کو ہم سے جدا ہوئے عرصہ ہو گیا۔ نہ صرف مصر بلکہ ایشیا کی "مجروح روح" اُن کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔ کہ وہ جہادِ حریت کا بہادر سپاہی، انسانی ہمدردی کا مبلّغ، مظلوموں اور غریبوں کا ہمدرد اور حق کا پجاری تھا۔ "النظرات" (افسانوی مضامین کا مجموعہ) کے علاوہ "الفضیلتہ"، "الشاعر"، "فی سبیل التاج"، "الانتقام" اور "ماجدولین" ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ (وقار)

"گذشتہ شب" میں اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں قلم تھا، اور میں اپنے اس پسندیدہ موضوع پر غور و فکر کر رہا تھا جس پر میں کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ اور یہ میری عادت ہے جس کو میرے اکثر احباب جانتے بھی ہیں کہ میں رات کے سکون میں لکھنے کا عادی ہوں، دن کی کدوشن میں نہیں۔ اہلِ فلسفہ اور صنائع، بدائع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے یہ مقصود کرلیں کہ میں مراعات النظیر پیدا کرنا چاہتا ہوں، رات کی تاریکی اور دوات کی سیاہی کے درمیان۔ یا یہ کہ میں اختر و نجوم کے طلوع ہونے کا انتظار کرتا ہوں۔ تاکہ میں اُن کی ضیا پاشیوں کی رہنمائی میں آسمانِ فکر و نظر تک رسائی حاصل کر سکوں کیونکہ یہ ناممکن سا ہے، اور لوگ میرے بارے میں اتنی تحقیق نہیں رکھتے جتنا کہ میں اپنے متعلق جانتا ہوں۔ مختصر یہ کہ یہ میری عادت ہی اور بس۔

ابھی میں اپنے موضوع کے متعلق غور و فکر ہی کر رہا تھا کہ میں نے اپنے کان میں مچھر کی بھنبھناہٹ سنی، اور پھر جب میں نے اپنے ہاتھ میں اس کے ڈنک مارنے کو محسوس کیا تو میرے ذہن سے وہ تمام چیزیں غائب ہو گئیں، جو میں نے سوچی تھیں، اور اس کے عوض ایک خلش پیدا ہو گئی۔ میں نے قلم رکھ دیا، اور اپنے اس نئے ملاقاتی کی مدافعت کے لئے مستعد ہو گیا۔ میں نے اس کو جھو رہی سے اُڑانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اُڑان میں زیادہ قوت رکھتا تھا، بہ نسبت میرے ہاتھ کی سرعتِ مدافعت کے۔ میں نے اس کے نکلنے کے لئے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ لیکن اس کے برعکس باہر کے مچھر بھی

کمرے میں داخل ہو گئے۔ تب میں نے اُن کے مار ڈالنے کا ارادہ کیا لیکن وہ سب منتشر ہو گئے۔ اور اگر وہ سب ایک دائرے میں مجتمع ہوتے تو خدا کی قسم میں ایک ہی ضرب میں اُن کی نسل کا خاتمہ کر دیتا۔ لیکن یا للعجب، میں نے اپنی زندگی میں ایسی کوئی قوم نہیں دیکھی جس کو بجائے اجتماعیت کے انتشار و تفریق فائدہ مند ہو۔ سوائے مچھروں کی جماعت کے۔ پر آہ! یہ انسان بھی کس قدر ضعیف ہے۔ اور اپنی طاقت و شوکت پر گھمنڈ کرنے اور اپنے نفس کو افضل ترین سمجھنے میں کس قدر کوتاہ ہے۔ اس کا یہ اعتقاد کہ کائناتِ ارضی کی عنانِ حکو مت اس کے ہاتھ میں ہے۔ کس قدر خام ہے، اور وہ اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے جس طرف چاہتا ہے اس کی لگام موڑ دیتا ہے، اور پھر جس طرح چاہے اس کو رکھتا ہے۔ اور یہ کہ اگر وہ اس عالمِ آب و گِل میں قدیم نظامِ ملک و معیشت کو مٹا کر ایک انقلاب پیدا کرنا چاہے تو وہ انقلاب اس کے عزم اور فکر و عمل کا مرہونِ منّت ہوگا۔ غرض اس کو اپنے متعلق زعمِ باطل ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس چھوٹے سے کیڑے (جو نہ صلاحیت فہم و ادراک رکھتا ہے اور نہ کوئی قدر و قیمت) کے زہرآگیں حملوں کے سامنے اُسی طرح بے بس ہے جس طرح شیر کے پنجوں میں پہنچ کر صیدِ آشفتہ قسمت، مگر یہ سب اس کا زبانی جمع خرچ ہے، اور اگر وہ اس حقیقت کو واقعی جان لیتا تو پھر وہ اپنے نخوت و غرور سے محترز ہو جاتا۔ اس کے کبر و تکبر کا شیشہ پاش پاش ہو جاتا، اور اُسے یہ یقینی طور پر معلوم ہو جاتا کہ انسان، حیوانات، نباتات اور جمادات سب اس قوتِ غیبی کی نگاہ میں مساوی درجہ رکھتے ہیں جس کی عظمت و جلالت کے سامنے نہ طاقت کام آتی ہے، اور نہ سلطنت و جبروت۔ جب میں اس جانور کے معاملے سے عاجز آ گیا تو میں نے صبر کی پناہ گاہوں کی راہ لی، اور صبر، جیسا کہ اصحابِ صبر و قناعت جانتے ہیں کہ وہ "برہانِ عاجز" اور "حیلۂ ناتواں" کا دوسرا نام ہے اور وہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ ملامت کرنے والوں کی لعنت و ملامت دُور کرنے کا۔ تب میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر مچھر میری بات کے سمجھنے کا شعور رکھتا تو میں ضرور اپنی داستانِ حیات اس کے گوش گذار کرتا، اور اس سے درخواست کرتا کہ وہ مجھے ایک لمحے کی مہلت دے دے کہ میں اس میں اپنے اس مضمون کی تکمیل کر لوں۔ پھر اس کے بعد میرے جسم اور خون کا ہر حصّہ اس کے لئے اسی طرح حلال ہوتا جس طرح اب۔ لیکن افسوس نہ وہ میری شکایت سُن سکتا ہے اور نہ وہ میری عجز و ناتوانی پر رحم کھا سکتا ہے۔ اور نہ اسے اندازہ ہے اخلاق و مروّت کی قدر و قیمت کا۔ کیونکہ وہ انسان نہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مچھر کے دہریلے انجکشنوں نے میرے فہم و ادراک سے کچھ حصّہ لے لیا ہے، اور میں اُس مریض کی طرح ہذیان بک رہا ہوں جو بخار و حرارت کی زنجیروں میں گرفتار ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر مچھر انسان ہوتا تو میری شکایت کو سُن پاتا، عدل و انصاف کو بروئے کار لاتا، اور اخلاق و مروّت کی قدروں کا متحمل ہوتا، اور مچھر سے انسان کی حالت کب بہتر ہے؟ انسان کے قلب میں رحمت و مہربانی کہاں؟ اور اس کے جسم میں شرافت و فضیلت کا خون کب رقصاں ہے! کہ میں یہ خواہش کروں کہ کاش! مچھر انسان کی جگہ ہوتا، اور اس کی بھی میرے پاس کیا گارنٹی ہے کہ میں جس چیز کو مچھر گمان کر رہا ہوں وہ انسان نہیں! ممکن ہے یہ انسان ہی ہو جو مچھر کی شکل میں نمودار ہو گیا ہے، اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے جبکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ انسان اور مچھر دونوں شر کو عزیز رکھتے ہیں، اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں ہمیشہ سے یکساں رہے ہیں۔ اور رہا یہ سوال کہ وہ صورتوں میں مختلف ہیں تو کسی چیز کی مماثلت و مجانست کا زیادہ دار و مدار اس کی صفاتِ عالیہ اور ذاتی شمائل پر ہوتا ہے نہ کہ صوری مشاکلت و مشابہت پر! کیا اُس خون کی قیمت جو مچھر انسان کے جسم سے چُوستا ہے زیادہ ہے؟ بہ مقابلہ اُس خون کے جو ایک قاتل مقتول کے جسم سے برآمد کر لیتا ہے۔[1]

حالانکہ بہ نسبت قاتل کے مچھر کے خون چُوسنے میں تکلیف و ضرر کم۔ اس کا انجام پاکیزہ ہے، اور مقصد جمیل تر! کیونکہ مچھر کی فطرتِ ایذا پسندی اُس کی بقا و حیات کا لازمہ ہوتی ہے، اور یہ کہ وہ اس طرح اپنی زندگی کو طلب کرتا ہے جو اس کا فطری تقاضہ ہے۔ اور جس کے سوا وہ کسی دوسری تدبیرِ معاش کی استطاعت نہیں رکھتا، اور اگر وہ کسی دوسرے ذریعۂ معاش پر قادر ہوتا تو غالباً اس کے لئے یہ بات کہنے کا موقع نہ مل سکا کہ

---

[1] اور بقول اقبال

بات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے	ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بُوند لہو	صلۂ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بِسوہ دارِ بے زحمت	پی گیا سب لہو اسامی کا

وہ بھی انسان کی طرح تکلیف و ایذا رسانی کا محمل ہے۔ میں نے انسان اور مچھر کے درمیان اکثر صفات و خصائل میں قریبی مناسبات پائی ہیں جن میں سے کچھ کو ذکر کرتا ہوں اور کچھ کو قارئین کی ذکاوت و فطانت پر چھوڑتا ہوں۔

(الف) مچھر خون چوستا رہتا ہے۔ اپنی ضرورت سے زیادہ وہ برابر چوستا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ ابھر جاتا ہے اور پھٹ جاتا ہے تو گویا وہ موت کے راستے سے زندگی کو ڈھونڈتا ہے، اور ہلاکت کے پوشیدہ مقام میں نجات کی راہوں کا جویا ہوتا ہے۔ تب وہ اس معاملے میں اس شرابی سے مشابہت رکھتا ہے جو جام اولیں نوش کرتا ہے۔ اور سرور و انبساط سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ شراب کا کیف اس کو اکساتا ہے، دوسرے جام کے لئے! وہ دوسرا پیتا ہے، تیسرا بھی، اور برابر شراب لنڈھاتا ہے۔ یہاں تک شراب اس کو موت کے منھ میں پہنچا دیتی ہے، اور وہ اپنی اس عزیز زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جس کے متعلق وہ یہ گمان کرتا تھا کہ وہ اس کو خوشی کے جھولے میں جھلا رہی ہے، اور اس کے لئے عیش و نشاط کے سامان مہیا کر رہی ہے۔

(ب) مچھر کا طریقہ تلاش معاش اچھا نہیں، کیونکہ وہ جسم پر بیٹھنے سے قبل اپنی بھنبھناہٹ کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دے دیتا ہے جس سے سننے والا اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لیتا ہے، اور مچھر کو اس کے مقصد کے حصول سے روک دیتا ہے، یا پھر اس کو مار ڈالتا ہے قبل اس کے کہ وہ اس تک پہنچے۔ پس مچھر کی مثال اُن ارباب سیاست کی سی ہے جو اپنی قوم اور ملک کے لئے مفید مقاصد تو رکھتے ہیں لیکن اُن مقاصد کو ایک "وقت خاص" تک اپنے سینوں میں محفوظ نہیں رکھتے۔ بلکہ شور و غل اور ہنگاموں سے اُن مقاصد کو حاصل کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابھی ان مقاصد کے سلسلے کی پہلی کڑی بھی میسر نہیں آتی، کہ یکایک ؎

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

کے مطابق وہ مقاصد پیش خاص و عام طشت از بام ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ان سیاسیئین کے دشمن کو ان "مقاصد" کی اطلاع ہو جاتی ہے وہ مقابلے کے لئے خاطر خواہ سامان بہم پہنچا لیتا ہے۔ اور تحریک مقاصد کو کچلنے کے لئے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر کوئی تدبیر بروئے کار لاتا ہے۔

(ج) مچھر کی رفتار لطیف ہوتی ہے اور کاٹ سخت۔ اس کی مثال اس ساتھی کی ہے جو ظاہر میں تو خوش منظر ہوتا ہے، لیکن باطن میں خراب، وہ ملاقات تو اسی مسکراہٹ سے کرتا ہے جو بظاہر پانی کی طرح پاک و صاف ہوتی ہے، اور محبوب کے ماہتابی چہرے کی طرح حسین و جمیل۔ لیکن بباطن اس کے پاس ایسا سخت قلب ہوتا ہے جس تک نہ محبت کی شعاعیں پہنچ پاتی ہیں، اور نہ صبر و وفا کے آب شیریں کی سیال موجیں۔

وہ تم سے کہتا یہی ہے کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" تاکہ وہ تمہارے دل کو موہ لے اور تمہارے نفس پر قابض ہو جائے۔ اور اس طرح تم سے تمہارے مال کو چھین لے، اگر تم اہل ثروت میں سے ہو۔ یا تمہارے ذریعے استحصال رتبہ و منزلت کر لے۔ اگر تم ذی وجاہت اور اصحاب جاہ و حشم میں سے ہو۔ اور اگر نہ تم صاحب دولت ہو اور نہ ذی جاہ، تو پھر وہ تمہیں ایسی راہ پر چلنے کے لئے اکساتا ہے جو تم سے اخلاق و مروت کی قدروں کو مٹا دے اور تمہاری شرافت و فضیلت کے پیرہن کو داغ دار کر دے۔ پس اگر بالفرض اس سے اس کی مریض زندگی صحت یاب نہیں ہوتی تو بہر حال اُس کے بغض و حسد کی آگ تو ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور بس۔

مچھر برابر مجھے ستاتا رہا، اور میں اپنے مضمون کی ایک سطر بھی نہ لکھنے پایا۔

مضمون نگاروں سے

مضامین اور نظمیں زیادہ تعداد میں جمع ہو گئی ہیں۔ اِس لئے التماس ہے کہ کم سے کم تین ماہ کے لئے بغیر طلب مضامین اور نظمیں ارسال نہ فرمائی جائیں۔

(ادارہ)

طارق اختر انصاری

ننھے کی موٹر

ننھے کی موٹر ——— ہے کتنی سُندر

پٹرول مانگے —— نا مانگے پانی
پر دوڑنے میں — گھوڑے کی نانی
اس سے نہیں ہے — کار اور بڑھ کر
ننھے کی موٹر — ہے کتنی سُندر

ننھا ہی لیکن — اس کو چلائے
اور بیٹھنے کو — جب کوئی آئے
سیٹ اب نہیں ہے — کہہ دے یہ اُٹھ کر
ننھے کی موٹر — ہے کتنی سُندر

کمروں میں گھر کے — اور گھر سے باہر
گا ہے گلی میں — گا ہے سڑک پر
ہو رات یا دن — چلتی ہے فر فر
ننھی سی گاڑی — ننھی سی موٹر

ننھے کی موٹر ——— ہے کتنی سُندر

م - خاتون

گاندھی جی

بات بہت پرانی ہے -

مہاتما گاندھی افریقہ سے ہندوستان واپس آگئے تھے۔ ہندوستان کے راج نیتک آکاش پر چھائی ہوئی تاریکی چھٹنے لگی تھی - اور گاندھی جی نے سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے سابرمتی آشرم کی بنیاد ڈالی - اس آشرم میں ذات پات، رنگ، نسل، اعلیٰ و ادنیٰ کا کوئی سوال نہیں تھا - اس میں سبھی لوگ برابر تھے - اپنی طاقت کے مطابق کام کرتے تھے حاکم و محکوم کے درمیان جو دیوار ہوتی ہے ایسی دیوار اس آشرم میں نہیں تھی - اس آشرم میں وہی لوگ رہتے تھے جن کے دل میں وطن کا پریم ہوتا تھا - اور جو اپنی غلام قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے تھے -

صبح کا وقت تھا - گاندھی جی بیٹھے ہوئے رات کے کھانے کے لئے گیہوں صاف کر رہے تھے - اس کام میں اور بھی دو چار لوگ لگے ہوئے تھے - اسی وقت ایک گریجویٹ بابو سوٹ بوٹ پہنے گاندھی جی کے پاس آئے - گاندھی جی نے ان کو نہایت پریم سے بٹھایا - گریجویٹ بابو نے گاندھی جی سے کہا -

"مہاتما جی! میرے دل میں دیش کا پریم ہے - میں دیش کی خدمت کرنا چاہتا ہوں - میرے لائق کوئی کام ہو تو دیجئے - میں کروں گا۔"

"کیوں نہیں - میرے پاس کاموں کی کیا کمی ہے ؟ کمی تو کام کرنے والوں کی ہے - آپ کے خیالات بڑے سُندر ہیں - پر جو کام میں خود کرتا ہوں وہی کام آپ کو کرنا پڑے گا"۔ گاندھی جی نے کہا -

"آپ حکم دیجئے - میں کرنے کو تیار ہوں"

"تو ذرا گیہوں صاف کرنے میں ہماری مدد کیجئے - ابھی اس کام کی بڑی ضرورت ہے - اگر گیہوں صاف نہ ہوئے تو آشرم کے تمام لوگ بھوکے رہ جائیں گے"۔ گاندھی جی کی باتیں سُن کر گریجویٹ بابو سٹپٹا گئے۔ انھوں نے تو سوچا کہ کوئی مضمون یا تقریر لکھنے کا کام ملے گا - اور وہ بابو جی اسی مقصد سے آئے بھی تھے -

مجبوراً گریجویٹ بابو گیہوں صاف کرنے لگے - گاندھی جی چہرے کو دیکھ کر ساری باتیں سمجھ گئے لیکن خاموش رہے - گیہوں صاف کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی - گریجویٹ بابو گھبرا گئے - بولے -

"اب اجازت دیجئے"

گاندھی جی تو یہی سُننا چاہتے تھے - انھوں نے گریجویٹ بابو کو اجازت دیتے ہوئے کہا -

" فیشن کے لئے تو بہت سے لوگ دیش کی خدمت کرنا چاہتے ہیں - لیکن سب اسے نبھا نہیں سکتے - صرف مضمون لکھنے اور تقریر اخباروں میں چھپوانے ہی سے دیش کی خدمت نہیں ہوتی - جس کے دل میں دیش کی محبت ہو گی وہ تو ہر کام کو کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے گا - ہمارے دیش کے طالب علم صرف لکھنے پڑھنے ہی کو کام تصور کرتے ہیں - لیکن ان چھوٹے چھوٹے کاموں کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے ---"

(ہندی سے)

محمد فیاض

میاں کی سالگرہ

ایک تھے لکڑ ہارے میاں - اُن کے ایک بیوی تھیں ...!

تم نے ایسی کہانیاں نہ جانے کتنی دفعہ سُنی ہوں گی - آج ہم تمہیں اس طرح کی ایک کہانی سُنانے ہیں - اب تک تم نے میاں بیوی کی جو کہانیاں سُنی ہوں گی وہ سب پُرانے زمانے کی تھیں - لیکن ہم جن میاں بیوی کی کہانی سُنائیں گے وہ آج کل کے میاں بیوی ہیں -

اچھا سُنو! میاں کہیں ملازم تھے وہ صبح دس بجے کھانا کھا کر دفتر چلے جاتے - بیوی گھر میں دن بھر کُرسی کے بعد اور پلنگ کے بان توڑا کرتیں - پڑوسیوں پر رُعب جماتیں' رسالے پڑھتیں سہیلیوں کو خط لکھتیں اور اگر کبھی غصّہ آجاتا تو ایک آدھ شیشے کے گلاس یا چینی کے برتن کے سر جاتا -

ایک روز میاں دفتر سے بہت پہلے واپس آگئے - گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا بیوی مُنہ سکوڑے ذرا پریشان سی بیٹھی ہیں - میاں کو دیکھتے ہی زبردستی مُسکرائیں اور پوچھا - "ارے! آج آپ بہت پہلے چلے آئے؟" میاں بھی جواب میں مُسکرائے اور اِٹھلاتے ہوئے اس طرح بولے جیسے کوئی بات چُھپا رہے ہوں - "آج ایک خاص موقعہ ہے - بُوجھ جاؤ تو جانیں"۔

بیگم صاحبہ کو میاں کی اس بات پر پیار آنے کے بجائے وہ سارے حادثات یاد آگئے جو دن میں پیش آئے تھے - اور اُن کا مُنہ پھر لٹک گیا - ہاتھ آگے کو جھٹکتے ہوئے بولیں "خاک ہوگا خاص موقعہ - آج تو میں دن بھر اتنا پریشان ہوئی کہ میں ہی جانتی ہوں - البتہ میرا تو سر دکھنے لگا توبہ توبہ"! میاں کُڑھ کر رہ گئے پھر بھی بیوی کی دلجوئی کرتے ہوئے پوچھا - "کیوں کیا ہوا بتاؤ تو سہی - کہیں گر پڑیں' چوٹ آگئی"؟ بیوی بولیں "اے ایک گر پڑیں - گر پڑنے ہی پر معاملہ ختم ہوجاتا تو کیا تھا - میری ایک دوست آگئی تھیں اُن کے لیئے چائے بنا کر لا رہی تھی کہ برآمدہ میں پیر پھسل گیا" میاں اچھل پڑے - "اُنہ بات پوری کر دی" - "اور وہ نیا چائے کا سٹ جو میں ابھی حال ہی میں لایا تھا چکنا چور ہو گیا؟" بیوی چڑ گئیں "تم کو سٹ کی پڑی ہے اور میری کہنیاں اور گھٹنے چھل کر خون خرابا ہو گیا" میاں پر رُعب پڑ گیا فوراً لجاجت بھرے لہجے میں بولے "تو میں کچھ کہہ تھوڑا ہی رہا ہوں ٹوٹ گیا تو ٹوٹ جانے دو - بولو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" بیوی ذرا نرم پڑیں تو میاں نے پھر پوچھا "اور کوئی نئی بات؟" وہ سوچ ہی رہے تھے کہ بس اس کے بعد وہ بیوی کو یاد دلائیں کہ آج ان کی سالگرہ ہے اور پوچھیں کہ کیا کیا انتظامات
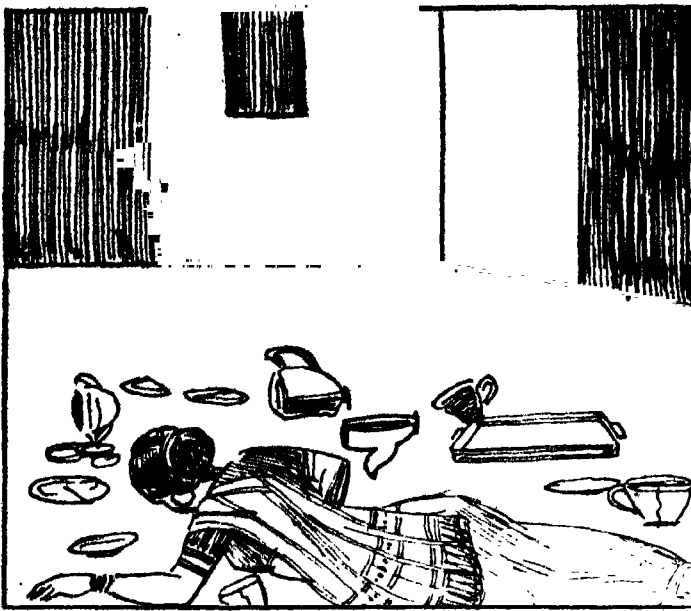
ہوتے ہیں کہ بیوی نے دکھڑوں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا - دہلی سے اختر بھیا کا تار آیا تھا کہ اُن کا بٹوہ چوری ہو گیا' انھوں نے روپے مانگ بھیجے تھے ۔ میں نے میز کی دراز میں جو نوٹ رکھے تھے انھیں فوراً بیمہ کر دیا" - میاں سے صبر نہ ہو سکا فوراً بات کاٹ کر پوچھ بیٹھے "گن بھی لیا تھا انھیں روپوں میں مکان کا کرایہ بھی تھا" - بیگم نے لاپروائی سے جواب دیا "گن تو ضرور لیا ہوتا لیکن اُس وقت دیکھا کہ مٹھو پنجرے کی کھڑکی کھول کر اُڑا جا رہا تھا - میں نے اسی طرح لفافہ چپکا کر ملازم کو دے دیا اور اسے پکڑنے کو دَوڑی' لیکن کم بخت اڑ ہی تو گیا - طوطا چشم! ہاں سُنو! میں آج تم سے کوئی بڑی ضروری بات کہنے والی تھی لیکن اس کم بخت حافظہ کو کیا کہوں" میاں حافظہ کی صحت کی دعائیں دل ہی دل میں مانگ رہے تھے کہ شاید بیوی کو ان کی سالگرہ خود ہی یاد آ جائے لیکن وہ تو آج حادثات ہی میں اُلجھی ہوئی تھیں مبارک موقعوں کے لئے وقت کہاں تھا - بولیں "اس وقت میں بازار جانے کی جلدی میں تھی - کل حسن برادرس کی دکان پر اپنی چھتری بھول آئی تھی اس کو لینے جا رہی تھی لوٹ کر جب آئی تو تم دفتر جا چکے تھے"۔

میاں نے پوچھا "تو مل گئی چھتری"؟ بیوی نے جواب دیا "ملتی کیا خاک اتنی بڑی دکان ہے - بیسیوں لوگ ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں اُٹھالی ہو گی کسی بدبخت نے" - میاں نے اس نقصان پر اپنا مُنہ پیٹ لیا بولے "اُفوہ! اتنی قیمتی چھتری اور تم نے اس آسانی سے گُما دی - ابھی پچھلے ہفتے ہی لی گئی تھی" - بیوی چٹک کر بولیں - "اب تم چھتری کو بیٹھ کر رونے لگے' میں سوچ رہی ہوں کہ صبح کوئی بات تھی جو میں تم سے کہنا چاہتی تھی ..." [تھوڑی دیر سوچتی رہیں پھر چونک کر] "ہاں! ایک اور حادثہ سُنو ——— میں میز صاف کر رہی تھی کہ جھاڑن لگ کر ٹائم پیس گر پڑی - شیشہ تو بال بال بچ گیا لیکن گھڑی اسی وقت بند ہو گئی - میرے خیال میں گھڑی ساز کو دکھائے بغیر ٹھیک نہیں ہو سکتی - مجھے وقت تو بہرحال دیکھنا ہی تھا' سوچا کہ لاؤ تمھارے ابو جان کی دی ہوئی سونے کی گھڑی میں چابی دے کر رکھ لوں - ایک دو دفعہ گھمایا ہو گا کہ اس میں سے کھر کھر کی سی آواز آئی اور پھر نہ وہ چلی نہ ہی چابی بھری' میں ان سب باتوں سے اتنا پریشان ہوئی کہ کیا بتاؤں ابھی ابھی تھک کر یہاں آرام کرنے لیٹ گئی" -

میاں اب کوئی کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہ تھے بولے "اچھا بھئی اب تو سب کچھ سُن لیا اور بھوک بھی خوب لگ آئی ہے کچھ چائے واے ملے گی یا نہیں"؟

" ارے ہاں دودھ کا سانحہ تو تمھیں بتایا ہی نہیں - صبح کا رکھا ہوا دودھ تو پھٹ ہی گیا تھا - میں نے مہمان کے لئے جو بازار سے منگوایا تھا اس میں سے تھوڑا سا رکھا تھا لیکن اس ہنگامے میں اسے اچھی طرح ڈھکنا بھول گئی تھی نہ جانے کس

وقت وہ موٹی بلی آئی اور سارا سُرک گئی اب تو بھئی تمہیں حمیدن (نوکرانی) کا انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن وہ منحوس بھی دیکھو جو آئے میں نے صبح اُسے دیر سے آنے پر جو ڈانٹا تو تنک کر بولی کہ "بی بی میں نے ہاتھ بیچے ہیں عزت نہیں۔ آپ سے کہہ تو دیا کہ لڑکا بیمار تھا اس کے لئے اسپتال دوا لینے چلی گئی تھی اس لئے دیر ہو گئی۔"

میں نے اسے خوب کھری کھری سُنائی اور صاف صاف کہہ دیا کہ میں اپنے گھر میں نوکر چاہتی ہوں نواب زادی نہیں جو مجھ سے مُنہ در مُنہ تڑاق تڑاق باتیں کرے۔ تم کو کام کرنا ہے تو کرو نہیں یہ سمجھ لو کہ شہر میں نوکرانیوں کا قحط نہیں ہے ـــــ خیر بھئی بُرا نہ ماننا مجھ سے ناشتہ بنانے کو اس وقت نہ کہنا میں بے انتہا تھک چکی ہوں۔ لیکن ذرا ٹھہرو۔ یاد آگیا۔ ابھی کچھ پھلکیاں تو بچی رکھی ہوں گی۔ البتہ ٹھنڈی ضرور ہو گئی ہوں گی۔ خدا آپ کو جیتا رکھے ذرا دو قدم نعمت خانے تک جا کر خود ہی اُٹھا لائیے۔ اُوہ میں کتنا تھک گئی ہوں"۔

تو اس طرح میاں نے اس روز اپنی سال گرہ منائی۔

الطاف حسین

لطیفے

اُستاد ۔ بچو! اُستاد کو ہمیشہ باپ کی جگہ سمجھو
ایک لڑکا ۔ بہت اچھا ماسٹر صاحب ۔ مگر ماسٹر صاحب! میرے باپ تو مجھے ۲ ر روزانہ جیب خرچ کے دیتے ہیں

جج ۔ (ملزم سے) تم نے اسے خنجر کیوں مارا؟
ملزم ۔ حضور! جلدی سے میان سے تلوار نہ نکل سکی

ہیڈ ماسٹر ۔ (خاکروب سے) آج صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیوں نہیں کیا؟
خاکروب ۔ حضور آج بارش تھی۔ اس لئے
ہیڈ ماسٹر ۔ کمبخت! تو چھتری لے لیتی تھی۔

گاہک ۔ (دوکاندار سے) مجھے اچھے سے دو جُوتے چاہئیں۔
دوکاندار ۔ بہت اچھا۔ میں جناب کو ایسے جُوتے دونگا کہ آپ عمر بھر یاد کریں گے

باپ نے اپنے نوجوان بیٹے سے کہا میں تو سگریٹ نہیں پیتا پھر تم نے کیوں پینا شروع کر دیا؟
بیٹے نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا "یہ میرے بالغ ہونے کی نشانی ہے پتا جی"۔
باپ نے گھبرا کر پوچھا "تو کیا میں ابھی بالغ نہیں ہوا؟"

محمد عبدالرحمن الہ آبادی

برق اور برقی کرشمے

بچو! تم لوگوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے بجلی کا نام نہ سنا ہو۔ بجلی کا نام سنتے ہی بعض بچوں کو اپنے گھر کا ریڈیو یاد آجائے گا۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے اس میں خاص طور پر ایک الگ پروگرام ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پسند کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ کسی کو قصہ کہانی سے دلچسپی ہے تو کسی کو ڈرامے سے۔ آؤ آج برق کے کرشمے دیکھیں۔ بجلی کے ذریعے تو ہر ناممکن بات ممکن ہوئی جا رہی ہے۔

بچو! بجلی عام طور سے دو طرح کی ہوتی ہے۔ پہلی وہ ہے جو کہ رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ تم نے برسات کے دنوں میں بادلوں میں چمک دیکھی ہوگی اور ساتھ ہی دل ہلا دینے والی گڑگڑاہٹ سنی ہوگی۔ وہ اسی رگڑ والی بجلی کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کی بجلی کو Frictional Electricity کہتے ہیں۔ دوسری طرح کی بجلی وہ ہوتی ہے جو ایک بہاؤ میں بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کو Current Electricity کہتے ہیں۔ اے۔ سی اور ڈی۔ سی کرنٹ کا نام تم نے سنا ہوگا۔ یہ اسی طرح کی ہے۔ لیکن دونوں کی طاقت برابر ہی ہوتی ہے۔

بچو! تم نے اپنے شہروں کے پاور ہاؤس کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ تم میں سے بعض بچوں نے تو اسے دیکھا ہوگا۔ یہ تقریباً ہر شہر میں ہوتا ہے۔ ایک طرح کی مشین ہوتی ہے جس کو ڈائنمو کہتے ہیں اس کے ذریعے بجلی پیدا کی جاتی ہے اور تانبے کے تاروں

کے ذریعے مختلف مقامات میں پہنچائی جاتی ہے۔

بجلی کے اثر سے بھی زیادہ تر بچے واقف ہوں گے۔ تم میں بہت لوگ سمجھو گے کہ بجلی کے بدن سے چھو جانے سے وہ یا تو پکڑ لیتی ہے یا زور سے دھکا لگتا ہے بس یہی بجلی کا اثر ہے۔ لیکن اصل میں یہ بات نہیں ہے۔ ہم دوسری طرح کے دو اثرات کا ذکر کریں گے۔ ایک کو تو برقی حرارت اور دوسرے اثر کو برقی روشنی کہتے ہیں۔

اب ہم پہلے برقی روشنی کے بارے میں کچھ کام کی باتیں بتائیں گے جب تک بجلی تانبے کے موٹے تار سے گزرتی ہے تب تک کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن اگر بجلی کو تانبے کے پتلے تار سے گزرنا پڑے تو اس کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ رکاوٹ کے پیدا ہونے سے گرمی ہوگی جس سے تار سرخ ہو جاتا ہے اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی اصول پر بجلی کا بلب بنا ہے۔ بچو! تم نے دیکھا ہوگا بلب کے اندر بہت ہی باریک تار ہوتے ہیں۔ جتنا ہی باریک تار ہوگا اتنا ہی زیادہ بجلی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس بلب کے اندر کی ہوا پمپ کے ذریعے نکال لی جاتی ہے۔ ۱۸۸۰ء میں

ایڈیسن صاحب نے کاربن فلیمنٹ کا بلب ایجاد کیا۔ لیکن آج کل زیادہ تر
ٹنگسٹن کے فلیمنٹ کے بلب استعمال ہوتے ہیں۔ آج کل ان میں غیر عامل
گیس جیسے نائیٹروجن وغیرہ بھر دیا جاتا ہے جس سے رنگین ہو جاتے
ہیں۔

دوسرا برقی اثر یعنی برقی حرارت ہماری روزانہ کی زندگی میں
بہت ہی کارآمد ثابت ہوئی۔ اگر تھوڑی دیر بلب جلتا رہے اور پھر
اس کو چھوا جائے تو بلب گرم معلوم ہوگا۔ بلب ہی کے اصول پر برقی
بھٹیاں، استری وغیرہ بھی بنائی جاتی ہیں۔

بچو! کیا تم نے ٹیلی فون دیکھا ہے۔ یہ بھی ایک برقی کرشمہ ہے
ٹیلیفون اس آلے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے ایک مقام سے بیٹھا
ہوا آدمی دوسرے مقام کے آدمی سے باتیں کر سکتا ہے۔ اس کے
موجد ایلگزنڈر گراہم تھے۔ جو لوگ مستقل طور پر ٹیلیفون رکھتے
ہیں ان کو سالانہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس آلے کے دو حصے
ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ساتھ ہوتے ہیں تاکہ بیک وقت بولا اور
سُنا جا سکے۔ ایک حصہ وہ ہے جس سے سنتے ہیں اور دوسرا بولنے کا
حصہ ہے۔ ٹیلیفون کا تعلق براہ راست ایکسچینج آفس سے ہوتا ہے
یہ آفس عام سہولت کے لئے دن رات کھلا رہتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر
کے ذریعے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ جب ہم لوگ بولتے
ہیں تو ہوا میں ایک طرح کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہ لہر ہوا کے ذریعے
ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتی ہے۔

بچو! اسی طرح خبریں ٹیلیگرافی کے ذریعے بھی ایک جگہ سے دوسری
جگہ بھیجی جا سکتی ہیں۔ کئی سائنس دانوں نے برقی قوت کو استعمال
کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں مورس صاحب نے اپنی کنجی اور بولنے
والا آلہ ایجاد کیا۔ اس کے تین حصے ہوتے ہیں:-

۱۔ خبریں بھیجنے والا۔ (ٹرانسمیٹر)

۲۔ تار کی لائن ۔ (لائن وائر)

۳۔ خبریں حاصل کرنے والا۔ (ریسیور)

اس طرح کا آلہ ہر شہر میں ہوتا ہے۔ اور ڈاٹ۔ ڈیش کے ذریعے
خبریں بھیجی جاتی ہیں۔ جب کوئی خبر بھیجنی ہوتی ہے تو کنجی دبائی جاتی ہے
اس سے دوسرے تار گھر سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور ریکارڈر جو کچھ
اسے خبر ملتی ہے ریکارڈ کرتا ہے۔
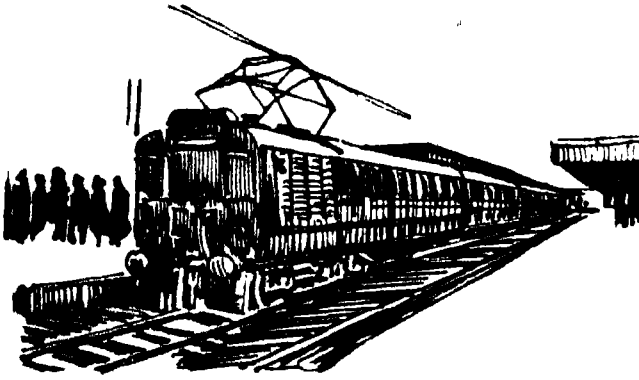
بچو! تم کبھی بمبئی یا کلکتہ گئے ہو۔ وہاں تم نے بجلی کی گاڑیاں
ضرور دیکھی ہوں گی اور غالباً اس پر سوار بھی ہوئے ہونگے۔ سب
سے پہلے ۱۹۲۵ء میں بجلی سے چلنے والی گاڑی تیار ہوئی تھی۔ لندن میں
زمین دوز گاڑیاں لوہے کی سُرنگوں میں بجلی کے ذریعے چلتی ہیں۔ اس سے
وقت کم صرف اور لوگوں کی جانیں بھی محفوظ رہتی ہیں اور دُھواں کا
کوئی ڈر نہیں رہتا۔ ان میں دروازے خود سے کھلتے اور بند ہوتے
ہیں۔ گاڑیوں کے لڑنے کا بھی خوف کم رہتا ہے کیونکہ چکردار راستے
ہوتے ہیں اور ایک راستے میں داخل ہوتے ہی تمام روشنی گل ہو جاتی
ہے۔ اور پیچھے خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ اگر ڈرائیور خطرے کا
سگنل نہ دیکھے اور گاڑی پیچھے سے آ رہی ہو تو گاڑی خود بخود
سگنل کے پاس آ کر رُک جاتی ہے۔ مختصر طور پر یہ بجلی اور اس
کے کرشمے ہیں۔

محمد عبید اللہ شریف

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

ایک وقت کی بات ہے ایک آدمی کا ایک لڑکا تھا۔ وہ بڑا بے وقوف تھا اس کی شادی ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ وہ اپنی سسرال کو جا رہا تھا۔ اس کے باپ نے کہا "بیٹا ذرا ٹھاٹ باٹ سے جانا تاکہ لوگ تیری عزت کریں۔ وہ اپنے باپ کا مطلب نہیں سمجھا اور راستے میں ٹھاٹ باٹ کھاٹ باٹ کہتا چلا۔ وہ ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ اس جنگل میں ایک چڑی مار جال پھیلائے بیٹھا تھا۔ جب یہ وہاں سے ٹھاٹ باٹ کہتا گزرا تو ساری چڑیاں اڑ گئیں چڑی مار کو بہت غصہ آیا اور اس بے وقوف کو خوب ڈانٹا اور مارا اور کہا "آتے جاؤ پھنستے جاؤ" کہتے ہوئے جا۔ اس بے وقوف نے تمام راستے میں یہی رٹ لگائی۔ راستے میں اسے کچھ چور ملے جو چوری کر کے واپس آ رہے تھے۔ انھیں بے وقوف کی یہ بات "آتے جاؤ پھنستے جاؤ" بہت بری لگی۔ انھوں نے بھی اسے خوب پیٹا اور کہا "یہ چھوڑ کے آؤ دوسرا لے کے جاؤ" کہتا ہوا جا۔ اب بے وقوف نے یہی بکواس شروع کی۔ راستے میں کچھ دیہاتی ایک مردے کو شمشان بھومی لے جا رہے تھے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ یہ چھوڑ کے آؤ دوسرا لے کے جاؤ۔" انھیں بہت غصہ آیا اور بے وقوف کی خوب مرمت ہوئی انھوں نے کہا "ایسا دن کسی کو نصیب نہ ہو" کہتا ہوا جا۔ چنانچہ وہ بے وقوف یہی کہتا ہوا جا رہا تھا اسے راستے میں ایک بارات ملی۔ جب دولھا کے باپ نے ایسا دن کسی کو نصیب نہ ہو" سنا تو کو خوب ڈانٹا اور کہا تم کسی سے کچھ نہ کہو اور سیدھے یہاں سے چلے جاؤ۔ اب اس نے اپنے سسرال پہنچ کر کسی سے کچھ نہ کہا یہ دیکھ کر ان لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ جب یہ اپنے گھر پہنچا تو باپ کو سارا کہہ سنایا۔ باپ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور کہا۔ تم بدھو کے بدھو ہی رہے"

لطیفہ

ایک دفعہ دہلی کے پلیٹ فارم پر دو مسافر ٹھہرے تھے۔ اچانک آپس میں لڑ پڑے اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ایک مسافر نے دوسرے سے "زبان کو لگام دو۔ ورنہ ایسا مکا ماروں گا کہ تم کلکتے پہنچ جاؤ گے

دوسرے نے کہا "بھائی معاف کرنا۔ مکا ذرا آہستہ لگانا کیونکہ مجھے امرتسر جانا ہے۔ کلکتے نہیں"۔

ہماری کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
جنتا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دلکش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے قیمت -/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمایئے -/۴/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے -/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزل مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت -/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو کی علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جب گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتدا اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل [illegible] میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ ملنے کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو [illegible] اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس سنجیدہ اور جاذبِ نظر [illegible] پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے [illegible] کی ہے۔"

خواجہ [illegible]

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—[illegible]

آٹھ آنے

نومبر ۱۹۵۵ء

ہماری
کتابیں
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش
سے ایک نیا مستقبل
عالم وجود میں آرہا ہے.
اس تابناک مستقبل کی جھلک
اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے
قیمت. ۴/-
پہلا پنج سالہ پلان
نیا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں
پنج سالہ پلان کے بارے
میں ہر قسم کی تفصیلات
درج ہیں۔ زبان سادہ
و دل کش ہے۔ قیمت ۲/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت
ہم سماجی بہبود کے
میدان میں کیا کر رہے
ہیں اس کی جھلک اس
پمفلٹ میں ملاحظہ فرمایئے
۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار
کیا گیا ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے۔ تصویروں او
خاکوں سے اس کی دلکشی میں
اضافہ کیا گیا ہے۔ ۸/-
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت
آمد و رفت اور رسل و رسائل
میں جو بہتریاں ہمارے
پیش نظر ہیں اس کا مفصل
نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا
کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود
کیا ہے اس کتابچے میں جامع
اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا
ہے۔ قیمت ۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوشؔ ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرشؔ ملسیانی

جلد ۱۴ —————— نمبر ۴

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

نومبر ۱۹۵۵ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق:- پرتوں پر نقاشی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

فراق گورکھپوری

غزل

آنکھوں سے جو بات ہو گئی ہے — اک شرحِ حیات ہو گئی ہے

غم سے چھٹ کر یہ غم ہے مجھ کو — کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے

مدت سے خبر ملی نہ دل کی — شاید کوئی بات ہو گئی ہے

کہتے ہیں جسے نگاہ تیری — اب برقِ صفات ہو گئی ہے

اب دل کی ہو دیکھئے کہاں صبح — ان زلفوں میں رات ہو گئی ہے

دل میں تجھ سے تھی جو شکایت — اب غم کے نکات ہو گئی ہے

جس فصل میں ہو گئے رواں اشک — گویا برسات ہو گئی ہے

اقرارِ گناہِ عشق سن لو — مجھ سے اک بات ہو گئی ہے

کیا جانیے موت کیا تھی پہلے — اب میری حیات ہو گئی ہے

گھٹتے گھٹتے تری عنایت — میری اوقات ہو گئی ہے

ہر شام جب آئی یاد اس کی — شامِ ظلمات ہو گئی ہے

اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے

جیتی ہوئی بازی محبت — کھیلا ہوں تو مات ہو گئی ہے

کوئی بھی وقت ہو مگر وہ — جب آئے ہیں رات ہو گئی ہے

دنیا ہے آج بے ٹھکانہ — عاشق کی برات ہو گئی ہے

جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے — اک برگِ نبات ہو گئی ہے

اکا دکا صدائے زنجیر — زنداں میں رات ہو گئی ہے

ایک ایک صفت فراق اس کی
دیکھا تو ذات ہو گئی ہے

ڈاکٹر محمد حسن

انشا کی شاعری

انشا نے "داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کی اس طرح شروع کی ہے۔

"دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل، اچپلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے، اپنی چوکڑی بھول جائے۔"

دیوان کے ابتدائی حصے کی ایک غزل کے آخری اشعار ہیں:

شوخی ادا سو ایسی جوشش و خروش آتا
بندش دھواں سو یہ اور طرزِ بیاں تماشا
کیا خوب واہ ماشاء اللہ ہے عجب کچھ
دیوان میر انشاء اللہ خاں تماشا

اپنے کلام کو "تماشا" قرار دینا ایسے کھلنڈرے، بانکے، ترچھے اور بچیس چھبیلے شاعر کے لئے انوکھی بات نہیں۔ انشا تو بقول محمد حسین آزاد، ان اہلِ مشاعرہ میں سے ہیں جن کی شوخی اور طراری طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دبے گی اور جو آتنا ہنسیں گے اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے، انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھرنے والوں اور پھولوں کی گیندیں بنا کر ہولی کے جلسے گرد کرد بنے والی گلباری کرنے والوں' میں انشا کا بھی شمار کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ قہقہے کے اس شور اور خوش مذاقی کے اس طوفان کے باوجود ہم انشا کو شاعروں کی صف میں عزت سے بلا کر بٹھاتے ہیں۔ ندیموں مصاحبوں اور مسخروں کے مجمع میں شامل کر کے انھیں بھول نہیں جاتے۔

انشا کو خود اپنے اور اپنی شاعری کے مستقبل کی زیادہ فکر نہیں۔ وہ حال کے شاعر ہیں اور حال میں بھی "محفل گریزاں" ان کا مقصود نظر ہے بزم شاہنشہ ہو یا مشاعرے کی محفلیں، ان کی طباعی اور ذہانت کو اس کی فکر تھی کہ ان کی بات بالا ہو اور آخری فیصلہ کن حربہ انھیں کے ہاتھ میں ہو۔ اپنی غزلوں میں ایک سے زیادہ بار انھوں نے اپنی سخن گوئی کا جواز کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ "شاعروں کے آگے تیری پشانیاں ہوں" یا "ہر ایک قافیہ کیا گرم اس غزل میں بٹھا" اور ہر رنگ کے چار پانچ اشعار اپنی غزل میں موجود ہونے پر اپنے دور کے اساتذہ سے داد تحسین حاصل کی ہے:

میر و قتیل و مصحفی و جرأت و مکیں
ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ
سو خوب جانتے ہیں کہ ہر ایک رنگ میں
انشا کی ہر غزل میں ہیں اشعار چار پانچ

مستقبل سے اس قدر بے نیاز اور حال کی فتح و نصرت میں اس قدر محو شاعر کے لئے ایسے ساز و سامان کی ضرورت تھی جو جلد اور یقینی فتح کی ضمانت کر سکے۔ یہاں وہ خاموش، متین اور شمع سوزاں کی طرح آہستہ آہستہ جلنے کا انداز کام نہ دے سکتا تھا جسے میر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہاں نفلوں سے بے نیاز اور خلوتوں کے رمز د ایما کو جاں گدازی جو میر و درد کا نشان ہے زیادہ کارآمد نہ تھی۔ انشا کو ایسی تلوار چاہیے تھی جس کے چلانے میں قوت کا مظاہرہ ہو، چاہے اس کی کاٹ زیادہ گہری اور دل میں ڈوب جانے والی نہ ہو۔

ابتداء ہی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم ایک ایسے شخص کو جو اپنے کلام کو تماشا اور آؤ جاؤ، تاؤ بھاؤ اور کود پھاند دکھانے کا ذریعہ سمجھتا ہے، جسے کسی حد تک نیاز مندی کے ساتھ ندیم و مصاحب کے منصب پر قناعت کرنے میں بھی باک نہیں، ہمارے ادبی مورخین کیوں شاعروں کی صفِ اول میں جگہ دینے پر مُصر ہیں؟

آخر وہ کون سی بات ہے جس نے ایک ایسے دور میں جب میر صاحب جرأت کی شاعری کو محض "چوما چاٹی" کہہ رہے تھے اور مصحفی شاعری اور درویشی کو دوش بدوش قرار دے رہے تھے انشا جیسے کھلنڈرے کو شاعروں کی صفِ اول میں پہنچا دیا۔ آخر وہ کون سی تبدیلی تھی جس نے یکایک خانقاہوں کو متقی "متانت اور" دل کی دنیا" کے حزن و ملال سے بے نیاز شاعر کو اپنے قہقہوں اور ہنگامہ آرائیوں سے اردو شاعری کی فضا بدلنے میں کامیاب کر دیا۔

چند غزلوں سے قطع نظر انشا نے اپنے کلام میں حزن و الم کو زیادہ راہ نہیں دی۔ اگر کوئی ان کی کلیات سے ان کے شاعرانہ مزاج اور معیارِ شاعری کے بارے میں ان کے بیانات کی مدد سے کوئی خاکہ بنانا چاہے تو قدم قدم پر ان کی شگفتہ روئی اور کشادہ جبینی کی مثالیں مل جائیں گی۔ کہیں وہ عیش و طرب کے زمزموں میں مست ہیں تو کبھی قلندرانہ شان میں:

خوش رہتے ہیں چادر ابر کی بتلا کے صفائی　　مانند قلندر
نے ہم کو غم درد نہ اندیشۂ کالا　　ہے خوب فراغت

کہیں ہمیشہ خوش و خرم رہنے کے لئے دعا سے توجہ کرتے ہیں۔

یارب انشا کو سدا عیش و طرب میں خوش رکھ
حیف ہے جورِ فلک سے ہو حزیں ایسا شخص

کبھی اپنے کو "نرے سیدھے سادے ہم تو بھلے آدمی ہیں یارو" کہتے ہیں اور کہیں اپنی شاعری کو دل کی بجائے دماغ کی تیزی و چالاکی کا نتیجہ بتاتے ہیں:

انشا دماغ شعر و سخن اب کہاں رہا
ہے سچ تو یوں کہ چاہیئے اس کو دماغ شرط

کہیں مرزا غفر غیبی کی زبان سے خود اپنا خاکہ کھینچتے ہیں اور طنز و شوخی کے سارے تیر اپنے اوپر ہی چلاتے ہیں:

"اور میاں انشاء اللہ خاں بجائے میر ماشاء اللہ کے بیٹے آگے پری زاد تھے ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے اب چند روز سے شاعر ہو گئے۔ مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرے کو نام رکھتے ہیں۔"

یہ بات بھی صحیح نہیں کہ انشا نے حسرت، ناداری اور انتشار کے دن نہیں دیکھے۔ ان کی نظروں کے سامنے دہلی کی بساط تہہ ہو رہی تھی حشمت و شوکت کی پرچھائیاں سیاہی میں غروب ہو رہی تھیں شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اہلِ کمال تتر بتر ہو رہے تھے اور حال کی وہ ساری درہمی جسے جمع کر کے میر نے دیوان کیا تھا انشا کی نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی کم از کم دو گواہیاں تو اُن کی غزلوں کے دیوان سے ملتی ہیں:

کہاں تک کروں میں زمانے کا شکوہ　　مصیبت ہے یوں تو سب اہلِ ہنر پر
خصوصاً وہ جو منصبداروں میں ہیں یاں　　برستا ہے افلاس ہی ان کے در پر
"کہارام جانی روپیہ دے گیا تو"　　کھڑا بنیا کہتا ہے اب ان کے در پہ
بیلمانی تلوار تو بے چکا ہے　　لگائی ہے اب تاک شاید سپر پہ
پڑا ہنہناتا ہے بے گھاس گھوڑا　　ہوئے چار فاقے ہیں پیہم شتر پر

دوسری جگہ کہتے ہیں:

وہ جو سردار تھے اگلے زمانے کے بڑے رستم　　یہ ان کا حال ہے اب عالم بیروزگاری میں
پڑے سوتا کمر چھے ہیں کسی ٹوٹی سی چارپائی پہ　　کہیں جو رہ گیا ہے پاؤ کوڑی بھر کناری میں
جو ڈیسے کی ڈولی میں کہیں جاتے ہیں چڑھ کر تو　　پرانی شال دیتے ہیں کہاروں کو کہاری میں
کفالت رزق کی کس سے کسی کی ہو سکے انشا　　صفت مخصوص ہے یہ تو فقط اس ذاتِ باری میں

اس کے باوجود انشاء اللہ خاں کی شاعری اضمحلال اور اداسی کے گہرے نقوش سے خالی ہے۔ انشا کی طبیعت نے اپنا بانکپن کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کے قہقہے سرد نہیں ہوئے اور انھوں نے کبھی ماضی کے مٹے ہوئے نشانات کو سینے سے لگا کر ان کا ماتم نہیں کیا۔ انشا کی شاعری کی اس شگفتگی اور کبھی نہ ختم ہونے والی زندہ دلی کی لہر کے ماخذ آخر کون سے ہیں؟

انشا کے مزاج کی گرہیں کھولنے کے لئے ہمیں اس بات پر بھی نظر رکھنی پڑے گی کہ ان کے آبا و اجداد سمرقند سے آئے تھے اور فارسی نژاد ہونے کے اعتبار سے انھوں نے اس ذوق سے خمیر پایا تھا جو علم و فضل کے لئے مخصوص تھا۔ ان کے باپ دادا میر ماشاء اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے اور زمرۂ امرا میں داخل تھے۔ جب دہلی میں سلطنت مغلیہ کا چراغ جھلملانے لگا تو میر ماشاء اللہ بھی اعزاز و معاش کی تلاش میں مرشد آباد چلے گئے۔ اور نواب سراج الدولہ کی رفاقت میں رہے جہاں بقول محمد حسین آزاد "ہاتھی دروازے پر جھومتے تھے اور یہیں سید انشا پیدا ہوئے۔"

بنگال کی فضا کا انشا نے کس قدر اثر قبول کیا یقین سے کہنا

دشوار ہے۔ ہاں اتنی بات طے ہے کہ مرشد آباد اور چوبیس پرگنہ کے علاقے خود بنگال کے رہنے والوں کے نزدیک بھی قدرتی حسن سے مالا مال کہے جاتے ہیں اور اسی لئے ان مقامات کے بنگالی شاعر اور بانداری گریوں کا کلام مادی حسن اور جسمانی نشاط کے جلووں سے بھرپور مانا جاتا ہے۔ یہی نہیں بنگالی زبان سے سیّد انشا نے یہیں واقفیت حاصل کی ہوگی جس کا اثر ان کی مثنوی "سلکِ گوہر" کے اس حصّے میں نمایاں ہے جہاں مسلمان ملاحوں کی بولی کی نقل اُتاری ہے۔ یہ حصّے بنگالی زبان اور لب و لہجہ سے مماثلت رکھتے ہیں اور بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، بنگالی ملاحوں کے گیتوں کی طرح ہیں۔

علاوہ بریں بنگال ہی کی سرزمین میں پہلی بار انشا نے آنے والے سیاسی انقلاب کے آثار دیکھے ہوں گے۔ سراج الدولہ کا دور نئے سماجی اور سیاسی عناصر کا مَورد ہے۔ انگریز بنگال میں آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہے تھے اور ان کے سیاسی اور سماجی اثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ انشا نے عمرانی زندگی کا رُخ پہچاننا نہیں سیکھا تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اس نئی تہذیب اور اس کے ظاہری رسوم و مظاہر سے ضرور روشناس ہوئے ہوں گے، خود اُن کی طباعی اور ذہانت کا یہ حال ہے کہ لڑکپن میں "کافیہ" بھی حفظ کرتے ہیں تو عربی کی نثر کی عبارت کو ستار پر بجا بجا کر یاد کرتے ہیں۔

انشا جب دہلی آتے ہیں تو اُن کی شخصیت ہمہ جہتی ہو چکی تھی۔ ایک طرف انھیں عربی فارسی کے علوم مروّجہ پر دستگاہ تھی تو دوسری طرف کچھ بنگالی، کچھ پنجابی، کچھ ترکی اور اس کے بعد بھاکا اور عام بول چال کی ہندی زبانیں بھی آتی تھیں اور علم موسیقی میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ وہ ان تمام خصوصیات اور کمالات سے مزیّن تھے جو دہلی میں ایک بار پھر امیر خسرو کے پیدا ہونے کے لئے موزوں تھے۔ انشا کی دہلی امیر خسرو کی دہلی نہ تھی۔ امیر خسرو اُبھرتے ہوئے شان و شکوہ کے دَور میں آئے تھے اور اس عزم و ارادہ کے ساتھ کہ اپنی ہمہ گیری اور صلحِ کل کے جذبے سے ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کو ایک آہنگ میں پرو سکیں۔ علم و فضل کی خلوت گزینی سے نکل کر وہ بھٹیاروں کی سرائے، پنگھٹ اور کوچہ و بازار تک پہنچے اور ایک ایسی زبان میں جو ابھی پوری طرح بنی بھی نہ تھی چٹکلے، پہیلیاں اور بیت لکھے گئے۔

انشا بھی زبانوں پر وہی عبور، موسیقی کا وہی ذوق، وہی ہمہ جہت شخصیت اور وہی شوخی و طراری لے کر دہلی آئے تھے۔ لیکن وہ تہذیب غروب ہو رہی تھی جس کے سنوارنے کے لئے انھوں نے علم و فضل سے خود کو مزیّن کیا تھا پھر امیر خسرو کے پاس ایک صوفیانہ رنگ تھا جو بے راہ روی میں بھی ایک ضابطہ اور آہنگ پیدا کر دیتا تھا۔ لیکن انشا کے پاس اپنی شخصیت کے کرامائی جادو کے علاوہ کوئی دوسرا رہ نما تھا۔

انشا دہلی کے ماتم میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کی طبیعت افسردگی اور اُداسی کے لئے نہیں تھی۔ یہاں بھی مشاعروں میں اساتذہ سے چھیڑ چھاڑ، لڑائی جھگڑے اور شاہ عالم سے شوخی اور طرّاری کی باتیں کر کے اس گھپ اندھیرے میں وہ پھلجھڑیاں چھوڑتے اور چنگاریاں روشن کرتے رہے۔ یہ معلوم نہیں کہ انشا نے دہلی میں کون سی غزلیں کہیں اور پھر لکھنؤ آ کر ان کا رنگِ تغزل کیوں کر بدلا۔ لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ انشا نے لکھنؤ میں آ کر خود کو پایا۔ یا وہ اس طرح بنے یا بگڑے جس شکل میں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

یہ دُہرانے کی شاید ضرورت نہیں کہ ایک ہی فکری سرمایہ تھا جو انشا کے دور تک ہماری اُردو شاعری کے فلسفیانہ پس منظر پر غالب رہا ہے۔ میری مراد اسلامی تصوّف سے ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسلامی تصوّف کے مقابلے میں دوسرا فلسفیانہ نظام اُردو شاعری میں فکری طور پر داخل نہیں ہُوا۔ یہ اردو ادب کی بڑی حسرت ناک حقیقت ہے کہ جس اسلامی تصوّف نے اُردو شاعری کے خیال پر صدیوں حکمرانی کی ہے اس کا تجزیہ اور مطالعہ ہنوز عالمِ طفولیت میں ہے۔ اسلامی تصوّف کی یوں تو مختلف تفسیریں اور تاویلیں کی گئی ہیں لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ نظریاتی اعتبار سے چاہے صوفیوں نے اسلامی شریعت سے الگ کوئی نظامِ فکر قائم کیا ہو یا نہ کیا ہو عوام نے تصوّف کو شریعت سے الگ اور کسی حد تک اس سے متصادم ادارہ ضرور قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی اور صوفی کی چھیڑ چھاڑ میں عوام کی ہمدردیاں صوفیوں کے ساتھ رہی ہیں انھیں کی خانقاہیں غریبوں کی دعاؤں کا مرکز بنی رہی ہیں اور انھیں خانقاہوں نے کبھی کبھی بادشاہانِ وقت کے مقابلے میں اور اکثر مروّجہ اخلاقی پابندیوں کے خلاف قدم جمانے کی ہمّت کی ہے۔

تصوّف خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اکثر ایک کمزوری سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ ہمّت شکن حالات سے بے نیاز ہونے کی منفی تاب و توانائی تو عطا کر دیتا ہے لیکن سازگار حالات میں جہانِ تازہ کی تعمیر کا حوصلہ نہیں بخشتا۔

"توشب آفریدی چراغ آفریدم" کا لہجہ اس میں شاذ و نادر ہی پیدا ہو سکا ہے۔ لکھنؤ کے حالات سازگار تھے آصف الدولہ کی ریاست شان و شوکت سے جگمگا رہی تھی اور پھر سعادت علی خاں کے دور میں جس طرح انتظامی بہتری کی صورتیں نظر آنے لگی تھیں۔ ان کے پیش نظر دہلی کے مہاجرین میں بھی اُمید و فراغ کی ایک جھلک پیدا ہوئی ہوگی۔

مادی آسودگی، انتظامی بہتری، شیعہ مذہب کا عروج اور نئی تہذیبی زندگی کا آغاز اور بعض دیگر وجوہ سے لکھنؤ کی فکری زندگی میں تصوف "برائے شعر گفتن خوب است" کی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ یوں تو خود انشا کے کلام میں تصوف کے اچھے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ ان میں شخصیت کا یقین اور اعتماد جلوہ گر نہیں یہاں تصوف چاشنی ہے جزوِ زندگی نہیں ہے۔ انشا کے کلام میں تصوف کی چند جھلکیوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

کیوں ہجر چھوڑ عابد غار و جبل میں بیٹھا | تو ڈھونڈھتا ہے جس کو وہ ہے بغل میں بیٹھا

میلے ہی میں ہے تمثال جلوۂ واجب | اگرچہ آئینۂ ممکنات ہے ناسوت

جمعیت اجزا کا کل نام ہے اے انشا | ہر چند کہ جزو میں پر موجود ہیں ہمیں کل کے

تجھے انشا اور تو کیا کھوٹ دو جہاں میں کوئی بھی طرف ہے
جو خدا کے نور سے پُر نہ ہو کہ محال دہر میں ہے خلا

صاف ظاہر ہے کہ یہ انشا کا رنگ نہیں۔

تصوف کے ذخیرے سے قطع نظر کرنے کے بعد اس دور کی شاعری کے سامنے دوسرا سرمایہ کیا تھا؟ انشا کے مزاج نے اس راستے کو اپنایا۔ تصوف کو جہاں روحانی تسکین کا ذریعہ اور اخلاقی جرأت قائم رکھنے کا وسیلہ کہا گیا ہے وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ تصوف کی دُنیا شکستِ دل کی داخلی دُنیا ہے۔ یہاں انسان باطن کے نقش و نگار میں اس قدر محو ہو کر رہنا پسند کرتا ہے کہ پائیں باغ کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی سوز و گداز کے گلدستوں سے فرصت ملی تو ماورائیت کی فضاؤں میں بلند پروازی ہمارے صوفی منش شعراء کو دھوپ، آسمان کی وسعت اور زمین کی پہنائی پر نظر نہیں کرنے دیتی تھی۔

انشا کی نظر کلیۃً احسان کی عادی نہیں۔ انھوں نے قدیم تہذیبی سرمایے سے ایک اور روایت بھی سیکھی تھی۔ جسے کسی بہتر اصلاح کی غیر موجودگی میں قدیم داستانوں کی روایت کہا جا سکتا ہے۔ سعدی شیرازی اور دوسرے معلمین اخلاق سے لے کر فارسی کی عشقیہ شاعری تک ہمارے مفکرین اور شعراء نے روحانیت اور مادیت کو باہم متصادم اور متضاد قرار نہیں دیا۔ ایک طرف اگر وہ اخلاق و روحانیت کا درس دیتے ہیں تو دوسری طرف ان کی نظر علمِ مجلسی، عشق و عاشقی اور حیاتِ انسانی کے لطیف تر مادی تقاضوں پر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی نے باب پنجم اور باب ہفتم کو بھی گلستاں میں شامل کرنا مناسب سمجھا۔

اس توازن نے آگے بڑھ کر داستانوں کو جنم دیا ہے۔ ان داستانوں کو صرف محیر العقول قصے اور جادو کی کہانیاں کہنا درست نہیں۔ ان میں زندگی کے بارے میں ایک دنیادارانہ انداز ملتا ہے۔ ایشیائی صلابت اور جبروت کا ان سے اعلیٰ نمونہ کم از کم ہمارے ادب میں موجود نہیں۔

داستانوں میں روحانیت کو ارضیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "طلسم ہوشربا" یا "داستانِ امیر حمزہ" کے اجزا ہوں یا "بوستانِ خیال" کے میر امن کی "چہار درویش" ہو یا سرور کا "فسانۂ عجائب" یا ان داستانوں کے اثرات سے پیدا شدہ مثنویاں اور تمثیلیں — ان سب میں ہیرو کا کردار صرف مادی قوت اور شان و شوکت ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے روحانی کشف و کرامات کی خصوصیات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ ہیرو کے علاوہ ان میں ایک عیار کا مرکزی کردار ہوتا ہے جو زمانے کے سارے کرتب اور جادو کے سارے ٹونے ٹوٹکے جانتا ہے۔ جس کی ذہانت دشمنوں کی جسمانی قوت اور حربوں کو شکست دیتی ہے اور جو ہمیشہ حق کی حمایت میں سینہ سپر رہتا ہے۔

داستانوں کی دنیا محض جادو یا افسانہ و افسوں کی دنیا نہیں یہاں بھی انسان اسی ابدی سوال کا جواب تلاش کرتا نظر آتا ہے کہ فطرت کو کس طرح مناسب سانچوں میں ڈھالے، کس طرح کائنات اور حقیقت سے اپنا رشتہ متعین کرے۔ ان داستانوں میں ایک ایسی تہذیبی روح کارفرما نظر آتی ہے جسے شان و شکوہ کا احساس بھی ہے اور جسے افسردگی اور ادا سی نے ہنوز سرنگوں یا سر در گریباں نہیں کیا ہے۔

داستانوں کے بارے میں دو باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے

ایک یہ کہ اُن داستانوں میں ساری آویزش خارجی سطح پر ہوتی ہے۔ غزلوں کے برخلاف یہاں آویزش فن کار کی ذات کے اندر موجود نہیں بلکہ وہ خارجی حقیقتوں کے خلاف صف آرا ہے۔ یہ حقیقتیں خود اپنے ساتھ یہ یقین لے کر آتی ہیں۔ کہ حق کو ہر حالت میں فتح ہوگی اور باطل اپنی بے اندازہ مادی قوت کے باوجود پسپا ہوگا۔ اس طرح داستانوں کا بنیادی آہنگ رجائیت اور خوش طبعی کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ داستان گو اپنی ذات میں مستغرق ہونے کی بجائے اپنے اردگرد کی زندگی میں کھویا ہوا ہے۔ اس کا تخیل سماوی فضاؤں کا رہ نورد ہے۔ لا انتہا وسعت اس کے گرد و پیش پھیلی ہوئی ہے۔ طوفانی رنگ ہیں، افراط و تفریط ہے، جذبے کا وفور اور خیال کی افراط ہے اور اس تخیل میں داستان گو اپنے سماج، اس کے رسوم، شادی، بیاہ ہنگامی اور غمی کے رنگ بھرتا ہے، ایک ایک نقشے کو پیار سے کھینچتا ہے۔ مجموں میں غل غپاڑے، ہنگامے اور طوفان سے داخل ہوتا ہے۔ جنگ کے میدان میں گھن گرج لے کر آتا ہے اور عشق و حسن کے درمیان رنگ دلونکا پردہ یوں کہ مدت تک جلوہ بار رہتا ہے۔

انشا کی شاعری کی فضا یہی ہے، ان کے ہاں رنگ و آہنگ بھی ہے قہقہے، دھما چوکڑی اور ہنگامہ بھی یہ خارجی مناظر اور ریت رسموں کے آئینہ خانے بھی ہیں اور معاملہ بندی کے وہ نقشے بھی ہیں جنھیں لکھنؤ کی سماج نے عیش و نشاط کی مادہ سینے کے لئے اپنی معاشرت کا جزو بنا لیا تھا۔ انشا کی شاعری پر داستانوں کے روپ رنگ کا اثر تو اس طرح بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود کم از کم دو داستانوں کے مصنف ہیں۔ ایک داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی اور دوسری سلک گوہر کے نام سے لکھی ہوئی ان کی بے نقط داستان لیکن اگر صرف ان کی شاعری ہی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بھی داستان کے نمایاں اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

شاگرد امیر حمزۂ صاحبقراں کے ہیں — کیوں کر بھلا نہ قلعہ اشرار توڑیئے
کیجے نقاشے باخرِ سبے بقا کو قید — بختک کے سر پہ گرزِ گراں بار توڑیئے
جھٹ پٹ کے نرگسِ جادو کی کھینچئے — کلی کو اس کی ماریئے للکار توڑیئے
رستم سے چھین لیجئے دیو سفید کو — اور اس کی وہ مروڑ کے تلوار توڑیئے
سدِ سکندری بھی جو چڑھ جائے دھیان میں — وہ ہیں طفیلِ حیدرِ کرار توڑیئے
آ جاویں ہفت خوانِ طلسمات سامنے — تو جھڑ سے انھیں بھی بہ تکرار توڑیئے
حصنِ زمرد پہ جس کا کوہِ قاف پہ — ہوشے تو اس کو بیخ کے عیار توڑیئے
زنبیل ہے عمرو کی حلِ فکر خیرہ یہ — اس کو کسی طرح سے نہ زنہار توڑیئے

ایک اور غزل میں بھی یہ اثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں:۔

تکیہ جو فضل خدا ساز پہ کر لیتا ہے — وہ سبک ٹڈ کوئی گڑ ہیلکے پر لیتا ہے
اژدہائے شب یلدا کو کرے ہے ٹکڑے — اور ان ٹکڑوں کو دھڑ زیرِ سپر لیتا ہے
اس کو خواہش نہیں ہوتی ہے اگر باپ نبی کی — باندھ کر سوتِ رو تارِ نظر لیتا ہے
منہ پہ جوگی کے کفر اوپر ڈپک مارے ہے — بس توکل پہ فقط، باندھ کر لیتا ہے
کوئی دیکھے اور وہ سب کو دیکھے — ٹوپی اس روپ کی کوئی وہ تہہ لیتا ہے
فضلے ہر شاخ کی وہ فتنے کی صورت ہو جائے — ہاتھ میں ایک کوئی زمین کا تبر لیتا ہے

اس طرح انشا کی غزلوں کے انوکھے اور عجیب قافیے ۱۶۱۱ نوس تلمیحیں اور ان کے چند مجبوب مضامین کا راز بھی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ستفعتو، بلم با حود ذیرو قوافی پر بھی انھیں داستانوں کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

ان داستانوں میں انشا کے ذہنی پس منظر کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں انشا ایک جادوگر کی طرح ہماری محفلوں میں آتے ہیں۔ وہ مجموں، ہنگاموں اور زندہ دل محفلوں میں پھبتیاں اڑاتے، فقرے کستے، پگڑیاں اچھالتے اور ہر مضمون میں اپنے علم و فضل کا سکہ جماتے ہوئے آتے ہیں۔ انشا اپنے عہد کی زندگی کے باغی نہیں ہیں۔ وہ اس سے بہت کچھ مصالحت کر چکے ہیں۔ انھیں اگر اردو شاعری کا قلبِ مطمئنہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

وہ ہنگاموں اور چہل پہل کے رسیا ہیں لیکن یہ ہنگامے تبدیلی اور انقلاب کی تلاش کی بجائے خوش طبعی اور وقت گذاری کے لئے ہیں۔ اپنے عہد کی طرف ان کا رویہ مصالحت پسندانہ ہے۔ اسی لئے وہ اپنے دور کی ہر جھلک کو بڑے پیار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس کی خارجی زندگی اس کے رسم و رواج اس کے نشاط و طرب کے وہ تماشائی نہیں بلکہ شریک کار ہیں۔

انشا اپنے عہد کے ٹھیٹھ اور نچلے کار نمائندہ ہیں۔ ان کا تمدن ان کی غزلوں میں جس طرح نمایاں ہو کر جھلکتا ہے اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں جھلکتا۔ یہ انشا کی بہت بڑی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ خامی اس لئے کہ وہ اس درباری تمدن کے دائرے میں محدود ہو کر ان آفاقی حقیقتوں تک نہیں پہنچ سکے جن کے آثار غالب کی پروازِ فکر یا نظیر اکبرآبادی کی رنگ رلیوں میں ملتے ہیں نہ غالب فلسفی ہیں نہ نظیر، لیکن دونوں اس دور کے استفہامیہ تک خود پہنچے ہیں اور اس گنبدِ بے در کی گھٹن کو محسوس کر کے انھوں نے نئی فضاؤں

کی تمنا اور تعمیر کی حسرت ضرور کی ہے۔ انشا کے بارے میں اسی لئے وہ مشہور جملہ ادھوری حقیقت ضرور رکھتا ہے کہ "انشا کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے تباہ کیا اور ان کی شاعری کو دربارداری نے"۔ انشا شیشے کے گھر کے رہنے والے ہیں وہ چھوٹی حقیقتوں پر قانع ہیں۔

اپنے تمدن سے گہری وابستگی انشا کے اس رجحان کا خوشگوار پہلو ہے انشا زمین سے جس قدر قریب ہیں اس کی مثال شاید نظیر کے علاوہ اور کم لوگوں کے ہاں ملے گی۔ انشا کا کلام ارضیت اور مادیت کا مجموعہ ہے۔ ان کا عشق بھی ارضی ہے اور حسن بھی ہمارے کرۂ زمین کا بسنے والا ہے۔ آج ہم اختر شیرانی کی نظموں میں "سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے" پڑھ کر یا حسرت موہانی کی غزلوں میں محبوب کو ننگے پاؤں آنے اور آنچل کو دانتوں تلے دبا لینے کی ادا کے تذکرے کو سراہتے ہیں اور عشق و عاشقی کی ارضی اور حقیقی تصویریں قرار دیتے ہیں یہی ارضی کیفیت یہی جیتی جاگتی سماجی تصویریں اپنے مادی پیکر کے ساتھ انشاء کے کلام میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

یہ نگہ، یہ منہ یہ رنگت یہ مسی یہ لعل خنداں

غضب اور تس پہ لینا یہ زباں بزیر دنداں

چھپ کے کیا موندی ہیں آنکھیں ارے بس کھول بھی دے

تاڑ جاتا ہے ترے پاؤں کی آہٹ عاشق

تم اور بات مانو اجی سب نظر میں ہے ___ دانتوں تلے زباں دبانی قسم کے ساتھ

جوں گلی میں مجھے آتے ہوئے دیکھا تو وہ شوخ

اپنی چوکھٹ سے اوچک جھٹ سے گیا پٹ سے لپٹ

یکھو نہ وہ پردہ نشیں پھر مجھے سوار___ میں نے تھے پھل کئی جانب علیں مارے

لے جا کے چپکے چپکے دوشالے کے نیچے ہاتھ

ناخن گڑو کے چٹکی سے انگشتِ پا کو چھیڑ

یہاں کئی حسین چہرے چلمنوں سے لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ چہلیں وہ انداز و ادا، آج صبح اور کہیں کہیں آنکھ مچولی کا ذکر، تو کہیں چھیپی کے جھگڑے کہیں "یاد فراموش" کی شرارتیں کرتے ہوئے ملیں گے۔ اس سلسلے میں دو باتوں کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنا ہے۔ ایک انشا کے تصورِ حسن کی ایک جھلک ہے اور دوسرے ان کا شناسا لہجہ ہے جو نجی گفتگو کا انداز رکھتا ہے۔ پہلے ان کے محبوب کی ایک جھلک دیکھ لیجئے:

عشق نے مجھ پہ اٹھایا اور تازہ اشتلا ___ لے گیا دل چھین ایک میلا کچیلا چلبلا

ہے اور کوئی ایسا جس میں یہ چھین نکلے ___ سچ دیکھ اسے کہتے ہیں بے ساختہ پن نکلے

آج تو کپڑے نہ بدلو تم کو میری ہی قسم ___ آپ کا میلا کچیلا پن بھی کچھ بیداد ہے

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا ___ نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

حسن کے اس انداز میں مادی اور ارضی نقوش نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ ان نقوش کو انشا کی شاعری میں نجی گفتگو کے لہجے نے اور بھی تیکھا کر دیا ہے۔ وہ محبوب سے متصوفانہ لگاؤ رکھنے کی بجائے کھل کھیلتے ہیں۔ اس کی محفل میں چپ چاپ سے اجنبی کی طرح بیٹھے رہنے کی بجائے چھیڑ چھاڑ میں مزہ لیتے ہیں اور پھر خود ہی کہتے ہیں:

چھیڑنے کا مزا تب ہے کہو اور سنو ___ بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

اس سلجھے ہوئے لہجے کو انشا نے بڑی لطافت سے برتا ہے اور اسے شاعری سے ہم آہنگ کیا ہے۔

اچھا ہے خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا ___ لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم ___ میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

تم نے تو نہیں، خیر یہ فرمائیے بارے ___ پھر کس نے لیا راحت و آرام ہمارا

انشا کا تصورِ عشق بھی مادی اور ارضی ہے۔ وہ نہ تو میر کے عشق سے واقف ہیں۔ جو "دور بیٹھا غبار میر اس سے" کا ادب شناس ہے اور نہ مہذب اور متین عشق ان کے ہاں جائز ہے۔ سچے ہنسوڑ کی طرح انھوں نے عشق کو درد اور خلش کے لئے نہیں، زندگی کی آسودگی، عیش اور ہنگامہ پسندی کے لئے اختیار کیا ہے۔ یہاں دھول دھپا بھی ہے اور پیش دستی کا حوصلہ بھی۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

اسبابِ کائنات سے بس ہو چکے لوا

انشا نے انتخاب کیا جام اور عشق

عشق کو انشا نے سو ہنگاموں کا ایک ہنگامہ سمجھا ہے۔ اور غالباً اس سلسلے میں ان کے سب سے زیادہ نمایندہ اشعار یہ ہیں:

اے عشق اجی آؤ ہمارا بھی کہا ہو ___ ڈھونڈھ رہے ہے تم کو

کر بیٹھے ہو تم لاکھوں کروروں ہی کے سر چٹ   اک آن میں چٹ پٹ

عشق پیچ ہو تو نہ معشوق ہو کیوں کر عاشق

جس پہ ہم عشق ہیں اجی وہ بھی ہے ہم پہ عاشق

نہ تو کام رکھئے شکار سے نہ تو دل لگائیے سیر سے

بس اب آگے حضرت عشق جی چلے جائیے گھر ہی کو خیر سے

جن کے ذہن میں دہلی کی بزمِ نشاط کی وہ تصویریں محفوظ ہوں گی جو مرزا غفر غینی نے "دریائے لطافت" میں اپنی گفتگو کے دوران پیش کی ہیں، وہ اندازہ کر سکیں گے کہ انشا کے دور میں عشق و عاشقی، حسن اور جنسی تعلقات کی تہذیبی نوعیت کیا تھی۔ زندہ دلی، پھکڑ پن اور تعیش کی حد تک لکھنؤ آ کر پہنچی لیکن اس دور میں نشاط کا قحط نہ تھا اور دو گال ہنس بول لینا چاہے وہ آٹھوں کے میلے میں ہو یا پھولوں کی سیر میں، زندگی کا ایک ضروری جزو بن گیا تھا۔

انشا کی شاعری نے اس دور کے ان تمام خارجی مناظر کو رچا بسا کر پیش کیا ہے۔ وہ پھکڑ بھی ہیں اور ہنسوڑ بھی۔ علم و فضل کے باوجود وہ تند جبیں ہونا پسند نہیں کرتے۔ وہ میلوں ٹھیلوں میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ ناچتے گاتے ہیں، جی بھر کر ہنستے بھی ہیں اور ہنساتے بھی ہیں۔ ان کی ہنسی میں غالب کا سا "خندۂ زیرِ لب" نہیں۔ کھلا ڈلا مزاح ہے جو صرف چند لمحے خوش گپی میں گنوانا چاہتا ہے۔ جو اپنے سماجی نظام کو طنز کے وار سے توڑ کر دوسرا نظام بنا لینے کے خواب نہیں دیکھتا۔ ہاں اس دائرے کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے لطف لینا ان کے ہاں رہا ہے۔

انشا کا سارا مزاج شگفتہ روئی اور اطمینان سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ الفاظ سے زیادہ خارجی واقعات اور عجیب و غریب حرکات کی تصویر کشی سے مزاح کا پہلو پیدا کرتے ہیں اور یہاں ہمیں شمالی ہندوستان کی اردو شاعری میں بڑے بھرپور خارجی عناصر کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دنیا ہماری اپنی دنیا ہے، عجیب ٹیڑھی میڑھی آڑی ترچھی مگر خوبصورت۔ جس میں رنگ برنگی تصویریں ہیں اور دل ربائی کے ان گنت انداز۔ اس مزاج کے چند نمونے دل چسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ ان نمونوں میں ایسا مزاح بھی ملے گا جسے پھکڑ پن کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے اور ایسی ملائم، نرم و نازک لطافت بھی ملے گی جس پر اعلیٰ ظرافت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مزا یہ دیکھئے گا شیخ جی ڈر کے اُٹھے   جو آن کا بزم میں کل احرام میں کیا

سجا بجا کے نکلے مغاش جن کی چھت سے   اے زاہد یہی ہے کیا شیخ جی کی مسجد

یقیں ہے خواجہ خضر تھے بچھائے جالۓ ننانوے   جو بیٹھے جاتے تھے اک بوڑھے گھاگ پانی پر

کہہ کر آئے تھے کہ ہم پانچ گھڑی بیٹھیں گے   میں نے اس مسخرے کے کل ایک گھڑی [illegible]

چند مدت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے   چلئے پر کعبہ بھی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

انشا علاوہ زاہدِ دیرینہ کیا کرے   خود جس کی جھانکتا تاک میں بنت العنب رہے

انشا کی یہ بذلہ سنجی اس دور کے علم مجلسی ہی کا ایک کھلا ڈلا نمونہ ہے اور اس تمدن کے سارے نقوش انھیں عزیز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انشاء نے اپنے دور کے انحطاط اس کے نشاط اور ہنگامہ آرائی کی جس قدر حقیقی خارجی تصویریں کھینچی ہیں اتنی اُردو شاعری میں کم شاعر پیش کر سکے ہیں۔ انشا کی شاعری تاثراتی کم ہے محاکاتی زیادہ ہے۔ اس میں داخلی روپ رنگ کی بجائے خارجی دنیا کی چمکیلی دھوپ، مست چاندنی، مزے کے ساتھ پڑتی ہوئی پھوار اور "سرد و گرم عالم" میں شاداں، فرحاں اور ہنگامہ برپا کرتے ہوئے لوگ ملیں گے۔ ان کی تصاویر بڑی سچی ہیں اور ان کے خاکے میں تشبیہ و استعاروں کی مینا کاری سے بے پروا مشاہدے کا رنگ ورد عتی جھلکتا ہے۔

چل نہ امریوں میں جھولیں لیں درختوں کی ہوا

چھا گئی کالی گھٹا ہے پیرہ نمتوں کی ہوا

بادل آئے بجلی چمکے مینہ کے ڈونگرے پڑتے ہیں

پھولوں کے منہ پر بادِ صبا کے آج چھینٹے پڑتے ہیں

پرتو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا   پھولوں کی سیج پر آ کر دے کرے چراغ ٹھنڈا

جھیلتے تھے جو کڑی آپ کے دیوانے لوگ   ان کی ان بیڑیوں میں لا کڑی مینہ کی گی

تھا بجز کون کہ جس نے نہ طمانچہ کھایا   کون سا پھول تھا جس کو نہ چھڑی مینہ کی لگی

کل تو سناٹے سے برسا ہی کیا ساری رات   آنکھ کم بخت نہیں کوئی گھڑی مینہ کی لگی

یہ صرف فطرت کی منظر کشی نہیں ہے۔ اس دور کی سماجی محفلوں، میلوں ٹھیلوں اور تقریبوں کی آئینہ برداری بھی ملتی ہے۔ اگر کوئی لکھنؤ کے تمدن میں ہندو اور عیسائی طور طریقوں کے اثرات کا پتہ لگانا چاہے تو انشا کا کلام اس کے لئے راہ نما کا کام دے سکتا ہے۔ یہاں ہندو دیو مالا کی شناساعلامتیں دیوان کے ہر صفحے پر بکھری ہوئی ملیں گی۔ اس تصویر خانے میں صرف ہولی، بسنت

اور میلے ٹھیلوں ہی کا بیان نہیں ملے گا۔ ان میں راجہ میرتری ہری بھی ملیں گے پتھوڑا کے محلوں کی بڑھیا، گنیش جی کا جوڑا، مہادیو جی، کیلاش، ٹھاکر۔ جوگ اور براگ کا جوڑا۔ کرشن جی اور رادھکا جی کی تمثیلیں۔ تلسی داس، گنگا جمنی اور تربینی اور فل ہوم کے نہ جانے کتنے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے ادب میں ہندو اور مسلمان تہذیبوں کے عناصر سے مل کر ایک نیا تمدن پیدا ہو رہا تھا اس کے علاوہ انگریزی اثرات کی طرف بھی انشا نے واضح اشارے کئے ہیں۔ ان کے مشہور قصیدے "بگھیاں پھولوں کی تیار کرائے ہوئے سمن" سے قطع نظر فرنگی ٹھاٹ کے جوڑے۔ ساعت فرنگی اور کلکتے کا تذکرہ کئی جگہ ملتا ہے۔

اس مشترک تہذیب کے بنانے اور سنوارنے میں انشا کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ اگر ان کی شاعری کے یہ شناسا رموز و نکات اور یہ پرچھائیاں اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ناکافی ہوں تو "دریائے لطافت" میں ساری ہندوستانی زبانوں کے لہجے اور مختلف عوامی بولیوں کو جمع کرنے کی کوشش اور ٹھیٹھ زبان میں لکھی ہوئی ان کی "داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" اس کے مزید ثبوت ہیں۔ "دریائے لطافت" میں فارسی اور عربی الفاظ کے لئے وہ دوسری زبانوں کا منہ دیکھنے کے بجائے اردو زبان کے رواج ہی کو معیار بنانے پر زور دیتے ہیں۔ لسانی قواعد کے اعتبار سے یہ کوئی معمولی خدمت نہیں۔

انشا ہمارے لئے نور اور استفادے کا ذریعہ بھی ہیں اور عبرت کا بھی۔ انھوں نے اردو شاعری کو گوشت اور خون بخشا۔ اسے جسم کی حرارت اور زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو دی، جو ماورائیت کی بلند ترین پرواز اور داخلیت کے عمیق ترین سفر سے بھی حاصل نہ کی جا سکتی تھی، انھوں نے ہماری دنیا کی باتیں کیں۔ شاعری کو صوفیانہ خیالات کی علامتوں اور داخلی دائروں سے نکال کر اسے چمکیلی دھوپ سے آشنا کیا۔ یہاں گرمی بھی ہے اور حرارت بھی۔ طاقت بھی ہے اور چہل بھی۔ یہاں دنیا رنگین چشمے سے نہیں دیکھی جاتی۔ ہاں ان کی کھینچی ہوئی تصویریں توازن سے محروم ہیں۔ ان میں نشیب و فراز ہیں۔ وہ سیماب پا اس جہاں سے گذرتے ہیں اور ہر لمحہ ان کے پھولوں کے رنگ بدلتے جاتے ہیں اور ان کے نغموں کا آہنگ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔

انشا عبرت ناک ہیں کیونکہ وہ چھوٹا سا درباری دائرہ جسے انشا نے اپنا مقصد بنایا ان کی صلاحیتوں کے لئے بہت مختصر تھا۔ وہ ان کے راستے میں سد راہ بن کر حائل ہو گیا اور وہ شخص جو امیر خسرو کا سا علم و فضل اور فیضی کا سا حافظہ لے کر آیا تھا اپنی ساری ذہانت روزی کمانے پر صرف کرنے کے لئے مجبور ہو گیا بقول انشا :-

گرچہ دُنیا کے ہنر ہیں لیکن
اپنی میں بے ہنری پہ خوش ہوں

انشا نے ایک اور جگہ کہا ہے :-

آوارہ دشت و کوہ میں مانند گرد باد
بھٹکا پھرا ہوں کر کے رہِ کارواں غلط

اور یہ بھٹکنے والا گرد باد اپنے پیچھے اردو شاعری کے لئے بڑے قیمتی نقش قدم چھوڑ گیا ہے۔ اس نے خارجیت اور ارضیت سکھائی ہے اردو شاعری جو آسمانوں اور سینوں کے نہاں خانوں کی مکیں تھی اسے کھلی فضا کا عادی بنایا ہے۔ اسے ہنسنے اور کھل کھیلنے ہی کا نہیں زندہ رہنے کا گر سکھایا ہے اور یہ زندگی دنیا بھر سے الگ تعصب ہٹ دھرمی اور علیحدگی پسندی کی زندگی نہ تھی بلکہ سارے تہذیبی عناصر کو ایک خوش گوار ملاپ کے ساتھ یکجا کرنے والی زندگی تھی۔ آج اس ہمہ جہت اور خوش آہنگ ملاپ کو آگے بڑھانے کا کام انشا کے ورثے میں نئی نسل کو منتقل ہو رہا ہے۔ آخر کار انشا کا یہ دعویٰ بے تعبیر نہیں رہا :

مثلِ گہر چھپے ہیں پاؤں کے آبلے
کیوں کر نہ ہووے اپنے ہر اک گام کو فروغ

"آج کل دہلی کا کشمیر نمبر" ——— خالد کشمیر کی رائے

میں نے "آج کل" کا "کشمیر نمبر" دیکھا۔ مجھے اس بات کا اظہار کرتے ہوئے بڑی مسرت حاصل ہو رہی ہے کہ یہ شمارہ نہایت عمدہ ہے۔ اس شمارے کو کامیاب بنانے کے لئے جو ساعی کی گئی ہیں میں ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(غلام محمد بخشی)

غزل

بنائے عیش یہ تونے نئی پیرِ مغاں رکھ دی
کہ بھر کر جام و مینا میں حیاتِ جاوداں رکھ دی

ارادت کا اثر دیکھو عقیدت اِس کو کہتے ہیں
حرم کی وہ زمیں نکلی جبیں میں نے جہاں رکھ دی

مبارک باد دو صیّاد کو، صرصر کو، بجلی کو
سرِ شاخِ چمن بُلبل نے طرحِ آشیاں رکھ دی

چھپا رکھی تھیں دل نے کیسی کیسی راز کی باتیں
ذرا سے اشکِ خوں نے کھول کر سب داستاں رکھ دی

نہالِ آرزو کے جس زمیں پر پھول کھلتے تھے
اُٹھا کر وہ زمیں تونے کہاں اے آسماں رکھ دی

خموشی کی ادا پہ ناز تھا سربستہ کلیوں کو
نسیمِ صبحدم نے توڑ کر مہرِ دہاں رکھ دی

جلیل اس طرح میں نے طے حرم کی راہ کی اکثر
جہاں نقشِ قدم دیکھا جبیں اپنی وہاں رکھ دی

(غیر مطبوعہ)

پروفیسر مسیح الزماں

شبلی موازنے کی روشنی میں

مولانا شبلی کا شمار اُردو کے مشہور انشا پردازوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے، اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے ذوقِ مطالعہ، تحقیق و تجسس اور ژرف نگاہی سے تاریخ و سوانح، تنقید و ادب کی بہت سی راہوں پر چراغ روشن کئے ہیں۔ اُن کی شعر فہمی اور سخن شناسی کا ثبوت اُن کے مضامین کے علاوہ شعر العجم کی پانچ جلدیں ہیں۔ "موازنۂ انیس و دبیر" میں بھی اُنھوں نے انیس کی شاعرانہ صلاحیتوں اور اُن کے کلام کی نزاکتوں پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ لیکن جہاں تک ایک تنقید نگار کے فرائض کا تعلق ہے ہمیں اُن کی تحقیق اور رائے زنی کا وہ بلند معیار نظر نہیں آتا جو اُن کے نام کے ساتھ وابستہ ہے۔

ایک غیر جانبدار محقق معقول شہادتوں یا واضح ثبوت کے بغیر کوئی قطعی رائے نہیں دیتا لیکن "موازنۂ انیس و دبیر" میں متعدد بیانات ایسے ہیں جن میں شبلی نے واضح الفاظ میں قطعی رائے دے دی ہے، اور کئی دوسری جگہ ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے اُن کے اس رائے کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس طرح خود انھیں کے جملوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ انھوں نے تحقیق و تنقید کے اصول مدِ نظر نہیں رکھے۔ مثلاً

۱۔ اُردو میں مرثیہ گوئی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اسی زمانے میں میر خلیق صاحب نے مرثیہ کے فن کو بہت ترقی دی[۱]"

اسی رائے کی تائید میں وہ یہ ثبوت پیش کرتے ہیں۔

۱۔ میر انیس صاحب اُن کے بیٹے جا بجا اپنے مرثیوں میں اُن کی فصاحت اور روزمرّہ کا ذکر کرتے ہیں: "حقا کہ یہ خلیق کی ہے سحر بیانی"۔

۲۔ میر خلیق نے خود ایک مقطع میں کہا ہے۔

گذری بہارِ عمر خلیق اب کہیں گے سب   باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

۱؎ موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۲۵

اُردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اپنے اشعار میں کہیں نہ کہیں اپنی تعریف نہ کی ہو، اور ادب میں اس کی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ اچھے ادیبوں نے اپنے والد کی ادبی صلاحیتوں کی تعریف مبالغے سے نہ کی ہو۔ پھر انیس نے تو صرف اپنی زبان کے متعلق خلیق کا نام لیا ہے۔ خود شبلی کی رائے میں بھی شاعری صرف زبان کی صفائی نہیں ہے۔ ان دو باتوں کو ثبوت قرار دے کر خلیق کو مرثیہ گوئی میں اہم جگہ دینا، اور یہ قیاس کرنا کہ اُن کا احسان اس فن پر میر ضمیر سے کم نہیں، اصولِ تنقید کو علانیہ نظر انداز کرنا ہے۔ کیونکہ شبلی کے سامنے میر خلیق کی اہمیت سمجھنے کے لئے اُن کا کلام نہیں تھا۔ خود ہی لکھتے ہیں۔

"افسوس کہ ان کا کلام نہیں ملتا۔ میر نواب صاحب نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مجموعہ چھاپا تھا جس میں میر خلیق، مونس اور انیس کے چند مرثیے جمع کئے تھے اس میں خلیق کے متعدد مرثیے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن زبان اور طرزِ ادا سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ انیس ہی کے نتائجِ فکر ہیں[۲]"۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ میر نواب کے مجموعے میں خلیق کے نام سے جو مرثیے شائع ہوئے ہیں، اُن کو شبلی خلیق کا نہیں سمجھتے۔

۲۔ الفاظ کے توازن اور تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اُس کو شبلی نے کئی جگہ واضح کیا ہے۔ ایک لفظ ایک جگہ فصیح ہو سکتا ہے، اور دوسری جگہ غیر فصیح۔ اسی کی مثال میں انھوں نے انیس کا یہ مصرع پیش کیا ہے۔

تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اس مصرع میں بلبل کا لفظ ویسا فصیح اور رواں نہیں ہے، جیسا کہ انھیں کے اس مصرع میں؛

بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں

۲؎ مجھے خلیق کی اہمیت سے انکار نہیں

۳؎ موازنہ صفحہ ۲۵

جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انیس کے کلام میں بھی کچھ شعر ایسے ضرور ہیں جن میں نشستِ الفاظ اتنی متوازن نہیں جتنی کہ اُن کے اچھے کلام میں عموماً ہوتی ہے۔ اس کے باوجود موازنہ کے صفحہ ۴۱ پہ ترتیبِ الفاظ کا ذکر کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں۔

"میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور اُن کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے"[1]

اب ذرا "تمام" اور "ہر" کی معنویت پر غور کیجئے، اور بیانات کا تضاد دیکھئے۔

۳۔ انیس سے پہلے کی مرثیہ گوئی کی تاریخ سے شبلی کی ناواقفیت ہم کسی اور تقریر میں بیان کر چکے ہیں۔ بحروں کے انتخاب کے سلسلے میں میر انیس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میر انیس سے پہلے مرثیے اکثر چھوٹی بڑی بحروں میں لکھے جاتے تھے"[1]۔

سودا، میر ضمیر اور دلگیر کے مرثیے بڑی آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں پانچ فی صدی سے زیادہ بڑی بحروں میں نہیں ہیں۔ معلوم نہیں انیس سے پہلے کے مرثیوں کا وہ کون سا ذخیرہ تھا جس کو دیکھ کر شبلی نے یہ رائے قائم کی تھی۔ موجودہ حالات میں تو یہ غیر ذمہ دارانہ قیاس آرائی نظر آتی ہے۔

۴۔ صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں۔

"عون و محمد کی روایت کا سرے سے کہیں پتہ نہ تھا لیکن جب میر انیس نے اس کو مرثیہ میں لکھا تو تمام لوگوں کو اس کی واقعیت کا دھوکہ ہوا"[2]

انیس کے معاصرین کے یہاں عون و محمد کی روایت ملتی ہے۔ اس کے متعلق یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ سب سے پہلے اسے کس نے نظم کیا ہے۔ لیکن شبلی نے اوپر کے جملے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے۔ حالانکہ ایک دوسری جگہ اُنھوں نے بھی عدمِ تحقیق کا اعتراف کیا ہے۔

"اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں سے اوّل کس نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا، اور خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے یہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں، اوّل کس نے کہے تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جدّ و جہد کے اس بارے میں مجھ کو کامیابی نہیں ہوئی"[3]

جب ایک جگہ مولانا نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا تھا تو اور بھی ضروری تھا کہ دوسری جگہ وہ اس کے خلاف یہ لکھیں کہ عون و محمد کی روایت سب سے پہلے انیس نے لکھی تو اس نتیجے پر پہنچنے کے قرائن کا ذکر ضرور کرنا چاہیئے، ورنہ اس کو صرف بیانات کا تضاد کہا جائے گا۔

"میر انیس کے خصوصیاتِ شاعری بیان کرتے ہوئے حسنِ تعلیل کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک قسم کی تخئیل ہے، اور اس لحاظ سے یہ صفت عین شاعری ہے، کیونکہ شاعری درحقیقت تخئیل کا نام ہے"[3]

اس بیان کے تقریباً چھ صفحوں کے بعد رقم طراز ہیں۔

"یہاں تک جن محاسنِ کلام کا ذکر ہوا وہ شاعری سے نہیں بلکہ بلاغت سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری جس چیز کا نام ہے، اس کی بحث اب شروع ہوتی ہے"[4]

ان بیانات کا تضاد ظاہر ہے۔ ایک جگہ ایک چیز کو عین شاعری کہہ کر اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ آگے چل کر اس کو شاعری سے الگ کہہ دیا جاتا ہے۔ مولانا کی ذہنی پراگندگی اسی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ بلاغت کو بھی بیچ میں لے آئے ہیں، اور اس کو بھی شاعری سے الگ کہہ گئے ہیں۔ حالانکہ پوری کتاب میں جگہ جگہ اُن کے ایسے بیانات موجود ہیں جن میں بلاغت ہی کو شاعری کا سرمایہ قرار دیا گیا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بلاغت کی تعریف دیکھئے۔

"غرض ہر واقعے اور ہر معاملہ بیان کرنے میں بلاغت کا اقتضا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعے کے پیش آنے سے پڑتا۔ میر انیس کے کلام میں عموماً یہ وصف پایا جاتا ہے"[5]

بلاغت کی شبلی نے جو تعریف پیش کی ہے اس کے علاوہ کس چیز کا نام شاعری ہے، اُسے شبلی خود بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھ کر ایسا کھو گئے ہیں کہ ایک بات کو ایک جگہ کہتے ہیں اور دوسری جگہ اس کی تردید کر جاتے ہیں۔

۶۔ مناظرِ قدرت پر اردو میں کم لکھا گیا ہے، اور اسے سب مانتے ہیں کہ مرثیے نے اس سلسلے میں اُردو کے سرمایے میں کافی اضافہ کیا۔ لیکن شبلی ایسے اردو کے ماہر سے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ اس زبان میں اس کی

---

[1] موازنہ صفحہ ۴۹ — [2] موازنہ صفحہ ۲۸

[3] موازنہ صفحہ ۱۱۰ — [4] موازنہ صفحہ ۱۱۷ — [5] موازنہ صفحہ ۶۰

کمی کے بجائے اس کے ناپید ہونے کا فیصلہ سنائیں ۔ دکن کا ادبی سرمایہ اُن کی نظروں سے اوجھل بھی ہو تو شمالی ہندوستان میں سودا کے قصیدوں کی بہاریہ تشبیہیں تو اُنھوں نے ضرور ہی دیکھی ہوں گی ۔ نظیر اکبر آبادی کے کلام کا ذکر اُنھوں نے موازنے کے صفحہ ۳۰ پر کیا ہے ۔ میر حسن کی مثنوی کا سنسان جنگل اور قمر، چمکتی ریت اُن کی نظروں سے گذرے ہی ہوں گے ۔ پھر بھی وہ اپنی رَو میں لکھتے ہیں ۔

"عربی اور فارسی میں مناظرِ قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے ، اور اردو میں تو گویا سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا ۔ میر ضمیر نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی"۔[1]

اُردو میں منظر نگاری کم ہی ، لیکن ایسی تو نہیں تھی کہ اُسے ناپید کہہ دیا جائے ۔ مگر شبلی لکھنے کی رَو میں آتے ہیں تو جیسے کچھ سوچتے ہی نہیں اور بس لکھتے چلے جاتے ہیں ۔

۔ مولانا کا ذہنی انتشار ، بات کہہ کر اس کی تردید کرنا اور متضاد بیانات دینا دبیر کے سلسلے میں بھی نمایاں ہے ۔ کبھی دبیر کے کلام کی تعریف کرتے ہیں اُن کے بعض پہلوؤں کی اچھائیاں مانتے ہیں ۔ مثلاً

"دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہیں" ۔ صفحہ ۲۸۶

"مرزا صاحب کا ایک اور نہایت مشہور مرثیہ ہے (دو بند لکھنے کے بعد) یہ دونوں بند اپنے انداز میں پورے ہیں" ۔ صفحہ ۲۹۳

"مرزا صاحب کے خاص کلام کا جوہر تشبیہات و استعارات ہے" ۔ صفحہ ۲۹۸

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں اُن کا کلام فصاحت اور بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے نہایت بلند مرتبہ ہو جاتا ہے" ۔ صفحہ ۳۰۲

اس کی مثال میں شبلی نے بیس بند اور چودہ شعر لکھے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنا حصہ ان کے کلام کا ضرور ایسا ہے ، جو اُن کے خیال میں بھی نہایت بلند مرتبہ کا ہے ۔ مگر اس کے باوجود کبھی کلامِ دبیر صرف خرابیوں کا مجموعہ رہ جاتا ہے ۔

"الفاظ میں فصاحت ، سلاست ، روانی ، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن میں کونسی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے ، فصاحت اُن کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی ۔ بندش میں تعقید اور اغلاق ۔۔۔۔ بلاغت نام کو نہیں"۔[1]

ایک طرف کم سے کم بیس بندوں کے فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورے اترنے کا اعتراف ہے ، دوسری طرف اس کے یکسر نہ ہونے کا اعلان ۔ کس بات کو صحیح مانا جائے ؟ یہ بیانات کا تضاد اتفاقی نہیں ۔ اس کی مثالیں موازنے میں بکھری پڑی ہیں ۔

"مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں لیکن بلاغت کا تو شائبہ بھی نہیں پایا جاتا"۔[2]

"تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ ہر چیز کی بلاغت الگ ہے مضمون کی الگ قصے کی الگ ، قصیدے کی الگ ، شعر کی الگ ۔ لیکن مرزا صاحب کے کسی قسم کے کلام میں یہ وصف پایا نہیں جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی مضمون کو وہ مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے"۔[3]

صفحہ ۲۱۳ پر جناب صغریٰ کی بات چیت کی مثال دے کر لکھتے ہیں ۔

"مرزا صاحب نے بھی عمدگی سے اس واقعے کو ادا کیا ہے"۔

پھر صفحہ ۳۳۳ پر لکھتے ہیں ۔

"بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون کو ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہو سکا ۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے اس کی تصدیق ہو گی"۔

صفحہ ۳۴۳ پر تو یہ لکھ دیا ہے کہ

مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے ۔ میر انیس صاحب نے اس مضمون کو کئی کئی طرح سے پلٹا ، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ بات نصیب نہ ہوئی"۔

ان مثالوں کی روشنی میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ موازنۂ انیس و دبیر میں شبلی نے محقق اور ناقد دونوں حیثیتوں سے لغزشیں کی ہیں ، اور اس میں اُن کی تحقیق اور رائے زنی کا وہ بلند معیار نظر نہیں آتا جو ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہے ۔

---

[1] موازنہ صفحہ ۱۷۳

[1] موازنہ صفحہ ۳۸۲
[2] موازنہ صفحہ ۳۰۹
[3] موازنہ صفحہ ۳۰۹

مغیث الدین فریدی

واہ ری دُنیا، ہائے زمانا

وہم یہ تھا غم خوار ہے دُنیا — مرہمِ قلبِ زار ہے دُنیا
اب یہ کھلا مکّار ہے دُنیا — ایک اُپی تلوار ہے دُنیا
کٹ گیا جس نے اس کو نہ جانا
واہ ری دُنیا، ہائے زمانا

دل میں کپٹ اور پیار کی چتون — دوست کے پردے میں بھی ہے دشمن
روئے جفا پر مکر کا دامن — راہنما کے بھیس میں رہزن
دل میں جہنّم، لب پہ ترانا
واہ ری دُنیا، ہائے زمانا

مکر ہے بزمِ دہر کی زینت — رُوح کے سودے، دل کی تجارت
بکتے ہیں ایماں حسبِ ضرورت — کچھ بھی نہیں انسان کی قیمت
دم میں گھٹانا، دم میں بڑھانا
واہ ری دُنیا، ہائے زمانا

ہاتھ میں مرہم آنکھ میں نشتر — لطف و کرم کی بات ہے لب پر
زہر بباطن، شہد سراسر — لوٹ لیا، احسان جتا کر
جھوٹ ہے فیشن، فن ہے بہانا
واہ ری دُنیا، ہائے زمانا

رسمِ زمانہ عام یہی ہے — حق کا یہاں انعام یہی ہے
بزمِ وفا کا جام یہی ہے — دوست کا شاید کام یہی ہے
آنکھ بچا کر زہر ملانا
واہ ری دنیا، ہائے زمانا

عجز میں بھی پندار کا عالم — دامنِ گلُ پر خار کا عالم
رنگِ ستم میں پیار کا عالم — جیت سے پہلو، ہار کا عالم
لطف کا تانا، مکر کا بانا
واہ ری دُنیا، ہائے زمانا

لب پہ ہیں لُطفِ خاص کی باتیں — آنکھ میں لیکن مکر کی گھاتیں
جھوٹ کے دن ہیں دھوکے کی راتیں — عقل کی چالیں ہوش کی ماتیں
وقت پڑے پر کام نہ آنا
واہ ری دنیا، ہائے زمانا

مُنہ پہ نیاز و ناز کی باتیں — درد کے قصے، راز کی باتیں
شوق کے ہر انداز کی باتیں — جیسے کسی دمساز کی باتیں
تیر مگر چھپ چھپ کے چلانا
واہ ری دنیا، ہائے زمانا

شاطر حکیمی

نوّاب وحید الدّین غازی

جس طرح محض ایک خاکہ کش معتبر کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا، اسی طرح فقط الفاظ موزوں کرلینے والا شاعر نہیں ہوسکتا۔ شاعری نام ہے دل کی آواز کا، جو دماغ کی کاوش سے مرتب ہوکر نوکِ قلم یا لبِ گویا سے ادا ہو۔ شاعری کو وہبی اور اکتسابی دونوں صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ایسا فن کار خواہ کتنا ہی گمنامی کی زندگی بسر کرنا چاہے وقت کے تقاضے اسے منظرِ عام پر لاکر دم لیتے ہیں۔

مہتابِ فطرت حضرت نواب وحید الدین غازی مدظلہ العالی خانوادۂ گورو جا شیٹ کے چشم و چراغ۔ عمر قریب اڑتالیس برس۔ رنگ کھلا گندمی۔ قد لمبا۔ آنکھیں روشن اور اس پر قیمتی سنہری چشمہ۔ کتابی چہرہ۔ پیشانی سے وسعتِ فکر و خیال نمایاں۔ رفتار گفتار سے رئیسانہ شان آشکار۔ آواز میں دبدبہ۔ مزاج میں تحمل۔ عبادت بے ریا، آپ کا دین و مذہب۔ اخلاقی فضیلت کے حامی۔ متواضع۔ صاحبِ نظر وجیہہ۔ کبھی کوٹ پتلون کبھی شیروانی کبھی جبہ میں ملبوس۔ ہر لحاظ سے جامہ زیب۔

گاہ خرقہ گاہ پوشاکِ قشنگ ایک بوئے مستقل ہفتاد رنگ

بلند پایہ اہلِ قلم اور مدبر۔ ذات گرامی بڑے سے بڑے منصب و مرتبہ کی مستحق، مگر باوجود احباب کے اصرار کے ہمیشہ طلبِ اقتدار سے دور اور مستغنی۔

۱۹۴۴ء کو جبل پور میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس کے زیرِ اہتمام ایک کل ہند بزمِ مشاعرہ ترتیب دی گئی جس کی صدارت خود صاحب موصوف نے فرمائی جس میں ملک کے نامی گرامی ادبا، شعرا مثلاً حضرت جگر مرادآبادی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مولانا ماہر القادری، پروفیسر شور، شعری بھوپالی، خمار بارہ بنکی وغیرہ شریک تھے۔ مشاعرہ کے دوسرے دن نواب سعید بہادر مولانا حبیب الرحمٰن شروانی آپ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ کلام سُنانے کی استدعا فرمائی۔ نواب غازی صاحب نے اپنی نظم "دین و دانش" میں سے جو ابھی زیرِ تصنیف تھی جس کے تقریباً چھ سو شعر لکھے جاچکے تھے چند بند اپنے بزرگ مہمان کو سُنائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی بڑے غور سے سماعت فرماتے رہے۔ کلام سے متأثر ہوکر ارشاد فرمایا۔ کیا علامہ اقبال کے بعد بھی ہندوستان میں ایسے شاعر موجود ہیں؟ مدیرِ رسالہ "مصنف" محترم الطاف صاحب بریلوی نے جو مشاعرے میں شریک ہوچکے تھے علی گڑھ سے جناب عبدالستار صاحب فاروقی ایڈیٹر الفاروق کو خط میں لکھا: "نواب غازی کی ذات قابلِ قدر ہے۔ آپ کی متاعِ فکر و نظر کی حفاظت فرمایئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے تغافل سے ادبِ اُردو کو نقصان پہنچ جائے" بازگو رالعصدر "دین و دانش" کے چند بند پیش ہیں فلسفیانہ موشگافیوں کا جائزہ لیجئے۔

موت سے ناداں نہیں مرتی حیاتِ مستقل — آگ کے شعلوں میں جل یا خاک کے ذروں میں مل
پھر سجائیں گے تجھے پیراہنِ انوار میں — غم نہ کر اترے اگر کہنہ گلیمِ آب و گل
لمحہ لمحہ آدمی عالم بعالم گامزن — ترکِ منزل سے نہ ہو یوں غمزدہ افسردہ دل
راہبرِ طفلی جوانی اور پیری سب مقام — تو بنو قالب میں تو ہوتا رہا ہے منتقل

تو ابھی واقف نہیں اجسام کی تقدیر سے
لرزہ براندام ہے کیفیتِ تغیّر سے

جملہ اجزائے پریشاں باوجودِ برہمی! — جز تماشائے صور لاشئے نہیں ہوتے کبھی
خاک و باد و آب و آتش خلیفہ بلغم و دماغ — مستحیل سبزۂ بیگانہ شورِ معدنی
گاہ گاہ زِ منہضم صورت پذیر گوسفند — گاہ بختی در تن و توشِ مدتِ منطقی
کیا قیامت روح وہ رشکِ ہیولائے لطیف — نطق بخشِ آب و گل جانِ جہانِ مادّی
کالعدم یوں ہو کہ جیسے لوح سے حرفِ غلط — دل لگی ہے، کھیل ہے گویا نمودِ زندگی

مانئے بر عقلے کہ ہو انعقادِ عناصر کو دوام
جوہرِ بنیائے ہستی چند روزہ کم قیام

صادق آتی ہے بشر پر تخمِ گندم کی مثال — مرتفع زینہ بہ زینہ گو بقا ہر پائمال
دفن ہوکر خاک میں نشوونما سے بہرہ یاب — کشتِ دہقاں سے دمیدہ پھر بہ رنگِ تخم نہال

گو یہ ہنگام ورود کام گیا گا ہا گیا — وحش اللہ بن گیا پھر نغمۂ اکلِ حلال
جسم میں تحلیل ہو کر کھُل گئی ظالم کی آنکھ — ہوش بن کر جاگ اُٹھا آبادی کی بزمِ خیال
مزرعۂ تخئیل سے باہر نکالے جب قدم — خرمنِ علم و عمل میں بن گیا فنی کمال

رُوحِ انساں بھی یہیں ہوتی ہے آخر ارجمند
رفتہ رفتہ پایۂ عرشِ معلیٰ تک بلند

ان اشعار سے نواب صاحب کی بلندیٔ فکر اور عمیق مطالعۂ فطرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے تخیل کے اعتبار سے الفاظ کا استعمال نواب صاحب خوب جانتے ہیں "حسن و شاعر" آپ کی طویل نظم ہے۔ لطف یہ ہے کہ کوئی قافیہ دوبارہ نہیں لایا گیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

حُسن

نمایاں رنگ سب دوشیزگی کے — شبابِ فتنہ زا پر حشر قرباں
وہ گل جس سے مشامِ جاں معنبر — شمیمِ رُوح رشکِ نازبویاں
گڑیں شمشاد غیرت سے زمیں میں — سراپا نازِ وہ سروِ خراماں
نگاہوں میں جوانی کی اُمنگیں — وہ آنکھیں غیرتِ چشمِ غزالاں
دہن میں خازنِ قدرت نے رکھ دیں — وہ نازک بے بہا موتی کی لڑیاں
تحفظ کے لئے درجِ صدف پر — لگا دی خاتمِ لعلِ بدخشاں
وہ نزہت وہ طراوت عارضوں پر — ہوئیں رشک سے کملائے خنداں
جبیں الماس کی وہ ماہ پارہ — صفا پر دیدۂ آئینہ حیراں
بھلا دیں زہرہ کو بابل کے قیدی — وہ زندانِ بلا چاہِ زنخداں
تراشیدہ وہ نازک قوس ابرو — وہ صیادِ قضا کی تیغِ براں
ہوائیں جس کی خوشبو سے معطر — مسلسل ریشمی وہ زلفِ پیچاں
وہ من سندر کی مورت موہنی سی — برہمن کر دیں جس پر دھرم بلیداں
عمامے راہ میں زاہد بچھائیں — نچھاور ایڑیوں پر کر دیں ایماں

پری چہرہ وہ نازک ماہ پیکر
اتر کر سیر دیکھیں جس کی پریاں

شاعر

سراپا مفلسی تصویرِ عسرت — برہنہ پا کھلا سر نیم عریاں
بدن پر اک لبادہ دھجیوں کا — گلے میں منتشر تارِ گریباں
پرانا سا قلم اک انگلیوں میں — بغل میں چند اوراقِ پریشاں
درخشاں اس طرح دلِ کہن میں — چھٹے بادل میں جیسے ماہِ تاباں
جبیں سے وہ فطانت آشکارا — متاعِ علم کر دے نذرِ لقماں
فضائے چرخ بازی گاہ جس کی — ستارے جس کے آگے گوئے چوگاں
فدا جس پر سمندر کا تلاطم — وہ طوفاں خیز دریا طبعِ جولاں
زمین و چرخ بدلے وہ نہ بدلے — نوشتِ بخت جس کے عہد و پیماں
تحمل بردباری مثلِ ساحل — پلٹ جائے جسے ٹکرا کے طوفاں
وہ ہمدردی کا جوہر بارک اللہ — مصیبت پر مو غیروں کی بھی نالاں
متاعِ گنجِ دل حرص و ہوا سے — نظر میں مال و زر ریگِ بیاباں
دماغِ عرشِ رفعت کا وہ غرہ — گھروندے جس کے آگے قصرِ ایواں

بیاباں ہیں شرارے بجلیوں کے
قلم سے جس کے لرزاں شاہ و سلطاں

مشاہدۂ فطرت بھی آپ کے کلام میں مکمل ملے گا۔

گورد ھا میں برسات

گل و یاسمن پھر ہوئے جلوہ آرا — چمن بن گیا ہے گوردھا ہمارا
بہاریں لئے آگئی فصلِ باراں — کوئی دیکھے اب "ستپڑاہ"[1] کا نظارا
بیاباں و کوہسار میں نامیہ نے — ہرے رنگ کا دے دیا ہے پچارا
وہ بینہ کا تلہٹی میں چھم چھم برسنا — چھٹے جیسے اندر بھون میں پھوارا
پہاڑوں میں وہ آبشاروں کا نغمہ — وہ گاتا ہوا سات نالے کا دھارا
وہ شاخوں پہ چڑیوں کا شیریں ترنم — وہ رنگیں فضا میں بہشتی دو تارا
ہواؤں میں وہ بھینی بھینی سی خوشبو — یہ جنگل ہے یا بوستانِ بخارا
شبِ تار میں بجلیوں کا چمکنا — وہ مشعل سے حوروں کا گویا اشارا
وہ بارش کا تھمنا وہ کوسج کی کرنیں — وہ بکھرا ہوا سبزے پہ پارا
گڈریئے ادھر جا بجا بن کھا رہے ہیں — ادھر بکریاں چر گئیں کھیت سارا
خوش آیند وہ رد پنے[2] کے مناظر — وہ چلتے ہوئے ہل وہ پانی وہ گارا

---

[1] ایک پہاڑی ندی۔ [2] دھان کی پود جمائی۔

کوئی پولیاں کھیت میں چُن رہا ہے — کھڑا ہے کوئی لے کے لٹھ کا سہارا
گوالوں کو گلّے کی پروا نہیں ہے — بلا سے کرے شیر جنگل میں گارا
کلاری میں ٹھرّا کوئی پی رہا ہے — کوئی گا رہا ہے ترا رائے تارا
نہیں ہوش اب تن بدن کا کسی کو — وہ لڑھکا کلنگی وہ پھسلا جپارا
"پروہت" کو سوجھی ہے حجت کی ہر مت — رہی یاد، پوجا نہ ٹھاکر دوارا
لیئے ڈور ہنسی میاں جی بھی نکلے
کہاں کی کتابیں کہاں کا سیپارا

نواب غازی اپنے صوبے میں بحیثیت شاعر ۱۹۲۳ء میں جب کہ آپ نے اکیس برس کی عمر میں ناگپور کے ایک عظیم الشان مشاعرے کی صدارت فرمائی تھی، عوام سے روشناس ہوئے۔ کامٹی میں موجودہ قیام سے قبل آپ نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں آل سی، پی برار مشاعرہ منعقدہ کامٹی میں شرکت فرمائی تھی، اس کے بعد آپ نہ صرف ناگپور کامٹی بلکہ صوبے کے اکثر بڑے شہروں کے عظیم ادبی اجتماعوں میں بحیثیت میر مشاعرہ شریک ہوئے، حتّٰی کہ ۱۹۳۴ء میں آل پنجاب یو، پی مشاعرے کی صدارت آپ نے شہر امرتسر میں فرمائی، اور ۱۹۳۶ء میں بمبئی کے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت بھی آپ ہی کو تفویض کی گئی تھی۔

غزل میں آپ کا ایک خاص طرز ہے۔ اہلِ فن کے نزدیک صاحبِ طرز ہونا ذی کمال ہونے کی دلیل ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سوال سوئے ادب ہے، زبانِ شوق خموش
یہ بارگاہ نہیں عرضِ مدعا کے لئے

دُور ہے وہ دور ہے۔ ہاں دور ہے مجھ سے مگر
دور اتنا میری ہستی مجھ سے جتنی دور ہے!

بےکس کے حالِ زار پہ آنسو بہائے کون
ویرانہ جل رہا ہے الٰہی بجھائے کون

نظر پھر بھی نہ دیکھا تھا کہ اشک آنکھوں میں بھر آئے
مجھے محروم رکھا دید سے جوشِ مسرت نے

منہ آپ نے کیا پھیرا محفل میں اندھیرا ہے
روشن نہ رہیں شمعیں باقی رہی بینائی

کترائی سی نگاہ یہ دزدیدہ التفات
آثار دے رہے ہیں خبر انقلاب کی

لے دے کے ایک فکرِ کفن ترکۂ غریب
اب موت کے سوا مری بالیں پہ آئے کون

قہر آلودہ نگہ تاک چھپے نظروں میں
میری آنکھوں نے تری چشمِ کرم دیکھی ہے

رومانی نظمیں بھی خوب فرماتے ہیں۔

انتظار

باغ ہے بہار ہے آب جوئبار ہے
چتر شاخسار ہے سیرِ لالہ زار ہے
آؤ انتظار ہے، جان بےقرار ہے

یہ جلوسِ نرم گام زنبق برق ہفت فام
یہ سماں یہ جشنِ عام، تم نہیں تو سب حرام
آؤ انتظار ہے، جان بےقرار ہے

زندگی ہے دل شکن چند روزہ پُرمحن
یہ شبابِ سرو تن پھر نہیں نگارِ من
آؤ انتظار ہے، جان بےقرار ہے

"عید ہے عید تمھارے در و دیوار کی عید" یہ نظم اپنا جواب نہیں رکھتی، آپ کی طبیعت میں طنز و مزاح بھی کافی پایا جاتا ہے۔ دیکھئے کس لطیف انداز میں فرماتے ہیں۔

بن سنور کر لیگ میں تشریف لائیں مس تراب
روز کی سُرخی لبوں پر، چہرہ پوڈر سے گلاب

مولوی صاحب جو بھنّائے تو بولیں چپ رہو
حسن آرائش سے پردے میں ہے روئے بے نقاب

مجالس میں کہیں قوموں کی ہو آئین کا جھگڑا
کہیں کشمیر پہ چشمک، کسی جا چین کا جھگڑا
ہماری خانہ جنگی کا نہ لیکن مورچہ بدلا
وہی مسجد میں ہو حق ہے وہی آمین کا جھگڑا

سیاسی نظمیں بھی آپ نے کافی لکھی ہیں۔ "مہاتما شیوراجی کا خواب" کافی مقبول ہوا۔ "مہذب بربریت"۔ "مزدور خدمت"۔ "ارتقاء"۔ "آپ کال"۔ "دیا بغریباں"۔ "مساوات" کے نسخے آج ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

آپ کا فارسی کا کلام سن کر ایک اہل علم بزرگ فرمانے لگے، نواب غالب پر ایرانیوں کا شبہ ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو کشمیر النسل جو ٹھہرے۔ سبحان اللہ کیا شعر فرمائے ہیں۔

مہ بوجد آید و انجم بہ فلک می رقصند
آخر ماہ صیام است چہ شامے دارم

در بہاراں ترکِ جامِ لالہ فام　　زاہد اطفلِ دبستانی ہنوز

بادۂ گلگوں نخستین از لبت نوشیدہ ام
مشربے با شم بکف گیرم دگر پیمانہ را

اے بگزری بخاکم آہستہ تر قدم نہ　　تا دامنت نگیرد دامن کش از غبارم

عربی اور انگریزی زبان میں بھی آپ کی نظمیں پائی جاتی ہیں۔ ہندی کا یہ عالم کہ نواب صاحب کا شمار ہندی شعرا کی صف میں کیا جائے گا۔

سائیں جگ دو گھٹ کا میلہ
باپ کپٹ سے مال ملایا　　لوبھ سے بھر بھر راکھا کوٹھی
کال دوارے آن پکارا　　ہاتھ نہ آیا دمڑی دھیلا

سائیں جگ دو گھٹ کا میلہ
نام ہری کا بھجتے رہیے　　رام بھجن دھن دولت ہے
سنسار کا سونا چاندی　　فانی مانو، ماٹی ڈھیلا
سائیں جگ دو گھٹ کا میلہ

اکثر مقام پر آپ کے بھجن کیرتنوں میں گائے جاتے ہیں۔

پار لگا دو بھگوان پیارے
تم ہو جگ کے تارن ہارے
لوبھ ترنگیں بھاری بھاری　　پھنس گئے پاپ بھنور نرناری
پربھو راکھیں لاج ہماری　　ڈوب نہ جائیں پاپی سارے
پار لگا دو بھگوان پیارے
تم ہو جگ کے تارن ہارے
دھن دولت بٹیا بیٹی میں!　　پاپ کپٹ لاگ لپیٹی میں
دن بیتے مال سمیٹی میں!　　آن پڑے اب کال کنارے
پار لگا دو بھگوان پیارے
تم ہو جگ کے تارن ہارے

آپ کی تحریر و تقریر دونوں ہی مختصر اور معنی خیز ہوا کرتی ہیں۔ نظم کی طرح نثر بھی نہایت عمدگی کے ساتھ لکھ لیتے ہیں۔ اس میں خاص رنگ اور نمایاں شان پائی جاتی ہے۔ آپ اپنے کتب خانے کی تنظیم و ترتیب خود فرماتے ہیں۔ حالانکہ مہتمم بھی ہوا کرتا ہے۔ کتابوں کی بے عزتی ایک نظر نہیں بھاتی۔ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، حکمت، اخلاقیات، ریاضیات، الہیات، تصوف، قصص و حکایات، آرٹ، فرہنگ و لغات، غرض جس موضوع پر دیکھیے کتاب موجود ہے۔ آپ کی مطبوعات میں "نغمیات"، "گلستانِ معرفت"، "ذکر و فکر"، "زمزمہ"، "دیہاتی گیت"، "نوائے نیم شب"، "مہذب بربریت"، "مزدور خدمت"، "ارتقاء"، "دیا بغریباں"، "مسافر"، "ہم سفر"، "آپ کال"، "مہاتما شیوجی کا خواب"، "وار اینڈ نیشن"، "مشعلِ راہ"، وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام بہت ہے، جو شائقین کی نظر سے نہیں گزرا۔

صوبہ متوسط کے تعلقہ داروں اور زمینداروں کی انجمن کے آپ صدر العدر رہے ہیں۔ چنانچہ زمینداروں کے وفد کے ساتھ کئی مرتبہ اراکین سلطنت سے ملنے تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ وردھا میں صدر کانگریس عالی جناب ڈاکٹر

ماجندر پرشاد موجودہ صدر جمہوریہ سے جو فطرتاً جوہر شناس واقع ہوئے ہیں، نواب صاحب کا تعارف ہوا۔ آپ نے موصوف کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے فرمایا "آپ کی جگہ یہ ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی ذاتِ گرامی اپنی علمی، ادبی شخصیت اور غیر جانبدارانہ اصولِ زندگی کے باعث ہندو مسلم زعما، اور عوام میں یکساں مقبول ہے۔

شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی بھی آپ کے قدردان تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے روزنامچے میں لکھا تھا "نواب غازی کے کلام، خیالات اور بندش میں حاکمانہ جوش پائی جاتی ہے"۔ اسی طرح حضرت مانی جائسی نے آپ کے کلام پر تبصرہ فرماتے ہوئے "تسنیم" کی کسی اشاعت میں تحریر فرمایا تھا "نواب غازی کے کلام کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ابھی ہندوستان کے رؤسا اور امرا میں ایسے دماغ موجود ہیں جنھیں بجا طور پر حامیِ ادب، خلاقِ معنی، نکتہ سنج اور دقیقہ رس کہا جا سکے"۔ دورانِ قیام دہلی میں حضرت بیخود اور حضرت نواب سراج الدین خاں سائل سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی، دونوں صاحبان آپ کے کلام کے معترف تھے۔ لکھنؤ کے احباب میں حضرت سراج، حکیم شیفتہ، وصل بلگرامی کے نام نامی مجھے یاد ہیں۔ گو نواب غازی نے اپنے اتالیق حضرت زیبا بلی لے کوٹی کو اوائلِ عمر میں کلام دکھایا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کا رنگ استاد مرحوم سے کہیں ملتا نہیں۔ اس کے متعلق خود زیبا صاحب مرحوم بھی فرماتے تھے۔ قابلیت کا یہ عالم ہے کہ کسی موضوع پر گفتگو کیجیے، آپ ایک ماہر کی طرح اظہارِ خیال فرمائیں گے۔ ملاقاتی آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ قناعت و استغنا کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سوا دو کروڑ کی جائداد خاتمۂ زمینداری کے قانون کی نذر ہو گئی، مگر نواب غازی کو کسی نے متفکر نہیں دیکھا۔ البتہ بحیثیت مفکر کے آپ کی امتیازی شان بدستور قائم ہے۔ حضرت عرش ملسیانی ایک مرتبہ کامٹی تشریف لائے، موصوف نے نواب صاحب سے ملنے کی "کاشانۂ غازی" تک زحمت گوارا فرمائی، کچھ دیر نشست رہی، اور آپ نواب صاحب کے کلام سے بہت متاثر و محظوظ ہوئے۔

"ہندوستانی موسیقی نمبر"

تجویز ہے کہ "آج کل" کا مارچ ۱۹۵۵ء کا شمارہ ہندوستانی موسیقی نمبر ہو۔

مندرجہ ذیل عنوانات پر بالخصوص اور ہندوستانی موسیقی سے متعلق دیگر موضوعات پر بالعموم مضامین درکار ہیں، جو اصحاب مضامین بہم پہنچا سکیں وہ مدیر رسالہ سے خط و کتابت فرمائیں۔

۱۔ ہندوستانی موسیقی کی تاریخ۔

۲۔ ہندوستانی موسیقی کے بڑے بڑے سرپرست۔

۳۔ مشہور گانے والوں کے حالات و کوائف۔ وشنو ڈگمبر، وشنو نارائن بھاتکھنڈے، سیتی علی، علی بخش، بندے علی خاں، فیاض خاں، رام کشن بوا وزے، کرشنا راؤ شنکر پنڈت، پنڈت رتن جانکار پرنسپل بھات کھنڈے کالج۔ گووند راؤ تانبے آف کولھاپور، اللہ بندے خاں، ذاکر الدین آف اودے پور، بھاسکر راؤ آف اودے پور، وغیرہ

۴۔ ہندوستانی موسیقی کے ساز

۵۔ ساز بجانے والے۔ بسم اللہ، شہنائی۔ بندو خاں، سارنگی۔ احمد جان تھرکوا، طبلہ۔ روی شنکر، ستار۔ عبدالعزیز، وچترونیا۔ ولایت خاں، ستار۔ عنایت خاں، ستار۔ حافظ علی خاں، سرود۔ علاؤ الدین خاں، سرود۔ اجودھیا پرشاد، مردنگ۔ وغیرہ

۶۔ فلمی موسیقی۔ سہگل، لتا منگیشکر، طلعت محمود۔ وغیرہ

۷۔ موسیقی کی ماہر خواتین۔ ہیرا بائی بڑودکر، گنگو بائی ہنگل، جودھ سنا بھوسلے۔ رسولن بائی۔ بیگم اختر۔ سدھیشوری دیوی۔

۸۔ لوک گیتوں کی موسیقی۔ پہاڑی۔ راجستھانی۔ اندھرا۔ پنجابی وغیرہ

۹۔ قوالی۔

۱۰۔ کرناٹک میوزک

۱۱۔ امیر خسرو۔ تان سین، سدا رنگ، ادا رنگ اور موسیقی کے بڑے بڑے موجد اور فن کار

۱۲۔ انھیں موضوعات سے متعلق نادر تصاویر کسی صاحب کے پاس ہوں تو وہ بھی مدیر رسالہ سے خط و کتابت فرمائیں۔

(ادارہ)

نواب وحید الدین غازی

آپ کی شاعری پر شاطر حکیمی کا مضمون ۱۶ تا ۲۰ صفحوں پر ملاحظہ فرمائیں

شمالي هند

جنوبي هند

راجستهان

مهاراشٹر

هندوستان کے
عورتوں کا

بنگال

جدید لباس

غرارہ اور قمیص

آسام

ـ حصوں میں
ـد لباس

انشا

پیدائش ۱۷۵۶-۵۸ عیسوی
وفات ۱۸۱۷ عیسوی

انشا کی شاعری پر ڈاکٹر محمد حسن کا
مضمون ۳ تا ۱۰ صفحوں پر دیکھئے

بھگوتی چرن ورما

آپ سے متعلق علی جواد زیدی
کا مضمون ۴۱ تا ۴۳ صفحوں پر
ملاحظہ فرمائیے

غزلیں

عبدالمجید حیرت

دل اگر شاد نہیں ہے نہ سہی
گھر یہ آباد نہیں ہے نہ سہی

تیرہ بختی میں کسی جانب سے
کوئی امداد نہیں ہے نہ سہی

ہم غریبوں سے وہ پیمانِ وفا
آپ کو یاد نہیں ہے نہ سہی

معتبر آپ کے نزدیک اگر
میری فریاد نہیں ہے نہ سہی

ظلم و بیداد بھی اُن کے نزدیک
ظلم و بیداد نہیں ہے نہ سہی

اس زمانے میں کسی شیریں کو
قدرِ فرہاد نہیں ہے نہ سہی

شکر اس کا ہے کہ آزاد ہے فکر
جسم آزاد نہیں ہے نہ سہی

یہ گنہگار سراپا تقصیر
فخرِ اجداد نہیں ہے نہ سہی

ایک جنبش بھی اگر حیرتؔ کی
قابلِ داد نہیں ہے نہ سہی

نجم آفندی

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

پھر ٹھیر گیا قافلہ ورد سنا ہے
شاید کوئی رستے میں مری طرح گرا اور

اک جرعۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وفا اور

اللہ گلہ کر کے میں پچھتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اُس نے کہا اور

کتنے بھی ہوں کشتۂ مرضِ حرص و ہوا کے
بیمار کی موت اور ہے مرگِ شہدا اور

کیا زیرِ لب آ دوست ہے اظہارِ حیات
حق ہو کے وہ ناحق ہو خفا تو بڑھا اور

دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا منعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور

یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے اُن کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

تمکین کاظمی

کچھ داغؔ سے متعلق

محترم علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی مدظلہٗ کا ایک مقالہ "داغ خطوط کی روشنی میں" اگست ۱۹۵۵ء کے آج کل میں شائع ہوا ہے۔ علامۂ محترم کو علم و ادب سے جو لگاؤ اور اردو زبان سے جو محبت ہے دنیا جانتی ہے، علامہ نے اسی مشغلہ میں ساری عمر گزار دی ہے اور اب بھی جبکہ اپنی عمر کی نوّے بہاریں دیکھ چکے ہیں اسی دھن میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ اس سن و سال کو پہنچ کر اپنے مشاغل کو جاری رکھنا اور اسی شوق و ذوق سے لکھنا پڑھنا جو شروع سے ہے، معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے۔ ہم لوگ پچاس سال عمر کے گزار کر نسیان کے شکار ہو گئے ہیں اور دماغی توازن ابھی سے بگڑنے لگا ہے۔ اپنی حالت پیش نظر رکھ کر علامہ کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اب بھی بہ ثبات عقل و ہوش و حواس کام کر رہے ہیں، خداوند عالم ان کا سایہ تا دیر قائم رکھے، آمین!

محولۂ بالا مقالہ علامہ نے بڑی عمدگی سے تحریر فرمایا ہے اور داغ کا مطالعہ ایک نئے زاویۂ نگاہ سے فرمایا ہے۔ چونکہ داغ سے متعلق صحیح معلومات کسی نے بھی فراہم نہیں کئے ہیں اس لئے بعض باتیں علامہ نے وہی تحریر فرمائیں جو داغؔ کے سوانح نگاروں نے لکھی ہیں چنانچہ داغؔ کے حیدرآباد پہنچنے اور ناکام واپس جانے اور پھر لوٹنے کا حال بھی کسی سوانح سے نقل فرمایا ہے کہ

"۱۸۸۸ء میں وہ (داغؔ) حیدرآباد دکن گئے لیکن کچھ مدت رہ کر ناکام واپس آگئے، تین چار سال کے بعد پھر حیدرآباد واپس آگئے

تو رسمی انتظار کے بعد آخر قسمت نے یاوری کی اور میر محبوب علی خاں نظام ششم والیٔ دکن کی مصاحبت اور اصلاح شعر کی خدمت سے سرفراز ہوئے تنخواہ بڑھتے بڑھتے ایک ہزار تک پہنچ گئی" (آج کل اگست ۱۹۵۵ء صفحہ ۵ کالم ۲ سطر ۱۳ تا ۱۸)

داغؔ کے حیدرآباد آنے۔ واپس جانے اور پھر آنے کے متعلق صحیح معلومات آج کل فراہم نہیں کئے گئے۔ داغؔ کی پہلی سوانح عمری حضرت احسن مارہروی کی لکھی ہوئی "جلوہ داغؔ" ہے جو داغؔ کی زندگی میں ان کے سامنے لکھی گئی بلکہ پورا مسودہ داغ کا سنا ہوا ہے چونکہ ان دنوں داغؔ کے مخالفین بہت تھے اور داغؔ کے متعلق بعض واقعات اور افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اس لئے داغؔ نے بڑی دقت سے اس کتاب کی اشاعت کی اجازت دی تھی اور اس کو بار بار سنا تھا تاکہ کوئی بات ایسی شائع نہ ہو جائے جو لوگوں کو تذکرہ بنانے میں مدد دے سکے مگر خود داغؔ نے اپنے حیدرآباد سے جانے اور پھر واپس آنے کی تاریخیں نہیں لکھوائی ہیں اس لئے یہ غلط فہمی بڑھتی گئی، خوش نصیبی سے مجھے داغؔ کے متعلق بعض سرکاری مثلیں مل گئیں جن سے یہ غلط فہمیاں رفع ہو جاتی ہیں۔

داغؔ کی تنخواہ جب جاری ہونے لگی تو ان سے تاریخ آمد دریافت کی گئی کیونکہ ان کی ابتدائی آمد کی تاریخ سے تنخواہ کی اجرائی منظور تھی چنانچہ داغؔ نے ایک فرد اپنے ہاتھ سے لکھ کر پیش کی جو مثل میں شریک ہے جس کی نقل پیش ہے۔

"فرد تاریخ ورود فرخندہ بنیاد حیدرآباد حسب تفصیل ذیل"

"غرۂ خورداد ۱۲۹۷ فصلی مطابق ۷ اپریل ۱۸۸۸ء"

"خورداد ۱۲۹۷ف لغایتہ غرۂ خورداد ۱۲۹۸ف	ایک سال
"خورداد ۱۲۹۸ف لغایتہ غرۂ خورداد ۱۲۹۹ف	ایک سال
"خورداد ۱۲۹۹ف لغایتہ غرۂ خورداد ۱۳۰۰ف	ایک سال
"خورداد ۱۳۰۰ف لغایتہ آخر آبان ۱۳۰۰ف	۶ ماہ
	ساڑھے تین سال ۶ ماہ

"اس ساڑھے تین سال کی مدت میں ایک مرتبہ ہندوستان جانے کا اتفاق اس طرح ہوا کہ ۵ر شہریور ۱۲۹۸ف کو بلدہ[1] سے گیا"

---

[1] شہر حیدرآباد کو بلدہ کہا جاتا ہے۔ (تمکین)

اور خورداد ۱۲۹۹ف کو بلدہ میں واپس آگیا جس کی مدت کل دس مہینے ہے۔ فقط

"داغ دہلوی بقلم خود"

یہ فرد بطور عرضی مد پیچ کر اور نامیہ پر جگہ چھوڑ کر لکھی گئی ہے اور نامیہ پر مدار المہام بہادر نے اپنے قلم سے تجویز فرمائی ہے ۔

نقل تجویز مدار المہام بہادر

" داغ صاحب کی تنخواہ اس فرد کے مطابق ساڑھے چار سو روپے حالی کے حساب سے جاری رکھی جائے "

قیام دہلی چونکہ حضرت پیر و مرشد کی اجازت سے ہوا۔ لہذا اس کے بابت وضعات نہ ہوگی' "آیندہ" بھی یہ تنخواہ جاری رہے گی اور پندرہ سو روپے جو پیشگی پہنچے مجرا کرلئے جائیں فقط "

۱۶ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ

اس فرد سے یہ ظاہر ہو گیا کہ داغ ۷ اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد پہنچے ۔ ۱۱ جولائی ۱۸۸۹ء تک حیدرآباد میں رہے اور ۳ شہریور ۱۲۹۸ف یعنی ۱۲ جولائی ۱۸۸۹ء کو حیدرآباد سے چلے گئے' پھر خورداد ۱۲۹۹ف یعنی اپریل ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد آگئے ۔ اس طرح (۹) مہینے کے قریب داغ نے حیدرآباد سے باہر گزارے ہیں ۔ تین چار برس کی مدت جو سوانح نگاروں نے بتائی ہے وہ غلط ہے ۔ خود داغ کی امید داری کی مدت انھیں کی لکھی ہوئی فرد کے مطابق ساڑھے تین سال ہے ۔

داغ ۷ اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد پہنچے اور سیف الحق ادیب کے مہمان ہوئے ایک سال دو مہینے بڑی کد و کاوش اور جد و جہد میں گزارے اور ۱۲ جولائی ۱۸۸۹ء کو حیدرآباد سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد حضور نظام نے یاد فرمایا اور حیدرآباد سے انھیں خطوط اور تار بھجوائے گئے چنانچہ اپریل ۱۸۹۰ء میں وہ حیدرآباد واپس ہو گئے اور ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو ساڑھے چار سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی' ابتدائی قیام حیدرآباد کے زمانے میں مدار المہام بہادر نے ایک دفعہ پانچ سو روپے مد خرچ کے طور پر دلوائے پھر ۸ ستمبر ۱۸۹۱ء کو ایک ہزار روپے بطور مد خرچ دلوائے ۔ اس طرح پندرہ سو روپے داغ کو اجرائی ماہوار سے قبل پیشگی دلوائے گئے تھے' ماہوار تنخواہ کی اجرائی ہوئی تو ساڑھے تین سال کی تنخواہ بحساب ماہوار (۴۵۰) جملہ (۱۸۹۰۰) ہوئی جس میں سے پیشگی ادا شدہ رقم (۱۵۰۰) وضعات کرکے (۱۷۴۰۰) روپے نقد داغ کو ملے ۔ حضور نے داغ سے ایک ہزار ماہوار تنخواہ کا وعدہ فرمایا تھا داغ برابر تقاضا کرتے رہے اور تین سال تک یہ تقاضا جاری رہا چنانچہ ۸ ستمبر ۱۸۹۴ء کو داغ کی سابقہ تنخواہ میں ساڑھے پانچ سو ماہوار کا اضافہ تاریخ اجرائی سابقہ یعنی ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء سے منظور فرمایا گیا جس کا بقایا بیالیس ہزار آٹھ سو روپے نقد ملا ۔ اس اضافے کی تاریخ داغ نے کہی ہے ۔

ابتدا سے اپنی ساڑھے پانچ سو نقدی بڑھی

۱۳ ۷ ۱۲

اس طرح داغ کو پہلے اور بعد کے دونوں بقایوں کو ملا کر ساٹھ ہزار دو سو روپیہ نقد ملا ہے' اور اس کے بعد خطابات سرفراز ہوئے ۔ محولۂ بالا مقالے میں علامہ نے داغ کے خطابات تحریر فرمائے ہیں ۔

" یہ خطابات داغ کو نظام کی پیش گاہ سے عطا ہوئے :" سپہ سالار' یار وفادار' مقرب السلطان' بلبل ہندوستان' جہان استاد' ناظم یار جنگ' دبیر الدولہ' فصیح الملک" (آجکل اگست ۱۹۵۴ء صفحہ ۵ کالم ۲ سطر ۱۹ تا ۲۱)

علامہ موصوف کو داغ کے خطابات میں تسامح ہوا ہے اس مقالے کی ترتیب کے وقت علامہ کے سامنے " انشائے داغ" مرتبہ احسن مارہروی رہی ہے مگر علامہ نے اپنے حافظے کی مدد سے خطابات نقل فرمائے ہیں' جس میں دو خطاب سپہ سالار' یار وفادار خود حضور نظام کے خطاب ہیں' انشائے داغ میں احسن نے داغ کا خط محمود رامپوری کے نام نقل کیا ہے جس میں ۲۸ مئی ۱۸۹۷ء کو داغ نے لکھا ہے ۔

"میرا خطاب یہ ہے"

" بلبل ہندوستان' جہان استاد' دبیر الدولہ' ناظم یار جنگ نواب فصیح الملک داغ بہادر"

(انشائے داغ صفحہ ۱۱۰)

یہ ایک معمولی تسامح ہے مگر علامہ کے مضمون میں ہونے کی وجہ سے چونکہ لوگوں کو مغالطہ ہونے کا قوی امکان ہے اس لئے میں نے حقیقت حال ظاہر کر دی ہے ۔ خدانخواستہ اس سے علامہ پر حرف گیری یا ایراد قطعاً مقصود نہیں سالہا سال پہلے کے خطابات جو اتنے بھی علامہ کے حافظے میں رہے حیرت ناک ہے ورنہ ہمیں تو وہ خطابات اور القاب بھی پورے یاد نہیں جو ہمارے دوستوں

اور عزیزوں کو ہمارے سامنے مختلف اوقات میں ملتے رہے۔

علامہ نے داغ کا مطالعہ بڑی وسعت و دقتِ نظر سے فرمایا ہے۔ داغ کی خودداری سے متعلق بالکل صحیح تحریر فرمایا ہے کہ

"مرزا نوشہ شاید خودبینی اور خودداری میں امتیاز نہیں کرتے تھے مگر مجھے یہ بہت پیاری لگتی ہے' انسان میں آن ضرور ہونی چاہئے" ہاں یہ ضرور ہے کہ مبالغہ سے کام لو گے تو خودداری خودبینی بن جائے گی' مرزا داغ میں یہ بات نہیں تھی' ان کی طبیعت اعتدال پسند واقع ہوئی تھی اور ان کا شعور توازن پذیر تھا"

میں نے داغ کے سینکڑوں ملنے والوں سے ان کے متعلق تفصیلی واقعات سُنے ہیں اور ان کی سیرت کے بیشتر پہلو میرے پیش نظر رہے جن کی بنا پر میں نے بھی داغ کو اعتدال پسند اور توازن پذیر شعور کا مالک قرار دیا ہے' مگر میں نے برسوں کی کد و کاوش اور ہزاروں واقعات سُن کر جو نتیجہ نکالا ہے علامہ نے صرف چند مکاتیب کے مطالعہ سے اخذ فرما لیا ہے یہ ہے کمال! خوش قسمت ہے ہندوستان کہ اسے علامہ کیفی جیسے صاحب الرائے ملے اور اردو فخر کر سکتی ہے کہ اس کو علامہ جیسے ادیب کی سرپرستی حاصل ہے' اپنے مقالے کے آخر میں علامہ نے احسن مارہروی کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

"میرا قیاس ہے کہ ادبی دنیا میں جو حسد اور مخالفت مرزا صاحب سے تھی وہ احسن جیسے پُرجوش شاگردوں کے مبالغہ آمیز دعووں کی وجہ سے ہوگی۔"

علامہ کا یہ قیاس بھی بالکل صحیح ہے' داغ نہایت مرنجاں مرنج اور سلجھے ہوئے مزاج کے آدمی تھے احسن وغیرہ جیسے پُرجوش شاگردوں نے اُن کو کانٹوں میں گھسیٹا ورنہ وہ ان ہنگاموں سے بہت دُور رہتے تھے' شعرائے لکھنؤ خصوصاً شاگردانِ امیر مینائی نے بھی داغ کو بہت مطعون کیا اور ان لوگوں کو اللہ واسطے کا بغض داغ سے تھا داغ کی زندگی میں جو کچھ کیا تھا وہ کچھ کم نہ تھا مگر داغ کے مرنے کے بعد بھی شاگردانِ امیر نے امیر مینائی کا نام لے کر ان کی سوانح لکھ کر ان کے خطوط شائع کر کے داغ کے خلاف زہر اُگلا ہے۔ انتہا یہ کہ اختر مینائی (اختر یار جنگ) فرزند امیر مینائی اور جلیل (فصاحت جنگ) جانشین امیر مینائی جن کو داغ نے حیدرآباد میں جمایا اور ہر طرح ان کی امداد اعانت اور سرپرستی کی نے بھی داغ کی مخالفت کی اور ہمیشہ داغ کی بدنامی کے درپے رہے۔

فصیح اللغات کے متعلق علامہ نے بڑے کام کی بات تحریر فرمائی ہے۔

"جناب احسن نے تجویز کی کہ کل محاورے جمع کئے جائیں اور داغ محاوروں کو مختلف اشعار میں باندھیں اور اس مجموعے کا نام فصیح اللغات رکھا جائے' صاحبِ لغات تو شاعروں اور ادیبوں کے کلام سے محاورے اخذ کرتے ہیں۔ یہاں اُلٹی گنگا بہانے کی تجویز عارضِ دماغ ہوئی۔ عجیب مشورہ تھا اور تعجب ہوتا ہے کہ داغ نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہی نہیں اس پر عمل ہونے لگا۔"

علامہ کا اعتراض بالکل بجا ہے مگر فصیح اللغات کے متعلق تفصیلات علامہ کو نہیں ملیں۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ امیر مینائی نے ایک لغت الفاظ اور محاورات کا "امیر اللغات" نام سے ترتیب دینا شروع کیا جس کا کام حافظ جلیل حسن اور دوسرے چند شاگرد امیر مینائی کی نگرانی میں کرتے تھے اس میں لکھنؤ کے محاورات متروکات وغیرہ تفصیل سے لکھے جا رہے تھے۔ یہ کام داغ کے سامنے ہی رامپور میں شروع ہوا تھا' اور داغ اس سے واقف تھے۔ امیر اللغات کو امیر مینائی لکھنؤ کے لئے مخصوص کر چکے تھے انھوں نے لکھنؤ کے محاورے لکھنؤ کی تذکیر و تانیث اور لکھنؤ کی زبان کے لئے اس لغت کو وقف کر دیا تھا اور اس میں سند کے شعر امیر مینائی ہی کے نقل کئے جاتے تھے' باوجود اس کے یہ کام داغ کے سامنے ہوتا رہا اور وہ اس سے بخوبی واقف تھے مگر انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔

داغ کے حیدرآباد آنے اور یہاں اعزاز و اکرام حاصل کرنے کے بعد لوگوں نے داغ کے ذریعے سے حیدرآباد میں کام نکالنے کی خاطر داغ کو مختلف طریقوں سے ہموار کرنا شروع کیا۔ مکتوبات داغ میں ایسے خطوط ملتے ہیں جو داغ نے اس قسم کی فرمائش کرنے والوں کے جواب میں لکھے ہیں مگر دنیا میں ایک سے ایک ہوشیار موجود تھا بعض لوگوں نے خط لکھ کر ٹکا سا جواب پا لیا تو بعض ہوشیاروں نے خاموشی کے ساتھ حیدرآباد پہنچ کر داغ کو ہموار کرنا شروع کیا جن میں .... تھے۔ یہ ابتداً حیدرآباد آئے تو داغ کو فصیح اللغات کی اشاعت کے لئے ابھارا۔ انھوں نے داغ کو یاد دلایا کہ امیر اللغات صرف لکھنؤ کے محاورات متروکات اور لکھنوی زبان کی حد تک محدود ہے اس میں دہلی اور دوسرے علاقوں کے محاورات نہیں ہیں اس لئے آپ ایک لغات دہلی کی زبان کے محاورات اور متروکات کے لئے ترتیب

دیں تو زبان کی بڑی خدمت ہوگی - اس میں التزام رکھا جائے کہ سند میں جتنے شعر بھی ہوں وہ آپ ہی کے ہوں اس سے ایک تو دلّی کی زبان مضبوط ہو جائے گی اور دوسرے آپ کے شاگردوں کے لئے ایک مستقل کتاب متروکات اور تذکیر و تانیث کی تیار ہو جائے گی -

داغ تصنیف و تالیف کے میدان کے مرد نہ تھے انھوں نے ابتداً تو کچھ اعتنا نہیں کی مگر .... نے داغ کے حاضر باش شاگردوں مثلاً احسن علی خاں امیر حیدر آبادی، عزیز یار جنگ عزیز حیدر آبادی وغیرہ کو ہموار کر کے داغ کو بار بار مجبور کرنا شروع کیا اور ان شاگردوں نے بھی مجبور کیا تو داغ اس شرط پر آمادہ ہو گئے کہ ...... ترتیب وغیرہ کا کام کریں صرف محاورات الفاظ وغیرہ لکھ کر داغ کو دیا کریں جنھیں داغ نظم کر دیں گے اس سے زیادہ کوئی کام داغ نہ کریں گے -

.... کا منشا اس لغات کی ترتیب سے یہ تھا حیدر آباد میں ان کا قیام مستقل طور پر ہو جائے اور وہ یہاں کوئی ملازمت یا وظیفہ حاصل کر سکیں - چنانچہ انھوں نے ....
کو بھی حیدر آباد بلا لیا اور انھیں داغ کا روزنامچہ مرتب کرنے کے لئے بٹھا دیا - داغ نے ان کی دو کتابیں بھی اپنے ایک معروضے کے ساتھ حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش کیں (ملاحظہ نقل معروضۂ داغ مؤرخہ ۳ رشوال ۱۳۱۹ھ ر ۱۴ رجنوری ۱۹۰۲ء مطبوعہ انشاء داغ مرتبہ احسن مارہروی) داغ چاہتے تھے کہ سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی وحید الدین بیخود دہلوی، افتخار عالم مارہروی اور احسن مارہروی کو دربار نظام میں پہنچا ئیں چنانچہ کئی بار انھوں نے حضور سے عرض بھی کیا تھا کہ حضور دو چار اہل زبان کو مصاحبت میں مقرر فرمائیں مگر حضور نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی تھی -

اس طرح .... نے داغ کو امیر اللغات کے جواب میں فصیح اللغات کے سہرے پر لگا لیا داغ مسابقت کے قائل نہ تھے اور پھر امیر مینائی کے انتقال کے بعد ہی امیر اللغات ختم ہو چکی تھی اس لئے مسابقت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ... نے اس طرح فصیح اللغات کی ترتیب شروع کی اور اس کے چند اجزا مرتب کر کے طباعت کی تیاری کرنے لگے - داغ نے اپنی جیب سے سو روپے نقد دئے - مہاراجہ سر کشن پرشاد نے تین سو روپے دئے اور بعض اور شاگردوں نے بھی حسب استطاعت دس بیس روپے دئے اس طرح کافی رقم جمع ہو گئی اور .... نے حیدر آباد کے ایک مطبع کو مسودہ دے دیا اور ایک آدھ جزو بھی نہیں چھپا تھا کہ وہ اپنے کسی خاص کام سے وطن چلے گئے اور ایسے گئے کہ پھر نہ آئے - مطبع میں جو حصہ چھپا ہوا پڑا تھا وہ ویسا ہی پڑا رہا - والدِ مرحوم حضرت تجلی نے ایک دو جزو غالباً مطبع سے حاصل کر لئے تھے جو نہایت گندے کاغذ پر بہت ہی خراب خط میں نہایت بھدے چھپے تھے جو مدت تک ردی کاغذات میں پڑے رہے اور ضائع ہو گئے -

یہ ہے فصیح اللغات کی کہانی اس میں کوئی زیادتی داغ کی طرف سے نہیں ہوئی تھی بلکہ داغ کے بھولے پن سے فائدہ اٹھا کر انھیں اس چکر میں پھانسا گیا تھا - چنانچہ جب .... واپس نہیں آئے اور مطبع والوں نے طبع شدہ اجزاء کی اجرت کا تقاضا کیا تو داغ بہت خفا ہوئے جمع شدہ رقم .... کے پاس رہ گئی تھی - مطبع والوں نے داغ کے نام پر کام شروع کر دیا تھا غالباً یہ اجرت داغ نے اپنی جیب سے ادا کی - یہ قصہ مجھے نواب حسن علی خاں امیر حیدر آبادی اور اپنے والد حضرت تجلی سے معلوم ہوا ہے ان تفصیلات سے حضرت نوح ناروی بھی بخوبی واقف ہیں -

علامہ کیفی نے فصیح اللغات کا تذکرہ فرماتے ہوئے آخر میں تحریر فرمایا ہے "یہ معلوم ہوتا ہے شاگرد اور استاد دونوں دماغی توانائی گنوا چکے تھے"
یہ رائے بالکل صحیح ہے مگر اس وقت جب کہ داغ نے محض اپنے پروپیگنڈے کے لئے کیا ہو، اس تفصیل کے ملاحظے کے بعد علامہ محسوس فرمائیں گے کہ اس کام میں داغ کی نیت بری نہ تھی وہ ... کے چکر میں پھنس گئے تھے اور اس کام کو اس لئے پسند کیا تھا کہ دلّی کی زبان اس طرح محفوظ ہو جائے اور یہ نیک نیتی تھی داغ کی -

داغ کسی جھگڑے میں پھنسنا یا مسابقت کرنا کبھی بھی پسند نہیں کرتے تھے - ان پر اعتراض کئے جاتے اور بڑے بڑے مضمون ان کے خلاف لکھے جاتے تھے مگر وہ نہ تو ان مضامین کا اثر لیتے اور نہ جواب دینا پسند کرتے تھے ایک دفعہ ذوالفقار علی خاں گوہر برادر مولانا محمد علی جوہر نے ایک ایسے ہی مضمون کا جواب لکھا تو داغ نے انھیں ڈانٹ بتائی چنانچہ داغ سے عبدالقادر (جو بعد کو خان بہادر اور سر ہوئے) نے اپنے سفر حیدر آباد کے زمانے میں ان

اعتراضات کے متعلق بات چیت کی تو داغ نے ان سے بھی یہی کہا کہ وہ ان بے ہودہ اعتراضات کا جواب دینا یا دلوانا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ایک دفعہ محمد الدین فوق (اڈیٹر کشمیری میگزین وغیرہ) اور وجاہت جھنجھانوی (اڈیٹر فصیح الملک وغیرہ) کو بھی داغ نے ایسے مضامین کا جواب لکھنے سے منع کیا تھا۔

امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے داغ کو بہت محبت تھی اور ہمیشہ ان دونوں کو یاد کرتے رہتے تھے چنانچہ امیر کو داغ نے بنارس بلوا کر کلکتے سے واپسی میں بنارس میں حضور نظام کے پاس باریاب کرایا قصیدہ پیش کرایا اور پھر حیدرآباد دکن بلا کر ان کو مہمان رکھا اگر امیر یہاں آنے کے بعد انتقال نہ کرتے تو داغ انھیں دربار میں باریاب کرا کر تنخواہ کرا دیتے مگر امیر تو مرنے کے لئے حیدرآباد آئے تھے' داغ نے ان کی مہمان داری اور تیمار داری جس محبت اور یگانگی سے کی سارا حیدرآباد جانتا ہے۔ صاحبزادہ آفتاب علی خاں مہر حیدرآبادی نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو اب تک بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں۔

محض امیر کی محبت میں داغ نے اختر مینائی اور حافظ جلیل حسن جلیل کو حیدرآباد میں ٹھہرا لیا ہر قسم کی امداد و اعانت کی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے دربار میں منسلک کرا دیا۔ چنانچہ مہاراجہ بہادر نے داغ کے انتقال کے بعد جلیل کو پیش کرکے استاذ السلطان بنا دیا اور داغ کی تنخواہ میں سے جلیل کی تنخواہ مقرر ہوئی اور مہاراجہ ہی نے اختر مینائی کا تقرر فرمایا۔ اس طرح اختر یار جنگ اور فصاحت جنگ داغ ہی کے طفیل میں بنے اور پروان چڑھے۔

داغ جن دنوں حیدرآباد آئے ہیں سازشیں عروج پر تھیں اور مختلف پارٹیاں بنی ہوئی تھیں مگر داغ نے کسی پارٹی سے بھی واسطہ نہیں رکھا۔ ہمیشہ الگ تھلگ رہے اور کمال یہ کیا کہ ملکی شاگردوں کو ایسا ہموار کر لیا کہ وہ ہر آڑے وقت داغ کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے اور ملکی غیر ملکی بحث میں اپنے آپ کو نہیں الجھایا اور نہ غیر ملکیوں ہی کا ساتھ دیا۔ داغ کے سامنے بیسیوں شہر بدر ہوئے مگر داغ قطب بنے رہے۔ مکاتیب داغ میں ایک دو خط ایسے نظر آتے ہیں جن میں داغ نے بعض شہر بدر ہونے والوں کا ذکر کیا ہے۔

حضور آصف میر محبوب علی خاں بہادر نہایت نازک مزاج اور فرشتہ فرماں روا تھے۔ داغ ہی تھے جو ان کی مزاج داری کر سکے اور اپنی عزت ان کے دل میں قائم رکھی دوسرا اس عمدگی سے نباہ نہ سکتا تھا۔ ایسا فرشتہ' آستاد ور اندیش ایسا پابند شخص۔ - - - - - - کے چکر میں نہ آتا مگر داغ کے دل میں اردو کے لئے بڑی جگہ تھی اور وہ دلّی کی زبان کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ دلّی کی زبان کے متعلق کوئی کتاب لکھی نہیں گئی تھی بلکہ سید احمد دہلوی کا جو لغات طبع ہو رہا تھا وہ داغ کی نظر میں غیر مکمل اور خالص دہلوی نہ تھا کیونکہ داغ سید احمد کو "غریب سرائے والے" کہا کرتے تھے اس لئے انہوں نے محض دلّی کی زبان کی خاطر "فصیح اللغات" کی ترتیب پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ یہ حقیقت ہے اس کام کی' ورنہ داغ بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے اور "الٹی گنگا بہانے کی تجویز کبھی بھی عارض دماغ" نہیں ہوئی تھی۔

عطائے محروم

آج کل کشمیر نمبر کے متعلق

محترمی تلوک چند صاحب محروم کی

گراں قدر رائے

مرے پیشِ نظر جو "آج کل" ہے
سراپا سحر و افسوں کا عمل ہے

نہایت خوب ہے کشمیر نمبر
یہ ہے کشمیر کا "توقیر نمبر"

نگارِ نازنیں ہے یہ صحیفہ
بہارِ دل نشیں ہے یہ صحیفہ

سیاہی ہے سوادِ شامِ کشمیر
سفیدی صبحِ گوہر فامِ کشمیر

لطافت بار ہے نیرنگِ تحریر
صناعت کا رہے حسنِ تصاویر

بہ ذوق و شوق اسے میں نے پڑھا ہے
پڑھا کیا اپنے دل میں رکھ لیا ہے

رگ و پے میں اثر اس کا ہے ساری
زباں پر ہے مری یہ شعر جاری

زہے کشمیر و حسنِ بے پناہش
غبارِ لالہ و گل خاکِ راہش

پرکاش پنڈت (آوازوں میں ایکانکی)

کھوئی ہوئی منزل

کردار

۱ - ایک عورت
۲ - وہی عورت
۳ - ایک مرد
۴ - ایک اور مرد
۵ - ایک بچہ
۶ - ایک اور بچہ
۷ - ایک بچی
زمانہ - ایک دن

(بیک گراؤنڈ سے بچوں کی کلکاریوں کے ساتھ گیت کے بول ابھرتے ہیں)

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار ہاؤ آئی وَنڈر وٹ یو آر
ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار ہاؤ آئی وَنڈر وٹ یو آر
ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار ہاؤ آئی وَنڈر وٹ یو آر

(واپس بیک گراؤنڈ میں جاتے ہوئے گیت کے بولوں پر ذیل کے الفاظ سپرامپوز)

عورت ۔ شور۔ دن رات شور۔ زندگی جیسے یہاں پہنچ کر شور میں ڈوب گئی ہے۔

(بیک گراؤنڈ سے پھر بچوں کی کلکاریاں اور گیت کے بول ابھرتے ہیں)

پنچھی کبوتر اُڑن فلائی لُک دیکھو اسمان سکائی
پنچھی کبوتر اُڑن فلائی لُک دیکھو اسمان سکائی
ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار ہاؤ آئی وَنڈر وٹ یو آر

(کلکاریاں اور گیت کے بول بیک گراؤنڈ میں چلے جاتے ہیں)

عورت ۔ بچے! تین بچے۔ سمندر کی طوفانی لہروں کا راستہ روکے ہوئے تین چھوٹے بڑے جزیرے۔ ایک جتنے فاصلے پر کھڑے تین سیارے! میرے بچو! میری آنکھوں کے معصوم تارو، یہ تمہاری ماں کتنی بُری ہے۔ ماں! نہیں میں ماں کہلانے کی حقدار نہیں۔ تمہیں دیکھ کر چھاتی میں ٹھنڈک پڑنے کے بجائے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں کس طرح تمہاری ماں ہو سکتی ہوں، میرے جگر کے ٹکڑو، اگر کبھی چاؤ سے میں نے تمہارا منہ نہیں دھویا۔ تمہیں اپنے جسم کا انگ نہیں سمجھا۔ میں کتنی گری ہوئی ہوں میرے بچو — لیکن، لیکن کیا میں سچ مچ گری ہوئی ہوں!

وہی عورت ۔ ہاں تم سچ مچ گری ہوئی ہو۔

عورت ۔ نہیں، نہیں، میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ تمہارے طعنوں نے ہی آج مجھے اس حالت پر پہنچایا ہے۔ آج میں نہ زندوں میں ہوں نہ مردوں میں۔ میری زندگی تم نے چھینی اور میری موت پر بھی تم نے پہرہ بٹھا دیا۔ مجھے بتاؤ، میری جنم جنم کی بیرن۔ مجھے کنویں میں ڈھکیل کر تمہارے ہاتھ کیا آیا؟ تمہاری کون سی مراد پوری ہو گئی، جو آج زندگی اور موت کے درمیان لٹکی ہوئی میں اس بُری طرح سٹپٹا رہی ہوں۔ بتاؤ کیا سہنے دیا تم نے میرے پاس۔

وہی عورت ۔ تمہارے پاس! دودھ پوت، سہاگ، عیش آرام، سبھی کچھ تمہارے پاس ہے۔ اس سے زیادہ عورت کو اور کیا چاہیئے۔ تمہیں تو اپنی قسمت پر فخر کرنا چاہیئے، کہ اس غموں دکھوں کی دنیا میں، گرم ہوا تک تم سے دور رہتی ہے۔

عورت ۔ گرم ہوا! میرا انگ انگ گرم راکھ میں دبا جھلس رہا ہے، میں انگاروں پر لوٹ رہی ہوں، اور تم کہتی ہو کہ گرم ہوا تک مجھ سے دور رہتی ہے۔ تمہارے خیال میں میں راج بھوگ رہی ہوں۔ دودھ، پوت اور سہاگ! کیا اس سے پرے عورت کے لئے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

وہی عورت ۔ ہاں، ایک حد تک۔

عورت ۔ حدیں، دور کی حدیں، نزدیک کی حدیں۔ ماں باپ اور لوک لاج کی حدیں۔ ساس سسر کی کڑی نظروں کی حدیں۔ دنیا کی زبان پر آنے اور اس کی انگلی اٹھ جانے کی حدیں اور ان حدوں میں گھری ہوئی عورت گھلتی رہے، تڑپتی رہے۔

وہی عورت ۔ لیکن عورت کے تڑپنے کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔

یونہی آسمان کے ستاروں کی طرف دیکھ دیکھ کر اگر وہ آہیں بھرتی رہے۔ پھولوں کی سیج پر سوتے سوتے زمین پر لوٹنے کو بے چین ہو اُٹھے تو تم ہی بتاؤ تم اسے کیا کہوگی؟

عورت۔ بے بس، لاچار، قابلِ رحم۔

وہی عورت۔ قابلِ رحم! ہونہہ! کیا پاگل پن ہے۔

عورت۔ ہاں تم اسے پاگل پن ہی کہوگی —— میں اپنی زندگی کی مختلف تصویریں بناتی ہوں، اور پھر خود ہی انھیں مٹا دیتی ہوں، سوچتی ہوں سکھی کون ہے؟ وہ جو سامنے کی چیز کو دیکھتا ہے یا وہ جو نظروں سے پرے کی دیکھنا چاہتا ہے۔

وہی عورت۔ جو سامنے کی چیز دیکھتا ہے۔

عورت۔ نہیں، یہاں وہ بھی سکھی نہیں۔ سامنے کی چیز دیکھتے دیکھتے میں نے اپنی زندگی کے تیس برس گزار دیئے —— تیس برس! ایک عورت کی زندگی کے تیس برس۔ کیا میں سکھی ہوں؟

وہی عورت۔ تم سامنے کی چیز نہیں دیکھتیں۔

عورت۔ اب میں سامنے کی چیز نہیں دیکھ سکوں گی۔

وہی عورت۔ کتنے بُرے خیالات ہیں۔

عورت۔ ہاں بُرے خیالات! تمھیں تو ہمیشہ میری ہر بات بُرے خیالات سے بھری نظر آتی ہے۔ مجھے وہ دن نہیں بھولے —— میں ان دنوں کو بھول بھی کیسے سکتی ہوں۔ جب میری روح کے تاروں سے پیار بھرے گیت پھوٹتے تھے۔ آزاد پنچھی کی طرح میں آسمانوں میں اُڑا میں بھرتی تھی۔ کتنی خوشیوں بھری زندگی تھی میری، اور میری زندگی ہمیشہ خوشیوں بھری رہتی اگر تم —— تم میری زندگی کی ناؤ میں ان بُرے خیالات کے اینٹ پتھر نہ بھر دیتیں۔ مجھے اپنی زندگی کے ساتھ جوا کھیلنے پر مجبور نہ کر دیتیں۔

وہی عورت۔ جوا؟

عورت۔ ہاں جُوا! میں نے جُوا کھیلا۔ میں جانتی تھی اس کھیل میں مجھے ہار ہوگی۔ لیکن یہ ہار اتنی تکلیف دہ ہوگی، یہ میں نہیں جانتی تھی۔

وہی عورت۔ ہار جیت زندگی کے ساتھ ہے۔ کوئی ہارتا ہے کوئی جیت جاتا ہے۔ لیکن جیت پر خوشیاں منانا اور ہار پر آنسو بہانا عقلمندوں کا کام نہیں۔ پھر تمھاری تو صحیح معنوں میں جیت ہوئی ہے۔ قربانی کے سامنے ہار جیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

عورت۔ قربانی ...... قربانی ...... قربانی ......

(سنگیت ایک دم اُبھر کر بیک گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے)

مرد۔ نہیں پورنیما، نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم خود ہی سوچو ایسا کیسے ہو سکتا ہے!

عورت۔ لیکن ہوگا یہی آنند —— میں جانتی تھی کہ ایک دن یہی ہوگا۔

مرد۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ تمھارا ہاتھ تھاما ہے۔ پورنیما تو تمھیں منجدھار میں نہیں چھوڑوں گا۔

عورت۔ لیکن دنیا اس ہاتھ کو چھڑا رہی ہے آنند، اور دنیا بہت ظالم ہے۔

مرد۔ میں دنیا کا ہر ظلم برداشت کر سکتا ہوں، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا پورنیما کہ تمھارا ہاتھ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلا جائے۔

عورت۔ میں بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ تم مجھ سے دور، بہت دور چلے جاؤ۔ اتنی دور کہ میری آواز تک وہاں نہ پہنچ سکے۔ میں تڑپتی رہوں لیکن تمھارا سامنا نہ دیکھ سکوں۔ تمھیں چھو نہ سکوں، تمھیں پیار نہ کر سکوں۔ لیکن یہ سب برداشت کرنا ہوگا میری خاطر آنند، میرے پیار کی خاطر، جو صرف تمھارے لئے ہے، اور تمھارے لئے رہے گا۔

مرد۔ تمھارے بغیر میں بالکل ادھورا رہ جاؤں گا پورنیما! نہیں میں تمھارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔

عورت۔ میں جانتی ہوں، اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمھارے بغیر جو میں زندہ رہوں گی تو وہ زندہ رہنا نہیں ہوگا۔ لیکن تمھیں زندہ رہنا ہے، اور مجھے بھی زندہ رہنا ہے، اور اسی لئے زندہ رہنا ہے کہ ہمارا پیار زندہ رہے۔ میں جہاں رہوں گی، جیسے رہوں گی، اس پیار کو زندہ رکھوں گی۔ میں اس پیار کو کبھی مرنے نہیں دوں گی آنند۔

(بیک گراؤنڈ سے سنگیت اُبھر کر قریب تر آتا ہے اور اونچے سُروں پر ختم ہو جاتا)

عورت۔ قربانی ...... قربانی ...... قربانی ......

کیا اسی کا نام قربانی ہے —— تم سمجھتی ہو اس قربانی سے دنیا کی کوئی بگڑی ہوئی بات بن گئی ہے۔ دنیا کے سنورنے کے لئے صرف میری اس

قربانی کی ضرورت تھی جو میں نے دے دی، اور اب جو میں اپنے کیے پر پچھتا رہی ہوں، تڑپ رہی ہوں تو یہ میری بھول ہے۔ میری گراوٹ ہے۔

وہی عورت ۔ ہاں یہ تمھاری گراوٹ ہے۔

عورت ۔ اور وہ کیا تھا جو میں نے کیا۔ تمھاری باتوں میں آکر میں نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ لوک لاج بچا لی لیکن اپنی چھاتی پر ایک پہاڑ رکھ لیا، جو سرکتا ہے اور نہیں سرکتا۔ دم گھونٹتا ہے۔ دم نکلنے نہیں دیتا۔

وہی عورت ۔ وہ تمھارا فرض تھا۔

عورت ۔ فرض! اور اب یہ بھی میرا فرض ہے کہ میں اسے بھول جاؤں۔ اسے کبھی یاد نہ کروں۔

وہی عورت ۔ ہاں!

عورت ۔ اور وہ تڑپتا رہے، اور میں تڑپتی رہوں۔

وہی عورت ۔ ہاں۔

(بیک گراؤنڈ سے بچوں کی کلکاریوں کا ابھرنا اور قریب آنا)

دو بچے ۔ (ایک ساتھ) ممی ممی، پاپا آئے ہیں۔

دوسرا مرد ۔ لو بھئی سنبھالو اپنے اس بے بی کو۔ سب کپڑے ستیاناس کر دیئے۔ ہر وقت دھول میں سنا رہتا ہے۔

عورت ۔ آؤ بے بی اترو پاپا کی گود سے ــــ دیکھو کیا گت بنا رکھی ہے تم نے۔

بچہ ۔ ممی! اُم لیل والی تیل لیے تھے۔

بچی ۔ پاپا، وہ میری سائیکل نہیں لائے؟

دوسرا بچہ ۔ اور میری موٹر ....

پہلا بچہ ۔ اول میلی بنڈوچ ....

دوسرا مرد ۔ سب آئے گا بھائی، سب آ جائے گا۔ لیکن تمھاری ممی آج بہت اداس معلوم ہوتی ہیں۔ کیا بات ہے پورنیما۔

عورت ۔ جی نہیں تو، بالکل ٹھیک ہوں۔ بچوں نے دوپہر میں سونے نہیں دیا۔ اس سے ذرا تھکن ...... لائیے میں آپ کا کوٹ اُتروا دوں۔ اب اُترو نا پاپا کی گود سے۔ بڑی بُری عادت ہے تمھاری۔ پاپا تھکے ہیں اتنی دھوپ میں آئے ہیں اور تم ...... آؤ اترو آؤ .....

پہلا بچہ ۔ نئیں اُترتے۔

عورت ۔ بہت ضدی ہو گئے ہو۔ دوپہر کی ڈانٹ ابھی تمھیں بھولی نہیں ......

پہلا بچہ ۔ پاپا ممی نے آج پہل مجھے مارا تھا۔

دوسرا مرد ۔ کیوں بچوں کو ہر وقت مارتی رہتی ہو پورنیما۔ تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مارنے سے بچے ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔

عورت ۔ جی بہت شیطان ہو گیا ہے۔ ایسا ناک میں دم کرتا ہے کہ ..

دوسرا مرد ۔ بچے تو شیطان ہوتے ہی ہیں۔ بچو (پیار کی آواز) لو، اب اترو بیٹے اور جاؤ جا کر ریل گاڑی کھیلو، اور دیکھو تھوڑی دیر میں آ کر کپڑے بدلنا، اور چائے پینا ہمارے ساتھ ـــــ تم بھی جاؤ دینا بیٹی، اور آپ جناب پپّو صاحب، چاہیں تو آپ بھی تشریف لے جا سکتے ہیں لیکن لیکن سڑک پر مت جانا دوستو، ورنہ نہ سائیکل ملے گی، نہ موٹر ......

پہلا بچہ ۔ اول میلی بنڈوچ .....

دوسرا مرد ۔ تمھاری بندوق سب سے پہلے آئے گی۔ تم تو سب سے اچھے بیٹے ہو، فوراً کہا مان لیتے ہو۔

دوسرا بچہ ۔ اور میں؟

بچی ۔ اور پاپا میں؟

دوسرا مرد ۔ تم سب کے سب بہت اچھے بیٹے ہو، اچھا، اب جاؤ کھیلو، شاباش ....

(بچوں کی کلکاریاں دور ہو جاتی ہیں)

...... کوئی آیا تو نہیں تھا آج؟

عورت ۔ جی نہیں، جی ہاں ـــ وہ سکسینہ بابو کا چپراسی آیا تھا، کہنے لگا آپ دفتر میں نہیں ملے۔

دوسرا مرد ۔ ہاں، آج میں دفتر میں ذرا کم ہی بیٹھا ہوں ـــ کوئی خاص بات تھی؟

عورت ۔ بات تو نہیں بتائی اس نے۔ کہتا تھا ضروری کام ہے، آئیں تو کہہ دینا۔

دوسرا مرد ۔ ایسا بھی کیا ضروری کام ہوگا ـــــ خیر ہٹاؤ۔ دیکھا جائے گا۔ لیکن حضور کا آج چائے وائے پلانے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔

عورت ۔ آپ کپڑے بدلئے ۔ ابھی سب ہو جاتا ہے ۔

دوسرا مرد ۔ لیکن ذرا جلدی ہو جائے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مارے بھوک کے بُرا حال ہو رہا ہے ۔

عورت ۔ ابھی دو منٹ میں لیجئے ۔

دوسرا مرد ۔ اور سنو، ابھی مجھے سچ سچ بتاؤ ۔ تم اداس تو نہیں ہو،

عورت ۔ جی نہیں تو ۔۔ میں بھلا اُداس کیوں ہونے لگی ۔ میرے پاس کس چیز کی کمی ہے ؟

دوسرا مرد ۔ کیوں اُداس ہونے لگی اور کس چیز کی کمی ہے، یہ تو میں نہیں جانتا ۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ تم اُداس ہو ۔ اور اکثر اداس رہتی ہو ۔ میں نے تمھیں اکثر اداس گیت گاتے سنا ہے ۔

عورت ۔ یہ کیا بیکار کی باتیں لے بیٹھے ہیں آپ ۔

دوسرا مرد ۔ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں پورنیما ۔ اداسی کے لئے اقرار کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اُداسی خود بول اُٹھتی ہے ، اور میں تو پچھلے دس برس سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورت ۔ آپ بیٹھئے ، دس برس کا حساب لگائیے ۔ میں جا کر چائے بناتی ہوں ۔

دوسرا مرد ۔ جاؤ ، بناؤ چائے ۔

عورت ۔ اور آپ یہاں بیٹھ کے دس برس کا حساب لگائیں گے،

دوسرا مرد ۔ نہیں میں کپڑے بدلوں گا ۔

وقفہ

{گیت کے پُر درد بول بیک گراؤنڈ سے آہستہ آہستہ ابھرتے ہیں اور واضح اور قریب تر ہوتے جاتے ہیں ۔}

الھڑ من سپنے بُنتا ہے ، میں دھیان سہارے بیٹھی ہوں
آشاؤں کے دوراہے پر ، من دھیرج ہارے بیٹھی ہوں
الھڑ من سپنے بُنتا ہے ، میں دھیان سہارے بیٹھی ہوں

تم میرے جیون درپن میں !
چھایا سی بن کر آتے ہو !
میں ہار پروتی رہتی ہوں
تم دور کھڑے مسکاتے ہو
تم لہر سی بن چھپ جاتے ہو ، میں دور کنارے بیٹھی ہوں
میں دور کنارے بیٹھی ہوں !
میں دور کنارے بیٹھی ہوں

{گیت کے بول جس طرح آہستہ آہستہ بیک گراؤنڈ سے اُبھرے تھے اُسی طرح بیک گراؤنڈ میں چلے جاتے ہیں ۔ ڈوبتے ہوئے سنگیت پر ذیل کا پہلا جملہ سپر امپوز ہوتا ہے}

پہلا مرد ۔ دور ! کیا تم سچ مچ مجھ سے دُور ہو پورنیما ؟

عورت ۔ پورنیما ! یہ کس نے مجھے پورنیما کہا ۔ یہ کس نے مجھے اپنے میٹھے ، شہد بھرے بولوں میں پورنیما کہا ؟

پہلا مرد ۔ میں نے پورنیما !

عورت ۔ تم نے ! کیا سچ مچ تم نے مجھے پکارا ہے ۔ نہیں یہ تم نہیں ہو ۔ یہ میرا وہم ہے ، یہ میرا وہم ہے ۔

پہلا مرد ۔ نہیں پورنیما ، یہ تمھارا وہم نہیں ہے ۔ یہ میں ہی ہوں ، جسے تم دیکھنے پر بھی نہیں دیکھ پاتیں ، اور جسے نہ دیکھنے پر بھی تم ہر سمے دیکھتی رہتی ہو ۔ یہ میں ہی ہوں پورنیما ! جو کبھی تمھاری نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ۔

عورت ۔ تو یہ تم ہی ہو آنند ! تمھارے ہونٹوں پر میرا نام کتنا اچھا ، کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ مجھے ایک بار پھر اسی نام سے پکارو ، ایک بار پھر مجھے یقین دلاؤ کہ یہ تم ہی ہو ۔

پہلا مرد ۔ ہاں پورنیما ، یہ میں ہی ہوں ۔

عورت ۔ میرے کانوں میں جیسے کسی نے شہد گھول دیا ہے ۔ میرے انگ انگ میں خوشی کی لہریں ناچ اُٹھی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ، میں ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں ۔ کوئی سندر سپنا دیکھ رہی ہوں ۔

پہلا مرد ۔ شائد ، شائد یہ سپنا ہی ہے پورنیما ۔

عورت ۔ نہیں ایسا مت کہو ، ایسا مت کہو آنند ۔ میں تو مجسم تمھیں دیکھ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی گہری جھیلوں ایسی آنکھیں ۔ وہی ہر وقت پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہونٹ ، وہی ماتھا ، وہی ماتھے پر بکھرے ہوئے بال ۔ مجھے تمھارے یہ اُلجھے اُلجھے بال کتنے پسند ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(چھوٹے بچے کی کلکاریوں کی آواز قریب آتی ہے)

بچہ ۔ ممی ممی باہر ایک صاحب آئے ہیں ۔

عورت ۔ کون صاحب ہیں؟ کہہ دو پاپا گھر پر نہیں ہیں۔

بچہ ۔ پاپا تے نہیں، وہ تم تے ملنے آئے ہیں۔

عورت ۔ مجھ سے! مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ کون صاحب ہیں؟

بچہ ۔ نام نہیں بتایا ۔ تہنے لدسے تمالی ممی ہیں؟ میں نے تہا، ہیں،

پھل تہنے لدسے جاتے ممی تے کہو، ایک تعاب ملنے آئے ہیں۔

عورت ۔ جاؤ انھیں بیٹھک میں بٹھاؤ، کہنا میں آتی ہوں۔

بچہ ۔ بٹھا دیا ممی ۔ اول ممی انھوں نے مجھے دودی میں اٹھالیا،

اول پیال تیا، اول تہنے لدسے تمالا نام تیا ہے؟

عورت ۔ چلو میرے ساتھ۔

(وقفہ)

بچہ ۔ آ دئیں ہمالی ممی۔

وہی مرد ۔ نمستے۔

عورت ۔ تم؟

وہی مرد ۔ ہاں، میں۔

عورت ۔ کب آئے؟

وہی مرد ۔ ابھی! لکھنؤ جا رہا تھا، سوچا تم سے بھی ملتا چلوں،

پھر جانے کبھی آنا ہو، نہ ہو۔

عورت ۔ ارے تم ابھی تک کھڑے ہو، بیٹھو نا۔

وہی مرد ۔ اور تم بھی تو کھڑی ہو ــــ آؤ، بے بی ہمارے پاس آؤ۔

بچہ ۔ نئیں ہم نئیں آتے۔

عورت ۔ جاؤ نا بے بی۔

وہی مرد ۔ کتنا پیارا بچہ ہے ــــ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

آؤ نا بے بی ہمارے پاس ۔ ہم تمھیں چاکلیٹ لے دیں گے۔

بچہ ۔ نئیں ہم بندوق لیں گے۔

وہی مرد ۔ بندوق؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے بھئی؟

عورت ۔ بندوق!

وہی مرد ۔ ارے ــــ ہاں ہاں بندوق بھی لے دیں گے۔

بچہ ۔ اول چھوٹے لے موتل اور بینالتے لے مٹھل۔

وہی مرد ۔ ہاں ہاں سب کچھ لے دیں گے۔

عورت ۔ جاؤ بے بی، جاکے باہر کھیلو، بہت پریشان کرتے ہو تم۔

(لمحہ بھر کا وقفہ)

عورت ۔ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟

وہی مرد ۔ یونہی، ادھر ادھر۔

عورت ۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

وہی مرد ۔ (خاموش)

عورت ۔ دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔

وہی مرد ۔ اور اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو؟

عورت ۔ مجھ سے ۔ مجھے کیا ہوا ہے؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

وہی مرد ۔ ہاں تمھیں کچھ نہیں ہوا ۔ تمھارا چہرہ ہمیشہ سے اتنا ہی

زرد تھا، اور تمھاری آنکھوں کے گرد ایسے ہی حلقے پڑے رہتے تھے، اور

تمھارے بال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورت ۔ (خاموش)

وہی مرد ۔ نہیں پورنیما، تمھیں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے۔

عورت ۔ دھوکہ؟

وہی مرد ۔ ہاں دھوکہ! وہ دھوکہ اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا

جو دوسروں کو دیا جاتا ہے ۔ لیکن وہ دھوکہ جو آدمی اپنے آپ کو دیتا ہے...

عورت ۔ تم نے بتایا نہیں کہاں رہے اتنے دنوں، کیا کرتے رہے؟

وہی مرد ۔ میں بھی اپنے آپ کو دھوکہ دیتا رہا! کبھی اس شہر میں

کبھی اُس شہر، کبھی یہاں کبھی وہاں ــــ لیکن میری بات دوسری ہے ۔ میرا دکھ

صرف مجھ تک محدود ہے ۔ صرف میری ذات ہی اس کا شکار ہوتی ہے لیکن

تمھیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورت ۔ مجھے!

وہی مرد ۔ ہاں تمھیں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے۔

عورت ۔ کیا تم مجھے نصیحتیں کرنے آئے ہو؟

وہی مرد ۔ نہیں، صرف تمھیں دیکھنے آیا ہوں ۔ دیکھنے آیا ہوں

کہ تم کیسی ہو؟

عورت ۔ میں بہت اچھی ہوں ۔ بہت اچھی زندگی گذر رہی ہے میری۔

وہی مرد ۔ کاش ایسا ہی ہو ۔ لیکن میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں۔

عورت ۔ کیا دیکھ رہے ہو تم؟

وہی مرد ۔ دیکھ رہا ہوں کہ تم ابھی تک ماضی کو نہیں بھولیں ۔ دس برس گزر جانے پر بھی تذبذب اسی دو راہے پر کھڑی ہو جہاں کھڑے ہو کر ایک راستے کا خود تم نے ہی انتخاب کیا تھا ۔

عورت ۔ یہ سب کیا کہہ رہے ہو تم! کیا تم میرے زخموں پہ نمک چھڑکنے آئے ہو ۔

وہی مرد ۔ نہیں پورنیما ۔ میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آدمی کو وہ سب کچھ بھلا دینا چاہیئے جسے یاد کرنے سے زندگی کی گاڑی رکتی ہو، اپنے لئے نہیں تو اپنے بچوں کے لئے ...... اپنے شوہر کے لئے ...... ان لوگوں کے لئے جن کا اس کھیل میں کوئی قصور نہیں ۔

عورت ۔ کھیل ۔

وہی مرد ۔ ہاں، اب اسے ایک کھیل ہی سمجھو پورنیما ۔ ـــــ جو ختم ہو گیا ۔

عورت ۔ ختم ہو گیا! تو کیا ...... کیا تم ...... میں پوچھتی ہوں تم کس لئے آئے ہو یہاں ۔ کس نے تمھیں یہاں آنے کو کہا ۔

وہی مرد ۔ اب نہیں آؤں گا پورنیما ۔

عورت ۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) چلے جاؤ بھگوان کے لئے چلے جاؤ ۔

وہی مرد ۔ پورنیما ـــ!

عورت ۔ میں کہہ رہی ہوں ۔ یہاں سے چلے جاؤ ـــ سنا نہیں تم نے ـــ میں تم سے جانے کو کہہ رہی ہوں، جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ ۔

وہی مرد ۔ پورنیما!

{ سسکیاں ابھر کر آہستہ آہستہ دب جاتی ہیں لیکن سسکیوں کے ڈوبنے سے پہلے ہی بچوں کی کلکاریاں اور گیت کے بول ابھرتے ہیں }

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار   ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار   ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار   ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر

(گیت کے بول آہستہ آہستہ بیک گراؤنڈ میں چلے جاتے ہیں)

(فیڈ آوٹ)

افسر سیمابی احمد نگری

سوزِ غم

جس قدر اسرارِ غم سے آگہی ہوتی گئی — زندگی رمز آشنائے زندگی ہوتی گئی

آتشِ احساس کے شعلے ہوئے جتنے بلند — رہگزارِ زندگی میں روشنی ہوتی گئی

جس قدر آتا گیا عرفانِ ہستی کا خیال — خود بخود عرفانِ ہستی میں کمی ہوتی گئی

ہر شبِ تاریک ہے گہوارۂ صد آفتاب — تیرگی بڑھ کر ہلاکِ تیرگی ہوتی گئی

تھی جہاں میں جو کے دم سے میکدوں کی آبرو — خانقاہوں میں انھیں سے روشنی ہوتی گئی

متصل بڑھتا گیا تہذیب و دانش کا خمار — متصل تہذیب و دانش کی نفی ہوتی گئی

کھل گیا آخر دلِ شاعر پہ رازِ کائنات — رفتہ رفتہ شاعری پیغمبری ہوتی گئی

تھا جمالِ حسن بھی افسر شریکِ آرزو

ہر نفس پہ سوزِ غم سے چاندنی ہوتی گئی

نو بہار صابر

غزل

نئی نگاہِ کرم کچھ فسوں کرے تو کرے — یہی علاجِ دلِ بے سکوں کرے تو کرے

خرد وروں سے محبت میں اک قدم نہ اٹھا — یہ حوصلہ کوئی صاحب جنوں کرے تو کرے

طریقِ تیغ سے ممکن نہیں فروغِ حیات — یہ اہتمام مئے لالہ گوں کرے تو کرے

نگاہِ ساقیِ گیسو بدوش و جام بدست — غمِ حیات کا پرچم نگوں کرے تو کرے

فریبِ ترکِ تمنا ہے زہرِ قند آلود — بشر کو اور بھی زار و زبوں کرے تو کرے

چراغِ دیر و حرم سے تو روشنی نہ ہوئی — یہ معجزہ مرا سوزِ دروں کرے تو کرے

بیانِ حق ہے سخن گستری نہیں صابر

کوئی گلہ مری باتوں کا یوں کرے تو کیا کرے

کمال احمد صدیقی

بہار لے کے آئے ہیں

قبول ہو سلام ہند کی عظیم سرزمیں

بہار — کاشمیر کی بہار لے کے آئے ہیں!

ترے لئے ہمالہ کا وقار لے کے آئے ہیں

فضائے کوہسار و لالہ زار لے کے آئے ہیں

دھنک کے رنگ، پھول کا نکھار لے کے آئے ہیں

ترے لئے سرودِ آبشار لے کے آئے ہیں

جبینِ نو بہار کا ستارہ لے کے آئے ہیں!

ترے لبوں میں زندگی کا رنگ بھرنے کے لئے

تبسمِ نشاط و شالامار لے کے آئے ہیں

تھکی ہوئی حیات کو سکوں کی نیند جس میں آ گئے

نسیم سے وہ سایۂ چنار لے کے آئے ہیں

مہکتی وادیوں سے، زعفراں کی سرزمیں سے

گدازِ عشق اور دلوں کا پیار لے کے آئے ہیں

چناب، سندھ، جہلم اور توی نے جس کو چن لیا

ترے گلے میں ڈالنے وہ ہار لے کے آئے ہیں!

قبول ہو سلام ہند کی عظیم سرزمیں

بہار — کاشمیر کی بہار لے کے آئے ہیں!

خواجہ حمید الدین شاہد

شاہ سراج کا نظریۂ عشق

شاہ سراج اورنگ آبادی کو گزرے ہوئے تقریباً ڈھائی سو سال ہو چکے ہیں لیکن اُن کے کلام میں وہ سوز و گداز اور تڑپ، وہ جاذبیت اور کشش موجود ہے کہ جس نے اُن کی شاعری کو لافانی بنا دیا ہے۔

وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جو ڈیڑھ دو صدی تک علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ استادِ تغزل شاہ سراج اُردو شاعری کے دورِ متوسط کے ایک بہت بڑے شاعر تھے، اُن کی شاعری کا رنگ اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث دوسرے شاعروں سے بالکل الگ اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ سراج کی عمر ابھی بارہ برس ہی کی تھی کہ اُن پر جذب و مستی کا عالم طاری ہو گیا، اور یہ کیفیت سات سال تک رہی۔ اس حالت میں وہ جنگلوں میں مارے مارے پھرتے اور سر بصحرا نکل جاتے۔ اکثر شاہ برہان الدین غریبؒ کے مزار پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے، جب حالتِ جذب و مستی سے افاقہ ہوا تو اہل اللہ کی صحبت سے فیض یابی کا خیال پیدا ہوا، اور شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ایک عارفِ کامل اور باخدا انسان بن گئے۔

شاہ سراج کو بچپن ہی سے شعر و سخن کے ساتھ فطری لگاؤ تھا، ۲۴ برس کی عمر میں انھوں نے پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان مرتب کر لیا تھا، صنفِ غزل کو مقبول بنانے میں ولی کے بعد انھیں کا درجہ ہے۔ چنانچہ خود سراج بھی اپنے آپ کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے، اور اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

تجھ مثل اے سراج بعدِ ولی
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے قلمروئے سخن میں عشق کی فرماں روائی ہے حُسن کی کرشمہ سازی اور عشق کی کارفرمائی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اُن کی کوئی غزل ایسی نہیں جس میں حُسن و عشق کی باتیں نہ کی گئی ہوں، کیونکہ غزل کا موضوع حسن و عشق کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ ان کی نظر حُسن پرست اور طبیعت محبت پسند تھی۔ وہ اس نظریئے کے قائل تھے کہ حسن و عشق انسان کے فطری عناصر ہیں، اور عشق محض ہوا و ہوس پر موقوف نہیں، بلکہ یہ بلند سے بلند مقصد کے لئے ہوتا ہے۔ وہ صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور محبت ہی اُن کی زندگی تھی۔ چنانچہ بچپن اور جوانی کے زمانے ہی سے ان کو بعض دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ گہری دوستی ہو گئی تھی۔ عبدالرسول خاں اور ضیاء الدین پروانہ سے اُن کے دوستانہ تعلقات مہر و محبت تک بڑھ گئے تھے۔ انھیں ایک لالہ جی کے لڑکے سے بھی محبت ہو گئی تھی، جو خود سراج کو بھی دل و جان سے چاہتا تھا۔ سراج نے اپنی ایک مثنوی "بوستانِ خیال" میں اس داستانِ محبت کو بڑے دردانگیز پیرائے میں بیان کیا ہے۔

شاہ سراج اس بات پر ایقان رکھتے تھے کہ درسِ محبت دُنیا کے سارے علوم سے کہیں بہتر ہے۔ کہتے ہیں۔

ہرگز نہیں ہے اس کوں حقیقت کی چاشنی | جس نے مزہ چکھا نہیں عشقِ مجاز کا
اگر حقیقت کی سیر ہے خواہش | راہِ عشقِ مجاز لازم ہے

سراج کی عاشقانہ طبیعت نے اُن کے کلام میں درد و سوز اور جذب و مستی کے عناصر کو بہت اُبھارا تھا۔ اُن کی ہر غزل میں سوز و گداز کا پہلو غالب نظر آتا ہے، اور اُن کے کلام میں جا بجا عشق کی جھلکیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ان اشعار میں سراج کی شاعری کا یہ رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے ؎

عاشقوں کا لختِ دل برگِ گُلِ بے خار ہے | پھول پر مت پاؤں رکھ تجھ کو نزاکت کی قسم

اے صبا جلدی سیں اس گل کا مجھے پیغام دے　　پیک آہِ سینۂ عاشق کی سرعت کی قسم

مت پوچھ سوزِ عشق سیں فارغ سراج کرن　　پروانہ وار جان سیں بلہار تھا سو ہے

عشق کے متعلق ان کا خاص نقطۂ نظر تھا، وہ اپنے آپ کو عام عاشقوں سے اس طرح ممیز کرتے ہیں۔

اور عاشقوں مثال مجھے تم نہ بوجھیو!　　سب مبتلائے عام ہیں میں مبتلائے خاص

جذبۂ عشق اس حد تک اُن میں سرایت کر گیا تھا کہ وہ سراپا عینِ عشق تھے، اور سارا کائنات اُن پر منکشف ہونے لگے تھے ؎

روشن ہے سببِ عشق کے کیفیتِ عالم　　آئینۂ دل ساغرِ جمشید ہوا ہے

سراج مشربِ عشق کے سچے پیرو تھے۔ اُن کی نگاہ میں کفر و ایمان اور شیخ و برہمن کا امتیاز نہ تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہبی امتیازات کے ظاہری پردے جب اٹھ جاتے ہیں تو سب کی منزلِ مقصود ایک ہی دکھائی دیتی ہے، اس خیال کو وہ کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

مشربِ عشق میں ہے شیخ و برہمن یکساں　　رشتۂ سبحہ و زنّار... کوئی کیا جانے

کفر و ایماں دو ندی ہیں عشق کی!　　آخرش دونوں کا سنگم ہوئے گا

سراج دنیا کی ہر حسین چیز میں حسنِ ازل کا پرتو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سرسری نظر ڈال کر بے اعتنائی سے نہیں گزر جاتے۔ بلکہ اس سے محبت کرنے کو عشقِ حقیقی کی تربیت کا وسیلہ سمجھتے ہیں ؎

ہر طرف یار کا تماشا ہے　　اس کے دیدار کا تماشا ہے

ہے تجلی بخش جب سیں پرتوِ اسرارِ عشق　　تب سیں دل میرا ہوا ہے مطلعِ انوارِ عشق

بے خبر ہے محفلِ کونین سیں مثلِ سراج　　جو ہوا ہے بیخودی کے جام سیں سرشارِ عشق

بوالہوس کی طرح وہ دنیا کی محبت میں گرفتار نہیں رہتے بلکہ اس سے بہت آگے نکل جاتے ہیں ؎

بوالہوس کا کام نہیں ہے عشق کا دعویٰ سراج
عشق کی لذّت اسے ہے جس نے عالم کو تجا

سراج ظاہری حسن پر فریفتگی سے زیادہ دل کی تڑپ کے اثر کے تحت شعر کہتے تھے۔ ایک اہلِ دل اور صاحبِ نظر انسان کی طرح انھیں حسنِ ازل سے سچا عشق تھا جو ہمیشہ درد و سوز کی صورت میں اُن کے دل میں کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ دنیا والوں پر جب ان کی نظر پڑتی تو انھیں کوئی بھی اپنا دم ساز اور آشنا دکھائی نہ دیتا۔ جذبۂ عشق میں جب زیادہ شدت ہو جاتی تو وہ اپنی اضطراری کیفیت کو اس طرح ظاہر کر دیتے۔

قیامت کا طوفان سہتا تھا میں　　ولیکن کسی سے نہ کہتا تھا میں!
کہ عالم کے سب لوگ بے درد ہیں　　نہیں گرمیٔ عشق دل سرد ہیں!
جو کوئی آشنا ہو تو کہنا بھلا　　دگر نہ وہی درد سہنا بھلا!
سو عالم کوئی یار جانی نہیں　　کہیں دوستی کی نشانی نہیں!
بہت آزمایا ہوں تحقیق ہو　　اور اس بات پر مجھ کو تصدیق ہو!
محبت سے ہوتا ہے حاصل خدا　　یہ زنہار ملتا نہیں آشنا!

حسن کی جلوہ طرازیاں دراصل آتشِ عشق کو بھڑکانے کا باعث ہوتی ہیں۔ جہاں حسن نہ ہو وہاں عشق کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جس محفل میں شمع روشن نہ ہو بھلا وہاں پروانوں کا کیا گزر۔ عشق کی لذت تو وہی جانتا ہے جس نے کسی سے دل لگایا ہے، اور شرابِ محبت کا متوالا ہے۔ حسن میں ایک ایسی بے پناہ کشش اور دلبری ہوتی ہے کہ انسان تو انسان فرشتے بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کیفیت کو ذرا سراج کی زبان سے ہی سنیے ؎

جہاں حسن ہے آتش افروزِ عشق　　وہاں گرم جوشی میں ہے سوزِ عشق
جہاں حسن کا باغ سیراب ہے　　وہاں بلبلِ عشق بیتاب ہے
جہاں حسن کی شمع ہے نور بار　　وہاں عشق قرباں ہے پروانہ وار
جو کوئی دل کسی کو دیا ہوئے گا　　شرابِ محبت پیا ہوئے گا
وہی جانے اس حسن کی خوبیاں　　کہ کیا کیا ہیں اس بیچ محبوبیاں
جہاں صورتِ خوب ہوئی جلوہ گر　　فرشتہ بھی دیکھے تو ہوئے بے خبر
نہیں خوب صورت کا طالب سو کون　　جسے نہیں ہے یہ شوق غالب سو کون
غرض میں بھی صورت کا مشتاق تھا　　یہاں لگ کہ مشہورِ آفاق تھا

لیکن اس کے بعد ہی وہ متنبہ کرتے ہیں کہ عشق کی راہ میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کا مقابلہ آسان نہیں۔ ہر کس و ناکس مست مرد افگنِ عشق کا حریف نہیں بن سکتا۔ یہ تو ان کا ہی کام ہے جو اس کوچے میں اپنی زندگی برباد کرتے ہیں۔ رہِ عشق میں ما و شما کا گزر نہیں۔ اس مرحلے میں جان اور سر کی بازی لگانے والے ہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ رہ نوردانِ شوق کی آگاہی کے لئے سراج اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

ہر کسی کو ن گزرِ عشق میں آنا مشکل
راہ سیدھی ہے ولے راہ کو ن پانا مشکل

بلا ہے وہ خنجر تیز عشق — ہے نہر ستم جام لبریز عشق
ثمر عاشقی کا یہی ہے یہی — کہ دینا محبت میں دلبر کو جی
جو کوئی لذت زہر قاتل چکھے — وہ عشق میں آ قدم و دکھے
ہر اک بو الہوس کا یہاں کام نہیں — مئے عشق ہے شربتی جام نہیں
محبت کی منزل کی ہے سخت راہ — کہ واں دیکھ کر کانپتی ہے نگاہ
عشق میں اول فنا درکار ہے — دل میں ترک ما سوا درکار ہے
ترک مقصد عین مقصد ہوا ہے — جس کو دل کا مدعا درکار ہے

کاروبار شوق میں سود و زیاں کا خیال ہی نہیں آتا۔ دل و جان کی بازی لگا کر اپنا سرمایۂ حیات پیش کرنا پڑتا ہے ؎

سودائی بازار محبت جو ہوا ہے — زنہار خیال اسکو نہیں سود و زیاں کا
آئی ہے ترے عشق کی بازی دل و جاں پر — اس وقت نظر کب ہے مجھے سود و زیاں کی

سراج اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ جو عشق و محبت میں اپنی جان دینے سے پس و پیش کرتا ہے، اس کو ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور جو کشتگان عشق ہیں وہ تو زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔

شہید خنجر الفت ہوا نہیں — سلامت ہے سلامت ہے سلامت
نہ کرنا جی کوں قرباں تجھ قدم پر — ندامت ہے ندامت ہے ندامت

عقل و دانائی اور فہم و فراست پر تکیہ کرنے والوں کا محفل عشق میں کوئی مقام نہیں۔ انجان بن کر ہی یہاں سب کچھ پا سکتے ہیں، اور دیوانگی ہی میں عین ہوشیاری ہے۔ اس کوچے میں عقل والے بیگانے ہیں اور دیوانے ہی آشنائے منزل ہوتے ہیں ؎

دور کر دل سے نقش دانائی — عاشقی میں کہاں ہے مرزائی
کیا بلا کا ہے نشہ عشق کے پیمانے میں — کوئی ہشیار نہیں عقل کے کاشانے میں
خوش ہوں میں صحبت مجنوں سیتی لیں عقل کا نام — آشنائی کی کہاں باس ہے بیگانے میں

عشق کی آخری منزل وہ ہے جہاں نہ خدا باقی رہتا ہے اور نہ خودی۔ عاشق مقام حیرت پر پہنچ کر پکار اٹھتا ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی!
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

نظریۂ عشق کی حقیقت کو کما حقہٗ بیان کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے، کیوں کہ عشق غیر مرئی ہے، اور غیر مرئی چیزوں کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کے ذریعے سے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ خود سراج جنھوں نے نظریۂ عشق کے بارے میں اتنا کچھ کہا ہے، یہ کہنے پر مجبور رہتے۔

عشق کا نام گرچہ ہے مشہور! — میں تعجب میں ہوں کہ کیا شے ہے!

ڈال ڈال کے پات

بھگوتی چرن ورما ——————— علی جواد زیدی

آپ ہیں شری بھگوتی چرن ورما ہندی کے مشہور ناول نگار' فسانہ نویس اور شاعر۔ سر سے پاؤں تک کھدر پوش' ہلکے فالسئی رنگ کی عینک لگائے' بہت سا پان کھلائے ایک خاص انداز میں مسکراتے ہوئے ابھی ابھی تو کمرے میں داخل ہوئے ہیں اور جھک کر اس فرشی سلام سے آپ کا استقبال کیا ہے جو مخصوص دوستوں کے لئے ہی مخصوص ہو سکتا ہے۔

آپ کا مخصوص دوست بننے کے لئے کسی طویل مدت کی ضرورت نہیں ہے۔ کھردرے کھدر کے نیچے ایک بہت ہی نرم مخملی دل ہے۔ معلوم نہیں آپ کی کونسی ادا کس وقت بھگوتی بابو کو پسند آ جائے اور آپ ان کے مخصوص دوستوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں۔ اس میں اکثر انھیں دھوکا بھی ہو جاتا ہے لیکن وہ پچھتاتے کبھی نہیں۔ فریب اکثر کھاتے ہیں مگر کبھی کسی کو فریب دیا نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فریب دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

اچھا بھگوتی بابو۔ آپ خوب آ گئے کہئے اس اسکیم کے بارے میں کیا ہوا۔ "ارے میں کہتا ہوں" کہہ کر بھگوتی بابو نے یہ ظاہر کر دیا کہ اب اس اسکیم سے بہتر کوئی اسکیم ان کے ذہن میں آ گئی ہے۔ دن رات اسکیمیں بنانا ہی تو ان کا کام ہے۔ اور ہر اسکیم کو بڑی عالی حوصلگی سے بناتے ہیں۔ بہت بڑا دفتر' بڑا سا عملہ ملک کے مختلف گوشوں میں بہت سی شاخیں' لاکھ دو لاکھ کا سرمایہ جوائنٹ اسٹاک کمپنی وغیرہ وغیرہ۔ اگر آپ نے ہمت کر کے سرمایہ کی فراہمی کی مشکلیں بیان کرنا چاہیں تو "ارے میں کہتا ہوں" کہہ کر پھر آپ کو خاموش کر دینا چاہیں گے' بڑے بڑے سرمایہ داروں کے نام گنا دیں گے اور اس بھروسے کے ساتھ گنائیں گے گویا یہ لوگ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن پر دستخط بھی کر چکے ہیں پھر آپ اس اسکیم کا اپنے ہر "مخصوص" دوست سے تذکرہ شروع کر دیں گے۔ اور دوسرے ہر دن اس کے چرچے ریڈیو اسٹیشن پر' کافی ہوس میں' کونسل ہاؤس میں' "ساہتیہ سماج" میں ہر جگہ ہونے لگیں گے لیکن جو دن اس اسکیم کی شہرت کا ہوگا اس دن وہ کوئی دوسری اسکیم بنا چکے ہوں گے۔ اس سے بھی بہتر اور بلند تر۔

آپ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اور بھگوتی بابو کو یونیورسٹی کی ہندی انجمن نے شعر خوانی کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ میں اردو کا طالب علم تھا مگر ہندی ادب سے دلچسپی اس وقت بھی تھی۔ چنانچہ وہاں میں بھی پہنچا اور وہیں میں نے بھگوتی بابو سے وہ مشہور نظم سنی "ہم دیوانوں کی کیا ہستی" اس کے بعد ریڈیو کے ان مشاعروں میں جن میں ہندی اردو کے شاعر ایک ساتھ شریک ہوتے تھے۔ میری ملاقات بھگوتی بابو سے ہوتی رہی۔ لیکن بہت جلد مجھے سیاست اور جیل نے چھین لیا اور بھگوتی بابو کو فلم کمپنیاں پہلے ہی سے چھین لے گئی تھیں۔

فلمی دنیا میں آپ کی شہرت "چتر لیکھا" کی مقبولیت سے ہوئی اس زمانے میں بھگوتی بابو نے کلکتہ اور بمبئی کی فلم کمپنیوں سے بھی اس طرح نباہ کیا جیسے وہ بُرے سے بُرے ساتھی کو آج بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد آپ نے "وچار" نکالا۔ رسالہ بڑی آب و تاب سے نکلا۔ معیار بھی خاصا رہا۔ لیکن یکے بعد دیگرے ہر چیز کو "ورما جی" سنبھالے رہے اور وہ "نوجیون" کے ایڈیٹر ہو کر لکھنؤ آ گئے۔ بہت جلد انھوں نے اس روز روز کی صحافتی کچ کچ سے نجات حاصل کی اور کچھ دنوں خالص شاعرانہ زندگی بسر کی۔ یکایک وہ خاتمہ زمینداری پبلسٹی بورڈ کے سیکریٹری مقرر ہو گئے

اور کاؤنسل ہاؤس کے اُسی کمرے میں آپ کا بھی میز لگایا گیا، جہاں میرا میز
تھا۔ یہاں میں نے بھگوتی بابو کو کافی قریب سے دیکھا۔ لیکن انھیں دور سے
دیکھنے یا قریب سے اُن میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہاں بھی اُن کی اسکیمیں بنتی اور
بگڑتی رہیں۔ دو ایک کامیاب بھی ہوگئیں، مگر بھگوتی بابو کو ان کامیابی
پر خوش ہوتے دیکھا اور نہ کسی اسکیم کی ناکامیابی پر افسردہ اور ملول،
ان کا کام اسکیم بنا دینا تھا، کامیاب ہونا نہ ہونا اسکیم کا کام تھا۔ کامیابی
اور ناکامی کی ساری ذمہ داری اسکیم پر تھی۔ نہ کہ بھگوتی بابو پر۔

انھیں اسکیموں میں جو کامیاب ہوئیں "ساہتیہ سماج" کا قیام بھی تھا۔
بھگوتی بابو نے لکھنؤ کے اُردو، ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کو اکٹھا
کر دیا۔ اور اُن کی ایک ایسی جماعت بنا دی جس نے شہر کی ادبی زندگی
میں ایک چہل پہل پیدا کر دی۔ اس سلسلے میں بھگوتی بابو کی اسکیمیں جلدی سے
ختم نہیں ہوئیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اس کے لئے ایک مستقل عمارت،
ایک مستقل دفتر قائم کر دیتے اور یہ تو خیر وہ برابر سوچتے ہی رہتے ہیں کہ اس
جماعت کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جائے۔ کبھی تو اس کا ایڈیٹر
منیجر، کلرک تک طے ہوگیا۔ کبھی یہ بھی طے نہیں ہو پایا کہ رسالے کی طباعت
لکھنؤ میں ہوگی یا الہ آباد میں۔ رسالہ جب بھی نکلتا، مگر اس کا نام طے ہوگیا
تھا کہ "ساہتیہ" ہوگا، اور اس کا ایڈیٹوریل بورڈ بھی تقریباً طے ہی سا
تھا۔ پھر بھگوتی بابو کو اور مشاغل نے آگھیرا۔ تازہ تر اسکیموں کی طرف
ان کی توجہ مبذول ہوگئی۔ ساہتیہ سماج کی نشستیں مریض نیم جاں کی نبضوں
کی طرح رُکتے رُکتے تھم ہی گئیں، اور ماہنامہ "ساہتیہ" کا چھپا ہوا پیڈ نقشِ
نگارِ طاقِ نسیاں بن گیا، یا کبھی کسی کے پاس مدتوں رسم و رہ دوستی کے بقا کا
واسطہ بنا رہا۔ یہ "ساہتیہ" وجود میں ہی نہیں آیا، اور اس کی جگہ ماہنامہ "اُترا"
نے لے لی۔ "اُترا" بھی اب بند ہے اور ہم آج زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ بھگوتی بابو کسی مسئلے میں کوئی قطعی اور واضح
رائے نہیں رکھتے۔ بھگوتی بابو ہر مسئلہ پر خواہ وہ سائنس کا ہو یا ادب کا،
جغرافیہ کا ہو یا جوتش کا، سیاست کا ہو یا مذہب کا، ایک رائے ضرور
رکھتے ہیں، اور ان کی رائے میں کافی قطعیت ہوتی ہے جس وقت وہ داہنا
ہاتھ آہستگی سے بلند کر کے یہ کہیں کہ "ارے میں کہتا ہوں" تو سمجھ لیجئے کہ وہ اپنے

مخالف کو قائل کرنے پر تُل گئے ہیں۔ اُن کا جوش استدلال آسانی سے سرد
نہیں ہوتا۔ لیکن جب دلیلیں دیتے دیتے اور بحث کرتے کرتے دل و دماغ
کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جاتا ہے تو پھر وہ دوسروں کی رائے سننے کے لئے بھی
آمادہ نہیں ہوتے بلکہ مان لینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ وہ
گاندھی وادی ہیں۔ لیکن اُن میں گاندھی واد کی انقلابی روح ہے، وہ
اہنسا اور پریم کے قائل ہیں۔ مگر سرمایہ داری اور سامراج کے دشمن بھی
ہیں۔ ادب میں مواد کے اعتبار سے وہ ترقی پسند ہیں۔ لیکن ہیولیٰ کے
اعتبار سے اُن کا تعلق پرانے اسکول سے ہے۔ سماجی معاملات میں وضع کے
پابند ہیں۔ لیکن اُن کی اسکیمیں کسی وضع کی پابند نہیں ہیں۔ ان کے بارے
میں صرف اتنا ہی قطعیت سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاعر و ادیب ہیں۔
اس کے آگے وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں، صرف ارادہ شرط ہے۔

وہ اُن کانگریسیوں میں ہیں جو جیل جاتے جاتے رہ گئے۔ اس لئے نہیں
کہ وہ ڈر گئے یا اُنھوں نے معافی مانگ لی۔ بلکہ اس لئے کہ انھوں نے عملی
سیاست میں حصہ ہی نہیں لیا۔ گھریلو ذمہ داریاں جن سروں پر پہلے آپڑتی
ہیں اُن کا اکثر یہی حال ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے ناولوں اور افسانوں اور
نظموں کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی کو کامیاب بنانے
میں ان کا کچھ کم ہاتھ نہیں رہا ہے۔

کھدر برابر پہنتے رہے۔ لیکن اس سے بھی نمائش مقصود نہیں تھی۔ نمائش
کے لئے تو وہ کبھی کچھ کرتے ہی نہیں۔ اگر کبھی وہ بہت اچھے قسم کی ریشمی کھادی
یا قیمتی پشمینہ کا استعمال کر لیں تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کسی اسکیم کے ماتحت یا
نمائش کے لئے ہے۔ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ ورماجی کا دل بڑا
ہے، اور ان کی نگاہوں میں اچھی چیزوں کے مقابلے میں روپے پیسے کی کوئی
قیمت نہیں ہے۔

کچھ دنوں سے ریڈیو پر یا ریڈیو میں ہیں۔ پہلے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے
ہندی پروگراموں کے لئے مشیر مقرر کئے گئے تھے۔ ریڈیو کے لئے لکھتے تھے
اور اس میں شک نہیں کہ اُن کے آجانے سے ریڈیو کے پروگراموں میں
نئی جان آگئی تھی۔ لکھنؤ ریڈیو سے دہلی ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں
"ہلکی پھلکی موسیقی" سے بھی کچھ دنوں دل بہلایا۔ پھر ہندی کے مشیر ہوگئے اور
اور آج بھی ہیں۔ ریڈیو شاید بھگوتی بابو کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ

کیونکہ بھگوتی بابو کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر اور ہر صنف سخن میں لکھ سکتے ہیں، اور خوب لکھتے ہیں۔ انھیں خطابت، صحافت اور علمیت کو سمو لینے کا طریقہ خوب معلوم ہے بمعلوم نہیں وہ ریڈیو پر کب تک رہیں گے۔

وہ ہیں بڑے وضع کے پابند، اس لئے اکثر دوستوں کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ کسی دن وہ اپنے ہی مصرع کا یہ ٹکڑا پڑھتے کسی اور سمت نہ چل دیں۔

"کبھی یہاں رہے کبھی وہاں چلے"

ان میں ایک عجیب بات ہے، وہ کسی ایک جگہ بہت دیر تک نہیں رہتے لیکن جتنی دیر رہتے ہیں اسی طرح رہتے ہیں، گویا انھیں ہمیشہ وہیں رہنا ہے، کبھی یہ شکایت نہیں ہوتی کہ اس کام میں دل نہیں لگتا۔ اُن کا ہر کام اور ہر دوست میں دل لگتا ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

لیکن کام کرتے ہیں، اور کام پورے خضوع وخشوع سے کرتے ہیں۔ جیسے اُن کا ضمیر یکایک چونکتا ہے کہ "تم کیا اسی لئے بنے ہو؟ اور وسیع میدانوں کی طرف کیوں نہ چلو" اور پھر وہ کسی طرف چل پڑتے ہیں کبھی بے سوچے سمجھے اور کبھی سوچ سمجھ کر، خدا کی زمین تنگ نہیں اور اُن کے پاؤں لنگ نہیں،

کھانے اور پینے کے شوقین ہیں۔ پہننے کا بھی شوق ہے۔ مذاق سادہ مگر صاف ستھرا ہے۔ راستے میں گاندھی ٹوپی سر پہ ہوتی ہے لیکن جب کہیں بیٹھ جاتے ہیں تو ٹوپی اُتار دیتے ہیں۔ آج کل تو شیروانی، پائجامہ یا دھوتی کرتے میں نظر آتے ہیں لیکن سُنا ہے کہ کبھی انگریزی سُوٹ کا بھی شوق تھا اور غالباً ٹوپی اُتار دینے کی عادت اسی زمانے میں پڑی تھی۔ پُرانی اور خاص کر لکھنوی تہذیب کا ایک مجسمہ ہیں، جُھک کر ملنا، باتوں میں بڑے چھوٹے کا خیال رکھنا، کسرِ نفس سے کام لینا، خُرد کو پاس نہ آنے دینا، ان کی خصوصیتیں ہیں۔

یہ تو تھے بھگوتی بابو، لیکن اگر شری بھگوتی چرن ورما، شاعر کو دیکھنا ہو تو اُس وقت دیکھئے جب وہ دنیا و مافیہا سب کچھ بھول کر شعر سُناتے ہیں۔ جذبات میں سموئی ہوئی آواز سامعین کو مسحور کر لیتی ہے، اور پڑھنے کا جوش وخروش سارے مجمع میں ایک برقی لہر سی دوڑا دیتا ہے۔ تعریف ہوتی ہے۔ تو وہ داہنی طرف کو اپنا سر جھکا کر، اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر ایک سنجیدہ سا آداب عرض کرتے ہیں، کچھ ایسی بے نیازی کے ساتھ جیسے یہ کہنا چاہتے ہوں کہ آپ کا فرض ہے تعریف کرنا، اور میرا فرض ہے آداب کرنا۔

ورما جی کو مخالفت میں بھی بڑا مزا ملتا ہے، انھیں تو کسی حزبِ مخالف کا لیڈر ہونا چاہیئے تھا، مگر وہ سیاست داں کم اور ادیب زیادہ ہیں۔ اس لئے زیادہ تر ادبی مباحثے اٹھاتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۹۳۶ء میں وجود میں آئی، ورما جی اس کے پہلے کے ترقی پسند ادیب ہیں۔ اس لئے اُن کی ترقی پسندی پُرانی روش کے شاعروں اور کمیونسٹ روش کے شاعروں دونوں ہی کی ترقی پسندی سے ٹکراتی ہے اور ورما جی کو مخالفتوں کے لئے ایک وسیع میدان مل جاتا ہے۔

بعض وقت تو وہ اپنی بات کو چونکا دینے والے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہیں گے کہ میں تو "ادب برائے ادب" کا قائل ہوں لیکن وہ کبھی نہیں کہیں گے کہ "ادب برائے زندگی" نہ ہو۔ چونکا دینا بھی اُن کی ایک اسکیم ہے بحث کو دلچسپ بنانے کے لئے۔ آپ چونکیں گے اور بحث کریں گے۔ خوب گرما گرم بحث ہوگی۔ آوازیں بلند ہو جائیں گی۔ ماہرین کی آرا کا اقتباس پیش ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ خاتمہ اس پر ہو کہ آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ بھگوتی بابو صرف بحث کے لئے اتنے خلوص سے بحث کر رہے تھے۔ ایسے موقعوں کے لئے میرا ایک مشورہ سنئے، بھگوتی بابو کو ایسی بحث میں ہرانے کے لئے آپ اُن سے کسی نظم کی فرمائش کر دیجئے۔ یقین کیجئے کہ وہ جو نظم آپ کو سنائیں گے اُس میں "ادب برائے زندگی" کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ (دنیا کھدا)

گُل کدہ

رابندر ناتھ ٹیگور —— مترجم۔ شانتی رنجن بھٹاچارجی

رُباعیات

فرض شناس

کون میرا کام سنبھالے گا۔" ڈھلتے ہوئے آفتاب نے سوال کیا
سبھی تصویر کی طرح خاموش ہوگئے
ایک مٹی کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے نے جواب دیا —" ناتھ!"
"مجھ سے جتنا بھی ہو سکے گا میں ضرور کروں گا۔"

• بھید بھاؤ

آم کے درخت نے ماکال[1] درخت سے کہا
ایک دن ہم سب جنگل میں بھائی تھے
لیکن۔ انسان اپنے ساتھ ذائقہ لے آیا
مساوات ختم ہوگئی اور بھید بھاؤ کا آغاز ہوا۔

رشتہ داری

بھیک کی تھیلی روپوں کی تھیلی سے مخاطب ہوئی
" کیا تم آپس کی رشتے داری کو بھول گئے؟"
روپوں کی تھیلی نے جواب دیا۔ " ارے تم بھی رشتہ داری بھول
جاتے، تو مجھ میں ہے اگر وہ تم میں منتقل ہو جائے۔"

نکتہ چین

ٹیکی[2] سر پر چڑھ کر جھوم کر بولی
" ہاتھ پاؤں ہر کام میں غلطیاں کرتے رہتے ہیں"
ہاتھ پاؤں نے ہنس کر جواب دیا۔ " اے نکتو بال! ہم چونکہ کام
کرتے ہیں اس لئے تو غلطیاں بھی کرتے ہیں۔"

ایک شعر

چاند سے

چاند نے کہا۔ میں نے اپنی چاندنی سے جہاں کو روشن کر دیا
جو سیاہ دھبے ہیں وہ صرف میرے رُخ پر رہ گئے

---

[1] ماکال درخت:۔ ایک جنگلی پھل کا درخت جس کا پھل دیکھنے میں آم کی طرح حسین ہوتا ہے۔

[2] پنڈت سر کے بالوں کا صفایا کرانے کے بعد بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ جو پیچھے کی طرف رکھتے ہیں اُسے بنگالی میں ٹیکی کہتے ہیں۔

برق بہاری

میری کتاب

تو اے کتاب مجھ کو نہایت عزیز ہے
تو نے مجھے سکھائی ہے جو کچھ تمیز ہے

قسمت نے جب تجھے میرے ہاتھوں پہ دھر دیا
اک نور تھا کہ جس سے میرا سینہ بھر دیا

سچ سچ بتا دے کونسی بستی سے آئی ہے
کیا اتنا علم علم کے دریا سے لائی ہے

مَیں بھی جوان ہو کے اگر کچھ کماؤں گا
کمخواب کا غلاف مَیں تیرا بناؤں گا

مخمل کی سبز جلد پہ سونا چڑھاؤں گا
طاؤس کے پروں سے تجھے مَیں سجاؤں گا

منظور مجھ کو اپنے کھلونوں کا توڑنا
پر جیتے جی نہ ساتھ کبھی تیرا چھوڑنا

تجھ سے ہی میرے ذہن کی کھیتی ہری ہوئی
جزدان میں ہے عقل مجسّم بھری ہوئی

وہ جن کو کھیل کود سے دن رات کام ہے
بد قسمتی سے بھول گیا تیرا نام ہے

وہ گمرہی کے بحر میں غوطے لگائے گا
لیکن کبھی نہ علم کے موتی کو پائے گا

میں تیرا ہوں تو میری ہے سیدھا حساب ہے
مَیں طالبِ کتاب تو میری کتاب ہے

اُستاد کا یہ قول مجھے خوب یاد ہے
نفرت جسے کتاب سے وہ نامراد ہے

نور الہدیٰ

لالچی راجہ

بھارت کے اُتری اور جنگلی علاقے میں ایک راجہ رہتا
تھا۔ وہ بہت لالچی تھا — لالچ کے سبب رعایا اس سے
خوش نہیں تھی — ایک بار راجہ اپنے کچھ درباریوں کے
ساتھ ایک گھنے جنگل میں شکار کھیلنے گیا — شکار کھیلتے
کھیلتے راجہ ایک بڑے اور گھنے جنگل میں پہنچ گیا — جہاں سورج کی
روشنی بھی مشکل سے پہنچتی تھی — اسی طرح راجہ دن بھر شکار کی تلاش
میں بھٹکتا رہا — مگر کوئی شکار نہیں ملا — سورج غروب ہو رہا تھا
ہر سمت سکوت طاری تھا۔ کہ یکایک جھاڑی کے سرکنے کی آواز نے
راجہ کو چونکا دیا — ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک خوبصورت
ہرن اس کے سامنے سے بھاگتا ہوا نکل گیا۔ راجہ نے فوراً گھوڑا اس
کے پیچھے ڈال دیا۔ وہ پیچھا کرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ مگر اندھیرا
ہونے کے سبب وہ ہرن کا تعاقب نہیں کر سکا اور ہرن آن کی آن
میں نظر سے غائب ہو گیا — راجہ نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور گھوڑے کی
رفتار سست پڑ گئی۔

راجہ بہت تھک گیا تھا۔ پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔
پانی کی تلاش میں راجہ گھوڑے کو ایک درخت کے ساتھ باندھ کر
آگے نکل گیا۔ چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ ابھی کچھ دور گیا
تھا۔ کہ اُسے روشنی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے روشنی کی طرف بڑھنے
لگا۔ اب وہ روشنی کے بالکل قریب تھا۔ یہ روشنی ایک خوبصورت
محل سے آ رہی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ محل کے باہر
کوئی نہیں تھا۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ اصل میں یہ دیو کا محل
تھا۔ جو دن میں باہر رہتا اور بارہ بجے رات محل میں واپس آتا۔
راجہ باہر کسی کو نہ پا کر محل میں داخل ہو گیا — اسے یہ دیکھ کر
سخت تعجب ہوا کہ اتنے بڑے محل میں صرف ایک لڑکی بیٹھی تھی — لڑکی
راجہ کو دیکھتے ہی غمگین ہو گئی۔ اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "دیکھو
یہ دیوؤں کا محل ہے۔ میرا باپ اس محل کا مالک ہے۔ وہ بہت ظالم
اور خوفناک ہے۔ تم اس کو دیکھنے کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ اپنی جان
کی خیریت چاہتے ہو تو فوراً محل سے بھاگ جاؤ۔ اس کے آنے میں
صرف تین گھنٹے باقی رہ گئے ہیں" —

راجہ یہ سنتے ہی خوف سے کانپنے لگا۔ اور لرزتی ہوئی آواز
میں بولا "میں ایک راجہ ہوں۔ شکار کھیلتے کھیلتے ادھر آ
آیا ہوں۔ بھوک اور پیاس سے پریشان ہوں۔ کھانا نہیں تو کم
کم پانی ہی پلا دو۔ میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا" —

لڑکی راجہ کو ایک کمرے میں لے گئی جو کھانے کی چیزوں سے
بھرا تھا۔ لڑکی نے راجہ سے کہا "جتنا کھانا ہو کھا لو اور جتنا
کمرے میں پانی ہے فوراً پی کر یہاں سے بھاگ جاؤ" —

راجہ کھانے میں لگ گیا ۔ لڑکی گھڑی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "ہمارے باپ کے لوٹنے میں صرف ڈھائی گھنٹے باقی ہیں۔ جلدی جلدی کھاؤ" ۔

راجہ جلدی جلدی جو کچھ کھا سکا ۔ کھا کر تیسرے کمرے میں پانی پینے چلا گیا ۔ جب پانی پی کر واپس ہوا تو اسے باقی دو کمروں کے دیکھنے کی خواہش ہوئی ۔ جیسے ہی اس نے پہلے کمرے میں قدم رکھا ۔ دم بخود رہ گیا ۔ کیونکہ کمرہ بے شمار ہیروں اور جواہرات سے بھرا ہوا تھا ۔ راجہ پہلے ہی سے لالچی تھا ۔ ہیرے اور جواہرات کو دیکھتے ہی اس کا لالچ اور بھی بڑھ گیا ۔ خوش ہو کر اس نے ہیرے جواہرات سے جیبیں بھر لیں ۔ جب وہ جیبیں بھر چکا تو اُسے دوسرے کمرے میں جانے کی خواہش ہوئی ۔ وہاں لعلوں کا انبار لگا ہوا تھا ۔ اسے دیکھتے ہی اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا ۔ اور پگڑی کھول کر اس میں کافی لعل باندھ لئے ۔ ادھر لڑکی انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی ۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ دن بھر کا بھوکا ہے کھانا کھاتا ہوگا ۔ اسی اثناء میں گھڑی نے بارہ بجا دئے ۔ لڑکی بارہ کا گھنٹہ سنتے ہی پریشان ہوگئی ۔ اور اُداس ہو کر بولی ۔ "اب تو تمھاری جان کی خیریت نہیں ہے ۔ اب تم کو ہمارا باپ مار ڈالے گا" ۔

ابھی لڑکی کہہ ہی رہی تھی کہ دیو پہنچ گیا ۔ راجہ دیو کو دیکھتے ہی خوف سے لرزنے لگا ۔ اور دیو راجہ کو دیکھتے ہی مسرت سے اُچھلنے لگا ۔ اور خوشی سے چلّا کر بولا "اخاہ ! گھر بیٹھے شکار پہنچ گیا ۔ خوب خوب اب جشن خوشی سے منایا جائے گا" ۔

اور اس نے ایک دیو کو حکم دیا کہ اس شکار کو تیسرے کمرے میں بند کر دو ۔ اور اچھا کھانا کھلاؤ ۔ دیو نے حکم کی تعمیل کی ۔ راجہ بہت زیادہ فکر مند تھا ۔ کہ لعل ہیرے اور جواہرات کی خاطر میری جان جائے گی ۔ موت کی گھڑی گنتے گنتے اس نے نو روز گزار دئے ۔ نویں روز دیو اس کو دیکھنے آیا ۔ اور مسکراتے ہوئے بولا ۔ "کل خوب رہے گا جشن، خوب مزیدار شکار ہے" ۔

"تو کل راجہ کو جان سے مار دیا جائے گا ۔ لڑکی نے اپنے باپ سے پوچھا" ۔

"ہاں اور کل اسی خوشی میں شاندار جشن بھی منایا جائے گا" ۔ دیو نے جواب دیا ۔

لڑکی یہ سُن کر چُپ ہوگئی ۔ جب دیو چلا گیا تو لڑکی تیسرے کمرے میں داخل ہوئی ۔ راجہ اُسے دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگا ۔ مجھے جلد یہاں سے نکال دو نہیں تو کل تمھارا باپ مجھے جان سے مار دے گا ۔ مجھ پر خدا کے لئے رحم کرو ۔ میں زندگی بھر تمھارا احسان مند رہوں گا ۔

لڑکی یہ سنتے ہی بولی "تم لالچی ہو، تم نے لالچ کے سبب اپنی جان گنوائی ہے ۔ اگر تم لعل ہیرے اور جواہرات کے لالچ میں نہ اُلجھتے تو آج اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے ۔ راجہ یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا اور ندامت سے گردن جھکاتے ہوئے بولا "اب میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی لالچ نہیں کروں گا ۔ اپنے لعل ہیرے اور جواہرات سب لے لو ۔ اور مجھے نکال دو ۔ میں اب لالچ ہرگز نہیں کروں گا ۔ جلدی کرو" ۔

لڑکی کو راجہ پر رحم آ گیا ۔ اس نے زنجیر کھول کر تیسرے کمرے سے نکال دیا اور حکم دیا کہ جہاں سے جو چیز لی تھی وہیں لے جا کر رکھ دو ۔ راجہ جلدی جلدی ہیرے جواہرات اور لعل رکھ کر محل سے بھاگ گیا ۔

اس کے بعد اس نے کبھی لالچ نہیں کیا ۔

سلام مچھلی شہری

نسرین کی ڈائری

۲۵ر جولائی (بوقت شام)

یہ کتابیں اور اک ننھی سی پیٹھ   ہانپتا جاتا ہے بے چارہ گدھا
آج کے اخبار کی تصویر میں   اک سوال اچھا مرے ہاتھ آگیا
یہ جو روز آتے ہیں اپنے ماسٹر   اور دیتے ہیں ترقّی کی دُعا
ان کو یہ تصویر دکھلاتے ہوئے   کل ادب کے ساتھ ہے یہ پوچھنا
"— پیار ہے دنیا میں یا برپا جنوں   کیا بتاتا ہے یہ دلکش کارٹون
کب تلک رٹوائیں گے "درسی کتاب"   کب رُخِ ہستی سے اُلٹیں گے نقاب؟

۲۷ر جولائی (بوقت شب)

نیلے ساگر میں ہے یہ چاندی کی ناؤ   کھے رہی ہے گاؤں کی بُڑھیا جیسے
سوچتی ہوں "بوڑھی ماں" سے یہ کہوں   اپنی کشتی میں گھما لاؤ مجھے
لیکن "امّی" کہتی ہیں یہ چاند ہے   تیرے آگے چاند لیکن ماند ہے!
ہوگا — کل میں بھی بنا کر ایک ناؤ   چھوڑ کر ندّی میں دیکھوں گی بہاؤ

۲۸ر جولائی (بوقت صبح)

اتنا کام اور ایک مَیں، اب کیا کروں   آج مَیں اسکول جا سکتی نہیں

اور اگر اسکول جانا ہی پڑا
تب میں یہ شادی رچا سکتی نہیں
اور شادی ٹل سکے ممکن نہیں
ظلم یہ "گڈّی" پہ ڈھا سکتی نہیں

بس ابھی آنے لگیں گے میہماں
اور دُلھن کو میں سجا پائی نہیں
عطر کی شیشی نہ جانے کیا ہوئی
ہائے مہندی بھی رچا پائی نہیں
بند کر رکھا ہے "امّی" نے ستار
گیت ئیں رخصت کا گا پائی نہیں

دے نہ دے "بجمہ" کہیں پھر مجھ کو مات
لے کے آتی ہوگی "گُڈّے" کی برات
پھُولے جلتے ہیں مرے تو ہاتھ پاؤں
اتنے سارے کام، میری ایک ذات
اے مری گُڈّو! چلو سچ لو ذرا
جانتی ہوں، کونسی ہے دل میں بات!

جانے کیوں برہم سا دل کا ساز ہے
کس کی یہ غصّہ بھری آواز ہے
— یہ مسلنے پر تُلے ہیں پھُول کو
"ڈیڈی" کہتے ہیں، چلو اسکول کو!!

۳۰ر جولائی (بوقت سہ پہر)

"— جون آف آرک" کی تصویر ہے یہ
اور چمکتی ہوئی شمشیر ہے یہ
اور یہ جھانسی کی مہارانی ہیں
دیس کے پریم میں دیوانی ہیں
"تاج بی بی" کی ہے تصویر یہاں
رضیہ بیگم ہیں یہ، یہ ہیں نور جہاں
اور یہ "نائیڈو" ہیں "بلبلِ ہند"
نکہتِ نسترن و سنبلِ ہند
— ہے چھپائے ہوئے لاکھوں مہتاب
میری تاریخ کی چھوٹی سی کتاب
ان ہی مہتابوں کے صدقے ہیں ذرا
روشنی — روشنی، اے مرے خدا
اپنی "نسرین" کی دعائیں سُن لے
خدمتِ ملک کی خاطر چُن لے

اے - آر - سعید

سونے کا برتن

بچو! تم نے یہ تو ضرور سُنا ہوگا کہ قوس و قزح کے آخری سرے پر ایک سونے کا برتن پوشیدہ ہے۔ مگر کیا تم جانتے ہو کہ وہ سونے کا برتن کسی کو مل چکا ہے یا نہیں؟ یہ آج سے برس ہا برس پہلے کا واقعہ ہے۔

ایک مرتبہ ایک خود غرض اور لالچی شخص چاندنی رات میں ایک چراگاہ سے تنہا گزر رہا تھا۔ اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ شخص مُنہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ اس نے سنبھل کر دیکھا کہ جس چیز سے وہ ٹکرایا تھا۔ وہ ایک سونے کا برتن تھا جس میں سونے کے سکّے بھرے ہوئے تھے۔ یہ وہی سونے کا برتن تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ قوس و قزح کے آخری سرے پر پوشیدہ ہے۔ بوڑھے خود غرض شخص کو یہ یاد تھا کہ اس روز دوپہر کو بارش ہونے کے بعد قوس و قزح کا سرا اس چراگاہ میں آ کر ختم ہوا تھا۔

اس سونے کے برتن کو پا کر اس خود غرض اور کنجوس شخص کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اور اس نے اس قیمتی شے کو ایسی جگہ چھپانا چاہا۔ جہاں سے کوئی دوسرا اس کو حاصل نہ کر سکے۔ اس لئے اس نے اس برتن کو جلدی سے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے تھیلے میں رکھ لیا اور تیزی سے جنگل کی طرف چلا۔ تاکہ اس کو ایسی جگہ چھپا دے جس کو اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ جان سکے۔

لیکن بدقسمتی سے اس تھیلے میں ایک بڑا سوراخ تھا۔ اس لئے اس بوڑھے خود غرض شخص کو پتہ بھی نہ چلا اور اس سوراخ کے ذریعے سے سونے کے سکّے ایک ایک کر کے راستے میں گرتے رہے۔ جب اس کو اس نقصان کا پتہ چلا تو اس کے افسوس کی حد نہ رہی اور وہ تیزی سے اپنے سکّے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے واپس ہوا۔ سکّے تلاش کرنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے تعجب کی حد نہ رہی کہ جب اس نے دیکھا کہ گرے ہوئے سونے کے سکّے زرد پھولوں میں تبدیل ہو گئے ہیں! آخر یہ کیسے ہوا؟ کیا تم کوئی جواب دے سکتے ہو؟

اس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خود غرض اور لالچی لوگوں کو ہر چمکنے والی چیز سونا ہی معلوم ہوتی ہے۔ پھولوں سے ہر ایک شخص کو محبّت ہوتی ہے۔ اور ان سے ہر ایک کا دل خوش ہوتا ہے لیکن خود غرض اور لالچی انسانوں کو کہیں اور کسی جگہ بھی خوشی حاصل نہیں ہوتی...... اور درحقیقت اس برتن میں زرد رنگ کے پھول ہی تھے۔ جو کہ سونے کے سکّے معلوم ہو رہے تھے۔ اور اس خود غرض لالچی اور کنجوس شخص نے ان کو سونے کے سکّے سمجھا۔ اور جب اس نے ان کو ہاتھ لگایا تو اس کو پتہ چلا کہ وہ زرد رنگ کے پھول ہیں

بچو! خود غرض، لالچی اور کنجوس آدمی دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ نہ تو وہ خوش رہ سکتا ہے اور نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ اس لئے تم ایسے نہ بننا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی زندگی دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہے۔ ان کو کسی چیز سے بھی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ ہم کو اپنے فائدہ اور ترقّی کے ساتھ دوسرے لوگوں کے فائدے اور ترقّی کا دھیان رکھنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف اپنی بلکہ ملک و قوم کی بھی بھلائی ہے۔

شوکت جمالی

چاکلیٹ کی کہانی

پیارے بچو! یوں تو تم بہت سی کہانیاں سُن چکے ہو مگر آج میں تمھیں ایک نئی اور انوکھی کہانی سنانے جا رہا ہوں۔

تم روزانہ ٹافیاں اور چاکلیٹ کھاتے ہو۔ سُنہرے اور نیلے اور سُرخ رنگ کے کاغذوں میں لپٹا ہوا چاکلیٹ جسے تم بازار سے خرید کر لاتے ہو تمھیں بہت اچھا لگتا ہے نا؟ ارے یہ کیا تمھارے منہ میں تو پانی آگیا — چھی چھی۔ اچھے لڑکوں کی یہ عادت نہیں۔ ذرا سا کسی چیز کا تذکرہ ہوا اور مُنہ میں پانی آنے لگا۔

ہاں تو میں چاکلیٹ کی کہانی سُنا رہا تھا۔ تم یوں تو روزانہ چاکلیٹ اور ٹافیاں کھاتے ہو مگر تم نے آج تک ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ کس چیز سے تیار ہوتے ہیں؟ ان کا موجد کون ہے؟ بھلا تمھیں اس سے کیا مطلب۔ تمھیں تو صرف کھانے کی فکر ہے۔ چولھے میں جائے اس کا موجد۔

مگر سنو اچھے بچے ہمیشہ ہر چیز کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر چیز کو پرکھتے ہیں اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔ ان کا علم بڑھتا ہے سوچ و فکر کا مادہ بڑھتا ہے پرکھنے کی صلاحیت بڑھتی ہے اور پھر وہی ایک دن دُنیا میں نام روشن کرتے ہیں۔

آؤ آج تم میرے سامنے یہ عزم کرو کہ تم ہر چیز کو پرکھنے کی کوشش کرو گے۔ اور ساتھ ساتھ چیزوں کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو گے تاکہ تمھاری صلاحیت بڑھے اور تم ہر شعبے میں ترقی کرو۔

ہاں تو میں تمھیں چاکلیٹ کی کہانی سُنانے جا رہا ہوں — تم جانتے ہو اس کا موجد کون تھا؟ نہیں — سُنو میں بتاتا ہوں — اس چاکلیٹ کا موجد یعنی ایجاد کرنے والا کولمبس تھا۔ ہاں ہاں وہی کولمبس جس نے امریکہ کا پتہ لگایا تھا — واقعی تمھیں تعجب تو ضرور ہوگا کہ کولمبس نے چاکلیٹ ایجاد کیا؟ ہاں یہ سچ ہے کولمبس ہی نے چاکلیٹ ایجاد کیا ہے —

چاکلیٹ کوکو سے بنتا ہے — اور کوکو کے درخت امریکہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

کولمبس جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ امریکہ پہنچا تو وہاں کے لوگوں سے اس کی جان پہچان بڑھی — اور اس ملاقات سے کولمبس کو کوکو کا بھی علم ہوا۔ جب کولمبس اور اس کے ساتھیوں نے کوکو کا پھل استعمال کیا تو ان لوگوں کو اس کا ذائقہ بہت اچھا لگا۔ جب کولمبس امریکہ سے لوٹا تو بہت سارا کوکو کا پھل اپنے ساتھ لیتا آیا۔

اب تک یورپ والوں نے چاکلیٹ کا نام تک نہیں سُنا تھا۔ اسپین میں بھی کولمبس کی ہی وجہ سے چاکلیٹ بننے لگا۔ اور پھر اس کی ترقی اتنی ہوئی کہ سارے یورپ میں یہ پھیل گیا۔

انگلینڈ میں چاکلیٹ کی ایجاد ۱۶۵۷ء میں ہوئی شروع شروع میں جب چاکلیٹ ایجاد ہوا تو لوگوں میں اسے مفت تقسیم کیا گیا۔ اور جب سبھوں کو اس کا ذائقہ اچھا معلوم ہوا تو لوگ اسے خرید خرید کر کھانے لگے۔

اب سنو اس کی بناوٹ:- کوکو کا پھل بالکل حرتے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ درخت میں رہتا ہے تو ٹہنی سے اس کا چھلکا الگ کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ سُوکھ جاتا ہے اور پھر بوروں میں بھر کر کوکو کا سوکھا پھل کارخانوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور پھر ان پھلوں کو کارخانے کے بڑے بڑے ٹرے میں رکھ کر بجلی کی آنچ سے سینک دیتے ہیں۔ اور پھر مشین کی چکی سے اُسے پیس ڈالتے ہیں۔ اور پھر دوبارہ اسے باریکی سے پیس لیتے ہیں۔ اور چینی اور دودھ ملا کر اسے گاڑھا کر لیتے ہیں۔

اور اسی گاڑھی لئی کو قسم قسم کے سانچوں میں ڈال کر جما دینے پر چاکلیٹ تیار ہو جاتا ہے۔ اور پھر سنہرے اور روپہلے کاغذوں میں لپیٹ دینے سے تو یہ اور بھی خوبصورت اور دل پسند ہو جاتا ہے۔ پھر جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ کارخانوں سے نکل کر ٹافیوں اور چاکلیٹ کے بکس بازار میں چلے آتے ہیں۔ اور پھر ان چاکلیٹ کا قیام چھوٹی چھوٹی دکانوں میں ہوتا ہے جہاں سے تم انھیں خرید کر پاکٹ میں بھر لیتے ہو اور پھر ایک ایک کر کے پاکٹ سے نکالتے ہو اور مُنہ کے حوالے کر دیتے ہو ــــ

یہی تمھارے ٹافیوں اور چاکلیٹ کی کہانی ہے۔

(مرکزی خیال انگریزی سے)

یاد رکھنے کی باتیں

(۱) ہمیشہ رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی اُٹھنا تندرستی کی علامت ہے۔
(۲) جسم اور لباس کو ہمیشہ پاک اور صاف رکھو۔
(۳) جو بات اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔
(۴) علم ہی وہ خزانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا۔
(۵) ہر آدمی کو ہمیشہ پاک اور بے باک رہنا چاہئے۔
(۶) علم بڑی دولت ہے اس کا حاصل کرنا ہر عورت و مرد پر فرض ہے
(۷) جھوٹ بولنا بدبختی کی نشانی ہے۔
(۸) جاہل کی دوستی اور بُرے آدمی کی صحبت سے بچو۔
(۹) اگر آپ اپنی عزّت چاہتے ہیں تو دوسروں کی عزّت کریں۔
(۱۰) ہمیشہ وعدہ کر کے اسے پُورا کرو۔ ورنہ کسی سے وعدہ ہی نہ کرو۔
(۱۱) ہمیشہ سچ بولو کیونکہ یہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔
(۱۲) کھانا ہمیشہ وقت پر کھاؤ۔
(۱۳) فقیر یا سائل کو دھتکارنا بہت بُرا ہے۔
(۱۴) جاہل آدمی کا جواب ہمیشہ خاموشی سے دو۔
(۱۵) چھوٹوں سے اچھا سلوک کرو اور بڑوں کا ادب کرو۔
(۱۶) جینے کے لئے کھاؤ لیکن کھانے کے لئے نہ جیو۔
(۱۷) کھانا کھاتے وقت باتیں نہ کرو۔
(۱۸) تربوز کھا کر پانی نہ پیو۔
(۱۹) غصّہ کمزوری کی نشانی ہے زیادہ غصّہ صحت کو خراب کرتا ہے۔

سفر کی آخری منزل

بٹی کے تیس کو ٹینکر جہاز سے ساحل کے
انسٹالیشن تک اور وہاں سے تیس کی
بوتلوں تک اور پھر بوتلوں سے
ملک کے دُور دراز مقامات کے
لمپوں تک پہنچنے میں ایک بہت لمبا
سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ برَما شل کے
۱۵,۵۰۰ ملازمین اپنی نگرانی میں
تیل کو فیکٹریوں، کھیتوں، شہروں اور دیہاتوں
تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور
ان حالات میں یہ دیکھنا ہمارا فرض ہوجاتا ہے
کہ صحیح قسم کا تیل، صحیح مقامات پر
صحیح وقت پہ پہنچے اور اس بڑے کام
کو سرانجام دینے کے لئے ہمیں بہت
کارکنوں اور (جیسا کہ ہمارے امریکی بھائی کہتے ہیں)
"نو ہاؤ" یعنی بہت کچھ جان کاری سے
کام لینا پڑتا ہے۔

برَما شل ...
ہندوستان کی زندگی
کا ایک حصّہ ہے

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُرازمعلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہوگیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بےچینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار لوگوں کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اسی تپاک سے اس کا خیرمقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے نامی اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ
چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں ۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے ۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔"

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں ۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں ۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے ۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں ۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی ۔"

ممتاز حسین

" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے ۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو ۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو [illegible] اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے ۔"

اشفاق حسین

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے ۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے ۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے ۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے ۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے ۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں ۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے ۔"

اختر اورینوی

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

بجنتری کو ہمارا سلام!

مدھیہ پردیش کے ایک دور دراز گاؤں "بجنتری" کے متعلق
کسی کو کیا علم ہوگا؟ کون اس کی پرواہ کرتا ہے! لیکن ہم جانتے
ہیں۔ کیوں کہ سارے ہندوستان میں برماشل کے ماتحت

۱۵،۰۰۰ سے زیادہ ملازمین
ملک بھر میں تیل تقسیم کرنے والے مخصوص مقامات پر
۸۰۰ سے زائد ڈپو
۴ برانچ آفس
۲۴ علاقہ وار آفس
۴۵۳ ڈلیوری لاریاں ہیں

"بجنتری" اور اس جیسے ہزاروں دیہاتوں کی خبر رکھنے
اور ان تمام کو مٹی کے تیل کی باقاعدہ سپلائی کا انتظام
کرنے میں ہم مدد کرتے ہیں

برماشل ... ہندوستان کی زندگی کا ایک حصہ ہے

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ —— نمبر ۵

سالانہ چندہ: —— ہندوستان میں:- چھ رُپے
پاکستان میں:- چھ رُپے (پاک)

غیر ممالک سے —— دس شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: —— ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

دسمبر ۱۹۵۵ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق :- بے خود دہلوی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی
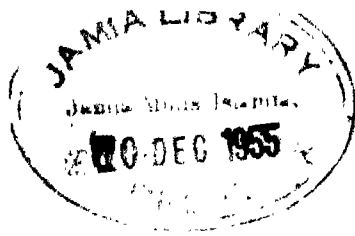
جوش ملسیانی

بے خود دہلوی

میرے خواجہ تاش

سید وحید الدین احمد بے خود دہلوی کی وفات اُردو کی تمام دنیائے ادب کے لئے غم واندوہ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ مرحوم نے ۹۶ سال کی عمر پائی اور کم وبیش ۷۰ سال اردو ادب کی خدمت کی۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد اگرچہ دہلی کا گلزارِ ادب بہت کچھ خزاں دیدہ ہوگیا تھا مگر پھر بھی اس کی افسردہ شاخوں پر چند شگفتہ و شاداب پھول کہیں کہیں اپنی بہار دکھاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دیکھنے والے ان چند پھولوں کے رنگ و بو کو بھی مشامِ ادب کا سرمایۂ راحت سمجھتے اور اُن کی بقا کو غنیمت جانتے تھے۔ ان میں سید ظہیر، مولانا حالی، حکیم اسد علی خاں مضطر جو مومن مرحوم کے رشتہ داروں میں سے تھے، نواب سائل جو حضرت داغ کے داماد بھی تھے، آغا شاعر، کنور بدری کرشن فروغ، لالہ سری رام مؤلف خم خانۂ جاوید، کیفی دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر، خواجہ ناصر نذیر فراق، شمس العلماء مولوی نذیر احمد اور بے خود دہلوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں مگر افسوس کہ یکے بعد دیگرے یہ شگفتہ اور تاب دار پھول بھی شاخوں سے جھڑتے چلے گئے۔ لے دے کر ایک بے خود دہلوی اور کیفی دہلوی ہی رہ گئے تھے شعر وادب کا قدر شناس پکار پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ ؎

تجھے واسطہ خدا کا اب انھیں نہ توڑ گل چیں
یہی پھول اب ہیں باقی مری شاخِ آشیاں سے

مگر کون سنتا ہے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ان میں بھی ایک شاداب پھول پژمردہ و افسردہ ہو کر پیوندِ خاک ہوگیا۔ اب اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو وہ جناب کیفی کا دم ہے[1] مگر ہچکیوں پہ ہی دم ہے۔ موصوف کی صحت بھی اب بہت خراب رہتی ہے۔ دہلی کی جذباتی شاعری، اس کی ٹکسالی زبان، اس کی ادبی شان اور اس کی فنی عظمت کا جنازہ بھی بے خود صاحب کے جنازے کے ساتھ اٹھ گیا۔ اس کی شاعرانہ فضیلت اور اس کے فنی جاہ وجلال کا صحیح طور پر یہی ایک نمائندہ تھا۔ اب رنگِ قدیم کی شاعری کو نبھانے والا جدید یت کے ساتھ نباہنے والا یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔ بقول مولانا حالی ؎

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا　　شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

مرحوم شاعرانہ حقائق اور فنی دقائق یعنی شاعرانہ ضروریات سے کماحقہ آگاہ تھے نیز ادب اور فن دونوں کے لحاظ سے مستند حیثیت کے مالک تھے۔ ان کا قول، ان کا کلام طالبانِ فن کے لئے سند تھا۔ بہت ٹھوس اور مضبوط شعر کہتے تھے۔ میرے اس دعوے کا ثبوت مرحوم کے دونوں دیوانوں دُرِ شاہوار اور گفتارِ بے خود کے پڑھنے پر ملتا ہے۔ خود حضرتِ داغ ان کی خوش بیانی اور پختہ گوئی کے مداح تھے۔ چنانچہ جب اُن سے یہ پوچھا گیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا تو انھوں نے فرمایا "بے خودین" یعنی بے خود بدایونی اور بے خود دہلوی۔ اگرچہ حضرتِ داغ کا رنگِ سخن اور اسلوبِ بیان اپنی طبیعت میں پورے طور پر جذب کر لینے کے لئے بے خود بدایونی کا پایۂ اعتبار بہت بلند ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک شعر سن لیجے۔ فرماتے ہیں ؎

کہہ بھی چک جو کچھ کہنا ہے واعظ　　سوچتا ہے نامہ بر تمہید کیا

اس بڑھی ہوئی قوتِ جاذبہ کی بنا پر حضرتِ داغ کا ارشاد بلاشبہ قابلِ تسلیم ہے مگر دوسری شاعرانہ خوبیوں کو بھی زیرِ نظر رکھا جائے تو بے خود دہلوی کی شاعرانہ عظمت کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی استادانہ شان بعض سنگلاخ زمینوں میں جنھیں پانی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ تمام اہلِ نظر سے خراجِ تحسین طلب کر رہی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کسی مظلوم کے محشر میں شاید کام آ جائیں　　اٹھا دیجے مجھے میرے دلِ ناشاد کے آگے
نکلا دل ستم گر نے نہ منصوبات بھی پوری　　کئے ہیں تیرے ہونٹوں پہ پوری فریاد کے [illegible]
گزر جاتے ہیں دو دو دن ہمیں بے آب و دانے کے　　قفس میں کون کھائے بیٹھ کر صیاد کے [illegible]

ایسی ہی ایک اور زمین کے تین چار شعر ملاحظہ ہوں

---

[1] افسوس کیفی صاحب بھی یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو رحلت فرما گئے۔

قاتل نے اُٹھانے نہ دیا سر تہِ خنجر   رکھا مجھے احساں سے دبا کر تہِ خنجر
وہ سینہ پہ ہیں اور مرا سر تہِ خنجر   کس لطف سے چھپکا ہے مقدر تہِ خنجر
منہ پھیر لیا تم نے دبا کر تہِ خنجر   کیوں کر نہ تڑپ بیتا دلِ مضطر تہِ خنجر
ابرو پہ شکن اور بھی غصّہ میں پڑی ہے   اب صاف نظر آتا ہے خنجر تہِ خنجر

مرحوم کی ذاتِ ستودہ صفات سے میرا ذاتی تعارف بیس بائیس سال سے تھا میں نے اس مدّت میں ان کے عادات و خصائل، ان کے حسنِ اخلاق اور اُن کے اوصافِ حمیدہ کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ بھی اپنا عزیز بھائی سمجھ کر بہت خلوص و محبّت سے پیش آتے رہے۔ آہ - اب یہ پُر لطف بل کہ پُر کیف صحبتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں۔ میرا یہ معمول تھا کہ جب بھی دِلّی آنے کا اتفاق ہوتا تھا ان سے ملے بغیر واپس نہیں جاتا تھا۔ وہ خود بھی میرے اس معمول کا اعتراف فرماتے تھے۔ پہلی ملاقات کا شرف غالباً ۱۹۳۳ء میں حاصل ہوا۔ نواب سائل کی تحریک پر ریڈیو سٹیشن دہلی نے حضرت داغ کے نام پر ایک مشاعرہ نشر کیا تھا۔ اس میں داغ مرحوم ہی کے شاگرد شامل کئے گئے تھے۔ مثلاً بے خود دہلوی۔ آغا شاعر نواب سائل، احسن مارہروی، سیماب اکبرآبادی، فدا گلاؤٹھی، راقم وغیرہ۔ ویر مارہروی شامل نہیں ہو سکے تھے البتہ غزل بھیج دی تھی جو احسنؔ نے پڑھ کر سنائی۔ اس تقریب میں حضرت بے خود دہلوی نے وہ مشہور غزل نشر کی۔ جس میں اکثر جگہ معنی آفرینی اور نزاکتِ خیال کی اُستادانہ مثالیں موجود ہیں اور جس کے دو تین شعر یہ ہیں ؎

ختم تھا نغمہ بھی مجھ پر نالہ و فریاد بھی   باغباں بھی یاد کرتا ہے مجھے صیّاد بھی
تمنّا مٹ گئی ارمان ان کا مٹ گیا   مرثیہ بھی ہم نے لکھا ہے مبارک باد بھی
ان حسینوں کو نئی چالیں سکھاتا ہے فلک   دونوں دشمن ہیں مرے شاگرد بھی استاد بھی

چوں کہ اس مضمون میں زیادہ تر ذاتی تاثرات ہی میرا مقصودِ بیان ہیں۔ اس لئے ان ملاقاتوں اور ان ادبی صحبتوں کی روداد کچھ تفصیل سے گزارش کروں گا۔ بے خود صاحب نواب سائل کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ "شروعات" کی بحث میں بھی دونوں کا فیصلہ مختلف تھا۔ نوّاب صاحب اس لفظ کو مفرد صورت میں بطور فصیح سمجھتے تھے اور بے خود صاحب ان کے قول کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اپنے قول کی تائید میں نوّاب صاحب نے جو شعر لکھا اسے بھی لغو سمجھتے تھے یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ سائل کو شعر کہنا نہیں آتا۔ انتہا یہ ہے کہ نوّاب صاحب کے فرزندِ عزیز احسن فصیح کو بھی تاکید کر دی تھی کہ اپنے والد سے اصلاح نہ لیا کرو۔ وہ شعر کہنا نہیں جانتے۔ نوّاب صاحب یہ باتیں سن کر ہنستے تھے۔ مگر دریا دلی دیکھئے کہ عزیزی فصیح کو بے خود صاحب ہی سے اصلاح لینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ بے خود صاحب کا معمول تھا کہ شام کو جامع مسجد کے نواحی حصّوں میں سیر کیا کرتے تھے۔ کبھی نوّاب صاحب بھی پھرتے پھراتے وہاں آنکلتے تو کوئی نہ کوئی ادبی بحث چھڑ جاتی اور بعض دفعہ تُو تُو مَیں مَیں تک نوبت پہنچ جاتی۔ میں نے دہلی کے مشاعروں میں کبھی یہ نہیں دیکھا کہ دونوں حضرات کسی مشاعرے میں شامل ہوئے ہوں۔ البتہ شملہ کے ایک مشاعرے میں ہر دو حضرات کو شاملِ مشاعرہ پایا اور ملک غلام محمد صاحب[1] صدر بزمِ اُردو شملہ کی کوشش بار ور دیکھی۔ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کے ساتھ دونوں حضرات کے مراسمِ دوستی بہت خوش گوار اور مخلصانہ تھے۔ مگر ساحر صاحب کے مشہور جوبلی مشاعرہ میں بھی جہاں نوّاب صاحب ہر ایک نشست میں شامل ہوتے رہے وہاں بے خود صاحب کسی ایک نشست میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ صرف تصویر کھنچوانے کی تقریب میں دیکھے گئے۔ بے خود صاحب کو یہ شکایت بھی تھی کہ حضرت داغ کے مکان کی چابی تو میری تحویل میں رہی اور سائل صاحب نے اُن کا جانشین اوروں کو بنا دیا۔ یہ اشارہ غالباً نوح ناروی، جگر بسوانی اور بے باک شاہ جہان پوری کی طرف ہے۔ جن کو نوّاب صاحب نے جانشینیٔ داغ کی سندات عطا کی تھیں۔ مگر اس کشیدگی کے باوجود میں نے دونوں بزرگوں کو ہمیشہ صاف دلی کا بہترین نمونہ دیکھا۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حضرت داغ کی یاد میں جو یادگاری مشاعرہ دہلی کے ٹاؤن ہال میں ہُوا۔ اس وقت نوّاب سائل راہیِ عدم ہو چکے تھے۔ بے خود صاحب نے بر سرِ مشاعرہ یہ اعلان کیا کہ سائل صاحب کی وفات پر میں نے شعر کہنا اب چھوڑ دیا ہے۔

اپنے اُستاد کا کتنا احترام ان کے دل میں تھا۔ اس کے ثبوت میں یہ لطیفہ سنئے جو میں نے انھیں کی زبان سے سنا۔ حیدرآباد میں جلیل مانک پوری کا ایک نومشق شاگرد تھا۔ وہ وہاں سے معاشی سلسلے میں دہلی آنے پر مجبور ہُوا تو اس نے عرض کی کہ میں دہلی جا کر ڈاک کے ذریعے سے اصلاح حاصل کرتے رہنے کا آرزومند ہوں۔ ناگوارِ خاطر نہ ہو تو اجازت دیجئے۔ جلیل صاحب اس شاگرد کی طبیعت کو ترقی کُن نہیں سمجھتے تھے اس لئے پیچھا چھڑانے کے مقصد سے یہ کہہ دیا کہ وہاں بے خود دہلوی ہیں ان سے اصلاح لے لیا کرو۔ اصلاح نزدیک تر زیادہ مفید ہوتی ہے۔ اس نے عرض کی کہ میں ان کا متعارف نہیں ہوں۔ براہِ مہربانی ایک تعارفی خط بطور سفارش عنایت کر دیجئے۔ جلیل صاحب نے سفارش نامہ لکھ دیا اور وہ دہلی

[1] موصوف حال ہی میں پاکستان کے گورنر جنرل تھے

آکر وہ چار دن کے بعد ان کے پاس پہنچ گئے۔ جلیل صاحب کی سفارش کو یہ رد نہ کرسکے اور اسے اجازت دے دی۔ چند غزلوں کی اصلاح سے انھیں بھی اس کی پست مذاقی کا یقین ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ یہ جوہر قابل نہیں ہے اس لئے محنت بے سُود ہے۔ بے رُخی ہی اچھی رہے گی۔ عدم التفات کو دیکھ کر اس نے جلیل صاحب کے نام خط میں لکھ دیا کہ بے خود صاحب توجہ نہیں کرتے۔ جلیل صاحب نے اس کے جواب میں لکھا کہ اگر وہ توجہ نہیں کرتے تو ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ بے خود وہ شخص ہے جس نے داغ کے نام کو روشن کیا۔ یہ خط لے کر جب وہ صاحب ان کے پاس آئے تو جلیل صاحب کے آخری الفاظ پڑھ کر انھیں غصہ آگیا۔ کہنے لگے بے خود کون ہوتا ہے داغ کے نام کو روشن کرنے والا۔ ارے داغ تو وہ ہستی ہے جو کسی کے سر پر جوتا لگا دے تو اُسے بے خود اور جلیل بنا دے۔

آخری فقرہ اگرچہ ان کی تیز طبیعت کا ثبوت ہے۔ مگر استاد کے متعلق جو احترامی جذبہ اس سے ظاہر ہوتا ہے اس نے مجھ پر خاص اثر کیا اور دل ہی دل میں اس قابلِ تقلید جذبے کی داد بھی دی۔

ایک دفعہ گوالیار کے کسی مشاعرے کا حال سنانے لگے وہاں کا مصرعِ طرح "اُدھر دیکھا، جگر دیکھا" کی زمین میں تھا۔ اور دیکھ کر دیکھا۔ یہ قافیہ التزامی تھا۔ ہر شاعر کو پابند کیا گیا کہ دیکھ کر کا قافیہ ضرور باندھا جائے۔ مشاعرے میں ان کی نشست صدر کے قریب ہی تھی۔ بعض شعراء نے اس قافیہ کے لئے عجیب و غریب مصرعے پڑھے مثلاً ادھر بھی دیکھ کر دیکھا اُدھر بھی دیکھ کر دیکھا یا۔ یہاں بھی دیکھ کر دیکھا وہاں بھی دیکھ کر دیکھا۔ ایک صاحب نے جو مقامی شخصیت بھی رکھتے تھے یہ مصرع پڑھا

اسے بھی دیکھ کر دیکھا اُسے بھی دیکھ کر دیکھا

اوروں کو تو ایسے سرد پا مصرعوں کی داد کیا ملتی مگر مقامی شخصیت کی وجہ سے مؤخر الذکر شاعر کو خوب داد دی گئی۔ صدر بھی اس داد میں شامل ہوئے مگر بے خود صاحب خاموش رہے۔ اس پر صدر نے ان سے کہا کہ آپ نے اس شعر کی داد نہیں دی۔ اس پر بیخود صاحب کچھ چوکنے ہوئے۔ بے ساختہ کہنے لگے کہ مغربی ممالک میں یہ دستور ہے لڑکے اور لڑکی کی نسبت کے لئے دونوں کا ڈاکٹری ملاحظہ ہوتا ہے اس امتحان میں وہ کامیاب ہو جائیں تو رشتہ پکا کر دیا جاتا ہے۔ اسے بھی دیکھ کر دیکھا اسے بھی دیکھ کر دیکھا۔ ان الفاظ کا مفہوم اگر یہی ہے تو شعر واقعی اچھا ہے اور میں داد دیتا ہوں۔ یہ سن کر صدر بھی لاجواب ہوگئے۔ قریب کے جن آدمیوں نے یہ جواب سُنا تو وہ بھی اس بات کے منتظر ہوئے کہ دیکھیں یہ شخص اس قافیے کو کس طرح باندھتا ہے۔ جب ان کی باری آئی تو انھوں نے دو چار شعر پڑھ کر اس قافیے کا یہ شعر بھی پڑھا ؎

ترے دیدار سے بڑھ کر نہیں کوئی خوشی ہم کو
ہلالِ عید بھی ہم نے ترا منہ دیکھ کر دیکھا

یہ شعر سن کر صدر اور وہ اصحاب جو منتظر بیٹھے تھے، سر دُھننے لگے۔ بزمِ مشاعرہ زیر و زبر ہوگئی اور سب نے مان لیا یہ شخص فی الواقع استادانہ شان کا مالک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بے خود صاحب نے اس شعر میں قافیہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ ردیف کے ساتھ جو ربط اس قافیے کو ہے اس سے بہتر صورت اور کیا ہوسکتی ہے۔ دوسرا مصرع فی الواقع سحرِ حلال ہے۔

اس قسم کے اور کئی ادبی لطیفے ہیں جو میں نے دہلی، شملہ، لائل پور کے متعدد مشاعروں میں ان کی زبانِ مبارک سے سُنے۔ سب کا ذکر باعثِ طوالت ہوگا۔ مشاعروں میں بڑی گرج دار آواز سے پڑھتے تھے اور یہ گرج آخیر عمر تک قائم رہی۔ اپریل ۱۹۵۵ء کے اس یادگاری مشاعرے میں جو "فسانہ ہیں ہم لوگ" کے عنوان سے ریڈیو اسٹیشن دہلی نے منعقد کیا اور جس میں صرف عمر رسیدہ شعراء ہی شامل کئے گئے۔ ان کی آواز میں وہی گرج تھی۔ اس وقت ان کا نقصِ سماعت انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ کسی کی آواز نہیں سُن سکتے تھے۔ مگر استاد بھائیوں کے ساتھ خلوص کا یہ عالم تھا کہ میری اور حضرت نوح ناروی کی غزلیں نشر ہو چکنے کے بعد پڑھنے کے لئے طلب کر لیں اور ملاحظہ فرما کر واپس کیں۔ مجھ سے تو یہ بھی کہا کہ بھائی اگرچہ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا مگر میں داد دیتا رہا ہوں اور آپ غزل پڑھ چکے کے بعد کر داد دیتا ہوں۔ جب سماعت کی قوت بحال تھی تو اچھے شعر کی داد دینے میں وہ بہت فراخ دل تھے۔ قیامِ جمہوریت کی تقریب میں جلسہ لال قلعہ میں جو مشاعرہ جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوا وہاں میں نے جمہوریت پر ایک قطعہ تاریخ پڑھا تھا۔ مصرع تاریخ میں نے ایک دن پہلے انھیں دکھایا تو فرمانے لگے۔ اس سے بہتر تاریخ نہیں ہوسکتی۔ وہ مصرعِ تاریخ یہ تھا۔

اہلِ وطن کا طوقِ غلامی اُتر گیا (۱۹۵۰ء)

شطرنج اور گھوڑوں کا بہت شوق رکھتے تھے۔ اگرچہ شطرنج خود نہیں کھیلتے تھے مگر ان کے صاحب زادے محی الدین سید گھر میں کسی سے کھیلتے ہوں تو پاس بیٹھ کر ہر ایک چال کی جانچ کرتے اور اچھی چال کی داد دیتے تھے۔ عمر بھر شہ سواری کرتے رہے۔ اصیل گھوڑوں کی پہچان میں بھی یکتا تھے۔ بعض دفعہ گھوڑوں کا طویل ذکر سن کر میں اور حضرت نوح ناروی دونوں برگشتہ خاطر ہو جاتے تھے۔ مگر پاسِ ادب سے خاموش رہتے تھے۔ بڑے متقی اور صوم و صلوٰۃ کے پابند

بیماری میں بھی اوراد و وظائف سے غافل نہ رہتے تھے۔ عمر کے آخری دس بارہ سال تنگی اور مصیبت میں گزرے۔ آئے دن کے عوارض نے جسم کو پورے طور پر مضمحل کر دیا۔ مرلی دھر شاد کی وفات کے بعد فکرِ معاش بھی دامن گیر رہی، اگرچہ سر شنکر لال کسی نہ کسی حد تک اس سلسلے میں مدد کرتے رہے۔ مگر ان کی وفات پر یہ تنگ حالی سوہانِ روح ہو گئی۔ آخر مرکزی حکومت نے گزارہ کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا، اور یہ سرکاری عطیّہ کسی قدر سہارے کا موجب رہا۔

مرلی دھر شاد کا نام بہ سبیلِ تذکرہ آیا ہے تو اُن کے متعلق یہ اظہارِ حقیقت بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں شاد صاحب بہت ہی سعادت مند اور بہت ہی خدمت گزار تھے۔ ان کا دوسرا دیوان "گفتارِ بیخود" انھیں نے مصارفِ عظیم گوارا کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ جب تک زندہ رہے معقول زرِ نقد ماہانہ ان کی خدمت میں بہ غرضِ معاش پیش کرتے رہے۔ لائل پور دہلی کاٹن ملز کے مشاعروں میں جو ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے، انھیں شامل کرنے کے لئے ہر سال انھیں خود دہلی آکے لے جاتے تھے، اور وہاں بھی معقول رقم بطور نذرانہ دیتے تھے۔ شاد صاحب کا پڑھنے کا انداز بہت معمولی تھا۔ ایک نشست میں غزل کامیاب نہ ہوئی تو بھری محفل میں کہہ دیا کہ کیسی اچھی غزل تھی، پڑھنے میں ستیاناس کر دیا اور غزل لاکر مجھے دو، میں خود پڑھ دوں گا۔ اس میں شک نہیں کہ بیخود صاحب وہی غزل خود پڑھتے تو بہت کامیاب اور سرسبز ہوتی۔ ان کی آواز تمام مشاعرے پر چھا جاتی اور لاؤڈ سپیکر کے بغیر بھی دور تک صاف سُنائی دیتی تھی۔

کلام

بیخود صاحب اپنے ہی قول کے مطابق بالعموم مومن کا رنگ پسند کرتے تھے۔ ایک دن یہ بھی ان کی زبان سے سنا کہ میں مومن کے رنگ میں کہتا ہوں، کچھ گر کر کہوں تو داغ کے رنگ میں کہتا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات انھوں نے محض مزاح کے طور پر نادانستہ کہہ دی۔ گو ان کی غزل میں مومن کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی استاد کا رنگ ہر غزل میں غالب نظر آتا ہے۔ استاد کی عظمت کا ذکر بھی انھوں نے بیشتر اشعار میں کیا ہے اور مومن کا ذکرِ خیر یا نام کسی جگہ بھی نظر نہیں آتا۔ مفصلہ ذیل مثالوں سے اہلِ ذوق خود اندازہ فرما سکیں گے کہ یہ اندازِ بیان حضرتِ داغ ہی کا، مومن کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں ؎

مرا دل چھین لینے کے لئے تیار کیسی ہے
نگاہِ یار مستی میں بھی ہشیار کیسی ہے

کرم میں بدگمانی آپ کو سرکار کیسی ہے
دلِ بیمار کی پرسش یہ سو سو بار کیسی ہے

بہت سی قسم کے دل ہیں بہت سی دل کی قسمیں ہیں
نہیں معلوم کیا تم کو یہ شے درکار کیسی ہے

نہیں اک بات ہے لیکن نہیں اک بات ہے اس میں
تجھے ہر بات پر آساں مجھے دشوار کیسی ہے

سبکے سب پیدا ہوئے ایذا رسانی کے لئے
آسماں بھی غیر بھی تم بھی تمھاری یاد بھی

اس سخن فہمی کے صدقے ان اداؤں کے نثار
گالیاں بھی شعر پر ملتی ہیں مجھ کو داد بھی

حضرتِ عشق لہو جسم میں باقی نہ رہا
میں کھلاتا شبِ غم اپنا کلیجا تم کو

دیکھ کر ایک تجلّی نہ رہے ہوش بجا
جاؤ بس دیکھ لیا حضرتِ موسیٰ تم کو

مسیح و خضر کی عمریں کہاں سے لاؤں میں
کہ جھوٹے وعدے کا کرنا ہے انتظار مجھے

تم سے کھلنے نہیں دیتا دلِ بدظن میرا
میرے پہلو میں چھپا بیٹھا ہے دشمن میرا

حسن ہے ناز ہے شوخی ہے ادا ہے تو ہے
مجھ کو اتنوں میں بتا کون ہے دشمن میرا

ان تمام اشعار میں استاد کے اندازِ سخن کا گہرا رنگ نمایاں ہے، اور اس قسم کے صدہا اشعار منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ رندانہ انداز کی شوخی بیان کرنے کے لئے صرف یہ شعر ہی کافی ہے ؎

مے کدے میں روحِ زاہد کی کہیں آتی نہ ہو
کل تو اک ساغر تھا غائب آج اک بوتل گئی

اگرچہ بیخود صاحب کی ٹکسالی زبان کا نمونہ پیش کرنے کے لئے یہی اشعار کافی ہیں۔ مگر اس عنوان کے ماتحت میں نے کچھ اور شعر بھی منتخب کئے ہیں۔ وہ بھی ملاحظہ ہوں ؎

پینے کے یہی دن تو ہیں ساقی اگر آئے
شیشے کی پری ابر میں اُڑتی نظر آئے

اس اُڑتی کی داد کہاں تک دی جائے۔ ضیافتیں اُڑ رہی ہیں، شراب اُڑ رہی ہے، شطرنج اُڑے گی، عموماً بولتے ہیں۔ پھر اڑنے کے لئے شیشے کی پری۔ یہ الفاظ ہیں یا نگینے جڑ دئے ہیں۔ اسی غزل کے دو شعر اور ؎

اب رات ہی کیوں ہو جو وہ دشمن کے گھر آئے
دن چھپنے نہ پائے کہ الٰہی سحر آئے

قاتل کو ستم کا نہ مزا ہے نہ سلیقہ
لایا ہے نمک پیس کے جب زخم بھر آئے

ملے مجھ سے اگر کوئی تو دل سے مہرباں بھی ہو
محبت کا مزا جب ہے یہاں بھی ہو وہاں بھی ہو

تمھیں سے مل کے جیتا ہوں تمھیں پر دم نکلتا ہے
تمھیں ہو مہرباں میرے تمھیں نا مہرباں بھی ہو

زمانے سے نرالا آدمی پاتا ہوں واعظ کو!
فرشتوں کے خصائل ڈھونڈنے بیٹھا ہے انساں میں

بھینے دے گا نہ یہ جمال ہمیں آئینہ پھینک کر سنبھال ہمیں

اس ردیف میں اعزازِ نفس کا پہلو کتنا نمایاں ہے، اور "پھینک کر" میں جو عجلت طلب تاکید ہے اسے منتہائے بلاغت کہئے۔ اس مختصری زمین میں یہ مطلع مطلعِ آفتاب ہے ؎

بہت کچھ سن چکا ہوں اور اب کب تک سُنے جاؤں
بہت کچھ کہہ چکے ہو اور اب کہنا ہے کیا مجھ سے

رعشہ بدن میں سرخ ہیں آنکھیں جبیں پہ بل آئے کہاں سے آگ بگولا بنے ہوئے

مصرعِ اوّل کا محاکاتی رنگ اور پھر آگ بگولا سے اس کا تناسب کس قدر استادانہ ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر حضرتِ داغ کا یہ مشہور مطلع یاد آجاتا ہے ؎

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں!
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

جب تک تمہیں نہ دیکھ لوں آتا نہیں قرار کیا کر دیا یہ تم نے یہ کیا ہوگیا مجھے
یہ حالت ہوئی ہے کہ اب چارہ گر مرا حال مجھ سے چھپانے لگا!

اس کنائے میں جو صراحت ہے، اس کی تعریف کہاں تک کی جائے۔ کوئی بات نہیں بتائی اور سب کچھ بتا دیا ہے۔

اب مومن کے رنگ کی بھی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ میرے خیال میں تو صرف یہی ایک شعر کافی ہے ؎

زندگی میں تھا تو لے دے کر سہارا اس کا تھا
موت بھی آکر کفِ افسوس مجھ پر مل گئی

دلِ مظلوم کو کیوں دفن کیا ظلم کیا ڈال دی خاک تڑپتے ہوئے ارمانوں پہ

ڈال دی خاک۔ یہ ٹکڑا اس شعر میں کس قدر استادانہ ہے۔ پھر "دفن کیا" کے ساتھ اس کا تناسب بھی دیکھئے ؎

عشق میں کٹ گئی جوانی تو عمر کٹتی نظر نہیں آتی

سکۂ قلب وخریداریِ ماہِ کنعاں! منزلت عشق کی تھی حسن کا اندازہ ہونا
جاں نثاروں کا گلا تیغ سے کٹتا ہے کہیں قتل اُن کا تو ہے شرمندۂ احساں ہونا
دردِ دل صبر کا صلہ ہے وہ دعا تو یہ تھی آدمی مجھ کو بنانا، مجھے انساں کرنا
میری تربت میں نکیرین نہ آنے پائیں کل بھی تکلیف ذرا لے شبِ ہجراں کرنا

کافرِ عشق ہے کم بخت، خرابی یہ ہے!
ہوسکے تم سے تو بےخود کو مسلماں کرنا

امید و بیم دونوں یار کے کوچے کی راہیں ہیں تفاوت کچھ نہیں پھر نارسائی نارسائی ہے
مسجدوں میں اہلِ دل ہم کو نظر آتے نہیں کیا یہ محرابیں بھی یا رب طاقِ نسیاں ہوگئیں

ان دونوں شعروں میں جدتِ خیال مستغنی عن التوصیف ہے۔ زبان اور تخیل کو دوش بدوش رکھنا ہی شاعر کے لئے اظہارِ کمال کا ذریعہ ہوتا ہے۔

اب رندانہ رنگ کے دو تین شعر بھی ملحوظ ہوں ؎

یہ عمامہ یہ قبا پھر حال یہ بےخود ترا تجھ کو پاسِ وضع اے مردِ خدا کچھ بھی نہیں
شراب شیشے میں بھر کر کہا یہ ساقی نے ابھی ہے حضرتِ بےخود کا انتظار مجھے

مے کدہ جنت ہے بےخود کچھ نہیں اس میں کلام
دو گھڑی کو آپ بھی تشریف لے آیا کریں

مے کدہ اور تشریف لے آنا، چہ خوب۔ اس اعزازِ نفس کا کیا کہنا۔ اگرچہ ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ لکھنے کی گنجائش موجود ہے۔ مگر حضرتِ بےخود کا کمالِ شاعری ظاہر کرنے کے لئے یہی انتخاب مجھے بہت کافی معلوم ہوتا ہے۔ دعائے مغفرت پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

نازؔ انصاری

دلّی کی آخری شمع

مرزا غالب نے کہا تھا ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دلّی کی آخری شمع علم و ادب حضرت سید وحید الدین بیخود دہلوی کے باب میں کہا گیا تھا اور خواجہ حسن نظامی کی وفات کے چند ہی روز بعد بیخود صاحب کے راہی ملک عدم ہو جانے سے تو یہ شعر نہایت صادق آ گیا ہے۔

بیخود صاحب کی موت اردو ادب کے لئے خواجہ صاحب کی وفات حسرت آیات سے کم جانکاہ حادثہ نہیں ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب طرز انشاء پرداز تھے تو بیخود صاحب بھی ایک صاحب طرز شاعر تھے بیخود صاحب کی موت ایک ادارے کی موت ہے ایک مدرسۂ فکر کی موت ہے۔ دلّی کے شعر و ادب اور قلعہ معلّٰے کی زبان کی موت ہے اور اگر ان الفاظ کو رسمی نہ سمجھا جائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بیخود صاحب کی موت سے دلّی اور خصوصاً اردو شاعری میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل بلکہ مشکل ترین ضرور ہے۔

آج سے تقریباً سو برس پیشتر ۱۲۷۹ھ میں بھرت پور کے کوتوال سید شمس احمد سالم کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام وحید الدین احمد رکھا لیکن افتاد طبع ماحول اور صحبت نے ان کو ایک نیا نام دیا وہ نام جسے شاعری میں تخلص کہہ لیجئے "بیخود" تھا اور آج وحید الدین احمد کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور بیخود کو ایک دنیا جانتی ہے۔ بیخود صاحب پیدائش کے دو ماہ بعد بھرت پور سے دہلی آ گئے تھے۔ پھر دہلی ہی میں پلے، بڑے ہوئے، یہی ان کا مسکن اور آخر میں مدفن بنی۔ دلی کی سرزمین اگرچہ پہلی جنگ آزادی کے سرفروشوں کے خون سے ابھی تک لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ اس کا علمی ادبی خزانہ لُٹ گیا تھا اور اس کے بیش قیمت ہیرے دہلی کے اطراف و اکناف میں منتشر ہو چکے تھے مگر فضا ابھی تک علم و ادب سے معمور تھی اس گئے گزرے دور میں بھی یہاں بہت سے باکمال اہل علم اور صاحب قلم موجود تھے۔ اس ماحول اور اس فضا میں بیخود صاحب کی دلّی میں پرورش ہوئی۔

بیخود صاحب کے آباد اجداد دہلی ہی کے رہنے والے اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ انقلاب ۵۷ء نے انھیں دلی سے اجاڑ کر بھرت پور میں جا بسنے پر مجبور کیا تھا۔ دلی میں بھی آپ کے بزرگ مغل دربار میں اعلےٰ عہدوں پر مامور تھے۔ بھرت پور میں آپ کے جد امجد مہاراجہ کے مشیر بنے اور منصب پایا یہی سلسلہ تھا جو بھرت پور دربار اور آپ کے خاندان میں آپ تک کسی نہ کسی صورت سے قائم رہا۔ آپ کے والد بھرت پور کے کوتوال بنے۔ مہارانی نے آپ کو اپنا دینی بیٹا بنا لیا تھا اور اپنی زندگی میں آپ کا تمام خرچ برداشت کرتی رہی۔ مرتے وقت اپنے ولی عہد کو وصیت کی کہ تم میرے بیٹے کو اپنا بھائی سمجھنا۔ چنانچہ مہاراجہ جسونت سنگھ نے اپنی زندگی میں اسے پوری طرح نبھایا اور بیخود صاحب کو سو روپے ماہوار ملتے رہے۔ بیخود صاحب بھی معترف رہے اور جب مہاراجہ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا تو انھوں نے اس کی کوئی شکایت نہیں کی اور نہ ان کی خودداری نے اس کی اجازت دی کہ وہ اس کے لئے دوڑ دھوپ کرتے بلکہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ؎

نہ کہ یاد بیخود وہ عیش گزشتہ   ہمیشہ رہا ہے زمانہ کسی کا

نواب محمد حسن صاحب کی والدہ بیخود صاحب کی حقیقی خالہ تھیں۔ ان کے دو لڑکے بھی تھے مگر انھوں نے بیخود صاحب کو گود لے لیا تھا۔ انھیں کے یہاں بیخود صاحب کی پرورش ہوئی۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ بچپن ہی سے علمی ادبی ماحول میسر آیا اور اس ماحول نے آپ کے دل و دماغ پر گہرے نقش پیدا کئے۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اس نے بیخود صاحب کی زندگی کا رُخ بدل دیا ورنہ اگر دوسرے فطری رجحانات اور ان مشاغل کا خیال کیا جائے جن میں بیخود صاحب کا کافی وقت گزرا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہیں استاد فن پہلوان ہونا چاہیئے تھا۔ پیراکی کا نامور معلم ہونا چاہیئے تھا بنوٹے کا مشہور زمانہ استاد ہونا چاہیئے تھا گھڑسواری میں یکتائے روزگار کہلانا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے اور جانتے ہوئے بھی وہ دنیا میں اس حیثیت سے مشہور نہ ہوئے۔ حالانکہ ان تمام چیزوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے ہر فن سیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے متعدد قیمتی سال صرف کئے تھے اور بڑا ریاض کیا تھا۔

بیخود صاحب کے سگے ماموں ننھے خاں صاحب (مولوی عبدالرحیم صاحب بیدل (دہلوی) کا گھر اس زمانے میں دلّی میں محفل علم و ادب تھا اور اپنے وقت کے مسلّمہ اردو اہل قلم حضرات کا وہاں اجتماع اور ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ چنانچہ وہاں انہیں شیفتہ۔ حالی۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ منشی ذکا اللہ مولوی ضیاء الدین اور علامہ مولوی نذیر احمد صاحب کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق انہوں نے بیخود کے اندر وہ جھلک دیکھی جس نے بیخود کو اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ بنایا۔ بیخود صاحب نے گلستاں بوستاں مولانا حالی سے پڑھی اور غالباً بارہ برس کی عمر تھی کہ استاد کو ایک شعر کہہ کر سنایا۔

دل سے نکل گیا کہ جگر سے نکل گیا
تیر نگاہِ یار کدھر سے نکل گیا

وہ بہت متاثر ہوئے مگر سمجھ لیا کہ لڑکا میرے خشک رنگ میں نہیں رنگا جا سکتا چنانچہ خواجہ صاحب نے خود ایک خط کے ہمراہ بیخود صاحب کو فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کی خدمت میں بھیجا اور آپ نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ استاد کا رنگ اور پھر طبیعت کی جولانیاں نہ صرف اس رنگ میں رنگے گئے بلکہ اس رنگ میں مزید نکھار پیدا کیا۔ استاد کے جانشین بنے اور ان کا نام دنیا میں خوب روشن کیا۔ حتیٰ کہ داغ مرحوم کو بھی بیخود صاحب کی خداداد صلاحیتوں ذوق و رنگ۔ ذہانت و فطانت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور سچ تو یہ ہے انہوں نے بہت فراخ دلی سے کیا۔ کئی بار بیخود صاحب کی غزلوں پر یہ لکھا کہ میں نے اس قافیے کا اپنا شعر قلم زد کر دیا ہے یا اس ردیف کی اپنی پوری غزل تلف کر دی ہے۔ اور اسی چیز سے متاثر ہو کر خواجہ میر درد کے نبیرہ و جانشین خواجہ ناصر نذیر فراق نے کہا تھا ؎

داغ شیریں سخن فصیح الملک
کرتے تھے احترام بیخود کا
پا گیا مثل داغ اب شہرت
ماشاء اللہ نام بیخود کا

بیخود صاحب نے متعدد غیر مطبوعہ غزلوں کے علاوہ ایک پورا غیر مطبوعہ دیوان دو مطبوعہ دیوان — گفتار بیخود اور درِ شہسوار بیخود چھوڑے ہیں۔ آپ کا ایک ناول ننگ و ناموس اور شرح دیوان غالب بھی مرآۃ الغالب کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ بیخود صاحب کے ایک عزیز ترین دوست سید مرتضیٰ علی نے مجھے ننگ و ناموس کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ نہایت عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ بہترین کاغذ پر چھپا تھا اور اس کا صرف ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ دوبارہ بیخود صاحب نے خود ہی کی اشاعت پسند نہیں کی وہ کہا کرتے تھے کہ میں شاعر ہوں ناول نگار نہیں بننا چاہتا۔ یہ تو ننگ و ناموس کے بارے میں بیخود صاحب کی اپنی رائے تھی۔ لیکن دنیا نے اس کو قدر و منزلت کی کن نظروں سے دیکھا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سید مرتضیٰ علی بتاتے ہیں کہ انھیں سینٹ اسٹیفنز کالج کے ایک پروفیسر ڈاکٹر فشر نے اس کا ترکی زبان میں ترجمہ دکھایا تھا اور وہ خود اس کے انگریزی ترجمے میں مصروف تھے۔ یہاں سید مرتضیٰ علی کا ذکر آیا ہے۔

اس لئے میں آپ سے موصوف کا بھی تھوڑا سا تعارف کرادوں اور ایک ہی جملے میں آپ اُن کا مقام پہچان لیجئے۔ کہ غالب کے یہاں جو درجہ شیفتہ کا تھا وہی بے خود صاحب کے یہاں سید مرتضیٰ علی کا تھا۔ بے خود صاحب جب کوئی تازہ غزل کہتے تھے تو سب سے پہلے سید صاحب کو بُلا کر سناتے تھے اور جب وہ اس کو پسند فرما لیتے تو بے خود صاحب اس کو شامل دیوان کیا کرتے۔ جو اشعار ان کو ناپسند ہوتے بے خود صاحب بلا تکلف ان کو قلم زد کر دیا کرتے تھے۔

مرزا بلاقی اور مولانا ارشد گورگانی بہادر شاہ ظفر کے تلامذہ میں سے تھے ان حضرات نے قلعہ معلیٰ کی صحبتوں سے استفادہ کیا تھا۔ دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے اور پسند کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا بلاقی بے خود صاحب کی زبان اور طرزِ ادا سے بےحد متاثر تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "بے خود جس طرح تم مضمون ادا کرتے ہو اور جو الفاظ تم استعمال کرتے ہو وہ قلعہ والا ہی کر سکتا ہے۔" مرزا بلاقی اور مولانا ارشد نے جو عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے بے خود صاحب کے ناول ننگ و ناموس کو بہت پسند کیا تھا۔ آپ بھی ایک زمانے میں سینٹ اسٹیفنز کالج میں پروفیسر ہو کر آ گئے تھے۔ اس زمانے میں سید مرتضیٰ علی بھی تعلیم پا رہے تھے۔ وہیں موصوف نے ان کی زبانی بے خود صاحب کے اس ناول کی زبان اور بے خود صاحب کی نثر کی تعریف سنی تھی۔ ناول میں سماجی اصلاح کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔

مراۃ الغالب کو بھی قبولیت عامہ کی سند حاصل ہوئی اور ایک زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے کورس میں شامل رہی۔ اس کے بارے میں خود بے خود صاحب کی رائے یہ تھی کہ "میں نے دیوانِ غالب کی شرح لکھتے وقت مولانا حالی کی ذہنیت کو پیش نظر رکھا ہے۔" اور یہ بات غلط نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ بے خود صاحب کا بچپن مولانا حالی کی صحبت میں گزرا ہے۔ افسوس کہ اب بازار میں ننگ و ناموس اور مراۃ الغالب دونوں ناپید ہیں۔

بے خود صاحب نے اردو کی جو سب سے بڑی خدمت انجام دی وہ انگریزوں کو اُردو تعلیم دینے کی ہے اور یہ ایک اتنی بڑی اور ٹھوس خدمت ہے کہ وہ اگر کچھ اور نہ بھی کرتے تب بھی اُردو کی تاریخ میں اُن کا نام زندہ رہتا۔ انھوں نے یہ خدمت دو چار دس سال نہیں پورے چالیس برس تک انجام دی ہے جو ایک پوری انسانی زندگی کی اوسط مدت ہے۔ بے خود صاحب نے یہ کام اس سلیقے سے انجام دیا ہے کہ جب ہم اُن کی زندگی کے باب میں چھان بین کرتے ہیں تو حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ ان کے انگریز شاگردوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ بے خود صاحب انگریزی قطعی نہیں جانتے تھے لیکن انھوں نے انگریزوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ اردو پڑھائی۔ اُن کے انگریز شاگردوں میں بہت سے، بڑے نامور ہوئے ہیں۔ جن میں سی، ایف اینڈریوز سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سینٹ سٹیفنز کالج میں آنے والے پروفیسر اور دہلی میں آنے والے آئی، سی، ایس افسران سبھی یکے بعد دیگرے بے خود صاحب کے شاگرد بنے ہیں وہ لوگ بے خود صاحب کی شخصیت، اُن کی زبان دانی، علمیت اور طریقۂ تعلیم سے کس درجہ متاثر ہوئے ہیں اس کا اندازہ اُن بے شمار خطوط اور سرٹیفکیٹوں سے ہوتا ہے جو آج بھی بے خود صاحب کے صاحبزادے سید محی الدین کے پاس محفوظ ہیں۔ اُن میں ایسے خطوط بھی ہیں جو اُن کے انگریز شاگردوں نے واپس لندن پہنچنے کے بعد لکھے یا جن میں ہندوستان آنے والے دوسرے انگریزوں سے بے خود صاحب کی سفارش کی کہ وہ اُن سے اردو پڑھیں۔

ان انگریزوں نے بے خود صاحب کی ایک خصوصیت عام طور سے بیان کی ہے اور وہ یہ کہ آپ کو اردو زبان پر اس درجہ عبور اور قدرت حاصل تھی کہ مشکل الفاظ کے نہایت آسان معانی بلا تامل پیش کر دیا کرتے تھے اور لفظ کے بدلے لفظ ہی بتاتے تھے۔ جو سرٹیفکیٹ قابلِ ذکر ہیں اُن میں سی، ایف اینڈریوز، برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک رکن مسٹر جے، بی آبٹ، پادری چارلس ایچ ہیمنگ کے علاوہ اُن کے شاگردوں میں سر جارج الیٹ اور لارڈ ہیلی سابق گورنر یو، پی کے نام بھی ملتے ہیں۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ اُردو کے بارے میں گاندھی جی کے جو نظریات تھے اُس کے پس منظر میں دو شخصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک سی ایف اینڈریوز اور دوسرے حضرت بے خود دہلوی۔ گاندھی جی دہلی میں اینڈریوز صاحب ہی کے یہاں قیام کیا کرتے تھے اور یہیں بے خود صاحب کی گاندھی جی سے ملاقاتیں ہوئی ہیں کیونکہ آپ اینڈریوز صاحب کو پڑھانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اینڈریوز صاحب ہی نے ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کو مہاتما گاندھی سے ملایا تھا۔ گاندھی جی اور بے خود صاحب کے درمیان اکثر سیاسی اور مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتی تھی۔ بے خود صاحب اگرچہ سیاسی یا مذہبی آدمی نہیں تھے۔ مگر اس میں کافی دلچسپی رکھتے۔ سیاسی طور پر ان کے عقاید وہی تھے جو گاندھی جی کے، یعنی وہ کسی خونیں انقلاب کے حامی نہیں تھے اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں اُن کے خاندان

کو زبردست نقصانات کا سامنا ہوا تھا۔ بے خود صاحب نے گاندھی جی کو بتایا تھا کہ اُردو اور ہندی دراصل دونوں بہنیں ہیں۔ اینڈریوز صاحب چونکہ خود اُردو کے بہت بڑے عالم اور زبردست حامی تھے، اس لئے انھوں نے گاندھی جی کو بھی اردو کا ہمنوا بنا لیا تھا۔

بے خود صاحب کی زبان دانی کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے حیدرآباد کے دارالترجمہ سے فالن کی انگریزی سے اردو ڈکشنری پر کچھ اعتراضات کئے گئے، اُس کے پبلشر نے اینڈریوز صاحب کو لکھا انھوں نے وہ اعتراضات بے خود صاحب کو بھیج دئے۔ بے خود صاحب نے ان کا جواب لکھا۔ ذوق، مومن، غالب اور داغ سے سندیں پیش کیں۔ اس پر ڈکشنری کے پبلشروں نے بے خود صاحب کو ایک کثیر رقم کی پیش کش کی اور ساری ڈکشنری پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے درخواست کی لیکن بے خود صاحب نے اس پر معذرت ظاہر کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے اینڈریوز صاحب سے کہا کہ اگر آپ مجھے وقت دیں تو یہ کام ہو سکتا ہے۔ وہ اس وقت سیاسیات میں آ چکے تھے اُن کے پاس وقت کہاں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ چیز رہ گئی۔

یہ تو تھا بے خود صاحب کی ادبی زندگی کا تذکرہ۔ اس کے علاوہ آپ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اور ان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ وہ بہت عمدہ پہلوان تھے اور انھیں اُستادِ فن کا درجہ حاصل تھا۔ برسوں اکھاڑے بازی کی ہے۔ پیر جی مظفر الدین کو پہلوانی میں اپنا پیر مانتے تھے۔ انھوں نے گوالیار کے ایک استاد سے بنوٹ سیکھا اور پورے ڈھائی برس وہاں رہ کر یہ فن حاصل کیا۔ انھوں نے اس میں اس درجہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ اگر اُن کے ہاتھ سے بدن کے کسی حصے پر چوٹ لگ جائے تو سارا بدن سڑ جائے پھر اس کا توڑ بھی وہی جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے جن لوگوں کو بنوٹ سکھایا یہ گُر نہیں بتایا۔ اس لئے کہ جن سے انھوں نے سیکھا تھا اس کا انتقال ہو گیا تھا اور دوسرا کوئی اس کو جانتا نہ تھا۔

بہرت بعد میں انھیں گھوڑے کی سواری کا شوق ہوا۔ اس شوق نے اس درجہ شدت اختیار کی کہ آپ نے سلوتری (گھوڑوں کا علاج) کا علم سیکھا اور اس میں بڑا ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ پتنگ بازی کا شوق ہوا تو لکھنؤ والوں سے میدانِ مقرر وسخن ہی میں معرکہ آرائیاں نہیں کیں بلکہ کنکوے بھی لڑائے۔ سائی صاحب گڈیاں بنا کر دیا کرتے تھے اور بے خود صاحب لڑاتے تھے۔ یہ شوق بھی آپ کو پیر جی مظفر الدین سے ہوا تھا۔

آخر میں کبوتر بازی کا بے حد شوق ہو گیا تھا۔ اس میں بھی اتنا ملکہ حاصل کر لیا تھا کہ اُن کے کبوتروں نے کبھی مار نہیں کھائی۔ ایک دفعہ اُن کی اپنے دوست وقار احمد خاں ایم اے ایل ایل بی سے کچھ بحث ہو گئی اور بات اس پر ٹھہری کہ بے خود صاحب نے اُن کو اپنا ایک کبوتر دیا۔ وہ اسے آگرے لے گئے اور وہاں جا کر چھوڑ دیا۔ چنانچہ کبوتر چھ روز بعد دلی واپس آ گیا۔ طرح طرح کے کبوتر پال رکھے تھے۔ پھر اُن کے اوصاف و اقسام پر بحث ہوتی تھی۔ جو کبوتر اُن کے یہاں نہ ہوتے اُن کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

آخری عمر میں سماعت محدود ہو گئی تھی مگر بینائی حیرت انگیز تھی سو گز سے کوئی چار پانچ ماہ قبل کا ذکر ہے میں اپنے گھر سے نکل رہا تھا اور بے خود صاحب دو آدمیوں کے سہارے سے گھر واپس آ رہے تھے۔ کوئی پندرہ قدم کا فاصلہ ہوگا۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا تو انھوں نے فوراً اپنی کڑک دار آواز میں جواب دیا۔۔۔ تقریباً پانچ چھ مہینے کی بات ہے کہ آل انڈیا ریڈیو سے ایک مشاعرہ "بزرگ شعراء" کا جس میں سب ساٹھ سال سے اوپر کے تھے، منعقد ہوا۔ بے خود صاحب بھی اُس میں شریک ہوئے۔ اور وہ اُن کی زندگی کا آخری مشاعرہ تھا۔ خود اپنا کلام پڑھا۔ چھیاسی برس کی عمر میں بھی آواز میں وہی گونج تھی۔ کتابی چہرہ، سفید براق سی سرسیدی داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبی اور اونچی ناک ماتھے پر بڑھاپے کی نہ صرف شکنیں بلکہ تمام لکیریں بہت نمایاں تھیں۔ بھرا بھرا پہلوانی جسم ترکی ٹوپی، شیروانی، مغلئی پاجامہ۔ یہ آخری عمر میں حلیہ تھا ـــــ آہ اب یہ صورت کبھی نظر نہ آئے گی۔ کبھی خود ہی کہا تھا اور خوب کہا تھا ؎

نہ دیکھے ہوں گے رند لاابالی تم نے بے خود سے
کہ ایسے لوگ اب آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

(اگلے صفحے پر آپ کے نام چند یادگار خطوط ملاحظہ فرمائیے)

چند یادگار خطوط

(عطیہ سید محی الدین احمد صاحب خلف الرشید جناب سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی)

مورخہ ۵۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء بروز جمعہ

سید صاحب اس وقت آپ کی دو غزلیں پہونچیں۔ مجھے پسند آئیں۔ دو شعر پہلی غزل کے کاٹ دیئے گئے۔ وہ یہ ہیں۔

آپ ملتے ہیں کب یہ سن کے کہا　　جب کوئی ہم سا دوسرا بھی ہو

تم بھی جھوٹے رقیب بھی جھوٹا　　جب ہمارا یہ نقشِ پا بھی ہو

ایک شعر یوں بنایا گیا

آرزو ہے کہ آرزو نہ رہے　　کہیں پوری میری دعا بھی ہو

دوسری غزل کے پہلے مطلع میں یہ اصلاح ہوئی

نگاہِ شوخ کہاں شرمسار آنکھوں میں　　کھٹک رہا ہے کوئی بے قرار آنکھوں میں

ایک اور شعر یوں بنایا گیا ہے

وہ بے پیئے بھی تو مستی میں جھومتے ہیں　　کہ سرخ ڈوروں کی ہے کیا بہار آنکھوں میں

ایک شعر میں

ادا کا نام نہیں ہے حیا کا نام نہیں　　کچھ اور ہے تری غفلت شعار آنکھوں میں

ایک شعر میں

عیاں ہوا ہے یہ سایہ سیاہ بختی کا　　کہاں ہے سرمہ مری سوگوار آنکھوں میں

آپ کا اصلاح پرچۂ غزلیات حضرت بندگانِ عالی مدظلہٗ العالی حضور نظام کے ملاحظہ کے لئے بھیج دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے رکھ لیا گیا ہے۔ میری طبیعت ناساز ہے۔ دردِ نقرس میں مبتلا ہوں۔ شاگردوں کا رجسٹر جو آپ نے طلب کیا ہے ایک کتاب ہے۔ کوئی لکھنے والا مل جائے تو لکھوا کر بھیج دیا جائے گا۔

زیادہ فقط

فصیح الملک داغ دہلوی

۵۸۶

بھائی بیخود صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

تسلیم عرض ہے۔ ایک خط آپ کا اوستاد قبلہ مدظلہٗ العالی کے پاس آیا تھا جس میں تم نے اپنا قصد یہاں آنے کا ظاہر کیا تھا اور برداشتہ خاطری وہاں کی لکھی تھی چنانچہ جواباً آپ کو حضرت موصوف نے لکھ دیا تھا کہ یہ تمہارا گھر ہے آجاؤ۔ محصول ریل کا انتظام بطور خود کر لو۔ اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ حضرت قبلہ کا تنخواہ کا مطالبہ چھ ماہ کا ہے۔ ذاتی بیشتر ضرورتیں رکی ہوئی ہیں۔ یہ وجہ ہوئی کہ محصول ریل کی رقم نہ روانہ کی گئی۔ ورنہ تم اوستاد کی علوِ ہمتی سے واقف ہو کہ وہاں ایسے خفیف خیال کبھی گذرتے ہی نہیں بہر نوع مجھ سے اکثر آپ کا ذکرِ خیر آتا ہے۔ اُن کے دل میں تمہاری محبت بہت ہے۔ چنانچہ کل بھی مجھ سے فرمایا کہ تم بھی بیخود کو لکھو کہ وہ آجاویں۔ اور اُن کو لکھ دو کہ رقم محصول بھی میں انشاء اللہ المستعان دے دوں گا۔ جب وہ یہاں آجائیں گے۔ برادرم پہلے مجھے یہ بتایئے کہ کبوتروں کا مرض آپ کا گیا یا موجود ہے۔ خدارا اس آفت کو چھوڑ دو اور للہ یہاں آجاؤ۔ اچھی صحبت رہے گی باقی فضلِ الٰہی خیریت ہے۔ چچا میاں قبلہ کو میری جانب سے تسلیم کہہ دیویں۔ ۱۱۔ جولائی ۱۹۰۲ء

آثم ابو المعظم سراج الدین احمد از حیدرآباد دکن ترپ بازار

جواب کا انتظار رہے گا [illegible]

کرمی نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

---

۱۸ مئی ۱۹۰۵ء

از مطبع رفاہِ عام لاہور

مخدومی و مکرمی۔ السلام علیکم۔ میں نے ریاض الاخبار میں اُستاد مرحوم کی جانشینی کا مسئلہ چھیڑا ہے۔ اُس میں میں نے آپ کا نام بھی پیش کیا تھا۔ اور اس سے اور لوگ بھی متفق ہیں۔ اگر آپ اصلاح کا کام بلا کسی بار کے انجام دے سکیں تو مطلع فرمائیں تاکہ عام طور پر اعلان کر دیا جائے۔ براہ نوازش جواب سے جلد مطلع فرمایئے

والسلام

خاکسار وجاہت حسین وجاہت صدیقی

سید محی الدین قادری زور

اُردو کا لسانیاتی ادب

لسانیات ایک ایسا علم ہے جس کی طرف اُردو زبان میں بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ یورپ کی اکثر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی سوائے جرمن اور فرانسیسی کے اس موضوع پر کم ہی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ایک جداگانہ سائنس کی حیثیت سے نسبتاً بہت بعد کو توجہ کی گئی ہے۔ اس کی تاریخ ڈھائی سو سال سے آگے نہیں جاتی۔

یوں تو مختلف زبانوں میں لغت نگاری، لفظوں کے مرکبات و مصادر اور صرف و نحو پر غور و فکر اور ان پر کتابیں مرتب کرنے کا کام نہایت ہی قدیم زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن زبان کے آغاز و ارتقاء اور نشو و نما پر سائنسی نقطۂ نظر سے کام کرنے کی طرف سب سے پہلے جرمن اور فرانسیسی علماء نے ہی توجہ کی۔ یونانی لاطینی، سنسکرت اور عربی زبان پر تحقیق و تفتیش اور تقابلی مطالعے کے سلسلے میں جو نتائج انھوں نے اخذ کئے اور اس بحث و تحمیص میں خود بخود جو اصول مدوّن اور مرتب ہونے لگے ان کی بناء پر یہ محسوس کیا گیا کہ زبانوں کا بھی ایک علٰحدہ علم ہے جس کو انھوں نے فلولوجی کے نام سے موسوم کیا اور ہم اُردو میں لسانیات کہتے ہیں۔

اس علم کی نسبت خود انگریزی میں اتنی زیادہ کتابیں نہیں ہیں جتنی کہ جرمن اور فرانسیسی میں ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ انگریز علماء ایک مدت تک ان جرمن اور فرانسیسی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل بھی نہ کر پائے۔ اور چونکہ اُردو، جدید علوم و فنون میں زیادہ تر انگریزی کی مقلد اور خوشہ چین ہے اس لئے شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اس میں اس [illegible]وع کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔

اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آب حیات میں اس کی طرف توجہ کی اور چونکہ وہ انگریزی ادب اور شاعری سے کافی متاثر تھے اور محکمۂ تعلیم پنجاب سے تعلق رکھتے تھے جو انگریزی ماہرین علوم مشرقیہ کی سرپرستی میں انگریزی ادب اور شاعری سے اردو کو روشناس کرانے کا خواہش مند تھا۔ اس لئے آزاد نے اُردو کے آغاز و ارتقاء پر خود اُردو میں پہلی بار لسانیاتی انداز میں روشنی ڈالی اور اُن کے عہد کی معلومات اور اُن کے مطالعہ کی وسعت کی حد تک ان کی کوشش بہت زیادہ کامیاب سمجھی جا سکتی ہے۔ اگرچہ وہ اُردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں صحیح نتائج پر نہیں پہنچ سکے اور نہ اس زمانے میں پہنچ سکتے تھے تاہم جو کچھ لکھا لسانیاتی پیرایے میں لکھا ہے۔

آب حیات کے بعد مدت تک اردو دنیا اس علم کے فیوض سے محروم رہی۔ یہاں تک کہ حافظ محمود شیرانی نے اس طرف پورے انہماک کے ساتھ توجہ کی۔ اس اثنا میں اگرچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر ہارون خاں شروانی وغیرہ نے چند لسانیاتی مضمون ضرور لکھے جن میں مولوی عبدالحق صاحب کے مضامین [illegible] مرہٹی پر فارسی کے اثرات" اور "اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولوی احمد دین کی "سرگزشت الفاظ" مولانا وحیدالدین سلیم کی "وضع اصطلاحات" اور مولانا فضل الرحمٰن کی "قاموس الاغلاط" بھی اسی علم کے بعض پہلوؤں سے مربوط سمجھی جا سکتی ہیں۔ لیکن لسانیات کے جدید ترین طرز تحقیق کو "پنجاب میں اردو" میں جس خوبی اور کامیابی سے برتا گیا ہے اس کا ان تحریروں میں دور دور تک اثر نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے محمود شیرانی کی اس کتاب کو ہماری زبان کی پہلی لسانیاتی کتاب سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں شیرانی نے اردو کی وجہ تسمیہ، اس کے مختلف ناموں اور اس کے آغاز و ارتقاء پر بڑی تحقیق و تلاش کے ساتھ بحث کی ہے اور پنجابی اور اردو کے تعلقات شرح و بسط کے ساتھ واضح کئے ہیں اور پنجاب میں اردو کا ایک تذکرہ بھی قلمبند کر دیا ہے۔ ان تمام پہلوؤں پر شیرانی نے اس خوبی اور مہارت سے روشنی ڈالی ہے کہ اردو کے بڑے بڑے عالموں اور ناقدوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو پہلی بار معلوم ہوا کہ زبان سے متعلق تاریخی اور تحقیقی تالیف کس طرح مرتب کی جاتی ہے اور اردو اس قسم کی کتابوں سے کس حد تک محروم ہے۔

پنجاب میں اُردو کی اشاعت کے دوسرے ہی سال میری کتاب "ہندستانی لسانیات" مرتب ہوئی جو پہلی دفعہ سنہ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصے میں لسانیات کے مقاصد، فوائد، اور تاریخ، زبانوں کی ماہیت، آغاز اور تشکیل، اُن کے فطری ارتقاء میں صوتی تغیر و تبدل اور داخلی اثرات اور زبان کی ارادی تشکیل میں عوام کے حصے، عالموں کے اثر اور وضع اصطلاحات وغیرہ پر علمی اور اصولی معلومات درج کی گئیں اور اسی سلسلے میں دنیا کی زبانوں کے طریقۂ تقسیم کو واضح کیا گیا ہے۔ اور مختلف لسانی خاندانوں کی وضاحت کر کے ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء، جدید ہند آریائی زبانوں اور ہندستان کی غیر آریائی زبانوں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ہندستانی یعنی اردو اور ہندی کے آغاز، ارتقاء، اس کی ادبی بولیوں اور اس کی ہمہ گیری پر بحث کر کے عہد حاضر کے اردو ہندی جھگڑے اور اردو کی ضرورتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ گویا اصل موضوع لسانیات پر پہلی اردو کتاب تھی جو زیادہ تر فرانسیسی اور انگریزی کتب لسانیات کے انداز میں مرتب کی گئی تھی۔

اس کے بعد لسانیاتی موضوعوں پر لکھنے کی طرف توجہ ہونے لگی۔ جیسا کہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے کئی مضامین قلمبند کئے اور وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے اور آخر کار "کیفیہ" کے نام سے یہ مضامین کتابی صورت میں بھی چھپ گئے۔ "کیفیہ" اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے صرف پہلا باب "اردو زبان کا تاریخی مطالعہ" لسانیاتی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے ابواب حروف تہجی، تلفظ، اسم، تذکیر و تانیث، حرف، مصدر، فعل، روزمرہ، محاورہ، کلام، اسلوب، عروض، خطابیات، خط و کتابت اور املا جیسے متفرق موضوعوں سے بحث کرتے ہیں۔ کیفی کا اسلوب لسانیاتی سے زیادہ انشا پردازانہ ہے۔ اور چونکہ وہ جدید علم لسان یا لسانیات سے واقف نہیں ہیں اس لئے لسانیات سے زیادہ زبان دانی پر توجہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب بحیثیت لسانیاتی تو نہیں البتہ زباندانی میں مددی ہے اور اردو زبان کے ایسے ایسے گوشے منظر پر لاتی ہے جو گہرے مطالعہ اور عالمانہ تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب یوسف زئی نے "لسان و مطالعہ لسان" پر اور پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما نے "آریائی زبانوں" پر بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں۔ ڈاکٹر ورما نے دراصل ادارۂ ادبیات اردو کے اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے آریائی زبانوں پر ایک آرٹیکل تحریر کیا تھا اور چونکہ اس انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت میں رقتی دشواریوں کی وجہ سے تعویق ہو رہی تھی۔ اس لئے میں نے اس آرٹیکل کو اپنے ایک مقدمہ کے ساتھ سنہ ۱۹۴۲ء میں ادارے کی طرف سے شائع کرا دیا۔ یہ دونوں کتابیں لسانیاتی ہیں۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی لسانیاتی موضوعوں پر پی، ایچ، ڈی کے امتحان کے لئے مقالے لکھوانے کی طرف اس اثنا میں توجہ ہونے لگی تو ڈاکٹر مسعود حسین نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے لئے اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق مقالے قلمبند کئے۔ یہ دونوں مقالے بالکل جداگانہ انداز میں لکھے گئے۔ اور ایک دوسرے سے مختلف اصولوں اور نظریوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مسعود حسین کا مقالہ تو شائع ہو چکا ہے لیکن ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مقالہ غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے اپنے مقالے کو "مقدمۂ تاریخ زبان اردو" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اور ابھی ابھی اس کا دوسرا ایڈیشن کافی اضافے اور ترمیم کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس کے پہلے باب میں ہندستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ درج ہے۔ دوسرے باب میں ہندستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور تیسرے میں ہندستانی کے عہد بہ عہد ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں برج بھاشا، پنجابی اور دکنی کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور پروفیسر شیرانی کے لسانی نظریے پر تنقید ہے۔ دہلی کی بعض نواحی بولیوں سے دکنی کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہریانوی کو اردو کا ماخذ قرار دینے کی طرف راغب ہے اور اس سلسلے میں بہت محنت سے مواد جمع کیا ہے جو اگرچہ ابھی تشنہ ہے تاہم ان کا اندازِ تحریر اور طریقۂ تحقیق بحیثیت لسانیاتی ہے اور آج وہی اُردو کے ایک ایسے صاحب علم نظر آتے ہیں جو لسانیات سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس پر اُستادانہ عبور اور ماہرانہ درک رکھتے ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی لسانیاتی تحریروں سے اردو کی ایک بڑی کمی دور ہو جائے گی۔

اس اثنا میں پروفیسر احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بیمز ایک انگریز عہدہ دار تھا جس کو گریرسن کی طرح زبانوں کے مطالعے کا خاص شوق تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر اُس نے یہ کتاب ۱۸۶۷ء میں مرتب کی تھی۔ چونکہ اس زمانے تک لسانیات نے ترقی نہیں کی تھی اور خود اردو زبان کی نسبت قطعی معلومات حاصل

نہیں سکیں اس لئے اس کی کتاب کو قدامت کا اعزاز تو حاصل ہے لیکن ؤ تقویم پارینہ سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ تاہم اس ترجمے کی وجہ سے اردو زبان میں ایک لسانیاتی کتاب کا اضافہ ہوا اور اس کے سلسلے میں پروفیسر احتشام جیسے فاضل ادیب اور ترقی پسند نقاد نے لسانیات کی طرف توجہ کی اور ایک عمدہ مقدمہ لکھا جس میں ہندستانی زبانوں اور اردو ہندی سے متعلق شائع شدہ انگریزی، اردو اور ہندی کی کتابوں سے استفادہ کرکے نہایت شائستہ اور عام فہم انداز میں اردو کے بارے میں ایک قابل قدر لسانیاتی تجزیہ مرتب کی۔

یہ تھی اردو میں لسانیاتی ادب کی کل داستان، جو اُردو جیسی بڑی زبان کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ رفتہ رفتہ اُردو کے ادیب اور عالم اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔

"ہندوستانی موسیقی نمبر"

تجویز ہے کہ آج کل کا مارچ ۱۹۵۶ء کا شمارہ 'ہندوستانی موسیقی نمبر' ہو

مندرجہ ذیل عنوانات پر بالخصوص اور ہندوستانی موسیقی سے متعلق دیگر موضوعات پر بالعموم مضامین درکار ہیں۔ جو اصحاب یہ مضامین بہم پہنچا سکیں وہ مدیر رسالہ سے خط و کتابت فرمائیں

۱۔ ہندوستانی موسیقی کی تاریخ

۲۔ ہندوستانی موسیقی کے بڑے بڑے سرپرست

۳۔ مشہور گانے والوں کے حالات و کوائف ۔ وشنو دگمبر، وشنو نارائن بھات کھنڈے، فتح علی، علی بخش، بندے علی خاں، فیاض خاں، رام کشن بواوزے، کرشنا راؤ شنکر پنڈت، پنڈت رتن جانکار، پرنسپل بھات کھنڈے کالج، گووند راؤ تانبے آف کولہاپور، اللہ بندے خاں، ذاکر الدین آف اودے پور، بھاسکر راؤ آف اودے پور وغیرہ

۴۔ ہندوستانی موسیقی کے ساز

۵۔ سازندے ۔ بسم اللہ، شہنائی ۔ بندو خاں، سارنگی ۔ احمد جان تھرکوا، طبلہ ۔ روی شنکر، ستار ۔ عبدالعزیز، وچتر وینا ۔ ولایت خاں، ستار ۔ عنایت خاں، ستار ۔ حافظ علی خاں، سرود ۔ علاؤ الدین خاں، سرود ۔ اجودھیا پرشاد، مردنگ وغیرہ

۶۔ فلمی موسیقی ۔ سہگل، لتا منگیشکر، طلعت محمود وغیرہ

۷۔ موسیقی کی ماہر خواتین ۔ ہیرا بائی بڑودکر ۔ گنگو بائی ہنگل ۔ سودھرشنا بھوسے ۔ رسولن بائی ۔ بیگم اختر ۔ سدھیشوری دیوی

۸۔ لوک گیتوں کی موسیقی ۔ پہاڑی ۔ راجستھانی ۔ اندھرا ۔ پنجابی وغیرہ

۹۔ قوالی

۱۰۔ کرناٹک میوزک

۱۱۔ امیر خسرو ۔ تان سین ۔ سدا رنگ ۔ ادا رنگ اور موسیقی کے بڑے بڑے موجد اور فن کار

۱۲۔ انہیں موضوعات سے متعلق نادر تصاویر کسی صاحب کے پاس ہوں تو وہ بھی مدیر رسالہ سے خط و کتابت فرمائیں۔

(ادارہ)

سروش عسکری طباطبائی

بہارِ تغزّل

کسی کی اُلفت فروغ پاکر جہاں کو اپنا بنا رہی ہے — کرن جو پھوٹی تھی دل کی تہ سے، تمام عالم پہ چھا رہی ہے

حریمِ جاں میں مچل مچل کر، وہ یاد دُھومیں مچا رہی ہے — نفس میں کلیاں کھلا رہی ہے، لہو میں شمعیں جلا رہی ہے

محبت آنکھوں میں اشک بن کر کسی کی رنگت اڑا رہی ہے — کنول کے گوشوں میں چھپ کے شبنم، کرن کا سونا چرا رہی ہے

دلِ گرفتہ کو یاد اُس کی ٹہوکے دے کر جگا رہی ہے — تمام گلشن مہک رہا ہے، صبا وہ غنچہ کھلا رہی ہے

لبوں پہ سوتے میں مسکراہٹ کسی کے رہ رہ کے آرہی ہے — گلاب کی پنکھڑی پہ گویا، کرن پڑی جگمگا رہی ہے

طوافِ حُسنِ نگار کرکے، نگاہ آنکھوں میں آرہی ہے — پلٹ کے سیرِ چمن سے لیلیٰ، پھر اپنا محمل سجا رہی ہے

نظر سے بچ بچ کے ایک صورت، حریمِ دل میں سما رہی ہے — لجا لجا کر، نئی نویلی، دُلھن شبستاں میں آرہی ہے

ہزار آنکھوں کو بند کرلو، ہزار کانوں میں اُنگلیاں دو

ادا وہ آنکھوں میں پھر رہی ہے صدا وہ کانوں میں آرہی ہے

وہ رُوح کی آرزوئے مبہم وہ رازِ ناآشنائے عالم — کہ دل بھی جس کا نہیں ہے محرم، اُتری نظر گنگنا رہی ہے

ملی ہے عرضِ سخن کی رُخصت، رہی نہ جب گفتگو کی طاقت — حدیثِ ناگفتۂ محبت، لبوں پہ ٹھوکر سی کھا رہی ہے

گذشتہ باتوں کو بھول جاؤ، جو آسکو اب تو جلد آؤ — چراغِ اُمید بُجھ رہا ہے، نظر کی لَو جھلملا رہی ہے

گھٹا گلستاں پہ چھا رہی ہے، جوانی پھولوں پہ آرہی ہے

کہاں ہو، اس وقت تم بھی آؤ کہ روحِ موسم بلا رہی ہے

آگرہ کالج — دسمبر ۱۹۳۰ء

ہنسا کے صحنِ چمن میں آؤ، جھٹک کے بالوں کو مسکراؤ
سحر کی دیوی نکھر نکھر کر، چمن میں موتی لٹا رہی ہے

لٹیں جبیں سے ہٹاؤ تم بھی، جمالِ رعنا دکھاؤ تم بھی
نسیم کروٹ بدل رہی ہے، بہار گھونگھٹ اٹھا رہی ہے

رباب اپنا اٹھاؤ تم بھی، ہمک کے اک گیت گاؤ تم بھی
کہ بہ کے کروٹ سے آبجو بھی، چمن کو ہرا سنا رہی ہے

لگاؤ ماتھے پہ تم بھی قشقا، دکھاؤ گھونگھٹ سے تم بھی مکھڑا
جما کے بیندی سحر جبیں پر، شفق کا آنچل اڑا رہی ہے

کمانِ ابرو جھکاؤ تم بھی، خدنگِ مژگاں ملاؤ تم بھی
دھنک کو دیکھو کماں کی زہ پر، کرن کا ناوک چڑھا رہی ہے

حنائی ہاتھوں سے مل کے آنکھیں، ادا سے چٹکاؤ انگلیوں کو
تھرک تھرک کر ہر ایک پتی، ہوا میں تالی بجا رہی ہے

ہوا پہ جوڑے کے پیچ اڑاؤ، سنبھالو آنچل نظر اٹھاؤ
گھٹا میں بجلی چمک چمک کر، بہار اپنی دکھا رہی ہے

ادا سے پھیلا کے ہاتھ دونوں، لچک کے انگڑائی تم بھی توڑو
چمن میں جھک جھک کے ڈالی ڈالی انگلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

غرضکہ منزل پہ تم بھی آؤ، سروش کی بزمِ دل سجاؤ
جہاں کی ہر شے سمٹ سمٹ کر خود اپنے مرکز پہ آ رہی ہے

سروش اس آمدِ سخن کا نہ کس طرح ہوں میں دل سے شیدا
حسین خوابوں میں بسنے والی لطیف شعروں میں آ رہی ہے

وہ کیا تصور میں آ رہی ہے، بہار گلشن پہ چھا رہی ہے
روش روش لہلہا رہی ہے کلی کلی مسکرا رہی ہے

ہزار طوفانِ رنگ و نغمہ قدم قدم پر اٹھا رہی ہے
چمن کو وہ پائمال کر کے، چمن کی قسمت جگا رہی ہے

وہ جانِ فطرت ہمک ہمک کر رباب اپنا بجا رہی ہے
چمن کوئی جیسے رقص میں ہے، ندی کوئی جیسے گا رہی ہے

وہ شعلہ اندام و قوسِ ابرو، نظر سے بجلی گرا رہی ہے
کہ سات رنگوں کا تاج پہنے، سحر کھڑی مسکرا رہی ہے

سید رغیب حسین

خسرو سخن طوطیٔ شکر مقال امیر خسرو دہلوی

نام ابوالحسن، باپ کا نام امیر سیف الدین محمود شمسی، مگر دنیا میں امیر خسرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام معمولی آدمی تو کیا اچھے پڑھے لکھے بھی نہ جانتے ہوں گے۔ امیر سیف الدین ترکی قبیلہ لاچین کے ایک فرد تھے۔ جب چنگیز نے بلاد ماوراءالنہر، ہزارہ نزدیک بلخ[1] کے علاقہ میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا تو یہ اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر ہندوستان میں وارد ہوئے، اور پٹیالی (کہ چھوٹا سا قصبہ ضلع ایٹہ میں ہے) میں اقامت گزین ہوئے، اور عماد الملک کی دختر نیک اختر سے اُن کی شادی ہوگئی۔ عماد الملک دربار شاہی (دہلی) کے ایک بلند مرتبت امیر تھے۔

سیف الدین کے تین لڑکے تھے (۱) عزالدین علی شاہ (۲) حسام الدین (۳) ابوالحسن المعروف بہ امیر خسرو دہلوی۔ امیر خسرو ۶۵۱ھ میں پٹیالی میں پیدا ہوئے، ابھی ان کا سن سات سال اور بقول بعض نو سال کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، لیکن ان کے نانا عماد الملک نے ان کی کفالت اپنے ذمہ لی۔ امیر خسرو بچپن سے ہی نہایت ذہین تھے۔ مروجہ علوم و فنون کی تحصیل میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ زبانِ فارسی میں اُن کو مہارت تامہ حاصل ہوگئی، اور آغازِ جوانی میں ہی انھوں نے شعر کہنے میں کمال حاصل کر لیا۔

امیر خسرو نے دہلی کو محلِ اقامت قرار دیا، اور اسی مناسبت سے دہلوی مشہور ہوئے۔ شاہانِ دہلی کے درباروں میں اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ جہاں سے اُنھیں بڑے بڑے انعام و اکرام حاصل ہوئے، ان سلاطین کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ شاہزادہ محمد ابن غیاث الدین بلبن
۲۔ سلطان معزالدین کیقباد (۶۸۶ — ۶۸۹ھ)
۳۔ جلال الدین فیروز شاہ دوم بن جلال الدین (۶۸۹ — ۶۹۵ھ)
۴۔ سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵ — ۷۱۵ھ)
۵۔ سلطان قطب الدین (۷۱۶ — ۷۲۰ھ)
۶۔ غیاث الدین تغلق (۷۲۰ — ۷۲۵ھ)
۷۔ محمد دوم بن تغلق (۷۲۵ — ۷۵۲ھ)

تصوف میں خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاؒ[2] (متوفی سال ۷۲۵ھ) کا دامن تھاما، اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ؎

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

خسرو اپنے پیرِ طریقت کا بے حد احترام کرتے تھے، اور پروانہ وار فدا تھے، حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے تمام ارادت مندوں اور مریدوں سے زیادہ ان پر توجہ مبذول فرماتے تھے۔ امیر خسرو حضرت کے عاشقِ صادق تھے، ان کا تمام کلام ان کے والہانہ جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی قدر شناس نظر اس سے واقف تھی۔ امیر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ میرا صاحبِ اسرار ہے۔ میں بغیر اس کے بہشت میں قدم نہ رکھوں گا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر شریعت میں دو شخصوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں وصیت کرتا کہ میری قبر میں خسرو بھی دفن ہوں۔ خواجہ صاحبؒ اکثر فرماتے تھے کہ جب قیامت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لائے ہو، تو خسرو کو پیش کر دوں گا۔ جب دعا مانگتے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے، "الٰہی بسوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش!"

امیر خسرو کو دربارداری کی خدمت بھی بجا لانی پڑتی تھی تصنیف و تالیف

[1] بقول بعض شہر کش (ترکستان)

[2] مشائخ ہند میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا درجہ بہت بلند ہے۔ آپ شیخ الاسلام فرید شکر گنج کے مرید تھے، شیخ فرید الدین کا سلسلہ طریقت شیخ الاسلام مودود بن یوسف چشتی تک پہنچتا ہے۔

کا سلسلہ بھی جاری تھا، بنگالہ کی مہم پر جب غیاث الدین تغلق شاہ گیا تو اپنے ساتھ امیر خسرو کو بھی لے گیا۔ اسی اثنا میں حضرت نظام الدین اولیا نے رحلت فرمائی، جب امیر خسرو کو اپنے پیر کے وصال کی خبر پہنچی تو زار و قطار روتے ہوئے دہلی روانہ ہوئے۔ درباری خدمت ترک کے اپنی تمام دولت اور املاک راہ خدا میں نثار کر دی۔ اور اس کا ثواب اپنے پیر کو پہنچایا۔ اس کے بعد روضۂ مبارک پر مجاوری کرنے لگے۔ اور بعد چھ ماہ کے یعنی سال ۷۲۵ھ میں دہلی میں آپ واصل بحق ہوئے۔ اور اپنے مرشد کے پائینتی دفن ہوئے۔ ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امرا میں سے تھا تعمیر کرایا۔ اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ کہہ کر لوح پہ کندہ کرائی ؎

شد عدیم المثل یکتا تاریخ او　　　واں دگر شد طوطی شکر مقال

عام قاعدہ ہے کہ جب دنیا کے سامنے کوئی محیر العقول کارنامے سرزد ہوں تو اس کے لئے غیر معمولی وجوہ بھی پیدا کئے جاتے ہیں، اور اگر کسی کی طبیعت میں ملکہ اور دماغی قوت میں نشو و نما زیادہ پایا جائے تو اس میں عجیب و غریب رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ نفوسِ قدسیہ اور ارواحِ زاکیہ کی توجہ اور دعا بھی ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ عوام کی زبان پر چڑھ کر یہی برکات و فیوض امتداد کے ساتھ ساتھ طلسمی افسانے بن جاتے ہیں، اور اصل حقیقت بالکل پنہاں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی روایات امیر خسرو کے متعلق بھی زباں زد عوام ہو گئیں۔ ان میں سے چند ایک ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

قصبہ پٹیالی عرف مومن پور ضلع ایٹہ میں امیر سیف الدین (والد امیر خسرو) کی جاگیر تھی، یہاں ایک مجذوب کامل صاحبِ حال رہا کرتے تھے۔ خسرو کے والدین کی خدمت کیا کرتے، اور اُن کے معتقد بھی تھے، جب خسرو پیدا ہوئے تو ان کو لے کر ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کو دیکھ واقفِ اسرار مجذوب کی زبان پر یہ الفاظ آئے: "آوردی کسے را کہ از خاقانی دو قدم پیش خواہد برد"۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی "اخبار الاخیار" میں اس جملہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں: "قصد آں مجذوب از دو قدم مثنوی و غزل باشد" مطلب یہ ہے کہ خاقانی صرف قصائد میں استاد تھا، اور اس مولود مسعود کا کمال مثنوی اور غزل میں بھی ہوگا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ ایک روز امیر خسرو کو حضرت خضر کی زیارت نصیب ہوئی، تو اُن سے اپنی تمنائے دلی کا اظہار کیا کہ میرے کلام میں شیرینی پیدا ہو جائے۔ حضرت خضر نے فرمایا کہ "ایں بچہ شیراز برد" یعنی کلام میں مٹھاس تو شیخ سعدی شیرازی کو مل چکی۔ امیر خسرو اس جواب سے مایوس ہوئے، اور یہ واقعہ اپنے پیر روشن ضمیر کی خدمت میں عرض کیا، حضرت نظام الدین اولیا نے فرمایا کہ شکستہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ آپ نے چند ٹکڑے مصری کے خسرو کے سر پہ سے نچھاور کئے اور ایک ٹکڑا آپ کے منہ میں بھی ڈال دیا۔ اسی کی مٹھاس ان کے کلام میں پیدا ہو گئی۔

مولانا سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ "روزے در مدح سلطان المشائخ پیش سلطان المشائخ شعرے گذرانید فرمان شد کہ چہ میخواہی چوں ہوس سخن در نظم داشت شیرینی سخن خواست فرمان شد کہ آں طاس شکر کہ زیر کھٹ است بیار و بر سر خود نثار کن و قدرے ازاں بخور، امیر خسرو ہم چناں کرد لاجرم شیرینی سخن او مشرق و غرب عالم گرفت"۔

مولانا سید محمد کرمانی امیر خسرو کے معاصر ہیں، حضرت نظام الدین اولیا کے مرید اور خلیفہ اور امیر خسرو کے پیر بھائی، ان کی روایت سب روایتوں سے زیادہ قابل وثوق سمجھنی چاہیے۔

امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو کے کلام میں جو جامعیت اور شیرینی ہے صرف حضرت نظام الدین اولیا کی دعاؤں اور توجہ کی مرہونِ منت ہے۔ خسرو لکھتے ہیں:

من از دمے لعاب دہاں یافتم　　　کزاں گونہ آبِ دہاں یافتم
دو قطرہ ازاں در دوات افگنم　　　تظلم در آبِ حیات افگنم

امیر خسرو فنِ موسیقی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ "ستار" جو موسیقی کا ایک مشہور ساز ہے انہی کی ایجاد سے ہے۔ بعد میں اگرچہ اس میں کسی قدر ترمیم ہو گئی ہے، مگر اصلیت اپنی جگہ یہی ہے۔ خوشنویسی اور فنِ خوشنویسی میں بھی کامل استاد تھے۔ موسیقی میں نایک کا خطاب حاصل کیا، ان کے بعد پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا۔

اس شاعرِ اعظم نے کثرت سے اشعار کہے ہیں۔ دولت شاہ سمرقندی اس بات کا معتقد ہے کہ خسرو نے قریباً ایک کروڑ بیت نظم کئے جیسا کہ بایسنغر تیلدار کی بلیغ سے امیر خسرو کا کلام جمع کیا جس کی تعداد ایک لاکھ

بیس ہزار بیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو ہزار بیت خسرو کی غزلیات سے ایک جگہ سے ہاتھ آئے کہ اُن کے دیوان میں نہ تھے۔ جب یہ سمجھ لیا گیا کہ ان تمام اشعار کا جمع کرنا ناممکن اور سعیٔ لاحاصل ہے تو اسے ترک کر دیا گیا۔ امیر خسرو نے ایک رسالے میں خود تحریر کیا ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ بیت سے کمتر اور چار لاکھ سے بیشتر ہیں۔ خسرو کو باری تعالیٰ نے ایسا دماغ ودیعت کیا تھا کہ جو ایجاد مضامین کا خزانہ تھا۔ تصانیف کی کثرت ایسی ہے کہ کسی سے سمیٹے نہ سمیٹا گیا۔

او حدی نے "تذکرۂ عرفات" میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ نادر مجموعۂ کلام آج کل ناپید ہے۔ خسرو کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی، فارسی اور عربی میں کامل تھے۔ ترکی اور فارسی تو ان کی اپنی زبانیں تھیں۔ لیکن عربی میں بھی اُنھیں کمال حاصل تھا۔ سنسکرت کے بھی ماہر ہیں۔ مثنوی "نُہ سپہر" میں تواضع کے لہجے میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "من قدرے برسر ایں کا مشم"۔

شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ چنانچہ ایک کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی ہے۔ اس میں زیادہ تر صنائع و بدائع پر طبع آزمائی کی ہے، اور اپنی طباعی اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے،

ایران میں جس قدر باکمال شعرا گذرے ہیں، خاص خاص اصناف سخن پر کمال رکھتے تھے۔ فردوسی اور نظامی مثنوی لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ انوری اور کمال کا نام قصائد کے لئے مشہور رہے۔ سعدی اور حافظ غزل کے میدان کے شہسوار ہیں۔ جب یہ لوگ کسی دوسری صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو ان کا کلام بہت پھیکا اور ماند پڑ جاتا ہے۔ مگر جب ہم امیر خسرو کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو تینوں اصناف سخن پر یکساں گامزن پاتے ہیں۔ مثنوی، قصائد اور غزل کہنے میں وہ ایک ہی سا درجہ رکھتے ہیں۔ نظامی کی مثنوی کے جواب میں خسرو سے قبل کسی نے اس صنف پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ اور نظامی خاتم مثنوی سمجھے جاتے تھے۔ مگر خسرو نے ثابت کر دیا کہ نظامی کے بعد اگر کسی کو اس پر قدرت ہے تو انہی کو ہے۔

غزل میں وہ سعدی کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ قصائد میں کمال اور ظہیر سے ٹکر لیتے ہیں، اگرچہ اس صنف میں اُن کو زیادہ شہرت حاصل نہ ہوئی۔

مثنوی میں خسرو کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے بیان میں صفائی اور سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ الفاظ کی موزونیت اور ندرت، بندش کی نفاست، خیالات کی ہمواری، عبارت کی روانی، مثالوں کی بھرمار، تمثیلوں کی برجستگی، پند و مواعظ میں دلچسپی اور شیریں بیانی صاحب ذوق کو گرویدہ کر لیتی ہے۔

باعتبار مضامین مثنوی کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں۔ رزمیہ، بزمیہ اور تصوف، اس تقسیم کے لحاظ سے فردوسی کا کلام "شاہنامہ" ایک رزمیہ نظم ہے۔ اس میں رزم کی تصویر جیسی اُس نے کھینچی ہے آج تک اس کا کوئی مقابل نہ ہو سکا۔ فردوسی کو رزمیہ مثنوی پر جو قدرت حاصل تھی وہ بزم پر نہ تھی۔ محمود کے دربار سے جب وہ شکستہ خاطر ہو کر بھاگا ہے تو یوسف زلیخا لکھی۔ لیکن اس سعی میں اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بعض اصحاب اس خامی کو اُس کی پریشانی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے ماننے میں کلام ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ جس قلم سے رستم و سہراب اور بہمن و اسفندیار کے کارنامے ادا ہوتے ہوں، کیوں کر ممکن ہے کہ لیلیٰ کی اداؤں کو نوکِ زبان پر لا سکے۔ عشق کے میدان میں فردوسی کا قلم اپنے عجز کا معترف ہے۔

صوفیانہ و اخلاقی مثنویاں لکھنے کے لئے قدرت نے رومی، حکیم سنائی، خواجہ فریدالدین عطار اور مولانا روم کو چُن لیا تھا لیکن بزم اور عاشقانہ مثنوی کے لئے قدرت نے ایک اور ہستی کو منتخب کر لیا تھا۔ یہ ہستی مولانا نظامی گنجوی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی۔ ان سے پیشتر اس صنف سخن پر اسلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے، مگر رنگینی اور مرقع کاری مولانا کے قلم میں مقدر ہو چکی تھی۔ مولانا نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ غزلیں کہیں، قصائد لکھے، مگر ان کا اصل میدان مثنوی ہی ہے، اور وہ بھی بزم آرائی کے مضامین جس میں انھوں نے اپنی روانیِ طبع دکھائی ہے، اور عجیب عجیب گل بوٹے کھلائے ہیں، اس صنف سخن میں جو تشنگی تھی اسے نظامی کے چشمۂ فیض سے سیرابی ہوئی۔

مولانا نظامی سے قبل مثنوی کے لئے تین بحریں مخصوص تھیں۔ شعرا انہی تین بحروں کو کام میں لاتے تھے، مولانا نے ان پر دو بحروں کا اضافہ کیا۔ جو اخلاف میں اتنی ہی مقبول ہوئیں جیسی کہ پیشتر کی تین بحریں مقبول تھیں، اور ان بحروں کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی۔

خسرو نے اپنی خداداد قابلیت کو کام میں لاکر پانچ بحروں پر دو مزید کا اضافہ کیا، اور اس طرح مثنوی کی سات بحریں ہوگئیں ۔ اس کے بعد خسرو نے ایک مثنوی "نہ سپہر" لکھی، اس میں دو نئی اور بڑھائیں ۔ اس طرح گویا خسرو نے مثنوی کو چار نئی بحریں عطا کیں۔

مولانا نظامی کے زمانے تک عنوان سادہ ہوا کرتے تھے۔ مثلاً حمد، نعت، مدح سلطان وغیرہ، مگر خسرو نے اس میں بھی ایک جدّت پیدا کی، اور اپنی مثنویوں میں عنوان کو ایک عجیب دل کش و رنگین نثر میں لکھا ہے۔ اس طرح عنوان قائم کرنے سے ایک لطف یہ پیدا ہوا کہ پڑھنے والے کو تکان پیدا ہونے نہیں پاتا، اور مذاق میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

خسرو کی قدر دانی جو بادشاہوں نے کی ہے اُس کی ایک مثال یہ ہے کہ قطب الدین خلجی نے مثنوی "نہ سپہر" کے صلے میں ہاتھی کے وزن سے ان کو سونا تول دیا۔ زمانۂ مابعد میں بھی اس کی عظمت و عزت میں کمی نہ آنے پائی۔ چنانچہ جہانگیر نے خسرو کا تغلق نامہ نامکمل پایا۔ اس کے چند اوراق فنا ہو چکے تھے تو اس کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ کسی طرح یہ مثنوی مکمل ہو جائے۔ شعرائے دربار کو حکم دیا کہ طبع آزمائی کریں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ حیاتی کا کلام بادشاہ نے پسند کیا۔ اگرچہ خسرو کے کلام میں پیوند لگانا تو ناممکن تھا، مگر حیاتی کے کلام کی شائستگی اور متانت اس درجہ پر تسلیم کی گئی، اور اس کا کلام پیوند کر دیا گیا، اس کے صلے میں حیاتی کو چاندی سونے میں تلوایا گیا۔

خسرو کے کلام کی تاثیر دلوں کو گرما دیتی ہے، چونکہ وہ خود ایک صاحبِ دل تھے اُن کے دل سے جو بات نکلتی تھی سراپا تاثیر بن جاتی تھی، اور ہر ایک کو تڑپا دیتی تھی۔ تزک جہانگیری اور داغستانی میں ایک چشم دید معتبر روایت موجود ہے کہ جہانگیر نے صوفیہ کو مجلسِ سماع کی دعوت دی، قوال نے امیر خسرو کا یہ شعر گانا شروع کیا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے   من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

اس مجلس میں مولینا علی احمد مہرکن جو نشانی تخلص کرتے تھے اس وقت وجد میں آئے۔ جہانگیر نے اس شعر کا مطلب پوچھا۔ مولانا اسی طرح رقص کرتے ہوئے جہانگیر کے سامنے گئے اور فرمایا کہ ہندو اپنے کسی تہوار میں جوق در جوق دریا کے کنارے جمع ہو رہے تھے اور غسل میں مشغول تھے حضرت نظام الدین اولیا بھی اس وقت سیر کرتے ہوئے اس طرف گذرے، ان لوگوں کے مذہبی جوش کو دیکھ کر حضرت محبوب الٰہی نے خسرو کی طرف جو ہمرکاب تھے اشارہ کر کے فرمایا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اتفاقاً حضرت شیخ المشائخ کے سر مبارک پر ٹوپی کج تھی، خسرو نے فوراً دوسرا مصرعہ

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

کہہ کر شعر پورا کر دیا۔ اس روایت کو ختم کر کے مولانا احمد علی اپنے سر پر ہاتھ لے جانا چاہتے تھے کہ اپنی ٹوپی کو اسی طرح کج کر کے بادشاہ کو دکھلائیں کہ حضرت شیخ المشائخ کی ٹوپی جس طور پر تھی۔ لیکن ہاتھ اُٹھاتے ہی وجد کا ایک عالم طاری ہو گیا، اور ایک نعرے کے ساتھ جاں بحق ہو گئے۔

سیر الاولیا میں منقول ہے کہ ایک روز سلطان الاولیا محبوب الٰہی کے سامنے امیر خسرو کے صاحبزادے نے امیر خسرو کی ایک غزل پڑھی، جب اس شعر پر پہنچے کہ ؎

خسرو تو کیستی کہ درآئی دریں شمار   کیں عشق تیغ بر سرِ مردانِ دینِ دہ است

حضرت محبوب الٰہی کی روتے روتے یہ حالت ہوئی کہ آپے سے گزر گئے۔

امیر خسرو کے کلام پر جب نظر کی جائے تو اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

(الف) دیوان

دیوان امیر خسرو پانچ ادوار پر مشتمل ہے جو ذیل میں دئے گئے ہیں۔

۱ - تحفۃ الصغر۔ اس میں بچپن اور آغاز جوانی کا کلام ہے۔ اس میں قصائد، غزلیات، ترجیع بند، سلطان غیاث الدین بلبن اور اُس کے لڑکے کی مدح میں، شیخ نظام الدین اولیا کی مدح میں قصائد درج ہیں۔

۲ - وسط الحیات۔ نام سے ظاہر ہے کہ یہ جوانی اور ادھیڑ عمر پر پہنچنے کا کلام ہے جس کا زمانہ ۲۰ اور ۳۰ سال کا درمیانی زمانہ قرار دے سکتے ہیں، اس میں شیخ نظام الدین اولیا۔ نصرۃ الدین سلطان محمد بلبن کے بڑے بیٹے (مقتول ۶۸۳ھ) کی مدح میں قصائد ہیں۔ یہ شہزادہ امیر خسرو کا مربی تھا۔ نیز سلطان معز الدین کیقباد کی مدح میں بھی قصائد ہیں۔

۳ - غرۃ الکمال۔ اس میں ۳۰ اور ۴۰ سال کے درمیانی زمانے کا کلام ہے۔ یہ اس زمانے کا کلام ہے کہ جب امیر خسرو کا کلام اپنے عروج

پہنچ چکا تھا۔ اس میں بجائے عربی کے فارسی زبان میں شعر کہنے کی خوبی پر مقدمہ لکھا ہے، اور ایران کے بزرگ ترین شعرا مثل سنائی، خاقانی، سعدی و نظامی کی زمینوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ شیخ نظام الدین اولیا و سلطان معزالدین کیقباد و جلال الدین فیروز شاہ (۶۸۹ - ۶۹۵ھ) اس کے جانشینوں رکن الدین و علاؤ الدین اور اسی قسم کے دوسروں کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اس دور میں قصائد، ترجیع بند اور قطعات شامل ہیں۔

۴۔ **بقیہ نقیہ**۔ نام سے ظاہر ہے کہ یہ پیرانہ سالی کا کلام ہے۔ اس میں علاؤ الدین محمد شاہ اور اس کے بیٹے اور دیگر امرا کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔

۵۔ **نہایۃ الکمال**۔ یہ امیر خسرو کے آخری حصۂ عمر کے کلام پر مشتمل ہے اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کی مدح میں قصیدہ، اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کا مرثیہ ہے۔

(ب) خمسہ

امیر خسرو نے خمسہ نظامی کی تقلید میں خمسہ لکھا ہے۔ اس میں حسب ذیل منظومے ہیں۔

۱۔ **مطلع الانوار**۔ مخزن الاسرار نظامی کے جواب میں، اس میں بیشتر اشعار دینی اور اخلاقی ہیں۔ یہ ۶۹۸ھ میں اختتام پر پہنچی۔ اور سلطان علاؤ الدین محمد شاہ کے نام پر لکھی گئی ہے۔

۲۔ **شیریں و خسرو**۔ مولانا نظامی کی خسرو و شیریں کے جواب میں یہ بھی ۶۹۸ھ میں سلطان علاؤ الدین کے نام پر لکھی گئی، اس نظم کے آخر میں ایک پند ہے جس میں اس کے بیٹے مسعود کی طرف خطاب ہے۔

۳۔ **مجنوں و لیلیٰ**۔ مولانا نظامی کی لیلیٰ و مجنوں کے جواب میں مذکورۂ بالا سال ہی میں سلطان علاؤ الدین ہی کے نام پر نظم کی۔ اس منظومہ کے اشعار کے ابیات بہت مؤثر ہیں، امیر خسرو نے اپنی والدہ اور اپنے بھائی کی وفات پر لکھے ہیں۔

۴۔ **آئینۂ سکندری**۔ مولانا نظامی کے اسکندر نامہ کے جواب میں۔ یہ بھی ۶۹۹ھ میں سلطان علاؤ الدین کے نام پر لکھی۔

۵۔ **ہشت بہشت**۔ مولانا نظامی کی ہفت پیکر کے جواب میں، یہ بہرام کی داستان پر مشتمل ہے۔ ۷۰۱ھ میں اس کو نظم کیا۔ اس منظومے کے آخر میں امیر خسرو نے کہا ہے کہ تمام خمسے تین سال میں نظم کر ڈالے اور

قاضی شہاب الدین نے جو اس زمانے کے فضلا میں سے تھے ان کا مطالعہ اور تصحیح کی ہے۔

امیر خسرو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ باپ ترک اور تازہ وارد ہندوستان ہوئے تھے، ان کی زبان ظاہر ہے کہ ترکی ہوگی۔ یا وہ زبان جو بلاد ماوراء النہر میں بولی جاتی، اور فارسی سے ملتی جلتی ہوگی۔ والدہ ان کی ہندی نژاد تھیں۔ اس ماحول میں خسرو کی زبان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ فارسی اور عربی میں انھوں نے ایسی استعداد پیدا کرلی کہ جب ان کی شاعری کی دھوم ہندوستان کی سرحدوں کو پار کرکے ایران میں پہنچی ہے تو ایرانی شعرا کو ان کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔

خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

شیخ سعدی، شاہزادہ محمد کو امیر خسرو کے حسن صحبت پر مبارک باد بھیجتے ہیں، اور اپنی تصانیف کا نسخہ بھیج کر معذرت کرتے ہیں کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے حاضری دینے سے مجبور ہوں، ساتھ ہی لکھتے ہیں کہ خسرو جوہر قابل ہیں ان کی تربیت کی جائے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ خسرو کی عمر ابھی تیس برس کے لگ بھگ تھی۔

زمانے کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی اولوالعزم شخصیت ترقی کی منزل پر پہنچ جاتی ہے، تو اس کے بہت سے دشمن اور حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایران میں جہاں اکابر شعرا نے خسرو کے کلام پر تحسین کے نعرے لگائے ایک بدنام زمانہ شاعر عبید زاکانی اپنے قومی تعصب کو نہ چھپا سکا، یہ خسرو کا ہمعصر ہے، اپنے دل کے جلے پھپھولوں کو یوں پھوڑتا ہے ؎

غلط افتاد خسرو را ز خامی — کہ سکبا پخت در دیگِ نظامی

خسرو، مادرزاد شاعر تھے۔ ان کے باپ دادا صاحب سیف تھے اور میدانِ کارزار کے جری سپاہی، تیغ زنی ان کا پیشہ تھا۔ قدرت نے امیر خسرو کی طبیعت میں شعر و شاعری کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھر دئے تھے۔ اپنی خاندانی روایات کے برعکس وہ ایک دوسرے راستے پر گامزن ہو اور ایسے جوہر بکھیر گئے کہ جس کا احصار مشکل ہے، اور دنیا آج تک ان

جواہر پاروں کو چن لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر یہ سب سعی لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "دوران صغر سن کہ دندان می افتاد سخن ہمی گفتم و گوہر از دہانم میریخت"۔

ایک عرصے تک اساتذہ کے کلام کا تتبع کرتے رہے۔ لیکن بعد میں اپنا کلام اساتذہ کو دکھانے لگے، اس کی شہادت ہشت بہشت سے ملتی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب شہاب کی صحت کردہ ہے۔

نظامی کی نسبت امیر خسرو لکھتے ہیں ؎

زندہ است بعجز اوستادم　　وز نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی کی نسبت بھی لکھتے ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

امیر خسرو نے غرۃ الکمال میں فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دینے کے کئی وجوہ بیان کئے ہیں۔

۱- عربی میں ایسے اضافات ہیں کہ اگر وہ فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے۔

۲- عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے کئی کئی مترادف الفاظ ہیں، اس لئے شاعری آسان ہے لیکن فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں۔

۳- عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔ عربی شاعری کا مدار صرف قافیہ پر ہے۔ مگر ان سب وسعتوں کے باوجود عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

ان دلیلوں کو زیر نظر رکھ کر امیر خسرو نے فارسی شاعری کو عربی پر ترجیح دی ہے۔

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ خسرو قدما کے کلام کے پیرو تھے، اور جب تک انھوں نے باقاعدہ اصلاح لینی شروع نہیں کی، اساتذۂ سلف کے کلام کو سامنے رکھ کر مشق سخن کرتے تھے۔ چنانچہ غزل میں انھوں نے سعدی کی اتباع کی ہے، مثنوی میں نظامی کے پیرو ہیں۔ پند و نصائح میں سنائی اور خاقانی کا رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ قصائد میں کمال اسمٰعیل اور رضی الدین نیشاپوری کا رنگ جھلکتا ہے۔

امیر خسرو کو اعتراف ہے کہ انھوں نے نظامی کی پیروی کی ہے، اور رزم، بزم اور تصوف کے مضامین پر انھیں کی تقلید کی ہے، اور انھیں نمونہ پر طبع آزمائی کی ہے، اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ دربارداری کی مصروفیتوں کے ساتھ انھیں اتنا وقت کہاں سے ملتا ہوگا کہ وہ شعر و شاعری کریں، اور حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ پانچ مثنویاں یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، مجنوں لیلیٰ، آئینۂ اسکندری، ہشت بہشت صرف سوا دو برس میں تمام کر ڈالیں، جبکہ وہ خود لکھتے ہیں ؎

مسکین من مستمند بے ہوش　　از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام　　در گوشۂ غم نگشتہ ام آرام
با خم ز برائے نفس خود رائے　　پیش چو خمے ستادہ برپائے
تا خون نہ رود ز پائے تا سر　　دستم نشود ز آب کس تر

مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا کلام لاکھوں ابیات پر پھیلا ہوا ہے تو تعجب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان کی طبعی ذہانت، طبیعت کی موزونی، قادر الکلامی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ اور سب سے بڑی خوبی اُن کی جزئیات پر نظر ہے، جو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ شیریں کلامی کا یہ حال ہے کہ اُن کے اشعار پڑھتے جاؤ پھر بھی طبیعت کو سیری حاصل نہیں ہوتی۔

ایک اور بڑی خصوصیت اُن کے کلام کی یہ ہے کہ لطائف نظم کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیتیں اپنی جگہ پر قائم رکھی ہیں۔ نثر میں بھی اگر ان کو کوئی لکھنے بیٹھتا تو شاید اتنی جزئیات پر نظر رکھنا دشوار بلکہ محال تھا، قادر الکلامی کا یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

امیر خسرو کے کلام کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ انھوں نے صحیفۂ فطرت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ واقعہ کا نازک سے نازک پہلو بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ واقعہ کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور دل میں اُتر جاتی ہے مثلاً پانی برس رہا ہے، عاشق اور معشوق میں جدائی ہونے والی ہے۔ عاشق کی آنکھیں جدائی کے غم سے برسات کی جھڑی کا سماں باندھ رہی ہیں معشوق بھی اس صدمے سے متاثر ہے۔ اس کو امیر خسرو کیسے رقت انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں ؎

ابر باراں و من و یار ستادہ بوداع　　من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

اس بات کو اگر کوئی نثر میں ادا کرنا چاہے تو صفحے کے صفحے سیاہ کرڈالے۔ مگر جو بات

اس ایک شعر میں ادا کر دی ہے ، وہ اس میں ادا نہیں ہو سکتی ، ایک ایک لفظ غور کرنے کے قابل ہے ۔

امیر خسرو کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ نظم کی کوئی ایسی قسم نہ تھی کہ جس پر انھوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو ۔ ان کا قلم دریا کی موجوں کی مانند لہریں مارتا تھا ۔ اُن کے کلام میں ہر دو رکے محاسن موجود ہیں ۔ سادگی و استواری ان کے کلام میں بکثرت ہے ۔ رنگینی ، لطافت اور ملائمت ان کا کمال ہنر ہے ۔ امیر کا ناصحانہ پیرایہ بھی بڑا دلپذیر ہے ، ادنیٰ ادنیٰ باتوں سے سبق لیتے ہیں ، اور نہایت خوبصورتی سے ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔

غزل کے لئے درد ، سوز و گداز ، شکستگی و نیاز ، عشق کی ہنگامہ آرائی ، حُسن کی دل کشی و دلآرائی و دل رُبائی کے بیان کی ضرورت ہے ، اور شاعر اس طرح ادا کرے کہ محاورے اور روزمرہ کی بول چال میں فرق نہ ہو ، اسلوب بیان نہایت شگفتہ ہونا چاہیئے تشبیہ میں لطافت ایسی ہو کہ جذبات میں ہلچل پڑ جائے ، عشق کے واقعات اس طرح بیان کئے جائیں کہ سننے والے کو عاشق کی حالت زار پر ترس آجائے ۔ یہی کمال شاعری ہے معشوق اپنے بناؤ سنگھار میں معروف ہے ، اس کو اس کے سوا کوئی غرض نہیں ، اس کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

گل چہ داند کہ حالِ بلبل کیست   او ہمیں کارِ رنگ و بو داند

عاشق کے سامنے سے معشوق گذرتا ہے ، عاشق کے دل پر بجلی گرتی ہے طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے ۔ استغاثہ کرتا ہے تو نہ قاضی داد رسی کرتا ہے نہ مفتی ، اس کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

کافرے رفت و دلم غارت کرد   شہرِ اسلام دمرا داد نبود

عاشق کی آنکھوں میں آنسو دریا کے پانی کی طرح موجزن ہیں ، جوش کا یہ حال ہے کہ سکون آنے ہی نہیں پاتا ، امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

میروی و گریہ می آید مرا   صبر کن چنداں کہ باراں بگذرد

معشوق جانا چاہتا ہے ، عاشق کی آنکھوں سے آنسو نکلتے ہیں ، عاشق کہتا ہے کہ اگرچہ تجھے میرے پاس بیٹھنا ناگوار ہی لیکن اتنی دیر صبر کر کہ پانی ختم ہو جائے تو چلے جانا ۔

امیر خسرو کی غزلیات پڑھ کر دل ہل جاتے ہیں ۔ بیقراری ، ناکامی ، انتظار ، مایوسی ، پریشانی کی جو تصویریں انھوں نے کھینچی ہیں ، ممکن نہیں کہ دل متاثر ہوئے بغیر رہ جائے ۔ چند غزلوں کے اشعار کو یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

از جانِ من آرام رفت آرامِ جانِ من کجا   بجرم نشانِ فتنہ شد فتنہ نشانِ من کجا

آمد بہار و مشک دم سنبل دمید و لالہ ہم   سبزہ بصحرا از و قدم سرو روانِ من کجا

در کارِ غم شد سو یہم بے پردہ شد ستو یہم   تلخ است عیش از دوریم شکر فغانِ من کجا

ہر دم جگر در سوز و تاب از دیدہ ریزم خون ناب   اینک مے و اینک کباب آں میہمانِ من کجا

گلِ نو رسید و بوئے ز بہارِ من نیامد   چہ کنم نسیمِ گل را چو زیارِ من نیامد

دلِ من چرا چو غنچہ نہ شود دریدہ صد جا   کہ صبا رسید و بوئے ز بہارِ من نیامد

اگرائے حریف داری نظرے برُوئے یارے   تو بہارِ خویش کن کہ بہارِ من نیامد

بہ شب نشاط یارا چہ خبر تر از خسرو   کہ بجانبِ تو روزے شبِ تارِ من نیامد

خسرو بحروں اور قافیوں کے استعمال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ، کتنی ہی مشکل زمین ہو ایسے ایسے الفاظ چن کر استعمال کرتے ہیں کہ روانی میں ذرا فرق نہیں پڑتا ۔ ذیل کی غزل سے ان کی روانیِ طبع کا اندازہ کیجئے ۔

سروے تو در اُچہ[1] و در ٹتہ نباشد   گل شکلِ رخِ خوب تو البتہ نباشد

دوزند قبا بہر قدت از گلِ سوری[2]   تا خلعتِ زیبائے تو از لتہ نباشد

در جنتِ فردوس کسے راہ گزارند   تا داغِ غلامیِ تو اش پتہ نباشد

لقمانِ مسکیں نکند میل بہ جنت   در صحنِ بہشت ار طبق پتہ نباشد

ایں حسن و لطافت کہ تو کافر بچہ داری   در چین و خطا و ختن و ختہ نباشد

ساقیا مے دہ کہ امروزم سرِ پیمانگیست   دور بر گرداں کہ مرگم از تہی پیمانگیست

من برغبت جاں ہم تو ہمت آری بزنم   ایں عنایت در میانِ دوستاں بیگانگیست

شمع شیریں چشیدست از سبو و باک نیست   لذت از آتش گرفتن مذہبِ پروانگیست

کج کلہا تنگ قبا ئے کیستی   لابہ گرا و دلبرا عشوہ نمائے کیستی

زیر کلاہ جعد تر تا کمرت کشیدہ سر   بستہ بہ چابکی کمر چست قبائے کیستی

مرکبِ ناز کردہ زیں دادہ بغمزہ تیغ کیں   ساختہ آمدہ چنیں تا ز برائے کیستی

سینہ بند جائے تو دیدہ بزیر پائے تو   با ہمہ در ہوائے تو تو بہ ہوائے کیستی

خسرو خستہ را سخن بستہ شد از تو در دہن   طوطیِ شکریں سخن نغمہ سرائے کیستی

---

[1] اُچہ ٹتہ دو مشہور مقامات قدیم ہند کے ۔ [2] سوری ، گہرے سرخ رنگ کا گلاب کا پھول

خلیل الرحمن اعظمی

نذرانے

اور تو کیا اب تم کو بھیجوں اپنی چاہت کے نذرانے
اُلجھے اُلجھے سے ہیں یہی بس میرے دُکھ کے تانے بانے

میں نے اپنی ساری پُونجی، اپنی جیون بھر کی کمائی
اپنے کچھ سپنوں کی خاطر نگر نگر میں جا کے لُٹائی

کیسے کیسے چہرے دیکھے، کیسے کیسے بھید ٹٹولے
کس کس در پر صدا لگائی، کتنے ہی دروازے کھولے

سیدھا سادا بھولا بھالا بن کر کتنے دھوکے کھائے
کتنے دھبّے بدنامی کے میں نے اس ماتھے پہ لگائے

کتنی جھوٹی باتیں کی ہیں اپنے نفس کو بہکایا ہے
اپنی ہر ہر ناکامی پر اپنے آپ کو سمجھایا ہے

کتنی خوشی محسوس ہوئی ہے اپنا غصّہ پی لینے پر
پھر بھی کتنی لعنت بھیجی باتیں سہہ کر جی لینے پر

مجبوری میں پڑ کے کیا ہے سجدہ کتنے شیطانوں کو
دل پہ پتھّر رکھ کے کہا ہے عاقل کتنے نادانوں کو

میرا پھول سا کومل چہرہ جب بھی قدر کمھلایا ہے
آئینے کو جھوٹا کہہ کر اپنے من کو بہلایا ہے

کتنے چرکے کھا کھا کر بھی چپ رہنے کی عادت ڈالی
ہنستے ہنستے پی ڈالی ہے غم کے زہر کی ہر ہر پیالی

بہہ نہ سکے جو آنسو میرے اُن کو بچا کر رکھا میں نے
یہ ہے ایک خزانہ میرا جس کو چھپا کر رکھا میں نے

اپنا کوئی مل جائے تو اُس پر راز یہ کھولوں گا میں
اس سے لپٹ کر جی چاہا تو آہیں بھر کر رو دوں گا میں

کنور سین

ہندوستان اور ایران کے باہمی ادبی تعلقات اور اثرات

بابِ اوّل ــ فصلِ اوّل

از منۂ قدیم ـــــ قدیم سنسکرت اور پہلوی زبانوں اور وید اور ژند اوستھا کی باہمی مشابہت اور یگانگی

یہ سلسلۂ مضامین فاضل مصنف (رائے بہادر کنور سین بار ایٹ لاء) کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کا باب اوّل ہے۔ موصوف بڑے کہنہ مشق ادیب اور انشاء پرداز ہیں۔ آپ مشرقی اور مغربی علوم کے ماہر اور مشہور زبان دان ہیں۔ پنجاب میں لا کالج کے پرنسپل رہے اور مختلف ہندوستانی ریاستوں میں چیف جسٹس اور وزیر قانون رہے۔ آج کل پیرانہ سالی کے دن دیرہ دون میں گزار رہے ہیں۔ امید ہے ان کی فاضلانہ تصنیف اہلِ علم اور ایران و ہندوستان کے ثقافتی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ (ادارہ)

ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات کئی ہزار سالوں اور تاریخی زمانے سے بہت پہلے سے کافی گہرے چلے آتے ہیں۔ قدیم آریہ اور ایرانی لوگ ابتداً ایک ہی اصل نسل سے ہیں۔ لفظ ایران بھی آر دھاتو یعنی جڑ سے نکلا ہے جس سے لفظ آریہ بنا ہے۔ آر کے معنی ہیں کاشت کرنا۔ ہل چلانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریہ قوم نے اپنی جمعیت کے لئے عجب الفاظ گھڑے اُس زمانے میں وہ کاشت کاری کے ذریعے سے غلہ پیدا کرنے اور گانوؤں میں رہنے سہنے لگے ہوں گے۔ گویا ارتقاء تہذیب کے کئی مدارج طے کر کے شہری زندگی اور تمدن کے مرحلے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ قدیم ترین ایرانی کتبوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اپنی قوم کو ایریوو دھنگوو ऐरियो वो धमवो. کہتے تھے۔ جس کا لفظی ترجمہ ہے آریہ نسل کا۔ ژند اوستھا میں بھی آریہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور دارا گشتاسپ جو چوتھی صدی قبل مسیح میں فرمانروائے ایران تھا اس کی قبر کے کتبے پر اس کو آرین اور آرین نسل کا بیان کیا گیا ہے۔

ان ہر دو اقوام کے قدیم ترین ادبی اور صحافتی آثار مسلّمہ طور پر ویدوں اور ژند اوستھا میں پائے جاتے ہیں۔ اور اگر وید کے منتروں اور رچاؤں کا ژند اوستھا کی گاتھاؤں کے ساتھ مقابلہ و مطالعہ کیا جائے یا اُن کا الحان سنا جائے تو اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں رہتا کہ ان ہر دو مجموعۂ آیات کے الفاظ، لغات، صرف نحو، خیالات، جذبات اور عقاید میں پوری پوری ہم آہنگی اور یگانگی ہے۔ اس سے صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں قومیں ابتداً ایک ہی قوم تھی۔ وہ لوگ ایک ہی زبان بولتے تھے اور ایک ہی خطۂ زمین پر آباد تھے اور ان کے طریقِ معاشرت یکساں تھے۔

سنسکرت اور ایرانی زبانوں کی یگانگی و مشابہت کی مثالیں دینا تحصیلِ حاصل کا مصداق ہوگا۔ کیونکہ آج کل سب تعلیم یافتہ لوگ جانتے ہیں کہ ان ہر دو زبانوں میں بے شمار الفاظ ایسے ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی ماں باپ کے دو بچے، نزدیکی رشتہ داروں مثلاً ماں باپ بھائی بہن وغیرہ۔ بدن کے اعضاء، گھریلو پالتو جانوروں اور خوردنی اشیاء وغیرہ کے لئے الفاظ بالکل مشابہ ہیں۔ مثلاً ماتری = مادر

پتری = پدر بھراتری = برادر دوہتری = دختر باہو = بازو۔
جانو = زانو جبھا = زبان شر = سر چکشو = چشم
ہست = دست پرشٹ = پشت سشر = خسر گھر = خر
اشو = اسپ گو = گاو مکشکا = مگس گودھوم = گندم
جو = جو

اسی طرح گنتی کے اعداد و شمار بھی یکساں ہیں مثلاً ایک = یک

دو = دو چتر = چہار پنچ = پنج شٹ = شش سپت = ہفت
نو = نو دش = دہ وغیرہ وغیرہ

افعال اور مصادر میں کثیر التعداد الفاظ یکساں ملتے ہیں۔ مثلاً کردن شنیدن، خفتن، چسیدن، پریدن، مردن وغیرہ وغیرہ

مندرجہ بالا لفظی مشابہتوں کی نسبت یہ یگانگی ژند اوستھا کی گاتھاؤں کے مطالعے اور مقابلے سے اور بھی زیادہ صریح اور واضح ہو جاتی ہے۔ جن میں نہ صرف الفاظ بلکہ تمام و کمال جملے، فقرے بلکہ پورے شلوک سنسکرت سے ژند زبان میں تحت اللفظ لکھے جا سکتے ہیں۔ چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:۔

ــ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اوّل باب ۴ صفحہ ۷۴ نیز ہندو سویلائزیشن مصنفہ ڈاکٹر رادھا کمود مکرجی صفحہ ۴۱۔

سنسکرت		ژنداوستھا
وشواُدڑکشوبھی وتی	=	وسپادرکش جینتی
وشوادرکشونشیتی	=	وسپادرکش نشیتی
یتھاشرنوتی ایشام واچم	=	یتھا ہنوتی ایشام واچم

مناوہ پماشیہ یا پرچیتا ای ما یاہ پری گاپاسئے میدھا اوتانہ ہستاہ آتواہ ۔ یتی ردھرسیہ چہ منسا آت وو دسور منساہ سوں رتیاہ	=	مت ماوپدیشیٔ یافرسرتاانہ یاد پیری جسای مزدا استانہ زاستو اٹ داواشا ارسے درہ یا کا نیما نگھا اٹ داو دنگے بیش نگھو ہرسے ماتا [1]

تت کوا پرشارتم میوحیہ اشر کوناہ جنیا تیارتسیہ پورا دیبہ کوناہ کم (سواہ) تارانشیچہ داد اوھوانم کو یو ماسم اکشیتی فرہیتی توت تا درک میدھا وسم اینی چہ وت توسے	=	تدھتوا پرسا ارشش مای داچا اہورا کسنا زاتھا پتیا اشا یاہ پورو دیو کسنا کو ینگ سٹا رتچا داد اووانم کے تاما ودکشیاتی ترے فستی تھوا اہمد مزدا دا ستیمی انیچا ود دیا ہ [2]

واضح ہو کہ یہ گاتھائیں بھی بمثل وید منتروں کے زیادہ تر نظم میں ہیں۔ ان کے الفاظ میں لمبے سُر والے حروف علت بکثرت پائے جاتے ہیں جو گانے کے لئے موزوں ہیں۔ رسم الخط بھی میخانی Cunciform تھا جو سنسکرت کی طرح بائیں طرف سے دائیں طرف کو چلتا ہے۔

نفس مضمون کے متعلق بھی کثیر التعداد مشابہتیں ملتی ہیں۔ مثلاً قدیم ایرانیوں کے کئی دیوتاؤں کے نام بھی ویدک دیوتاؤں کے ناموں سے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ھوم (سنسکرت سومؔ) ھور (سنسکرت سوریہ) مویرا (سنسکرت مترا) اھرمزدا (سنسکرت اُسرمیدھا) ایرانی لفظ ژند سنسکرت لفظ چھند اور لیسنا سنسکرت یجو یا یگیہ کا مترادف ہے۔

ویدوں میں تینتیس ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے یعنی آٹھ وسو वसु گیارہ ردر रुद्र بارہ آدیتہ आदित्य ۔ ایک اندر इन्द्र اور ایک پرجا پتی प्रजापति ۔ ان کے مطابق ژنداوستھا میں بھی تینتیس ایسی ہستیوں کو مانا گیا ہے جو مافوق الانسان خیال کی گئی ہیں۔ اور جن کو رتو نام دیا گیا ہے (لیسنا۔ I۔ ۱۵)

ویدوں میں ایک اور روایت یم راج اور دی وسوان کی مندرج ہے۔ اسی قسم کی ایک کہانی ژنداوستھا میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایرانی لٹریچر میں ان کا تلفظ بدل کر یم यम اور دی واسن विवस्वान ہو گیا۔

علاوہ ازیں ایک تمثیلی کہانی کا ویدوں میں ذکر آتا ہے کہ ترِتا یعنی اندر نے ایک خوفناک سانپ اھی نامی سے لڑائی کی تھی اور اس پر فتح پائی تھی۔ اسی کے مطابق ژنداوستھا میں بھی قصہ ملتا ہے۔ صرف ترِتا کے بجائے تھرتاؤتا اور اھی کے بجائے اژدی بن گیا ہوا ہے۔ رگ وید میں اھی کو ورتر نام بھی دیا گیا ہے جس کے لفظی معنی پردے کے ہیں۔ اور یہ کہانی ذومعنی ہے۔ ایک تو ظاہری معنی یہ ہیں کہ بادل سورج پر پردہ ڈال کر اس کو چھپا دیتے ہیں۔ مگر بالآخر سورج بادلوں کے پردوں یا اژدہاؤں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اندر یعنی سورج اپنے مخالف اھی یعنی بادلوں پر فتح پا لیتا ہے۔ اسی طرح نیکی کی طاقت بدی پر فتح یاب ہو جاتی ہے۔ ایرانی مسئلہ ثانویت یعنی تصور اہرمزد اور انگرا مینو یا اہرمن اسی قسم کے خیالات پر مبنی معلوم ہوتا ہے ایرانی لفظ اژدہا اسی لفظ اژدی داہک (سنسکرت اہی داہک) سے بنا ہے۔ ویدوں میں اندر یا سورج دیوتا کو ورتر یا بادلوں پر فتح یاب ہو جانے کی وجہ سے ورترھن یا ورترگھن (یعنی ورتر کو مار ڈالنے والا) بھی نام دیا گیا ہے۔ اسی خیال اور لفظ کو قدیم ایرانی عقیدے کی رو سے ورتھراگنا کہا گیا ہے۔ اسی طرح وید کے دو ملے جلے دیوتاؤں ناستیہ کا نام بھی اوستھا میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ بقول ڈاکٹر تارپورے والا ویدوں کے گندھرو اور کرشناؤ کے بالمقابل الفاظ گنڈاریوا اور کیریسانی بھی اوستھا میں پائے جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے ژنداوستھا کی تعلیم و تلقین ہندو آریوں کے ویدوں کے عقاید مذہبی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ دونوں قومیں قانون ابدی و قدرتی (ریت) کے قائل ہیں جس کی پابندی انسان پر لازم

[1] فاونٹین ہیڈ آف ریلیجن مصنفہ گنگا پرشاد اُپادھیائے
[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا گیارھواں ایڈیشن

ہے۔ دونوں اقوام ایک اعلیٰ ترین ہستی یعنی آتمایا اہرمزد کو ہی نوع انسان کے لئے معراجِ مقدس مانتی ہیں اور اس کی پرستش لازم سمجھتی ہیں۔ دونوں میں اخلاق کا اہم ترین عملی اصول منسا ۔ واچا ۔ کرمنا یعنی خیالات، الفاظ اور اعمال کی پاکیزگی ہے۔ آسمان پر سورج اور زمین پر آگ اور آسمان اور زمین کی درمیانی فضا میں بجلی اسی ذات پاک کے مظہر اور کرشمے ہیں اور اسی لئے پوجا پرستش کے لائق ہیں۔ رگ وید میں کثیر التعداد منتر سورج اور اگنی کی حمد و ثنا پر مشتمل ہیں۔ ژندا وستا کے یسنا کے باب ۳۶ کی پہلی فصل بھی اسی قسم کی ہے۔ آگ کے متعلق درج ہے کہ وہ اہرمزد کا مظہر اور نمایندہ ہے۔ جو بھڑکتے شعلوں میں نمودار ہوتا ہے۔

گائے نہ صرف انسان کو دودھ خوراک کے لئے دیتی ہے بلکہ اس کی نسل کھیتی باڑی کے لئے ضروریات سے ہے جس کے ذریعے سے اناج پیدا ہوتا ہے۔ اور جس پر مہذب انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ لہٰذا گائے کو متبرک جانور سمجھ کر اس کو ذبح کرنا پاپ یا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ گھوڑا نہایت کارآمد جانور ہے نہ صرف اغراضِ سفر کے لئے بلکہ اغراض باربرداری کے لئے بھی ایسا تیز رو اور جفاکش کوئی اور جانور نہیں۔ چنانچہ آریہ اور ایرانی ہر دو اقوام کے لوگ گھوڑوں کو عزیز رکھتے تھے اور خود اچھے شہسوار ہوا کرتے تھے۔ ہر دو ممالک کی صحافت میں گھوڑے کی تعریف کی جاتی رہی ہے۔ اشومیدھ یگیہ اسی امر کی یاد دلاتا ہے۔ اشیائے نوشیدنی میں سوم رس کا استعمال دونوں اقوام میں پایا جاتا ہے۔ جس طرح آریہ لوگ یگیہ وغیرہ کے موقعوں پر سوم رس پیا کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم ایرانی لوگ بھی اسی بیل یا بوٹی کا عرق نوش کیا کرتے تھے۔ اور اس کو ھوم کا نام دیتے تھے۔ رگ وید میں اس پودے کی جائے پیدائش کی بابت صرف اس قدر حوالہ ملتا ہے کہ یہ بوٹی سلسلہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی سوجاونت نامی میں پائی جاتی تھی۔ جو بقول ڈاکٹر زمر غالباً وادیٔ کشمیر کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔

جیسے آریہ ہندو لوگ تری مورتی (تین دیوتاؤں) یعنی برہما، وشنو اور مہیش اور اُن کی زوجگان لکشمی، سرسوتی اور درگا دیویوں کے معتقد تھے۔ اسی طرح ایرانی زرتشتی چھ مقدس ہستیوں کو مانتے تھے۔ جن کو امیشا سپنتا अमेशा स्पन्ता کا نام دیا جاتا تھا۔ اور جن میں سے تین بصیغہ مذکر اور تین بصیغہ مؤنث تھے۔ ان کو اہرمزد کی شعاعیں یا کرنیں خیال کیا جاتا تھا۔[۲]

عالم کون و مکاں کے مسبب الاسباب ہستی کے متعلق بھی رگ وید اور ژندا وستا کے عقاید یکساں ہیں۔ رگ وید کے دسویں منڈل کے مندرجہ ذیل منتروں میں اس کی ذات و صفات کو سوالات کی صورت میں بیان کیا ہے

हिरण्यगर्भः समवर्तताग्रे भूतस्य जातः पतिरेक आसीत् ।
सदाधार पृथिवी द्यामुतेमां कस्मै देवाय हविषा विधेम ॥

य आत्मदा बलदा यस्य विश्व उपासते प्रशिषं यस्य देवाः ।
यस्यच्छायाऽमृतं यस्य मृत्युः कस्मै देवाय हविषा विधेम ॥

यः प्राणतो निमिषतो महित्वैक इन्द्राजा जगतो बभूव ।
य ईशे अस्य द्विपदश्चतुष्पदः कस्मै देवाय हविषा विधेम ॥

گویا ان مکرر سہ کرر سوالوں کے جواب یہی دئے جاتے ہیں کہ ہماری دُعائیں ورندرانے صرف اسی ذاتِ واحد کے لئے واجب ہیں جو ہیرنیہ گربھ بقعۂ نور اور محیط کل ہے جس میں تمام عالم سمایا ہوا ہے۔ جو زندگی اور موت کا مالک اور قادرِ مطلق ہے۔ رگ وید کے نویں منڈل میں بتایا گیا ہے کہ اسی ہستی کو اندر، متر، ورن، اگنی اور بلند پرواز گرڑ وغیرہ کے ناموں سے پکارا گیا ہے۔ وہی پورش (ذات) پرجاپتی (مالک نوعِ انسانی) اور تد برہم (ذاتِ مطلق) ہے۔ جس کی طاقت سے یہ کائنات قایم اور قانونِ قدرت جاری ہے۔ اتھرو وید میں صریح طور پر درج ہے کہ وہ ہستی صرف ایک ہی ہے۔ نہ دو ہے نہ تین نہ چار نہ پانچ نہ چھ نہ سات نہ آٹھ نہ نو اور نہ دس۔ گویا کہ شمار بر طریق عشری بتانے کے علاوہ مسئلہ توحید بالتاکید

---

[۱] ملاحظہ ہو رگ وید منڈل ۱۰ سوکت ۸۰ منتر ۱۰۔ تین مجبوں کے ساتھ اگنی کو پوجتا ہوں۔ جو دیوتا ہے پرہ ہت ہے اور ہماری آہوتیوں کو دیوتاؤں تک پہنچاتی ہے اور اس کے پاس بے شمار دولت ہے۔

[۲] مطبوعہ انڈو ایرانی کا جلد نمبر ۴

کی تلقین ہے۔

اسی طرح ژند اوستھا میں بھی زرتشت اسی ایک ہستی کو یوں بیان کرتا ہے کہ "او۔ اہرمزدا میں تجھ سے پوچھتا ہوں۔ سچ بتا کہ سورج اور تاروں کے مدار اور طریقِ رفتار کس نے قائم کئے۔ کون ہے جو چاند کو گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ کون ہے جو نیچے زمین کو اور اوپر آسمان کو سنبھالے ہوئے ہے اور گرنے نہیں دیتا۔ کون ہے جو پانی کو سنبھالتا اور پودوں کو اگاتا ہے۔ کون ہے جو بادلوں کو تیز رفتاری بخشتا ہے اور کون ہے جو نیک دل پیدا کرتا ہے"۔ (اشاویتی گاتھا۔ یسنا XLIV-8)

ویدک آریہ لوگ زمانہ قدیم سے مسئلہ آواگون یعنی تناسخ کے معتقد رہے ہیں اُن کے نزدیک رُوحِ انسانی کرموں یعنی اعمالِ نیک وید کے مطابق بروئے قانون علت و معلول جنم لیتی یعنی جسمانی جسم اختیار کرتی ہے۔ تعلیم زرتشت میں بھی اعمالِ حسنہ پر بہت زور دیا گیا ہے[1] مگر مسئلہ تناسخ کی بابت ژند اوستھا میں صرف دو جگہ اس کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ یعنی یسنا (۴۹ - ۱۱) میں لفظ اُروان वरवम آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں "واپس آنا۔" جس کا مطلب آواگون ہی ہو سکتا ہے۔ یسنا (۱۰ - ۳۰) میں لفظ زیرنتے जायन्ते استعمال ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے ("وہ بار بار پیدا ہوتے ہیں")[2] واضح ہو کہ ایران کے اندر تیسری صدی عیسوی میں ایک بانیٔ دین زندیق مانی نے بھی اصولِ تناسخ کی صریح الفاظ میں تعلیم و تلقین کی جس کے اثرات دُور دُور تک پھیلے۔

جس طرح آریہ لوگوں میں چار ورن یا طبقے برہمن، کشتری، ویش اور شودروں کے تھے جن کے فرائض جداگانہ تھے اور جن کا حوالہ قدیم سنسکرت صحافت میں ملتا ہے بعینہ اسی طرح قدیم ایرانیوں میں بھی سوسائٹی چار پشترا اُمن یعنی طبقوں میں منقسم تھی۔ بروئے ژند اوستھا وہ چار پشترا حسب ذیل تھے۔

اوّل۔ اتھروان۔ جو بمثل برہمناں پیشوایانِ دین تھے۔

دوم۔ رتھا ایستا۔ جو کشتریوں کی طرح اہلیان سیف تھے۔

سوم۔ ویستریا خشومنت۔ جو ایران کے تجارت پیشہ ویش تھے۔ جن کا آبائی پیشہ تجارت یا زراعت تھا۔ اور

چہارم۔ ہیوتی۔ یہ لوگ ایران قدیم کے گویا شودر تھے جن کا فرض منصبی

---

[1] دیکھو یسنا باب ۳

[2] ملاحظہ ہو ڈاکٹر تارپوروالا کا مضمون مطبوعہ انڈو ایرانی کلچر۔

غزل

شہریار پرواز

پھر اک جنوں کو لئے چل پڑے ہیں دیوانے	کدھر ہے منزلِ مقصود یہ خدا جانے
بہار آئے گی کب اور کب یہ دیوانے	اسی خیال میں جھومے کئے ہیں ویرانے
قیودِ دیر و حرم سے ہوئے جو بیگانے	نئے خدا و صنم ڈھال ہیں گے دیوانے
حیات و مرگ ہیں جذب و جنوں کے افسانے	عدم کو چھاند نہ جائیں تمہارے دیوانے
تم اور جفا کے ارادے نہیں نہیں توبہ	جفا کے وہم مجھے آگئے تھے بہکانے
سحر تو سادہ و بے رنگ سی حقیقت ہے	اندھیری رات کے دل میں لکھے افسانے
وہ التفاتِ فراواں وہ نشۂ پیماں	تری نگاہِ خفی کاش ہم کو پہچانے
مئے دوشینہ کی گرمی ہنوز باقی ہے	ہیں چور چور کھنکتے ہیں پھر بھی پیمانے

جنوں پہ فاش ہے سرِّ حیات اے پرواز
غریب عقل بھلا زندگی کو کیا جانے

دیگر تین طبقوں کے لوگوں کی خدمت گزاری تھا۔

یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ ان چار طبقوں میں سے پہلے تین طبقوں کے لوگوں کو آریہ ورت کے لوگوں کی طرح یگیوپویت (زنّار) پہننا ضروری تھا۔ اس زنّار کو کُشتی कुश्ती کہتے تھے۔ یہ رسم زنّار بندی پارسی قوم میں اب تک جاری ہے۔

پس بقول ڈاکٹر آئی جے ایس تارپورے والا ایم اے پی ایچ ڈی جو خود پارسی ہیں اور وید سنسکرت اور ژند اوستھا کے فاضل کامل ہیں، اپنے مطبوعہ مضمون میں قرار دیتے ہیں کہ "ایرانی قوم کا قدیم ترین مذہب یقیناً آرین تھا۔ یعنی وہی جو قدیم ترین ویدوں میں پایا جاتا ہے۔ وہی دیوتا پوجے جاتے تھے اور قریب قریب یکساں ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ رسم و رواج، طریقِ معاشرت بھی بہت کچھ ویسے ہی تھے جیسے کہ ویدک آریوں کے۔ پس ویدوں کو ہی ہندوستانی اور ایرانی دونوں قوموں کے مذہب اور تہذیب کی بنیاد قرار دیا جانا چاہئے"[3]

---

[3] ملاحظہ ہو مرجان موٹڈرف کی انگریزی کتاب کارلیشن آف لیٹر वर्णमाला

شیخ تصدق حسین

کنگلا محل

شاہ اودھ سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر اپنی ایک بیگم نواب قدسیہ محل کو بے انتہا چاہتے تھے۔ مگر جب انھوں نے ۲۱۔ اگست ۱۸۳۴ء[1] کو بوجہ زہر کھا کر اپنی جان گنوا دی تو بادشاہ کے اضطراب و بے چینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ فرح بخش کی سکونت ترک کر کے وہ کبھی دولت خانۂ آصفی میں قیام کرتے، کبھی قصرِ دل کشا میں، مگر طبیعت ہر دم ملول و افسردہ رہتی تھی۔ نہ محفل میں دل بہلتا تھا نہ ویرانے میں قرار آتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر رفقا و مصاحبین اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کو شہر کی خاک چھاننے لگے کہ جہاں سے بھی ممکن ہو مرحومہ کی شکل و شمائل کی کوئی عورت ڈھونڈ نکالیں تاکہ بادشاہ کی اشک شوئی ہو، اور قدسیہ محل کے غم کی پھانس دل سے نکل جائے۔

شروع میں بادشاہ نے خیال کیا کہ قدسیہ محل کی ایک چھوٹی بہن نازک ادا نامی اور بھی ہے جو نواب دولہا کو منسوب ہے، اور جب کہ دونوں بہنوں نے ایک ہی کوکھ میں پیر پھیلائے تو ایک ہی شاخ کے دو پھول اور ایک ہی سیپ کے دو موتی کہاں تک ہم رنگ و ہم صفت نہ ہوں گے۔ اسی لئے ہوا خواہوں نے اس کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے۔ مگر اُس نے اپنے غریب اور محبوب شوہر کو فرماں روائے وقت پر ترجیح دی، اور کسی طرح اُس کی جدائی گوارا نہ کی۔ معاملا نے یہاں تک طول کھینچا کہ اس کے شوہر نواب دولہا کو لکھنؤ سے میاں گنج بھیج کر زیرِ حراست کر دیا گیا، اور فتح الدولہ محمد رضا برق اُس کے ہمراہ گئے، تاکہ سمجھا بجھا کر اس کی بیوی سے کنارہ کشی کرنے پر آمادہ کریں۔ کئی مہینے کے بعد جناب مولوی سید محمد صاحب سلطان العلماء کے حقیقی بھائی میر سید علی بھی نواب روشن الدولہ وزیر اعلیٰ کی طرف سے نواب دولہا کو سمجھانے کی غرض سے تشریف لے گئے، اور بہزار جد و جہد دُرِ مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور نواب دولہا نے صیغۂ طلاق جاری کر دیا۔

ادھر نازک ادا پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ اس کے انکار پر اس کو ایک مکان میں نظر بند کر کے چوکی پہرہ بٹھا دیا گیا۔ مگر اس ترشی سے بھی اُس کا نشہ نہ اُترا اور ایک روز موقع پا کر وہ قید سے نکل گئی، اور کان پور میں اپنے شوہر سے جا ملی۔ صاحب "دربارِ اودھ"[2] بیان کرتے ہیں کہ نازک ادا کے فرار میں نواب روشن الدولہ کا ہاتھ تھا، اور طلاق سے پہلے ہی نواب دولہا کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ تمھاری بیوی بہت جلد رہا ہو کر تم تک پہونچ جائے گی۔

نازک ادا کے غائب ہو جانے سے بادشاہ کی کاوشوں اور کاہشوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ مگر چونکہ اس معاملے میں روشن الدولہ کا قدم درمیان تھا، اس لئے اصل راز کا پتہ نہ چل سکا۔ بادشاہ یہی سمجھے کہ جو کچھ ہوا وہ نواب دولہا کی چالاکی سے ہوا۔ تاہم انھوں نے لکھنؤ کا ایک ایک کونا ڈھونڈھوایا، اور جب انھیں نازک ادا کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی تو پھر قدسیہ محل کی ہم شکل کی تلاش شروع کر دی۔

بہت سی لڑکیاں بادشاہ کو ملاحظہ کرائی گئیں، مگر نظرِ انتخاب سے سب محروم رہیں۔ کیونکہ اگر بادشاہ کو کسی کا حسن و جمال پسند آتا تھا تو وہ سادہ مزاج ہوتی تھی، اور اگر کسی میں شوخی اور طرّاری پائی جاتی تو وہ دل کشی اور رعنائی سے معرّا ہوتی۔ آخر کار ایک روز موقع پا کر روشن الدولہ نے باتوں باتوں میں اپنے ایک عزیز قریب کی لڑکی کا ذکر بادشاہ سے چھیڑا، بلکہ معشوقہ[3] کو پردہ کی آڑ سے دکھا بھی دیا۔

صاحب تاریخ اودھ[4] نے ان واقعات کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں: "روشن الدولہ نے اب دوسری تجویز یہ کی کہ قدسیہ بیگم کے چہلم کے بعد اعلیٰ حضرت کا نکاح کسی ناکتخدا لڑکی سے ہو جائے، تاکہ موصوف کا غم غلط ہو۔ لیکن اس کام کو بذاتِ خود انجام دینا چاہا، تاکہ اُن کی

---

[1] تاریخ اودھ [2] قیصر التواریخ جلد اول

[3] قیصر التواریخ جلد اول [4] تاریخ اودھ جلد چہارم از مولانا نجم الغنی

گرم بازاری ہیں اور چار چاند لگ جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک روز بادشاہ کو دعوت کے حیلے سے اپنے مکان پر بلایا اور زنانخانہ میں جہاں خواتین کا ہجوم تھا اپنے اہل وعیال کو نذر گزراننے کو پیش کیا اور مرزا باقر علی خاں سابق چکلہ دار روہیل کھنڈ کی لڑکی بادشاہ کو دکھا دی۔ اس لڑکی کا رنگ سُرخ وسفید، جلد باریک۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ ہونٹ پتلے اور چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ بادشاہ کی طبیعت اُس کی طرف فوراً مائل ہوگئی، اور اس کے خواستگار ہوئے۔ مگر روشن الدّولہ نے عرض کیا کہ یہ لڑکی بڑی عالی خاندان ہے۔ اگر طبیعت مبارک اُس کی طرف رجوع ہے تو اس کے باپ کو افتخار کے طریقے پر راضی کرنا چاہئے، اور جس طرح سلاطینِ ماضیہ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اُسی طرح عقدِ شرعی کرکے خدمت مبارک میں سرفرازی بخشی جائے۔ یہ صورت اُس کے والدین کی عزت کا موجب ہوگی، اور شادی میں عذر کی گنجائش بھی نہ رہے گی۔ بادشاہ نے روشن الدّولہ کی عرضی قبول فرمائی۔ اور شادی کے سرانجام کے لئے ارشاد کیا۔

یہ لڑکی مرزا باقر علی خاں کی نورِ نظر اور مرزا حسین علی خاں سابق چکلہ دار کٹہر (روہیل کھنڈ) کی پوتی تھی۔ مرزا باقر علی خاں کو نوابِ روشن الدولہ کی سگی بہن گمانی خانم منسوب تھیں۔ جن سے باقر علی خاں کے صرف ایک بیٹا محمد علی خاں (سراج الدولہ) اور ایک لڑکی قمر طلعت بیگم تھی۔ بالفاظِ دیگر یہ نوّاب روشن الدولہ کی سگی بھانجی تھی۔

بادشاہ کی خواستگاری کے بعد روشن الدّولہ نے اپنے بہنوئی مرزا باقر علی خاں سے اس طرح تذکرہ کیا[1] کہ کسی مشاطہ نے آپ کی بیٹی کا ذکر اعلیٰ حضرت تک پہونچایا ہے وہ اُس سے عقد کے خواہاں ہیں اگر منظور ہو تو اس کارِ خیر میں کوئی مضائقہ نہیں۔ انھوں نے جواب دیا میں غریب آدمی ہوں اہلِ دنیا بھی کہیں گے کہ یہ کام لالچ سے کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ کے سیکڑوں محل ہیں۔ تین یوم رغبت کرکے خواص پورہ میں داخل کردیں گے۔ میری تمام عمر رسوائی ہوتی رہے گی، اور لڑکی الگ کہے گی کہ ابا جان نے جان بُوجھ کر مجھ کو ڈبو دیا۔ تیسرے یہ کہ میں مفلس اور وہ بادشاہ "چھوٹا گھر اور بڑا سمدھیانا" والی مثل ہو جائے گی۔ بھلا اُن کے مقابلے میں مجھ سے کیا ہو سکے گا،

اگر تمام اثاث البیت فروخت کرکے کچھ انتظام کر بھی لوں تب بھی یہی حکم ہوگا کہ کوئی وکیل نکاح کے لئے چلا جائے۔ اس صورت میں تمام عمر بدنامی رہے گی کہ فلاں شخص نے اپنی بیٹی بطریق سَرِّیہ دے دی، اور میری بیٹی کی پھر کبھی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ مگر روشن الدولہ نے انھیں شیشے میں اُتارا اور رضامند کرکے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ لڑکی کے باپ راضی ہیں، مگر اس امر کے امیدوار ہیں کہ حضرت سر پہ سہرا باندھ کر مع امراء و اعزا اُن کے مکان پر تشریف لے جائیں۔ خانہ زاد کو اس امر میں کسی قدر دقت محسوس ہوئی مگر میں نے بھی ایسی شق لگائی کہ مرزا لاجواب ہو گئے۔ میں نے اُن سے کہا کیا مضائقہ، حضرت بنفسِ نفیس تشریف لائیں گے مگر ان کی شان کے موافق جہیز بھی ہونا چاہئے، وہ سمجھ گئے کہ جہیز میں کم سے کم دس بارہ لاکھ روپے صرف ہوں گے۔ آخر مجبور ہو کر خاموش ہوگئے۔ اُن کے باقی سوال میں نے قبول کرلئے اور جہیز کا بار اپنے سر لے لیا۔ اب اِس لڑکی کو اپنے مکان پر مانجھے بٹھاؤں گا اور شادی کے تمام مراسم بھی خود ادا کروں گا۔ حضرت کوئی تاریخ سعید قرار دے کر اور سہرا باندھ کر رزیڈنٹ اور تمام امرا اور رشتہ داروں کو ساتھ لے کر نوبت و نقارہ کے ساتھ تشریف لے جائیں، اور اس امر میں کوئی مضائقہ نہیں، آخر وہ بھی حضور ہی کا مکان ہے۔ بادشاہ نے قبول فرمایا۔ نوّاب نے سب سامان نوعروسی تیار کیا۔

مانجھا لڑکی والوں کی طرف سے بڑے طمطراق سے بھیجا گیا، جس کے جلوس کا نقشہ مصنّف دربارِ اودھ نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے۔

" دو گھڑی دن بہے درِ دولت (دولت خانۂ آصفی) سے روشن الدولہ کی کوٹھی تک لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ مکانوں کی چھتیں اور کمرے مردوں اور عورتوں سے معمور تھے، درِ دولت پر بھی اراکینِ سلطنت کا مع حواشی ایک کثیر مجمع تھا۔ یہ لوگ نہایت زرق برق لباس پہنے مصروفِ انتظام تھے۔ زنانی ڈیوڑھی پر ہزاروں فنوں سے سواریاں اُتر رہی تھیں۔ کھاٹیاں خواجہ سرا دوڑ دوڑ کے سواریوں کے اُتارنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ قریب شام مانجھے کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ بادشاہ نے درِ دولت سے برآمد ہو کر پھاٹک کے بالائی کمرے میں مانجھے کا جلوس دیکھنے کے لئے قیام کیا۔ بالاخانہ بہت بلند مقام تھا، اور یہاں سے دور تک نظر جاتی تھی۔ بادشاہ کے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد نشان کا ہاتھی نظر آیا۔ اِس ہاتھی پر عماری کے علاوہ ایک اونٹ بٹھایا تھا،

[1] تاریخ اودھ جلد چہارم

جس کے ہاتھ میں نشان تھا جس کا پٹکہ نہایت بیش قیمت کارچوبی اور جڑاؤ کام کا تھا، اور علم کی جگہ ایک آفتاب تھا گیند سونے کا لگا ہوا تھا۔ اس ہاتھی کے بعد دوڈھائی سو ہاتھیوں کی قطار تھی جن میں سے پہلے چند ہاتھیوں پر ماہی مراتب تھا جو شہنشاہ دہلی نے نواب اودھ کو بطور اعزاز کے بخشا تھا۔ باقی ہاتھیوں پر لوگ سوار تھے اور ہر ایک ہاتھی پر گنگا جمنی ہودے کسے ہوئے تھے۔ ان ہاتھیوں کے بعد قندھاریوں کا رسالہ تھا۔ اس کے پیچھے دو دیسی رسالے تھے۔ رسالوں کے بعد اختری نادری پلٹنیں تھیں۔ ہر پلٹن کے ساتھ اُس کا جنگی باجہ بجتا جاتا تھا۔ پلٹنوں کے پیچھے متعدد تخت رواں تھے اور اُن پر شہر کی نامی کسبیاں مجرا کرتی چلی جاتی تھیں۔ اُن کے بعد مصنوعی آرائش کے ہزاروں تخت تھے۔ اُن کے بعد مختلف قسم کے باجے تھے، جن کی نغمہ سرائی سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، جب یہ ہلڑ بھی ختم ہوا تو تمام شہر کے سوانگیوں کے تخت گزرنا شروع ہوئے۔ کسی تخت پر لیلیٰ مجنوں کسی پر شیریں فرہاد اور کسی پر وامق و عذرا کا سوانگ تھا۔ کسی پر بے سر لاش اور کسی پر تھالی میں سر دھرا ہوا جو باتیں کرتا جاتا تھا۔ بہت سے سوانگیے تمام جسم پر سفید دھلے مونڈھوں پر بیٹھے سیفیں نگلتے تھے۔ کوئی منہ سے اتنا بڑا گولا اُگلتا جو منھ اچھی طرح کھولنے سے بھی دانتوں میں اٹکتا تھا۔ کوئی دانت سے پکڑ کر دیگ اٹھاتا، جس میں ایک آدمی بھی کھڑا ہوتا تھا۔ کوئی سموچی تولیں چباتا چلا جاتا تھا۔ کوئی چار چار پانچ پانچ سیفیں نگل کے سیفوں کے دستوں میں پانی بھرے ہوئے گھڑے لٹکائے ہوئے تھا۔ الغرض ان تختوں کے ساتھ عوام تماشائیوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ ان تختوں کے بعد ایک سنہری چوکی پر جس پر نہایت اعلیٰ قسم کی سُرخ مخمل منڈھی ہوئی تھی اور نہایت بیش قیمت کام بنا ہوا تھا۔ ایک طلائی لوٹا اور کٹورا رکھا ہوا تھا، دونوں چیزیں تاروں سے چوکی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ چوکی کے گرد سیکڑوں چوبدار نقرئی طلائی عصا ہاتھوں میں لئے سلطانی بانات کی وردیاں پہنے ہٹو بچو کرتے چلے جاتے تھے۔ چوبداروں کے پیچھے ہزاروں خوان جن میں پینڈیاں بھری ہوئی تھیں مزدوروں کے سروں پر تھے۔ ان کے بعد دولھن والوں کی طرف کی عورتوں کی ہزاروں فینسیں تھیں جن کے ساتھ بانکی مہریاں ریشمی لہنگے پہنے تیل ہانی سے درست فینس کا ایک کونا پکڑے ساتھ ساتھ دوڑی چلی جاتی تھیں۔

بادشاہ نے معمولی مراسم کے خلاف اس شادی میں نہایت عجلت کی۔ جس دن مانجھا آیا اُس کے صرف ایک دن بعد ادھر سے ساچق گئی۔ پھر اس کے دوسرے دن اُدھر سے مہندی آئی جس کے دوسرے دن بادشاہ بیاہنے کو گئے۔ بادشاہ کا دلی جوش تو ان جھگڑوں میں پڑنے کی بالکل اجازت نہ دیتا تھا۔ مگر چونکہ وزیر دولھن کے سگے ماموں تھے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کسی بات میں ہیٹی نہ ہونے پائے اور صرف یہی وجہ اس شادی میں اتنی دھوم دھام کی ہوئی۔

اس کتخدائی کے مصارف کے بارے میں مصنف "دربار اودھ" اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اودھ کے رنگیلے بادشاہ کی شادی نے لکھنؤ میں ایک عجیب دھوم دھام پیدا کردی۔ نواب سعادت علی خاں نے جس جزرسی اور انتظام سے خزانہ معمور کیا تھا، اُس کے جانشینوں نے ویسے ہی فضول اور بیہودہ کاموں میں اُسے اُڑانا شروع کیا، اس شادی میں اسراف کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رہا۔ یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ شاہِ حال کی شادی جس شان و شوکت اور عظم و شان سے ہوئی ہے کسی اگلے حکمراں کی ایسی شادی نہیں ہوئی۔ الغرض یہ شادی لکھنؤ کی تاریخ میں اپنے اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت نمایاں شہرت کے قابل سمجھی گئی۔

ابتدائی رسوم ادا ہوچکنے کے بعد بتاریخ ۱۳۔ رجب ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء بروز ولادت حضرت علی علیہ السلام محفلِ شاہانہ آراستہ ہوئی، بادشاہ کے عزیز و اقارب و عمائدین و ارا کینِ سلطنت۔ جنرل لو صاحب رزیڈنٹ اودھ اور بہت سے صاحبان والاشان اور ولایت کی عالی مرتبت خواتین بھی شریک بزم طرب تھیں۔ جنرل لو صاحب نے کمال اتحاد اور خصوصیت سے اپنے ہاتھ سے شاہ کے فرقِ مبارک پر سونے اور پھولوں کے سہرے باندھے۔ بادشاہ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک طلائی ورق لگی ہوئی گلوری پلیٹ میں رکھ کر اُن کو عنایت فرمائی۔ صاحب نے بہت تکلف سے لے کر نوش کی۔ غرض یہ صحبت بھی یادگار زمانہ ہوئی، اور جب بادشاہ سہرا باندھے ہوئے محل سرا میں داخل ہوئے، دولھن کے پاس بیٹھے تو جملہ رسوم شادی ادا کی گئیں۔ بلکہ اس شادی میں ایسی رسمیں بھی ادا کی گئیں جو بادشاہ کی کسی شادی میں ادا نہ ہوئی تھیں۔ بعد ازاں صبح کے سہانے وقت اپنی نوعروس کو مع سامانِ جہیز جو حسب بیان نواب روشن الدولہ چودہ لاکھ روپے کا تھا،

دولت خانۂ قدیم نواب آصف الدولہ میں سہرے جلوے سے بیاہ کر لائے۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ دولھن کو "بادشاہ جہاں ممتاز الدہر" خطاب اور کئی لاکھ روپے کے مرصّع زیورات مثل چھپکا ، نتھ ، دبنیا ، دہا نتوں کے گلابی ہیرے جڑے ہوئے کڑے عنایت کئے۔

چوتھی چالے کی رسمیں ادا ہونے کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ ہماری تمام بیگمات نئی دولھن کو نذریں گذرانیں۔ کیونکہ ہماری جو پہلے شادی ہوئی تھی وہ والدین کی مرضی سے ہوئی تھی ، اور یہ شادی ہم نے خود اپنی پسند سے کی ہے۔ اس رشتے کی بدولت دولھن کے باپ کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس ڈیوڑھی کے کل انتظامات انھیں کے ہاتھ میں آگئے۔ اُن کے بیٹے علی محمد خاں نے جو روشن الدولہ کے داماد اور اس نئے محل کے بھائی تھے "سراج الدولہ" کا خطاب اور علاقہ محمدی کی چکلہ داری پائی۔ دونوں باپ بیٹوں کی بیش قرار تنخواہیں بھی سرکار شاہی سے مقرر ہوگئیں۔ شروع میں بادشاہ اس محل کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ کوٹھی فرح بخش سے دولت خانہ آصفی تک آٹھ گھوڑوں کی سیج گاڑی پر بادشاہ کے ہم پہلو سوار ہوتی تھیں۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد بادشاہ کا دل اُن کی طرف سے کھٹا پڑ گیا۔ سبب یہ تھا کہ بادشاہ حسن وجمال کے ساتھ عورت میں بے حجابی اور ناز و کرشمہ بھی چاہتے تھے ، مگر یہ بات پردے میں بیٹھنے والی بہو بیٹیوں میں کہاں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ خصوصی[1] کے بعد بادشاہ محل میں آرام کرنے کے ارادے سے آکر مسہری پر بیٹھ گئے اور ممتاز الدہر کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بوجہ شرم ولحاظ طلب فرمانے کی متوقع تھیں کہ یکایک برہم ہوکر دعنیا مہری سے کہا کہ میں بہت عرصے سے بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہوں اور یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ دعنیا نے عرض کیا کہ ابھی نئی نویلی ہیں اس لئے شرم کرتی ہیں۔ اس جواب سے اور زیادہ چراغ پا ہوئے ، اور کہا ہم کو مدت سے معلوم ہے کہ تو نواب سے ملی ہوئی ہے اسی لئے باتیں بناتی ہے ، یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دعنیا سمجھی کہ اس وقت بیگم کی بے طرح خبر لیں گے۔ اس لئے اس نے دوڑ کر ان کی کمر پکڑ لی۔ جب انھوں نے خوب زور کیا تو دعنیا زمین پر گر پڑی۔ بادشاہ نے دعنیا کے سینے پر چڑھ کر اتنا مارا کہ بدن میں کئی جگہ ورم ہو گیا ، اور چلّا کر کہا بیگم صاحب اس وقت شرم وحیا کو طاق پر رکھئے اور یہاں آکر میری جان بچائیے۔ غرضکہ بیگم دوڑی ہوئی آئیں۔ بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئیں ، اور دعنیا کی گلو خلاصی ہوگئی۔

علاوہ اس کے بیگم کی امّاں جان جو محل سرائے سلطانی میں اپنی بیٹی کے ہمراہ رہتی تھیں ، اپنے بھائی روشن الدولہ کی بالکل ضد واقع ہوئی تھیں ، حالانکہ دونوں بہن بھائی ایک ہی ماں باپ سے پیدا تھے۔ مگر دونوں کی طبیعتوں میں سیاہ وسفید کا فرق تھا۔ بھائی حد درجے کے شاہ خرچ اور بہن پرلے سرے کی خسیس ، پیسے پیسے پر جان دیتی تھیں۔ نو عروسی کے دن بادشاہ نے دو ہزار روپے تقسیم انعامات کے لئے مرحمت کئے ، وہ انھوں نے رکھ چھوڑے کسی کو نہ دیئے۔ باورچی خانے سے جو روٹیاں بچی ہوئی آتی تھیں اُن کو دھوپ میں سکھا کر جمع کرتی تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے شیرینی کی فرمائش کی۔ انھوں نے دو روپے کی مٹھائی بازار سے منگا کر سامنے رکھ دی جس کو بادشاہ نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ یہ باتیں بادشاہ کے بہت بار خاطر ہوتی تھیں۔ آخر میں[2] ایک نیا گل کھلا جس کی وجہ سے ممتاز الدہر بادشاہ کی نظروں سے بالکل گر گئیں ، وہ یہ کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپے اور پینتالیس بدریاں دوشالوں ، رومالوں ، جامہ واروں اور گرمیوں کی پوشاک کے لائق جامدانی وغیرہ کے تھانوں کی اپنی ناموری سمجھ کر بیگم کو عنایت کیں کہ تم بادشاہ کی بیوی ہوئی ہو۔ یہ کل چیزیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو تقسیم کردو کہ وہ لوگ بھی یاد کریں کہ اُن کی کسی عزیزہ کی شادی بادشاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔

دولھن نری صاحبزادی تھیں۔ اُن کی والدہ مکرمہ ان کی آتالیقہ اور عقل کل تھیں۔ انھیں کا حکم سب باتوں میں چلتا تھا۔ انھوں نے صرف بے جا سمجھ کر سب نقد وجنس رکھ لیا ، کسی کو تقسیم نہ کیا۔ صبح کو جب بادشاہ بیدار ہوئے تو تقسیم کو دریافت کیا۔ بیگم کی امّاں جان نے جواب دیا "آخر اس اسراف سے کیا فائدہ۔ ہم تمہارا گھر بنانے آئے ہیں یا لٹانے کو۔ سنتے ہی بادشاہ کا شعلۂ غضب بھڑک اٹھا اور اٹھ کر باہر جانے لگے۔ بیوی نے دامن پکڑ کر روکا تو فرمایا "تو کنگلی ہے ، تو کیا کسی کو دے گی!" محل کے باہر تشریف لائے تو راجہ غالب جنگ مہتمم دیوان عام سے فرمایا " راجہ ہم نے اس نئے محل کو

---

[1] تاریخ اودھ حصہ چہارم

[1] تاریخ اودھ حصہ چہارم [2] قیصر التواریخ جلد اوّل

"کنگلا محل" خطاب دیا"۔ راجہ نے اسی خطاب سے بآوازِ بلند ایک چوبدار سے کہا "جاؤ کنگلے محل سے حضرت کا تاج[1] لے آؤ"۔ اس وقت سے بیگم کنگلے محل کے خطاب سے مشہور ہوگئیں، اور چار دن کی چاندنی اُن کی بھی ختم ہوگئی، اور مصداق "تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ"۔ اس کے ساتھ ہی نواب روشن الدولہ کے سب منصوبے بھی خاک میں مل گئے، کیونکہ اگر ان کی بھانجی کا عروج ہو کر اُن سے اولادِ نرینہ ہو جاتی تو سلطنت اودھ کی حکومت انہیں کے خاندان میں آجاتی۔

یہ واقعہ بیگم اور اُن کے قرابت داروں کے لئے سوہانِ روح ہوگیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بیگم کو پندرہ سو روپے ماہوار خزانۂ شاہی سے ملتے تھے۔ ان کے بھائی سراج الدولہ اُن کی تنخواہ پر قابض و متصرف رہتے تھے۔

سراج الدولہ کا مکان چودھری کی گڑھیا پر تھا جو منہدم ہو کر فروخت ہو چکا ہے۔ صرف اُس کا پھاٹک باقی ہے جو شاکرہ منزل کا جزو ہوگیا ہے۔ موصوف کا ایک وسیع اور عالی شان امام باڑہ بھی محلہ نہرہ حال جگت نرائن روڈ پر حکیم مہدی علی خاں کے مقبرے کے سامنے تھا۔ یہ عمارت بھی فروخت ہو چکی ہے۔ اب اس میں ہیوٹ انجینئرنگ اسکول قائم ہے۔

ممتاز الدہر کی محل سرا اور بارہ دری موسومہ چاندی خانہ و امام باڑہ محلہ ڈیوڑھی آغا میر میں تھا۔ اب کل عمارت فروخت ہو کر ایک مہاجن کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ بارہ دری بوسیدہ حالت میں آج تک موجود ہے۔ اب یہ کل محلہ چاندی خانہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ بیگم نے غدر کے تخمیناً بیس برس بعد اپنے مکان مسکونہ چاندی خانہ میں انتقال کیا۔ لاش امام باڑہ بڑا صاحب واقع نہرہ میں سونپی گئی، پھر کربلائے معلّی روانہ کر دی گئی۔

---

[1] اُس زمانے میں رواج تھا کہ جس محل میں بادشاہ کا تاج رکھا ہوتا تھا وہ کل محلوں کا سرتاج سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جس دن سے ممتاز الدہر بیاہ کر آئی تھیں اُسی دن سے حسبِ ایمائے روشن الدولہ تاجِ شاہی انھیں کے محل میں رکھ دیا گیا تھا۔

تلوک چند محروم

ایک قطعہ - ایک غزل

قطعہ

انساں ہے باغبانِ گلستانِ زندگی

توفیقِ گُل نہیں، نہ سہی، خار تو نہ دے!

انسانیت کا ہے یہ تقاضائے اوّلیں!

لطف و کرم نہیں ہے، تو آزار تو نہ دے

غزل

ہجراں کی شب جو درد کے مارے اداس ہیں

اُن کی نظر میں چاند ستارے اُداس ہیں

آنکھیں وہ پھر گئیں کہ زمانہ اُلٹ گیا

جیتے تھے جو نظر کے سہارے، اُداس ہیں

کیا ہیر اب کہیں ہے، نہ رانجھے کا جانشیں

کیوں اے چناب! تیرے کنارے اُداس ہیں؟

بہتر ہے ہم بھی چشمِ جہاں بیں کو مُوند لیں

دُنیا کے اب تمام نظارے اُداس ہیں

محروم کیا کلام بھی اپنا فنا ہوا

کیوں ہم کو کھو کے دوست ہمارے اداس ہیں

عیسیٰ صدیقی

کچھ کھو گیا تھا؟

دوپہر پیاسے ہونٹوں کی طرح خشک اور بھٹی کی آنچ کی طرح تکلیف دہ حد تک گرم تھی۔

اوشا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کمرے کی الماریوں کو ایسے ٹٹولنے لگی جیسے اُسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ پھر وہ ایسے ہی بے مقصد انداز میں چلتی ہوئی زینے تک آگئی۔ زینے کے آدھے حصّے پر اُوپر کی جانب دھوپ چمک رہی تھی اور نچلے حصّے میں سایے کی ہلکی سی تہ بچھی ہوئی تھی —— اُسے اندازہ تھا کہ جب آدھے زینے پر دھوپ باقی رہ جاتی ہے تو اُس کے شوہر کے آنے میں دو گھنٹے باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ رسوئی کی طرف مڑ گئی اور دو تین برتنوں کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتی رہی پھر کمرے میں واپس آکر صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئی ——
اُس کی نظریں ایسے ہی بہت دیر تک صوفے کے پالش پر جمی رہیں۔

اس کی زندگی ایسے گذر رہی تھی جیسے سورج صبح کو مشرق سے نکلتا ہے اور شام کو مغرب کی پستیوں میں جا گرتا ہے۔ مشینی انداز میں ایک اُکتا دینے والی یکسانیت کے گرد پانچ برسوں سے اُس کی زندگی گھومے جا رہی تھی۔ ان پانچ برسوں میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جو کچھ چونکا دینے والی ہوتی —— سوائے دو بچوں کے۔ وہ بھی شروع میں کچھ اجنبی سے لگے۔ اور زندگی میں ایک نئے پن اور ایک دلچسپی کا اضافہ معلوم ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ دونوں بچے بھی اُسی محور میں آ گئے جس کے گرد وہ بغیر دلچسپی کے گھوم رہی تھی —— شادی کے شروع دنوں میں پرکاش کی باتیں بھی اُسے نئی اور دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اب وہ ان باتوں کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اُسے پتہ رہتا کہ اب پرکاش کیا کہنے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض مرتبہ وہ پرکاش کی بات سنے بغیر ہی اُس کا جواب دے دیتی۔ صبح کو دفتر جاتے وقت پرکاش کے حسین جملے اب اس کی مسکراہٹ کا سبب بنتے بنتے تھک گئے تھے۔

"اچھا اب چلیں دفتر!!" وہ چھوٹے بچے کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہتا۔ جس کا مطلب تھا کہ "میرا کوٹ لا دو۔"

اور وہ بغیر جواب دئے اُسے کوٹ پہنانے لگتی۔

"تمہارے پاس سے بڑی اچھی مہک آتی ہے۔" کوٹ پہننے کے دوران میں یہ کہنا بھی تقریباً اُس کا معمول تھا۔

پہلے وہ اس جملے پر مسکرا دیا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ یہ کہنے لگی تھی۔

"اچھا تو میرے کپڑے پہن کر چلے جایا کرو نا۔"

"مگر تمہیں پہن کر تو نہیں جایا جا سکتا۔" وہ اس کا یہ جواب دیا کرتا تھا۔

مگر اب وہ یہ سب کچھ نہ کہتی، خاموشی سے سنتی رہتی۔

پھر وہ اس کے بازوؤں کو تھپتھپاتا ہوا چلا جاتا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ دفتر سے آتے ہی یہ کہے گا۔

"اُف کیا مصیبت ہے یہ ملازمت بھی۔ سارا بدن اکڑ جاتا ہے دن بھر بیٹھے بیٹھے۔"

"چائے لے آؤں۔" وہ اس سے پوچھے گی۔

"ذرا میں پانی ڈال لوں۔" اور وہ غسل خانے میں گھس جائے گا۔

چائے پینے کے بعد وہ اوشا سے قریب ہو کر صوفے پر بیٹھ جائے گا۔

"آپ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"پھر کھائیں گے کہاں سے"

"دنیا میں اور بھی کام ہیں ملازمت کے علاوہ۔"

"خیر چھوڑو ان بے کار باتوں کو۔" پھر وہ دونوں ہاتھ پکڑ کر اُن کی تعریف کرنے لگے گا۔ کبھی کبھی جواب میں وہ بھی اس کے بالوں کی تعریف کر دیا کرتی مگر ہمیشہ نہیں۔ پھر وہ کہے گا

"ذرا ٹہل آؤں تھوڑی دیر۔" پھر آدھی رات سے کچھ پہلے واپس آئے گا۔

یہ تو خیر اس کے شوہر کی بات تھی۔ وہ تو یہاں تک واقف تھی کہ گذشتہ سال جیسے پانے اس کا دنر پر اور اس سال اُس کا دنر پر اور اس کے بعد وہ کہاں

گھونسلا بنا سکتی ہے۔ شام کو دھوپ کمرے کے کس گوشے میں زیادہ دیر تک رہتی ہے اور کس گوشے میں کم۔

وہ دیر تک صوفے پر ایسے ہی لیٹی رہی پھر محض کچھ نہ کچھ کرنے کی غرض سے اس نے وشنو کو اُٹھا دیا۔

"اُٹھ جاؤ بیٹیا۔ تمہارا مُنہ دھلا دیں۔ حالانکہ اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

وہ منمناتا رہا لیکن وہ اُسے اُٹھا کر غسل خانے میں لے گئی اور اُسے نہلانے کے بعد تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لائی اور دُھلی ہوئی سفید نیکر اور قمیص پہنانے کے بعد سوچنے لگی کہ اب وہ کیا کرے۔

"ہمیں پتلون اچھی لگتی ہے ماں۔"

"نہیں مُنّے بچے نیکر پہنتے ہیں۔ پتلون تو بڑے آدمی پہنتے ہیں۔"

"ماں تم مجھے بہکاتی کیوں ہو۔ وہ سامنے والی دوکان پر ایک چھوٹی سی پتلون ٹنگی ہے۔"

"کون سی دوکان پر؟" اوشا نے بچّے کی ذہانت پر مسکرا دی۔

"وہ سامنے جو ٹیلر ماسٹر ہے نا اُس کی دوکان پر۔ چلو میں بتاتا ہوں۔" اور وشنو چھوٹے چھوٹے پیروں سے کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

"وہ دیکھو ماں کالی پتلون ہے نا — وہ چھوٹی سی!"

"ارے وہ تو خراب ہے!" اوشا نے کھڑکی میں آکر اُسے گود میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو خراب ہی بنا دو تم"

اوشا ہنسنے لگی۔

ہنسی کی آواز سن کر گلی میں جانے والے ایک راہگیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور ٹیلر ماسٹر نے جس کی نگاہیں کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں اپنی مسکراہٹ کو دانتوں تلے دابنا چاہا۔۔۔ اوشا کی اُس پر نظر پڑی تو اُس نے کھڑکی کا ایک پٹ بند کر دیا اور اُس کی آڑ میں ہو گئی۔ ٹیلر ماسٹر نے اپنی عادت کے مطابق گانا شروع کر دیا —— اُس کی عادت تھی جب اُسے کوئی حسین چہرہ نظر آجاتا تو اُس کے گلے میں سویا ہوا سنگیت جاگ اُٹھتا اور پھر وہ گھنٹوں اپنی مشین کے ساز پر گایا کرتا — بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بہت سے لوگ محض اُس کے اچھے گلے کی وجہ سے اس کے یہاں کپڑے سلواتے ہیں۔ اوشا نے اُسے گاتے دیکھ کر کھڑکی کا دوسرا دروازہ بھی بند کر دیا مگر وہاں سے گئی نہیں۔

کھڑکی کی درازوں میں سے وہ دیر تک دیکھتی رہی کہ ٹیلر ماسٹر کی نظریں گاتے گاتے کئی بار کھڑکی کے بند دروازوں سے ٹکرا کر جھکتی رہیں —— اوشا کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہ معمولی سا ٹیلر ماسٹر کیسے زبردست جادو کو اپنے گلے میں چھپائے پھرتا ہے، وہ دیر تک کھڑی اس کے مشین کے پائیدان پر رکھے ہوئے پیروں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اور اس کا دماغ گانے کے بولوں کے ساتھ اُترتا رہا۔

"وشنو — وشنو۔" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وشنو غائب تھا۔ وہ زینے کی طرف لپکی۔ زینے کی آخری سیڑھی پر ہاتھ ٹیکے وشنو دروازے سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو بیٹیا؟"

"کہیں نہیں ماں یہیں دروازے میں ہوں۔"

دروازے سے باہر نہ جانا۔ اگر کسی سائیکل یا تانگے سے ٹکرا گئے تو ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔"

وہ دوبارہ کھڑکی میں آکر بیٹھ گئی۔

ہری — ٹیلر ماسٹر گائے جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے سُن رہی تھی —— دوپہر بتانے کا آسان نسخہ آج اُسے ہاتھ لگا تھا۔ یکایک ہری کی آواز بند ہو گئی۔ اور جب اس نے درازوں میں سے جھانک کر دیکھا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وشنو ٹیلر ماسٹر کی مشین کے آگے کھڑا کالی پتلون کی طرف اشارہ کر رہا تھا — اوشا نے کھڑکی کھول دی۔

"وشنو۔ ارے وشنو یہاں آؤ۔" اس نے آواز دی۔

مگر وشنو نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ پتلون بیچتے نہیں تو پھر آپ ان کا کیا کرتے ہیں؟"

ہری نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جو بنواتا ہے اُسے دے دیتے ہیں۔"

"تو پھر آپ میرے لئے بھی ایسی ہی ایک کالی پتلون بنا دیجئے نا۔"

"ہاں، ضرور بنا دیں گے۔"

"وشنو چل ادھر — کمبخت کہیں کا۔" اوشا نے کھڑکی سے اس کی بات سُن کر کہا۔

"ماں جا رہی ہیں۔" وشنو اس کی گود سے اُترنے لگا۔

"اگر تم ہمارے پاس سے چلے جاؤ گے تو پھر ہم تمہیں کالی پتلون بنا کر

نہیں دیں گے۔

وشنو دوبارہ اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

"نہیں سنو گے تم وشنو۔ چلو وہاں سے۔" اوشا پھر ایک بار چیخی۔

"کہہ دو نہیں آتے" ہری نے اُسے سکھایا۔

وشنو ایک لمحہ جھجکا۔ پھر کہنے لگا — "ہم نہیں آتے۔"

"اچھا میں بتاؤں گی تمہیں۔" اوشا نے غصّے سے کہا۔ ہری مسکرانے لگا اور اوشا نے کھڑکی بند کر دی۔

ہری وشنو کو گود میں لئے اُس کے زینے تک آیا اور دروازے میں اُسے چھوڑ کر واپس جا ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر اوپر سے اُترتی ہوئی اوشا پر پڑی۔ اس بار وہ مسکرا بھی نہ سکا۔ جس پر اُسے خود بعد میں افسوس بھی ہُوا۔

کچھ دن بعد ہری نے کاسے کپڑے کی ایک گرم پتلون وشنو کے لئے بنائی اور جب وہ پتلون دینے کے لئے زینے کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا تو اس کا دل بھی اُسی شدت کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔

اُس کی عمر بھی عجیب ڈھنگ سے گزری تھی۔ ماں تو اُسے بچپن میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اور اس کا باپ سال کے زیادہ تر مہینے جیل میں گزارا کرتا تھا۔ اور ایک بار وہ ایسا جیل گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ ہری اُس وقت نو سال کا تھا۔ اگر محلے کے ایک درزی نے اُسے اپنے یہاں پناہ نہ دی ہوتی تو شہر کے بھک منگوں، جیب کتروں یا معقول معاوضے پر مار پیٹ کرنے والوں میں ایک کا اضافہ ہو جانا غیر ممکن نہ تھا۔ گیارہ سال تک ہری اُس کے یہاں رہا — دوکان پر کام کرنے والے کاریگر کی حیثیت سے، اور گھر کا سودا لانے والے ایک نوکر کی حیثیت سے بھی۔ مگر ایک دن اُسے وہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ تب اُس نے یہاں اپنی دوکان کھول لی تھی۔

جس دن دوکان بند ہوتی اُس دن وہ شہر کے بدنام ترین محلوں میں گھومتا رہتا اور اگر جیب گرم ہوتی تو ایک آدھ بوتل بھی چڑھا لیتا اور راہ چلتے اُسے کوئی حسین چہرہ نظر آ جاتا تو وہ گانا شروع کر دیتا اور میلوں سڑک پر چلتا رہتا اور گاتا جاتا تھا۔

"کون ہے ؟" اوشا نے خلافِ معمول دروازے پر دستک سُن کر اندر سے پوچھا۔

"ماں" وشنو کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

"ٹھہرو۔" اوشا کی آواز آئی۔ "کیا بات ہے۔"

اُس نے پھر ہری کو غائبانہ مخاطب کیا۔

"جی وہ . . . پتلون ہے — وشنو بھیا کا — پتلون"

"میں آ رہا ہوں ماسٹر جی۔" وشنو نے چیخ کر کہا

ہری نے زینے میں جھانک کر دیکھا تو وشنو ایک سیڑھی پر پیر اور دوسری پر ہاتھ رکھے نیچے اُترنے لگا تھا۔

"وشنو نیچے نہیں جاتا۔" اوشا نے تیز لہجے میں کہا اور جھک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وشنو نے پورا زور لگا کر دروازے کو زور کا جھٹکا دیا اور اوشا کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سیڑھیوں پر لڑھکنے لگا۔ اوشا بجلی کی سی تیزی سے اُس کے پیچھے لپکی۔ ہری جو یہ سب دیکھ رہا تھا آگے بڑھا اور اُس نے وشنو کو تھام لیا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔" اوشا گھبراہٹ میں سارا غصّہ بھول چکی تھی۔

"نہیں! کہنی پر خراش آ گئی ہے معمولی سی۔" ہری نے جواب دیا۔

"پتلون کہاں ہے میری۔" وشنو کو نہ چوٹ کا احساس تھا اور نہ کسی اور بات کا۔

"یہ دیکھو بالکل ایسی ہے نا جیسی اُس دن دیکھی تھی تم نے۔" ہری کا غذ کا ایک بنڈل کھولتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی — یہ تو بالکل ویسی ہی ہے۔" وشنو پتلون دیکھتے ہی ایک دم چیخ اُٹھا اور اُس نے پتلون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"دیکھوں ذرا۔" اوشا نے ایسے کہا جیسے یہ پتلون اُسی نے سلوائی ہو۔

"ذرا پہن کر تو دیکھو بھیا۔" ہری وشنو سے کہہ رہا تھا اور آنکھ کے گوشوں سے اوشا کو دیکھ رہا تھا۔

اور جب اُس نے وشنو کو پتلون پہنائی تو وشنو کی آنکھیں، اوشا کے گال اور اُس کے ہونٹ چمک رہے تھے۔

اوشا نے پہلی بار بغیر جھجکے اُس سے پوچھا "کتنے دام ہوئے اس کے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں ؟"

"یہ کسی نے سلوائی نہیں ہے مجھ سے۔ اسے میں نے اپنی مرضی سے بنایا ہے۔"

"پھر بھی لاگت ہوگی اس پر ؟"

" جی ہاں۔ لیکن آپ کے لئے نہیں۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور پھر کہنے لگا۔ " یہ بھیا نے بنوائی ہے مجھ سے۔"

" ہاں یہ تو میں نے بنوائی تھی ہاں۔"

" تو چپ رہ۔ ہاں؟" اور وہ استہزا میہ انداز میں ہری کی طرف دیکھنے لگی۔

" آپ گھر میں جو کپڑا سیتی ہیں اپنی مرضی سے ۔۔۔ اس کے کون دام دیتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے کپڑا بناؤں تو کون دے گا دام مجھے؟"

منطق اپنی جگہ پر مکمل تھی۔ اوشا سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ اوپر جانے لگی تھوڑی دیر بعد جب ہری نے گانا شروع کیا تو اوشا نے کھڑکی کھول دی غیر ارادی طور پر، ہری کی آواز اور بلند ہو گئی۔

چند دنوں سے اوشا کی زندگی اور ہری کی آواز میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ ہری دھیرے دھیرے اوشا کے دن بھر کے پروگرام سے واقف ہوتا گیا۔ وہ جاننے لگا تھا کہ کب اوشا اپنے شوہر کو ناشتہ دیتی ہے، کس وقت وشنو کو نہلاتی ہے اور کب رسوئی سے لوٹتی ہے، کس وقت اُس کمرے میں آتی ہے جس کی کھڑکی اُس کی دوکان کے سامنے تھی۔ اب وہ دن بھر گاتا رہتا تھا۔ اوشا کی زندگی نے اپنا ایک معمولی سا خلا پُر کر لیا تھا۔ اب وہ رسوئی میں کھانا بناتے ہوئے اُکتاتی نہ تھی اور نہ اُسے وشنو پر بلا وجہ غصہ آتا تھا ۔۔۔ رسوئی میں کھانا بنا رہی ہو یا گھر میں جھاڑو دے رہی ہو یا بچوں کے کپڑے سی رہی ہو، ہری کی آواز سے اُسے اپنے کام میں بڑا سہارا ملتا تھا۔ اگر کسی وقت ہری کی آواز نہ آتی تو وہ اداس ہو جاتی اور ایسے وقت اُسے کسی بات پر ہنسی بھی آتی تو وہ اس سے بھی اُکتانے لگتی ۔۔۔ مگر چھٹی کے دن اُسے ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب پرکاش اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا تو وہ ٹھیک طریقے سے جواب نہ دے سکتی۔ اُس کی نگاہیں اور منہ پرکاش کی طرف ہوتا، دماغ گیت کے بولوں میں اور کان ہر لفظ بلند و پست ہونے والی آواز پر۔

" میرا خیال ہے کہ وشنو کو اسکول میں داخل کرا دوں۔" ایک دن پرکاش نے اُس سے کہا۔

اوشا خاموش رہی۔ ہری کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ گیت کے بولوں نے اُسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ایک اونچے بہت اونچے پہاڑ کی وادی میں پرواز کر رہی ہو جہاں نیچے سبزہ تھا اور آبشار، اوپر ستارے اور آسمان کی لامحدود وسعتیں ۔۔۔ اور وہ اُن سب کے درمیان اپنے آپ کو خیال سے زیادہ سبک اور قوس و قزح سے زیادہ رنگین محسوس کر رہی تھی۔

" میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

پرکاش نے نیم سنجیدہ اور نیم ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

" ابھی لاتی ہوں۔" اوشا نے اسی کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

" کیا؟" پرکاش نے حیرانی سے سوال کیا۔

" تم چائے مانگ رہے تھے نا۔"

" نہیں تو۔"

" ارے میں یہ ہی سمجھ رہی تھی۔" اُس نے لاشعوری میں پڑتے ہوئے تبسم کو ہونٹوں پر لانے کی ناکام کوشش کی۔

" اور میں بھی تم سے یہ ہی پوچھ رہا تھا۔"

" کیا؟" وہ پوچھنے لگی لیکن اُس کے لہجے میں کچھ جاننے کی خواہش نہ تھی۔

" تم کچھ دنوں سے اداس رہنے لگی ہو۔ ایسا کیوں؟"

" پہاڑوں کے درمیان بہتے ہوئے آبشار ستاروں کی مدھم روشنی میں کیسے لگتے ہوں گے؟"

اُس نے بالکل ایک غیر متعلق سا سوال کیا

" کیا بے تکی بات لے بیٹھیں تم۔"

" یہ سامنے جیں درزی کی دوکان ہے کتنا اچھا گاتا ہے۔"

پرکاش مُڑ کر ٹہلنے لگا اور پھر باہر چلا گیا۔ وہ اوشا کی اس تبدیلی کو کئی دنوں سے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ یکسانیت جس نے اوشا کو اوشا سے چھین لیا ہے، اُسے احساس تھا کہ اس میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کنواری اوشا کے آئیڈیل سے کم تر مخلوق بھی ہو سکتا ہے ۔۔۔ وہ سوچتا تھا ممکن ہے اوشا نے اُسے پا کر بھی اپنے "آئیڈیل" کو فراموش نہ کیا ہو۔ مگر وہ مجبور تھا وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

وشنو اب بے تکلفی سے ہری کی دوکان پر بیٹھا گھنٹوں اُس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اوشا اب اُسے ہری کی دوکان پر جانے یا اس سے باتیں کرنے سے نہ روکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ خود بھی اُس سے کسی نہ کسی بہانے بات کر لیا کرتی۔ بعض اوقات وشنو کو شرارتوں سے روکنے اور بعض اوقات کوئی غلطی پر جھ

منہ گانے کے لئے۔ ہری اب بھی اُسی طرح گاتا تھا۔ مگر گانے کے دوران میں بار بار اُس کی آنکھوں کو کھڑکی کے بند دروازوں سے ٹکرانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب وہ کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر ٹنگی ہوئی پرکاش کی تصویر پر جمی رہتیں۔ اور وہ اپنے گانے کی اُونچ نیچ سے زیادہ کھڑکی سے ذرا ہٹ کر کرسی پر بیٹھی ہوئی اوشا پر زیادہ توجہ دیا کرتا تھا۔ اوشا سنتی رہتی۔ ہری اور اُس کی "اوشا" گلتے رہتے۔

ایک اتوار کو پرکاش اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا اور اُس دن ہری کی دکان بھی بند تھی۔ اوشا بے دلی کے ساتھ کمروں میں ادھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ پریشان سی، مغموم سی، ایکدم ہری کی آواز سنائی دی۔

"وشنو بھیا۔ وشنو۔"

"ارے وشنو جا وہ بچھے تیرے ماسٹر جی بلا رہے ہیں۔"

"کہاں ہیں ماں؟" وشنو خالی نیکر پہنے اُٹھ آیا تھا۔

"وہ نیچے —— ارے" اوشا نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ زینے پر بھاری قدموں کی آواز آ رہی تھی۔

ہری لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا

اوشا حیرانی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"وشنو یہاں آؤ۔" اوشا ابھی تک اپنی حیرت کے احساس کو دبا نہ سکی تھی۔

"اور تم بھی میری۔۔۔ میری رانی۔۔۔۔" اُس کی آواز بار بار گلے میں پھنس جاتی تھی۔ شراب کی تیز بُو اوشا کی حیرانی اور خوف پر غالب آنے لگی تھی۔

پھر وہ آگے بڑھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے اوشا کو پکڑنا چاہا۔ اوشا نے بغیر کسی گھبراہٹ کے قریب پڑی ہوئی ایک ادھ جلی لکڑی اُٹھائی اور غصے کا اظہار کئے بغیر تین چار لکڑیاں پے در پے اُس کے سر پر ماریں۔ ہری کے سر سے خون کی کئی لکیریں ایک ساتھ بہہ نکلیں۔

"اب جاؤ یہاں سے۔" وہ ایسی نرمی سے بولی جیسے گھنٹوں وہ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی ہو۔

ہری نے اپنا ایک پسندیدہ گانا شروع کرنا چاہا۔ لیکن اوشا نے زینے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک دم زینے کی طرف بڑھا اور دیوار کا سہارا لے کر نیچے اُترنے لگا۔ اوشا کے ذہن میں ہری کے خلاف عجیب سا جذبہ اُبھر گیا تھا جو غصے سے بہت دُور تھا لیکن نفرت سے قریب بھی نہ تھا۔

دوسرے دن وہ پرکاش سے ناشتے کے بارے میں پوچھ رہی تھی تو پرکاش نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ کہیں سے طویل غیر حاضری کے بعد واپس آئی ہو۔

"اوشا آج تم پہلے کی طرح خوش نظر آ رہی ہو۔"

"میں ناخوش کب تھی؟"

"میں کچھ دن سے تمہارے اندر ایک تبدیلی سی محسوس کر رہا تھا۔"

"کیا ہمیں اور کہیں مکان نہیں مل سکتا۔" ایسا لگتا تھا جیسے یہ سُن کر اُسے کوئی بھولی بات یاد آ گئی ہو۔

"کیوں؟"

"اس مکان سے دل گھبرا گیا ہے۔"

"کیا اسی لئے تم اتنے دن اداس رہیں۔"

"ہاں۔" اُس نے ایسے کہا جیسے وہ اس بات کا اور کچھ بھی جواب دے سکتی ہو لیکن دینا نہ چاہتی ہو۔

"اچھا دیکھو میں تلاش کروں گا۔ جلد ان بیکار باتوں کو۔ تمہارے ہاتھ کتنے اچھے ہیں۔" وہ دوپہر بھی پیاسے ہونٹوں کی طرح خشک اور بھٹی کی آنچ کی طرح تکلیف دہ حد تک گرم تھی۔

شاہین غازی پوری

غزل

میری چاہت پہ نہ الزام لگانا لوگو | کچھ سمجھ کر ہی اُٹھاتا ہے کوئی بارِ گراں
پھر سرِ شام تمھیں نیند نہ آ جائے کہیں | منزلِ عشق بہت دور ہے اے راہرواں
پہلے ذرّاتِ زمیں بوس کا ہمراز تو بن | پھر سمجھنا بہت آساں ہے ستاروں کی زباں
حُسنِ محبوب! جفاؤں پہ پشیماں نہ ہو | ہم مریضانِ وفا خود ہیں بہانہ ساں
پھر زمانے میں ترا نام نہ لے گا کوئی | رہ گئے یونہی تہی جام اگر تشنہ لباں
رازدارِ گل و نسریں تو ہزاروں تھے مگر | کوئی سرمایۂ اشجار کی سمجھا نہ زباں

پھینکتی ہے ترے شاہین پہ دنیا پتھر
ناگہاں چور نہ ہو جائے یہ شیشے کا مکاں

غلام احمد فرقت

مولانا حسرت موہانی کے لطائف

رئیس التحریر مولانا حسرت موہانی مرحوم ڈاڑھی نکلنے سے قبل دیکھنے والوں کو خواہ صورت سے لاکھ شاعر یا سیاست داں معلوم ہوتے ہوں، مگر ان کی وہ عمر جو سیاہ سفید اور کھچڑی داڑھی کی راہوں سے ہوکر گزری ہے۔ اُس میں نہ تو وہ صورت سے شاعر معلوم ہوتے تھے اور نہ رفتار و گفتار سے سیاست داں، لباس بھی وہ ساری عمر شاعری اور سیاست دانی سے آنکھیں چُرانے والا پہنتے رہے۔ حالانکہ گذشتہ نصف صدی کے اردو غزل گو شعرا اور ناقدین میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور یہی حال ان کی سیاست دانی کا تھا۔ سیاسی میدان میں جہاں تک آزادئ وطن کی راہ میں قربانی دینے اور جیل جانے کا سوال تھا، اُس میں بھی بڑے سے بڑا دھاکڑ اور جیل کا کُندہ اُن کے سامنے طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۳۰ء میں جب کانگرس نے انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی اور لکھنؤ میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا جیل نہ جاتے۔ امین الدولہ پارک میں شام کے وقت پارک کے دونوں طرف جیل کی لاریاں کھڑی رہتی تھیں، پارک میں کانگریسی لیڈر حکومت کے خلاف تقریریں کرتے اور یہ لاریاں اُن کو بھر بھر کر حوالات پہنچا آتیں۔ اُس زمانے میں امین آباد پارک ایسا بارونق نہیں تھا جیسا کہ اب ہے، بلکہ اُس میں بڑی بڑی گھانس اُگی ہوئی تھی۔ مولانا اسی پارک میں گرفتار ہوئے۔ اور جس وقت گرفتار ہوئے جا رہے تھے اُس وقت راقم الحروف وہاں موجود تھا۔ مولانا اپنی تقریر ختم کرکے جیسے ہی چبوترے سے اُترے سپاہی آپ کو پکڑنے کے لئے لپکے، پہلے تو مولانا نے سپاہیوں کو ایک طرح کی جھکائی دی، اس کے بعد ایک دم زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور گھانس پکڑ لی۔ اب عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ دو سپاہی مولانا کو اوپر کی طرف کھینچ رہے تھے، اور دوسری طرف مولانا تھے کہ گوہ کی طرح زمین پکڑے تھے۔ آخر تین سپاہیوں نے زور لگا کر جو مولانا کو پوری قوت سے کھینچا تو جڑ سمیت مولانا اکھڑ آئے اور سپاہیوں نے مولانا کو پارک کے باہر لاری کے دروازے پر گود میں لاکر اس بے دردی سے لاری میں ٹھونس دیا جس طرح انجن میں کوئلہ جھونکا جاتا ہے۔ مولانا نے نونِ غنّہ کے ساتھ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کیا، اور رستے بھر نعرے لگاتے لاری پر جیل روانہ ہوگئے۔

سنہ ۴۶ء یا سنہ ۴۷ء میں ایک دن میں نے دیکھا کہ امین آباد میں جہاں پُرانی کتابوں کی دوکانیں ہیں، وہاں مولانا ایک یکّہ والے سے کرایہ پر بحث میں مصروف تھے، اُس روز اُن کے سر پر بجائے ترکی ٹوپی کے سفید ٹوپی تھی، غالباً وہ عجوبۂ روزگار ٹوپی گھستے گھستے یا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکی تھی یا ممکن ہے کہ انھوں نے اس کو عید، بقرعید کے موقع پر پہننے کے لئے رکھ چھوڑا ہو، بہر حال اُس وقت اُن کے سر پر ایک دو پلی، سہ پلی یا چوگوشیہ قسم کی ایک قلندرانہ ٹوپی تھی، اُس کے نیچے پہنے تھے، جو حجّام کی حسرت میں گرتے گرتے لاوارثوں کی زندگی بسر کرنے پر اتر آئے تھے، اُس کے نیچے ایک کوٹ تھا، جو نزکوں کی اس ضد میں پہن رکھا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے یہاں اُسے متروک کیوں قرار دیا، اور اس کوٹ کی دل جوئی کے لئے انھوں نے اُس میں دو ایک جیبوں کا اور اضافہ کرلیا تھا، تاکہ جس وقت کتب فروش اُن کی لکھی ہوئی غالب کی شرح کے نسخے انھیں واپس کریں تو اُن کے ہاتھ مصروفیت سے بچے رہیں اور چمڑے کا کرم خوردہ بٹوا یا تھیلا اُن کے داہنے ہاتھ کی رفاقت سے منہ نہ موڑنے پائے۔ یکّہ پر غالباً دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے اُس وقت تک جس وقت کہ یہ بحث ہو رہی تھی، مولانا کو کبھی امین آباد سے باغ مولوی انوار تک جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، اسی لئے اُن کا خیال تھا کہ چوک سے امین آباد اور امین آباد سے چوک تک کا وہی تین پیسے سواری کرایہ ہے، جو جنگ

چھڑنے سے پہلے تھا۔ چنانچہ اپنے لون غنّہ آمیز مکالمے میں مولانا بکّہ والے سے فرما رہے تھے۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ بھی برابر سرمایہ داریں کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہوں، بڑیں شرم کی بانت ہے۔"

اور یکّہ والا اپنی بیڑی جلانے میں اس طرح مصروف تھا کہ گویا یہ ساری باتیں کسی اور سے ہو رہی ہیں، اور اُس سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ جانے وہ مولانا کو کیا سمجھے ہوئے تھا۔

میری کتاب 'مداوا' کی اشاعت کے بعد مولانا بھی حیدرآباد میں ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں میرے خلاف بہت کچھ کہہ کر واپس ہوئے۔ کتب خانہ دانش محل لکھنؤ میں ایک دن شام کو مولانا بیٹھے تھے کہ میں پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے مولانا سے کہا کہ مولانا! سبھوں نے تو میری مخالفت میں جو کچھ کہا وہ کہا، البتہ حیرت ہے کہ آپ نے بھی اُن کی ہمنوائی کی، حالانکہ مداوا میں جو پیروڈیز میں نے آزاد نظموں پر لکھی ہیں اُن کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ مجھے اُن تجربوں سے اختلاف ہے، جو بعض ترقی پسند ادبا اور شعراء اردو شاعری میں کر رہے ہیں۔ بلکہ اختلاف اس چیز سے تھا اور ہے کہ ہر یونیورسٹی سے نکلا ہوا نوجوان اندھا دھند شاعر بنا چلا جا رہا تھا اور ترقی پسندی کے نام پر نہ صرف اِن تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل نے مہمل گوئی شروع کر دی تھی، بلکہ وہ عریانی اور فحاشی کو بھی جزوِ ادب سمجھنے لگے تھے، اور اسی کو وہ ادب برائے زندگی سمجھنے لگے تھے، بولے

"توں کیا فحاشی کو آنپ براں سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تو فحاشی یعنی فاسقانہ شائنعری ہی حقیقیں شائنعری ہے، ورنہ بقیاں شائنعری محض بناوٹ ہے۔"

میں نے کہا، اور عارفانہ شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

بولے۔

"ییں ہیں اللہ اکبر، اللہ اکبر واں لی شائنعری۔"

اس کے بعد بولے۔

"مگر آنپ نے اچھاں کیا، میں آنپ کی رائیں سے بالکل متّفق ہوں، اس سیں زیادہ سخت آنپ کو لکھنا چاہیئے تھاں۔ میں نے کتاب نہیں پڑھی ورنہ میں بہنت سخت ڈانٹتا۔"

اس کے بعد میں نے کہا کہ مولانا اگر آپ اجازت دیں تو میں دو تین باتیں آپ کی زمانۂ طالب علمی کے زمانہ کی آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

بولے۔

"اس کیں کیا ضرورنت ہے۔"

میں نے کہا کہ یہ گستاخی محض اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ آپ باقیات الصالحات میں سے ہیں، اور آپ کی زبانِ مبارک سے ہر ایک فقرہ آئندہ نسلوں کے لئے ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

بولے۔

"توں آپ کس قسم کے وانقعات معلوم کرنا چاہنتے ہیں؟"

میں نے کہا، مثلاً علی گڑھ کے طلباء میں جو شوخی اور شریفانہ شرارتیں آپ کے زمانۂ طالب علمی میں رائج تھیں اور اُن شریفانہ شرارتوں میں آپ کا جو کچھ حصّہ رہا ہو۔

بولے۔

"ہیں گو اپنے ساتھیوں میں بہت شوخ مشہور تھا، مگر وہاں کی ایکٹی وٹیوں میں زیادہ تر حصّہ نہیں لیتا تھاں، مگر پھر بھی اُن سے گریز کرنا شرافت کے منافی سمجھتاں تھا۔ چنانچہ میں بی۔ اے کے دوسرے سال میں تھاں، تو میرے ایک ساتھی نے قریب کے ایک آم کے بانغ میں سے آم توڑ لیا۔ اِس پر بانغ بچانے والے نے اُن کو پکڑ لیاں۔ یہ بانغات یونیورسٹی کے تھے، اور اُس کی فصل پک چکیں تھی جس سے یونیورسٹیں کی سالانہ آمدنی خاصی تھی۔ ساتھی کے پکڑے جانے پر میں اور میرے دو ایک ساتھیں اور جمع ہو گئے۔ بانغ شنز کی خاطر میں نے پوچھا کہ کیاں بانت ہے۔ اِس پر بولا: اِن صاحب نے ساراں بانغ اُجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں نے کہاں: ایک آم توڑنے سے کہیں بانغ انجڑتا ہے؟ اِس پر ٹراں کر بولاں: بانغ ایسے ہی اجڑتا ہے، اور کیا اُسے اجاڑنے کے لئے ہاتھیں آئیں گے۔ مجھیں غصّاں آگیا، اور میں نے کہاں: بانغ انجڑاں تو نہیں تھاں، البتّاں اب انجڑے گا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے بانغ پر دھاواں بول دیا، اور بُری طرح بانغ تباہ کرنا شروع کر دیا۔ اِس پر اچھیں خاصی مارپیٹ ہوئی جس میں سب سے زیادہ اُس نے مجھیں

مجھیں کوں مانا۔ سب سانتھی تو بھاگ گئے بمگر وہ مجھیں برا نبر مارتا رہا تھاں، اور میں بہر ہاتھ پر زمین سے اینک ڈھیلاں اُٹھا نکر آم کے درخت پر پھینکتا جاتا تھا، اور اُس کاں ہاتھ نہیں رُکتاں تھا۔ میں کہتاں تھا کہ ابیں جب چھوڑئے گا تب بیہیں کردں گا۔ اِس بیزدہ اور مارتا، آخر تھنک کر اُس نے مجھیں چھوڑ دیا، اور سیندھا پرنسپل کے پانس آیا، اوُ اُن سے ہم سبھوں کی شکانیت کردی۔ ڈانکٹر ضیا رالدین نے اُس زمانے میں یونیورسٹیں سے نکال دیا، اور مجھسے کہا کہ انگر تم معانفی مانگ لے توں تم کوں معانف کنر دیاں جائے گا۔ میں نے کہاں کہ انگر سلئے جائیں گے تو سنب لئے جائیں گے، ورنہ میں تنہاں نہ رہوں گا۔ اور یہ کہنکر میں کانن پور چلا آیا، اور دوسرے لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے بعند میں ڈانکٹر صاحب سبھوں کو لینے پر تیار ہو نگئے۔ مگر میں نے علا والقیاں اس کے بعند بھی والپس نہیں آئے، اور میں نے بڑی ممتانز حینثیت سے بی، ایے، پانس کیا۔"

اب جو واقعہ بیان کر رہا ہوں وہ ایک صاحب کا بیان کردہ ہے اور اس کی صداقت اور عدم صداقت کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر چونکہ واقعہ دلچسپ ہے اور مولانا کے کردار کی روشنی میں اس کے غلط ہونے کا امکان کم ہے۔ اس لئے بیان کئے دیتا ہوں۔ بہر حال اس کی صداقت اور عدم صداقت برگردنِ راوی۔

مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد جب ایک گڈول مشن چودھری خلیق الزماں کی سرکردگی میں مصر بھیجا گیا تو اُس زمانے میں وہاں کے وزیر اعظم نحاس پاشا تھے۔ اُس مشن میں مولانا بھی شامل تھے۔ چنانچہ مصر پہنچ کر بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ مصر پہنچنے پر مولانا نحاس پاشا سے ملنے گئے۔ گیٹ کے پاسبان نے اُن سے داخلے کا سرکاری اجازت نامہ طلب کیا۔ اس پر مولانا حد درجہ چراغ پا ہو کر بولے "یہاں بھیں وہی پانس وانس والاں طریقاں رائج ہے۔ میں تو بغیر پانس ہی کے جاؤں گا۔" اِس پر پاسبانوں سے خاصی جھگڑے کی صورت پیدا ہوگئی۔ اتنے میں نحاس پاشا جو کہیں گئے ہوئے تھے اپنی موٹر پر آگئے، اور سیدھے اندر چلے گئے، اور جب اندر جاکر انھیں معلوم ہوا کہ مولانا حسرت آئے ہیں تو انھوں نے انھیں اندر بلوا بھیجا۔ مولانا نے سب سے پہلے نحاس پاشا سے کہا، "جناب آپنے بھیں ہندوستان جیساں طریقاں اپنے یہاں جاری کر رکھاں ہے، یہ تو غلط ہے!"

ہندوستان سے جو گڈول گیا تھا اُس کے ممبروں کو ایک روز ممبرانِ پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کا موقع دیا گیا۔ سب سے پہلے "امیر المومنین" چودھری خلیق الزماں صاحب کی تقریر ہوئی جس میں انھوں نے ہندوستان اور مصر کے قدیم تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں کہیں برطانوی سیاست کی تعریف کردی۔ اس کا سننا تھا کہ اپنی نشست پر مولانا کی حالت غیر ہونے لگی۔ جیسے جیسے چودھری صاحب کی زبان سے برطانیہ کی مدح میں فقرے نکلتے ویسے ویسے مولانا پر ہسٹریا کے سے دورے کی شدت زور پکڑتی جاتی۔

چودھری صاحب کے بعد دوسرا نمبر مولانا ہی کا تھا۔ چنانچہ پندرہ منٹ مولانا کو بھی تقریر کے لئے دئے گئے تھے۔ آپ جب تقریر کرنے گئے تو آپ نے اپنے پورے پندرہ منٹ صرف چودھری صاحب کی مذمت اور ان کی تقریر کی تردید میں صرف کر دئے۔ اس کے بعد جو رعایتی وقت دیا گیا اُس میں براہِ راست برطانیہ کی مذمت میں دل کی بھڑاس نکال لی۔ دورانِ تقریر میں پہلے وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ اس گھنٹی کے وار کو مولانا نے خالی دیا۔ اُس کے بعد دوسری گھنٹی، پھر تیسری گھنٹی اور پھر مسلسل گھنٹیاں بجنا شروع ہوئیں۔ مگر وہاں نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا، مولانا برطانیہ پر گولہ باری کرتے یا فضول اوقات کی پابندی میں اپنا وقت ضائع کرتے۔ آخر میں جب مولانا اس پر بھی نہ مانے تو اُن کو اٹھا کر کرسی پر لے جایا گیا، مگر مولانا کرسی اور اسٹیج کے درمیانی حصے میں بھی بولتے رہے۔ اس کے بعد کہاں کی دوستی اور کہاں کا گڈول مشن۔ وہ مصر سے ہندوستان چل پڑے، اور ہندوستان آتے آتے کراچی میں چودھری صاحب کی مزید مذمت میں ایک لمبا چوڑا بیان اخبارات میں دے مارا جس میں مصریوں کی مذمت کم اور چودھری صاحب کی "مرمت" زیادہ تھی۔ یہ بیان راقم الحروف نے ضرور پڑھا تھا۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں میں نے ہفتہ وار "صداقت" لکھنؤ کا ایک ہندوستانی نمبر شائع کیا تھا۔ مولانا اُس زمانے میں یو۔ پی اسمبلی کے ممبر تھے۔ چونکہ اِن دنوں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، اس لئے لکھنؤ ہی میں مقیم تھے۔ میں اس سلسلے میں ان سے ایک مضمون لینے کی غرض سے کونسل چیمبر گیا۔ مولانا لنچ ٹائم میں اجلاس سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے مولانا کو اپنے ملنے کی غرض بتائی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس نمبر کے لئے ہندوستانی پر کوئی مضمون آپ بھی لکھ دیں۔ مولانا یہ سنتے ہی چراغ پا ہوگئے،

بولے۔

"میں تو آپ کی رائے سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اردو اور ہندوستانی کا جھگڑا کھڑا کرنے کے ذمہ دار کون دو صاحبان ہیں ـــــ اوّل آرزو لکھنوی جنھوں نے اِس دور میں خالص اردو کا جھگڑا کھڑا کیا، اور دوسرے...... جنھوں نے اُردو کو ہندوستانی کہہ کر اُردو کو اور مصیبت میں مبتلا کیا۔ دونوں نے اردو کے ساتھ دشمنی کی۔ ارے صاحب یہ خالص اردو اور ہندوستانی کیا چیز ہوتی ہے، آپ سیدھی سیدھی اردو کہتے کیوں شرماتے ہیں"۔

اکتوبر ۵۰ء میں مولانا بارھویں مرتبہ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد کراچی سے خشکی کے راستے کانپور جانے کے لئے ۱۷ اکتوبر کو لاہور پہنچے۔ وہاں کے لوگ حسرت موہانی کے نام سے تو ضرور واقف تھے، اور ان کے کلام کو بھی پسند کرتے تھے۔ مگر ان کی شکل و صورت سے ناآشنا تھے۔ حسرت کے کلام، اُن کی شاعرانہ عظمت اور ان کی سیاست دانی سے لوگوں کا خیال تھا کہ جیسے خوبصورت اور دلکش شعر کہتے ہیں، ویسا ہی اُن کا لباس، اُن کا چہرہ اور ان کی رفتار و گفتار بھی ہوگی۔ پاکستان کے صاحب بہادران یا وہاں کے حکام تو کہاں کہ اس عظیم المرتبت شاعر کے استقبال کے لئے اسٹیشن آنے کی زحمت گوارا کرتے، اور نہ وہاں کے سیاست دانوں کو اپنی لین دین والی سیاست سے اتنی فرصت تھی کہ وہ حسرت جیسے مخلص کو لینے کے لئے اسٹیشن آتے یا کم از کم اپنی زرق برق موٹریں ہی بھیج دیتے، البتہ اِدھر سے گئے ہوئے چند مخلصین میں سے دو ایک جنھیں اطلاع ملی تھی کہ مولانا آرہے ہیں، وہ اسٹیشن پہنچے۔ مگر ان لوگوں میں سے بھی شاید کسی کو بالمشافہ مولانا سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، لہٰذا ان کا بھی یہی خیال تھا کہ کم از کم مولانا فرسٹ نہیں تو سکنڈ کلاس سے تو ضرور ہی آئیں گے اور چونکہ وہ اُن کے مزاج سے ناواقف تھے، اس لئے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ گاڑی رُکتے ہی پہلے مولانا کا پرائیویٹ سکریٹری منہ میں سگار لگائے اور بہترین سوٹ پہنے پلیٹ فارم پر اپنے جوتوں کو دیکھتا، اپنے جدید وضع کے سوٹ پر تجزیہ نگاہیں ڈالتا اترے گا اور چلائے گا۔ ہوشیار رئیس التحریر حضرت مولانا حسرت موہانی کی سواری آگئی۔ اس کے بعد اُن کا بہترین ریشمی ہولڈال اُتارا جائے گا۔ پھر بہترین قسم کے ہینڈ بیگ ہوں گے جن کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ناشتے دانوں کا سلسلہ شروع ہوگا، جن میں پلاؤ، باقرخانی اور فرینی کی خوشبوؤں میں مرغ مسلم اذانیں دیتے ہوں گے۔ اُس کے بعد مولانا عطر اور کیوڑے میں بسے بہترین لباس میں فرسٹ کلاس کے ڈبے سے برآمد ہوں گے، اور کائنات چلّا اٹھے گی کہ دیکھو حسرت موہانی انھیں کہتے ہیں۔ چنانچہ جس گاڑی سے مولانا آنے والے تھے اُس کا عالم اِن معنوں میں دیکھنے والا تھا کہ چند معتقدین اِدھر اُدھر گھبرائے گھبرائے ہر فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے ڈبے میں ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے مظاہرے کر رہے تھے، سب سے زیادہ ہائی جمپ کرنے والوں کی پوزیشن سکنڈ اور فرسٹ کلاس ہی پر تھی، ایک صاحب ایک فرسٹ کلاس میں گھس گئے اور وہاں ایک سفید پوش ریشائیل بزرگ سے فرمانے لگے "تشریف لے چلئے نا!" مگر جب اُنھیں معلوم ہوا کہ وہ صاحب ایک انگریز پادری ولیم ڈیوڈ ہیں جو لاہور کسی کام سے آئے ہوئے ہیں، تو ایک دوسرے صاحب سے جو بہترین قسم کا سوٹ پہنے بیٹھے تھے حسرت کا شبہ کرکے مکالمے میں مصروف ہوگئے۔ گاڑی کے بالکل کنارے تھرڈ کلاس کا ایک ڈبہ لگا ہوا تھا جس میں چیکٹ پنجاب کی دیہاتی عورتیں اور مرد بھرے تھے اور پورے دھکا پیل کے ساتھ اتر رہے تھے۔ اِسی بھیڑ سے ایک صاحب کچلتے کچلاتے اور دھکے کھاتے اترے جن کی وضع قطع یہ تھی کہ مٹیالی سفید بے داغ داڑھی، چہرے پر بنی ہوئی جھریاں، بڑی بڑی آنکھوں پر ایک لمبے شیشوں والی عینک جس کا فریم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہمارا بھی قصور معاف کرا دے۔ کیونکہ کھال اُترنے کے بعد فریم کے ریڑھ کی ہڈی نے اندر سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ ہاتھ میں حضرت نوح علیہ السلام کے جہیز کی چھتری جس کا کپڑا اپنا سیاہ رنگ چھوڑنے کے بعد عام دُنیوی رنگوں سے مختلف رنگ اختیار کرنے پر کمر بستہ تھا۔ بغل میں ایک بستر جسے سُتلی باندھ کر پھانسی دے دی گئی تھی، ایک عبادت گذار لوٹا جس کے ماتھے پہ پایا خانۂ کعبہ کی زیارت کرنے کے سبب سیاہ گھٹے پڑ گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی جو کسی زمانے میں خواہ کتنی چھڑی رہی ہو، مگر اُس وقت تو وہ ترازو کی ڈنڈی معلوم ہونے لگی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ اپنا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لئے پلیٹ فارم سے باہر نکلے تو نہ جانے مجمع اُن کے گرد کیوں جمع ہوگیا، اور کچھ نے بستر اور کچھ نے جھولا اُن کے ہاتھ سے لینا شروع کیا مگر اس پر اسی اور لن ترانی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ اتنے میں ایک صاحب جو غالباً اُن کو پہچانتے تھے، اپنے ہمراہ لے چلے گئے۔

یہ تھے رئیس التحریر مولانا حسرت موہانی مرحوم، جن کا جواب شاید اب دُنیا نہ پیدا کر سکے۔

مالک رام
ع - م

کتابیں اور رسالے

کتاب نورس

مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی - مُرتبہ، ڈاکٹر نذیر احمد
صفحات ۱۶۸ مجلّد ـ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
ملنے کا پتہ - دانش محل امین الدّولہ پارک لکھنؤ

بہمنی سلطنت کے زوال پر جو پانچ سلطنتیں عالم وجود میں آئیں، اگرچہ وہ سب کی سب علم و فضل کی قدر دان تھیں ـ لیکن ان میں بھی دو خاص طور پر ممتاز تھیں ـ گول کنڈہ کے قطب شاہی اور بیجا پور کے عادل شاہی - اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر اسی قطب شاہی خاندان کا پانچواں حکمراں محمد قلی تھا (۱۵۸۰ء ۱۶۱۱ء)ـ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی مہربانی سے اس کی مفصل سوانح عمری اور دیوان شائع ہو چکا ہے ـ عادل شاہیوں کا دربار بھی شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کے لئے مشہور رہا ہے ـ اسی خاندان کا چھٹا بادشاہ ابراہیم ثانی (۱۵۸۰ء - ۱۶۲۶ء) فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا شاعر تھا ـ زیرِ نظر کتاب نورس اسی کی تصنیف ہے ـ جسے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے ـ

ڈاکٹر صاحب موصوف نے فارسی کے مشہور شاعر ظہوریؔ پر کام کیا ہے، اور یہی ان کی ڈاکٹریٹ کی سند کے مقالے کا موضوع تھا ـ ظہوری پر کام کرنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ انھیں ابراہیم ثانی اور انھیں کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے دلچسپی پیدا ہو جاتی، کیوں کہ ظہوری اسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھا، اور 'سہ نثر ظہوری' میں سے ایک نثر اسی کتاب نورس' کا دیباچہ ہے ـ

'کتاب نورس'، دراصل موسیقی کی مختلف اصناف کے نمونوں پر مشتمل ہے ـ ابراہیم عادل شاہ خود ماہرِ فن اور موسیقی کا بہت بڑا رسیا تھا ـ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "اس دنیا میں دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک طنبورہ اور دوسرے خوبصورت عورت" یہ کوئی مسلسل کتاب نہیں بلکہ مصنف نے مختلف راگوں کے لئے خالص ہندی زبان میں گیت لکھے اور انھیں اس کتاب میں جمع کر دیا ـ پوری کتاب میں ۵۹ گیت اور ۱۷ دوہے ہیں جنھیں ڈاکٹر نذیر احمد نے اب پہلی مرتبہ نو قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مرتب کیا ہے، کتاب کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے ـ اس کے بعد کتاب کا متن ہے ـ پھر ترتیب وار تمام گیتوں کا اردو ترجمہ ہے ـ چونکہ گیت ہندی زبان میں ہیں ـ اس لئے ہندی دیو مالا کے قصّوں کی طرف اشارہ ناگزیر تھا ـ ترجمے کے بعد ایک باب میں ان تمام تلمیحات کی تشریح ہے ـ آخر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ ہے ـ

کتاب میں بعض قلمی نسخوں کے چند صفحوں کے عکس بھی ہیں ـ

یہ خیال کہ کتاب دکھنی زبان کا نمونہ ہے (دیباچہ صفحہ ۸، ۲۳ وغیرہ) غلط ہے ـ چند گیتوں کو چھوڑ کر جن کی زبان نسبتًا آسان ہے، پوری کتاب خالص اور مشکل ہندی زبان میں ہے جس میں سنسکرت کا بھی اچھا خاصا حصّہ ہے ـ اسے کسی طرح دکھنی یا اردو کی ابتدائی شکل قرار دینا ٹھیک نہیں ہوگا ـ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی دیباچے کے دوسرے حصّے میں اپنے پہلے بیان کی تردید کر کے یہی لکھ دیا ہے (صفحہ ۲۸)

چند گیتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں ـ

۱ - میرا پریتم مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا، تو اُس کی جدائی سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ـ لیکن میں نے ان سب ٹکڑوں کو جمع کر کے تسبیح بنا لی، اور اُس کے نام کا ورد کرنے لگا ـ چونکہ اس کا دھیان آبِ حیات ہے ـ اس لئے اب موت میرے قریب نہیں پھٹک سکتی ـ

۲ - دوست کا عکس میری آنکھ کی پتلی میں ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسا حضرت یوسف ہوں، جنھیں ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا ہے ـ

۴ - چاندنی رات کی تشبیہ میں کہتا ہے ـ یہ دنیا گھڑا ہے، جس میں چاندنی

کا دودھ بھرا ہے ۔ چاند خالص مکھن ہے ۔ جو گھڑے کے منہ پر آ گیا ہے ۔

۴ - چاند اپنی سیاہی اور سپیدی کی وجہ سے ایک حسین عورت کی طرح ہے ۔ بادل اس پر ایسا ہے جیسا کسی حسین کے چہرے پر آنچل ۔ ہوا کی وجہ سے کبھی چہرہ چھپ جاتا ہے اور کبھی کھل جاتا ہے ۔

اس کتاب سے اردو ادب میں ایک دلچسپ کتاب کا اضافہ ہوا ہے ۔

(مالک رام)

شاہراہ (طنز و مزاح نمبر)

مرتبہ فکر تونسوی ۔ حجم ۳۰۸ صفحات ۔ قیمت تین روپیہ

ملنے کا پتہ : مکتبہ شاہراہ ۔ اُردو بازار ۔ دہلی

طنز و مزاح بڑا وسیع اور نازک موضوع ہے ، اور اُسے نباہنا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ ہماری زبان میں صحیح مزاح بہت کم لکھا گیا ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرزِ کلام کے لئے ہمارے ہاں کی آب و ہوا راس بھی نہیں ۔ مزاح کے لئے اوّلین شرط آزادیٔ فکر اور غمِ روزگار سے اطمینان کی ہے ۔ لیکن جس ملک میں غلط روحانیت اور مذہبیت کا دیو دماغ پر اس طرح مسلط ہو ، جیسا ہمارے ہاں ہے ، اور جہاں لوگوں کو پیٹ کا دھندا چین سے بیٹھنے نہ دے ، وہاں بے فکری کی کہاں سُوجھ سکتی ہے ۔ البتہ حالات طنز کے لئے ضرور ساز گار تھے لیکن ہم نے اس میدان میں بھی کوئی نمایاں اور قابلِ قدر کارنامہ نہیں دکھایا ، اُردو ادب کی ساری تاریخ میں طنز و مزاح کی کامیاب مثالیں بہت نادر ہیں ، اور ستم یہ ہے کہ آج تک اُس کی تاریخ لکھنے کی بھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ۔ لے دے کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک کتاب "طنزیات و مضحکات" اس موضوع پر ہے ، اور اس میں بھی کتنی کتر بیونت کی ضرورت ہے ۔

شاہراہ کے اس نمبر میں بھی اس صنفِ ادب کی تاریخ و تدوین پر تو توجہ نہیں کی گئی ۔ لیکن بعض اچھے اچھے مزاحیہ مضمون اس میں ضرور جمع ہو گئے ہیں ۔ قدسیہ زیدی کا ڈرامہ "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" جو امتیاز علی تاج کے اسی نام کے مشہور افسانے پر مبنی ہے ، کامیاب کوشش ہے ۔ رشید احمد صدیقی کا مضمون اگرچہ مختصر ہے ، لیکن بڑا خیال انگیز ہے ۔ بعض اور مضمون بھی خوب ہیں ۔

(مالک رام)

گجر (دو ماہی)

فی پرچہ ۲/۸ ، سالانہ دس روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ۔ گجر ۔ بی ۴۴۳ ۔ نامپلی مارکیٹ حیدر آباد دکن ۔

اس رسالے کا یہ دوسرا شمارہ ہے ۔ گجر سے ہمارے موقت الشیوع پرچوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے ۔ اسے اردو کے بعض اچھے اور مشہور لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے ۔ چنانچہ زیرِ نظر پرچے ہی میں ڈاکٹر اعجاز حسین ، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ، سجاد ظہیر کے مقالے ، فراق ، آثر ، مُلّا ، آل احمد سرور ، وحید کے منظومات ، قاضی عبد الغفار ، عصمت چغتائی ، ل احمد ، وغیرہ کی نگارشات شامل ہیں ۔

پرچے کی اُٹھان اچھی ہے ۔ خدا نظرِ بد سے بچائے ۔ اگر یہ پرچہ جاری رہا تو اُردو کا اچھا خدمت گذار ثابت ہو گا ۔

سرفراز (محرم نمبر)

۲۶۰ صفحے ۔ قیمت ۸/ ۔ ملنے کا پتہ ۔ منیجر سرفراز لکھنؤ ۔

یہ لکھنؤ کے مشہور اخبار سرفراز کا محرم نمبر ہے ۔ جس میں مشہور لکھنے والوں نے محرم کے موقعے پر حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی شہادت سے متعلق اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار نظم و نثر میں کیا ہے ۔ بعض مضمون واقعی دلچسپ ہیں ۔

(مالک رام)

دھمپد

ناشر ، انجمن ترقی اردو ہند ، علی گڑھ قیمت ، تین روپے

مہاتما گوتم بُدھ کے تلقیناتِ مقدس کا منظوم اردو ترجمہ ۔ مترجم منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی ۔ منوّر صاحب اس سے قبل گیتا اور کمار سنبھو کے کامیاب ترجمے نظم میں پیش کر چکے ہیں ۔ اس ترجمے میں بھی اصل کی شان نظر آتی ہے ۔ منوّر صاحب نے اپنی قادر الکلامی پر ایک اور مہر ثبت کی ہے ۔

حکیم بانا (زمینوں کا بادشاہ)

از علی عبّاس حسینی ۔ ناشر ادارۂ فروغِ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

قیمت تین روپے ۔

بقولِ مصنّف " حکیم بانا کا کردار اس سوسائٹی کی کلچرل ذہنیت کو نمایاں کرتا ہے جس میں غلبیت بھی تھی ، رومانیت بھی ، حقیقت سے چشم پوشی بھی تھی جھوٹے خوابوں کی تعبیروں کی تلاش بھی ۔ پُرانی عظمتوں کی جھلک بھی اور زوال پذیر ہونے کے سارے آثار و قرائن بھی "

یہ کردار واقعی اردو کے مزاحیہ کرداروں میں ایک اضافہ ہے۔

سنگِ میل

یعقوب عثمانی صاحب (محلہ گھاٹی، اورنگ آباد، دکن) کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ ناشر، مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی۔ قیمت دو روپے

یعقوب عثمانی صاحب بڑی سوجھ بوجھ اور علم و فضل کے مالک ہیں۔ "شعر و نغمہ" آپ کا پہلا مجموعہ ملک کے اکابر سے دادِ سخن پا چکا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں نظمیں اور غزلیں بھی آپ کی ترقی پسندی اور خوش ذوقی کا مظہر ہیں۔ ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

انگاروں کے گیت

حسن شہیر صاحب کا مجموعۂ کلام۔ ناشر، کتابستان الہ آباد۔ قیمت ۲ روپے

کتاب بہت حسین و جمیل چھپی ہے۔ ابتدائیہ خود مصنف نے ہی لکھا ہے جس میں اپنے نظریۂ سخن کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جس طرح نظم میں اُلجھاؤ ہے نثر بھی اظہارِ مطالب میں قاصر ہے۔ ترقی پسندی اس کا نام تو نہیں کہ ترقی پسند خیالات یا تاثرات ابہام اور الجھاؤ کا شکار ہو کے رہ جائیں۔ نظموں میں جدّتِ تراکیب و جدّتِ بیان تو موجود ہے لیکن وہ سپردگیٔ بیان نہیں جو قدرتِ کلام سے حاصل ہوتی ہے۔ مصنف اس بات کے مدّعی ہیں کہ وہ قدامت پرستی سے دُور ہیں۔ یہ تو بڑی غنیمت بات ہے لیکن قدامت سے ہٹ کر حال کو پُوجنے کے لئے ایک سلیقہ چاہیئے۔ وہ سلیقہ ہمیں اس کلام میں نہیں ملتا۔

نئے اور پُرانے چراغ

آلِ احمد سرور صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ (مع اضافہ جدید)

ناشر، ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ۔ قیمت پانچ روپے۔ تیسرا ایڈیشن۔

دیباچے کے علاوہ سولہ تنقیدی مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔

فہرست مضامین یہ ہے۔

نئے اور پُرانے چراغ۔ اقبال اور ابلیس۔ اقبال اور اُس کے نکتہ چیں۔ سرسید کے مخالف۔ سجاد انصاری اور غالب۔ جدید غزل گو شعراء۔ اکبر اور سرسید۔ رُوحِ اقبال، اُردو شاعری میں فانی کی قدر و قیمت۔ ریاض اور ہم، فروزاں، جنگِ عظیم کے بعد اردو شاعری عظمت اللہ خاں اور سُریلے بول۔ نیا ادبی شعور، رشید احمد صدیقی کی شخصیت۔

سرور صاحب کا نام ہی کتاب کی قدر و قیمت کی ضمانت ہے۔

پیسہ اور پرچھائیں

ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے نو ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ۔

ناشر، ادارۂ فروغِ اردو قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

اس کتاب کے مصنف اُردو کے نوجوان ادیبوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ تنقید، افسانہ اور ڈراما میں آپ اپنے کمالات پیش کرتے رہے ہیں۔ اُمید ہے زیرِ نظر مجموعہ اہلِ نظر میں مقبول ہوگا۔

موصولات

دم نیم سوز۔

ناشر یونی ورسٹی بک ایجنسی انارکلی لاہور۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

صدیق کلیم صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے، جو موصوف نے پچھلے پندرہ سال کے دوران میں لکھا۔ کلام میں صفائیٔ بیان اور جدّتِ فکر کے نمایاں عناصر موجود ہیں۔

نو رنگ

منجو قمر صاحب کے اخلاقی اور اصلاحی افسانوں کا مجموعہ۔

ملنے کا پتہ مینیجر بزم بک ڈپو۔ مہر مسکن، ملتانی پورہ بازار، حیدرآباد دکن

قدر و نظر

اختر اورینوی صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ یہ مضامین نہایت سلجھے ہوئے تنقیدی مذاق کے آئینہ دار ہیں۔

ناشر، ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے فی جلد

سفر (ناول)

از مائل ملیح آبادی۔ قیمت چار روپے۔ ناشر ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

ضخامت ۳۰۰ صفحات۔

سیّد سالار مسعود غازی

وحشی محمود آبادی کا تاریخی ناول۔ ناشر، ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

قیمت تین روپے۔ ضخامت ۲۰۲ صفحات

سرخ چین سے فرار

لیو شاؤ تنگ کے قلم سے۔ دیباچہ از ڈاکٹر ہیو شیہ سابق سفیر چین متعینہ امریکہ۔ ناشر، سدھارتھا پبلیکیشنز ۵ فیض بازار دہلی

قیمت کتاب پر درج نہیں۔

یومِ حقوقِ انسانی

ہم ہر سال انسانی حقوق کا دن مناتے ہیں۔ صرف ہم ہی نہیں بلکہ دنیا کی بیشتر قومیں یہ دن مناتی ہیں۔ اصل میں نسلِ انسانی اس دور میں تہذیبی اور سماجی ترقی کی ان منزلوں پر پہنچ چکی ہے کہ بلاتمیز مذہب و ملت ہر فردِ واحد کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ انجمن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اُنتیس ۲۹ دفعات پر مشتمل حقوقِ انسانی کے ایک چارٹر کا اعلان کیا تھا۔ ان دفعات کی رُو سے ایک عالمگیر سکھ اور شانتی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ اگر دنیا کی تمام قومیں اس بات کا تہیہ پورے طور پر کر لیں کہ وہ اس چارٹر کی خلاف ورزی نہیں کریں گی تو مسلسل جنگوں، بدامنیوں، بغاوتوں اور ظلم و ستم کا ستایا ہوا یہ انسان سکھ کی نیند سو سکتا ہے۔ پیدائش سے نہ کوئی افضل ہے نہ اعلیٰ نسلی امتیاز خود غرضی کو پیدا کرتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ قانون کی نظر میں ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر ہیں۔ ہر شخص دادرسی کے لئے قانون کی مدد مانگ سکتا ہے۔ کسی شخص کی عزت آبرو، شہرت اور پرائیویٹ زندگی پر ناجائز حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے ملک میں ہر شخص کو آنے جانے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ یہ ہے چند ضروری دفعات کا خلاصہ۔ نہ تو کسی شخص کی قومیت جابرانہ طور پر اس سے چھینی جا سکتی ہے اور نہ اسے قومیت تبدیل کرنے کے حق سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

ان دفعات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم سب پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم ایسی فضا پیدا کریں جس سے اس چارٹر کے مقصد کو حاصل کرنے میں مدد ملے۔ سماجی بہبود اور معیارِ زندگی کی بہتری اسی میں ہے کہ کوئی قوم دوسری قوم پر ناجائز غلبہ کرنے کی کوشش نہ کرے، اور محبت اور اخوت کا دور دورہ رہے۔ ہندوستان اپنے ملک کے اندر اور اپنی خارجہ پالیسی کے ذریعے سے اس نیک راہ پر گامزن ہے، اور اُمید ہے کہ دنیا عام طور پر یہی راہ اختیار کرے گی۔ اسی میں ابنِ آدم کی حقیقی نجات ہے۔

ایشیا میں آج تک ہونے والی نمائشوں میں سب سے بڑی

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ایشیا میں سب سے بڑی بین الاقوامی نمائش —— انڈین انڈسٹریز فیر کا افتتاح کیا؛

غیر ملکی شعبہ

غیر ملکی شعبہ میں ۲۱، اقوام اور بہت سے انفرادی شرکا حصہ لے رہے ہیں۔ یہاں جدید ترین اہم مالوں کی نمائش ہوگی۔ یہاں قومی پیویلین میں حصہ لینے والے ممالک میں، آسٹریلیا، بیلجیم برما، چین، زیکوسلاویکیہ، مشرقی جرمنی، فرانس، ہنگری، ایران، عراق، اٹلی، جاپان، نیدرلینڈ، پاکستان، پولینڈ، رومانیہ، برطانیہ، امریکہ، روس، مغربی جرمنی، یوگوسلاویہ۔
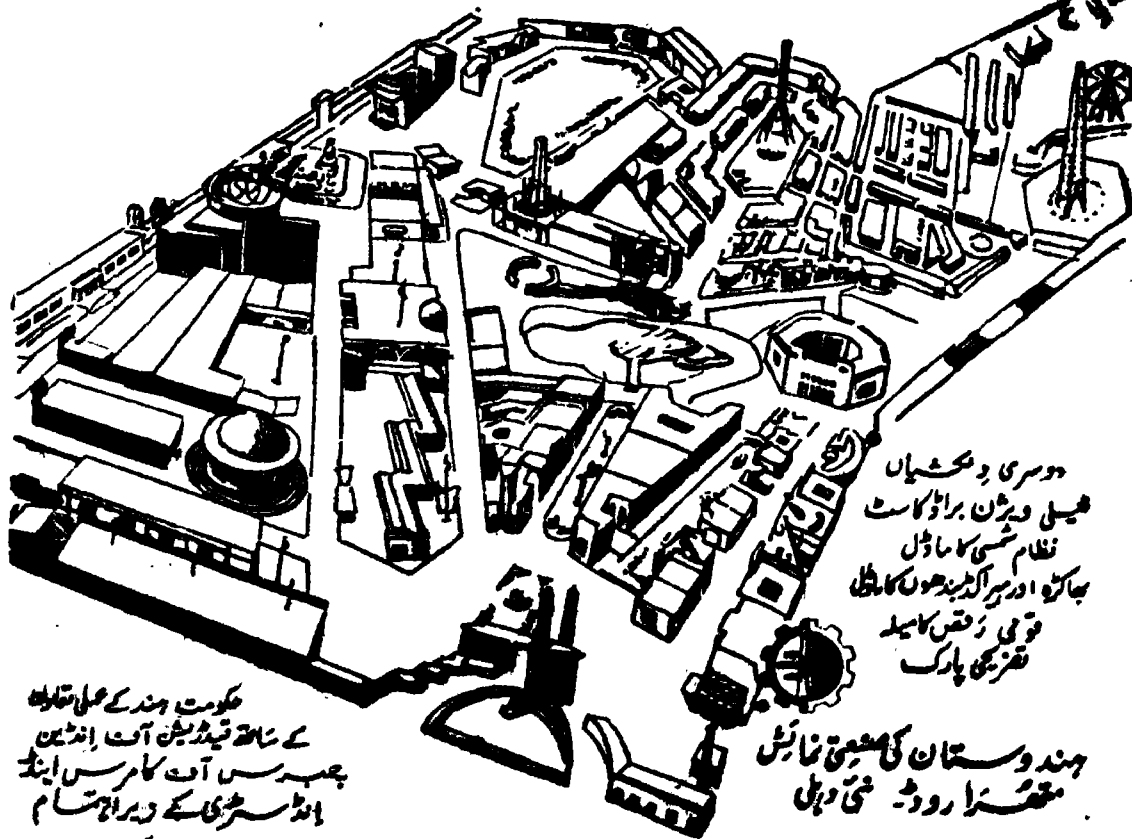
ہندوستانی شعبہ

اس شعبہ میں منظم طور پر چلنے والی ہندوستانی صنعتوں کی نمائش شد و مد کے ساتھ ہو رہی ہے ان صنعتوں کی نمائش سے تماشہ بینوں کو ملک کی صنعتی ترقی کا ایک خاکہ معلوم ہو سکتا ہے ایک علیحدہ شعبہ میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی مختلف اشیاء کی نمائش سے ہندوستان کی اقتصادیات کی تصویر ذہن میں ابھر جاتی ہے

عام داخلہ، ۳۰۔ اکتوبر سے ۱۵۔ دسمبر تک

دو سخنے

حسن الدین عثمانی کاکوروی

۱- فقیر بڑبڑایا کیوں - اندھیرا چھایا کیوں

۲- لفافہ کیوں منگوایا - وعدہ کیوں نہ کیا

۳- سنار کیوں نہ بلوایا - بچّہ کیوں نہ لٹایا

۴- گھوڑا اڑا کیوں - پان سڑا کیوں

۵- برہمن پیاسا کیوں - گدھا اداسا کیوں

۶- انار کیوں نہ چکھا - وزیر کیوں نہ رکھا

۷- کوٹ سلا کیوں نہیں - اسکول کھلا کیوں نہیں

۸- باغ لگا کیوں نہیں - مضمون لکھا کیوں نہیں

۹- جوتا کیوں نہ پہنا - بڑا کیوں نہ کھایا

۱۰- ڈوم کیوں نہ گایا - گوشت کیوں نہ کھایا

جوابات

۱- دیا نہ تھا

۲- آٹا نہ تھا

۳- سونا نہ تھا

۴- پہرا نہ تھا

۵- لوٹا نہ تھا

۶- دانا نہ تھا

۷- ماسٹر نہ تھا

۸- قلم نہ تھا

۹- تلا نہ تھا

۱۰- گلا نہ تھا

انجم پرویز

کرنی کا پھل

جب رگھوبر کا باپ مرا تو کافی دولت چھوڑ گیا۔ اپنے گاؤں میں اس کا باپ بڑا ہی کنجوس خیال کیا جاتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جس نے صبح ہی صبح اس کی شکل دیکھ لی تو پھر دن بھر کے لئے اس کا ٹھکانہ ہو گیا۔ اب اسے ہزاروں جتن کے باوجود کھانا ملنا مشکل ہے۔ اس نے کوڑی کوڑی جوڑ کر بہت سی دولت اکٹھی کر لی تھی۔ لیکن افسوس کہ مرتے وقت وہ ایک کوڑی بھی ساتھ نہ لے گیا۔ دولت پڑی کی پڑی رہی۔ اور وہ خالی ہاتھ چلا گیا۔

اس کے بعد اس کی دولت کا تنہا مالک اس کا بیٹا رگھوبر ہوا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کنجوس لوگوں کی اولاد جی کھول کر دولت لٹاتی ہے۔ لیکن رگھوبر بالکل اس سے اُلٹا نکلا۔ وہ تو باپ سے بھی بڑھ کر کنجوس ثابت ہوا۔ بہت ضروری اخراجات کے لئے بھی اُسے پیسہ نکالتے ہوئے بڑا دُکھ ہوتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کا تو نام سنتے ہی اُسے بخار چڑھ آتا تھا۔ اور بھک منگوں سے تو وہ اس طرح بھڑکتا تھا جیسے کپڑے سے سانڈ۔ ایک پیسہ بھی وہ کبھی کسی کو دیتا نہیں تھا۔

ایک بار رگھوبر کو کہیں جانا تھا۔ سواری تو اس کے پاس کوئی تھی ہی نہیں۔ نہ وہ کرایے کی سواری کے لئے ایک کوڑی خرچ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ بیساکھ کا مہینہ تھا۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ جیسے آگ کی بارش ہو رہی ہو۔ زمین توے کی طرح تپ رہی تھی۔ رگھوبر کے پیر میں جوتے بھی نہیں تھے۔ اس لئے اسے چلنے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے اسے ایک برگد کا درخت نظر آیا جس کی چھاؤں میں وہ تھوڑی دیر ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہاں ایک اور آدمی آ پہنچا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دو پودے تھے۔ جسے وہ بہت سنبھال کر پکڑے ہوئے تھا۔ رگھوبر نے اس سے پوچھا۔ یہ کس درخت کے پودے ہیں ؟

یہ دونوں طلسمی پودے ہیں۔ اُس آدمی نے جواب دیا۔

لیکن دیکھنے میں تو معمولی پودوں جیسے ہی لگتے ہیں۔ رگھوبر نے کہا۔ اس میں خوبی کیا ہے ؟

میرے داہنے ہاتھ میں جو پودا ہے اس کا نام ہے "دھن دا" اس میں یہ خوبی ہے کہ جتنے روپے پیسے اس سے مانگیں یہ دے جاتا ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں جو پودا ہے اس کا نام ہے "آن دا" ۔ اس سے کھانے پینے کے لئے جو شے بھی طلب کی جائے۔ فوراً حاضر کر دیتا ہے۔ اُس آدمی نے جواب دیا۔

رگھوبر کو یہ سُن کر بہت تعجب ہوا۔ اُس نے کہا۔ آپ مجھ

سے دل لگی کر رہے ہیں کیا۔ ایسے بھی کہیں پیڑ ہوتے ہیں۔
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ پودے تمہارے سامنے ہیں
جانچ لو۔ اس آدمی نے کہا۔
بڑی ہی حیرت اور خوشی میں ڈوبے ہوئے لہجے میں رگھوبر نے "دھن دا" پودے سے کہا۔ مجھے اس وقت سولہ اشرفیاں چاہئیں"۔ اس کے منہ کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ پودے سے جھن جھنا کر سولہ اشرفیاں گر پڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ ابھی تازہ تازہ ڈھل کر ٹکسال سے باہر آئی ہیں۔

رگھوبر کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے "ان داتا" پودے سے کہا۔ لسی پینے کے لئے دہی اور چینی چاہیئے۔ بس اُسی وقت دہی اور چینی سے بھرے ہوئے برتن حاضر ہوگئے۔ اب تو رگھوبر کے لئے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ اُسی وقت اس نے بھر پیٹ لسی پی۔ اس آدمی نے وہ سولہ اشرفیاں بھی اسے دے دیں۔ لیکن دولت پاکر انسان اور بھی لالچی بن جاتا ہے۔ رگھوبر کی للچائی ہوئی نظریں ان ہی پودوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح یہ دونوں پودے اُسے مل جائیں تو پھر راجوں اور مہاراجوں کی بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہ رہے۔ اس نے بڑی لجاجت اور عاجزی سے اپنے دل کی بات اس آدمی سے کہی یہ سُن کر وہ آدمی مسکرایا' پھر بولا۔ اگرچہ ان پودوں کے مقابلے میں بڑی بڑی حکومتوں کا بھی کوئی وجود نہیں' پھر بھی میں تمھیں یہ پودے دے سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے:۔
رگھوبر خوشی سے اُچھل پڑا۔ کیا شرط ہے۔ میں وہ شرط ماننے کو تیار ہوں۔
اس آدمی نے کہا' تم کسی دن بھی کسی فقیر یا بھکاری کو اپنے دروازے سے بغیر کچھ دئے واپس نہ لوٹاؤ گے۔ جب بھی کوئی شخص تم سے کوئی شے مانگے' تم دینے کو تیار رہوگے۔
یہ شرط سُن کر کچھ دیر تک تو رگھوبر چُپ رہا۔ کیونکہ دینے کا نام سُن کر ہی اس کی ہوائی اُڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا یہ تو آپ خوب کہتے ہیں۔ اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ تم روپے سے بھرا ہوا اپنا صندوق میرے حوالے کر دو۔ تو کیا میں ایسا کر دوں گا؟
وہ آدمی ہنس پڑا' اس نے کہا۔ تمھیں تو میں ایک ایسی چیز دے رہا ہوں' کہ تم جب چاہو اشرفیوں سے بھرے ہوئے صندوق منگوا سکتے ہو۔ پھر ایک صندوق دے دینے میں تمھیں کیا افسوس ہے:
یہ سُن کر رگھوبر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخر اس نے اس آدمی سے وعدہ کیا کہ وہ کبھی کسی کو ناکام نہ لوٹائے گا۔ اور پیسے کے معاملے میں پس و پیش نہ کرے گا۔ اس کے بعد اس آدمی نے وہ دونوں پودے رگھوبر کے حوالے کر دئے۔ رگھوبر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اپنی چادر میں ان دونوں پودوں کو باندھ کر اس نے لاٹھی میں پیچھے کی طرف لٹکا لیا۔ اس کے بعد جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے آگے

بڑھا۔ وہ پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کہیں وہ آدمی پیچھے پیچھے آ تو نہیں رہا ہے۔ کون ٹھکانہ ہے کہیں وہ اپنے پودے واپس نہ مانگ لے۔ اب اُسے نہ تو دھوپ لگ رہی تھی اور نہ ہی اس کے پاؤں جل رہے تھے۔ آگ کی طرح تپتی ہوئی زمین بھی اسے ٹھنڈی اور خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔

کچھ دُور جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک بھکاری آگے کھڑا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کانپ اُٹھا۔ اس نے سوچا وہ یقیناً کچھ نہ کچھ مانگ بیٹھے گا۔ اس لئے اس نے اس کی آنکھ بچا کر آگے بڑھنا چاہا۔ اب وہ اور تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ لیکن پھر بھی بھکاری نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس کے پاس آکر اس نے کہا۔ دو چار پیسے مل جائیں داتا!

دو تین بار تو رگھوبر نے اس کی مانگ سُنی اَن سُنی کر دی۔ لیکن جب بھکاری بہت چلّایا۔ تب اس نے جھلّا کر جواب دیا۔ کیوں فضول میں پریشان کرتے ہو۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

بھکاری نے مُنہ بنا کر کہا بہت بھوکا ہوں دیا تو۔ کچھ کھانے پی کو دے دیجئے نا؟ اس پر رگھوبر بگڑ کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ آگے دیکھو۔

یہ سُن کر وہ بھکاری ہنس پڑا۔ اس نے اپنے بدن پر سے میلا کچیلا کپڑا اُتار پھینکا۔ اب رگھوبر کو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ تو وہی آدمی تھا جس نے اسے دونوں پودے دئے تھے۔ اس آدمی نے کہا خوب وعدے کے پکے نکلے تم۔ جب تم سے چار پیسے تک نہیں نکلتے تب تم اور کیا دے سکتے ہو۔ واپس کر دو میرا پودا۔

اب تو رگھوبر بہت گھبرایا۔ اس نے صاف کہہ دیا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے کچھ نہیں دیا ہے۔ کچھ بھی نہیں دیا ہے۔ کڑک کر اس آدمی نے کہا۔ اچھا جاؤ تمھارے پاس کچھ نہ سہی۔ تم کنگال ہو۔

اس کے اتنا کہتے ہی رگھوبر خوف سے کانپ گیا۔ بڑبڑا کر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سچ مچ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دونوں پودے غائب تھے۔ ان اشرفیوں کا بھی پتہ نہیں تھا۔ اور نہ وہ آدمی ہی وہاں موجود تھا۔

رگھوبر پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ وہ زور زور سے وہیں رونے لگا۔ لیکن اب رونے سے کیا ہوتا تھا۔ اسے تو اپنی کرنی کا پھل مل چکا تھا۔

لطیفہ

ڈاکٹر:- تو تم ٹھیک اصطبل کے اوپر رہتے ہو۔ مگر یہاں رہنا تو صحت کے لئے اچھا نہیں۔

کسان:- مگر یہاں تو پندرہ برس میں ایک گھوڑا بھی نہیں مرا۔

انیس الفتی

غرور کا نتیجہ

راجہ بھوج اپنے وقت کا بہت مشہور راجا تھا۔
اس کے زمانے میں علم و فن بہت کمال تک پہنچا ہؤا تھا۔
عالموں کی کافی قدر و منزلت تھی۔ اسی کے دربار میں ایک
بہت بڑا عالم پنڈت پرور ماگھ بھی تھا۔ اسے اپنے علم
پر بڑا گھمنڈ اور غرور تھا اور وہ کسی کو بھی اپنے سے
بڑا یا برابر کا عالم مانتا ہی نہ تھا۔ اس کے گھمنڈ سے تمام لوگوں
کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر کسی میں طاقت نہیں تھی جو اس کا مقابلہ
کر سکے۔ کئی ایک عالم مقابلے پر بھی آئے مگر سبھوں کو شکست ہو گئی۔
اس وجہ سے راجہ بھوج پنڈت ماگھ کو بہت مانتا تھا۔
ایک دن کا ذکر ہے کہ پنڈت ماگھ اور راجہ بھوج چہل قدمی
کرتے ہوئے اجین سے بہت دُور نکل گئے۔ واپسی کے وقت انھیں
راہ کا خیال نہیں رہا اسی وجہ سے وہ دیر تک بھٹکتے رہے۔ آخر وہ
دونوں ایک جھونپڑی کے پاس پہنچ گئے۔ اس جھونپڑی کے دروازے
پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ پنڈت ماگھ نے آگے بڑھ کر اس
بوڑھی عورت سے پوچھا۔

ماں یہ راہ کدھر کو جاتی ہے؟

بوڑھی عورت نے دونوں اشخاص کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ
راہ تو کہیں نہیں جاتی ہے بلکہ اس پر لوگ آیا جایا کرتے ہیں۔ آپ
بتائیں کہ آپ لوگ کون ہیں؟

ہم مسافر ہیں۔ پنڈت ماگھ نے کہا۔

مسافر؟ ضعیفہ حیرت سے بولی۔ مسافر تو صرف دو ہیں
ایک سورج اور دوسرا چاند۔ آپ کیسے مسافر ہوئے سچ سچ بتائیے
کہ آپ کون ہیں؟

ہم فانی انسان ہیں۔ پنڈت ماگھ نے کہا۔

فانی؟ فانی تو صرف دو چیزیں ہی ہیں۔ ایک جوانی اور دوسری
دولت۔

ماگھ سخت حیران ہوئے پھر بھی بولے ہم راجہ ہیں۔

راجہ بھی صرف دو ہیں۔ ایک "اندر" اور دوسرا "یم" (موت
کا فرشتہ)

یہ جواب سُن کر پنڈت ماگھ سخت گھبرائے اور انھیں معلوم
ہونے لگا کہ دنیا میں ان سے بھی زیادہ قابل موجود ہیں۔ آج تک
تو یہی ہوتا آ رہا تھا کہ پنڈت ماگھ کے سوالات کے آگے لوگ
جواب دینے سے محروم رہا کرتے تھے۔ مگر آج پنڈت ماگھ جواب
دینے میں کمزور پڑ رہے ہیں۔ آخر وہ خاموش ہو گئے تو راجہ بھوج
نے جو اب تک خاموش کھڑے تھے آگے بڑھ کر کہا۔

ماں ہم خاکسار انسان ہیں۔

ضعیفہ نے بھی خوب سنبھل کر کہا بھائی! خاکسار تو ایک "زمین" ہے دوسری "عورت" آپ ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہیں۔

اس جواب کے بعد راجہ بھوج بھی کچھ گھبرائے اور انھوں نے ہمت کر کے کہا۔

ہم پردیسی ہیں۔

پردیسی بھی صرف دو ہیں ایک جوانی اور دوسرا درخت کا پتّہ۔

پھر راجہ بھوج اور پنڈت ماگھ نے کافی غور و خوض کے بعد اعلان کیا کہ "ماں ہم ہار گئے"۔

ضعیفہ نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا اور کہا ہارتے بھی صرف دو ہیں ایک لڑکی کا باپ اور دوسرا قرضدار۔ یہ جواب سن کر دونوں خاموش کھڑے ہو گئے۔ ضعیفہ نے کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد سمجھ لیا کہ اب ان سے جواب نہیں بن پڑتا۔

ضعیفہ یہ دیکھ کر مسکرائی اور اس نے کہا کہ پنڈت ماگھ جی اس دنیا میں خدا نے ایک سے ایک بڑھ کر انسان بنایا ہے اس لئے کبھی انسان کو غرور اور گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ اب آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں جانتی ہوں کہ اس وقت ہمارے سامنے مہاراج بھوج بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ اور میں نے جانتے ہوئے ہی اتنی بات بڑھائی۔ اب میں آپ لوگوں سے معافی چاہتی ہوں۔ آپ اسی راہ پر چلے جائیے یہ آپ کو اُجین پہنچا دے گا۔ اس دن کے بعد پنڈت ماگھ نے پھر کبھی غرور اور گھمنڈ کی بات نہیں کی۔ اور سبھی عالموں کی قدر کرنے لگے۔

علم کا ہے وہ چمن جس میں خزاں آتی نہیں
جہل ہو جس قوم میں وہ آبرو پاتی نہیں

حسن الدین عثمانی

پہیلیاں

(۱) کالی ماں کے گورے پوت۔ ان دونوں کے نئے کرتوت
بھائی کو بھائی سے لاگ۔ ایک ہے ٹھنڈا دوسرا آگ

(۲) کھیت میں اُپجے ہر کوئی کھائے۔ گھر میں ہووے کوئی نہ کھائے

(۳) سفید مُرغی ہری پونچھ۔ بُوجھ تو بوجھ نہیں تو اپنی ماں سے پوچھ

(۴) ایک صندوقچہ جس میں بارہ خانے۔ ہر خانہ میں تیس دانے

(۵) ہری زمین کھرکھرے کانٹے۔ بُوجھ تو بوجھ نہیں تو ناک کان کاٹے

(۶) چار کھڑے چار پڑے۔ ایک ایک کے منہ میں دو دو بھرے

(۷) چار گھڑے بہشت بھرے۔ چوڑ نکیں لے نہ سکیں

(۸) شیخ تھا شہزادہ تھا۔ اُچھلتا ہوا جاتا تھا۔ جو نہ بوجھے اس کا دادا تھا۔

(۹) بازار جاتا تو چار چیزیں لاتا۔ کھانے کو حلوہ، پینے کو شربت، لونگوں کا گچھا۔ بکری کا چارہ۔

(۱۰) رنگ بادامی شکل میں انڈے۔ اُبال کر ان کو کرتے ٹھنڈے
چھلکے ان کے اتارے جاتے۔ ڈال مسالہ خوب بناتے

(۱۱) کالی اس کی وردی دیکھی اس کی چال۔ ہر گھر میں ایسا پھرے جیسے کوتوال

(۱۲) اگل کھوٹا بگل کھوٹا۔ گاٹے رکھی دودھ میٹھا

جوابات

(۱) چاند سورج، (۲) پھوٹ (۳) مولی (۴) سال مہینے، (۵) کٹھل، (۶) چارپائی، (۷) گائے کا تھن۔ (۸) مینڈک، (۹) تربوز، (۱۰) آلو، (۱۱) کوا۔ (۱۲) سنگھاڑہ

آغا سہیل

لوہے کی کہانی

بچو! کیا تم جانتے ہو کہ اگر لوہے کو دنیا سے مٹا دیا جائے تو کیا ہوگا؟ آسمانوں پر اڑنے والے طیارے (ہوائی جہاز) ریلیں، انجن، موٹر، بجلی کے تار اور کھمبے ریلوں کی پٹڑیاں اور تمھارے بعض کھلونے کیوں کر بنیں گے ——؟ اس بات سے اس کا اندازہ کرو کہ اگر لوہا نہ ہوتا تو دنیا نے آج اتنی تیزی سے ترقی نہ کی ہوتی نہ موٹریں ہوتیں نہ انجن، نہ طیارے نہ بحری کشتیاں اور ہم ہنوز اونٹ گاڑیوں، بیل گاڑیوں پر سفر کرتے ۔ لوہے کی مشینوں کے نہ ہونے سے معمولی کپڑے پہنتے ۔ بھونڈے بھونڈے مکانوں میں رہتے اور ہمارا تمدن جنگلی لوگوں کا تمدن ہوتا —— لیکن لوہے نے ہمارے لئے کتنی آسانیاں مہیا کر دی ہیں ۔ ہم مہینوں اور سالوں کے سفر کو دنوں اور چند گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں ۔ ایک جگہ سے بیٹھے بیٹھے ہزاروں اور لاکھوں میل کی خبریں معلوم کر لیتے ہیں ۔ آج اونچے اونچے مکانوں میں ہم بجلی کی روشنی جگمگا کر دن کر لیتے ہیں ۔ ان سب باتوں کے لئے ہمیں لوہے کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے ۔

آؤ آج تمھیں بتائیں کہ لوہا کیا ہے؟

یہ تاریخ کی بہت اہم بات ہے ۔ اس بات کا پتہ پرانے زمانے سے ہے ۔ خدا کا دیا ہوا تحفہ اس لوہے کو کہا جاتا تھا جو ٹوٹنے والے تاروں سے زمین پر آ گرتا تھا ۔ اور جیسا کہ تم کو بھی تاریخ سے

معلوم ہوا ہوگا کہ کانسی کے زمانے کے بعد ہی سے لوہے کا زمانہ شروع ہوا اور دنیا نے اس نعمت سے بڑا فائدہ اٹھایا اور ترقی کی —— یہ بات بتانا فخر سے خالی نہ ہوگی کہ پرانے بھارت کے لوگ لوہے کا استعمال بہت پہلے سے جانتے تھے جس کا ثبوت دہلی کا لوہے کا ستون ہے ۔ لیکن یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ بھارت میں لوہا بنانے کے محض چار بڑے کارخانے ہیں ۔

(۱) ٹاٹا آئرن (Iron) اینڈ اسٹیل Steel کمپنی جمشید پور

(۲) بنگال آئرن کمپنی لمیٹڈ کلٹی (E. I. R.

(۳) میسور آئرن ورکس بھدراوتی

(۴) انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی آسنسول (E.I.R.

لیکن تمھیں یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ ٹوٹے ہوئے تاروں سے خالص لوہا بہت کم مقدار میں ملتا ہے اور زیادہ تر لوہا گندھک اور آکسیجن سے ملا یا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں بہت سی اہم باتیں تم (Science) کے مضمون میں اونچے درجوں میں معلوم کر سکو گے یہاں اتنا جان لو کہ طرح طرح کے لوہے طرح طرح سے بنائے جاتے

مثلاً - ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کاربونیٹ اور اکسائیڈ سے اگر لوہا حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھیں کوئلے میں ملا کر بھٹی میں گرم کر لیا جاتا ہے ۔

لوہے کی تین خاص قسمیں ہیں ۔

(۱) فولاد (Steel)

(۲) ڈھالا ہوا لوہا (Cast Iron)

(۳) پٹواں لوہا (Wrought Iron)

فولاد سے گھڑیوں کی کمانیاں ۔ اُسترے' تلواریں' سوئیاں میگنیٹ' چاقو اور قینچی وغیرہ بنائے جاتے ہیں ۔ اور لوہے کی یہ قسم سب سے زیادہ کارآمد ہے ۔ اس لئے یہ بھی معلوم کرتے چلو کہ فولاد کو کیونکر بجھایا جاتا ہے ۔ فولاد کے بجھانے کو انگریزی زبان
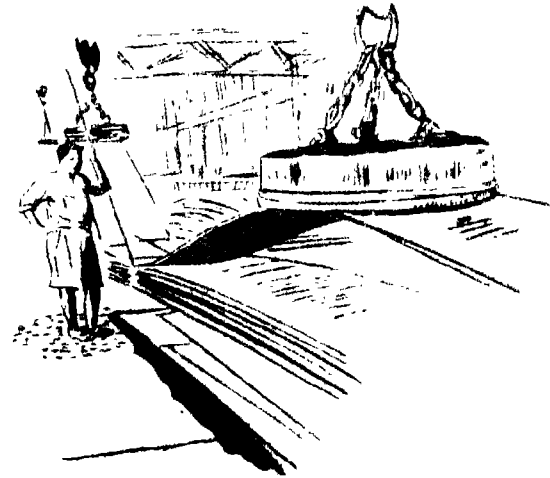
میں (Tempering of Steel) کہتے ہیں ۔ جب فولاد کو خوب گرم کیا جاتا ہے اور یکایک ٹھنڈا کیا جاتا ہے تو بہت سخت اور بھربھرا ہو جاتا ہے اور اس طریقے کو فولاد کا سخت کرنا کہتے ہیں ۔ مگر یہ سخت لوہا پھر لچکدار ہو جاتا ہے تو اس طریقے کو ٹھنڈا

کرنا (Annealing) کہتے ہیں ۔ اس طریقے پر فولاد جتنا زیادہ گرم کیا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ لچک دار ہو جاتا ہے ۔ اس وجہ سے جتنا لچک دار فولاد بنانا ہوتا ہے اسے اتنا ہی گرم کیا جاتا ہے

ڈھالا ہوا لوہا' یا (Cast Iron) ڈھلائی کے لئے اس لئے موزوں ہوتا ہے کہ دوسری طرح لوہے سے کم درجۂ حرارت پر پگھل جاتا ہے اور اسی وجہ سے یہ چولھے' بینچوں کے پائے ۔ لوہے کی چھڑ ۔ زنجیر ۔ آرائش کے سامان کے کام آتا ہے اور مشینوں کے پُرزے اس سے بہت آسانی سے ڈھالے جا سکتے ہیں ۔

پٹواں لوہا Wrought Iron صاف اور سخت ہوتا ہے ۔ اور اسی لئے تار کھینچنے' کیلیں بنانے' چادریں بنانے اور گھوڑے کے نعل بنانے کے کام آتا ہے ۔ اس سے نل اور چھڑیں بھی بنائی جاتی ہیں ۔

لوہے کی ان قسموں سے تمھاری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہو گی کہ کتنے قسم کے لوہے' کس کس طرح کس کس کام آتے ہیں اور کیونکر بنتے ہیں ۔ مگر لوہے پر خاص خاص اور گہری باتیں تم آگے چل (بڑے ہو کر پڑھ لکھ کر) مختلف کتابوں سے معلوم کر سکو گے اور یا ذاتی تحقیق سے ۔

اس سے زیادہ ہم جو کچھ تم کو بتائیں گے' وہ تمھاری سمجھ سے باہر ہو گا ۔

لطیفہ

دو دنوں کی شادی ہو چکی تھی ۔ ایک دن خاوند نے بیوی سے پوچھا تم نے اس نوجوان گدھے گپتا کو کیوں نہ پسند کر لیا ؟

بیوی :- اس لئے کہ مجھے ایک اور گدھے سے پیار ہو چکا تھا ۔

Published by the Director, Publications Division, and printed by the

ہماری کتابیں
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش
سے ایک نیا مستقبل
عالم وجود میں آرہا ہے۔
اس تابناک مستقبل کی جھلک
اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے
قیمت ۔۔ ۔/۴/۔
پہلا پنج سالہ پلان
خستا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں
پنج سالہ پلان کے بارے
میں ہر قسم کی تفصیلات
درج ہیں۔ زبان سادہ
و دلکش ہے۔ قیمت ۔/۲
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت
ہم سماجی بہبود کے
میدان میں کیا کر رہے
ہیں اس کی جھلک اس
پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
۔/۴/۔
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار
کیا گیا ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے۔ تصویریں اور
خاکوں سے اس کی دلکشی میں
اور اضافہ کیا گیا ہے۔ ۔/۸/۔
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت
آمد و رفت اور رسل و رسائل
میں جو بہتریاں ہمارے
پیش نظر ہیں اس کا مفصل
نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
۔/۴/۔
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا
کر رہے ہیں اور ہماری منزل مقصود
کیا ہے اس کتابچے میں جامع
اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا
ہے۔ قیمت ۔/۴/۔
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ — نمبر ۸

سالانہ چندہ: — [ہندوستان میں: - چھ روپے
پاکستان میں: - چھ روپے (ڈاک)]

غیر ممالک سے: — نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: — [ہندوستان میں: - آٹھ آنے
پاکستان میں: - آٹھ آنے (ڈاک)]

مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

فراق گورکھپوری

غزل

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں جی بھر آئے تو اشک بہائیں
ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں اے دل رو رو کے سو جائیں

جانے والا گھر جائے گا کاش یہ پہلے سوچا ہوتا
ہم تو منتظر اس کے تھے بس کب ملنے کی گھڑیاں آئیں

الگ الگ بہتی رہتی ہے ہر پرانی کی جیون دھارا
دیکھو ملیں کب آج کے بچھڑے لے لوں بڑھ کے تیری بلائیں

سنتے ہیں کچھ رو لینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے
شاید تھوڑی دیر برس کر چھٹ جائیں کچھ غم کی گھٹائیں

اپنے دل سے غافل رہنا اہلِ عشق کا کام نہیں
حسن بھی ہے جس کی پرچھائیں آج وہ من کی جوت جگائیں

سب کو اپنے اپنے دکھ ہیں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
اے دلِ غمگیں تیری کہانی کون سنے گا کس کو سنائیں

جسمِ نازنیں میں سر تا پا نرم لویں لہرائی ہوئی سی
تیرے آتے ہی بزمِ ناز میں جیسے کئی شمعیں جل جائیں

ہاں ہاں تجھ کو دیکھ رہا ہوں کیا جلوہ ہے کیا پردہ ہے
دل دے نظارے کی گواہی اور یہ آنکھیں قسمیں کھائیں

لفظوں میں چھپ رہے نظر آئیں گے چشمِ بینا کی ہے شرط
کئی زاویوں سے خلقت کو شعر مرے آئینہ دکھائیں

مجھ کو گناہ و ثواب سے مطلب؟ لیکن عشق میں اکثر آئے
وہ لمحے خود میری ہستی جیسے مجھے دیتی ہو دعائیں

چھوڑ وفا و جفا کی بحثیں اپنے کو پہچان اے عشق
غور سے دیکھو تو سب دھوکا ہے کیسی وفائیں کیسی جفائیں

حسن ہے ایک دُرِ ناسفتہ یا اک بے سونگھا ہوا پھول
ہوش فرشتوں کے بھی اڑا دیں تیری یہ دوشیزہ ادائیں

باتیں اس کی یاد آتی ہیں لیکن ہم پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں

ساقی اپنا غم خانہ بھی مے خانہ بن جاتا ہے
مستِ مئے غم ہو کر جب ہم آنکھوں کے ساغر چھلکائیں

اہلِ مسافت ایک راستا کا یہ بھی ساتھ غنیمت ہے
کوچ کرو تو صدا دے دینا ہم نہ کہیں سوتے رہ جائیں

ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں آخر شاعرِ فطرت ہوں
صبح کے ست رنگے جھرمٹ سے جب وہ انگلیاں مجھے بلائیں

ایک غزالِ رم خوردہ کا منہ پھیرے ایسے میں گزرنا
جب مہکی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں دن ڈوبے آنکھیں جھپکائیں

دیں گے ثبوتِ عالی ظرفی ہم میکش سرِ میخانہ
ساقی چشمِ سیہ کی باتیں زہر بھی ہوں تو ہم پی جائیں

موزوں کر کے سستے جذبے منڈی منڈی بیچ رہے ہیں
ہم بھی خریدیں جو یہ سخنور اک دن ایسی غزل کہہ لائیں

بات چلی ہے جوگن ہو کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے دیپ بجھے، ہم بھی سو جائیں

ممتاز حسین

منشی پریم چند بہ حیثیت ناول نگار

اگر ایک طرف یہ بات صحیح ہے کہ آرٹسٹ پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ بنتا بھی ہے۔ اپنے ماحول اپنے کسب اور اپنی ریاضت سے اس تلخ حقیقت کا اعتراف چیخوف ایسے بڑے فن کار نے بھی کیا ہے۔ جس کی فطری صلاحیت میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جو کچھ کہ ٹالسٹائی اور ترگنیف کو فطرت سے عطیے کے طور پر ملا تھا مجھے وہ چیزیں اپنی زندگی میں حاصل کرنی پڑیں" ظاہر ہے کہ یہاں اس کا اشارہ صلاحیت کی طرف نہیں ہے بلکہ اس کلچر کی طرف ہے جس سے ایک انسان کے دل و دماغ، جذبات اور احساسات کی تربیت ہوتی ہے۔ وہ آرٹ کے میڈیم اور مذاقِ سخن سے آشنا ہوتا ہے۔ اس میں وہ حلم، وہ دردمندی پیدا ہوتی ہے جو بجز انسانی رشتوں کے کسی اور رشتے کو انسانوں کے درمیان قبول نہیں کرتی۔ جس طرح چیخوف نے اس کلچر تک پہونچنے میں اپنے پس ماندہ ماحول یعنی غلامی کے خون کو قطرہ قطرہ کر کے اپنے جسم سے نچوڑا۔ اسی طرح منشی پریم چند کو بھی اس کلچر کے حاصل کرنے میں نہ صرف ناقابل بیان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اپنی نچلے متوسط طبقے کی نفسیات کو بھی دھونا پڑا۔ انھیں اپنے کو آرٹسٹ بنانے میں اپنے کو ایک انسان بھی بنانا پڑا ہے۔ ہندوستانی معاشرت کے کلچر میں ایک طویل زمانے سے جاگیردارانہ عہد میں رہنے کے باعث جن اقدار پر زور دیا جاتا رہا ہے وہ بالعموم داخلی رہی ہیں نہ کہ خارجی۔ اس کلچر میں سائنس کی اہمیت کم اخلاقیات کی زیادہ رہی ہے۔ منشی پریم چند اپنے اس کلچر سے متاثر رہے ہیں۔ وہ چیخوف کی طرح یہ نہیں کہہ سکے کہ "ایک بجلی گھر کا کھلنا انسانیت کے حق میں اس سے کہیں زیادہ مفید ہے کہ دنیا کی ساری جنتا گوشت ترک کر کے ترکاری پر زندہ رہے" وہ عصمت، وفا، خلوص، ایثار، قربانی، محبت، اخوت عالمگیر انسانی برادری اور عالمی امن پر ہی زور دینا کلچر کی اعلیٰ قدریں سمجھتے تھے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ سائنس اور مشین کے مخالف تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے ان کے ناولوں میں ان چیزوں سے پریم بھی نظر نہیں آیا ہے حالانکہ تعلیم کا پریم بہت زیادہ ملتا ہے۔ بہرحال اس بات کو چھیڑنے کا مقصد یہ ہے کہ دھن وادی نظام نے انھیں جس کلچر سے محروم رکھا اور جس کے حاصل کرنے اور اپنی زندگی میں برتنے میں انھیں اتنی ہمتوں سے کام لینا پڑا۔ وہ اسے پونجی والوں کے غاصبانہ قبضے سے نکال کر عام جنتا تک پہونچانے کے حامی تھے، جس کی محنت کا وہ ثمر ہے تاکہ وہ اس سے اس طرح فائدہ اٹھائیں جس طرح کہ وہ روشنی ہوا اور پانی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ منشی پریم چند کا آرٹ انھیں معنوں میں مبلغانہ ہے۔ یوں تو اس بات کا گیان منشی پریم چند سے بہت پہلے جاگیردارانہ عہد میں بھگت کویوں اور صوفی شعرا کو بھی ہوا تھا لیکن چونکہ ہر دور کی حقیقت مختلف ہوتی ہے۔ اس کا تضاد، اس کا سجھاؤ اور اس کے آگے بڑھنے کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر دور کے آرٹ میں بڑے فن کاروں کا آدرش بھی مختلف رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ کبیر کے آرٹ میں اخوت و مساوات کا اتنا ہی شدید اور انقلابی جذبہ ہے جتنا پریم چند کے آرٹ کے یہاں ہے۔ لیکن دونوں ہی اپنے آرٹ میں مختلف سجھاؤ اور مختلف راستوں کا پرچار کرتے ہیں۔ گو آئیڈیل نہ صرف انھیں کا بلکہ دنیا کے سارے ہی انسان دوست فن کاروں کا ایک ہی ہے۔ اگر کبیر حقیقت کے ادراک پر زور دیتے ہیں تو منشی پریم چند زندگی کے عمل پر۔ ایسا کیوں ہے کہ ہندوستانی سماج کے آرٹ میں عمل کا نتیجہ خواہ وہ انقلابی ہو یا اصلاحی، انگریزوں کی غلامی سے پہلے کے زمانے میں نہیں ملتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس پر بحث کی جائے لیکن یہ اشارہ بے معنی نہیں رہے گا کہ یورپ میں بھی عمل پسند صرف سرمایہ دارانہ نظام ہی کے آرٹ میں دیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ جب ایک بار انسان

کے شعوری عمل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو چکا ہے تو پھر اسے منظم اور اجتماعی عمل کے مستقبل میں زیادہ یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی انقلاب نے یہ بات عام کر دی کہ عمل کا میدان رزق حاصل کرنے کی انفرادی جد و جہد تک محدود نہیں ہے اور نہ پیٹ کاٹ کر پونجی ہی جمع کرنے اور اپنے بیوپار کے بڑھانے تک محدود ہے بلکہ عمل کی ایک جماعتی صورت بھی ہے جس سے سماجی رشتوں اور سماجی اداروں کو بدلا جا سکتا ہے، نئے آئین اور نئی زندگی کو جنم دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے کے زمانے سے سماجی سدھار کی جو تحریکیں چلیں اُن کے پیچھے اسی فرانسیسی انقلاب کے عمل اور خیال دونوں ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ لیکن چونکہ انگریزی عملداری نے ولایتی صنعت کی ترقی کے نقطۂ نگاہ سے اس طبقے کو تقریباً موت ہی کے گھاٹ اتار دیا تھا جو یہاں کی معاشرت میں ولایتی سرمایہ داروں کا حریف بن سکتا اور جو اس انقلاب کی سیاسی رہنمائی بھی کر سکتا۔ اس لئے سماجی سدھار کی تحریک اس وقت تک یہاں سیاسی روپ اختیار نہ کر سکی جب کہ اس تحریک کی رہنمائی روشن خیال راجگان، تعلقہ داران اور رؤسا کے ہاتھ سے نکل کر اس ملکی بیوپاری طبقے کے ہاتھ میں نہ پہونچی جو بدیسی سرمایے کی ضرورت سے اس کی رفاقت میں اور محتاجی کے عالم میں اُبھرا اور جس نے یہاں کے متوسط طبقے کو روزگار کے ذرائع مہیا کر کے زیادہ مضبوط کیا۔ جو زمانہ اس طبقے کے پیدا ہونے کا تھا وہی زمانہ کم و بیش منشی پریم چند کے بھی پیدا ہونے کا تھا۔ یعنی اگر کانگریس کی بنیاد سنہ ۱۸۸۵ء میں پڑی تو منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور اس وقت اپنی ادبی زندگی کے سفر کا آغاز کیا جب کہ ۱۹۰۵ء میں ایشیا کی ایک نئی اُبھرتی ہوئی طاقت یعنی جاپان نے مغرب کی ایک بہت بڑی سامراجی طاقت یعنی روسی بادشاہی کو شکست دی۔ اس سے سارے مشرق کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ مغرب کی سرمایہ دارانہ امپیریلزم کوئی نہ ٹلنے والی حقیقت نہیں ہے اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، اگر ہم مغرب کی سائنس سے استفادہ کریں اور اپنے اندر بھی نیشنلزم کا جذبہ پیدا کریں۔ ہندوستان میں نیشنلزم کی تحریک صحیح معنوں میں اسی زمانے سے اُبھرتی ہے جسے بنگال کی تقسیم نے اور زیادہ ہوا دے دی۔ منشی پریم چند نے اپنے ابتدائی زمانے کی کہانیوں میں بالعموم اسی نیشنلزم اور حب الوطنی کے جذبے کو اُبھارا ہے اور ناولوں میں بالخصوص (رفتار مشرقی) قومی اصلاح کی تحریک کی آئینہ داری اور پیشوائی دونوں ہی کی ہیں۔ ایسا تقریباً ناگزیر تھا کیونکہ جب تک روس کے مزدوروں نے پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر ایک بہت بڑے ملک سے سرمایہ داری کو ہمیشہ کے لئے نہیں ختم کر دیا اور اشتراکیت کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنا شروع نہیں کیا۔ مشرق کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا نہیں تھا کہ وہ مغرب کی امپیریلزم سے نجات حاصل کرنے کے لئے سرمایہ داری کے راستے پر چلنا ضروری نہ سمجھے۔ چنانچہ اگر آپ راجہ رام موہن رائے اور عارف جنگ سر سید احمد خاں کے زمانے کے خیالات پر غور کریں یا راجہ رابندرناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کی سوچ کا مقابلہ انھیں کے خیالات سے جنگِ عظیم کے بعد کی سوچ سے کریں تو اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ سن ۱۹۱۷ء سے پہلے اُن میں سے کسی نے بھی سرمایہ داری کو مشرق کے لئے مسترد نہیں کیا ہے ۱۹۱۸ء سے پہلے انیسویں صدی کے روشن خیال رؤسا اور روشن خیال متوسط طبقہ دونوں ہی مشرق کے جاگیردارانہ نظام اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا کچھ ایسا امتزاج چاہتا تھا جس میں دونوں نظاموں کی اچھی قدریں محفوظ کی جا سکیں۔ لیکن جب جنگِ عظیم میں مغرب کی ہیبت کا پول کھل گیا اور اس کی بنیاد انتی کھوکھلی نظر آئی کہ فرانسیسی انقلاب کے ڈیڑھ سو سال ہی کے بعد مزدوروں نے اسے کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصے سے منسوخ کر دیا اور پیچھے لوٹنے کی بجائے آگے اشتراکی نظام کی طرف قدم اُٹھایا تو ہندوستان کے فن کاروں نے بھی سرمایہ داری کے حل کو یہاں کی معاشرت میں ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا۔ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصال سے نکلنے کے لئے سرمایہ دارانہ استحصال کو قبول کرنا کسی بھی بڑے آرٹسٹ کے لئے ہمیشہ ناقابل قبول رہا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ یورپ میں اس وقت بھی جبکہ سرمایہ داری ایک بڑھتی ہوئی قوت رہی ہے یعنی نشاۃ ثانیہ کے دور میں اور اس وقت بھی جبکہ وہ اپنے عروج کے زمانے میں تھی یعنی انیسویں صدی میں وہاں کے تقریباً تمام بڑے فن کاروں ہی نے سرمایہ دارانہ استحصال کی مخالفت کی۔ غلامی کے عہد سے لے کر جبکہ کموڈٹی پروڈکشن نے سرمایہ داری کا ریگ لیا۔ سرمایہ دارانہ نظام تک جبکہ وہ اپنے عروج پر پہنچی دنیا کے تمام ہی عظیم المرتبت فن کار اس کے ردِّ عمل میں ایک ایسی معاشرت کا خواب دیکھتے آئے ہیں جو زر کی اقتصادیات، غلامی اور استحصال کے رشتوں سے پاک ہو۔ ان کی آئیڈیولوجی، خواہ وہ ایپی کیورس اور ڈیموکریٹس کے مادّی فلسفے کی حامل ہو یا Stoics کے اخلاقی فلسفے کی یا Mysticism سرّیت، تصوف اور بھگتی یا الوہیت

رہی ہو غلامی اور استحصال کی حمایت نہیں کرتی ہے۔ ان کی آئیڈیولوجی یا تو منفی رہی ہے یا اٹوپین۔ منشی پریم چند بھی انھیں ائیڈیلیسٹ فن کاروں کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں جو عہدِ غلامی سے لے کر سرمایہ دارانہ عہد تک اشتراکیت کے خواب دیکھتے آئے ہیں۔ اشتراکیت کا خواب انسان نے اسی وقت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جب سے اس کا سماج ظالم اور مظلوم کے طبقات میں تقسیم ہو گیا تھا اور کموڈیٹی پروڈکشن کی بنیاد پڑ گئی تھی۔

منشی پریم چند نے بھی سرمایہ داری اور مہاجنی تہذیب کو رد کر کے اشتراکیت کا خواب دیکھا۔ لیکن اس کی طرف وہ اس زمانے میں متوجہ ہوئے جبکہ دنیا کے مزدوروں کی رفاقت سے سوویٹ روس کے مزدوروں نے دنیا کے آئیڈیلیسٹ فن کاروں اور مفکّروں کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ کیا منشی پریم چند، کیا رابندرناتھ ٹیگور اور کیا ڈاکٹر سر محمد اقبال ان تینوں ہی نے مزدوروں کے اس عظیم عمل کو سلامی دی اور اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس عظیم عمل کے پیچھے جو علم، جو شعور، اشتراکیت کی جو سائنس تھی اسے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اس ضرورت کو تو محسوس کیا کہ سماج کو سرمایہ دارانہ استحصال کے رشتوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ اسے نیچ اونچ اور طبقات کے امتیازات سے پاک ہونا چاہیے۔ لیکن اس آئیڈیولوجی کو قبول نہیں کیا جس کے عام رہنمائی کے اصولوں کو روس کے حالات پر منطبق کر کے سوویٹ روس کے مزدوروں نے وہاں غیر طبقاتی سماج کی بنیاد ڈالی۔ اس کے برخلاف انھوں نے اپنی اپنی غیر مارکسی آئیڈیولوجی میں کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جس سے غلامی اور استحصال کی حمایت نہ ہو سکے۔ یعنی اسے زیادہ سے زیادہ انسانیت نواز بنایا اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کی آئیڈیولوجی غیر مارکسی ہوتے ہوئے بھی انسان دوستی کی آئیڈیولوجی تھی اور سرمایہ داری کی سخت دشمن تھی۔ اگر منشی پریم چند کے یہاں قدیم ہندوستان کے دیہی جمہوریہ کی اٹوپین اور اخلاقی ائیڈیولوجی تھی، علامہ اقبال کے یہاں ابتدائے اسلام کے عربوں کی قبائلی جمہوریہ کی اٹوپین اور مذہبی آئیڈیولوجی تھی، لیکن چونکہ وہ عمل کے قائل تھے اور فلسفۂ عمل مغرب کے بورژوا طبقے کی دین تھا اس لئے علامہ اقبال کے یہاں بالخصوص جنھوں نے فلسفۂ عمل سے زیادہ بحث کی ہے، وہ آئیڈیولوجی بہت زیادہ مرکب اور پر تضاد ہو گئی ہے۔ لیکن چونکہ منشی پریم چند فلسفۂ عمل سے زیادہ صرف عمل کے قائل تھے اس لئے ان کی آئیڈیولوجی نسبتاً صاف اور سادہ ہے۔ لیکن چونکہ عمل کسی بھی طبقاتی سماج میں طبقاتی تصادم اور تشدد سے عاری نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے عمل کے وہ نتائج منشی پریم چند کی ائیڈیولوجی کی اخلاقیات سے ٹکراتے بھی ہیں۔ وہ اپنے جذبۂ عمل اور اخلاقیات کے اس تضاد پر اس وقت قابو پا سکتے تھے جبکہ وہ حقیقت کو خواب میں بدل دیں۔ لالہ سمرکانت (میدانِ عمل) استحصال کے تشدد سے عاجز آ کر استحصال کو چھوڑ دیں۔ منشی پریم چند کے ناولوں میں ظلم کرنے والے کرداروں میں جو روحانی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے وہ اسی طریقۂ کار یا خواب کا نتیجہ ہے۔ وہ جذبۂ عمل کو اپنی ائیڈیولوجی کی اخلاقیات کا پابند کر دیتے ہیں۔ وہ ظالم کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں لیکن اسے جسمانی طور سے ختم کرنے کے بجائے اسے روحانی طور پر زندہ کرتے ہیں۔ اگر منشی پریم چند کے ناقدین اسے خلافِ حقیقت بتلاتے ہیں تو یہ غلط نہیں ہے کیونکہ حقیقت کی دنیا میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس سے منشی پریم چند کی حقیقت نگاری پر کوئی بڑا حرف نہیں آتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اس طریقۂ کار میں نہ تو ظالم کے تشدد سے آنکھیں چراتے ہیں اور نہ ہی اس کے ظلم پر پردہ ڈالتے ہیں۔ حقیقت نگاری کا اہم ترین کام سماجی حقیقت کے تضاد کو بے نقاب کرنا ہے۔ ضدین کو ان کے منطقی نقطے یعنی ایک دوسرے کو نفی کرنے والے نقطے تک لے جانا ہے۔ ناول میں کلائمکس اس نقطے پر پہونچتا ہے ظاہر ہے کہ اس معرکے میں نفی وجود کی پرانی قوت کی ہوتی ہے نہ کہ نئی قوت کی کیونکہ قانونِ حقیقت یہی ہے۔ اس لئے نئے کے ساتھ فن کار کا جذباتی اتحاد Identification بہت ضروری ہے۔ لیکن اگر اس سے کوئی یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ فن کار اس جذباتی اتحاد کی منزل سے آگے بڑھ کر باقاعدہ کسی حل کو پیش کرے تو وہ فن پر نامناسب بوجھ لادنا چاہے گا۔ پریم چند کا جذباتی اتحاد نئی طاقت کے ساتھ ہوتا ہے کہ نہیں اس پر آگے روشنی ڈالی جائے گی سرِ دست تو یہ کہنا ہے کہ ان کی ائیڈیولوجی کی اخلاقیات سماجی حقیقت کے تضاد کو منطقی نقطے تک پہونچانے میں مانع نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے آرٹ پر اس سمجھوتہ بازی کا الزام عائد نہیں ہو پاتا ہے جو سماجی حقیقت کے تضاد کو اس کے منطقی نقطے تک نہیں پہونچاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ تضاد کے حل کرنے والے عمل کو اپنی آئیڈیولوجی کے اخلاقیات کا پابند کر دیتے ہیں اس لئے اس کا اثر ان کے عمل پر بھی پڑتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ یقیناً نکالا جا سکتا ہے کہ منشی پریم چند بھی ٹالسٹائی کی طرح اخلاقیات کے [illegible]

دیتے ہیں۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے نہ صرف اپنے ناولوں میں کیا ہے بلکہ اپنے خطبات اور تحریروں میں بھی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں کہ "اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف ان کے طرزِ تخاطب میں فرق ہے"۔ اس کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ "بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے (اور اس میں وہ ظالم مظلوم کا کوئی فرق نہیں نکالتے ہیں) ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چپٹی ہوئی ہیں۔ جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری، اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے"۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پریم چند کا انسان فطری طور پر اخلاقی انسان ہے۔ اخلاقیات اور نیچرلزم کا یہ امتزاج جو کہ ہمیں منشی پریم چند کے یہاں ملتا ہے اور جو یورپ کی رومانوی تحریک کی دین تھی مشرق کے لئے بہت ہی سازگار رہا ہے۔ یہ امتزاج مختلف صورتوں میں حالی، اقبال، پریم چند سب ہی کے یہاں ہے۔ بہرحال یہ اسی امتزاج کا نتیجہ ہے کہ اگر ایک طرف (ابتدائی دور کے قصے کہانیوں کو چھوڑ کر جبکہ وہ فوق العادت چیزوں کو بھی پیش کیا کرتے تھے) وہ واقعیت، مشاہدے اور محسوسات پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف اتنا ہی زور وہ عصمت وعفت، خلوص ووفا، ایثار وقربانی، ضبطِ نفس اخوت اور محبت کی قدروں پر بھی دیتے ہیں جو کہ ایک غیر طبقاتی سماج ہی میں بامعنی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک طبقاتی سماج میں جہاں انسانی رشتے مفقود ہوں اور صرف زر کے رشتے ہی انسانوں کے درمیان ہوں وہ قدریں اپنی نفی خود ہی کرنے لگتی ہیں۔ مثلاً ایک طبقاتی اور استحصالی سماج میں عورت کی وفا، ایثار اور خلوص مرد کے استحصال اور پرجا کی وفا، ایثار اور قربانی راجہ کے استحصال کا جواز بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات تقریباً ناگزیر ہو جاتی ہے کہ اخلاقی اقدار کے طبقاتی پہلوؤں کو نہ اجاگر کر سکنے کے سبب سے منشی پریم چند بہت سے امور میں قدامت پسندی اور رجعت پسندی کے حامی غیر شعوری طور پر ہو جائیں۔ مثلاً ہندوستانی سماج میں عورتوں کی جو پوزیشن رہی ہے وہ صرف انسانی رشتوں ہی کی متعین کی ہوئی نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر اقتصادیات، رسم ورواج اور دھرم شاستروں کے متعین کئے ہوئے ضوابط کی رہینِ منت رہی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں اقدار قدیم زمانے ہی سے آپس میں برابر ٹکراتی رہی ہیں۔ لیکن چونکہ جاگیردارانہ سماج میں انسانی رشتے بھی موجود رہے ہیں اس لئے ان کا تصادم اس وقت اتنا شدید نہ تھا جتنا سرمایہ دارانہ نظام میں ہوا ہے جس نے انسانی رشتوں کو تقریباً بالکل ہی بے دخل کر دیا ہے۔ . . . چنانچہ اس سماج میں بعض حالات میں تو مردوں کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ پالتو چوپاؤں اور پنچھیوں کا بھی نہیں رہا ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ جوں جوں ہمارے سماج میں مغرب کی لائی ہوئی آئینی حکومت، جمہوریت، انفرادیت اور تعلیم کا اثر بڑھتا گیا عورتوں میں بھی انفرادیت اور آزادی کا تصور اُبھرتا گیا۔ اس سے ان میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا اور وہ ان (اقدار) کو ٹھکرانے لگیں جو اُن کی آزادی کی جدوجہد میں حائل ہوئیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انھیں مردوں سے انسانی رشتوں کی بنا پر پریم نہیں رہا اور نہ اس کے یہ معنی ہیں کہ انھیں عصمت وعفت و وفا، ایثار اور قربانی عزیز نہ رہی۔ ہاں یہ فرق ضرور ہوا کہ وہ ان اقدار میں مساوات کی مدعی بن گئیں۔ منشی پریم چند نے اپنے ناولوں میں اس کسمساہٹ اور اس تصادم کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے لیکن وہ پوری طرح سے مرد اور عورت کے درمیان مساوات کے حامی نہ ہو سکے۔ وہ عورتوں کو غلام بنا کر رکھنے یا انھیں تعلیم و ترقی سے محروم کر دینے کے دعویدار نہیں ہیں۔ لیکن وہ اس معاملے میں یقیناً اٹل معلوم ہوتے ہیں کہ عورت مرد کو صرف سیوا ہی سے رام کر سکتی ہے۔ امرکانت "میدانِ عمل" میں سکینہ سے جو عشق کرنے لگا اس کا بنیادی سبب وہ یہی بتلاتے ہیں کہ سکھدا نے امرکانت کو اپنی سیوا سے رام نہیں کیا۔ تصور یہ ہے کہ وہ عورت کو بنیادی حیثیت سے ماں ہی کے روپ میں دیکھتے تھے جس میں بجز ایثار و قربانی اور مہر و وفا کے کوئی دوسرا ایسا جذبہ نہیں ہوتا۔ مزید اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ مرد کی نفسیات میں کرختگی ہوتی ہے جسے نرم کرنے کے لئے ماں کے پیار کا ملنا ضروری ہے۔ منشی پریم چند کے ان کلیات میں کتنی صداقت ہے یہاں اس سے بحث نہیں کیونکہ یہ باتیں سچ ہوتے ہوئے بھی اضافی ہو سکتی ہیں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ عورتوں کے بارے میں ان کے بہت سے تصورات قدامت پسندانہ اور کچھ رجعت پسندانہ بھی تھے۔ وہ اپنے اسی آئیڈیل کو سامنے رکھ کر اپنی تمام ہیروئنوں کو ایثار و قربانی، خلوص و وفا کی دیویوں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ گو ایسا نہیں ہے کہ پیر ڈگمگاتے نہ ہوں مثلاً "بازارِ حسن" میں سمن کی بے راہ روی میں اس کی اپنی کمزوریاں بھی دکھلائی گئی ہیں لیکن انھوں نے اس کی بڑی ذمہ داری اس کے شوہر ہی کے کاندھے پر ڈالی ہے اور اُسی سے سمن کے گناہوں کا پرائشچت بھی کرا دیا

ہے ۔ عورتوں کے بارے میں اُن کا یہ اندازِ نظر "گئو دان" تک میں قائم رہتا ہے مسٹر مہتا ایسا روشن خیال آدمی جو سماجی سدھار کا رہنما ہے اور جس کے خیالات کے ساتھ منشی پریم چند کی کافی ہم آہنگی ہے ویسی ہی باتیں عورتوں کے بارے میں کہتا ہے جس کا اظہار منشی پریم چند کئی ایک ناولوں میں کر چکے ہیں ۔

" میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بن جاتی ہے ۔ قالب مرد کا ہوتا ہے مگر جان عورت کی ہوتی ہے ۔ آپ کہیں گے کہ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا عورت ہی سے کیوں یہ اُمید کرتا ہے ۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا ۔ وہ کسی گپھا میں جا بیٹھے گا اور حال وقال کا خواب دیکھنے لگے گا ۔ اس میں جلال کی زیادتی ہے وہ اپنے گھمنڈ میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پتلا ہے سیدھا خدا میں جذب ہونے کا تصور کیا کرتا ہے ۔ عورت زمین کی طرح صبر و سکون اور برداشت والی ہے ۔ مرد میں عورت کے اوصاف آجائیں تو وہ مہاتما بن جاتا ہے اور عورت میں مرد کے گن آجائیں تو وہ بدکار بن جاتی ہے "

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مسٹر مہتا طلاق کے مخالف ہیں ۔ وہ شادی سے پہلے آزاد انتخاب کا تو حق دیتے ہیں لیکن شادی کے بعد طلاق کا نہیں چنانچہ انھیں خیالات سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے اس ناول میں مس مالتی اور مسز کھنا کے کردار کا جو مقابلہ کیا گیا ہے اس میں برتری اور فضیلت ، وفا اور ایثار کی مورت مسز کھنا کو بخشی گئی ہے کیونکہ اس نے اپنی خودی کو مٹا ڈالا تھا ، مسٹر کھنا کے ہاتھوں پٹتی ہے پھر بھی ان سے جدا ہونے کا نام نہیں لیتی ہے ۔ اس کے برعکس مس مالتی جو ولایت کی پاس شدہ ایک لیڈی ڈاکٹر ہے ، مسٹر مہتا کے رجعت پسند خیالات کے سانچے میں اپنے کو بہت کچھ ڈھالنے کے باوجود وہ مسٹر مہتا سے شادی کرنا پسند نہیں کرتی تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو مٹانا نہیں چاہتی ہے وہ سماج کو تندرست رکھنے کے لئے عورتوں کے حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے ۔ وہ اپنے آپ کو اور مسٹر مہتا کو یہ سمجھا کر تنہا رہنا پسند کرتی ہے کہ سماج کو مسٹر مہتا کی خدمات کی ضرورت ہے ۔ اگر وہ بال بچوں کے جھمیلے میں پڑ گئے تو وہ اپنی خدمت کو پوری طرح انجام نہیں دے پائیں گے ۔ قاری اس کی ان باتوں سے اتنا مطمئن نہیں ہوتا جتنا اس بات سے کہ مس مالتی کو مسٹر مہتا کے جذبۂ رقابت کی حیوانیت سے سخت نفرت تھی جو اصل میں ان کے جذبۂ ملکیت کی غمازی کرتا ۔ منشی پریم چند نے دو آزاد شخصیتوں کے بیاہ کو ، دو خودیوں کے امتزاج کے مسئلہ کو اسی جگہ پر چھوڑ دیا ہے آگے نہیں بڑھایا ہے ۔ چونکہ جس نقطۂ نگاہ سے وہ عورت اور مرد کو دیکھنے کے عادی تھے اور جس قسم کا تصور وہ بیاہ اور شادی کا رکھتے تھے اس میں مالتی اور مسٹر مہتا کا کوئی حل نہیں تھا ۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ وہ مس مالتی کو اس قسم کی فلسفہ بازی پر مجبور کرتے ہیں جس میں دیش بھگتوں اور مصلحانِ قوم کے لئے اکیلا رہنا ہی مستحسن ہے ۔ اس قسم کا گریز منشی پریم چند کے یہاں کئی جگہوں میں ملتا ہے جب وہ زندگی میں عمل اور صرف عمل کے قائل ہو گئے اور " میدانِ عمل " ایسی بلند پایہ تصنیف پیش کی تو اس کی امید کی جاتی تھی کہ وہ امرکانت کے جوشِ عمل کو ٹھنڈا کرنا پسند نہیں کریں گے ۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب وہ جیل میں جاتا ہے تو جیل کا سفر اُس کے لئے ہردوار کی یاترا بن جاتی ہے ۔ جب وہ جیل میں اپنے عمل سے پیدا شدہ تشدد پر غور کرتا ہے تو اندھیرے میں کھوئے ہوئے مسافر کی طرح اس کا ضمیر سر جھکا کر دُعا کرنے لگتا ہے " بھگوان مجھے کچھ نہیں سوجھتا " ۔ اور جب وہ سامابائی کو بھی اسی جیل یاترا میں پاتا ہے اور ساتھ ہی یہ خبر بھی سنتا ہے کہ نینا انصاف کی اسی لڑائی میں ماری گئی تو امر کی "حواس نصیب" آنکھوں میں چاروں طرف مشیت ایزدی کے جلوے نظر آنے لگتے ہیں ۔ " یہ صحیح ہے کہ منشی پریم چند کی یہ روحانیت فراری نہیں ہے وہ جوگ بیروگ اور ترک نہیں سکھاتی لیکن جس حد تک کہ اس روحانیت کا تضاد ایک طبقاتی سماج میں عمل کے ناگزیر تشدد سے ہے وہ عمل کی گرمی کو ٹھنڈا بھی کر سکتی ہے جیسا کہ امرکانت کے ساتھ ہوا وہ اپنے پورے کنبے کے ساتھ میدانِ عمل چھوڑ کر ہردوار کی راہ لیتا ہے ، حالانکہ اس ناول میں یہ امرکانت ہی ہے جو کہتا ہے کہ " خدا انسان نہیں پیدا کرتا ۔ انسان ارتقاء کی ایک منزل کا نام ہے ۔ ان ساری باتوں کے اُبھارنے کا مقصد یہ تھا کہ باوجود اس بات کے کہ منشی پریم چند کا کریکٹر اخلاقیات کا پابند ہے ، باوجود اس بات کے کہ وہ روحانیت کے قائل ہیں ، باوجود اس بات کے کہ وہ بعض سماجی اقدار میں قدامت پسند ہیں ، اُن کا آرٹ ترقی پسند ہے ۔ اس معنوں ہی کے ناتے نہیں کہ ان کی آئیڈیلزم سماجی حقیقت

کے تضاد کو بے نقاب کرنے میں کامیاب نہیں آتی، بلکہ اس خیال کے تحت بھی کہ اُن کی آئیڈیولوجی مارکسی نہ ہونے کے باوجود (جبکہ مارکسزم اُن کے ملک میں موجود تھا) ان ترقی پسند عناصر کی حامل ہے جو جاگیردارانہ دور کی اشتراکیت اور انسان دوستی کی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی آئیڈیولوجی میں بعض رجعت پسند عناصر بھی ہیں لیکن وہ غالب نہیں ہیں منشی پریم چند کی یہ آئیڈیولوجی امپیریلزم اور سرمایہ دارانہ استحصال کی حمایت نہیں کرتی ہے ان کی یہ آئیڈیولوجی ہندوستانی سماج میں اس وقت تک مارکسزم کے ساتھ ساتھ زندہ رہے گی اور دورِ غلامی کے باقیات کے خلاف جنگ کرنے میں مددگار ہوگی۔ جب تک کہ اشتراکیت کی سائنس جو اُنیسویں صدی کی پیداوار ہے مارکسزم کو ہندوستانی سماج میں ایک زندہ اور ایک ٹھوس حقیقت اور ایک تہذیب افزا تخلیقی قوت میں تبدیل نہ کردے یعنی جب تک وہ مشرق کی بہترین اقدار کو ہضم نہ کرلے۔ اس سلسلے میں اس بات کی وضاحت کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ منشی پریم چند کی آئیڈیولوجی گاندھی ازم اور اہنسا کی آئیڈیولوجی نہیں ہے۔ "گوشۂ عافیت" "چوگانِ ہستی" "میدانِ عمل" اور "گئودان" ان میں سے کوئی بھی ایسا ناول نہیں ہے جہاں ظلم کی مخالفت اور مدافعت میں انسانوں کو لہو سے تر بتر نہ دکھایا گیا ہو، جہاں ظالم کو اپنی جگہ سے نہ ہٹنے پر دھکا نہ دیا گیا ہو اور جہاں اس لڑائی میں مرنے والوں کو شہیدِ انسانیت کا لقب نہ دیا گیا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ نیکی کے جذبے کو بیدار کئے بغیر ظالم کو موت کے گھاٹ اُتارنا ناانصافی سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے ضمیرِ انسانیت کی عدالت میں دکھی انسانوں کا استغاثہ لاتے ہیں۔ ظالم کو مجرم قرار دے کر اس کو اعترافِ جرم اور استغفار پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر اس طریقۂ کار سے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے تو وہ اسے اپنی برادری میں قبول کر لیتے ہیں ورنہ اس کے خلاف بندوق اور ڈنڈا اور سب کچھ استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ فلسفہ گاندھی ازم سے مختلف ہے اس میں سماجی ظلم اور ناانصافی کے خلاف اٹل جذبۂ بغاوت ہے وہ انھیں فطرتاً شروع ہی سے کانگریس کے گرم دل اور [illegible]ء کے لیے انقلابی جماعتوں کی طرف کھینچتا رہا ہے۔ چنانچہ "گوشۂ عافیت" میں وہ سوویٹ انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن سوویٹ روس کی اشتراکیت کے بارے میں جو صحیح اطلاعات بہت دنوں تک ہندوستان میں نہ آسکیں اور یہاں کے دانش ور طبقے میں اشتراکیت کے غلط تصورات (جو یقیناً مضحکہ خیز ہیں) پھیلے ہوئے تھے اس لئے ان کی دلچسپی اس کے فلسفے سے نہ بڑھ سکی۔ اس کا

اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ "گئودان" میں پنڈت اونکارناتھ ایسے گھٹیا صحافی کو اشتراکی خیالات کا ترجمان بناتے ہیں اور مسٹر مہتا سے اُن کے خیالات کی تردید کرواتے ہیں۔ اگر آج کی اطلاعات اور معلومات کی روشنی میں ہم اونکارناتھ کے اشتراکی خیالات کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں گے کہ شری پنڈت اونکارناتھ جہالت محض کا ایک بنڈل تھا۔ یہ عدم واقفیت نہ صرف اس زمانے میں عام تھی بلکہ آج بھی یہاں کے دانش ور طبقے کے بعض حلقوں میں موجود ہے۔ کوئی اشتراکیت کو روٹی کا فلسفہ سمجھتا ہے، کوئی اسے اٹھارھویں صدی کی میکانکی اور بھونڈی مادیت تصور کئے ہوئے ہے اور کوئی فلسفۂ عیش کوشی کو ابیکورس کے سر تھوپ کر اشتراکیت کے ہم معنی کئے دیتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل محسوس نہیں ہوتا کہ جہاں تک اشتراکیت کی سائنس یا فلسفے کے علم کا تعلق ہے منشی پریم چند کو اگر کوئی علم تھا تو وہ غلط اطلاعات پر مبنی تھا لیکن چونکہ انھوں نے گورکی کی طرح اشتراکیت کو زندگی سے سیکھا تھا اس لئے وہ مارکسٹ نہ بننے کے باوجود اشتراکی تھے۔ انھوں نے اشتراکیت کی اسپرٹ کو اپنے آئیڈیل اور اپنے تصورات میں ڈھال لیا تھا۔ جس پس ماندہ ماحول میں منشی پریم چند گھرے رہے، جن لوگوں کی صحبت سے وہ فیضیاب ہوئے اس میں رہ کر وہ اس سے زیادہ کیا کرسکتے تھے کہ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے ذریعے ایک ایسی معاشرت کی ضرورت کو محسوس کرائیں جو غلامی، استحصال اور مہاجنی تہذیب کے رشتوں سے پاک ہو اور جہاں صرف انسانیت کے رشتوں کا بول بالا ہو۔ یہ نصب العین کانگریس کا کبھی نہیں رہا ہے جو کہ مہاجنی تہذیب کا ایک ستون ہے۔ کانگریس کا نصب العین سیاسی آزادی سے آگے تھا ہی نہیں اس کے برعکس منشی پریم چند کا نصب العین ہندوستان کی صرف آزادی نہیں بلکہ آزاد انسانوں کی ایک جمہوریہ کا رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس جمہوریہ کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں نہ تھا اور نہ انھیں اس جمہوریہ تک پہنچنے کا کوئی سائنٹفک راستہ ہی معلوم تھا۔ لیکن اس سے اُن کے نصب العین پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ منشی پریم چند شروع ہی سے کسی بہت بڑے آئیڈیل کے حامل تھے یا یہ کہ وہ شروع ہی سے انقلابی تھے۔ یہ رجحان انھیں سنہ [illegible]ء کے بعد پیدا ہوا ہے جس کا اظہار میں پہلے کر چکا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نہ نکالنا چاہئے کہ جب وہ اس منزل کی طرف آگے بڑھتے ہیں تو اُن کی حقیقت نگاری میں کوئی کھوٹ نہیں رہتا۔

"گوشۂ عافیت" "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" یہ تینوں ناول جو سنہ
کے بعد لکھے گئے اُن کے آرٹ کی بہت سی کمزوریوں کا پتا دیتے ہیں۔ وہ حقیقت
کو جذباتی روپ میں دیکھنے کے تو عادی ہو جاتے ہیں اور پلاٹ کی سازش
سے کترانے لگتے ہیں لیکن سماجی حقیقت کے بنیادی تضاد کو پوری طرح سے
اُبھار نہیں پاتے ہیں۔ مثلاً "چوگانِ ہستی" میں سورداس کسی قابلِ کاشت
زمین کو نہیں بلکہ اپنی ناقابلِ کاشت زمین کو پانچ ہزار روپے کے معاوضے پر بھی
اس لئے نہیں بیچتا کہ صنعتی تہذیب بدکاری پھیلاتی ہے اور وہ اُس زمین پر
مندر اور دھرم شالہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ موٹو یا محرک سورداس کے سے مذہبی
اور بھکاری کیریکٹر کے حق میں تو ٹھیک ہے لیکن ہندوستانی معاشرت کے
پس منظر میں جہاں زمینداری اور سرمایہ دارانہ استحصال کسانوں کو روز بروز
زیادہ سے زیادہ بے کھیت اور مزدور کسانوں میں تبدیل کرتا رہا ہے، صنعتی
پھیلاؤ کم از کم اُن کے لئے روزگار بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اگر منشی پریم چند
صنعتی پھیلاؤ کے کسی اور ترقی پسندانہ پہلو کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ منشی پریم چند
نے حقیقت کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کیا ہے صرف ایک جانب سے یعنی صنعتی
تہذیب میں اخلاقیات کی گراوٹ کے نقطۂ نظر سے صنعتی پھیلاؤ کو دیکھا ہے۔ چنانچہ
"گئودان" ایک ایسا ناول ہے جہاں وہ سماجی حقیقت کے تضاد کو اس کے منطقی
روپ میں دکھلاتے ہیں وہاں اُن کی گرفت زندگی پر زیادہ سے زیادہ مستحکم نظر آتی
ہے۔ کسی بھی فن کار کے آرٹ کو پرکھنے کے لئے اس کی بہتر چیزوں کو دیکھنا چاہئے
نہ کہ اس سے کم درجے کی۔ قبل اس کے کہ میں ناول کی تفصیلات میں جاؤں، اس
متنازعہ مسئلے کو لینا چاہتا ہوں کہ آیا ہوری جو کہ اس ناول کا ہیرو ہے ایک عظیم
کیریکٹر ہے کہ نہیں۔ کسی بھی کیریکٹر کی عظمت اس کے کردار میں ہوتی ہے نہ کہ
اس بات میں کہ فن کار نے کس ہنرمندی سے اس کے کردار کو پیش کیا ہے ۔۔۔
ہوری منشی پریم چند کے اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے تو یقیناً عظیم ہے لیکن
وہ منشی پریم چند کے انقلابیت کے نقطۂ نظر سے یا سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ
سے عظیم نہیں ہے۔ وہ عظیم اس اعتبار سے ہے کہ وہ ہمیں سوشل اقدار،
محبت و مروت، ایثار و اکرام کا حامی ہے انھیں باوجود مصائب کے نبھاتا
ہے۔ وہ مر جاتا ہے لیکن اپنی محبوب ترین اقدار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔
گو یہ اس کا اظہار کرتا ہے کہ جس دیش کے لوگ بھوکے ننگے ہوں وہاں یہ
قدریں بے معنی ہیں لیکن ہوری اپنی ڈگر سے نہیں ہٹتا ہے۔ وہ اس
پر قائم رہتا ہے۔ ہیرا نے اُس کی عزیز ترین آرزو یعنی اُس کی گائے کو
زہر دے دیا لیکن وہ اس سے انتقام لینے کے بجائے اُسے جیل سے بچانے
کے لئے ڈنڈ بھرتا ہے اور ہیرا کے بھاگ جانے کے بعد وہ اس کے کنبے کی
پرورش کرتا ہے۔ ہوری منشی پریم چند کی نگاہ میں اسی معنی میں عظیم ہے
کہ وہ آدمی نہیں بلکہ دیوتا ہے۔ بھگوان کی طرح رحیم و کریم ہے۔ " کون
کہتا ہے کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں ہارا ہے۔ یہ خوشی یہ غرور، یہ حوصلہ
دراس کی موت کے وقت کی تصویر ہے، کیا یہ غروری علامت ہے۔ ایسی
ہی شکستوں میں اس کی فتح ہے، اس کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار اس کی فتح
کے جھنڈے ہیں، چہرے پر چمک آگئی ہے، ہیرا کی ممنونیت میں اس کی زندگی
کی ساری کامیابی مجسم ہو گئی ہے۔" پریم چند کا یہ آخری جملہ ہی ہوری کی
کامیابی اور عظمت دونوں کو اُبھارتا ہے۔ ہوری کی بہترین آرزوؤں کا قاتل
اپنے پاپ پر نہ صرف نادم ہے بلکہ ہوری کا ممنون ہے جس طرح کہ ایک بندہ خدا
کا ممنون ہوتا ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

اہلِ کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا کہتے

کاش پریم چند کو بھی یہ احساس ہوتا کہ کسی کو خدا کہنا بھی شرم کی بات ہے تو
وہ ہوری کی، ہیرا کے مقابلے میں دیوتا کی طرح پرستش نہ کرتے بلکہ انسان
کے اس کارنامے کا کھوج لگاتے جو ممنونیت کے اسباب کو اپنے سماج سے
ختم کرتا جا رہا ہے۔ ہوری سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے ایک مجہول
کردار ہے۔ اس میں مرجاد کے بندھن کو جو کہ قطعاً ایک رجعت پسندانہ قدر
ہے، توڑنے اور اپنے حقوق کے لئے سینہ سپر ہو کر لڑنے کے لئے دم باقی
نہیں ہے۔ یہاں منشی پریم چند کا ہوری ٹالسٹائی کا وہ کسان ہے جو ظلم
کو اخلاقی قوت کے ساتھ جھیلنے اور دشمن کو اپنی اس اخلاقی قوت سے
مفتوح کرنے ہی میں زندگی کی بڑائی تصور کرتا ہے۔ ٹالسٹائی کے اس رجحان
کی مخالفت میں کسی اور کا ذکر کیا، چیخوف ایسے فن کار نے جو اُس کے فلسفے
سے کسی زمانے میں متاثر تھا، اس کے رجحان کی مخالفت کی ہے۔ اور اگر
یہ کہا جائے کہ جس زمانے میں یعنی سنہ ۳۰ء کے بعد کے زمانے میں جب کہ
یہ ناول لکھا گیا تھا کسانوں کے درمیان سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے
کوئی بڑا اور مثبت کردار پیدا نہیں ہوا تھا تو ایسا کہنا غلط ہوگا کیونکہ

منشی پریم چند ویسا شخصیت کردار نہ صرف ... میں ... کرچکے تھے بلکہ اسی ناول میں گوبر کی شخصیت میں موجود ہے۔ پھر بھی وہ گوبر کو ہیرو نہیں بناتے ہیں اور نہ اس کے کردار کے انقلابی پہلو ہی کو پوری طرح اُبھارتے ہیں۔ اصل سے ہٹا کر خانگی لوکر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان ساری باتوں کا سبب یہ ہے کہ وہ ٹالسٹائی کی اخلاقیات سے متاثر تھے۔

(باقی)

شبیر فاطمہ

باسمہٖ سبحانہٗ

(تہنیۃ قدوم جلالۃ الملک السلطان سعود بن عبد العزیز خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ)

اَبیاتُ اَطیاب

طُوبیٰ لنا مَقدمُ السُّلطان - اِنَّ لَہٗ   فَضلاً جَسِیماً علیٰ جمعِ الاساطینِ

ہمارے لئے حضرت سلطان کی تشریف آوری ایک سعادت و مسرت کی بات ہے، کیونکہ اُن کو مشاہیرِ عالم پر ایک بڑی فضیلت حاصل ہے

بخدمۃِ الحرمینِ اللہُ اَسعدَہٗ   کفیٰ بہٖ شرفاً بینَ السَّلاطینِ

اللہ تعالیٰ نے اُن کو حرمین شریفین کی خدمت بخش کر بڑی سعادت عطا فرمائی ہے، یہ شرف اُن کو سلاطینِ عالم سے ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے

فغیرُہٗ مرکبُ دُنیاہُ ترکبُہٗ!   وانَّہٗ راکبُ دُنیاہُ بالدِّینِ

کیوں کہ دیگر سلاطین تو گویا ایک سواری ہیں جس پر خود ان کی دنیا سوار ہے، اور یہ ایک شہسوار ہیں جو دین کی برکت سے اپنی دنیا پر قابو یافتہ ہیں

شعائرُ اللہِ فِی الدُّنیا معظَّمۃٌ   مِن عزمِہٖ وجرتْ شرائعُ الدِّینِ

آپ کے عزم جزم کا یہ اثر ہے کہ آج دنیا میں شعائر اللہ کی تعظیم کی جا رہی ہے، اور شرائع دین کا رواج عام ہو رہا ہے

وقلبُ کُلِّ صبُورٍ شاکرٍ فرِحٌ   بالہندِ زارُوا ملیکاً غیرَ مظنونِ

ہر صابر شکور (مسلم) کا دل آج بہت ہی خوش ہے کیونکہ اُنھوں نے ہندستان ہی میں ایسے بادشاہ کی زیارت کر لی جن کے آنے کا وہم بھی نہ تھا

دُنیاہُ ما دنستْ باللُّومِ شیمتَہٗ   فیا لہٗ ملکٌ فی طبعِ مسکینِ

آپ کی دُنیا اور ملکداری، آپ کے شیم کریمہ کو پستی و دنائت سے ذرا بھی آلودہ نہ کرسکی، واہ رے بادشاہ کہ قبضہ میں سلطنت پھر بھی مزاج میں مسکنت

یا ربِّ! اَحیِہٖ مِسکِیناً - اَمِتہٗ کذا   واحشُرہُ یا ربِّ فی زُمرِ المساکینِ

(حدیث کے الفاظ میں دعا ہے کہ) اے خدا! آپ انھیں مسکین ہی زندہ رکھئے اور آخر دم تک انھیں مسکین رکھئے اور انھیں زمرۂ مساکین میں محشور فرمایئے۔ آمین

نازش پرتاپگڑھی

مرنے سے پہلے، مرنے کے بعد

(مجاز کی موت پر)

"رات اور ریل" میں لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ غزل اتنی نہیں، اور بھی گہری ہوتی
اور "نورا" کے کئی شعر بہت عریاں ہیں
وہ فلاں نظم، ذرا اور بھی تیکھی ہوتی
کتنی بے معنی و بے ربط ہے "یہ آوارہ"
ایسی کیوں ہے — یہ ذرا اور بھی ویسی ہوتی

بزمِ تہذیب میں یہ شخص ہے ننگِ محفل
باغِ اخلاق میں اک خار بنا پھرتا ہے
حلقۂ شعر و ادب میں نہ بلاؤ اس کو
میزبانوں کے لئے بار بنا پھرتا ہے

گندگی سب پہ اُچھالے گا وہ مصرعے اپنی کر
اپنی اک[1] نظم کا کردار بنا پھرتا ہے

یہ — اور اس قسم کے کچھ اور بھی سطحی فقرے
لوگ کہتے رہے، کہتے رہے کہتے ہی رہے
اور کوتاہ نگاہوں کی نہ پہنچ سے آگے
وہ کہ خود[2] اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
بزمِ احباب میں ہر لمحہ بنا باغ و بہار
دامنِ غم پہ بناتا ہی رہا نقش و نگار

۱- مراد "آوارہ"   ۲- مجاز ہی کا مصرعہ ہے

وہ کہ اس دور میں "رسوا سرِ بازار ہے" تھا
وہ کہ اس دور کے طوفان سے لڑتا ہی رہا
اپنے ہاتھوں میں لئے ساغر و مینا کے کنول
وہ کہ ظلمات کے شیطان سے لڑتا ہی رہا
وہ کہ دامن میں سنبھالے ہوئے چبھتے فقرے
تلخیٔ زیست کے طوفان سے لڑتا ہی رہا

خونِ دل، خونِ جگر اپنے تبسم میں لئے
رنگِ تصویر میں بکھرتا رہا، بھرتا ہی رہا
درد و غم جتنے بڑھے جرأتِ دل بڑھتی گئی
وہ سوئے کوچۂ جاناں کے خلوص اور نکھرتا ہی رہا
قطرۂ مے نوشی میں بھی تشنہ و امنت نہ بجھی
وہ بگڑ جانے میں کچھ اور سنورتا ہی رہا

رشکِ صد ہوش جو مستی تھی وہ مستی نہ رہی
تھی[1] جو چلتی ہوئی تلوار وہ ہستی نہ رہی
حیف وہ سادگیٔ زیست کی بستی نہ رہی

قوم چلائی — دیوقیں پہلے بھی چلائی ہے
اس کے مرنے سے بپا ہو گیا اک ایسا خلاء
سال ہا سال بھی پُر ہو نہ سکے جو شاید
فن کی معراج ہے اس شخص کی نظم "آوارہ"
"رات اور ریل" کے کیا کہنے کرشمہ پارہ ہے
زیست کا آئینہ خانہ ہے ہر اک شعر اس کا
اُس کی مے نوشی تو اک پردۂ محرومی تھی
اُس کا کردار بڑا پختہ، بہت اونچا تھا
کتنا بے لوث وہ انسان تھا، کتنا مخلص
عظمتِ زیست کا راز اُس کے سوا کس کو ملا

—اور پھر ٹوٹ گیا ربطِ ہستی کی طرح
(چند بے جان سی سانسوں کی تضمینت کیا ہے)
(اس اپنے کا سبب کون ہے احباب کرے؟)

جانے اس رسم کو کب دور کیا جائے گا
جانے فن کار کو کب جینے دیا جائے گا

[1] یہ دو شعر مجاز کی نظم "نذرِ دل" سے مستعار ہیں

مختار الدین احمد آرزو

مانچسٹر میں اردو کے کچھ قدیم رقعات

جون ریلینڈز لائبریری مانچسٹر، انگلستان کی مشہور پبلک لائبریری ہے جو اپنے عربی و فارسی مخطوطات کی وجہ سے خاص شہرت رکھتی ہے۔ عربی مخطوطات کی تفصیلی اور فارسی کی دستی فہرستیں شائع بھی شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے وہاں اردو کی بھی کچھ قلمی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جن کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں۔ ان میں سے فی الحال دو مجموعوں [ہندوستانی: ۲۳، ۲۴] کا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں جن میں اردو کے بعض رقعات موجود ہیں۔

ہندوستانی: ۲۳ کاغذوں کا ایک رول ہے جس میں رقعات پروانے اور مختلف قسم کی تحریریں یکے بعد دیگرے چسپاں کر کے لپیٹ دی گئی ہیں۔ یہ تحریریں زیادہ تر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا کی ہیں۔ اکثر فارسی میں ہیں۔ بعضوں پر محمد حسن خاں کا نام ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں انھیں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس میں چند اردو رقعے بھی ہیں۔ رقعہ ۱ کا متن پیش کیا جاتا ہے۔ لکھنے والا کا نام موجود نہیں۔ تحریر خوش خط ہے زبان ہندی ہے لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ رقعہ لکھنے کے لئے رسم الخط فارسی اختیار کیا گیا ہے۔

ہندوستانی: ۲۴ کچھ منتشر کاغذات دو بچھوں میں بغیر کسی ترتیب کے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ زیادہ تر انگریزوں کے نام ہیں۔ کچھ فارسی میں کچھ فارسی رسم الخط میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب بہادر جب ہندوستان میں تھے تو متعلقین اور متوسلوں نے جو رقعے انھیں لکھے تھے انھوں نے محفوظ رکھ چھوڑا اور بعد میں یہ کاغذات کچھ مزید کاغذات کے ساتھ اس لائبریری میں پہنچ گئے۔ اس میں اردو کے بھی بعض رقعات اور عرضیاں ہیں۔ بعض عرضیوں کی پشت پر انگریزی تحریریں ہیں۔

اردو کے رقعوں کے مکتوب الیہوں کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ رقعات ۲، ۳ ایک ہی قسم کے کاغذ اور ایک ہی روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور کاتب دونوں کا ایک ہے۔ رقعہ ۱ کسی اہل کار اور متصدی کی طرف سے ہے، ۲، ۳ دوستانہ اور برادرانہ رقعات ہیں (رقعات ۲، ۳) عرضی ہے جس میں ایک ماہ کی مہلت مانگی گئی ہے۔ یہ ممکن ہے کسی انگریز آفیسر کے نام ہو۔ ۳، ۴ اپنے سے کسی بڑے کو عرضیانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔

ان رقعات کی ادبی اہمیت تو کچھ نہیں ہے۔ لکھنے والے کم پڑھے لکھے لوگ معلوم ہوتے ہیں اور زبان و املا کی متعدد غلطیاں موجود ہیں، لیکن اس کی لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو رقعوں پر سال تحریر سنہ ۱۸۴۴ء درج ہے اور تحریروں کا زمانۂ تحریر بھی اس کے لگ بھگ سمجھنا چاہیے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو میں خطوط لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور عوام تو عوام خواص بلکہ اردو زبان کے شعراء اور ادباء بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ خود مرزا غالب کا کوئی رقعہ یا خط سنہ ۱۸۴۴ء یا اس سے پہلے کا اب تک دست یاب نہیں ہوا ہے۔

اس بات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رقعہ ۱ کے کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہندو ہیں۔ زبان ہندی ہے لیکن رقعہ نگار نے فارسی رسم الخط میں لکھنا پسند کیا ہے۔ اسی طرح رقعات ۴، ۵ کے لکھنے والے گوردیال لعل اور نرائن سنگھ ہیں۔ رقعہ ۵ کا مکتوب الیہ متحقق نہیں لیکن رقعہ ۴ کا مکتوب الیہ یقیناً کوئی ہندو بابو صاحب ہیں۔

اس رقعے میں حسب ذیل عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں:

مہربان، حال، سلامت، بعد، سلام و بندگی، ظاہر، معلوم، طبیعت، خیر و عافیت، ہمیشہ، صورت احوال، طور، رخصت، طرف، حیران و پریشان، قصور، قسمت، یک مرتبہ، ارادہ، دوچار، منع، سبب، امید، ذات، تکلیف، آئینہ، مالک و مختار، مناسب، فقط، زیادہ، راقم، شوق، بندہ۔

اب رقعات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

بابو صاحب ... سدا آنند سے ان کو رکھے شیو بھگوان

بعد چرنجیوی اوپر نام کے ظاہر کیا گیا ہیرده مبارک میں آتا ہے کہ یہاں چھوٹے بڑے سب ساتھ خیریت کے ہیں اور آپ کی خیر و عافیت کے واسطے نت گوسیاں کی درگاہ میں دست بہ دعا رہتے ہیں۔

صاحب میرے! یہاں کا سماچار ایسا ہے کہ ۔ ۔ بیسویں اکتوبر مہینہ سنہ حال کو بابو کرن سنگھ صاحب نے ایک تعلقہ پرگنہ اسماسے (۹) ضلع بہار ہیں کہ جمع روں اس کا پانچ ہزار روپیہ بہ تعداد چالیس موضع ایک کوزہ اصلی کے مقرر ہے بہ قیمت ساٹھ ہزار روپے کمپنی پر ڈاک نیلام میں صاحب کلکٹر کے کچہری میں خرید کیا ہے۔ واسطے اطلاع کے بیکھا (لکھا)

ایام خوشی کا ہمیشہ ساتھ مقصد کے ہو جیو

(۲)

اللہ برتر

پیارا بھائی میرے کو خدا سلامت رکھے۔ بہت بہت دعا اور نہایت شوق کے پیچھے عزیز کو معلوم ہووے کہ بہت روز بیت گیا تمہارا خط نہ پانے سے نہایت متفکر ہوں اس لئے بڑا بے تاب ہو کر تمہاری خیریت کی خبر کے واسطے آدمی بھیجتا ہوں چاہیئے کہ اس کی معرفت اپنا احوال لکھ کر بھیجو گے کہ اس میں خاطر کی تسلی اور دل کی جمعیت حاصل ہوگی۔ اس کے پیچھے خط بھیجنے میں اور غفلت نہ ہوئے کاہے کہ طرفین سے خط لکھنا حقیقت میں آدھی ملاقات ہے۔

تمہارے واسطے احمد علی سائیس کے ہمراہ یک راس گھوڑا بھیجا گیا پہنچے گا۔

فی التاریخ ۱۱ ماہ فروری سنہ ۱۸۴۲ عیسوی

(۳)

غریب پرور سلامت

آداب اور کورنش کے پیچھے معروض رکھتا ہے کہ آپ کے نوازش نامہ اس مہینے کی ۱۲ تاریخ ڈاک کی راہ پر ہمارے گھر میں آ پہونچی۔ ہم نے مہتاب رائے کو کلکتہ سے آکر حالات اس خط کے معلوم کئے۔ یہ صاحب سرکار کے مادے میں جو لکھے تھے سو آج کل ہونا بہت مشکل ہے۔ کاہے کہ میری طبیعت بہت نادرست [ہے] اس لئے میں وہاں جا نہیں سکوں گا۔ غیر اور دو تین روز کے بعد وہاں ہم جا کر آپ کو عرض کریں گے۔ حضور کے اقبال سے ہمارے یہاں سب خیریت میں ہیں۔ زیادہ حد آداب۔

فی التاریخ ۱۹ ماہ فروری سنہ ۱۸۴۳ عیسوی

(۴)

بابو صاحب مہربان بہت ، ہمارے حال پر تم کو سلامت رکھے کالی جی بعد سلام و بندگی کے ظاہر کرتا ہے تم کو معلوم ہوگا۔ ہم اچھی طرح سے ہیں اور تمہارا (کذا) خیر و عافیت ہمیشہ چاہتے رہتے ہیں۔ اب صورت احوال کا ہمارے اس طور پر ہے کہ جس روز سے ہم تم سے رخصت ہو کر واسطے نوکری طرف ضلع صاحب گنج کے آئے۔ اس روز سے نہایت حیران و پریشان رہتے ہیں لیکن یہ سب قصور اپنی قسمت کا ہے بلکہ یک مرتبہ ارادہ کیا تھا کہ پھر آویں مگر دو چار آدمی ہمارے دوستوں میں سے منع کیا دکھا کہ دس پانچ روز اور بھی دیکھ لو ، تب جانا۔ اس سبب سے رہا ہوں۔ اب امید آپ کی ذات سے ہے کہ ہمارے گھر کے آدمیں (آدمی) کسی بات سے تکلیف نہ پاویں آبندہ کو آپ مالک و مختار ہیں جیسا مناسب جانیئے گا ویسا کریئے گا۔ فقط زیادہ کیا لکھا جائے۔

راقم شوق

بندہ گوردیال لعل

(۵)

غریب پرور سلامت

بعد یک قطعہ مکان فدوی کا بہ سبب برشگال کے شکست ہو گیا ہے و فدوی باعث تہی دستی کے تیار نہیں کر سکتا ہے۔ چناں چہ حسب نالش شیو پرشاد کے حضور سے حکم واسطے تیاری مکان مذکور کے ہوا۔ اس واسطے امیدوار فضل و کرم خداوندی کا ہے۔ واسطے تیاری کے مہلت یکم مہینے کی دیا جائے۔ بعد گزرنے میعاد کے فدوی تیار کرے گا۔ فقط

عرضی فدوی نرائن سنگھ

دوست اور محب میرے سلامت رہو

سلام کے بعد عرض لکھتا ہے (خیریت ہمارا (کذا)) تمہاری خیریت سے ہے (خوشنودی مزاج آپ کا (کذا)) درگاہ میں اللہ کو بہتر چاہیے والا رہتا ہے مگر دس مہینے سے بندہ مرضی الٰہی کے بیمار رہتا ہے وبار سے تپ وکھانسی کے بہت لاچار رہتا ہے اور تاقت (طاقت) اُٹھنے و بیٹھنے کا نہیں رہتا ہے۔ اس واسطے آپ کو لکھا جاتا ہے کہ آپ دس روز کے واسطے مہربانی کرکے ہمارے پاس ملاقات کرنے کے لئے آئیے گا اس واسطے کہ ہم نیم جان ہیں اور کچھ دیری مت کیجئے گا اور جس وقت آپ آئیے اس وقت کوئی حکیم کو لیتے آویں گے۔ فقط

مضمون تمام ہوا، لیکن اس مجموعے میں سُرخ تلنگی کاغذ پر خوش خط لکھا ہوا فارسی میں ایک دعوت نامہ مجھے نہیں بھولتا جو پھلواری شریف، ضلع پٹنہ، بہار کے ایک بزرگ سید قمر علی مرحوم نے اپنے دو ہندو دوستوں کو آج سے ایک صدی پہلے بھیجا تھا جس سے اُس زمانے کے آپس کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

احقر العباد سید قمر علی بہ خدمت بزرگان و دوستان ملتمس مے گردد کہ بہ تاریخ نوزدہم ماہ صفر روز پنج شنبہ سائے بان بندی، و بہ تاریخ بستم روز جمعہ نیاد کند، و بہ تاریخ بست و یکم روز شنبہ روانگی برات برخوردار سید محمد عظیم سلمہ اللہ تعالیٰ از موضع بخورہ سب ہاش بہ موضع سانڈے گشتہ تاریخ بست و دوم ماہ مذکور بہ مقام قصبہ پھلواری داخل شدہ، بعد نماز ظہر در خانقاہ حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی از صیغہ عقد نکاح فارغ شدہ۔ پس از رسیدن دانا پور بہ شب بست سوم تقریب محفل نشاط، و بہ شب بست چہارم روز دوشنبہ گشت برات مقرر یافتہ۔

ترصد بہ شرف قدوم میمنت لزوم محفل شادی را زینت دہند و ممنون و مشکور منت فرمایند۔ والسلام بہ خدمت شریف پرمک (؟) سنگھ صاحب و بہ خدمت شریف بالبشنیر صاحب

ان دونوں مجموعوں کے کچھ اور رقعات کی نقل میں نے لی ہے اور کچھ کے فوٹو لئے ہیں۔ رقعات ۲، ۳ کے عکس ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مانچسٹر، انگلستان

۱۲- اپریل ۱۹۵۵ء

گنے کے متعلق معلومات

ہندوستان میں تقریباً دو کروڑ کاشتکار گنّے اُگانے کے کام میں مشغول ہیں۔

ہندوستان میں گنّے کا زیر کاشت رقبہ تقریباً ۴۰ لاکھ ایکڑ ہے، جو دنیا میں گنّے کے کل زیر کاشت رقبے کا ۳۵ فی صدی ہے۔

ہندوستان میں گنّے کی فی ایکڑ پیداوار چودہ پندرہ ٹن ہے اور یہ پیداوار ہوائی کی ۶۲ ٹن اور انڈونیشیا کی ۵۶ ٹن فی ایکڑ پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

۱۹۵۴-۵۵ء کی فصل میں گنّے کی پیداوار ۵ کروڑ ۶۴ لاکھ ٹن رہی۔ جبکہ ۱۹۵۳-۵۴ء میں یہ پیداوار ۴ کروڑ ۸۳ لاکھ ٹن اور ۱۹۵۲-۵۳ء میں ۵ کروڑ ۲ لاکھ ٹن تھی۔

ہندوستان میں گنّے کی کل پیداوار کا تقریباً ۵۵ فی صدی حصہ گڑ اور کھنڈساری شکر تیار کرنے میں صرف ہوتا ہے اور صرف ۲۵ فی صدی حصہ چینی تیار کرنے کے لئے ملوں میں جاتا ہے۔

آج کل ہندوستان میں ۱۶۰ شوگر ملیں ہیں جن کی موجودہ صلاحیت تقریباً ۱۲۷۰۰۰ ٹن گنّا یومیہ ہے۔

۱۹۵۴-۵۵ء میں چینی کی کل ۱۵ لاکھ نوّے ہزار ٹن پیداوار کی بدولت چینی کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو گیا ہے۔ اس سال ۴۶ کروڑ روپے کی مالیت کا ایک کروڑ ۹۵ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن گنّا پیلا گیا تھا۔

عبداللطیف اعظمی

اقبال سہیل کی سیاسی شاعری

پچھلا سال سیاسی لحاظ سے جیسا بھی رہا ہو، مگر اردو کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اس نے اتنے عظیم المرتبت اور اتنی بڑی تعداد میں اہل قلم اور صاحب تصنیف ہم سے چھین لیے جن کی مثال کسی اور سال میں شاید ہی مل سکے گی۔ غور فرمایئے، خواجہ حسن نظامی۔ بے خود دہلوی۔ دتاتریہ کیفی، اقبال سہیل اور مولانا اسلم جیراج پوری جیسی شخصیتیں جو کسی ملک یا قوم میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں، ایک سال کے اندر ہم سے چھن گئیں۔ ان بزرگوں کی صف میں ایک نوجوان شاعر مجاز بھی شامل ہے جو ایک نئی آن بان کا مالک تھا۔

ان سب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اقبال سہیل کے بارے میں کم لکھا گیا ہے۔ اقبال سہیل اپنی زندگی میں بہت بے پروا تھے، ان کی اس عادت ہی کی وجہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ اگر وہ چاہتے تو بہت نام پیدا کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی پروا نہیں کی۔ بلکہ ان کے قدردان جب کبھی ان کے کلام کو جمع کرنا چاہتے تو اس کی اجازت نہ دیتے۔

اقبال سہیل اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی طرح بہت سی خصوصیات کے مالک تھے۔ مگر ان میں سب سے نمایاں اور ممتاز ان کی شاعری تھی اور اس میدان میں وہ اپنے دور کے منفرد شاعر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قصیدہ اور غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ پرانے شعرا میں قصیدہ گو اور غزل گو شعرا الگ الگ ہوتے تھے۔ قصیدہ گو غزل میں اور غزل گو قصیدے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ دونوں کی زبانیں الگ ہوتی ہیں۔ مگر مستثنیٰ اشخاص بھی ہیں، جو دونوں مملکتوں پر ایک ساتھ حکمراں ہیں۔ جیسے قدما میں سعدی متوسطین میں عرفی اور اخیر میں شبلی مرحوم سہیل صاحب بھی انھیں مستثنیٰ قابلیت کے لوگوں میں ہیں، جو قصیدہ اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔"

ویسے سہیل کی غزلوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جو اچھی غزل کی جان ہوتی ہیں۔ مگر ان کی وہ غزلیں مجھے زیادہ پسند ہیں، جن میں سیاسی خیالات و افکار کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ تغزل میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ بقول آل احمد سرورؔ یوں تو حالیؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، وحیدالدین سلیم سب نے غزلوں میں سیاسی حقائق کی ترجمانی کی ہے۔ مگر اقبال سہیل کے یہاں ایک بات سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے صرف غزل ہی سے کام لیا، اور اس طرح کام لیا کہ خلافت اور ترک موالات سے لے کر اس وقت تک کے سیاسی میلانات اپنے سارے پیچ و خم کے ساتھ آ گئے۔" مثلاً یہ بات کہ انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے وہ آہستہ آہستہ اس کے حکمران بن بیٹھے سہیل نے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کرم مہماں کا ہے یا حُسنِ خُلقِ ناتواں میرا — مرے گھر کو گھر اپنا جانتا ہے میہماں میرا
خیال ان کے سخن میرا، زباں اُن کی دہن میرا — بہار ان کی چمن میرا، گُل اُن کے گلستاں میرا
پُوچھتے کیا ہو دیارِ دل کی یہاں پڑی — جو بُلایا ہوے آئی وہ مقامی ہو گئی

یا یہ خیال کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو آپس میں لڑاتا ہے اور ہم لڑتے ہیں۔

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقیِ میخانہ برسوں سے — کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
خدا سمجھے بت سحر آفریں سے — گریباں کو لڑایا آستیں سے
نہیں اب کارگر کوئی فریبِ حسن کا افسوں — مدار اب وہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر

ایسے اوقات بھی آئے ہیں کہ ہم نے آپس کی لڑائی میں وطن اور اس کی آزادی کو پس پشت ڈال دیا۔ شاعر غزل کی زبان میں کہتا ہے۔

صیاد مژدہ باد عنادل میں چل گئی — اس کش مکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں کانگریس نے حکومت برطانیہ سے

مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرے تو اس نے محوری طاقتوں کے حملے کا بہانہ کیا۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفے سے قبل ۱۹۳۹ء میں یوپی اسمبلی میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ اقبال سہیل بھی اسمبلی کے ممبر تھے۔ انھوں نے ریزولیوشن کی تائید میں برجستہ شعر کہے۔ ملاحظہ ہوں۔

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے تو آ کے گلچیں بھی لوٹ جائے
ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے، کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے، یہ مہربانی کا جھوٹ جائے
بلا سے قزاق آ کے لوٹیں، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اُچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس کم بخت ٹوٹ جائے

غزل اگرچہ طویل ہے لیکن غزل کے انداز میں سہیل کی سیاسی شاعری کو سمجھنے کے لئے پوری غزل پیش کرتا ہوں۔ اس میں بڑی خوبی کے ساتھ آزادیٔ وطن کے جذبے کو ابھارا گیا ہے۔

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا — ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا
کئے ہیں چاک دل سے بڑھ کے گل نے بال و پر پیدا — ہوس ہو زندگانی کی تو ذوقِ مرگ کر پیدا
یہ مشتِ خاک اگر کر لے پر و بالِ نظر پیدا — تو اوجِ لامکاں تک کاں ہزاروں رہگذر پیدا
جمالِ دوست پنہاں پردۂ شمس و قمر پیدا — یہی پردے تو کرتے ہیں تقاضائے نظر پیدا
محبت تیرے صدقے تو نے کر دی وہ نظر پیدا — جدھر آنکھیں اٹھیں ہوتا ہے حسنِ جلوہ گر پیدا
شبِ غم ایسا سنائے خیالِ جیب و دامن کی — رہے دستِ جنوں باقی تو کر لیں گے سحر پیدا
مذاقِ سربلندی ہو تو بیعتِ دیر و حرم کیسے — جبیں سائی کی فطرت نے کئے ہیں سنگِ در پیدا
فقط اس لن ترانی کے یہ کیا کم ہو شرف اس کا — دلِ خود دار نے کر لی نگاہِ خود نگر پیدا
دلِ برباد محرومی چمن کی آج ہنستے ہو — یہی ویرانہ کرتا تھا کبھی لعل و گہر پیدا
جوانو یہ صدائیں آ رہی ہیں آبشاروں سے — چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا
وہ شبنم کا سکوں ہو یا کہ پروانہ کی بیتابی — اگر اڑنے کی دھن ہوگی تو ہوں گے بال و پر پیدا
دلِ آتش تو انجم کو قسم ہے ولولہ جاں کی — دیارِ حسن میں ہو جائے شور و الحذر پیدا

سہیل اب پوچھتا ہے انقلابِ آسمانی سے
ہماری شامِ غم کی بھی کبھی ہوگی سحر پیدا

وطن کی آزادی کے بعد جو قیامت ٹوٹی اور ہندو پاکستان میں جو انسانیت سوز حرکتیں ہوئیں، ان پہ کون ہے جو ملول نہ ہوا ہو۔ بہت سے شاعروں نے اس پر نظمیں کہی ہیں۔ خود اقبال سہیل نے بھی کہی ہیں۔ مگر ذرا یہ غزل ملاحظہ فرمایئے۔

مجھ سے پوچھو نہ مزاجِ دلِ ناشاد ابھی — میرے نغموں میں ہے کچھ تلخیٔ فریاد ابھی
ہے عنادل کو وہی دردِ کہن یاد ابھی — کہیں بیٹھا تو نہیں گھات میں صیاد ابھی
خود کہیں کی نہ رہی توڑ کے شیرازۂ گل — اور کیا چاہتی ہے نکہتِ برباد ابھی
فرشِ خاکی پہ گرا کنگرۂ عرش سے دل — اس کی قسمت میں ہے کچھ اور بھی افتاد ابھی
بجلیاں آئیں جو باہر وہ جو گھستا بھی تو — شعلہ افگن ہے مگر برقِ چمن زاد ابھی

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل
ہوش گم کردہ ہیں مرغانِ نو آزاد ابھی

ایک طویل جدوجہد کے بعد وطن آزاد ہوا تو ملک کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور بڑی شان کے ساتھ جشنِ آزادی منایا گیا —
اس موقع پر سبھی شاعروں نے نظمیں کہیں۔ ان کوتاہ بینوں کا ذکر نہیں جن کو آزادی نظر نہیں آئی۔ انھیں آتی بھی کیوں کر جبکہ یا تو انھوں نے اس کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی یا ان کی نظر کہیں اور تھی۔ ہندوستان سے دور کسی اور دنیا میں۔ جب ان کا خواب پورا نہ ہوا تو جھنجھلائے، خفا ہوئے اور آزادی کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا۔ جب ان کے نصیب میں مسرت آئی ہی نہیں تو یہ بھلا کہتے کیا۔ جذبہ کہاں سے لاتے اور خیالات کو پرواز کہاں نصیب ہوتی۔ البتہ جن شاعروں نے کروڑوں انسانوں کی اس خوشی کو اپنی خوشی سمجھا، انھوں نے اس موقع پر خوب کہا۔ ان خوب کہنے والوں میں ایک اقبال سہیل بھی تھے۔ ایک نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔ خیالات کی بلندی اور عظمت کے ساتھ زبان کا لطف بھی آئے گا۔

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج — سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج — ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج

صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

پھر موجوں نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا — بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا
کھوئی ہوئی عظمت وہ ملی ہم کو دوبارا — روشن ہے پھر آزادیٔ مشرق کا ستارا

یہ خوش خبری لائی ہے سورج کی کرن آج

رخصت ہے شبِ تارِ غلامی کا اندھیرا — وہ سامنے ہے صبحِ سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا — لہرائے نہ کیوں عظمتِ قومی کا پھریرا

آزاد ہوا قید غلامی سے وطن آج

ہندوستان کی تقسیم پر ہمارے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے غلط طور پر اپنے غصّے کا اظہار کیا ہے۔ گویا ملک کے رہنما جنھوں نے آزادی وطن کی راہ میں بڑے بڑے مصائب جھیلے تھے۔ ملک کے ساتھ غدّاری کے مرتکب ہو سکے ہیں۔ مگر بسمل کی بالغ نظروں سے سیاست کی اُلجھنیں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ اس لئے وہ انگریزوں کی اس چال بازی کی کامیابی کے باوجود بے حد خوش ہیں۔ کیوں کہ آزادی کی بے بہا دولت ملی ہے۔

ہر چند کتر بیونت سے چُوکا نہیں صیّاد   پھر بھی تو بہرحال وطن ہو گیا آزاد
قائم ہوئی جمہوریت ہند کی بنیاد   اب شوق سے پھُولے پھلے ہر نخل چمن زاد
پھر سبزۂ بیگانہ سے خالی ہے چمن آج

اس خوشی اور سرمستی میں شاعر بے حال نہیں ہوا ہے۔ ایسے موقع پر جبکہ آزادی کا جشن منایا جا رہا ہے، مجاہدین آزادی کا یاد آنا فطری تھا، چنانچہ وہ ایک ایک مجاہد کو یاد کرتا ہے۔ جو شہید وطن ہوئے اُن کو بھی، اور جو چمن کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں اُن کو بھی۔ کہتا ہے اور کس قدر پتے کی بات کہتا ہے۔

غالب ہوئی طاقت کے مقابل میں سچائی   صیّاد سے چھینی ہے اسیروں نے رہائی
جیتی ہے اہنسا نے اہنسا کی لڑائی   آزاد کو تبریک جواہر کو بدھائی
سچ ہو کے رہا دہر میں گاندھی کا بچن آج

وہ زندۂ جاوید وطن کے وہ فدائی   جاں اپنی جنھوں نے رہِ ملّت میں گنوائی
ہمّت نے انھیں کی ہمیں ساعت یہ دکھائی   انصاری و اجمل ہوں، تلک ہوں کہ ودیائی
یاد آتے ہیں ہم سب کو شہیدانِ وطن آج

دنیا سے اُٹھے وہ اس بھی بہر وہی نہیں ہیں   نیتا جی خدا جانے کہاں گوشہ نشیں ہیں
پھر بھی یہی کہتے ہیں جو ارباب یقیں ہیں   جسم اُن کے کہیں ہوں، مگر ارواح یہیں ہیں
اور وہ بھی ہیں اس جشنِ مسرت میں مگن آج

شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد قاسم، مولوی علی اور بھگت سنگھ وغیرہ کو یاد کرنے کے بعد شاعر آزادی کے اوّلین مجاہد سلطان ٹیپو، ظفر شاہ اور جھانسی کی رانی کو مژدۂ جاں فزا سناتا ہے۔

اے باد صبا خواب سے ٹیپو کو جگا دے   مرحوم ظفر شاہ کے شانے کو ہلا دے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے   پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنا دے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ہوں گی اُسی دنیا میں کہیں جھانسی کی رانی   وہ خالدۂ ہند وہ نوشابۂ ثانی
ہے فخرِ وطن جن کی شجاعت کی کہانی   اُن کو بھی سنا جا کے یہ پیغام زبانی
پوری ہوئی آزادیٔ قومی کی لگن آج

مولانا محمد علی برطانوی حکومت سے آزادیٔ وطن کی بات کرنے گئے تو اعلان کر دیا کہ یا تو وہ آزادی لے کر واپس جائیں گے یا وہ جان دے دیں گے۔ بالآخر دوسری بات پوری ہوئی۔ شاعر اُن کو پیغام بھیجتا ہے۔

ہے یاد ہمیں حضرت جوہر کا وہ ارشاد   آئیں گے نہ وہ ہند میں جب تک نہ ہو آزاد
کہہ دے کوئی اُن سے کہ ہوئی ختم وہ میعاد   اُجڑی ہوئی محفل ہے کریں اس کو پھر آباد
آجائیں کہ پورا ہوا وہ عہد کہن آج

یہ سب کہتے کہتے شاعر ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کچھ فکر کے آثار بھی چہرے پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُس کا ذہن حال سے ماضی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ آپس کے لڑائی جھگڑے سامنے آتے ہیں، سوچتا ہے مداری تو چلا گیا، مگر اس کی تخریبی کارروائیوں کے نشانات اور اُن کے اثرات لوگوں کے دلوں پر اب بھی باقی ہیں۔ فکرمند ہوتا ہے کہ کہیں ہم آپس میں پھر دست و گریباں نہ ہو جائیں اور ملک کی تعمیر جیسا جاں گُسل کام یونہی دھرا نہ رہ جائے۔ اس لئے پہلے وہ راہِ تعمیر کی مشکلات اور کٹھنائیوں کو یاد دلاتا ہے، پھر مذاہب اور زبانوں کے اختلاف کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ ہر مذہب محبت کا پیغام لے کر آیا ہے اور زبانوں کا فرق وطنی اتحاد کے منافی نہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اربابِ وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل   ہاں جشن منا لو کہ ہے موقع اسی قابل
ہونا نہ کہیں جوشِ طرب میں کہیں غافل   تخریب تو آسان تھی، تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یکساں   اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیاں ایک   ہم سب کا خدا ایک ہے، ہم سب کا نشاں ایک
پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج

وہ چشم فسوں گر ہے نہ وہ دورِ شبانہ   کل جو بھی ہوا آج بھلا دو وہ فسانا
ہر روز نیا رنگ بدلتا ہے زمانہ   اچھا نہیں سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا

لے پنڈت موتی لال نہرو مرحوم

جائز نہیں آپس میں جبینوں کی شکن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہبِ اسلام — جو دیں بھی ہو دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لئے مت کیجئے بدنام — گھل شیر و شکر ہوں، یوں ہی کُل ہند کی اقوام
سنگم پہ ہیں جس طرح ملی گنگ و جمن آج

آخری بند ہے۔

گوتم نے چراغاں کیا کل ملک میں یکسر — روشن کرو اُلفت کا دیا دل کے بھی اندر
کیوں حرف سہیلؔ آج نہ ہو پھول کے دفتر — اک شاعرۂ ہند ہے صوبے کی گورنر
اُٹھے دلِ شاعر سے نہ کیوں موجِ سخن آج

آزادی کے بعد جو طوفانِ بدتمیزی اُٹھا، اس سے ہر ہندوستانی کی گردن جھک گئی۔ مگر یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہا جائے۔ بلکہ ضرورت تھی کہ فرقہ پرستی کی ہر طرف جو آگ لگی ہوئی تھی اُس کو بجھانے میں سب ایک جان ہو کر لگ جائیں۔ ایسی باتیں کہنے کے بجائے کہ جس سے عوام کی ہمتیں کمزور ہوں، ایسے پیغام کی ضرورت تھی جس سے لوگوں میں بُرائی کا مقابلہ کرنے کا عزم راسخ پیدا ہو۔ بجائے اس کے کہ حکومت اور قومی رہنماؤں پر جا و بیجا تنقید کی جائے، ضرورت تھی کہ ان کا ہاتھ بٹایا جائے اور تعمیر کا جو بھی کام ہو رہا ہے، اس کو خوب سے خوب تر کیا جائے۔ آزادی کے بعد بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے بڑی بہکی بہکی باتیں کی ہیں اور حکومت کی کمزوریوں کی اس مبالغے اور اس زور شور کے ساتھ تشہیر کی ہے کہ اس کی مثال کسی اور ملک میں نہ مل سکے گی۔ مگر ہمارا شاعر ان باتوں کا ذکر ضرور کرتا ہے اور بڑی ناپسندیدگی کے ساتھ، مگر وہ ان سب کو آثارِ غلامی سے تعبیر کرتا ہے، اور اُمید ظاہر کرتا ہے کہ تاریکی کے یہ بادل چھٹیں گے اور سحرِ نو دار ہوگی۔ ملاحظہ ہو۔

یہ مانا آج بھی ہر چیز کی بیحد گرانی ہے! — وہی خود غرضیاں ہیں، ویسی ہی سیوا تپانی ہے
دلوں میں کھوٹ ہے لب پر صفائی کی کہانی ہے — سبق برطانیہ کا ہے، زباں ہندوستانی ہے
نظامِ کہنۂ سرمایہ داری اب بھی قائم ہے
غریبوں کا غمِ بے روزگاری اب بھی قائم ہے

بلند و پست میں اب تک بھی باہم سرگرانی ہے — زبانوں پر ابھی تک داستانِ پاسبانی ہے
ابھی تک مسلم و ہندو میں کچھ کچھ بدگمانی ہے — زباں کی کشمکش اب تک جنابِ درمیانی ہے

مگر آثار ہیں یہ سب اسی دَورِ غلامی کے
نتیجے ہیں یہ سودائے وطن خواہی کی خامی کے

دھوئیں سے جنگ کے مسموم ہے آب و ہوا اب تک — غبارِ مغربیت سے مکدر ہے فضا اب تک
دلوں میں زخمِ تقسیمِ وطن کا ہے ہرا اب تک — کئی صدیوں کا گھاٹا کچھ نہ کچھ ہے بچ رہا اب تک
مگر یہ سب اندھیرا جلد ہی اب مٹنے والا ہے
اور اس کے بعد صدیوں تک اُجالا ہی اجالا ہے

ذرا یہ بند ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے بارے میں شاعر کی یہ پیشین گوئی کہ "تو دنیا بھر میں آزادی کا میرِ کارواں ہوگا" کس قدر صحیح ثابت ہوئی۔

ہمارا دورِ آزادی ہے طفلِ شیرخوار اب تک — کہ دیکھی ہی جہاں میں ایک ہی فصلِ بہار اب تک
رہے حالات گرد و پیش گو ناسازگار اب تک — مگر پھر بھی ترقی ہی پہ ہے یہ ہونہار اب تک
خدا رکھے یہ بچہ کچھ دنوں میں جب جواں ہوگا
تو دنیا بھر میں آزادی کا میرِ کارواں ہوگا

اسی طرح تیسرے جشنِ آزادی کے موقع پہ کہتے ہیں۔

اور آزادی کو گذرے ہیں ابھی تک دو ہی سال
عہدِ ماضی سے کہیں بہتر ہے پھر بھی حالِ ہند
اب عزیزانِ وطن، کوشش یہ ہونی چاہیئے
حال سے بہتر ہی ہوتا جائے استقبالِ ہند
آئیے اب صدقِ دل سے سب کریں مل کر دعا
روز افزوں ہو الٰہی حشمت و اجلالِ ہند
بغض و نفرت سے وطن والوں کے سینے پاک ہوں
دم بدم شاداب تر ہو گلشنِ آمالِ ہند
ایشیا کو اس کے سائے میں حیاتِ نو ملے
ہو نشانِ امن و راحت پرچمِ اقبالِ ہند

آخری شعر میں شاعر نے جو دعا کی تھی، بالآخر قبول ہوئی۔ ہندوستان آج ایشیا کی عزت و آبرو ہے اور دنیا کے امن کے قیام میں اس نے جو کامیاب کوششیں کی ہیں اُن کا اعتراف دوست دشمن سبھی کو ہے۔

غرض سہیلؔ کی شاعری ایک جاندار اور حیات بخش پیغام کی حامل ہے۔ وہ خود عزم اور ولولے کی دولت سے مالا مال ہیں، اور ملک کے ہر نوجوان کو اس سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں۔ مایوسی ان پر بھی آتی ہے۔ تنگ نظری

ٖ مسز سروجنی نائیڈو

اور فرقہ پرستی سے وہ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ مگر فوراً بول اُٹھتے ہیں۔

سہیلؔ اس ملتی پھرتی چھاؤں سے دل گیر ہونا کیا
یہ دُنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

غرض پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں "اُردو شاعری میں عام طور پر جو ماتمی لے، جو شبنمی نظر، جو فریاد و فغاں، جو مایوسی اور ناکامی ہے، اس کے پیشِ نظر وہ شعراء یقیناً زیادہ احترام کے قابل ہیں جو عزم و ہمت، سرفروشی و جگرداری، اعتماد و یقین کی دولت رکھتے ہیں، جن کا کلام زندگی اور اس کی چمن بندی کا ایک رجز ہے، جو نہ خود مایوس ہوتے ہیں، نہ پڑھنے والے کو مایوس کرتے ہیں، جن کا لہجہ باوقار اور جن کی آواز پُرشکوہ ہے۔ اقبال اور جوش کے علاوہ اس لحاظ سے دو اور شاعر قابلِ ذکر ہیں —— ایک وحیدالدین سلیم دوسرے اقبال احمد سہیل"

رُوح افزا بیگم صدیقی

قصیدہ[1]

در تہنیتِ ورودِ مسعود جلالت الملک سُلطان سعود خلّد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

لِلّٰہ الحمد کہ آئی ہے وہ پُرکیف بہار
سبز و شاداب نظر آتے ہیں دشت و کہسار

قوتِ نامیہ کی باغ میں ہے افزائش
گُل و اثمار سے بھرپور ہیں نجم و اشجار

تختہ بندی و چمن کی ہے کہ سبحان اللہ
باغبانوں کی لیاقت پہ ہیں کلیاں بھی نثار

قمریاں ہیں کہیں شمشاد پہ کُوکُو میں مگن
ہے کہیں نغمہ سرا طوطیٔ شیریں منقار

کہیں گلبن پہ نواسنج عنادل کا ہجوم
شورِ طاؤس کہیں ہے کہیں پی پی کی پکار

کیا عجب گر ہے یہی مبداءِ فیاض کا فیض
ہوں جوانانِ چمن جوش میں گرمِ رفتار

ہاتفِ غیب سے آتی ہے یہ کانوں میں نوید
جہتِ قبلہ سے آتی ہے وہ پُرکیف بہار

جس کا نظارہ ہے ہر دیدۂ مومن کو بہشت
جس کے دیدار سے ہر قلبِ مسلماں سرشار

جس سے سیراب ہے یکسر چمنستانِ نبیؐ
جس سے ہے عالمِ اسلام سراپا انوار

اس شہنشاہ کے مسکن کا ولی آیا ہے
نافۂ نافِ زمیں جس سے ہے فردوس قرار

وہ سراپائے تقدس متشرع سلطان
وہ فقیہہِ متبحر وہ امامِ الابرار

پیکرِ زہد و ورع یعنی وہ سلطانِ سعودؔ
جس کے ہر پرتوِ جاں بخش سے ایماں بیدار

جس کی ہر شان سے شاداب شریعت کا چمن
جس کی ہر آن سے آئینہ محمدؐ کا شعار

میرے آقا کے وہ مامن کا مقدس والی
میرے مولا کے وہ مولد کا معظم سرکار

جس کی تقدیس پہ حاشا کہ میں دل قرباں
جس کی تعظیم کو باللہ میں سو جاں سے نثار

فرطِ بہجت سے وہ اب مطلع رقم کر تُو رُوحیؔ
جس پہ خاقانی بھی اَحْسَنْتَ کہے زیرِ مزار

میکدے کی کئے دیتی ہیں ہوائیں سرشار
بے پئے مست ہوئے جاتے ہیں سارے میخوار

ہند پی کر مئے وحدت ہوا ایسا سرشار
سر میں باقی نہ رہا نشۂ نخوت کا خمار

اللہ اللہ وہ سلطانِ حجازی کا وُرود
ہو گیا غنچۂ دل جس سے گلستاں بکنار

اللہ اللہ وہ ہر گام پہ فردوس نگاہ
سرو و شمشاد و گل و لالہ و صحنِ گلزار

اللہ اللہ وہ انوارِ تجلّی پیہم
اللہ اللہ وہ رحمت کی مسلسل بوچھار

اللہ اللہ وہ کعبے سے ملائک کا وُرود
اللہ اللہ وہ قبلہ سے نزولِ اخیار

اللہ اللہ وہ وہ گلریزیٔ مژانِ ولا
حیدرآباد نظر آتا ہے جس سے گلزار

اللہ اللہ وہ مہمانِ گرامی کا قدوم
میزبانوں کے لئے گلشن و گل باغ و بہار

عرب و ہند کی اللہ رے ہم آہنگی
اللہ اللہ وہ جذباتِ محبت کا اُبھار

چمنِ ہند کی بلبل کا ترانہ ہے آج!
فیضِ سُلطان سے دیں نخلِ تمنا اثمار

دوستی ایسی ہو ہند اور عرب کے مابین
جس میں اخلاص و عقیدت کی نہ حدّ ہو شمار

دونوں قوموں میں اِماحت ہو اب کے بجائے
دونوں ملکوں سے محبت کے ڈاں ہوں بجا

فرسِ خامہ کی اب موڑ عناں اے رُوحیؔ
ختم کر نظم کو اب لکھ کے دُعا کے اشعار

روشنی دن میں ہو، تاریکی ہو شب میں جب تک
صبح اور شام کے جب تک ہیں جہاں میں آثار

قاف تا قاف ہو سلطاں کے قدم سے مسعود
چشمِ بد کا نہ ہو تا حشر قریب اس کے گزار

---

[1] سلطان سعود کے ورودِ حیدرآباد کے موقعہ پر لکھا گیا۔

یحییٰ اعظمی

آہ اقبال سہیل

اے سہیل اے محفلِ شبلی کی شمعِ آخریں
اے چراغ افروزِ اسلاف و فروغِ باستاں

تابش آموزِ کمال و جلوہ اندوزِ ہنر
آئینہ دارِ سلف گنجینہ دارِ رفتگاں

فیضِ شبلی تھا کمالِ نغز گفتاری ترا
اے نقیبِ نعت اے روح القدس کے ہم زباں

تھا رہینِ خامۂ استاذ ہر نقشِ قلم
تھی وہی رنگیں طرازی تھا وہی حسنِ بیاں

تیرے دم سے زندہ تھے دانش کے اسرارِ کہن
تازہ تھی تجھ سے ہنر کی داستانِ باستاں

تیرے لب تھے اور جوشِ بادۂ شیراز تھا
گرچہ می بود آب و گِل از خطّۂ ہندوستاں

وہ دبستانِ ادب تھی بارگہ تیری جہاں
سعدی و سلماں نظر آتے تھے سر بر آستاں

تیرے نغموں پر فدا تھے نغمہ گویانِ عجم
اے گلستانِ وطن کے بلبلِ شیوا بیاں

خاکِ اعظم گڑھ تھی تیرے فیض سے شیرازِ ہند
ہم سخن حافظ کے عرفی کے حریف و ہم بیاں

نوکِ خامہ سے ترے جاری تھے چشمے شعر کے
صفحۂ قرطاس جس کے فیض سے تھا گل فشاں

اے ازل سے مست و سرشارِ رحیقِ منقبت
'موجِ کوثر' میں ہمیشہ تر رہی تیری زباں

مہرِ میرِ شینین کی سرکار میں یہ نذرِ مدح
سرورِ کونین کے دربار میں یہ ارمغاں

مغفرت کے واسطے تیری ہے کافی اے سہیل
کیا عجب بخشے تجھے پروردگارِ دو جہاں

ہے ادب کا نیرِ اعظم تہِ خاک آہ آج
حشر تک اس کی شعاعیں اب نہ ہوں گی ضو فشاں

فیضِ تابش سے ترے اب ہو گئے محروم ہم
آہ اے خورشیدِ دانش اے سہیلِ نکتہ داں

تھا حریمِ شعر تیرا مرجعِ اہلِ کمال
تشنگانِ فیض تیرے ہوں گے حاضر اب کہاں

یہ نہیں تنہا ترے فیضانِ تابش کا غروب
بلکہ ہے اک آفتابِ شعر و دانش کا غروب

اثر لکھنوی

"حرفِ تمنا" پر ایک سرسری نظر

"حرفِ تمنا" حضرت بیکش اکبرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے آخر میں چند رباعیاں بھی شامل ہیں۔ موصوف "نقد اقبال" کے مصنف ہیں جو ان کی وسعت مطالعہ و تبحر علمی کی آئینہ دار ہے۔ اقبال پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں مگر جس غائر اور بے لاگ نظر سے حضرت بیکش نے اقبال کے کلام و فلسفہ کا تجزیہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

حرفِ تمنا میں ان کے پہلے مجموعے "میکدہ" کا انتخاب بھی شامل ہے حرف اوّل یا پیش لفظ میں انھوں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔

"میرے سامنے ادب کے کئی رجحانات اُبھرے اور مٹے ہیں۔ سیاست اور تہذیب نے کئی پلٹے کھائے ہیں۔ میں نے ان سب کا مطالعہ کیا ہے ایک تماشائی کی طرح نہیں بلکہ ایک فریق کی طرح اور اس میں سے مجھے جو بھی بہتر معلوم ہوا اسے اپنے ذہن میں سمونے کی کوشش کی ہے ۔۔۔۔ مختلف زبانوں اور ان کے ادبیات مختلف مذاہب اور فلسفے اور ان کے نظریات کے مطالعے نے مجھے ایک ایسی نظر اور ایک ایسا دل عطا کیا ہے جو سب کے ساتھ ساز کر سکتا ہے اور سب سے ہمدردی رکھتا ہے۔

میرا نظریہ اور عقیدہ وحدت کائنات ہے ۔۔۔۔ جو تمام کائنات سے محبت سکھاتا ہے (اور) کائنات کو حسین تر بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر کا خلاصہ ان کے اس شعر میں ہے ؎

بزمِ جہاں میں کوئی تجلیٔ دلنواز
بچ کر کبھی گئی نہ ہماری نگاہ سے

مجھے اتنا اضافہ کرنے دیجئے۔ تاہم انھوں نے ماضی کی شاندار روایات کو حقارت سے ٹھکرایا نہیں بلکہ ان کا احترام کیا ہے اور فخریہ کہا ہے ؎

بیکش کے دم سے تازہ اگلی شرافتیں ہیں
اب آدمی کہاں ہیں اس دل کے اس نظر کے

اسی قدیم و جدید کے امتزاج نے ان کے کردار میں دلکشی اور ان کے کلام میں رعنائی بھری ہے۔ ایسا ہی صاحب نظر و عالی ظرف ہر بات میں افسانے کی وسعت دیکھ سکتا اور خاموشی کو سخن طراز پا سکتا ہے ؎

رات اس محفل کا عالم کیا کہوں
بات افسانہ تھی خاموشی فسوں

ایسا ہی شخص خونِ دل ہونے کے باوصف لالے کی طرح اپنی رعنائیاں نہیں کھوتا بلکہ دعوت نظر دیتا ہے کیونکہ اس کا دلِ داغ داغ دبُرخوں "نظرگاہ حیا" نہیں بلکہ شبستانِ محبت ہے ؎

ہم نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں

صفحہ ۴ پر جو غزل ہے اس میں خیال کا تسلسل اور ماضی و حال کا تقابل ہے مگر اس تضاد سے جو درس حاصل کیا گیا ہے اس ماضی کا ماتم نہیں بلکہ ؎

خود سے زیادہ اب مجھے اوروں کی فکر ہے
جب خود ہی گم تھا میں وہ زمانہ گزر گیا

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان عیش و عشرت میں پڑ کر بھول جاتا ہے کہ زمانہ کروٹ بدلے گا یا تن آسانی کے علاوہ سماج کے بھی کچھ حقوق اس کے ذمے ہیں۔

ایسا شخص زمانے کا شکوہ سنج نہیں ہوتا بلکہ اس طرح اپنے دل کو تسکین دیتا ہے ؎

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں
ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں

وہ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور کسی کو چشم حقارت سے نہ دیکھنے کی اس طرح تعلیم دیتا ہے ؎

غبار آلود چہروں پہ نہ جانا
انھیں میں کیقباد و جم بہت ہیں

ایسے شخص کا غیور ہونا لابد ہے ؎

مجھے کچھ ساز ہے نشتر سے ورنہ
مرے زخموں کے یاں مرہم بہت ہیں

وہ مخالف ماحول میں بھی ہمت نہیں ہارتا اور مایوس نہیں ہوتا کیونکہ اسے اعتماد ہے کہ ایک بہتر زمانہ آنے والا ہے جس کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ "افسوس

ہم نہ ہوں گے" بلکہ اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتا ہے ؎

خزاں میں آئے، بیٹھے خاک گل پر سوئے کانٹوں پہ
سلام اپنا بھی کہہ دینا جو گلشن میں بہار آئے

وہ خیالی انقلاب کا قائل نہیں جس کے بیشتر زعمائے عصر مرید ہیں۔ اور ہنکارتے یا بغلیں بجاتے ہیں بلکہ بیٹھے بولوں میں کہتا ہے ؎

یہ کہنہ جام و ساغر کیسے بدلیں۔ ہاں مگر ساقی
تری محفل میں آئے انقلاب اور بار بار آئے

یعنی یہ انقلاب کے خیر مقدم کو تیار ہے مگر حالات حاضرہ کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کرنا اور ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے دوسرے ملکوں کے خواب نہیں دیکھتا۔

ایسے شخص کی محبت میں (وہ کسی فرد کی ہو یا جماعت کی ہو) ذاتی غرض یا خواہشات کا لگاؤ نہیں ہوتا بلکہ شان سپردگی و ایثار پائی جاتی ہے ؎

یہ جبر و اختیار عشق ہے تم اس کو کیا سمجھو | رہے گا دل پہ کب قابو جو تم پر اختیار آئے

ایسی پر مغز اور اشاراتی شاعری میں تراشے ہوئے ہیرے کی طرح کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ غالباً اس شعر سے اندازہ ہوگا جو ہر لحاظ سے ایک شاہکار ہے ؎

ہزار صبحیں شب انتظار میں دیکھیں | کہ جو چراغ جلایا وہی بجھا ڈالا

یہ اردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اس کی لطافتیں بیان کرنے کو دفتر درکار ہے۔ چراغ کا گل ہونا سحر کی علامت ہے۔ جب چراغ بار بار جلایا اور بجھایا تو ہر دفعہ ایک نئی صبح طالع ہوئی مگر شب انتظار بدستور قائم رہی۔ اگر چراغ جلانے اور بجھانے سے سعی و تدبیر کے پہلو بدلنا مراد لیجئے اور شب انتظار کو مصیبت اور محرومی کی رات سمجھئے تو اور ہی سماں پیش نظر ہوتا ہے۔

ایسا ہی نغز و نازک یہ شعر ہے ؎

ایسا بھی انقلاب جہاں میں ہوا نہیں | دن ہو گیا ہے اور اندھیرا گیا نہیں

یا یہ شعر لیجئے ؎

آہ اپنے آشیانے میں بلبل ہے بے وطن | صیاد کے بھی عہد میں ایسا ہوا نہیں

یہ اشعار آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ؎

بغیر گریۂ بلبل ہنسا نہ گل کوئی | بغیر جہد کے بدلا گیا نہ کوئی نظام
کوئی یقین کبھی محکم نہ بنے عمل کے ہوا | کہ بے عمل کے یہ سارے یقین ہیں اوہام

زبان شعر و نغمہ میں کیسے کیسے رموز و نکات بیان ہوئے ہیں اور کیسی پتے کی باتیں کہی گئی ہیں۔ پھر جو کچھ ہو بر بنائے محبت و آشتی ہو۔ اس کے بغیر محض نمائش و ریاکاری رہ جاتی ہے ؎

اگر جنون محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں | یہ ذکر و فکر یہ صوم و صلوٰۃ یہ احرام

زمانے پر ہمیشہ نظر رکھنے اور لکیر کا فقیر نہ ہونے کی تعلیم ؎

کوئی اور ترانہ لے مطرب اب ان گیتوں کو کیا گانا
وہ دھن بھولی وہ سُر بدلے وہ ساز ہٹے وہ گیت گئے

وحدت کائنات کی مثال دیکھئے جس کی طرف حضرت میکش نے حرف اوّل میں اشارہ کیا ہے ؎

اتنے فاصلے سے تو موج بھی ہے دریا بھی | ڈوب کر کوئی دیکھے موج ہے نہ دریا ہے

اس میں "ڈوب کر" کی بلاغت قابل داد ہے۔

ابھی "حرف تمنا" کے گیارہ صفحے بھی تمام نہیں ہوئے۔ بقول غالب سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے۔

اب مختلف موضوعات پر چند شعر سن لیجئے۔

تم مضطرب نہیں مرے حال تباہ سے | دیکھو ذرا نگاہ ملا کر نگاہ سے
وہی ناقدری ارباب صفا آج بھی ہے | دار و زنجیر صداقت کا صلہ آج بھی ہے
اٹھ گئے غیر کبھی کے تری محفل سے مگر | رنگ محفل کا ہمیشہ سے جو تھا آج بھی ہے
میں نے گلشن کے لئے آپ کو بدلا لیکن | مجھ سے بدلی ہوئی گلشن کی فضا آج بھی ہے

جو کسی پہ آپ نہ کر سکے مجھے اس جفا کی تلاش ہے
رہے جس سے آپ بھی بے خبر مجھے اس ادا کی تلاش ہے

جس نامے کو لکھا تھا تمنا نے عمر بھر | خود تھا ہی کیا وہ حسرت پیغام کے سوا
چمن میں سب سے ملی اور گزر گئی سب سے | لٹے ہوئے تھی مری خو نسیم مست خرام
فقیہہ! ہیچ ہے میکش سے تیری ہر حجت | وہ آپ اپنا مقلد ہے آپ اپنا امام
نہیں وقت کے مطابق یہ مزاج منعمانہ | تو بدل دے اپنی خو بھی کہ بدل گیا زمانہ
نہیں تیرا زعم رندی ابھی معتبر کہ تیری | نہ نگاہ عارفانہ نہ مزاج باغیانہ
حسن ہو گیا آخر عشق رائگاں اپنا | بن گیا نشان ان کا مٹ کے ہر نشاں اپنا
تلخی جو مرے دل میں غم عشق نے گھولی | وہ میں نے تمنا کی حلاوت میں سمو لی
تیری خاموشی نے خودداری سکھائی ہے مجھے | ورنہ در عشق سر سے پاؤں تک پیغام تھا
افتاد طبع اہل محبت نہ پوچھئے | وہ مسکرائے بھی تو یہاں جی دہل گئے
عجیب طرح محبت میں انقلاب ہوا | نگاہ شوق ہوئی شوق اضطراب ہوا

ترے تبسم نے یوں دی مری نگاہ کی داد — ستارہ چاند ہوا، چاند آفتاب ہوا
رنگِ شفق میں جیسے ڈبو دیا ہوا ہو دیا — وہ ان پہ سر سے پا تک چھایا ہوا تبسم
کیوں نگاہِ مہر کی تو نے دلِ ناکام پہ — ایک منظر یاس کا تھا وہ بھی ویراں ہو گیا
جس طرح ترے لب پر عنوانِ بہار آیا — اس شان سے گلشن میں کس روز بہار آئی
(عنوان بہار تبسم کی تاویل ہے)

ہیں ہوں یوں زیب خانہ ویرانی — ہو شفق جس طرح پہاڑوں میں

چند ابتدائی مشق کے نمونے

اب نہ بولوں گا جو مرضی نہیں تیری لیکن — بات کرنی مری تمہید شکایات نہ تھی
لحد میں ساتھ لئے جا رہا ہوں اے میکش — گلے لگانے کی حسرت گلے لگائے ہوئے
پھر رہی ہے وہ بزم آنکھوں میں — یاد صحبت بھی خوب صحبت ہے
غایت قرب ہوا وجہ حجاب — کاش کچھ دور وہ ہم سے ہوتا
تیور چڑھے ہوئے ہیں نظر جھکی ہوتی ہے — زلفیں کھلی ہوئی ہیں آنچل ڈھلا ہوا ہے
سب کی نظر بچا کر میں اس کو دیکھتا ہوں — میری نظر بچا کر وہ مجھ کو دیکھتا ہے
دل میں پہلے تمنا کی خلش کچھ کم نہ تھی — اور آفت ہو گئے تم مہرباں ہونے کے بعد

یہ محض سرسری انتخاب ہے۔ ایسے ایسے نہ معلوم کتنے جواہر پارے اس مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں مگر بقول عشرتی ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار — گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ جن بحروں میں آج کل کے بعض نامور شعرا موزوں شعر نہیں کہہ سکتے میکش صاحب نے عروض سے کامل واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک غزل صفحہ ۷۶ پر ہے جس کا مطلع ہے ؎

میں ہوں لازمِ اُلفت کو مجھ کو لازم اُلفت ہے
میں ہوں اپنی ضرورت سے مجھ سے میری ضرورت ہے

اس بحر کے مقررہ اوزان ہیں۔ فاع فعولن فاع فعولن فاع فعولن فعلن فع (فاع فعولن کی جگہ فعلن فعلن بسکون عین بھی آتا ہے۔ اور کتنے ہی زحافات ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ آٹھ شعر کی غزل ہے۔ میکش صاحب نے قریب قریب سبھی زحاف صرف کئے ہیں) اُنھوں نے بحر کی تقسیم اس طرح کر دی ہے۔ فاع فعولن فعلن فع فاع فعولن فعلن فع اور یہ قواعد عروض کی رو سے بالکل درست ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ فانی مرحوم کے سوا اس بحر میں کسی نے طبع آزمائی نہیں کی۔ اُن کی غزل جس کا یہ مصرع ہے اسی بحر میں ہے "دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے"۔

مجھے حرف تمنا میں جستہ جستہ زبان کے مسلمہ اصول سے انحراف بھی ملا۔ مثلاً "تمنی بے التجا" بجائے تمنائے بے التجا "علحدہ" (بلا الف) بجائے علیحدہ۔ اس حصے سے بحث بے کار ہے کیونکہ حرف اول میں میکش صاحب کا اعلان ہے کہ وہ الفاظ کے ترک و اختیار میں کسی کے مقلد نہیں۔ ان کی زبان ان کی اور ان کے شہر کی زبان ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایسی ایک عام ہوئی تو زبان بھانت بھانت کی بولیوں کا مجموعہ بن کر اپنی لطافت کھو بیٹھے گی۔

اگر زندگی نے مساعدت کی اور صحت نے اجازت دی تو نظموں کے متعلق علحدہ مضمون لکھوں گا۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱۔ فصل رواں میں ۱۵ لاکھ ۸۶ ہزار ٹن چینی کی پیداوار کی بدولت ملک میں چینی کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو گیا ہے۔ اس سال کی پیداوار ۵۲-۱۹۵۱ء کی ریکارڈ پیداوار سے بھی ۸۷ ہزار ٹن زیادہ رہی۔

۲۔ کنٹرول کی تنسیخ کے بعد ملک میں صرف کے لئے سفید چینی کی مانگ ۵۲-۱۹۵۱ء کے اخیر میں دس لاکھ ٹن تھی۔ جو ۵۴-۱۹۵۳ء میں ۱۸ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن تک بڑھ گئی ہے۔

۳۔ گزشتہ سات سال کے دوران میں بحالیات کی مالی تنظیم نے مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے رفیوجیوں کو ۲ کروڑ ۵۷ لاکھ ۸۷ ہزار روپے کے قرضے دئے۔ مغربی پاکستان سے آنے بے گھر لوگوں کو ۶ کروڑ ۹۲ لاکھ ۵۷ ہزار روپے کے قرضہ جات دئے گئے۔

تنویر احمد علوی

کرۂ ارض

یہ فضاؤں میں مچلتا ہوا خاکی ذرّہ
ماہ و انجم کی طرح جس میں درخشانی ہے
اور یہ قوس و قزح کا متلوّن نقطہ
جس میں خود قوس و قزح کی سی گل افشانی ہے

مادّہ کا یہ فسوں جوہرِ ہستی کا طلسم
جس میں بے جان عناصر نے نمو پایا ہے
خام تھی خوشۂ انجم میں جو صہبائے حیات
پختہ ہونے کو جہاں اس نے سبو پایا ہے

صدفِ کون و مکاں کا یہ شہابی قطرہ
جس کی تقدیر میں تھا گوہرِ غلطاں ہونا
کشتِ آفات میں سویا ہوا یہ تخمِ حیات
جس کی طینت تھی سمن زار و گلستاں ہونا

یہ جمادات و نباتات کی کثرت یہ ہجوم
اور یہ انسان یہ حیوان یہ طائر یہ وحوش
ارتقاء کا یہ تسلسل یہ تغیّر کا عمل
زیست کے سلسلۂ لامتناہی کے نقوش

جس میں صحراؤں کی وسعت تھی وہی ذرۂ خاک
جس میں کہساروں کی عظمت تھی وہی نقطۂ نور
جس کے سینہ میں سمندر تھے وہی قطرۂ آب
ہاں وہی تخم کہ خود جس میں تھے خرمن مستور

اس کی یہ فطرتِ آزاد یہ روحِ معصوم
ذہن کو جس نے فرشتوں کا تصوّر بخشا
اس کے سینے میں مچلتے ہوئے شیریں چشمے
جس نے انساں کو بہشتوں کا تصوّر بخشا

یہ حسیں چاک کرے خانۂ ہستی کے لئے
جس پہ صورت گر صانع نے تراشے ہیں ایاغ
اور یہ رقص یہ گردش یہ سفر یہ رفتار
جس میں ہر گام پہ جلتے ہیں ستاروں کے چراغ

ہاں یہ سیّارۂ سیمینِ نظامِ شمسی
جس کی قسمت پہ ستاروں کو بھی رشک آتا ہے
دامنِ موجِ ہوا میں یہ مہکتا ہوا پھول
جس پہ جنّت کی بہاروں کو بھی رشک آتا ہے

کہیں ایسا نہ ہو یہ جنّتِ ارضی اے دوست
ایٹمی عہد کے شعلوں سے جہنم بن جائے
امن کی گود میں تہذیب کے گہوارے میں
زندگی سر بسر اک سلسلۂ غم بن جائے

حبیب الرحمٰن غزنوی

گجراتی زبان و ادب

پر

عربی فارسی اور اردو کے اثرات

(۱)

گجراتی زبان و ادب پر اردو، فارسی کے اثرات کا ذکر ہم اُس مسافر کی طرح کر رہے ہیں جو زبان و ادب کی شاہ راہ کے اُس سنگِ میل پر کھڑا ہو جہاں سے گذری ہوئی منزلوں کے نشان بھی نظر آتے ہوں اور آنے والی منزلیں اُسے اپنی طرف کھینچتی بھی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نئی چیز میٹھی ہوتی ہے۔ لیکن پکا آم اور پرانا چاول بھی ذائقہ میں کچھ کم نہیں ہوتا۔ جدت، تنوع اور ترقی کے اس دور میں گڑے مُردے اُکھاڑ کر اُن کا معائنہ اور مشاہدہ کرنا بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ صرف حال کے آئینے میں مستقبل کی پیش پا اُفتادہ خیالی صورت دیکھ کر ہی مگن ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخ کے اُن کرم خوردہ اوراق کا مطالعہ نہیں کرتے جس میں تمدن، زبان اور ادب کی وہ قدریں محفوظ ہیں جو ہماری موجودہ معاشرت اور مدنیت کی سربفلک عمارتوں میں بنیادی اینٹوں کی طرح جمی ہوئی ہیں۔

دراصل دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو زندگی کے آخری مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں، یہ سمجھے بغیر کہ انھوں نے صحیح معنوں میں ابھی تک جینا بھی شروع نہیں کیا ہے! ان سے اگر پوچھا جائے کہ "ہمارے آنے سے پہلے دنیا کیسی تھی؟" تو وہ یہی جواب دیں گے کہ "جیسی وہ ہمارے چلے جانے کے بعد ہوگی" — ان کے نزدیک جینے کے معنی ہیں — "یہ بھول جانا کہ کبھی ہمیں مرنا ہے —" اور مرنے کے معنی ہیں — "یہ بھول جانا کہ کبھی ہم جیتے تھے!" — ہو سکتا ہے کہ زندگی کا یہ سطحی نظریہ بادی النظر میں دلچسپ اور خوش گوار نظر آئے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل زندگی کی سچی خوشی کا سرمایہ اُس کی پرانی یادوں میں پنہاں ہوتا ہے۔ زندگی کی گذرنے والی گھڑی سے ہم کماحقہٗ لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ البتہ خوشی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ گھڑی گذر جاتی ہے، اور اس کی دیرپا یاد باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں مستقبل عدمِ محض ہے، اور ماضی ایک زندہ حقیقت! چنانچہ جو زندہ ہے وہ ہمیشہ سے زندہ تھا، اس کی زندگی لامتناہی ہے کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ البتہ زندگی کا مستقبل کسی نہج پر منتج ہوگا، اس کا دارومدار حالات و حوادث کی اُن کروٹوں پر منحصر ہے جو بطنِ مستقبل میں پوشیدہ ہیں، جن کے متعلق ہم کوئی صریح حکم اُس وقت نہیں لگا سکتے۔

دو ہزار سال قبل

گجراتی زبان و ادب کی تعمیر و ارتقاء میں جن حالات و حوادث نے اہم رول ادا کیا ہے ان کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں دو ہزار سال پیچھے جا کر کچھ گڑے مُردے اُکھاڑنے ہوں گے۔ کیونکہ ہم خود جو عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس کا کوئی واضح اور مکمل نقشہ جب تک ہمارے سامنے نہ ہو، اُس وقت تک تعمیر و تخلیق کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے قبل گجراتی زبان کا تجزیہ کیا جائے، اور اس کے ارتقائی مدارج کو سامنے لایا جائے۔ ایک عربی مقولہ ہے "کُلُّ شَیْءٍ یُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا" یعنی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اور جہاں تک ہمارا خیال ہے ہر شے کا پس منظر ہی اس کے حق میں ضد اور عکس کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس مسئلے کی ابتدا گجراتی زبان کے اُس پس منظر سے کر رہے ہیں جس میں اس کے صحیح خد و خال نظر آ سکیں۔

قوم خزر

قرآن کریم کے پندرھویں پارے میں یاجوج و ماجوج کا ایک قصہ بیان ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندر (متوفی ۳۲۳ ق م) جب بحر خزر کے قریب پہنچا تو وہاں کی ایک قوم نے اس کے دربار میں آکر فریاد کی کہ یاجوج و ماجوج ہر سال ٹڈی دل کی طرح ہمارے علاقے پر یلغار بول دیتے ہیں اور ہمارے کھیت اور بستیاں پامال کرکے ہمیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سکندر نے یاجوج و ماجوج کی گذرگاہ کے درمیان ایک آہنی دیوار بنوا دی تاکہ وہ وحشی اور خونخوار لوگ اس طرف نہ آسکیں۔ یہی دیوار تاریخ اور افسانوی ادب میں سدِّ سکندری کے نام سے موسوم ہے۔ اکثر مفسّرین کا قول ہے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ سکندر ذوالقرنین تھا۔ فیلقوس یونانی کا بیٹا سکندر نہ تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو! تاہم کردار کے ناموں کی تبدیلی سے نفسِ واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سکندر ذوالقرنین ہو یا فیلقوس یونانی کا بیٹا سکندر ہو، بہرحال جس واقعہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ اپنے اندر صحت ضرور رکھتا ہے۔

نظامی گنجوی نے بھی اس واقعہ کو سکندر نامہ میں اس طرح نظم کیا ہے۔

دریں پاسگہ رخنہائے کہ ہست	عمارت کنند تا شود سنگ بست
مگر ز آفت آں بیابانیاں	بہ راحت رسد کار خزرانیاں
بہ فرمود شہ تا گذرہائے کوہ	بہ بندند خزرانیاں ہم گروہ[1]

ان اشعار میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ نیز ان اشعار میں جو لفظ "خزرانیاں" آیا ہے، اس سے وہی قوم مراد ہے جو بحرِ خزر کے قرب و جوار میں آباد تھی، اور ممکن ہے اسی بحرِ خزر کی مناسبت سے یہ قوم خزرانی کے نام سے موسوم ہوگئی ہو — بحرِ خزر دراصل وہی سمندر ہے جسے ہم آج کاسپین کے نام سے جانتے ہیں — اس کا محل وقوع ترکستان کا وہ شمالی علاقہ ہے جو ایران کی حدود میں واقع تھا اور اس وقت روس کے ماتحت ہے۔

خزر سے گوجر

خزر قدیم فارسی (سکزی) زبان کا لفظ ہے۔ یہی لفظ عربی کا جامہ پہن کر جزر بنا۔ اور پھر عربی سے فارسی میں منتقل ہوتے وقت "ج" نے "گ" سے بدل کر گزر بن گیا۔ آج بھی بحیرۂ کاسپین کی مغربی سمت کوہ قاف کے دامن میں جارجیا نامی جو علاقہ آباد ہے اُسے گرجستان بھی کہتے ہیں۔ اس علاقے کا یہ نام اُسی قوم خزر یا گزر کی مناسبت سے مشہور ہوا جو یہاں آباد تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہی نام گزر سے گوجر بن گیا۔

گجراتی زبان کی بنیاد فی الحقیقت یہیں سے دستیاب ہوتی ہے کیونکہ گجراتی آج سے کچھ عرصہ قبل گوجری کہی جاتی تھی۔ اب سوال رہ جاتا ہے گوجروں اور گجرات کے باہمی تعلق کا؛ تو اس کا جواب تاریخ کے اُن ابواب سے مل جاتا ہے جن کا لب لباب ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اسی جواب میں گجراتی زبان کے ارتقائی مدارج کا حال بھی ضمناً شامل ہے۔

آریوں کی ابتدائی ہجرت

نسلی اعتبار سے گوجروں کا تعلق اُن آریہ اقوام سے پایا جاتا ہے جو تین ہزار سال قبل مسیح دریائے جیحون و سیحون کے اُس پار آباد تھیں۔ ان علاقوں میں آریوں کا وجود زمانۂ قبل از تاریخ میں بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن تین ہزار سال ق م میں یہ قومیں انتقالِ سکونت کرکے جیحون و سیحون کے وسطی علاقہ میں بس گئیں، اور پھر ان کے بعض قبیلے افغانستان اور ایران کی طرف بڑھے، اور رفتہ رفتہ خیبر اور قندھار اور بلوچستان کی راہ سے سرزمین ہند پر آپہنچے۔ مؤلف تاریخ افغانستان اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> "در ازمنۂ قبل التاریخ نژاد سفید (آرین) در آسیائے وسطی زندگی میکرد۔ و در ۳۰۰۰ ق م اراضی واقعہ مابین جیحون و سیحون را مسکن قرار دادند۔ و بعدہا رخت سفر بافغانستان کشیدہ، نخست در ولایت باختر (بلخ) اقامت اختیار کردند۔ و متعاقباً از جہت کثرت نفوس و قلت جائے از راہ ہائے شمال و مشرق، و شمال و مغرب بہ سائر ولایت ہائے افغانستان از قبیل آریانہ (ہرات) اپارتیا (خراسان و طور) اور یشیا (بلوچستان) اراکوسیا (قندھار) تخارستان (بدخشان و قطغن) بولوستان (چترال) گندھارا (پشاور و کابل) پاکتیا (ولایات جنوب و مشرق) اندس (سندھ) ست گوش (پنجاب) کشمیر پراگندہ و منقسم گردیدند"
> (تاریخ افغانستان [illegible])

[1] سعدی نے بھی لکھا ہے ؎ سکندر بدیوار روئین و سنگ — بکرد از جہاں راہ یاجوج تنگ (ادارہ)

ایریوں کی اس ابتدائی ہجرت اور انتقالِ سکونت میں گوجر شامل نہیں تھے بلکہ وہ تو بدستور اپنے علاقے میں آباد تھے۔ البتہ جب آرین قبائل ایران، افغانستان اور ہندوستان میں آکر بس گئے اور یہاں انھوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ اس سے کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال بعد گرجروں نے اپنے وطن سے انتقالِ سکونت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جب یہ لوگ آگے بڑھے تو جو لوگ ان سے صدیوں قبل آکر ایران، افغانستان اور ہند میں آباد ہوگئے تھے وہ نسلی اعتبار سے آرین ہونے کے باوجود گرجروں کے لئے غیر اور اجنبی تھے۔ ہر جگہ انھوں نے ان گرجروں کا مقابلہ کیا بعض اوقات انھیں پسپا بھی کیا اور بعض اوقات ان سے مغلوب بھی ہوئے۔ یہ لوگ گرجستان سے اپنی قدیم زبان کو ساتھ لے کر چلے تھے۔ مگر جن جن ممالک میں پہنچے وہاں کی زبانوں سے ان کی زبان متاثر ہوتی گئی۔

گرجستان سے گجرات تک

ایران کی سرزمین پر یہ قوم سب سے قبل ساسانی نسل کے بادشاہ قباد (۴۸۸ء تا ۵۳۱ء) کے عہد میں نمودار ہوئی۔ مگر ایرانیوں نے ان کا یہ حملہ پسپا کر دیا۔ البتہ جب نوشیرواں نے ترکوں کی مدد سے ۵۶۵ء میں ہنوں کی قدیمی سلطنت کا خاتمہ کردیا تو ہن اور ان کے حلیف گرجروں کے لئے دوسرے راستے کھل گئے۔ ایران کے مختصر دورانِ قیام میں گرجروں کی زبان پر کئی ایک قدیم فارسی زبانوں کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ ایران سے گرجروں اور ہنوں نے ہندوستان کا رُخ کیا اور یہاں کے سرسبز و شاداب میدانوں میں ڈیرے ڈالنے شروع کردئے تھے۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ گرجر قوم ہنوں کی معیت میں پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے درمیان ہندوستان پہنچی تھی۔ یہ لوگ ابتداءً شمال مغربی سرحد اور پنجاب ہی میں مقیم ہوئے۔ یہاں ان کی بود و باش اگرچہ زیادہ عرصے نہیں رہی۔ تاہم تاثرات کے لحاظ سے پنجاب اور سرحد میں ان کا قیام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ پنجاب کے گوجرانوالہ اور گجرات نامی شہر انہیں کی یادگار ہیں۔

سرحد و پنجاب میں قیام کے بعد یہ لوگ آگے بڑھے اور چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں مشرقی راجپوتانہ، مالوہ اور آبو کے اطراف میں پھیل گئے۔ یہاں انھوں نے اپنی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا اور پھر رفتہ رفتہ دریائے نربدا اور سوراشٹر تک کا تمام درمیانی علاقہ انھوں نے فتح کرلیا۔ ساتویں سے نویں صدی عیسوی تک بھن مال (آبو کا شمال مغربی علاقہ) گرجر علاقے کے نام سے موسوم تھا۔ مشہور چینی سیاح ہیوآن سانگ نے ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں اس علاقے کی سیاحت کی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی اس علاقے کو گرجر علاقے کے نام سے یاد کیا ہے۔

نویں اور دسویں صدی کے عرب مسلمان سیاحوں کے سفرناموں میں بھی "جزر" لفظ ملتا ہے۔ دراصل یہ اسی لفظ گرجر کا معرب ہے۔ اس زمانے میں مارواڑ کی شمالی سرحد سے لاٹ کی شمالی سرحد تک کا علاقہ "گرجر پردیش" کے نام سے مشہور تھا۔ رفتہ رفتہ یہی گرجر دیس آگے چل کر "گجرات" کے قالب میں ڈھل گیا۔

گرجروں کی زبان

گرجر اپنے ساتھ سکزی اور ہردی زبان بھی لائے تھے۔ جو اُن دنوں عام طور پر سیستان، ہرات اور ترکستان کے بعض علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ گجرات پہنچتے پہنچتے اس زبان پر کئی ایک غلاف چڑھ چکے تھے۔ گرجروں نے اس طویل سفر میں جہاں جہاں قیام کیا اُن علاقوں کی مروجہ زبانوں سے ان کی زبان متاثر ہوتی گئی، اور اسی طرح ان کی زبان نے وہاں کی زبانوں کو بھی کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ گجرات میں ان کی آمد کے بعد ان کی زبان گرجری کے نام سے مشہور ہوئی۔ گجرات کی یہ گرجری کوئی خالص زبان نہ تھی، بلکہ اردو کی طرح متعدد زبانوں کا ایک مرکب بن گئی تھی، اور پھر گجرات کے مقامی باشندوں کے ساتھ ساتھ اختلاط اور روزمرہ کی ضرورتوں نے گرجروں کی زبان کو ایک مرتبہ پھر اپنی وضع قطع اور تلفظ میں متعدد تبدیلیوں پر مجبور کیا۔ حتیٰ کہ یہ زبان کافی حد تک بدل کر ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوئی جسے آج ہم گجراتی زبان کہتے ہیں۔ پنجاب کے دورانِ قیام میں وہاں کی مقامی بولی سے مخلوط ہو کر گرجری نے ایک نئی شکل اختیار کی تھی جو آج بھی پنجاب کے بعض مقامات اور کشمیر کے بعض کوہستانی علاقوں میں رائج ہے۔ اسی طرح راجستھان میں بھی یہ زبان وہاں کی مقامی زبان سے گھل مل کر نیا قالب اختیار کرچکی تھی۔ چنانچہ آج بھی راجستھان اور مارواڑ کے بیشتر علاقہ جات کی زبان گجراتی سے ملتی جلتی نظر آتی ہے۔

گجراتی میں ایسے فارسی الفاظ ملتے ہیں جن کی صورتیں مسخ ہوجانے کے باعث پہچانے نہیں جاتے کہ یہ الفاظ کس زبان سے منتقل ہو کر یہاں آئے ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے الفاظ سنسکرت اور ہندوی زبان ہی کے ہیں، جو امتداد زمانہ اور مقامی زبانوں اور لوگوں سے اختلاط اور تلفظ کے تنوع کے باعث اپنے اصلی خد و خال بدل چکے ہیں۔ گجرات کے مشہور ریسرچ اسکالر پروفیسر چھوٹو بھائی نائک نے ان امور پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ گجراتی داں اہل علم حضرات کو آپ کی تصانیف کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔

عربوں کی گجرات میں آمد

گجراتی قوم اور زبان کی مندرجہ بالا مختصر تاریخ و تمہید سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ گجراتی زبان کی بنیادیں اور جڑیں وسطی ایشیا کی ان زبانوں سے جا کر مل جاتی ہیں جو ڈھائی تین ہزار سال قبل مسیح میں دریائے جیحون و سیحون کے اس پار اپنی ابتدائی شکل میں رائج تھیں جنھیں ماہرین لسانیات آرین زبانوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زبان کے اس سلسلے کی دوسری کڑیاں ملانے سے قبل اگر ہم عربوں کی گجرات میں آمد کا ذکر نظر انداز کر دیں تو عہد حاضر کی گجراتی زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ چنانچہ نہایت اختصار کے ساتھ تاریخ کے اُن اوراقِ پارینہ کو یہاں پیش کیا جاتا ہے جو اس مسئلے کے سمجھنے میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔

گرجر قوم اس علاقے میں آکر ہنوز متمکن ہوئی ہی تھی کہ عربوں کی آمد کا سلسلہ یہاں شروع ہوا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ آغازِ اسلام سے تقریباً چھ سو سال قبل عربوں کا وجود گجرات کی سرزمین پر پایا گیا ہے۔ عرب تاجروں نے سنہ عیسوی کے ابتدائی دور میں ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر آمد و رفت شروع کر دی تھی۔ اسطخری کی کتاب الاقالیم اور دیگر مستند تاریخیں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ سنہ عیسوی کے اوائل میں چیمور، کلیان اور سوپارہ کے ساحلی علاقوں اور مالابار کے کنارے بہت سے عرب تاجر مقیم تھے۔ کلیان اور سوپارہ تو بمبئی کے اطراف میں آج بھی موجود ہیں۔ البتہ چیمور کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مقام کس جگہ آباد ہے۔ ممکن ہے یہ وہی سیل بندر ہو جو سوراشٹر میں ریاست جوناگڈھ کی حدود میں مانگرول کے قریب واقع ہے۔ بہر حال یہ عرب تاجر اپنے ملک سے یہاں آتے تھے، اور پھر یہاں سے نادر اشیاء اور ضروری چیزیں لے کر افریقہ اور چین کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ اس تجارتی تعلق کے باعث نیز موسم کی خرابی اور سمندر کی طغیانیوں کے باعث بسا اوقات انھیں چھ چھ ماہ تک یہیں قیام کرنا پڑتا تھا، اور انھیں عوارض کے پیش نظر انھوں نے یہاں کے متعدد ساحلی علاقوں میں اپنی مستقل قیام گاہیں بنا لی تھیں۔

سلیمان سیرافی، ابن حوقل بغدادی، مسعودی وغیرہ کے سفرناموں میں اور سید سلیمان ندوی کی تصنیف "عربوں کی جہاز رانی" میں ان امور پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

چونکہ عرب تاجروں کا زیادہ تر تعلق گجرات کے مندرجہ بالا ساحلی علاقوں ہی سے تھا اور اندرون ملک ان کو جانے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہوتا تھا، لہٰذا اُس دور میں گجرات کے ساحلی علاقوں کی زبان ہی کسی حد تک عربی زبان سے متاثر ہوئی تھی۔ گرجروں کے جو بعض خاندان ان علاقوں میں بس گئے تھے صرف وہی عربوں سے متعارف ہوئے تھے۔ البتہ جو قبائل اندرونی علاقوں میں آباد ہوئے تھے اُن کی زبان پر صرف انہی علاقوں کی مقامی زبانوں کا رنگ چڑھنے لگا تھا عربی کا چنداں اثر نہ تھا۔ عرب تاجروں میں ہندوستان کے اندرونی علاقوں کے متعلق قسم قسم کی روایات رائج تھیں، جن میں سے زیادہ تر روایات کی بنیادیں تو صرف توہمات ہی پر قائم تھیں۔ البیرونی اپنی کتاب الہند میں، ابوالفدا نے اپنی تاریخ کے مخصوص باب البراہمہ میں اور الہمدانی اور ابن حوقل نے ہندوستان کے اندرونی علاقوں کے متعلق جو بعض باتیں پیش کی ہیں وہ موجودہ دور میں نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔ بہر حال انہی روایات کے باعث یا دوسرے اسباب کی بنا پر اوائل سنہ عیسوی میں یا اس کے بعد کافی عرصے تک عرب تاجروں کا زیادہ تر تعلق گجرات کے ساحلی علاقوں ہی سے رہا ہے۔ مزید معلومات کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "ہزار سال پہلے" ملاحظہ فرمائیے۔

عرب حملہ آوروں کا وُرود

عرب تاجروں کے علاوہ گجرات میں عرب حملہ آوروں کی آمد بھی ایک جداگانہ موضوع رکھتی ہے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حکم بن ابوالعاص ثقفی نے ۶۳۶ء میں بمبئی کے قریب تھانہ پر سب سے پہلی مرتبہ حملہ کیا، اور اس جنگ سے فارغ ہو کر واپس لوٹ گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہی حکم بن ابوالعاص دوسری مرتبہ بھڑوچ پر حملہ آور ہوا، اور پھر یہاں سے وہ مکران کی طرف روانہ ہو گیا۔ حکم ثقفی کے ان دو حملوں کے بعد تیسرا حملہ یعقوب مدنی اور اس کے نائب اسماعیل نے ۸۴۰ء میں گھوگھہ کا ٹھیاواڑ

پر کیا۔ اُس وقت سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) میں ولبھی تی راجہ شیلا دتیہ حکمراں تھا، اور شام میں امیر معاویہ برسرِ اقتدار تھے۔ یعقوب مدنی کا یہ حملہ ناکام رہا حتیٰ کہ وہ خود مع اپنی تمام فوج اور سرداروں کے گھوگھا میں کھیت رہے۔

اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک ــــــــ کے عہدِ خلافت میں محمد بن قاسم نامی ایک ۱۷ سالہ سپہ سالار نے سندھ پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ ۹۲ھ کا ہے، اور پھر ۱۰۷ھ میں جنید بن عبدالرحمٰن مری کے ہاتھ میں سندھ کا اقتدار آتے ہی اُس نے گجرات پر فوج کشی کی۔ وہ مانڈل (ویرگام کے قریب) اور دھینوجا (پٹن کے قریب) کے علاقے فتح کرتا ہوا بھڑوچ جا پہنچا، اور یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد مارواڑ ہوتا ہوا سندھ کی طرف لوٹ گیا۔ جنید کے بعد تمیم عتبی اور حکم بن عوانہ علی الترتیب سندھ کے عامل مقرر ہوئے۔ مگر یہ لوگ گجرات اور مالوہ کے مفتوحہ علاقوں پر قابض نہ رہ سکے۔

۱۴۲ھ میں بہ عہدِ خلیفہ منصور عباسی گجرات پر ایک حملہ اور بھی ہوا تھا۔ اُس وقت ہشام بن عمر تغلبی سندھ کا عامل تھا۔ اُس نے عمر بن جمل کو فوج دے کر سمندری راستے سے گجرات پر بھیجا۔ عمر براہِ راست بھاڑبھوت پہنچا، جو بھروچ کے نواح میں واقع ہے۔ لیکن اس مہم میں عمر کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس کی واپسی کے بعد ۱۵۱ھ میں خود ہشام تغلبی گجرات پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے گندھار کو نشانہ بنایا جو سوراشٹر کے گوگھا بندر اور جزیرۂ پیرم کے عین سامنے واقع تھا۔ اس فوج کشی میں ہشام کو عظیم الشان فتح نصیب ہوئی۔ یہیں اس نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو سرزمینِ گجرات پر سب سے پہلی مسجد کہی جاتی ہے۔ اس مہم میں کامیابی کے بعد جزیہ اور خراج کے معاملات طے کرنے کے لئے ہشام کو کافی عرصے تک یہاں قیام کرنا پڑا، اور آخر کار ان امور کا تصفیہ ہو جانے کے بعد عرب فوج واپس روانہ ہو گئی، اور پھر کافی عرصے تک اُنھیں شاہانِ گجرات سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

۱۵۹ھ میں خلیفہ المہدی عباسی (۱۵۸ھ۔۱۶۹ھ) نے عبدالملک بن الشہاب المسمعی کو ایک جرّار فوج دے کر گجرات روانہ کیا۔ عبدالملک ۱۶۰ھ میں بھاڑبھوت پہنچا۔ اس فوج میں مشہور تابعی حضرت ابوبکر ربیع بن صبیح البصری بھی تھے۔ مسلمانوں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فنِ حدیث میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، اور جن کے متعلق کشف الظنون میں چلپی نے لکھا ہے، هُوَ اَوَّلُ مَنْ صَنَّفَ فِي الْاِسْلَامِ۔ عبدالملک کو اس مہم میں کامیابی تو ملی مگر بعض عوارض کی بنا پر اُسے کافی عرصہ یہاں قیام پذیر رہنا پڑا۔ اسی دورانِ قیام میں وہاں ہندوؤں کا ایک بڑا میلہ لگا جو ہر اٹھارہ سال بعد لگا کرتا تھا۔ موسم کی خرابی اور بے شمار افراد کے اژدہام کے باعث وہاں ایک وبا پھوٹ پڑی۔ ہزارہا افراد دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل ہو گئے جس میں اسلامی فوج کے بیس سپاہی بھی چل بسے۔ اس وبا کا شکار ہونے والوں میں ربیع بصری بھی تھے۔ جن کا مزار آج بھی وہاں موجود ہے۔

(ان تمام واقعات کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فتوح البلدان (بلاذری) معجم البلدان (یاقوت حموی) ابنِ خلدون۔ کامل (ابن اثیر) تاریخ ابوالفدا عربوں کی جہاز رانی (سلیمان ندوی) یادِ ایام (عبدالحی) وغیرہ وغیرہ)

عرب حملہ آوروں کی ان یلغاروں، صلح، جزیہ اور خراج سے متعلق گفت و شنید اور متعدد عرب خاندانوں کی بود و باش نے براہِ راست گجراتی زبان کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سات سو سال کے طویل عرصے میں عرب تاجر اور سپاہی تھانہ، کلیان، سوپارہ، چھایم، چیمور، سورت، کھمبایت، بھڑوچ، بھاڑبھوت، دیو، گھوگھا اور گندھار وغیرہ ساحلی مقامات پر پھیل گئے تھے۔ ابنِ بطوطہ۔ بزرگ بن شہریار۔ ابنِ حوقل۔ نورالدین عوفی۔ ابنِ تیمیہ عیراقی۔ ابنِ سعید اور ابو اسحٰق اصطخری وغیرہ سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ان عربوں کے حالات اور اہلِ گجرات سے ان کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

پارسیوں کی آمد

جس طرح گرجر قوم وسطی ایشیا سے آکر گجرات میں آباد ہو گئی تھی، اسی طرح سرزمینِ ایران سے پارسی بھی گجرات میں آکر آباد ہوئے تھے۔ اہلِ ایران ابتدا از سمندر کی لہروں سے خوفزدہ رہتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ پہلے دور میں سمندری سفروں اور سیاحتوں سے ان کی زندگی معرّا نظر آتی ہے۔ مگر پارتھو عہد میں انھوں نے جہاز رانی کی ابتدا کی، اور پھر تو رفتہ رفتہ یہ لوگ خلیج فارس سے تھانہ بندر تک تجارتی سفر کرنے لگے۔ چنانچہ ساسانی عہد میں بھی ہندوستان کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

۶۳۶ء اور ۶۴۱ء میں شہنشاہِ ایران یزدجرد کو علی الترتیب قادسیہ اور نہاوند میں عربوں نے شکست دے کر سرزمینِ ایران پر اپنا علمِ کامرانی

پڑا پا تھا۔ اسی زمانے میں زرتشتی پارسیوں کے چند قبیلے سرزمین ایران کو الوداع کہہ کر گجرات کی طرف سمندری راستے سے روانہ ہوئے۔ عہد حاضر کے مشہور ایرانی شاعر آقا پوردادؤد نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چہ باک از کولاک آید ستیز   بہم بشکند کشتی از آب خیز
فرو رفتن اندر دہان نہنگ   بہ از تازیان گشتن گشتن تنگ
اہورا بود یار آوارگاں   بہ دریا درون لنگر و پشتیاں

پارسیوں کا پہلا قافلہ ۷۵۲ء میں سوراشٹر کی مشہور بندرگاہ دیو پر لنگرانداز ہوا (جو اس وقت پرتگیزیوں کے قبضہ میں ہے اور اس کی واگذاری کے لئے عوامی تحریک چل رہی ہے) یہ لوگ دیو میں ۱۹ سال قیام پذیر رہے۔ مگر یہاں کی آب و ہوا خلاف طبیعت ہونے کے باعث یہ لوگ اپنے جہازوں میں لد کر سورت کے قریب سنجان جا پہنچے۔ اور "ما ہمہ ہندوستان ما یار ایم" کہتے ہوئے مستقل طور پر یہیں متمکن ہو گئے۔ یہیں انھوں نے آتش کدۂ بہرام کی تعمیر کی اور کم و بیش تین سو سال تک سنجان ہی کو اپنا وطن بنائے رکھا۔ ۱۱۴۲ء میں کچھ پارسی خاندان نوساری (سورت کے قریب) پہنچے، اور پھر رفتہ رفتہ گجرات کے دریاؤ، بھروچ، انکلیشور اور کھمبات نامی شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے۔ یہ لوگ ابتداءً شراب اور تاڑی کی تجارت کرتے تھے۔ ان کے کچھ خاندان پارچہ بافی اور جہاز سازی کا کام بھی کرنے لگے تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ لوگ سورت پہنچے، اور پھر ۱۶۶۱ء میں بمبئی پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو جانے پر پارسیوں نے بمبئی کو اپنا مستقر بنا لیا۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

بہرحال ـــــ گرجروں کی آمد کے بعد یہاں گجراتی نامی جو نئی زبان رائج ہوئی تھی اس پر عربوں کی آمد اور مستقل بود و باش نے کسی قدر عربی کا رنگ چڑھایا، اور بہت سے عربی الفاظ اس زبان میں داخل ہو گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عرب اور پارسی جو جو نئی اشیاء اپنے ساتھ لائے تھے ان کے لئے گجراتی میں پہلے سے مخصوص الفاظ واستعارے نہ ہونے کے باعث یہ تمام چیزیں انہی عربی اور فارسی ناموں سے موسوم ہو گئیں جو ان کے اصلی نام تھے۔ رفتہ رفتہ ایسے تمام عربی، فارسی الفاظ گجراتی زبان کا جزو لاینفک بن گئے۔ (باقی)

مینا کاش

رام اور رحیم

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اور سروج سونے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ باہر دروازے پر لگی گھنٹی دور زور سے بجنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی "ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب!" کسی کی بہت ہی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ کون آمرا! کم بخت رات کو بھی تو چین نہیں لینے دیتے!" سروج جھنجلا سی پڑی، "او مائی "ہوبنڈ"! ...... کیا زندگی ہے ڈاکٹروں کی بھی! نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام۔ بس مشین کی طرح ہر وقت مریضوں کا کام!... یہ بھی کوئی زندگی ہے!... " نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگی۔ ڈسپینسری میں میری بے پناہ مشغولیت اُسے بے طرح اکھرتی تھی جس کی وجہ سے وہ اکثر مجھ پر بگڑتی کہ مجھے نہ تو اپنا خیال ہے اور نہ ہی اُس کا۔ اور اگر رات کو کوئی مجھے بلانے آتا تو وہ میرے ساتھ اُسے بھی آڑے ہاتھوں لیتی، اور اس سے جھوٹ موٹ ہی کہہ دیتی کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔

"کوئی ضرورت مند ہی ہوگا!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا، اور قریب تھا کہ اٹھ کر دروازہ کھولنے جاؤں، کہ وہ فوراً اٹھ کر بولی۔

"ٹھہرئیے! میں دیکھتی ہوں کہ کون ہے"

"لیکن دیکھو، اگر کوئی مجھے بلاتے ہیں تو اس سے یہ مت کہنا کہ..."

"آپ چپ رہئے جی!" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا، جیسے کہنا چاہتی ہو "کیوں فضول باتیں کر رہے ہیں"

دروازہ کھول کر اندر واپس آنے میں اُسے تھوڑا وقت لگا۔ اور جب وہ آئی تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان ہو گئی ہے۔ اندر آ کر وہ بڑبڑانے لگی "اب کیا کیا جائے؟ لوگ تو کمال کرتے ہیں! یہ لوگ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ڈاکٹر انسان نہیں؟ کیا اُسے بھوک پیاس ستانے اور آرام کرنے کی ضرورت نہیں؟ کیا وہ مشین ہے کہ کہیں سے بلاوا آتے ہی بھاگ کھڑا ہو؟"

میں نے پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟ کوئی مجھے بلانے آیا ہے کیا؟"

"اور نہیں تو کیا؟" اُس نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا "میں نے اُس سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سو رہے ہیں۔ پھر بھی بھلا آدمی جانے سے انکار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ آپ کو ساتھ لئے بغیر ہرگز نہیں جائے گا۔ چاہے اُسے صبح تک ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے۔ اب بتائیے کہ کیا کیا جائے؟"

"جھوٹ ہمیشہ ہی کامیاب نہیں ہوتا" میں نے ہنس کر کہا "اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو اب اُسے سچ بات بتا کر آئندہ کے لئے جھوٹ بولنے سے توبہ کر لینی چاہیئے اور ڈاکٹر صاحب کو فوراً اس کے ساتھ چل دینا چاہیئے"

میرا خیال تھا کہ یہ مزاحیہ الفاظ سُن کر وہ ہنسنے لگے گی۔ لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ میں نے پھر کہا "اُس سے کہہ دو کہ ڈاکٹر صاحب ابھی چل رہے ہیں"

"نہیں جی!" وہ نہایت سنجیدہ ہو کر بولی "کوئی اور آدمی اس وقت آپ کو بلانے آتا تو شاید میں آپ کو نہ روکتی، لیکن اس آدمی کے ساتھ میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی۔ اُس کے بھائی کو تیز بخار چڑھا ہے، اور وہ مر جائے تو بھی ہرج نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ اپنے بھائی کے ساتھ اگر وہ بھی مر جائے تو اور بھی اچھا ہو!"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں انگشت بدنداں سا ہو گیا "تم کتنی کٹھور ہو کر ...... !"

"جی ہاں، میں کٹھور ہوں!" اُس نے بھنویں چڑھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے قطع کلام کیا "جانتے ہو کہ آپ کو بلانے کون آیا ہے؟ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو آپ بھی وہی کہتے جو میں نے کہا ہے!"

"کون ہے وہ؟"

"رحیم! ابھی سال بھر ہوا کہ پانچ سال کی سزا کاٹ کر جیل سے لوٹا ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کو سرکار عمر قید کی سزا کیوں نہیں دے دیتی۔

بڑا بھیانک غنڈہ ہے وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھول گئے کیا اُسے ؟"

بھلا اُسے میں کیسے بھولتا ؛ ہمارے شہر اور دیہات کا بچہ بچہ اُس کے نام سے واقف تھا۔ اُسے ہی نہیں رام کو بھی سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ دونوں ہی شہر کے نامی غنڈے تھے۔ دونوں بہت ہی حوصلہ مند تھے، اور اپنے اپنے مذہب کی خاطر جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اپنی قوم پر دونوں کا گہرا اثر تھا۔ رام کے احکام کی تعمیل کرنے کے لئے ہزاروں ہندو اور رحیم کے فرمان کے سامنے سر جھکانے کے لئے ہزاروں مسلمان ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ہندو دھرم کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری رام اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا اور اسلام کا محافظ رحیم خود کو تصور کرتا تھا۔ دونوں ہی شہر کے اتنے طاقتور غنڈے لیڈر تھے کہ میونسپلٹی کے انتخابات سے لے کر گورنر صاحب کو ایڈریس پیش کرنے تک کا کوئی بھی کام انھیں خوش رکھے بغیر کرسکنا ناممکن تھا۔ مارکاٹ اور دنگا فساد کرنے میں اُنھیں بڑا مزہ آتا تھا۔ دونوں کے آگے پیچھے دن رات دو چار سو پہلوان رہا کرتے تھے۔ پولیس کپتان، ڈپٹی کمشنر وغیرہ تمام اعلیٰ سرکاری افسران کے مارے پریشان تھے۔ دسہرہ، دیوالی، ہولی یا عید اور محرم جیسے تہواروں پر اکثر دونوں فرقوں میں مارکاٹ ہوا کرتی تھی۔ ایک بار ایک مندر میں بھجن ہو رہا تھا۔ بس اُسی کو لے کر خوفناک فساد شروع ہوگیا۔ دونوں طرف کے سینکڑوں آدمی زخمی ہوئے، اور کتنے ہی جان سے مارے گئے۔ دونوں پر سرکار نے مقدمے چلائے۔ اور رام اور رحیم دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپے جُرمانے کے ساتھ پانچ سال کی قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

مجھے پچھلی تمام باتیں یاد آگئیں۔ اس لئے میں نے سروج سے کہا —

"نہیں میں بھولا نہیں ہوں۔ اس رحیم کے بچے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"جانتے ہو تو پھر میری بات مانئے!" وہ سنجیدگی سے بولی: "اس کے ساتھ ہرگز نہ جائیے! آج تک جس نے سوائے غنڈہ پن کے کچھ بھی نہیں کیا، شہر کے امن و امان کو تباہ کیا، ہزاروں انسانوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالیں۔ اس کی مدد نہ کرنے سے آپ کو کوئی پاپ نہ لگے گا۔"

اُس کا کہنا بہت ٹھیک تھا۔ لیکن اُس وقت مجھے اُس کی بات پسند نہ آئی۔ کوئی بھیانک بیماری پھیل جاتی ہے تو ایک فرض شناس ڈاکٹر کے لئے اچھے بُرے اور بڑے چھوٹے کی کوئی بھی تمیز نہیں رہتی۔ جہاں کہیں بھی بیماری ہو وہیں اُسے ختم کر ڈالنا۔ اور بیماری کے نرغے میں پھنسے ہوئے دکھی انسانوں کی مدد کے لئے بلا تاخیر پہنچنا، ایک ڈاکٹر کا فرض اوّلین ہے۔ ان خیالات کے علاوہ دوسرے کسی بھی طرح کے خیالات کا، چاہے وہ کتنے ہی خوبصورت فائدہ مند اور سکون آگیں کیوں نہ ہوں، ڈاکٹر کے دل و دماغ پر اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے میں نے کہا: "نہیں سروج! مجھے جانا ہی چاہیئے۔"

"کیا آپ پاگل ہوگئے ہیں؟" وہ قدرے چڑ کر بولی: "رحیم دس نمبری بدمعاش ہے۔ غنڈہ ہے او۔ اس کے ساتھ آپ کا جانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن تم یہ نہ بھولو کہ اس وقت وہ میرے گھر رحیم غنڈے کے رُوپ میں نہیں، بلکہ بستر مرگ پر تڑپتے ہوئے کسی دُکھی اور بدقسمت انسان کے بھائی کی حیثیت سے آیا ہے۔"

"لیکن یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ سچ مچ اُس کا بھائی بیمار ہے؟ کیا ثبوت ہے اس کا؟" اس نے اور بھی تیز ہو کر کہا۔

"سروج!" میں سنجیدگی سے مسکرا کر بولا "تمھارا یہ شک اور خوف دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ رہی ہے۔"

"کچھ بھی ہو، لیکن میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی۔"

اُسے سمجھانا مشکل تھا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح اسے سمجھا بجھا کر راضی کیا، اور کپڑے پہن کر رحیم کے ساتھ ہو لیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ رات کی تاریکی کی وجہ سے ہر طرف ایک بھیانک سکوت مسلط تھا۔ اور میں سہما سہما اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

راستے میں میری اُس سے بالکل بات چیت نہیں ہوئی۔ رام مندر کے سامنے سے جب ہم گزرنے لگے تو مجھے یاد آیا کہ یہی وہ بھیانک جگہ ہے جہاں چھ سال پہلے ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں رام اور رحیم کے بھڑکانے سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس میں مارکاٹ شروع کی تھی، اور آخر میں پولیس نے گولیاں چلائی تھیں۔

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ندامت سے سر جھکائے تیزی سے چل رہا تھا، اور اُسے اسی حالت میں دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی۔ مندر میں ہری کیرتن ہو رہا تھا، اور باجے طبلے کے ساتھ سب لوگ گا رہے تھے ؎

"ایشور، اللہ تیرے نام سب کو سنمتی دے بھگوان"

کتنے شیریں اور بامعنی تھے یہ سنجیدہ الفاظ! اور جب مندر میں صرف آج

ہی نہیں بلکہ چھپنے کی برسوں سے سیکھا جاتا تھا۔ اسی میں ان لوگوں نے کتنے ہی انسانوں کا خون بہایا تھا۔ اس خوفناک اور قابلِ نفرت واقعے کے لئے کون ذمہ دار تھا؟ رام یا رحیم؟ یا پڑھا تھا اور استاد، یا دھرم اور مذہب سے متعلق غلط فہمیاں اور بُرے خیالات؟ —— اور یہی سب سوچتے سوچتے ایک مرتبہ پھر میری نظریں اس پر جم گئیں۔ اب اُس کی گردن پہلے سے زیادہ جھک گئی تھی، اور وہ اور بھی تیز چل رہا تھا۔

مسلم بستی کے شروع ہوتے ہی مجھے یکایک خیال آیا کہ اس کا مکان یہیں کہیں ہے۔ اس لئے میری چال قدرے آہستہ ہو گئی۔ لیکن اُس نے کہا "ابھی بہت دور جانا ہے ڈاکٹر صاحب!"

"لیکن تمھارا مکان تو اسی بستی میں ہے" میں حیرت و سنجیدگی سے بولا "میرا خیال ہے کہ وہ سامنے ہی تو ہے تمھارا مکان!"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ جواب دیا، "کسی زمانے میں وہ میرا تھا۔ لیکن اب نہیں ہے"

"کیا مطلب؟"

وہ خاموش رہا۔

اُس کی خاموشی مجھے عجیب سی محسوس ہوئی، اور سروج نے اس کے ارادے کے بارے میں جو شک ظاہر کیا تھا اس کی بھی یاد آئی لیکن مجھ پانکل ڈر نہیں لگا۔ اور میں نے پھر اُس سے پوچھا "تو اب کہاں ہے تمھارا مکان؟"

"مزدور بستی میں!"

اُس کا جواب بہت ہی حیرت کُن تھا۔ چند منٹ تک تو میں یقین ہی نہ کر سکا۔

دس منٹ کے اندر ہم مزدور بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک مکان کے سامنے رُک کر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا، اور زور سے آواز دی۔ "سُکھیا!"

یہ نام سن کر تو میری حیرت بے انتہا ہو گئی اور میں سوچنے لگا مسلمان رحیم کے گھر ایک ہندو عورت سکھیا کیسے؟ کسی غریب ہندو عورت کو اس نے اغوا کر کے تو نہیں رکھا ہوا ہے؟ سوچتے سوچتے میں ڈگمگانے لگا۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ سروج ٹھیک ہی کہتی تھی۔ غنڈہ آخر غنڈہ ہی ہوتا ہے۔

شاید یہ مجھے مارنے ہی کے ارادے سے ...... یکایک مکان کا دروازہ کھلا اور میں نے چونک کر خود کو سنبھالا۔

اُس نے کہا "آئیے ڈاکٹر صاحب!"

میں کانپتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہو گیا۔

ایک مصیبت زدہ مزدور کا مکان جیسا ہوتا ہے وہ مکان بھی ویسا ہی تھا۔ ایک طرف ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا، جو روشنی کی بجائے دھواں ہی زیادہ دے رہا تھا۔ کوئی بھی چیز صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی، اور پھر دیکھنے لائق وہاں چیز بھی کیا ہو سکتی تھی۔ ایک طرف کمبل پر مریض پڑا تھا، وہ مجھے اُس کے پاس لے گیا سکھیا چراغ اُٹھا لائی۔

لیکن جب میں نے مریض کو دیکھا تو میں مجسم حیرت و استعجاب بن کر رہ گیا۔ وہ مریض کوئی اور نہیں بلکہ وہی انسان تھا جس سے اُس کی ایک عرصے تک دشمنی چلتی رہی تھی یعنی ہندو غنڈوں کا لیڈر رام!....

"یہ کیا؟" عالم حیرت میں میرے منہ سے نکلا "تم نے تو کہا تھا کہ تمھارا بھائی بیمار ہے۔ لیکن یہ تو رام......؟"

"ٹھیک ہی تو کہا تھا میں نے ڈاکٹر صاحب!" اُس نے نہایت سنجیدہ اور کومل لہجے میں جواب دیا "یہ میرا بھائی ہی تو ہے!" اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب مخلصانہ چمک تھی جو اُس کے دلی جذبات کی صحیح ترجمان تھی۔

اب تک کے عجیب واقعات نے مجھ پر جو حیرت آمیز چوٹیں کی تھیں اُن سب سے یہ چوٹ کہیں زبردست تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" مجھے حیرت میں ڈوبے دیکھ کر اُس نے کہا "رام کو دیکھ لیجئے اور اسے دوا دے دیجئے۔ پھر اگر وقت رہا تو میں آپ سے کچھ عرض کروں گا۔"

میں نے رام کو اچھی طرح دیکھا۔ بخار کی تیزی کی وجہ سے وہ اپنے آپے میں نہیں تھا۔ تاہم میرے سبھی سوالوں کا اس نے خاطر خواہ جواب دیا۔ اور اسے دوا پلانے کے بعد جب میں اُس کے جسم پر چادر ڈالنے لگا تو وہ کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب شاید میں نہ بچ سکوں۔ اگر ایسا ہوا تو......

تو...... میری گھر والی اور بھائی کا خیال رکھنا!"

"کون ہے تمھارا بھائی؟" میں نے اُسی طرح حیرت سے پوچھا۔

"رحیم!"

"لیکن یہ تو تمھارا دشمن ہے!"

"نہیں نہیں! اب نہیں" وہ تڑپ سا اٹھا۔ "پہلے کبھی رہا ہوگا۔ یہ میرا دشمن۔ لیکن اب تو میں اُس کا اور وہ میرا بھائی ہے۔ ہاں میرا بھائی" بمشکل تمام یہ کہہ کر اُس نے سر پر چادر اوڑھ لی۔

تھوڑی دیر بعد رحیم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! رام اور رحیم جو کبھی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اب بھائی بھائی بن گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ کو تعجب ہو رہا ہے۔ بات ہی کچھ عجیب ہی ہے۔ آدھی عمر تک ہم نے دشمنی نبھائی۔ مذہب کے پیچھے پاگل تھے ہم دونوں! رام سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے بنا ملک کی حالت اچھی نہیں ہو سکتی اور مجھے بھی یقین تھا کہ ہندوؤں کو بالکل ختم کرنے میں ہی اسلام کی سچی خدمت ہے۔ ہم نے دنگے فساد کئے۔ گلے کاٹے، خون بہائے، اور اگر ہمیں موقع ملا ہوتا تو ہم ایک دوسرے کو بھی جان سے مار ڈالتے۔ ہمیں سزا دی گئی اور دونوں کو ایک ہی جیل میں رکھا گیا۔ وہاں دو تعلیم یافتہ جوان ہمیں ملے۔ انھوں نے ہمیں بار بار سمجھایا نصیحت کی، اور ہمیں انسانیت اور اس کے اصلی روپ کو پہچاننے کے قابل بنا دیا۔ مذہب کے پیچھے ہمارا دماغ بگڑ گیا تھا، ہوش ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ لیکن اُنھوں نے ہمیں سکھایا کہ ہندوؤں کے اصل دشمن مسلمان یا مسلمانوں کے اصل دشمن ہندو نہیں ہیں۔ اس باہمی تفرقہ کی حقیقی وجہ روپیہ اور غریبی ہے۔ روپے کی کمی اور غریبی کی وجہ سے لوگوں میں جو بے چینی ہے، اسی کی وجہ سے لڑائی اور جھگڑے بھی ہوتے ہیں، اگر لوگ خوش حال اور پڑھے لکھے ہوں تو مذہب کے حقیقی روپ کو پہچان سکیں گے اور کہیں کوئی دنگا فساد بھی نہ ہوگا۔ جیل سے یہ سب سیکھ کر ہم دونوں گھر لوٹے۔ ہمارے دوستوں نے آتے ہی ہمیں گھیر لیا۔ لیکن اب ہمیں اُن سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس لئے ہم نے کسی کو بھی منہ نہ لگایا۔ پیٹ بھرنے کے لئے ہم نے مزدوری کرنا اور رہنے کے لئے مزدوروں کی بستی ہی کو ٹھیک سمجھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ جب تک مذہب کے نام پر ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنا نہ چھوڑیں گے تب تک کوئی بھی امن و امان سے نہیں رہ سکتا۔ ہم دونوں جھگڑا کر کے دیکھ چکے ہیں، اسی میں تیسری طاقت کا فائدہ ہے۔ جو غریبوں سے ورشیاں باہمی نفرت و تفرقہ پھیلا کر، انھیں ہندو اور مسلمان کہہ کر وقتاً فوقتاً باہم لڑا دیتی ہے۔ اور پھر غریبوں کی لاشوں پر اپنی خود غرضی کے محل تعمیر کرتی ہے۔ ہم غریب لوگ کٹ کر مر جاتے ہیں لیکن اُن کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ اُن کی خود غرضی اسی طرح برقرار رہتی ہے۔

میں گھر واپس آیا تو دیکھا سروج انتظار میں پاگل ہو رہی تھی لیکن جب میں نے رام اور رحیم کی محبت کا ذکر کیا تو اپنے مخصوص انداز میں بولی "آپ ڈاکٹر کیوں بن گئے آپ کو تو افسانہ نگار بننا چاہئے تھا۔"

حکومتِ کشمیر کا دوسرا شاندار ترقیاتی پنج سالہ پلان

بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت کشمیر ریاست میں تعلیم کو وسعت دینے اور طبی امداد کے کاموں اور رفاہ عامہ کے ایسے ہی دوسرے کاموں پر اپنے بجٹ کا نصف حصہ صرف کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے دوسرے پانچ سالہ پلان میں اکیاون کروڑ روپے خرچ کرنے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس میں سے ۳۴ کروڑ روپے کی رقم بلاکوں کے لئے مخصوص کی گئی ہے تاکہ صوبہ جموں کے پس ماندہ علاقوں کو بھی تاسیس تعمیری ترقی کے کاموں میں مناسب حصہ مل سکے۔

انھوں نے کہا کہ پہلے پانچ سالہ پلان میں ریاست کشمیر میں عوام کا رہن سہن اونچا کرنے کے کئی مفید کام کئے گئے ہیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع کو وسعت دینے کی خاص اسکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ بانہال ٹنل کی کھدائی تسلی بخش طریقہ پر آگے بڑھائی جا رہی ہے۔ کسانوں کو آب پاشی کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ بجلی کے نئے مرکز قائم کئے جا رہے ہیں اور لداخ، اقصا وہ علاقوں کو عام شاہراہ جموں کے ساتھ ملا یا گیا۔ جس سے ریاست کی تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوگا۔

ایس - ایم - ایس - کوہلی

پنجابی کا ٹیگور —— بھائی ویر سنگھ

کوئی ایسا پنجابی ہے - جسے بھائی صاحب ڈاکٹر ویر سنگھ جی کے نام سے واقفیت نہ ہو - پنجابی زبان میں آپ کو وہی درجہ حاصل ہے - جو کہ کالیداس کو سنسکرت، شیکسپیئر کو انگریزی اور گورو دیو ٹیگور کو بنگالی میں ہے در اصل عنوان میں بھائی صاحب کو گورو دیو ٹیگور سے نسبت دینے سے میرا مدعا آپ کی بلند پایہ شاعری کے علاوہ آپ کی روحانی فضیلت کو بھی ظاہر کرنا ہے - آپ بلا شبہ جدید پنجابی نظم و نثر کے جنم داتا اور پنجابی کے ملک الشعراء ہیں -

ضلع جھنگ (مغربی پنجاب) میں "گڑھ مہاراجہ" کے نام کا ایک خاص شہرت کا قصبہ ہے - اسی قصبہ میں میر منو کے وقت (۱۷۲۶ء) ایک مشہور ہستی دیوان کوڑا مل نامی ہو گزری ہے - قصبہ "گڑھ مہاراجہ" کا نام بھی آپ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے - دیوان کوڑا مل جنھیں ان کی شیریں کلامی اور پاک کارناموں کے باعث 'مٹھا مل' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں - میر منو کے دیوان تھے اور بعد میں ملتان کے حاکم مقرر کئے گئے -

بھائی ویر سنگھ جی اسی نامی گرامی ہستی کے خاندان سے ہیں - آپ کے دادا بابا کاہن سنگھ جی "گڑھ مہاراجہ" سے آ کر امرت سر میں آباد ہو گئے تھے - ویر سنگھ کے والد بزرگوار ڈاکٹر چرن سنگھ جی کا ادبی معیار بہت بلند تھا - آپ کا شکنتلا ناٹک کا پنجابی زبان میں ترجمہ اس کی زندہ مثال ہے اور ڈاکٹر صاحب کی ادبی یادگاریں علم و ادب کے دائرے میں نہایت ہی ممتاز درجہ رکھتی ہیں - بھائی صاحب ویر سنگھ کا جنم ۵ ردسمبر ۱۸۷۲ء کو امرت سر میں سازگار فضاؤں میں ہوا - اونچا خاندان ادبی جیون اور روحانیت کا رجحان ورثے میں ملا - اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے ان خوبیوں کو چار چاند لگا دئے -

ویر سنگھ کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو ادبی اور دھارمک تھا - باپ اور دادا کی پاکیزہ عملی زندگی سے رہنمائی لینے کے علاوہ آپ کو اپنے نانا گیانی ہزارہ سنگھ جی سے کافی گیان حاصل ہوا بلکہ ان کے بچپن کا کافی سے زیادہ حصہ انھیں کی سرپرستی میں گزرا - گیانی ہزارہ سنگھ جی خود سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور آپ کی صحبت عام طور پر علم پرستوں اور سادھو سنتوں سے رہتی - جس کا اثر ہونہار ویر سنگھ پر ہونا لازمی تھا - شاید یہی وجہ ہے کہ ہم "شاعر ویر سنگھ" اور "سنت ویر سنگھ" میں امتیاز نہیں کر سکتے -

ابتدائی تعلیم اپنے نانا جی سے پائی اور ۱۸۹۱ء میں مشن ہائی اسکول امرت سر سے میٹرک پاس کیا - ضلع امرت سر میں اول رہے اور امرتسر ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے آپ کو سونے کا تمغہ انعام کے طور پر ملا -

آزاد طبیعت ہونے کے باعث آپ نے نوکری کرنی پسند نہ کی - حالانکہ چند ایک جگہ سے آپ کو پیشکش بھی ہوئی - ۱۸۹۸ء میں سردار وزیر سنگھ کے ساتھ مل کر "وزیر ہند لیتھو پریس" کھولا - جو کہ امرتسر میں پنجابی زبان کا سب سے پرانا چھاپہ خانہ ہے

بھائی ویر سنگھ ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھے جہاں خدا پرستی اور دھرم کا دور دورہ تھا - اس کے عین متوازی وقت کی حکومت کے ایما پر ایک مذہبی لہر نہایت ہی زوروں سے چل رہی تھی جس کو دھارمک الفاظ میں عیسائیت کا پرچار کہا جا سکتا ہے - ڈر تھا کہ اگر ہندوستان کے پرانے مذہبوں نے اپنی اندرونی کمزوریوں کو دور نہ کیا اور ان کے پرستاروں کا معیار اخلاق بلند نہ کیا - تو سب کے سب مغرب کی اس دھارمک رو میں بہہ جائیں گے - چنانچہ جہاں ہندو سماج میں آریہ سماج - برہمو سماج

اور دیگر دھارمک ہروں کا آغاز ہوا۔ سکھ سماج کے دھارمک پرچار کا بیڑا نوجوان ویر سنگھ نے اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اور سنگھ سبھا کی لہر کی رہنمائی کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پنجابی زبان کا پرچار بھی شروع کیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ بھائی ویر سنگھ نے پنجابی زبان کا پرچار لفظوں سے نہیں بلکہ زبان میں ادب کا اضافہ کر کے کیا۔ اور آج اسی ادب کی بدولت دریاؤں کی دھرتی پنجاب کی بھاشا فخر سے سر اونچا کرنے کے قابل ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ بھائی صاحب نے جدید پنجابی زبان کو "بولی" کی بجائے شائستہ اور ادبی "زبان" کہلانے کا مستحق کر دیا ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

ابتدائی تصانیف میں اردو لغات۔ جغرافیہ ہند کا پنجابی میں ترجمہ اور بچوں کے لئے چند کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۸۹۴ء کا سال آپ کی زندگی میں ایک نہایت ہی اہم سال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی سال نوجوان ویر سنگھ نے اپنی شہرت کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کی بدولت آج انھیں ادب اور اخلاق کی دنیا میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ شہرت کا یہ سنگ بنیاد خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی کا آغاز تھا۔ جو کہ آج تک بدستور چل رہی ہے۔ آج تک سوسائٹی نے بارہ سو مضامین پر علیحدہ علیحدہ ٹریکٹوں کی صورت میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ جلدیں اور تقریباً دو درجن کے قریب کتب شائع کی ہیں۔ جن میں سے بیشتر آپ ہی کی تصنیف سے ہیں۔ لیکن آپ نے اپنا نام ان میں سے کسی ایک پر نہیں دیا۔ علاوہ ازیں تقریباً ۲۰ ہزار ٹریکٹ سندھی زبان میں بھی شائع کئے جا چکے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں آپ نے گورمکھی میں پنجابی زبان کا ایک ہفت روزہ اخبار "خالصہ سماچار" کے نام سے نکالا۔ جو کہ آج بھی پنجابی زبان کا نہایت ہی سنجیدہ اخبار سمجھا جاتا ہے۔

آپ کی شادی ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی اور آپ کے گھر دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔

۱۹۰۸ء میں آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر چرن سنگھ رحلت فرما گئے جس کی وجہ سے گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی آپ کے کندھوں پر آگئی۔

آپ کی ادبی زندگی تین دوروں میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور وہ ہے جب آپ نے زبان اور دھرم کے پرچار کی خاطر لکھا۔ دوسرا دور اور سب سے اہم دور وہ ہے جب آپ کے قلم نے قدرت کے رنگین نظاروں کو روحانیت کے جامے میں پیش کر کے جدید پنجابی شاعری کو امر کر دیا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے شعروں میں نئی اور چھوٹی بحروں میں سنگیت بھرے الفاظ اور اچھوتے خیالات کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ تیسرا دور ۱۹۴۹ء کے بعد آج تک کا ہے۔ جب کہ بھائی صاحب اس پیری کی عمر میں محض روحانیت کے پجاری ہو چکے ہیں۔ شری ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے ممبر پارلیمنٹ نے جو کہ انگریزی کے ایک برگزیدہ شاعر ہیں۔ آپ کی علمیت اور شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کو پانچ دریاؤں کی سرزمین میں چھٹا دریا کہہ کر پکارا ہے۔ آپ نے اس خطے کے لوگوں کو تہذیب اور ادب کے دھارے سے سالہا سال سیراب کیا ہے۔ اور آپ کی زندگی ہمیشہ ہی ادب کی روح رواں رہی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی نے آپ کی ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے سال ۱۹۴۹ء میں آپ کو ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ کی آنریری ڈگری پیش کی۔ جب بھائی صاحب نے ڈگری لینے کے لئے کسی دوسری جگہ جانے سے بھی انکار کر دیا۔ تو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈگری پیش کرنے کی رسم بھی امرتسر میں آپ کی کوٹھی پر کی گئی۔

آپ نے جدید پنجابی ادب کو نہ صرف جسم ہی دیا ہے بلکہ اس میں روح بھی پھونکی ہے۔ پنجابی کے مشہور شاعر بابا ہدایت اللہ نے کسی موقعہ پر آپ کے متعلق یہ رائے زنی کی تھی۔ یہ پہلے پنجابی شاعر ہیں۔ جن میں انفرادیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے"۔ اور یہ انفرادیت ہی بھائی جی کو دوسرے پنجابی شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو بھی ان کی نظم "پیپل کا درخت" نہایت ہی پسند تھی۔ آپ کی شاعری میں زندگی اور بہار و جوبن کے آثار بڑی فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔

زندگی یا "جیون" کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آپ نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

"جمنا - پُھلنا - پھلنا تے مرجانا"

جیسے پھولوں کی کلیاں چٹک کر کھلتی ہیں اور پھول بن کر خوشبو دیتی ہیں۔ پھر پھول مرجھا جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس "جیون" میں "کھیڑے" (خوشی) کا ہونا نہایت ہی لازمی ہے۔ اس کے بغیر زندگی کی تصویر ادھوری کھینچی ہے۔

چھڈیا جد کھڑتاں اساں — رنگ۔ روپ۔ رس نال
پھلنا۔ پھلنا چھڈیا — رہے رہن دا مال
تدوں کہاڑا آ گیا — وڈیا شاخو شاخ
جڑ مڈوں وڈ ڈیگیا — ڈھیری کیتا خاک

جس نخل سے پھولوں کی شگفتگی دور ہو جاتی ہے اس کی شاخ شاخ اور تنے کو کہاڑے سے کاٹ کر گرا دیا جاتا ہے اور لکڑی کو جلا کر خاک کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے لکھتے ہیں۔

کھیڑا جندڑی اک ہٹن — اک دوہاں دی چال

جس نے زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے اصلیت کو حاصل کر لیا ہے۔

کھیڑا بھریا ہر رُتے ہے — ہر حلے ہر جائی
کھیڑا چھڈیا جس نہ اسدا — رمز اسے نے پائی

(بجلیاں دے ہار)

ہجر کے درد میں بھی بھائی ویر سنگھ کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق دردِ ہجر میں وصل یار سے بھی زیادہ مزہ اور خوشی ہے۔ کیونکہ محبوب کے پیار میں عاشق اتنا مست ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات میں بھی محبوب نظر آنے لگتا ہے۔

میں لیلیٰ۔ میں لیلیٰ۔ کوکے مجنوں لیلیٰ ہویا
آپے پریتم بن گیا پریمی۔ ٹیک جاں اندر پائی

(بجلیاں دے ہار)

ان اشعار میں بلھے شاہ کی کوتا کا کچھ کچھ رنگ ملتا ہے۔

رانجھا۔ رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدو نی مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھیو کوئی

(کافیاں بلھے شاہ)

مگر دونوں کے کتھن میں ایک فرق نمایاں ہے۔ جہاں بلھے شاہ کے عشق میں سوز و درد ہے وہاں بھائی صاحب کے اشعار میں شکر اور کھیڑا (خوشی) ہے۔ شکوہ نہیں۔

راہ گزرتے ہوئے کسی نے ٹہنی سے پھول توڑ لیا اور سونگھ کر پھینک دیا۔ پھول پنکھڑی پنکھڑی ہو کر پاؤں کے نیچے روندا گیا۔ مگر اس نے شکوہ نہیں کیا۔ لیکن لمس ناز نین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھول نے کہا۔

تسی توڑیا۔ اسی ٹٹ پئے۔ وچھڑ گئے ساں ڈالوں
تساں سُنگھ۔ سینے لا سُٹیا۔ وچھڑ گئے تساں نالوں
پیراں ہیٹھ لتھاڑ لنگھوں۔ کیتا کھنڈی کھنڈی
پر شکرانہ چھوہ تیری دا۔ اجے نہ بھلدا سانوں

یہ ہے بھائی صاحب کا پیغام زندگی۔ خوشی اور پیار ہی زندگی کا اصلی راز ہے۔

"بھائی" اور "ویر" دونوں کے معنی برادر کے ہیں۔ بھائی ویر سنگھ نام اور کلام دونوں حیثیتوں سے انسانیت کے "بھائی" ہیں۔ جذبۂ برادری اور تکرار لفظی دونو کے لئے شعر ملاحظہ ہو۔

"دنیا دا دکھ دیکھ دیکھ۔ دل دیدا دیدا جاندا"

بھائی صاحب کی شاعری میں کلاسکی عنصر بہت پایا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے الفاظ اور محاورے استعمال میں لاتے ہیں جن میں روحانی تقدس اور مذہبی روایات موجود ہوں۔ ان کے الفاظ میں جذبۂ عشق حقیقی اور اسلوب بیان میں ایک آہنگ پایا جاتا ہے۔ اور غالباً یہی ایک سبب ہے۔ کہ آپ کے حلقے کے لوگ آپ کو مذہبی پیشوا تصور کرتے ہیں۔ اور آپ کی شاندار شخصیت سے متاثر ہیں۔

بھائی ویر سنگھ کے کلام میں ان کی بصیرت اور عمیق مطالعے کا ثبوت ملتا ہے۔ جہاں آپ نے ہندو مذہب کی خوبیوں کا کھلے طور پر مطالعہ کیا ہے وہاں اس غیر فانی شاعر نے اسلام کی خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

مذہبی نقطہ نظر سے بھائی ویر سنگھ کی شاعری کا درجہ بہت بلند ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی جہاں تک خالص شعریت کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے حسنِ بیان کے محل کھڑے کر دئے ہیں۔ آپ کی ذہنی صلاحیت قابلِ رشک ہے اور تخلیق شدتِ خلوص کا نتیجہ ہے۔

پھولوں سے خاص طور پر آپ کو پیار ہے۔ اپنی کوٹھی میں نرگس اور گل داؤدی کے پھول بڑے شوق سے لگوا رکھے ہیں۔

ایک سال زیادہ بارش کی وجہ سے گل داؤدی کے پھول نہ کِھلے تو آپ نے ان لفظوں میں خیالات کا اظہار کیا۔

"گل داؤدیاں نہی آئیاں 'اندر' مار مُکائیاں"

کِھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں۔

رکھڑے متھے تسی سجنوں۔ تسی متھے وٹ نہ پائیے

شاعر کو پتھروں میں بھی زندگی نظر آتی ہے۔ کشمیر کی سیر کے دوران میں جب اوانتی پور اور مارتنڈ کے کھنڈروں کو دیکھا تو کوی کا نازک دل لرز اُٹھا۔

ماریئی جد مارتنڈ نوں۔ پتھر رو کُرلانے
"پتھر توڑیں" دل پئے تُٹدے! دل کعبہ بلنے

(مشک ہلارے)

یعنی حملہ آور نے مارتنڈ کے مندروں میں پوجا کے بتوں کو بے رحمی سے توڑ دیا۔ اور بُت پرستی کو ختم کرنا چاہا۔ شاعر کی بصیرت اس سے آگے جاتی ہے۔ اور وہ بُت توڑنے والے سے پوچھتا ہے۔ تم پتھر توڑ رہے ہو۔ مگر اس پتھر کے بُت کے پیچھے اس کو بنانے والے کا دل چھپا ہوا ہے۔ اور یہ وہ دل ہے جو کہ خدا کا گھر ہے۔ لہذا یہ پتھر نہیں۔ دل توڑے جا رہے ہیں۔

پھر لکھتے ہیں۔

گھٹ گھٹ دے وچ وسدا جیہڑا تو کیہنوں رب پچھانے

خدا تو ذرّے ذرّے میں ہے لیکن بھلا بتا۔ تو کون سے خدا کو خاطر میں لاتا ہے۔

شاعر کشمیر کے ایک دریا کے کنارے بیٹھا ہوا قدرت کے نیرنگ نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور اچانک بہتے ہوئے دریا سے سوال کرتا ہے۔ اے بہتے ہوئے دریا تو دن رات چلتا رہتا ہے۔ کیا تو تھکتا نہیں؟ نازک خیالی ملاحظہ ہو دریا جواب دیتا ہے۔

سینے برچھ جنہاں نے کھادی	اُہ کر آرام نہیں بہندے
نہاں والے نیناں کی نیندر	اُہ دِنے راتیں پئے وہندے
اکو لگن لگی لئی جاندی	ہے ٹور انت اُنہاں دی
وصلوں اُرے مقام نہ کوئی	سو چال پئے رات دن وہندے

(بجلیاں دے ہار)

جس دل میں پیار کی لگن ہو وہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اور محبت کی مستی سے بھری ہوئی آنکھوں میں نیند کہاں؟ وہ ہر وقت محبوب کے فراق میں رواں رہتی ہیں (روتی رہتی ہیں)۔ اس دل میں ایک ہی لگن ہے محبوب کے پاس جانے کی۔ لہذا اس کی چال کبھی ختم نہیں ہوتی آخری منزل مقصود وصل یار ہے۔ اس لئے وہ (یعنی دریا) دن رات چلتا رہتا ہے۔

پھل دار درخت ہمیشہ نیچے کی طرف جُھکتا ہے۔ ان تمام اوصاف کے باوجود بھائی صاحب ڈاکٹر ویر سنگھ میں ذرا بھی انانیت نہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ ان کی کسی تصنیف میں کسی جگہ بھی لکھنے والے کا نام نہیں لکھا ہوا۔ اور یہ لکھا ہے۔

میرے چھپے رہن دی چاہ۔ تے چپ کر جان دی
ہائے پوری ہندی ناہ۔ میں ترلے لے رہیا

اور آپ کی تمام زندگی اسی طرح تنہائی میں گزری ہے

۱۹۵۲ء میں آپ کی قابلیت کے پیش نظر آپ کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے اپر ہاؤس کا ممبر نامزد کیا گیا۔

آپ نے نظم اور نثر دونوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:۔

نثر:۔ سُندری (ناول) کلغدھر چمتکار۔ گورو نانک چمتکار ستونت کور وغیرہ

نظم:۔ مشک ہلارے۔ بجلیاں دے ہار۔ رانا سورت سنگھ۔ پریت وینا وغیرہ

اظہر علی فاروقی

بنگلا کا وشنوی ادب

مذہبی تحریکیں اُبھرتی ہیں اور دب جاتی ہیں ۔ اور بنگال میں وشنویت کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔ ایسے تو وشنو کی پرستاری عہد قدیم سے چلی آتی ہے ۔ مگر بودھ اور جین دھرموں نے اسے نیم جان بنا دیا آچاریہ رامانج نے ۱۲ ویں صدی میں ایک بار پھر وشنویت کی سسکتی روح میں قوت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن بودھ دھرم کی سہجیائی تحریک نے عوام کے رجحانات اپنی طرف کچھ اس طرح مبذول کر لیے تھے کہ وشنویت جان بر نہ ہو سکی ۔ ادھر جب سوامی شنکر اچاریہ نے ویدانتی دھرم کا صور ایک بار پھر پھونکا جس سے بودھ اور جین دھرم مُردہ ہوتے نظر آنے لگے ۔ مگر بودھ دھرم کے مہایانی اور سہجیائی نظریات عوام کے دلوں میں ایسے جاگزیں ہو چکے تھے کہ مٹانے سے نہ مٹ سکے اور بودھ دھرم کا مہایانی مبلغ ناگارجن ان کا مقابلہ کرتا رہا کہنے کو تو ہم اسے مقابلہ کہہ سکتے ہیں مگر ہوا یہ کہ ویدانتی مبلغوں کی دیکھا دیکھی ناگارجن کے مقلدوں میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا ۔ جس نے عوام کی تسکین کے لئے ویدانتی دیوتاؤں کے برابر اپنے دیوتا لا کر کھڑے کر دئے ۔

پرگیا، اب لوکیشر، منجاشری جیسی دیویاں اور دیوتا گڑھ لئے ۔ سمجھ دار مہایانیو کے دلوں میں یہ بات کھٹکنے لگی اور انھوں نے جب "اب لوکیشر" پر غور کیا تو انھیں واسدیو کا دوسرا روپ نظر آیا اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے رستے سے الگ ہٹتے جا رہے ہیں اور اس طرح ایک بڑی تعداد ناگارجن کے اس رویے پر شبہ کرنے لگی ۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ایسے لوگ ہندو سوسائٹی سے نکالے جا چکے تھے اور ان کے لئے دوبارہ اس جگہ پہنچنا ناممکن سا تھا اور انھیں اپنے لئے ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ۔ ادھر یہ بھی ہو رہا تھا کہ نرونم ولاس اور بھگتی رتناکر کے ذریعے وشنو کی کرامات عوام تک بالکل اسی طرح پہنچ رہی تھیں جس طرح مہاتما بدھ کے کراماتی کارنامے چینی سیاح یوانگ سانگ کے سفرنامے کے ذریعے پہنچ رہے تھے یا کوسی نگر اور بنارس کے بیانات پڑھ پڑھ کر لوگ مہاتما بدھ کی کرامات سے واقف ہوتے تھے ۔

بودھی بھکشو اور وشنوی ویراگی، اب لوکیشر اور واسدیو بظاہر ایک دوسرے سے مماثلت بھی رکھتے ہیں اگرچہ بنیادی طور پر بودھیت اور وشنویت ایک دوسرے سے جداگانہ نظریات رکھتی ہیں جبکہ ایک گیان اور دوسری بھگتی پر زور دیتی ہے ۔ مگر ایسے لوگوں کے لئے جو بودھیت سے غیر مطمئن ہو چلے تھے اور ہندو دھرم انھیں اپنانے کے لئے طیار نہ تھا ۔ بودھ دھرم کے ساتھ وشنویت کی یہ ادنیٰ مماثلت اکسیر کا کام کر گئی اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بنی ۔ اور انھیں وشنویت کا سہارا لینے ہی میں نجات کی صورت نظر آئی خصوصاً جب انھیں اس کا یقین ہو گیا کہ کوئی دھرم ایسا بھی ہے جو بھگتی کے لئے گیان کی شرط نہیں لگاتا سچ پوچھئے تو دیوپالائی تاریخ کا یہ انقلاب محض برائے نام تھا سرے کرشیلا چندر اور مہادیو سے لے کر گورکھ ناتھ، کالوپا بلکہ رائے پنڈت کم کی تلقینوں کا لب لباب بے ثباتی عالم اور روحانی تقوے ہی رہا ہے ۔ نالندا کی تعلیمی خانقاہوں سے اُبھری ہوئی آوازیں ندیا ٹول کی بدولت نشاۃ ثانیہ کے روپ میں بدل چکی تھیں ۔ بودھیت نفس کشی کی وہ منزلیں دکھا چکی تھی ۔ جن کی بدولت انسان شہوانی کش مکش پر قابو پا سکتا تھا ۔ ادھر سولہویں صدی میں مسلمان مبلغوں سے زیادہ فرماں رواؤں کی بدولت اسلامی نظریات بھی کچھ نہ کچھ پھیل چکے تھے ۔ اور ویدانتی، بدھی، مہایانی، سہجیائی مقلدوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر چکے تھے ۔ مشرقی بنگال ان سب نظریات کا صدیوں سے جولان گاہ

رہ چکا تھا۔ انقلابی قدریں اپنا اپنا کام کرتی رہیں۔ کچھ نظریات اُبھرے کچھ مسخ ہوئے۔ کچھ نئے پیدا ہوئے کچھ مٹے مگر ویدانتیوں کا کٹر پن۔ ذات پات کی اونچ نیچ، چھوت چھات، باہمی نفرت اور تذلیل اپنے حال پر قائم رہی اور لوگوں کے دلوں میں کھٹکتی رہی۔ مہاتما بدھ کی رحم کی تلقین، گیان اور بھگتی کی تبلیغ کے درمیان عشق بسوزد و بسازد کی ایک آواز اُبھری اور لوگوں نے اس پر لبیک کہا اور یہ آواز تھی وشنویت کی جسے سوامی چے تنیہ دیو نے اُبھارا۔

وشنوی شعر و ادب کا ڈھانچا اُن انقلابی قدروں سے بنتا ہے جو بنگال میں تقریباً چار سو سال سے اوپر کام کر رہی تھیں۔ اور خصوصیت سے سولھویں صدی عیسوی کے اُن رجحانات کو بہت بڑا دخل ہے جو برسوں سے ان انقلابی قدروں سے تاثر قبول کر رہے تھے۔

وشنوی ادب سے پیشتر بنگلا میں جو ادب ملتا ہے وہ دیومالائی ادب ہے۔ چنڈی، منسا، منگل کی عقیدت کے ترانے ہیں یا پھر پال خاندان کے راجاؤں کے تعریفی ترانے ہیں، جہاں حقیقت کا فقدان ہے اور جنھیں ہم قصے کہانیوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دے سکتے۔ بودھی ادب نے بھی دیومالائی روپ اختیار کیا۔ اور بنی نوع انسان کی طرف کوئی اعتنا نہ کی۔ مختصر یہ کہ وشنوی شعر و ادب سے پیشتر بنگلا کا پوتھی ادب مائی تھالوجی پر مبنی ہے۔ وشنوی ادب کی زبردست خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مبالغہ سہی مگر تاریخی صداقت کا بڑا عنصر موجود ہے۔ اور اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری نظر اس سوانحاتی ادب پر پڑتی ہے جسے سوامی چے تنیہ دیو کے چیلوں نے نظم کیا۔ ایسے ادب میں سب سے اہم کرشن داس کوی راج کی چے تنیہ امرت ہے۔ کہنے کو تو یہ سوامی جی کی سوانح عمری ہے مگر ہم اسے وشنویت کی انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ سماجی۔ معاشرتی اور کلچرل زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ چھوت چھات اور ذات کا بھید بھاؤ کس طرح مٹ رہا تھا۔ کالی داس نامی ایک شخص نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا کہ وہ ڈوم، چنڈال اور دوسرے نیچ ذات کے لوگوں کے کھانے کے پتلوں کا پس خوردہ اپنے ہاتھ سے ضرور چھوا کرے گا۔ تریری چکرورتی ایک دوسرا برہمن شاعر ہے جس نے ایک ضخیم نرو تم کے سوانح حیات نظم کئے۔ سوامی چے تنیہ دیو کا ذکر ایک لوچن گوبند داس ہے جس نے سوامی جی کے دکن کے دورے اور سیاحت کے حالات نظم کئے۔ جو کرچا کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ رپورتاژ معاشرت کے بڑے اچھے اچھے مرقعے پیش کرتا ہے "سوامی جی کی ماں خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی تھیں۔ جو کچھ پکتا پہلے کرشن بھگوان کی مورتی پر چڑھایا جاتا۔ گھر کے لوگ اسے متبرک اور پرشاد سمجھ کر بڑی خوشی سے لیتے ....." کھانا کیا پکتا تھا وہ اس طرح بیان کرتا ہے "گوشت مچھلی گھر میں نہیں آ سکتی تھی ساگ بھاجی، بھنی ترکاریاں، دودھ، دہی، پھل پھلاری، حلوا، پوری پسٹی، لڈو وغیرہ ....." تعجب ہے کہ اس نے چاولوں اور بھات کو کھانے کی فہرست میں داخل نہیں کیا۔

ورندابن داس ایک دوسرا شاعر ہے جس نے سوامی چے تنیہ دیو کے سوانح زندگی نظم کئے۔ اس کے سوانحی منظومات تاریخی حیثیت سے لائق ستائش ہیں۔ وہ تاریخوں کے ساتھ دن اور وقت تک بیان کرتا ہے۔ وشنوی مرکز یا نودیپ، چٹگانگ، سلہٹ، راڑھا، اڑیسہ وغیرہ کے جغرافیائی بیانات بڑی خوبصورتی سے دیتا ہے۔ لوچن داس اور جے نند کے چے تنیہ منگل بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان میں معاشرہ اور کلچر کی تصویروں کے علاوہ حسین شاہ حاکم بنگال کی بدعنوانیوں اور پچھتاوے کا ذکر بھی ہے۔ چے تنیہ پد اور دیو گوشٹھا وشنوی ادب کی دو اور شاخیں ہیں۔ چے تنیہ پدوں میں کرشن جی کی زندگی کے اجاگر خاکے پیش کئے گئے ہیں اور اس طرح یہ شعری ادب سورداس، رس کھان، میراں کے بھجنوں سے بہت کچھ مماثلت رکھتا ہے ہندی کے وشنوی کویوں نے اپنا تخیل ان کے بچپن کے لہو و لعب، جوانی کی رنگ رلیوں تک ہی صرف کیا۔ میراں کے بھجنوں میں کرشن جی کی زندگی سے زیادہ خود اس کی آپ بیتی، فراق کے غموں اور وصل کی آرزوؤں کے خاکے ہیں مگر چے تنیہ پدوں میں راجا کنس، باسدیو، دیوکی، گوالوں کے لڑکوں، چراگاہ منظروں کی بڑی دلکش تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ کالی دمن، کالی سرود، باکا بھنجن وغیرہ کی کہانیاں بڑے لطیف پیرایے میں بیان کی گئی ہیں۔

وشنوی شعری ادب ہمارے تمدن اور تہذیب کا ایک ایسا ورثہ ہے جس سے کسی حالت میں بے اعتنائی نہیں کی جا سکتی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندی زبان پر اس کا براہ راست اور اس ادب پر بہت کچھ اثر ہے

ایش کمار

معلوم ہے ہی آپ کو بندے کا ایڈریس

آج صبح سے ہی گھر میں شور تھا۔ کہ آپ ناشتے پر کیا کھائیں گے حیران تھا کہ اس چہ معنی۔ کہیں چھوٹو کی ٹانگ تو نہیں ٹوٹ گئی جو آج چولھا گرم نہیں کرے گا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دن کے تمام کھانوں میں صبح کا ناشتہ ہی تو مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ اور خاص کر جب سردی ہو۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہو۔ ایسے وقت میں میں ناشتہ بستر پر ہی کیا کرتا ہوں۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں۔ کہ خدا نے دو ہی چیزیں بنائی ہیں۔ ایک رضائی۔ دوسرے چائے۔ رضائی کا مزا بھی بارش میں ہوتا ہے۔ اور بارش کا مزا پہاڑوں پر۔ معلوم نہیں پہاڑوں پر لوگ بارش سے گھبراتے کیوں ہیں۔ بارش کے بغیر پہاڑ کس کام کے میدانوں میں تو بارش چند ہی منٹ کے لئے ہونی چاہئے۔ ورنہ چھتیں جواب دے دیتی ہیں۔ مکان گر جاتے ہیں۔ سڑکوں پر کیچڑ۔ گلیوں میں پانی۔ اور بارش ہو چکنے کے بعد وہ سڑان ہوتی ہے۔ کہ توبہ ہی بھلی۔ اور پھر بارش کے "پس ماندگان" ہیں مچھر۔ نام لینے سے ہی جی گھبراتا ہے۔ اک چاک ہو تو سی لوں۔ یہاں برساتی اور چھاتا تو پوشاک کا حصّہ بن ہی چکے ہیں۔ بس پھر کیا ہے رضائی میں بیٹھے تھک گئے۔ تو گھومنے چلے جایئے۔ بارش سے جی گھبرائے تو کالکا کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی موٹروں کے بیسیوں اڈّے ہیں۔ جہاں ارزانی بھی ہے اور "خشک سالی" بھی۔ عام طور پر یہ دو نعمتیں اکٹھی نہیں ملا کرتیں۔ ہاں تو صحبتِ مونس ہو۔ بارش ہو۔ رضائی ہو۔ بجلی کی روشنی ہو۔ اور چائے کی بلوریں پیالی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ میں جنّت کا نقشہ کھینچ رہا ہوں۔ کونسی جنّت۔ وہ آدم بابا کی ابتدائی جنّت نہیں۔ اس وقت خداوندکریم کارِجہاں بانی میں شاید ناتجربہ کار تھے آدم کو تو بنا دیا۔ اسے علم وعقل سے محروم رکھا۔ اسی لئے تو جنّت جنّت معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ ؎

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

رضائی کی تاریخ ایجاد کا تو مجھے علم نہیں۔ چائے کی پتی اور بجلی کی روشنی علم و عقل کی باتیں ہیں۔ جو انسان کو حضرت عزازیل کی وساطت سے نصیب ہوئیں۔ ورنہ اللہ تعالےٰ تو جنگل و بیابانوں کو ہی جنّت کا نام دے کر ہمارے بزرگ کو ورغلا رہے تھے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم	سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی	خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

آدم کی جنّت بھی کوئی خوشگوار جگہ تھی۔ کہ اس کا نقشہ کھینچا جائے۔ کیا کشش و دلجوئی تھی وہاں۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے والا معاملہ تھا۔ تعجب نہیں۔ کہ بابا آدم کا دل اکتا گیا۔ اور التجا کی کہ جی بہلانے کا سامان مہیّا ہو۔ اور جہانبانی کی ستم ظریفی دیکھئے۔ کہ کیا سامان مہیّا کیا۔ اور اس سے کتنے فتنے برپا ہوئے۔ اس کا پھر کبھی ذکر کروں گا اتنا کہہ دوں۔ کہ آخرکار آدم کو ایسی جنّت میں عمر بھر بسر کرنا ناگوار گزرا اور ہماری خوش قسمتی تھی۔ کہ اس نے اسے خیرباد کہہ دیا۔

موجودہ جنّت یہ ہے۔ کہ شملے کی پہاڑیاں ہوں۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہو۔ پلنگ کی اوٹ ہو اور ساٹن کی رضائی۔ بجلی کی روشنی میں چائے کا بلوریں پیالہ۔ اور ہاتھ میں ادب لطیف کی کوئی کتاب میں اکثر بانگِ درا پڑھا کرتا ہوں اور سوچا کرتا ہوں۔ کہ علّامہ اقبال نے "کوہ ہمالیہ" ڈلہوزی میں لکھی تھی یا شملے میں۔ بادلوں کا جو نقشہ علّامہ نے کھینچا ہے وہ ڈلہوزی سے نسبت رکھتا ہے ؎

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر — فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
جن کے گیسوئے رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں — شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
ہوا کے زور سے اُبھرا۔ بڑھا۔ اُڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا۔ لو برس پڑا بادل

یہ تمام نظارے شملے کی بہ نسبت ڈلہوزی سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ بادلوں کی جو پُرکیف اٹکھیلیاں میں نے ڈلہوزی میں دیکھی ہیں اور کہیں نہیں دیکھیں۔ شملے میں بارش تو خوب ہوتی ہے۔ مگر نہ وہ ہوا ہوتی ہے اور نہ "ہوا کے زور سے اُبھرا۔ بڑھا۔ اُڑا بادل"۔ اور نہ ہی وہ کنجِ عزلت جس کا اقبال شیدائی تھا۔ "گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کوہسار میں"۔ دامنِ کوہسار کا جو سکوت ڈلہوزی کی وادیوں میں ہے شملہ کے "آباد ویرانے" میں نہیں۔ بقرو ٹہ کے کنجِ تنہائی میں ہی بانگ درا لکھی گئی ہوگی۔ تبھی تو اقبال بادلوں کے دلفریب خرام ذہن نشین کرا سکا۔ بارش کی دھیمی دھیمی پھوار اور ٹین کی چھت پر گڑگڑاہٹ دونوں سے گھبراتا ہی رہا۔

موجودہ جنت کا خاکہ کھینچ رہا تھا۔ بانگ درا ہاتھ میں ہو۔ یا اوتھیلو یا کیٹس کی کوئی اوڈ کیا کہنا۔ ساتھ رفیق ہو۔ اور ہلکی ہلکی باتیں ہو رہی ہوں۔ کچھ پیار کی باتیں۔ کچھ پرانی یادوں کو تازہ کرنے والی باتیں۔ نرم نرم اکساہٹ کی باتیں۔ کچھ دماغی اور روحانی باتیں اچھا تو منظور ہے۔ کچھ فاصلے پر سہگل کی گائی ہوئی غزل "بنائے نہ بنے" دھیمی سی سنائی دے۔ جو باتوں میں لطافت تو پیدا کرے۔ مخل نہ ہو۔

کہاں کا کہاں جا پہنچا ہوں۔ صبح سے گھر میں شور تھا۔ کہ آج آپ ناشتے پر کیا کھائیں گے۔ آخر سمجھ میں آیا۔ کہ آموں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ ایک ٹوکرا لدھیانے سے لایا تھا۔ ایک پیٹی دہلی سے آگئی تھی۔ لیکن یہاں ٹوکرے اور پیٹیاں کیا کر سکتی ہیں۔ سال میں دو ماہ صبح آموں کا ہی ناشتہ کیا کرتا ہوں۔ آم نہ ہوں تو مشکل پڑتی ہے۔ بازار میں آم یہاں بھی بکتے ہیں۔ مگر میں سیروں میں خریدنے کا عادی نہیں۔ ترازو میں رکھے ہوئے آم مجھے کچھ بھدّے سے لگتے ہیں۔ ٹن کا پیمانہ جواب کوئلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ آموں کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ غالب مرحوم سے جب پوچھا گیا۔ کہ آپ کو کیسے آم مرغوب ہیں۔ تو فرمانے لگے۔ میٹھے ہوں اور بہت ہوں معلوم نہیں مرزا کی میٹھے آموں سے کیا مراد تھی۔ دہلی میں چونسہ آم بہت کھایا جاتا ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ میٹھا تو مالدہ کی طرح ہوتا ہے۔ مگر خوشبو میں اس سے بہتر۔ پنڈت جواہر لال الفانسو کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں اور پیٹیاں کی پیٹیاں ہر سال یورپ بھیجا کرتے ہیں۔ غالباً الفانسو ہی پچھلے ماہ روس لے گئے تھے۔ مجھے تو لنگڑا پسند ہے۔ خالص بنارس کا لنگڑا۔ الفانسو اور چونسہ بہت نہیں کھائے جا سکتے۔ لنگڑا بہت کھایا جا سکتا ہے۔ اور میٹھا بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ آم کو ہونا چاہئے۔

الفانسو سے ایک واقعہ کی یاد تازہ ہو آئی ہے۔ معلوم نہیں کس طرح میرے شاگردوں کو علم ہو گیا ہے۔ کہ مجھے آموں کا بے حد شوق ہے۔ ایک دن چند طالبات[1] نے آکر میری میز پر الفانسو کا ایک آم رکھ دیا۔ اور لگیں میری حاشیہ آرائی کا انتظار کرنے۔ میں نے مذاقیہ کہا۔ کہ میں ایک آم کو کیا کروں اکیلا ایک آم تو میں نے عمر بھر کبھی نہیں کھایا۔ وہ بولیں۔ یہ ایک خاص آم ہے۔ اس پیٹی میں سے ہے۔ جو ان میں سے ایک کے منگیتر نے بمبئی سے بھیجی ہے۔ اگر آپ ٹھیک قیاس آرائی کریں۔ کہ وہ خوش قسمت کون ہے۔ تو ہم ایک ایک آم آپ کو دیں گی۔ ورنہ آپ ہم سب کو ایک ایک آم دیں۔ سودا کچھ کھرا سا جچا۔ میں نے شرط مان لی۔ اور لگا ان کے چہروں کا جائزہ لینے۔ کہ شاید کچھ سراغ مل جائے۔ کچھ ہچکچاہٹ یا حیا کی علامت نظر پڑے۔ لیکن حیا تو آج کل کا فیشن ہی نہیں۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ اور آخر یونہی ایک طرف اشارہ کر دیا۔ جو غلط نکلا۔ اس لڑکی کا چہرہ کچھ ایسا بے علامت سا تھا کہ حیرانی ہوئی۔ اب دس آم میرے ذمے ہیں۔ اور قرضہ ابھی تک بے باق نہیں ہو سکا۔

ہاں تو ہمارا آموں کا ذخیرہ کل ختم ہو گیا تھا۔ آج کی صبح تو جوں توں کاٹی۔ کل کا فکر دامنگیر تھا۔ کہ دوپہر کی ڈاک میں ایک اور بلٹی آ گئی۔ جان میں جان آئی۔ فوراً جا کر اسٹیشن سے بلٹی لے آیا۔ اور آدھ گھنٹہ لگا کر اسے کھولا۔ اور قطاروں میں لگا دیا۔

---

[1] صاحبِ مضمون گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں تنقید پروفیسر ہیں (ن۔م)

کسی کو کیا معلوم۔ کہ کھانے کے علاوہ آموں کی محبت کئی طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ میز پہ دھرے ہوئے آم تو ہر ایک کھا سکتا ہے اور ویسے تو جسے پوچھو آموں کا عاشق بنا پھرتا ہے چاہے طوطا پری اور دسہری میں تمیز نہ کر سکے۔ مجنوں دراصل تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ جو منڈی میں جا کر دیکھیں، چکھیں اور خریدیں۔ اور پھر ٹوکرے کو کھول کر پختگی کے مطابق نہیں لگائیں یا الماری میں سجائیں۔ کہ کونسی نہ یا قطار کل

تیار ہو گی اور کونسی پرسوں ؎

ایسے مزہ رہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں   پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے

کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے ٹھنڈے پانی یا برف میں لگائیں۔ اور پھر ایک خاص طریق سے کھائیں۔ یہ تمام تکلفات میں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ کسی کی کیا مجال کہ دست اندازی کرے۔ کاٹنے کی نسبت مجھے چوسنا زیادہ پسند ہے۔ ایک تو ہاتھ منہ آلودہ نہیں ہوتے۔ اور دوسرے زیادہ کھانے میں مدد ملتی ہے۔ اگر آم کھانے کا طریقہ سیکھنا ہو۔ تو کبھی میرے ساتھ کھائیے۔ مقابلے میں کبھی گھاٹے میں نہ رہیے گا۔

ابھی حضرت آدم کی جنت کا ذکر کر رہا تھا۔ بار بار خیال آتا ہے۔ کہ ہمارے بزرگ اول کو کیا سوجھی کہ سیب ہی کی خاطر حکم عدولی کا مرتکب ہوا۔ آم ہوتا تو کچھ بات بھی تھی۔ لیکن ہاں۔ آم کے بغیر جنت بھی کونسی رہنے کے لائق جگہ تھی۔ اور شاید باتوں باتوں میں حضرت عزازیل نے حوا اماں کے کانوں میں پھونک دیا ہو۔ کہ زمین پہ آم اگتے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ کامیابی یقینی تھی۔ آم کے بغیر جنت بھی جنت نہیں۔ اور آم کے ساتھ ہر گوشہ جنت ہے۔ اور ہندوستان تو جنت عظیم۔ اور یہ سال تو آموں کا ہی ہے۔ ہر سال میں کوئی خصوصیت ہوتی ہے جس سے وہ موسوم ہوتا ہے ۱۵۲۶ء مغلوں کی فتح کا سال تھا۔ ۱۷۵۷ء پلاسی کی لڑائی کا۔ ۱۸۵۷ء آزادی کی پہلی جنگ کا۔ ۱۹۴۷ء ہماری فتح کا۔ ۱۹۵۵ء آموں کا سال ہے۔ بہترین لنگڑے کا ٹوکرا اس دن میں نے ساڑھے پانچ آنے سیر خریدا۔ اب بتائیے کھانے کی کونسی چیز ساڑھے پانچ آنے سیر ملتی ہے۔ بھنڈی بارہ آنے سیر۔ کدو میاں بھی چھ آنے سیر بکتے ہیں۔ بی چنے کی دال بھی اتنی ارزاں نہیں۔ علم اقتصادیات بھی عجب چیز ہے۔ کہ لنگڑا تو ساڑھے پانچ آنے سیر بکے اور بھنڈی بارہ آنے سیر۔

یہ کہنا تو بھول ہی گیا۔ کہ آج کی بلٹی کے ساتھ معذرت درج تھی کہ فضلی آم بھیجے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اور کوئی قسم اب دستیاب نہیں۔ سلسلہ گفتگو میں جب موسم کا ذکر آنے لگے۔ تو مفہوم ہوتا ہے۔ کہ گفتگو بند کر دی جائے۔ آموں میں بھی جب فضلی آم کی نوبت پہنچے۔ تو کھانا بند کر دینا ہی بہتر ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

آپ کہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر   اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

فسانے میں آپ کی نیند تو اڑ گئی۔ کیا آپ کے کان پر جوں بھی رینگی یا نہیں۔ اگر نہیں رینگی۔ تو اپنی تنگدلی اور سنگدلی کی دوا کے لئے دعا کیجئے۔ اور اگر رینگی ہے۔ تو

معلوم ہے ہی آپ کو بندے کا ایڈریس

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ ۱۹۵۵ء کے آخر تک بحالیاتی مالی ادارہ نے پوربی اور پچھمی پاکستان کے بے گھر لوگوں میں نو کروڑ پچاسی لاکھ ننانوے ہزار روپے بطور قرض دئے ہیں۔

۲۔ اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت چار سو باون ہیلتھ سنٹر مختلف مقامات پر کھولے گئے ہیں۔

۳۔ بھارت سرکار نے ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوران میں کھادی اور دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے لئے پانچ کروڑ روپے کے عطیے اور ڈھائی کروڑ روپے کے قرضے آل انڈیا کھادی اور دیہاتی صنعتوں کے بورڈ کو دئے ہیں۔

۴۔ جزائر انڈیمان اور نکوبار میں اس وقت اکتیس پرائمری اسکول، دو مڈل اسکول اور ہائی اسکول ہیں۔

اطہر پرویز

کرنوں والا

"برلن کے ایک سائنس داں، ہرآٹو فاوسٹ نے ۱۲ دن کے اندر ایک ایسا ریڈیو بنایا ہے جو سورج کی کرنوں کی گرمی سے کام کرتا ہے۔ اس میں بجلی کی بیٹری یا تار کی تاربرقی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ریڈیو کا پچھلا حصہ کھول کر اس کو دھوپ میں رکھنا پڑتا ہے۔ دھوپ جتنی تیز ہوتی ہے آواز بھی اتنی ہی بلند ہو جاتی ہے۔ اس میں سورج کی گرمی اکٹھا کرنے والی مشین ہے جو سگار کے بکس کے برابر ہے۔"

روزنامہ "قومی آواز" مورخہ ۲۔ فروری ۱۹۹۵ء

آپ نے یہ خبر پڑھی۔ سورج کی روشنی کا ایک بڑا کارنامہ ——— بڑا کارنامہ میں نے اس لئے کہا کیونکہ سورج کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ دنیا ہے۔ سچ پوچھئے تو سورج ہی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہماری آپ کی یہ خوبصورت دنیا۔

ہم کوئلہ یا لکڑی، کھانا پکانے کے لئے جلاتے ہیں۔ یہ لکڑی یا کوئلہ کہاں سے آتا ہے؟ پرانے درخت جب کاٹ ڈالے جاتے ہیں تو اُن کا ایندھن ہی بنایا جاتا ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو یہ درخت بھی نہ اُگیں۔ آپ اگر اپنے باغ کے پودے کو دھوپ سے ہٹا کر کسی اندھیری جگہ پر رکھ دیں، ایسی جگہ جہاں سورج کی روشنی نہ پہنچ سکے تو پھر آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوگا یہی کہ آپ کا لہلہاتا ہوا سرسبز پودا مُرجھا جائے گا۔ اس سے پتہ چلا کہ پودوں کی زندگی سورج کے دم سے ہے۔ اب اگر پیڑ پودے نہ ہوں تو آگ کیسے جلے، ہم آپ کھانا کیسے پکائیں۔ پھل پھلاری کہاں سے لائیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو بجلی کا زمانہ ہے۔ ہم بجلی جلائیں گے اور بجلی کے چولھے سے اپنا کھانا پکائیں گے۔ لیکن بھائی بجلی کہاں سے آتی ہے؟ اگر سورج نہ ہو تو بجلی بھی نہ پیدا ہو سکے گی۔ سورج کی روشنی اور گرمی سے ہی تو سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے اور اوپر اُڑ کر بادل کی شکل میں ہمیں نظر آتا ہے اور یہی بادل جھم جھم مینہ برساتے ہیں۔ اور پھر یہ پانی کہاں جاتا ہے؟ یہی پانی بہتا ہوا دریا میں چلا جاتا ہے، اور اسی پانی سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر پانی نہ ہو تو بجلی بھی نہ پیدا ہو، اور یہی نہیں، یہ ہوا جس سے ہم سانس لیتے ہیں

یہ خود بھی سورج کی دھوپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر سورج ختم ہو جائے تو یہ ہوا بھی ختم ہو جائے گی، اور ہماری آپ کی یہ دنیا بالکل ٹھنڈی، اندھیری اور مردہ دنیا ہوگی۔ جہاں نہ پھل پھول اور پودے ہوں گے، نہ آگ، پانی اور ہوا ہوگی اور نہ جانور، کیڑے، مکوڑے اور انسان ہوں گے۔ پھر یہ دنیا کیسی ہوگی ——— ؟ بہت بُری ——— یا جہاں زندگی نہ ہو وہاں کیا ہو سکتا ہے نہ اچھا نہ بُرا۔

آپ نے غور کیا کہ یہ سورج جس کو ہم دن بھر چمکتا دیکھتے ہیں، کتنا اہم ہے۔ اسی کے دم سے سارا ظہور ہے، اور جب یہ اتنا اہم ہے تو آئیے اس کے بارے میں اور باتیں معلوم کریں۔

لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ ایسا ہی ایک ستارہ جو آپ رات کے وقت آسمان پر ہزاروں لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں کی تعداد میں دیکھتے ہیں، لیکن آپ کہیں گے "نا بھائی، سورج اگر ستارہ ہے تو پھر اتنا بڑا کیوں ——— ستارہ تو ننھا منّا سا ہوتا ہے۔"

آپ کا خیال بھی ٹھیک ہی ہے۔ لیکن بھئی ننھا منّا تو یہ اس لئے نظر نہیں آتا کیونکہ دوسرے ستاروں کے مقابلے میں اس کا فاصلہ زمین سے بہت کم ہے۔ آپ یہ سن کر اور بھی چونک پڑیں گے کہ آسمان پر ان گنت ستارے تو ایسے ہیں جو سورج سے بھی بڑے ہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ زیادہ دور کی چیز چھوٹی نظر آتی ہے، یہاں تک کہ اگر فاصلہ زیادہ ہو تو چھوٹا ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تو آپ کو سورج کے مقابلے میں وہ ستارے زیادہ

چھوٹے نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ سورج کے فاصلے سے بھی کئی لاکھ گنا زیادہ فاصلے پر ہیں۔ ہاں تو سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ ستارے کی خصوصیت کیا ہے۔ ستارے کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ وہ روشنی کے لیے کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ اور ستارے اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں اور سیارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ہماری زمین جو ایک سیارہ ہے۔ ہماری زمین بھی اور دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے اردگرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اور اس کا آدھا حصہ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا ہے۔ جس آدھے حصے پر روشنی پڑتی ہے وہاں دن ہوتا ہے، اور دوسرے حصے میں رات۔ چونکہ سیاروں کی اپنی روشنی نہیں ہوتی اس لیے ان کو سورج کی روشنی کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہماری زمین کو ملا کر کل نو سیارے ہیں جو سورج کے اردگرد ہماری زمین کی طرح چکر لگاتے ہیں۔

سورج کی کہانی جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی عجیب و غریب بھی۔ اب کون آسانی سے یقین کرے گا کہ ہماری زمین سے اس کا فاصلہ ۹۳،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے۔ یہ فاصلہ ہمارے خیال میں بھی نہیں سماتا۔ لیکن بھئی یہ بات سچ ہے، سورج کا فاصلہ واقعی نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ آئیے ذرا اس فاصلے پر اور زیادہ غور کریں۔ یوں سمجھیے کہ اگر ہم چار سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑنے والے جہاز سے سورج کی طرف جائیں اور ایک لمحے کے لیے بھی جہاز کی رفتار کو کم نہ کریں، تو ہم سورج کے پاس تیس سال کے عرصے میں پہنچ سکتے ہیں۔ اور رات کے وقت جو ستارے ہمیں نظر آتے ہیں وہ اس سے ہزاروں گنا زیادہ فاصلے پر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اتنے چھوٹے نظر آتے ہیں، اور بعض تو ہمیں نظر بھی نہیں آتے۔ انھیں ہم بہت بڑی اور طاقت ور دوربین کے ذریعے ہی دیکھ سکتے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر تو سورج سے بھی بڑے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ سورج ہم سے کتنا دور ہے لیکن اس کے باوجود ہم کو کافی بڑا نظر آتا ہے۔ تو بھئی اس کا وزن کیا ہوگا۔ وزن — ارے بھائی اس کا وزن منوں اور ٹنوں میں تو نہیں ہو سکتا۔ اس کے وزن کا اندازہ یوں سمجھیے کہ ہماری زمین کتنی بڑی ہے۔ اگر ہماری زمین جیسی تین لاکھ تیس ہزار (۳۳۰،۰۰۰) زمینیں رکھ دی جائیں تو پھر کہیں جاکر سورج کے وزن کے برابر ہوں گی۔

افوہ! کتنا بڑا ہے، اور دیکھیے تصور کیجیے، مئی جون کے مہینے میں کتنی گرمی پڑتی ہے۔ اچھا ہی ہے جو یہ سورج ہم سے اتنے فاصلے پر ہے۔ اگر قریب ہوتا تو پھر ہم آپ زندہ بھی نہ رہتے، اسی دھوپ میں جل کر مر جاتے۔ آپ جانتے ہیں کہ سورج خود کتنا گرم ہے، اس کا درجۂ حرارت ۱۱۰۰۰ ڈگری ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جب کبھی کسی شہر کا درجۂ حرارت ۱۱۰ ڈگری ہو جاتا ہے تو وہاں موتیں شروع ہو جاتی ہیں، تو پھر بتائیے کہ گیارہ ہزار ڈگری کی حرارت میں کون زندہ رہ سکتا ہے۔

کتنا انوکھا ہے یہ سورج   ہمیں تو چکا چوندی ہونے لگی۔

احسان برہان پوری

غزل

اے آتشِ غم اتنا تو بتا، کیا تجھ سے بھی سوزش میں ہے سوا
وہ آگ، جسے پی کر چشمِ مے خوار سے شعلے اٹھتے ہیں

ہر گُل ہے دہکتا انگارہ، ہر غنچہ بہاروں کا مارا
ہائے یہ سلگتا نظارہ، گلزار سے شعلے اٹھتے ہیں

احساس بھڑک اٹھتا ہے کبھی، اشکوں کی جھڑی میں یوں جیسے
الہام کی بارش میں خُلدِ افکار سے شعلے اٹھتے ہیں

خود پھول برسنے لگتے ہیں اس وقت بقدرِ ذوقِ طلب
جس وقت محبت کی راہِ پُرخار سے شعلے اٹھتے ہیں

میں ایک نظر میں کیا دیکھوں جنت کہ جہنم اُف یہ ستم!
زلفوں میں گھٹاؤں کا عالم، رخسار سے شعلے اٹھتے ہیں

ظفر علی سید

ایگزیلیری کیڈٹ کور

رسکن نے جو کہ نوعِ انسان کا سچا پرستار تھا، ایک کتاب میں بار بار دہرایا ہے کہ خوش حال اور تندرست لوگ ہی ملک کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ کسی ملک کی اصلی طاقت اُس کے مادی خزائن میں پوشیدہ نہیں بلکہ عوام میں مضمر ہے ——— اور قوم کا صحیح سرمایہ اس کے بچے ہیں۔ آج کے بچے کل کے قائد ہوں گے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ بچوں کی صحیح تربیت ہی ملک و قوم کی تعمیر ہے۔

اس سلئے دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں اور ماہرینِ تعلیم نے بچوں کی تعلیم و تربیت ہی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ جان لاک اور روسو نے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر اپنے افکار کے مطابق کافی روشنی ڈالی ہے۔

جان لاک کے خیال میں تعلیم کے تین اہم پہلو ہیں (۱) جسمانی (۲) اخلاقی (۳) دماغی۔ جن میں سے جسمانی تعلیم کو وہ سب سے زیادہ ضروری اور اہم خیال کرتا ہے۔ اپنی کتاب Thoughts on Education میں اُس نے لکھا ہے۔

"ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہی اس دنیا میں خوش حالی کی مختصر مگر جامع تشریح ہے۔ جسے یہ دونوں میسر ہوں، اُسے شاید ہی اور کسی چیز کی خواہش ہو، اور جس میں ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو وہ ناقص ہے"

دماغی اور جسمانی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"جسم کو مضبوط اور توانا رکھو تاکہ وہ دماغ کا حکم ماننے اور اس پر عمل کرنے کے قابل ہو"

روسو نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف Emile میں کہا ہے۔

"تمام شر و فساد کمزوری سے پیدا ہوتے ہیں"

ہمارے ملک کے مدبرین نے بھی ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جسمانی تربیت کو بچوں کی تعلیم کا ایک لازمی جزو قرار دے دیا ہے۔

اور اسی مقصد کے لئے کئی تحریکیں مثلاً بوائے اسکاؤٹ، گائڈز، بالکان جی باڑی، این سی سی وغیرہ جاری کی گئیں، مگر چند وجوہ کی بنا پر یہ بچوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچانے میں قاصر رہیں، اس لئے ہند سرکار نے ملک میں ایک نئی تحریک "آگزیلری کیڈٹ کور" کے نام سے جاری کی۔ جسے "اے۔ سی۔ سی" بھی کہتے ہیں۔

اس کا مقصد "دیش سیوا" ہے، اور ذیل کے نظریات اس کے بنیادی اصول ہیں۔

۱۔ بچوں کو اخلاقی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تربیت دینا، انھیں ایک عمدہ شہری بنانا اور اُن میں قیادت کا جذبہ پیدا کرنا۔

۲۔ ان میں حبِ وطن کے جذبات کو بڑھانا۔

۳۔ خود اعتمادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا کرنا اور انھیں سماج سیوا کے لئے تیار کرنا۔

۴۔ ان میں ایسے خیالات پیدا کرنا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں شرم اور جھجک محسوس نہ کریں۔

یہ تمام ہائی اسکولوں میں جاری کی گئی ہے۔ اس میں بارہ سال سے زیادہ عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل کئے جاتے ہیں۔ میڈیکل امتحان (طبی معائنہ) کے بعد ان سے حلف لیا جاتا ہے کہ وہ دیش اور قوم کی سیوا کے لئے ہمیشہ تیار رہیں گے۔ پریڈز میں باقاعدگی سے حاضر ہوں گے اور تمام احکامات کی حتی المقدور پابندی کریں گے۔

چونکہ طلبا اور اساتذہ میں محبت و شفقت کا رشتہ ہوتا ہے وہ ایک دوسرے سے بڑے قریب ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ کام فوجی اشخاص کے سپرد نہ کرتے ہوئے موزوں اور صحت مند اساتذہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ چونکہ فوجی افسروں کی زیرِ نگرانی اسی غرض سے ٹریننگ کئے گئے ہیں، ان کو اے سی سی آفیسر کہتے ہیں۔

بچوں میں **Esperit-Corps** کا جذبہ، ڈسپلن، جوش اور اُمنگ پیدا کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے یونی فارم دیا جائے گا، طلبا واُ اساتذہ کے یونی فارم میں نیکر، شرٹ، کینواس شوز اور موزے شامل ہیں اور لڑکیوں کے لئے۔

ا۔ سفید شلوار اور سفید قمیص۔

ب۔ سفید بلاؤز اور سفید سکرٹ۔

ج۔ سفید بلاؤز اور سفید یا سکرٹ چوڑی نیلے حاشیے والی ساری اور کینواس شوز ہیں۔

ٹریننگ کا نصاب حسب ذیل ہے۔

۱۔ ماس فزیکل ٹریننگ۔

۲۔ ماس ڈرل

۳۔ روٹ مارچ

۴۔ ٹیم گیمیں

۵۔ فرسٹ ایڈ

۶۔ صفائی اور حفظانِ صحت

۷۔ آگ بجھانا

۸۔ تیراکی اور ڈوبتے کو بچانے کے طریقے

۹۔ بھیڑ کی روک تھام

۱۰۔ شہریت

کیمپ

اس کے علاوہ شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر کھلی فضا میں کیمپ ہوں گے۔ یہ کیمپ کسی تاریخی جغرافیائی یا کسی مشہور مقام پر ہوں تو بہتر ہے، ہر ماہ ایک ایک روز کا آخر ہفتہ کا کیمپ ہوگا، اور ہر کیڈٹ ہر ٹرم کے اختتام پر تین روز کا کیمپ ہوگا۔

بنیادی تنظیم

اگزیلری کیڈٹ کور کی اکائی "ایک سیکشن" ہے جس میں پچاس کیڈٹ (طلبا) ہوتے ہیں۔ ان کو ٹریننگ دینے والے استاد "سیکشن لیڈر" کہلاتے ہیں۔ آسانی کے لئے سیکشن کو دو "سب سیکشن" میں تقسیم کیا جاتا ہے جس میں ۲۴ کیڈٹ اور ایک "سب سیکشن سارجنٹ" ہوتا ہے۔ یہ سارجنٹ کیڈٹ ہی ہوتا ہے۔

ایک مدرسے میں لڑکوں کی تعداد کے مطابق کئی سیکشن ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ سب مل کر "اگزیلری کیڈٹ کور کا "گروپ" کہلاتے ہیں جس کی کمان "گروپ کمانڈر" کرتا ہے، جو کہ سینئر مدرس ہوتا ہے۔ اُن کی مدد کے لئے ایک دو سے مدد "ڈپٹی گروپ کمانڈر" کہلاتے ہیں۔

ہر کیڈٹ اور آفیسر اے، سی، سی" کر لیبٹ لگائیں گے۔ اس کے علاوہ ذیل کے بیج ہوں گے۔

۱۔ سب سیکشن سارجنٹ	۱	اشوک چکر
۲۔ سیکشن لیڈر	۲	" "
۳۔ ڈپٹی گروپ کمانڈر	۳	" "
۴۔ گروپ کمانڈر	۱	اشوک کا شیر

ڈیفینس منسٹری (وزارتِ دفاع) کے ایما پر نیشنل کیڈٹ کور ڈائرکٹر این، سی، سی کے تجربات کی روشنی میں اگزیلری کیڈٹ کور کو چلاتے ہیں۔ انسٹرکشنل اسٹاف، ٹریننگ پروگرام کی ترتیب، این سی سی کا اسٹاف کرتا ہے۔ جسے گورنمنٹ آف انڈیا آسانیاں مہیا کرتی ہے۔

اے۔ سی۔ سی مختلف کمیونٹی پروجیکٹ علاقوں، ڈیولوپمنٹ بلاک میں بھی کام کرے گی جس کے انتظامات کمیونٹی پروجیکٹ کے منتظمین اور این، سی، سی کے افسر کریں گے۔

حالات اور تجربات کے پیش نظر نصاب میں تبدیلیاں کی جائیں گی۔ جیسے پار سال لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹریننگ میں کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا گیا تھا۔ مگر امسال کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں —— روٹ مارچ، تیراکی، بھیڑ کی روک تھام کو لڑکیوں کے نصاب سے خارج کر کے ذیل کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

۱۔ ہوم نرسنگ

۲۔ چائلڈ ویلفیر

۳۔ آگ بجھانے کی نظری تعلیم

۴۔ لوک ناچ اور لوک گیت

۵۔ باغبانی، کشیدہ کاری، ڈرائینگ، مصوری اور ایسے مضامین جو لڑکیوں کے مذاق اور دلچسپی کے مطابق ہوں۔

نجم آفندی

بھارت دیس

بھارت سب کی آنکھ کا تارا — گنگا جمنی دیس ہمارا
ہندو ہو یا مسلم کوئی — اپنا گھر ہے سب کو پیارا
سب نے کی ہے سیوا جس کی — سب نے مل کر جس کو سنوارا
جس کے کارن گاندھی جی نے — تن بھی وارا، من بھی وارا
گرمی نیاری سردی پیاری — برکھا جیسے امرت دھارا
کھیتوں والا، باغوں والا — آشاؤں کا پالن ہارا
پورب پچھم اتر دکھن — چاروں اور بسے اجیارا
میٹھے پھل اور پھول سجیلے — آم ہے میوہ خاص ہمارا
اونچا سب سے ہمالا پربت — تن سنگھ جس پر چڑھ کے پکارا
اک دن اپنا دیس بنے گا — سارے جگ کا پریم سہارا

امر چند قیس جالندھری

انوکھا شیر

کردار :-

اورنگ زیب —— مغلیہ شہنشاہ

جس ونت سنگھ —— ایک سردار

پرتھوی سنگھ —— جس ونت سنگھ کا لڑکا

درباری —— دربان ——

شکاری —— حاضرین ——

[مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا دربار آراستہ ہے امیر وزیر قرینے اور ادب سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ دربان احترام کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے —]

دربان ۔ جہاں پناہ! جنگل کے کچھ باشندے جنگل کے بادشاہ کو پنجرے میں قید کرکے لائے ہیں ۔ اسے وہ آپ کی نذر کرنا چاہتے ہیں ۔

اورنگ زیب ۔ انھیں اپنے نذرانے کے ساتھ ابھی پیش کرو ۔

[دربان جاتا ہے ۔ شکاری اور شیر کا داخلہ]

— اُف! کتنا خوف ناک تُند اور دلیر ہے ۔ یہ شیر تو اس سے بھی زیادہ خوں خوار ہے جسے ہم نے نماز پڑھتے وقت شمشیر کے گھاٹ اُتارا تھا ۔

ایک درباری ۔ عالی جاہ! واقعی ہماری نظر سے تو اتنا بڑا خطرناک جانور آج تک نہیں گزرا ۔

دوسرا ۔ ہم بھی تو کئی دفعہ حضور کے ساتھ شکار میں شریک ہوتے ہیں — لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا شہ زور شیر کبھی نظر سے نہیں گزرا ۔
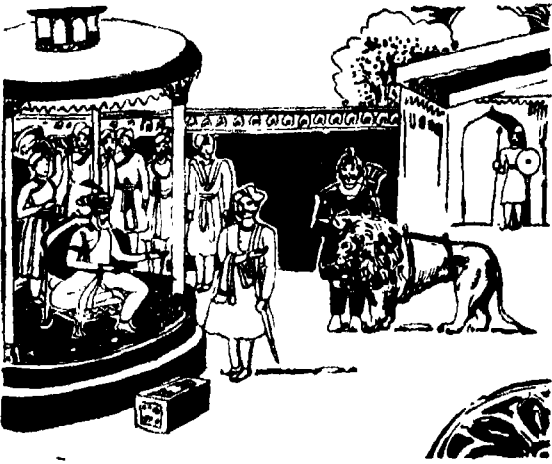
تیسرا ۔ دیکھئے تو پنجرے میں کس شان سے گرج رہا ہے ۔

چوتھا ۔ گویا ابھی پنجرے کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل آئے گا ۔

پہلا ۔ اُف! کس قدر غضب ناک ہو رہا ہے ۔ آنکھوں سے شعلے برستے ہیں ۔

اورنگ زیب ۔ یہ شیر کہاں سے پکڑا بھئی! تم نے ؟

شکاری ۔ عالم پناہ! اس نے جنگل میں اودھم مچا رکھا تھا ۔ اب کی بارش نہ ہونے کی وجہ سے پانی کی تلاش میں پہاڑ سے نیچے اُتر آیا ۔ اس کی مادہ بھی ساتھ تھی ۔ اُسے ہم نے ہلاک کر دیا ۔ یہ ہے اس کی کھال ۔

اورنگ زیب ۔ مادہ کا قد بھی بہت بڑا ہے کیتنی شان دار ہے یہ کھال — علاقے میں کوئی نقصان تو نہیں ہوا ؟

شکاری ۔ کچھ نہ پوچھئے عالی جاہ! اس نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا ۔ گھر سے باہر نکلنے کی جرأت کسے ہوتی تھی ؟ بہت سی انسانی زندگیوں کے علاوہ مویشیوں

کی جانوں کا بھی نقصان ہوا ہے ۔
اورنگ زیب ۔ ٹھہرو ۔ تمھیں شاہی خزانے سے انعام دیا جاتا ہے .... لیکن تم ابھی تک خاموش ہو ؟ جس ونت سنگھ !
کیا بات ہے ؟
جس ونت سنگھ ۔ کچھ نہیں ان داتا !
اورنگ زیب ۔ آخر یہ سکوت ؟ کیا تمھیں ہم سب سے اختلاف ہے ؟
جس ونت سنگھ ۔ کیا عرض کروں ۔
اورنگ زیب ۔ کیوں ؟ کچھ تو کہو ۔ کیا تمھیں ایسا خوف ناک درندہ آج سے پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ؟
جس ونت سنگھ ۔ کیوں نہیں ؟ حضور ! یہ کیا چیز ہے ؟
اورنگ زیب ۔ اچھا ! کب اور کہاں ؟
جس ونت سنگھ ۔ غریب پرور ! اب بھی وہ میرے پاس ہے ۔
اورنگ زیب ۔ اب بھی وہ تمھارے پاس ہے ؟ ہم نے تو کبھی دیکھا نہیں اور نہ ہی سُنا ہے کہ تمھارے پاس بھی کوئی شیر ہے ۔
جس ونت سنگھ ۔ میرا شیر اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے ۔
ایک درباری ۔ حضور ! یہ محض گپ ہے ۔
جس ونت سنگھ ۔ گپ ہے ؟ ابھی آزمائش ہو جاتی ہے ....
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ؟
.... دونوں شیروں کی کشتی دیکھ لی جائے ۔
اورنگ زیب ۔ ہم ابھی تماشا دیکھیں گے ۔ لیکن اگر تمھارے شیر کو شکست ہو گئی ؟
جس ونت سنگھ ۔ یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے ؟ میرا شیر اسے یقیناً پچھاڑ دے گا ۔ لیکن بہ فرض محال اگر ایسا ہو بھی گیا تو میں اسی وقت اس دربار میں اپنی گردن کاٹ کے رکھ دوں گا ۔
اورنگ زیب ۔ (اُمرا سے) ابھی وسیع میدان کا انتظام کرو جنگلہ وغیرہ تیار ہو جائے ۔ احتیاط کے ساتھ تمام حفاظتی تدابیر عمل میں لاؤ ۔ ہم ابھی کشتی دیکھیں گے ....
[جس ونت سنگھ سے] سردار ! تم جا کر اپنے شیر کو لا سکتے ہو ۔
جس ونت سنگھ ۔ جہاں پناہ ! میرا شیر ہر وقت تیار ہے ۔ آپ مناسب انتظامات کی تکمیل کرا لیں ۔ یہاں کوئی دیر نہیں ۔

[وسیع میدان کے درمیان لمبی لمبی سلاخوں کا مضبوط جنگلہ ۔ جس میں صرف دو دروازے ہیں ۔ ایک دروازے کے ساتھ جنگلی شیر کے پنجرے کا دروازہ کھلتا ہے ۔ دوسرا دروازہ دوسرے شیر کے داخلے کے لئے ہے ۔ حاضرین حیرت سے تک رہے ہیں]
اورنگ زیب ۔ جس ونت سنگھ ! کہاں ہے تمھارا شیر ؟ لاؤ اب اسے
جس ونت سنگھ ۔ ابھی وہ میدان میں کود پڑے گا ۔ شیر کے پنجرے کا دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرمائیں ۔ حضور !
اورنگ زیب ۔ مگر تمھیں شرط کا بھی خیال ہے ؟
جس ونت سنگھ ۔ مجھے اپنی زبان کا پاس ہے ۔ میں پھر اپنے الفاظ اس دربار میں دُہراتا ہوں کہ اگر خدا نہ خواستہ میرے شیر کو شکست کا مُنہ دیکھنا نصیب ہو تو میری گردن کاٹ کر جسم سے الگ کر دی جائے ۔ مجھے کوئی عُذر نہ ہوگا ۔
اورنگ زیب ۔ شکاری ! پنجرے کا دروازہ کھول دے ۔
شکاری ۔ بندہ نواز ! مقابلہ پر تو ....
جس ونت سنگھ ۔ تجھے اس سے کیا ؟ تو اپنے فرض کی طرف توجہ دے ۔ شاہی فرمان کی تعمیل ہی تیرا کام ہے ۔

[شکاری پنجرے کا دروازہ کھول دیتا ہے]

—— بیٹا پرتھوی! اب نکل تو میدان میں ذرا۔ دیکھ تیرا حریف کس طرح گرج گرج کر تجھے للکار رہا ہے۔

[شیر کی گرج]

اورنگ زیب۔ یہ ہے تمھارا شیر؟ اب ہم سمجھے۔

سرگوشیاں۔ اس کم سِن بچّے کو موت کے مُنہ سے بچاؤ۔

ایک مدھم آواز۔ ابھی تو اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ہے۔

دُوسری آواز۔ اُف! باپ کا کلیجہ!

جس ونت سنگھ۔ پرتھوی! دیکھتا کیا ہے بیٹا! اس موذی کو ایسی نیند سُلا دے جس سے کوئی آنکھ بیدار ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

پرتھوی سنگھ۔ [تلوار میان سے سونت کر] اس تلوار کے ایک ہی ہاتھ سے ابھی اس کا کام تمام کر دوں گا۔

جس ونت سنگھ۔ کیا کرتا ہے؟ اسے میان میں ڈال۔ جنگ کے اصولوں سے بھی واقف نہیں؟ ہوش کر نہتے دشمن پر ہتھیار کے ساتھ حملہ کر دینا کہاں کا دھرم ہے؟

پرتھوی سنگھ۔ بھول گیا۔ پتاجی! معاف کر دیجئے۔

[تلوار پھینک دیتا ہے]

جس ونت سنگھ۔ ہاں۔ راجپوتی آن پر آنچ نہ آئے۔ شاباش۔

[شیر پرتھوی سنگھ کی طرف لپکتا ہے۔ مگر پرتھوی سنگھ جبڑوں کو پکڑ کر چیر دیتا ہے۔ شیر دم توڑتا ہوا درد سے کراہتا ہے۔ سہمے ہوئے حاضرین کے چہرے خوشی سے چمک اٹھتے ہیں اور وہ بے اختیار نعرے لگاتے ہیں]

ایک۔ سردار جس ونت سنگھ کی ——

باقی۔ جے

دوسرا۔ کمار پرتھوی سنگھ کی....

باقی۔ جے

پرتھوی سنگھ۔ [قدموں میں جُھک کر] پتاجی! پرنام

جس ونت سنگھ۔ شاباش۔ آ بیٹا! تجھے سینے سے لگا لوں۔
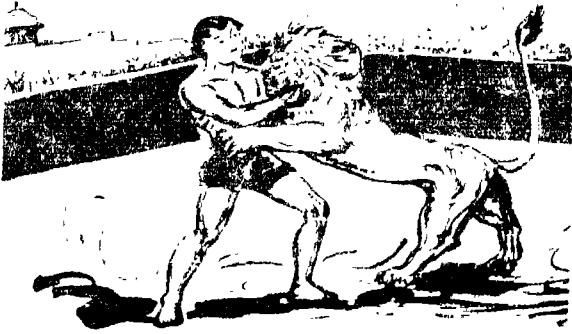
اورنگ زیب۔ [دل ہی دل میں] کتنا من چلا ہے یہ کم سِن لڑکا... یہ راجپوت تو موت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ اپنی آن کے لئے جان پر بھی کھیل جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے... کاش!

[پرتھوی سنگھ تعظیم کے لئے اورنگ زیب کے تخت کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے]

—— زندہ باش۔ پرتھوی! ہم تیرے دلیرانہ کارنامے سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ عزیز! کیا انعام دیا جائے تجھے؟

پرتھوی سنگھ۔ مَیں نے پتاجی کے ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ فرض کسی انعام کی تمنّا نہیں رکھتا۔ وہ ایسی توقعات سے بے نیاز رہتا ہے۔ آپ کی ہر طرح نوازش ہے۔ شکریہ!

اورنگ زیب۔ اچھا۔ آج شام ہمارے محل میں آنا...

[دل ہی دل میں] یہ راجپوت لڑکا غضب کا دلیر تو ہے ہی۔ اخلاق کے زیور سے بھی اس کی طبیعت خوب آراستہ ہے۔

[پردہ]

وحید قیصر

نادان خرگوش

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نادان خرگوش رات کے وقت جنگل میں اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے اُڑتے پھرتے تھے۔ چاند کی روشنی میں جنگل کی ہر چیز نور میں ڈھلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ خرگوش کو یہ سماں بڑا پیارا لگ رہا تھا اور وہ مست ہو ہو کر چھلانگیں لگا رہا تھا کہ اچانک اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔

جوں ہی وہ ناریل کے ایک درخت کے نیچے سے گزرا درخت سے ایک ناریل ٹوٹ کر اس کے سر پر آلگا۔ اس پر دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ چاند کے رُخ پر بادل آجانے کے سبب جنگل میں گھُپ اندھیرا ہو گیا۔ خرگوش نے سمجھا کہ شاید آسمان سے چاند ٹوٹ کر اس کے سر پر آلگا ہے۔ جبھی تو ہر طرف اندھیرا ہو گیا۔

بس اب کیا تھا۔ وہ سر پہ پیر رکھ کر وہاں سے چیختا چلاّتا بھاگ کھڑا ہوا۔ راستہ میں ایک جگہ گلہری سے اس کا سامنا ہو گیا۔ گلہری نے اسے اس بدحواسی سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو وجہ پوچھی۔

"اے بہن کیا پوچھتی ہو"! وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولا "تم نے دیکھا ابھی تھوڑی دیر پہلے چاند آسمان پر چمک رہا تھا"۔

"ہاں ہاں۔ چاند کو چمکتے ہوئے تو میں نے بھی دیکھا"۔ گلہری نے اس کی بات کی تائید کی۔

بس وہی چاند ٹوٹ کر ابھی ابھی میرے سر پر آلگا ہے۔ یقین نہ ہو تو دیکھ لو۔ میرا سر بھی زخمی ہو گیا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ سر ثابت ہی رہا پھوٹ نہیں گیا۔

خرگوش کی باتیں سُن کر گلہری نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو اُسے وہاں سچ مچ ورم سا معلوم ہوا۔ ادھر آسمان پر چاند بھی غائب تھا۔ چنانچہ اسے خرگوش کی بات کا پورا پورا یقین آگیا اور اُس نے خرگوش کو زندہ بچ رہنے پر مبارکباد دی۔

"ہمیں جلد از جلد یہ خبر جنگل کی برادری کے ہر فرد تک پہنچا دینی چاہیے"۔ گلہری نے اسے مشورہ دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور" خرگوش نے کہا اور دونوں یہ خبر لئے سب سے پہلے اُلّو کے پاس پہنچے۔

"بوڑھے فلسفی! بوڑھے فلسفی"! گلہری اُلّو کے قریب جاتے ہی چلاّئی "کچھ سُنا تم نے؟ یہ جو آسمان پہ چمکتا ہے نہ چاند۔ یہ ابھی ابھی ٹوٹ کر میرے دوست خرگوش کی کھوپڑی پر آلگا ہے۔ جبھی تو تمام جنگل میں یکایک اندھیرا ہو گیا ہے"!

"ہائیں۔ کیا کہا؟ کیا سچ کہتی ہو!" اُلّو یہ خبر سُن کر چونک اٹھا

"ہاں ہاں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ چاند میرے سر پر آ لگا ہے۔ میرا سر ابھی تک درد کر رہا ہے"۔ خرگوش نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اگر تمھاری خبر درست ہے تب تو بہت بُرا ہوا ہمیں جلدی سے سب کو اکٹھا کر کے سوچنا ہوگا کہ کس طرح دوبارہ چاند کو اس کی اصل جگہ پر لگایا جائے"؟ اُلّو نے پریشان ہوتے ہوئے کہا اور ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

تینوں چلتے چلتے چوہے کے گھر تک پہنچے اور اسے بھی یہی خبر سنائی۔ چوہا یہ خبر سُنتے ہی ایک دم اپنی جگہ پر اُچھل پڑا اور بوکھلاتے ہوئے بولا۔

"کیا تم سچ کہتے ہو؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے"؟

آخر جب جنگل کی تمام برادری اکٹھی ہو گئی تو اُنھوں نے ناریل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ ٹوٹے ہوئے چاند کو دوبارہ آسمان پر کس طرح لگایا جائے کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ اگر چاند کو آسمان پر واپس نہ لگایا جا سکا تو ان کی راتیں کبھی جگمگا نہ سکیں گی۔

ابھی وہ سب بیٹھے سوچ بچار کر ہی رہے تھے۔ کہ تیز ہوا چلی اور درخت سے چند ناریل ٹوٹ کر ان کے سروں پر آ لگے۔

"خرگوش کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ضرور وہ بھی ناریل ہوگا جو اس کے سر پر لگا ہے"۔ سب نے بیک آواز کہا۔

نہیں میں اتنا احمق بھی نہیں کہ چاند اور ناریل کا فرق بھی نہ سمجھ سکوں۔ خرگوش غصّہ سے تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کیا تمھاری نظر میں ہم سب جھوٹے ہیں"؟ تینوں کرخت آواز میں بولے اور چوہے کو مجبوراً ان کی بات کا اعتبار کرنا پڑا۔

اسی طرح وہ باری باری جنگل کے تمام جانوروں کے پاس یہ خبر لے کر پہنچے۔ ہر ایک نے اس خبر کو تعجب سے سُنا اور خرگوش سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔

عین اسی وقت چاند کے رُخ پر سے بادل ہٹ گئے اور چاند پھر پہلے کی طرح آسمان پر چمکنے لگا۔

یہ دیکھ کر تمام جانوروں نے خرگوش کی حماقت پر ایک قہقہہ لگایا۔ اور خرگوش شرم سے مُنہ چھپا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

سچ ہے بے سوچے سمجھے بات کرنے والوں کو آخر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

محمد اسلم خواجہ

دروازہ بند کردو

چند کام کرنے والے

رامو - ایک کسان   آشا - رامو کی بیوی

جگو - ایک حجام   وقت - سہ پہر شام

منظر - رامو اور آشا دونوں دن بھر کھیت میں کام کرنے کے بعد تھکن سے چُور ہو کر آگ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں - آشا توے پر سے آخری روٹی اُتار رہی ہے' رامو بھوک کے مارے بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہے - اور آخر کار بھوک سے بے قابو ہو کر جلدی جلدی اپنے آپ ہی کچے سالن کی دیگچی اتار کر روٹی کے بڑے بڑے نوالے توڑ کر کھانے لگا - کھانا کھا چکنے کے بعد پانی پی کر آشا سے کہتا ہے

رامو - آشا ! ذرا دروازہ بند کردو -

آشا - تم ہی بند کردو' میں ذرا تھکی ہوئی ہوں -

رامو - نہیں تم ہی اُٹھ بیٹھو میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں -

آشا - مجھ میں اس وقت ذرا سکت نہیں - ہلنے کو بھی جی نہیں چاہتا -

رامو - (اپنی بیوی سے لڑنا نہیں چاہتا تھا - اس لئے فوراً بولا) اچھا دیکھو ! تھکے ہوئے تو دونوں ہیں - لیکن اب جو پہلے بولے گا اُسی کو اُٹھ کر دروازہ بند کرنا پڑے گا -

اس کے بعد گہری خاموشی طاری ہوگئی - خاموش رہنا بظاہر مشکل نہیں اس لئے اس پر دونوں شدت سے عامل نظر آتے تھے - شام ہوگئی رات ہوگئی اور دونوں بدستور مُنہ سے کچھ نہ بولے اور خاموشی سے اپنے اپنے پلنگوں پر جا کر لیٹ رہے دروازہ اُسی طرح کھلا رہا - آدھی رات کے قریب گھر میں ایک کُتا گھس آیا - اور ساری روٹیاں ایک ہی مُنہ میں دبا کر چلتا بنا - کُتے کی آہٹ سے برتنوں کے کھڑکھڑانے سے آشا کی آنکھ کھل گئی - آشا اس کے پیچھے بھاگی اور اسے بھگا کر پھر واپس اپنے پلنگ پر آگئی - مگر مُنہ سے کچھ نہ بولی - اس طرح صبح ہوگئی -
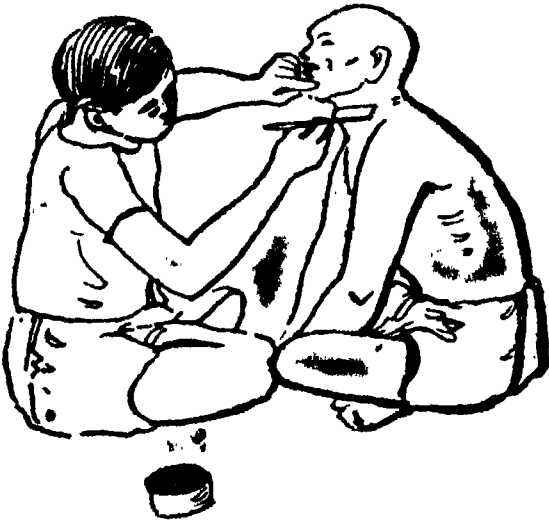
آشا اپنی پڑوسن کے پاس آٹا لینے چلی گئی - رامو ایک مونڈھے پر دُھوپ کھانے کے لئے گھر کے سامنے بیٹھ گیا - اتنے میں جگو حجام آگیا -

حجام - ہجور ! بال بنا دوں ؟

مگر رامو خاموش بیٹھا رہا اور مُنہ سے کچھ نہ بولا - جگو نے خود ہی بال کاٹنے شروع کردئے اور پھر پوچھا -

حجام - کیا انگریجی بال بناؤں یا سب کاٹ دوں -

رامو - پھر بھی چُپ رہا تو حجو نے خود ہی سب بالوں کا صفایا شروع کر دیا رامو نے گردن بھی نہ ہلائی، اور غمگین صورت سے بالوں کا یہ عبرتناک حشر دیکھتا رہا، اتنے میں حجو پھر بول اُٹھا -

حجام - ہجور! کیا آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے ؟

رامو پھر بھی خاموش رہا مگر یہ سوچنے لگا کہ واقعی اس کی طبیعت خراب تو نہیں - اُدھر حجو کو شرارت سُوجھی تو اس نے چولھے کی راکھ پانی میں گھول کر اُس کے سر سے مل دی اور ساتھ ہی بولا -

حجام - اس سے سر ہلکا ہو جائے گا سب جُوئیں مر جائیں گی - پھر وہی راکھ بھرے ہاتھ مُنہ پر مل کر کہنے لگا -

حجام - چہرے کی چھائیاں بھی اس سے دُور ہو جاتی ہیں!

حجام کی آواز سُن کر آشا بھی آ گئی اور بے اختیار مُنہ سے نکل گیا -

آشا - ارے یہ کیا تماشہ ہے ---- حجو یہ کیا کر رہا ہے ؟

رامو - (خوشی سے اچھل کر) دروازہ بند کر دو! (پردہ)

کام کی باتیں

(۱) ہر وقت ایک خوشگوار خیالی نقشہ اپنے پیشِ نظر رکھو -

(۲) کسی دیانت دار بال بچوں والے مزدور کو تنگ حال پاؤ چپکے سے اُس کی مدد کرو -

(۳) کسی کو غمگین دیکھو تو اس کا غم دُور کرنے کی کوشش کرو -

(۴) سادہ لوح لوگوں کو عیاروں کے خطرات سے بچاؤ -

(۵) جو دُنیا میں لوگوں کی خدمت نہیں کرتا - وہ آخرت میں اجر نہیں پاتا -

(۶) کبھی کبھی کی ملاقات بہت خوشگوار ہوتی ہے -

(۷) جس آدمی کا سلوک بیوی بچوں سے اچھا نہ ہو - اس کی عبادت کس کام کی -

(۸) جس باپ کو اپنے بھوکے بچوں کی فریاد سُنائی نہیں دیتی وہ بہرہ ہے -

(۹) آوارہ مزاج اور اوباش دوستوں سے بچو کہ یہ کسی کو گھر گھاٹ کا نہیں چھوڑتے -

(۱۰) لوگوں کی خیالی امداد میں مصروف رہنے سے بھی انسان کو ایک سرور سا حاصل ہوتا ہے -

(۱۱) افسوس ہے ان لوگوں پر جنھوں نے پیغمبروں کو مانا لیکن ان کی تعلیم سے انکار کیا -

(۱۲) غریبوں سے محبت کا برتاؤ کرو -

(۱۳) خدمتِ خلق مذہب کی جان ہے -

آج کل
آٹھ آنے
APR 1956
DELHI

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ وار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ نمبر ۹

سالانہ چندہ :— ہندوستان میں : چھ روپے
پاکستان میں :— چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :— نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ :— ہندوستان میں :— آٹھ آنے
پاکستان میں :— آٹھ آنے (پاک)

اپریل ۱۹۵۶ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱، دہلی

عبدالمجید حیرت

غزل

سب کہاں منتقل سفینوں میں
لے گئے لوگ راز سینوں میں

ہم ہیں، یا آپ سوچئے تو سہی
کون ہے کس کے خوشہ چینوں میں

کی نہ تھی، آہ بھی، ابھی کہ وہاں
شکنیں پڑ گئیں جبینوں میں

جب ملے تھے، تو ہم یہ سمجھے تھے
مے بھی ہو گی اِن آبگینوں میں

بات اکثر سمجھ نہیں پاتے
ہیں غبی بھی بہت ذہینوں میں

جوہری ہی نکال سکتا ہے
فرق اچھے بُرے نگینوں میں

یا مکاں ہی نہیں قرینے کے
یا سلیقہ نہیں مکینوں میں

اس قدر ربط و ضبط تھا جن سے
نظر آتے ہیں اب مہینوں میں

دلق پوشوں کو کم نہ سمجھیں آپ
کیا نہیں اُن کی آستینوں میں

ذہن ہوتا ہے، دل نہیں ہوتا
آج کے نکتہ آفرینوں میں

حیرت آساں نہیں غزل کہنا
اس قدر مختصر زمینوں میں

چندر کرن سون رکسا

تہذیب کی راہ پر

سمیرو کی بہو کا دل بہت دنوں سے کڑھی کھانے کو چاہ رہا ہے۔ لیکن یہی سوچ کر چپ رہ جاتی کہ ڈیڑھ پاؤ تیل اور تین پاؤ بیسن اگر وہ کڑھی میں خرچ کر دے گی تو مہینے کے باقی آٹھ دن بنا چھونکی دال ترکاری ساس کے سامنے کیسے رکھے گی۔ کہنے کو تو اپنے کنبے میں وہ دو ہی ہیں۔ سمیرو تو دلّی کی کپڑا مل میں نوکر ہے۔ کبھی چھٹے چھماہے گھر آتا ہے۔ گود کا بچہ جو ابھی دودھ پیتا ہے۔ لیکن اس سے کیا؟ چکّی میں تازہ بیسن پیس کر ملائین کے گھر سے بڑا لوٹا بھر مٹھا مانگ کر وہ کڑھی بنائے گی تو کیا۔ کٹورا بھر کڑھی من بھری کاکی کو نہیں دے گی؟ مانا کہ کاکی پرسوں ہی اس کی ساس سے لڑ کر گئی ہے۔ تو کیا ہوا وہ رشتے میں اس کی چچیا ساس لگتی ہے۔ بڑوں کی لڑائی میں چھوٹوں کے بولنے کا کیا کام؟ جو اگر کسی سے کاکی نے سُن لیا کہ کڑھی بنائی اور اس کے گھر نہیں بھیجی تو کتنا بُرا مانے گی۔ کڑھی بنائی تو کٹورا بھر اندھی کو بھی دینا ہوگی۔ روٹی تو سبھی اسے دے دیتے ہیں۔ لیکن اس محتاج کو کڑھی کہاں نصیب۔ پھر دیوان جی ہیں۔ اپنے للّا کو کتنا پیار کرتے ہیں۔ انھیں تو اس کے ہاتھ کی کڑھی پکوڑی بہت ہی بھاتی ہے۔ کٹورا بھر کڑھی کے ساتھ چار پھلکے تو انھیں گھر بُلا کر ہی کھلائے گی۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ دیوان جی کسی ریاست کے منیجر ہیں یا کبھی ہوا کرتے تھے ایسا نہیں۔ اس چھوٹے گاؤں کا تو کوئی شخص کبھی داروغہ کے رتبے تک بھی نہیں پہنچا۔ بس دیوان جی ہی ایسے خوش نصیب نکلے کہ ساری نوکری میں کبھی دو مہینے ہیڈ کانسٹبل رہے تھے۔ اب تیرہ روپے ماہوار پنشن پاتے ہیں۔ پھر بہو سُسر کو کیسے بھول جاؤں۔ گاؤں کے ناتے وہ سمیرو کے تاؤ ہیں اور بہو کے سُسر۔ کڑھی بنے گی تو نائن ہے، دھوبن ہے کہاری ہے انھیں بھی تو ایک ایک کٹوری دینی ہی ہوگی۔ یوں سمیرو کی بہو کے پاس اتنا تیل سالن سے تھوڑی بچا کہ وہ نائن سے سر دبوائے۔ نہ ہی دو کے علاوہ تیسری دھوتی کہ دھوبن کو دھلنے دے۔ ان دونوں کو پہنچ پہنچ کر پہنتی رہتی ہے۔ جب وہ بالکل میلی چکٹ ہو جاتی ہیں تب وہ انھیں باری باری سے دُھلنے دیتی ہے۔ جمنا دھوبن انھیں ریہہ مٹی اور بکری کی مینگنیوں سے رگڑ ندی سے دھو کر لا دیتی ہے بمشکل سے چار آنے مہینے کی دُھلائی بیٹھتی ہوگی۔ کہاری تو کبھی اس کے سسر کے وقتوں میں ہی لگی ہوگی۔ اب تو خود ہی اندھیرے مُنہ اٹھ کر گھونگھٹ کاڑھ۔ چار گھڑے پانی مصر کے کنوئیں سے کھینچ لاتی ہے۔ تب بھی وہ ہے تو ان سب کی ججمان ہی۔ آج بھی یہ سب اس کی ساس کو ٹھکرائن اماں کہہ کر پاؤں لگتی ہیں۔ پھر بنا لیجیے ایک اچھی چیز بنائے گی تو بھلا انھیں چکھائے بغیر اپنے پیٹ میں کیسے رکھ لے گی؟ اور ہاں۔ جمادارن چاچی کو تو بھول ہی گئی۔ وہ تو اس کے گھر کا نرک دھوتی ہے۔ ایک بار سمیرو کی بہو خود روکھی روٹی بھلے ہی کھالے۔ جمادارن کو روزانہ جو روٹیاں دی جاتی ہیں۔ ان پہ دال، سبزی یا کچھ نہ ہو تو ایک آدھ اچار کی پھانک ضرور ہی رکھ دیتی ہے۔ اسے تو وہ دو بڑی کرچھی سے کم کڑھی دے ہی نہیں سکتی۔ اس کے بعد رہ جاتی ہے بھولی اس کی گائے۔ جاڑوں میں اس کا چھنمنا (لڑکا) جب بہت بیمار ہوا اور شہر کے ڈاکٹر نے بغیر نقد پیسے کے دوا دینے سے انکار کر دیا۔ تب بھولی کو لالہ رام دھن کے ہاتھ بیچ دینا پڑا۔ وہ آج پرائی ہے۔ پھر بھی کڑھی بنے گی تو دو روٹی اور کٹورا بھر کڑھی اسے بنا کھلائے اس کا دل کیسے مانے گا؟ بیچ دینے سے دودھ پینے کا حق جاتا رہا۔ کھلانے کا حق تھوڑے ہی چلا گیا۔ پھر محلّے کے رکھوالے اس کا لو کتّے کو بھی جسے وہ پیا ناغہ صبح شام دو موٹی روٹیاں ڈالتی ہے ایک آدھ کرچھ کڑھی تو ضرور دے گی۔ بھگوان نے جانے کن گناہوں کے سبب اسے کتّا بنایا۔ ورنہ بہو کا عقیدہ ہے کہ پچھلے جنم میں وہ انسان ہی ہوگا کتنا اصیل کتّا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں، بنا آدھ سیر تیل اور سیر بھر بیسن کے وہ کڑھی کیسے بنائے۔ اب کے جب سمیرو آئے گا۔ تو اس سے ایک

روپیہ الگ سے مانگ کر وہ اپنی خواہش کو پورا کرے گی ۔ سمیرو اگلے پکھواڑے میں آئے گا ۔ کل دس گیارہ دن ہی تو رہ گئے ہیں ۔

کڑھائی بھر کڑھی کی تفصیل سُن کر سمیرو نے ندرے مُسکرا کر کہا "اچھا کڑھی تو تُو نے ایک انمول نعمت بنائی ہے ۔ اسے محلے بھر میں دے گی ہی ۔ پر آٹا بھی دو سیر سے کم نہیں گوندھا ہے ۔ کیا آج تیری کاکی چاچیوں کے گھر توا بھی نہیں چڑھے گا ؟"

اس پر بہو نے تھوڑا جھنجھلا کر جواب دیا ۔ کیسی باتیں کرتے ہو ۔ شہر جا کر تو تم ایک دم ہی صاحب بن گئے ہو ۔ کیا وہاں کوئی کُتّے بلّی کو بھی ٹکڑا نہیں ڈالتا ؟ ارے بابا ! تین جنے تو ہم خود ہی کھانے والے ہیں ۔ دو روٹی جمادارن چاچی کی ہوئیں ۔ دو روٹی اندھی کو دینی ہوتی ہیں ۔ ایک روٹی گئو گراس کی نکالی ۔ دو روٹی کالو کو ڈالنی پڑیں گی ۔ پھر دو چار روٹی فالتو بھی بناؤں گی ۔ پتہ نہیں کب کوئی مہمان آجائے ۔ اور نہیں پڑوس کے بچّے ہی کھیلنے آجائیں اور اُنھیں ہی ٹکڑا ٹکڑا پکڑانا ہو تو کیا اسی وقت چولھا جلا کر توا چڑھاؤں گی ؟ سمیرو چپ ہو گیا اور بالٹی رسی اُٹھا کر کنوئیں پر نہانے چل دیا اور بہو توا رکھ کر روٹی سینکنے لگی ۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شہر کیا گئے کہ سارے ناتے بھلا بیٹھے ؟ شادی کے پورے نو سال بعد تو میرے چندن ہوا میری ہر آئے تو بڑی خوشی خوشی بولے ۔ ہم تو لڈو بانٹیں گے ۔ اور لڈوؤں کے نام کل آٹھ روپے نکالے ۔ بھلا چار سیر لڈو میں کس کس کو دیتی ۔ کس کو چھوڑتی ! کہنے لگے ۔ یہاں چار گھر اپنی برادری کے ہیں ، دو گھر لالہ اور نمبردار کے ۔ اور دو دو لڈو دھوبی اور بھنگی کو ۔ بتاؤ جس گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ جس محلے میں کھیل کر بڑے ہوئے ۔ وہاں کیا برادری اور کیا غیر ۔ رمضان جولاہے کے ہاں پوتے کا ختنہ ہوا تھا تو کیا اس نے چھوہارے ، مصری نہیں بھیجی تھی ؟ ہم کیسے انھیں چھوڑ دیتے ! رگھو ماچھی ، بھلوا کہار ، نتھوا تیلی کیا للّا کے ہونے کی آس نہیں لگائے تھے ؟ یہ بھی کتنے نرموہی ہو گئے ہیں ۔ کہنے لگے ۔ کیا رگھو ترکاری کے پیسے نہیں لیتا ؟ بھلا گھوڑا گھاس سے یاری کرے تو کھائے کیا ؟ اپنی چیز اور محنت کے پیسے نہ لیں تو ان کا گزر کیسے ہو ؟ پر اس سے کیا محبت کے ناتے ختم ہو گئے ۔ یہ تو شہر میں رہتے ہیں ۔ ادھر امّاں سدا بیمار رہتی ہیں ۔ رگھو ہی دونوں وقت وید جی سے دوائی لا کر دیتا ہے ۔ نتھوا کی بہو تو میرے چندن کے سُکھ دُکھ میں اپنے گھر کا کام چھوڑ کر دن رات یہیں بیٹھی رہی ہے ۔ مسجد کے امام میرے لیے تو سگے ماں باپ سے زیادہ ہیں ۔ بیچارے دونوں وقت للّا کو پھونک ڈال جاتے تھے ۔ پھونک ڈلوائی کا کبھی دھیلا بھی نہیں لیا ۔ شیخو بہشتی اماں کو دیکھتے ہی سلام کرتا ہے ۔ بھگوان نے ہمیں خوشی دکھائی تھی تو کیا انھیں بھول جاتے ؟ میں نے اسی لئے تو اماں سے کہہ دیا ۔ ادھار لے کر لڈو بانٹنے کو میں نہیں کہتی چاہے بتاشے بانٹو ۔ پر دو نگی میں سب کو ۔ اس پر کتنی مشکل سے بتاشے لا کر دئے تھے ۔

"بہو ! باہر سے دیوان جی کھانستے ہوئے داخل ہوئے ۔ سچ کہتا ہوں تیری کڑھی کی خبر سُن کر تو میرا ایک چلّو خون بڑھ گیا ۔ کہاں ہے چندن ؟ اس کے لئے جھنجھنا لایا ہوں ۔

بہو نے گھونگھٹ کھینچ کر دھیمے لہجے میں کہا "سو رہا ہے للّا تو ۔ آپ نہا آئے ہوں تو تھالی پرسوں" ؟ نہا تو آیا ہوں ۔ پر سمیرو کو بھی آجانے دے تبھی پرسنا ۔ اتنے میں للّا اُٹھ گیا ۔ دیوان جی نے اس کو بڑے پیار سے گود میں اٹھا لیا اور لگے باتیں کرنے ۔

دھوپ چڑھتی جا رہی تھی ۔ سمیرو رہ رہ کر جھنجھلا اُٹھا ۔ لو دس بجنے کو آئے ۔ چھ کوس بیل گاڑی پر چل کر نجف گڑھ پہنچنا ہو گا ۔ تب کہیں دلّی جانے والی بس ملے گی ۔ اور بہو ہے کہ دھر اُٹھائی ، پیروں لگائی اور گلے ملائی سے فرصت ہی نہیں پاتی ۔ کل بھی مل کا ناغہ ہوا ۔ آج بھی شاید ٹائم سے نہ پہنچ سکے گا ۔ ناحق دو روپے کا نقصان ہو جائے گا ۔ نہ اماں مرتی ۔ نہ اسے بہو کو ساتھ لے جانا پڑتا ۔ کوٹھڑی کے اندر عورتیں اس کی بہو کو شہر میں رہنے اور بچّے کی سار سنبھال کے بارے میں نصیحتیں دے رہی تھیں ۔ لڑاکا من بھری کاکی بھی آج سب جھگڑے بھول للّا کے لئے ڈبیا بھر نیا کاجل بنا کر لائی تھی ۔

باہر آنگن میں مرد چندن کو کھلونا بنائے پیار کر رہے تھے ۔ رگھو کاچھی اپنی باڑی سے اس کے لئے ایک بڑا خربوزہ اور کئی تازہ ککڑیاں توڑ کر لایا تھا ۔ بھلوا مٹّی کا گھوڑا ۔ ہاتھی اور گڑیا تھامے چلا آرہا تھا ۔ دیوان جی نے اپنی پرانی اچکن کٹوا کر دو کرتے سلوائے تھے ۔ للّا کو پیار کر کے بھرے گلے سے بولے "بدمعاش ! مجھے چھوڑ کر شہر جا رہا ہے ! لے یہ اپنے بابا کی نشانی ۔ کرتہ پہن کر میری ہی طرح بوڑھا ہوتا ۔ سمجھا ہے ۔ اور بوڑھے نے سب کی نظر بچا کر وہ آنسو پونچھ ڈالے جو اس کی سفید مونچھ پر

کے کنارے ڈھلک آئے تھے۔ رمضان چندن کے لئے کھٹولے کی چھوٹی سی دری دے گیا۔ بھلے ہی وہ میلے روگڑ (پرانی روئی) کی تھی۔ بندوالی کا چھوکرا اپنی بھوجی کے اچار ڈالنے کے لئے باغیچہ سے کچے آم ہی توڑ لایا بہو روتی جاتی تھی اور سب چیزیں گٹھڑی میں باندھتی جاتی تھی۔

"بہو! او بہو!" نتھو اکی بہو ایک بوتل میں تیل لئے اندر داخل ہوئی۔ "لو للا کے سر کان میں ڈالنے کو تیل رکھ لو۔ شہر میں تو مسین کا تیل بکے ہے۔ وہ تو کھسکی کرے ہے۔ بہو نے آگے بڑھ کر پاؤں چھوئے اور بوتل لے کر گٹھڑی میں ایک طرف ٹھونسنے لگی۔ سمیرو سے اب چپ نہ رہا گیا۔ بولا۔ "گٹھڑی میں دس بیس من گیہوں بھی گاؤں کے ہی باندھ لے چل۔ شہر کے گیہوں میں تو بھوسا ملا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں تیری گٹھڑی مٹھڑی کے دن میں بندھے گی"؟

اتنے لوگوں کے سامنے بہو کیا بولتی۔ گھونگھٹ کاڑھے اپنے کام لگی رہی۔ دروازے پر لالہ رام دھن کی گاڑی آ گئی۔ بیلوں کی گھنٹی سن بہو دہاڑیں مار کر رونے لگی۔ آج وہ ساس سسر کی مقدس دہلیز میں تالا ڈال کر شہر جا رہی ہے۔ نہ ساس مرتی اور نہ یہ دن ہوتا۔ وہ ایک بار پھر سب سے ملی۔ مردوں کو دور سے ماتھا زمین سے لگا آداب بجا لائی اور روتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ دیوان بھی بہت دور تک چندن کو گود میں لئے گاڑی کے ساتھ ساتھ گئے۔ پھر بھرے دل سے اسے سمیرو کو دے کر دوسرے لوگوں کے ساتھ گاؤں لوٹ گئے۔

گٹھڑی کو ہاتھوں میں تولتے سمیرو نے بیوی سے کہا۔ "دنیا بھر کا کباڑ باندھ لائی۔ دیکھ لینا بس میں اس کا کرایہ ضرور لگے گا۔ یہ خام خربوزے ککڑی کیا دلّی میں نہیں ملتے؟

بہو کو کہنا ہی پڑا۔ ان لوگوں نے پریم سے سوغات دی تو کیا وہیں پھینک آتی؟ تم تو جانے کیسی باتیں کرتے ہو"۔

ایک دوسری بڑی پوٹلی اٹھاتے ہوئے سمیرو نے پوچھا۔ "اور اس میں کیا ہے؟" "پوریاں ہیں"۔

اتنی ساری پوریاں! وہاں کون سی تیری کاکی۔ تائی یا اندھی بیٹھی ہیں جو یہ تیل کی پوریاں کھائیں گی؟

بہو نے تعجب سے بولی۔ "ارے۔ پانچ چھ برسوں سے وہاں بستے ہو محلے والیاں یہ نہ کہیں گی کہ پہلے پہل بہو آئی تو کسی کے گھر چار پوری بھی نہ دیں"۔

اس کے بھولے پن پر ہنس کر سمیرو بولا۔ "محلہ کہیں کی۔ شہر میں اتنا سگا نہیں ہوتا۔ برسوں پاس پاس رہ کر بھی لوگ ایک دوسرے کا نام نہیں جانتے سب کو اپنے کام سے کام ہے۔ بہتیرے تو بنا مطلب 'جے رام جی' نہیں کرتے۔

ہائے رام! بہو چونک کر بولی۔ تب تو کسی کے دکھ میں کوئی کاہے کو شامل ہوتا ہوگا۔ چاہے کوئی مر بھی جائے"۔

"مر کیسے جائے؟ سمیرو نے سمجھایا، سینکڑوں ڈاکٹر ہیں۔ بس پیسہ پاس میں ہونا چاہئے۔ پھر کچھ فکر نہیں۔ پیسہ ہوگا تو محلہ خود بھی بات پوچھیگا۔

اور جو کوئی غریب ہو؟ اپنی اندھی کی طرح اکیلی ہو تو؟

تو کیا؟ ان کے لئے خیراتی ہسپتال ہیں۔ جا کر پڑ جائیں۔ یہ سن کر بہو تو خاموش ہو گئی۔ دھیرے سے بولی۔ نہ سہی محلے میں۔ بھنگی، دھوبی نائی کو تو پوریاں دینی ہی ہوں گی"۔

"بھاگوان میں تیرے ہاتھ جوڑوں۔ سمیرو نے کہا۔ نہ تو تو جا کر بھنگی کو اپنا جیٹھ سمجھیو اور نہ دھوبی کو تاؤ۔ بھنگی کو وہاں منوا کہتے ہیں اور دھوبی کا نام سندر لال ہے۔ شہر میں کسی کو روٹی دینے کا فیشن نہیں ہے۔ دو آنہ کپڑا دھوبی لیتا ہے۔ اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ بھنگی۔ پھر کاہے کو کوئی روٹی دے گا"۔

"ڈیڑھ روپیہ؟ باپ رے! جمادارن چاچی کو تو ہم چوتھی دیتے تھے تمہاری دلّی تو بہت مہنگی ہے"۔

"مہنگی وہنگی نہیں ہے۔ تیری سمجھ کا پھیر ہے۔ دو روٹی روز کے حساب سے تو دو روپے سے بھی زیادہ بیٹھتا ہے۔ پیسنے، پکانے کی محنت الگ۔

بہو روٹیوں کی اس تفصیل سے دنگ رہ گئی۔ جمادارن کی چوتی کو پیسہ آنے میں بدلنے کی درخواست پر اس نے چاہے اس سے دو گھنٹے بحث کی۔ لیکن بے انتہا مہنگائی کے دنوں میں بھی یہ اس نے کبھی نہیں کیا کہ اس کی دو موٹی روٹیوں کو ہلکا کر دیا ہو۔ گیہوں مہنگا ہونے پر اس نے چنے پیچھے کھائی اور وہی بھنگن، اندھی اور کاکو کو کھلائی۔ لیکن یہ کسی دن نہیں سوچا کہ ان لوگوں کو دینا بند کر دے۔ تو وہ اکیلی اچھے گیہوں میں گیہوں کھا سکتی ہے۔ وہ بے تابی سے شہر پہنچنے کا انتظار کرنے لگی۔

بیلوں نے چھ کوس کا راستہ تین گھنٹوں میں طے کیا۔ ایک بجے کی بس چھوٹ چکی تھی۔ گنڈ ی مٹھڑیوں پر نظر ڈال سمیرو بڑبڑایا: یہاں پڑے پڑے دوپہر کے بجرے چاند گنجی ہو جائے گی۔ ڈیوٹی کا ناغہ ہو گا سو الگ۔ بہو کیا بولتی۔ چپ چاپ آنچل سے بچے کو ہوا کرتی رہی۔

تین بجے دوسری بس چلی۔ 'لوٹ' کے مسافروں میں وہ بھی ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھ گئے۔ سمیرو نے پوریوں کی پوٹلی کھولی اور پوریاں نکال کھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو ایک گھنٹے میں دلّی پہنچ جائیں گے۔ مجھے 'کوارٹر' پہنچا کر میں سیدھا مل چلا جاؤں گا۔ تو گھر جھاڑ' بُہار لینا۔ گلی میں نل ہے پانی لے لینا۔ میں رات کو نو بجے لوٹوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں چاروں طرف بستی ہے۔ سمجھی"۔

للاّ بھوکا ہے۔ اس کے لئے پاؤ بھر دودھ دے کر جانا۔ بہو بولی "لگائی نہ تو نے جھنجھٹ۔ بازار کے نکڑ پر حلوائی ہے تو آپ ہی لے لیجیو۔ شہر میں کوئی پردہ نہیں کرتا"۔

بھری ہوئی بس میں بہو کیا کرتی۔ گھونگھٹ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ بس رُکی۔ سمیرو نے جھٹ سے اُتر کر سبزی منڈی کا تانگہ کیا۔ بھیّا ذرا تیزی سے ہانکنا"۔

ابھی پہنچے چلتے ہو جی۔ چل میرے بادشاہ۔ ہاں' ہاں بیٹا قدم بڑھا۔ گھوڑا جیسے ہوا ہو گیا۔

گھونگھٹ کے پیچھے سے بہو تعجب کے ساتھ اس بڑے شہر کو دیکھتی رہی۔ گلی میں بہت سی عورتیں صاف کپڑے پہنے اپنے کاموں میں لگی تھیں۔

" اوہو سمیرو بہو لے آئے"۔ ایک بھاری بھرکم بڑھیا نے ٹوکی کترتے ہوئے پوچھا۔ اس کے پاس اس کا دس سالہ پوتا کھڑا پتنگ کے لئے اکنّی مانگ رہا تھا۔

"ہاں اماں جی! لے آیا"۔ تالا کھول' سامان اندر پٹک' وہ لمبے لمبے قدم رکھ مل کو چل دیا۔

بھوک اور گرمی سے پریشان بچے کو کندھے لگائے ہوئے بہو نے امّاں جی کے پاؤں چھوئے۔ پھر "بن دھرتی" والے بھوت کے ڈیرے جیسے گھر کے آنگن میں پڑی چھوٹی کھاٹ پر رمضان جولاہے کی ہی چھوٹی دری بچھا چندن کو لٹا دیا۔ اندر سے ایک گلاس تھامے وہ امّاں جی کے پاس پہنچ التجا سے بولی۔ امّاں جی حلوائی کی دکان سے ہمیں پاؤ بھر دودھ منگا دیتیں؟

امّاں جی کا منہ لٹک گیا۔ پوتے کو انگوٹھا سے اکنّی کھول دیتی ہوئی بولیں۔ کس سے منگا دوں ہمارے تو کوئی نوکر ہے نہیں"؟

بچے کو اکنّی مل گئی تھی وہ پتنگ لینے بھاگ گیا۔

لاچار ہو کر بہو گلاس لے روتے بچے کو گود میں اٹھا گلی پار کر جیسے تیسے حلوائی سے دودھ لے کر گھر کو بھاگی۔ بچے کو دودھ پلایا تو وہ سو گیا۔ پھر بہو نے کوٹھڑی' آنگن صاف کر ڈالا۔ گھڑا اُٹھا کر گلی کے نل پر پانی لینے آئی۔

بھوک اور پیاس سے اس کا بُرا حال تھا۔ گلا سوکھ رہا تھا۔ صبح تو اس سے باپ دادا کی دہلیز کو چھوڑنے اور گاؤں والوں سے جدا ہونے کے رنج میں کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔

نل پر دو تین عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اپنے سے کچھ بڑی عورت سے بہو نے بڑی منت سے کہا۔ اے جیجی! مجھے ایک گھڑا پانی بھر لینے دو۔ دھار کے نیچے سے بالٹی سرکا' بڑا کلسا رکھتے ہوئے جیجی نے اطمینان سے کہا۔ بھر لینا گھڑا۔ نل کہیں بھاگا تھوڑے ہی جاتا ہے۔ سمیرو تو نو بجے رات کو لوٹیگا۔ ہمارے تو اب لوٹنے والے ہوں گے۔ بہو من مارے کھڑی رہی۔ ابھی رسوئی میں چوکا لگانا ہے۔ چولھا بھی نہیں ہے۔ ایک ٹوٹی انگیٹھی پڑی ہے۔ گھر میں یا باہر کہیں بھی اُسے چکنی مٹی نظر نہیں آئی تھی۔ (ویسے گلی میں خاک بہت تھی) چولھا کس سے بنائے گی۔ ہمت باندھ کر اس نے پھر کہا۔ جیجی یہاں مٹی کہاں ملے گی۔ چولھا بنانا تھا"۔

یہ کوئی گاؤں تو ہے نہیں کہ ہر جگہ سے مٹی کھود لو"۔ جیجی نے مہربانی فرما کر بتایا۔ مٹی والا دوسرے چوتھے بیچنے آتا ہے۔ دو آنے ڈلیا دیتا ہے۔ آئیگا تو میں تمھیں بتا دوں گی"۔ دوسرے چوتھے؟ بہو سوچ میں پڑ گئی۔ تب تک کیا بغیر چوکا لگائے روٹی بنائے گی؟ گلی بھری پڑی ہے عورتوں سے۔ یہ چھ سال سے یہاں رہتے ہیں۔ جان پہچان بھی ہے ہی۔ پر کسی نے اس سے ایک گلاس پانی کے لئے بھی نہیں پوچھا شربت تو دُور کی چیز ہے۔

نل خالی ہوا تو اس نے گھڑا بھرا اور گھر چلی گئی - اس نے ہاتھ منہ دھویا دو بتاشے گلاس بھر پانی میں گھول کر شربت پیا - جب کچھ ہوش آیا - تب اسے پھر مٹی کا فکر سوار ہوا - بنا انگیٹھی پوتے تو وہ اس پر کھانا بنانے سے رہی - ہمت کرکے وہ مٹی مانگنے نکلی - ہنگا پہنے - گھونگھٹ کاڑھے سمیرد کی بہو کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تقریباً گلی کی سبھی عورتیں اپنے گھروں سے جھانک رہی تھیں - پاس ہی ایک نوجوان عورت انگیٹھی سلگا رہی تھی - بہو نے اس سے کہا - اے جیجی ! ہمیں تھوڑی مٹی دے دو، چوکا پوتنے کو چاہیئے - جیجی بن کر وہ عورت کچھ خوش تو نہیں ہوئی' لیکن لمحہ بھر رک کر اندر مٹی لینے چلی گئی - آدھ پاؤ گڑ کی ڈلی جتنا مٹی کا ڈھیلا بہو کے ہاتھ پر رکھ کر بولی - بہن جی یہاں تو مٹی بھی مول آتی ہے - سمیرد کو چاہیئے تھا کہ تمھیں لانے سے پہلے یہ چھوٹی موٹی چیزیں لے کر رکھ لیتا"۔

بہو کبھی مٹی کی ڈلی کو تاکتی تھی اور کبھی اپنی ہمسائی کو -

چوتھے دن وہی پڑوسن اپنی مشین اٹھائے سمیرد کے گھر پہنچی "بہن جی' ! شہد گھلی آواز میں پڑوسن نے مخاطب کیا - دس پانچ دن ہماری مشین اپنے گھر رکھ لو تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

مسالہ پیسنا چھوڑ کر بہو نے اس کے لئے پیڑھا بچھاتے ہوئے جواب دیا "بیٹھو جیجی - پیر مل پڑوں - کیا کہیں جا رہی ہو کچھ دنوں کو جو مشین رکھو گی ؟ رکھ دو"- جیجی بیٹھی نہیں - مقفل مشین کو احتیاط سے کوٹھڑی میں رکھ کر چلتے ہوئے بولی - جانا کہاں ہے بہن جی - کل تمہارے سے میری جیٹھانی آرہی ہے - مشین دیکھ لی تو اس کی خیر نہیں - رات دن اس کے بچوں کے کپڑے سینے پڑیں گے - تمھیں بتاؤ اب سب کے کپڑے سینے لگی تو میری مشین چار دن میں ختم ہو جائے گی - سات سال ہوگئے آج بھی نئی سی چمکتی ہے - بابا میں ایسے سگے پن سے باز آئی کہ میری چیز ہی ٹوٹ جائے - یہ کہہ کر پڑوسن چلی گئی -

بہو سوچتی رہی - جیٹھانی اتنی غیر ہے - کل ہی تو بڑے بابو کی لڑکی کے دو فراک انھوں نے سی کر بھیجے ہیں - وہ دفتر کے بڑے بابو جو ٹھہرے"۔

بہو مسالہ پیس کے سل دھو رہی تھی کہ سامنے والی بھاری بھرکم دملا کی ماں سر پر ایک چھوٹی میز رکھے اندر گھسی -

"نمستے بہن جی" - اپنی لڑکی کے برابر بہو سے بولی - ایک تکلیف دینے آئی ہوں - بہن جی' ہماری دو کرسیوں اور اس میز کو کچھ دنوں کو اپنی کوٹھڑی میں جگہ دے دو - یوں رکھنے کو تو گلی بھر میں کسی کے بھی گھر میں رکھ دیتی - پر سچ کہتی ہوں' بہن جی ! مجھے کسی محلے والی کا اعتبار نہیں پرائی چیز کو تو سب مفت سمجھتے ہیں - بس مجھے تو تم ہی بھلی دکھائی دیتی ہو - رکھ لوگی نا" ؟

اپنی تعریف سن کر بہو نے فوراً ہامی بھر لی - رکھ دو بہن جی ! ہمارے تو کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے گا - کیا کہیں جا رہی ہو" ؟

"ارے نہیں - میری نند آرہی ہے' دس پندرہ دن کے لئے - ان کے کئی بچے ہیں - کود کود کر سب کی پالش خراب کر دیں گے اور منع کروں گی تو نند رانی کو برا لگے گا - سو میں بھلی سے بری کیوں بنوں - نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بنسری - گھر میں رکھوں گی ہی نہیں - تو کس پہ چڑھیں گے"۔

بہو پر تو جیسے سکتہ چھا گیا -

لیکن اس کے ایک سال بعد ٹھیک اسی دن دملا کی ماں نے سمیرد کے گھر آکر کہا - بہن جی ! آج ہمارے کیرتن ہے - اپنی ڈھولک تو دے دو - وہ موا مندر کا پجاری تو مندر کی ڈھولک کی چونی مانگ رہا ہے - میں نے کہا - رہنے دے - میں تو اپنی بہن جی سے مانگ لوں گی"۔

تو بہو نے ٹالڈا سے چڑی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کرتے ہوئے فکر آمیز لہجے میں کہا - ہائے بہن جی ! ڈھولک تو آج ہی مرمت کو دی ہے - ایک پڑے میں چندن نے سوئی مار کر چھید کر دیا تھا - بڑا شیطان ہو گیا ہے للا ہمارا -

بے اعتباری کی سانس بھر کر جب دملا کی ماں لوٹ گئی تب بہو نے جھٹ پٹ دروازے کی کنڈی لگادی - اچھی بھلی کپڑے میں بندھی ڈھولک کھونٹے سے اتار - اپنے نئے پائدان سے پاؤں پونچھ نئی کرسی پر چڑھ اسے مچان کے پیچھے رکھ دیا - اور پھر کیرتن میں جانے کے لئے ساڑھی بدلنے لگی -

ابر احسنی گنوری

غزل

آہ کس شے کی طلب تھی اور کیا پاتا ہوں میں
ڈھونڈنے نکلا تھا ان کو گم ہوا جاتا ہوں میں

درد سے، حسرت سے، غم سے دل کو بہلاتا ہوں میں
ابرؔ ہر پتھر سے اس شیشے کو ٹکراتا ہوں میں

عیش و غم راہِ طلب میں کرتے ہیں آ کر سلام
اور ہنس کر ان دوراہوں سے گزر جاتا ہوں میں

باوجودِ ترکِ اُلفت اب بھی اتنا ربط ہے
جب کوئی نام اُن کا لیتا ہے تڑپ جاتا ہوں میں

تم مری خاطر نقابِ رُخ اُٹھا سکتے نہیں
آپ ہی بن کر نقابِ رُخ اُٹھا جاتا ہوں میں

دوستوں کے لُطفِ بے حد نے کہاں پہنچا دیا
کوئی لفظِ دوست کہتا ہے تو گھبراتا ہوں میں

اور ضبطِ غم کی تاکیدیں مجھے فرمایئے
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوا جاتا ہوں میں

ہے اسی کا نام اگر دُنیا تو دنیا کو سلام
اہلِ ساحل ہنس رہے ہیں ڈوبتا جاتا ہوں میں

بزمِ جاناں طور ساماں بھی جناں بردوش بھی
ابرؔ اس جنّت میں اپنی ہی کمی پاتا ہوں میں

ممتاز حسین

منشی پریم چند بحیثیت ناول نگار

(۲)

ہوری کے کریکٹر کے ایک اہم پہلو پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں لیکن چونکہ پورے ناول کو اس کے کریکٹر کے صرف ایک ہی پہلو سے سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کے کریکٹر کے اس پہلو کو بھی سامنے لائیں جس کے پس منظر میں رائے صاحب اگر پال سنگھ تعلقہ دار اور ان کے احباب کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ جاگیردارانہ نظام میں کسانوں کی زندگی میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ زمین کے اسی بندھن اور اس کی ملکیت کے جذبہ کے گرد ان کی نفسیات کا تانا بانا بنتا رہتا ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے کھیت مزدور تو موجود تھے لیکن کھیتہر (کھیت والے) کسانوں کو بے دخلی کا کوئی خوف نہ تھا یہ بات انگریزوں کے لائے ہوئے زمیندارانہ نظام میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی خوف سے ان میں غلامی کا وہ جذبہ زیادہ پیدا ہوا جو کہ سرمایہ دارانہ رشتوں کے لائے ہوئے حق انفرادیت اور مساوات کے جذبے سے ٹکراتا ہے۔ ہوری کی زندگی کا آغاز ہمارے ناول میں تیس پینتیس برس کی عمر سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نفسیات گوبر کی نفسیات کے مقابلے میں نسبتاً پرانے رشتوں ہی سے متعین ہوتی ہے جبکہ سرمایہ دارانہ رشتے دیہاتوں میں زیادہ جگہ نہیں بنا پائے تھے اور وہ زر کی اقتصادیات سے نسبتاً محفوظ تھے چنانچہ ایک ہی ماحول میں رہتے ہوئے ہوری اور گوبر کی نفسیات میں جو فرق دکھایا گیا ہے وہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ گوبر کی نفسیات زر کی اقتصادیات سے متعین ہو رہی ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام کا حق انفرادیت یا روزگار کمانے والی آزادی کے جذبے سے متاثر ہو رہی ہے اور ہوری کی نفسیات زمیندارانہ نظام ہی کے رشتوں سے متاثر رہی ہے۔ رائے صاحب کی چاپلوسی اور خوشامد کرنے پر جب گوبر ہوری کو ٹھوکا دیتا ہے "جب ہم سے زمین کی لگان لی جاتی ہے تو پھر ہمیں رائے صاحب کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔ تو ہوری اس کا جواب دیتا ہے کہ "اسی سلامی کی برکت ہے کہ دروازے پر جھونپڑی بنائی اور کسی نے کچھ نہ کیا۔ گھورو نے دروازے پر کھونٹا گاڑا تھا۔ اس پر کارندے نے دو روپے تاوان لے لیا تھا۔ ہم نے کتنی مٹی کھودی کارندے نے کچھ کہا؟ جو دوسرا کھودے تو نجرانہ دینا پڑے۔ اپنے مطلب سے سلامی کرنے جاتا ہوں"۔

کسانوں کی زندگی میں یہ غلامی اور یہ تحقیر نفس اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ وہ اپنی زمین کا مالک نہ تھا۔ اسے بے دخلی کی دھمکی اور خوف توہین آمیز عاجزی مل سکتی'۔ خوشامد اور چاپلوسی سکھاتی اور نذرانہ دینے پر مجبور کرتی۔ ان حالات میں کسانوں کا اپنی زمین کو دانت سے پکڑنا فطری صرف اس بات سے نہ تھا کہ وہی ان کا ذریعہ معاش تھا بلکہ اس لئے بھی کہ ایک ایسے زمانے میں جبکہ زمین بالعموم زمینداروں کی تھی کسی کسان کا شکمی ہونا یا موروثی زمین کا مالک ہونا کسی بڑی نعمت سے کم نہ تھا ہوری کی زندگی کا بڑا کارنامہ اس تین بیگھے کھیت کو بچانا تھا جو کہ موروثی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہوری کی اصلی جد و جہد یہی تھی۔ اگر وہ اپنے دھرم پر اٹل رہ سکتا تو بھی کچھ اشک شوئی ہو جاتی مگر یہ بات نہ تھی۔ اس لئے نیت بھی بگڑی اور ادھرم بھی کمایا۔ کوئی ایسی برائی نہ تھی جس میں پڑا نہ ہو پھر بھی زندگی کی کوئی خواہش پوری نہ ہوتی۔ اچھے دن سراب کی طرح دور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ اب ان سے وہ دھوکا بھی نہ رہ

گیا تھا۔ چھوٹی امید کی ہریالی اور چمک بھی اب دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہارے ہوئے راجہ کی طرح اس نے خود کو اس تین بیگھے کھیت کے قلعے میں بند کر دیا تھا اور اسے جان کی طرح بچا رہا تھا۔ ہوری کے بارے میں منشی پریم چند کی یہ تفسیر اس کی زندگی کے ان آخری دنوں کی ہے۔ جبکہ بے دخلی کے مقدمے کی تاریخ کے صرف پندرہ دن رہ گئے تھے اور اسی سوال پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ ہوری نے کھیت کو بچا لیا۔ باپ دادا کی نشانی کو بچا لیا لیکن اپنی روپا کو دو سو روپے میں بیچ کر۔ ہوری کی شکست اصل میں کیا تھی کہ اس نے کھیت کی خاطر اپنے دھرم کو بیچ دیا۔ ہوری نے روپے لئے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر نہ اٹھ سکا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ گویا ذلت کے گہرے سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا جا رہا ہو۔ آج تیس سال کی زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا ہے اور ایسا ہارا کہ گویا اسے شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور جو جاتا ہے وہ اس کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے بھائیو میں رحم کا مستحق ہوں۔ میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے اور ماگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو تو اس میں کتنی جان رہ گئی ہے وہ کتنی چوٹوں سے چور اور ٹھوکروں سے کچلا ہوا ہے۔ اس سے پوچھو اس نے کبھی آرام کے درشن کئے ہیں کبھی چھاؤں میں بیٹھا ہے اس پر یہ ذلت اور وہ اب بھی جیتا ہے نامرد، لالچی، کمینہ اس کا سارا اعتقاد جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اگر ہوری کوئی عظیم یا منشی پریم چند کا ایک ایڈیل کیریکٹر ہوتا تو وہ جذبۂ خود تحقیر میں اس سے اپنے کو نامرد، لالچی اور کمینہ نہ کہلواتے وہ زمین سے ہاتھ دھو بیٹھتا لیکن وہ اپنا دھرم نہ گنواتا۔ پھر اسے منشی پریم چند نے اپنے ناول کا ہیرو کیوں بنایا۔ اس لئے کہ وہ اس حق کے سختی سے حامی تھے کہ زمین اس کی ہے جس کا ہل اس پر چلتا ہو۔ کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے کا حق ختم ہونا چاہیئے کسانوں کے اس بنیادی حق کے تحفظ ہی کے لئے انھوں نے ہوری کو تخلیق کیا لیکن ہوری ہمارے سامنے صرف ایک فریادی کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کا کام بغاوت کے علم کو بلند کرنا نہیں ہے بلکہ اعلےٰ طبقے کے دانش ور اور روشن ضمیر افراد میں انصاف اور حق کی حمایت کے جذبے کو پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ اس کے حقوق کے لئے لڑ سکیں۔ چنانچہ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ

وہ رائے اگرپال سنگھ کو جو کہ ہوری کا زمیندار ہے پورے طور سے ظالم کے روپ میں پیش نہیں کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ خود غلام ہیں لیکن اس سے ظلم کی نوعیت دوہری ہو جاتی ہے نہ کہ ہلکی بلکہ اگرپال سنگھ اگر ایک طرف یگیہ کے موقع پر بڑے بڑے نذرانے لیتے ہیں۔ بیگار کے معاملے میں کڑے ہیں اور اپنے کارندوں کو کسانوں کے لوٹنے کی پوری آزادی دئے ہوئے ہیں تو دوسری طرف کانگرس کی پہلی ستیہ گرہ میں کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل کی یاترا بھی کر آئے تھے۔ وہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں "صرف افسروں کے آگے دم ہلا ہلا کر کسی طرح انھیں مہربان کرنا اور ان کی مدد سے اپنی رعایا پر رعب جمانا ہی اپنا کام ہے چاپلوسوں کی خوشامد نے ہمیں اتنا مغرور اور تنک مزاج بنا دیا ہے کہ ہم سے شرافت عاجزی اور خدمت سب رخصت ہو گئی ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر سرکار ہمارے علاقے چھین کر ہمیں روزی کے لئے محنت کرنا سکھا دے تو ہم پر بڑا احسان ہو۔ اور یہ تو یقین ہے کہ اب سرکار ہماری حفاظت نہ کرے گی اب ہم سے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹنے والا ہے۔ میں اس دن کا خیر مقدم کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ ایشور وہ دن جلد لائے وہ ہماری نجات کا دن ہو گا۔ ہم موجودہ حالتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں وہی ہمارا ستیاناس کر رہی ہیں۔ جب تک پونجی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نہ کٹیں گی تب تک یہ نحوست ہمارے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ اور ہم انسانیت کا درجہ نہ پا سکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا مقصد ہے"۔

رائے صاحب ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو کہ امپیریلزم کے لئے ہندوستانی سماج میں سماجی بنیاد کا کام دیتا ہے ایسی صورت میں رائے صاحب کا یہ سوچنا کہ اب ہم سے سرکار کا کوئی مطلب نہیں نکلتا ہے کہاں تک صحیح ہے پھر بھی اس میں سچائی موجود تھی۔ جوں جوں آزادی کی تحریک کا دباؤ سرکار پر پڑتا تھا وہ کسانوں کے حق میں بعض چھوٹی چھوٹی مراعات دینے اور قانون کاشتکاری پر ترمیمات کرنے کے لئے مجبور ہوتی جاتی تھی۔ رائے صاحب اندر سے غالباً اس کے لئے بھی تیار نہ تھے لیکن چونکہ انھیں اپنے طبقے کی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ عام بیداری کی وجہ سے انسانیت کے دھرم کی باتیں کرنے لگے ہیں لیکن اس کا فعل ایک

ظالم ہی کا رہتا ہے - لیکن اس ظالم کی بدنامی مختاروں اور کارندوں کے سر تھی - وہ تو بقول پریم چند صرف ضابطے کے غلام تھے - رائے صاحب قوم پرست ہوتے ہوئے بھی حاکموں سے میل جول قائم رکھتے تھے - ان ساری باتوں پر منشی پریم چند نے رائے صاحب کی زندگی کی دو رخی کی تصویر جو صرف انھیں کی نہیں بلکہ ان کے طبقے کی بھی ہے پیش کی ہے - اس طرح نہ صرف اس امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا ہے کہ یہ طبقہ پوری طرح قوم پرست بھی ہو سکتا ہے - بلکہ اس چیز کی ضرورت بھی محسوس کرائی ہے کہ یہ ایک فضول درمیانہ طبقہ ہے جس کا پیدا واری عمل میں کوئی حصہ نہیں ہے - اس کی موت ہی میں سماج کی بھلائی ہے - لیکن منشی پریم چند نے جس طرح رائے صاحب کو پیش کیا ہے - اس میں طبقاتی شعور اتنا واضح اور صاف نہیں ہے وہ ان کی اخلاقیات سے مل کر پیچیدہ ہو گیا ہے - رائے صاحب کا ستارہ اقبال پر تھا وہ کانگرس کی تحریک میں حصہ لینے کے باوجود انگریزی راج میں صوبے کے ہوم ممبر ہو جاتے ہیں - مقدمہ جیت کر جائیداد میں اضافہ کرتے ہیں اور اس طرح سے اتنے متمول ہو جاتے ہیں کہ مسوری نینی تال اور کئی جگہ کوٹھیاں کھڑی کروا لیتے ہیں - مگر جب اپنے صاحب زادے رودر پال کی آزاد روی اور اپنی بیٹی مینا کشی کی تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں جسے بدقسمتی سے ایک عیاش شوہر ملا تھا تو وہ اتنا دکھی ہوتے ہیں کہ روحانیت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں - اس طریق کار میں پریم چند نے عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور زمیندارانہ نظام کی ٹوٹتی ہوئی شکل کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ دھن اور مایا کی جھوٹی چمک دکھا کر رائے صاحب کے دل میں نیکی اور روحانیت کے جذبے کو بیدار کیا ہے - رائے صاحب نے سکھوں کی جو بہشت بنائی تھی - اسے اپنی ہی زندگی میں غارت ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے - اب دنیا سے مایوس ہو کر ان کی روح اندر کی جانب متوجہ ہو رہی تھی - اب ادھر کا راستہ بند ہو جانے پر ان کا دل خود بخود عبادت کی طرف جھکا جس میں خواہشات سے کہیں زیادہ سچائی تھی جس نئی جائیداد کے بھروسے پر قرض لیا تھا وہ جائیداد ادائی کئے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی - اور وہ بوجھ سر پر لدا ہوا تھا - ہوم ممبری سے ضرور اچھی رقم ملتی تھی مگر وہ سب کی سب اس عہدے کا وقار قائم رکھنے ہی میں صرف ہو جاتی تھی اور رائے صاحب کو اپنے شاہانہ شان و شوکت نباہنے کے لئے وہی اسامیوں پر خاصا اضافہ اور بے دخلی کرنا

اور ان سے نذرانہ لینا پڑتا تھا جس سے انھیں دلی نفرت تھی - وہ رعایا کو تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے ان کی حالت پر رحم آتا تھا مگر اپنی ضروریات سے مجبور تھے مگر موہ انھیں نہیں چھوڑتا تھا اور اس کشمکش میں انھیں سکون نہیں ملتا تھا - وہ موہ کو چھوڑنا چاہتے تھے مگر موہ انھیں چھوڑتا نہ تھا. اور اس کش مکش میں پڑ کر انھیں ذلت - افسوس اور اضطراب سے چھٹکارا نہ ملتا تھا ـــــ ان کی روح کے اونچے سنسکاروں کی بربادی نہ ہوئی تھی - ظلم، مکاری بے عزتی اور تکلیف رسانی کو وہ تعلقہ داری کی زینت اور شان و شوکت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے - یہی ان کی سب سے بڑی شکست تھی -

قصہ مختصر یہ کہ منشی پریم چند رائے صاحب کو بھی فطرتاً ایک اخلاقی انسان ہی بتلاتے ہیں - وہ تو صرف حالات کے شکار تھے - جس سے نکلنے کے لئے خود ان کے پاس کوئی نسخہ نہ تھا - بلکہ سرکار کے پاس تھا وہ اگر ان سے تعلقہ چھین کر انھیں محنت کرنا سکھا دے تو وہ خوش تھے - ظاہر ہے کہ ایسے آدمی سے ہوری کا کوئی بڑا تصادم نہیں ہو سکتا تھا - کیونکہ وہ سب کے سب غلامی کی ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے وہ زنجیر مہاجنی تہذیب اور سرمائے کی غلامی تھی - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رائے صاحب کے طبقے کا وہ نیوڈل کیریکٹر ابھرنے نہیں پاتا جو امپیریلزم کو سہارا دئے ہوئے ہے گو اس کی طرف اشارہ موجود ہے - جس طرح ہوری بے بس و بے دست و پا ہے اسی طرح رائے صاحب بھی بے دست و پا ہیں ہوری پر ظلم تو صرف ضابطے کی کارروائی کا نتیجہ ہے - ان حالات میں منشی پریم چند ان دونوں ہی پر رحم کھاتے ہیں اور اس طبقے کی طرف روشنی اور عمل کی تحریک کے لئے بڑھتے ہیں جسے درمیانہ طبقہ کہیں گے جو کہ سوشل ریفارم اور آزادی کی جدوجہد کی حمایت کرتا رہا تھا - اس طبقے کے بہترین عناصر کی نمائندگی مسٹر مہتا کرتے ہیں جو کہ یونی ورسٹی میں پالیٹکس یا اقتصادیات کے نہیں بلکہ فلاسفی کے پروفیسر ہیں - اور جن کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ ہے - مسٹر مہتا کی رہنمائی صرف رائے صاحب تعلقہ دار، مسٹر کھنا سرمایہ دار - نئی روشنی کی آزادی چاہنے والی ولایت کی پاس شدہ لیڈی ڈاکٹر مس مالتی اور ڈیموکریٹ کردار کی دیوی مسز کھنا ہی قبول نہیں کرتی ہیں بلکہ مزدوروں کی جماعت بھی انھیں اپنا لیڈر بناتی ہے - جس وقت شکر مل میں مزدوروں کی ہڑتال

چلتی ہے تو مسٹر مہتا ہی مزدوروں کی آئیڈیولوجی کو قبول کئے بغیر ان کی جماعت کے صدر اور رہنما سے نظر آتے ہیں اور اس جماعت کے سکریٹری مرزا خورشید ایسے پرانے کھلاڑی ہیں جو سب کچھ کھو چکنے کے بعد بھی ایسے رئیس ہیں کہ جوتے کی ایک دوکان سے چار پانچ سو روپے روز کی بکری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریفارمیشن اور آزادی کی جد و جہد میں متوسط طبقے کا ایک اہم رول رہا ہے۔ اس لئے خیالات کو عوام میں پھیلایا ہے اور یہ فعل آج بھی انجام دے رہا ہے۔ لیکن جب تک اس طبقے کی حدود اور خصوصیات کو اجاگر نہ کیا جائے اور آزادی کی جد و جہد میں مزدوروں اور کسانوں کے رول اور مزدور تحریک کے وجود میں آنے کے بعد مارکسزم کے رول کو بھی اجاگر نہ کیا جائے۔ اس طبقے کی خدمات اس کی پیشوائی کے حدود متعین نہیں ہو پاتے ہیں۔

چونکہ متوسط طبقے کی نفسیات بیٹی بورژوا کی ہوتی ہے یعنی وہ اپنی طبقاتی پوزیشن کی نوعیت سے پرولتاری اور بورژوا طبقے کے درمیان ہوتا ہے اور حالات کے اعتبار سے کبھی اوپر چڑھتا ہے تو کبھی نیچے سرکتا ہے اس لئے صحیح حقیقت نگاری کا کام اس وقت انجام پا سکتا ہے۔ جب ہم اس کی اس نفسیات اور اس کی طبقاتی پوزیشن کو بے نقاب کریں۔ منشی پریم چند نے مسٹر مہتا کو اسی نفسیات کے ساتھ اس کے اس طبقاتی کردار کو پیش نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا یہ سبب ہو کہ ان کے زمانے میں جس حد تک کہ رائے صاحب کے طبقے کا نفاذ ظاہر ہو چکا تھا اس حد تک مسٹر مہتا کے طبقے کا نفاذ ظاہر نہ ہوا ہو۔ بہر حال اگر مسٹر مہتا مزدور طبقے کی طرف اتنا جھک سکتے تھے کہ وہ اس کی جماعت کے صدر بن جائیں اور ہڑتال کی رہنمائی کریں تو اس کی توقع کی جاتی ہے کہ انھیں اس طبقے کی آئیڈیولوجی سے بھی متاثر دکھایا جاتا۔ پریم چند نے ایسا نہیں کیا ہے۔ مسٹر مہتا اصل میں منشی پریم چند کے آئیڈیلسٹ خیالات کے ترجمان ہیں گو وہ ایک آدھ جگہ ان کے خیالات پر تنقید بھی کرتے ہیں مثلاً مسٹر مہتا کا آزادانہ عیش کوشی کا فلسفہ منشی پریم چند کو پسند نہیں ہے لیکن بیشتر چیزوں میں وہ انھیں کے خیالات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مسٹر مہتا اگر ایک طرف نام نہاد اشتراکی پنڈت اونکار ناتھ کے غلط سلط خیالات کی تردید کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ مس مالتی کے اس خیال کی بھی تردید کرتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ اس طرح مسٹر مہتا منشی پریم چند کے آئیڈیلسٹ خیالات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں جو ایک طرف میکانکی اور دیگر فلسفہ اشتراکیت کے خلاف ہے تو دوسری طرف بعض سماجی اقدار میں قدامت پسندانہ یا رجعت پسندانہ بھی ہیں۔ لیکن اس ناول میں منشی پریم چند اتنا آگے ضرور بڑھے ہیں کہ وہ مس مالتی کے ترقی پسندانہ خیالات کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ اسے مٹاتے نہیں ہیں۔ مس مالتی کی یہ فلسفہ بازی کہ مسٹر مہتا کو سماجی خدمت کے لئے اکیلا ہی رہنا چاہئے اسی بات کا اشارہ ہے کہ وہ مس مالتی کی شخصیت کو ختم کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس طرح منشی پریم چند اپنے اس خیال میں متشکک ہو جاتے ہیں۔ کہ ازدواجی زندگی میں عورت کو اپنی شخصیت شوہر کی شخصیت میں کھو دینا چاہئے۔ پریم چند کی یہ طرز اصل میں ان کے لئے آرٹ کی جیت ہے لیکن یہ جیت ہمیں سرمایہ دار مزدور کے تضاد کو پیش کرتے وقت نہیں ملتی ہے۔ وہ مسٹر کھنا کے طبقاتی مفاد اور مزدوروں کے طبقاتی مفاد کے تصادم کو تو دکھاتے ہیں لیکن اس تصادم کے پیچھے جو تضاد ہے اس کی مادی بنیاد کو ابھار نہیں سکے ہیں۔ وہ تضاد سوشل پروڈکشن اور انفرادی نفع اندوزی کا تضاد ہے اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس آشیانے ہی کو آگ لگا دی جائے یعنی مل ہی کو جلا دیا جائے جس سے یہ تضاد اور یہ تصادم پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس تضاد کو اس منطقی انتہا تک پہنچایا جاتا ہے جہاں انفرادی نفع اندوزی کی نفی ہو اس کا حل نظر آتا نہیں یعنی جہاں سوشل پروڈکشن سوشل تصرف کے ساتھ ایک نئی وحدت اختیار کرنے کے لئے مضطرب نظر آتا۔ اس کے برخلاف جب منشی پریم چند شکر مل میں آگ لگوا دیتے ہیں تو باوجود اس بات کے کہ ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ موجود رہتا ہے۔ آپ کا یہ عمل رجعت پسندانہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے آپ کا یہ عمل شاید اس لئے تھا کہ وہ مسز کھنا کی زبان سے مسٹر کھنا کو یہ اخلاقی تعلیم دیتے ہیں۔ تم اتنا دل کیوں چھوٹا کرتے ہو۔ دھن کے لئے جو سارے پاپوں کی جڑ ہے اس دھن سے ہمیں کیا سکھ تھا۔ اور جب مسز کھنا دھن جمع کرنے کی تپسیا کی طرف اس کا دھیان دلانے کی بات اٹھاتی ہوئی کہتی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ دھن کے لئے تھوڑی تپسیا کرنی نہیں پڑتی ہے مگر پھر بھی ہم نے اسے زندگی کی جتنی اہم چیز سمجھ رکھا ہے اتنی وہ نہیں ہے میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے یہ بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے انسان بنیں گے۔ خود غرضی اور ...

پھلے تھیں۔ زندگی کا سکھ دوسروں کو سکھی کرنے میں ہے۔ انہیں لوٹنے میں نہیں۔ بُرا نہ ماننا اب تک تمھاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش پرستی۔ ایشور نے ہمیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمھارے لئے زندہ بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس کے حصول پہ اگر کچھ تکلیف بھی ہو تو اس کا خیر مقدم کرو۔ اسے مصیبت سمجھتے ہی کیوں ہو یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تمھیں بے انصافیوں سے لڑنے کا موقع ملا ہے میرے خیال میں تو ظالم ہونے سے مظلوم ہونا کہیں بہتر ہے۔ دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما کو پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے کیا اسے اتنا جلد بھول گئے۔"

میں شروع میں اس بات پر کافی زور دے چکا ہوں کہ منشی پریم چند نے اشتراکیت کے نصب العین اور اشتراکیت کی انسان دوستی کو قبول کیا تھا نہ کہ اشتراکیت کی سائنس کو۔ ایسی صورت میں ان کے نصب العین کے درمیان اور ان کے سجھائے ہوئے اس آدرش تک پہنچنے میں تضاد کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن جو لوگ کہ تنقید کے اصول سے واقف ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ فنکار کی سماجی تنقید اور اس کا نصب العین اس کے سجھائے ہوئے راستوں سے زیادہ اہم ہوا کرتا ہے۔ جب مرزا خورشید نے مسٹر مہتا کے سامنے طوائفوں کی ناٹک منڈلی کی تجویز رکھی تو مسٹر مہتا نے ان کی اصلاحی کوششوں پر طنز کرتے ہوئے کہا "جب تک سوشل نظام اوپر سے نیچے تک بدل نہ ڈالا جائے اس طرح کی منڈلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا"۔ تو یہاں پریم چند کا انقلابی جذبہ اُبھر آتا ہے یہ انقلابی جذبہ مسز کھنّا کے اس جملے میں بھی ملتا ہے "انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے کیا اسے اتنا جلد بھول گئے"۔ اور یہ جذبہ گوبر کے اس جملے میں بھی پایا جاتا ہے جب گوبر ہوری سے اس کے آخری دنوں میں یہ کہتا ہے کہ جسے دو وقت کی روٹی میسّر نہ ہو اس کے لئے آبرو اور مرجاد سب ڈھونگ ہے اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبایا ہوتا ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا یہ اس کا ڈنڈ ہے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پر لٹکا ہوتا۔ پریم چند کا یہ انقلابی جذبہ ماتا دین کے کردار میں بھی اُبھرا ہے۔ ایک چمارن کے رکھ لینے پر ماتا دین کو برہمنوں نے گائے کا پیشاب اور گوبر کھلایا۔ ماتا دین اس رکیک عمل کے سامنے تو جھک گیا لیکن جتنا ہی وہ جھکا اتنا ہی زیادہ وہ اُبھرا بھی۔ اسے دھرم سے چڑھ ہو گئی۔ اس نے پروہتی کو گنگا میں ڈبو دیا اور یہ کہہ اُٹھا۔ "میں چمار ہی رہنا چاہتا ہوں جو اپنے دھرم کو پالے وہی براہمن ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پریم چند ایسے ہی انقلابی تھے تو انھوں نے ہوری کے بجائے گوبر کو کیوں نہیں ہیرو بنایا۔ یا اس کے کردار کو کیوں نہیں پوری طرح تعمیر کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ناول میں ایک کا تصور پرانا ہو چکا ہے۔ جب سے سماج کی زندگی پیش کی جاتی ہے تو اس میں کوئی ایک شخص اہم نہیں ہوا کرتا ہے بلکہ لاکھوں آدمی مل کر سماجی ترقی کے ایک رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ہم اس ناول گئودان میں صرف ہوری کی شخصیت یا اس کے ذاتی افسانے میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں بلکہ پورے گاؤں کی زندگی سے دلچسپی لیتے ہیں جس کی پرانی وحدت زرعی اقتصادیات سے ٹوٹ رہی تھی۔ اگر ایک طرف غلامی کے عہد کے باقیات کے خلاف بغاوت ہو رہی تھی تو دوسری طرف امپیریلزم کے ستون زمیندارانہ راج "بے دخلی" "بیگار" "نذر نذرانہ" "تاوان ڈنڈ" اور اس کے بُرے نتائج کے خلاف بغاوت کا شعلہ بھڑک رہا تھا لیکن چونکہ کسانوں کا طبقہ بلا شرکت غیرے اپنی غلامی کے جوئے کو اتار نہیں سکتا ہے تاوقتیکہ اس کی کوئی رہنمائی نہ کرے۔ اس لئے منشی پریم چند نے اپنے اس زمانے کے غالب رجحان کے تحت دانش ور طبقے ہی کو اس کی رہنمائی کے لئے منتخب کیا جو کہ صرف کسانوں ہی کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جد و جہد نہیں کرتا ہے بلکہ مجموعی اعتبار سے پورے سماج کے لئے۔ اس متوسط طبقے کے روشن خیال افراد کی انقلابیت منشی پریم چند کی نظر میں یہ تھی کہ وہ معاشرتی خرابیوں کی جڑ ہی کاٹ دیں وہ جڑ منشی پریم چند کی نظر میں زرعی اقتصادیات ہے جو انسانی رشتوں کو سماج سے خارج کر دیتی ہے وہ جڑ پونجی کا اکٹھا ہونا ہے۔ جس سے سرمایہ داری جنم لیتی ہے۔ اس پہ کھٹے میں ہوری کی پند لیٹی کسی زندہ اور انقلابی کسان کی جھینپ کھائی گئی ہے بلکہ ایک ایسے فریادی کی ہے جس کے گرد ظلم کے خلاف لڑنے والے سپاہیوں یعنی دانشمندوں کی فوج اکٹھا ہوتی ہے۔ ہوری اس ناول کا ہیرو ایک فریادی کی حیثیت سے ہے نہ کہ باغی [illegible]

کے ایک طیوارکی حیثیت سے - یہ فریادی ہوری جو رحم کی بھیک مانگتاہے سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے ہیرو نہیں ہے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیاہے وہ ہیرو اخلاقی قدروں کے بنانے' نباہنے اور برتنے کے نقطۂ نگاہ سے ہے۔ سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے تو فطری طور پر گوبر ہی ہیرو ہے جو کسانوں کی ایک نئی نسل کی نمائندگی کرتاہے جو زمیندارانہ استحصال' ورندکی اقتصادیات سے مجبور ہو کر شہر میں روزی کمانے کے لیے چلا جاتا ہے - نوکری چاکری اور خوانچہ گیری کی منزلوں سے گزر کر مل مزدور بنتاہے - اپنے حقوق کے لئے لڑتا ہے اور جب دیہات میں لوٹ کر آتا ہے تو مزدوروں کے شعور کو کسانوں میں بھی بانٹتا ہے - ناول میں یہ سارے اشارے موجود ہیں لیکن پریم چند نے شعوری طور پر پیش نہیں کیاہے کیونکہ وہ اشتراکیت کی سائنس کی طرف ملتفت تھے اور انھیں منظم مزدوروں کی زندگی کے دیکھنے کا اس وقت تک موقع ملا تھا چنانچہ یہی سبب ہے کہ جب شوگر مل میں ہڑتال ہوتی ہے تو وہ مزدوروں کو آپس ہی میں لڑا دیتے ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ ایسا ہوتا ہے - لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ نئے مزدور پرولتاری وحدت کے شعور کے تحت مل میں کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مل کی نوکری کے زمانے میں مزدور کی جو زندگی پیش کی یہ مزدوروں کا کوئی ٹیپیکل عمل نہیں ہے وہ صحیح ہوتے ہوئے بھی ٹیپیکل نہیں ہے - زندگی میں مزدوروں کی اخلاقی گراوٹ کا صرف ایک نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے - ان کا اخلاق اور وہ بلند معیار سامنے نہیں آتاہے جو مزدوروں کے اخلاق کو سرمایہ داروں کے اخلاق پر فضیلت بخشتا ہے لیکن یہاں ہم پریم چند کو معاف کر دیں کیونکہ وہ اصل میں صنعتی تہذیب کی بدکاریوں کو پیش کر رہے تھے نہ کہ گوبر کے اخلاق کو. گوبر ملِ کی زندگی سے ہٹتے ہی جبکہ وہ مس مالتی کا مالی بن جاتا ہے - وہ بداخلاقی کے اس گڑھے سے بھی باہر نکل آتا ہے — وہ تو سر پر چوٹ کھاتے ہی ٹھیک ہو گیا

منشی پریم چند اپنے آرٹ میں حقیقت نگار اور معلم اخلاقیات بہ یک وقت دونوں ہی ہیں - وہ حقیقت نگار ہیں - سماجی حقیقت کے تضاد کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور اپنے آرٹ میں نیچرلزم کے برتنے میں ان کا کوئی بھی کردار ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ ان نیچرل ہے لیکن جس حد تک وہ معلم اخلاقیات تھے - یعنی حقیقت کے تضاد کے فطری ارتقا کو دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کرتے اور صرف اخلاقیات کا سہارا لے کر ایک غیر فطری طریقۂ کار سے بدی کو خیر سے مسترد کر دیتے یا بدی کو خیر میں تبدیل کر دیتے - ان کے کرداروں میں غیر حقیقی عناصر کے پیوند بھی لگے ہوئے نظر آتے ہیں -

فنکار کے آئیڈیلسٹ ہونے یعنی کسی بلند نصب العین کے رکھنے اور حقیقت نگار ہونے میں تو کوئی تضاد مجھے نظر نہیں آتا ہے لیکن اس کے معلم اخلاقیات ہونے میں اس کا خطرہ پایا جاتا ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے راستے سے ہٹ جائے کیونکہ اس وقت فنکار بہ یک وقت دو چیزوں کی ترویج کرتا ہے ایک تو حقیقت کے ادراک کی اور دوسری اخلاقیات کی - پریم چند نے اپنے ناولوں میں جوں جوں اخلاقیات کی تعلیم کے بوجھ کو اپنے آرٹ میں ہلکا کیا ہے ان کی حقیقت نگاری ابھرتی گئی ہے - انسانی رشتوں پر زور دینا بذاتِ خود فن کی اخلاقیات ہے اسی کو انسان دوستی بھی کہتے ہیں - اس سے آگے جب بھی کوئی فنکار قدم اٹھاتا ہے کسی اخلاقی نظام یا آدرش کی ترویج کرنے کا تو اس کا فن آرٹ کے اپنے بلند مرتبے سے گر جاتا ہے - پریم چند کے ساتھ اگر زندگی نے کچھ اور دنوں وفا کی ہوتی تو وہ یقیناً اسی بلند مرتبے کو پہنچتے کیونکہ ان کا آرٹ اس منزل کی طرف گامزن نظر آتا ہے پھر بھی جیسا انھوں نے ہمیں دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان کا شمار دنیا کے بڑے فن کاروں ہی میں کیا جائے گا -

اب میں چند لفظوں میں کچھ ان کی تکنیک اور کرافٹ کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں - ناول یقیناً اظہار خیال ہی کا ایک ذریعہ ہے - لیکن وہ ذریعہ مشتمل ہے کردار نگاری پر - جس طرح شاعری میں تشبیہات اور استعارے رمز اور کنائے خیال کو زندگی اور احساس بخشنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اسی طرح ناول میں کیریکٹر کو استعمال کیا جاتا ہے - کسی بھی ناول میں کیریکٹر اور اس کی زندگی کے واقعات کے خالق ہونے کے علاوہ فن کار کی کوئی دوسری شخصیت واعظ - شارح اور مفسر کی نہیں ہوا کرتی - فلابیر نے اسی خیال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "فنکار کی پوزیشن اس کی اپنی تخلیق میں خدا کی طرح ہوتی ہے - وہ ہر جگہ ہوتا ہے اور کہیں بھی نہیں"۔ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ چونکہ منشی پریم چند ناول سے بہ یک وقت تعلیمِ اخلاقیات اور ادراکِ حقیقت دونوں ہی کا کام لینا

چاہتے تھے اس لئے وہ بالخصوص اپنے ابتدائی ناولوں میں واعظ ہی رہے ہیں - خواہ ان کے وعظ کا لہجہ میٹھا اور آسان ہی کیوں نہ ہو - منشی پریم چند کا یہ رجحان "چوگان ہستی" میں کم ہوجاتا ہے وہیں سے صحیح معنوں میں ہمیں جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں خواہ وہ ائیڈلسٹ رجحان کے حامل ہی کیوں نہ ہوں - ہوری کچھ کم ائیڈلسٹ ہے لیکن ایسا جیتا جاگتا ٹھوس اور پکّا کسان ہے کہ ویسا مجھے ابھی تک اپنے یہاں کسی ناول میں نظر نہیں آیا ہے - اس سلسلے میں یہ مشاہدہ کافی اہم ہے کہ جو زندگی اور جان مجسّم شخصیت منشی پریم چند کے کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کے کرداروں میں نظر آتی ہے وہ ان کے اوپر کے درجے کے کرداروں میں نظر نہیں آتی مثلاً "گئو دان" میں رائے صاحب اگرپال سنگھ مسٹر مہتا - مرزا خورشید - مسٹر کھنّا - مسز کھنّا - مس مالتی لیڈی ڈاکٹر یہ تمام ہی کردار اپنی اپنی انفرادی خصوصیات' اپنی اپنی داخلی عصبیتوں میں غیر اطمینان بخش ہیں - وہ ایک دوسرے سے مختلف یقیناً ہیں ان کی اپنی اپنی انفرادیت بھی ہے لیکن ان کی انفرادیت کا کوئی ٹھوس مرکز ثقل نظر نہیں آتا ہے لیکن یہ بات پنڈت اونکار ناتھ اور مسٹر ٹھنّا دلال کے کیریکٹر میں نہیں ہے - جو کہ نچلے متوسط طبقے کے ہیں - بات یہ ہے کہ منشی پریم چند کو پونجی والوں سے اتنی نفرت تھی کہ وہ عام حالات میں ان سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے - اس سے ان میں یہ کمزوری رہ گئی کہ اوپر کے طبقے کے کردار کو وہ اور زیادہ قریب سے دیکھ نہ سکے - منشی پریم چند کے کردار عشق و محبت میں بھی خوب پھنستے ہیں لیکن مشکل ہی سے کبھی وہ جنوں کی منزل میں بھی قدم رکھتے ہیں بجز صوفیہ کے جو کہ ہندوستانی نہیں ہے - کیا ایک صوفیہ کا دل مس مالتی کے سینے میں نہ تھا اور کیا مسٹر مہتا فلسفی ہونے کی وجہ سے انسان نہیں رہ گئے تھے - منشی پریم چند نے جس سختی کے ساتھ ان کے جذبات کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہے اس سے ان کی جذباتی زندگی کا کسی قدر قتل بھی ہوا ہے مجھے یہ قتل ٹالسٹائی کے ناولوں میں نہیں ملتا ہے حالانکہ معلّم اخلاقیات وہ بھی ہے - اس کا جواب وہ ہندوستانی سماج دے گا - جہاں محبت اور جذبۂ عبودیت کے درمیان کوئی خط جاگیردارانہ سماج میں کھینچا نہ جاسکتا تھا - اگر ایک طرف یہ چھوٹی موٹی کمزوریاں ان کی کردار نگاری میں ہیں تو دوسری طرف کچھ خامیاں ان کے ناول کی منطق یا پلاٹ میں بھی ہیں - کسی بھی ناول میں پلاٹ اجزائے کل کی مصنوعی تکوین کی ضرورت سے ابھرتا ہے - چنانچہ پلاٹ کی سازش قصّے کے فطری پن کو قتل کر دیا کرتی ہے - منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں پلاٹ کی سازش موجود ہے یہ سازش میدان عمل میں بھی ہے جہاں جیل میدان عمل کی ایک منزل نہیں بلکہ روحانی یاترا کا گھاٹ بن جاتا ہے - قصّے کا فطری پن تو صرف "گئو دان" ہی میں ابھرا ہے - اس ناول میں وہ قصّے کو کسی بھی یاترا پر ختم نہیں کرتے ہیں بلکہ لامتناہی سلسلۂ عمل کے رشتے میں چھوڑ دیتے ہیں - ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ گاؤں اور شہر کے درمیان اس قربت کو پیش نہیں کرتے ہیں جو کہ ان کے زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع کے بڑھنے سے پیدا ہوگئی تھی - مس مالتی اور مسٹر مہتا دیہات کی زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن ہوری کے گاؤں والے گوبر کے شہر کی زندگی میں کوئی دلچسپی لیتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں - حالانکہ جھنگری' بیشوری اور نیکھے رام ان بنیوں ہی کے لڑکے شہر میں انگریزی پڑھتے تھے اور تعطیل میں گھر آتے تھے اس کمزوری کے باوجود جیسی زندہ تصویر انھوں نے ہوری کے گاؤں کی کھینچی ہے اس کی مثال اردو ہندی کے ادب میں نہیں ہے لیکن وہ زندہ تصویر شہر کی زندگی اجاگر کرنے میں نہیں ملتی ہے - آخر میں ایک بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں - منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں کا اسلوب ناہموار ہے لیکن گئو دان میں ان کا اسلوب بالکل ہموار اور خالصتاً ان کا اپنا ہے - جو فنکارانہ ہونے کے باوجود قابل تقلید ہے - ممکن ہے کہ یہاں کچھ لوگ یہ بات اٹھائیں کہ اسلوب وہی اچھا ہوتا ہے جو ناقابل تقلید ہوتا ہے میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں - سچائی اور خلوص کا اسلوب آدمی کے لہجے میں گفتگو کرنے کا اسلوب ہمیشہ ہی قابل تقلید ہوتا ہے - ہندوستانی زبان کی تعریف بہت سے مولویوں اور پنڈتوں نے کی لیکن وہ سچائی تک پہنچ نہ سکے - اس سچائی تک منشی پریم چند ہی پہنچے ہیں - جو زبان ہوری کے گاؤں میں بولی جاتی ہے وہی اودھ میں ہندوستانی کا دیہاتی فارم ہے - اور جو زبان شہر میں پنڈت اونکار ناتھ صحافی اور مزدور بولتے ہیں وہی اس کا اودھ میں شہری فارم ہے - میں نے منشی پریم چند کا نام نہیں لیا ہے - بلکہ پنڈت اونکار ناتھ کا جو مزدوروں کا اخبار "بجلی" نکالتے تھے -

رحمان راہی

تصویرک زٕ رُخ

کشمیری

نیَبس پٮ۪ٹھ تارہ کوٗ کرِہ مالہٕ مخٔنتسٕ
مہ باسیوٚ زَن ژٕہ ژٕھک نبتیٖ اُمارَن سان ہیینہٕ درامژٕ
گوٚ ہُو پتہٕ ژٕ ووٚنہٕ کوٚرژھل کالہٕ اوٚبرس
مہ وٚوٚپ ظاہر چھ چاَنی ٹاٹھ کانہہ وٚتیس سوِن گُن آمژٕ

صُبح پھوٚل بُلبُلو کوٚر بول بوشاہ
مہ باسیوٚ زَن ژٕ ژٕ ژھک میٹھہٕ آوٗ دِتھ مہ وُزہ ناوان
ہوا وٚوٚل تتِھہ پھوٚل اکھ دانہٕ پوشاہ
گماں سپدُم چھ چاَنی لوِ لہٕ مَنشٕ نارٕ ژھکراواں

وٚلسٕ دٔلہٕ موج پیٚ تھتھراۓ آبَس
مجہ چھم آدٕنگ کانہہ ادساہ آسی ژٕ تِیہ تنبلیوٚمت
بوٚھٹیو پنیٚنہٕ نک چھ پاراں ناوٕ تارس
مہ باساں دُورگامَن ساَل کرٕنک ظَن ژٕ تِیہ چھئی پیوٚمت

آجکل دہلی

تصویر کے دو رُخ

ترجمہ

ستارے آسمان پر موتیوں کے ہار پرو رہے ہیں
اور (انھیں دیکھ کر) مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تو ہی میری محبوبہ اپنی آرزوؤں کا جائزہ لینے نکلی ہو
پہاڑوں کے پیچھے سے چاند کالے بادلوں کی گرفت سے نکل آیا
میں سمجھا جیسے تمھاری ہی کوئی پیاری سہیلی کافی دنوں کے بعد ہمارے یہاں آ رہی ہو۔

صبح ہوئی اور بلبلیں چہک اُٹھیں
میں نے یوں محسوس کیا جیسے تم ہی اپنے میٹھے بول بول کر مجھے نیند سے جگا رہی ہو۔
نسیم کا جھونکا آیا اور انار کا سُرخ پھول کھل اُٹھا
مجھے یوں گمان گزرا جیسے تمھاری ہی محبت کے آتش دان میں انگارے دہک رہے ہیں

جھیل ڈل کی سطح آب پر ایک لطیف سا ارتعاش پیدا ہوا
میں جانتا ہوں تمھارے دل میں جوانی کی کوئی امنگ مچل اُٹھی ہوگی
دریا کے کناروں پر لوگ پار اُترنے کے لئے کشتی کا انتظار کر رہے ہیں
میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے تمھیں دُور دُور گاؤں کی سیر کا شوق چرایا ہے

کمٔلن پیٹھٕ بیاں سہ ہے ہاٲلِ درامُت
خبر ژٕسے ماہیژرت کوٚچھہ کوٚچھہ کرنِ تِسٕ منز بکیس لاںسس
چھہ رٕونہ پانسٕ سمتھ اَز ژاٹ آمُت
خبر ژٕسے مادٕ وٕینت گوٚژھہ پوٚتُھ چھاوٕن زاشُرنی ناںسس

بنجارِیاہ بکھہ دوان دراوسا نہ بَرتٕلِ
پَژ ہی آسی ژٕ یہ اندِ پکھٕ ریشمٕچ تھرتھراےٚ ہیش باسان
چھیٚر گنڈٕ شٕتر. بوٚانہ ہا بانکہِ ژوٹ ژلِ
خبر چھیٚم ماوسٕن منز چھےٚ ژٕ یہٕ نَشرٕچ ترائے ہیش باسان

حمالس خون گرمیو بور سارا ن
مِہ دوٚپ ژٕسے شولہ تو وُتھ ژٕ ونگ شامن جوٚزِ نٕ گٔنزران
خوٚجس شکرٕ یو نیدٕ یوٚ راہ خشم ہا ران
مہ باسیو زٕن ژٕہ پوٚنئ وٲنسٕس نِش چھیک نیاےٚ کالہ اُنزران

چھواں آس ہہر نیاہ سوٚرمس تہ سازس
مہ دوٚپ ظاہر یہ چھیک ژٕ ی یادٕ پنٕ کالہ شوٚرخ یٕنِ بیران
جواناہ اکھ دوٚچھم دوران محاذس
مہ باسیو زٕن ژٕہ پینہ نِسٕ آنگنسٕ چھیک پرانٕ وِژس شیران

چھہ کٲبیاہ زندگی ہند رنگ شوٚبان
چھہ کاٚ زاہ دِلکشی بیچھرٕ ہیوٚ چانیو اَزواژ رواد
دیٚنج معدٕ وٕیشتہ دِل چھہ ژوبان
بیٚن وٕینت چھہ چھیک راحتس چانیو اعازو واد

کسان اپنے دامنوں میں نئی فصلوں کے بیج بھر کے کھیتوں پہ آ رہے ہیں
کیا معلوم تمھیں نے اپنے پنگھوڑے کے لال کو کروٹ میں جھلانا تو شروع نہیں کیا ہے
رفوگری کا کام کرنے والے کم سن شاگرد اپنے اُستاد کے ہاں روزانہ اجرت لینے آتے ہیں
ممکن ہے تم نے اپنے نوزائیدہ لال کے گریبان پر ریشم سے کشیدہ کاری کی سوچی ہو۔

پھیری والا پارچہ فروش ابھی ابھی ہماری دہلیز سے آوازیں لگاتا گزرا
کوئی تعجب نہیں کہ تمھیں ہر جانب سے ریشم کی سرسراہٹ محسوس ہوئی ہو
ایک بچّہ ابھی ابھی لٹو خریدنے کے لئے مچل اُٹھا
میں جانتا ہوں کہ تمھیں اپنی آرزوؤں میں ناچنے اور تھرکنے کا انداز جاگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں

حمال کا لہو بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اُبلنے لگا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمھیں نے شام ہوتے وقت اپنی کاتی ہوئی پشم کے تاگے گن کے دیکھنا شروع کیا ہے
ایک نادار محنت کش نے کسی سرمایہ دار کو سختی سے جھڑک دیا
میں نے یوں محسوس کیا جیسے تمھیں پشم کے کسی تاجر سے اپنا کوئی تصفیہ چکا رہی ہو۔

ایک دُلھن اپنے ہار سنگار پر اترا رہی تھی
میں نے سمجھا جیسے تمھیں اپنی جوانی کا کوئی شوخ تانا بانا بُن رہی ہو
میں نے ایک نوجوان کو مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے محاذ پہ دوڑتے دیکھا
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تم اپنے آنگن کی پرانی دیوار کی مرمت کر رہی ہو

زندگی کے یہ رنگ کتنے بھلے لگتے ہیں
تمھاری اداؤں نے کس قدر دلکشی پائی ہے
زمانے کی دوڑ دیکھ کر دل بیٹھا جا نہیں سکتا
تمھاری آمنگوں نے اس بری مجبور ذات کو زندگی میں جدوجہد کا سبق دیا ہے

حبیب الرحمٰن غزنوی

گجراتی زبان و ادب

پر

عربی فارسی اور اُردو کے اثرات

(۲)

گجرات میں مسلمانوں کی حکومت

۱۰۲۵ء میں محمود غزنوی براہ ملتان گجرات پر حملہ آور ہوا۔ گجرات کا سولنکی راجہ بھیم دیو (۱۰۲۲ء-۱۰۷۲ء) انہلواڑ (پٹن) سے فرار ہو کر کچھ جا پہنچا۔ محمود نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ اور سوراشٹر کے آخری سرے پر جا کر سومناتھ۔ پاٹن پر یلغار کی۔ اس مہم میں کامیاب ہو کر وہ کچھ کا ریگستان طے کرتا ہوا براہ ملتان غزنی کو واپس لوٹ گیا۔ محمود غزنوی کے ہم عصر مورخ عتبی اور البیرونی نے سومناتھ کا مندر توڑنے کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ محمود کے درباری شاعر فرخی نے اپنے ایک قصیدے میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ فرخی اس مہم میں محمود کے ہمرکاب تھا۔

محمود کے بعد ۱۱۷۸ء میں شہاب الدین غوری نے گجرات پر فوج کشی کی، مگر اس مہم میں اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ البتہ گجرات کے دوسرے سولنکی راجہ بھیم دیو (۱۱۷۶ - ۱۲۴۳ء) کے عہد میں شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۴ء میں گجرات پر یلغار کی۔ پٹن کے محاذ پر بھیم دیو کو شکست ہوئی اور قطب الدین ایبک اُس سے تاوانِ جنگ اور خراج وصول کر کے واپس لوٹ گیا۔ اس دوران میں شہاب الدین غوری دہلی میں قطب الدین کو اپنا نائب مقرر کر کے افغانستان چلا گیا تھا۔ قطب الدین نے ۱۱۹۶ء میں گجرات پر دوسرا حملہ کیا اور اس پورے علاقے کو فتح کر کے یہاں اپنا نائب مقرر کر دیا اور خود واپس دہلی لوٹ گیا۔

۱۲۹۷ء میں علاء الدین خلجی نے اپنے سپہ سالار اُلغ خاں کو ایک عظیم الشان فوج دے کر گجرات کے باگھیلا راجپوت راجہ کرن گھیلا کے مقابلے پر روانہ کیا۔ اُلغ خاں نے کرن گھیلا کو اس جنگ میں شکست دی، اور یہیں سے گجرات پر مسلمانوں کا عملاً تسلط ہو گیا۔ اس کے بعد کسی راجپوت یا گرجر راجہ کو گجرات پر حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اسی وقت سے گجرات دہلی کی مرکزی حکومت کے زیرِ نگین ہو گیا تھا، اُلغ خاں کے بعد ۱۲۹۷ء سے ۱۳۲۰ء تک آٹھ نائبین حکومت دہلی کی مرکزی حکومت کی جانب سے سرزمین گجرات پر حکمرانی کرتے رہے۔ اسی طرح خاندان تغلق کے عہد میں ۱۳۲۰ء سے ۱۴۰۳ء تک ۱۴ نائبین یکے بعد دیگرے گجرات کا نظم و نسق سنبھالتے رہے۔ غرضیکہ کم و بیش دو صدی تک سلاطین دہلی اپنے عمال اور ناظموں کے ذریعے گجرات پر حکمرانی کرتے رہے۔

سلاطینِ گجرات

۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے نے دہلی کی مرکزی حکومت کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اُس وقت گجرات میں ظفر خاں مرکزی حکومت کی جانب سے ناظم الامور تھا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر میں جس طرح خضر خاں نے ملتان میں، دلاور خاں نے مالوہ میں اور ملک سرور نے جونپور میں اعلان استقلال کر دیا تھا، اسی طرح ظفر خاں نے بھی گجرات میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پٹن اس کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۴۰۳ء میں ظفر خاں کا بیٹا تاتار خاں سریر آرائے سلطنت ہوا، اور اس نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا، لیکن وہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکا، اور اس کے انتقال کے بعد ظفر خاں نے بذاتِ خود مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس طرح گجرات پر سلاطینِ گجرات کی مستقل حکومت قائم ہو گئی اور ۱۴۰۳ء سے ۱۵۷۲ء تک ۱۲ بادشاہوں نے گجرات پر حکومت کی۔

گجرات پر مغلوں کا تسلط

سلطان مظفر شاہ ثالث (۱۵۶۰ء سے ۱۵۷۲ء) کا عہدِ حکومت

نہایت متزلزل اور کمزور تھا۔ اسی کے عہد میں اکبر نے گجرات پر فوج کشی کی اور معاً گجرات دوبارہ دہلی کی مغل سلطنت کے اقتدار میں چلا گیا۔ اکبر کے بعد جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب وغیرہ گجرات پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس عرصے میں مرکزی حکومت کی جانب سے گجرات پر ۵۹ صوبیداروں کا یکے بعد دیگرے تقرر ہوتا رہا جن میں مرزا عزیز کوکا، عبدالرحیم خان خاناں، شاہجہاں (بہ عہد شہزادگی) اور دارا شکوہ کا زمانہ نہایت پُرامن رہا۔ گجرات میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔

بہرحال گجرات میں مسلمانوں کی حکومت کم و بیش پونے پانچ سو سال رہی۔ اس کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے۔

سلاطین دہلی کا اقتدار ۱۲۹۵ء سے ۱۴۰۳ء تک۔ سلاطین گجرات کا اقتدار ۱۴۰۳ء سے ۱۵۷۳ء تک۔ اور پھر سلاطین مغلیہ کا اقتدار ۱۵۷۳ء سے ۱۷۵۷ء تک۔

زبان کی بحث

غلبہ اور استیلا کی تشریح کرتے ہوئے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے، ذہنی اور اخلاقی غلبہ، اور دوسرا سیاسی اور مادّی غلبہ۔ کسی قوم کے ذہن و اخلاق کا ماؤف اور مرعوب ہو جانا یا سیاسی اور مادّی اعتبار سے کمزور اور خستہ ہو جانا اس کی ذہنی، اخلاقی، سیاسی اور مادّی موت کے مترادف ہوتا ہے۔ ایک قوم اپنی فکری اور نظری قوتوں میں اس قدر ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار و نظریات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے لگیں، اسی کے خیالات و عقائد کا سکّہ چلنے لگے۔ قلوب و اذہان اُسی کے سانچے میں ڈھل جائیں، اُسی کی تہذیب و معاشرت کو تہذیب و معاشرت سمجھا جائے، اُسی کے علم و فن پر ایمان لایا جائے۔ غرضیکہ اُسی کے تمام رطب و یابس کو صحیح و مسلّم جانا جائے تو اسے ذہنی اور اخلاقی غلبہ قرار دیا جائے گا۔

یا کوئی قوم سیاسی اور مادّی ذرائع و وسائل کے اعتبار سے اتنی طاقتور ہو جائے کہ دوسری قومیں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے باعث اس کے مقابلے میں اپنی سیاسی آزادی برقرار نہ رکھ سکیں، اور جذبۂ جاں سپاری کے غلط اور خوشامدانہ تصور میں مگن رہتے ہوئے اپنے وسائلِ ثروت اُسی کو تفویض کر دیں تو اسے سیاسی اور مادّی غلبہ سے تعبیر کیا جائے گا۔

آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے گجرات کی بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ گرجر قوم عرب تاجروں یا حملہ آوروں کی طرح تازہ دم اور تازہ خون نہ تھی۔ بلکہ گرجستان سے چلنے کے بعد اور گجرات میں پہنچنے تک وہ کئی علاقوں کو اپنا وطن بنا چکی تھی۔ مختلف علاقوں میں قیام اور صدیوں تک کی خانہ بدوشی، ایران، افغانستان، بلوچستان، پنجاب، راجستھان اور مارواڑ کی اقوام سے میل جول اور باہمی ربط و اختلاط نے گرجروں کی ذہنی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی حالت پر بڑے دُور رس اثرات مرتب کئے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گجرات میں متوطن ہونے کے بعد رفتہ رفتہ یہ قوم تدبّر اور تفکّر کے میدان میں ضعیف اور درماندہ ہوتی چلی گئی۔ دوسری اقوام کے تتبّع اور مقامی لوگوں کے رسم و رواج، لباس اور وضع قطع کی پیروی نے اس کے قلوب و اذہان کو تقلید جامد کا شیدائی بنا دیا تھا۔ دراصل جو قوم تقلید کی خوگر ہو جاتی ہے قدرت اُسے اجتہادی غور و فکر کی دولت سے محروم کر دیتی ہے۔

الغرض ——— بیرونی تاجروں اور حملہ آوروں کا تسلّط و اقتدار جوں جوں بڑھتا گیا۔ گجراتیوں میں احساس کمتری اور غلط قسم کی خیر سگالی کا جذبہ بھی ترقی کرتا گیا۔ گجراتی زبان پر براہِ راست عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ محکومیت اور مرعوبیت نے فاتح اور طاقتور اقوام کی زبان، تہذیب اور معاشرت اختیار کرنے پر انھیں اکسایا۔ روزمرّہ کی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں نے اپنے اثرات دکھائے اور نتیجے کے طور پر ایسے بیسیوں عربی، فارسی الفاظ گجراتی زبان میں داخل ہو گئے جن کا کوئی بدل گجراتی زبان میں نہ تھا۔ چونکہ وضع و اختراع کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ اس لئے عربی، فارسی کے متعدد الفاظ انھیں بجنسہٖ قبول کر لینے پڑے۔

نئے الفاظ

مشہور اسکالر پروفیسر چھوٹو بھائی نائک نے لکھا ہے کہ۔

نئے لوگ اپنے ساتھ تعمیرات کے نئے نام اور نئی وضع قطع بھی لائے تھے، انھوں نے یہاں مسجدیں (ع) مینارے (ع) قلعے (ع) برج (ع) اور دروازے (ف) تعمیر کئے۔ چونکہ گجراتی میں ان تعمیرات کے لئے مخصوص نام اور الفاظ نہیں تھے، اس لئے یہی الفاظ بجنسہٖ گجراتی میں داخل ہو گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ ایسے الفاظ اس زبان میں اس طرح رچ بس گئے کہ آج انھیں جدا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔

اسی طرح کئی ایک تجارتی اور روزمرّہ کے استعمال کی چیزوں کے [illegible]

نام جیسا فلاؤ قعیں جیسے شراب اور تقی عرب سے آئے ۔ سرمہ اور گلاب ایران سے آئے ۔ شام سے اطلس آئی ، ترکی سے توپ آئی ، بندوق اور خنجر خراسان سے آئے ۔ پہاڑوں سے برف (ف) منگوا کر پانی ٹھنڈا کرنے کا طریقہ بھی مسلمانوں نے رائج کیا ۔ انھوں نے اپنے مکان کے دریچوں پر پردے (ف) لٹکائے ۔ وہ لوگ اپنے ساتھ دیگ (ف) رکابی (ف) پیالہ (ف) اور خوانچے (ف) بھی لائے ۔ رات کو روشنی کے لئے انھوں نے فانوس (ف) استعمال کئے ۔ راستوں پر مشعلیں روشن کیں ۔ مقامی لوگ گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوتے تھے ۔ مسلمانوں نے یہاں آکر زین (ف) لگام (ف) رکاب (ع) اور مہمیز (ع) کو رواج دیا ۔ انھوں نے یہاں حوض (ف) فوارہ (ع) باغ (ف) اور باغیچے (ف) بنوائے ، کھانوں میں بریانی (ف) حلوہ (ع) جلیبی (ف) برفی (ف) اور کباب (ع) رائج کئے ۔ لباس میں پاجامہ (ف) ازار (ع) پیرہن (ف) اور ڈگلا (ف دگلہ) کو رواج دیا ۔ بہرحال اسی طرح بے شمار عربی ، فارسی اور ترکی الفاظ گجراتی میں آمیز ہوتے چلے گئے ۔

گجرات کی ناگر قوم

چونکہ اُردو زبان بجائے خود عربی ، فارسی ، ہندی اور ترکی کا مرکب ہے ۔ اس لئے عربی ، فارسی کے علاوہ خود اُردو زبان نے براہِ راست گجراتی زبان کو کس طریقے پر اور کس دور میں متاثر کیا ۔

مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں چونکہ سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی ، اس لئے بہ تقاضائے وقت گجراتیوں نے اس زبان کو اپنالیا ، ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ کائستھ ، برہم چھتری اور ناگر سب سے پیش پیش تھے ۔ اس عہد میں تمام کلیدی عہدوں اور منصبوں پر انھیں کا تصرّف ہوگیا تھا ۔ ناگر قوم چونکہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ وارفع سمجھتی آئی تھی ۔ اس لئے سرکاری محکموں میں عمل ودخل اس نے اپنا حق سمجھ لیا تھا ۔ ناگروں کی تاریخ بھی اس امر کی شاہد ہے کہ انھوں نے تاریخ کے پچھلے ادوار میں بھی بڑے بڑے منصب اور سرکاری عہدے حاصل کئے تھے ۔ ولبھی میترک راجاؤں ۵۰۰ تا ۸۰۰ء تک کے جو کتبے ملتے ہیں انہیں بھی وڈنگر (شمالی گجرات) کے ایک برہمن کا ذکر پایا جاتا ہے ۔ اور اس کے بعد بھی سولنکی اور باگھیلا نسل کے راجاؤں کے عہد میں بھی وزارتوں اور دیگر سرکاری عہدوں پر ناگر ہی قابض تھے ۔

ناگروں کا مسلمانوں سے پہلا سابقہ محمود غزنوی کے عہد میں (۱۰۲۴ء) میں پڑا ۔ اس کے بعد غوری ۔ ایبک ۔ خلجی کے عہد میں اُنھوں نے فارسی زبان سیکھنے پر توجّہ دی ۔ اگرچہ محمود غزنوی کے حملے سے لگا کر اکبر کی یلغار تک تقریباً چھ سو سال کے درمیانی عرصے میں گجرات میں فارسی زیادہ رائج نہیں ہوئی تھی ، تاہم اس کی تعلیم کا آغاز ہوچکا تھا ، اور سکندر لودھی (۱۴۸۹ء سے ۱۵۱۷ء) کے عہد میں جابجا فارسی تعلیم وتدریس کے مدارس چل رہے تھے ۔ سولھویں صدی عیسوی سے پہلے بھی ممکن ہے ناگروں نے فارسی زبان میں ید طولیٰ حاصل کرلیا ہو مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ۔ گجرات ودّیا سبھا کی جانب سے پروفیسر چھوٹو بھائی نائک نے ناگروں کی فارسی دانی سے متعلق ایک کتاب گجراتی میں تصنیف کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناگروں نے فارسی زبان میں درجۂ کمال حاصل کرلیا تھا ۔ نیز اس سلسلہ میں گجرات کے مشہور ماہر لسانیات اور ودّیا سبھا کے ریسرچ اسکالر پروفیسر کے ۔ کا ۔ شاستری اور مشہور گجراتی ادیب و مصنف جینتی دلال سے میں نے بارہا تبادلۂ خیالات کیا ہے عنقریب ہی میں گجرات کے ناگروں کی فارسی دانی پر ایک سیر حاصل مقالہ 'آج کل' کے ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا ۔

عہدِ اکبری میں فارسی کا رواج

اکبر کے وزیر محاصل راجہ ٹوڈرمل نے ۱۵۸۲ء میں جب فارسی کو سرکاری اور دفتری زبان قرار دیا ، اُسی زمانے سے ہندوؤں نے عموماً اور گجرات کے ناگروں نے خصوصاً فارسی زبان کی تحصیل کی جانب توجہ کی ، تاآنکہ ان لوگوں نے اس زبان میں اس قدر استعداد پیدا کرلی کہ اُس عہد کی مُسلم حکومتوں میں دیوان (شعبۂ محصولات کا افسر اعلیٰ) وکیل (سرکاری ایجنٹ یا سفیر) بخشی (تنخواہ تقسیم کرنے والا) دفتردار (محاسب یا اکاؤنٹنٹ جنرل) چٹنیکار (سکرٹری یا پرسنل اسسٹنٹ) وغیرہ کے عہدوں پر عموماً ناگر ہی فائز ہوتے رہے ، اور یہ عہدے اُن میں نسل درنسل اس طرح جم گئے تھے کہ جس خاندان کا کوئی بزرگ جس عہدے پر فائز ہوتا اُس کا پورا خاندان اسی عہدے کے نام سے مشہور ہوجاتا ۔ گجراتی میں اس لقب کو انک کہتے ہیں ۔ چنانچہ آج بھی گجرات کے ہندوؤں میں دیوان ، وکیل ، بخشی ، دفتری وغیرہ انکیں رائج ہیں ۔ اور بقول پروفیسر نائک ۔ جو لوگ کسی مسلمان حاکم یا عہدیدار کے پاس ملازم ہوتے وہ بھی اپنے آقا کے عہدے کو اپنی انک بنا لیتے ۔ چنانچہ

گجرات کے ہندوؤں میں سید، بادشاہ، بنقی، حضرت، معصوم، بادشاہ، منشا اور شاہ وغیرہ کی اٹکیں عام ہیں۔ یہ رواج عہد اکبری میں کافی عروج پر تھا۔ اور آج بھی یہ اٹکیں باوجود امتداد زمانہ کے جوں کی توں قائم ہیں۔

اس سلسلے میں گجرات کی مشہور ادیبہ دنو دینی نیل کنٹھ نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں گجراتیوں کی تمام مروجہ اٹکوں پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ عہد اکبری اور اس کے بعد بھی ناگروں اور دیگر ہندو جاتیوں میں بچوں کے فارسی آمیز نام رکھے جانے کا عام رواج تھا۔ مثلاً مجلس رائے، گلاب چند، ہمت لعل، صاحب داد، خوشحال رائے، دولت رام، نعمت رائے، بلاقی داس، چمن لعل، حکومت رائے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہی وہ زمانہ تھا جس میں گجراتی زبان کافی حد تک فارسی سے متاثر ہوئی۔ بہت سے عربی الفاظ تو براہ راست گجراتی میں داخل ہو گئے تھے لیکن عربی الفاظ کا ایک معتد بہ حصہ فارسی کے ذریعے بھی گجراتی میں شامل ہو گیا تھا۔

گجراتی زبان میں عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا ذخیرہ

گجرات سماچار (احمد آباد) کے سالنامہ میں پنڈت بیچر داس دوشی کا ایک محققانہ مقالہ تین سال قبل شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے گجراتی کے ایک مشہور لغت "سارتھ جوڈنی کوش" کا اس طرح تجزیہ کیا ہے۔

اس لغت میں کُل ۵۶۸۳۰ الفاظ شامل ہیں۔ جن میں:-

۲۰۲۶۵۔ سنسکرت

۱۷۵۶۔ فارسی

۸۲۴۔ عربی

۳۶۰۔ انگریزی

۱۸۳۔ ہندی

۴۴۔ مرہٹی

۲۷۔ ترکی، اور

۲۹۔ پرتگیزی زبان کے الفاظ ہیں۔

سنسکرت الفاظ تو چونکہ گجراتی زبان کی بنیاد ہیں، اور وسطی ایشیاء سے آئے۔ لہٰذا ان کی کثرت ایک قدرتی بات ہے۔ البتہ گجراتی میں سنسکرت الفاظ کی مندرجہ بالا جو تعداد بیان کی گئی ہے۔ اُن میں سے سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو صرف علمی اور تحقیقاتی مضامین ہی کے لئے گجراتی میں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ عوامی بول چال کے لئے یہ الفاظ اب متروک اور غیر مانوس بن گئے ہیں۔ صحافتی زبان میں بھی ان کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

گجراتی زبان کا تلفظ

عہد حاضر کے مشہور ادیب پروفیسر رتن لال وسنت لال دیساتی (جن کا انتقال اسی سال ہوا ہے) کا قول ہے کہ۔

"گجراتی زبان تلفظ کے اعتبار سے کسی حد تک بے جان سی واقع ہوئی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عہد متوسط کے گجراتی شعراء اور ادبا نے اس زبان کو زیادہ سے زیادہ نرم و نازک اور فصیح و بلیغ بنانے کی کوششیں ضرور کی ہیں۔ مگر دوسری جانب اسے جوہر مردانگی سے یکسر خالی اور زنانہ بنا کر رکھ دیا۔"

(اسٹڈیش - دیوالی انک)

اور جب ہم سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) کی گجراتی زبان کا گجرات کی گجراتی سے مقابلہ کرتے ہیں تو مندرجہ بالا قول کی صداقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سوراشٹر کی گجراتی دلکش اور شیریں ہونے کے ساتھ ساتھ رزمیہ شاعری کے لئے بھی کافی موزوں ہے۔ جبکہ گجرات کی گجراتی صرف دلکش و شیریں ہی ہے۔ رزمیہ شاعری کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اب تک کوئی رزمیہ شاعر گجراتی میں نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ موجودہ دور کے گجراتی غزل گو شعراء نے اب کسی حد تک اس زبان کو چُست اور مردانہ وار بنانے کی کوششیں شروع کی ہیں۔ اور اُنھیں اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور جگر مرادآبادی کے تتبع میں گجرات کے غزل گو شعراء نے جو کلام اب تک پیش کیا ہے، نیز پیش کر رہے ہیں وہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ، تراکیب اور اسالیب اور تلفظ کے اعتبار سے کافی زوردار ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی کے وسطی زمانہ تک ـــــ یعنی کم و بیش ساڑھے سات سو سال تک ـــــ گجراتی زندگی ذہنی اور سیاسی اعتبار سے مجبور و محکوم رہی۔ راجہ کرن گھیلا (۱۲۹۷ء) کے بعد سے اب تک کسی گجراتی راجہ کو اس سرزمین پر آزادانہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ گجرات کے مسلمان سلاطین ـــــ سلطان محمد شاہ تغلق سے سلطان مظفر شاہ ثالث تک ـــــ نے گجرات کی قومی خصوصیات کو ختم ...

کی کوشش کی تھی مگر سولھویں صدی میں اکبر کی فتوحات نے ان کوششوں کا بھی خاتمہ کر دیا، اور گجرات کلیتاً ان سلاطین و حکمرانوں کے غلبہ و استیلا کا شکار رہا جنھوں نے اس علاقے کے قومی اوصاف کا عملاً خاتمہ کر دیا۔ ممکن ہے گجرات کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے داخلی طور پر اپنی قومی خصوصیات کو کسی حد تک زندہ و برقرار رکھا ہو، مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس طویل و مسلسل عہد محکومی میں کوئی ایسی ہمہ گیر تحریک گجرات میں رونما نہیں ہوئی جو گجراتیوں کی قومی خصوصیات اور تاریخی روایات کو زندہ رکھ سکتی جس طرح کہ بنگالیوں، مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے قومی اوصاف اور قومی مزاج کو زندہ و برقرار رکھا ہے۔ اس طویل دور کے لازمی اثرات — جو گجراتی تہذیب اور معاشرت کی اقدار کو پامال کر چکے تھے — گجراتی زبان و ادب میں بھی ظاہر ہو کر رہے۔ برعکس ازیں کاٹھیا واڑ میں اب تک کاٹھی، راجپوت اور مسلمانوں کی ریاستیں قائم تھیں، نیز وہاں کے بھاٹ اور چارن کے راجاؤں نوابوں اور کا دو مکرانی یا خورسند ہوانی ایسے ڈاکوؤں کے کارنامے نظم کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اس زبان میں زور اور طاقت قائم رہا ہے۔

جغرافیائی اثرات

کسی بھی قوم کی زبان اور ادب کی تعمیر و تشکیل میں جغرافیائی اثرات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ کوہستان یا ساحلی علاقوں میں رہنے والی قومیں عموماً جفاکش اولوالعزم، حوصلہ مند اور دلیر ہوتی ہیں۔ گجرات کی سرزمین پہاڑوں سے یکسر خالی ہے بعض بعض علاقوں میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں واقع ہیں۔ لیکن ۸۰ یا ۹۰ فی صدی علاقہ میدانی اور سپاٹ ہے۔ البتہ سمندر کا بہت بڑا ساحل گجرات کو گھیرے ہوئے ہے۔ تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ سمندری سفر اور امواج بحر کے تیز و تند تھپیڑے ساحلی علاقوں میں بسنے والی قوموں کی زندگی پر بڑے دور رس اثرات مرتب کرتے ہیں، اور خود گجرات کی تاریخ اس امر کا ثبوت پیش کر رہی ہے کہ اس سرزمین پر جس قدر فاتح اقوام آئیں وہ یا تو دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں رہنے والی تھیں یا سمندر کی طغیانیوں سے کھیلنے والی تھیں۔

گجرات کو پہاڑی علاقے تو چنداں نصیب نہیں ہوئے لیکن بمبئی سے لگا کر سورت، کھمبات، بھروچ، دمن، دھولیرا، گھوگھا، جعفر آباد، دیو، ویراول، مانگرول، پسیل بندر، بھاؤنگر، جام نگر، اوکھا پورٹ اور تو لکھی تک سب کا سب ساحلی علاقہ ہے۔ جہاں سمندر کی موجیں دیوانہ وار ساحل گجرات سے ٹکراتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ گجراتیوں نے امواج بحر کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ ان کی روایاتی زندگی میں سمندر کا سفر گناہ سے تعبیر ہوتا رہا۔ تقریباً سو سال کا عرصہ ہوا کہ انھوں نے سمندری راستے سے تجارتی سفر شروع کئے۔ آج وہ انگلینڈ امریکہ، یورپ اور مشرق بعید کو بھی جاتے ہیں، لیکن وہ سفر انھوں نے قطعی نہیں کئے جو ان میں جفاکشی اور اولوالعزمی پیدا کرتے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین نے بہترین سیاست دان، بہترین صنّاع، بہترین ریاضی دان، بہترین شاعر اور ادیب پیدا کئے، لیکن مرد میدان شاید ہی پیدا کیا ہو!

مروّجہ عربی فارسی الفاظ

ان حالات میں اگر گجراتی زبان زور و طاقت سے محروم رہ گئی ہو تو چنداں تعجب خیز نہیں ہے۔ آج اس زبان میں تھوڑی بہت طاقت اگر پائی جاتی ہے وہ تقریباً انھیں الفاظ کی رہینِ منت ہے، جو عربی، فارسی یا ترکی سے اس زبان میں منتقل ہو کر بُنْیَانٌ مَرْصُوْصٌ (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح جمے ہوئے ہیں۔ اُن میں بیشتر الفاظ تو ایسے ہیں جن کا کوئی نعم البدل گجراتی میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ذرا ان الفاظ کو ملاحظہ فرمائیے۔

قلم (ع)، قدر (ع)، قابو (ف)، قلی (ت)، قبضہ (ع)، قاتل (ع)، قاعدہ (ع)، قبول (ع)، قرض (ع)، قدم (ع)، قدردان (ف)، قرمزی (ع)، قحبہ (ع)، قلعی (ع)، قول (ع)، قرار (ع)، قاصد (ع)، قاضی (ع)، قسمت (ع)، قیدی (ع)، قیمت (ع)، قانون (ع)، قتل (ع)، قابل (ع) ——! اور اسی طرح۔ کُل (ع)، کام (ف)، کارکن (ف)، کاریگر (ف)، کسر (ع)، کسب (ع)، کشتی (ف)، کلال (ف)، کفش (ف)، کفایت (ف)، کلف (ع)، کمان (ف)، کمال (ع)، گنج (ف)، کم نصیب (ف)، کوچ (ف)، کمزور (ف)، کرسی (ع)، کامدار (ف)، کرامت (ع)، کباب (ف)، کیمیا (ع)، کیف (ع۔ ف)، کمبخت (ف)، کیسہ (ف۔ گجراتی تلفظ کیسہ) یہ پچاس الفاظ صرف وہی ہیں جو حرف قاف یا کاف سے شروع ہوتے ہیں۔ ابجد کے حساب سے اسی طرح میں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی ایک فہرست تیار کی ہے جس میں ڈھائی ہزار سے زائد الفاظ جمع ہو گئے ہیں۔ اگر مزید غور و فکر سے کام لیا جائے تو اور بھی الفاظ مل سکتے ہیں۔ کیونکہ گجراتی میں رائج ہونے کے بعد تلفظ کے تغیر نے ان کی اصلی ہیئت بدل دی ہے۔ اس لئے بہت سے الفاظ تو آسانی سے پہچانے بھی نہیں جاتے۔ اوپر جو الفاظ ہم نے درج کئے ہیں یہ تمام کے تمام روزمرہ کی زبان میں

رائج اور مستعمل ہیں۔ اور پھر ان میں سے تیس یا پینتیس فی صدی الفاظ تو ایسے ہیں جن کا نعم البدل سر دست گجراتی زبان میں نہیں ہے۔ مثلاً وکیل، دوکان، کرسی، رومال، قلم، کمان، قلعی، کفن، کلال وغیرہ وغیرہ۔

گجراتی میں بعض ایسے الفاظ بھی رائج ہیں جو بیک وقت عربی زبان میں بھی ہیں، اور سنسکرت میں بھی! ایسے بعض الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں پروفیسر کے۔ کا۔ شاستری، پروفیسر نائک اور جینتی دلال وغیرہ سے میرا تبادلۂ خیالات جاری ہے۔ ممکن ہے ہم کسی نتیجے پر پہونچ سکیں!

گجراتی پر اُردو زبان کے اثرات

اردو زبان چونکہ مجموعہ ہے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کا —— لہٰذا اس زبان کے ذریعے جو الفاظ گجراتی میں داخل ہوئے ہوں گے، وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان ہی کے ہوں گے۔ براہِ راست عربی اور فارسی نے جن حالات اور حوادث کے زیرِ اثر گجراتی زبان کو متاثر کیا، اس کا ذکر تو ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُردو زبان نے براہِ راست گجراتی کو کس حد تک متاثر کیا! تاریخ کے کس دور میں اور کن کن ذرائع و وسائل کے ماتحت متاثر کیا ——!

اس سلسلے میں بھی گجراتی کے متعدد ادیبوں، نقادوں نیز ماہرینِ لسانیات سے میں نے بارہا تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ گجرات کے مشہور غزل گو شعراء شیخ آدم آبو والا، اشوک ہرش، روی شنکر راول، ہلیہ پالن پوری، کے۔ کا۔ شاستری، نرنجن بھگت، جینتی دلال۔ وغیرہ سے مجھے اس سلسلے میں بڑی مدد ملی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض امور میں مجھے ان سے اختلاف ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ گجراتی زبان براہِ راست اُردو سے اسی صدی میں متاثر ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سب سے قبل اس کا سابقہ اُردو ڈراموں اور ناٹکوں سے پڑا تھا۔ آغا حشر اور دوسرے ڈراما نویسوں کے اُردو ڈرامے جب پہلی بار گجرات کے اسٹیج پر پیش کیے گئے تو کافی مقبول ہوئے۔ ان ڈراموں کو گجراتی اسٹیج پر پیش کرنے کا سہرہ پارسیوں کے سر ہے۔ عبدالرحمٰن کابلی اور رتن شاہ سیٹھنا ایسے بھاری بھرکم اداکاروں کی دبنگ اور پاٹ دار آوازیں، اُردو کے جاندار مکالمے، دلوں کو متاثر کرنے والا تلفظ گجراتیوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ حتیٰ کہ خود میں نے اپنے بچپن میں بہت سے بند۔ حضرات کو نجی گفتگو میں ان ڈراموں کے پورے پورے مکالمے بولتے سنا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کے لیے چونکہ گجراتی زبان میں موزوں اور رعب دار الفاظ کا فقدان تھا۔ اس لیے ان مکالموں کے زوردار الفاظ اپنی معنوی خوبیوں اور تلفظ کے تناؤ کے باعث گجراتی زبان میں آمیز ہوتے گئے۔ گجراتی کے براہ راست اردو سے متاثر ہونے کا یہ پہلا زینہ تھا۔

دوسری مرتبہ اردو زبان نے تحریک خلافت کے زمانے میں گجراتی پہ اثر ڈالا "بولی اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو" والا زمانہ بڑی سرگرمیوں اور جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ انقلاب، آزادی، قربانی، قید، سزا، شہید وغیرہ قسم کے بیسیوں عربی، فارسی الفاظ اس دور میں اُردو کے ذریعے گجراتی زبان میں داخل ہوئے۔ علی برادران، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر انصاری، مولانا فاخر الہ آبادی، مولانا عبدالماجد بدایونی وغیرہ بزرگوں اور رہنماؤں کے گجرات میں طوفانی دورں، عظیم الشان جلسے جلوسوں اور ان کی دھواں دھار اُردو تقریروں اور طرزِ خطابت نے بھی گجراتی زبان کو کافی حد تک متاثر کیا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی عربی فارسی کے جو الفاظ اُردو کے ذریعے گجراتی زبان میں شامل ہوگئے تھے وہ آج اس زبان کا جزو بنے ہوئے ہیں۔

تیسرا اثر اس زبان پر اردو غزل نے ڈالا ہے۔ عہدِ متوسط میں فارسی غزلیات نے بھی گجراتی کو کافی حد تک متاثر کیا تھا، اور ناگروں نے ان غزلوں کا کامیاب تتبع بھی کیا تھا۔ مگر اُردو نے براہِ راست گجراتی زبان پر جو اثر اُردو غزل کے ذریعے ڈالا ہے وہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ گجراتی میں غزل کی ابتدا انیسویں صدی کے اوائل میں ہو چکی تھی۔ لیکن اُس صدی کے اختتام تک گجراتی میں جو غزلیں کہی گئی ہیں وہ ابتدائی رنگ کی ہیں۔ تغزل اس میں نظر نہیں آتا۔ اور وہ سب فارسی کا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ دیا رام (متوفی ۱۸۵۲ء) ترمہ (۱۸۸۶ء) اور بالا شنکر (۱۸۹۸ء سے ۱۹۲۲ء) وغیرہ نے فارسی غزل گو شعراء ہی کی پیروی کی ہے۔ خصوصاً بالا شنکر نے تو حافظ شیرازی کی کئی ایک فارسی غزلوں کو اُنہی بحور اور ردیف و قوافی کے ساتھ گجراتی میں منتقل کیا ہے۔

مگر بیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے جو غزلیں اُردو کے تتبع میں کہی جانے لگی ہیں، اُن کا سہرا کلاپی کے سر باندھا جا رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے

کہ خود کلاپی غزل کی تکنیک سے چنداں واقف نہ تھا۔ اس نے عربی، فارسی الفاظ اپنی غزلوں میں کافی استعمال کئے ہیں اور بہت سی تراکیب اور محاوروں کو رائج بھی کیا ہے، لیکن اُردو غزل کے نشیب و فراز سے ناواقف ہونے کی بنا پر اس کی غزلیں فن کا نمونہ یا شاہکار نہیں بن سکیں۔ البتہ غزل کی مقبولیت اور گجراتی مشاعروں کی ہر دلعزیزی اُسی کے دور سے شروع ہوئی ہے۔

گجراتی غزل نے زبان و ادب کی سب سے بڑی خدمت اگر کوئی کی ہے تو یہ ہے کہ اس نے گجراتی زبان ڈھیلی چولیں کافی حد تک کس دی ہیں۔ آج یہ زبان اس قابل ہوگئی ہے اسے رزمیہ شاعری کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے تتبع میں غزلیں کہنے والے گجراتی شعراء میں امرت کیشو نائک۔ کلاپی، منی لال دوی ویدی۔ گوردھن رام، ویرا سری۔ کانت، للت، ادیشہ خبرا، مستان، نارائن وسنت جی ٹھکر، دیوانہ، فانی اور بوٹا دکر وغیرہ نے اردو سے متأثر گجراتی غزلوں کے پہلے دور میں زبان کی کافی خدمت انجام دی ہے۔ اور پھر موجودہ دور میں شیدا۔ صابر، امرت گھائل۔ شنئیہ پالن پوری۔ سیف، شیخ آدم، اوماشنکر جوشی، رنگ اودھت، آثم راندیری۔ بدری کاچ والا، فقیر، بیکار، نشار، محب، انیل، چتیل، نسیم، صغیر، اشوک ہرش۔ ڈاہیر وغیرہ کا کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر اُردو غزل کا رنگ کس حد تک چڑھا ہوا ہے۔ شیدا، شنئیہ، شیخ آدم اور امرت گھائل نے اس سلسلے میں اپنی انفرادیت کو کسی حد تک قائم رکھا ہے۔ بیکار اور نشار نے مزاحیہ غزلوں اور طنزیہ رباعیات میں الا انداز پیدا کیا ہے۔ تاہم ان سب کو غزل کی تکنیک اور غزل کے تقاضوں کے باعث اردو کے غزل گو شعراء کی پیروی کرنی ہی پڑتی ہے۔ گجرات کے غزلگو شعراء عموماً جوش، حفیظ، حسرت، جگر، فانی۔ نوح، اصغر، مجاز اور سائل سے زیادہ متأثر نظر آتے ہیں۔ کچھ شعراء پر اقبال اور چکبست کا رنگ بھی غالب ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آج گجراتی مشاعروں اور گجراتی غزلوں نے گجراتی کے تمام اصنافِ سخن کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ گجراتی عوام غزل کے بڑے گرویدہ نظر آتے ہیں، اور غزل ان میں زیادہ سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز بنتی چلی جا رہی ہے۔

گجراتی زبان کو سب سے آخر میں ٹاکیز فلموں نے متأثر کیا ہے۔ "یہودی کی لڑکی" اور نیو تھیئٹرس کی دوسری بیسیوں تصاویر نیز پکار کے مکالمے آج بھی گجراتیوں کی زبان پر رواں دواں ہیں۔ اُردو ڈائلاگ کے بعض مغلق الفاظ نہ سمجھتے ہوئے بھی لوگ انھیں شوق سے سنتے ہیں۔ چونکہ فلم بینی کا رواج عام ہے۔ اس لئے فلمی مکالموں اور گانوں کے ذریعے بھی گجراتی زبان متأثر ہو رہی ہے۔

گجراتیوں کی وسیع النظری

گجرات کا تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام ——— زبان و ادب کے معاملے میں کافی وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔ دوسری زبان کے الفاظ، محاوروں یا ترکیبوں کو انھوں نے کبھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ گجراتی شعراء و ادبا نے اپنی زبان کے دامن کو ہمیشہ گلہائے رنگا رنگ سے بھرنے کی سعی کی ہے۔ ایسے الفاظ اور جملے جن کی معنویت یا ظاہری شان و شوکت اُنھیں بھا جاتی ہے، اُنھیں وہ فوراً اپنی زبان میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس صورت خوبصورت، جاندار، معنی خیز اور سلیس الفاظ کا ذخیرہ گجراتی میں آج بھی شامل ہوتا جا رہا ہے۔ بنیادی، عوام، زندگی، مرمت، جمہوریت، عنایت، طوفان، نزاکت ایسے بیسیوں عربی فارسی الفاظ حال ہی میں گجراتی ادب اور صحافت میں داخل ہوئے ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے رائج بھی ہوگئے ہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آج گجراتی زبان اس قدر صلاحیتیں پیدا کر چکی ہے کہ ہر قسم کے علمی، ادبی، تجارتی، صنعتی، سیاسی، اقتصادی، سائنسی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی اور فلسفیانہ مضامین بحسن و خوبی اس میں لکھے جا سکتے ہیں۔ گجرات کے شعراء و ادباء، سیاسی اور مفکر، محقق اور ماہرین اقتصادیات ہر قسم کی تصانیف و تالیفات نیز تلخیص و ترجمے سے گجراتی زبان کے خزانے بھرپور اور معمور کرتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی چند مشہور و معروف صوبجاتی زبانوں میں آج گجراتی زبان اپنی استعداد اور صلاحیتوں کی بنا پر، نیز اپنے علمی، ادبی اور فنی ذخائر کی بنا پر کافی اہمیت رکھتی ہے، اور ترقی کی رفتار کا یہی عالم رہا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کئی ایک صوبجاتی زبانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی یہ زبان بہت آگے نکل جائے گی۔

"آج کل" کا اگست ۱۹۵۶ء کا شمارہ "موسیقی نمبر" ہوگا

فضا ابنِ فیضی

اے شاعرِ امروز!

شمعِ رخِ فطرت ہے تو یہ شمع جلا کر — اشعار کو سوزِ نگہِ فکر عطا کر
کب تک تری دنیا میں یہ افسردہ شب و روز
اے شاعرِ امروز!

کر شعر میں پیدا تپش و جذب کی تاثیر — جوہر ہے عدم تو ہے کُند دمِ شمشیر
انفاس کو دے روشنیٔ جذب و تب و سوز
اے شاعرِ امروز!

بے سوزِ دروں شمعِ نظر جل نہیں سکتی — انفاس میں فطرت کی نوا ڈھل نہیں سکتی
احساس کو کر شعلہ صفت روشن و پُرسوز
اے شاعرِ امروز!

تیری خردِ خام جنوں پیشہ نہیں ہے — امروز ترا صاحبِ اندیشہ نہیں ہے
تو محرمِ فردا ہے نہ آسودۂ دیروز
اے شاعرِ امروز!

سرمایۂ فن فکر کا خمیازہ نہیں ہے — کچھ آج بھی ایمانِ سخن تازہ نہیں ہے
وہ نالۂ دل گیر ہے یا آہِ جگر دوز
اے شاعرِ امروز!

ہر نقش تصور کا ہے صورت گرِ الحاد — قلب و نگہ و روح کی ہے دولت برباد
افسردہ ہے کیوں آج ترا سوزِ خرد افروز
اے شاعرِ امروز!

یہ رسمِ نظر بازی و آوارہ دلی کیا — الہام ہے جب شعر تو یہ کم نفسی کیا
بے نور و غلط بیں ہے تری چشمِ کم افروز
اے شاعرِ امروز!

سرمائیٔ عقل عبارت ہے جنوں سے — زندہ ہے چمن لالۂ خونیں کے فسوں سے
قائم ہے احساس میں جوشِ تپش و سوز
اے شاعرِ امروز!

حاصل نہ ہو صاحب نظری جس سے وہ فن کیا — تخئیل میں رفعت جو نہ ہو لطفِ سخن کیا
اے فکرِ رسا جرأتِ پرواز بیاموز
اے شاعرِ امروز!

تقدیر سبو تشنہ لبی ہو نہیں سکتی — تدبیر جسے تیرہ شبی ہو نہیں سکتی
اے سوزِ نفس شمعِ وفا بانہ بیفروز
اے شاعرِ امروز!

دیوانۂ افکار کو فردوسِ نظر کر — "فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر"
یہ عالمِ افکار نہ رہ جائے سیہ روز
اے شاعرِ امروز!

محمد یونس خالدی

حضرت غمگینؒ دہلوی اور اُن کا غیر مطبوعہ کلام

آج کی دُنیا کا غیر معروف شاعر یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ غیر معروف ہی رہے۔ اور کل کی دُنیا اسے نہ جانے یہی حال "حضرت غمگینؒ[1] دہلوی" کا ہے۔ حضرت غمگینؒ کل کی دُنیا میں صرف جانے پہچانے شاعر نہیں۔ بلکہ ایک بڑے شاعر کے ادبی مشیر[2] اور اپنے زمانے کے بہترین زبان داں تھے۔ ان کا زمانہ میر تقی میرؔ مرزا محمد رفیع سودا۔ اور خواجہ میر درد کا زمانہ تھا۔ ان کی بارگاہ میں حضرت ذوقؔ کی جبین عقیدت تو جھکتی نظر آتی ہے مگر مرزا غالبؔ[3] جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہر ایک کو زبان قلم کا نشانہ بناتے تھے وہ بھی سجدہ ریز ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

حضرت غمگینؒ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ زبردست مصلح اور اپنے وقت کے کامل شیخ تھے، اور ان کی فیض بخشی کا سلسلہ بھی عام[4] تھا۔ لیکن شعرا کی صف میں جو مقبولیت خواجہ میر دردؔ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ تاریخ ادب اردو کی روشنی میں میر درد ہی پہلے صوفی شاعر ہیں۔ جنھوں نے مجاز کو حقیقت سے آشنا کرایا۔ اور بارگاہِ محبوب میں جبہ سائی کرتے کرتے حقیقی محبوب کے مطلوب بن گئے۔ اس شہرت کا سبب دہلی کی سکونت اور اہل دلی کی قدر دانی اور ان کے جانشینوں کی ہوش مندی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خواجہ میر دردؔ بعض خصوصیات کی بہ دولت اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں۔ مثلاً

میرؔ کی شاعری ایک صاحب دل اور ادبی بصیرت رکھنے والے انسان کی شاعری ہے۔ اس لئے جہاں ان کے کلام میں رنج اور الم، حسرت اور یاس کا بے پناہ ہجوم ہے۔ وہاں حالات زمانہ کے پیش نظر وہ کرب اور بے چینی بھی نظر آتی ہے جو ایک صاحب بصیرت کا حصّہ ہے۔ مگر اس کرب اور بے چینی میں اپنی اور اپنے وطن کی تباہی کا عرفان بھی ہے۔

رہے "مرزا سودا" تو شیخ چاند نے سودا کو زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ قصائد میں ان کا مقام کچھ بھی ہو لیکن سودا سے درد کی غزل گوئی کہیں بلند ہے۔ درد کی شاعری پاکیزہ اور جاندار ہونے کے علاوہ معرفت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ان کی روح کی پاکیزگی ان کے کلام میں سرائت کر گئی ہے۔ اس لئے ان کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ایک فانی دُنیا ہے۔ اس دنیا کے علاوہ ایک اور بھی دنیا ہے جو اپنی پاکیزگی کی وجہ سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اس وصف میں اگر کوئی ان کا شریک ہے اور کسی دوسرے کے کلام میں یہ تمام محاسن نظر آتے ہیں تو وہ صرف حضرت غمگینؒ ہیں۔ اور اگر حضرت غمگینؒ کی شاعری آج سے قبل کاغذی پیکر میں آچکی ہوتی تو ناقدین کی زبانیں پکار اُٹھتیں کہ اس باب میں اولیت کا شرف اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ حضرت غمگینؒ کو حاصل ہے۔

حضرت غمگینؒ کے کلام کے دو مجموعے ہیں۔ ایک دیوان رباعیات

---

[1] نام میر سید علیؒ تخلص غمگینؔ لقب حضرت جی مشہور بہ خدا نما جانے ولادت دہلی ۱۱۹۶ھ / ۱۷۵۲ء جائے وفات خاص گوالیار ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء

[2] حضرت ذوق "ابتدا میں شاہ نصیرؔ مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علی خاں غمگینؒ وغیرہ وغیرہ استادوں سے مشورہ ہوتا رہا"۔ (دیوان ذوق ص۳ ملی پرنٹنگ ورکس دہلی

[3] ملاحظہ فرمایئے کلیات نثر غالب فارسی ص ۱۸۳ تا ۱۸۴ ۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۲۸۷ھ

[4] اس عام فیض بخشی کی نمایاں نظیر آپ کے سلسلے کی بردل عزیزی ہے۔ حضرت بے خود دہلوی کے دادا سید بدر الدین احمدؒ۔ عبداللہ شاہؒ (انا دُ) شیخ الٰہی بخش فاروقیؒ (ناگوری)۔ شہزادہ مرزا فیروز شاہ (اکبر آباد) مولینا حبیب اللہ شاہ (رام پور) شیخ احمد حسینؒ (مانوں گا۔ بمبئی)۔ میاں محمد غنیؒ (کلکتہ) مولوی مفتی بہادر علیؒ (گوالیار) حافظ میاں ہدایت البنیؒ (گوالیار) پیر جی سید دائم علی شاہؒ (گوالیار) حکیم حارث علی خاں بقائیؒ دہلوی ثم گوالیاری وغیرہم جیسے اکابر آپ کے خلفاء میں ہیں۔

"مکاشفات الاسرار" دوسرا دیوان غزلیات "مخزن الاسرار" ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ تو غزل کو میر نے روح تغزل عطا فرمایا۔ غالب نے زبان کی معراج بخشی۔ "مومن" نے مجاز کی راہوں سے مشاہدہ حق کی نشاندہی کرتے ہوئے تجربات انسانی کے لئے بے شمار ذخیرے دنیائے غزل میں داخل کئے۔ تو حضرت غمگین رح نے درد کی معیت میں تصوف کی پاکیزگی اور حقیقت اور معرفت کی بے پناہ گہرائی اور اسرار الٰہی سے اس کو مالا مال کیا۔ ان کی غزل گوئی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جبکہ دنیائے غزل سنور رہی تھی۔ مگر دہلی کے بُرے دن آنے شروع ہو گئے تھے۔ دہلی انقلاب اور حوادث سے دوچار تھی۔ بھرپور محفلیں اجڑتی چلی جا رہی تھیں۔ سلطنت مغلیہ نابینا ہو چکی تھی۔ اکبری اقبال کا جنازہ اُٹھ چکا تھا۔ صاحبان ثروت مفلوک الحال ہوتے چلے جا رہے تھے اس وقت شعراء کے لئے لکھنؤ کی سرزمین مبارک سرزمین تھی۔ دہلی میں ہی نہیں بلکہ خانقاہی زندگی پر جمود طاری تھا۔ کلمۂ حق بلند کرنا مشکل تھا۔ مگر ایک ایسے ولی اللہ کا خاندان بھی نظر آتا ہے۔ جو مشعلِ حق بلند کئے ہوئے تھا مگر اس کا رُخ مذہب اور سیاست دونوں طرف تھا۔ اس دَور میں جو بات کہی جا سکتی تھی اس دور کا سب سے بڑا مجاہد وہ تھا جو نفس سرکش سے جنگ کرنا جانتا ہو۔ حضرت غمگین رح فرماتے ہیں کہ ؎

جنگ اپنے نفس سے مشکل ہے کچھ آساں نہیں   تو ہیں اک نکلے ہے اے دل مرد اس میدان کا

حضرت غمگین اس میدان کے مرد میدان نظر آتے ہیں۔ دہلی میں تو کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چونکہ جب آنکھ کھولی تو حکومت کی باگ ڈور اپنے عم محترم[1] اور والد محترم[2] کے ہاتھوں میں دیکھی۔ پھر عم زاد بھائی[3] کے ہاتھوں کو مضبوط پایا۔ فنِ شہسواری اور فنِ سپہ گری میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ ایک بکری کی یخنی صرف ناشتہ کے لئے تھی۔ کھانے کا کیا حال ہو گا۔ لیکن نفس کو شکست دینے کے بعد کل غذا ایک فرنی کا پیالہ اور دو ٹکیاں روٹی کی جس کا وزن دو ڈھائی تولے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ عیش و آرام رخصت، دنیا طلبی سے نفور۔ اس کی مثال دہلی چھوڑنے اور گوالیار میں آباد ہونے کے بعد دولت راؤ مہاراجہ سندھیا کی قدردانی اور اعزاز کی فراوانی، اور حضرت غمگین کا استغنا ہے۔ اس طرح بات میں بات نکلتی چلی آئے گی اور مدحت سرائی کا باب طویل ہوتا چلا جائے گا۔ میرا مقصد اس باب کو طول دینا نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ حضرت غمگین نے غزل کو تصوف کی پاکیزگی اور معرفت و حقیقت کی دولت بخشی۔ تو اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود ان کا کلام اس بات کی کھلی شہادت ہے۔ ان کی اہلیت اور جامعیت کے لئے مرزا غالب کی نیاز کیشی کو سامنے لایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ موقع نہیں۔ آپ ان کے کلام سے ان کی عظمت کا اندازہ لگائیے۔ کسی دوسرے کے سہارے کسی غیر معروف باکمال شخصیت کا تعارف کرانا حقیقت میں اس کے کمالوں پر پردہ ڈالنا ہے۔ حضرت غمگین خود صاحب کمال تھے۔ دنیائے تصوف میں حضرت خدا نما کے نام سے مشہور ہیں۔ شعری کمال کے لئے ایک حمد و نعت کو لے لیجئے۔ یہ موضوع بہت اہم موضوع ہے۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ

حمد ہے جس نے جو کلام کیا	میں نے یوں حمد کو تمام کیا
نعت یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے	اس میں اپنا ظہور تام کیا
لانہایت ہے حمد اے غمگین	پر تری فکر نے بھی کام کیا

دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی اس سے بہتر مثال نہیں ملتی کچھ شعر اور سنیئے ؎

ظاہر و باطن ہے حمد و نعت ہر انساں کا	معنی و صورت یہ مطلع ہے مرے دیوان کا
روبرو ہے پر اسے دیکھا نہیں جاتا ہے آہ	کیا کہوں میں حال اپنے حسرت و ارماں کا
بے سر و سامانی اک ساماں ہے اے دل یاد رکھ	کارواں عشق میں ہر بے سر و ساماں کا
معرفت پر اس کی حق کی معرفت موقوف ہے	مرتبہ ایسا ہے عالی حضرت انساں کا
اپنی ہستی کو عدم ہم کو کیا موجود آہ!	نیست ہو کر ہم تو بھی بدلہ ہو نہ احساں کا

علم سے جبکہ مرا مرتبہ مافوق ہوا	نحن اقرب مری گردن سے ہیں رگ ہی سے ہوا

[1] چچا کا اسم شریف سید شاہ نظام الدین رح ہے۔ ان کا شمار شاہ عالم کے خاص وزراء میں تھا۔ جب دہلی میں مرہٹہ مہاراج مہاداجی سندھیا کا تسلط ہوا۔ تو سب سے پہلے ان کو ایک صوبہ دار کی فکر ہوئی۔ جو صداقت مآب اور قابل اعتماد ہو۔ اس کے لئے سید شاہ نظام الدین رح کا انتخاب عمل میں آیا اور سندھیا مہاراج نے بہ منظوری شاہ عالم یہ عہدہ جلیلہ آپ کو تفویض کیا۔

[2] والد ماجد کا اسم گرامی حضرت سید شاہ سید احمد رح تھا۔ آپ کا مزار زیر شہر پناہ اجمیری دروازہ دہلی میں ہے۔ آپ اپنے بڑے بھائی کے دست راست اور نائب تھے۔

[3] عم زاد بھائی کا نام نواب سید میر خاں تھا۔ آپ اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے۔ عظیم الدولہ معین الملک تہور جنگ آپ کا شاہی خطاب تھا۔

کسی صورت سے نہیں جب ہوئی ان کی شناخت | نا شناسی میں عجب لطف و عجب شوق ہوا
حالِ غمگیں یہ ہوا جب نہ رہا کوئی مقام | جو کہ ماتحت ہے اس کے وہی مافوق ہوا

بُرا نصیب ہو جس کا بھلا نہیں ہوتا | شراب جتنی پئیں ہم نشہ نہیں ہوتا
تری نماز سے بہتر ہے یہ شراب مری | کہ اس میں نام کو نما بد ریا نہیں ہوتا

فدا جو تجھ پہ مثالِ چکور ہیں عشاق | بہ شانِ ماہ ہوا ہے تو شہرۂ آفاق
جمال اپنا دکھا دے اب ان کو لے پیارے | کہ تیرے حسن کے عاشق ازل سے ہیں مشتاق
جہاں میں منعم و شاہ و گدا سے اے غمگین | طمع نہ کیجئے ہرگز کہ ہے خدا رزّاق

تری یہ حمد اے واعظ سفیدی پر سیاہی ہے | ہمیں ہر شے مجسّم صورتِ حمدِ الٰہی ہے
دلیلوں سے کرے ہے کیوں تو چشمِ اثبات پھر اس کا | درخشاں حسن جس کا ماہ سے تا بہ ماہی ہے

ان اشعار میں زبان کی لطافت کے ساتھ تخیل کی بلندی بھی نظر آتی ہے اور طرزِ ادا میں جو ندرت ہے وہ داد اور تعریف سے مستغنی ہے۔ پھر اس کے دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کلام ایک ایسے شاعر کا کلام ہے۔ جو اپنے وقت کا مسلم الثبوت استاد ہے۔ شمس العلما مولینا محمد حسین آزاد[1] کی شہادت کے بعد اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ذوق کا مشورہ کرنا ظاہر ہے۔ لیکن "مرزا غالب" جن کو "ظہوری" اور "نظیری" کا ہم پلّہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور جن کا اردو کلام "سراپا الہام" ہے۔ جو اپنے دَور میں نہیں بلکہ آج تک ایک انفرادی شان کے حامل ہیں وہ حضرت غمگین سے کس قدر متاثر تھے یا ان کے مقابلے میں حضرت غمگین کا کلام کس مقام کو چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم طرح غزلوں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ پورے دیوان پر نظر ڈالنا اس مقالہ میں مشکل ہے۔ دونوں بزرگوں کی ایک ہم طرح غزل کے چند شعر پہلو بہ پہلو حاضرِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :-

مرزا غالب	حضرت غمگین
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک	کون جیتا ہے شبِ ہجر سحر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک	عمر اک چاہئے یہ عمر بسر ہونے تک

مرزا غالب	حضرت غمگین
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ	خانہ آباد کہیں دیکھ نہ ہو گھر برباد
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک	دل ہوا اس بُت کی وفا کا ترے گھر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب	مثلِ شبنم نہیں کچھ ہستیٔ موہوم اپنی
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک	کہ ترے مہر کی ٹھہرے یہ نظر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن	آئے بھی اور گئے دل بھی وہ لے کر غمگیں
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک	ہائے کیا کیا نہ ہوا ہم کو خبر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج	
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک	

جہاں تک حضرت غمگین کے دیوان "مخزن الاسرار" کا تعلق ہے وہ علاوہ مخمس، تاریخی قطعات اور رباعیات کے سات سَو ننانوے (۷۹۹) غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس مجموعہ کا ایک ایک شعر اثر میں ڈوبا ہوا اور فطرت کا حسین شاہکار نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے بلند شاہکار دیوان رباعیات "مکاشفات الاسرار" ہے۔ پھر یہ بھی کوئی مختصر دیوان نہیں بلکہ یہ دیوان خود تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلے حصے میں بسم اللہ کی شرح کے علاوہ توحید، وحدت الوجود، حقیقتِ انسانی، بطون، ظہور، حقیقت محمدیؐ، چہل مراتب، ایمان علمی، ایمان غیبی، ایمان خاص و عام، گناہ کبیرہ، اختلاف شرائع، معجزات، کرامات، طبقات صوفیہ، عارف و معرفت، توبہ صاحب مجاہدہ، توبہ صاحب مشاہدہ، تسلیم و رضا، وفا، شرم، حیا، اخلاق، مروت، احسان، استقامت، قناعت، حسد، اخلاص، صدق، کذب جیسے سیکڑوں عنوانات کے تحت تقریباً چھ سَو رباعیاں ہیں۔ دوسرا حصہ جو ردیف وار رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی اسی قدر رباعیاں آپ کے سامنے آئیں گی۔ متفرقات کے باب میں تین سَو سے کم رباعیاں نہ ہوں گی۔ اس طرح یہ دیوان تقریباً پندرہ سو رباعیات کا خزانہ ہے۔ پھر مجھے جو دیوان دستیاب ہوا ہے وہ ناقص ہے، حضرت غمگین نے کتنی رباعیاں کہیں، خود حضرت غمگین فرماتے ہیں کہ :-

"یک دیوان رباعیات قریب یک ہزار و ہشت صد رباعی گفتہ شد"[1]

اور یہ مکمل دیوان آج بھی جانشیں حضرت غمگین امیر المشائخ سید شاہ

---

[1] دیوان ذوق صفحہ ۳ علمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳ء

[1] مراۃ الحقیقت (قلمی)، شرح دیوان رباعیات "مکاشفات الاسرار" صفحہ ۳

غنی محمد حضرت جی کے کتب خانہ فقیر منزل گوالیار میں موجود ہے - پھر یہ سب رباعیاں مرزا غالب کے لئے لکھی گئی تھیں - ان رباعیوں کے لکھنے کا زمانہ ۱۲۵۳ھ ہے - ان رباعیوں نے مرزا غالب کی زندگی پر اور ان کے کلام پر جو اثر ڈالا ہے - اس کا خود مرزا کو اعتراف ہے[۱] اور زندگی کے آخری ۲۳ سال اور اس دور کا کلام شاہد ہے ۔

رباعیات کے نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے ۔

تکرار بھلا کب ہے تجلی میں روا — کس طرح ہر ایک کی نہ صورت ہو جدا
باطن میں دو ہے، ہے ایک ظاہر میں گو — ہرچند جدا جدا ہے اک ایک خدا

عارف کوئی پوچھے کس کو کہتے ہیں بنا — تو کہہ کہ جو کچھ نہ جانتا ہو بخدا
جو پوچھے کہ معرفت کیا ہے اے غمگین — تو کہہ کہ نہیں شناخت اپنے کے سوا

دل صاف نہیں کسی سے بدظن تیرا — کر سے کشی تا عیب ہو روشن تیرا
غمگین سب دوست ہیں تیرے عالم میں — پر علم خودی ہے ایک دشمن تیرا

وہ آب حیات یہی پانی ہے شراب — دیتی جو عمر جاودانی ہے شراب
ہم مست ہیں جس شراب میں اے غمگین — ہے یعنی کہ وہ اپنی زندگانی ہے شراب

ہرگز نہ کسی سے عشق ہے نہ الفت — سودا ہے کچھ مجھے نہ غمگین وحشت
ہوتی تھی دیکھنے سے جن کے تفریح — آتی کیوں دیکھ کر ہے ان کو حیرت

ہمدم یہ تری مہربانی ہے عبث — اے دل یہ تری جانفشانی ہے عبث
جیتے ہیں پر مرے سے بدتر غمگین — بن اس کے یہ زندگانی ہے عبث

تشخیص مجھے ہوا نہ کچھ اپنا مزاج — جو درد کا میں اپنے کروں کوئی علاج
جو جانا فنا مشاہدہ میں اس کے — غمگین انسان کی یہی ہے معراج

[۱] دیوان رباعیات سے بے انتہا مسرت ہوئی - میں نے ان کے مطالب سے بار بار فائدہ اٹھایا - میں اس لائق نہ تھا کہ میرے لئے ایسے موتی پرو دئے جائیں - ترجمہ و تلخیص مکتوب مرزا غالب بنام حضرت غمگین (فارسی)

گر مے کا نشہ نہ ہو تو مستی ہے ہیچ — اور عشق نہ ہو تو بت پرستی ہے ہیچ
غمگین یہ بات یاد رکھنا میری — جب تک نہ فنا ہو تو یہ ہستی ہے ہیچ

وہ کہتے ہیں بھید میرے کھولا مت کر — اور جام میں مے کے زہر گھولا مت کر
سو بار کہا ہے تجھے اور کہتے ہیں — غمگین تو نشے میں ہم سے بولا مت کر

جز عشق نہیں ہے کوئی اپنا دمساز — کہنے کا نہیں کسی سے لیکن یہ راز
مت چھوڑ تو عشق کو کبھی اے غمگین — گر ہو نہ حقیقی تو حقیقت ہے مجاز

مت کر تو نفی میں غیر کی کچھ تحریک — اور اس کو یقین جان لے بے تشکیک
اپنی ہی فنا کی فکر رکھ اے غمگین — تجھ میں نہیں کوئی بھی اللہ کا شریک

ہمدم نہیں کوئی آہ اپنا جز غم — اور غم کو کہیں تو کہہ نہیں سکتے ہیں ہم
غم بھاگے ہے اپنی بے کسی سے غمگین — ہمدم کوئی دم ہے، تو اپنا ہے دم

غمگین یہ شرع، جسم انسانی ہے — ان سے کیا جن کی روح حیوانی ہے
اور اس کی بدی میں ہے حقیقت یہ روح — جو سمجھے جدا، یہ اس کی نادانی ہے

اس سرسری مطالعہ سے اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور بے ساختہ زبان سے حضرت غمگین کی زبان میں نکل جاتا ہے کہ :-

غمگین یہ رباعیاں تیری ہیں جو چند — عارف کہے کس طرح نہ ہر ایک کو پسند
ذرہ میں کیا ہے مہر کو پوشیدہ — دریا کو کیا ہے تو نے کوزہ میں بند

مگر یہ رباعیاں ان کے لئے ہیں جو نسبت کی حقیقت سے واقف ہیں اور اس بات پر ایمان بھی رکھتے ہیں کہ

غمگین حسن مجھ سے روح انسانی ہے قلم — اور لوح ہے دل جس میں سب کچھ ہے رقم
ہے عرش یہ جسم، اور کرسی یہ نفس — بس نسخۂ جامع الٰہی ہیں ہم

حضرت غمگین اس راہ کے راہی نہیں بلکہ منزل کا پتا بتانے والے اور منزل تک پہنچانے والے بزرگ تھے - دیوان کا ایک ایک شعر ان کی حقیقت کا آئینہ دار ہے ۔

گوردیال سنگھ والیہ

دُنیا کے مشہور پہلوان

فنِ کشتی میں ہندوستان کا نام دنیا بھر میں ہمیشہ اونچا رہا ہے۔ ہندوستان کے کچھ پہلوان دنیا بھر میں کافی مشہور اور مقبول ہو چکے ہیں اور کچھ تو فاتح کل عالم بھی تھے۔ ہندوستان میں کبھی کشتی کا فن بامِ عروج پر تھا اور نہایت غیر معمولی تعریف کے قابل تھا، اسے راجوں مہاراجوں نے خوب ترقی دی۔ کشتی کے شوقین راجہ مہاراجہ پہلوانوں کو اپنی ریاست میں اپنے پاس رکھ کر اُنھیں خوب کھلاتے پلاتے تھے وہاں اُنھیں معقول خرچ اور انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کشتیاں آج ہوتی ہیں اور دہلی، بمبئی، کلکتہ وغیرہ شہروں میں غیر ملکی اور ملکی پہلوانوں کا دنگل اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے۔ مگر آج کل بیشتر کشتیاں امریکن طریقہ سے ہو رہی ہیں۔ ہندوستانی طریقہ کی کشتیاں اب اتنی مقبول نہیں رہ گئی ہیں۔ جیسے کہ وہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے تھیں، اُس زمانے میں بیشتر لوگوں کو اپنے جسم کو مضبوط اور سڈول رکھنے کا ایک جنون سا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پچیس سال پہلے بھارت کے گاؤں گاؤں میں اکھاڑے پائے جاتے تھے۔

رستمِ ہند غلام احمد بخش

گاما کی مقبولیت سے پہلے غلام بھارت کا بہترین پہلوان مانا جاتا تھا۔ غلام کی وفات سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ لیکن اُس کا نام تب تک زندہ رہے گا جب تک بھارت میں فنِ کشتی زندہ رہے گا۔ غلام کا جسم خوب سڈول اور دلکش تھا۔ مگر پیٹ سے اوپر کا حصہ حقیقتاً قابلِ دید و شنید تھا۔ اس کی چھاتی کا گھیرا ساٹھ انچ کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے دو اچھے توانا جوان کھڑے ہونے پر بالکل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اتنا بھاری جسم ہونے پر بھی اکھاڑے میں اُس کی پھرتی کسی سے کم نہیں تھی۔ "دھوبی پاٹ" اور "ہتھ اکھڑا" اس کے خاص داؤ پیچ تھے۔ اُس کے ان پیچوں سے نکل جانا یا اُنھیں برداشت کر لینا اچھے اچھے پہلوانوں کے لئے مشکل تھا۔ اس کے حملے کی تاب برداشت کر لینے کی ہمت اور طاقت اُن دنوں ہندوستان کے مقبول و محبوب پہلوان کیکر سنگھ اکیلے میں ہی تھی۔

پیرس کی بات ہے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں وہاں فنِ کشتی کی بہت بڑی نمائش کی گئی، اس نمائش میں دنیا کے مشہور پہلوان اور کسرت کرنے والے اکٹھے ہونے والے تھے۔ بھارت سے کشتیاں لڑنے کے لئے غلام کو پنڈت موتی لال اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس نمائش میں غلام کی مڈبھیڑ ترکی کے ایک مشہور پہلوان احمد مادر علی سے ہوئی۔ ترکی کا چھ ہاتھ لمبا دیونما انسان اور پھر وہ پہلوان اکھاڑے میں آتے ہی غلام پر بُری طرح ٹوٹ پڑا۔ غلام اتنا زبردست طاقتور ہونے پر بھی مادر علی کے پیچ میں اس بُری طرح پھنس گیا کہ بڑے زور سے چلّانے لگا "پنڈت جی یہ تو مجھے جان سے مار رہا ہے"۔

پنڈت موتی لال جتنے دلدار، زندہ دل شخص تھے، اُتنے ہی مزاج کے تیز بھی تھے۔ غلام کی وہ گھبراہٹ اُنھیں ذرا بھی پسند نہیں آئی، اُنھوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہی غلام کو للکارا "ہندوستان کے نامور پہلوان اپنی طاقت کو مت بھول اور اُٹھ جا"۔ اسے سن کر غلام کے وقار کو ٹھیس لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مادر علی کے پیچ سے نکل آیا، اور آخر میں کشتی برابر کی رہی۔ غلام، مادر علی کے ساتھ اگرچہ برابر رہا۔ لیکن اس کے پیچ سے نکل جانا ہی بہت بڑی بات تھی۔ غلام کی اس غیر معمولی طاقت کا تذکرہ یورپ کے تمام اخبارات میں خوب ہوا۔ غلام کی جگہ پر اگر کوئی دوسرا معمولی پہلوان ہوتا تو اُس کے لئے مادر علی کے پیچ سے نکل جانا ناممکن ہی تھا۔

دوسرے ہفتے دوبارہ غلام اور مادر علی کا جوڑ پڑا۔ اس بار غلام نے چھیالیس منٹ کے دوران میں مادر علی کو فرش پر پچھاڑ دیا، اور اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔

رستمِ ہند کیکر سنگھ

کشتی میں غلام سے ٹکر لینے والا اکیلا کیکر سنگھ ہی تھا۔ کیکر سنگھ اور

غلام کی کئی کشتیاں ہوئیں۔ جموں میں پہلی مڈبھیڑ ہوئی تو دو گھنٹے تک سامنا ہوتا رہا۔ دوسری کشتی لاہور میں ہوئی، اور حیرت کی یہ بات ہوئی کہ غلام کا جو خاص داؤ "کسوٹا" تھا اُسی کو کیکر سنگھ نے غلام پر لگایا۔ اس پیچ کی وجہ سے غلام بیہوش ہو کر گر پڑا، اسی طرح ایک بار اندور میں کشتیوں کی نمائش کی گئی۔ یہاں بھی کیکر سنگھ نے غلام کو ایسا ہی پیچ ڈالا تو وہ گھبرا کر زور زور سے چلّانے لگا۔

کیکر سنگھ ایک کسان تھا اور کھیتی باڑی ہی اُس کا ذریعۂ معاش تھا۔ اس لئے اکھاڑے میں بھی اس کا برتاؤ نہایت اُکھڑا اور بے رحمانہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کی ہاتھی جیسی قوّت کے سامنے اچھے اچھے تجربہ کار پہلوان بھی ہوش و حواس کھو بیٹھتے تھے۔ اُس کی قوّت کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے—

ایک بار جموّں میں کشتیوں کا ایک بڑا دنگل ہونے والا تھا۔ کیکر سنگھ بھی کشمیر دربار کا مہمان بن کر آیا ہوا تھا۔ ان دنوں مہاراجہ نے دباؤ ڈالنے والی بجلی کی ایک مشین یورپ سے منگوائی تھی اُس وقت مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے کسی رشتہ دار کو گٹھیا کی بیماری تھی۔ اس مشین میں دو طرح کی نلکیاں تھیں جن کے ذریعے بجلی کے کرنٹ کو بہا کر دبا دیا جاتا تھا۔ ان نلکیوں کو درد کی جگہ پر گھمانے سے مریض کو آرام ہو جاتا تھا۔ لیکن تندرست آدمی کے لئے اُن کا چھو جانا بھی بڑا تکلیف دہ تھا۔ اُسے چھوتے ہی جھٹکے کے ساتھ انسان دُور جا گرتا تھا۔ اس موقعے پر مہاراجہ نے آئے ہوئے پہلوانوں کی طاقت کا اندازہ لگانے کی ترکیب سوچ لی۔ صبح سویرے تمام پہلوانوں کو بلایا گیا اور ایک ایک کو بجلی کی وہ نلکیاں ہاتھ میں پکڑنے کو کہا گیا۔ نلکی ہاتھ میں لینے پر بجلی کا کرنٹ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن اُس کا جھٹکا لگتے ہی ہاتھ کو جھاڑتا ہوا ہر ایک پہلوان دور بھاگ جاتا تھا۔ جب کیکر سنگھ کا نمبر آیا تو تمام کی یہی امید تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح پیچھے ہٹ جائے گا۔ لیکن کیکر سنگھ نے دونوں نلکیاں اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیں اور برقی قوت کا سامنا کرنے کے لئے وہ چھاتی ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ برقی کرنٹ چلتے ہی اس کے ماتھے پر پسینے کی موٹی موٹی بوندیں اُبھر آئیں۔ آنکھیں لال ہو کر باہر کو نکلنے لگیں۔ لیکن کیکر سنگھ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کی اتنی زبردست قوت دیکھ کر مہاراجہ کو اچنبھا ہوا اور انھوں نے فوراً ایک ہزار روپیہ انعام کے طور پر دے دیے۔

کیکر سنگھ ہندوستان کا واحد پہلوان تھا جو کسی بھی کشتی میں گرا نہیں تھا۔

رستمِ زماں گاماں اور رستمِ ہند امام بخش

سرت کمار مِتر نام کے ایک رئیس نے ۱۹۱۰ء کی گرمیوں کے موسم میں ہندوستانی پہلوانوں کا ایک دستہ برٹن بھیجا۔ اس میں گاما، امام بخش، احمد بخش جیسے بڑے بڑے اور مشہور پہلوان تھے۔ بھارت سے انگلینڈ جانے والی یہ دوسری پارٹی تھی۔ پہلی پارٹی میں پہلوان بھوتا سنگھ اور گنگا سنگھ تھے، جو وہاں سے آگے اور سارے یورپین ممالک میں کشتیاں لڑتے اور اپنی فتوحات کا پرچم لہراتے واپس ہندوستان لوٹ آئے تھے۔ ہندوستانی پہلوانوں کی ٹیم کے منیجر بینجمن کو ان ہندوستانی پہلوانوں کے ساتھ کشتیاں جمانے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاما کی کشتی امریکہ کے اُس وقت کے چیمپین "رولر" کے ساتھ ہونی قرار پائی۔ یہ کشتی ہندوستانی فنِ کشتی کے بجائے امریکن فری اسٹائل سے ہوئی۔ پانچ منٹ کے اندر ہی رولر کو گاما نے زمین پر لٹا دیا۔ دوبارہ کشتی ہونے پر پھر سے سات منٹ میں اور تیسری بار تو صرف تین منٹ کے اندر رولر کو زمین دیکھنی پڑی۔

ہندوستانی پہلوانوں کے دنگل کو دیکھ کر لندن کے تمام لوگ انگشت بدنداں رہ گئے اور ہر گلی کوچے میں ان کی تعریف کے گیت گائے جانے لگے۔ مگر وہاں کے بہت سے لوگوں میں حسد کا مادہ جاگ اُٹھا اور کسی بھی طرح ہندوستانی پہلوانوں کو نیچا دکھانے کے منصوبے تیار کئے جانے لگے۔ چنانچہ فوراً ہی مقابلے کے لئے یورپ کے رستم جان لوم کو تیار کر کے امام بخش کے خلاف لڑنے کے لئے لایا گیا۔ لیکن امام بخش نے بارہ منٹ کے اندر ہی اُسے دو بار چت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ مغربی ممالک کے پہلوان مشرقی ممالک کے پہلوانوں کے مقابلے میں ابھی کافی پیچھے ہیں۔

جان لوم کی شکست کے بعد تو لندن کے عوام بھی جل بھن گئے۔ کسی بھی قیمت پر ہندوستانی پہلوانوں کو شکست دینے کے لئے انھوں نے انگلینڈ کے تمام پہلوانوں کو پھر مدعو کیا۔ روس کا مشہور پہلوان ہیکن سمدہ ہندوستانی پہلوانوں کی غیر معمولی قوت دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اسے ہمت ہی نہیں ہو سکی کہ وہ بھی ٹکر لے۔ بڑے بڑے امراء و زراء بھی اُس کی خوشامد کرنے سے پیچھے نہیں رہے۔ مگر وہ کسی بھی قیمت پر ہندوستانی پہلوانوں سے زور آزمائی پر آمادہ نہیں ہوا۔ آخر میں عوام اور اخبارات کی تنقیدوں اور طعنے بازی

سے بچنے کے لئے وہ سوئیٹزرلینڈ نکل بھاگا۔

ہیکن سمد کے بھاگتے ہی اُس وقت کے تیسرے نمبر کے پہلوان سٹینسلاس زبسکو کو کھڑا کرکے ہندوستانی پہلوانوں کو نیچا دکھانے کی اسکیم تیار کی گئی۔ زبسکو کو خاص طور پر وہاں بلایا گیا تھا۔ اُس کے آتے ہی مشہور سکاٹش پہلوان اپولو کی ہدایات کے بموجب کشتی کی خاص تیاری کرائی گئی۔

زبسکو اور گاما کی یہ مشہور کشتی لندن کے ہال بوزن ایمپائر تھیئیٹر میں کرائی گئی۔ اس کشتی کو دیکھنے کے لئے اتنی بڑی بھیڑ اکٹھی ہوئی کہ آس پاس کے تمام راستے بھر گئے تھے کشتی شروع ہوتے ہی گاما نے ایسا حملہ کیا کہ زبسکو لڑکھڑاتا ہوا زمین پر لیٹ گیا اور گاما اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اس کشتی کے بعد زبسکو نے ایک اخباری نمائندے کے سامنے صاف صاف قبول کر لیا کہ "گاما کا سامنا کرنے کی مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ میں اگر کھڑا رہنے کی کوشش بھی کرتا تو گاما مجھے کھلونے کی طرح زمین پر پٹک دیتا"! اُس دن لگ بھگ دو گھنٹے تک کشتی ہوتی رہی اور پورے دو گھنٹے تک گاما ہی زبسکو کی پیٹھ پر سوار رہا۔

زبسکو کی ہندوستان میں آمد

مگر اس ہار کے کچھ سال بعد زبسکو کو کیا سوجھی کہ وہ خود ہندوستان چلا آیا۔ اٹھارہ سال پہلے اپنی شکست کے بدنما داغ کو مٹانے کی غرض سے وہ اتنا لمبا چوڑا سفر طے کرکے آیا تھا۔ گاما کو چاروں شانے چت کرنا ہی اس کا مقصد تھا۔ اٹھارہ سال کے اس لمبے عرصے میں وہ عروج کی ایک ایک سیڑھی چڑھ کر رستم زماں بننے کے قریب آپہونچا تھا۔ اُس نے گاما کو کشتی کے لئے للکارا اور گاما نے اُس کا چیلنج بخوشی منظور کر لیا۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں کے لوگ بہت بڑی تعداد میں پٹیالہ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان دنوں کشتیوں کا مرکز پٹیالہ بنا ہوا تھا۔ ۲۸ جنوری ۱۹۲۸ء کو کشتی کا دن مقرر ہوا۔ دونوں اطراف سے اُردو، ہندی اور انگریزی زبان میں اشتہارات چھاپے گئے کہ جو اس کشتی کو جیتے گا وہی رستم زماں مانا جائے گا۔

ہزاروں شائقین تماشا جن میں راجے مہاراجے، بڑے بڑے ملکی اور غیر ملکی افسران اور پہلوان وغیرہ تھے، کے سامنے مقررہ وقت پر کشتی شروع ہوئی۔ دونوں شہ زور پہلوان جب اکھاڑے میں اُترے تو ہزاروں آنکھیں اس بڑی کشتی کو دیکھنے کے لئے ان دونوں پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر کشتی شروع ہوئی اور پورا ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ گاما نے زبسکو کو چاروں شانے چت گرا دیا اور اس طرح گاما ایک بار پھر رستم زماں تسلیم کر لیا گیا۔

زبسکو کی شکست کے بعد کسی بھی غیر ملکی پہلوان نے گاما سے لڑنے کی جرأت نہیں کی۔ امام بخش نے بھی اسی طرح یورپ کے بلند قامت اور شہ زور پہلوانوں کو یکے بعد دیگرے کئی شکستیں دیں اور وہ بھی ایک دن رستم زماں جونیئر بن گیا۔ گاما کے بعد رستم زماں کا خطاب امام بخش کو ہی دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اسکاٹش مشہور پہلوان "اپولو" بھی ہندوستان آیا۔ یہ وہ انسان تھا جس نے گاما کے خلاف لڑنے کے لئے زبسکو کو تیار کرنے میں حصہ لیا تھا۔ بھارت کے اپنے اس دورے میں اپولو اپنے جسمانی کرتبوں اور طاقت کی نمائش کرتا رہا۔ اس کا اصلی نام تو ولیم مینکر تھا۔ لیکن جسمانی ساخت اور خوبصورتی میں بہت اچھا ہونے کی وجہ سے اُس کا نام "اپولو" پڑ گیا تھا۔

وہ اپنے ساتھ آٹھ من کی آٹے کی بوری رکھا کرتا تھا۔ اُسے وہ اکیلا اُٹھا لیتا تھا۔ اور اپنی پیٹھ پر لاد کر سٹیڈیم میں بڑے غرور کے ساتھ چکر کاٹا کرتا تھا۔ اُس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی اس بوری کو میری طرح اُٹھا کر پیٹھ پر رکھے گا اُسے پانچسو روپے انعام دیا جائے گا۔ انگلینڈ میں کوئی بھی یہ کام نہ کر سکا۔ آخر اُسے یقین ہو گیا کہ بھارت میں بھی یہ کام کوئی نہیں کر سکے گا۔ وہ جب جب بھی بوجھ اُٹھانے کی نمائش کرتا تب تب کئی طاقتور لوگ اُس بوری کو اُٹھانے کی کوشش کرتے لیکن اُس بوری کو اُٹھانا طاقت کے ساتھ ساتھ چالاکی کا بھی کام تھا۔

ایک بار جب الہ آباد میں اُس کی نمائش ہو رہی تھی تو ایک مضبوط فوجی جوان وہاں آنکلا۔ اُس نے آٹے کی اس بوری کو پیٹھ پر اُٹھا لینے کی چالاکی کو تاڑ لیا اور اپولو کے چیلنج کو منظور کر لیا۔ اُس نے وہ بوری زمین پر رکھ دی، اور خود لیٹ کر اس کا ایک کونہ پکڑ لیا۔ پھر دھیرے دھیرے بوری کو اُٹھانے کے ساتھ ساتھ خود بھی کہنی اور گھٹنوں کے سہارے زمین سے اوپر آدھا جُھک گیا اور اُس نے اپولو سے پانچسو روپے جیت لئے۔

سویڈن کا پہلوان پٹیرسن

پیٹرسن نام کا ایک سویڈن پہلوان گاما کو للکار کر ایک بار بھارت آیا تھا۔ پٹیرسن ایک معمولی پہلوان ہوتے ہوئے بھی "فاتح [illegible]" کہلانا مناسب سمجھتا تھا۔ پٹیرسن جیتے یا ہارے اُسے پچیس ہزار روپے دینے کا

اعلان مہاراجہ پٹیالہ نے اپنی طرف سے کر دیا۔

پٹیالہ میں جب سامنا ہوا اُس وقت پیٹرسن اپنے سارے جسم کو ویسلین سے چکنا کر کے اکھاڑے میں آیا۔ اکھاڑے میں اُترنے کے بعد بھی ایک پوری ویسلین کی شیشی اُس نے اپنے جسم پر اُنڈیل لی۔ اس طرح کی حرکت کشتی کے میدان میں خلاف قاعدہ ہے مگر گاما نے پھر بھی اعتراض نہیں کیا کشتی شروع ہوئی۔ گاما نے سویڈن پہلوان کو کئی بار پیچ میں پھنسانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا جسم ویسلین سے چپ چپا ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی گاما اسے پکڑتا تبھی وہ چکناہٹ کی وجہ سے پھسل جاتا۔ آخر کار تنگ آ کر گاما نے ایک ترکیب سوچی۔ اکھاڑے سے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر پیٹرسن کے پاؤں پر پھینکا۔ وہی مٹی اُس کے گھٹنے پر ویسلین کی وجہ سے خوب اچھی طرح چپک گئی، خواہ چاہے انگلی کی جگہ کیوں نہ ہو۔ گاما کے لئے یہی بہت کچھ تھا۔ اُس نے وہیں سے پکڑ کر ایک لمحہ میں اُسے ایسا پٹکا کہ وہ پیٹھ کے بل زور سے زمین پر جا گرا۔ پیٹرسن کے چت ہونے ہی بڑے زور سے چیختا چلاتا اور بھپرتا ہوا گاما اس کی چھاتی پر اپنے دونوں گھٹنے ٹیک کر جا بیٹھا۔ گاما نے اپنی قوت کا مظاہرہ اس شکل میں پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

پیٹرسن جب اپنے ملک کو روانہ ہوا تو اُس کے پاس کافی دولت تھی۔ وہ دولت مند کیوں نہ ہوتا جبکہ گاما سے مار کھانے پر بھی اُسے پچیس ہزار کی کثیر رقم بطور انعام دی گئی تھی۔

پروفیسر رام مورتی نائیڈو

پروفیسر رام مورتی بھیم سین کے نام سے تمام بھارت میں مشہور تھے۔ ان کے عجیب و غریب جسمانی کرتبوں کو دیکھ کر تمام دنیا سخت حیران تھی۔ آپ صوبہ مدراس کے شہر وجے نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ۱۹۱۲ء میں پورے یوروپ کا دورہ کیا، اور جہاں جہاں گئے وہاں وہاں کی جنتا آپ کے فن کشتی اور جسمانی کھیلوں کو دیکھ کر سخت حیرانی میں پڑ گئی۔ دو موٹروں کو ایک ساتھ روکنا، ہاتھی کو چھاتی پر چڑھانا۔ لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں کو توڑنا، پندرہ بیس من کے پتھروں کو سینے پر رکھ کر توڑنا وغیرہ وغیرہ جیسے کام آپ کے لئے معمولی سی بات تھی۔

آپ نے تمام یورپ کے پہلوانوں کو لڑنے کے لئے للکارا لیکن آپ سے بھڑنے کی جرأت کسی میں نہیں ہوئی۔ ہاں سوئٹزرلینڈ کے دو پہلوانوں نے آپ سے لڑنے کی جرأت تو ضرور کی لیکن وہ دونوں ہی آپ کے چیلوں سے شکست کھا گئے۔ خود سینڈو کو بھی آپ نے لڑنے کے لئے للکارا تھا لیکن سینڈو نے آپ کا چیلنج قبول نہیں کیا۔

یورپ کے کچھ علاقوں میں ایک بہت خوفناک اور خونخوار کھیل کھیلا جاتا تھا۔ ایک مہیب سانڈ کو اکھاڑے میں پاگل بنا کر لایا جاتا تھا۔ ایک گھوڑ سوار ننگی تلوار لئے اس پر ٹوٹ پڑتا تھا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ پروفیسر رام مورتی کو یہ کھیل دیکھ کر بہت دلی اور روحانی ٹھیس پہونچی، اور انھوں نے تمام تماشائیوں سے کہا کہ اگر کوئی حقیقتاً بہادر ہے تو سانڈ کو بغیر ہتھیار کے قابو کر کے دکھائے۔ لیکن اتنی جرأت کس میں تھی۔ تب پروفیسر رام مورتی نے کہا کہ اگر آپ لوگ اس کھیل کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کا وعدہ کریں تو میں سانڈ کو دیکھتے دیکھتے قابو میں کر لوں گا۔ لیکن ان کی بات کسی نے بھی نہیں سنی اور وحشیانہ کھیل بدستور جاری رہا۔

پروفیسر رام مورتی کے چیلوں اور شاگردوں نے یورپ میں جہاں جہاں کشتیاں لڑیں اپنے استاد کا نام ہمیشہ ہی اونچا رکھا۔ اور ہندوستان کا شاندار وقار بنائے رکھا۔ پروفیسر رام مورتی حقیقتاً طاقت کا پہاڑ تھے۔

اس کے علاوہ احمد بخش کالی، گوبر پرشاد، حمیدہ پہلوان، رستم ہند گونگا پہلوان، بجلی پہلوان۔ رحمان پہلوان۔ محمود پہلوان، دلاور پہلوان، دلبر پہلوان، کریم پہلوان، سمپورن سنگھ پہلوان، پاندہ پہلوان، شیخ پہلوان، تارا سنگھ پہلوان۔ تاراچند پہلوان، مان سنگھ پہلوان وغیرہ بھی کچھ ایسے نامور پہلوان تھے جنھوں نے بیرونی ممالک میں جا کر اپنی قوت اور فن کا سکہ جمایا اور اپنے حریفوں کو ہمیشہ نیچا دکھایا۔ احمد بخش کالی کو پنڈت موتی لال نہرو انگلینڈ لے گئے تھے۔ وہاں احمد بخش نے فرانس کے نہایت طاقت ور پہلوان ماریس ڈریاچ کو پہلی بار کچھ ہی سیکنڈوں میں، اور دوسری بار ایک ہی منٹ میں چت کر دیا۔ ماریس ڈریاچ اُس زمانہ میں فرانس، انگلینڈ، بلجیم، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ناروے اور ڈنمارک کا چیمپین تھا۔ کچھ ہندستانی پہلوان جن کا چیلنج یورپ میں کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس امید سے امریکہ گئے کہ وہاں دنیا کے بلند قامت اور شہ زور پہلوان فرینک گوچ سے لڑیں گے لیکن اتنا مشہور ورلڈ کا چیمپین فرینک گوچ اُن سے لڑنے کی جرأت نہیں کر سکا، کیوں کہ ایک بار مان سنگھ پہلوان نے پیرس میں اُس سے کشتی لڑ کے

وقت اُسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر اکھاڑے سے باہر ہوا میں دس فٹ اونچا پھینک دیا تھا۔

روس کا پہلوان ہیکن سمد

آج سے ستر سال پہلے پیٹرو گراڈ سے تھوڑی دور معمولی سے ایک گاؤں میں ہیکن سمد کا جنم ہوا تھا۔ اُس کے کئی بہن بھائی تھے۔ بچپن میں اُس کے بارے میں کسی کو یہ اُمید نہیں تھی کہ آگے چل کر وہ ایک مشہور و معروف پہلوان ہوگا۔ کیونکہ اس کا جنم ایک بہت ہی معمولی کسان کے گھر ہوا تھا، اور روس میں اُن دنوں کسانوں میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ اپنے گھریلو جھنجھٹوں سے گلو خلاصی پانے کے علاوہ وہ بیرونی دنیا اور دیگر اشغالِ زندگی کے بارے میں سوچ سکیں۔ پیٹرو گراڈ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہاں بھیجا گیا۔ وہاں اسکول میں ہی اُس کو پہلوانی کا شوق ہوا۔ اپنی زندگی کے بارے میں ہیکن سمد نے خود ہی بڑے پُرلطف اور دلکش ڈھنگ سے روشنی ڈالی ہے۔

اُس نے لکھا ہے کہ جب میں انیس[19] سال کا تھا تب بھی کافی توانا اور طاقتور رہتا تھا۔ ایک بار ریٹیرس برگ کے ایک متموّل ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کے گھر پر آکر اپنی طاقت کا امتحان دوں۔ میں وہاں گیا۔ پہلے مجھے کھانے پینے کی چیزیں دی گئیں اور اس کے بعد تھوڑی سی شراب بھی پیش کی گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ اس لئے مجھے فوراً نشہ ہو گیا۔ بعد میں مجھے بوجھ اُٹھانے کو کہا گیا اور میں نے دنیا میں بوجھ اُٹھانے کے تین ریکارڈ یکے بعد دیگرے توڑ دئے۔ پہلے دن میں نے سات سَو اسّی پونڈ وزن اٹھایا تقریباً ساڑھے آٹھ سو پونڈ وزن اُٹھا کر دنیا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔

کچھ دنوں بعد یورپ کے چمپین پہلوان "پال پونس" وہاں پہونچے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جو شخص اُنھیں دنگل میں شکست دے گا اُنھیں وہ ایک ہزار فرانک انعام دیں گے۔ میں نے ان کا چیلنج قبول کر لیا۔ لیکن انھوں نے خود مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ میں پہلوان نہیں ہوں اس لئے مجھے لڑنا نہیں چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میں اُن سے لڑوں گا تو میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ ان کی اس دھمکی نے مجھے اندر ہی اندر پاگل بنا دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے صلاح لے کر اُن کو پھر مقابلے پر آنے کا چیلنج دیا۔ لڑائی ہوئی اور خوب ہوئی۔ پال پونس کو میں نے چھیالیس منٹ کی لڑائی میں نیچے گرا دیا۔

اسی طرح ماسکو، ولین اور وینا کے دنگلوں میں بھی میں نے اُنھیں پھر شکست دی، اور مجھے رستمِ یورپ کا خطاب دے دیا گیا۔

ہیکن سمد کا وزن دو سو چھیالیس پونڈ تھا۔ وہ پانچ فٹ چھ انچ لمبا تھا۔ اُس کی چھاتی سانس لینے پر چوّن انچ کی ہو جاتی تھی۔ اُس کی گردن کی موٹائی بائیس[22] انچ تھی اور کمر کی موٹائی تینتیس[33] انچ تھی۔ آج سے چالیس سال پہلے وہ دنیا کا سب سے بڑا پہلوان مانا جاتا تھا۔ سانس لے کر وہ اپنی چھاتی بارہ انچ پھیلا لیا کرتا تھا جب کہ عام طور پر بڑے بڑے پہلوان چار یا چھ انچ سے زیادہ چھاتی کا پھیلاؤ نہیں کر سکتے ہیں۔ ترکی کے غیر معمولی پہلوان نور اللہ کو شکست دے کر ہیکن سمد تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا۔ نور اللہ، ہلی الدعلی نام کے ایک ترکی پہلوان کا شاگرد تھا۔ اس لئے نور اللہ کے بعد اس نے ہلی الدعلی سے لڑنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہلی الدعلی کا وزن تین سو پچاس پونڈ تھا، اور وہ چھ فٹ قد کا دیو نما انسان تھا۔ لوگوں نے ہیکن سمد کو ہدایت دی کہ ہلی الدعلی سے لڑنے کا ارادہ چھوڑ دے۔ لیکن ہیکن سمد اپنی ضد پر قائم رہا اور ایک گھنٹے کی لڑائی میں اُس نے ہلی الدعلی کو بھی پچھاڑ دیا۔

ترکی کے سلطان کو جب اس کی خبر ملی تو انھوں نے ہیکن سمد کو احمد علی نام کے ایک درباری پہلوان سے لڑنے کو کہا۔ احمد علی کا وزن ساڑھے چار سو پونڈ تھا۔ لڑائی کے وقت احمد علی نے ہیکن سمد کی ناک میں انگلی گھسیڑ دی جس سے اس کی ناک میں سے خون بہنے لگا۔ غصے میں آکر ہیکن سمد نے احمد علی کی کمر پکڑ لی اُسے اوپر اُٹھایا اور گردن کے بل اس طرح زمین پر پٹک دیا کہ فوراً اس کی جان نکل گئی۔

ترکی کے ایک اور مشہور پہلوان نام جبکیش کو بھی شکست دے کر اُس سے اُس کا سونے کا گرز ہیکن سمد نے چھین لیا۔

ہیکن سمد کو ہندوستانی پہلوانوں کے ساتھ زور آزمائی کے لئے کئی بار لکھا گیا لیکن وہ یورپ میں کشتیوں کے لڑنے میں اتنا مصروف تھا کہ ہندوستان آنے کا اُسے موقع ہی نہیں ملا۔

مگر ۱۹۱۱ء میں برلن میں جب بین الاقوامی کشتیاں ہو رہی تھیں اور ہندوستان سے رستمِ پنجاب بھوتا سنگھ، شیرِ پنجاب گنگا سنگھ، رستمِ ہند امام بخش اور رستمِ زماں گاما پہونچے، اور وہاں کے تمام غیر ملکی پہلوانوں کو گراتے چلے گئے۔ چمپین رولر، رستمِ یورپ جان لوم جیسے شہ زور پہلوان ڈر گئے

تو ہیکین سمدجو اس وقت دوسرے نمبر کا جرمن پہلوان تھا۔ اسے امام بخش اور گاما سے لڑنے کو کہا گیا مگر اتنا جرمن پہلوان ہمت ہار کر انگلینڈ سے سوئٹزرلینڈ بھاگ گیا تاکہ بدنامی نہ ہو۔

دنیا کا ہیبت ناک پہلوان کنگ کانگ

پچھلے سال بمبئی کے ولبھ بھائی پٹیل اسٹیڈیم میں دنیا کے مشہور پہلوانوں کا دنگل بہت بڑی دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ ملک ملک کے پہلوانوں نے اس میں حصّہ لیا۔ چھ فٹ لمبے دیو نما کنگ کانگ کی طرف لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ چار من اڑتیس سیر کا یہ دیو نما انسان دیکھنے کے قابل تھا۔ کنگ کانگ سے اونچے اور بھاری بھرکم کئی پہلوان دنیا میں موجود ہیں۔ سویڈن کا اینجل پہلوان سوا چھ فٹ اونچا اور چھ من تیس سیر وزنی ہے سنگاپور کا ایک جرمن پہلوان کا جسم تو طاقت کا پہاڑ ہے۔ وہ سات فٹ اونچا اور نو من بھاری ہے۔ اس کا نام گارگنٹوآن ہے۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں کنگ کانگ کشتی کے فن میں زیادہ تجربہ کار اور ماہر ہے۔ اور دنیا کا ایک بہت بڑا مشہور پہلوان مانا جاتا ہے۔

کنگ کانگ کا اصلی نام ایمل سیاہے۔ وہ ہنگری کا رہنے والا بیالیس سال کی عمر کا شخص ہے۔ ہندوستان کے تواریخی اور مشہور پہلوان بھیم سین کی طرح وہ بھی بڑا پیٹو پہلوان ہے۔ مہا بھارت میں منوں کھانا کھا جانے والے بھیم سین کو اس کی زبردست بھوک کی وجہ سے پیٹو ہی کہا جاتا تھا۔ کنگ کانگ کی خوراک بھی اس کے جسم کی طرح لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ وہ بڑھیا اور بہت سا کھانا کھانا پسند کرتا ہے۔ ناشتے میں چھتیس کچے انڈوں کو ایک بڑے مرتبان میں ڈال کر اور نمک مرچ لگا کر وہ غٹا غٹ پی جاتا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں چھ پرندے ایک پاؤ مکھن آدھا پاؤ کچا پیاز اور ایک پاؤ لال ولائتی مولی' آدھ سیر ٹماٹر' ڈیڑھ درجن کیلے' ایک درجن سنگترے۔ آدھا سیر اناناس اور آدھ سیر ڈبل روٹیاں یا سینڈوچ وہ کھا جاتا ہے تیسرے پہر دو سیر تازہ پھلوں کا رس یا دودھ پینا اسے پسند ہے۔ اور رات کے کھانے میں دو مرغیاں' ساگ سبزیاں اور ایک ٹوکرا پھل اسے دئے جاتے ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے بیچ میں روزانہ ایک گیلن تازہ دودھ بھی وہ پی جاتا ہے۔ "کچے انڈے کچی ترکاریاں اور نیم کچے پھل کھانے سے اس کا جسم اتنا مضبوط ہے" وہ بڑے غرور سے کہتا ہے۔ اتنا کھا کر وہ کبھی بیمار نہیں ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ آج تک اُسے زکام تک نہیں ہوا۔ اس کی وجہ اس کی اچھی خوراک اور ورزش ہے جو مقررہ وقت پر وہ روزانہ کرتا ہے۔

اگرچہ وہ بیمار کبھی نہیں ہوا تو بھی اس کی زندگی کے چار قیمتی سال ہسپتال میں گزرے ہیں۔ کشتی میں لگی ہوئی چوٹوں کی وجہ سے برابر اسے ہسپتال میں پناہ لینا پڑی ہے۔ اس کی داہنی ٹانگ تین بار ٹوٹ چکی ہے اور بائیں ٹانگ دوبار۔ اس کی ناک' دانت اور پسلیاں بھی ٹوٹ چکی ہیں۔ جسم کا شاید ہی کوئی ایسا حصّہ بچا ہوگا جو ٹوٹا نہ ہو۔ کنگ کانگ نے آج تک شادی نہیں کی۔ کیونکہ وہ شادی شدہ پہلوانوں کی حالت زار دیکھ چکا ہے اور گرہستی کی گاڑی کھینچتے ہوئے وہ پہلوانی نہیں کرنا چاہتا ہے۔ جوانی کے ایام سے ہی وہ عورتوں کی سوسائٹی سے نفرت یا پرہیز کرتا آرہا ہے اور آج تک کبھی کسی لڑکی کے چنگل میں نہیں پھنسا۔ وہ کہتا ہے ان ننھی منی لڑکیوں کو جب میں تندرست اور لمبے چوڑے مردوں سے بے ہودہ مذاق کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ حقیقت میں مرد خواہ کتنا ہی مضبوط اور تندرست کیوں نہ ہو اور کیسی بھی شخصیت کا مالک ہو عورت اس کی نکیل اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا پسند کرتی ہے۔ نہ بابا مجھے نہیں چاہئے ایسی تندرستا اور صنفِ نازک کی دوستی۔ میں الگ تھلگ ہی بھلا"۔ اسی لئے وہ آج تک اکیلا ہے۔

اپنی پہلوانی کی "گولڈن جوبلی" منا کر وہ اکھاڑے سے کنارہ کشی کر لینا چاہتا ہے۔

وہ کہتا ہے "جب میں اکھاڑے میں اترتا ہوں تو دو باتوں کا دھیان رکھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں ہر حالت میں جیتوں اور دوسری یہ کہ میری کشتی سے عوام کی زیادہ سے زیادہ تفریح ہو۔ اور ان کے ٹکٹوں کے پیسے ضائع نہ ہوں۔ اسی لئے کبھی کبھی تو میں اپنے حریف کو بیس بیس منٹ تک لڑنے دیتا ہوں۔ اگرچہ میں اسے دو منٹ میں ہی پٹک سکتا ہوں۔ کنگ کانگ کی یہ خوبی اس کی "نمائشی پہلوانی" کے فن کا نمونہ ہے۔ بچپن میں وہ بڑا بدتمیز چھوکرا تھا۔ وہ ایسا تنک مزاج تھا کہ نو دس برس کی عمر میں ذرا ذرا سی بات پر اپنے سے دُگنے لڑکوں سے بھڑ جاتا تھا۔ کنگ کانگ کے باپ نے اس کی اس لڑاکا ذہنیت" سے چھٹکارا پانے کے لئے اسے ایک ورزش گاہ میں داخل کرا دیا۔ جس سے وہ کوٹ پیٹ کر وہاں سیدھا ہو جائے۔ لیکن سیدھا ہونے

کے بجائے وہ ایک بہت بڑا پہلوان بن گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے یورپ کے "مڈل ویٹ چیمپین" کو دو منٹ میں اٹھا کر پٹک دیا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی نام ایمل تسیا سے ہی مشہور تھا اور اسی نام کو لے کر اس نے پورے یوروپ کا فاتحانہ دورہ کیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں وہ مصر کی راجدھانی قاہرہ میں ایک دن شام کے وقت مشہور و مقبول امریکن فلم "کنگ کانگ" دیکھنے گیا۔ افریقہ کے اس بڑے خوفناک بن مانس کو ہوائی جہازوں کو اکھاڑ پچھاڑ کرتے دیکھ کر نوجوان ایمل تسیا حیرت زدہ رہ گیا۔ رات بھر سوچتے رہنے کے بعد اس نے اپنا نام کنگ کانگ رکھنا پکا کر لیا۔ کنگ کانگ جیسی بھیانک شکل بنانے کے لیئے اس نے داڑھی بھی رکھی۔ چھ مہینے تک داڑھی بڑھانے کے لیئے اس نے گوشہ نشینی کی اور کوئی کشتی نہیں لڑی۔ داڑھی بڑھانے بڑھانے اس نے اتنا لمبا کر دیا کہ وہ بزرگ نما معلوم ہونے لگی۔ لیکن کشتی کے وقت حریف پہلوان کے ہاتھ میں آ کر وہ اس کی شکست کا باعث بھی بنی۔ کبھی کبھی جب مخالف پہلوان کا سر اس کے سر سے ٹکرا جاتا تو داڑھی اس کی آنکھیں ڈھانپ لیتی۔ آخر کار اس نے تنگ آ کر داڑھی کٹا کر چھوٹی کر لینے کا پکا ارادہ کر لیا اور شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح اس کی موجودہ فرنچ کٹ خس خسی داڑھی اس پرانی داڑھی کی یاد کا ایک چھوٹا سا لشان یا ثبوت ہے۔ چھوٹی ہونے پر بھی وہ کبھی کبھی اب بھی مخالف پہلوان سے پکڑی جانے پر اس کے غصے کی وجہ بن جاتی ہے۔ کنگ کانگ کے اس دن کے نازیبا سلوک سے عوام بہت مشتعل ہوئے جب اس نے بمبئی میں ریفری رشید کو بھی اکھاڑے کے باہر پھینک دیا تھا۔

کنگ کانگ نے بہت سی کشتیاں جیتی ہیں مگر وہ ہمیشہ حمیدہ پہلوان سے دبتا رہا ہے۔ حمیدہ پہلوان پانچ منٹ کے اندر ہی اسے چت کر دیا کرتا تھا۔ ویسے وہ اینجل' دارا سنگھ' ٹائیگر جوگندر سنگھ' ہرنیس سنگھ' بھولو پہلوان سے بھی شکست کھا چکا ہے۔

دو غزلیں

محمد منشاء الرحمن خاں

شکوۂ جورِ یار کون کرے — عشق کو بے وقار کون کرے

اضطراب اصل زندگی ہے تو پھر — دل کو وقفِ قرار کون کرے

جو ہیں خود آپ کی عطائے خاص — اُن غموں کا شمار کون کرے

جب محبّت ہی زندگی ٹھہری — فکرِ انجام کار کون کرے

چاک دامن کو آج ہی کر لوں — انتظارِ بہار کون کرے

دل کو دے کر فریبِ عیش و نشاط

رُوح کو سوگوار کون کرے

چندر پرکاش شاد

دیوانہ فرطِ غم میں یہ کیا سوچتا ہے آج — ہر ذرّہ کائنات کا چونکا ہوا ہے آج

کچھ راہ سُوجھتی نہیں کیا ہو گیا ہے آج — شاید مری نظر سے دھواں اُٹھ رہا ہے آج

پھر جائزہ لیا ہے کچھ اپنی حیات کا — پھر مجھ کو میرے حال نے تڑپا دیا ہے آج

کچھ آسرا تو دو کہ مرا جی نہ ڈوب جائے — مجھ سے مرا خیال اُلجھنے لگا ہے آج

تو تھا ترا خیال تھا یا تھا مرا وجود! — کیا کیا مری نگاہ کو دھوکا ہوا ہے آج

ہنگامۂ جہاں سے گریزاں تھا دل مگر — تنہائیوں سے اور بھی گھبرا گیا ہے آج

پہلے کبھی کہا نہ گیا تھا زبان سے — جو کچھ مری خموش نظر نے کہا ہے آج

سری کنٹھ کول

راج ترنگنی

ہندوؤں کی مسلسل وار تاریخ اس وقت دستیاب نہیں ہے جیسے کہ دوسری اقوام کی ہے۔ اس کمی کے بہت سے وجوہ بتلائے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پراچین ہندو بوجہ نادیۂ عقبائی دنیاداری کی باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے اور اس باب میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ یونانی اور ہندو دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دنیا فانی ہے۔ یونانی اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے ملک کی بہبود کے لئے اس فانی زندگی کو نثار کر دیں۔ لیکن اس کے برعکس ہندو اس دنیا میں بطور ایک اجنبی کے رہ کر عقبیٰ کی فکر میں لگے رہتے اسی وجہ سے فلسفہ، دھرم شاستر وغیرہ مضامین پر تو بے شمار کتابیں ملتی ہیں مگر تاریخ نایاب ہے۔ یہ بات ایک بڑی حد تک ٹھیک ہے لیکن سولہ آنے درست نہیں۔ کیونکہ ہندوؤں نے اپنا ریکارڈ چھوڑا ہے جو سنسکرت کی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ ہندو بطور مضمون کے تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ پُران، راماین، مہابھارت اور دیگر ہزاروں سنسکرت کی کتابوں میں زمانہ وسطیٰ کی یادداشت قلمبند کر گئے ہیں۔

ہندوستان کے زمانہ وسطیٰ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کشمیر مدت دراز تک سنسکرت علوم کا ایک مرکز رہا ہے۔ یہاں کے آچاریوں میں تاریخی ادراک پہلے سے تھا۔ آچاریہ ابھنوگپت، کلہن، کھیمندر وغیرہ کی تصانیف مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان آچاریوں نے گو اپنے وقت کے واقعات قلمبند نہیں کئے ہیں مگر اپنی زندگی کے حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تصانیف سے کشمیر کے زمانہ وسطیٰ کی تہذیب و تمدن پر بہت سا مواد ملتا ہے۔ یہاں تک کہ کشمیر میں مناظروں اور مشاعروں پر کس قسم کے مجالس آراستہ کئے جاتے تھے اس مضمون پر منکھ کے شری کنٹھ چرت میں ایک باب ہی الگ ہے جو نہ صرف کشمیری زندگی کی ایک جھلک دکھاتا ہے بلکہ سنسکرت زبان میں بھی ایک بے نظیر شاہکار ہے۔

راج ترنگنی یا "بادشاہوں کا دریا" نظم میں لکھی گئی آٹھ ترنگوں یعنی ابواب پر مشتمل کشمیر کے حکمرانوں کی ایک سرگزشت ہے جسے کلہن نے ۱۱۴۸ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۱۵۰ء میں دو برس بعد ختم کر لیا۔ کلہن پنڈت کی راج ترنگنی نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں بطور ماخذ تاریخ ہند مشہور ہے۔ سنسکرت کے وسیع لٹریچر میں راج ترنگنی ایک ایسا نسخہ ہے جس کے جوڑ کی دوسری کتاب نہیں ملتی۔

کلہن پہلا مصنف نہیں ہے جس نے کشمیر کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے یوں تو اس سے پہلے کئی عالموں نے کچھ نہ کچھ ریکارڈ چھوڑا تھا مگر وہ اس وقت دستیاب نہیں۔ راج ترنگنی کی تمہید میں کلہن نے خود لکھا ہے کہ تاریخ سے تعلق رکھنے والی گیارہ کتابوں اور نیل مت پُران سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی تصنیف شوورت کی ہے جو کلہن کے مطابق بہت کٹھن ہے اور تاریخی واقعات خوش اسلوبی سے پیش نہیں کرتی۔ دوسری تصنیف کھیمندر کی نرپاولی یعنی "فہرست راجگان" جو ایک شاعر کی تصنیف ہونے پر بھی غلطیوں سے مبرا نہیں۔ کیونکہ کھیمندر دراصل ناول لکھنے والا ہے اور وہ کوئی تاریخ داں نہیں ایسا ہونے پر بھی کھیمندر کی دیگر تصانیف کشمیر کی سماجی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ کشمیر کے حکمرانوں میں سے باون حکمرانوں کا تذکرہ فراموش ہو چکا تھا اور ان میں سے چند ایک کے کوائف کلہن نے مختلف کتابوں سے لئے ہیں۔ نیل مت پُران سے چار راجاؤں کا ذکر لیا ہے۔ ایک اور مصنف پدم مہر نے اپنی کتاب میں اشوک سے پہلے کے آٹھ راجاؤں کی کیفیت اخذ کی تھی۔ راجاؤں کا ذکر کلہن نے پدم مہر سے لیا ہے۔ اشوک اور اس کے بعد کے پانچ بادشاہوں کا ذکر شولاک کی کتاب سے لیا ہے۔ کلہن کے مطابق ان مصنفوں نے ہم عصر بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے۔

کلہن نے آثار قدیمہ کے تحقیقات کرنے والوں کی طرح مندروں کے کتبے، وقف کے تمسک کے تختے، سکے، بادشاہوں پر لکھے مدح آمیز کلام، قدیم روایات

اور دیگر کتابوں سے سہارا لے کر بھول چوک کا سدھار کیا ہے۔ اور سب سے بڑی صفت جو تاریخ داں کے لئے اشد ضروری ہے وہ ہے مصنف کا بے لوث ہونا۔ کلہن اس بارے میں خود لکھتا ہے کہ اسی تاریخ داں کا بیان قابلِ تعریف ہے جو ایک منصف کی طرح بغیر کسی طرفداری اور تعصب کے واقعات کو بیان کرے۔

راج ترنگنی کے آٹھ ابواب کے مضامین حسب ذیل ہیں:۔

نام باب	خاندان
اوّل	۱۔ گونند اوّل سے ابھنیو اوّل تک
	۲۔ گونند سوم سے یدھشٹر اوّل تک
دوم	پرتاپ آدتیہ اوّل سے سندھمت آریہ راج تک
سوم	میگھ واہن سے بال آدتیہ تک
چہارم	کارکوٹ خاندان
	درلبھ وردھن سے اُتپلا پیڈ تک
پنجم	اُتپل خاندان
	اونتی ورمن ۸۵۵ء سے شور ورمن ۹۳۹ء تک
ششم	یشسکر ۹۳۹ء دیدا ۹۸۰ء تک
ہفتم	لوہر خاندان
	سنگرام راج ۱۰۰۳ء سے ہرش ۱۰۸۹ء تک
ہشتم	اُچل ۱۱۰۱ء سے جے سنگھ ۱۱۲۸ء تک

راج ترنگنی میں کلہن نے کشمیر کا اتہاس مہابھارت کے بعد سے شروع کر کے اپنے وقت تک قلمبند کیا ہے۔ ابتدائی کے ابواب کے اندراج افسانہ آمیز ہونے کی وجہ سے تاریخ کے دائرے میں نہیں آسکتے۔ ان میں کتنا حصّہ تاریخی ہے اور کتنا افسانہ آمیز۔ یہ ایک مضمون ہے جو تحقیق طلب ہے۔ اس حصّہ کو آرکیالوجی اور کسی حد تک قدیم سنسکرت لٹریچر صاف کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ پہلے تین ابواب کی واقعہ نگاری مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ واقعات کی اصلی تاریخ کہیں بھی درج نہیں۔ چوتھے باب کے شلوک نمبر ۷۰۳ سے تاریخیں ملتی ہیں اور پانچویں باب سے جہاں اُتپل خاندان کے واقعات کا اندراج ہے کلہن نے حکمراں کی حکومت کی تاریخ ابتدا اور خاتمہ دکھایا ہے۔ یہاں تک کہ سال مہینہ اور دن تک دکھائے ہیں۔ تاریخ بتانے کے لئے سپت رشی سمت جو سن عیسوی سے تین ہزار چہتر برس پہلے شروع ہوتا ہے استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سٹین کے قول کے مطابق کلہن کی بتائی ہوئی تاریخیں قابلِ اعتبار ہیں۔

کلہن کی راج ترنگنی یورپ کی سرگزشتوں کے ڈھانچے کی ہے۔ اس میں اکثر راجاؤں کی زندگی کے حالات ملتے ہیں۔ ان کے شادی بیاہ، ارکان دولت کی سازشیں، جنگ و جدل، بادشاہوں کا بے دردی سے قتل، فوجی حالات، جاگیرشاہی، بادشاہوں کی تعمیرات، باہر کے ممالک پر حملے وغیرہ وغیرہ۔

آج کل کی تحقیقات کے مطابق تاریخ کے نام کی حق دار وہی تصنیف ہو سکتی ہے جو عام جنتا کے حالات کا جائزہ لے اور صرف حکمرانوں کے حالات کو بیان ہی نہ کرے۔ راج ترنگنی میں کشمیر کے سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسان کس طرح جاگیرشاہی سے پستا جاتا ہے۔ راجپوت، برہمن، کالستھ، عدالتوں کے عملے، فوجی افسر اور دیگر امراء کس طرح سے کسانوں کا خون چوستے ہیں۔ جو بھی شخص حکمرانِ وقت کی ذرا بھی خدمت انجام دیتا اس کو سرکار کی طرف سے جاگیر ملتی۔ مندروں سے وابستہ پروہت پریشد یعنی پروہتوں کی مجلس کو بلا ادائی خراج بڑے بڑے قطعہ زمین ملتے تھے۔ اگر کسی راجے نے برہمنوں کی زمین چھین لی یا بٹائی میں تھوڑی لی تو یہ پروہتوں کی مجلسیں اودھم مچا دیتیں اور ملک میں جتنے بھی حکمرانِ وقت کے حریف ہوتے وہ ان کے ساتھ مل کر امن و امان کو برباد کرتے۔
آج کل کے چند مورخوں نے پرانے کشمیریوں اور مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن راج ترنگنی میں بیان کردہ پروہتوں کی بھوک ہڑتال اور مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کا کسی پہلو سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پروہتوں کی بھوک ہڑتال اکثر خودغرضی کی وجہ سے ہوتی تھی اور اس کے برعکس گاندھی جی قومی مفاد یا صداقت کے لئے بھوک ہڑتال کیا کرتے تھے۔ کلہن نے ان پیشہ ور بھوک ہڑتالیوں کی بڑی مذمت کی ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ جب خراسان سے ڈلچو نے کشمیر پر ترکی فوج سے کر دھاوا بول دیا۔ اُس وقت کے راجہ سہہ دیو نے سبھی کشمیریوں پر حملہ آور سے بچنے کے لئے ٹیکس لگا دیا۔ لیکن ایسے آڑے وقت میں بھی برہمنوں نے بوجہ اونچی ذات کے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا اور بھوک ہڑتال پر آمادہ ہو گئے۔ راجا ملک سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دشمن ملک میں داخل ہوا اور سارے ملک کو تہ و بالا کر کے انھیں برہمنوں کو غلام بنا کر ایشیا کے دوسرے ملکوں میں فروخت کے

بدلے میں بیچ دیا

کلہن کی راج ترنگنی سے ہمیں نہ صرف کشمیریوں کی اقتصادی اور سیاسی واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کی سماجی زندگی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ چھوت چھات کی بیماری زیادہ پائی نہیں جاتی ہے کیونکہ شیومت میں چاروں ورن یعنی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر شامل ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بدھ مت کی وجہ سے ہو لیکن یہ دستور عالمگیر نہیں۔ کشمیر کے ایک منطقی جینت کی ایک بودھ سے مذہبی معاملات پر بحث ہوئی تھی اور بودھ نے بحث کے دوران میں کہا تھا کہ برہمن چھوت چھات کے قائل ہیں۔ اس کا جواب جینت نے اس طرح دیا تھا کہ اگر تم چھوت چھات نہیں مانتے ہو تو پھر شودروں کے ساتھ کھاتے پیتے کیوں نہیں ہو۔ اس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ کہنا کہ بودھوں میں چھوت چھات نہیں تھی ٹھیک نہیں۔ عقیدے کی بات ایک ہے اور عمل کی دوسری۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنے بھی مذاہب پیدا ہوئے ہیں چھوت چھات کسی نہ کسی طرح سے ان کا ایک بنیادی اصول رہا ہے۔ کلہن نے ذات پات توڑ کر شادی بیاہ اور شودروں کے مندروں میں داخل ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ عورتوں کے ساتھ اکثر اچھا سلوک ہوتا تھا۔ امیر لوگ اور راجے مہاراجے ایک سے زیادہ بیاہ کرتے تھے۔ پردے کا رواج نہیں تھا۔ بیوہ عورتوں کا دوسری بار شادی کرنا سوسائٹی میں برا مانا جاتا تھا۔ کھیمندر نے اس بارے میں لکھا ہے کہ بیوہ عورتوں کی ٹولیاں ایک تیرتھ سے دوسرے تیرتھ پر اپنے خاوندوں کو پانی دینے کے لئے آوارہ پھرتی ہیں۔ ستی کی رسم زوروں پر تھی۔ راج ترنگنی سے ایسی مثالیں چھانی جا سکتی ہیں کہ بیواؤں کے رشتہ دار اُن کی جائیداد ہضم کرنے کے لئے عورتوں کو ستی ہونے پر مجبور کرتے تھے۔ ستی اپنی مرضی سے بھی ہوتی تھی جیسے رانی سوریہ متی راجا اننت کے بعد ستی ہوئی۔ یہ رسم سہہ بھٹ المعروف سیف الدین نے سکندر بت شکن اور علی شاہ کے وقت میں بند کرائی تھی۔ لیکن ہندو اپنی بیوی کو دوسری دنیا میں ساتھ لے جانا چاہتے تھے اس لئے اس رسم کے بند کرنے کو مذہب میں دخل اندازی سمجھنے لگے۔ اسی وجہ سے سلطان زین العابدین اس معاملے میں غیر جانبدار رہے اور ستی کی رسم پھر سے چل پڑی۔

راج ترنگنی میں کشمیریوں کے مذہبی عقیدوں پر بھی جا بجا نوٹ ملتے ہیں۔ ہر سوسائٹی میں مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہوش مندوں کا اور دوسرا بے خبروں کا۔ اس بارے میں البیرونی نے بھی اپنی مشہور کتاب "الہند" میں نوٹ لکھا ہے کہ ہر ہندو بُت پرست نہیں ہے۔ لیکن کلہن کے وقت میں اور اس کے بعد کے زمانے میں کشمیری جنتا کا مذہب شیومت کے اونچے اصولوں سے گر کر روایات پرستی اور جادوگری پر آ پہنچا تھا۔ کلہن نے خود لکھا ہے کہ نئی نئی کتابیں تنتر کے نام سے روزانہ مشتہر کی جاتی ہیں۔ شیومت کے ماننے والوں اور تانترکوں میں کئی فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ کسی ایک بات پر یہ لوگ متفق نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحدت کے علمبردار آچاریہ ابھینوگپت جیسے عالموں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ غالباً اسی وجہ سے کشمیر ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا گیا۔ کلہن نے بطور تاریخ دان کے اہلِ کشمیر کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔

اس کے علاوہ کشمیری قوم کی روایات، برہمنوں کا کٹرپن اور تیاگ راجپوتوں کے ڈھنگ، بادشاہوں کی بزدلی اور سنگدلی، عورتوں کی بے وفائی نیک دیدرانیاں، ارکانِ دولت کی سازشیں اور وفاداری، سرکاری اہلکاروں کا جبر و ظلم، خوراک کے مسئلے، خانہ جنگی، شاہی خاندانوں کا گرنا اور بننا، برہمنوں اور راجپوتوں کا باہمی جھگڑا مرمزہ وغیرہ وغیرہ زندگی کے ہر پہلو پر مفصل بیانات اس بیش بہا نسخے میں ملتے ہیں۔ آٹھواں باب تاریخی اہمیت کی وجہ سے خاص درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس باب میں بیان کردہ واقعات کلہن نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ کلہن کی راج ترنگنی کشمیر کے تہذیب و تمدن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے لئے بھی اس میں سے مواد لیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ کے ماخذ میں شمار ہوتی ہے۔

راج ترنگنی نہ صرف بادشاہوں کی ایک سرگزشت ہے بلکہ یہ ایک شاعر کا کلام بھی ہے۔ مصنف کے شاعرانہ اندازِ بیان کی چھاپ جگہ جگہ ملتی ہے۔ سنسکرت کے النکار شاستر یعنی علم بلاغت میں ماہر ہونے کی وجہ سے طرزِ تحریر میں آراستگی آئی ہے۔ اس کی زبان دلائی جہا جاتی کی طرح ملیح اور دلبستہ کے نیشد چرت وغیرہ کی طرح کٹھن۔ استعارہ اور تشبیہ سے جگہ جگہ کلام پُر ہے جس سے کلہن کے اشلوک مقالوں کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ دنیا کی ناپائداری اور معتقد کی نامناسبت پر اشعار جگہ جگہ ملتے ہیں۔ ساری نظم

میں کلہن نے شانت رس ہی کو سمویا ہے۔ اصطلاحی الفاظ کے استعمال ہونے سے کہیں کہیں معنی ٹھیک طور پر سمجھ میں نہیں آتے۔

مسلمانوں کے تسلط کے زمانے میں بھی راج ترنگنی کی اہمیت تسلیم کرلی گئی تھی۔ سب سے پہلے ترجمہ سلطان زین العابدین کے فرمان سے فارسی زبان میں ہوا تھا۔ اکبر اعظم نے بھی عبدالقادر بدایونی کے ذریعے سے کرایا تھا۔ ابوالفضل نے بھی آئینِ اکبری میں راج ترنگنی کے کچھ حصے کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں حیدر ملک نے راج ترنگنی کا خلاصہ نکالا۔ انگریزوں کے زمانے میں سب سے پہلے مسٹر ٹرویر نے فرانسیسی زبان میں اور اس کے بعد جوگیش چندر دت نے انگریزی میں مکمل ترجمہ شائع کیا۔ سٹین کا انگریزی ترجمہ بوجہ تحقیقاتی نوٹوں کے اعلیٰ پیمانے کا ہے۔ اس کے بعد آر۔ ایس پنڈت کا انگریزی ترجمہ ہے جس میں تحقیقاتی مسئلوں پر زیادہ زور نہ دے کر مصنف کے کلام کو ہو بہو انگریزی زبان میں لانے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ترجمہ لفظی ہوا ہے۔ بہت دیر ہوئی راج ترنگنی کا اردو ترجمہ ٹھاکر اچھر چند نے شائع کیا تھا جو اس وقت بازار میں نایاب ہے۔ کچھ برس پہلے اس کا ترجمہ مراٹھی زبان میں بھی ہوا ہے۔

کلہن کی زندگی کے حالات سے ہم آج کل آگاہ نہیں۔ مگر راج ترنگنی اور اتفاقی شہادت سے اس کی شخصیت کے بارے میں تھوڑا بہت جانا جا سکتا ہے۔ راج ترنگنی کے اندرونی تذکرے سے ہم جانتے ہیں کہ کلہن کے والد کا نام چنپک تھا جو کشمیر کے حکمرانوں کا وزیر اور راجہ ہرش کے وقت میں دوار پتی یعنی دروں کے محافظ کے عہدے پر مامور تھا۔ کلہن للتا آدیتہ کے بسائے ہوئے نگر پرہاس پور میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ آج کل پرس پور کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ کے کھنڈرات بوسیدہ حالت میں ہونے پر بھی تعمیر کنندہ کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ کلہن ذات سے برہمن اور عقیدے سے شیومت کا پیرو تھا۔ یہ بات راج ترنگنی کے ہر باب کے پہلے اشلوک سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہاں اس نے شو کو اردھ ناریشور کے روپ میں تعظیم ادا کی ہے۔ لیکن کلہن کٹر پنتھی نہ تھا اس لئے راج ترنگنی میں بدھ مت کو جگہ جگہ ادب سے یاد کیا ہے۔ اس سے مصنف کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے۔ کلہن کی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق گرامر، انشا پرداز ی، دھرم شاستر، جوتش، الںکار وغیرہ مضامین میں ہوئی ہے۔ کلہن کا مطالعہ بھی وسیع ہے جیسا کہ راج ترنگنی میں راماین، مہا بھارت، پرانوں اور دیگر کتب کے حوالہ جات دئے گئے ہیں کلہن نے سنسکرت کے پرانے شاعروں کی رچنائیں ذکر انکھ دیو چرت، اگھوش وغیرہ اور بان بھٹ کے ہرش چرت کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے۔ کھمندر کی نرپاولی اور دوسری تاریخی کتابوں سے اس نے کتنا مواد لیا ہے اس باب میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ کتابیں آج کل دستیاب نہیں۔ اتفاقی شہادت میں منکھ کا شری کنٹھ چرت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب میں منکھ نے ایک ایسی مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں کشمیر کے بڑے بڑے عالم اکٹھے ہوئے تھے اور نظم شری کنٹھ چرت پیش کی گئی تھی۔ اس باب میں اس وقت کے کئی شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں ایک شخص کلیان نام سے پکارا گیا ہے اور اس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کہانی لکھنے میں بڑا ماہر ہے۔ علم اللسان کے ذریعے سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کلیان ہی کلہن ہے۔

کلہن کی تصانیف میں سے آج کل صرف راج ترنگنی ملتی ہے مگر رس کنٹھ کے سار سموچے سے پتہ چلتا ہے کہ کلہن نے جے سنگھ ابھیودے نام کی ایک اور کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا ایک شلوک دلبھ دیو کی سبھاشت آولی کے تمہید میں ایڈیٹر نے درج کیا ہے۔

وزیر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے کلہن کی اقتصادی حالت اچھی رہی ہوگی جس کی وجہ سے کلہن سارے کشمیر کی سیاحت کر سکا جیسا کہ راج ترنگنی میں بیان کردہ ندیوں، پہاڑوں اور دیگر مقامات کے ناموں سے کشمیر کی جغرافیائی حالات کی واقفیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

کلہن کے خاندان کا تعلق راجہ ہرش کے ساتھ رہا ہے۔ جس کا قتل اچل اور سُسّل کی بغاوت کی وجہ سے ہوا۔ کلہن کا والد چنپک راجہ ہرش کا ایک وفادار وزیر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے کلہن کسی بڑے سرکاری عہدے پر مامور نہیں ہو سکا۔ کلہن کی اولاد نے سفارت خانوں میں کام کرنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

(مترجم ہیرالال چوپڑہ)

موعظۂ حسنہ

(ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر علی اصغر حکمت سفیر ایران برائے ہند کی وہ تقریر
جو اُنھوں نے جموں کشمیر یونیورسٹی کے چھٹے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر کی)

میں جموں کشمیر یونی ورسٹی کا ممنون ہوں کہ مجھے آپ کے سامنے آج تقریر کا موقع ملا۔

کشمیر ہمیشہ علم و حرفت کا ایک اہم مرکز رہا ہے، اور یہ عین واجب ہے کہ یہاں ایسی یونی ورسٹی کا قیام ہو جہاں پُرانے علوم کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانے کے فنون کی بھی تعلیم دی جائے۔ یہاں کی یونی ورسٹی ایسی ہو جو مطالعہ اور تحقیق کا مرکز ہو۔

کشمیر کے مشہور اہلِ علم کے فلسفیانہ اور ادبی شاہکار نیز مستعد فن کاروں کی صنعت کے نمونے ہم کو بطور وراثت عطا کئے گئے ہیں اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن اساتذۂ کرام کا تتبع کریں۔ اُن کی حیات انگریزی شاعر لانگ فیلو کے قول کے مطابق ایسا نشان ہے جس سے ہم اپنی زندگی کو اعلیٰ و ارفع بنا سکتے ہیں۔

کشمیر نے دنیا کو اخلاق و حکایات کی ایک بلند ترین کتاب "پنچ تنتر" دی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ ایک ایرانی حکیم برزوی اس خوبصورت خطۂ زمین میں ایک ایسی جڑی بوٹی کی تلاش میں محو تھا جس سے انسان کو حیاتِ دوام عطا ہوتی ہے تو اس کے عوض اُسے عقل و ہدایت سے لبریز یہ کتاب مل گئی جو نیم مُردوں کے لئے آبِ حیات تھی۔

اس کتاب کا نام پہلوی زبان میں "ہندنامہ کلیلک و دمنک" ہے اور اسی کا بعد میں عربی زبان میں ترجمہ کرکے اس کا نام "کتاب کلیلہ و دمنہ" رکھا گیا۔ عربی سے یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ کی گئی اور ازاں بعد دنیا کی تمام زبانوں میں منتقل ہوئی۔ خوش قسمتی سے وہ کتاب اب بھی ہمارے پاس ہے اور دنیا کے ادب میں ایک اہم جگہ رکھتی ہے۔

یہ بھی عین مناسب ہوگا اگر کشمیر یونی ورسٹی اپنی عمارت کے پانچ دروازے رکھے اور یہ دروازے پنچ تنتر کے پانچ ابواب کے نام سے منسوب ہوں یعنی فلسفہ، ادب، قانون، طب اور فنونِ لطیفہ۔

ہزاروں سال سے ایران اور کشمیر کے خیالات میں ہم آہنگی اور تمدن میں یکسانیت پائی جاتی ہے جو وسطی اور مغربی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے دونوں خوبصورت ملکوں کے باشندے جہاں رفیع و منیع پہاڑوں سے نکلنے والے چشموں سے اپنی تشنگی فرو کرتے ہیں وہاں ادبی اور ثقافتی چشموں کے آبِ حیات سے بھی مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

آج جب کہ ہم مغربی ایشیا میں ایک بہت بڑے ثقافتی انقلاب کے آستانے پر کھڑے ہوئے ہیں تو ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم فکر و تدبر کے روایتی لین دین کو برقرار رکھیں۔ ہم ایک دوسرے کے سماجی اور تاریخی تجربوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ فارسی کے شاعرِ اعظم سعدی نے ہم کو ایک عالمگیر اصول دیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے ؎

نرود مُرغ سوئے دانہ فراز | چوں دگر مرغ بیند اندر بند
پند گیر از مصائبِ دگراں | تا نگیرند دیگراں ز تو پند

(پرندہ دانے کے سامنے نہیں جاتا جب دوسرے پرندے کو وہ قید میں دیکھتا ہے۔ دوسروں کی مصیبت سے نصیحت حاصل کر تاکہ دوسرے تجھ سے نصیحت حاصل نہ کریں)

مغربی ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح ہم بھی ایران میں تمدن کے انقلاب کی نئی روش میں سے گزر رہے ہیں، تاکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔ ہم بھی ایسے ہی حالات میں ہیں اور یہ غیر واجب نہ ہوگا اگر ہمارے

کشمیری بھائی ایران کے سماجی انقلاب کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس دل فریب وادی میں چنار کا درخت پہلے پہل ایران سے ہی لایا گیا تھا اور وہ آج اس کی فطری خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہے۔ چنار اپنی نقل مکانی سے ہم کو نصیحت کرتا ہے کہ اس دور میں بھی ہم ایک ملک کے سماجی تجربوں کو دوسرے ملک میں آسانی سے رائج کر سکتے ہیں، اور کشمیر اور ایران دونوں میں ایسی بہت سی مشترک مثالیں موجود ہیں، اور آج میں تھوڑی سی مشترک خصوصیتوں پر ہی اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔

آج سے ایک صدی پیشتر مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم صرف مغربی یورپ کے چند ملکوں میں رائج تھی۔ کچھ سال ہوئے ایران نے بھی سات سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دے دی ہے۔ کوئی تیس سال ہوئے ایران کے اکثر شہروں میں لڑکیوں کے بہت کم اسکول تھے، اور ابتدائی درجوں میں مخلوط تعلیم مفقود تھی۔ لیکن ایران میں تعلیم کے میدان میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کی وجہ سے کئی نئے پرائمری سکول جاری ہو گئے ہیں۔ آج ملک کے دور افتادہ گوشے میں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی اسکول ہے، جہاں لڑکے اور لڑکیاں علیحدہ یا مخلوط تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ پرائمری تک تعلیم مفت ہے، اور دیگر درجوں میں کافی سستی ہے۔

اس لئے یہ دیکھ کر مجھے یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ کشمیر میں ابتدائی ثانوی اور یونی ورسٹی یعنی ہر سہ درجوں کی تعلیم مفت ہے۔ کشمیر سرکار کا یہ قدم بذات خود اس کی اشاعت تعلیم کی سرگرمی کا بیّن ثبوت ہے۔

جس نکتے کو میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حرف پر نہیں بلکہ روح پر زور دینا چاہیئے۔ سکولوں کی تعداد پر نہیں بلکہ ان کی افادیت پر زور دیا جائے۔ نصاب اس ڈھنگ سے مقرر کئے جائیں کہ طلبا اس سے کردار اور خود اعتمادی کی تشکیل کر سکیں۔ ہمارے اسکول اور یونی ورسٹیاں عمل اور ارادے والے ایسے انسان پیدا کریں جو اپنی شخصیت میں راست بازی، خلوص اور پرہیزگاری کو دولت، مرتبہ اور ظاہری نمود و نمائش پر ترجیح دیں۔ کشمیر جیسے ملک میں جہاں قدرت کی نعمتیں فراواں ہیں اور لوگوں میں صنعت و حرفت اور دستکاری کا شوق عام ہے وہاں نصاب بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں جن سے زراعت، باغبانی اور سلک پروری کو فروغ حاصل ہو اور دوسری طرف دستکاریوں پر زیادہ توجہ مبذول ہو۔ سائنس کی تھیوریوں (نظریوں) کی تعلیم کی بجائے عملی فنون سے بچوں کو واقف کیا جائے۔ تاکہ وہ مفید شہری بن سکیں۔ عوام کو تعلیم کی نسبت تربیت کی زیادہ ضرورت ہے۔ انسانی ہمدردی رحم اور دیگر نیک خصائل یعنی سچائی، حیا، پاک بازی، سخاوت اور رواداری کا ان میں پیدا کرنا ضروری ہے۔ ہمدردی کے اصول کا ملک کے ہر مرد اور عورت کو جاننا لازمی ہے۔

اکثر مشرقی ممالک کی طرح ایران میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی مدارج میں ان بنیادی اصولوں کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر نوجوان مرد اور عورتیں تعلیمی درسگاہوں سے نکل کر سست اور غبی ہونے کے علاوہ متزلزل مزاج اور بزدل ہوتے ہیں۔ ان کی تمام بہادری اور شجاعت ملازمتوں کے لئے تگ و دو تک محدود ہوتی ہے۔ وہ ملازمت کے لئے سرکار کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہی تو آج کل کے سکولوں کے نصاب کی بدترین کمزوری ہے جس کی طرف ماہرین تعلیم نے توجہ دلائی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں تعلیم اس برائی سے پاک اور منزہ رہے گی۔

زبان کا مسئلہ ریاست کے تعلیمی مسائل میں بہت اہم ہے۔ ریاست کا ہر بچہ چار زبانوں کے سیکھنے پر مجبور ہے۔ مادری زبان، اردو، ہندی اور انگریزی کا اس کے لئے جاننا ضروری ہے، تاکہ وہ موجودہ آرٹ اور سائنس کی تعلیم سے مزین ہو سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ مادری زبان کے علاوہ دیگر تین زبانوں میں مہارت ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے درجوں میں طلبا پر کافی بوجھ ہے۔ اس مسئلہ کو تعلیمی بورڈ اور ماہرین تعلیم کو حل کرنا چاہیئے۔ ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیئے کہ طلباً صرف دو ہی زبانیں سیکھیں، جیسا کہ ایران، ٹرکی اور دیگر عرب ملکوں میں ہے۔ اس انتظام کے بغیر دو فالتو زبانوں کے سیکھنے میں قیمتی وقت خواہ مخواہ رائگاں جاتا ہے جس سے موجودہ سائنس اور تمدن کی تعلیم میں رکاوٹ پڑتی ہے۔

وقت کی اہمیت پر کچھ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس پر میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں، یہاں جہاں قدرت کی نعمتوں کی فراوانی ہے۔ کچھ لوگ ابھی تک وقت کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر لمحہ ایک قیمتی دولت ہے جس سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ سعدی فرماتے ہیں ؎

بے فائدہ ہر کہ عمر در باخت   چیزے نہ خرید و زر بینداخت

(جس نے اپنی زندگی کو بے فائدہ گذار دیا اُس نے کوئی چیز خریدے بغیر ہی اپنا زر پھینک دیا)

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ وقت دولت ہے۔ لیکن آپ کی گزیٹڈ اور غیر گزیٹڈ تعطیلات غیر ضروری طور پر بہت زیادہ ہیں۔ اتوار کے علاوہ سال میں آپ کی تعطیلات کی تعداد چوّن ہے۔ اِن دنوں میں سرکاری دفاتر، مارکیٹ، بنک، سکول اور دیگر ادارے بند رہتے ہیں۔ ہم کو انسانی طاقت کا اِن چھٹیوں کی وجہ سے ضائع ہو جانے پر غور کرنا چاہیئے۔ سماج کی اقتصادی زندگی کو اس تضیع اوقات کی وجہ سے کتنا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ کچھ سال ہوئے ایران میں ہم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ لیکن تجربے نے سکھایا کہ سال میں صرف چودہ یا پندرہ چھٹیاں عید و محرّم کے علاوہ ہونی چاہئیں۔ اس طرح سماجی زندگی میں کافی بچت ہو گئی۔

تعلیم کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اُس انقلاب کا بھی ذکر ضروری ہے جو مغربی ایشیا کے ممالک میں عورت کے مقام کے تعیّن کے بارے میں ہوا۔ کوئی نصف صدی پیشتر دیگر مُسلم ممالک کی طرح ایران میں بھی عورتیں پردہ کرتی تھیں اور سماج کا یہ نصف عنصر بالکل بیکار تھا۔ جب سے پردہ ختم ہو گیا ہے عورتیں غلامی سے نجات پا کر اپنے ملکوں میں مردوں کے برابر مقام پا سکی ہیں۔ انھوں نے جان لیا ہے کہ خدائے متعال نے حصولِ علم و معاش اور تمدنی زندگی کے دیگر مسائل میں عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیا ہے۔ پیغمبر اسلام نے بھی اس طرح فرمایا ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ (علم کی تلاش ہر مرد اور عورت پر فرض قرار دی گئی ہے) ایران کی عورتوں نے جان لیا ہے کہ پردے سے مراد عورت کی قید یا گوشہ نشینی نہیں ہے۔ نہ ہی اس سے انسانیت کے نصف جسم کو مُردہ بنانا مقصود ہے۔ پردے کا مقصد صرف عفّت، عصمت، حیا، اتّقا اور دل کی صفائی ایسے اوصافِ حمیدہ کا اختیار کرنا ہے۔ مشرقی ممالک میں اِس احساس نے کئی نسوانی تحریکوں کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لڑکیاں آج اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں وہ صرف اچھی مائیں ہی ثابت نہ ہوں گی بلکہ اچھی اُستانیاں، کامیاب ڈاکٹر اور ہنرمند نرسیں بنیں گی۔ اور ان میں اکثر ایسی ہوں گی جو ملک کی خدمت میں امتیاز حاصل کریں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ کشمیر کے مسلمان ہمارے اس تجربے سے سبق حاصل کریں گے اور عورتوں کی فلاح کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

دوسرا اہم مسئلہ جو مغربی ایشیا کے تمام ممالک میں اور کشمیر کی سماجی زندگی میں بھی قابلِ غور ہے وہ صفائی اور صحتِ عامّہ کا ہے۔ دین کے آئینی فرائض کبھی صفائی کے بنیادی اصول تھے۔ لیکن آج صفائی طبّی اصولوں کے سہارے پر کھڑی ہے۔ اگر زمانۂ قدیم میں وضو اور غسل ضروری فرض قرار دئے گئے تھے۔ کیونکہ دین کا حکم تھا اَلنظافۃ من الایمان یعنی صفائی ایمان کا جزو ہے تو آج سائنس ہمیں تلقین کرتی ہے کہ جسم کو صاف اور مضرت رساں کیڑوں سے مبرّا پانی سے دھونا صحت کے لئے بے حد مفید ہے۔ اکثر مغربی ایشیائی ممالک میں خشک لق و دق ریگ زار اور صحرا ہیں اور پانی کی سخت قلّت ہے۔ اور جہاں کے شہروں اور دیہات کے لئے آب رسانی ایک خاص مسئلہ ہے وہاں غسل کے نہ کرنے کا بہانہ چل سکتا ہے۔ لیکن کتنا افسوسناک اور ساتھ ہی حیرتناک بھی ہے کہ کشمیر کا ملّاح یا کاشتکار جو دن رات پانی ہی میں رہتا ہے وضو یا غسل کرنے سے قاصر ہے۔ اگر وہ اس فرض سے کوتاہی کرتا ہے تو گویا دین کے ایک حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔

سائنس کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اُس نے ملیریا، اسہال، تپ محرقہ، تپ دق یا ہیضہ جیسی بیماریوں اور وباؤں کے انسداد کے آسان وسائل مہیا کر دئے ہیں۔ ہمارے طبیب اُن بیماریوں کے معالجے سے اچھی طرح سے واقف ہیں، لیکن صحتِ عامہ کا یہ عالمگیر اصول ہے کہ "پرہیز علاج سے بہتر ہے" ہمیشہ قائم ہے۔ انفرادی اور مجموعی طور پر مرد، عورت، جوان، بوڑھا ہم میں سے ہر ایک کو اُس چیز سے پرہیز اور احتیاط لازم ہے جس سے بیماری کے پیدا ہونے کے امکانات ہوں۔

مغربی ایشیا کے اکثر دیہاتی صفائی کی نعمت سے بے بہرہ ہیں۔ صفائی کے نہ ہونے سے مردم شماری کے اعداد کے مطابق اموات کے متعلق تشویش کن حالات رونما ہوتے ہیں۔ اب مچھروں کے مارنے اور مکھیوں سے بچاؤ کی تجویزیں گورنمنٹیں عوام کے سامنے رکھتی ہیں جس سے عوام بھی عادی ہوتے جا رہے ہیں کہ صاف پانی پئیں اور وہ سادہ اور صحت بخش غذائیں کھائیں جو اچھی سبزیوں سے تیار کی گئی ہوں۔ اس سے امراض اور وباؤں کے پھیلنے کے امکانات بہت کم ہو گئے ہیں۔

جس دَور میں سے ہم جا رہے ہیں وہ روشنی اور طاقت کا دَور ہے۔

بالکل اسی طرح جس طرح کائنات کے ذرے اپنی چمک آفتاب سے مستعار لیتے ہیں، علم کی روشنی سے بھی ہر ایک انسان کو منور ہونا چاہیئے۔ تمام بنی نوع انسان بلا امتیاز رنگ، نسب، نسل اور جنس خدا کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والے ہیں۔ اگر اُن کو کوئی چیز ممیز کرنے والی ہے تو وہ اُن کی خوبی اور خوش اخلاقی ہے۔ کیونکہ خداوند کریم کی نگاہوں میں وہی سب سے زیادہ معزز ہے جو پاکباز ہے۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)

تعصب اور تفرقہ زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ اِس لئے ہم کو اُن سے بازرہنا چاہیئے۔ ہم کو واجب ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے میل جول سے رہیں جیسے باغ میں ایک ہی مالی کے لگائے ہوئے مختلف پیڑ رہتے ہیں۔

صلح پسند مشترکہ زندگی کے پانچ سنہری اصول (پنچ شیل) جو ہندستان کے مایۂ ناز وزیر اعظم نے وضع کئے ہیں صرف سماجی گروہوں، قوموں اور ملکوں کی ہی بہبود کا موجب نہ ہوں گے بلکہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو وہ نجی زندگی میں بھی مسرت اور اطمینان کا باعث ہو سکتے ہیں۔ کشمیر کی وادی ایک ایسے گھر کی طرح ہے جس کے گرد پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔ یہاں کی زمین اس کی ماں ہے جو اپنے سپوتوں کو محبت اور شفقت سے پالتی ہے۔

وقت آگیا ہے جب اِس خاندان کے سب افراد بہنوں اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اور نسلی اور مذہبی امتیازات کو بھلا کر اُن کو صلح اور خوش حالی میں رہنا چاہیئے اور یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ خود اپنے آپ کو سنواریں گے تو خدا بھی اُن کو کامیابی عطا کرے گا۔

پیشتر اِس سے کہ میں اِس مقدس مجلس سے رخصت ہوں، چاہتا ہوں کہ قرآن کی ایک فاضلانہ نصیحت پر ختم کردوں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

دو تہذیبوں کا میل

بھارت اور ایران

زندگی اور ثقافت

بھارت کی زندگی اور ثقافت پر اثر انداز ہونے والے بہت سے لوگوں اور قوموں میں سب سے زیادہ قدیم اور مسلسل تعلقات ایرانیوں کے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات انڈو آرین تہذیب کے آغاز سے بھی قبل کے ہیں نسلی رشتے کے علاوہ اُن کے قدیم مذاہب اور زبانوں کا پس منظر بھی مشترک ہے۔ ویدک دھرم اور پارسی مذہب میں بہت حد تک اشتراک موجود تھا۔ ویدوں کی سنسکرت اور قدیم پہلوی بولی یعنی "اوستا" کی زبان ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ کلاسیکی سنسکرت اور فارسی نے الگ الگ نشو ونما پائی ہے لیکن ان کے بہت سے مصادر ایک ہی ہیں، جیسے دیگر تمام آرین زبانوں کے کئی مصدر مشترک ہیں۔ دونوں زبانیں اور ان سے بڑھ کر دونوں ملکوں کے فنون اور ثقافت اپنے اپنے ماحول سے اثر پذیر ہوئے۔

ہندوستان کی مانند ایران کی ثقافتی بنیادیں بہت مضبوط اور مستحکم تھیں، اور وہ حملہ آوروں کو بھی متاثر کرنے اور ان کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عربوں نے ساتویں صدی عیسوی میں ایران کو فتح کر لیا تھا لیکن وہ بہت جلد ہی ایران کا اثر قبول کر گئے، اور انھوں نے اپنے سادہ صحرائی طریق و اطوار کو چھوڑ کر ایران کی پُر تکلف ثقافت اختیار کر لی۔ یورپ میں فرانسیسی زبان کی طرح فارسی بھی بہت جلد ایشیا کے وسیع خطوں میں مہذب لوگوں کی زبان بن گئی تھی۔ ایرانی فنون اور ثقافت مغرب میں قسطنطنیہ سے لے کر صحرائے گوبی کے کنارے تک پھیل گئی تھی۔

بھارت پر ایرانی اثرات مسلسل جاری رہے بلکہ افغان اور مغلوں کے عہدِ حکومت میں فارسی اس ملک کی درباری زبان تھی، اور انگریزی دور حکومت کے آغاز تک فارسی ہی سرکاری اور عدالتی زبان رہی۔ ہندوستان کی تمام جدید زبانیں فارسی کے الفاظ سے بھری پڑی ہیں۔

کابل قندھار اور سیستان کے سرحدی علاقے جو اکثر مرتبہ سیاسی طور پر ہندوستان کا حصّہ رہے ہیں، ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے ملاپ کا مقام تھے۔ پا رتھین عہد کے ان علاقوں کو سفید ہندوستان کہا گیا۔ ان علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی علّامہ جیمز ڈامیسٹلر لکھتا ہے۔ "ان علاقوں میں ہندو تہذیب پھیلی ہوئی تھی۔ حقیقت میں دوسری صدی قبل از مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک ان علاقوں کو سفید ہندوستان کہا جاتا تھا اور مسلمانوں کی فتوحات تک یہ علاقے ایران کے مقابلے میں زیادہ تر ہندوستان میں ہی شامل تھے۔

ہندوستان میں ایک نئے فنِ تعمیر نے جنم لیا جو ہندوستانی آدرشوں اور ایرانی تخیل کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ دہلی اور آگرہ میں بہت سی نہایت نفیس اور حسین عمارتیں جا بجا نظر آنے لگیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور تاج محل ہے۔ مشہور فرانسیسی سیّاح اور مورخ ایم گروسٹ تاج محل کے بارے میں لکھتا ہے "ایران کی رُوح نے ہندوستان کے قالب میں ظہور پایا ہے"۔

بدقسمتی سے ہمارے اس طویل، گہرے اور باوقار تعلق کی آخری یاد آج سے دو سو برس قبل نادر شاہ کا حملہ ہے۔ جو مختصر ہونے کے ساتھ ہی نہایت خوف ناک بھی تھا۔

اس کے بعد انگریز آگئے۔ انھوں نے تمام دروازے بند کر دئے، اور وہ تمام راستے مسدود کر دئے جو ہمیں اپنے ایشیائی ہمسایہ ممالک سے ملاتے تھے۔ باقی ایشیا سے اچانک اس طرح الگ تھلگ اور منقطع ہو جانا

ہندوستان میں انگریزی راج کا سب سے زیادہ نمایاں اور قیمت اثر تھا۔

تیرہ سو برس گزرے جب ایران میں اسلام پھیلا تو زرتشت مذہب کے چند ہزار پرستار ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان چلے آئے تھے۔ یہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور وہ بمبئی ساحل پر آباد ہوگئے۔ وہ بنا کسی دخل اندازی کے اپنے عقیدہ اور رسم و رواج پر کاربند رہے۔ انھوں نے دوسروں کے کسی ایسے کام میں کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ آج بھی ان کی تعداد قریباً ایک لاکھ ہے۔ انھوں نے کاروبار میں خوب ترقی حاصل کی، اور ان میں سے بہت سے بھارت کی صنعتوں کے رہنما ہیں۔ عملی طور پر ان کا ایران کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ مکمل طور پر ہندوستانی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی قدیم روایات پر قائم ہیں اور اپنے قدیم وطن کی یاد بنائے رکھتے ہیں۔

حال ہی میں ایران میں ایک زبردست رجحان پایا گیا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل کے زمانہ کی قدیم تہذیب پر پھر سے توجہ دی جائے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جذبہ ثقافتی اور قوم پرستانہ ہے جس کا مدعا ایران کی طویل اور مسلسل ثقافتی روایات کی کھوج لگانا اور ان پر فخر کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

دنیا کے حالات کی رفتار اور مشترکہ مقاصد ایشیائی ملکوں کو پھر سے ایک دوسرے سے تعلق بڑھانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یورپی قوموں کے غلبے اور حکومت کا زمانہ ایک بُرے خواب کی طرح گزر چکا ہے۔ اب ماضی قدیم کی یادیں ان کو پھر سے قدیم دوستی اور مشترکہ جدوجہد پر مائل کر رہی ہیں۔ بلاشبہ بھارت مستقبل قریب میں ایران کے اسی طرح زیادہ قریب ہو جائے گا جس طرح کہ چین کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ (جواہر لال نہرو)

اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران

اعلیٰ حضرت شاہِ ایران پہلوی خاندان کے بانی جناب رضا شاہ پہلوی کے فرزند ہیں۔ ان کا جنم ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ہوا، اور ۱۹۴۱ء میں آپ سریرآرائے سلطنت ہوئے۔ شاہِ ایران اپنے ملک کے لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی بڑی تمنا رکھتے ہیں، اور انھوں نے اس مقصد کے لئے اپنی مساعی مسلسل جاری رکھی ہیں۔

۱۹۲۵ء میں جب ان کی عمر صرف چھ برس کی تھی ملٹری ایلیمنٹری اسکول تہران میں ان کی تربیت کا آغاز ہوا۔ بعد میں انھوں نے سوئیٹزرلینڈ میں اس تربیت کو جاری رکھا، اور آخرکار ایران ملٹری ایکاڈیمی سے ۱۹۳۸ء میں گریجویٹ بن کر نکلے، اور ان کو فوج میں لیفٹننٹ کا عہدہ دیا گیا۔ اعلیٰ حضرت شاہ کو فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ انھیں نیچرل سائنس۔ لٹریچر خاص کر فارسی لٹریچر سے بہت انس ہے۔ ان کی عظیم الشان ذاتی لائبریری میں ایران کے بلند پایہ شاعروں اور مفکّروں کی تصانیف شامل ہیں۔ شاہِ ایران کھیلوں اور جسمانی تعلیم میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ خود برف پر دوڑنے کے کھیل کے ماہر اور اعلیٰ درجے کے ہوا باز ہیں۔ انھیں ایران کے برف پوش پہاڑوں کی ڈھلانوں سے نیچے پھسلنے یا خود اپنے ہوائی جہاز میں ان پہاڑوں کے اوپر پرواز کرنے سے زیادہ کوئی دوسرا شغل مرغوب نہیں ہے۔ کھیلوں میں شاہ کی ذاتی دلچسپی کی بدولت ہی لندن اور ہلسنکی میں اولمپک کھیلوں کے گذشتہ دونوں مقابلوں میں ایران کے کھلاڑیوں کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مرتبہ کے ساتھ ذمہ داریاں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ہمیشہ ہی شاہی خاندان کے افراد پر زور دیتے رہتے ہیں کہ وہ ایران کی سماجی انجمنوں میں سرگرم حصّہ لیں۔ مثال کے طور پر خود ملکہ ثریّا (شاہ کی بیوی) زچّہ بچّہ کی بہبود کے ادارے کی رُکن اعلیٰ ہیں۔ شاہ کی دونوں بہنیں شہزادی اشرف اور شہزادی شمس سماجی خدمات کے شاہی اداروں سرخ شیر ببر۔ آفتاب سوسائٹی کی لیڈر ہیں۔ یہ دونوں انجمنیں ایران میں ریڈکراس سوسائٹی کی مدِمقابل ہیں۔

شاہ نے خود بھی اپنی شاہی جاگیر کو کسانوں میں بانٹ کر ایک ترقی پسند اقدام کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت شاہ نے ۱۹۵۰ء میں ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کے ذریعے پچاس ہزار ایکڑ سے زائد زیر کاشت آراضی اور باغات ایران کے کسانوں کو تقسیم کر دیے گئے۔ اس فرمان کے تحت کُل آراضیات جو کسانوں میں تقسیم کی جائیں گی وہ اس رقبہ سے پچاس گنا زائد ہوں گی اور ان کی قیمت سات کروڑ ڈالر سے زائد ہوگی۔

شاہ نے اپنے ذاتی سرمایہ اور جائداد کو کس طرح اپنے ملک کے لوگوں کی بہتری کے لئے صرف کیا ہے۔ شاہی آراضیات کی تقسیم تو اس کا صرف ایک نمونہ ہے۔ گذشتہ برسوں میں شاہ نے ساڑھے تین لاکھ ریال یعنی قریباً چالیس لاکھ ڈالر صحت و صفائی، تعلیم اور خیراتی کاموں کے پروگراموں

کے لئے چندہ دیا ہے۔ ایران کی زراعت و صنعت کی ترقی کا ایک طویل المیعاد پروگرام وضع کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے شاہ نے سات سالہ منصوبہ تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ اس ادارے نے ایران کی صنعت و زراعت کو نمایاں طور پر بلند کرنے میں مدد دی ہے۔

۱۹۴۷ء میں شاہ نے ایران کی تاریخ میں پہلی بار سینیٹ کے انتخابات کا حکم جاری کیا تھا۔ ایران کے آئین میں اس قانون ساز جماعت کے قیام کی دفعہ تو موجود تھی لیکن اعلیٰ حضرت شاہ کے مذکورہ فرمان سے قبل کبھی اس پر عمل نہیں ہوا تھا۔

باہمی تعلقات

اُردو زبان کی نشو و نما ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھارت اور ایران کی زبانوں کے اختلاط کی یاد دلاتی رہے گی۔ یہ دونوں ملکوں کے لوگوں کے خیالات اور اصولوں کے باہمی تبادلہ اور مفاہمت اور اشتراک کی وسعت اور صلاحیت کی بیّن دلیل ہے جنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ گفت و شنید اور نامہ و پیام کے لئے اُردو کو ایک نہایت عمدہ وسیلہ اور ذریعہ پایا۔ بھارتی مؤرخین فارسی کے نامور علامہ ابوریحان البیرونی کے بعد ممنون ہیں جنھوں نے اپنی مشہور تصانیف قدیم قوموں کے تاریخ و احوال اور انڈیکا میں ہندوستانی، ایرانی اور یونانی علوم اور معاشرتوں کے تقابلی مطالعہ کے لئے یادگاری وقائع اور تحریریں پیش کی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ البیرونی نے کابل، ملتان، پشاور، بنارس اور کشمیر کی سیاحت کی، اور ہندوستانی عالموں کے ساتھ براہِ راست تعلق کے کافی مواقع حاصل کئے۔ اس نے ہندوستان کے مشہور ودوانوں کی مدد سے سنسکرت کے بہت سے گرنتھوں کا مطالعہ کیا۔ اسے علم نجوم اور جیوتش میں بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ سلطان محمود کے درباری جیوتشی کی حیثیت میں وہ "برہم سدھانت" اور اسی قسم کے دیگر جیوتش شاستروں سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

جب ایران کے علما ہندوستان کے عظیم علوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے اس وقت اکبر نے ایرانیوں کو ہندوستان کے مشہور علوم و فنون کی بہت سی خوبیوں سے روشناس کرنے کے لئے سرگرم مساعی کی تھیں۔ اس شہنشاہِ اعظم نے مہابھارت، رامائن، ہری ونش اور کلہن کی تاریخ کشمیر جیسی عظیم تصانیف نیز بھاسکر آچاریہ اور لیلاوتی کے علم حساب پر مشہور رسالوں کے فارسی میں ترجمے کرائے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں "شک سپتتی" (طوطے کی ستر کہانیاں) کے فارسی ترجمہ "طوطی نامہ" کے ذریعے اور اسی کی مانند "کتھا سرت ساگر" (کہانیوں کا سمندر) جیسی بھارتی تصانیف سے دنیا بھر کو روشناس کر دیا گیا تھا۔

(ہز ایکسیلنسی علی اصغر حکمت)

مشترکہ وراثت

قدرت نے ایران اور ہندوستان کی دونوں قوموں کے درمیان محبت، قرابت اور اخوت کے رشتوں کی بنیاد اس وقت ڈالی جب کہ ایرانیو اور ہندوستانیوں کے آبا و اجداد سطح مرتفع پامیر کے شمالی اور مغربی علاقوں میں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ زمانۂ تاریخ اور زمانۂ قبل از تاریخ کے ایک ہزار سال کے دوران میں فاصلے کی دوری، بڑھتے ہوئے اختلافات اور تغیرات کے باوجود ایکے اور اتحاد کا یہ جذبہ، قربت کا احساس اور پُر مسرت باہمی مفاہمت جوں کی توں چلی آتی ہے۔

صدیوں کے سماجی و تجارتی تعلقات اور باہمی تبادلۂ خیالات نے دونوں قوموں کے طور طریقوں، رسم و رواج اور اعتقادات کو ایک ہی جیسی شکل و صورت اور یکساں ترتیب عطا کی ہے جس طرح لسانیات میں 'اوستا' کی زبان میں ہمیں سنسکرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح زرتشتی نے بھی بہت سی چیزیں ہندوازم کے اصولوں سے لی ہیں نسل و تہذیب کے اس بنیادی ایکے اور اتحاد کی قدیم مثالوں اور حوالوں سے ان لوگوں کے تعجب کو دور کرنے میں مدد ملے گی جو ایران اور ہندوستان کی ادبی اور فنی یادگاروں کو بہ نظر استعجاب دیکھنے کے عادی ہیں۔

ہندوستان کے لوگوں نے سنسکرت میں اپنے آباؤ اجداد سے ایک عظیم اور شاندار وراثت پائی ہے اور گذشتہ چھ صدیوں میں انھوں نے اپنی اس وراثت میں فارسی کے نظم و نثر کے مختلف شاہکاروں کے ذریعے کافی اضافہ کیا ہے۔

اگر آج کوئی ماہر اعداد و شمار اس زندہ جاوید ترکہ کا شمار کرنے بیٹھے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی علما نے فارسی میں جو تصانیف چھوڑی ہیں، ان کی تعداد کسی صورت میں ان کتابوں کی تعداد سے کم نہیں جو

ایران میں لکھی گئیں۔ گیارھویں صدی میں ایران اور ہندوستان میں ایک ہی قسم کے ادبی وفنی شاہکاروں کی تصنیف وتخلیق میں رشک ومقابلہ کا ایک بڑا جذبہ پایا جاتا تھا۔ یہ ایک لازمی سی بات نظر آتی ہے کہ اصفہان میں جو بھی گیت لکھا گیا ہوگا) اس کا مماثل آگرہ اور دہلی میں ضرور موجود ہوگا اسی طرح ایران میں عمارتوں کی دیواروں اور چھتوں کی نقاشی نے ہی یہاں کے فن کاروں کو متأثر کرکے فتح پورسیکری آگرہ اور دہلی میں ویسی ہی نقاشی کرنے کی ترغیب دی ہوگی۔

اس مقابلہ ورفاقت کے نتیجے کے طور پر ایک قلیل مدت میں ایسے بےشمار شاہکار وجود میں آئے جنھیں ہندوستان اور ایران آج اپنا مشترک قیمتی سرمایہ یا مشترکہ وراثت خیال کرسکتے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں جب کہ ہندوستان کے عوام ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی تلے دبے ہوئے تھے اور حالات اس مشترکہ سرمایہ کے تحفظ کے لئے موافق نہیں تھے تو بھی انھوں نے ان یادگاروں کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے اس عالمی وراثت کے لئے اپنی محبت اور دلچسپی کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ ہر غیر ملکی حکومت اس بارے میں ایک نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی سینکڑوں خوبصورت اور پرکشش عمارتیں اور شاندار ادبی تصانیف اپنی پرانی شان وشوکت کے ساتھ موجود ہیں، اور موجودہ نسل کو ایک یادگار صورت میں حاصل ہوئی ہیں۔ (انڈو ایرانیکا)

ہندوستانی آرٹ پر ایران کا اثر

گذشتہ کئی صدیوں میں ایرانی آرٹ اور ثقافت ہندوستانی آرٹ پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اور مغلیہ حکومت کے ابتدائی دور میں فن کتاب سازی نے جو شائدآرٹ کا سب سے دل کش شعبہ ہے اور جس میں خوش خطی اور مصوری بھی شامل ہیں لوگوں کی بہت زیادہ توجہ کھینچی۔ چنانچہ متمدن اشخاص، عالموں اور مصوروں کی ایک بڑی تعداد میں اس فن کے لئے بےمثال دلچسپی اور جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ بنگال میں گذشتہ صدی کے وسط تک ایسے بنگالی موجود تھے جو ایرانی ثقافت کے مداح تھے، اور جنھیں فارسی شاعری اور فلسفے پر عبور حاصل تھا۔

ایشیائے کوچک، عراق۔ شام اور فلسطین۔ کاکیشس اور ترکستان، مصر۔ افغانستان اور شمالی ہندوستان (دریائے سندھ تک) سب کے سب کسی وقت ایرانی اقتدار کو تسلیم کرتے تھے اور ایرانی آرٹ، ادب اور ثقافت نے ان کی تہذیبوں، لباس، رسم ورواج اور رہن سہن پر گہرا اثر ڈالا ہے، حتٰی کہ قدیم یونان کو بھی ایران کی طاقت کا احساس تھا۔

ایرانی فن تعمیر کی خصوصیات میں گنبد کی خوبصورتی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ہم تاج کے گنبد میں جو بلا کی نفاست اور خوبصورتی دیکھتے ہیں، اس کا محرک کسی اور مسلم ملک کی بہ نسبت ایران کا آرٹ زیادہ تھا۔ ایک نقاد کے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں یہ ایک عجیب سی بات نظر آتی ہے کہ ایک ایسے مذہب نے جس کا شروع میں آرٹ سے اتنا کم تعلق تھا ان تمام مقامات پر جہاں کہ اس کی اشاعت ہوئی آرٹ کے ڈیزائن میں اتنی زیادہ یکسانیت پیدا کی؟ چنانچہ سپین سے لے کر ہندوستان تک مسلم عمارتیں اور بت تراشی کے نمونے محض تھوڑے سے رد وبدل کے ساتھ ایک ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایرانی آرٹ کے سبھی ادوار میں ہمیں آرائش کا ایک بےپناہ جذبہ ماہرانہ صناعی اور اختراعی قابلیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ خوبیاں اور رنگوں کا دل کش امتزاج مصوری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ غالیچوں اور مٹی کے برتنوں میں بھی یہ خوبیاں کچھ کم اجاگر نہیں ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے ہندوستان پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہندوستانی ڈیزائن کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایرانی طرز تزئین نے ہندوستان کے آرائشی آرٹ کو نہایت درجہ تک متأثر کیا ہے۔

کثیر تعداد میں چمکدار ٹائلوں کا استعمال جس کے سبب ابتدائی مغل دور کی عمارات کی خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ایرانی آرٹ نے ہندوستانی فن تعمیر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ فن خوش نویسی کو بڑی قدر ومنزلت حاصل تھی اور مشہور خوش نویسوں کو قرآن کے بیش قیمت نسخے لکھنے کے لئے ملازم رکھا جاتا تھا۔ ان خوش نویسوں نے بھی عظیم ترین آرٹسٹوں سے کوئی کم شہرت حاصل نہیں کی۔ اکثر اوقات خوش نویس اور آرٹسٹ ایک ہی شخص ہوتا تھا۔

انور برہانپوری

علم

کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو | بنو پڑھ کے فاضل تم اے پیارے بچو
جہالت مٹا دو زمانے سے بڑھ کر | کرو عزمِ کامل تم اے پیارے بچو

کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

یہ علم و عمل کے کرشمے تو دیکھو | یہ موٹر یہ گاڑی یہ تانگے تو دیکھو
یہ ایجادیں ہیں علم ہی کی بدولت | تم اوراقِ تاریخ اُلٹ کے تو دیکھو

کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

جہالت کی دُنیا کو اب خاک کر دو | جو پردے جہالت کے ہیں چاک کر دو
مٹاؤ برائی ، بڑھاؤ بھلائی | یہ چرچا زمیں سے با فلاک کر دو

کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

یہ سکوں کی دولت نہ کام آ سکے گی | بھروسے کے قابل نہیں دولت ایسی
عجب دولتِ علم دی ہے خدا نے | کرو خرچ جتنا یہ ہے بڑھنے والی

کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

گڑیوں کا اسکول

مختار بارہ بنکوی

بہت معقول ہے گڑیوں کا اسکول
بہت موزوں ہے اس کا عرض اور طول
ہیں سب کمرے نہایت ہی ہوادار
ہے سب کا فرش چکنا اور ہموار
کشادہ اس کی ساری کھڑکیاں ہیں
سبھی کمروں کے آگے سائباں ہیں
ہراک کمرے میں فرنیچر ہے کافی
کتابوں کی ہیں صندوقیں بھی وافی
قرینے سے لگی الماریاں ہیں
حسیں ہر ایک پر گلکاریاں ہیں
ہے استانی کی بالکل وسط میں میز
ہے جس کی وارنش بے حد دلآویز
بیک انداز ڈیسکیں بھی رکھی ہیں
سبھی کے کرسیاں پیچھے لگی ہیں

بجا اسکول کا گھنٹہ ٹناٹن
لگی آنے سبھی گڑیاں دنادن
برابر آتی تھی اسکول کی بس
چلی جاتی تھی خالی ہو کے واپس
کھچا کھچ بھر گیا اسکول کا ہال
تھی استانی کی سب پر دیکھ اور بھال
سوا ان کے کئی استانیاں تھیں
ہراک کے کام کی نگرانیاں تھیں
سوا دس کی جونہیں گھنٹی بجائی
لگی ہونے وہیں فوراً پڑھائی
لیا اک دم نہ استانی نے آرام
اسے دیکھا جو گھر پہ تھا دیا کام
کسی گڑیا کی کاپی لے کے دیکھی
غلط جو بات تھی اس کو بتائی
کسی گڑیا کو مارا زن سے چانٹا
کسی کے کان اُکھیڑے اور ڈانٹا
کسی گڑیا کو تو مرغا بنایا
کسی کے بید ہاتھوں پر لگایا
طمانچوں سے کسی کے سرخ تھے گال
کسی کے ہاتھ کی تھی اُڑ گئی کھال
کوئی بے چاری سسکی بھر رہی تھی
کوئی اپنی جگہ پر ڈر رہی تھی
پھر اس کے بعد میں املا لکھایا
برابر ہال میں سب کو بٹھایا
تھا استانی کا ایسا رعب غالب
کوئی تھا نقل کرنے کا نہ طالب

تھے املا میں کئی الفاظ مشکل ۔۔۔ حباب و قلزم و گرداب و ساحل
لکھے سب بورڈ کے اوپر برابر ۔۔۔ کہ لکھیں بچیاں اس کو سمجھ کر
لکھائے ارتھمیٹک کے سوالات ۔۔۔ بتا کر حل نکلوائے جوابات

کرالی حل زبانی ارتھمیٹک ۔۔۔ پڑی دس بیس کے ہاتھوں پہ اٹک
خوش الحانی سے پھر پڑھوائے اشعار ۔۔۔ کہ جس سے ان کے ہوں جذبات بیدار
رہی تا دیر یوں ہی نغمہ خوانی ۔۔۔ زبانوں میں ہر اک کے تھی روانی
کرے کے نقشے میں تبلا کے حالات ۔۔۔ دکھائے سب کو جغرافی مقامات
ضروری نوٹ کاپی پر لکھائے ۔۔۔ ہر اک کے نقشے نظروں میں جمائے
جو تھیں تاریخ کی ایک اوستانی ۔۔۔ بڑی تھیں قابل اور بے حد سیانی
وہ کرنے لگتی تھیں جس وقت تقریر ۔۔۔ تو سننے والے بن جاتے تھے تصویر
تھی ان کی قابلیت کی بڑی دھوم ۔۔۔ زمانے بھر کی تھی تاریخ معلوم
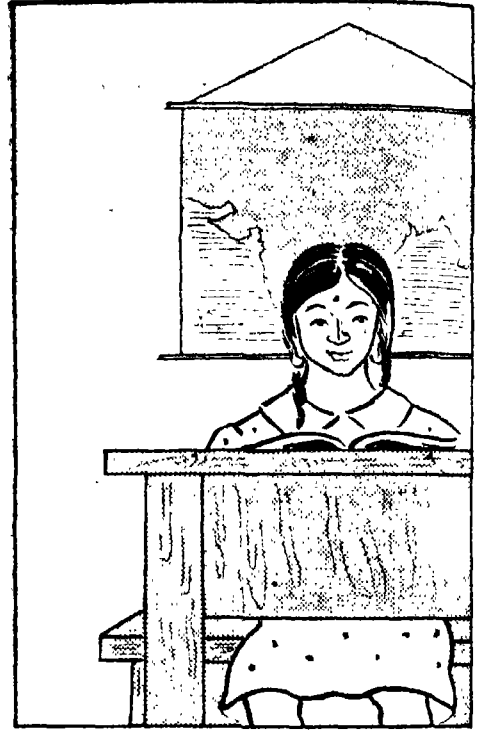
بھرے درجے میں استانی جو آتی ۔۔۔ معین اپنا مضموں وہ پڑھاتی
ڈرل کی اوستانی تھیں تنو مند ۔۔۔ کسا تھا جسم کا ان کے ہر اک بند
اچھل اور کود میں بے حد تھیں بے باک ۔۔۔ بڑی ہنس مکھ نہایت چست چالاک
ڈرل کے واسطے جس دم وہ آتیں ۔۔۔ بہت ہنس ہنس کے وہ سب کو ہنساتیں
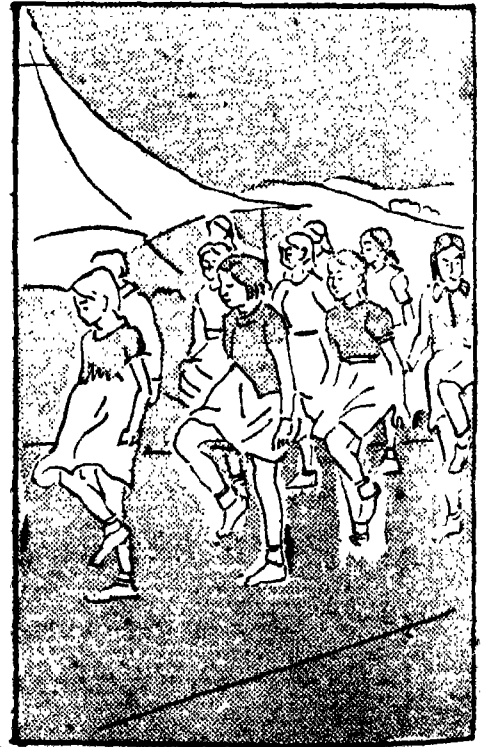
یوں ہی پڑھتے پڑھاتے بج گئے چار ۔۔۔ بجا چھٹی کا گھنٹہ آخر کار
بہت تھا وقت چھٹی کا سہانا ۔۔۔ سبھی گڑیاں ہوئیں گھر کو روانہ
کوئی موٹر سے اپنے جا رہی تھی ۔۔۔ کسی کے واسطے بس آ رہی تھی
گیا مغرب کو سورج ہو گئی شام ۔۔۔ کریں گی بچیاں اب گھر میں آرام
کوئی تو جا کے دیکھے گی سینما ۔۔۔ وہاں سے لوٹ کر کھائے گی کھانا
یونہیں ہر روز صبح و شام ہوں گے ۔۔۔ یونہیں اسکول کے سب کام ہوں گے

لکھا مختار نے یہ نظم الاوقات
یہ سب گڑیوں کے ہیں زندہ کمالات

رتن سنگھ شاہی

ہاتھی

پیارے بچو! تم سب نے کئی بار ہاتھی دیکھا ہوگا۔ آؤ آج تمہیں ہاتھی کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ ہاتھی ایک بڑا بھاری جانور ہوتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً سیاہی مائل خاکی ہوتا ہے اور جسم موٹا ہوتا ہے۔ اس کا سر بڑا اور گول ہوتا ہے آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور بھدی سی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اس کی سونڈ بہت لمبی ہوتی ہے جس کی لمبائی تقریباً پانچ یا چھ فٹ ہوتی ہے۔ اس کے کان بھی بہت چوڑے چکلے پنکھے کے مانند ہوتے ہیں۔ نر ہاتھی کے منہ کے دونوں طرف دو لمبے لمبے دانت ہوتے ہیں۔ ہاتھی خشکی کے جانوروں میں سب سے بڑا جانور ہے۔ اس کی اونچائی آٹھ سے دس فٹ تک ہوتی ہے۔

ہاتھی ہندوستان، افریقہ اور برما کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ جنگلوں میں چھوٹی بڑی ٹولیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا ایک سردار ہوتا ہے اور وہ سب اس کے زیر حکم رہتے ہیں۔ جنگلوں میں یہ عموماً وحشی حالت میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں ہاتھی کا شکار بڑی مشکلوں اور جان جوکھوں سے کیا جاتا ہے کیونکہ آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں ہوتا۔

شکاری جنگلی ہاتھیوں کو گڑھوں یا جالوں کے ذریعے سے پکڑتے ہیں۔ مگر اکثر اوقات ہاتھی شکارگاہوں میں سدھی ہوئی ہتھنیوں کے ذریعے سے پکڑے جاتے ہیں جو اسی غرض کے لئے سدھائی جاتی ہیں۔ پالتو ہاتھی بہت ہی فرماں بردار ہوتے ہیں اور ہر بات میں اپنے مہاوت کا حکم مانتے ہیں۔ کیونکہ وہی انھیں سدھاتا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس لئے یہ بھی اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ مہاوت اس کے سر کے قریب بیٹھا ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور نوکیلا

اوزار ہوتا ہے جسے یہ ہاتھی کے سر میں چبھو کر جس طرف کو اشارہ کرتا ہے وہ اسی طرف کو چلتا ہے۔ اسی طرح ان کے اُٹھنے اور بیٹھنے کے لئے بھی خاص اشارے مقرر ہیں۔ شکار میں پکڑے ہوئے ہاتھی کئی کئی روز بھوکے رکھے جاتے ہیں اور جب یہ بھوک سے تنگ آکر ایک لمبی چیخ مارتے ہیں تو اس وقت انھیں کھانے کو دیا جاتا ہے۔

ہاتھی پانی میں نہانے کا بہت شائق ہے۔ وہ اپنی سونڈ میں پانی بھر لیتا ہے اور پھر اس کا کچھ حصّہ وہ اپنے بدن پر چھڑک لیتا ہے اور کچھ حصّہ اپنی سونڈ کی نوک سے اپنے حلق میں ڈال لیتا ہے۔ خطرے کے موقع پر ہاتھی کے دانت اس کے لئے بہت ہی کارآمد ہوتے ہیں۔ ہاتھی راگ کا بہت ہی دلدادہ ہے۔ یہ بہت عقلمند جانور ہے اور اپنے مہاوت کے ادنےٰ سے ادنےٰ اشارے کو فوراً ہی سمجھ جاتا ہے۔ پُرانے زمانے میں ہاتھی لڑائیوں میں بہت استعمال ہوتے تھے۔ ان سے راجوں، مہاراجوں اور رئیسوں کی سواری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ آج کل ہاتھی اکثر لکڑی کے لٹھے لے جانے کے لئے برما اور ہندوستان کے لکڑی کے کارخانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کھیل تماشوں، جلوسوں اور شکار میں بھی کام آتے ہیں۔ ہاتھی کے دانت بہت قیمتی ہوتے ہیں کیونکہ ان سے بہت سی کارآمد اشیا بنائی جاتی ہیں۔ بچوں کے اکثر کھلونے اور بہت سی خوبصورت چیزیں ہاتھی دانت سے ہی بنائی جاتی ہیں ●

جاوید (فخر سے) امی جان۔ میں اپنی کلاس میں تیسرے نمبر پر پاس ہوا۔
ماں (خوش ہو کر) جیتے رہو یہ تو بتاؤ کل کتنے لڑکے پاس ہوئے؟
جاوید... تین۔ (انور)

سیّد منظر امام

تعویذ

کہتے ہیں کسی شہر میں ایک حکیم رہتا تھا جو تعویذ بیچا کرتا تھا اس تعویذ کے متعلق مشہور تھا کہ جو کوئی بھی اسے باندھ لیتا وہ زندگی کے تمام خطروں سے آزاد ہو جاتا تھا، اس کے تمام گناہ دُھل جاتے تھے اور موت کا خدشہ اس کے دل سے ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتا تھا۔

شہر کے تقریباً سبھی لوگ حکیم کو مانتے تھے اور اس تعویذ پر یقین رکھتے تھے اور انھوں نے تعویذ باندھ رکھے تھے۔

ایک نوجوان جو اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اُس نے جب تعویذ کے متعلق سنا تو وہ حکیم کے پاس آیا اور اُس سے کہا "مجھے بھی ایک تعویذ دیجیے۔"

حکیم نے اُسے تعویذ دیتے ہوئے بتایا کہ اب وہ زندگی کے تمام خطروں سے محفوظ ہو چکا ہے۔ نوجوان یہ سُن کر بے حد خوش ہوا اور تعویذ لے کر چلا گیا۔

✖

دو ماہ بعد ہی نوجوان ایک اسٹریچر پر حکیم کے پاس لے جایا گیا۔ حکیم اسے دیکھ کر بوکھلا سا گیا اور بولا۔ "تجھے کیا ہوا؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میں تو زندگی کے تمام خطروں سے آزاد ہو گیا تھا لیکن آج ایک پانی چھڑکنے والی گاڑی سے ٹکرا گیا ہوں اور میری دا ہنی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔"

حکیم بولا۔ "میرے دوست، یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ لیکن
میں تمہیں اپنے تعویذ کے فائدے سمجھا دوں۔ ٹانگ کا ٹوٹ جانا بڑے
خطروں کے مقابلے میں ایک معمولی سا سانحہ ہے اور اس کا تعلق اس قسم
کے حادثے سے ہے جس جگہ میرا تعویذ کارگر نہیں ہوتا۔ گناہ، میرے
دوست گناہ ہی وہ سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے ایک عقل مند
کو بچنا چاہیئے۔ میں نے تمہیں گناہ سے محفوظ کر دیا ہے اور جب تم
گناہ پر آؤ گے اس وقت تمہیں میرے تعویذ کی اہمیت کا پتہ چلے گا۔"

"خیر، جو کچھ بھی ہوا ہے میری بہتری ہی کے لئے ہوا ہے۔"
نوجوان نے ٹھنڈی آہ بھری اور مایوس ہو کر بولا۔ "اب میں
تمہارا شکر گزار ہوں گا اگر تم میری ٹانگ درست کر دو گے۔"

"یہ میرا نہیں ڈاکٹر کا کام ہے۔" حکیم نے جواب دیا۔

نوجوان چلا گیا۔

قریب تین سال بعد پھر وہی نوجوان حکیم کے پاس انتہائی
پریشانی کے عالم میں دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔

"میں تو گناہ کے بندھن سے آزاد ہو گیا تھا لیکن ابھی ابھی
میں نے ایک شخص کو قتل کر کے گناہِ عظیم کیا ہے۔ پھر اس تعویذ
کا کیا فائدہ ہے؟"

"کیوں۔" حکیم نے کہا۔ پھر رک کر بولا۔ "میں سمجھتا ہوں مجھے
تم کو اس تعویذ کی تاثیر بتلانی ہی پڑے گی۔ اچھا تو سنو۔ یہ
گناہ کو عملی طور پر روکتا نہیں ہے بلکہ برے نتائج کو روکتا ہے۔ یہ
اس دنیا کے لئے اتنا مفید نہیں ہے جتنا دوسری دنیا کے لئے۔ مختصر
یہ کہ زندگی کے لئے نہیں بلکہ موت کے لئے ہے جس کے لئے میں نے
تمہیں ابھی سے تیار کر رکھا ہے اور جب تم مرنے کے قریب آؤ گے
اس وقت تم میرے تعویذ کی اہمیت جان سکو گے۔"

"اُف" نوجوان بے چین ہو کر بولا۔ "اب مجھے مایوسی ہو رہی

ہے، لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ سب کچھ میری بہتری کے لئے
ہوا ہے۔ میں آپ کا بہت احسان مند ہوں گا اگر آپ میرے گناہ دور کرا دیں گے۔"

"یہ میرا کام نہیں ہے۔" حکیم نے جواب دیا۔ "ہاں اگر تم پولیس
کے دفتر جاؤ تو مجھے یقین ہے کہ وہاں تمہیں سکون نصیب ہوگا۔"

کچھ دنوں بعد حکیم کو شہر کے قید خانے میں بلایا گیا۔ نوجوان اسے
دیکھتے ہی چلایا۔ "آخر اس کا کیا مطلب ہے، میں نے اب تک تمہارا
تعویذ باندھ رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی ٹانگ توڑ
لی ہے۔ مجھ سے ہر قسم کے گناہ سرزد ہو چکے ہیں اور کل مجھے پھانسی
ہونے والی ہے اور میں اس قدر خوف محسوس کر رہا ہوں جس کی
تصویر لفظوں میں نہیں کھینچ سکتا۔"

"میرے عزیز!" حکیم مسکرایا۔ "سچ مچ یہ بڑے تعجب کی بات
ہے، لیکن اگر تم اس تعویذ کو نہیں باندھتے تو تم اس سے بھی زیادہ
خوف محسوس کرتے جتنا تم اس وقت محسوس کر رہے ہو۔"

نوجوان سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور حکیم مسکراتا ہوا واپس
چلا آیا۔

(آر۔ ایل اسٹیونسن کی انگریزی کہانی سے)

شاہد علی خاں

کرنی کا پھل

ایک تھی بڑھیا، کمر اُس کی کمان کی طرح ٹیڑھی، بال سفید سن جیسے، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، سارے بدن میں رعشہ، ہر وقت جیسے لرزا چڑھتا رہتا، پر کھانے کی بے حد شوقین، ہر وقت مُنہ چلتا ہی رہتا۔

ایک دن اُسے سیم کھانے کا شوق چرّایا۔ لکڑی ٹیکتی باغ میں پہنچی۔ ڈھیر سے سیم توڑے، پھونس اکٹھا کیا اور گھر واپس آگئی۔ کانپتے ہاتھوں سے پتیلی میں سیم ڈال رہی تھی کہ ایک سیم اُچھل کر دُور جا گرا۔ بڑھیا دیکھ بھی نہ پائی اور اس نے پتیلی کو انگیٹھی پر چڑھا دیا۔ انگیٹھی میں کوئلے پہلے ہی سے بھرے تھے۔ اب اس نے پھونس کو مٹھی میں دبا کر انگیٹھی میں بھرنا شروع کیا تو ایک پھونس اُنگلیوں کے بیچ سے نکل کر ہوا کا سہارا لے، سیم کے قریب جا پہنچا۔ بڑھیا نے انگیٹھی میں ماچس دکھائی اور پھونس سر سے جل اُٹھے۔ تم جانو کوئلہ جیسا صاف دل اور صحبت کا اثر ماننے والا کون ہوگا۔ آگ لگے تو آگ اور پانی پڑے تو پانی ہو جاتا ہے۔ کوئلوں نے آگ پکڑ لی۔ ان کوئلوں میں ایک کوئلہ بڑا تیز طرّار تھا۔ کونے میں پڑا بڑھیا کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ آن کی آن میں غصّہ کے مارے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا اور وہ جھٹ سے ایک چھلانگ لگا سیم اور پھونس کے قریب پہنچ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلے کو دیکھ کر پھونس میاں کی ہوا سرکی اور گھبرا کر بولے۔ "بھائی او بھائی۔ ہم سے ذرا دُور ہی رہنا۔ یہ لال لال آنکھیں ہمیں کیوں دکھاتے ہو۔ واہ بھئی واہ۔ کرے کوئی بھگتے کوئی۔ میاں جب تمہارا غصّہ ٹھنڈا ہو جائے تب ہمارے قریب آنا۔"

کوئلہ ٹھیرا سمجھدار، اس نے سوچا۔ "یہ تو سب بڑھیا کا کیا دھرا ہے ہمیں جلانے میں ان بیچاروں کا کیا قصور" اور اس کا غصّہ کافور ہوگیا۔ اب تینوں گلے ملے اور بولے۔ 'جان بچی لاکھوں پائے' ایک طرف ہو لئے۔ چلتے چلتے راہ میں انھیں ایک ندی ملی۔ اب اسے پار کریں تو کیسے — تینوں سر جوڑ کر سوچنے لگے۔ اتنے میں پھونس بولا۔ "دیکھو تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ میں تمھیں پار اُتار دوں گا۔" سیم تھا بڑا چالاک، بڑا ہوشیار۔ فوراً بولا۔ "دونوں کا ایک ساتھ جانا خطرے سے

خالی نہیں۔ تم پہلے کوئلے کو پار چھوڑ آؤ پھر مجھے لے جانا۔" یہ بات سب کو پسند آئی۔ پھونس جھٹ سے پانی میں کود پڑا۔ کوئلہ چھلانگ لگا کر پھونس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور دونوں لگے پانی میں تیرنے۔ اچانک کوئلے کو اپنے ساتھیوں کی یاد آئی۔ اس کے سارے جسم میں گرمی دوڑ گئی۔ اتنے میں پانی کا ایک چھینٹا اس پر پڑا اور وہ بیچ میں سے کھسک گیا۔ پھونس تھا بڑا دوست نواز، فوراً کوئلے کو بچانے کے لئے لپکا۔ لیکن فوراً ہی ایک خوفناک لہر آئی اور کوئلہ اور پھونس دونوں آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ سیم کنارے پر کھڑا ان دونوں کو ڈوبتا دیکھ کر ہنسنے لگا۔ تم جانو اللہ میاں دوسروں پر ہنسنے والے سے کتنے ناراض ہوتے ہیں۔ سیم ہنسا اور اتنا ہنسا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ وہیں چاروں شانے چت زمین پر لیٹ گیا۔ اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گزرا۔ اس نے جب سیم کو اس حالت میں دیکھا تو اسے بڑا ترس آیا۔ اس نے جھٹ جیب سے سوئی اور دھاگا نکالا اور اس کا پیٹ سی دیا۔ چونکہ کسان کے پاس اس وقت کالا دھاگا تھا۔ سیم میں جان تو پڑ گئی لیکن اس کا پیٹ آج تک اسی کالے دھاگے سے سیا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہمیشہ دکھائی دیتا رہے گا۔ جو جیسا کرے گا ویسا ہی بھگتے گا۔ دوسروں پر ہنسنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

جان پہچان ۔ ملّا نصرالدین جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ کچھ آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ملّا بھی اُن کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی نے پوچھا "آپ کی ہم میں سے کس کے ساتھ جان پہچان ہے؟" ملّا نے کھانے کی طرف اشارہ کرکے کہا "اس سے میری جان پہچان اور دوستی ہے۔"

محمد اسماعیل حسن خاں

پہیلیاں

۱۔ لعنت ہے، لعنت کی بھری ہے
اس کو بھی لوگ کہتے ہیں پوشیدہ کلی ہے

۲۔ چتلی مرغی دم دراز — انڈا دیوے بے شمار
انڈا گرا طشت پر — بیوی پکڑی گئیں گشت پر

۳۔ قفل، کنجی، تالا — ماں گوری بیٹا کالا

۴۔ شیر پنجہ، فیل گردن — چشم آہو، بانگ خر

۵۔ ذرا سا لڑکا احمد نام — سارے ترکش چھپنے نام

۶۔ ایک کھیت میں ایک ہی ڈھیلا

۷۔ راہ راہ دو جوگی جائیں — چھپا پھول بکھیرتے جائیں

۸۔ ہری تھی من بھری تھی لالہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی

۱۰۔ ایک بوٹا اس میں پانچ شاخیں۔ دو دھوپ میں تین سایے میں

۱۱۔ لکڑی کا گھوڑا کپڑے کی زین۔ آئے دو ہوئے تین

۱۲۔ ذرا سا چھید کو چھیدتا جائے — نو سو انڈے دیتا جائے

جوابات: ۱۔ چھپ کلی ۲۔ مچھلی ۳۔ شریفا ۴۔ مینڈک ۵۔ بچھو ۶۔ چاند ۷۔ گنّا ۸۔ جوار ۱۰۔ نماز ۱۱۔ ڈولی ۱۲۔ سوئی ڈورا

ہماری کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
خستا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دل کش ہے۔ قیمت ۲/-
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آ رہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے قیمت ۔/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
-/۴/-
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
-/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت -/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

معاوضے کی درمیانی اسکیم

دو آنے

"یہ ایک بہت مفید کتابچہ ہے جس میں بے گھر لوگوں کو معاوضے کی درمیانی اسکیم کے بارے میں قیمتی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ معاوضے کی قطعی اور آخری اسکیم کے نفاذ سے پہلے ان ضرورت مندوں کو معاوضہ دیا جائے جو اپنا کاروبار چلانے کے لئے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت جو کچھ کرنا چاہتی ہے اس کی پوری تفصیل اس کتابچے سے معلوم ہو سکتی ہے۔" "الجمعیۃ" دہلی

پنچ سالہ پلان (سوالات و جوابات)

"پلاننگ کمیشن نے جو پنچ سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ زیر نظر ۷۲ صفحات پر مشتمل کتاب میں تمام اہم مسائل اردو سوال و جواب کی صورت میں بیان کر دئے ہیں۔ کتاب مرتب کرتے وقت اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل پلان کا نچوڑ اس کتاب میں آ جائے ......"

قیمت چار آنے — "قومی آواز" لکھنؤ

نئے ہند کی تعمیر

"یہ توضیحی پمفلٹ حکومت ہند کی وزارت اطلاعات نے شائع کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اردو خواں بھی اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ حکومت کے کارناموں اور اسکیموں سے ان کو واقف کرنا نہایت ضروری ہے۔

اس پمفلٹ کی زبان نہایت سلیس اور دل نشیں ہے۔ تصویریں اور طباعت سب اعلیٰ درجہ کی ہیں۔"

قیمت آٹھ آنے — "سیاست" کا[illegible]

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

ہماری کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
خلاصہ ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دلکش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے قیمت -/۴/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
-/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
-/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزل مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت -/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

اڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ نمبر ۱

سالانہ چندہ:- { ہندستان میں:- چھ روپیہ / پاکستان میں:- چھ روپیہ (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- { ہندوستان میں:- آٹھ آنے / پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مئی سنہ ۱۹۵۶ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

سکندر علی وجد

اجنتا

(بعد ترمیم و اضافہ)

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنّتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہو
یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ شانِ جمالی ہو

تجلّی زارِ عرفاں شاہکارِ ابنِ آدم ہے
سرِ فطرت عمل کی بارگاہِ حُسن میں خم ہے
تمدّن منعکس ہو جس میں ایسا ساغرِ جم ہے
جمالِ زندگی رہنِ جلالِ عزمِ گوتم ہے

اُمیدِ جانِ تازہ پھر دلِ بسمل میں آئی تھی
تلاشِ امن میں تہذیب اس منزل میں آئی تھی

حریمِ کعبۂ فن، معبدِ نازک خیالاں ہے
جہانِ نور و نکہت مسکنِ آشفتہ حالاں ہے
جنوں افشاں فضا میں مستیِ چشمِ غزالاں ہے
لبِ جوئے کہستاں جلوہ گاہِ خوش جمالاں ہے

مِلا ہے زندگی کو بانکپن ان کج کلاہوں سے
نظر والوں پہ شمشیریں برستی ہیں نگاہوں سے

بہانہ مِل گیا اہلِ جنوں کو حُسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا
سکھایا گُر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے　　ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے　　کھلیں گے راز اس ڈھب سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

حریفِ نغمۂ جاں بخش یہ خاموشیِ گویائی　　کمالِ فکر و فن، حسنِ تناسب شانِ زیبائی
حقیقت بن گئی جذبات کی صد رنگ رعنائی　　لبوں پر ضوفگن ہے نورِ اعجازِ مسیحائی

نگاہوں میں عجب انداز ہے خاراگدازی کا
دلوں پر نقش رہ جاتا ہے جن کی بے نیازی کا

کہیں پیدا ہے ساری کیفیت صحنِ گلستاں کی　　کہیں رونق نظر آتی ہے بازارِ شبستاں کی
کہیں حیرت زبانِ حال ہے حالِ پریشاں کی　　لکیریں ہیں کہ شریانیں دلِ انسان و حیواں کی

کہیں ظلمت کے پیچھے روشنی محسوس ہوتی ہے
کہیں تو موت میں بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی　　تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی　　تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

کرشمہ ہے یہ اربابِ ہمم کی سعیِ پیہم کا　　جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا　　قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر　　خوشامد اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاکِ در در کی کسی انعام کی خاطر　　جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

مہاتما بدھ کا پیغام

طبیب کے دواخانے میں سبھی قسم کی دوائیں رہتی ہیں۔ طبیب کو یہ سب دوائیں ہمیشہ یاد نہیں ہوتیں۔ جب جس دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ قابل طبیب کا ہاتھ اسی وقت اس دوا پر جاتا ہے۔ یہ انسانی عادت ہے۔ کہنے کو انسان کتنا ہی اصول پرست ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی خاص وقت اس بات کو اپنا اصول مان لیتا ہے جو اس کے لئے مفید ہو۔ سچائی اور اہنسا کی تعریف بھارت میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ بھارت کی تو تمام مذہبی کتابیں ان دو نیکیوں سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن سچائی اور اہنسا کی جیسی قدر گزشتہ تیس برسوں میں ہوئی ہے۔ ویسی صدیوں سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مہاتما گاندھی سے پہلے دنیا کے لوگ سچائی اور اہنسا کو اونچے درجے کا دھرم یوگ کا ذریعہ اور نش کام کرم (بے غرض عمل) کا حصہ مان کر غور و خوض اور ریاضت کا موضوع سمجھا کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے انھیں موجودہ بھارت کے سب سے بڑے روگ یعنی بدیشی راج کو ختم کرنے کا ذریعہ بنا کر کارآمد ثابت کر دیا۔ یہ دیکھ کر بھارت کے لوگوں کو خوشی ہوئی کہ سچائی اور اہنسا جیسے قدیم مذہبی اصول آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اب تو "ستیہ میو جیتے" اور "اہنسا پرمو دھرم" جیسے اقوال جو پرانی کتابوں کے ڈھیر میں دبے پڑے تھے۔ نکال کر دیواروں پر چسپاں کئے جانے لگے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اصول پرستی کا ڈھول بجاتے ہوئے بھی اندرونی طور پر مقصد پرست ہے

جس زمانے میں مہاتما بدھ نے بھارت میں جنم لیا۔ اس وقت دیش بہت سے مذہبی اور سماجی امراض میں بری طرح مبتلا تھا۔ مذہب صرف روایات میں زندہ تھا۔ تپسوی (ریاضت کار) اور برہمن وہ لوگ کہلاتے تھے جو جٹائیں بڑھا کر اور جسم جلا کر بے عمل زندگی گزارنے لگتے تھے۔ جاڑوں میں ٹھنڈے پانی میں کھڑا ہونا یا گرمیوں میں جلتی آگ تاپنا ریاضت کہلاتا تھا۔ یگیوں میں جانوروں کا بھینٹ چڑھانا مذہب کا اہم حصہ مانا جاتا تھا۔ بھارتی سماج ایسی مذہبی بدحالی میں مبتلا تھا۔ جب مہاتما بدھ نے کپل وستو میں جنم لیا۔ وہ جب سب کچھ دیکھنے اور غور کرنے کے قابل ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ جسے لوگ دھرم مان رہے ہیں۔ وہ دھرم کا صرف ظاہری روپ ہے۔ اور وہ بھی بہت بگڑا ہوا روپ۔ ان کے دل میں سچا دھرم جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جو شاہی محلوں سے نکال کر راجکمار سدھارتھ کو جنگلوں میں لے گئی۔ کچھ عرصے تک سدھارتھ نے اس زمانے کی مروجہ ریاضتوں اور مذہبی طریقوں کا مطالعہ کیا۔ جب دیکھا کہ باہر کی بھاگ دوڑ سے نہ تو سچا گیان (عرفان) حاصل ہوا اور نہ دل کو سکون ملا تو انھوں نے اپنے اندر ہی سچائی کی تلاش شروع کی۔ جو چیز چند برسوں کی بھاگ دوڑ سے نہ ملی وہ دل کی آنکھیں کھول کر تلاش کرنے سے چند دنوں میں مل گئی۔ وہ سخت جسمانی ریاضتوں اور روائتی طریقوں سے مایوس ہو کر نرنجنا ندی کے کنارے ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے دھیان لگا کر بیٹھ گئے اور سچے راستے کی جستجو کرنے لگے۔ صبح ہوتے ہوتے انھیں اندر سے وہ روشنی مل گئی۔ جس کی تلاش میں وہ گھر سے نکلے تھے۔ انھوں نے جان لیا اصلی دھرم سچی اور اچھی زندگی گزارنے میں ہے۔ جسم کو تپانے اور یگیوں میں جانوروں کو بھینٹ کرنے میں نہیں۔ اس وقت راجکمار سدھارتھ "بدھ" یعنی "عارف" کے درجے کو پہنچ گئے۔

گوتم بدھ نے جس روپ میں دھرم کو سمجھا وہ "دھم پد" کے ان اشلوکوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

"بہت بولنے سے دھرم کا پالن نہیں ہوتا۔ جو تھوڑا سن کر اپنے جسم سے دھرم کا پالن کرتا ہے اور جو دھرم میں مشکلات پیدا نہیں کرتا۔ وہی دھرم کو ماننے والا ہے" (ترجمہ)

"جس میں سچائی' دھرم' اہنسا اور ضبط ہے۔ وہی پاک' صابر اور مستقل مزاج کہا جاتا ہے"۔

"صرف سر منڈانے سے کوئی شرمن (بودھ سادھو) نہیں ہو سکتا۔ جو جھوٹ بولتا ہے اور دنیاوی فائدہ کی خواہش رکھتا ہے وہ 'شرمن' کیسے کہلا سکتا ہے"۔

'شرمن' کون ہے؟ اس سوال کا جواب مہاتما بدھ نے ان الفاظ میں دیا ہے "جو یہاں عذاب و ثواب کو چھوڑ کر برہمچاری بنا اور 'گیان' کے ساتھ دنیا میں مصروف عمل ہوا وہ بھکشو کہا جاتا ہے"۔

اس وقت دھرم اپنی اصلی شکل کو چھوڑ کر روایات کا شکار ہو گیا تھا۔ لالچی بھکشوؤں اور ناسمجھ برہمنوں کی رہبری کی وجہ سے عوام الٹے راستے پر چل کر دکھ اٹھا رہے تھے، مہاتما بدھ کی تعلیم نے انھیں بہت سکون پہنچایا۔ گویا روحانی پیاس سے ستائے ہوئے لوگوں کو امرت مل گیا۔

اس زمانے میں ملک بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ راجہ لوگ خاص کر دو ہی کام جانتے تھے۔ یا تو راج کی دولت لٹاتے تھے۔ یا اپنے راج کی حدیں وسیع کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے۔ لڑائیوں کی وجہ سے راجاؤں اور ان کے خاندانوں میں دشمنی پیدا ہو جاتی تھی اور ہمیشہ کے لئے پڑوسیوں کو دشمن بنا دیتی تھی۔ راجاؤں کی ان لڑائیوں میں رعایا برباد ہوتی تھی۔ اس طرح راج کاج رعایا کے لئے مصیبت کا باعث بنا ہوا تھا۔ مہاتما بدھ نے اس مصیبت کو دور کرنے کا یہ طریقہ بتایا۔

"یہاں دشمنی سے دشمنی پیدا ہوتی ہے امن و سکون نہیں۔ دوستی سے ہی امن و سکون پیدا ہوتا ہے۔ یہی سچا دھرم ہے"۔

"مجھے گالی دی' مجھے مارا' مجھے ہرا دیا' مجھے لوٹ لیا۔ اس طرح من میں جو گانٹھیں باندھتے ہیں۔ ان کی دشمنی کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی"۔

یگیوں میں جانوروں کی بھینٹ دھرم کا کام سمجھا جاتا تھا۔ راجہ لوگ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھی سیکڑوں گھوڑوں کو مار ڈالتے تھے۔ مہاتما بدھ نے انھیں بتایا۔

"جیسا میں ہوں، ویسے ہی وہ ہیں۔ اور جیسے وہ ہیں ویسا ہی میں ہوں اس لئے اپنی طرح سب کو سمجھ کر نہ کسی کو مارے اور نہ مارنے کا خیال دل میں لائے"۔

"پہلے تین ہی روگ تھے۔ خواہش، بھوک اور بڑھاپا۔ جانوروں کی بھینٹ شروع ہو جانے پر وہ ۹۸ ہو گئے۔ یہ یاجک، یہ پروہت معصوم جانوروں کو مروا ڈالتے ہیں۔ دھرم کو برباد کرتے ہیں۔ یگیہ کے نام پر جانوروں کی بھینٹ یقیناً قابل ملامت اور نیچ کرم ہے"۔

اسی طرح کے مختلف اپدیشوں کے ذریعے مہاتما بدھ نے لوگوں کو اہنسا کی تعلیم دی۔ یگیوں میں جانوروں کی بھینٹ کی خاص طور پر برائی کی جس دھرم کو بھکشو اور برہمن بہت پردوں میں چھپا کر عوام کے سامنے رکھتے تھے، اُسے مہاتما بدھ نے بہت آسان الفاظ یعنی "آریہ ستیہ چتشٹیہ" کی صورت میں پیش کیا۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

۱۔ پہلا آریہ ستیہ، دنیا میں دکھ ہے جنم میں بڑھاپے میں، موت میں، دشمن کے ملنے میں اور دوست کی جدائی میں دکھ ہی دکھ ہے۔

۲۔ دوسرا آریہ ستیہ، دکھ کی اصل وجہ تشنگی ہے۔ رات دن بڑھتی ہوئی خواہش ہی دکھوں کو پیدا کرتی ہے۔

۳۔ تیسرا آریہ ستیہ ——— انسان دکھ سے چھٹکارا چاہتا ہے۔

۴۔ چوتھا آریہ ستیہ ——— دکھ سے چھٹکارا پانے کے آٹھ راستے ہیں ——— وہ یہ ہیں:-

سچی نگاہ۔ سچا ارادہ۔ سچ بولنا۔ نیک کام۔ سچی روزی۔ سچی کوشش۔ سچی یاد۔ سچا تجربہ۔ سچائی پہ جمے رہنا۔

یہ تھا عملی اور آسان دھرم، جو مہاتما بدھ نے سچی تعلیم اور شفقت آمیز عمل کے ستائے ہوئے انسانوں کو بتایا۔ انسان دھرم کے نام پر روایات کو مانتے اور ان پر چلتے ہوئے بھی اپنے دلوں میں بے چینی محسوس کرتے تھے، انھیں اپنی روح کی گہرائیوں میں دھرم کی جگہ خالی محسوس ہوتی تھی۔ جب مہاتما بدھ نے انھیں دھرم کا آسان اور سیدھا راستہ بتایا تب اُسے اپنانے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ راجہ اور پرجا اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں بدھ کا پیغام سارے دیش میں پھیل گیا۔

مہاتما بدھ کی تعلیم کے لگ بھگ سو سال بعد ان کا پیغام ایشیا کے بڑے حصے میں پہونچ چکا تھا۔ مہاراجہ اشوک کی کوششوں سے بھکشوؤں اور مبلغوں کی جماعتوں نے جنوبی اور پوربی دیشوں میں جگہ جگہ عملی دھرم

کا پرچار کر دیا۔ اس پرچار کو جیسی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انسانی سماج صرف ریت رواج میں گھرے ہوئے مذہبی ٹھیکیداروں سے تنگ آ چکا تھا۔ انھیں ایسی تعلیم کی ضرورت تھی، جو اُن کی روح کو سکون دے سکے۔ مہاتما بدھ کی تعلیم انسان کو روایات کی دلدل سے نکال کر عملی دھرم کا راستہ دکھانے والی تھی۔ لوگ لڑائی جھگڑے، جھوٹ فریب سے پریشان تھے۔ بدھ نے انھیں امن کا راستہ دکھایا، گویا بھوکے کو کھانا مل گیا۔ عالم انسانیت کے ایک بڑے حصے نے بودھ دھرم کو اپنا لیا۔

آج پھر انسانی دنیا مہاتما بدھ کو یاد کر رہی ہے۔ انسان مریض ہو کر ہی طبیب کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت دنیا کے مہذب کہلانے والے دیشوں کی جو حالت ہے، اُس کو اگر سرسام کے مرض سے تشبیہ دی جائے تو مناسب ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ترقی کا زمانہ ہے۔ ترقی کا یہ ثبوت دیا جاتا ہے کہ انسان نے سائنس کی مدد سے بہت بڑی تعداد میں سُکھ کے ذرائع پیدا کر لئے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ سائنس نے انسانی ذرائع کو بہت بڑھایا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ ان ذرائع سے انسانوں کے سُکھ چین میں کوئی ترقی ہوئی۔ اگر غور سے مہذب کہلانے والی قوموں کی ذہنی حالت کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کہ دراصل جوں جوں سائنس کی مدد سے انسان کے مادی ذرائع بڑھتے گئے ہیں ــــ انسان اور سماج کی روحانی بے چینی بھی بڑھی ہے۔ آج کل کے مفکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نیا زمانہ علّت پرستی کا زمانہ ہے ــــ وہ روایات کا دشمن ہے۔ موجودہ زمانے کے مفکّروں کا یہ دعویٰ خود ایک بھدّی روایت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔ روایات کا روپ بدل گیا ہے۔ لیکن مغرب کے دماغ پر آج بھی نئی روایات کی ویسی ہی حکومت ہے جیسی آج سے ۵۰۰ سال پہلے یورپ میں بسنے والوں کے دماغ پر تھی۔ عیسائیت ہو یا کمیونزم وہ خود انھیں بیماریوں کے شکار ہیں، جن سے انسانوں کو نکالنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سائنس اور مشین کی ساری طاقت لگا کر امریکہ اور یورپ کے دیش ان کی قیادت میں بہت سے دوسرے دیش بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جنگ کا خطرناک سامان تیار رکھنے میں مشغول ہیں۔ ۲۵۰۰ سال پہلے وہ لوگ اَن دیکھے دیوتاؤں کی پیاس بجھانے کے لئے جانوروں کی بھینٹ کیا کرتے تھے۔ آج کی ترقی کے دعوے دار یہ لوگ اپنی بڑی بڑی خواہشات کے لئے انسانوں کی بھینٹ چڑھانے میں دن رات کوشاں ہیں۔

کچھ عرصے سے انسان پھر سے مہاتما بدھ کو یاد کرنے لگا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب مرض ویسا ہی ہے تو علاج بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور معالج بھی وہی چاہیئے جو مرض کا علاج کر سکے۔ آج پھر انسانیت کو مہاتما بدھ کے اس سچّے پیغام کو دل میں بٹھانے کی ضرورت ہے جو انھوں نے اپنے پیرؤوں کو دیا تھا۔

گناہوں کا نہ کرنا، کُشل دھرمو، یعنی ثواب کا پھیلاؤ۔ اور اپنا من صاف رکھنا۔ یہی بدھ کی تعلیم ہے۔

بدھ کی تعلیم ہے:-

۱۔ برائی نہ کرنا۔
۲۔ تشدّد نہ کرنا۔
۳۔ اصول کے ساتھ ضبط قائم رکھنا۔
۴۔ ہلکی غذا کھانا۔
۵۔ تنہائی میں رہنا۔
۶۔ من کو یوگ میں لگانا۔

مہاتما بدھ نے یہ تعلیم پنڈتوں کی زبان سنسکرت کو چھوڑ کر عوام کی زبان میں دی، اسی وجہ سے ان کی تعلیم عوام میں تیزی کے ساتھ پھیلتی گئی۔ جیسے آج سے پچیس صدی پہلے مہاتما بدھ کی اس تعلیم نے عوام کو سُکھ کا راستہ دکھایا۔ ویسے ہی آج بھی دنیا امن اور سکون پا سکتی ہے۔

باقر مہدی

یگانہ آرٹ

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاسؔ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا یہ شعر ہمیں ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے کیونکہ یہی ان کا مطمح نظر تھا۔ یگانہ کے بارے میں نقادوں اور شاعروں کا رویہ زیادہ تر یک طرفہ تھا۔ مجھے اردو غزل کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ہوا ہے کہ ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب میں حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ مگر یگانہ کے بارے میں ایک جملہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ انھوں نے اتنا احسان ضرور کیا ہے کہ یگانہ کی چند غزلوں کو انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح ترقی پسند نقادوں نے (سوائے مجنوں گورکھپوری کے) بھی ان کو نظر انداز کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس رویے کے بنانے میں خود یگانہ کا بھی حصہ ہے انھوں نے تعلی کو خود پرستی کے فلسفے کا رنگ دیا اور اتنے زور شور کے ساتھ پیش کیا کہ معتدل مزاج ادیبوں کو بھی ان سے شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ "غالب شکن" لکھ کر انھوں نے اپنے خلاف خاصہ مواد "دشمنوں" کو دے دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یگانہ کے آرٹ میں آب و تاب بھی ان کے انتہا پسند نظریے سے آئی ہے وہ اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ لکھنوی شاعری فرسودہ روایات کی راہیں پیٹتی ہوئی تھی اور شعراء اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے دوسرے بڑے شاعروں کے رنگ میں غزلیں کہنا فخر سمجھتے تھے۔ عزیز لکھنوی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کے اس دور کے شاعروں نے آتش سے اپنے رشتے توڑ لئے تھے اور میر و غالب کے رنگ میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کے یہ شاعر خود اپنے شہر کی قدیم روایات کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ ان سے فیض حاصل کیا جا سکے۔ ایسے دور میں اگر کوئی شاعر کسی دور دیس سے آکر لکھنؤ کی بود و باش اختیار کر کے وہاں اپنی انفرادیت کا علم اٹھانا چاہے تو اسے باغی سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہاں کی اکثریت کا اس کو اپنے خلاف ایک محاذ سمجھنا بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یگانہ کو لکھنؤ والوں سے جو بے شمار شکایتیں تھیں ان میں تھوڑی بہت صداقت ضرور تھی۔ یہاں اس "خطرناک" مسئلے کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے بلکہ اشارتاً یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ یگانہ کی شخصیت میں جو چڑچڑاپن پیدا ہوا وہ فطری تھا اور ان کے انتہا پسند رویے کی ابتدا بھی ایک ردعمل کی صورت میں ہوئی تھی وہ شروع میں کھری کھری سنانا ہی ایک بڑا کام سمجھتے تھے اور اس حق گوئی نے آگے چل کر ان کے کلام پر وہ جلا کی ہے کہ قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ ان کو جن معرکوں کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ انشاء اور مصحفی کے دور کی یاد دلاتے ہیں ان کی زندگی ان مظالم کے خلاف جد و جہد کرتے گزری تھی اور ان کے آرٹ میں جو زندگی کا ولولہ اور جوش ہے وہ بھی ایک زبردست احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون "میر اور ہم" میں ایک اہم بات لکھی ہے ان کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

"ہر دور میں بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے زمانے کی کشاکشوں کا خودداری اور وقار کے ساتھ رچے ہوئے اشاروں میں اظہار کر لیتا ہے لیکن شعر کو پروپیگنڈہ نہ ہونے دے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی عظمت کی ایک اور پہچان یہ ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے اندر بغیر واعظانہ یا مبلغانہ دھن اختیار کئے ہوئے یہ احساس پیدا کر سکے کہ ان کو بھی اپنے زمانے کی نئی مشکلوں اور پیچیدگیوں کا خود اعتمادی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے" (فنکار نمبر ۳ صفحہ ۱۹)

اس بات کو پوری طرح سے سمجھ لینا چاہئے جبھی ہم یگانہ کی شخصیت میں

شدید قسم کی کجروی کو سمجھ سکتے ہیں ان کی خودداری نے انھیں انتہاپسندی کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا تھا مگر اس سے ان کے آرٹ کو نقصان نہیں پہنچا شاید کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب سی معلوم ہو حقیقت یہ ہے کہ یگانہ کے کلام میں جو تلوار کی کاٹ دھار کی تیزی اور زندگی کی لگن ہے وہ اسی کی ودیعت کی ہوئی تھی۔ وہ بظاہر غالب کے شدید مخالف تھے مگر وہ ان کے معترف بھی تھے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ آیات وجدانی پڑھتے ہوئے کم از کم مجھے بار بار اس کا احساس ہوا تھا کہ وہ غالب کی عظمت کے قائل ہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کی پیروی کرنا کسر شان سمجھتے ہیں اور یہ منطقی طور سے غلط بھی نہیں ہے۔

یگانہ آرٹ کو سمجھنے میں "آیات وجدانی" کا مطالعہ بڑی مدد کرتا ہے یہ اپنی قسم کا واحد مجموعہ ہے جس میں اشعار کی شرح بھی شامل ہے یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ دور اردو ادب میں ایک ہنگامے کا دور تھا۔ اقبال کی شاعری عروج پر تھی۔ جوش نے اپنا ایک حلقہ بنانا شروع کر دیا تھا اور لکھنؤ اسکول کے شعراء ابھی تک بڑے شاعروں کی پیروی میں محو تھے۔ حسرت موہانی نے غزل کا احیاء کیا تھا لیکن اس کو وہ معیار نہیں دے سکے تھے جو ان سے پہلے کلاسیکی شاعروں نے قائم کیا تھا۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ حسرت نے غزل کو دوبارہ مقبول بناتے ہوئے بڑا اہم رول ادا کیا ہے لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ غزل کو پُر وقار اور بہت بلند مقام پر لے گئے تھے۔ ان کا شعری لب و لہجہ دل نشین ہونے کے باوجود بڑی شاعری کا لب و لہجہ نہیں ہے اور کم و بیش یہی حال اس دور کے دوسرے غزل گو شعراء کا تھا۔ اس مضمون میں تمام شعراء کے تقابلی مطالعے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے اتنا کہنا ضروری ہے کہ جب اردو غزل دوبارہ ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لئے قدم بڑھا رہی تھی اس وقت جو لوگ اس کے ساتھ ساتھ تھے ان میں یگانہ بھی پیش پیش تھے۔ اس بات کا اعتراف نہ تو ڈاکٹر یوسف حسین نے "اردو غزل" میں کیا ہے اور نہ ہی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مقالے "جدید غزل" میں۔ یگانہ کو شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں سے نظر انداز کرنے کی مہم بڑی حد تک کامیاب رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے پڑھے لکھے متوازن مزاج لوگ بھی ان کے کلام سے زیادہ واقف نہیں ہیں اس زیادتی کے خلاف کسی نہ کسی نقاد کو ایک دن قلم اٹھانا ہی پڑے گا۔

مرزا یاس کا اصلی نام مرزا واجد حسین اور تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ تھا۔ ان کا پہلا تخلص یاس تھا لیکن لکھنؤ آکر انھوں نے یگانہ بھی رکھ لیا تھا۔ وہ ۱۳۰۱ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے تھے ان کی ابتدائی تعلیم مولانا بیتاب اور مولانا شاد کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ وہ ۱۹۰۴ء سے لکھنوی ہو گئے تھے اور خود کو لکھنؤ کے فدائیوں میں سمجھتے تھے۔ یہاں ایک اور نا انصافی کا ذکر کر دوں۔ ڈاکٹر ابواللیث نے اپنی کتاب "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں معمولی شاعروں کا ذکر کیا ہے مگر یگانہ کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں ملتا یہ یقیناً زبردست زیادتی تھی مگر یگانہ ان "مظالم" کے عادی ہو چکے تھے جبھی تو یہ کہا کرتے تھے کہ ؎

دل طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

اس شعر کو یگانہ کی زندگی کے پس منظر میں دیکھئے تو اس میں ایک لمبی داستان پوشیدہ معلوم ہوگی اور اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ یہ ایک بڑے جری شخص کے کارناموں کا خوبصورت شاعرانہ انداز میں اعتراف ہے ان کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے وہ ان غزل گو شعراء میں نہیں تھے جن کے چند مصرعے یا دو ایک شعر ہی تاریخ ادب میں رہ جاتے ہیں۔ عزیز اور صفی اسی قبیل کے شاعر تھے مگر اپنے دور میں ان کو یگانہ سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی اسی لئے کہا گیا ہے کہ مقبول عام کو شاعرانہ عظمت کے لئے سند بنا کر نہ پیش کرنا چاہیئے۔ ورنہ وقت کا ایسا بڑا نقاد مشاعروں کے ہنگاموں محفلوں کی شمعوں اور پروپیگنڈے کو حرف غلط کی طرح مٹا کر صرف کلام کو پرکھتا ہے اور یگانہ اس معاملے میں یقیناً خوش نصیب ہیں کہ آنے والا زمانہ انھیں زیادہ عزت دے گا۔

یگانہ کا فلسفۂ حیات ایک جامع صورت میں نہیں ملتا کیونکہ ایک غزل گو شاعر سے اس کی توقع کرنا ہی بے سود ہے۔ پھر بھی زندگی کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنے کا ایک انداز ضرور ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک روشن فکر کے مالک تھے اور ان کا ذہن رسا دور دراز فکری مضامین کی خبر بھی رکھتا تھا ان کے یہاں تصوف ایک عقیدے کی صورت میں نہیں ملتا جیسے کہ اکبر کی شاعری میں ہے بلکہ کلاسیکی شعراء کا یہ دستور تھا کہ ایک غزل میں مختلف موضوعات کو زیر بحث لاتے تھے اور خیال آرائی کے پیش نظر تصوّف کے مضامین بھی نظم کرتے تھے اس کے علاوہ اپنے انفرادی رنگ کو ابھارنے کے لئے دوسرے شاعروں کی زمینوں میں غزلیں کہتے تھے۔

اس طرح ایک ہی بحر میں دو تین شاعروں کی غزلیں دیکھئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کس شاعر کا کلام ہے۔ مصرع طرح پر کہنے کا رواج عام تھا اور یگانہ کے یہاں بھی بہت سی غزلیں ایسی ملیں گی جو مشاعرے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ مگر وہ "روش عام" سے ہمیشہ ہٹ کر چلتے تھے اور اپنی انفرادیت کا ہر لمحہ خیال رکھتے تھے وہ بھی مقبول عام رنگ میں غزلیں کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ مگر اس میں ان کی شخصیت کے مجروح ہونے کا امکان تھا۔ یگانہ کا فلسفۂ حیات اردو کے کلاسیکی شعراء سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہ بھی جبر و قدر، وحدت الوجود، دنیا کے فانی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی جد و جہد پر ایمان، خود شناسی، زندگی کی لگن اور کچھ کر گزرنے کی تمنا بھی ملتی ہے۔ انھوں نے آتش کی آبائی شاعری کو دوبارہ زندہ کیا تھا۔ وہ کلاسیکی شعراء سے ایک معنی میں مختلف بھی تھے ان کے یہاں جو سوز و گداز ہے وہ عشق کی دین نہیں ہے بلکہ زندگی کے تلخ ترہ تجربات کا نتیجہ ہے جس سے انھیں سابقہ پڑا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں عشقیہ اشعار نہیں ہیں لیکن ان کے کلام میں نمایاں حیثیت ان شعروں کی ہے جس میں زندگی کے کسی نہ کسی تجربے کو فکری انداز میں پیش کیا گیا ہے میرا تو خیال ہے کہ اگر ان کی شخصیت کی کج روی انھیں اپنے میں محدود کرنے کے بجائے کسی ادبی تحریک سے وابستہ کر دیتی تو وہ بہت ہی بڑے شاعر مان لئے جاتے۔ یوں بھی وہ بیسویں صدی کے غزل گو شاعروں میں سب سے زیادہ اہمیت کے مستحق ہیں اس سے انکار کرنا زیادتی ہوگی۔ آیات وجدانی میں پہلی اردو غزل میں یہ اشعار ملتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزہ نہ ملا	کمال صبر ملا صبر آزما نہ ملا
امید وار رہائیٔ قفس بدوش چلے	جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر	کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے	وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

اور آیات وجدانی کی پہلی غزل جو فارسی میں ہے۔ اس کے بھی یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

منکہ بر نے تابم درد زیستن تنہا	صبحدم چساں بینم شمع انجمن تنہا
صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ	وامدا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا

ان اشعار کو پڑھنے کے فوراً بعد جو ردّ عمل ہوتا ہے وہ لطیف شاعرانہ کیفیت کے علاوہ قوتِ عمل کے جذبے کو جگاتا ہے اور ذہن کو بیدار کرتا ہے

ان اشعار کا لب و لہجہ بھی دوسرے اس دور کے شاعروں سے بہت مختلف ہے ان میں بقول مجنوں گورکھپوری ایک مردانہ پن پایا جاتا ہے۔

یگانہ کا آرٹ مینا کاری کا آرٹ نہیں ہے ان کے یہاں نازک جذبات بھی زور بیان کے تیکھے پن کے ساتھ آتے ہیں اور ان کا یہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے آتش و غالب کی زمین میں بلند پایہ غزلیں کہی ہیں جو نہ تو ان شعراء کی آواز باز گشت ہیں اور نہ صدا بہ صحرا بلکہ ان میں آواز کی تیزی اور سوز و گداز کی آنچ کے ساتھ زندگی کا ولولہ بھی پایا جاتا ہے جسے ہم یگانہ آرٹ کہہ سکتے ہیں ؎

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد	سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ	کہ مجھ کو لے کے دل دوست میں سما نہ گیا

ان کے مجموعۂ کلام "گنجینہ" کی پہلی غزل کے یہ دو شعر ہی میرے خیال کی پوری تائید کرتے ہیں ان میں درد کی عظمت اور انسانی ہمدردی کا جذبہ اس خوبصورتی کے ساتھ نظم ہوا ہے کہ ہم بڑی آسانی کے ساتھ پوری کیفیت سے نہ صرف آگاہ ہو جاتے ہیں بلکہ روح کی بالیدگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یگانہ کی یہ بھی ایک خوبی تھی کہ رائج الوقت خیالات کے شدید مخالف ہوتے ہوئے بھی ان انسانی تجربات اور محسوسات کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں جن سے ہم سب دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

ان کی زندگی ایک شدید تنہائی اور اذیت کے ساتھ گزری تھی لیکن ہمیں کہیں بھی وہ قنوطیت نہیں ملتی جو فانی کا جزو ایمان تھی اور وہ فراریت نہیں ملتی جو انسان کو آسمانوں میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اصغر کی شاعری کی بنیاد اسی پر تھی یگانہ کے یہاں ایک ایسا بانکپن ہے جو نامرادی اور غم کو بھی آسان بنا دیتا ہے، انھوں نے اس بات کو یوں کہا ہے ؎

مزے کے ساتھ ہوں اندوہ غم تو کیا کہنا
یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا

اور یقیناً یگانہ اس امتحان میں کامیاب رہے ہیں ان کے طنز میں نشتریت ضرور ہے لیکن وہ زہر میں بجھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی خلش آدمی کو بے چین رکھ سکتی ہے مار نہیں ڈالتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا	مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

کدھر چلا ہے ادھر ایک رات بستا جا　　گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا

صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے　　اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

خداؤں کی خدائی ہو چکی بس　　خدا یا بس دہائی ہو چکی بس

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا　　کنج قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

جو غم بھی کھائیں تو پہلے کھلائیں دشمن کو　　اکیلے کھائیں گے ایسے تو ہم گنوار نہیں

چپکے چپکے ریشہ دوانی یہ بھی کوئی ہیٹی ہے

للکار نہیں تو کچھ بھی نہیں جھنکار نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل سے خدا کا نام لئے جا، کام کئے جا دنیا کا

کافر ہو دیندار ہو دنیا دار نہیں تو کچھ بھی نہیں

مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلیں پھولیں

مگر نازل کوئی فضل الٰہی ناگہاں کیوں ہو

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی　　ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

طاعت ہو یا گناہ پس پردہ خوب ہیں　　دونوں کا جب مزہ ہے کہ تنہا کرے کوئی

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے　　دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے

آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے　　خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلمان ہو جائے

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے　　کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

ان اشعار میں ظرافت کی چاشنی ہے ہلکی ہلکی سی گدگدی ہے طنز کی نشتریت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ہنسی ہنسی میں بہت سی کام کی باتیں کہی گئی ہیں جو زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہم ان اشعار کو پڑھ کر ذہنی لطف حاصل کرتے ہیں اور طنز کی تلخی کا بھی احساس رہتا ہے اس کے معنی ہیں کہ شاعر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ یگانہ کے یہاں مزاح کہیں کہیں پھکڑپن کی صورت اختیار کر لیتا ہے خاص کر ان کی وہ رباعیات جو غالب کے بارے میں ہیں مگر عموماً ان کے مزاح میں صرف الفاظ کی الٹ پھیر نہیں رہتی بلکہ ایک مقصد اور خیال کے تحت وہ تبسم ہونٹوں پر آجاتا ہے جو زندگی کی صحت پر دلالت کرتا ہے مندرجہ بالا اشعار میں ایک اور بات صاف نمایاں ہے وہ ہے خلوص نیت۔ وہ اپنے طنز کی دھار کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں استعمال کرتے اور نہ کسی کی پگڑی اچھالنے کا کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی شگفتگی پیدا ہو گئی ہے جو مزاح کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ یگانہ کے کلام میں خاصہ تنوع ہے اس کے باوجود روایتی انداز کے اشعار بھی ملتے ہیں پھر بھی ہر جگہ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر الگ اپنی راہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یگانہ اپنے دور میں مقبول نہ ہو سکے وہ بازار کا بھاؤ دیکھ کر شعر نہیں کہتے تھے بلکہ جو ان پر گزرتی تھی اس کو آتش سیال بنا کر پیش کرتے تھے۔ ان کے یہاں فکری عناصر کے ساتھ جذبات کی گہرائی بھی ملتی ہے وہ عقل و دل کی کشمکش ہو یا حسن و عشق کی کشش دونوں قسم کے موضوعات کو اپنے اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہیں ان سے یہ شکایت تو کسی کو نہیں ہو سکتی کہ وہ ادائے خیال میں الجھتے ہیں یا محاورات کے استعمال میں کمزور ہیں۔ البتہ کچھ لوگ اتنی تیزی و طراری پسند نہیں کرتے۔ ان کی شاعری شیشہ گری نہیں کرتی وہ شکست و ریخت میں یقین رکھتے ہوئے بھی جہد و عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ اصل میں ان کے کلام میں خودپرستی نے ایک نئے قسم کا تیقن پیدا کر دیا ہے جو ترقی پسند اور دوسرے قسم کے غزل گو شعراء کے یہاں نہیں ہے، ان کی بڑھی ہوئی انفرادیت نے اپنے لئے وہ سنگلاخ زمین چنی تھی جس کو میر، غالب اور آتش ایسے شاعر پہلے ہی ہموار کر کے شاداب کر چکے تھے اور ان پامال موضوعات کو دل کی جلن کے طفیل نئے انداز میں پیش کرنے کا کام بھی یگانہ نے انجام دیا وہ لکھنؤ کے شعراء سے لڑائی کر کے ادبی دنیا میں وقتی طور سے کامیاب نہ ہو سکے لیکن انھوں نے اپنے کلام میں مردانگی، بانکپن، نشاط، مزاح اور فکری عناصر کے امتزاج سے وہ جوہر ضرور پیدا کر دیا جو ان کو فاتح بنا کر رہا۔ ان کے یہاں الفاظ کی بندش، محاورات کی سادگی، تراکیب کی خوب صورتی تشبیہات کی قدرت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور کوئی بھی انصاف پسند نقاد ان کی شاعرانہ اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا ہے ان کا شعری لب و لہجہ نہ صرف اس دور کے اردو غزل گو شعراء سے الگ اور بہتر ہے۔ بلکہ اردو کے کلاسیکی شعراء کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اسی میں یگانہ آرٹ کی عظمت مضمر ہے۔ وہ اپنے مرتبے سے واقف تھے یا نہ تھے لیکن وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ایک فنکار کے لئے خود اعتمادی ضروری ہے اور انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں پر اسی سے صیقل کی ہے جبھی وہ دھار میں تیزی آسکی ہے جو ایک ہی وار میں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھئے اور پھر تیور کا اندازہ لگائیے ؎

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا　　خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہو جائیگا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مرا پا باز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیلِ راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

خود اپنی آگ میں جلنا تو کیمیا ہونا
مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا

عجب کیا وعدۂ فردا پس فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شام بے سحر ہو کر

اُف رے تقوفات عشق آگ لگے دھواں نہ ہو
ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذت سوز و ساز میں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں

دل نے بزورِ عشق لگایا ہے راہ پر
گم گشتگان غمکدۂ روزگار کو

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکر آسمانی کیوں ہو

شمع کیا، شمع کا اُجالا کیا
دن چڑھے سامنا کرے کوئی

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

تمہارے دم سے سلامت ہیں ٹوٹے دل کے
سزا کے بعد مظاہر اُبھارنے والے

نگاہ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
ستم رسیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پہ دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

میں نے اتنے زیادہ اشعار کو اس لئے پیش کیا ہے کہ اس سے کچھ نہ کچھ ان کے کلام کی خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کے اشعار کا تجزیہ اور تنقید کرنا مشکل ہے پھر بھی مندرجہ بالا اشعار کے بارے میں چند باتیں کہہ دینا ضروری ہے۔ ان میں موضوع کے تنوع کے ساتھ لب ولہجہ کا اتار چڑھاؤ بھی موجود ہے۔ فکر کے پہلو بھی عیاں ہیں۔ خیال کی لطافت بھی ظاہر ہے۔ عشق کا والہانہ پن بھی ملتا ہے اور سوز و گداز بھی ہے جو ناکامیوں کو قوت عمل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ نیقن بھی ہے جو زمانے کی راہ سے الگ اپنی راہ بنانے میں مدد دیتا ہے اور یہی صاحب نظری کی دلیل بھی ہے۔ چند شعر تو ایسے ہیں کہ اردو غزل کے سخت سے سخت انتخاب میں شامل کئے جا سکتے ہیں اور کئی شعر ضرب المثل بن چکے ہیں۔ لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ یہ شعر یگانہ کی دین ہیں۔ غالب کی زمین میں دو تین شعر بھی اتنے اچھے کہنا محال تھا اور یگانہ کے شعر (کیوں ہو) کسی لحاظ سے بھی غالب کے اشعار سے کم نہیں ہیں۔ ان میں جذبات کی نہیں نہ سہی فکر کی بلندی اور لب ولہجہ کا وقار ضرور ہے جس کی اتنی اچھی تصویر بھی ہے۔ "چتونوں سے باطن کا سراغ" لگانا اردو شاعروں کے لئے نیا خیال نہ سہی پھر بھی اپنی قسم کا واحد شعر ضرور ہے اور دنیا میں آدمی ماضی کی باتیں کتنی جلدی بھول جاتا ہے۔ اس کو اتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ جوش ایسے بڑے شاعر نے بھی یہ مصرع استعمال کیا ہے۔ یہاں تمام اشعار کی تفسیر و تنقید کی گنجائش نہیں ہے اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں۔

یگانہ آرٹ کے سلسلے میں رباعیات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے یہ آبگینہ کا فن ہے اور اس میں مہارت چند ہی شاعروں کو حاصل ہے ان میں بیسویں صدی کے شاعروں ہی میں نہیں بلکہ انیس کے بعد یگانہ ہی کا نام آتا ہے۔ پھر جوش اور فراق کا ـــ اس فن میں یگانہ کا آرٹ اپنے عروج پر ہے اور اس بات کے تو وہ لوگ بھی قائل ہیں جو یگانہ کو بڑا غزل گو شاعر نہیں مانتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اچھے شاعر کے کمال کے جوہر اسی میں کھلتے ہیں۔ چار مصرعوں میں ادائے خیال کے ساتھ ساتھ لب ولہجہ کا اتار چڑھاؤ اور سب سے بڑھ کر تیسرے اور چوتھے مصرع کی کاریگری ہی حسن رباعی کو دوبالا کرتی ہے یہ ایک خطرناک صنف بھی ہے کیونکہ اوسط درجے کے غزل گو کا سارا بھرم کھل جاتا ہے دوسرے صرف تشبیہ و استعارہ سے کام نہیں چلتا ہے۔ خیال کی ندرت تراکیب اور الفاظ کی بندش کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ صنف نظم اور غزل کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے یگانہ نے اس کو اپنے انتہا پسندانہ نظریے کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا ترانہ کے نام سے منتخب رباعیات کا مجموعہ بھی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اب ان کو "گنجینہ" میں شامل کر لیا گیا ہے پہلی رباعی ہے۔

ساجن کو سکھی منالو پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو پھر سو لینا

سونا سنسار، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سُنا تو پھر سو بیٹا

اس رباعی میں کوئی بڑا خیال نہیں ہے لیکن حسن ادا اور سادگی نے اس کو دل نشین بنا دیا ہے" سننے والا بیدار" استعمال کر کے سکھی کے دکھ درد کی پوری کہانی کو چھیڑ دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانے کتنی افسردہ دلی سے سوتی ہو گی شاید انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہو۔

اسی طرح ایک اور رباعی ملاحظہ ہو جو فلسفہ حیات کے بارے میں ہے۔

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا   سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے   جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

شاعر نے "سنبھلتے رہنے" کہہ کر زندگی کی جد وجہد کی طرف اشارہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ رباعی انیس کے اس خوبصورت شعر سے زیادہ اچھی ہے ؎

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

یگانہ نے غم سے زندہ دلی کا کام لیا تھا اور طوفان سے ٹکرا کر آگے بڑھتے رہتے تھے۔ امید کن دشوار گزار منزلوں سے گزرتی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اپنے پر پورا اعتماد رکھتا ہو اور امید پر نہ جیتا ہو۔ یگانہ نے اپنی رباعیات میں کہیں تو جذبات کے نازک نازک پھولوں کو پیش کیا ہے کہیں مردانہ وار حالات سے جنگ مول لی ہے کہیں زندگی کے تسلسل کو بیان کیا ہے اور کہیں موت کی آرزو کی ہے۔ کہیں غور و فکر کے لئے وہ نظر پیدا کی ہے جو اوجھل راہوں کا پتہ لگاتی ہے اور پتھر کا جگر چاک کر ڈالتی ہے۔ مندرجہ ذیل رباعیات ملاحظہ ہوں۔

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے   طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے   کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

امکان طلب سے کوئی آگاہ تو ہو
منزل کا تہ دل سے ہوا خواہ تو ہو
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے
مل جائے گی راہ راست گمراہ تو ہو

ہر رنگ کو کہتا ہے فریب نظری   ہر بو کو ہوائے منزل بے خبری
ہر حسن کو فلسفی کی آنکھوں سے نہ دیکھ   دشمن کو مبارک ہو یہ بالغ نظری

ہاں فکر رسا دیکھ بڑا بول نہ بول   گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت اتنی قیمت   ہیرا کبھی کنکر ہے کبھی ہے انمول

دنیا میں رہ کے راست بازی کب تک   مشکل ہے کچھ آسان نہیں سیدھا مسلک
سچ بول کے کیا حسین بننا ہے تجھے   آٹا سچ بول، دال میں جیسے نمک

دنیا سے الگ جا کے کہیں سر پھوڑو   یا جیتے ہی جی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار   بڑھنا ہے بڑھو نہیں تو رستہ چھوڑو

وہ حسن ہی کیا ہے جو گلے کٹوائے   فتنے برپا کرے قیامت ڈھائے
دیکھا ہو گا مگر نہ دیکھا ہو گا   وہ حسن جسے دیکھ کے چپ لگ جائے

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں   یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا   ایک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

یگانہ کی ان رباعیات میں تمام فنی خوبیاں ملتی ہیں ان میں جامعیت بھی ہے اور خیال کی پوری ادائی بھی۔ زبان و بیان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی اس کا اظہار بھی ملتا ہے۔ آخری زمانے میں انھوں نے زیادہ تر رباعیات ہی لکھی تھیں۔

یگانہ کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور کی کمی ضرور ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا آرٹ قابل وقعت ہونے کے باوجود بہت بڑا نہ بن سکا اس میں وہ آفاقیت نہ آ سکی جو اقبال، جوش، فراق اور مجاز کے کلام میں ملتی ہے انھوں نے اپنے تصور حیات میں دنیا کے غم کو محسوس تو کیا مگر اس کو ایک نظریے کی صورت میں نہ دیکھ سکے ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کو ایک بڑے پس منظر کی تلاش نہ تھی اور جد و جہد کا پیغام بھی دیتے تھے لیکن زندگی کے فانی اور آدمی کے مجبور ہونے کے قائل تھے۔ ان میں ایک بہت بڑے شاعر بننے کے پورے امکانات تھے مگر انھوں نے اپنی کج روی کے پیش نظر زندگی دشواریوں میں گذار

دی لیکن اُف تک نہ کی۔ کاش وہ بھی تھوڑی بہت مصلحت وقت سمجھتے اس طرح ان کے آرٹ میں روح عصر کے عناصر زیادہ آجاتے تو ان کا ذہنی اُفق زیادہ وسیع ہو جاتا۔ اس کے باوجود وہ اردو کے ان غزل گو شعرا کی صف میں یقیناً شامل ہیں جن کے نام سے غزل کی شمع آج تک روشن ہے اور ان کے اس مرتبے کو ادب کے طالب علم کو پہچاننا چاہیئے اُنھوں نے لکھنؤ کے آخری دور کی شاعرانہ روایات سے بغاوت کر کے کوئی اسکول تو نہیں قائم کیا مگر فراق ایسے بڑے غزل گو کو متاثر ضرور کیا اور جو رچاؤ اور وقار ان کے کلام میں ملتا ہے وہ اصغر اور جگر کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ یگانہ کے خلاف جتنے ہنگامے اٹھائے گئے تھے اس کا کسی موجودہ شاعر کو سامنا نہ کرنا پڑا۔ اور ان صبر شکن حالات میں بھی وہ پوری خودداری کے ساتھ اپنے آرٹ کی پرورش کرتے رہے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کو زمانے کی ناقدری کا نشانہ بننا پڑا وہ آزاد فکر اور روشن طبع شاعر تھے۔ ان پہ جہالت اور تعصب نے ہر طرح کے وار کئے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اُن کے سینے میں زخم ناسور بن چکے تھے مگر جب بھی یہ درد شعر میں ڈھل کر آیا ہے تو وہ مردانہ وار حالات سے مقابلہ کرنے والا جنون بن کے آیا ہے کتنے ایسی بلند شخصیت کے لوگ ہوں گے جو اپنے خیالات اور نظریات کے لئے سخت سے سخت سزائیں برداشت کر لیتے ہیں اور پوری زندگی غم و اندوہ میں گزارنے کے باوجود اپنے کلام میں مزاح کی چاشنی، طنز کی نشتریت لب و لہجہ کا وقار مضامین کی بلندی اور زبان و بیان کی قدرت کا اظہار کرتے ہیں۔

یگانہ کا آرٹ وہ آئینہ ہے جس میں ایک بلند شخصیت کے شاعر کی تنہا جد و جہد کی پوری داستان چھپی ہے اور آج بھی وہ حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ ابھی تک لوگوں نے ان کو نظر انداز کیا ہے یہ سلسلہ کب تک رہے گا کوئی کیا جانے۔ مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ قدر شناس نظروں نے ان کے کلام کو پہچان لیا ہے اور بہت جلد اردو ادب کا نیا مؤرخ بھی ان کو وہ بلند مقام عطا کرے گا جس کے وہ مستحق تھے۔

حبیب تنویر

غزل

بتلائیں راز برہمیٔ زلفِ یار کیا ‎ ‎ سمجھائیں لذتِ سببِ انتشار کیا

سہنا پڑے گا عشق کے غم کا بھی بار کیا ‎ ‎ کم تھا مرے لئے یہ غمِ روزگار کیا

ہونٹوں تک آکے خوفِ ہزیمت سے رُک گیا ‎ ‎ اے دل یہی تھا نالۂ بے اختیار کیا

رکھا نہ اُن کے لطف و کرم کا بھی کچھ حساب ‎ ‎ اب قطرہ ہائے خونِ جگر کا شمار کیا

ہاں رفتہ رفتہ باعثِ تسکینِ دل تو ہیں ‎ ‎ وجہ نشاط ہوں گے مگر غم گسار کیا

دل چاہتا ہے مل کے کسی دن یہ پوچھ لوں ‎ ‎ ہوتے ہو تم بھی درد سے یوں بے قرار کیا

تنویر اب کی ہم نے ہی انکار کر دیا
تجدیدِ عشق خوب ہے پڑ بار بار کیا

لہ پر معنی مگر متروک ہے۔

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

مہاتما بدھ کی یاد میں

مژدۂ عیش ملا قیدیٔ زنداں کے لئے — ہوئی امیدِ رفو چاک گریباں کے لئے
آگیا تحفۂ معراج دل و جاں کے لئے — پھر وہ پیدا ہوا ہمدردیٔ انساں کے لئے

خواب مایا نے جو دیکھا تھا وہ سچا نکلا — دردمندوں کی دعاؤں کا نتیجہ نکلا
آدمیت کے فلک پر وہ ستارا نکلا — سامنے جس کے رخِ مہر بھی پھیکا نکلا

ہو چکا ہے جو نمودار جہاں میں پہلے
آ چکا ہے جو کئی بار جہاں میں پہلے

دیوتا جس کی سلامی کے لئے رکتے ہیں
جس کے سجدے کو فرشتوں کے بھی سر جھکتے ہیں

دیدِ لاہوت عجب شان سے وا ہوتا ہے — وعدۂ عالمِ اسرار وفا ہوتا ہے
پردۂ غیب سے اعجاز نما ہوتا ہے — ازلی عقدہ کشا عقدہ کشا ہوتا ہے

روشنی دانش و ادراک کے ایواں میں ہے — تازگی مہر و محبت کے گلستاں میں ہے
چاشنی ایک نئی علم میں عرفاں میں ہے — زندگی ایک نئی گردشِ دوراں میں ہے

پاٹلی پتر[1] کے گلشن میں بہار آتی ہے
کوہِ ممتاز[2] کے دامن میں بہار آتی ہے

صدق و اخلاص کے کانٹوں میں وفا تلتی ہے
ترک و ایثار کی اک راہ نئی کھلتی ہے

برجِ مایا[3] کے حمل کا جو چمک اٹھا ہے — دل مہاراجہ سدھودھن[4] کا پھڑک اٹھا ہے
جلوۂ فطرتِ بیدار جھلک اٹھا ہے — گلشنِ عالمِ اسباب مہک اٹھا ہے

دل تڑپتا ہوا سینے میں صدا دیتا ہے — دردمندوں کو محبت کی دوا دیتا ہے
اپنے اعجاز سے مردوں کو جلا دیتا ہے — غمِ دنیا کے مریضوں کو شفا دیتا ہے

زندگی ایک نئی بینشِ منظر ملتی ہے
بدھ اوتار[5] کی دنیا کو خبر ملتی ہے

بے سکت جو ہیں انہیں تاب و تواں ملتی ہے
بے پناہوں کو رہِ امن و اماں ملتی ہے

---

[1] پاٹلی پتر پٹنہ کا قدیم نام [2] کوہِ ممتاز سے مراد ہے ہمالہ پربت [3] مایا مگدھ دیش (موجودہ بہار) کے مہاراجہ سدھودھن کی مہارانی کا نام جن کے بطنِ مقدس سے مہاتما گوتم بدھ کا ظہور ہوا۔ [4] مہاراجہ سدھودھن۔ مہاتما گوتم بدھ کے پدرِ بزرگوار کا نام۔
[5] اوتار یعنی نزول۔

سبزۂ زخمی کو جو سینے سے لگا کر دیا   مرغ بسمل کو زمیں سے جو اٹھا کر دیا
چوٹ سی چوٹ کلیجے پہ جو کھا کر سویا   پاس اک بیکس و بیمار کے جا کر دیا
جس نے برباد جوانی سے لڑکپن دیکھا
جس نے مخلوق کو مخلوق کا دشمن دیکھا

جس نے بچپن کی اداؤں کو گزراں کو دیکھا   جس نے ڈھلتے ہوئے افراد جواں کو دیکھا
جس نے ملتے ہوئے پیری کے نشاں کو دیکھا   جس نے ہر کیفیت عمر رواں کو دیکھا
درس دیتا ہی رہا ہر غم تازہ جس کو
سبق آموز تھا مُردے کا جنازہ جس کو

رنگ رلیوں کی فضا میں جسے اُلجھن تھی بہت   عیش و عشرت کی ہوا میں جسے الجھن تھی بہت
حلقۂ زلف دوتا میں جسے اُلجھن تھی بہت   پنجۂ ناز و ادا میں جسے اُلجھن تھی بہت
حُسن کی تہ میں فنا جس کو نظر آتی تھی
عاشقی ایک بلا جس کو نظر آتی تھی

خود کو اپنا ہی بنایا ہے نشانہ جس نے   زینت جسم کیا ترک کا بانا جس نے
مہر و اُلفت کا لُٹایا ہے خزانہ جس نے   شخصیت اپنی بنائی ہے یگانہ جس نے
جس کو تعلیم بنارس سے بھی تسکیں نہ ہوئی
علم حاصل تو کیا قلب کی تزئیں نہ ہوئی

راج کے ٹھاٹھ کو جو ایک مصیبت سمجھا   تاج کے تخت کے اعزاز کو لعنت سمجھا
ظلم کو جور کو جو وجہ اذیت سمجھا   جس نے سمجھا تو بس اک ازمحبت سمجھا
سلطنت سے تھا نہ کچھ کام حکومت سے تھا
مطمئن دل تھا تو اک درد کی دولت سے تھا

روشنی بودھ گیا سے ہوئی حاصل جس کو   مل گئی منزل رہبر کامل جس کو
اپنے حلقے میں کیا عقل نے داخل جس کو   کر دیا ہوش نے نروان کے قابل جس کو
پا لیا اپنا پتہ ہو گیا جب ذات میں گم
آشکارا جو ہوا، ہو کے مساوات میں گم

مُنہ زر و مال کے انبار سے موڑا جس نے   دوستداروں کو عزیزوں کو بھی چھوڑا جس نے
زن و فرزند کے رشتے کو بھی توڑا جس نے   سلسلہ زیست کا نروان سے جوڑا جس نے
چوٹ کھا کھا کے نئی طرح عمل ڈالی ہے
جس نے انسان کی فطرت ہی بدل ڈالی ہے

جس کی عظمت کا ہے صدیوں سے زمانہ قائل   جس کی جانب ہوا پھر آج زمانہ مائل
جس کے رستے میں نہیں ایک بھی ذرّہ حائل   جس کے آگے ہے دراز آج بھی دست سائل
پیروی جس کی محبّت کا سبق دیتی ہے
نوعِ انساں کو اخوّت کا سبق دیتی ہے

جس کو دم بھر نہ رہا شوکت زر سے مطلب   جس کو دم بھر نہ رہا لعل و گہر سے مطلب
جس کو دم بھر نہ رہا تیغ و تبر سے مطلب   جس کو دم بھر نہ رہا شر سے شر سے مطلب
کج کلاہی کی طرف جس کی نظر ہی نہ اُٹھی
تاج شاہی کی طرف جس کی نظر ہی نہ اُٹھی

جس کی تعلیم سے وابستہ ہی قوموں کی نجات   جس کی تعلیم کا اعجاز ہی تہذیب حیات
جس کی تعلیم سے شیطان نے بھی کھائی ہے مات   جس کی تعلیم سے ہے امن و عالم کو ثبات
جس کی تعلیم کا پھر دور نیا آیا ہے
جس کی تعلیم کو ہندنے بھی اپنایا ہے

سید لطیف حسین ادیب

مثنوی پیامِ ساوتری

حضرت شام موہن لال جگر بریلوی ایک اونچے غزل گو کی حیثیت سے (نگار اکتوبر ۱۹۵۵ء میں) متعارف کرائے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا یہ ایک ناتمام سا پہلو تھا۔ تمامی کیفیت مثنوی "پیام ساوتری" میں ملتی ہے۔ جہاں ایک مقصد ہے آدرش ہے اور اس کو منوانے کے لئے بے پناہ جذبہ۔ انھوں نے "پتیلی" ہی نہیں پکائی "دیگ" پکانے کی بھی جرأت کی۔ "پتیلی" اور "دیگ" کی نسبت ڈھکی چھپی ہوئی نہیں تھی، لیکن وہ عہدہ برآ ہوئے۔ نہ نمک پھیکا رہا، نہ آنچ کی کسر رہی۔ ان کی غزل میں ہم نے دیکھا کہ محرک ایک ازلی پرتو ہے، وہ کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ روح میں بالیدگی و انبساط کے طوفان اُمنڈ آتے ہیں۔ پڑھنے والا کچھ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے ہی دل کی بات کہہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ غزل کی بات تھی۔ مثنوی میں زیادہ مربوط، زیادہ واضح طور پر خیالات کو نظم کرنا پڑتا ہے۔ "پتیلی" اور "دیگ" والا معاملہ ہے۔ ایک آنچ کی کسر والے امکانات ہر ہر منزل پر پیدا ہوتے ہیں۔ جگر صاحب ان منزلوں سے بھی گذر گئے۔ انھوں نے سب کچھ کہا اور خوب کہا۔ سوچی سمجھی باتیں سامنے رکھیں۔ بڑی حد تک اپنے "فلسفۂ غم" سے گریز کیا، اور زندگی کرنے کے لئے عمل کو ضروری قرار دیا۔

جس سے کھل جائے فریبِ حسنِ تدبیر و عمل
ایسی بھی اک کوششِ ناکام ہونا چاہئے

یہ بلند آہنگی اور اس کے جلو میں نسوانی سیرت کا افسانوی پس منظر، اردو مثنوی کا نیا موضوع ہیں۔

جیسا نام سے ظاہر ہے مثنوی قدیم ہندو دیومالا پر مبنی ہے۔ ساوتری ستیہ وان کا قصہ پرانوں میں ملتا ہے، اور چونکہ ستی دھرم کا مثالی نمونہ ہے۔ اس لئے آج بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جگر صاحب نے خود کہا ہے: "ساوتری ستیہ وان" کا قصہ ہر سال ہیرا مادس کے دن پوجا کے سلسلے میں میرے خاندان میں بڑی بوڑھی عورتیں دہرایا کرتی ہیں۔ اس قصہ کا پلاٹ سیدھا سادھا اور گنجلک سے پاک ہے۔ ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ درمیانی کڑیاں مربوط، مضبوط اور واضح ہیں ـــــ" ست جگ کے زمانے میں ایک راجا تھا جس کا نام اشوپت تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہندوؤں میں خیال کیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد جس کے کوئی پانی دینے والا نہ ہو اس کی نجات نہیں ہوتی۔ کچھ اس خیال سے، کچھ تاج و تخت کے وارث نہ ہونے کے خیال سے، پیری میں راجا بہت غمگین رہنے لگا۔ اس نے اپنے پنڈتوں اور منجموں سے مشورہ کیا، آیا اولاد پیدا ہونے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی قسمت میں اولاد نہیں ہے۔ ہاں اگر تاج و تخت چھوڑ کر جنگل میں عبادت کریں تو قدرتِ خدا سے کچھ بعید نہیں۔ راجا نے جنگل میں جا کر اٹھارہ سال تپ کیا۔ اس تپ کا یہ اثر ہوا کہ ساری کائنات گھبرا اٹھی اور سُرلوک میں دیوتاؤں کو یہ اندیشہ ہوا کہ اشوپت کی ریاضت و عبادت اس لئے تو نہیں کہ ہمارے حقوق و اختیارات حاصل کرے۔ یہ سب برہما (خالق عالم) کے پاس گئے کہ ان سے اپنے اندیشے بیان کریں اور ہدایت چاہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ راجا کسی کے اختیارات چھیننا نہیں چاہتا۔ اندر کا سا اس کا اقبال ہے۔ کبیر کی سی دولت ہے۔ اس کے سامنے جمراج کا بھی اقتدار ہیچ ہے۔ یہ بات جمراج کو ناگوار ہوئی۔ انھوں نے ردو قدح کیا۔ برہما نے تقدیر و عمل پر درس دے کر ان کی تشفی کی اور آخر میں فرمایا کہ راجا کا تپ اولاد کے لئے ہے۔ اب برہما نے ساوتری دیوی کو بلایا اور ان سے کہا کہ راجا اشوپت اٹھارہ برس سے جنگل میں تپ کر رہا ہے، تم اسے جا کے درشن دو اور کہو کہ تیری ریاضت قبول ہوگئی۔ راجا جنگل سے گھر پلٹ آیا اور ایامِ مقررہ کے بعد اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ چونکہ اس کا مژدہ ساوتری دیوی نے دیا تھا اس لئے لڑکی کا

نام ساوتری رکھا گیا۔ جب ساوتری سولہ سال کی ہوئی تو راجہ کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی لیکن لڑکی میں کچھ ایسا غیر معمولی حسن تھا کہ کوئی تاب نہ لاسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر بجائے اس کے کہ شادی کا خیال پیدا ہو ترکِ دنیا و تجرد کی آرزو دلوں میں پیدا ہوتی تھی۔ جب عام طریق پر ساوتری کا مسئلہ حل نہ ہوا تو راجا نے مجبور ہو کر بیٹی سے کہا کہ اب تم خود ہی اپنے لئے بر تلاش کر لو، تیرتھ ستھانوں میں جاؤ، ممکن ہے وہاں کوئی لائق بر مل جائے۔ ساوتری نے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے سفر کیا اور ایک مقام پر ستیہ وان کو دیکھا۔ وہ ایک ایسا جوان تھا جو اس کے حسن و جمال سے مرعوب و منفعل نہ ہو سکا۔ ساوتری سفر سے پلٹ آئی راجا سے کہا کہ ستیہ وان کو میں نے بنظر شوہر دیکھا ہے۔ راجا اور سب اہلِ دربار خوش ہو گئے۔ مگر نارد منی نے برہمی ظاہر کی اور کہا کہ ستیہ وان ایک سال بعد مر جائے گا، اس لئے شادی بے کار ہے۔ راجا نے ساوتری کو مخاطب کر کے کہا کہ بیٹی کیا کیا جائے کچھ اور سفر و سیاحت کر ڈالو۔ ساوتری نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ اس کے بعد راجا اشوپت جنگل میں گئے، جہاں ستیہ وان کے ماں باپ عبادت کرتے تھے اور ساوتری کا بیاہ ستیہ وان سے کر دیا۔ ساوتری کا بیاہ ہو گیا اور اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ شوہر کی موت کو کس طرح ٹالنا چاہیئے۔ اس نے بالکل ایک سادھو کی زندگی بسر کرنا شروع کی۔ قوتِ ارادی کو ترقی دینا شروع کیا اور عبادت و ریاضت سے یقین کو مضبوط کیا کہ شوہر کی موت ہو نہیں سکتی اور ہو گی تو میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔ آخر ستیہ وان کی موت کا دن آیا۔ یہ دن اور اس کے پہلے دو دن ساوتری نے اپواس میں گزارے تھے۔ اپواس وہ برت ہے جس میں کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ اس دن شام کو ستیہ وان کے ساتھ خود بھی بن میں گئی کہ اسے اکیلے چھوڑ نہیں سکتی۔ وہاں ستیہ وان ایک پیڑ پر لکڑی کاٹتے کاٹتے دردِ سر سے بیتاب ہوا۔ نیچے اترتے اترتے بے ہوش ہو گیا۔ ساوتری اس کے پاس بن میں بیٹھ گئی۔ پہلے جم کے دوت یعنی قاصد ستیہ وان کی روح قبض کرنے آئے۔ مگر ساوتری کی پر جلال صورت کو دیکھ کر ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کے پاس آئیں۔ اب جم راج خود آئے اور ستیہ وان کی روح قبض کر کے عالمِ علوی کی سمت روانہ ہوئے۔ ساوتری نے ان کا پیچھا کیا اور بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد ستیہ وان کی روح بخشوالی اور دنیا کو دکھا دیا کہ ستی دھرم کیا چیز ہے اور کس طرح یقین و عمل کی قوت سے مردے زندہ ہو سکتے ہیں۔"

(بحوالہ مکتوب جگر صاحب۔ ۳-اپریل ۱۹۵۳ء)

اس مثنوی میں کل چودہ سو اشعار ہیں۔ بحر وہی ہے جو نسیم نے اختیار کی ہے۔ مثنوی کی تقسیم اسی ڈھنگ پر ہے جس طرح متقدمین کرتے آئے ہیں۔ مختلف عنوانات ہیں اور ہر عنوان ان اشعار کا اختصار ہے جو اس کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں۔ "مثنوی مختلف اوقات میں کہی گئی۔ غالباً دسمبر ۱۹۲۵ء یا جنوری ۱۹۲۶ء میں اس کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۹ء میں تکمیل کو پہنچی پھر نظرِ ثانی کی جس کا سلسلہ اب تک جاری رہا۔" (دیباچہ مصنف) مثنوی ایک فاضل دوست کو بھیجی، اور ان کی رائے بھی مانگی۔ انھوں نے لکھا "ایک اعلیٰ درجے کی مثنوی میں جو آپ کے قلم سے نکلے جس قدر روانی اور زورِ بیان ہونا چاہیئے وہ اس میں پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ زورِ بیان سے یہ نظم بالکل معرا ہے۔ ہرگز نہیں بعض موقعوں پر آپ نے روانی اور زورِ بیان کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ باید و شاید۔ مثلاً کرم کے متعلق ساوتری کی تقریر ہر دو محاسن مذکورہ کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔ مگر کل نظم اس اعتبار سے جیسی ہونی چاہیئے تھی ویسی نہیں ہے۔ بقول حضرتِ مصنف "یہ نہایت مختصر و جامع تبصرہ تھا۔" چنانچہ"..... ترمیم لازمی ٹھہری اور شروع کر دی گئی۔ اب کے قطع و برید کا سلسلہ جو شروع ہوا تو آج تک برابر جاری رہا۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہر نسخہ کچھ نہ کچھ بدلتا چلا گیا۔..." (دیباچہ مصنف)

واقعات کی تمام ترتیب ہندی ناول "ساوتری ستیہ وان" سے اخذ کی گئی ہے۔ کہیں کہیں تاریخی واقعات سے بچ کر شاعرانہ تصرف سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ساوتری جب دمت سین کی کٹی پر پہنچتی ہے تو ہندی ناول میں ستیہ وان بچھڑے سے کھیلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ مثنوی میں اس موقع پر ستیہ وان کو پھلواری میں کھڑے ہوئے دکھایا ہے۔

مثنوی کی ابتدا حمد اور مناجات سے ہوتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اُردو مثنوی کی یہ ایک روایت ہے "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" کی ابتدا بھی حمد اور مناجات سے ہوتی ہے۔ بعض نے اجتناب بھی کیا، لیکن "عشق کی تعریف" اور "شکایتِ فلک" سے آگے نہ بڑھ سکے۔

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ۔ ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال (میر)

اور پہنچی ہے کار دانحواں تک ۔ بے مہر ہے آسماں کہاں تک (راسخ)

میر حسن نے کافی طویل حمد لکھی ہے ، انداز فلسفیانہ اور مقابلتاً مشکل ہے اگویا آورد ہے۔ آمد اور روانی نہیں نسیم کے یہاں کمال کا اختصار ہے۔ یقیناً اتی بل تقلید اختصار ، اس سے ان کی فنی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسیر — حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی کہ مطیع پنج تن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زباں کی پیش دستی

جگر صاحب نے بائیس اشعار حمد پر اور تیس اشعار مناجات پر نظم کئے ہیں۔ بظاہر یہ طوالت عیب معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ اُن کا طرز بیان "نہ صوفیانہ ، نہ فلسفیانہ ، بلکہ نفسیاتی ہے۔

تخیل کی مدد سے نئے مضمون کی تلاش اور "لے دل تو خرسندم تو بُتے کسے داری" والی باتیں نہیں ہیں۔ انھوں نے پہلے بشر کی ذہنی کیفیات سمجھنے کی کوشش کی ہے یعنی پہلا انسان کیا تھا ، ماحولی کیفیت کیا تھی۔ اس ماحول میں اس نے خود کو کس طرح کھویا پایا ، کس طرح اس کے شعور نے رہنمائی کی اور بالآخر وہ ایک "مدار قوت" اور "جوہر کائنات" کا قائل ہو گیا۔ یہ خدا کی توصیف نہیں ہے۔ "پہلے بشر" کی حیرانگی اور اس کی ذہنی ترقی کا ذکر ہے۔ بغیر استدلال اور فلسفیانہ غور و فکر کے وہ خدا کی برتری کا قائل ہو جاتا ہے۔ حمد کا مطلب خدا کی تعریف اور اس کی عظمت کا اظہار ہے لیکن عظیم تر بات یہ ہے کہ انسانی امکانات کو سامنے رکھ کر اس کی قدرت تسلیم کی جائے۔

تخلیق ہوئی جب بشر کی! — حیران تھا جس طرف نظر کی
جو دفتر کائنات دیکھا — نیرنگ عجائبات دیکھا
جب عقل و خرد نے پر نکالے — دفتر دنیا کے دیکھ ڈالے
مجبور ہوا جو ہو کے ششدر — سر عجز سے رکھ دیا زمیں پر
کہنے لگا اے مدار قوت — اے جوہر کائنات و فطرت
آتا نہیں تو سمجھ میں کیا ہے — لیکن یہ یقین ہے بڑا ہے
قدرت نہیں کوئی تیری محدود — کیوں کر نہ بنائیں تجھ کو معبود
سر عجز سے خم ہے تیرے آگے — خاموش قلم ہے تیرے آگے

یہ مناجات کا انتخاب ہے ؎

جب سے مجھ کو شعور آیا — جب سے آنکھوں میں نور آیا

بازار جہاں کو خوب دیکھا — ارزاں کو ، گراں کو خوب دیکھا
دولت ہے تو ہے سخن کی دولت — عزت ہے تو ہے سخن کی عزت
ارباب سخن ہیں مرد آزاد — ہر حال میں ہر خیال میں شاد
رہتے ہیں یہ بے پیے ہوئے مست — خم خانہ بدوش و جام در دست
اے خالق جوہر معانی — سرچشمۂ فیض خوش بیانی
رحمت سے مجھے نہال کر دے — دامان سخن گہر سے بھر دے

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے عموماً مثنویوں میں آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے ؎

خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب — کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب
مئے ارغوانی پلا ساقیا — کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا
پلا ساقیا مجھ کو اک جام گل — جوانی میں آیا ہے ایام گل
پلا آتشیں آب پیر مغاں — کہ بھولے مجھے گرم و سرد جہاں
شتابی مجھے ساقیا دے شراب — کہ یہ حال سن کر ہوا دل کباب

نسیم اپنے قلم کا ذکر کرتے ہیں ؎

کرتا ہے جو طے سواد نامہ — یوں حرف ہیں نقش پائے خامہ
گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
پھرنا جو وطن کو مدعا ہے — اب صفحہ پہ یوں قلم پھرا ہے
ہے بس کہ یہ چرخ جور پیشہ — یوں خار رہ قلم ہے ریشہ
گل چیں کا جواب پتا ملا ہے — یوں شاخ قلم سے گل کھلا ہے

لیکن اس طرح آغاز ہو تو بھی حرج نہیں ہے محض مروجہ طرز کی پابندی ہے۔ جگر صاحب کے یہاں عرض مدعا کے لئے کسی تمہید ، کسی گریز کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

ست جگ کا زباں پہ ہو فسانہ — کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ
طفلی کا تھا کائنات کا دور — جو طور تھا سادگی کا تھا طور
بھولے تھے لوگ جیسے بچے — سیدھے سادے زباں کے سچے
آپس میں بشر تھے بھائی بھائی — یکساں تھی نگاہ میں خدائی

(ست جگ کا حال)

تاروں کی ہے چھاؤں کچھ اندھیرا — ہوتا چلا آتا ہے سویرا
تاریکی میں نور کے ہیں آثار — پھٹنے میں جھلک رہے ہیں انوار

سناٹا فضا میں چھا رہا ہے   فطرت کو کچھ انتظار سا ہے
مُنہ دیکھتا ہے اثر دعا کا   ہے وقت قبول التجا کا
ساوتری اب کُٹی سے نکلی   پُوجا کرنے خوشی سے نکلی

(ساوتری کا اپواس)

مثنوی آغاز سے انجام تک بالکل سیدھے سادے طریقے پر پہنچتی ہے۔ پہلی کڑی دوسری کڑی کا پتہ دیتی ہے۔ داستان کی گنجلک اور مختصر قصوں کا اُلجھاؤ نہیں ہے، اور نہ ہی جدید افسانے کی ٹیکنیک برتی گئی ہے، کوئی اُلٹ پھیر، کوئی اُلجھاؤ نہیں ہے۔ پلاٹ کا سارا حُسن اس کے قصے پن میں ہے۔ حمد اور مناجات کے علاوہ اُنیس ٹکڑے یا باب مثنوی کے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضبوطی سے ایک دوسرے سے بندھا ہوا ہے، اور نہ ہی دوسرا بیان پہلے کی تکذیب کرتا ہے۔ نظم اس سادگی کی متحمل ہے۔

قصے کا موضوع "ہندوانہ" ہے، اور غالباً اردو مثنوی میں اپنی قسم کی سب سے پہلی کوشش ہے۔ ہندو کرداروں پر مبنی مثنویاں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ نصرتی کی "منوہر و مدمالتی" یا ہنر کی "نیہ درپن" اور "اوتار درپن" کافی مشہور ہیں۔ لیکن ہندی جام میں پارسی شراب بھری گئی ہے۔ چند ہندی الفاظ کا استعمال، کرداروں کا منوہر و مدمالتی نام اس فضا، اس رس، اور اس تھرتھراہٹ کی ضمانت نہیں کرتے جو ہندی سے متھ کر امرت کی شکل میں نکالا جائے۔ چنانچہ یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ منوہر و مدمالتی کو اس صدی میں بھی "دائرۂ شریعت" میں داخل کیا گیا تھا۔ عاقل خاں رازی نے اس کا نام مہر و ماہ رکھا اور فارسی میں ترجمہ کر ڈالا ؎

حدیثِ روشن و دل خواہ گویم   سخن از عشقِ مہر و ماہ گویم
کنم عشقِ منوہر را کتابے   دہم از نام مہر آں را خطابے
نوائے عشقِ مدمالت سرایم   ولے از پردۂ ماہش نمایم

گویا فارسی تہذیب ہندی نام کی متحمل نہیں تھی۔ ترجمے کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ ناموں میں تبدیلی کر دی جائے۔ بالکل آج کی اُردو کی طرح جو آغوش میں ہندی و سنسکرت کے موزوں اور سرل اور رچے ہوئے الفاظ کو جگہ نہ دے سکی جس نے اُردو کو بجائے کلچرل روایات کے حامل بنانے کے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ وہ ایک عام ہندو کے احساسات و جذبات کا محرم و منبع نہ بن سکی۔ اس کی نظر جب بھی ادب پر پڑی تو وہ اُردو نظم کی شعریت کی تو تعریف کر سکا لیکن جس رس کا وہ جویا تھا یا وہ کیف جو روح میں تازگی اور بالیدگی پیدا کرتا ہے اُس کو کبیر، میرا بائی، تلسی داس، رس کھان، سورداس، دیو، متی رام اور بہاری لال وغیرہ میں ہی مل سکا۔ یہ اُردو کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ جگر صاحب نے سفالِ ہند میں خالص ہندی نکھرا ابھرا ہے۔ فارسی دخترِ رز کا خون رگ جاں نہیں۔ ان کی شراب میں وہ مستی ہے جو تیر بہدف ہے۔ اس میں ہمارے کلچر، ہمارے احساسات کی نمائندگی ہے۔ یہاں یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ جگر صاحب خود فارسی کے اسکالر ہیں۔ فارسی کا رس اُن کو ورثے میں ملا ہے۔

انگریزی ادب نے یونانی اور لاطینی سے کیا کچھ نہیں حاصل کیا۔ ہر اچھا انگریزی داں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ خود بیسویں صدی میں بلکہ انیسویں صدی کے آخری نصف دَور سے اُردو ادب نے انگریزی سے کتنا استفادہ کیا۔ ڈھکی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، لیکن کیا یہ غضب نہیں ہے کہ ہم نے سنسکرت کو فراموش کیا۔ قدیم ہندو دیومالا سے پرہیز کیا اور اُردو کو جس کی ابتدائی جڑیں اس زبان سے ملتی ہیں محدود کر کے ایک حد قایم کر دی، وسعت سے محروم کر دیا۔ انگریزی اور اُردو اپنی اپنی جگہ ہیں۔ پردیسی ادب نے (یونانی، لاطینی، انگریزی) ان کو نئے الفاظ دیئے، اور فکر کے نئے طریقے بخشے، محکوم نہیں بنایا۔ سنسکرت الفاظ اور خیال کا اضافہ کر سکتی ہے، ایسے تصورات دے سکتی ہے جو ہماری قومی زندگی کے لئے امرت ہیں۔ "پیام ساوتری" میں سنسکرتی ہے۔ بھارتیتا ہے، ستی دھرم کا آدرش ہے۔ ہر مشرقی عورت کے لئے وہ قوتِ حیات ہے جو موت پر بھی فتح پا سکتی ہے۔

اُردو مثنوی کی تمام کائنات عشق ہے۔ چند صوفیائے کرام مثنوی نگاروں کو چھوڑ کر ہر مثنوی میں روایتی، پامال اور تصوّراتی عشق ملے گا۔ زندگی تمام تر عشق نہیں ہے، نہ تھی اور نہ ہوگی۔ زندگی کی کچھ اور بھی لذتیں ہیں جو جنس سے ماورا ہیں۔ مثنوی "پیام ساوتری" ایک ایسی باضابطہ کوشش ہے جس میں زن و شوہر کی محبت پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ محبت مثالی ہے، اور دوسروں کے لئے نمونہ۔ اس میں رچاؤ ہے، سماس ہے، جنسیات کہ عرف عام میں ہم جس کو شہوانیت کہتے ہیں وہ اُردو مثنویوں میں ملتی ہے،

جنسی لذت کا چھٹا پا عام ہے۔ ایک پر سرام، ایک بے نظیر، ایک بکا ڈلی، ہر مثنوی میں جاری و ساری ہے۔ تاہم جنسی ہیجان آنکھوں پر تاریکی کے پردے ڈالے تو شاعر بس اتنا ہی کہہ کر گزر جاتا ہے ؎

چھایا تھا فضا میں رنگ دلجو   مہکی ہوئی تھی شباب کی بُو
ذرہ ذرہ نشاط آگیں   کیفیت و انبساط آگیں
رشتہ جب ان کا ہو گیا پاک   پردے نا محرمی کے تھے چاک
دلدادہ و دلستاں تھے دونوں   دو قالب اور ایک جاں تھے دونوں
دیدار کی کھل گئیں جو راہیں   ملنے لگیں شوق کی نگاہیں

(ساوتری کا بیاہ)

یہاں شاعر کی نظر "اونچی کیرتی" کے اتار چڑھاؤ میں اٹک کر نہیں رہ جاتی۔ اس کا مشاہدہ زیادہ عمیق اور اس کا بیان بہت پُر اثر ہے۔

جیسا میں نے کہا روایتی عشق و محبت نے اردو شاعروں کو مشاہدۂ فطرت سے باز رکھا، اور مثنویوں میں جستہ جستہ منظر کشی ملتی ہے لیکن رسم اور تکلف کے ساتھ۔ کلیم الدین احمد کے الفاظ جو انھوں نے میر حسن کے لیے استعمال کئے تھے: "بیان مرصع ہے۔ شاعر نے پھولوں کا معطر گلدستہ مرتب کیا ہے جس سے دل و دماغ مسرور ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ پھول مصنوعی ہیں۔ جو خوبصورتی کسی دیہاتی پھول کی سادگی میں ہوتی ہے وہ سارے باغ کو میسر نہیں" قریب قریب ہر اردو مثنوی پر لاگو ہو سکتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہی ہے کہ ہمارے مثنوی نگاروں کا قلم وہیں تیز چلتا ہے جہاں اختلاط، غم فراق اور وصل کی باتیں ہوتی ہیں۔

اس کے خلاف مثنوی "پیام ساوتری" میں ایک صبح کا منظر ان الفاظ میں ملتا ہے ؎

تاروں کی ہے چھاؤں کچھ اندھیرا   ہوتا چلا آتا ہے سویرا!
تارے ابھی جھلملا رہے ہیں   چھپنے کو ہیں ٹمٹما رہے ہیں!
تاریکی میں نور کے ہیں آثار   پردے میں جھلک رہے ہیں انوار
سناٹا فضا میں چھا رہا ہے   فطرت کو کچھ انتظار سا ہے
کیا نور و سرور کا سماں ہے   رحمت کے ظہور کا سماں ہے
منہ دیکھتا ہے اثر دعا کا   ہے وقت قبول التجا کا

اس کے بعد تڑکا ہو جاتا ہے ؎

تڑکے کا سماں وہ عالم نور   بکھرا ہوا دور تک وہ کافور
وہ نور میں جھلکیاں شفق کی   نارنجی کہیں، کہیں سنہری!
میدان میں سبزہ دوب کا فرش   شبنم کے وہ قطرے انجم فرش
موتی بکھرے ہوئے پڑے ہیں   ہیرے ابھرے ہوئے جڑے ہیں
اشجار میں کونپلیں نئی ہیں   دھانی، عنابی، اکتئی ہیں
نکھرے نکھرے ہیں ہرے ہرے برگ   چکنے چکنے نئے نئے برگ
ننھی کلیاں غضب سجیلی   اودی، نارنجی، نیلی، پیلی
چھو جائے ہوا تو گل کھلائیں   چٹکیں کھلیں، نکہتیں اڑائیں
جھاڑی ہے کریل کی طرحدار   چنری اوڑھے ہے یا کوئی نار
بھینی بھینی گلوں کی خوشبو   ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے دلجو

اور یہ ہے ایک شام کا منظر ؎

دن ڈھل گیا شب کا دور آیا   آخر ہوئی شام اندھیرا چھایا
گنجان گھنا گھنا وہ جنگل!   سنسان ڈراونا وہ جنگل
ہیبت سی جہاں پہ چھانے والی   پھیلی ہوئی رات کالی کالی
آسیب و بلا نے بن کو گھیرا!   ظلمت کا ہجوم گھپ اندھیرا
ظلمت وہ کہ جس سے بھوت بھاگے   آنکھوں سے نظر بڑھے نہ آگے
آغوش عدم تھی رات کیا تھی   میت تھی کائنات کیا تھی
اشجار کا سائیں سائیں کرنا   خونخوار درندوں کا گزرنا
ہیبت سے ہوا کا بند تھا دم   پُر ہول سکوت ہُو کا عالم
سنکے جو ہوا تو جی نکل جائے   پتہ کھڑکے تو دل دہل جائے
ایسے میں اگر کہیں بشر آئے   اپنے ہی سے ہول کھا کے مر جائے

اور یہ ہے ایک حسین عورت کی عبادت کا منظر ؎

ساوتری اب کٹی سے نکلی   پوجا کرنے خوشی سے نکلی
ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے   چوٹی سلجھا کے مانگ بھر کے
وسواس سے دل کو پاک کر کے   باطن میں یقیں کا رنگ بھر کے
بیٹھی ہے بچھائے کشا کا آسن   ہے گھی کا چراغ آگے روشن
چاول، کافور، دھوپ اور گھی   لونگیں، رولی، سپاریاں بھی
کچھ پھول، بتاشے اور اک پان   پوجا کا سبھی ہے جمع سامان
پھیلی ہوئی ہے جو بو ہون کی   مہکی ہوئی ہیں ہوائیں بن کی

دل دھیان میں ہاتھ میں ہے سمرن   پوجا میں لگا ہوا ہے تن من
چھایا ہے سکون تن بدن پر   ہے سانس نسیم سے سبک تر
مورت ہے وہ دھیان کی سراپا   ترشا ہوا بت ہو جیسے رکھا

ان اشعار کو دھیان میں لاکر ایک مصور بڑی آسانی سے نظر فریب تصویر کھینچ سکتا ہے۔

یہ تینوں اقتباس اپنی اپنی جگہ مکمل ہلکی پھلکی نظمیں ہیں۔ ان میں بلا کی شعریت اور اثر انگیزی ہے۔

بیانیہ شاعری میں دوسروں کی تصویر کھینچنا، دوسروں کے جذبات کو صحیح صحیح پیش کرنا فن کار کے لئے مشکل کام ہے۔ تخیل کی معمولی بے راہ روی تصویر غلط بنا سکتی ہے، اس کے فن اور اثر میں کمی کر سکتی ہے۔ شاعر عموماً ایسے موقع پر صنائع بدائع سے کام لیتے ہیں۔ لیکن دیکھا کچھ ایسا گیا ہے کہ مبالغہ اور صنائع لفظی اور معنوی ظاہری حسن تو بڑھا دیتی ہیں لیکن اثر گھٹا دیتی اور محاکاتی پہلو تاریک کر دیتی ہیں۔ ایک اچھی تصویر اسی وقت ممکن ہے جب کہ شاعر خارجی واقعات کو اس حد تک اپنا کرلے کہ وہ اس کے اپنے ہی بن جائیں۔ تصویر کا موضوع یا واقعہ کا ہیرو وہ خود ہو جائے ؎

محویت شر کی ہے یہ صورت   پتھر کی دھری ہو جیسے مورت
چیتل، پاڑھے، پلنگ، لنگور   کیفیت بندگی سے مخمور
راجا کے ہیں ارد گرد بیٹھے   چیلے ہوں کسی رشی کے جیسے
ہے جسم میں کچھ تو استخواں ہیں   یا کھال ہی اور جھریاں ہیں
لب بند ہیں، بند دیدہ و گوش   ہیں یاد خدا میں خود فراموش
چھٹکی ہے بھبھوت تن بدن میں   ویراگ برس رہا ہو بن میں
چہرے سے جلال ہے نمودار   جنگل میں جھلک رہے ہیں انوار
تصویر سکوں کی ہیں سراسر   دم بھی کہیں رک رہا ہے چل کر
آئینۂ طاعت و صفا ہیں   تصویر تصور خدا ہیں

(راجہ اشوپت کا تپ)

اتنے ہی میں چند بھوت آئے   بیجے ہوئے جھکے وہ آئے
سوکھی ہوئی ہڈیوں کے پنجر   مکروہ، مہیب، فتنہ در سر
دیدے کوئی لال لال پھاڑے   ہونٹوں میں سفید دانت گاڑے
چہروں پہ شکن غضب کی ڈالے   شعلے کی طرح زبان نکالے
دائیں بائیں گزر رہے ہیں   آپس میں اشارے کر رہے ہیں

(ساوتری کی تپ)

مثنوی مختلف واقعات و حالات سے گزرتی ہے۔ کردار بھی کئی ہیں۔ ایسی صورت میں مختلف موقعوں پر مختلف اور پر تنوع جذبات کا پیش کرنا ضروری تھا۔ ایسے مقام مثنوی میں بہت سے ہیں جہاں متضاد نفسی کیفیات کرداروں پر طاری ہوتی ہیں۔ اور جہاں شاعر اگر صحیح او رسالم نکل جائے تو اس کے فن کی معراج ہے۔ جذبات نگاری کے معاملے میں میر اور اثر کے یہاں اثر انگیزی ہے، وہ کچھ اس وجہ سے کہ دونوں درد اور تکلیف کی عکاسی کے وقت اپنی شخصیت کا گہرا رنگ بھر دیتے ہیں۔ میر حسن کے یہاں پختگی اور تنوع ہے نسیم شروع سے آخر تک پر تکلف اور پر تصنع ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ جگر صاحب میر حسن کی طرح سادہ ہیں۔ لیکن نفسی کیفیت اور خصوصیت سے نسوانی جذبات کے تجزیئے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

ساوتری سفر سے واپس آنے کے بعد ستیہ وان کے لئے اپنی پسند کا اظہار کرتی ہے۔ نارد منی جو اس وقت کے دربار میں موجود تھے غیظ و غضب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایک سال بعد ستیہ وان مرجائے گا۔ راجہ اشوپت کی محبت موجزن ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ساوتری کوئی دوسرا بر تلاش کرے۔ کچھ ایسی صورت آپڑی ہے ؎

یہ سنتے ہی مضطرب ہوئی وہ   مشکل میں تھی کشمکش میں تھی وہ
بحث آپڑی غیرت و وفا میں   اور باپ کے حکم نا روا میں

ایک طرف ستیہ وان کی محبت اور دوسری طرف باپ کا حکم ہے۔ شاعر نے اس کش مکش سے فائدہ اٹھا کر ساوتری کے دھرم کی پختگی اور بے خوفی کا نمونہ بھی پیش کیا ہے ؎

گویا ہوئی یوں وہ ہو کے مجبور   ارشاد یہ راستی سے ہے دور
مذہب سے، رواج و رسم سے دور   زنہار نہیں یہ مجھ کو منظور
وہ زر ہو کہ قول ہو کہ دختر   واپس لیتا ہے کوئی دے کر
دیکھا جب انھیں سمجھ کے شوہر   رشتہ میرا ہو چکا مقرر
ممکن نہیں اب یہ عہد ٹوٹے   ممکن نہیں ان سے رشتہ چھوٹے

بیا ہوں گی کسی کو تو انہیں کو   عمر اُن کی زیادہ ہو کہ کم ہو

اسی طرح سفر سے واپسی پر ساجانے جب ساوتری سے پوچھا ؎

روداد سفر سناؤ بیٹی   کیا کیا دیکھا بتاؤ بیٹی
تو وہ سے غیرت کا مقام تھا لجائی   نیچا کیا سر نظر جھکائی
اور سے بولی کہ بہت دیار دیکھے   جنگل اور کوہسار دیکھے
گزرے کبھی ایک جا دو ایام   ہوتی کہیں صبح اور کہیں شام
جنگل میں کبھی قیام ہوتا   بستی میں کبھی مقام ہوتا
یہاں بھی اک دن سفر سے تھک کے   پہونچے سرِ شام اک کٹی پر
رہتے ہیں وہاں رشی دمتسین   خالق کی کبھی تھی ان پہ بھی بن
اک وقت تھا تاجدار تھے وہ   قسمت سے فقیر ہوگئے وہ
دل بند ہیں ستیہ دان اُن کے   اٹھارہ برس کے کوئی ہوں گے
اٹھنا تھا ادھر میری نظر کا   مقصود سمجھ گئی سفر کا
صحرا میں ہوئی جو ختم منزل   بے چین ہوا پلٹنے کو دل

عشق کی سب سے اہم منزل محض ایک لمحے میں گزر جاتی ہے، اور جو بات دفتر کے دفتر چاہتی ہے پلکوں کی دو جنبشوں اور پتلی کی ایک گردش میں طے ہو جاتی ہے ؎

حیرت سے نظر ادھر اٹھائی   وہ شمع جمال کچھ لجائی
دو چار ہوئیں نگاہیں اُن کی   بہریں ملیں شہد و شیر کی سی
بچھڑی ہوئی روحیں تھیں مقابل   ملتے ہی نگاہیں مل گئے دل
عقدے ہوئے حل بیک نظر میں   منزل پوری ہوئی سفر میں

ہمارے متقدمین نے بجائے چار اشعار پر اکتفا کرنے کے دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں۔

مثنوی کا مرکزی کردار ساوتری ہے۔ شاعر نے اس کردار کے نشو و نما میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ پوری مثنوی میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور توجہ کے قابل ہے تو یہ نسوانی سیرت ہے، صاحبِ مثنوی نے دیباچے میں کہا ہے "اردو شاعری میں ہندوستانی عورت کی صحیح تصویر نظر نہیں آتی جو محبوب شاعروں کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ اگر اس سے قیاس کیا جائے تو ہندوستانی عورت کا تخیل جسمانی ہر پہلو سے مضحک نظر آتا ہے اور اخلاقی معیار سے اس قدر پست کہ بیان کرتے شرم آتی ہے اور تصور سے نفرت ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے ایسی نظم کہنے کی فکر ہوئی جس میں عورت کے قلب کے خاص خاص پہلو اصلیت کے ساتھ نمایاں ہو جائیں اور یہ نقش ایک حد تک معیاری اور مکمل نقش ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اردو مثنوی میں خصوصیت سے جن کرداروں کا تذکرہ آیا ہے وہ ہماری دنیا کے انسان نہیں ہیں۔ ان کی صورت درحقیقت مضحک ہے۔ وہ دنیا کی تمام صفات کا مرکز ہیں۔ عالم ہیں۔ شجاع ہیں، وسیع سلطنتوں کے مالک ہیں، عشق کے میدان میں پرچم بردار ہیں۔ ہیرو اور ہیروئن میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ہیرو کی تعریف، اس کے حسن کا تذکرہ کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ اس میں نسوانیت، شانِ محبوبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہیروئن کی تعریف پر قلم توڑ دئے گئے ہیں۔ ہر ہر عضو کی علیحدہ علیحدہ تعریف کی گئی ہے، راسخ اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ انھوں نے ترتیب وار جبیں سے لے کر "پائے نگاریں" تک کا تذکرہ کیا ہے۔ آثر دو قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ اپنے تخیل کو کسی مستور شے کے تصور سے بھڑکانا چاہا ہے ؎

رفتہ و شستہ صاف کیسا ہے   کچھ نہ کہہ زیرِ ناف کیسا ہے

ساوتری کے حسن کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن رہتی وہ انسان ہی ہے، اور نہ ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاہدِ بازاری ہے۔

وہ حسن کہ دل کو پاک کر دے   دامانِ نظر میں نور بھر دے
وہ جلوہ کہ چاندنی بھی شرمائے   جس سمت نظر ہو دھوپ کھل جائے
وہ شانِ جمال و رعبِ عصمت   کیا تاب نظر جو دیکھے صورت
دیکھا نہ لباس نے بھی عریاں[1]   پتلی میں نظر ہو جیسے پنہاں
رفتار نسیم کو بھی شرمائے   اک موج شراب اٹھ کے رہ جائے
صورت کو شباب نے نکھارا   سیرت کو شعور نے سنوارا

کیسا پاکیزہ اور شعریت سے لبریز بیان ہے۔ بایں ہمہ اس کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشرقی آداب کی جان ہیں۔ شادی سے پہلے ؎

ماں کی جو مثال سامنے تھی   آئینہ ہوئے رسوم ہستی
سیکھی کیا گھر ہے کیا گرہستی   کیا دھرم ہے کیا وفا پرستی
حاصل کیا علم بھی ہنر بھی   دامن میں بھتے پھول بھی گہر بھی

---

[1] فردوسی کے اس شعر سے بھی یہ شعر آگے نکل گیا ؎

منیژہ منم دختِ افراسیاب   برہنہ ندیدہ تنم آفتاب (ع۔م)

شادی کے بعد ؎

ساوتری جب عروس بن کر　　آئی جنگل میں ساس کے گھر
سوچا کہ یہاں تو سب ہیں سادھو　　ظاہر نہ ہو خسروانہ خو بو
دیبا نہیں زرق برق پوشاک　　سج دھج کے خیال سے ہوں پاک
زیور کہ تھا جی دکھانے والا　　چھلا چھلا اتار ڈالا
پوشاک شہانہ بھی اتاری　　پہنی سادہ سپید ساری

شوہر پرستی کا یہ حال ہے کہ ایک مثالی کردار بن گئی ہے۔ موت پر فتح پاتی ہے ــــ اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بناتی ہے۔

صاحب مثنوی نے اس کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے معمولات، رہن سہن، سوچ اور فکر کے طریقے، عبادت و ریاضت، نیک باتیں، غرض کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا ہے جو اس کی سیرت کو تشنہ چھوڑ دے۔ اس کی سیرت میں غضب کی جاذبیت ہے، اور ان تمام باتوں کے باوجود وہ ہم آپ میں سے ہی ایک ہے۔ ایک نیک عصمت مآب، شوہر پرست عورت۔ حالی کے یہاں جو بات اشارہ تھی، جگر صاحب کے یہاں وہ زندہ اور بھرپور تصور بن گئی ہے۔

اردو مثنویوں کو پڑھنے کے بعد قاری پر کیا جذبات طاری ہوتے ہیں۔ اس کی چشمِ تصور میں کس قسم کی تصویریں گھومتی ہیں، ایک دلچسپ بات ہے۔ یہ سب کچھ قاری کی ذہنی صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ اُس وقت جب علم وسیع نہیں تھا۔ ہر حقیقت پر انسان کا تخیل افسانہ بن کر چھایا ہوا تھا، ان مثنویوں میں زبردست کشش تھی۔ اس کی چشمِ تصور میں ایک "بکاؤلی" ایک "پری رام" گھومتے ہوں گے طلسم حقیقت ہوگا۔ ایک لاشعوری آرزو ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہوگی کہ وہ بھی طلسم سیکھے، ایک "بکاؤلی" پر حکومت حاصل کرے۔ لیکن اس عہد میں، قطع نظر خالص ادبی نقطۂ نظر کے، ان مثنویوں کی حیثیت کسی کتب خانے کی زینت سے زیادہ نہیں، اور کیونکہ اس زمانے کے معاشرے سے ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے ان میں تمدنی آثار اور بڑی حد تک غیر شعوری عہدی رجحانات کا ردِ عمل ہے۔ اس طرح یہ اس زمانے کے عمرانی اقدار کی بھی امین ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک چیز ایسی ہے جو آج بھی تیر کی طرح چبھتی ہے، خصوصیت نے پرولتاری دماغوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہے، اور وہ ہے جنسی طغیان جو ان مثنویوں پر فضا بن کر چھایا ہوا ہے۔ صورت کچھ ایسی ہے ؎

جذبِ لطیف، رنگ و بو چھوٹے نہ چھوٹتا ہے کبھی
ربطِ حبیب و آرزو ٹوٹے نہ ٹوٹتا ہے کبھی
جتنا بھلاؤ گے مجھے اتنا ہی یاد آؤں گا میں

ہر چند یہ طغیان صحت مند اور سائنٹیفک طرزِ فکر رکھنے والے دماغوں کے لئے اتنا ہی بے معنی ہے جتنا بھوتوں اور دیوؤں کا وجود۔ لیکن جذبِ لطیف "رنگ و بو" اور "ربطِ حبیب و آرزو" کو کیا کیا جائے۔ آج بھی ایک لمبی چوڑی تعداد شوق، اثر اور نسیم کی جنسی روایات کو دوہراتی نظر آتی ہے۔ متقدمین نے انجان بن کر کہا اور یہ جان بوجھ کر کہتے ہیں۔ فرق بس یہ ہے، وہ ڈھیٹ نہیں تھے یہ ڈھیٹ ہیں، ضدی ہیں۔ ورنہ جنسیات اور نفسیات کے لفظوں سے وہ بھی ناآشنا تھے اور یہ بھی ہیں۔ جنسی ادب کا ایک اہم اور معاشرتی ترقی کے لئے بے حد ضروری موضوع ہے۔ لیکن قلم اٹھانے سے پہلے زبردست رچاؤ، مقصد میں خلوص، کاوش، جنسیات پر علمی قدرت، معاشرتی مشاہدے اور پھر ان سب کی مصوری کی پیغمبرانہ صلاحیت کی ضرورت ہے۔

مثنوی "پیامِ ساوتری" میں ایک روحانی سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ سنسکرت ادب کی بڑی خصوصیت وہ روحانی فضا ہے جو اس پر طاری ساری رہتی ہے۔ مثنوی کا تعلق کیونکہ پرانوں کے عہد سے ہے، اس لئے پوری احتیاط کے ساتھ سست، سکون اور فطرت نگاری سے اس کو سجایا ہے، جگمگایا ہے۔ قاری پر ایک ہی اثر مرتسم ہوتا ہے اور وہ ہے تقدس جس کو ست جگ کی فضا، بنوں کے ماحول اور ویدک روایات نے اچھی طرح اجاگر کر دیا ہے۔ مثنوی میں کوئی دوسرا طغیان نہیں۔ اس میں ایک ایسا تکلم ہے جو جنگلوں کی تنہائی میں سنا جاتا ہے، اور ایسی نغمگی ہے جو تقدس کی طرف مائل کرتی ہے۔

طلسم، تقدیر پرستی، اور تقدیر پرستی طلسم پیدا کرتے ہیں۔ مثنوی "پیامِ ساوتری" کا موضوع انسانی عظمت سے عبارت ہے۔ اس میں موت پر فتح حاصل کی گئی ہے۔ انسان کے تپ اور عمل کو کامیاب بنایا گیا ہے۔ اس لئے فوقِ فطرت اور فوقِ انسان، باتوں کا ادعا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک مرد اور ایک عورت کا قصہ ہے جو ہم اور آپ میں سے ہی تھے۔

ان کی داستان ہماری آپ کی داستان ہے۔

مثنوی میں نادر تشبیہات ہیں، پُراثر اور خوبصورت۔ ان میں بیساختہ پن ہے۔ شعریت ہے تصنع اور خشکی نہیں۔ ساوتری جوانی میں قدم رکھتی ہے ؎

دن رات بڑھی بہ رنگِ امید یا صبح کو جیسے نورِ خورشید

یا طفلی تھی شباب کے اثر میں ملتی تھی چاندنی سحر میں

نسوانی خصوصیات کا اظہار ؎

تھا جانِ وفا حیا کا انداز تھا جسمِ لطیف صورتِ راز

دکھلاتی تھی جسم میں جوانی مینا میں شراب ارغوانی

رفتار نسیم کو بھی شرمائے اک موجِ شراب اُٹھ کے رہ جائے

تتلیوں کو انسانی آرزو سے تشبیہ دی ہے ؎

یہ تتلیاں ہیں کہ آرزوئیں متوالی ہیں شوقِ رنگ و بو میں

ایک برگد کے پیڑ کا پُرمعنی نقشہ ملاحظہ ہو ؎

نیچے برگد کے تھا وہ مسکن سینے میں جیسے قلب روشن

برگد تھا کہ ایک راہبِ پیر یا عظمتِ زندگی کی تصویر

ستیہ وان کے حُسن پر اس طرح روشنی ڈالی ہے ؎

چھوٹی چھوٹی جٹائیں سر کی کرنیں چھٹکی ہوئیں قمر کی!

پیکر میں شباب بس رہا تھا غنچہ کھل کھل کے ہنس رہا تھا

دامانِ شباب میں تھا پیکر یا دھوپ کھلی ہوئی گلستاں پر

اور جب غم کی طرف دماغ راغب ہوتا ہے ؎

اس غم میں لبوں پہ جو ہنسی تھی شمشان میں چاندنی بسی تھی

جھاڑی جھاڑی بلا بنی تھی گویا پرچھائیں موت کی تھی

مثنوی کے آخری اوراق خصوصیت سے بہت خوب ہیں۔ ان سے شاعر کی بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ جم راج جب ستیہ وان کی روح لے کر جاتے ہیں تو ساوتری ان کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ یہ منظر ایک سو تیتالیس[143] اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔ جم راج ستیہ وان کی روح واپس دینے پر آمادہ نہیں ہیں قطع نظر دوسری باتوں کے انھیں ایک احساس یہ بھی ہے کہ کہیں ایک عورت اُن پر فتح نہ پالے، ساوتری پیچھا نہیں چھوڑتی، کافی بحث و تمحیص کے بعد شوہر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

اشعار میں مثنوی کے فلسفے کا نچوڑ ہے ہستی و عدم کی روح ہے، اور شاعر کی فنی کامیابی کا آدرش ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بھاگ دوڑ کا منظر ہے۔ الفاظ کا وزن اور تشبیہات کی موزونیت سے مختلف مراحل کتنی عمدگی سے طے کئے گئے ہیں ؎

پیچھے پیچھے لپک چلی وہ سائے کی طرح سرک چلی وہ

پیچھے نہ مگر ذرا ہٹی وہ ہمزاد کی طرح ساتھ تھی وہ

ساوتری پھر بھی ہم عناں تھی آندھی کی طرح رواں دواں تھی

اک آہوئے بادپا ہوئی وہ صرصر یہ ہوئے، ہوا ہوئی وہ

یہ کہہ کے اڑے وہ صورتِ تیر بجلی سی لپک چلی وہ دلگیر

مثنوی کا تعلق کیوں کہ قدیم ہندو دیو مالا سے ہے، اس لئے یہ ضروری تھا کہ لب و لہجہ خالص ہندی یا ہندوی ہو۔ چنانچہ ہندی الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ شاعر نے بڑی خوبی سے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اور وہ فضا اور لہجہ قائم کر دیا ہے جس کو مثنوی کی شدید ضرورت تھی۔ ہندی الفاظ بحر کی قید میں پھنسنے کے بعد ترش گئے ہیں، اُن میں چمک بڑھ گئی ہے ؎

جنگل میں اشوپت جب آئے کچھ بھیل کھرا اور کانس لائے

راجا کے لئے کٹی بنائی پھلواری ہری ہری لگائی

سائے میں بچھا کے مرگ چھالا کفنی پہن اور لے کے مالا

راجا دھونی رما کے بیٹھے خالق سے لگن لگا کے بیٹھے

وہ خالقِ دہر و عالم آرا وہ جوہرِ کائنات برہما

باشان و شکوہ سطوت افزا تھا برہم پوری میں جلوہ فرما

تھا وقت عجب، عجب سماں تھا سامان سرورِ قلب و جاں تھا

کنر گندھرو، اپسرائیں گاتے تھے وید کی رچائیں

سارنگی، ستار اور مردنگ بینا، طنبورہ، بانسری، چنگ

سب ساز ملے ہوئے تھے باہم توحید کی بج رہی تھی سرگم

جگر صاحب حضرت عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اس طرح ان کا دبستانِ لکھنؤ سے معنوی تعلق ہے۔ علامہ عزیز کے یہاں نکھار ہے، طہارت ہے، محبوب گردی نہیں ہے۔ یہی حال جگر صاحب کا ہے۔ وہ بہت ڈوب کر کہتے ہیں۔ پاکیزگی کو مقدم سمجھتے ہیں — اپنے موضوع، مقصد اور پھر اس کے اظہار کے لحاظ سے مثنوی "پیام ساوتری" اردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہے۔

نظیر اکبر آبادی

لیلیٰ ہی اس کے ہوش سے واقف تھی ورنہ یاں اکثر یہ جانتے ہیں کہ مجنوں دِوانہ تھا

بدھ کی کانسی کی

بُدھ — سمادھی میں

بُدھ کی مورتی - پانچویں صدی عیسوی

بُدھ کا انتقال - دسویں صدی عیسوی کی سنگ تراشی

سانچی کے د

بُدھ ستوّا - دسویں صدی عیسوی

مہاتما بُدھ - کُشان یگ

صدی عیسوی)

مہاتما بُدھ - اُپدیش دیتے ہُوئے

بالائی حصّہ
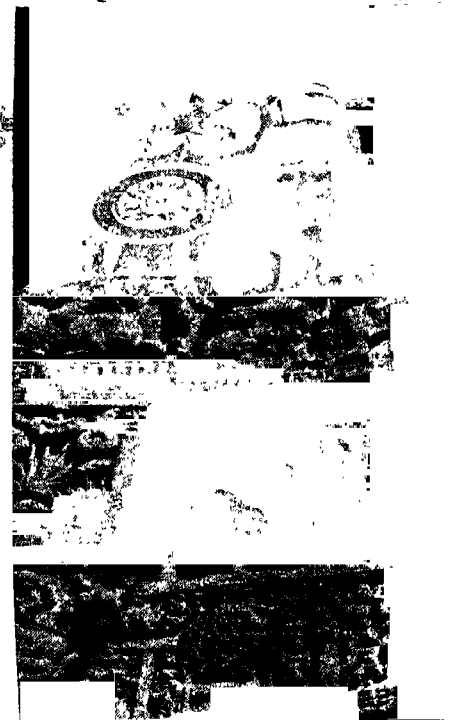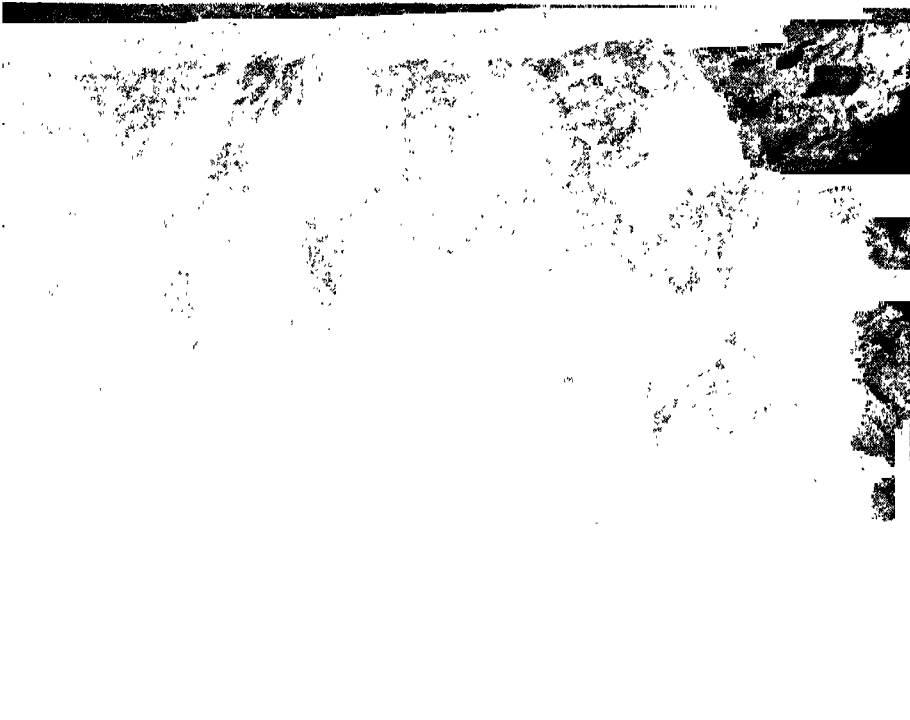
آچاریہ نرندر دیو

شری جی، وی ماولنکر
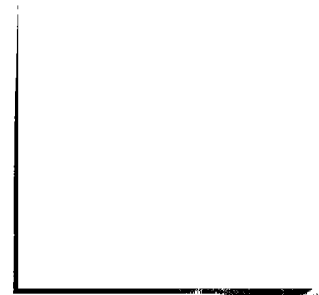
ڈاکٹر میگھ ناد ساہا

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے　　　پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے
(میر)

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی
میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

مخمور دہلوی

یگانہ چنگیزی

خیر مقدم

بہ تقریب ورودِ مسعودِ اعلیٰحضرت شہنشاہِ ایران در کشورِ ہندستان

سیّد محی الدّین قادری زورؔ

ستمِ دوست بجا ہست امروز شاید از ما کہ خطا ہست امروز

تو چہ دانی کہ چہ باشد فردا آنچہ نقشِ کفِ پا ہست امروز

ایں مپندار کہ خالی ز خطر راہِ اربابِ وفا ہست امروز

حافظ و سعدی ہمی یاد آیند شاہِ ایراں کہ بہ ما ہست امروز

ساقیا بزمِ رباب و چنگ است مے و پیمانہ کجا ہست امروز

بادہ عہدِ جہانگیر بیار محفلِ شاہِ رضا ہست امروز

شجرِ رشتۂ دیرینہ را موسمِ نشو و نما ہست امروز

بہرِ خوش وقتیٔ ہند و ایراں ہر کجا دستِ دعا ہست امروز

فیضِ مہمانِ عزیز است اے زورؔ فکرِ شاعر کہ رسا ہست امروز

تلوک چند محرومؔ

شاہِ ایراں جانبِ ہندوستاں آید ہمی میہماں عزّت فزائے میزباں آید ہمی

گل فشاں موجِ بہاراں ست ایں دورِ سنت واندریں دیگر بہارِ گل فشاں آید ہمی

مژدہ آدہلی کہ با امواجِ نکہت صف بہ صف در چمن ہا بیت نسیمِ اصفہاں آید ہمی

کامراں باشد وزیرِ اعظمِ ہندوستاں فالِ نیک است اینکہ شاہِ کامراں آید ہمی

ہند و ایراں امن جویانند بہرِ عالمی گفتگوئے امنِ عالم درمیاں آید ہمی

آنکہ می نازد بر علم و ادب عزم و عمل آنکہ باشد صاحبِ بختِ جواں آید ہمی

نازِ فرماۓ آسماں بختِ بلندِ ما رسید بر زمینِ ما ثریا شادماں آید ہمی

در زبانِ ما دری بر مقدمِ مسعودِ شاہ ہر زماں ایں شعر ما بر زباں آید ہمی

شاہ ماہِ جلوہ ساماں است و ہند آسماں ست جلوہ ریزاں ماہ سوئے آسماں آید ہمی !

ہنس راج رہبر

رُوح کا رِشتہ

کردار

سریندر موہن ۔ ایک ادیب ۔ عمر تیس کے لگ بھگ
پیران ناتھ ۔ سریندر موہن کا دوست عمر پچیس کے قریب
ریکھا ۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی، عمر اکیس بائیس قد ٹھگنا
[illegible] ۔ ایک اور پڑھی لکھی لڑکی ۔ عمر بائیس تیئیس ۔ قد لمبا

پہلا منظر

زمانہ ۱۹۵۶ء وقت بعد دوپہر

(سریندر کا گھر ۔ ایک عام کمرہ ۔ نہ بہت بڑا اور نہ چھوٹا ۔ دائیں بائیں دو دروازے ۔ معمولی مختصر سامان ۔ دو کرسیاں، ایک مونڈھا، ایک تپائی اور ایک میز ۔ میز پر کچھ کتابیں اور ایک دو رسالے پڑے ہیں ۔ سامنے کی دیوار پر دائیں طرف ایک الماری ہے اور اس کے قریب ہی دیوار پر تاریخیں بدلنے والا کیلنڈر ہے ۔ بائیں طرف کانس ہے جس پر کنگھا شیشہ اور ٹائم پیس وغیرہ کے علاوہ دو فریم شدہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک ٹیگور کا اور دوسرا سریندر کا ہے ۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو سریندر موہن بلند آواز سے خط پڑھ رہا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے)

سریندر موہن (خود پڑھتا ہے) تمہارا خط پڑھ کر دل خوشی سے بھر گیا ۔ اس میں جانے ایسا کون سا جادو تھا کہ ہر لفظ آپ ہی آپ دل پر نقش ہو گیا ۔
(بولتا ہے) واہ پیاری واہ! خوش کر دیا ۔ خوب کہی ۔ ہر لفظ دل پر نقش ہو جاتا ہے ۔ ہا ہا ہا! اچھا آگے کیا لکھا ہے؟
(پڑھتا ہے) مجھے اب اس بات کا احساس ہو گیا ہے ۔ وہ جادو اصل میں تمہاری شخصیت کا جادو ہے جو تمہاری تحریر کو اتنا سندر بنا دیتا ہے
. . . . . .

(بولتا ہے) شخصیت کا جادو (ہنستا ہے) شخصیت کا جادو تحریر کو سندر بنا دیتا ہے ۔ عورت جب مرد کو سمجھنا چاہتی ہے تو سچ مچ کمال کر دیتی ہے (ذرا توقف سے) لیکن پیاری ایک بات اور بھی ہے جس نے سونے پر سہاگہ کر دیا ہے ۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جب سے تم نے مجھے عشق اور محبت کی دولت سے مالا مال کیا ہے ۔ میری شخصیت اور میری تحریر اور بھی نکھر آئی ہے ۔ عشق کا جادو سب جادوؤں کو مات کر دیتا ہے ۔ پیاری میں سچ کہتا ہوں کہ تمہاری یاد آتے ہی میرے تصور میں ہزاروں جنتیں جگمگا اٹھتی ہیں اور ہر گھڑی یوں محسوس کرتا ہوں ؎

تم میرے پاس ہوتی ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
بس یوں سمجھ لو کہ اب تمہارے ہی نام سے زندہ ہوں

(پیران ناتھ داخل ہوتا ہے سریندر اسے نہیں دیکھتا)

پیران ناتھ ۔ کیوں جناب، یہ آپ ہی آپ کیا بڑبڑا رہے ہو؟

سریندر ۔ آیئے مسٹر پیران پیران ناتھ جی تشریف رکھیئے ۔ (کرسی اس کی طرف سرکاتا ہے) سنایئے کیا حال ہے؟

پیران ناتھ ۔ میرا حال تو ٹھیک ہے اس کی فکر نہ کرو ۔ تم سناؤ تمہارا اپنا کیا حال ہے

سریندر ۔ ہمارا حال بھی ٹھیک ہے، سوا آپ نے ٹھیک ۔

پیران ناتھ ۔ پھر تم یہ آپ ہی آپ کیا بڑبڑا رہے تھے؟ کس کے نام سے زندہ ہو رہے تھے

سریندر ۔ (مسکراتے ہوئے) پران ناتھ جی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سننے اور سنانے کے بجائے دیکھنے اور دکھانے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

پیران ناتھ ۔ تو گویا یہ کسی ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی

سریندر ۔ بہت ہی خوبصورت، دلچسپ اور دل کش ڈرامے کی ۔

پیران ۔ جو تمہیں بہت جلد دیکھنا نصیب ہو گا!

سریندر۔ صرف ڈرامہ ہی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا ساتھ ہی مٹھائی بھی کھانے کو ملے گی۔

پران۔ آج تو خوب چہک رہے ہو اور نشے میں معلوم ہوتے ہو

سریندر۔ نشہ! (ہنستا ہے) میرے دوست تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ یہ عشق بھی تو ایک نشہ ہے! ایک ایسا نشہ جو بہت دیرپا اور مسرور کن ہوتا ہے۔

پران۔ گویا تم جو ڈرامہ ہمیں دکھانے جا رہے ہو وہ عشق و محبت کا ڈرامہ ہے؟

سریندر۔ اس میں کیا شک ہے (ذرا توقف سے) اور تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تمہارا دوست شری مان سریندر موہن حسن و عشق کے اس ڈرامے کا ہیرو ہوگا۔

پران۔ اور ہیروئن؟

سریندر۔ وہی جس کے نام سے ہم زندہ ہیں۔

(پران کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستا ہے)

پران۔ وہ نام جس سے تم زندہ ہو اگر ہمیں بھی معلوم ہو جائے تو کوئی حرج ہے؟

سریندر۔ حرج (ہنستا ہے) حرج بالکل نہیں۔

پران۔ پھر بتاؤ۔

سریندر۔ مگر تم اتنی جلدی کیوں کرتے ہو۔ کیا تم اس وقت کا انتظار نہیں کر سکتے جب تمہارا دوست سریندر موہن سہرا باندھ کر دولہا بنے گا۔ تم مبارک باد دینے آؤ گے۔ برات میں ساتھ چلو گے۔ پھر تم وہ نام بھی جان جاؤ گے اور نام والے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو گے۔

پران۔ یہ شیخ چلی کی باتیں چھوڑو۔ تم نے کئی بار سہرے باندھے۔ ہم نے کئی بار مبارک باد بھی اور برات چڑھی۔ اب تو یہ عالم ہے کہ تمہیں دیکھ کر پنجابی کی ایک کہاوت یاد آتی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ دن کبھی نہیں آئے گا جب کبڑے کو گھوڑی چڑھنا نصیب ہوگا۔

سریندر۔ لیکن اب دنیا کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا دوست سریندر موہن کبڑا نہیں ہے۔ وہ ایک بلند شخصیت کا مالک ہے۔ ملک کا مشہور اور نامور ادیب ہے

پران۔ اور ایک شاندار ایکٹر بھی ہے جو جلد ہی حسن اور عشق کے ڈرامے کا ہیرو بنے گا

سریندر۔ ہیرو بن چکا ہے۔ ڈرامہ بہت دنوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ بس آج آخری سین اور ہوگا جس میں تمہارا دوست سریندر موہن گھوڑی چڑھے گا اور تم حیران ہو کر دیکھو گے۔

پران۔ تو یہ ریہرسل آخری سین کا ہو رہا تھا۔

سریندر۔ ہاں بالکل آخری۔

پران۔ اس کا مطلب ہے کہ تم ہمیں پورا ڈرامہ نہیں اس کا صرف آخری سین دکھاؤ گے۔

سریندر۔ میں نے اس کا باقی سین دوستوں سے پوشیدہ رکھے ہیں اور اس طرح پوشیدہ رکھے ہیں کہ انہیں صرف آخری سین میں پورے ڈرامے کا لطف آ جائے۔

پران۔ لیکن کل آنند سے ملاقات ہوئی تھی . . .

سریندر۔ آنند تمہیں کہاں ملا؟ وہ تو ترنتارن گیا ہوا ہے۔

پران۔ میں بھی تو ایک ہفتے سے ترن تارن گیا ہوا تھا۔ رات ہی تو لوٹا ہوں۔

سریندر۔ تو وہاں تمہاری آنند سے ملاقات ہوئی؟

پران۔ ہاں یونہی، اتفاق سے بازار میں مل گیا اور اس نے کہا . . .

سریندر۔ کیا کہا؟ تم نے کچھ میرا ذکر چھیڑا ہوگا

پران۔ نہیں۔ میں نے تو کوئی ذکر نہیں چھیڑا وہ خود ہی کہنے لگا کہ سریندر سے ملاقات ہو تو اسے مبارک باد دینا۔ اب اس کی شادی جلد ہونے والی ہے۔

سریندر۔ (جھنجھلا کر) وہ بھی عجیب آدمی ہے۔ ہزار بار سمجھایا کہ ابھی کسی سے مت کہنا۔

پران۔ اور آج امرت سے ملاقات ہوئی تو اس نے سب سے پہلے یہی خوش خبری سنائی۔

سریندر۔ خیر امرت کی تو اور بات ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس سے تو کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ شادی کا انتظام وہی کرے گا۔

پران۔ اور مہندر سے؟

سریندر۔ کیا مہندر ملا تھا؟

پران۔ نہیں۔

سریندر۔ پھر تم کیسے کہہ رہے ہو کہ اسے بھی شادی کی بات معلوم ہے؟

پران۔ (ہنستا ہے) میرے پیارے دوست شری مان سریندر موہن جی! میں تمہیں جو جانتا ہوں اس لئے اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میری امرت سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔

سریندر۔ ملاقات نہیں ہوئی؟

پیران۔ نہیں (ذرا توقف سے) اور پھر آننہ نے بھی تمہارا اور تمہاری شادی
کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

سریندر۔ سچ ؟

پیران۔ بالکل سچ۔ جھوٹ تو ہم نے کبھی بولا ہی نہیں

سریندر۔ اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے مفت میں بنا رہے تھے۔

پیران۔ واہ! یہ بنانے کی بھی خوب رہی۔ میرے پیارے دوست شریمان سریندر
جی کسی کو بنانے کی کیا ضرورت ہے، جب تم خود بن رہے ہو (ہنستا ہے)
میرا مطلب ہے کہ تم دولھا بن رہے ہو۔

(دونوں ہنستے ہیں)

ایک لڑکی۔ (باہر سے) کیا میں اندر آ سکتی ہوں ؟

سریندر۔ بڑے شوق سے (جلدی جلدی اٹھتا ہے اور کرسی ایک طرف لڑھک
جاتی ہے)

لڑکی۔ نمستے

پیران۔ نمستے۔

سریندر۔ (کرسی ٹھیک کرتے ہوئے) آپ ہیں میرے دوست شریمان پیران ناتھ
ایک مشہور اور نامور آرٹسٹ

پیران۔ اور آپ ؟

سریندر۔ آپ ہیں کماری ریکھا اور.....

پیران۔ اچھا سمجھ گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔ میری مبارک باد قبول کیجئے۔

(پیران ناتھ جاتا ہے)

سریندر۔ بیٹھئے۔

لڑکی۔ آپ بھی بیٹھئے۔ کیا آپ۔ ہاں ہاں تم نے اپنے دوستوں سے شادی کا
چرچا شروع کر دیا ہے

سریندر۔ نہیں تو

لڑکی۔ پھر یہ مبارک باد کس بات کی دے رہے تھے۔

سریندر۔ اوہ یہ بات ہے۔ (ذرا توقف سے) انھوں نے میری وہ نئی کہانی
پڑھی ہے جو منزل میں شائع ہوئی ہے۔ کہانی انھیں پسند ہے۔ کہہ رہے
تھے کہ بالکل نیا تکنیک ہے آرٹ کے اعتبار سے بھی بے جوڑ ہے۔ اور
(قدرے شرماکر اور مسکرا کر) کہہ رہے تھے کہ اس پر میری شخصیت
کی چھاپ ہے۔

ریکھا۔ کہانی واقعی اچھی ہے۔ مجھے بھی بہت پسند ہے۔ میں نے اسے چار پانچ بار
پڑھا۔ جب اکیلی ہوتی ہوں تبھی پڑھنے لگتی ہوں۔ جب پڑھتی ہوں
تمہاری شخصیت آنکھوں کے سامنے ابھر آتی ہے۔ اور....

سریندر۔ اور وہ تصویر میری اس ظاہری تصویر سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے

(دونوں ہنستے ہیں)

یہ بھی ٹھیک ہے ریکھا ؟ تم یہی کہنا چاہتی تھیں نا ؟ دیکھا کیسی رہی۔
تمہارے منہ کی بات چھین لی۔

ریکھا۔ آپ کہانی کار جو ٹھہرے۔ دوسروں کے دل کی بات سمجھنے والے۔

(پھر دونوں ہنستے ہیں)

سریندر۔ دراصل کہانی یا نظم پڑھتے وقت ادیب اور شاعر کی جو تصویر ذہن میں
بنتی ہے وہ اس کی روح کی اور شخصیت کی تصویر ہوتی ہے جو اس کی
ظاہری اور مادی تصویر سے.....

ریکھا۔ کہیں زیادہ خوبصورت ہوتی ہے، دل کو لبھاتی ہے

(دونوں ہنستے ہیں)

ریکھا۔ دیکھا، میں نے تمہارے من کی بات بوجھ لی۔

سریندر۔ اور پیاری اس بات کی داد دو کہ میں نے بھی اس لڑکی کو منتخب کیا ہے
جو میرے من کی بات بوجھ سکتی ہے، جو میری شریک حیات بن سکتی
ہے۔ پیاری سچ کہتا ہوں کہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا اس وقت
سمجھ گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی۔

ریکھا۔ اور مجھے بھی ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو اونچی شخصیت کا مالک ہو
جس نے سماج کے پرانے بندھنوں کو توڑ دیا ہو۔ جو عورت کے من کو
سمجھتا ہو اور اپنی ہونے والی بیوی کو داسی نہیں زندگی کا ساتھی بنانا
چاہتا ہو۔

سریندر۔ نئے ہندوستان میں اب ایک نئے سماج کی تعمیر ہوگی۔ اس میں مرد اور
عورت کے رشتے بھی نئے ہوں گے۔ پرانے اور دقیانوسی طریقے ترک
کر دئے جائیں گے۔ نئے ہندوستان اور نئے سماج کی تعمیر کے لئے
بلند خیال اور بلند شخصیت کے مرد اور عورتوں کی ضرورت ہے۔

ریکھا۔ مجھے جب تمہارا پہلا خط ملا تو میں سمجھی کہ یہ بلند خیال اور بلند شخصیت

سب عورت کو پھسلانے اور بہلانے کی باتیں ہیں۔ مرد اپنے مطلب کے لئے
ایسی باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔

سریندر۔ تو گویا تمھیں میرے پہلے خط کا یقین نہیں آتا اور اسی لئے تم نے میرے
پہلے خط کا جواب نہیں دیا (ہنستا ہے) اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

ریکھا۔ پھر تمھارا دوسرا خط اور پھر تیسرا خط ملا۔ تب میں سمجھی کہ یہ باتیں صرف
لکھنے کے لئے نہیں لکھی گئیں سچے دل سے نکلی ہیں اور میں نے اسی وقت
آپ سے . . . نہیں نہیں تم سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

سریندر۔ بیاہ سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا آپس میں ملنا بہت ضروری ہے ظاہری
شکل صورت اور رنگ روپ معمولی باتیں ہیں۔ اصل بات شخصیت ہے۔
اور شخصیت کا اندازہ آپس کے میل جول ہی سے ہو سکتا ہے۔ اب ہم نے
ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ لیا ہے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ
لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم دونوں کی آیندہ زندگی نہایت خوشگوار
ہوگی اور ہمارا بیاہ نئے سماج کے لئے ایک مثال قائم کرے گا۔

ریکھا۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو خوب سمجھ لیا ہے اور ہمارا
بیاہ اب جلد ہو جانا چاہیئے۔

سریندر۔ (جوشِ مسرت سے) نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں تو ایک مدت سے تمھارے
منہ سے یہ بات سننے کے لئے بے قرار ہوں۔ بتاؤ تو وہ مبارک دن کب
آئے گا۔ آج اور اسی وقت طے کر لو (ذرا توقف سے) پیاری چپ کیوں
ہو گئیں، کیا تمھیں کسی سے مشورہ لینا ہے، کسی سے کچھ پوچھنا ہے؟

ریکھا۔ نہیں مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔ میں اپنی مرضی کی آپ مالک ہوں۔

سریندر۔ میں جانتا ہوں کہ جو لڑکی سخت محنت کرتی ہے اور اپنی روزی آپ کماتی
ہے وہ کسی کے مشورے کی محتاج نہیں۔ وہ اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ
کرنے میں آزاد اور خود مختار ہے۔

ریکھا۔ میں نے تمھیں اپنی مرضی سے پسند کیا ہے میں تمھارے خیالات کی قدر
کرتی ہوں اور تمھاری شخصیت کی پجارن ہوں۔ میں خود چاہتی ہوں
کہ بیاہ جلد ہو جائے۔

سریندر۔ پھر پیاری آؤ، ہم تاریخ کا فیصلہ کر لیں۔ آخر جھجک کس بات کی ہے؟

ریکھا۔ کوئی جھجک نہیں۔ میں چپ اس لئے تھی کہ دل ہی دل میں تمھاری خوشی
کا اندازہ لگا رہی تھی۔

(سریندر ہنستا ہے۔ ریکھا بھی ہنستی ہے)

ریکھا۔ تمھیں یہ جان کر اور بھی خوشی ہوگی کہ میں نے دفتر سے ایک مہینے کی
چھٹی لے لی ہے۔ کل گاؤں چلی جاؤں گی اور ایک مہینہ بے فکر ہو کر، لوگوں
دفتر کے جھنجھٹوں اور جھمیلوں سے دور رہ کر اپنے آپ کو نئے جیون
کے لئے تیار کروں گی۔

سریندر۔ واہ کیا اچھوتا خیال ہے۔ گاؤں کی کھلی فضا میں تمھارا یہ حسن اور بھی
نکھر آئے گا۔ یہ حسین کلی جو اب بند بند سی رہتی ہے ایک دم کھل جائے گی

ریکھا۔ گاؤں سے نئے ارمان اور نئے ولولے لے کر لوٹوں گی اور لوٹتے ہی پہلا
کام . . . . .

سریندر۔ ہم دونوں کا بیاہ ہوگا۔ (دونوں ہنستے ہیں) بیاہ کتنا خوشگوار
لفظ ہے۔ اور پھر ہم دونوں کا بیاہ دو آزاد روحوں کا، دو دھڑکتے
دلوں کا ملاپ ہوگا۔ یہ ملاپ ایک مہینہ بعد ہوگا۔ ایک مہینہ!

ریکھا۔ جب دلوں میں پریم ہو تو ایک مہینہ آنکھ جھپکنے میں گزر جاتا ہے۔

سریندر۔ پیاری۔ ایک مہینہ کیا میں برسوں اور صدیوں تمھارا انتظار کر سکتا ہوں

ریکھا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ پہلے بھی تو اتنی مدت سے انتظار کر رہے تھے۔

سریندر۔ یہ تم نے ٹھیک کہا۔ تلاش کرنا بھی تو انتظار کرنا ہی ہوتا ہے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

سریندر۔ اچھا تو اب تم جا رہی ہو۔ اس دوران میں خط تو برابر لکھوگی؟

ریکھا۔ وعدہ نہیں کرتی۔ کوشش کروں گی۔ کیونکہ گاؤں میں . . . . . .

(دروازے کی طرف آگے بڑھ جاتی ہے)

سریندر۔ ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ اچھا بائی بائی

(دوسرا منظر)

(وہی سریندر کا کمرہ۔ میز اور کرسیاں پہلے دائیں کونے میں لگی ہوئی تھیں
اب بائیں کونے میں لگی ہوئی ہیں۔ کلینڈر میں تاریخ دس پندرہ دن
آگے بڑھ گئی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو سریندر اور سروج آپس
میں باتیں کر رہے ہیں)

سریندر۔ مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

سروج۔ ضرور دیکھا ہوگا۔

سریندر۔ ممکن ہے تم نے دیکھا ہو۔ ویسے بھی خیال آتا ہے۔ کیونکہ جو آدمی ہمیں اچھا لگے۔ میرا مطلب ہے کہ بہت اچھا لگے اس کے متعلق خواہ مخواہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہم نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے جیسے وہ ہمیشہ ہی سے ہماری زندگی کا مقصد رہا ہو۔

سروج۔ یہ تو آپ مجھے بنا رہے ہیں۔

سریندر۔ نہیں سروج! میں سچ کہتا ہوں۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو، بہت اچھی — اتنی اچھی کہ تمہارے بنا میری زندگی ادھوری تھی۔ میں اپنی شخصیت میں کمی سی محسوس کرتا تھا۔ تم نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے ملانے والے پروفیسر دیوراج کو میرا بال بال دعائیں دیتا ہے۔

سروج۔ پروفیسر دیوراج بڑے اچھے آدمی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔

سریندر۔ سروج، مجھے آپ نہیں تم کہو۔ میں تمہارے منہ سے "تم" سننا چاہتا ہوں۔

سروج۔ لیکن آپ اتنے بڑے لکھک ہیں۔ دیس بھر میں مشہور ہیں۔ ہر کوئی آپ کا نام لیتا ہے ہر جگہ آپ کا چرچا ہے۔ میں آپ کو . . . .

سریندر۔ یہ سچ ہے کہ سریندر موہن دنیا کی نظر میں ایک مشہور اور نامور ادیب ہے۔ مگر اس نے تمہیں اپنے دل کی رانی بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تم بھی اسے اپنے دل کا راجا بناؤ۔ یہ آپ سے نہیں تم ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ہو پیاری جیسے میں "تم" کہتا ہوں۔ تم بھی مجھے "تم" کہو۔

سروج۔ لیکن آپ کی بلند شخصیت . . . . .

سریندر۔ یقین جانو کہ "تم" کہنے سے بلند شخصیت اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بار ہا مل چکے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ آپ میں جو ایک طرح کا بیگانہ پن ہے ایک دوری کا احساس ہے وہ اب مٹ جانا چاہیئے۔

سروج۔ تم اگر سچ مچ ایسا سمجھتے ہو تو پھر "تم" ہی سہی

سریندر۔ واہ، تم! تم!! تم!!! خوش کر دیا (ہنستا ہے)

سروج۔ آپ . . . . نہیں نہیں تم ابھی اولے ہنستے ہو کہ مجھے تم سے ملتے ہوئے شروع میں جو ایک طرح کا ڈر، ایک جھجک محسوس ہوئی وہ اب بالکل دور ہو گئی۔

سریندر۔ دو دھڑکتے ہوئے دل جب آپس میں مل جاتے ہیں تو ڈر اور جھجک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

سروج۔ اب تو بلکہ (قدرے توقف سے) جب میں تم سے دور ہوتی ہوں تو مجھے اپنا گھر سونا اور ویران دکھائی دیتا ہے۔ ہر طرف سائیں سائیں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور دیواریں بھائیں بھائیں کرتی ہیں۔

سریندر۔ یہ بھی تو کمال ہے کہ تم اتنے بڑے شہر میں اکیلی ایک دم اکیلی رہتی ہو۔ مرد تو اکیلے رہ لیتے ہیں مگر عورتیں بھی اکیلی رہ سکتی ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین نہ تھا۔ ہمارا یہ سماج بہت پچھڑا ہوا ہے۔ عورت کی آزادی اور خود مختاری پر ہر طرف سے حملے ہوتے ہیں۔ آوازے کسے جاتے ہیں۔

سروج۔ پہلے جب آپ سے . . . نہیں نہیں تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ تنہائی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب تو گھر کاٹنے کو آتا ہے

سریندر۔ سروج۔ سچی محبت کی یہی پہچان ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ تنہائی اب مجھے بھی کھٹکنے لگی ہے۔

سروج۔ لوگوں کو کہتے سنا تھا اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ تنہائی بھی ایک روگ ہے

سریندر۔ کچھ روگ جسم کے ہوتے ہیں اور کچھ روح کے ہوتے ہیں۔ جسم کا روگ کیسا بھی بھیانک ہو، برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن روح کا روگ ایک دم ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ تنہائی بھی روح کا روگ ہے۔

سروج۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں اس روگ کا علاج سوچیں۔

سریندر۔ علاج بہت آسان ہے (ہنستا ہے) اور میرا خیال ہے کہ تم نے بات کہنے سے پہلے ہی علاج سوچ لیا ہے، لیکن جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں۔ ہم ابھی کچھ دن ایک دوسرے سے ملیں جلیں، ایک دوسرے کے اور قریب آئیں اور ایک دوسرے کے خیالات اور شخصیت کو سمجھیں۔

سروج — لیکن تھوڑی دیر پہلے تمہیں نے کہا تھا کہ ہمیں آپس میں ملتے ہوئے اب کافی دن ہو گئے، ہم اب ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں، ایک دوسرے کو کافی سمجھ لیا ہے اور ہم میں دوری کا جو احساس ہے وہ اب مٹ جانا چاہیئے۔

سریندر۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن پیاری بیاہ کے معاملے میں میں جلد بازی کا قائل نہیں ہوں۔ کیونکہ بیاہ دو جسموں کا نہیں دو روحوں کا ملاپ ہے۔

ہمارا یک بیاہ سے پہلے لڑکے لڑکی کو آپس میں ملنے کا، ایک دوسرے کی
شخصیت کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیا جائے۔ تبھی بیاہ بیاہ ہوں گے
اور زندگی خوش گوار رہے گی۔

سروج۔ یہی بلند خیالی تمہاری بلند شخصیت کا ثبوت ہے۔ اسی لئے پروفیسر دیوراج
آپ کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ یہی خیال تمہاری کہانیوں میں موتیوں کی
طرح بکھرے پڑے ہیں۔ میں سچ کہتی ہوں کہ آپ کی — نہیں نہیں
تمہاری کہانیاں پڑھ کر مجھے نشہ سا ہونے لگتا ہے۔

سریندر۔ میری کہانیوں سے نشہ سا ہونے لگتا ہے۔ میں بڑا خوش ہوں اور تمہارا
بے حد ممنون ہوں۔ میں کہانی ہمیشہ محنت سے لکھتا ہوں اور اس میں
اپنی روح کو منتقل کر دیتا ہوں۔

سروج۔ میں نے ان ملاقاتوں سے کہیں زیادہ تمہاری کہانیوں سے تمہیں سمجھا ہے
جب بھی میں تمہاری کوئی کہانی پڑھتی تھی تم سے ملنے کا ارادہ کرتی تھی۔
پھر جب پروفیسر دیوراج نے تمہاری تعریف کی اور تمہارا پتہ بتایا تو میں ملنے
کے لئے بے چین ہو اٹھی اور سچ کہتی ہوں کہ میں نے اپنے من میں تمہارا
جو روپ سوچا تھا تمہیں تو ٹھیک اس کے مطابق پایا۔

سریندر۔ کہانی کا روپ ہی لیکھک کا سچا روپ ہوتا ہے۔

سروج۔ میں نے تو تمہیں خوب سمجھ لیا ہے۔ ملنے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا (آزمائش
لہجے میں) تم نے مجھے ابھی نہ سمجھا ہو یا پسند نہ کیا ہو تو دوسری بات ہے۔

سریندر۔ نہیں نہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے سروج۔ سچ سچ جب میں تمہیں دیکھتا
ہوں تو یہی خیال آتا ہے کہ جس لڑکی کی مجھے مدت سے تلاش تھی وہ اب
اچانک مل گئی ہے۔

سروج۔ پھر یہ ملنے ملانے اور سمجھنے سمجھانے کی باتیں کیوں کہتے ہو۔ میں جس طرح
صاف کہتی ہوں کہ مجھ سے اب یہ تنہائی کا روگ سہا نہیں جاتا۔ اس
طرح . . . . .

سریندر۔ اچھا اچھا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری خوشی میری
خوشی اور میری خوشی تمہاری خوشی ہے۔

سروج۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے بھی مجھے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

سریندر۔ ہاں پیاری سمجھ لیا ہے اور خوب سمجھ لیا ہے۔

سروج۔ اگر یہ سچ ہے تو میں چاہتی ہوں کہ ہم اگلے مہینے کی دس تاریخ سے
ایک شریا ور ایک پران ہو کر ایک ہی گھر میں رہنا شروع کر دیں۔

سریندر۔ (جوش کو دباتے ہوئے) اگلے مہینے!

سروج۔ اگلے مہینے اور دس تاریخ کو

سریندر۔ تو گویا تم جیوتشی سے تاریخ پوچھ آئی تھیں (ہنستا ہے)

سروج۔ پریم خود ہی سب سے بڑا جیوتشی ہے۔ بات پکی رہی نا؟

سریندر۔ جیسی سرکار کی مرضی

سروج۔ تو پھر آپ — نہیں نہیں۔ میں بھی کیا بھول کر جاتی ہوں۔ میں پرسوں
پانچ بجے پھر آؤں گی اور ہم دس تاریخ کا پروگرام بنائیں گے۔

سریندر۔ کیا کچھ لمبی چوڑی تیاری کا ارادہ ہے؟

سروج۔ بس یہی کہ دعوت کیسی ہو، کون کون سا سامان خریدا جائے اور
تمہارے اور میرے دوستوں میں سے کس کس کو بلایا جائے۔

سریندر۔ بہت خوب، ہم تم بیاہ کا پروگرام بنائیں گے اور ہمارا بیاہ تو ایک
آدرش بیاہ ہوگا۔

سروج۔ تو پرسوں پانچ بجے تم میرا انتظار کروگے؟

سریندر۔ ضرور۔

سروج۔ اچھا نمستے

سریندر۔ نمستے۔

(سروج چلی جاتی ہے اور پران داخل ہوتا ہے)

پران۔ یہ شریمتی کون تھیں

سریندر۔ تم خود ہی بتاؤ۔

پران۔ پہیلیاں مت بجھواؤ۔ صاف صاف بات کرو۔

سریندر۔ تو پھر شریان پران ناتھ جی صاف صاف سنئے۔ یہ شریمتی جی جنہیں
آپ نے ابھی جاتے ہوئے دیکھا ہے آپ کے دوست شریان سریندر موہن
کی ہونے والی دھرم پتنی ہے۔

پران۔ دھرم پتنی!

سریندر۔ ہاں ہاں دھرم پتنی۔ اس میں چونکنے کی کوئی بات ہے۔ ہماری دھرم پتنی
اور تمہاری بھابی۔

پران۔ اور دیکھا؟

سریندر۔ دیکھا دیکھی کی باتیں چھوڑو۔ وہ اس قابل کہاں کہ ہندوستان کے

بلند پایہ ادیب سریندر موہن کی۔ ۔ ۔ ۔

پیارن۔ یوں اس وقت تو بڑے ڈھول پیٹ رہے تھے کہ وہ جلد بہت جلد ہماری بھابی اور تمھاری دھرم پتنی بننے والی ہے۔

سریندر۔ لیکن تمھارے دوست سریندر موہن کو اپنی صحیح عظمت کا احساس اب ہوا ہے۔ اب اس نے اپنی قابلیت، ذہانت اور شخصیت کا لوہا لوگوں سے منوا لیا ہے۔ اب ایک سے ایک بہتر لڑکی اس پر فدا ہو رہی ہے۔ بیاہ کرنے کو اس کے پیچھے دوڑتی ہے۔

پیارن۔ اس لئے تم ۔ ۔ ۔ ۔

سریندر۔ اس لئے ہم انتخاب کریں گے (ذرا توقف سے) اور تم دیکھ رہے ہو کہ یہ لڑکی ریکھا سے کہیں بہتر ہے۔ صحت اچھی ہے۔ خدوخال تیکھے ہیں۔ پھر ریکھا محض کلرک تھی۔ یہ ایک سکول میں ٹیچر ہے۔ ریکھا سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ ہمارے ادب اور ہماری شخصیت کو اس سے کہیں بہتر سمجھتی ہے اور خود بھی ایک بلند پایہ شخصیت کی مالک ہے۔ ٹیچر ہونے کے علاوہ سماجی اصلاح اور ترقی کے کاموں میں حصہ لیتی ہے۔ عورتوں کی انجمن کی سرگرم کارکن ہے۔ خوب کام کرتی ہے۔ ہم دونوں مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو جائیں گے۔

(ہنستا ہے)

پیارن۔ یار۔ بڑے خوش قسمت ہو۔

سریندر۔ خوش قسمت ہی نہیں سمجھدار بھی ہیں۔ ہم نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ ریکھا کو چند روز ٹالا تو اس سے کہیں بہتر لڑکی مل گئی۔

پیارن۔ اگر اسے بھی چند روز ٹالو تو ممکن ہے کہ اس سے بھی بہتر لڑکی مل جائے۔

(ہنستا ہے)

سریندر۔ اب وہ دن دور نہیں جب تم ہماری خوش قسمتی پر رشک کرو گے۔

پیارن۔ ہم تمھاری خوش قسمتی پر اس سے بھی زیادہ رشک کرنا چاہتے ہیں۔

سریندر۔ واقعی ؟

پیارن۔ ہاں، میری بات مانو اور چند روز اسے بھی ٹالو۔ اب تو تم ایک اور ایک گیارہ بنتے ہو لیکن تیسری یا پھر چوتھی لڑکی تمھیں ملے گی وہ ایسی ہو گی کہ تم دو اور ایک ایکیس بن جاؤ گے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

سریندر۔ خیر دوست، اب مذاق چھوڑو اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو ہمارا بیاہ ہو رہا ہے۔

پیارن۔ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو!

سریندر۔ ہاں دس تاریخ سوموار کے روز ہمارا بیاہ ہو رہا ہے اور یہ تاریخ میں نے نہیں تمھاری ہونے والی بھابی نے خود تجویز کی ہے۔

پیارن۔ بہت خوب!

سریندر۔ اس سلسلے میں تمھارے ذمے ایک کام تو یہ ہے کہ کم سے کم دو سو روپے کا انتظام تمھیں کرنا ہو گا۔

پیارن۔ اور دوسرے برات میں چلنے کو تیار رہنا ہو گا۔

سریندر۔ وہ تو خیر تم بنا کہے بھی چلو گے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

پردہ گرتا ہے

تیسرا منظر

(وہی سریندر کا کمرہ۔ میز اور کرسیاں اسی طرح پڑی ہوئی ہیں صرف ٹائم پیس اب کارنس کی بجائے میز پر پڑا ہے اور سریندر اس کی طرف بار بار دیکھتا ہے)

سریندر۔ پانچ بجنے میں دس منٹ۔ صرف دس منٹ باقی رہ گئے۔ وہ اب آتی ہی ہو گی (اٹھ کر کارنس کے قریب جاتا ہے۔ آئینہ اٹھا کر دیکھتا ہے اور آپ ہی آپ مسکراتا ہے۔ چونک کر) ہاں یہ اس کی چاپ ہے۔ اسی کی۔ اُن نازک قدموں کی چاپ کو اب میں خوب پہچانتا ہوں۔

(آئینہ رکھ کر مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور سامنے ریکھا کو کھڑے دیکھ کر پھیکا رہ جاتا ہے)

ریکھا۔ نمستے۔

سریندر۔ (بے دلی سے) نمستے۔

ریکھا۔ مجھے دیکھ کر تم گھبرا کیوں گئے؟

سریندر۔ نہیں تو۔ گھبرانے کی اس میں کیا بات ہے؟

ریکھا۔ تو پھر بیٹھو نا (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

سریندر۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ہاں ہاں، آپ بھی۔ میرا مطلب ہے کہ

تم بھی بیٹھو۔

ریکھا۔ آج ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ تم واقعی بہت پریشان ہو۔ شاید میرا آنا ہی اس پریشانی کا باعث ہے۔

سریندر۔ دراصل۔ ۔ ۔ ۔ دراصل۔ ۔ ۔ ۔

ریکھا۔ ہاں، ہاں۔ کہتے کیوں نہیں، دراصل آنا کسی اور کو تھا اور میں یوں آن ٹپکی (کرسی سے اُٹھ کر) لو۔ میں چلی جاتی ہوں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو۔

سریندر۔ نہیں ریکھا۔ ایسی بات نہیں۔ بیٹھو بیٹھو۔ دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمہاری چھٹی تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تمہیں تو ابھی کچھ دن اور گاؤں میں رہنا تھا۔

ریکھا۔ (بیٹھ جاتی ہے) چھٹی کے ابھی دس دن باقی ہیں۔ لیکن گاؤں میں میرا دل ہی نہیں لگا۔ بار بار تمہاری یاد۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سریندر۔ (خوش ہو کر) واقعی ؟

ریکھا۔ ہاں سچ کہتی ہوں بار بار تمہاری یاد آتی تھی۔ اس لئے سوچا کہ جب یہاں من نہیں لگتا تو چلو شہر ہی میں چلوں۔

سریندر۔ اس لئے تم چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی چلی آئیں۔

ریکھا۔ ہاں، میں پہلے ہی چلی آئی۔ لیکن تم خوش کیوں نہیں ہو؟

سریندر۔ (مسکرا کر) میں تو خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔

ریکھا۔ پھر مجھ سے کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے ؟

سریندر۔ اب تو تم یہیں ہو۔ باتیں ہم خوب کریں گے اور ہر روز کریں گے۔ لیکن اس وقت معذرت چاہتا ہوں۔ کیونکہ آج مجھے فرصت نہیں ہے۔

ریکھا۔ کیا مطلب ؟ آج تمہیں فرصت نہیں ہے ؟

سریندر۔ (ملائمت سے) ہاں ریکھا، دو منٹ بعد مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

ریکھا۔ اور مجھے بھی تو تم سے ضروری ــ بہت ضروری کام ہے اور اس سلسلے میں بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

سریندر۔ وہ باتیں کل بھی تو ہو سکتی ہیں۔

ریکھا۔ (مچل کر) آج اور ابھی ہوں گی۔

سریندر۔ ریکھا۔ اتنی جلد بازی کیوں ؟ سوچو کہ اگر آج تم گاؤں سے نہ آتیں اور اگر اس وقت میں تمہیں گھر پر نہ ملتا ؟

ریکھا۔ لیکن آج میں آ گئی ہوں اور تم مجھے گھر پر بھی مل گئے ہو اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ہمیں جو فیصلہ کرنا ہے وہ ابھی کر لیں۔

سریندر۔ فیصلہ ؟

ریکھا۔ ہاں، جب ہم ایک ساتھ رہنا طے کر چکے ہیں تو اب الگ الگ نہیں رہنا چاہئے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آج ہم بیاہ کی تاریخ کا فیصلہ کر لیں۔

سریندر۔ ریکھا۔ کیسی بھولی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی تم اتنے دن بعد آئی ہو۔ کچھ اپنی کہو۔ کچھ میری سنو۔ بیاہ کوئی بچوں کا کھیل ہے جو۔ ۔ ۔ ۔

ریکھا۔ ہاں ہاں میں جانتی ہوں کہ بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ روح کا رشتہ ہے اور میں نے تم سے دور رہ کر دیکھ لیا کہ یہ روح کا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ اب ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا مشکل ہے بلکہ ممکن ہی نہیں ہے،

سریندر۔ (ذرا طنز سے) بہت خوب! اب ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ریکھا۔ نہیں ہے، نہیں ہے، بالکل نہیں ہے۔

سریندر۔ (ہنس کر) اچھا تو ہم قریب رہیں گے۔ اب تم کبھی گاؤں مت جانا۔

ریکھا۔ (حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

سریندر۔ یوں کیا دیکھ رہی ہو؟

ریکھا۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم وہی سریندر موہن ہو جو پہلے تھے۔

سریندر۔ ہاں میں وہی سریندر موہن ہوں جو کہانی کار ہے جو ملک کا مشہور ادیب ہے جو۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ریکھا۔ مگر آج تمہارا لہجہ کچھ کچھ بدلا ہوا ہے۔

سریندر۔ میرا لہجہ (طنزاً ہنس کر) میرا لہجہ بالکل نہیں بدلا۔ دراصل شہر سے دور گاؤں میں رہ کر تم خود بدل گئی ہو۔ ۔ ۔ ۔

(سروج یکایک داخل ہوتی ہے۔ اس نے چھپی ساڑھی پہن رکھی ہے۔ بالوں میں پھول ٹنکے ہوئے ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ دل کش دکھائی دے رہی ہے)

ریکھا۔ (کھڑی ہو کر) بہن نمستے۔

سروج۔ نمستے (ایک نظر سریندر کو دیکھ کر اور پھر ریکھا کی طرف پلٹ کر) تم یہاں کیسے ؟

ریکھا۔ یہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں کہ تم یہاں کیسے ؟

سروج۔ بہن میرے ہونے والے دولہا بھی تو ہیں اور میں ان سے . . .

ریکھا۔ کیا کہا؟ مسٹر بیاں سریندر موہن تمھارے ہونے والے دولہا ہیں؟

سروج۔ ہاں ہاں۔ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

ریکھا۔ لیکن بہن میرے ہونے والے دولہا بھی یہی ہیں اور میں ان سے . . .

سروج۔ بیاہ کی تاریخ طے کرنے آئی ہو؟

ریکھا۔ ہاں بہن۔ ہم نے طے کیا ہے کہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہو کر رہیں گے۔

سروج۔ لیکن ان سے میرے بیاہ کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔

ریکھا۔ تاریخ طے ہو چکی ہے!

سروج۔ ہاں بہن۔ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو ہمارا بیاہ ہے اور اب میں اسی کا پروگرام بنانے یہاں آئی ہوں۔

ریکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے میرا دولہا مجھ سے چھین لیا۔

سریندر۔ (چڑھ کر) ریکھا، بات مت بناؤ۔ میں نے تم سے بیاہ کا وعدہ کبھی نہیں کیا۔

ریکھا۔ بیاہ کا وعدہ کبھی نہیں کیا؟

سریندر۔ نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دوست تھے اور دوست رہیں گے۔

ریکھا۔ اور یہ لمبے لمبے خط صرف دوست بننے اور دوست رہنے کے لئے لکھے تھے

(بٹوا کھولتی ہے اور خط نکال کر سامنے پھینک دیتی ہے)

سریندر (گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے)

ریکھا۔ اس وقت تو بڑے طمطراق سے کہتے تھے۔ تمہیں وہ لڑکی ہو جس کا مجھے مدت سے انتظار تھا۔

سروج۔ اور بیاہ جسم کا نہیں روح کا رشتہ ہے۔

ریکھا۔ بالکل، بالکل! اور یہ بھی کہا تھا کہ اصل بات شخصیت ہوتی ہے۔ ہم نے چونکہ ایک دوسرے کی شخصیت کو سمجھ لیا ہے۔ اس لئے ہمارا بیاہ ایک آدرش بیاہ ہوگا۔

سروج۔ اور نئے سماج کے لئے نمونہ بنے گا۔

ریکھا۔ (دانتوں میں انگلی دے کر) ہاں بہن، کیا یہ ساری باتیں انھوں نے تم سے بھی کہیں؟

سروج۔ اور میں نے سوچا کہ جس کے خیالات اتنے اچھے ہیں اور جس کی شخصیت اتنی بلند ہے اسے پا جانا خوش قسمتی ہے . . .

ریکھا۔ (اٹھ کر) تو بہن تمھاری یہ بلند شخصیت تمہیں مبارک۔ میں چلتی ہوں۔

(دروازے کی طرف تیزی سے بڑھتی ہے)

سروج۔ ریکھا، ریکھا! (وہ ٹھہر جاتی ہے) ذرا ادھر آؤ۔ بات سنو۔ تم میری پیاری سکھی ہو، منہ بولی بہن ہو۔ میں تمھارا ہونے والا دولہا تمہیں لوٹاتی ہوں اور تم دونوں کو سچے دل سے بدھائی دیتی ہوں۔

ریکھا۔ نہیں نہیں، تمھارا دولہا تمہیں مبارک (پھر چلنے لگتی ہے)

سروج۔ بہن ٹھہرو۔ تمہیں میرے سر کی قسم۔ ذرا میری بات سنو۔

ریکھا۔ (ٹھہر کر) ہاں کہو

سروج۔ پہلے ادھر آؤ

ریکھا۔ (لوٹ کر) لو میں آگئی۔ لیکن تم مجھے جانے کیوں نہیں دیتیں۔ تمہیں تو اپنے دولہا سے باتیں کرنا ہوں گی۔

سروج۔ دیکھو بہن۔ تم پہلے ان کی زندگی میں آئی ہو۔ اس لئے یہ تمھارے دولہا ہیں۔ میں ہرگز ان سے شادی نہیں کروں گی۔

ریکھا۔ اور میں بھی نہیں کروں گی۔

سروج۔ تم کرو۔ میں نہیں کروں گی۔

ریکھا۔ کہہ دیا کہ میں نہیں کروں گی۔

سروج۔ تو میں بھی نہیں کروں گی۔

سریندر۔ کیا مطلب؟

سروج۔ مسٹر بیاں سریندر موہن جی۔ دیس کے مشہور لیکھک۔ کیا آپ اتنی سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔

(ریکھا اور سروج دونوں کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ سریندر حیران و پریشان اُن کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(ڈراپ سین)

موج علیگ

تخلیق

وہ دوستوں کی ہزار راتیں
تبسّموں قہقہوں کے فتنے
حسین چہرے
محبتوں کے
جوانیوں کے
بہت زمانہ ہُوا کہ اے دل
خلائے ماضی میں کھو گئے ہیں
مرے مقدر سے چھن گئے ہیں
مگر نگاہیں نہیں بجھی ہیں
کہ نصف شب تک
اسی شبستاں میں بن سنور کر
شراب کی تلخیاں نگل کر
اکیلا بیٹھا ——————
خود اپنے سائے کو دیکھتا ہوں
دراز سایہ !
بلند سایہ !!

آج کل دہلی

من موہن تلخ

موت کی آواز

آج پھر موت کے جذبے میں بڑی شدّت ہے
آج وہ بات نہیں ہے کہ طبیعت شل ہو
اس خنک رات میں موجود ہے ہر وہ عنصر
جس سے تکمیلِ تمنا بڑی آساں ہو گی
کچھ نہیں سوجھ رہا ہوش کا عالم یہ ہے
سیٹیاں بجتی ہیں کانوں میں عجب گونجیں ہیں
یوں دھمک نبض کی آتی ہے کہ دم رُکتا ہے
یوں ٹھٹھکتے ہیں قدم جیسے کہ اندھا ہوں میں
دل پہ جیسے ہو منوں بوجھ اک ہر دھڑکن سے
ذہن میں ٹیسیں اُبھرتی ہیں رگیں تنتی ہیں
مٹھیاں آپ ہی بھنچ جاتی ہیں کھل جاتی ہیں
کوئی احساس کا لاوا ہے کہ تھمتا ہی نہیں
ماورائے سخن و فہم ہے آوازِ ضمیر
زندگی گھوم گئی ہے مری نظروں میں کہ یوں
جی میں آتا ہے کہ میں چہرہ جھلس لوں اپنا
اتنا ویراں مرا ماضی ہے کہ ممکن ہی نہیں
میں کسی یادِ گزشتہ کا سہارا لے لوں
رکھ دیا مجھ کو دھنک کر مرے احساس نے آج
سرد ماتھے پہ پسینے کی ہیں بوندیں ایسے
سنگِ مرمر کی کسی [illegible] دمِ صبح
اوس کے قطروں کی جھالر سی پڑی ہوتی ہے
حاصلِ عمر ہے یہ پل کہ مری ہستی میں
زندگی بھر نہ ہوئی تھی کبھی ایسی ہلچل
میں ہوں مرتا بقدم مرکزِ محسوسات اب
غالباً موت دبے پاؤں چلی آتی ہے

مئی ۱۹۵۶ء

ل۔ احمد اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی

(صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے)

یہ تقریر ۹۔ دسمبر ۱۹۵۵ء کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھی۔ لیکن ریڈیو تقریر میں بحث کے بعض پہلو چھوڑ دئے گئے تھے، اب توضیحی اضافوں کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ ل۔ احمد

آزاد نے نظیر کے بعض شعروں کو میر کے اشعار سے پہلو مارتے کہا ہے۔ اس کو اگر تعریفاً سمجھ بھی لیا جائے تو ایسی تعریف کسی معمولی درجے کے شاعر کے لئے وجہ تفاخر ہو سکتی ہے۔ نظیر تو اپنی جگہ صرف صاحبِ طرز ہی نہیں، ایک اسکول ہیں۔

طرزِ نظیر کی خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ ان کا شعر اگر ان کے کسی ہم عصر کے کلام میں ملا دیا جائے تب بھی شناخت ہو جائے گا۔ نظیر کے ہر شعر پر ان کی اپنی چھاپ ہوتی ہے۔ ان کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ و محاورات کا کثیر استعمال کرکے نظیر نے بہت سے حسین پیرایۂ بیان محفوظ کر دئے ہیں۔ "ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا" اس مصرعے میں چھڑکواں کا لفظ جس خوبی کے ساتھ آیا ہے، یہ طریقِ استعمال اب کسی کو یاد بھی نہیں رہا ہے۔ اس گفتگو میں نظیر کے جو شعر نقل کئے جائیں گے وہ طرزِ نظیر کی خصوصیت کا اندازہ کرا دینے کو کافی ہوں گے۔

نظیر کی شاعری کا رتبہ قرار دینے میں ادبی نقاد فی الجملہ مشکل میں ہے، ایک طرف ان کا حقیقت زندگی سے معمور کلام، اور عوام الناس کے جذبات و محسوسات کی نقاشی ہے تو دوسری طرف پوچ و پست بلکہ کچھ غیر ثقہ اشعار بھی سامنے آجاتے ہیں۔ شیفتہ کی تنقید اور فرحت اللہ بیگ کے تبصرے کے ما بین کئی مستقل تبصرے اور متعدد مضامین لکھے گئے، مگر کلام نظیر کے اس تضاد و تبائن پر بحث یا توجیہہ نہیں کی گئی یا پھر وہ میرے علم میں نہیں آئی۔ اسی دقت نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو غیر جانب دار بن جانے پر مجبور کیا، اور وہ مختلف نقادوں کی رائیں نقل کرکے سبکدوش ہوئے۔

میاں نظیر کے متعلق یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ تاج گنج سے مائی تھان، اور وہاں سے تاج گنج جاتے ہوئے لوگ میاں نظیر کے پابو کو روک لیتے اور حسبِ حال شعروں کی فرمائش کرتے تھے، اور چوں کہ میاں نظیر کے مسلک میں دل شکنی نا روا تھی، اور مزاج میں قلندریت کا عنصر بھی تھا، کھڑے کھڑے تُک بندی کرکے یاروں کو ہنسا دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس تُک بندی کا مقصود اہلِ بازار کو ہنسانا ہو اس کی شاعرانہ نوعیت کیا ہوگی سمجھیے۔ وہ شاعری تو ہونے سے رہی۔ اس بنا پر میرا پختہ خیال ہے کہ نظیر کے مجموعے میں ایسی تُک بندیاں بھی شامل کر دی گئی ہیں، اور اس کے علاوہ ان کے دیوان میں الحاقی غزلیں ہونا بھی بعید از قیاس نہیں جو شاید ان کے لڑکے آسیر کی ہوں۔

الحاصل، ایسے کلام کو نظیر کے مجموعے میں شامل کر دینا ایک اہم ادبی غلطی تھی، اور اس کلام کو بنائے تنقید بنانا میرے خیال کے مطابق دوسری اہم غلطی ہے۔

اس کو ایک طرفہ اتفاق ہی کہا جائے گا کہ اردو زبان کے شعراء کی طویل فہرست میں غالب و نظیر دو ہی شاعر ایسے گزرے ہیں جو اپنے جیتے جی تو ناموری حاصل نہ کر سکے۔ بلکہ مردود ٹھہرے، لیکن بعد کے زمانے میں ان کی مقبولیت نے اردو شاعری کے دھارے ہی کو موڑ دیا۔

غالب ونظیر کی اس بے مثال مقبولیت نے ہمارے ادب نوازوں کو ان دونوں کے غیر شائع شدہ کلام کی تلاش وجستجو میں لگا دیا، اور ان "دریافتوں" کے نتیجے میں غالب کا وہ کلام بھی شائع ہو گیا جسے خود انھوں نے مسترد کر دیا تھا، اور نظیر کا سارا رطب و یابس بھی چھاپ دیا گیا جس کا بڑا حصہ میں سمجھتا ہوں کہ دیوان میں شامل کرنے کی غرض سے نہیں کہا گیا تھا۔

بلاشبہ اس طرح ان "دریافت" کر لینے والوں کو تفاخر کا موقعہ مل گیا، لیکن اس وجہ سے تنقیدی الجھنیں بھی پیدا ہو گئیں، اور غالب و نظیر کے ادبی رتبے میں بالیقین کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آج غالب جس بنا پر زندہ ہیں وہ ان کی سہل ممتنع غزلیں ہیں۔ اور نظیر کو جس چیز نے پھر سے زندہ کیا وہ ان کی نظمیں ہیں۔ میری رائے میں غالب کے نسخۂ حمیدیہ اور نظیر کے دیوانوں کے مسودوں کا کتب خانے میں محفوظ ہو جانا کافی تھا۔ ہمارے کتب خانوں میں بہت سے مسودے محفوظ ہیں جو شائع نہیں کئے گئے مگر ریسرچ کے کام آتے رہتے ہیں۔

حالات زمانہ کے انقلاب نے زندگی کی قدروں کو بدل دیا ہے، اور اس انقلاب سے کلام نظیر کی مقبولیت عام ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اگر انجمن ترقی اردو (ہند) اس طرف توجہ کرے اور بعد تحقیق و تدقیق کلام نظیر کا ایک منتخب اور ایک فرہنگ نظیر مدوّن کرا کے شائع کر سکے تو زبان و ادب کی یہ ایک بہت بڑی خدمت ہو گی، اور وقت کی بڑی ضرورت پوری کرے گی۔

الغرض، جاگیرداری دور کی اشرافی سماج نے شیفتہ کی زبان سے کلام نظیر اور خود نظیر پر "بازاری" ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ اس لئے کہ نظیر نے سماجی قید و بند سے بغاوت کر کے زندگی کی حقیقتوں کو موضوع شعر بنایا تھا، اور زندگی بھی طبقہ "اجلاف" اور "حشرات الارض" کی، اور ستم بالائے ستم یہ کیا کہ خود کو عوام الناس کے ساتھ شناخت کرا کے اپنے شعر میں عوامی لب و لہجہ۔ عوامی الفاظ و زبان، عوامی روزمرہ و محاورہ استعمال کئے (جہاں تک آج کل کے بادعائے خود "عوامی شاعر" نہیں پہنچ سکے ہیں، اور وہ نظیر سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں) اور انسانوں کے اس جم غفیر کے احساس و خیال کو اپنے شعر کا پیکر بخشا۔

چنانچہ شیفتہ کی تنقید کی غایت و نوعیت تو بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن عہد حاضر کے نقاد کا جب کہ فن و صناعت کے نظریات اور زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں، کلام نظیر کے تضاد و تباین پر امتیازی نظر نہ ڈالنا حیرت انگیز ہے، نظیر کے ثقہ و پست اشعار پر نظر پڑتے ہی خیال کا اس طرف جانا ناگزیر ہے کہ یہ اگر ایک ہی شخص کا کلام ہے تو پست و فحش اشعار یقیناً اشاعت پانے کے لئے نہیں کہے گئے تھے۔ اسی قسم کی شاعری اکثر شعرا نے کی ہے جو بھلا بھی دی۔ لیکن بعض اساتذہ کا غیر ثقہ کلام شائع بھی ہوا۔ مگر اس بنا پر ان کا رتبۂ شاعری مجروح نہیں ہوا۔ شیخ سعدی اپنے غیر ثقہ کلام کے سبب رسوا نہیں ہوئے اور امیر خسرو زفاف کی تفصیلات بیان کر کے مردود نہیں ٹھہرے۔

ہر چند نظیر غزل گو شاعر نہیں ہیں، لیکن ان کے بعض غزلیہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر خیال کی ندرت و بلندی، مفہوم کی پاکیزگی اور گہرائی۔ بیان کی سادگی و صفائی اور لب و لہجہ کی ثقاہت و سنجیدگی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ٹھہرا عشق کے آفات کے صدمے سے نظیر
کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

دیا دل تو پھر عہد و پیمان کیا
لیا جس نے اُس کا ہے احسان کیا

نظیر اس سے ہم نے چھپایا جو دل کو
تو ہنس کر کہا "ہیں یہ انسان کیا؟"

لیلےٰ ہی اُس کے ہوش سے واقف تھی و نہ یاں
اکثر یہ جانتے ہیں کہ مجنوں دِوانہ تھا

تیشے کی کیا مجال تھی یہ کہ تراشے بیستوں
تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

چمک جا پھر خدا کے واسطے او بے کسے شعلے
کہ مثل آتش افسردہ ہے دل پھر کچھ جلا کھا

تھے ابھی ہم جواں او نظیر اب
رنگ موسیم تاب سا دیکھا

شام کی صبح ہو گئی دم میں
یہ تو کچھ ہم نے خواب سا دیکھا

یہ جو اہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہل صورت کا ہے دریا، اہل معنی کا سراب

کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کا
اے ساقیان بزم بہار یہ ہر چہ ہست

میں تو بے غیرت نہیں کیا جاؤں اُس شوخ کے پاس
کون سا کم بخت لے جاتا ہے مجھ کو گھیر کر

قرب سمجھا تھا جسے تو وہ ہی دوری اے شیخ
اسی نزدیکی نے پھینکا تجھے دور آخر کار

بندے کے قلم ہات میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

کیا کاشتے کیجئے اس بزم میں ہم نشیں
دور فلک سے کیا خبر پہنچے کا اب کہ تک نہیں

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہے وہ فنا ہے

جو شکل دُور باش تھی روزِ نخست کی — اب بھی جو ہم گئے تو وہی برملا ہوئی
جب اُس حبیب پاس ہم شب کو پہنچے — فروغِ مسرت کے منصب کو پہنچے

ان مختلف اشعار پر کسی اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں، اور بار بار نظیر سے ان کے محاسن شعری نظر انداز ہو بھی نہیں سکتے، مگر مختلف اشعار پیش کرنے کے ساتھ ایک پوری غزل نقل کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کی غزل گوئی کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب — یوں ہے جیسے بروئے آب حباب
گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں! — پر کا ہے میان گرداب
بادۂ ناب کیا ہے ؟ خونِ جگر! — دردِ بے رنگ ہے شبِ مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں — وہ بھی ہے اک ہوائے خانہ خراب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے ؟ — مثلِ تحریرِ موج نقش برآب
حسن اور عشق جس کو کہتے ہیں — خطفۂ برق و قطرۂ سیماب
فرصتِ عمر؟ قطرۂ شبنم! — وصلِ محبوب ؟ گوہرِ نایاب
سب کتابوں کے کھل گئے معنے
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

ان شعروں کا لب و لہجہ، معانی و مفہوم اور سنجیدگی و ثقاہت پر نظر رکھتے ہوئے یہ شعر بھی سنئے۔

ناز کا اس کے جو تھپیڑا ہے — طبعِ مشتاق کو وہ پیڑا ہے
کہا جو ایک لے بوسہ، میں تو لگا لینے — تو ہنس کے کہنے لگی چل ہٹ ایک نہ دو

وقس علیٰ ہذا۔

کون صاحبِ ذوق باور کرے گا کہ ایسے شعر میاں نظیر کے سروشِ غیبی کی تحریک کا نتیجہ ہیں ؟ اور کون ذی فہم قیاس نہ کر سکے گا کہ یہی وہ شعر ہیں جو اہلِ بازار کی فرمائش پر ان کو ہنسا دینے کے لئے کہے گئے تھے ؟

اوپر کی سطروں میں کہا جا چکا ہے کہ نظیر جس بنا پر نظیر مانے گئے ہیں وہ ان کا غزلیہ کلام نہیں، بلکہ ان کی نظمیں ہیں، جن کے موضوعات کا تنوع زندگی کی گوناگوں کیفیات، متنوع انسانی جذبات و محسوسات کے اظہار کے ساتھ ہر نظم کی تہ میں ایک وجہِ مشترک بھی ہے اور وہ ہے نظیر کی انسان دوستی! نظیر جو کچھ بھی تھے، وہ سب سے پہلے ایک درد مند دل رکھنے والے انسان تھے، اور اسی لئے عامتہ الناس کے رنج و مسرت سے شدید اثر لیتے تھے۔ ان کی نظر میں آدمی، آدمی پہلے تھا اور باقی سب کچھ بعد میں، اور وہ باقی سب کچھ نظیر کی نظر میں بے حقیقت تھا۔ دردمندی انسانیت کا وصفِ اوّل ہے۔ نظیر کا یہ قطعہ پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا۔

کہا یہ دل نے مجھے ایک دن کہ باغ کو دیکھ — ذرا تو چل کے گلستاں کے شب چراغ کو دیکھ
جو نہی گیا میں چمن میں تو دل ہوا خرّم — گلوں کے حسن کو اور نازو اور دماغ کو دیکھ
کہ اس میں آیا نظر مجھ کو ایک گل لالہ — میں شاد اس سے ہوا عیش با فراغ کو دیکھ
یکایک اُس نے کہا تو نگہ نہ کر مجھ پر — نہ میرے بادۂ شبنم سے پُر ایاغ کو دیکھ
نہ میری دیکھ تو سبزی نہ رنگِ سرخ نظیر! — ہے دردمند اگر تو تو میرے داغ کو دیکھ

آدمی نامہ، نظیر کی مشہور نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں نظیر کی انسان دوستی پوری طرح جھلکتی ہے۔ جب وہ اعلیٰ و ادنیٰ، اچھے اور بُرے ہر قسم کے آدمی کو جیسا کا تیسا پیش کر کے کہتے ہیں کہ "ہے وہ بھی آدمی"! ایک بند ملاحظہ ہو۔

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار — اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقّہ، صراحی، جوتیاں دوڑے بغل میں مار — کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اس طویل نظم میں نظیر خود کوئی رائے نہیں دیتے۔ کسی قسم کا خیال ظاہر نہیں کرتے۔ نہ اچھے سے اُلفت بیان کرتے ہیں، نہ بُرے سے نفرت۔ محض حقیقت الامر کی طرح اشارے کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والا یہ اثر لینے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ نابرابری کیوں ہے ؟ یہ ایک پالکی سوار کے لئے اتنے کہار، کفش بردار، پیادے سوار اور نقیب بنا کر آخر انسانیت کو ذلیل کیوں کیا جا رہا ہے۔

نظیر نے جو زمانہ پایا اُس زمانے میں "عالم ہیچ است"، کا فلسفہ مذہبی عقیدہ بن کر خاص و عام کی زندگی کا جزو بن گیا تھا، اور نظیر اس سے بدرجۂ اتم متأثر ہوئے۔ اس لئے قناعت مزاج بن گئی۔ ایسا اگر نہ ہوتا تو ریاست بھرت پور اور دربارِ لکھنؤ کے بلاوے مسترد نہ ہو جاتے۔ کیونکہ میاں نظیر کی بسر اوقات کا ذریعہ معلّمی کا پیشہ تھا، اور اس پیشے میں جو یافت ہو سکتی وہ معلومِ عام ہے۔ میاں نظیر نے ایک نظم میں اپنا حلیہ بیان کیا ہے، اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ان کی جوانی اور پیری دونوں دورِ عالمِ افسردگی تھے۔

لیکن اس کے باوجود کلام نظیر اگر ان کی طبع و مزاج کی شہادت بن سکتا ہے تو مجھے ان کے کلام میں "بیزاری" منسلک ہونے کی شہادت نہیں ملی بلکہ اس کے برخلاف اس کا ثبوت کثرت سے ملا کہ وہ زندگی کے زبردست شیدائی تھے اور اس کے ہر ہر لمحے کو جی لینا چاہتے تھے۔ عیش میسّر کو ہات سے کھوتے نہیں اور غیر حاصل مسرت کے سخت آرزومند رہتے ہیں: کہتے ہیں۔

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

ایک مختصر سے قطعے میں نظیر خوب محبوب سے شاد کام ہونے اور اس کی ایک ایک ادا اور سجاوٹ سے جداگانہ لطف اندوزی کو اس طرح بیان کرکے زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔

ہوئے خوش ہم ایک نگار سے، ہوئے شاد اس کی بہار سے
کبھی شان سے کبھی آن سے، کبھی ناز سے کبھی پیار سے

ہوئی پیرہن سے بھی خوش دلی کلی دل کی اور بہت کھلی
کبھی طرّے سے کبھی گجرے سے، کبھی بدھی سے کبھی ہار سے

وہ کناری اس میں جو تھی گندھی، اُسے دیکھ کر بھی ہوئی خوشی
کبھی تورے کبھی مہر سے، کبھی برگ سے، کبھی بار سے

وہ نظیر سے تو ملا کیا، مگر اپنی وضع میں اس طرح
کبھی جلد سے کبھی دیر سے، کبھی لطف سے کبھی عار سے

نظیر کا سارا کلام اسی رنگ و آہنگ کا ہے، اور وہ آس پاس کی زندگی سے جی کھول کر بہرہ اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مجموعے میں ایسے شعر بکثرت ملیں گے جن کے اندر نظیر کے خنداں و رقصاں زندگی کے مرقع نظر آئیں گے۔ اور جہاں یہ نہ ہوگا وہاں عشرت نارسا پر حسرت کا اظہار ملے گا۔ اس غزل کو پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ کوئی افسردہ دل انسان ایسی غزل کہہ سکتا ہے۔

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا
جوں رنگ بہاروں میں ہووے جوں حال چمن اور گلشن کا

جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں
ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا

لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں
وہ ساغر پہونچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا

ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے
وہ حسن جتانا گانے کا اور جوش دکھانا جوبن کا

ہے روپ عبیروں کا ہوش اور رنگ گلالوں کا گلگوں
ہیں بھرتے جس میں رنگ، بنا ہے رنگ عجب اس برتن کا

اس گل رُو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی اور مدہوشی ہے
نا خیال ہمیں کچھ چولی کا نا دھیان تمھیں کچھ دامن کا

جب ہم نے نظیر اس گل رُو سے یہ بات کہی ہنس کر اس دم
کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری، ہے مست مہینا پھاگن کا

یہ اور ایسی اکثر نظمیں جیسے "آیا رچل کے دیکھیں برسات کا تماشا" یا "پھر دیکھ بہاریں جاڑے کی" یا "چکھ ڈال مال دھن کو" ایک ہی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اتنا سارا اور اس رنگ کا کلام سامنے ہو تو باور نہیں ہوتا کہ یہ ایک مرتاض انسان کا کلام ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیا کو ہیچ سمجھ لینے کے بعد زندگی کی اُمنگوں کے لئے میدان باقی نہیں رہتا ہے، اور جب اس کے باوجود نظیر زندگی کی مسرتوں میں حریص بن کر حصہ لیتے نظر آتے ہیں تو ان کی عالی ظرفی کے سامنے سر جھکا دینا پڑتا ہے کہ مستقل افسردگی کے باوجود وہ شگفتہ رہتے اور دوسروں کو شگفتہ دل بناتے تھے۔ اس اعتبار سے نظیر کا کردار بہت بلند نظر آتا ہے۔ اور اُن کے کردار کا یہ پہلو گوگول کا قول یاد دلاتا ہے کہ:-

"ایک فن کار کا کمال اس میں ہے کہ وہ زندگی پر دونوں حالتوں میں نظر ڈالے۔ قہقہہ مارتے ہوئے بھی جیسے دنیا دیکھ سکتی ہے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی جیسے کوئی نہیں دیکھتا!"

حضرت مانی جائسی یہ شعر کہہ کر گوگول کے خیال کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں۔

دل میں کہرام ہے میں پھر بھی ہنسوں گا اے دوست
اگر اس طرح کے ہنسنے میں خوشی تیری ہے

ڈال ڈال کے پات

گیت ——— شاد امرتسری

تیرے نام کی مالا جپتے جپتے جیون انت ہوا
شانت بھئی اب آشا اور نراشا کارن انت ہوا
اس کی چھب نیاری البیلی جیسے مدھر سُریلی تان
من بالک رس راگ کا رسیا اس کے کارن انت ہوا
گورے مکھڑے نین رسیلے راس نہ آئے جیون بھر
ان کے دھیان ہیں گھُلتے گھُلتے اپنا جوبن انت ہوا
روگ لگا تو جوگ کمایا اس پر بھی پل چین نہیں
پل پل نیر بہائے نرمل آنسوں کا دھن انت ہوا
نگری نگری چلتے پھرتے پاؤں تھک کر چُور ہوئے
سُندرتا کی کھوج لگاتے من موہن تن انت ہوا
سُکھ کے اُجلے نگر پہ چھائیں دُکھ چنتا کی پرچھائیں
اب اندھیارا دوار دوار اُجیالا درشن انت ہوا
شاد بڑا ہی مُورکھ ہے جو موہ کی بانی بولے ہے
جُگ بیتے اس لوبھی جگ ہیں موہ کا بندھن انت ہوا

"لالہ زار" لائلپور۔ جنوری ۱۹۵۶ء

قلم نہیں ہے ——— عبدالحمید عدم

بڑے سلیقے سے حلقہ ارباب ذوق کا بزم آفریں ہے
اور اپنی ہنگامہ خیزیوں کے لحاظ سے رزم آفریں ہے
خیال ہے کرسئ صدارت پہ نصب اب کچھ کیا ہی جائے
گزر گئی ساعت معین تو کسب اب کچھ کیا ہی جائے
تضیعِ اوقات ہو رہی ہے عجیب سی بات ہو رہی ہے
یہ کیسی لغزش سی مہتمم سے خلافِ عادات ہو رہی ہے
مقالہ ہائے لطیف و نازک مزاج ناراض ہو رہے ہیں
غزل پریشان ہو رہی ہے' غزال شبہات سے بھرے ہیں
مگر سلیقہ شعار ارباب ذوق نعرے لگا رہے ہیں
قلم کے ملنے کی دیر ہے ہم بساط محفل سجا رہے ہیں
بڑے بڑے باوقار افراد زینت افروز انجمن ہیں
علوم عرفان ابتلا ہیں' خیال "الہام" پیرہن ہیں
مگر مصیبت یہ ہے بھری انجمن میں کوئی قلم نہیں ہے
کھُلے مطالب کی زلف جس سے وہ شانۂ تیز رَم نہیں ہے
قلم ملے نام درج ہوں صدر منتخب ہو تو رنگ چھائیں
جوان غزلیں رباب چھیڑیں حسین مضامین سبو اٹھائیں
ابھی ذرا دیر اور ٹھہرو' وہ ایک خوش پوش آ رہا ہے
جو اپنی رفتار گرم سے "پارکر" کا جلوہ دکھا رہا ہے
مجھے یہ شک تھا کہ صرف مجھ کو ہی راس کوئی قلم نہیں ہے
یہاں تو ساقی تمام حلقے کے پاس کوئی قلم نہیں ہے

"اقدام" ۵ فروری ۱۹۵۶ء

گفتنی و ناگفتنی

شورش کاشمیری

دار و رسن کی گود میں پالے ہوئے ہیں ہم
سانچے میں مشکلات کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم

وہ دولتِ جنوں کہ زمانے سے اُٹھ گئی
اس دولتِ جنوں کو سنبھالے ہوئے ہیں ہم

ہر تو گردشِ لیل و نہار رُک جائے
وہ راز جن سے بہت غم اُٹھائے ہیں میں نے

ہزار بار زمانے کے سرد طاقوں پہ
چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں میں نے

اُفق کی سُرخ قبا سے سراغ ملتا ہے
ہمارا خون ستاروں میں جگمگائے گا
ہمارے بعد کہاں یہ وفا کے ہنگامے
کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا

اُلجھیں تو کائنات کے سینے میں ہو شگاف
یلغار ہو تو لشکرِ میداں شکار ہیں
اُٹھیں تو مہر و ماہ کے جلو میں ہم رکاب
پھیلیں تو ہر روش پہ گلوں کا نکھار ہیں
ہم ہیں حرم فروش فقیہوں کے نکتہ چیں
ہم ہیں فقیرِ راہ مگر شہریار ہیں

حفظِ خودی پہ نظمِ جہاں کا مدار ہے
یہ راز آشکار اگر کر سکے تو کر
بیدار کر ضمیر کو، بے باک کر عمل
یہ عہد اُستوار اگر کر سکے تو کر

صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا
مرے وطن! تری عظمت کے گیت گاؤں گا
بچھاؤں گا ترے ذرّوں پہ فرشِ لالہ و گل
ترے اُفق کے ستاروں میں مسکراؤں گا
تری طلب پہ مرے لختِ دل بھی حاضر ہیں
انھیں سے میں ترے دیوار و در سجاؤں گا

وہ لوگ جنھوں نے اپنی بیویوں کی ہجو کی

خالد الحذاء کہتا ہے کہ میں نے قبیلہ اسد کی ایک عورت کو شادی کا پیام دیا۔ اس نے مجھے دیکھنے کے لئے طلب کیا۔ میرے اس کے درمیان باریک پردہ پڑا تھا۔ اس نے مجھے پردے کے باہر بیٹھنے کو کہا اور کنیز کو چھنے (؟) ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ کنیز ایک بہت بڑی قاب لائی، جو چاول اور گوشت سے لبریز تھی۔ خاتون کھا گئی۔ پھر ایک بہت بڑا پیالہ دودھ کا پی گئی۔ اس کے بعد پردہ اُٹھا دیا گیا۔ واقعی وہ جوان اور خوبصورت تھی اور شیر کی کھال پر بیٹھی ہوئی تھی مجھ سے کہنے لگی۔ "عبداللہ! میں شیرنی ہوں اور شیر کی کھال پر بیٹھا کرتی ہوں۔ میرا ناشتہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ آج کل بھوک ہی نہیں لگتی۔ بتاؤ اب کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ "کل آکر کہوں گا"۔ مگر پھر کبھی اس کے گھر کا رُخ نہیں کیا۔

اصمعی کی روایت ہے کہ میں ایک بدوی شاعر کے پاس مشکل الفاظ کے معنی پوچھنے جایا کرتا تھا۔ جب دروازے پر آواز دیتا تو وہ کہتا "امامہ دروازے پر جو ہے اُسے بلا لے۔" امامہ اس کی بیوی تھی۔ ایک دن جب میں گیا تو امامہ اس نے یہ بات نہیں کی۔ مجھے تعجب ہوا اور سبب پوچھا اس نے غصّہ کے ساتھ چند شعر پڑھے جن کا ترجمہ ذیل میں دیکھئے۔

"امامہ طلاق لے کر چلی گئی اور مجھے بڑھیوں سے نجات مل گئی!"
"وہ چلی گئی تو نہ میرے دل کو رنج ہوا نہ آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔"
"اگر میں اُسے طلاق نہ دیتا تو خود اپنی زندگی کو طلاق دینا پڑتی۔"

(سوغات دہلی)

اگر تصرّفِ گلچیں رہا بہاروں پہ
تو پھر میں ان کا لہو تک نچوڑ لاؤں گا
خدا نے شعلہ نوائی مجھے عطا کی ہے
عوام سوئے ہوئے ہیں، انھیں جگاؤں گا

تری نگاہ نے جس کو ہلال سمجھا ہے
کہیں یہ نوحۂ قدرت کا کوئی مسند نہ ہو
سوادِ ارض کے انسان کی یہ بربریت ہے
مری ندیم! فرشتوں کا زہرخند نہ ہو

[illegible]

سر عبدالقادر — (ایک طویل مضمون کے اقتباسات) — عاشق حسین بٹالوی

مخزن جاری ہوتے ہی ایک ادبی انقلاب رُونما ہوا۔ ہندوستان کا انگریزی خواں طبقہ جو قدیم خیال کے بزرگوں کے نزدیک گویا ذوقِ ادب سے یکسر محروم تھا یکایک جاگ اُٹھا۔ اس طبقے میں علی گڑھ۔ لاہور۔ دہلی حیدرآباد اور پٹنہ کے وہ نوجوان شامل تھے۔ جنھوں نے ایک طرف جدید تعلیم سے اپنے دماغ کو روشن کیا تھا اور دوسری طرف قدیم روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ ان لوگوں میں اقبال۔ سجاد حیدر یلدرم۔ ظفر علی خاں محمد علی۔ مرزا محمد سعید۔ غلام بھیک نیرنگ۔ اعجاز حسین۔ شاہ دین ہمایوں۔ خوشی محمد ناظر۔ حسرت موہانی۔ تلوک چند محروم۔ شیو نرائن شمیم وغیرہ شامل تھے۔ ان نوجوانوں کے ساتھ ساتھ جلال۔ تسلیم۔ رسا۔ سائل مہدی مجروح۔ محمد حسین آزاد۔ شبلی اور حالی بھی مخزن کی آراستہ کی ہوئی بزم سخن میں موجود تھے۔ قدیم رنگ تغزل سے پہلو بہ پہلو جدید رنگ کی نظمیں چھپتی تھیں۔ اور پرانی نثر کے ساتھ ساتھ مغربی طرز کے افسانے بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ اقبال کی شاعری کو پہلی مرتبہ مخزن ہی نے عوام سے روشناس کرایا۔ ابوالکلام آزاد۔ سجاد حیدر یلدرم۔ سلیمان ندوی اور حسن نظامی کے مضامین پہلی بار مخزن ہی میں شائع ہوئے۔ سید سلیمان ندوی کہتے تھے کہ ندوہ کی طالب علمی کے زمانے کے چھپنے سے جتنی خوشی مجھے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں صفحے سیاہ کئے بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ دنیا نے توقع سے بڑھ کر داد بھی دی۔ لیکن جو مخزن میں اپنا پہلا مضمون چھپنے کے بعد ہوئی تھی وہ دوبارہ حاصل نہ ہوئی"۔

مخزن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قوم کے نونہالوں کو احساس کمتری سے نجات دلا کر انھیں ذہنی غلامی سے آزاد کیا۔ ان میں خود اعتمادی کی رُوح پیدا کی اور اُن کو اپنے ادبی سرمایے کی ترتیب و تدوین کی طرف متوجہ کیا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے خدمت گزاروں کی فہرست میں ایسے ایسے نام شامل ہونے لگے جن کے متعلق آج گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ لوگ بھی ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں گے مخزن کے اولین دَور کے مضمون نگاروں میں سر فضل حسین۔ سر علی امام سر منوہر لال۔ سر عبداللہ المامون سہروردی۔ سر تیج بہادر سپرو اور سر جوگندر سنگھ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اس زمانے میں نوجوان تھے۔ اور زبان و ادب کی خدمت کے ولولے نے انھیں بھی سرشار کر رکھا تھا۔

جب بادشاہ جارج پنجم ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو ہز ہائی نس آغا خاں کی سعی و کوشش سے وہ چند گھنٹوں کے لئے علی گڑھ بھی تشریف لائے تھے۔ علی گڑھ کے ارباب حل و عقد آغا خاں کی اس کرم فرمائی کے بے حد ممنون تھے۔ چنانچہ اسی شب آغا خاں کے اعزاز میں دعوت منعقد ہوئی جس میں نواب محسن الملک نے بڑی فصیح و بلیغ تقریر کی اور آغا خاں کی اُن مساعی کا ذکر کرتے ہوئے جو وہ ایم اے او کالج کی بہتری کے لئے مسلسل کرتے رہے تھے کہنے لگے۔

نمی گویم من اے ساقی گل و باغ و بہار از من

بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

دوسرا مصرع پڑھتے وقت محسن الملک بار بار اپنی انگلی سے آغا خاں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اور آخر میں زور سے دایاں ہاتھ اپنے سینے پر مار کر کہنے لگے۔ یار از من۔ اس پر جس زور سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے وہ فلک شگاف تھے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ جس زمانے میں شیخ صاحب وزیر ہند کی کونسل کے رُکن تھے۔ اور انگلستان میں مقیم تھے تو انھوں نے ایک دفعہ مسجد ووکنگ میں عید الفطر کی نماز کی امامت بھی کی تھی۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو ڈاکٹر اقبال نے ایک بے تکلف صحبت میں کہا کہ "لو بھئی۔ ایک امامت عبدالقادر کے دستِ ستم سے بچی ہوئی تھی۔ ظالم نے اس پر بھی ہاتھ صاف کر دیا ہے"۔

اتفاق سے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب اپنے صاحب زادے احسان قادر کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر لاہور تشریف لائے تو ایک روز باتوں باتوں میں مَیں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ کی امامت کی خبر سُن کر ڈاکٹر صاحب نے یہ فقرہ چُست کیا تھا۔ شیخ صاحب بے اختیار ہنسے۔ اور دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ اگر تم ڈاکٹر صاحب سے ملو تو ان سے عرض کرنا کہ عبدالقادر نے آپ کے فقرے کے جواب میں آپ ہی کا یہ شعر سُنایا تھا ؎

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال — بلا کے دیر سے مجھ کو امام کہتے ہیں

ایڈیٹر ادبی دنیا کے صاحب زادے وجیہہ الدین کی شادی تھی۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کے احترام اور اپنی خاندانی روایت کے مطابق یہ تقریب سعید اپنے جدی مکان میں منائی۔ جو شاہ عالمی دروازے کے اندر گمٹی بازار کے قریب ایک چھوٹی سی گلی کوچہ ہنومان میں واقع تھا۔ چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی تھی اور بیچ میں صرف یہی ایک مکان مسلمانوں کا تھا۔ صحن میں کرسیوں پر مہمان بیٹھے تھے۔ اور میں شیخ صاحب کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگے۔ یہ مکان بڑی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا سے کہو کہ وہ اسے اچھی طرح محفوظ کر لیں۔

میں نے عرض کیا "وہ کیا تاریخی حیثیت ہے۔ ذرا ہمیں بھی بتا دیجئے"۔

کہنے لگے "میر غلام بھیک نیرنگ مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی (مولوی ضیاالدین احمد مرحوم) کے بہت دوست تھے۔ اور جب وہ یہاں گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو اسی مکان میں رہتے تھے۔ اقبال اور میں اُن سے ملنے اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ اس کونے میں ایک اکھاڑہ تھا۔ جہاں نیرنگ اور اقبال کشتی لڑا کرتے تھے"۔ (ادبی دنیا)

ہجر کی رات ڈھل گئی ———— **فیض احمد فیض**

شام فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزم خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخر شب کے ہمسفر، فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

(چٹان)

ملاحظات

ماہ مئی ۱۹۵۶ء میں بدھ کی ۲۵۰۰ ویں جینتی منائی جارہی ہے۔ اس شمارے میں بھی بنی نوع انسان کے اس مصلح اعظم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ بھارت کو اس بات پر فخر ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی تعلیمات سے متاثر کرنے والے اس مہا پرش کا جنم اس دیس میں ہوا۔ اور پھر اسی دیس میں گیا کے تاریخی پیپل کے درخت کے نیچے اسے عرفان حاصل ہوا۔ بدھ کی تعلیمات ظلم، تعدی اور بربریت کے خلاف ہیں اس لئے اس دور میں جسے انسانیت کُش اسلحہ سازی کا دَور کہنا چاہیئے۔ بدھ کی جینتی مناکر اس کی تعلیمات کو تازہ کرنا انسان دوستی کی روایات کو تازہ کرنے کے برابر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ جینتی دنیا میں بقائے امن کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوگی۔

اس سال سیاست، صحافت اور ادب کے میدان کو کتنے ہی شہ سواروں نے خالی کر دیا۔ ہماری پارلیمنٹ کے اسپیکر شری ماؤلنکر کا سانحۂ ارتحال ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے پارلیمانی حلقوں کا نقصان ہے۔ موصوف آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کے پہلے اسپیکر تھے انھوں نے دستوری روایات کو قائم رکھنے کے لئے جو مساعی کئے وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

آچاریہ نریندر دیو یوں تو پرجا سوشلسٹ پارٹی کے صدر تھے لیکن علم و فضیلت اور شرافت نفس کی بناء پر ہندوستان کے ہر سیاسی، مجلسی اور ادبی حلقے میں مقبول تھے۔ اُن کا اُٹھ جانا ایک بہت بڑی شخصیت کا ہم سے الگ ہو جانا ہے۔ اتنا متین، گمبھیر اور مرنجاں مرنج انسان ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ ؏ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر میگھ ناتھ ساہا نے سائنسی تحقیق میں جو کارہائے نمایاں کئے تھے وہ ہماری ملکی ترقی کے آئینہ دار تھے۔ افسوس ؏ آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

ادب کی صف تو صفِ ماتم بن گئی۔ یگانہ، قاضی عبدالغفار، بدر جلالی، عباس بیگ محشر، پیارے لال شاکر میرٹھی، حکیم آشفتہ لکھنوی، مخمور دہلوی اور مراٹھی کے ممتاز شاعر شری مردھیکر اپنے چاہنے والوں کو مصروف ماتم چھوڑ کر چلے گئے۔ یگانہ بقول خود "خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا"۔ زبردست خود پرستی اور انا کے مالک بلکہ مریض تھے۔ ایسے تیکھے مزاج کے شاعر اردو میں کم پیدا ہوئے ہیں۔ قاضی عبدالغفار صحافی بھی تھے، ادیب بھی۔ سیاست دان بھی اور مجلس و قوم کے خادم بھی۔ جنتین بھی اور منسوڑ بھی۔ ایسی طرزِ نگارش اب کہاں دیکھیں گے۔ جناب بدر جلالی بہت پرانے صحافی اور نیشلسٹ تھے۔ عباس بیگ محشر کی نظموں میں گوز و دز کی شان تھی۔ پیارے لال شاکر کہنہ مشق شاعر اور ادیب تھے۔ ادیب اور مختلف رسالوں کے ایڈیٹر رہے۔ آشفتہ لکھنؤ کی پرانی وضعداری کا نمونہ تھے۔ حیدرآباد کو وطن بنایا تھا وہیں پیوند خاک ہوئے۔ غزل سرایان دہلی کی یادگار حضرت مخمور دہلوی کے مرنے کے دن نہ تھے۔ ابھی ان کی غزلیں ہندوستان اور پاکستان میں گونجی تھیں۔ لیکن یہ خوش رنگ پھول بھی دستِ قضا نے توڑ لیا۔ شری مردھیکر آل انڈیا ریڈیو میں ایک ممتاز عہدے پر تھے۔ مراٹھی کے مقبول شاعر بھی تھے۔ ابھی پچاس کے بھی نہ ہو پائے تھے ؎

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

مسٹر عطاء اللہ خاں درانی (لائنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ارکانسا امریکہ) نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر (تقریباً ساڑھے سات لاکھ روپیہ) کا گراں قدر عطیہ مسلم یونیورسٹی کو مرحمت فرمایا ہے جس سے سید حسن اردو ریسرچ چیئر کا قیام مقصود ہے۔ درانی صاحب اردو شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ غالب کے فکر و فن کی عظمت و اہمیت کو مغربی دنیا تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ اردو کے مشہور ادیب اور نقاد جناب آل احمد سرور صاحب کا اس "چیئر" پر "پروفیسر" کی حیثیت سے تقرر ہو گیا ہے۔ ان کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اس چیئر کے تحت گراں قدر کام انجام پائے گا۔

مدیر کو حال ہی میں حیدرآباد جانے اور "اردو ہال" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے ان تھک اور بے لوث سیکرٹری جناب حبیب الرحمن صاحب نے ذاتی ایثار اور دوستوں کے تعاون سے اتنا بڑا کام کیا ہے جس کی مثال اس زمانے میں نہیں ملتی۔ پچاس ہزار کے قریب روپیہ ان لوگوں نے جمع کیا۔ پہلی منزل بن چکی ہے اور دوسری کے لئے جدوجہد جاری ہے۔ خدا ان ہمت وروں کے ارادوں کو برکت دے۔

نئی کتابیں اور رسالے

مصنف ڈاکٹر رضا زادہ شفق
تاریخ ادبیاتِ ایران مترجم سیّد مبارز الدین رفعت
ناشر، ندوۃ المصنّفین اردو بازار۔ دہلی۔ ضخامت ۵۶۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۲/۸ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت غیر مجلّد آٹھ روپے مجلّد نو روپے۔

اس کتاب میں قبل اسلام ایرانی ادبیات سے لے کر صفوی اور قاچاری دور تک کی ادبیات، شاعری اور اس کے اثرات کی مکمل تفصیل مورخانہ اور محققانہ انداز سے پیش کی گئی ہے۔

فاضل مترجم نے "عرض مترجم" میں فرمایا ہے کہ "ڈاکٹر شفق جامعۂ تہران میں فارسی ادبیات کے معلم ہیں۔ ایرانی قومیت کے احیاء کے شوق میں ان کا دامن بھی غلو کے دھبّوں سے پاک نہیں۔ تاہم ایران کے موجودہ مصنّفوں کے مقابلے میں یہ بہت غنیمت ہیں۔ انھوں نے اوروں کی بہ نسبت زیادہ اعتدال سے کام لیا ہے۔" حقیقت حال ہمیں کچھ اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ کیونکہ شفق ایسا اعتدال پسند ادیب بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ قبل اسلام ایرانی ادبیات سے متعلق ہے۔ اس میں زبان کی ابتدا اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ "خط" کی ابتدا اور ارتقاء، اوستائی اور پہلوی ادب پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ماخذ کا بیان شرح و بسط سے کیا ہے۔

دوسرا حصّہ بعد اسلام ایرانی ادبیات سے متعلق ہے اور کتاب کا اصل حصّہ ہے۔ اس میں عہد بہ عہد کے فارسی شعراء کا مفصل تذکرہ ہے۔ آخر میں صفوی اور قاچاری دور کے نثری ادب کی تفصیل ہے۔ بیان کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ تاریخ اور لغت کی کتابوں کا ذکر بڑا جامع اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر شفق نے کتاب کو دلچسپ بنانے میں بڑی محنت کی ہے۔ وہ داستان سرائی کرتے ہیں۔ لیکن تحقیق کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، جو لطائف وہ بیان کرتے ہیں اس کا حوالہ یا سند بھی بیشتر پیش کرتے ہیں۔ سخن فہم بہت اچھے ہیں۔ اس لحاظ سے شعراء کے کلام پر اُن کا تبصرہ ایک ایرانی کی حیثیت سے بڑے کام کی چیز ہے۔ یوں تو ڈاکٹر براؤن کی "ادبی تاریخ ایران" اور مولانا شبلی نعمانی کی مشہور عالم کتاب "شعر العجم" ایران کے ادبیات پر بڑی جامع کتابیں ہیں، لیکن ان میں غیر ضروری تفصیل و تشریح بھی ہے اور شنید پر مبنی داستان سرائی بھی۔ یہ کتاب نسبتاً مختصر ہے لیکن اختصار کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے۔ طلباء کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ شاہنامے پر شبلی نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن شفق نے بھی کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی۔

باباطاہر کے بیان میں انھوں نے ایک خاص بات کا اعتراف کیا ہے کہ باباطاہر کی دوبیتیوں کا وزن عام رباعیوں کے وزن سے الگ ہے۔ آج کل فن و عروض سے نابلد شعراء چار مصرعے جمع کر کے اُسے رُباعی کا نام دیتے ہیں۔ تھوڑا بہت پڑھے لکھے لوگ باباطاہر کی دوبیتیوں کو سند میں بھی پیش کر دیتے ہیں۔

اُردو میں میر کی عظمت کو ناسخ۔ غالب، ذوق اور دیگر شعراء نے تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح عطّار کے تذکرے میں عطّار کے لئے فارسی شعراء کی عقیدت کا ذکر شفق نے حوالہ جات سے کیا ہے۔

هفت شهر عشق را عطّار گشت — ما هنوز اندر خم یک کوچه ایم (رومی)
عطّار روح بود سنائی دو چشم او — ما از پئے سنائی و عطّار آمدیم
انچه گفتم در حقیقت اے عزیز — آں شنیده ستم من از عطّار نیز

محمود شبستری۔ مرا از شاعری خود عار ناید — کہ در صد قرن چوں عطار ناید

سعدی کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے پیشروؤں سے جا بجا استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ بڑی دلچسپ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً

فردوسی — زنا پاک زادہ مدارید امید — کہ زنگی بشستن نہ گردد سفید
سعدی — ملامت کن مرا چندان کہ خواہی — کہ نتوان شستن از زنگی سیاہی

فردوسی — ازیں پنج شیں روئے رغبت متاب — شب و شاہد و شہر و شمع و شراب
سعدی — شب است و شاہد و شمع و شراب و شیرینی
غنیمت است دمے روئے دوستاں بینی

سنائی — اندریں راہ در بدی نیکی است — کاب حیواں درونِ تاریکی است
سعدی — ز کار بستہ منیدیش و دل شکستہ مدار — کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکی است

چنانچہ اسی طرح کی مثالوں سے یہ کتاب بڑی دلچسپ بن گئی ہے۔

کتابت کی غلطیاں اور اختلافِ زبان کی مثالیں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مشائخوں حوادثات وغیرہ جمع الجمع کی مثالیں نہ ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

لیکن یہ فروگذاشتیں یا خامیاں شاذ کا حکم رکھتی ہیں اور مجموعی حیثیت سے افادیت میں یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ندوۃ المصنفین ایسی کار آمد علمی کتاب کی اشاعت کے لئے اور فاضل مترجم اپنی محنت کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔ ہر اچھی لائبریری کے لئے اس کتاب کا خریدنا ضروری ہے، اور نصاب میں بھی اس کتاب کو شامل ہونا چاہئے۔

آرٹ اِن اُردو پوئٹری ART IN URDU POETRY (انگریزی)

شہاب الدین رحمت اللہ صاحب مشرقی پاکستان میں کمشنر ہیں۔ ذوقِ تنقید اور ذوقِ شعر کی دولت سے بھی بہرہ مند ہیں۔ انگریزی میں اُردو شاعری پر یہ نادر کتاب اُن کے اس دو آتشہ ذوق کی شاہد ہے۔ پیش لفظ ڈاکٹر عبدالحق صدر انجمن ترقی اردو پاکستان نے لکھا ہے۔ کتاب بڑی دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ مجلد ہے، اور جلد پوش سے مزین۔ بائیس تصویریں کتاب کی زینت ہیں۔ ان سب تصویروں کا موضوع کوئی نہ کوئی مشہور شعر ہے۔ تصاویر کے لئے شعروں کا انتخاب اور پھر ان کے عین مطابق مصور کا عمل قابلِ تحسین ہے۔ ان تصویروں میں سے چھ نادر تصویریں مؤلف کی اہلیہ محترمہ کے موقلم کا نتیجہ ہیں۔ شاد عظیم آبادی کے ان شعروں کی تصویریں خوب ہیں۔

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

کتاب میں اردو کے مشہور اشعار اور ان کے ساتھ ہی ان کا انگریزی نظم میں ترجمہ بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ معقول نقد و تبصرہ بھی ساتھ ساتھ شامل ہے۔ مؤلف خود بھی شاعر ہیں اس لئے ترجمے میں وہ اصل کی روح کو قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ کتاب کے آخر میں مؤلف نے انگریزی ادب، انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کے اردو شاعری پر اثرات کے سلسلے میں مفصل بحث کی ہے۔ مشاعروں اور ان کی شاعر آفرینی کا ذکرِ خیر بھی ہے۔

ترجمے کی خوبی کا صرف ایک مثال سے اندازہ ہو جائے گا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

Behold, the tulip and the rose
A few of faces fair revealed
Here deep in dust, I do suppose
Lie many beauteous forms concealed.

لطفِ قوافی بھی ہے اور ترنمِ بحر بھی۔ پھر اصل سے نہ تجاوز ہے نہ اختصار۔ کتاب میں زندہ شعراء کا کلام شامل نہیں۔ اقبال سے مؤلف بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ انتخاب بہت معقول ہے۔ اختلاف کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ لیکن یہ کوشش بڑی نیک اور مسعود ہے۔ اردو شاعری سے متعلق انگریزی میں ایسی دلچسپ اور حسین کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ کہیں کہیں موازنے کی خاطر نہ بھی لطفِ سخن کی خاطر مؤلف نے اپنے اشعار بھی مشہور شعراء کے ساتھ ساتھ دے دئے ہیں۔ ان سے

کتاب کی متانت میں ہلکا سا فرق آگیا ہے۔ لیکن مؤلف کے شعر کسی حیثیت سے بُرے نہیں۔ کتاب کے آخر میں انڈکس بھی ہے۔ کاغذ بہت عمدہ اور دبیز ہے۔ قیمت دس روپے فی جلد۔ تقطیع ۲۹×۲۲/۸ ضخامت ۱۰۲ صفحات

ہندوستان میں ملنے کا پتہ۔ مائنرس ایمپوریم پوسٹ بکس ۱۱۲۱ بمبئی

گُفتنی ناگُفتنی شورش کاشمیری کے کلام کا مجموعہ۔ کتابت طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ تقطیع ۲۶×۲۲/۱۶ قیمت چار روپے

مطبوعات چٹان لاہور۔ دیباچہ از غلام رسول مہر

شورش ایک اچھے خطیب تھے اور ہیں، لیکن یہ سانحہ ایک خوش آیند واقعہ ہے کہ وہ شاعر بھی ہوگئے۔ یہ "ہوگئے" کا پیوند بھی انصاف پر مبنی نہیں، بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ شاعری ان کی فطرت میں خوابیدہ تھی۔ اب جاگ اُٹھی ہے اور پوری گھن گرج سے جاگ اٹھی ہے۔ شورش نے زندگی کے دس برس قید و بند میں گزارے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق دل کی اذیتیں جسم پر بیت گئیں۔

شورش اختر شیرانی اور احسان دانش سے بہت قریب رہے ہیں۔ دونوں کی شاعری کا امتزاج ان کی شاعری میں موجود ہے۔ اختر سلمیٰ کو روتا تھا، شورش ربیعہ کے غم میں غلطاں ہے۔ ہر چند وہ کہے کہ ربیعہ شعری احساسات کا جمالیاتی تخیل ہے۔ دیکھنے والے اگر اس پردۂ زنگاری میں کوئی نہ کوئی معشوق دیکھیں تو اُن کا قصور نہیں۔

شورش کی ردیفیں بڑی حسین، بحریں مترنم اور قافیئے صوتی اور راگ کے آئینہ دار ہیں۔ جہاں سیاسی مسائل یا مجلسی معائب کا ذکر آتا ہے نوبت تلخ نوائی تک پہنچ جاتی ہے۔ خود شورش کو اس کا اعتراف ہے ؎

کچھ لوگ مری تلخ نوائی سے خفا ہیں   لیکن مجھے اُس جرم سے انکار نہیں ہے

اپنی زندگی اور مسلک سے متعلق تین شعر انھوں نے کہے ہیں۔

دس سال قید و بند میں دفنا چکا ہوں میں
یہ خدمتِ وطن کا صلہ پا چکا ہوں میں

نوجواں عمر کے دس سال گزارے میں نے   قید کی گود میں ناموسِ وطن کی خاطر

بارہا سختیٔ قانون کا دل ڈوب گیا   میری للکار سے انگریز کے ایوانوں میں

اب ان کے کچھ اچھے شعر ملاحظہ فرمایئے۔

زر پرستوں کو ہے انکار تو انکار کریں   میرا ایماں ہے غریبوں کا خدا آج بھی ہے

معذرت شیوۂ مردانِ اولوالعزم نہیں   آج بھی اپنی صداقت پہ ہے اصرار مجھے

اک نئے دَور کی ترتیب کے ساماں ہوں گے   دستِ مجبور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے
برق خود اپنی تجلّی کی محافظ ہوگی!   پھول خود اپنی لطافت کے نگہباں ہوں گے

اپنے باب میں خود کہتے ہیں۔

تہذیب خطابت ہو کہ تہذیب صحافت   ان دونوں محاسن کا نمائندہ رہوں گا

کچھ اپنی سرگذشت کہی ہے برنگ شعر   کچھ آپ کے لئے بھی غزل خواں رہا ہوں میں
عزیزوں کی ستائش دوستوں کی داستاں لکھی
مجھے جس دن سے شورش شعر کہنے کا شعور آیا

"قصیدے لکھو" کے عنوان سے ایک نظم کا آخری شعر ہے ؎

اس چمن زار میں رہنا ہے تو اک کام کرو   اپنے انمول خیالات کو نیلام کرو

اب ذرا فقیہہ ریاکار کے دشمن اس مولوی نما صحافی و خطیب کے دل کی دھڑکنیں دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ وہ فطرتاً شاعر ہے یا کچھ اور۔

سُبو سے ربط بڑھائیں فضا پہ لہرائیں   یہ سامنے ہے چلو میکدے میں ہو آئیں
لطیف نغمہ الاپیں کہ چاند روشن ہے   عجب نہیں کہ ستارے شراب بن جائیں

مطربہ ساز اٹھا رات چلی جاتی ہے   اک غزل اور سنا رات چلی جاتی ہے
حادثے عشق کا عنوان خصوصی ہی سہی   اب انھیں بھول بھی جا رات چلی جاتی ہے
خوب ہے نیم نگاہی بھی مگر وقت نہیں   آنکھ سے آنکھ ملا رات چلی جاتی ہے
اپنے اس ریشمی آنچل کی اُڑانوں پہ نہ جا   کھول دے بندِ قبا رات چلی جاتی ہے

شورش کبھی کبھی ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کردار بہت بلند ہے لہٰذا انھیں مذہب اور اخلاق سے بڑا ذہنی لگاؤ ہے، چنانچہ ان سرحدوں میں پاکیزہ کردار کے جو تقاضے ہیں اُن کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ اپنے اشعار میں تہذیب جدید کی تعیش پسندی کا گلہ بہت کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

حسین فارسی ترکیبیں اور دلکش ردیفیں اور بحور آپ کی شاعری کی جان ہیں۔ ایک آدھ جگہ کوئی زبان و فن کی خامی نظر آئے تو وہ تقاضائے بشریت ہے۔ ایک جگہ آپ نے "گلاب دہن" لکھا ہے۔ گلاب پھول کے معنی میں خالص ہندی ہے "گُل دہن" ہونا چاہیئے۔ اس گوقلموں اور رنگارنگ مجموعے پر شورش مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ابھی خود ان کے قول کے مطابق سینکڑوں عنوان ان کے لئے بکھرے پڑے ہیں،

جن پر وہ شعر آزمائی اور سخن سرائی کریں گے۔

دامانِ باغباں سے کفِ گلفروش تک
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنوان کے لئے

دیہاتی دنیا

اس کتاب میں دیہات اور دیہاتیوں کی اصلاح سے متعلقہ ضروری باتوں کو سادہ اور سلیس طریق سے اردو نظموں میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف مہتہ امرنا تھ موہن پیٹا نے بزرگوں میں سے ہیں اور اردو شعر وادب پر اُن کا یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ہندوستان میں اس وقت دیہات کی ترقی پر خاص توجہ کی جارہی ہے۔ ہمارے پہلے اور دوسرے پنج سالہ پلان میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے۔ فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے اس کتاب کی افادیت کا پتہ چل جاتا ہے تیس کے قریب عنوانات پر سلیس نظمیں ہیں۔ صفائی کی برکتیں، گاؤں کے تالاب، روشن دان، گاؤں کی پنچایت، بکھرے کھیتوں کا اکٹھا کرنا، عورتیں اور گوبر، نہری کھیتی، آوارہ کتے، ٹڈی دل، پشوؤں کی حفاظت وغیرہ عنوانات سے [illegible] بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔

مہتہ صاحب کے کلام میں شیرینی اور حلاوت ہے۔ نمونے کے لئے " زمیندار کا سونے کا خزانہ " کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے

گوبر کا انتظام کرو دیکھ بھال کر	سونے کا یہ خزانہ ہے رکھو سنبھال کر
گوبر بہت ہے قیمتی گوبر ہے کیمیا	یہ ایک ہی کسان کے سو دُکھ کی ہے دوا
بیکھ گڑھوں کی کھاد جو کھیتوں میں ڈالنا	ہو جائے پھر اناج کا مشکل سنبھالنا
فصلیں جو کھا دوالی زمینیں اُگائیں گی	فصلیں وہ سے کے تھیلیاں نیچے کی لائیں گی
بھرپور جب اناج سے ہو جائیں گے گدام	مٹ جائیں گی کسان کی پھر دھڑکنیں تمام
پھل خوشی کی ہر کوئی کھیلے گا چھاؤں میں	بسرام ہر کوئی کرے گا سکھ کی چھاؤں میں

اس کتاب کو لائبریریوں کی زینت بننا چاہیئے۔ پنچایت والے اسے چوپال میں دیہاتیوں کو پڑھ کر سنانے کا انتظام کریں۔ کمیونٹی پراجیکٹوں کے سنٹر اسے خریدیں۔ الغرض ایسی کارآمد نظم کی کتاب کی ہر طرح حوصلہ افزائی ہونا چاہیئے۔ مصنف ایک اور بڑا کام کریں اگر اسے دیوناگری حروف میں شائع فرمادیں۔

ضخامت ۴۲۲ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، مجلد اور جلد پوش سے مزین کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ

ا۔ مہتہ امرنا تھ موہن ایڈوکیٹ۔ شکتی نگر دہلی

۲۔ دیہاتی پستک بھنڈار۔ چاوڑی بازار دہلی

دبستانِ روس

چند روسی نظموں کا منظوم ترجمہ ڈاکٹر تشفا

مصنف۔ ڈاکٹر پریم پال اشک [illegible]

نے اس کتاب میں شائع کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اس کتاب کے بارے میں اچھی رائے پیش کی ہے۔ گورکی کی ایک نظم، پشکن کی ایک طویل نظم خانہ بدوش اور یوگینی انیگین کے اقتباس، اکریلوف کی کہانیاں اور انقلاب کے بعد کی شاعری کے چند نمونے ترجمے کے لئے منتخب کئے گئے ہیں۔ یہ انتخاب کسی سلسلے کے تحت نہیں پھر بھی قاری کو روسی زبان کی شاعری کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ترجمہ سہل اور سلیس ہے۔ کتابت اور فن کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ پہلی ہی نظم کے پہلے ہی شعر میں ' غیض ' لکھا ہے۔ ' غیظ ' ہونا چاہیئے۔

پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ دہلی نے جو خود روسی اچھی طرح جانتے ہیں اس کتاب کے باب میں اچھی رائے ظاہر کی ہے اور ترجمے کی معقولیت کا اعتراف کیا ہے۔

کتاب مجلد ہے اور ۲۲×۳۶/۱۶ تقطیع کے ۱۴۰ صفحوں پر مشتمل ہے قیمت فی جلد ۴ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ قصرِ اردو، اردو بازار دہلی

رسالے

ساقی۔ سال نامہ۔ ۴۰۸ صفحوں پر مشتمل یہ سال نامہ اپنی مثال آپ ہے مُدیرِ ساقی شاہد احمد صاحب کی یہ کوشش واقعی کوشش مشکور ہے۔ مندرجات میں گزارشات کے علاوہ منظومات، مقالات، ناولٹ، غزلیات، افسانے اور ڈرامے شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں ہندوستان اور پاکستان کے اچھا لکھنے والے شامل ہیں۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ مینجر رسالہ ساقی کراچی (پاکستان)

نقوش رسالہ نقوش لاہور ۵۵، ۵۶۔ مارچ ۱۹۵۶ء۔ ادارۂ فروغ اردو لاہور۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۲۰۸ صفحے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری پر چار قیمتی مضمون شاملِ اشاعت ہیں۔ یادِ مجاز کے سلسلے میں دو مضمون محمد رضا انصاری اور ڈاکٹر محمد حسن کے قابلِ مطالعہ ہیں۔ مجاز کا غیر مطبوعہ کلام بھی شاملِ اشاعت ہے، اس کے علاوہ فراق کے خطوط، نظمیں، غزلیں، افسانے غرضیکہ سب کچھ ہے اور جو کچھ بھی ہے اچھا ہے۔

کمال پاشا

لوری

میرے منّے پیارے منّے　　میرے راج دلارے منّے
میرے جیون کے اُجیارے　　سو جا میرے پیارے منّے
نیل گگن سے تارے لاؤں　　ان تاروں کا ہار بناؤں
پہنا کر یہ ہار نرالا　　تجھ کو پیارا گیت سناؤں
میری آشاؤں کی کیاری　　میرے جیون کی پھلواری
میری دُنیا میری جنّت　　صورت تیری چاند سے پیاری
اچھے سے پروان چڑھاؤں　　دُنیا میں بلوان بناؤں
اچھی اچھی باتیں کہہ کے　　اک اچھا انسان بناؤں

اچھے اچھے کام کرے گا
دُنیا میں کچھ نام کرے گا
میرا راج دُلارا مُنّا
دُنیا میں آرام کرے گا

قمر ارمان

بھُوتنی

بہت دن پہلے کی بات ہے - رتن پور گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا - اس کا نام شاموں تھا - وہ بڑا ہی سیدھا سادہ اور نیک آدمی تھا -

لیکن اس کی بیوی بڑی چالاک اور خود غرض تھی - جب شاموں گھر پر رہتا وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی تھی - جیسے وہ نہ جانے کب سے بیمار پڑی ہو - وہ بڑی مکّار اور کاہل بھی تھی -

شاموں بے چارہ اپنے ہی ہاتھوں سے کھانا پکاتا - اور وہ آرام سے پڑی رہتی اور جب وہ کھاپی کر کھیت پر چلا جاتا تو وہ چارپائی سے اُٹھتی غسل وغیرہ کرتی اور پھر اچھے اچھے کھانے بنا کر خود کھاتی -

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا - اور بیچارے شاموں کو اس کی کچھ بھی خبر نہ تھی - اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا -

ایک دن جب شاموں کھاپی کر اپنے کھیت پر اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق پہنچا تو اسے اپنا حُقّہ یاد آیا جسے وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا اور جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو چند لمحے بیٹھ کر اُسے آرام سے پیا کرتا تھا -

وہ اُلٹے پاؤں گھر کی طرف لوٹا - جوں ہی اس نے گھر کے اندر قدم رکھا اس کی بیوی پر نظر پڑی - جو بڑی تیزی سے باورچی خانہ میں داخل ہو رہی تھی -

وہ چند منٹ کے لئے رُکا رہا - پھر وہ دبے پاؤں اندر گیا اس نے اپنا حُقّہ لیا اور واپسی میں اس نے ایک نظر اپنی بیوی کو باورچی خانہ میں جھانک کر دیکھا - وہ اچھے اچھے کھانے بنانے میں لگی ہوئی تھی -

اُسے یہ سب کچھ دیکھ کر غُصّہ آگیا - مگر اس نے اپنے غُصّے کو پی لیا - اور دل ہی دل میں کچھ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا -

اُسے غصّہ صرف اس بات پر تھا کہ اگر اُسے اچھے اچھے کھانے کھانے کی خواہش تھی - تو اس نے مجھ سے کیوں چھپایا -

اس کی بیوی مزے سے باورچی خانے میں کھانے پکاتی رہی اُسے نہ شاموں کے آنے اور نہ جانے ہی کی خبر ہوئی -

دوسرے دن جب وہ کھیت پر جانے لگا تو اس نے اپنی بیوی

سے کہا — سُستی ہو جی! دن رات پڑی پڑی کیا کرتی ہو۔ بازار سے روئی لا دیتا ہوں ۔ سُوت ہی بیٹھی کاتا کرو ۔

اس کی کاہل بیوی دل ہی دل میں بہت جھلّائی ۔ اس نے یوں ٹالنے کے لئے کہا ۔ اچھا ۔ اچھا! لے آنا ۔ کات دُوں گی —

شاموں اُسی دن شام کو بازار گیا اور وہاں سے ایک گاڑی کپاس لاکر اس نے ایک کوٹھڑی میں بھر دیا ۔

اس کی بیوی کو اس کی اس حرکت سے کافی رنج ہوا ۔ مگر وہ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ بولی ۔ خاموش ہی رہی ۔

کئی ماہ گزر جانے کے بعد ایک روز کھیت پر جاتے وقت اس نے اپنی بیوی سے پوچھا ۔ کتنا سُوت تم نے کاتا ہے؟ — دیکھو جتنا بھی سُوت تم نے کاتا ہے وہ سب باہر نکال دینا ۔ میں کل صبح بازار جاؤں گا تو وہیں بیچ دوں گا ۔"

اب تو وہ بہت گھبرائی ۔ چونکہ اُس نے اب تک ایک روز بھی سُوت نہیں کاتا تھا ۔ مگر وہ جتنی کاہل تھی اتنی ہی چالاک بھی تھی کچھ دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک ترکیب سُوجھی اور وہ خوش ہو اُٹھی ۔

جنگلی جانور سے فصل کو بچانے کے لئے وہ رات کو کھیت ہی پر رہا کرتا تھا ۔

جب کافی رات گزری تو وہ پلنگ سے اُٹھی ۔ اس نے سب سے پہلے اپنے مُنہ پر خُوب کالک لگائی ۔ اس کا مُنہ کالی کلوٹی ڈراؤنی شکل کا بن گیا ۔ پھر اس نے ایک ہانڈی میں جلتی ہوئی آگ رکھی اور اسے اپنے سر پر رکھ کر کھیت کی طرف چلی جہاں شاموں بیٹھا کھیت کی رکھوالی کر رہا تھا ۔

شاموں ابھی کام ختم کر کے بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا ۔ یکایک اس کی نظر جلتی ہوئی آگ پر جو ہانڈی میں جل رہی تھی اور برابر اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی ۔ وہ ڈرتا ہوا اس طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔

جب وہ قریب پہنچی تو اُسے دیکھ کر وہ کانپ سا اُٹھا اپنے سامنے ایک بھُوتنی کو دیکھ کر اُس کے رہے سہے ہوش اُڑ گئے ۔

بھُوتنی اس کے سامنے ناچتی ہوئی بولی — تم کو مار کر تمھارا

خون پیوں شاموں یا تمھاری بیوی نے جو سُوت کاتے ہیں اُسے تُوم کر پھر کپاس بنا دوں ۔ کہو تم کیا چاہتے ہو؟

وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا ۔ بھُوتنی کے مُنہ سے یہ سُن کر اس کی جان میں جان آئی ۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا — اے مہارانی تم میری جان بخش دو ۔ پھر چاہے سارے سُوت کپاس ہی کیوں نہ کر دو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا" —

اچھا! — ڈراؤنی سی آواز میں اس نے جواب دیا اور پھر ناچتی ہوئی جدھر سے آئی تھی چلی گئی —

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی وہاں سے گھر کی طرف بھاگا ۔ چونکہ وہ بہت ڈر گیا تھا اور اب اس کا کھیت پر ایک منٹ بھی ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا ۔

اس کی بیوی کو لیٹے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہ گھر میں داخل ہوا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا — اس کی بیوی جو اپنا ہاتھ منہ دھو کر پلنگ پر لیٹی بناوٹی خرّاٹے بھر رہی تھی۔ یک لخت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور شاموں کو تعجب سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"آخر بات کیا ہے؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کھیت میں کوئی شیر وغیرہ گھس آیا ہے کیا؟ —"

"نہیں — ایسی کوئی بات نہیں — وہ رُک رُک کر بولا اور پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس بھوتنی کا سارا قصہ اُسے کہہ سُنایا

اور جب قصہ سُنا تو وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی اور روتے ہوئے بولی: "ہائے ہائے میری اتنے دنوں کی محنت رائیگاں گئی۔ اب میں کیا کروں خدایا! —"

"ارے روتی کیوں ہے؟ — شاموں نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "پہلے چل کر دیکھ بھی تو کیا سچ مچ سارا سُوت کپاس ہو گیا ہے —"
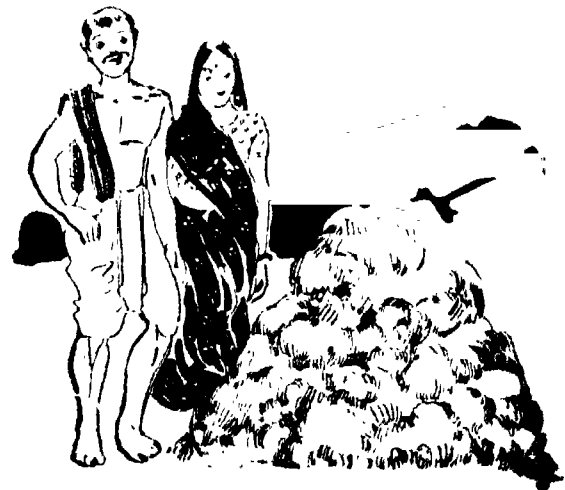
وہ دونوں میاں بیوی وہاں سے اُٹھے اور کوٹھڑی کے قریب پہنچے۔ اس کی بیوی نے کوٹھڑی کھولی تو وہ اور بھی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ شاموں نے دیکھا سچ مچ کوٹھڑی میں صرف روئی ہی بھری پڑی تھی۔ سُوت کا ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ اُس نے بیوی کو ڈانٹ کر کہا: "خبر مناؤ کہ میری جان بچ گئی۔ روئی تو پھر بھی کاتی جا سکتی ہے —"

اب تو اُسے اور بھی گھبراہٹ ہوئی کہ جس کام سے بچنے کے لئے اس نے سارا ڈھونگ رچایا مگر پھر بھی چھٹکارا نہ ملا۔

اور اُسی روز سے اُس نے سُوت کاتنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کام سے گھبرانا اچھا نہیں۔ کاہلی ہی سب مصیبتوں کی جڑ ہے۔ اور اس سے سوائے نقصان کے فائدہ نہیں۔

لطیفے

مجسٹریٹ ۔ حاضرین عدالت میں سے اگر کسی نے شور مچایا تو ہم باہر نکال دیں گے۔

چور ۔ لیجئے میں شور مچاتا ہوں مجھے باہر نکال دیجئے۔

لٹیرا ۔ (گھڑی ساز سے) اس گھڑی کی مرّمت کا کیا لوگے؟

گھڑی ساز ۔ جتنی اس گھڑی کی قیمت ہے اُس سے آدھی بنوائی لوں گا۔

لٹیرا ۔ میں نے چار گھونسے مار کر یہ گھڑی ایک آدمی سے چھینی تھی۔

گھڑی ساز ۔ تو تم کو دو گھونسے ابھی ماروں یا گھڑی بن جانے کے بعد۔

بچّہ ۔ پتاجی مجھے ایک ڈھول لے دو۔

باپ ۔ بیٹا تم ہر وقت شور کرو گے۔ کوئی کام نہ کرنے دو گے۔

بچّہ ۔ ہرگز نہیں۔ میں اُس وقت بجایا کروں گا جب آپ گہری نیند سو جایا کریں گے۔

جہاز کا کپتان ۔ (مسافروں سے) سمندر میں جوار بھاٹا آرہا ہے جہاز ڈوبنے کا ڈر ہے۔

ایک مسافر ۔ ڈوب جانے دو۔ آپ نے کرایہ بھی بہت لگا رکھا ہے۔

امرت لال عشرت

پہاڑ کی شام

وہ دیکھو پربت کے پیچھے سورج گرتا جاتا ہے

ہرے ہرے پربت پر کیسا سونا سا پگھلاتا ہے

ڈھلتی دھوپ کی کومل کرنیں پھیکی پڑتی جاتی ہیں

شام کی سانجھ سلونی پریاں وادی پر لہراتی ہیں

اُجلے اُجلے ڈھور بنوں سے نکلے ہیں گھر جانے کو

چرواہوں کے گیت بہاریں دیتے ہیں ویرانے کو

گاؤں گاؤں پربت پربت ناچ رہی ہے دُھندیالی

ڈر کے مارے کانپ رہی ہے کھیت کھیت کی ہریالی

تھوڑی دیر میں کالی چادر دُنیا پر تن جائے گی

رات کی رانی نیند کے میٹھے میٹھے گیت سنائے گی

دُور کے نیلے نیلے پربت کُہرے میں کھو جائیں گے

ننھے پنچھی چہک چہک کر پیڑوں پر سو جائیں گے

ایک خط

(بھوپال میں سولہ سال سے کم عمر کے بچوں نے خطوط نویسی کے ایک مقابلے میں حصہ لیا۔ سعیدہ سلمہ کا یہ خط اس مقابلے میں اوّل درجے کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔)

میرے ننھے ساتھی!

جب میں بہت چھوٹی تھی، اسی وقت سے مجھے خط لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی ہم جماعت سہیلیوں کو اگرچہ وہ مجھ سے قریب ہی رہا کرتی تھیں، کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کرتی تھی۔ وقت گزرا حالات بدلے میرے اور بہت سے ساتھی پیدا ہوئے۔ ان میں سے کچھ بچھڑ کر ہمارے شہر سے دُور کسی دوسرے شہر میں چلے گئے۔ اب تو خط لکھنے کی اہمیت میرے لئے اور زیادہ ہوگئی اور میں ایسے دوستوں کے پتے حاصل کرلیتی۔ اور ان کو خط لکھ کر اپنے حالات بتاتی اور ان کے حالات معلوم کرتی۔ ایسے مجھے پتہ چلا کہ یہ خط وکتابت بھی تعلّقات برقرار رکھنے کے لئے کتنی ضروری چیز ہے۔

آج جب کہ میں یہ خط لکھ کر تم کو دوستی کی دعوت دے رہی ہوں، جو مجھ سے ہزاروں میل دور اپنے ملکی ماحول اپنے دیش کے ساتھیوں کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہے تو میں کتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہ دنیا سمٹ سمٹا کر تعلقات کی شکل میں ایک چھوٹے سے دائرے میں آگئی ہے۔ یہاں تک کہ میں بھی اس میں اپنی عمر کی مناسبت سے تعلقات پیدا کر رہی ہوں سائنس کی ترقی نے جہاں فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ اقتصادی مشکلات کو دور کیا اور سیاسی تعلقات میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ وہاں انسان میں یہ احساس بھی پیدا کر دیا ہے کہ امن اور بھائی چارے ہی میں قوموں کی بقا ہے یہی وہ احساس ہے جس کے سہارے انسان امن کی زندگی گزار سکتا ہے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی امن کی دعوت دے سکتا ہے۔ اخبار رسالوں اور کتابوں میں یہ پڑھ کر ہم تم اور ہمارے بھائی بہن کتنے خوش ہوتے ہیں کہ دنیا میں اب امن اور بھائی چارہ پیدا کرنے کے لئے یو این او، اور اسی قسم کے اور ایسے ادارے قائم ہوگئے ہیں۔ جو رات دن جدوجہد کر کے اس بہترین جذبے کو کامیاب بنانے کے لئے اَن تھک کوشش کر رہے ہیں اور جب ہم ان اداروں کی تھوڑی سی بھی کامیابی دیکھتے ہیں تو کتنا سکون محسوس کرتے ہیں ان کے اس پروگرام کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہماری اور ہمارے بعد کی نسلوں کو جنگ جیسی لعنت سے بچانے کے لئے تیار کئے گئے ہیں تو ہماری کس قدر حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کیا کیا غلطیاں کی ہیں اور تاریخ کا کوئی ورق ایسا نہیں جس کو

ہم جنگی واقعات سے خالی پائیں ۔ بہر حال اب ہمارا یہ کام ہے کہ سائنس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور آپس میں مل جل کر رہیں ۔ وہ غلطیاں جو ہمارے بزرگوں سے ہوئی ہیں انھیں ہم نہ دہرانے پائیں ۔ بچپن میں جب ہم کھیلا کرتے تو تمھارے ملک کے بنے ہوئے کھلونے ہمارے لئے کافی تعداد میں آئے تھے اور انھیں ہم اس لئے بہت زیادہ پسند کرتے تھے کہ وہ بہت سبک اور ان کی بناوٹ بالکل اصل کے مطابق ہوتی تھی ۔ اور پچھلی جنگ میں تمھارا ہی کھلونے بنانے والا ملک لڑائی میں شامل ہوا ۔ اور حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ ہاتھ جو کھلونے بناتے تھے ۔ کھلونے بناتے بناتے جنگی سامان تیار کرنے لگے ۔

ہم اور تم ایک ہی دھرتی کے باسی ہیں ۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے مجھے کافی متاثر کیا اور میں تمھارے ملک کے بارے میں بھی معلومات کرتی رہی ۔ ہمارے ملک الگ الگ ضرور ہیں مگر ہمارے دل ایک ہیں ۔ ہم امن کے پجاری ہیں اور تم بھی اور جب تمھارے ملک کو ترقی اور خوشحالی کی راہوں پر چلتے دیکھتے ہیں تو کتنی خوشی ہوتی ہے ہمارے بھارت کی مثال ہی لے لو کہ سالہا سال سے انگریزی سامراج کا غلام رہا اور غلامی کی زنجیریں اس قدر مضبوط ہو گئی تھیں کہ ٹوٹے نہ ٹوٹتی تھیں ۔ لیکن طوفان جب سر سے اونچا ہو جاتا ہے اور پسماندگی اور غلامی کا احساس شدید ہو جاتا ہے تو شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے اور ضرور کچھ نہ کچھ نتائج برآمد ہوتے ہیں ۔ چنانچہ انگریزی سامراج کو ہار ماننا پڑی اور ہم آزادی کی دنیا میں سانس لینے لگے ۔ ہمارے باپو نے ہم کو امن کا سبق سکھایا ہے ۔ ہمارے چاچا نہرو کو تو تم نے بھی دیکھا ہوگا ۔ وہ بھارت کے وزیر اعظم ہیں مگر ہمارے چاچا نہرو ہیں ۔ تم نے ان کی شیروانی میں گلاب کا پھول ضرور دیکھا ہوگا ۔ وہ امن کا نشان ہے ۔ گلاب کے پھول کی طرح ہمارے چاچا بھی امن کا ہنستا ہوا پھول ہیں ۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں ۔ جب وہ تمھارے دیس میں گئے تھے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ بچوں سے کتنا پیار کرتے ہیں ۔

ہمارے ملک میں کھیتی باڑی کی بھی بہت ترقی ہوتی ہے ۔

مجھے موسیقی اور مصوری سے کافی لگاؤ ہے ۔ اس لئے میں بطور تبادلہ تم سے ایسی ہی چیزیں لینا پسند کروں گی ۔ پھر میں تمھارے مذاق کے سنہرے پن کی پوری طرح داد دے سکوں گی ۔ مجھے بہت ارمان ہے کہ ایک بار تمھارے ملک کی سیر کروں ۔ تاکہ میں دھان کے مناظر دیکھوں ۔ دھان کی پھولوں سے لدی ہوئی کیاریاں دیکھوں اور ان میں کھیلتی پھروں ۔ اور پھر بھارت جیسی عبادت گاہوں کی سیر کروں ۔

میری یہی کوشش رہے گی اور مجھے امید ہے کہ میں ضرور اپنے ارادے میں کامیاب ہوں گی ۔ ہو سکتا ہے ۔ تم بھی کبھی ہمارے دیش میں آؤ ۔ تم بھی یہاں آنے کی خواہش رکھتی ہوگی ۔ دیکھو اگر تم مجھ سے پہلے ہی بھارت آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا ۔

غلطیاں

۱ ۔ جو کام اپنے سے نہ ہو سکے وہ تمام انسانوں کے لئے ناممکن خیال کرنا ۔

۲ ۔ اپنا راز دوسرے کو بتا کر اس کے پوشیدہ رکھنے کی سفارش کرنا ۔

۳ ۔ بےکاری میں راحت محسوس کرنا ۔

۴ ۔ ہر بات میں اپنی ہی رائے کو صحیح سمجھنا ۔

۵ ۔ دوسروں کی تکلیف میں حصہ نہ لینا اور اپنی تکلیف میں دوسروں کی امداد کی توقع رکھنا ۔

۶ ۔ اس نیت سے عیب کرنا کہ ایک دو بار مزا لے کر پھر اپنے کو اس عیب سے بچا لوں گا ۔

ظفر علی سید

سُنہری مچھلی

صبح ہوتے ہی سورج نے اپنی روپہلی کرنیں دریا میں پھیلا دیں۔ تھوڑی دور پر ایک کشتی نظر آئی جس میں ایک مچھیرا تھا۔

اس نے پانی میں جال پھینکا مگر جال خالی نکلا۔

وہ دوبارہ جال پھینکنے ہی والا تھا کہ اُسے جال میں ایک ننھی سی مچھلی نظر آئی۔ اس کا رنگ سُنہرا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ مچھیرے نے جب اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مچھلی بولی:۔

"اے مچھیرے مجھے چھوڑ دے۔ میں سمندر کے بادشاہ کی بیٹی ہوں، جو مانگے گا۔ میں تجھے دوں گی"۔

مچھیرے کو یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا اور اُس نے کہا۔

"اچھا! میرا جال سونے کا بنا دے"۔

تھوڑی دیر میں اس کا جال سونے کا بن گیا۔ اور مچھلی نے کہا "تیرا جال سونے کا بن گیا، اب تو مجھے چھوڑ دے"۔

مچھیرا سونے کا جال دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور بولا۔

"ہاں، ہاں تجھے ابھی چھوڑتا ہوں۔ لیکن میرے پتوار بھی سونے کے بنا دے"!

تھوڑی دیر میں اس کے پتوار بھی سونے کے بن گئے اور مچھلی نے کہا "تیرا جال سونے کا بن گیا۔ تیرے پتوار سونے کے ہو گئے — اب تو مجھے چھوڑ دے"۔

مچھیرے نے سونے کے پتوار کو دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگا اور کہا "تو بڑے کام کی چیز ہے — میں تجھے نہیں چھوڑوں گا"۔

یہ سُن کر سنہری مچھلی کی نیلی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولی۔

"اچھے مچھیرے! مجھے چھوڑ دے — سمندری دنیا میرا انتظار کر رہی ہوگی"۔

مچھیرے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تو نے میرا جال سونے کا بنایا۔ پتوار سونے کی بنائی — میں تجھے کیسے چھوڑ دوں"؟

وہ سوچنے لگا میں اس کے ذریعے اور بھی دولت حاصل کر سکتا ہوں۔ اس نے مچھلی سے کہا۔

"اچھا، اب میری کشتی سونے کی بنا دے"!

کشتی فوراً سونے کی بن گئی اور پانی میں ڈوبنے لگی۔ مچھیرا چلّایا۔ وہ کودنا چاہتا تھا کہ سونے کے جال میں اس کے پاؤں پھنس گئے۔ وہ گھبرا کر جو گرا تو سونے کی پتوار پر — اس کا سر پھوٹ گیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور کشتی پانی میں ڈوب گئی۔

یہ کتابیں پڑھیئے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے۔
اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کیجئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک بڑے سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے وہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم امور بیان کئے گئے ہیں۔

[illegible] ۴ ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کارنمایاں میں حصّہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیر تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے ہاں کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو کی علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دلکشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار لوگوں کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دلکش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے نامور اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنہوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

آجکل

ہماری کتابیں
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش
سے ایک نیا مستقبل
عالم وجود میں آرہا ہے۔
اس تابناک مستقبل کی جھلک
اس مختصر سے کتابچے میں دیکھئے
قیمت۔ -/۴/-
پہلا پنج سالہ پلان
چھٹا ایڈیشن
اس ایڈیشن میں
پنج سالہ پلان کے بارے
میں ہر قسم کی تفصیلات
درج ہیں۔ زبان سادہ
و دلکش ہے۔ قیمت -/۲
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت
ہم سماجی بہبود کے
میدان میں کیا کر رہے
ہیں اس کی جھلک اس
پمفلٹ میں ملاحظہ فرمائیے
-/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار
کیا گیا ہے۔ زبان نہایت
آسان ہے۔ تصویریں اور
خاکوں سے اس کی دلکشی میں
اور اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
ٹرانسپورٹ
اور
پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت
آمد و رفت اور رسل و رسائل
میں جو بہتریاں ہمارے
پیش نظر ہیں اس کا مفصل
نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
-/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا
کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود
کیا ہے اس کتابچے میں جامع
اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا
ہے۔ قیمت -/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:- مالابار کے ساحل پر ماہی گیری

(عکس - جے بھٹا چارجی)

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ ــــ نمبر ۱۱

سالانہ چندہ:- [ہندوستان میں چھ روپے / پاکستان میں - چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- دس شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- [ہندوستان میں آٹھ آنے / پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

جون سنہ ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سکریٹریٹ، دہلی

سکندر علی وجد

غزل

غمِ زندگی گوارا تری مستیٔ نظر سے

مری رفعتِ تخیّل ہے شکستِ بال و پر سے

یہ نشاطِ تیز گامی ہے کمال شادکامی

مجھے منزلوں سے مطلب نہ غبارِ رہگزر سے

وہ مقام میکدے ہیں وہ جہاں جہاں رُکے ہیں

ہیں قدم قدم پہ گُلشن وہ گُزر گئے جدھر سے

یہ نگاہِ شرم آگیں یہ شکارِ شیر و شاہیں

یہی راز پُوچھنا ہے ترے حُسنِ کارگر سے

کہیں موسمِ بہاراں کہیں زندگی غزلخواں

ترے حُسن کی بدولت مرے شعر کے اثر سے

نہ کلامِ نشتر افشاں نہ سلامِ تیغِ عُریاں

دلِ وجدؔ ہے پریشاں ترے حرفِ بے ضرر سے

مختار الدین احمد

راجا رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ

(گارساں دتاسی کے نام)

اردو ادب کے محسن اور مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی سے اردو ادب کا کون طالب علم واقف نہیں۔ ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور "تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی" ہے جو دوبار چھپی اور اب نہایت کم یاب ہے۔ ان کی ایک اور کم یاب تصنیف اردو زبان کے قواعد سے متعلق ہے جو پیرس سے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی زبان سیس(؟) فرانسیسی ہے، جس میں اردو زبان کے قواعد اردو مثالوں کے ساتھ درج ہیں۔ اس کے دوسرے حصے میں اردو اور ہندی کے کچھ خطوط اور رقعات فرانسیسی ترجمے اور حواشی کے ساتھ مندرج ہیں۔ یہ حصہ ضمیمے کے طور پر پیرس ہی سے ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں اردو کے ۱۸ خطوط اور رقعات ہیں جن میں سب سے قدیم خط ۱۸۱۰ء کا لکھا ہوا ہے، جب مرزا غالب کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس مجموعے سے رام موہن رائے کا لکھا ہوا ایک رقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے دتاسی کو انگلستان سے لکھا تھا۔

رام موہن رائے شاہِ دہلی اکبر ثانی کے سفیر اور وکیل بن کر انگلستان آئے تھے۔ یہاں انھوں نے اپنے دوران قیام میں بہتوں کو متاثر کیا۔ اس کے ثبوت میں وہ مضامین اور کتابیں پیش کی جاسکتی ہیں جو ان کے متعلق یہاں لکھی گئیں۔

مشہور فرانسیسی رسالے "ایشیاٹک جرنل" بابت ۱۸۳۳ء جلد ۱۲ صفحہ ۱۹۵ میں ان پر ایک پُرمعلومات مضمون شائع ہوا۔ اسی سال M. Sandford Arnot نے جو دوران قیام انگلستان میں رام موہن رائے کے سکرٹری تھے۔ ان کے حالات میں ایک مضمون Athenaeum (اکتوبر ۱۸۳۳ء) میں شائع کیا۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ مضمون نگار کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ Rev. Lant Carpenter نے ان کی بہت اچھی سوانح عمری لندن سے ۱۸۳۳ء میں شائع کی۔ ایک سال کے بعد ان کی بیٹی مس کارپنٹر نے اس مواد کو استعمال کیا اور کچھ نئی معلومات حاصل کیں اور ایک بہت دلچسپ کتاب Last Days in England of the Raja Ram Mohan Roy کے نام سے ۱۸۳۴ء میں شائع کی۔ یہ کتاب بہت اہم ہے اور ان کے زمانۂ قیام انگلستان پر اس سے بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

خود اس اردو رقعے کے مکتوب الیہ گارساں دتاسی نے رام موہن رائے کا تفصیلی ترجمہ اپنی تاریخ ادبیات جلد دوم صفحات ۵۴۸-۵۵۲ (اشاعت دوم) میں لکھا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔

اب رقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

جنابِ فضیلت مآب! زاد مجدہم و شرفہم

رقعۂ مبارک پہنچا و بندہ کو مسرور و معزز کیا۔ قادرِ علی الاطلاق آپ کو اس یادآوری کے ساتھ سلامت رکھے۔ تین مہینے سے بندہ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عن قریب پارس میں مشرف خدمت ہوگا، اور آپ کی توجہ سے جناب شیزی صاحب کی ملاقات حاصل کرے گا۔ آپ کے وعدۂ مراعات سے بندہ کمتر ممنون ہوا و ادائے شکر تہِ دل سے کرتا ہے۔

زیادہ حدِ ادب

خادمکم و ممنونکم

رام موہن

حرر فی التاریخ یکم اگست سنہ ۱۸۳۱ء

جنابِ شفقت فرمائے گرامی قدر فاربس صاحب کے حوالے کیا گیا۔

اب اس رقعے سے متعلق بعض امور عرض کئے جاتے ہیں ۔
۱ ۔ دتاسی نے جو رقعہ رام موہن رائے کو لکھا تھا، اُس کا پتا نہیں، رام موہن رائے نے جواب اُردو میں دیا ہے، اس لئے قریب بہ یقین ہے کہ دتاسی کا گمشدہ رقعہ بھی اُردو ہی میں ہوگا۔ دتاسی اُردو لکھنے میں بندہ تھا۔ اس کا لکھا ہوا ایک اُردو خط میری نظر سے گذرا ہے جو انھوں نے سرسید کو لکھا تھا۔
۲ ۔ "پہنچا" کا املا رام موہن رائے کے یہاں "پونچھا" ہے۔
۳ ۔ جناب شیزی M. Chezy کا پتا نہ چل سکا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ظاہرا کوئی فرانسیسی اہل علم معلوم ہوتے ہیں جو اس زمانے میں پیرس میں مقیم تھے۔
۴ ۔ M. Forbes ایک انگریز مستشرق تھے، جنھوں نے "قصۂ حاتم طائی" کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ انگلستان سے پیرس جا رہے ہوں گے اس لئے رام موہن رائے نے یہ خط ان کے حوالے کیا۔
۵ ۔ خط کے لفافے پر یہ پتا درج ہے۔
جناب فضیلت مآب جامع علوم عربی و ہندی مولوی گارسین دتاسی زاد مجدہم۔
دارالسلطنۃ پارس ۔ فرانس
(پیرس ۱۵ ۔ فروری ۱۹۵۵ء)

"عکسی زیارت" سے متعلق

سید مرتضیٰ حسین صاحب بلگرامی کا ایک مضمون بعنوان "عکسی زیارت" رسالہ ہذا کی اشاعت فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے جس کے آغاز میں سید صاحب موصوف نے محض سید بندہ رضا صاحب رضوی بلگرامی کی تحریر کے حوالے سے سید کمال الدین صاحب رضوی کو فاتح بلگرام قرار دیا ہے لیکن دعوے کا کوئی ثبوت پیش نہیں فرمایا جو اہالی بلگرام معلوم کرنا چاہتے ہیں۔
سید بندہ رضا صاحب رضوی بلگرامی ہمیشہ بلگرام سے دور ملازمت پر رہے، آپنے نہ کوئی تاریخ بلگرام لکھی اور نہ اس موضوع پر کوئی مطبوعہ تحریر چھوڑی۔ مرحوم کی کسی یادداشت میں اگر اس قسم کی کوئی تحریر موجود بھی ہو تو وہ ایسے اہم تاریخی سوال کا ثبوت کیوں کر ہوسکتی ہے۔
اس موقعے پر میں جناب سید مرتضیٰ حسین صاحب رضوی بلگرامی کے پردادا مرحوم جناب میر نوازش علی صاحب بلگرامی رضوی مرحوم کی تالیف کتاب "تذکرۃ الکرام تاریخ اسلام بلگرام" سے صرف ایک پیرا اقتباس کرکے ذیل میں پیش کرتا ہوں، جو انکشاف حقیقت کے لئے کافی ہے۔
"القصہ جد اعلائی مجموع قضات عثمانیہ قاضی محمد یوسف گازرونی ہمرکاب لشکر ظفر پیکر سلطان محمود غازی غزنوی در قنوج آمدہ۔ سلطان قنوج را مفتوح ساختہ بعد نظم و نسق آں محال فوجے بسر کردگی و سرداری او بایں روئے گنگ جہت تسخیر قصبۂ سری نگر کہ المحال بلگرام مشہور است فرستادہ۔ راجہ سری فرار شدہ و پرگنہ بلگرام یعنی پرگنۂ سری نگر بے مقابلہ و مقاتلہ مفتوح شدہ نزہت شعار اسلام گردیدہ و بجائے نالۂ ناقوس بانگ اللہ اکبر بلند شدہ۔ سلطان محمود غازی غزنوی قاضی محمد یوسف عثمانی گازرونی را کہ ہمرکاب لشکر ظفر پیکر بود بحلیۂ علم و فضل آراستہ و پیراستہ منصب جلیل القدر قضائی سری نگر عطا فرمودہ و فرمان قضا بنام نامیش مرقوم شدہ و بشوکت تمام برمسند قضائی سری نگر اجلاس دادہ حاکم سری نگر خواندہ از اں دور و عہد خدمت قضائے بلگرام ظہراً بعد ظہر و نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن در فرزندان قاضی محمد یوسف عثمانی است کسے دیگر از شرفائے شہر یا غیر محال بلگرام نہ شد۔"
ناظرین کرام میں کسی صاحب کو مذکورہ اقتباس کے بعد قاضی محمد یوسف گازرونی کے فاتح بلگرام ہونے میں کوئی شبہ باقی رہ جائے تو وہ ایک ہزار سالہ پرانی اصلی دستاویزات ملاحظہ فرما سکتے ہیں جو میرے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔
شریف الحسن بلگرامی ۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شوکت سبزواری

کیفی کی وصیت

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اردو دنیا میں اپنے علمی، ادبی اور لسانی کارناموں کی وجہ سے ایسی بے مثال شہرت کے مالک ہیں کہ ملک کا بچّہ بچّہ اُنھیں جانتا ہے اور دل سے ان کی قدر کرتا ہے۔ وہ یادگار زمانہ لوگوں میں سے تھے، جو اپنی زندگیاں علمی کارناموں کے لئے وقف کر دینے کے بعد اپنے ہر اُس سانس کو سمجھتے ہیں کہ رائگاں گیا جو علم و ادب کی یاد سے خالی ہوتا ہے۔ پنڈت کیفی صحیح معنی میں علم و ادب کی دیوی کے پجاری تھے۔ انھوں نے وفادار پرستار کی طرح اپنی ساری عمر اُردو کی پُوجا کرتے اور اس کی مالا جپتے نذر کر دی۔

کیفی کو اردو زبان سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی یہ محبت بے خودی اور والہانہ شیفتگی کی حدوں سے گزر کر از خود رفتگی اور دیوانگی تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اُردو کے لئے جیئے اور بڑے دھڑلّے سے جیئے۔ ابھی حال میں ان کی اٹھاسی ویں سال گرہ منائی گئی تھی۔ انھوں نے ہندوستان میں اُردو کی شمع روشن رکھی۔ اُردو کی لگن نے انھیں ضعف و پیری کے عالم میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ ہندوستان کی انجمن ترقیِ اردو کے جوان سال کارکنوں سے بڑھ کر سرگرم کارکن تھے۔ اُردو کی خدمت میں وہ "پاؤں پہیہ اور سر گاڑی" بنے رہے کبھی دہلی سے علی گڑھ جاتے اور کبھی علی گڑھ سے دہلی۔

مئی ۱۹۵۳ء میں پہلی مرتبہ اور آخری بار میں دہلی میں ان سے ملا، وہ علی پور روڈ پر طالب سرپرام مصنف خم خانۂ جاوید کی شاندار کوٹھی کے ایک حصّے میں مقیم تھے۔ یہ ملاقات پنڈت جی سے اس وصیّت کے سلسلے میں ہوئی تھی جس کا ذکر میں اس فرصت میں کرنا چاہتا ہوں۔ پنڈت جی اس وقت اپنی عمر کے چھیاسی ویں سال میں تھے۔ ان کے چہرے پر جھرّیوں کی یہ کیفیت تھی جیسے ایک چوسا ہوا آم جس کی گٹھلی نکال کر پہلے ہی پھینک دی گئی ہو۔ بھویں جھک کر اور لٹک کر پپوٹوں پر آ گئی تھیں اور پپوٹے آنکھوں کو پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ انسان کیا تھے بس کپڑا اور حریرہ تھے۔ لیکن اس پر بھی ان کا شوقِ مطالعہ دیکھئے کہ وہ ایک کرسی پر سنبھلے ہوئے بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر کتابوں، رسالوں، بڑے بڑے دفتروں اور کاغذوں کا ایک انبار تھا اور وہ پاکستان کے ماہنامے "ماہِ نو" سے کوئی مضمون ایک رجسٹر میں اُتار رہے تھے۔ اللہ اللہ! یہ عمر اور تحصیلِ علم کا یہ شوق، اور اس کے لئے اتنی مشقّت اور دل سوزی! یہ دھیان رہے کہ مہینہ مئی کا تھا، جب دہلی میں بلا کی گرمی پڑتی ہے، اور سخت لُو چلتی ہے۔ میں نے رسالہ اُٹھا کر دیکھنا چاہا کہ وہ کون سا مضمون ہے جسے وہ اپنے رجسٹر میں محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر پرچہ میرے ہاتھ میں سے لے لیا "بھئی! یہ تو آپ ہی کا پرچہ ہے۔ دیکھتے رہئے گا!"

کیفی صاحب کے پاس میں نے دو بالکل نئی چیزیں دیکھیں۔ کئی بڑے بڑے رجسٹر تھے جن میں اُنھوں نے مختلف عنوانوں کے ماتحت اچھے اور پسندیدہ مضامین اپنے ہاتھ سے نقل کر رکھے تھے۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو اسی قسم کا ایک رجسٹر ان کے سامنے تھا جس میں وہ ایک مضمون نقل کر رہے تھے۔ دوسرے انھوں نے اتنے ہی سائز کے ایک رجسٹر میں اپنے احباب، رفقاء اور اعزّہ کے خطوط ایک صفحے پر نقل کر لئے تھے۔ دوسرے صفحے پر ان کے بالمقابل اصل خطوط چسپاں تھے۔ اس رجسٹر کے اوپر جلی حرفوں میں "خطوطِ مشاہیر" لکھا ہوا تھا۔ خطوط کا یہ مجموعہ انھیں بہت عزیز تھا۔ اس میں ان کے بے شمار دوستوں، رفیقوں اور شاگردوں کی یادیں اور باتیں دفن تھیں، اس میں انھوں نے ان کی آوازوں کو بند کر رکھا تھا جس طرح ریکارڈ میں نغمہ کار کی صدا بندی کی جاتی ہے۔ ان کے یہ رفیق قریب قریب سبھی اردو کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ اپنے اس مجموعے میں سے کیفی صاحب

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا ایک مکتوب اور اس کا جواب اس طرح پڑھ کر مجھے سنایا جیسے کوئی رکارڈ بجا کر نغمہ سناتا ہے۔

میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ پنڈت کیفی اُردو کے لیے جئے اور شاید اسی لئے انھوں نے اتنی طویل عمر پائی۔ اب اگر میں کہوں کہ وہ مرنے کے بعد بھی اُردو کے لیے زندہ ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھے گا۔ اُردو کی خدمت کے لئے اتنی عمر پاکر بھی انھیں یہ خیال پریشان رکھتا تھا ع

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ان کے بعد اُردو کا کیا حشر ہوگا؟ ان کی اردو کتابیں جو چھپ گئی ہیں اور زندہ ہیں وہ بارہ کیسے چھپیں گی اور کس صورت میں چھپیں گی اور انھیں کس طرح زندہ رکھا جائے گا؟ اور جو نہیں چھپی ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اردو کی موجودہ کساد بازاری کو دیکھ کر وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا یہ قیمتی سرمایہ جسے انھوں نے ساری عمر خونِ جگر کھا کر پیدا کیا ہے، دستبردِ زمانہ کی نذر نہ ہو جائے۔ وہ ایک حوصلہ مند شخص کی تلاش میں تھے جو ان کی ادبی کاوشوں کو زمانے کی چیرہ دستیوں سے بچائے۔ اُن کے پُر بہار گلشن کی آبیاری کرے جسے انھوں نے اپنے خونِ دل سے سینچا تھا۔ لیکن انھیں کوئی ایسا شخص نہ ملا۔ اوّل اوّل ان کی نظرِ انتخاب مالک رام صاحب پر پڑی لیکن وہ بقول ان کے "حد سے سوا غالب زدہ نکلے"! آخر اُن کی نظریں میری طرف اٹھیں، انھیں کیا پتہ تھا کہ مالک رام کی طرح میں بھی اسی "بت ہزار شیوہ" کی اداؤں کا مارا ہوا ہوں۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

اگر انھیں اس کا علم ہوتا تو شاید وہ یہ غلط انتخاب نہ کرتے۔

بہرحال جنوری ۱۹۵۳ء میں اُنھوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ میری شاعری اور نثر نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں کیا اور میری رائے کیا۔ لیکن مجھے امر کیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے کسی قدر تفصیل سے اپنی رائے ان کی نظم و نثر کے متعلق لکھ کر بھیج دی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں بے چین ہوں۔ خدارا لکھئے کہ آپ جیسے کہنہ مشق ادیب اور شاعر شیوا بیان کو مجھ جیسے بے سواد کی اپنی شاعری اور نثاری کے بارے میں رائے لینے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو خط مجھے لکھا اس کی میری نگاہ میں بڑی اہمیت ہے۔ اُردو ادب کے شیدائیوں اور کیفی صاحب کے مداحوں کی آگاہی کے لئے میں اسے شائع کر رہا ہوں۔ اس سے کیفی صاحب کے قدردانوں کو علم ہوگا کہ مرحوم اپنی اردو تصانیف کے بقا و احیا کے لئے کیا چاہتے تھے۔ میں اُن کی وفات کے بعد اُن کی آخری خواہش کو ان کے قدردانوں تک، جو ہندوستان میں بھی ہیں اور پاکستان میں بھی، انہی کے لفظوں میں پہنچائے دیتا ہوں۔ میں ان کی وصیت پوری نہ کرسکا۔ ان کے وصی بننے کا شرف حاصل نہ کرسکا۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ میں اس کا ماتم کرنے کی بجائے ان کی آخری وصیت دوسروں تک پہنچا دوں۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔ ان کا خط ملاحظہ فرمائیں۔

۱۰ - علی پور روڈ۔ سول لائنز۔ دہلی

مورخہ ۱۱۔ فروری ۱۹۵۳ء

مشفق میرے!

آپ کا پچیس جنوری کا مودّت نامہ مل گیا تھا —— مگر میں اس تاریخ کے بہت پہلے سے بیمار رہا معمولی شکایت کے دورے کے علاوہ ایک نئی شکایت یہ ہوگئی تھی کہ کئی دن تک ناک اور منہ سے خون بہتا رہا۔ غالب کو تو یک قطرۂ خون کے باندازِ چکیدن سرنگوں ہونے کی شکایت تھی۔ یہاں ڈاکٹر کو یہ حیرت ہوئی کہ خون نہ پھیپھڑے سے آتا ہے نہ کسی شریان میں درز پڑی ہے۔ خیر جو کچھ تھا رفع ہوگیا اور میں ایک ہفتے کے لئے تبدیلِ آب و ہوا کے واسطے شہر کے قریب ہی ایک عزیز کے یہاں چلا گیا۔ اب واپس آیا ہوں۔ طبیعت معمول پر ہے۔

بھائی اس استفسار کی وجہ ایک خود غرضی تھی جس کی تشریح یہ ہے۔ میرا چھیاسی واں سال گزر رہا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے وجع مفاصل، دل اور سانس کی بیماریوں کا شکار ہوں۔ مجھے اُمید نہیں کہ ایک سال سے زیادہ مرگِ مسلسل کی سزا بھوگ سکوں۔ اس لئے میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے جاننے والے ہنسیں گے کہ کیفی کا وصیت کرنا چہ معنی دارد۔ وہ اس دنیا میں نہ ایک اینٹ کا مالک ہے، نہ کوئی بینک اس کی گراں مایہ باقی فاضل کا امانت دار ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجھے اپنی تصانیف اور مسودات کی فکر ہے۔ اور اسی سلسلے میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اب سے پہلے کوئی آدمی ایسا نظر نہ آیا جس کو

میں اپنا ادبی وصی قرار دیتا۔ پہلے میری نظر مسٹر مالک رام پر گئی، مگر وہ قد سے سوا غالب تر وہ نکلے۔۔۔۔۔ ملازمت کی وجہ سے وہ رہتے بھی ہندوستان سے باہر ہیں۔ ماحول بھی ان کا اس کام سے موافق نہیں۔ آپ بھی ہندوستان میں نہیں پاکستان میں رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اُردو ادب اور زبان کا تعلق ہے ہندوستان اور پاکستان کو میں دو ملک نہیں سمجھتا۔ آپ کا زیرِ جواب خط دیکھ کر مجھے جرأت ہوئی کہ آپ سے دریافت کروں کہ کیا آپ اس ذمہ داری کو جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، لینے کو تیار ہیں۔ اسی غرض سے وہ استفسارات تھے جن کے جواب آپ نے مہربانی سے خاصی تفصیل میں دئے ہیں۔ آپ کا جواب آنے پر میں وصیّت کا انتظام کروں گا۔ اگر آپ نے یہ ذمّہ داری منظور کر لی تو میں ایک مفصل نوٹ آپ کو بھیج دوں گا۔

چند موٹی موٹی باتیں یہ ہیں کہ "واردات" میں سے کئی چیزیں نکال کر الگ کتابی شکل میں شائع کرنی چاہئیں۔ مثلاً "مثنوی آئینۂ ہند"، "ترکیب بند" "شوکتِ ہند" وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک مجموعہ متفرق مثنویوں کا اور ایک قومی نظموں کا "واردات" میں سے نکال کر علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے۔ دو مثنویاں پہلے سے الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک "پریم ترنگنی" اور دوسری "جگ بیتی"۔ پھر مقالے اور خطبے ہیں، جن کی نوعیت زیادہ تر اُردو ادب اور زبان سے متعلق ہے۔ کچھ غیر فرقہ وارانہ سیاسی اور سوشل معاملات پر بھی محتوی ہیں۔ افسانچے یعنی شارٹ اسٹوری بھی بہت سی ہیں۔ ایک مجموعہ ان کا چھپ بھی چکا ہے۔ پھر ناول ہیں۔ ڈرامے اور ریڈیو کی تقریریں ہیں۔ غرض مختصر یہ کہ سب کچھ خرافات میرے قلم سے نکلی ہے۔ دو تین کتابوں کے سوا میری تمام مطبوعہ تصانیف کی دو دو چار چار کاپیاں میرے پاس موجود ہیں۔

میرا ناول "نہتّا رانا" کیا آپ کی نظر سے گزرا ہے؟

میرا ارادہ ہے کہ وصیّت میں کچھ پیسے اس مجوزہ ادبی خدمت کی انجام دہی کے لئے نامزد کر جاؤں، اگر آپ کا جواب اثبات میں آیا تو جس سبیل سے آپ فرمائیں گے اپنی تصانیف مطبوعہ کی ایک ایک کاپی آپ کو بھیج دی جائے گی۔ واردات۔ کیفیہ اور منشورات تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔

خط بہت لمبا ہو گیا۔ معاف کیجئے۔

عندلیب صاحب کو سلام کے ساتھ کہئے کہ ایک ہفتے میں "خاور" کے لئے کچھ بھیجوں گا۔"

اخلاص کیش کیفی

اس داستان کا آخری حصّہ بھی سن لیجئے۔ میں ایک ضرورت سے میرٹھ گیا تو کیفی صاحب سے ملنے دہلی پہنچا۔ اس کا ذکر میں سطورِ بالا میں کر چکا ہوں۔ کیفی صاحب نے، جیسا کہ اپنے خط میں لکھا ہے، اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔ ساتھ ہی مطبوعہ مضامین کے تراشے بھی دئے، اور فرمایا، انھیں ترتیب دے کر ایک مقدمہ لکھ دو۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) انھیں شائع کرنا چاہتی ہے۔ میں یہ بیش بہا خزانہ لے کر فرحاں و شاداں ڈھاکے پہنچا، اور یہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اور مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ میں منتشر مضامین کو ترتیب دے کر مقدمہ لکھتا۔ کیفی صاحب کو عجلت تھی۔ اس لئے انھوں نے مضامین واپس طلب کر لئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ جب مجھے موقع ملے گا مقدمہ لکھ کر میں ان کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔ ستم ہائے روزگار نے ادھر مجھے سر اُٹھانے کی فرصت نہ بخشی، اُدھر داعیِ اجل نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ تقاضا کریں۔ میرے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ ادھورا اور نامکمل رہا۔

ان کو دیکھو نظر آیا کئے ہر ایک میں!
مجھ کو دیکھو دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا

(صفی اورنگ آبادی)

کون وہ آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے
شب کو اک آہ اتر آتی ہے الٰہی کیا کروں

(")

غمِ جہاں کہ بلا ہو گیا ہے سب کے لئے
مرے سپرد کرو اُس کو ایک شب کے لئے

(سراج الدین ظفر)
(ماہ نو)

عرش ملسیانی

ٹیسو کا بن

مارچ ۱۹۵۶ء کے آخری دنوں میں دہلی سے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ریل کا طویل سفر جانکاہ بن جاتا اگر راستے میں ٹیسو کی بہاریں نظر نہ آتیں۔ میلوں تک جنگلوں اور پہاڑیوں کا منظر بہار افروز تھا۔ ٹیسو کے کھلے ہوئے سُرخ سُرخ پھول اور پھر ان کی فراوانی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔ ع "گلشن کو کس نے آگ لگا دی بہار میں"۔ ریل ہی میں یہ نظم ہو گئی۔ ۲۳ مارچ کو حیدرآباد ریڈیو سے نشر ہوئی۔ انھیں کے شکریے سے آج کل میں شائع کی جا رہی ہے۔ (عرش)

شاخوں پہ دمکتے ہوئے ٹیسو کی بہاریں
یا سُرخ لبادوں میں ہیں حوروں کی قطاریں

یہ نور میں ڈوبے ہوئے اشجار کے جھل بل
اِک جشنِ بہاراں ہے کہ جنگل میں ہے منگل

پہنے ہوئے اشجار ہیں پوشاک زری کی
یا فوج اُتر آئی ہے اک لال پری کی

لپکا ہوا کوندا ہے ہر اک شاخ کا جوبن
بجلی نے درختوں پہ بنائے ہیں نشیمن

انوار کے یہ سُرخ عساکر سرِ کہسار
جنت سے تو آئے نہیں کرتے ہوئے یلغار

اِک پیرہنِ سُرخ زسر تا بقدم ہے
فطرت کی سُہاگن ہے کہ اک حورِ ارم ہے

جنگل کو بہاروں نے ہے اک آگ لگائی
اے حُسن کے سیلاب دُہائی ہے دُہائی

اللہ رے یہ سُرخیِ افسانۂ فطرت
لبریزِ مئے سُرخ ہے پیمانۂ فطرت

جھونکے پہ ہوا کے ہے گماں ساغرِ مُل کا
دبتا ہے ہر اک برگ جوابِ آتشِ گُل کا

ٹیسو کا یہ بن جلوہ گہِ نورِ جہاں ہے[1]
راتوں کو یہاں دن کے اُجالے کا سماں ہے

---

[1] جناب محروم کا یہ شعر پیشِ نظر تھا ؎ دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے / کہنے کو یہ آرام گہِ نورِ جہاں ہے

کچھ دُور سرِ کوہ وہ ٹھہرا ہوا لاوا — یا آشتہ خاکی پہ ہے اک سُرخ بچھاوہ
میدان میں پہنے ہوئے یا کیسری بانا — جوہر کے لیئے نکلے ہیں چتّوڑ کے رانا
یا ڈھونڈ کے شہروں سے بہت دُور بسیرا — بھکشو ہیں سرِ کوہ جمائے ہوئے ڈیرا
جس شاخ کو دیکھو وہی پھولوں کی چھڑی ہے — انوار کی اک دھار ہے جو پھوٹ پڑی ہے
لعلیں لبِ فطرت پہ ہنسی آئی ہوئی ہے — بوٹوں نے سنگاروں کی قسم کھائی ہوئی ہے
سبینۂ ورچھڑکتی ہوئی اٹھی ہے جوانی — یا ہے کسی مہجور کی خوں نابہ فشانی
لالی یہ شفق کی ہے کہ خونِ شہدا کی — یا دستِ بہاراں پہ ہے سُرخی یہ حنا کی
فطرت کا رُخِ سادہ مسرّت سے ہے لال آج — اُڑتے ہیں فضاؤں میں عبیر اور گلال آج
قدرت کی یہ ہولی یہ سماں یاد رہے گا — عشرت کدۂ حُسنِ جواں یاد رہے گا
نشاخوں کے فضا میں ہیں پھریرے بھی نشاں بھی — پریاں ہیں سر دوش لئے تخت رواں بھی
پھولوں کے دہکتے ہوئے رخسار تو دیکھو — جلووں کی ذرا گرمیٔ بازار تو دیکھو
طالب کے لیئے حاصلِ یک مشت یہی ہے — آتشکدۂ حضرتِ زرتشت یہی ہے
گو وادیٔ ایمن سے یہ بن دُور بہت ہیں — مُوسےٰ کو بلاؤ کہ یہاں طُور بہت ہیں

ہے شہرِ بدخشاں تو بہت دُور یہاں سے
یہ لعلِ گراں آئے ہیں لے عرش کہاں سے

غلام احمد فرقت

خانۂ انوری

گھنٹی بجی اور میں نے زینے کے پاس پہنچ کر پوچھا "کون"؟

ایک بلبے تڑنگے صاحب بولے "حضرت! معاف کیجئے گا۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ اس وقت کیا بجا ہے؟

میں نے جل کر کہا "قبلہ! یہ کوئی انکوائری آفس تو ہے نہیں جو آپ اس وقت اتنی رات گئے وقت دریافت فرما رہے ہیں۔ بولے بات یہ ہے کہ گلی میں سارے کنواڑ بند تھے۔ اتفاق سے آپ ہی کے یہاں زینے پر بجلی جل رہی تھی اور کنواڑ بھی کھلے تھے۔ سوچا کہ جس گھر میں بجلی ہوگی وہاں گھڑی کا ہونا بھی لازمی ہے اسی لئے میں نے آپ کو زحمت دی۔ دوسری بات یہ کہ میں پرسوں باہر سے نمائش دیکھنے آیا تھا اور اب نمائش دیکھ کر مجھے آج ہی شب کی گاڑی سے واپس جانا ہے۔ میں نے کہا۔ صحیح وقت معلوم کرتا چلوں کہیں گاڑی چھوٹ ووٹ نہ جائے"۔

میں نے جل کر کہا۔ ۱۱ بجے ہیں۔ اور یہ کہہ کر غصے میں اندر سے دروازے میں کنڈی لگا دی اور احتیاطاً دوبارہ کنڈی کو کھینچ تان کر دیکھ لیا کہ کہیں کھلی تو نہیں رہ گئی۔ جو رات بھر لوگوں کو وقت بتانے بتلانے پہنچ سیدھے ہو جائیں۔ گھر میں سوائے میرے کوئی نہ تھا کیونکہ بیوی بچے وطن گئے ہوئے تھے۔

زینے سے اپنی میز تک آتے ہوئے میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ نہ جانے دیس بدیس کہاں کہاں کے مُردے نمائش دیکھنے کے بہانے اس قبرستان میں دفن ہونے آتے ہیں۔ خدا غارت کرے اس مصیبت کو جس نے شہر والوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں...... آئے تھے احمق داس..... اس وقت گیارہ بجے شب کو وقت پوچھنے۔ یہ کہہ کر میں نے شام کی ڈاک دیکھنا شروع کی جو ابھی میز پر اسی طرح بند رکھی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ایک نیلا لفافہ کھولا جس کا مضمون یہ تھا۔

"کہو! آج کل تو بڑے چکلس آ رہے ہوں گے۔ خوب خوب نمائش لگواتے ہو ما بدولت معہ ایک عدد دوست کے سویرے کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں۔ گھر ہی پر ملئے گا۔ ورنہ تالا والا توڑ کر گھر کا سامان نمائش لے جا کر بیچ لوں گا"

لطیف مخلص

یہ ہمارے ایک بے تکلف دوست لطیف کا خط ہے۔ اس خط کے نیچے ایک کارڈ تھا جس کا مضمون تھا۔

مکرمی تسلیم۔ یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو دلّی میں مکان مل گیا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نمائش جاؤں تو کہاں رکوں۔ بہرحال یہ پریشانی دور ہو گئی۔ انشا اللہ آئندہ ہفتے معہ بچوں کے دو روز کے لئے آپ کو زحمت دوں گا۔ نیاز کیش - افضال

تیسرا خط ایک بند چھ پیسے والا لفافہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس کا مضمون یہ تھا۔

"عزیزی سلمہٗ دعا ہا۔ میرے دوستوں میں دو صاحبان دلّی نمائش دیکھنے آ رہے ہیں۔ تمہارے یہاں قیام کریں گے۔ میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ مکان خالی ہے۔ آپ کسی ہوٹل ووٹل میں رہنے کا انتظام نہ کیجئے گا۔ وہیں ٹھہر جائیے گا۔ آپ کو کھانے پینے کی بھی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ لوگ صرف چار روز رہیں گے۔ ان میں ایک صاحب کا نام ابوالحسن اور دوسرے کا محمود علی ہے۔ باقی حالات بدستور ہیں"۔ یہ خط ہمارے حقیقی ماموں کا تھا۔

چوتھا کارڈ پڑھنے میں ہم پس و پیش کر رہے تھے کہ پڑھیں یا نہ پڑھیں کیونکہ پچھلے تین خطوط پڑھنے کے بعد ہم کو یقین ہو گیا تھا کہ آج کل ہندوستان سے ملک کے اندر اور باہر جتنی ڈاک نکلتی ہے وہ صرف نمائش ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ اور ایک ڈاک ہی پر کیا موقوف

ہے۔ ہندوستان سے باہر آنے جانے والے ہر قسم کے جہاز اگر نمائش ہی کے مسافر اور سامان ڈھونے میں لگے ہوں تو بھی تعجب نہ کرنا چاہئے۔ یہی حال باربرداری کے جانوروں اور گاڑیوں کا ہوگا اور گدھے جیسا حقیر جانور تک اس نمائش کی زد سے نہ بچا ہوگا کیونکہ ایک روز قبل ہم نے ایک موٹر رکشا والے کو کہتے سنا تھا کہ غازی آباد سے جب کوئی سواری نہ ملی تو دھوبیوں نے اپنے اپنے گدھوں کی زینیں کس کر نمائش کے مزے لوٹنا شروع کر دئے۔ مگر اس کے باوجود ہم نے جی کڑا کر کے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چوتھا خط پڑھنا شروع کر دیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا۔

بھابھی جان کی والدہ آگرے سے معہ بچّوں کے ۲۰ تاریخ ½۸ بجے شب کی گاڑی سے دلی پہنچ رہی ہیں۔ اسٹیشن پر ان کو رسیو کر لینا ورنہ ان کو مکان کے ملنے میں زحمت ہوگی"۔ تمھارا

بھائی صاحب

ہم نے اس خط کو پڑھ کر رکھا ہی تھا کہ تابڑ توڑ دو مرتبہ زینے کی کال بل بجی۔ اس مرتبہ بجائے زینے تک جانے اور کنواڑ کھولنے کے ہم نے اوپری برآمدے سے جھانک کر دیکھا تو پانچ صاحبان سوٹڈ بوٹڈ کاندھوں پر چسٹر ڈالے ہمارے دروازے کے مقابل بیچ سڑک پر کھڑے تھے ہم نے اوپری کمرے کا ایک کنواڑ جو کھلا تھا آہستہ سے بند کر دیا۔ اتنے میں پھر گھنٹی بجی۔ اس پر ہم نے آواز بدل کر اور کرخت لہجے میں ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون گھنٹی بجا رہا ہے؟ بند کر بدمعاش" ہماری اس آواز پر چند سیکنڈ کے بعد اس طرح کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک آواز - اماں چلو بھی۔ یہ مکان نہیں ہے اس میں سرحدی پٹھان قسم کی کوئی چیز رہتی ہے تم نے آواز سے اندازہ نہیں کیا۔ ایسی آواز بھلا کسی مہذب انسان کی ہو سکتی ہے۔

دوسری آواز - واقعی کوئی نہایت بگڑے دل قسم کا خان معلوم ہوتا ہے۔

تیسری آواز - مگر جونہی ڈپٹ کر آواز آئی تھی "فرنڈس" کہہ کر پوچھ تو لیا ہوتا کہ وہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔

چوتھی آواز - اماں! جو صاحب بولے تھے وہ دُم سے تو بات کر رہے تھے۔ اگر اس کے بعد ایک گھنٹی اور بجاتے تو خدا لبا ہم لوگوں میں سے کسی صاحب کی خیریت نہ ہوتی مارتے مارتے ہم سب کو نمائش میں رکھنے کے قابل بنا دیتا۔

ان پانچوں میں سے ایک کچھ میرا اُدھورا نام لے کر کہہ رہا تھا کہ بھائی ہم لوگ تو صورت آشنا بھی نہیں ہیں صرف ایک خط کے سہارے آئے ہیں وہ بھی ایک زٹیئے کا ہے جس کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔ عجب نہیں جو صرف صورت آشنا ہی رہا ہو اور محض ہم لوگوں پر رُعب جمانے کے لئے لکھ دیا ہو کیونکہ خط کا مضمون "مکرمی تسلیم" سے شروع ہوتا تھا اسی سے تم ان کی بے تکلفی کا اندازہ کر لو۔

دوسری آواز - بس بہتر ہے کہ یہاں سے بھاگ چلو ورنہ اوپر سے اینٹیں آنے ہی والی ہیں۔ آواز سے آدمی بے حد جھلایا ہوا اور بگڑے دل کا معلوم ہوتا تھا۔

تیسری آواز - ابے ایک بار محض تپانے ہی کے لئے گھنٹی بجا دے مگر پہلے سب لوگ چھجے کے نیچے ہو جاؤ تاکہ اگر پتھر وتھر آئیں تو سب لوگ بچے رہیں۔ اس کے بعد جب پھر گھنٹی بجی تو ہم نے مکان کے چھجے سے دو تین اینٹیں اٹھا کر وسط سڑک پر پوری قوت سے جو پٹکیں تو قہقہوں کی آواز کے ساتھ آواز آئی۔ لیجئے اب جام شہادت نوش فرمائیے ہم نہ کہتے تھے کہ کیوں مرنے کا بندوبست کر رہے ہو۔ مغل ڈھیلوں سے وہ کام لیتے ہیں جو انگریز توپوں سے لیتا تھا۔ چنانچہ سرحد پر ہمیشہ انگریزوں کو مغلوں نے ڈھیلے مار کر بھگا یا اور کبھی اپنے علاقے میں انھیں دھنسنے نہ دیا۔

چوتھی آواز - قبلہ۔ بیربل کو جب اکبر نے سرحد فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا تو ان کی ہلاکت بھی ایک مغلئے کے ڈھیلے ہی سے واقع ہوئی تھی

پہلی آواز - مگر استاد! اب تو چھجے سے باہر ایک قدم نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

دوسری آواز - اور وہ منحوس خط کہاں ہے جو لے کر چلے تھے۔

تیسری آواز - وہ تو بکس میں بھول آئے۔

اس کے بعد ایک آواز یہ کہتی سُنائی دی۔ چلو رات کی رات اسٹیشن پر ان ہی چسٹروں میں دبک رہیں۔ نمائش میں بالکل مزہ نہیں آیا کل ہی سویرے آگرے چل دو۔

اس کے بعد وہ چھجّے کے نیچے سے یا علی کہتے اور بھرا مار کر چلاتے ہوئے گزرے۔ بھاگیو۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتے جاؤ ڈھیبسلا دیلا تو نہیں آرہا ہے مگر جب تک ان کے جوتوں کی چاپیں ہم کو سُنائی دیتی رہیں ہم ایسا محسوس کرتے رہے کہ وہ پانچوں ہمارے سینے پر جوتے پہنے چل رہے ہیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ہم نے کمرے کی لائٹ آن کی اور اپنے اوپر آیتہ الکرسی دم کی۔ مگر بیٹھتے ہی پھر گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں پانچوں پھر رستہ بھول کر ادھر سے نہ گزریں اور گھنٹی بجانا شروع کر دیں۔ لہٰذا ہم نے اٹھ کر فوراً ہی لائٹ گُل کر دی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے اور لحاف کو پوری طرح اپنی پیٹھ اور ٹانگوں کے نیچے دبا لیا تاکہ اگر کہیں کنڈ لگا کر کسی ترکیب سے یہ لوگ اوپر چڑھ آئیں اور لحاف کے اندر زبردستی گھسنے کی کوشش کریں تو ہم محفوظ رہیں کیونکہ ہم ان کو بغیر بستر کے دیکھ چکے تھے۔ اس کے بعد ہم سوچتے رہے کہ اگر ایسے لوگوں کا سلسلۂ آمدورفت جاری رہا جن کی صورت تک سے ہم واقف نہیں اور جن کو ہمارے بعض ستم ظریف دوست تفننِ طبع کی خاطر ہماری جان پر اکناف عالم سے لڑھکا رہے ہیں تو ہم کہاں جائیں گے۔ کوئی ڈیڑھ بجے شب تک ہم کو نیند نہیں آئی اور ہم نمائش کو دانت پیس پیس کر گالیاں دیتے دیتے سو گئے۔

رات ہم نے ایک نہایت ہی بھیانک خواب دیکھا۔ ہم نے دیکھا کہ جیسے نمائش میں جان پڑ گئی ہے اور ساری نمائش اسٹالوں اور مشینوں سمیت ہمارے سینے پر سوار ہو کر کہہ رہی ہے۔

"کیوں بے! تو ہی ہے جو بیٹھے بیٹھے ہم جیسی بین الاقوامی شہرت والیوں کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ "گھونٹ دوں تیرا گلا"۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کانپتے ہوئے کہا "یہ ہماری پہلی خطا ہے بس اس مرتبہ اپنے سارے اسٹالوں کے صدقے میں ہمیں معاف کر دیجئے"۔ ہماری آنکھ پہلے تو کھلی کی کھلی رہ گئی اور ہم کو کمرے کی ہر چیز گلا گھونٹتی دکھائی دی۔ مگر بعد میں جب ہم نے اپنے ہوش و حواس اکٹھا کر لئے تو ہم اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے مگر خواب کا بھیانک تصوّر اس وقت تک ہمارے دماغ پر مسلط رہا جس وقت تک کہ ہم نے سورج کی روشنی کو صحن میں پھیلتے نہ دیکھ لیا"۔

اس کے بعد نہا دھو کر ہم نے چائے کا پانی انگیٹھی پر رکھا اور بازار سے کچھ پھل اور مٹھائیاں لا کر میز پر ناشتہ چنا اور اپنے دوست لطیف کا جنھوں نے سویرے کی گاڑی سے ہم کو اپنے آنے کی اطلاع دی تھی انتظار کرنے لگے۔ آٹھ بجے، نو بجے اور سوا نو بج گئے مگر جب وہ نہ آئے تو یہ خیال کر کے کہ شاید گاڑی لیٹ ہو گئی ہے ہم نے اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کے ہمراہ بجائے ایک کے دو تین صاحبان اور ہوں۔ کئی پیالیاں میز پر چن کر اسی رعایت سے مٹھائیاں اور پھل رکھ کر میز کو ایک تولیے سے ڈھانک دیا۔ اور دوسری میز پر خود ناشتہ کر کے کالج روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت ہم نے ایک دلچسپ پرچہ لکھ کر میز پر رکھ دیا تاکہ اُسے پڑھ کر ہمارے دوست لطف اندوز ہوں۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

اے ناہنجار، نابکار، مجہول، مقہور، منحوس، مغرور کہیں کے۔ دیکھ ساڑھے نو بجے تک تیرا انتظار کرتے کرتے صاحب کالج جا رہا ہے۔ تیرے لئے ناشتہ تیار رکھا ہے۔ اسے زہر مار کر کے اور اپنی بھابھی کے فرائض انجام دے کر برتن قاعدے سے دھو کر پورے نظم و ضبط کے ساتھ الماری میں رکھ دینا اگر اسی طرح برتن پڑے ملے تو سمجھ لینا کہ چھٹے ماہوار جاڑے کی جڑ اول اور پھٹا پرانا جو تجھ کو ماہ بماہ ملتا ہے بند۔ نہ جانے تو کس موت کی گھوڑی پر بیٹھ کر چلا کہ ساڑھے نو بجے تک گدھے کے سر کے سینگ بنا رہا۔ صاحب تجھ سے بہت ناراض ہے۔ ۲ بجے کالج سے واپسی پر ملاقات ہوگی۔ تیرا "صاحب"۔

چلتے وقت ہم نے دروازے میں قفل لگا کر کنجی نیچے ہوٹل والے کو دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے مہمان اگر آئیں تو یہ کنجی ان کو دے دینا اور کہہ دینا کہ وہ آپ لوگوں کا انتظار کرتے کرتے کالج چلے گئے۔

چار بجے کالج ختم کر کے جب ہم واپس آئے تو ہوٹل والے نے خوش خبری سنائی کہ آپ کے جاتے ہی آپ کے مہمان آئے تھے۔ وہ لوگ نمائش دیکھنے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ شب میں واپسی ہوگی۔ ہم نے ہوٹل والے سے کنجی لے کر جلدی سے دروازہ کھولا اور مسرت میں سرشار زینہ طے کر کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صحن میں پانچ بستر بند کھلے پڑے ہیں۔ دو چار جوتے ایک دوسرے سے بغل گیر اخبار دو دو پیٹے قریب رکھے ہیں۔ ایک جھبیا میں کچھ تیل کی باسی پوریاں رکھی ہیں جن پر دو تین کوے بیٹھے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اندر کمرے میں آ کر دیکھا تو پلنگوں پر نہایت نفیس بستر لگے تھے۔ سرہانے سوٹ کیس کرطے تکیے رکھے

تھے اور پائنتی نہایت قیمتی کمبلوں کی ایک دیوار تھی۔ اندر والے چھوٹے کمرے میں پلنگ پر سفید کڑھی ہوئی چادر اور اس پر ریشمی لحاف رکھا تھا۔ جن کھونٹیوں پر ہم اپنے تولیے ٹانک کر گئے تھے ان پر نئے نفیس قسم کے تولیے ٹنگے تھے اور جن کھونٹیوں پر ہمارے کوٹ ٹنگے تھے ان کی جگہ تین سویٹر اور قیمتی شال ٹنگی تھی۔ ہم کو پہلے اپنے بستر اور کوٹوں کی فکر ہوئی کہ وہ ان چیزوں سے بھاگ کر کہاں پناہ گزیں ہیں۔ بڑی تلاش کے بعد ہمارا بستر تو پیچھے پر تڑک کی جانب اپنے پاؤں لٹکائے خودکشی پر آمادہ ملا۔ اور اسی پر ہمارے تولیے اور کوٹ بھی سوار تھے اور مرگ انبوہ جشنے دارد کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ میز جس پر ہم نہایت اہتمام سے ناشتہ چن گئے تھے اس پر کیتلی قلا بازی کھائے پڑی تھی اور دو پیالیاں سربسجود تھیں ایک پیالی میں کچھ ملے جلے بسکٹ زندگی سے بیزار ہو کر اپنے کو گھلائے ڈال رہے تھے۔ میز پوش پر آدھے سے زیادہ چائے انڈی پڑی تھی۔ البتہ طشتریوں کو جن میں رس گلّے اور بالائی تھی اس طرح صاف کیا گیا تھا کہ جیسے بھینسی پر چڑھا دی گئی ہوں۔ کیلے کے کچھ چھلکے ایک لوٹے میں فن شناوری کی مشق کرتے ملے اور کچھ اس طرح اچھال دئے گئے تھے کہ بعض نے کھڑکی کے مونگروں پر سکونت اختیار کر لی تھی اور کچھ کو میز پر اطمینان کی سانس لینے کا موقع مل گیا تھا۔ جو پرچہ ہم میز پر لکھ کر رکھ گئے تھے۔ وہ گرم گرم چائے سے غسل لینے کے بعد بھی اپنی تر دامنی پر خجل تھا۔ اپنے دوست کی اس "خوش سلیقگی" کو دیکھ کر ہم نے کہا آنے دو مردود کو۔ یہ ساری حرکتیں اس نے ہمارے اس رقعے کے جواب میں کی ہیں جو ہم میز پر اس کے نام لکھ کر چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ ہم لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی دس ساڑھے دس بجے ہوں گے کہ ہم کو زینے پر زور زور سے پیر پڑنے کی چاپیں سنائی دیں اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کچھ مادرزاد دیہاتی زینے پر چمرودھے جوتے پہن کر چڑھ رہے ہیں۔ ہم نے نمائش کے متعلق ایک مضمون لکھنے کے لئے عنوان قائم ہی کیا تھا کہ ایک ساتھ چار "سلام علیکم" کی آوازیں اس طرح سنائی دیں جیسے کسی نے "سلام علیکم" کا تیل میں ڈوبا ہوا کوڑا ہماری ننگی پیٹھ پر رسید کر دیا ہو۔ دل میں آیا کہ جوابی حملے میں ہم بھی کہیں کہ آپ خود سلام علیکم مگر وہ ساری صورتیں ہمارے لئے اجنبی تھیں۔ ان آنے والوں میں دو صاحبان پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور دو صاحبان کرسیوں پر رونق افروز ہو گئے اور قبل اس کے کہ ہم ان سے ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل کریں ایک صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ذرا میرے بکس سے پاجامہ تو نکالنا۔ دوسرے صاحب ہم سے بولے "صاحب! نمائش دیکھ آئے" "خوب ہے" ہم نے مری ہوئی آواز میں کہا "اچھا"۔

بولے۔ بڑی بھیڑ ہے۔ ایک پر ایک لدا پڑ رہا ہے۔

ہم نے کہا "ہاں"

تیسرا۔ صاحب! جامع مسجد بھی خوب بنی ہے۔

ہم۔ جی ہاں

پہلا۔ یہ تو قطب الدین کی بنوائی ہوئی ہے نا۔ قبل اس کے کہ ہم بولیں۔

دوسرا۔ نہیں میاں، اس سے پہلے کے کسی مسلمان بادشاہ نے بنوائی تھی۔

ہم۔ اچھا

پہلا۔ جامع مسجد پر بھی بڑا مجمع رہتا ہے۔

ہم۔ جی ہاں

دوسرا۔ (چوتھے سے مخاطب ہو کر) بھیا ذرا ہماری چپل ادھر تو پھینکنا تو

پہلا۔ (موزے اتارتے ہوئے) موزے بھی پھٹ گئے۔ کل دوسرے خریدیں گے۔

تیسرا۔ (ہم سے مخاطب ہو کر) آپ کو نمائش کیسی لگی۔

ہم۔ اچھی۔ مگر ہم گئے نہیں۔

دوسرا۔ صاحب ضرور دیکھئے۔ پرسوں آپ ہمارے ساتھ چلئے گا۔

ہم۔ بہت اچھا۔

تیسرا۔ (پلنگ کے قریب سے اپنے چپل اٹھاتے ہوئے) آپ کا ہیٹر بھی خوب ہے"

ہم۔ جی ہاں

پہلا۔ یہ آپ نے یہیں خریدا ہوگا۔

ہم۔ جی ہاں

دوسرا"۔ اس کا تار بدلوا دیجئے گا۔ ابھی جب ہم لوگوں نے سویرے چائے گرم کی تو اس کا سارا تار جل گیا (ہیٹر اٹھا کر ہم کو دکھاتے ہوئے) یہ دیکھئے اس کی کیل تک مسالے میں چپک گئی ہے۔ اس کا مسالہ بھی بدلوا دیجئے۔

ہم - بہت بہتر

دوسرا - (اپنے ساتھی سے) بھائی دیکھو - یہ کہہ کر کہ بڑے پلنگ پر تو ہم اور تم سو رہیں اور چھوٹے دو پلنگوں میں سے ایک پر تم دونوں سو رہو - ایک پر ہماری طرف مخاطب ہو کر) آپ سو رہیں گے -

ہم - نہیں میں اندر فرش ہی پر سو رہوں گا -

پہلا - واہ صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے - یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور اندر ایک پلنگ پر بستر بچھانے لگے اور ہم اس غوطے میں پڑ گئے کہ یہ ہیں کون لوگ - کہاں سے آئے ہیں - اور ان کو ہمارا نام اور مکان کا پتہ کس نے بتایا - اتنے میں ایک صاحب پھر آ کر ہماری کرسی کے مقابل بیٹھ گئے اور بولے - صاحب! یہاں مرچ بہت کھایا جاتا ہے ابھی ہوٹل میں ہم لوگوں نے جو کھانا کھایا تو عجیب حالت ہو گئی - تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی دل چاہتا تھا کہ کوئی شکر یا برف کا کنواں ہو تو پھاند پڑیں -

دوسرے صاحب - (تیسرے صاحب سے مخاطب ہو کر) اچھا ہوا ہوٹل میں نہیں رکے اور آپ کا مکان بھی بالکل اتفاق سے نظر پڑ گیا

ہم نے کہا - یہ کیسے ؟

بولے - جب ہم کانپور سے چلے تو مومن صاحب نے بتایا کہ آپ سے ضرور ملتے آنا - ہم لوگوں نے آپ کی کتابیں پڑھی تھیں اس لئے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا - چنانچہ آپ کے مکان کے سامنے سے ہمارا تانگہ گزر رہا تھا کہ عین آپ کے مکان کے دروازے کے سامنے گھوڑے کا پیر پھسل گیا - ہم لوگ تانگے سے کود پڑے اور گھوڑے کو اٹھانے میں لگ گئے - اتنے میں پیچھے مڑ کر جو دیکھتے ہیں تو آپ کے دروازے پر آپ کا لیٹر بکس دکھائی پڑا مگر دروازے میں قفل لگا تھا لیکن ہم لیٹر بکس پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ کے مکان کے نیچے جو ہوٹل والا ہے - اس نے ہم کو آپ کے مکان کی کنجی دیتے ہوئے کہا کہ وہ آپ کا انتظار کرتے کرتے کانپور چلے گئے -

چنانچہ ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ضرور مومن صاحب نے آپ کو لکھ دیا ہے آپ کے اخلاق کی تعریف انھوں نے پہلے کر دی تھی اس لئے یہ سُن کر تکلیف ہوئی کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا آپ کے دوکان دار نے ہم لوگوں کے بستر بھی زینے پر لے جا کر رکھ دئے - یہ بیان سُن کر ہم کو خیال آیا کہ کانپور میں ایک مشاعرے میں ہم چار سال ہوئے جب گئے تھے اور وہاں اس نام کے ایک صاحب نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی تھی ان ہی صاحب نے غالباً ہم پر یہ نوازش فرمائی ہے - یہ لوگ چار روز رہ کے چنانچہ ان کے جاتے ہی ہم نے اپنا لیٹر بکس نکال کر پہلے اسے کچلا پھر مکان کی کال بل نکال کر اس کو زمین پر تین چار مرتبہ ٹپکا اور قسم کھائی کہ اب سے لیٹر بکس استعمال کرنے والے پر لعنت -

---

پسماندہ جاتیوں کی بہبود کا کام

پہلے پنجسالہ منصوبے کی مدت میں پسماندہ جاتیوں کی بہبود کے کام کی کئی اسکیمیں تیار کی گئی ہیں - ان لوگوں کو متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے سماجی اور اقتصادی حالات کے سدھار کے لئے خاص امداد کی ضرورت ہے - اچھوت جاتیوں، پسماندہ قبائل اور دیگر پچھڑے ہوئے طبقوں کے کام کے لئے اور ان کی خصوصی ضروریات کے مدنظر پہلے منصوبے میں ۳۹ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی - اس میں ۱۹ کروڑ روپے ریاستی حکومتوں کو امدادی گرانٹ دینے کے لئے مخصوص کیا گیا تھا - پسماندہ قبائل اور پسماندہ علاقوں کی بہبود و ترقی پر پندرہ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا اور چار کروڑ روپیہ چھوت چھات کے خاتمہ اور سابق جرائم پیشہ قبیلوں اور دیگر پسماندہ جماعتوں کی بہبود پر خرچ ہوا -

دوسرے منصوبے میں چھوت چھات کے خاتمے، پسماندہ جماعتوں کو کھیتی باڑی کے کاموں پر مائل کر کے اور منافع بخش ہنروں اور دستکاریوں کی تربیت اور ان کی اقتصادی حالات کو سدھارنے پر زور دیا جائے گا - پچھلے چند برسوں میں ان جماعتوں کے لئے تعلیم کی سہولتوں کو کافی توسیع دی گئی ہے - ان کو وظیفے، گرانٹ اور گزارہ الاؤنس وغیرہ سے مالی امداد بھی دی گئی ہے - ان پروگراموں کو آئندہ بھی پوری اہمیت ملتی رہے گی -

دوسرے منصوبے کے عرصہ میں ان لوگوں کے لئے مکانات مہیا کرنے کی خاص اسکیمیں جاری کی جائیں گی -

عبدالحی خاں سیوراوی

شعر یا ترنم

(ادارہ اس موضوع پر موافق و مخالف خیالات کے اظہار کی دعوت دیتا ہے)

مشاعروں کی واہ واہ اور داد و تحسین کے فلک شگاف نعروں کی فضا میں جب فہم و شعور کی پذیرائی ہوتی ہے تو علم و ادب کے طالب علم کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، شاعر کا ترنم اچھا تھا یا شعر میں خوبی ہی ایسی تھی کہ مجمع واہ واہ کے سیلاب کی زد میں آگیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ادھر چند دنوں سے کچھ شدت اختیار کر گیا ہے، اور اب اردو کے نیم ذمہ دار حلقوں میں بھی کانا پھوسی ہو رہی ہے کہ غزل اور نظم کو راگ اور لہجے کی اس بدعت سے کیوں کر آزاد کیا جا سکتا ہے جہاں روحِ شاعری شاعر کی خوش گلوئی کے بوجھ کے نیچے دب جاتی ہے، جہاں مضمون لفاظی کی رنگینیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور مشاعرے جو عہدِ قدیم سے اب تک عوام اور شاعری میں براہِ راست تعلق پیدا کرتے تھے کیوں کر عوام کو صحیح ذوق اور شائستہ مذاق عطا کر کے ان میں پاکیزہ تہذیب پیدا کر سکتے ہیں۔

ہر شعر کے الفاظ کے گل بوٹوں سے نظر ہٹائیے، اوزان اور قواعد کی میزان پر شعر کو تولئے تو ہر شعر میں ایک آہنگ یا نغمہ ملے گا۔ یہ آہنگ اور نغمہ در اصل شاعری کی جان ہیں۔ الفاظ کے پیچھے جو موسیقی یا راگ ہوتا ہے وہ بجائے خود شاعری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ ہونا چاہیے کہ یہاں نغمگی اور موسیقیت بے جان نہیں۔ یہاں اوزان کے خانوں میں الفاظ کو فٹ کر کے بے نشانے کی بندوق نہیں چھوڑی گئی ہے، یہاں کچھ اور ہے جس کا مقصد کسی خاص خیال کی ترجمانی، کسی مخصوص جذبے کی ادائی یا کسی دلکش منظر کی تصویر کشی ہے۔ صرف سادہ بربط کے معیار پر پورا اترنے والے علم موسیقی کی گت یا سُر نہیں، یہاں زندگی اور زندگی سے متعلق انسانی تجربات بھی ہیں۔ چنانچہ علم شاعری کی عالمی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسانی تہذیب جب رقص و موسیقی کی منزل سے آگے بڑھی تو قدم کے تال اور بانسری کی تان میں انسانی دل و دماغ کے پیدا کئے ہوئے وہ الفاظ بھی شامل ہو گئے جن کا مقصد انسانی عادات و خصائل سے متعلق کسی جذبے یا احساس کی ترجمانی تھا۔ شاعری کی یہ ارتقاء، عام ارتقائی مراحل کی طرح اپنی منزلِ اول کی خصوصیات سے یکسر بے نیاز نہیں ہو گئی۔ یعنی اس ترقی پذیر لفظی رقص و آہنگ میں بانسری کی تان پھر بھی محفوظ رہ گئی۔ شاعری صرف الفاظ کا مجموعہ نہ بنی بلکہ حسنِ ترکیب اور بیان و اسلوب کے اعتبار سے موسیقی سے ہم آہنگ رہی، اور پھر دھیرے دھیرے ہم اس منزل پر پہونچے جہاں یہ موسیقیت بھی گراں بار ہو گئی۔ الفاظ کی حرکت پر سے اوزان کی حکومتوں کا رعب جاتا رہا، اور دنیا کے بعض بلکہ تقریباً سبھی حصوں سے آزاد شاعری کا مطالبہ ہونے لگا، گویا اس منزل پر ہم راگ راگنی بھول گئے۔ موسیقی اور نغمہ جانِ شاعری نہ بن سکے اور انسانی تہذیب کے تقاضوں نے شعر کو انسان کی سماعت کے لئے صرف الفاظ کا مجموعہ بنا دیا جو بلند خیالی کے کوہستانوں سے گذرتا ہوا، نثر کے میدانوں تک جا پہونچا۔ غرضکہ یہ انجام وہی ہوا جو اس کا تاریخی انجام تھا۔ لیکن اس آزاد شاعری میں بھی بالکل نثریت نہیں ہے، خیال اور مشاہدہ کا عکس بھی ہے، اندازہ اور تجربے کا دخل بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کے وہ مخصوص خصائل بھی ہیں جسے شعرا اور شاعری کی زبان میں رمزیت اور اشاریت کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ موسیقی مر چکی، نغمگی جاتی رہی، لیکن مذاقِ شاعری اس صنف میں بھی برقرار رہا —— غرض یہ ہے ایک مختصر جائزہ شعر و نغمہ کی تاریخی ہم آہنگی کا۔

اردو شاعری وزن و آہنگ سے یکسر آزاد نہیں ہو سکی ہے، اب سے دو چار برس پہلے ملک کے نوجوان حلقوں میں آزاد شاعری یا بلینک ورس کا رجحان زیادہ تھا۔ یہ رجحان اُس دور کا ہے جب غزلوں کی بائیکاٹ میں

سے اجتناب ہمارے نقادوں کے نزدیک اُردو شاعری کے تحفظ و بقا کا واحد حل تھا لیکن حالات بدل گئے ہیں، وہ شعرا، جو بلینک ورس کی صاف شفاف لہروں سے کھیلتے رہے غزل کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ مجنوں، احتشام اور دوسرے معتبر ناقدینِ غزل کی گیرائی اور وسعت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک غزل کے امکانات ہیں، اور غزل اُن عوامی احساسات کے بار کی متحمل ہو سکتی ہے، جسے اب تک صرف نظم یا آزاد شاعری کے دوش پر سوار کیا جاتا رہا۔ غرض کہ غزل ہم سے قریب ہو رہی ہے، اور ظاہر ہے مینائے غزل کی ہر ہر بوند سے تغزّل کا امرت رس ٹپکے گا یعنی غزل اپنے تمام تر اوزان اور قواعد کی زد و بکتر کے ساتھ صف آرا ہوگی۔ اس میں موسیقی بھی ہوگی، وہ نغمہ یا آہنگ بھی ہوگا جسے ترنّم کی قالین پر پایۂ ہم خوش خرامی و خوش گامی آگے بڑھنا ہوگا۔ لیکن غزل بنانے والے غزل گو شاعر کو اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا، غزل کو ان تمام کیلی کانٹوں سے کسنا ہوگا جن کی مضبوطی سے قبائے غزل کا دامن تار تار نہ ہو۔ یہی نہیں ہمارے شعرا کو "اشاریت" کی وہ قندیل روشن کرنی ہوگی جس کی ہر کرن غور و فکر کے آئینوں سے منعکس ہو کر زندگی کی قوسِ قزح بنائے گی، اور غزل کے اس لاؤ لشکر میں ترنّم اور نغمے کی دل آویزی بہر حال ہوگی۔ ہم اپنی شاعری کے اِن امکانات کی فضا میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

ترنّم ہمارے حلق سے لگا ہوا ہے۔ یہ وہ احساس ہے جس کو ہماری فطرت اور انسانی اعضا و افعال کے ساتھ منسلک اعصاب ہرگز بھلا نہیں سکتے۔ ترنّم کی گدگدی ہمارے نوجوان، بوڑھے اور بچے کے دل میں وہ کیفیتیں پیدا کرتی ہے جسے ہم کچھ دیر کے لئے بے حد پسند کرتے ہیں، ہم کیف و نغمہ کی بلند ترین منزلوں سے گزر کر ایک ایسی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں گم ہو جانا زیادہ پسند کرتے ہیں اور واپس لوٹنا ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن ہم کو جب کبھی اپنے سر کو جنبش دینے کا موقع ملتا ہے ہم ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے گم شدہ اعصاب کو ڈھونڈتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ منزل ایک تخیلی جنّت تھی جہاں کی ترنّم ریزیوں میں ہمارا دل اٹکا ہوا تھا یا وہ دنیا ایک طلسماتی ارض کی تھی جس میں ہر جگہ یکساں کیفیتیں طاری تھیں۔ غرض جب ہم اُس عارضی دنیا سے گزرتے ہیں

تو اپنی زندگی یاد آتی ہے۔ زندگی جو میدانِ حشر کی طرح شور و شر، چیخ اور پکار، آہ و کرب، بے چینی اور ہیجان سے بھری ہوئی ہے۔ ہم کو اپنا وزن خود محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہمارے اعصاب ہم کو صحیح پوزیشن Equilibrium کا پتہ دیتے ہیں اور ہم کو فطری طور پر ترنّم کے اُس فریبِ تخیّل سے پیچھا چھڑانا پڑتا ہے۔ اب خالی شدہ رہ جاتا ہے، دو مصرعوں کا ایک شعر یا چند الفاظ کا ایک مجموعہ۔ یہ مصرعے اور الفاظ کے اس قسم کے مجموعے اچھے بھلے ہوتے ہیں یا بُرے ہوتے ہیں، اس کی تمیز اب ہوتی ہے جب کہ ترنّم کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور شاعر کی آواز کے پیچھے اس کا شعر ہمارے شعور تک داد و تحسین کی فریاد کرتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ترنّم کی ڈگڈگی بجا کر مداری شاعر اپنے فن کا تماشا دکھا گیا اور ہم اُس کا پیچھا کرتے رہ گئے۔

ترنّم کے بھی کئی درجے ہیں۔ ترنّم کا سلسلہ گدڑیے کے بول سے مشہور گانے والی طوائفوں اور فلمی پریوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ترنّم کے اس مرض البلاد میں ہمارے مشاعروں کے شاعر کو کس مقام تک پہونچنا ہے۔ یہ غور طلب امر ہے۔ اس پر سوچنے سے پہلے ہم کو یہ بتانا پڑے گا کہ ہمارے شاعر کے پیشِ نظر شعر ہے یا ترنّم۔ مذاقِ شاعری ہے یا ذوقِ نغمہ۔ جذبۂ فن ہے یا خواہشِ نمود۔ اس کے جواب میں کوئی ایک فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ ترنّم پر جان دینے والے زیادہ تر شعرا کے جذبات نام و نمود کے ہوکے میں مبتلا ہیں۔ عوامی اسٹیج پر بیٹھنے کی سرفرازی کا جذبہ اُن کے ذوقِ شاعری کو ترنّم کے پہیّوں پر آگے ڈھکیل رہا ہے۔ وہ "شاعرِ رنگین نوا" بننے کی دُھن میں پوچ اور پست اشعار پر خوش گلوئی کی ساری صلاحیتوں کو صرف کرتے ہیں۔ کچھ کی تعداد ایسی ہے جو ترنّم سے زیادہ شعر پر توجہ دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شعر کو ترنّم انداز میں پڑھنا، اچھی شراب کو مٹی کے پیالوں کی بجائے شیشے کے سبو میں پینے کی مانند ہے۔ ان کے یہاں ترنّم شاعری کی صلاحیت غلطی نہیں بلکہ اضافی صلاحیت ہے۔ مگر ان شعرا کی تعداد بے حد کم ہے جو شعر تو کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں لیکن پیرانہ سالی یا ترنّم سے ناواقفیت کی بنا پر مصرعے توڑ توڑ کر یا زبان کی لکنت پر قربان ہو کر مجمع میں شعر پڑھتے ہیں۔ مختصراً شعرا کی تین جماعتیں ہیں مترنّم، نیم مترنّم اور غیر مترنّم۔ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ "جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی

وہ خاموش ہے" کے قول کے مطابق ہر وہ شاعر جو جتنا ہی زیادہ مترنّم ہے وہ اتنا ہی کم شاعر ہے (مستثنیات کی ہر جگہ گنجائش ہے) اور کوئی ضروری نہیں کہ یہ تقسیم بھی تمام شعراء کی طول طویل قطار میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کے نزدیک ترنّم کی اہمیت زیادہ ہے۔ گویا ان کا مقصد شاعری نہیں، ترنّم کے بل بوتے پر مجمع پر اپنا رنگ جما لینا مقصود ہے۔ اس قسم کے شاعر اور ان کی شاعری کا مشاعرے کے پنڈال سے باہر کوئی وجود نہیں، اور بادی النظر شاعر سے کہیں زیادہ مشاطر ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مشاعروں اور پبلک اسٹیجوں پر شاعر کو کون سا لہجہ اختیار کرنا چاہیئے، ترنّم کی کس روایت کو زندہ کرنا چاہیئے۔ گدھے کے بول سے فلمستان تک کے سلسلے میں کس سے نسبت قائم کرنا چاہیئے تو اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا شاعر وہ لہجہ اختیار کرے جو آواز کے اعتدال پر مبنی ہو، جو فلمی گانوں کی نقّالی سے مبرا ہو جو تقریباً وہی یا اُس سے کم و بیش گنگناہٹ، وہی نغمگی اور وہی لہجہ ہو جو شعر کہتے وقت شاعر نے اختیار کیا تھا، اُس کے اشعار میں ترنّم کی آویزش دودھ میں شکر کی مقدار رہی ہو اور شاعر پاکیزگی اور صفائی کے ساتھ اپنے اشعار کو عوام میں پیش کر سکے۔

ادھر چار یا پانچ برسوں میں مجھے متعدد مقامات پر کئی مشاعروں میں حاضر ہونے کا موقع میسّر آیا۔ ایک غیر شاعر یا عام پبلک کی حیثیت سے مجھے عوام کے احساسات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ میں نے ان لوگوں کے تبصرے بھی سننا چاہا جو، وہ نہیں جانتے، جو محفلِ مشاعرہ میں اسی بحث ترنّم کی تلاش میں آتے ہیں جیسے ہم فلمی تصویر گھروں میں تلاش کرتے ہیں۔ میں نے یہ اندازہ کیا ہمارے شعراء کی یہ ترنّم ریزی شعر فہمی اور شعر گوئی کے مذاق کو تباہ کر رہی ہے، اور آزادیٔ ہند کے بعد تو بہتیرے سر پھیروں نے اس تیزی کے ساتھ شاعر ہونے اور مشاعروں کے دعوت نامے پانے کا اعزاز حاصل کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کونسا جادو کا درخت اُگ آیا جو اشعار کے پھول اُگل رہا ہے۔ آج کل شاعری وہ شئے لطیف نہیں رہی جس کے لئے احساس، خلوص اور سوز کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج تو شاعری کی صرف دو منزلیں ہیں، میٹرک کے درجے کے بعد اُس نے کسی چلتے ہوئے شاعر کی دو چار غزلیں حفظ کیں اور پھر قافیوں کے کتر بیونت کئے۔ بس حلق کا بلغم پھینکا اور دوسرے ہی لمحے میں شعر لہرانے لگا۔ یہ شعر نہیں ہماری بدذاتی کا وہ سانپ ہے جس کے پھن لہراتے ہیں، اور جو ہماری تہذیب کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

کسانوں کی قومی کنونشن کے ۶۹۳ ڈیلیگیٹوں کا دورہ

بھارت کے کسانوں کی دوسری کنونشن کا اجلاس حال ہی میں دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کنونشن میں بھارت کی قریباً تمام ریاستوں سے آئے ہوئے ۶۹۳ ڈیلیگیٹوں کو لے کر ایک اسپیشل ریل گاڑی کورو کشیتر پہنچی۔ ان میں ۷۵ عورتیں بھی شامل تھیں۔

کمیونٹی پروجیکٹس ایڈمنسٹریشن کے زیر اہتمام ان لوگوں کو تھانیسر کمیونٹی پروجیکٹ دکھانے کے لئے کورو کشیتر لے جایا گیا تاکہ ان کا پنجاب کے کسانوں سے ملاپ کرایا جائے۔ مہمانوں میں بہت سے کرشی پنڈت اور فصلوں کے ریاستی مقابلوں میں انعام حاصل کرنے والے لوگ شامل تھے۔

اس ملاقات کی غرض وغایت یہ تھی کہ ملک بھر کے کسانوں کے ان نمایندوں، مقامی کسانوں اور کمیونٹی پروجیکٹ عملہ کے مابین مشترکہ مسائل پر تبادلۂ خیال اور ایک دوسرے کے تجربات کا تبادلہ کر کے متعلقہ مسائل پر ملک بھر کے وسیع مفاد کے نظریے سے غور وخوض کیا جائے۔

کورو کشیتر میں ایک مجلس مباحثہ منعقد کی گئی جس میں بہت سے مہمانوں اور مقامی کسانوں نے حصہ لیا۔ بہت سے مقرّرین نے ایک امر پر متفق رائے ظاہر کیا کہ وہ اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کمیونٹی پروجیکٹ تحریک نے اُن کی طرزِ زندگی اور کام کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ اس دن کا پروگرام گروپ ناچ اور فلم شو دکھانے کے بعد ختم ہوا۔ بھارت کی زندگی کلچر اور ترقیات کے مختلف پہلوؤں پر دستاویزی فلمیں دکھائی گئیں۔

اختر علی تلہری

غزل

پھر تری بزمِ طرب میں ہے غزل خواں کوئی
چھیڑنے بیٹھا ہے پھر تارِ رگِ جاں کوئی

ملتفت پھر ہے اِدھر برق بہ داماں کوئی
پھر ہے تکمیل طلب کارِ نمایاں کوئی

دیکھ بے باک نگاہوں سے نہ گلشن کی بہار
نکہت و رنگ کے پردے میں ہے رقصاں کوئی

رنگ بھرتے کو نیا طُور کے افسانے میں
پھر چلا ہے طرفِ منزلِ جاناں کوئی

میں نے دیکھی ہے ترے عارضِ رنگیں کی بہار
کیا سمائے مری آنکھوں میں گلستاں کوئی

دامنِ دل میں چھپائے ہوئے لاکھوں ارماں
آ رہا ہے طرفِ عالمِ امکاں کوئی

پھر گناہوں پہ مرے قہر کی نظریں ڈالے
پہلے بدلے تو سہی فطرتِ انساں کوئی

گلشنِ دہر کا سب رنگ اُڑا جاتا ہے
اب حقیقت کو کرے اور نہ عریاں کوئی

برقِ جلوہ کو ذرا رُخصتِ بے باکی دو
ہے کہیں طاقتِ دیدار پہ نازاں کوئی

رنگ و بوئے دہر کے سب کھینچ لئے ہیں دل میں
اب تو زنداں نہیں میرے لئے زنداں کوئی

ایک جلوہ ہے مگر ذوقِ نظر ایک نہیں
کوئی گلچینِ تماشا ہے تو حیراں کوئی

ہم نفس آج ہے کیوں لب پہ ترے نوحۂ غم
لُٹ گیا عینِ بہاراں میں گلستاں کوئی

دیر و کعبہ نہ سہی محفلِ رنداں ہی سہی
کاش مل جائے کہیں دہر میں انساں کوئی

اب یہ ہے بخت کی شوخی کہ عطا کی شوخی
گُل بداماں ہے کوئی خاک بداماں کوئی

ہاں میں سمجھا کہ بہارِ چمن آرا کیا ہے
ہے گل و لالہ کی دنیا میں فروزاں کوئی

شوخیٔ پُر عشوہ کی یہ شوخ ادائی اختر
برق کی راہ سے ہے سلسلہ جُنباں کوئی

مبارز الدین رفعت

دکن کی نادر صنعت پارچہ بافی

ہمرو، مشروع اور کمخواب

ہندوستان میں پارچہ بافی کی صنعت کب سے شروع ہوئی یہ تو ٹھیک طور پر بتایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اتنا قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنعت ہندوستان میں بہت ہی قدیم زمانوں سے چلی آ رہی ہے۔ اس کے بہت سے ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستانی صنعت پارچہ بافی کی بے نظیر ماہرانہ کاریگری کے ارتقائی مدارج کی کڑیاں ہمیں موہنجوداڑو کی مہروں، سانچی اور متھرا کی مورتیوں اور اجنتا کی دیواری تصویروں میں ملتی ہیں۔ حالیہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ فراعنۂ مصر کے مقبروں میں رنگین کپڑوں کے جو ٹکڑے برآمد ہوئے ہیں۔ وہ آج سے پندرہ سو سال پہلے ہندوستان میں بنائے گئے تھے۔ اجنتا کی دیواری تصویروں میں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں بنی ہیں۔ ہمیں مختلف وضع قطع اور مختلف ڈیزائنوں کے کپڑے پہنے عورت اور مرد دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصویروں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس زمانے میں کپڑے بننے کی تکنیک اور ڈیزائن بنانے کی صلاحیتیں کتنے اونچے درجے پر پہنچ چکی تھیں۔ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے ہیون تسانگ سے لے کر اس ملک کے کتنے ہی سیاحوں کے لئے موجب حیرت بنے رہے۔ میگاس تھنیز حضرت عیسیٰ سے کوئی تین سو سال پہلے ہندوستان آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ یہاں کے راجے مہاراجے ایسے کپڑے پہنتے تھے جن پر خالص سونے کا کام کیا ہوتا تھا اور ان میں قیمتی ہیرے جواہرات ٹکے ہوتے تھے۔

لیکن اس قدیم صنعت پارچہ بافی کا کوئی نمونہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ صرف سولھویں صدی عیسوی سے ہمیں ہندوستانی کپڑوں اور پوشاکوں کے نمونے ملتے ہیں۔ کپڑے کے یہ نمونے بڑے ہی خوبصورت اور دلکش ہیں اور مغلوں کی نفاست پسندی اور ان کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کے شاہد عادل ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے ہندوستانی پارچہ بافی کی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں کپڑوں کی کئی قسمیں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہاں دیہاتیوں کے اپنے خاص کپڑے تھے جن کے ڈیزائن اور رنگ بندھے ہوئے تھے۔ کچھ خاص ذاتیں تھیں جو مخصوص رنگ اور مخصوص ڈیزائن ہی استعمال کیا کرتی تھیں۔ پھر شادی بیاہ اور موت مٹی کی رسمیں تھیں جن میں رسوم خاص قسم کے لباس کی طالب تھیں۔ خوشی کے موقعوں پر خالص ریشم اور سونے چاندی میں بنا ہوا کپڑا ہندو عورت اور مرد سب ہی پہنتے تھے۔ لیکن ایسا کپڑا پہننا شرع کی رو سے مسلمان مردوں کے لئے ناجائز تھا۔ وہ ملے جلے ریشم اور سوت کا کپڑا پہنتے تھے اور اسی تجدید نے ہمرو اور مشروع جیسے کپڑوں کی صنعت کی بنیاد رکھی۔ اس کے سوا شاہانہ درباروں کی روایات تھیں جن میں ریشم کے ساتھ سونے چاندی کے تاروں میں بنے ہوئے کپڑے پہنے جاتے تھے اور ان ہی روایات نے کمخواب جیسے دلربا کپڑے کی صنعت کو فروغ دیا۔

ہمرو، مشروع اور کمخواب دکن کی دستی صنعت پارچہ بافی کی مشہور پیداوار ہیں اور اورنگ آباد اور اس کا نواحی شہر پیٹھن دونوں قدیم زمانوں سے اپنی ان صنعتوں کے لئے مشہور چلے آ رہے ہیں۔

مشروع

مسلمان مردوں کے لئے شرع کی رو سے خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں۔ ہاں ملے جلے ریشم اور سوت کا کپڑا وہ پہن سکتے ہیں۔ اس تجدید کا ایک دلچسپ نتیجہ مشروع (لغوی معنی ہیں شرع کی رو سے جائز) اور ہمرو جیسے کپڑوں کی صنعت ہے۔ مشروع ملے جلے سوت اور ریشم کا کپڑا ہے۔ اس میں اطلس جیسی چمک تو نہیں ہوتی لیکن یہ چمک دار چھینٹ سے مشابہ دکھائی دیتا

ہے۔ بُنے جانے کے بعد مشروع کو ریٹھے اور میٹھے نیبو سے دھویا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کپڑے میں ایک طرح کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کو اصل چمک ایک اور چیز کے ذریعے دی جاتی ہے جو "کنڈی" یا کلف کہلاتی ہے۔ یہ کلف خریداری طے ہو جانے کے بعد ہی دیا جاتا ہے۔ ضلع اورنگ آباد کے اور دو مقامات وبیجا پور اور پیٹھن میں بھی مشروع تیار ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں اورنگ آباد کے پُر تکلف مشروع ہندوستان بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر مسلمان مرد ان کی شیروانی، چغے اور دوسرے لباس بنا کر پہنتے اور یہ کپڑا عورتوں کے پاجاموں وغیرہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

مشینی کپڑوں کے قبول عام کے بعد مشروع کی مانگ بتدریج گھٹنے لگی تو اس کے بننے والوں نے بھی گرتے ہوئے بازار کا ساتھ دینے کے لئے نقلی ریشم استعمال کرنا شروع کیا۔ اب خالص ریشم اور سوت کے بُنے ہوئے مشروع شاذ و نادر ہی بنتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب بھی مشروع بننے والوں کی مہارت اور صناعی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے لیکن مانگ نہ ہونے سے اس صنعت کا حال بہت بُرا ہے۔ آج کل لوگ ایسی چیزوں پر جو خاص خاص موقعوں پر ہی استعمال کی جا سکیں، اپنا کافی روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ تاہم اب بھی یہ صنعت تباہ ہونے سے بچائی جا سکتی ہے اگر لوگ اس پر تھوڑی سی توجہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ تقریباً ایک سو سال سے سسکتی ہوئی اس صنعت میں نئی جان ڈالی جا سکتی ہے اگر اس کے استعمال کے ڈھنگ اور نئی نئی تدبیریں سوچی جائیں۔

ہمرو

ہمرو اورنگ آباد کی ایک خوبصورت اور نازک پارچہ بافی کی صنعت ہے۔ یہ کپڑا ابھی ہاتھ سے بنا جاتا ہے اور کئی لحاظ سے مشروع سے ملتا جلتا ہے۔ یہ سوت اور ریشم ملا کر بنا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں جن میں کبھی کشمیری شالوں کی نقالی بھی ہوتی ہے۔ کبھی اسے ریشم اور اون کا حاشیہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے ایک تھان کو تین آدمی دو مہینوں میں بُن لیتے ہیں۔ کسی زمانے میں اس کپڑے کے تانے بانے میں سوت استعمال کیا جاتا تھا اور اس کے اوپر کے بیل بوٹے ریشم کے ڈورے سے بنائے جاتے تھے۔ لیکن آج کل اس کپڑے کی تزئین اور آرائش کے لئے بیشتر نقلی ریشم ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ نقلی ریشم عام طور پر انگلستان، اطالیہ، فرانس اور جاپان کا بنا ہوا ہوتا ہے۔

مشروع اور ہمرو جن اشیاء سے بُنا جاتا ہے ان کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ کپڑے بہت زیادہ پائیدار ہوتے ہیں اور انھیں اچھی طرح دھویا جا سکتا ہے۔ ہمرو کی بنت کافی گنجان ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد سوت ہوتی ہے اور اس کے بیچ بیچ میں ریشم ملا کر اس پر ہلکے گہرے رنگوں میں خوبصورت ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض کی بنت ململ کی طرح نفیس ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں اس کپڑے کے نقلب، ٹوپیاں، دلہن کے ملبوس اور ساڑھیاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ موجودہ طرز ملبوس کے لحاظ سے اس کپڑے سے کئی کام لئے جا سکتے ہیں۔ خواتین کے شام کے کوٹ بلاوز اور پاجاموں کے لئے اس سے اچھا کپڑا ملنا مشکل ہے۔ پاجاموں اور لہنگوں وغیرہ کے سوا اس کے تکیوں کے غلاف، اور بستر کی چادریں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔ ہلکے رنگ کے ہمرو کی شیروانی بھی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ہمرو ہلکے گہرے کئی رنگوں میں بنایا جاتا ہے اور اس کے اوپر بنے ہوئے گل بوٹے زائد تانا بانا دے کر بنت کے اندر ہی بنائے جاتے ہیں۔ اس کے ڈیزائنوں کی ترتیب، ان کے دائروں اور ان کی دھاریوں کا اُتار چڑھاؤ، ان کے رنگوں کا تناسب اور ان کے دھاگوں کی پیچ در پیچ بنت، یہ سب چیزیں مل کر ان کپڑوں کو عجیب دلکشی بخشتی ہیں۔ اس کپڑے کی بنت کافی گُتھی ہوئی ہونے پر بھی یہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔ اس کے ایک مربع گز کپڑے کا وزن تین سے لے کر پانچ اونس سے زیادہ نہیں دیکھا گیا۔ اس کپڑے کے ایک مربع انچ کے اندر دھاگے کی دو سو اسی چوکڑیاں ایک عام بات ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ہمرو کی صنعت کو کچھ فروغ حاصل ہوا ہے اور اس کے بیل بوٹوں میں نئی جدتیں پیدا کی گئی ہیں۔ اب تو اس کے قیمتی صوفوں اور کرسیوں کے گدوں کے غلاف بنائے جا رہے ہیں۔ اس کپڑے کے سوتی پس منظر میں بنی ہوئی بوٹیاں، دھاریاں اور خوبصورت گل کاری کمروں کے فرش فروش اور پردوں وغیرہ کے لئے نہایت درجہ موزوں ثابت ہوئی ہے۔ اگر اس کپڑے کے پردوں اور فرش وغیرہ سے کمروں کو سجایا جائے تو ان کی زیبائش دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔

شروع کی طرح ہمرو کی صنعت کے بُرے دن بھی بس اسی وقت سے شروع ہوئے جب سے کہ بھڑکیلے مشینی کپڑوں نے رواج عام پایا۔ پھر تو فیشن بھی بدلے اور ان کپڑوں کے بننے والوں کی سرپرستی بھی ختم ہوئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا چاہئے تھا کہ بس دو چار ہی راچھوں پر کام ہوتا تھا۔ یہ افسوسناک حالت دیکھ کر ریاست حیدرآباد دکن کے محکمۂ صنعت و حرفت نے اس کی امداد کے لئے اپنا دست کرم بڑھایا۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ محکمہ اس صنعت کی ترقی میں کوشاں ہے اور اس کی امداد سے یہ صنعت اب بڑی حد تک سنبھل گئی ہے۔ مقامی کارخانوں میں جو ہمرو تیار ہوتا ہے اسے گھریلو صنعتوں کی فروخت کا شعبہ خرید لیتا ہے اور ہند اور ہند سے باہر ان کی فروخت کا انتظام کرتا ہے۔ اس محکمہ کے فنی مشوروں سے اب جو ہمرو تیار ہو رہا ہے اس کے ڈیزائنوں اور ان کی بناوٹ میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اس کپڑے کے سوت کے لئے جو رنگ استعمال ہوتے ہیں وہ بالکل پکے ہوتے ہیں اور یہ محکمہ صرف پکے رنگوں کا سوت ہی کپڑا بننے والوں کو فراہم کر رہا ہے۔ اب یہی محکمہ ہمرو کے مختلف ڈیزائنوں کا ایک البم شائع کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ہمرو بننے والوں کی ایک کواپریٹو سوسائٹی بھی قائم کر دی گئی ہے اور اس سوسائٹی نے بڑے پیمانے پر اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اس صنعت کی ترقی کے لئے حکومت ہند نے سات ہزار ایک سو بارہ روپے کی امداد کے سوا چوبیس ہزار نو سو روپے بھی بطور قرض دئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حکومت ہند نے ضروری آلات و اوزار خریدنے کے لئے مزید پانچ ہزار روپے کا عطیہ دینا بھی منظور کیا ہے۔ ہماری عوامی حکومت کی یہ نظرِ توجہ ہندوستان کی اس قابل فخر صنعت کے لئے ایک فال نیک ہے۔

کمخواب

کمخواب ایک اعلیٰ درجے کا کپڑا ہے۔ زری کے کام کا یہ کپڑا جس میں سونے اور چاندی کے تار استعمال کئے جاتے ہیں۔ اورنگ آباد اور پیٹھن میں بنا جاتا ہے۔ اگر زری کا کام خالص ریشم پر ہو تو اسے "امرو" کہا جاتا ہے اور ریشم کے ساتھ اس میں سونے کے تار استعمال کئے جائیں تو یہی کمخواب کہلاتا ہے۔ زری کا یہ کام ہندوستانی صنعت پارچہ بافی کا ایک اعجاز ہے۔

ہندوستان میں زری کے کپڑے اور مہین ململ بننے کا فن کم سے کم دو ہزار سال سے بھی پرانا ہے۔ یہاں کی پرانی سے پرانی مورتیوں میں دیوی دیوتاؤں اور راجے مہاراجوں کو زرتار کپڑوں اور مہین ترین ململ میں ملبوس دکھایا گیا ہے۔ اجنتا کی تصویروں میں عورتوں کے زرتار کپڑوں کا رنگ نیلا ہے جو اب بھی ایک مقبول عام رنگ ہے۔ ہندوستانی کپڑوں اور مہابھارت کی رنگین دھاریں اور گل کاریوں کی روایتی تزئین و آرائش سے قدیم شاید ہی کوئی اور روایتی تزئین ملے۔ کمخواب یا ریشمی زرتار کپڑوں میں کئی ہزار سال کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ آشوریہ اور مصر نے نفیس پارچہ بافی غالباً ہندوستان ہی سے سیکھی۔ قدیم ترین زمانوں میں ہندوستان، مصر، کلدانیہ، آشوریہ، بابل اور فنیقیہ میں سوت میں سونے چاندی کے تار ملا کر کپڑے بننے کا رواج عام تھا۔ پہلے تو سونے چاندی کے چپٹے پتر دھاریوں اور پٹوں کے لئے دئے جاتے تھے۔ پھر اس کے مہین تار بنا کر انھیں کپڑے کے اندر ہی بنا جانے لگا۔ اس کے استعمال کے قدیم ترین طریقے اب بھی پورے ہندوستان کے طول و عرض میں مستعمل ہیں۔

کمخواب کا استعمال ریشم سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ خیال ہے قدیم دنیا میں اس صنعت کو سب سے زیادہ فروغ بابل، [illegible] میں ہوا۔ اور اس کے وہی ڈیزائن اور فنی طریقے اختیار کئے گئے جن کی ایجاد کا فخر اہل ہند کو حاصل تھا۔ اہل ہند کو یہ طریقے اور یہ ڈیزائن بھی رامائن اور مہابھارت کی تصنیف سے بھی پہلے سے معلوم تھے اور منو شاستر کی تدوین کے وقت ان کا فنی شعور اپنے پورے عروج پر تھا۔

رنگین ریشمی پارچہ بافی کی صنعت اصل میں بہت ہی قدیم زمانوں میں چین سے ہندوستان آئی۔ اس دیس میں مسلمان آئے تو ان کے ذوق جمال نے ریشمی کپڑوں کے ڈیزائنوں کو بھی خوب متاثر کیا۔ مسلمانوں کے بعد اہل مغرب ہند آنے جانے لگے تو اطالیہ کے بعض ڈیزائنوں کا اثر اس صنعت نے قبول کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی پارچہ بافی کی تاریخ میں کشیدہ کاری کی شکلیں قدیم زمانے سے غیر متبدل دیکھنے میں آتی ہیں لیکن زرتار کپڑوں کے بعض ڈیزائنوں میں سولھویں صدی کے اطالوی ڈیزائنوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ قدیم زمانوں میں زرتار کپڑوں کی بڑی زبردست مانگ مندروں اور مسندوں کے غلافوں کے لئے تھی کیونکہ

ہیں اصل میں یہ صنعت مصر، ہندوستان، بابل اور فنیقیہ کی ان عورتوں کی یادگار ہے جو ایسے نقاب استعمال کیا کرتی تھیں۔

کہتے ہیں ہمرو، مشروع اور کمخواب کی صنعتوں نے اورنگ آباد اور اس کے نواحی علاقوں میں احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہوں کے عہد میں اپنے قدم جمائے۔ ان صنعتوں کے موروثی پارچہ باف اصل میں گجرات سے یہاں آئے تھے جہاں ان کے اسلاف قدیم ترین زمانوں سے گجرات کے راجاؤں اور سلطانوں کی سرپرستی میں اپنی صنعت کو جلا دیتے چلے آ رہے تھے۔

پیٹھن اور اورنگ آباد میں جو کمخواب بنا جاتا تھا کسی زمانے میں اس کی شہرت پورے ملک میں تھی اور اس کے نہایت بیش قیمت تھان یہاں تیار ہوتے تھے۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کے پانچویں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ۱۶۰۳ء کے لگ بھگ ایران کے صفوی بادشاہوں کا ایک سفیر گولکنڈہ آیا اور ۱۶۰۶ء تک قطب شاہی دربار میں مقیم رہا۔ جب یہ سفیر اپنے ملک کو واپس جانے لگا تو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کے ہاتھ شاہ ایران کے لئے بیش قیمت تحفے روانہ کئے۔ ان تحفوں میں کمخواب کا ایک تھان بھی تھا۔ اس تھان کو بننے کے لئے پیٹھن کے کمخواب بننے والے تمام راچھے پانچ سال تک مصروف رہے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دربار کا ملک الشعرا فیضی دکن آیا اور یہاں سے جو عرضداشت اس نے شہنشاہ اکبر کی خدمت میں بھیجی ان میں دکن کی صنعت پارچہ بافی کی تعریف میں یہاں تک لکھا گیا کہ "صنعت پارچہ بافی در پیٹھن بے بدل است" مارکوپولو نے اپنے سفرنامے میں دکن کی صنعت پارچہ بافی کی بڑی مدح سرائی کی ہے اور سونے چاندی کے زرتار کپڑوں کی نفاست کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "ان کی بنت اتنی مہین اور نفیس ہوتی ہے کہ مکڑی کے جالے سے ان کا اچھی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اور دنیا کے کسی بھی ملک کے شاہ اور ملکہ ان کپڑوں کو پہننا اپنے لئے باعث فخر سمجھیں گے"۔

شہنشاہ اورنگ زیب دکن میں کوئی بیس سال تک قیام پذیر رہے شہنشاہ اور ان کے افراد کے اتنے طویل قیام دکن نے پارچہ بافی کی ان صنعتوں کو اور بھی فروغ بخشا۔ شہنشاہ اورنگ زیب ہندوستان کے تخت پر کوئی پچاس سال تک رونق افروز رہے لیکن ان کے ذاتی زہد و تقوی نے ان صنعتوں کی ترقی کو بالکل ہی متاثر نہیں کیا۔ مشہور فرانسیسی سیاح ٹیورنیر سترھویں صدی کے نصف آخر میں مغل دربار میں حاضر تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے جلوس کے جشن کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "شہنشاہ کے جلوس کے جشن کے لئے زرکار سرخ مخمل کے شامیانے کھڑے کئے گئے ہیں۔ زرکار مخمل کے یہ شامیانے اتنے زیادہ وزنی ہیں کہ انھیں تھامنے کے لئے جہازوں کے مستولوں جیسے زبردست کھمبے دئے گئے ہیں"۔

کمخواب اورنگ آباد اور پیٹھن کی دستی صنعت پارچہ بافی کی نفیس ترین پیداوار ہے۔ پیٹھن اصل میں دکن کے قدیم حکمران خاندان ساتواہن راجاؤں کی قدیم راجدھانی ہے۔ اس کا پرانا نام "پراتسٹھانہ" تھا۔ یہ دکن کے قدیم ترین شہروں میں گنا جاتا ہے اور قدیم یونانی مؤرخوں کی کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شہر اورنگ آباد سے کوئی تیس میل جنوب میں دریائے گوداوری کے کنارے آباد ہے۔ یہاں جو کمخواب ریشم میں بنا جاتا ہے اس پر طرح طرح کی گل کاری کی جاتی ہے۔ اس کے سنہرے حاشیے پر اتنا بڑھیا کام ہوتا ہے کہ کپڑے کی قیمت اصل ریشم سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ کمخواب بننا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے خصوصی مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس کے حاشیے اور پلّو اس طرح بنے جاتے ہیں کہ اس کپڑے کے دونوں رُخ یکساں نفیس ہوتے ہیں اور ان میں اُلٹا سیدھا نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض کی بنت ململ کی طرح نہایت مہین اور نفیس ہوتی ہے۔ ان کپڑوں کے نقاب، سر کے لباس، شادی کی پوشاکیں اور ساڑھیاں بنتی ہیں۔ کاری گری اور رنگوں کے لحاظ سے اس کپڑے کی کئی قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک قسم چاند تارا کہلاتی ہے، ایک دھوپ چھاؤں، ایک بلبل چشم اور ایک مرغولہ وغیرہ وغیرہ۔

کمخواب ایک بیش قیمت کپڑا ہے۔ اب بھی اس کا ایک چھوٹا سا تھان ایک ایک ہزار روپے سے بھی زیادہ قیمت کا ہوتا ہے۔ کمخواب کے تھان عام طور پر طول میں تین گز اور عرض میں ایک گز کے ہوتے ہیں۔ قیمتی تھان صرف خصوصی آرڈر پر ہی تیار کئے جاتے ہیں۔ عموماً ان کے تھانوں کی قیمت دو سو سے کر پانچ سو روپے تک ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ کپڑا گھروں کی نچلی منزلوں میں بنا جاتا ہے۔ دو مرد اور ایک لڑکا مل کر اس کا تھان تقریباً دو مہینوں کے اندر بن لیتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے تانے بانے میں سُوت بھی ملایا جاتا ہے اور ایسی صورت

میں اس کی لاگت کم ہو جاتی ہے۔ خالص سونے چاندی کی زرکاری کم ہی ہوتی ہے۔ اور عام طور پہ اس میں کچھ اور دھاتیں ملا دی جاتی ہیں اور گل کاری میں بھی ریشم کی جگہ سوت کے دھاگوں کو مختلف رنگ دے کر استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں امراء اور رجے رجواڑے اور خوش حال لوگ اس کپڑے کے بڑے سرپرست تھے۔ لیکن اب تو صرف شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی یہ کپڑے خریدے جاتے ہیں اور وہ بھی آرڈر دینے پر تیار کئے جاتے ہیں۔ مردوں کے لئے اس کی شیروانی اور صدری بنتی ہے۔ عورتیں اسے قدیم مغل طرز کے پاجاموں، صدریوں اور ساڑھیوں کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

پٹن میں ریشمی ساڑھیوں کے نہایت خوبصورت زریں پلّو بھی تیار ہوتے ہیں۔ ان پر نہایت نفیس گل کاری ہوتی ہے اور طرح طرح کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ ساڑھیوں کے یہ نہایت درجہ خوبصورت زرکار پلّو اب میز پوش، ہینڈ بیگ اور شام کے لباسوں کے لئے بھی استعمال کئے جا رہے ہیں اور ان کی بنی ہوئی یہ چیزیں بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں۔

عام سرپرستی سے محروم ہو کر پچھلے کئی سالوں سے اس صنعت کا انحطاط بڑھتا ہی جاتا تھا۔ ہمرو کی طرح کمخواب کی صنعت کو تباہی سے بچانے کے لئے ریاست حیدرآباد کے محکمہ صنعت و حرفت نے مختلف کوششیں کی ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس صنعت کو کوآپریٹو کی بنیاد پر چلانے کے لئے حکومت ہند نے دو ہزار روپے بطور عطیہ دئے ہیں اور سولہ ہزار ایک سو روپے کی رقم اس کے اراکین کو بطور قرض دی ہے۔ اب پٹن کے زری بننے والے باقندوں کی ایک کوآپریٹو سوسائٹی بن گئی ہے اور ان کا ایک مرکزی کارخانہ قائم ہو گیا ہے۔ اس طرح پٹن کی اس اعلیٰ صنعت کے باقندوں کو جو بڑی حد تک بے کار بیٹھے تھے اچھا روزگار فراہم ہو گیا ہے۔

ہمرو مشروع اور کمخواب کے ڈیزائن

ہمرو ہو کہ مشروع یا کمخواب ان تمام کپڑوں کے روایتی ڈیزائنوں کی خصوصیت ہندسی شکلیں ہیں۔ دھاریاں، دائرے، چوخانے وغیرہ گل کاری بیل عام طور پر بوٹی بہت ہوتی ہے۔ ان ڈیزائنوں پر ایرانی اثر غالب نظر آتا ہے — کبھی گل کاری "شجر حیات" کی صورت میں بھی کی جاتی ہے اور پھول پتے بڑے دلکش انداز میں بنائے جاتے ہیں۔ کپڑوں پر یہ گل کاری مغلوں کا عطیہ ہے

ایران کے دلکش فنون لطیفہ کی روایات سے متاثر مغلوں نے اپنے دربار کے ذریعے اس ملک کے فنون لطیفہ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ کہیں کہیں ان کپڑوں کے ڈیزائنوں میں ہمیں بیرونی ملکوں کے ڈیزائن بھی مل جاتے ہیں بے شک ان کا خیال باہر سے لیا گیا ہے لیکن انھیں کچھ اس طرح برتا گیا ہے کہ یہ خیال ہندوستانی قالب میں ڈھل کر رہ گئے ہیں۔ کمخواب کے پلّوؤں کے ڈیزائنوں میں کبھی مچھلیوں کی قطاریں بھی بنائی جاتی ہیں۔ کبھی مور اور راج ہنسوں کے جوڑے بنائے جاتے ہیں۔ ان کے سوا ادبی پرندوں کی شکلیں ان میں جگہ پاتی ہیں۔ اب کچھ دنوں سے اجنتا کی خوبصورت دیواری تصویروں کی گل کاری کی نقل بھی ان میں دکھائی دینے لگی ہے۔ ان کپڑوں پر یہ دلکش گل کاری اور بھی زیادہ دلفریب دکھائی دیتی ہے۔

ان صنعتوں کی زبوں حالی اور ہمارا فرض

انتہائی نفاست اور اعلیٰ درجے کی فن کاری کے ساتھ پارچہ بافی کی صنعت میں ہندوستانی صنّاع قدیم ترین زمانوں ہی سے ماہر چلے آئے ہیں۔ ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے دور دیسوں میں بڑی چاہت کے ساتھ خریدے جاتے تھے۔ لیکن صنعتی انقلاب آیا اور مشین کی پیدا کی ہوئی آسانیوں نے صنعتی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تو ہماری یہ گھریلو صنعت بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پچھلی صدی کی ابتدا میں جب یورپی ملکوں نے اپنے ملکوں کا مشینی مال ہندوستان میں پھیلانا شروع کیا تو ہندوستان کی اور بہت سی صنعتوں کی طرح ہندوستانی دستی پارچہ بافی کی صنعت پر بھی نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بازاروں میں جدھر جاؤ قیمتی سے قیمتی اور ہلکے سے ہلکے سبھی کپڑے مشین ہی کے بنے ہوئے ملنے لگے۔ ہمارے غریب باقندے مشین کے لائے ہوئے اس سیلاب کے سامنے کیا ٹھہر سکتے۔ ان کی حالت روز بروز زبوں سے زبوں تر ہوتی گئی اور تدریجاً ان صنعتوں کا انحطاط مکمل سے مکمل تر ہوتا گیا۔

پچھلے پچاس سال ہندوستانی دستی پارچہ بافی کی تاریخ میں بڑے صبر آزما دن تھے۔ سستے کپڑوں کی روز افزوں مانگ نے بیرونی ملکوں کے کپڑوں کے لئے یہاں بڑا اچھا مارکٹ فراہم کر دیا تھا۔ ان کپڑوں کے جاذب ڈیزائنوں نے ہندوستانی خریداروں میں بھڑکیلے کپڑے خریدنے کی بد مذاقی کا بیج بو دیا اور ہندوستانی صنّاعوں میں ہیپ، امریکہ اور جاپان کے جاذبانہ

اور بجلے کپڑوں کی تقالی کا شوق پیدا کیا۔ یہ سچ ہے کہ پچھلے چند سالوں میں ان گھریلو صنعتوں کو مستحکم کرنے کی کوششیں ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن اب بھی ہمارے عوام کی نظریں ان صنعتوں کی سدا بہار خوبیوں کی طرف سے بند ہی ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بیرونی ملکوں میں جب کبھی صنعتی نمائشوں کے ذریعے ان کپڑوں کو ان ملکوں کے عوام سے روشناس کرایا گیا۔ ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور ہندوستان سے کہیں زیادہ یہ کپڑے اب بیرونی ملکوں میں فروخت ہو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اب ہمارے فیشن اتنے بدل گئے ہیں اور ہمارے بازاروں میں سستے اور نمائشی کپڑوں کی وہ بہتات ہے اور ہمارے مذاق اس درجہ بگڑ گئے ہیں کہ ان خوبصورت اور دلکش کپڑوں کے لئے ہندوستان میں عام بازار حاصل کرنا مشکل ہی ہے۔ مشروع، ہمرو اور کمخواب کی صنعتیں ہمارا قومی ورثہ ہیں۔ یہ صنعتیں آج تک صرف اس لئے زندہ رہیں کہ ہمارے راجے مہاراجے اور امیر امراء ان کے بڑے قدردان اور سرپرست رہے۔ اب آزاد ہند میں راجے، مہاراجے اور امیر امراء نہ ہوں گے۔ اس عمومیت اور جمہوریت کے دور میں عوام ہی پر اپنی قومی روایتوں کو زندہ رکھنے کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اگر ہم ان نیم جاں صنعتوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا قومی فریضہ جان کر ان صنعتوں کی امداد پر کمربستہ ہونا پڑے گا۔ یہ صنعتیں سرمایہ مانگتی ہیں۔ انھیں نئے ڈیزائنوں کی ضرورت ہے اور ان کی نکاسی کے لئے ملکی اور بیرونی منڈیوں کی حاجت ہے ان صنعتوں کو ایسے لوگوں کی تنظیم اور ہدایت کی ضرورت ہے جو رنگوں اور شکلوں کا وجدانی ذوق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ غریب ہیں، مفلس ہیں۔ درماندہ ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے آباد اجداد سے اعلیٰ درجہ کی صنّاعی اور فنون لطیفہ کی نزاکتیں ورثے میں پائی ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو اب تک بے میل اور خالص رکھا۔ انھوں نے ان کپڑوں میں نمائشی بھڑک پیدا کر کے یا ان کے چھچھورے اور عامیانہ ڈیزائن بنا بنا کر بد مذاقی نہیں پھیلائی اور اس طرح عظیم الشان فن کی تذلیل اور توہین نہیں کی ہے۔

مصلح الدین احمد اسیر

لسان الحق شاہ تراب رح کاکوروی

لکھنؤ میں میر تقی و سودا گر ہائے آبدار بکھیر رہے تھے، دلی میں خواجہ میر درد نغمہ طراز تھے، میر حسن بھی لکھنؤ پہنچ چکے تھے، حضرت مرزا جان جاناں عالم حیات میں تشریف فرما تھے، مصحفی ابھی دلی ہی میں فرد کش تھے، اُردو شاعری لڑکپن سے نکل کر جوانی میں قدم ناز رکھ چکی تھی، بارھویں صدی پوری ہونے میں اُنیس سال کا قلیل عرصہ باقی تھا کہ اُردو کے مردم خیز قصبہ کاکوری میں حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ کے دولت خانے میں فرزند دلبند کی مبارک بادیاں دی جا رہی تھیں۔ کون جانتا تھا کہ یہ فرزندِ سعید کیا ہوگا مگر حقیقت میں نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا کہ یہ بیک وقت عالم، صوفی، فقیہہ، درویش، مؤرخ اور شاعر بے بدل اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں ہوگا اور اس کی خاکِ قدم زمانے کی آنکھوں میں توتیا بن کر رہے گی۔

تراب علی نام، تراب تخلص، بانیٔ تکیہ شریفہ کاکوری شاہ محمد کاظم قلندر کے صاحبزادہ، علوی نسب، مخدوم نظام الدین قاری عرف شاہ بھیکہ کاکوروی کی اولاد اور رعیان وہ شرفائے قصبہ میں سے تھے۔ شریعت، طریقت اور حقیقت کے جامع، علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ، "برکفے جام شریعت برکفے سندانِ عشق" کے مصداق، فقر و درویشی میں اسلاف کے قدم بہ قدم، شعر و سخن ادب و تاریخ و فقہ میں عالم و فاضل غرضکہ ایامِ طفولیت ہی سے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" اُن کے ناصیہ مبارک سے ہویدا تھے۔

مُلا قدرت اللہ بلگرامی، مولوی معین الدین بنگالی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا حمید الدین محدث کاکوروی سے سبق لئے، قاضی القضات نجم الدین علی خاں بہادر سے عروض اور مولوی فضل اللہ ساکن نیوتنی سے فقہ پڑھی والد ماجد نے صاحبزادے کا رجحان تقویٰ و پرہیزگاری کی جانب دیکھ کر تعلیم و تربیت کے لئے اپنے زیر سایہ رکھا، مسائل فقہ پر عبور ہو جانے کے بعد کتب تصوف پڑھائیں، بارہ سال کی عمر سے اذکار کی مشق کرائی، پندرہ سال کی عمر میں تلقین و ارشاد کے مراتب حاصل کر چکے تھے، دو سال کے بعد منظفر الدولہ بخشی الملک ابوالبرکات خاں کی نواسی دختر شیخ محمد عوض چکلہ دار سے عقد نکاح ہوا

شاعری جذبات نگاری یا واردات قلبی کو قلمبند کرنے کا نام ہے احساسات و ادراک کو موزوں پیرایہ میں پیش کرنے کی صلاحیت جو فطرتاً اپنے ساتھ لایا ہو وہی درحقیقت نغمہ بن کر دنیا پر چھا سکتا ہے۔ قال اگر حال کی تصویر پیش کر سکے تو دہی تیر سا دل میں پیوست ہو جاتا ہے اور سامع کامل لوٹ پوٹ ہو کر اس کی روح کو عالم بالا کی جانب صعود کرنے پر مائل کرتا ہے جس کو دوسرے الفاظ میں وجد و حال کہتے ہیں، حضرت کی شاعری اردو ہو کہ فارسی یا ہندی سرتاپا تاثیر و سوز میں ڈوبی ہوئی ہے، واردات قلبی کی گوناگوں موجیں اس میں اہریں مارتی ہیں احساسات و ادراکات اور جذبات نگاری کا مرقع ہے کیونکہ ایک عارف کا نفتعال ہے جو کلام موزوں کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا گیا ہے تشبیہات کی برجستگی، جذبات کی مصوری، معاملہ بندی کی لطافت، واقعہ نگاری کا کمال قابل صد ستائش ہے۔ زبان پرانی ہو چکی ہے۔ بعض محاورے اب متروک ہیں تاہم بیشتر حصۂ کلام اس قدر متاثر سے لبریز ہے کہ سننے والوں کے دل لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

آپ کا کلام اردو، فارسی، ہندی تینوں زبانوں میں ہے مگر زیادہ حصہ اُردو میں ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ نے کسی کو نہ اپنا کلام دکھایا اور نہ اصلاح لی اور عجیب تر یہ کہ ایک شعر بھی آپ نے تکیہ شریف پر بیٹھ کر کبھی نظم نہیں فرمایا۔ بلکہ قاعدہ یہ تھا کہ جب قصبے تشریف لے جاتے تو آنے جانے میں دو غزلیں کہہ لیا کرتے اور تکیہ شریف پہنچ کر اپنے مرید مخلص و حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر کے پوتے جناب مولوی عبدالاسد صاحب کو سنا دیا کرتے اور وہ فوراً لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ کہنا صحیح طور پر مشکل ہے کہ پہلا شعر آپ نے فارسی میں کہا یا اُردو میں، مادری زبان اُردو تھی اس لئے فطرتاً پہلا شعر اردو ہی میں موزوں ہوا ہوگا تاہم وہ زمانہ وہ تھا جبکہ شرفا اردو زبان میں خط و کتابت کو معیوب سمجھتے تھے اور

گفتگو بھی زیادہ تر فارسی میں کرتے تھے اس سلئے اس کا بھی امکان ہے کہ حضرت کی شاعری کا آغاز فارسی ہی سے ہوا ہو، اس خیال کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ آپ کا پہلا تخلص شہید تھا جو بعد کو تراب قرار پایا۔ اردو کی کسی غزل میں شہید کا نام نہیں مگر کلیاتِ فارسی میں اس کی شہادت موجود ہے۔

گذار کہ حبیبِ عالم آمد

ایں بیت کہ گفتۂ شہید است

فارسی شاعری پر اس وقت تبصرہ کرنا منظور نہیں۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مثنوی اصل المعارف کی زبان نہایت سلیس ہے اور مضامین دقیق کو عام فہم بنا کر پیش کیا ہے۔

نیست در زید و بکر جزئیکُ جُز   مختلف باشند گو اندر وجود
فرق در صورت ز زید ست و بکر   در حقیقت نیست فرقے معتبر
دیدہ خالد جملہ وہم و خیال   حضرتِ حق است ظاہر ذوالجلال

اس مسئلہ کو زبانِ شریعت میں یوں ادا فرمایا ہے۔

بحر در صورت ز موج خود جداست   در حقیقت لیک عینِ موجہاست
غیر محض ار موج را گوئی خطاست   عین صرف ار گوئی ایں ہم ناروا است
چونکہ با دریاست قائم موجہا   گر جدا از وے شود گردد فنا
ہم چنیں جملہ جہاں را با خدا   نسبتِ عینی و دوئی ہست اے گدا
پس لقا ہر غیری گو خلق را   در حقیقت ایں ہمہ عینِ خدا

حضرت کی اردو شاعری کی ابتدا ۱۲۱۱ھ سے پیشتر ہو چکی تھی۔ کلیات گلہائے رنگیں و بوقلمونیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری تین دوروں میں منقسم ہے۔ اول سے غلبۂ عشق مجاز کا پتہ چلتا ہے، دوسرے میں مجاز و حقیقت دونوں کی آمیزش معلوم ہوتی ہے اور تیسرا سراسر حقائق و معارف سے لبریز نظر آتا ہے۔ پہلا دور تیس سال رہا اور مثنوی "عاشق صنم" کا بیشتر حصہ اسی زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ مثنوی عاشق صنم پر قلم اٹھانے کے لئے ایک علیحدہ گنجائش نکالنے کی ضرورت ہے، اس لئے اس کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں اس وقت محض اردو شاعری پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

آپ کے دیوان اردو میں دیوان حافظ کی طرح فال بھی دیکھی جاتی ہے۔ کلیاتِ فارسی آپ کا سہ بارہ مطبع سرکاری رام پور میں طبع ہوا۔ اس میں علاوہ دیوان کے مثنوی اصل المعارف و ترجیع بند و مخمس کریا بھی شامل ہے۔ اور کلیاتِ اردو سات آٹھ مرتبہ مطبع نول کشور میں طبع ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کلیات مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں علاوہ دیوان کے مثنوی عاشق و صنم و شجرات منظوم اور ٹھمریاں بھی ہیں۔ محمد رضا صبر کاکوروی جو شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے، قطعۂ تاریخ میں لکھتے ہیں ؎

بشر کا قول نہیں یہ کلام قدسی ہے   کسی نے ایسے اثر کی زباں کہاں پائی

اور منشی مقصود احمد نطق نے جو خود ایک باکمال شاعر تھے اور اساتذۂ فن میں شمار کئے جاتے تھے، تحریر کیا ہے ؎

حق سے راز دنیا ذہے ان میں   صوفیوں میں عجب کتاب ہے یہ
گویا دیوان خواجہ حافظ کا   ریختہ میں رقم جواب ہے یہ

آپ کے کلام کے مطالعے سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ آپ کی غزلیں حافظ کی غزل کی طرح بہت ہی مرتب ہوتی تھیں۔ ایک غزل ایک ہی کیفیت کی حامل، ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے یعنی آپ کی غزل کا ہر ہر شعر موتی کی لڑی کی طرح پرویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح ہر ہر شعر جدا جدا کیفیات کا ترجمان نہیں ہے کہ وصل کا حال کہتے کہتے فراق کا رونا رونے لگیں۔ آپ نے اگر کبھی وصل کی کیفیت قلم بند فرمائی ہے تو غزل اسی کیفیت سے لبریز نظر آتی ہے، اور اگر کہیں فراق و ہجر کے جذبات پر قلم اٹھایا ہے تو غزل کا ہر ہر شعر فراق ہی کا قصہ بیان کر رہا ہے، اور در اصل جذبات نگاری اسی کا نام ہے بھی، کیونکہ ایک وقت میں ایک شاعر ایک ہی قسم کے جذبات کا علمبردار ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ہجر اور وصل دونوں متضاد کیفیتیں دل میں پائی جائیں، اور شاعر اس کی ترجمانی کر سکے۔

آپ کی شاعری اصلاحی، حقائق و معارف سے لبریز کیفیات دل کی علمبردار اور آپ کے مسلک کی آئینہ دار ہے۔ ذیل میں چند اردو اشعار پیشکش کئے جاتے ہیں ؎

عاشقی کارِ نامرادی ہے   عشق دکانِ نامرادی ہے
کون اس راہ میں قدم رکھے   یہ تو میدانِ نامرادی ہے

عشق و عاشقی کے متعلق صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ نامرادی کی دکان اور دکان ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس نامرادی کے میدان سے الگ ہی رہو۔

لیکن اگر قدم رکھ چکے ہو تو سب کچھ ہیچ کر اور تج کر نامرادی کے میدان میں آؤ، اور ہوا و ہوس کے دام سے رہائی حاصل کرو ۔

اس کی بے الفتی و استغنا ساز و سامانِ نامرادی ہے

اور اس نامرادی کے ساز و سامان کے حصول کے لئے اُس کی بے الفتی و استغنا سے استفادہ کرو، وہی تم کو اس نعمتِ گراں بہا سے مالا مال کر سکتی ہے ۔

اور سے حکم ہے کہ مانگ مراد ہم سے فرمانِ نامرادی ہے

یہاں تو یہ حال ہے کہ غیر جس نے کہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں چکھی ہے، اُس سے فرمائش کی جاتی ہے کہ مرادیں مانگو ہم پوری کریں گے، اور ہم جو اُن کی محبت میں سرتاپا آرزو و مراد بنے ہوئے ہیں ہمارے لئے یہی حکم ہے کہ تیرے لئے نامرادی ہی خوب ہے ۔

ہاتھ اُٹھائیں نہ کیوں دعا سے ہم وہ تو خواہانِ نامرادی ہے

اور جب وہی (معشوق) خود نامرادی پسند کرتا ہے تو ہم دعا مانگ کر کیا کریں، اب تو دعا سے دست کشی ہی اولیٰ ہے ۔

نامرادی کی بھی طلب نہ رہے یہی پایانِ نامرادی ہے

اور نامرادی کی انتہا کیا ہے؟ یہ نہیں کہ نامرادی کی تکلیف دل سے مٹ جائے بلکہ نامرادی کی انتہا در اصل یہ ہے کہ خود نامرادی کے حصول کی طلب بھی دل سے جاتی رہے ۔

اہلِ فقر و غنا ہیں جو اُن پر نت نئی شانِ نامرادی ہے

جو اپنے آپ کو مٹائے ہوئے ہیں، جو نامرادی کو بھی ٹھوکر مارے ہوئے ہیں انھیں کے پاس نامرادی نئے نئے لباس میں اور مختلف صورتوں میں متشکل ہو کر آن بان کے ساتھ آیا کرتی ہے اور وہ اُس سے لطف اندوز ہوتے ہیں ۔

ہے عجب ان دنوں ترابؔ کا حال دست و دامانِ نامرادی ہے

جیسے کہ ان دنوں ترابؔ کا حال ہے کہ اس کا اوڑھنا بچھونا نامرادی ہی نامرادی ہے ۔

نشاں اس کا کسی سے کیا بیاں ہو وہی پاوے نشاں جو بے نشاں ہو

کیا اچھی تعلیم ہے مطلب یہ ہے کہ اُس بے نشان کے حصول کے لئے خود ہی بے نام و نشان ہو جاؤ، جب جا کر کہیں اُس کا پتہ لگ سکے گا، ورنہ محال ہے

کہ اُس کا نشان حروف و صورت کی شکل میں پیش کیا جا سکے، اُس کی ترجمانی کے لئے لغات گونگے ہیں۔ وہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بیان میں نہیں آ سکتا ۔

منزّہ وہ تو ہے کون و مکاں سے مکاں اُس کا کہاں جو لا مکاں ہو

کیونکہ وہ مقامیت و مکانیت سے پاکیزہ تر ہے اور جب وہ لا مکاں ہی ٹھہرا تو اس کا مکاں کہاں پاؤ گے، لا مکاں کی سیر کرو اور اس کی یاد سے دم نقد خوش وقت و شاد کام ہو ۔

کوئی جا گہ نہیں ہے اس سے خالی زمیں ہو، عرش ہو، یا آسماں ہو
سوا اس کے نہیں کوئی جہاں میں تلاش اس کی کرو یا سو جہاں ہو

ڈھونڈھنے والے کے لئے کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں وہ موجود نہ ہو۔ زمین، عرش، آسمان، جہاں دیکھو وہی وہ ہے، شرق سے غرب تک، اور شمال سے جنوب تک سوا اس کے اور کون ہے۔ وہی تو موجوداتِ عالم کی رُوح ہے۔ اے دوستو! جہاں کہیں بھی تم ہو اُسی کی دُھن میں رہو، اُسی کی یاد و بود کرو، اُسی کی جستجو میں اپنی جانِ عزیز قربان کرو۔ اور کسی صورت سے اُس کا شہود حاصل کرو ۔

ٹھکانا اس کا میں کیوں کر بتاؤں خدا جانے وہ ہر جائی کہاں ہو

تم اگر مجھ سے اس کا کوئی خاص ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانا ہو تو بتایا جائے۔ ذرّہ ذرّہ میں وہی جاری و ساری ہے۔ عرش سے فرش تک اسی کی ضیا باریاں ہیں۔ ایسے ہرجائی کے متعلق کوئی مقام کیوں کر مختص کیا جا سکتا ہے ۔

ترابؔ اُستاد سے معلوم کر لو طریقِ معرفت گر قدرداں ہو

اے ترابؔ بہتر صورت یہ ہے، اگر تم واقعی اس کی معرفت، اس کی شناخت اس کی تلاش حاصل کرنے کے درپے ہو تو جان و مال کھپاؤ۔ اور اپنے شیخ اپنے رہبر اپنے ہادی اپنے پیر و مرشد کی امداد و فیضان سے اُس کو ڈھونڈھ نکالو کہ یہی سب سے سیدھا راستہ ہے، بغیر اس کے کوئی چارہ نہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں حکمت کی دو قسمیں ہیں نظری و عملی۔ نظری سے تو صرف حکمت کے حقائق پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے متعلق معلومات ذہن نشین ہوتے ہیں، اب اگر کوئی شخص اس سے زیادہ کے حصول کا متمنی ہے تو وہ عملاً اس کی آزمائش کرتا ہے۔ اُس میں درک آتا ہے، اس کا تجربہ کرتا ہے، اور تجربہ کے بعد نتیجہ اخذ کرتا ہے، اور وہی انسان قابلِ تعریف

بھی سمجھا جاتا ہے جو خود عملی ہو اور اس ترکیب کے ساتھ ارباب حکمت کو پیش کرے اگر وہ چاہیں تو اس پر عمل پیرا ہوں اور نتیجہ برآمد کرکے ترقی کو ڑی نکال لائیں ۔

حضرت لسان الحق کی شاعری محض زبانی جمع وخرچ نہیں ہے بلکہ نظری کے ساتھ ساتھ عملی ہے ۔ تلاشِ حق کے رموز و نکات بیان فرماتے ہیں ساتھ ہی ساتھ اس کا سیدھا راستہ اور اُس راستے پر چلنے اور حصول مقصد کا عملی راز بھی سمجھا دیتے ہیں اور شاعری کا یہی مقصد بھی ہے کہ وہ جس قوم کی زبان میں ہے اُس قوم کی اصلاح کرے ۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری قوم اس درجہ گم کردہ راہ ہے کہ اس کو اپنا مقصدِ حیات ہی یاد نہیں رہا و تر حصولِ مقصد تو درکنار ۔ اُس کے لئے صرف یہی ایک شعر شمع راہ ہے ؎

تراب استاد سے معلوم کر لو طریقِ معرفت گر قدرداں ہو

مگر رونا تو اس کا ہے کہ کوئی قدرداں ہی نہیں ہے ۔

اس وقت میں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے وہ بہت بسیط ہے ۔ اور اس سے زیادہ وسعت کا طلب گار ، اس لئے میں اب حضرت لسان الحق کی چند غزلوں کو ہدیہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اُن کی شرح خود ناظرین کی سمجھ ، عقل اور ادراک پر چھوڑتا ہوں ؎

پہلا دَور

یہاں تک بڑھی ناتوانی ہماری کہ دوبھر ہوئی زندگانی ہماری
لگا وار اس پر کہا اُس صنم سے رہے گی صدا یہ نشانی ہماری
جئے اب تلک ہم جدائی میں اُس کی اجل دیکھنا سخت جانی ہماری
تراب اس کا احوال کس سے کہوں میں ہوئی عاشقی اک کہانی ہماری

عزیزو ناحق اس کی دوستی کی مجھ پہ تہمت ہے ! نہ صحبت ہے نہ ملت ہی فقط صاحب سلامت ہے
نہ پوچھو اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں دل ربائی کی حیا ہے ناز ہے غمزہ ہے عشوہ ہے نزاکت ہے
اگر اس وقت یاں آجائے تو پوچھو دیدنی تماشا ہو لبِ دریا ہے گل ہے جام مُل ہے بزم عشرت ہے
یہ کیا عاشق شیدا کہ حال عشق کا ہی کیا قلق ہے درد ہے غم ہے فضیحت ہے ملامت ہے
تراب اک بار کیا صو بار پوچھے کوئی کہ اتنا تجھے صنم سے مجھکو اُلفت ہے تعلق ہے محبت ہے

جس کی تصویر دل میں چھائی ہے ہم سے آنکھ اُس نے کیوں چرائی ہے
ہجر میں کیجئے کہاں تک صبر نہیں اب طاقت جدائی ہے
کون خوبوں سے آشنا ہوئے کچھ نہیں اُن کی آشنائی ہے
پہلے ہے لطف دیدار آخرکار ستم و جور و بے وفائی ہے
مجھ کو دیوانہ کرکے کہتا ہے تو نے یہ شکل کیا بنائی ہے
لے گیا دل تراب کا وہ شوخ شاہ کاظم تری دہائی ہے

اُس دن سے پھر کبھی نہ ہماری پلک لگی آنکھوں میں جب سے یار کی پیاری جھلک لگی
یا رب وہ کیا بشر تھا کہ جس کی مثال میں شکل پری نہ صورتِ حور و ملک لگی
زنار باندھ لے ابھی تسبیح ڈالے توڑ زاہد اگر تو دیکھے وہ صورت تلک لگی
پھرتا ہے گرد اس کے میری طرح رات دن تیری بھی آنکھ یار سے کیا اے فلک لگی
جب جانئے تراب تو یکتا ہے عشق میں اُس بت سے لو رہے دم آخر تلک لگی

شاعری کا دوسرا دور

جب مسندِ تلقین و ارشاد پر متمکن ہوئے تو حضرت کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا ، اب تصوف کی چاشنی تیز ہوئی اور کلام میں جوش وخروش پیدا ہوا ؎

مری عاشقی کا مچا ہے شور کوئی دیکھیے میرے جنوں کا زور
جو اُجاڑ کھنڈ تھا قیس کا اُسے جا کے میں نے بسا دیا

حق تعالیٰ عشق اپنا دے تو بہتر ہے تراب حُسن صوری کچھ نہیں اُس سے تو جی بالکل اُٹھا

مصحفی ہنوز زندہ تھے ، آتش کی شہرت کا آغاز تھا ؎

آتش کی غزل دیکھی سُنا سوز کا واسوخت تجھ سا میں تراب ایک نہ دیکھا نہ سنا گرم

جوش وخروش میں سودا ضرب المثل تھے ، اور میر درد صوفیانہ شاعری کے پیغمبر خیال کئے جاتے تھے ؎

ہمدم تراب کا ہے الفت میں درد و بیدل ہجران میں سوز و حسرت وحشت میں یار سودا

حضرت کی زبان اب بھی ابتدائی دور کی سی تھی ، بندش نسبتاً صاف ہے ، عشق مجاز ہے اور حقیقت بھی فلسفہ اخلاق ہے اور داستان محبت بھی ۔ دیوان کا بیشتر حصہ اسی دور میں مرتب ہوا ۔ بہت سی ٹھمریاں بھی اسی دور کی یادگار ہیں ۔ کلام میں اس قدر شیرینی پیدا ہو گئی تھی کہ استاد الاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرہ ' ریاض الفصحا ' میں جس کا سالِ اختتام

...ہ ہے حضرت کا فصحا میں شمار کیا اور آپ کی ذہانت اور طبع رسا کی داد دی۔

"شاہ تراب علی تراب تخلص پسر شاہ محمد کاظم قلندر سکنہ کاکوری طبع رسا و ذہن ذکا دارد، از انتخاب اشعار او ست۔"

صورت میں حقیقت جسے مشہود ہے یارو — اپنا تو وہی ہادی و معبود ہے یارو
رہتا ہے تراب اس کے ہی کوچے میں ہمیشہ — اس کی تو وہی منزل مقصود ہے یارو
رسیلی آنکھ تیری گرچہ قتل عام کرتی ہے — مگر یہ شوخ چتون اور ہی کچھ کام کرتی ہے
محبت سے میں ہوں ناچار گو اس نے کہا سو کہا — تراب الفت تری مجھ کو بہت بدنام کرتی ہے
شوخی و رندی تری یہ کب تلک لیکن تراب — اب تو دن پیری کے آئے نوجوانی ہو چکی
پھر انا الحق ہی نکلتا ہے مرے منہ سے تراب — جس گھڑی اپنی خودی میں گزر جاتا ہوں

اس غزل میں اپنی گزری ہوئی کہانی ہے اور اس کا انجام

دل کو میرے عشق کی جس دن سے بیماری ہوئی — ایک پل جی کو نہیں کل زندگی بھاری ہوئی
پھنس گیا زلفوں میں ایسا چھوٹنا مشکل پڑا — ہائے اس جنجال میں بیٹھے بٹھائے گرفتاری ہوئی
دین و ایمان عقل و عرفان عشق میں سب کام ہوا — زہد و تقویٰ کب کا ہاتھ سے جب یاری ہوئی
فی الحقیقت کچھ نہیں یارو کسی کا اختیار — بندۂ مجبور کو کہنے کو مختاری ہوئی
یارو تم کیا کہتے ہو ہم کو نہیں معلوم کیا — عاشقی میں جو ہماری وقت خواری ہوئی
کیا نکل سکتا تراب اس تو جو الجھے دام سے — لی خبر پیروں نے مرشد کی مددگاری ہوئی
میں حقیقت میں نہیں صورت پرست — دیکھتا ہوں سب کہیں حق کا جمال
اس بت کی محبت کا اگر بھید کہوں میں — سکتے میں مسلمان ہو حیران ہو کافر

اس وقت لکھنؤ میں ضلع جگت کا بازار گرم تھا۔ حضرت نے بھی اسی رنگ میں جوش طبعی کے جوہر دکھائے ہیں۔

اس نے دل کو مرے پتنگ کیا — عشق بازی میں خوب چنگ کیا
خط کو میرے بنا کے کاغذ باد — پیٹیا پھاڑا نہ کچھ درنگ کیا
کس کے بل سے وہ ہو گیا چنچل — کس نے شہ دیکے گولہ ڈھنگ کیا
ڈور اس کی لگی ہے اور کہیں! — ناحق الجھا کے ہم کو تنگ کیا
ابھی اک ڈھیل دوں تو کٹ جائے — مجھ سے کیا پیچ کے ساز جنگ کیا
اس سے کھیلے جبث اڑن گھائی — عاشقی نے جب یہ اکنگ کیا!
وہ تو سادہ دکھا دھاگا تھا — ہم نے مانجھے سے اس پہ رنگ کیا
چاند تارا بنا دیا جس کو — اس نے پھر ہم سے یہ ترنگ کیا
وہ ہوا خواہ ہے تراب اپنا — بڑھتی ہو اس کی جس کے سنگ کیا

عارف اس کو کہئے جو اپنے تئیں پہچان لے
ہر جگہ اپنی حقیقت کا تماشائی رہے

دلا سراپا سرمہ ہو جا مثل کے ظلمت سے نور ہو جا!
خدا کے نشہ میں چور ہو جا رہے گا مست شراب کب تک
مجھے تو آتی ہے اس پہ رقت کہ عشقبازی ہے اس کی خلقت
وہ دام صورت میں فی الحقیقت پھنسا رہے گا تراب کب تک

ہشیار میکدے میں نہ پایا کسی کو آہ — بیخود کوئی نظر نہ پڑا خانقاہ میں
مئے وحدت سے کوئی اک لبالب مجھ کو ساقی دے — میں صدقے اس کے ہو جاؤں جو متوالا مجھے کر دے
پلا ساقی مجھے وہ مے جو ذوق بیخودی بخشے — رگ و ریشہ میں میرے کیفیت منصور کی بھر دے
تو شیخ جام کر مجھ کو قسم ہے پیر مغ تجھ کو — سقاھم ربھم پڑھ کے شراب انگور سے بھر دے
ملامت عشقبازی کی اٹھائے کون شیخی میں — تراب اس کام کا تو ہے کہ پھر کالے وہ سر دے

تیسرا دور

مسئلہ وحدت الوجود حضرت کا حال تھا۔ آخری دور کی غزلیں سراپا حقائق و معارف کی تعلیم ہیں۔ توحید کی تلقین ہے یا فلسفہ اخلاق، بے ثباتی روزگار کا اظہار ہے یا انقلاب عالم کی روداد، تجلیات کی بوقلمونی کا انکشاف ہے یا تصفیۂ قلب و ترک تعلقات کا ارشاد۔

شاہ نیاز احمد بریلوی ان کے ہم مشرب تھے۔ مگر ان کے کلام میں عشق مجاز کمیاب ہے۔ خواجہ میر درد کے دیوان میں مجاز کا اس قدر غلبہ ہے کہ حقائق و معارف کے موتی تلاش کرنے سے دستیاب ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور صفائی بندش کے اعتبار سے بیشک میر درد کا مرتبہ اردو کے صوفیانہ شاعروں میں اعلیٰ ہے لیکن حقائق تصوف کے بیان اور آمیزش مجاز کے لحاظ سے شاہ تراب کا دیوان "جس کا اول نہیں وہ ثانی ہے"

اس دور کی چند غزلیں اور اشعار پیش ہیں۔

وحدت الوجود

مجھے یار سے اب یہی گفتگو ہے — جو تو ہے سو میں ہوں جو میں ہوں سو تو ہے
مجھ سے سب مانگتے ہیں اپنی مراد — سب کا مقصود و مدعا ہوں میں
ہوں بری وہم و فہم سے تیری — کیا بتاؤں تراب کیا ہوں میں
مراد از الخلاف آسمان کبریائی ہے — جہاں کا میں جہانباں ہوں جہاں کبریائی ہے
زمیں سے تا بہ فلک بلکہ اور عرش تلک — جو دیکھتا ہوں تو سارا وجود ہے اپنا!

تصفیۂ قلب

دِل کو خراب آرزو نے نفس نے کیا! — دل صاف وہ ہے جس میں کوئی آرزو نہ ہو

نفس کی اصلاح کر پہلے ریاضت سے تراب — بے شکستِ نفس امّارہ ظفر ملتی نہیں

بے ثباتیٔ روزگار

کچھ نہیں اعتبار دنیا کا — ہیچ ہے کاروبار دنیا کا

چاہیئے سب کو آخرت کا غم — غم نہ ہو زینہار دنیا کا

چشمِ عبرت سے ہم نے دیکھا خوب — اس جہاں کا عجیب عالم ہے

پھول ہنستا ہے اور کلی ہے چپ — منہ پہ دونوں کے رونق شبنم ہے

کس سے کہیئے تراب اس کا بھید — اس حقیقت سے کون محرم ہے

تسلیم و رضا

تراب اپنی تدبیر سے باز آ — برائے خدا تن بہ تقدیر ہو

کوہ ٹل جائے بزرگوں کے تصرف سے تراب — گر وہ بے حکم خدا چاہے تو پتہ نہ ہلے

فلسفۂ اخلاق

جو یہاں بوئے گا تخم اس کا وہاں پائے گا پھل — وہ جہاں دار الجزا ہے یہ جہاں دار العمل

نشست و شو ظاہر کی اسے زاہد بہت کرتا ہے کیوں

جامۂ دل کو بد اخلاقی سے دھونا چاہیئے

آدمیت جس میں ہو کہتے ہیں اس کو آدمی — اس کو حیواں کہئے جو اخلاقِ انسانی چھوڑ دے

طینتِ انساں کی خاکساری ہے — جو تکبر کرے وہ ناری ہے

تجلیات

موسیٰ نے جسے جلوہ نما طور سے دیکھا — کا برق اُسے میں نے بھی کل دور سے دیکھا

بے خطر ہو کے دیکھ تماشائے دل تراب — کیا کیفیت ہے کیا یہ تجلی نور ہے

بجلی چمکے تو ابھی آنکھ جھپک جاتی ہے — بھر نظر کس نے بھلا صورت جاناں دیکھی

واقعات

۱۲۵۳ھ میں شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کا انتقال ہوا، فرانس کی لیڈیاں مصاحبت میں رہتی تھیں اور یورپ کے خط تراش رفیق تھے۔ پیرس کا فیشن پسندِ خاطر تھا ؎

جس شاہ کے نوکر تھے بہت گورے فرنگی — وہ گور میں تنہا ہے نہ کوئی ساتھی نہ سنگی

دن میں جو بدلتا تھا گرگٹ کی طرح کی پوشاک — افسوس ہے لاش اس کی پڑی خاک میں ننگی

جو ڈھونڈھتے تھا خیمہ کے لئے وسعت میداں

کیا سخت عذاب اُس پہ ہوئی گور کی تنگی!

خاک میں گل گئے آتی ہے کفن سے بدبو — سیج پر پھولوں کی سوتے تھے جو تن عطر ملے

کیا ہی آغوشِ لحد میں ہیں بُری حالت سے — جو بہت ناز سے تھے گود میں دائی کی پلے

آمد و رفت سے ارواح کے کیا کہیئے تراب

کس طرح آئے کہاں جاتے ہیں کیا کر کے چلے

۱۲۵۶ھ میں امیر دوست محمد خاں والیٔ کابل پر انگریزوں نے چڑھائی کی۔

جس کا اقبال ہو تنزل پر — وہ چڑھے لے کے فوج کابل پر

غزلیات

آدم کو ملک کہتے تھے کیا خاک بنے گا — سمجھے نہ کہ سرتا قدم ادراک بنے گا

مٹی خاک سمجھ اُن کی کسی نے نہ یہ سمجھا — آدم دمِ حق سے نفسِ پاک بنے گا

ہوئے گا کوئی دم میں یہ مسجودِ ملائک — یہ خاک نشیں حاکمِ افلاک بنے گا

اولاد سے ہوگا اُسی کے وہ پیمبر — جو صلِ علیٰ صاحبِ لولاک بنے گا

رہ شاد تراب اپنی حقیقت کو سمجھ کر — صورت کے لئے کاہے کو غمناک بنے گا

خدا نے جن کو خوبی دی وہ برقع منہ پہ ڈالے ہیں

کمال اپنا چھپائیں کیوں نہ جو اللہ والے ہیں

تو اربابِ ملامت کی صلاحیت سے کیا واقف

بغل میں جن کی شیشے اور ہاتھوں میں پیالے ہیں

تو کیا جانے کسے مجذوب کہتے ہیں کسے مجنوں

کہاں اندھے کو سوجھے ہے یہ گورے ہیں یہ کالے ہیں

ولی کو جز ولی ہرگز نہیں پہچانتا کوئی

جو بندے خاص ہیں حق کے وہ دنیا سے نرالے ہیں

ہزاروں اولیا مکتوم و صدہا اہلِ خدمت ہیں

اُنھیں سے خیر و برکت ہے وہی دنیا سنبھالے ہیں

تراب ان سے کہاں اظہار ہو کشف و کرامت کا

ہمیشہ جن کو حق سے اپنی گم نامی کے لالے ہیں

مجھے یار سے اب یہی گفتگو ہے — جو تو ہے سو میں ہوں جو میں ہوں سو تو ہے

مئے عشق میں کیا مزا ہے نہ پوچھو — عجب بیخودی ہے عجب ہائے و ہُو ہے

جہاں تک نظر جائے دیکھو اسی کو — جہاں میں وہی جلوہ گر چار سُو ہے

نہ سمجھے کوئی یار سے غیر مجھ کو — کہ صورت میں میری وہی ہو بہو ہے

تراب اُس نے دل میں ترے گھر بنایا — تو کس کے لئے در بدر کو بکو ہے

خدا کی شکل پر آدم بنا ہے — یہ آدم کیا عجب عالم بنا ہے

دل اس کا ہے مثالِ لوحِ محفوظ — اسی کی نقل جامِ جم بنا ہے

کہیں موسیٰ کہیں فرعون و ہاماں — کہیں عیسیٰ کہیں مریم بنا ہے

کہیں زاہد کہیں عابد کہیں رند — کہیں شبلی کہیں ادہم بنا ہے

کہیں ہنستا کہیں روتا کہیں چپ — کہیں شادی کہیں ماتم بنا ہے

کہیں حکمت کہیں دارو کہیں رد — کہیں زخمی کہیں مرہم بنا ہے

کہیں ذرہ کہیں خورشید غرہ — کہیں قطرہ کہیں قلزم[1] بنا ہے

تراب اس کو کسی دم بھولے مت — کہ وہ ہر دم ترا ہمدم بنا ہے

جو بندۂ سیم و زر کا ہو امیروں کے قدم پکڑے

جسے شاہوں سے ملنا ہو وزیروں کے قدم پکڑے

جو شاہد بازی و صورت پرستی کا رکھے مشرب

بتانِ سادہ رو و دلپذیروں کے قدم پکڑے

جو کوئی چاہے صحبت میں کسی کی اُن کی صیقل ہو

تو اہلِ باطن و روشن ضمیروں کے قدم پکڑے

جسے توحید فقر و نیستی کا ہو مزہ چکھنا!

تراب ایسے مجا شاہی فقیروں کے قدم پکڑے

کوئی ایسی ذات کو کیا کہے جو نہ فرد ہے نہ وحید ہے!

صفت اُس کی ہووے کسی سے کیا جو نہ دید ہے نہ شنید ہے

اُسے محض مطلق مت کہو کہ مقید آپ ہوا ہے وہ!

وہی ایک ہے کہ بنا ہے دو نہ وہ مخفی ہے نہ پدید ہے

وہی کعبہ ہے وہی دیر ہے، وہی قند شیرہ ہی خیر ہے

نہ وہ عین ہے نہ وہ غیر ہے نہ مراد ہے نہ مرید ہے

کرے کون میرے کلام پہ صاد مجھے کون دے یہ سخن کی داد

نہ تو شبلیؒ ہے نہ جنیدؒ ہے نہ نظامؒ ہے نہ فریدؒ ہے

بہ نگاہِ کاظمؒ رہنما، بطفیل باسطؒ مقتدا

ہے وہی شہود تراب کا کہ قلندروں کی جو دید ہے

---

[1] قلزم بقیہ ثالث ہے نہ کہ بفتح

سایۂ درگاہ کاظمؒ ہم کو کیا کم ہے تراب — در بدر ہم کیوں پھریں ظلِّ ہما کے واسطے

فارسی

نہ باشد از تو خالی ہیچ بزم و منزل و خانہ — ز تست آبادیٔ عالم جہاں از تست ویرانہ

توئی ساقی توئی شراب توئی بادہ و پیمانہ — توئی رندِ خرابِ باقی توئی مخمورِ میخانہ

مسلماں بندۂ رویت برہمن بستۂ مویت — توئی در کعبہ و مسجد توئی در دیر و بتخانہ

تراب از راہِ معنی گر بہ بینی جملہ عالم را — ہمہ با ہم یگانہ رند یک کس نیست بیگانہ

سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا حال ہے۔ کیوں نہ ہو، پھر آخر ایک قلندر کا کا حال ہے، کیا اچھا درس ہے، کیا عمدہ حکمت ہے۔ خدا آپ کے طفیل سے ہم کو آپ کو، سب کو اس راستہ پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے، کہ بے توفیقِ ایزدی ایک قدم اُٹھانا بھی محال ہے۔

حق یہ ہے کہ کہاں آپ کی شاعری اور کہاں یہ خاک نشین۔ آپ کی شاعری کی تعریف و توصیف میری زبان سے بالکل ویسی ہے جیسا کہ آفتاب کو چراغ دکھانا، یا چھوٹا منہ بڑی بات۔ مگر تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس دونوں ستم ہیں جہاں سخن شناس مہر بر لب ہوں تو ایک ناشناس ہی کو قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ خدا میری اس جرأتِ رندانہ کو معاف فرمائے۔ ورنہ دراصل بقول خود حضرت لسان الحقؒ

کرے کون میری کلام پہ صاد مجھے کون دے یہ سخن کی داد

نہ تو شبلیؒ ہے نہ جنیدؒ ہے نہ نظامؒ ہے نہ فریدؒ ہے

دراصل ایسی ہی بزرگ ہستیاں آپ کی شاعری پر داد دینے کی مستحق تھیں۔

آخر زمانۂ حیات میں غلبۂ روحانیت نے جسمِ اطہر کو نحیف و زار کر دیا تھا، بلا اعانت کروٹ لینا دشوار تھا۔ دو سو رکعتیں نفل کی روزانہ پڑھنا اس ضعیفی میں بھی معمول تھا، اور تہجد سے اشراق، مغرب سے عشاء تک یہ جلسۂ واحد ذکر و فکر کی مشغولی قضا نہ ہوتی تھی۔

ربیع الثانی ۱۲۷۵ھ میں جب کہ سن شریف ۹۰ سال کا تھا حسبِ دستور اپنے والد ماجد کے عرس میں صدارت کے فرائض ادا کئے۔ مگر اس کے بعد سے "من خرائطم تا نہایات الوصال" کے اشارے ہونے لگے۔ ۲، جمادی الاولیٰ کو فالج نے حملہ کیا اور ۴۔ جمادی الاولیٰ کو شب کے وقت قیدِ تعلق ہستی سے آزاد ہو گئے۔

پیش ازیں آشوب و خونریزی مجہ — پیش ازیں از قسمِ تبریز ہا مگو

شعر و سخن

غزل
شفیق جون پوری

غمِ محبوب ہاں کونین کی وسعت کا حامل دے — جو ساری عمر تڑپائے وہی بیتابئ دل دے
الٰہی کچھ نہ دے تو بس یہ سودینے کا دینا — کہ ہر انسان کے پہلو میں تو انسان کا دل دے
تری بخشش ہوئی دشواریوں پہ ناز کرتا ہوں — سوا تیرے کسی سے بھی نہ حل ہو ایسی مشکل دے
بگولے بھی ہوں بادِ تند بھی خارِ مغیلاں بھی — جو ویرانہ ہی دینا ہو تو دیوانوں کے قابل دے
یہ کہہ کر شمع ساری رات تنہائی پہ روئی ہو — کہ یا رب دشمنی دی ہو تو پروانوں کی محفل دے
وہ ہمت دے کہ ٹکراؤں ہر اک گردابِ طوفاں سے — جب الجھانا ہے موجوں میں تو کشتی دے نہ ساحل دے
صبا کیا پائے گی تو اور اس کو منتشر کر کے — جو دودِ شمعِ محفل خود پیامِ مرگِ محفل دے
بچھڑنا قافلے سے اور شمعِ راہ کا بجھنا — خدا دشمن کو بھی یہ غم نہ اے یارانِ منزل دے
زمانے سے اٹھی جاتی ہے اب رسمِ وفاداری — ہماری سرفروشی کو دعا بازوئے قاتل دے
تجھے آئینہ گر آئینہ خانہ بخش دے سارا — مگر اللہ صورت بھی تو آئینے کے قابل دے

شفیق اکثر یہ کہتا ہے دعائے صبح گاہی میں
مجھے روتی ہوئی آنکھیں مجھے ٹوٹا ہوا دل دے

غزل
قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی

پہنچے ہیں نہ پہنچیں گے وہ منزلِ جاناں تک — پروازِ نظر جن کی ہے مشکل و آساں تک
سرمایۂ غم تیرا محفوظ رہا پھر بھی — یوں تو غمِ دنیا نے لوٹا حدِ امکاں تک
ہر پھول کی خوشبو کو احساس نے لوٹا ہو — دل کاش پہنچ سکتا اسرارِ بہاراں تک
ہر طرح کا غم یوں تو دنیا میں میسر ہے — آخر کبھی پہنچے گا! انساں، غمِ انساں تک
ساحل پہ نہ بیٹھیں گے مایوسِ عمل ہو کر — ہم اپنے سفینے کو لے جائیں گے طوفاں تک

کیا ہوش پرستوں کی محفل میں رکیں قاسم
ہم، رازِ حقیقت تک۔ وہ خوابِ پریشاں تک

غزل
شفا گوالیاری

اس انقلابِ نظارہ کا بھی جواب نہیں — کہ اُن کے جلووں کو میری نظر کی تاب نہیں
ہے آئینہ بھی حسیں، عکسِ آئینہ بھی حسیں — مری نگاہ، ترے حسن کا جواب نہیں
دوانہ چونک اٹھا ہے غمِ زمانہ سے — مرے خیال سے اب کوئی محوِ خواب نہیں
غمِ حیات نے راہِ حیات چمکا دی — ہمارے کون سے آنسو میں آفتاب نہیں
ذرا سمجھ کے انہیں دیکھ دیکھنے والے — حجاب جس کو سمجھتا ہے تو حجاب نہیں
حجابِ حسن کی نیرنگیاں کوئی دیکھے — کہ دھوپ پھیل رہی ہے اور آفتاب نہیں

غمِ جہاں سے شفا لاکھ ربط ہے لیکن
غمِ حبیب سے بھی دل کو اجتناب نہیں

غزل
امر چند قیس

زبان دل کی نہ دل ہی زبان کا ہے رفیق — کہاں سے سیکھ لیا آپ نے ریا کا طریق؟
جنوں پہ کھل گئے ہستی کے عقدہ ہائے دقیق — خرد کو خواب میں بھی ہو سکی نہ یہ توفیق
زبانِ زہد ابھی تک ہے نابلد جن سے — ٹپکتے ہیں لبِ ساغر سے وہ رموزِ عمیق
اگرچہ وعظ کے دریا بہا دیئے اس نے — مگر نہ کی مرے ساقی نے شیخ کی تصدیق
کھلے بھی رازِ حقیقت تو کیا کھلے ہم پر — مذاقِ شستہ میسر نہ دیدۂ تحقیق
ہمیں ہیں وہ جو ہے بے نیازِ دیر و حرم — نہ برہمن میں ہی دم خم نہ شیخ کو توفیق

نگاہِ پیرِ خرابات ہے کلید اس کی
طلسم بندیِ بیم و رجا ہے قیس! دقیق

غزل
متین نیازی

وہ لمحہ جو اسیرِ غم نہیں ہے — رموزِ عشق کا محرم نہیں ہے
تبسم کر رہا ہے ترجمانی — کلی پروردۂ شبنم نہیں ہے
مآلِ خندۂ گل ہے نظر میں — بہارِ بے خزاں کا غم نہیں ہے
غمِ انساں کو سینے سے لگا لو — یہ خدمت بندگی سے کم نہیں ہے
شکستِ غنچۂ تازہ ہے شاہد — نشاطِ غم، خوشی سے کم نہیں ہے
زمیں کی وسعتیں ہیں ایک دم سے — عبث یہ گردشِ پیہم نہیں ہے
خلش ہر غم کی ہے عمرِ رواں تک — مسرت کوئی مستحکم نہیں ہے

متین انجامِ الفت دیکھئے گا!
ابھی چشمِ کرم برہم نہیں ہے

پرکاش پنڈت

ایک ایکٹ
ایک منظر

نہلے پر دہلا

کردار

۱- جیوتشی ۲- جیوتشی کا چیلا
۳- ایک عورت ۴- ایک مرد

[پردہ اُٹھنے پر۔ توندیلے جیوتشی صاحب چوکی پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ سر گھٹا ہوا ہے اور گلے میں جنیؤ ہے۔ ان کے سامنے فرش پر اُن کا چیلا بیٹھا کٹوری ہاتھ میں لئے اُن کے ماتھے پر چندن کا تلک لگا رہا ہے۔

جیوتشی:- لمبا — ذرا اور لمبا تلک لگاؤ رامانند — ہوں، لگا دیا!

چیلا:- جی گورو جی۔

(کٹوری زمین پر رکھ دیتا ہے)

جیوتشی: گورو جی کی ایسی تیسی۔ صبح سے چھ بار تلک لگوا چکا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سوج گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی بوں گئی اور سالا ایک گاہک نہیں آیا رامانند!

چیلا:- جی گورو جی!

جیوتشی:- پھر وہی۔ سچ سچ بتاؤ تم مجھے گورو جی کہتے ہو یا گالی دیتے ہو؟ پچاس بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ گورو جی مجھے صرف گاہک کے سامنے کہا کرو۔

چیلا- جی گورو جی!

جیوتشی- پھر وہی گورو جی! تمہاری کھوپڑی میں کوئی بات بیٹھتی کیوں نہیں رامانند! یہاں بیٹھے گورو جی گورو جی رٹ رہے ہو۔ اتنا تم سے نہیں ہوتا کہ گھیر گھار کے کوئی گاہک پکڑ لاؤ۔ کاروبار کی اگر یہی حالت رہی تو میں تو مروں گا ہی میرے ساتھ تمہارا سارا گورو جی بھی نکل جائے گا۔

چیلا- میں کہاں سے پکڑ لاؤں گاہک کو؟

جیوتشی- جہنم سے۔

چیلا- گاہک لانا میرا کام نہیں۔

جیوتشی- اور کیا تمہارا کام صرف میرے ماتھے پہ تلک لگانا ہے اور اسی کام کے لئے میں تمہیں پورے کاروبار پہ پچیس فی صدی کمیشن دیتا ہوں؟

چیلا- میں اور بھی پچاس کام کرتا ہوں۔

جیوتشی- اور کام؟ تلک لگانے اور گورو جی گورو جی رٹنے کے علاوہ حضور اور کون سا گُل کھلاتے ہیں؟

چیلا- بیٹھک میں جھاڑو دیتا ہوں۔ دن میں دس بار آپ کے نام کا بورڈ صاف کرتا ہوں۔ گاہکوں کے سامنے آپ کے پاؤں دباتا ہوں....

جیوتشی- ان کے علاوہ — میرا مطلب ہے ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے علاوہ حضور کون سا تیر مارتے ہیں؟

چیلا- آپ کے گھر کا سودا لاتا ہوں، آپ کے پوتن درجن بچے کھلاتا ہوں۔ آپ کے کپڑے....

جیوتشی- اچھا، اب تم گستاخی بھی کرنے لگے۔ میرے سامنے لڑتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟

چیلا- آپ نے ہی کہا تھا۔

جیوتشی- میں نے! یہ میں نے تم سے کہا تھا کہ یوں میری گردن میں ہاتھ دو۔ میرے منہ آؤ، میری بے عزتی کرو — رامانند!

چیلا- جی گورو جی۔

جیوتشی- گورو جی گئے بھاڑ میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ یوں کب تک کام چلے گا؟

چیلا- میں کیا بتاؤں؟

جیوتشی- پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔ لوگوں کا جیوتش پر سے ایمان اُٹھ گیا ہے یا کلجگ آ گیا ہے کہ سب کے پالے سیدھے پڑ رہے ہیں۔

چیلا۔ لوگ عقل مند ہوگئے ہیں شاید۔

جیوتشی۔ (جھڑک کر) ناممکن! لوگ عقل مند ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم لوگوں کی موجودگی میں چوہے عقل مند ہو سکتے ہیں، چھپکلیاں عقل مند ہو سکتی ہیں لیکن لوگ وہی گدھے کے گدھے رہیں گے۔ تم نے ٹیکٹو والی یا مسٹ کانفرنس کی رپورٹ نہیں پڑھی؟

چیلا۔ آپ نے سنائی تھی۔

جیوتشی۔ تو پھر کیسے کہہ سکتے ہو کہ لوگ عقل مند ہوگئے ہیں۔ رپورٹ میں صاف صاف لکھا ہے کہ پوری دنیا میں غریبی بڑھ رہی ہے اور جوں جوں لوگوں کی غریبی بڑھے گی لوگ بے وقوف ہوتے جائیں گے اور جوں جوں لوگ بے وقوف ہوتے جائیں گے جیوتشیوں کا ستارہ چمکتا چلا جائے گا۔

چیلا۔ ہو سکتا ہے۔

جیوتشی۔ بس ہو ہی سکتا ہے! راما نند! کسی دن سے تو پھوٹے منہ سے کہہ دو کہ یہ ہوگا یا تم یہ کر سکتے ہو۔

چیلا۔ میں کیا نہیں کر سکتا؟

جیوتشی۔ کوئی گاہک لا سکتے ہو؟

چیلا۔ گاہک لانا میرا کام نہیں

جیوتشی۔ کیوں نہیں! کیوں نہیں۔ تمہارا کام تو صرف میری جیب پر ڈاکہ ڈالنا ہے یہ کیوں بھولتے ہو راما نند! کہ میں تمہیں کمیشن دیتا ہوں۔

چیلا۔ تو اس سے کیا ہوا؟

جیوتشی۔ اچھا تو اس سے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس سے یہ ہوا نارد منی جی کہ کمیشن لینے سے آپ کمیشن ایجنٹ ہوگئے اور کمیشن ایجنٹ صرف ماتھے پر تلک لگانے کا کمیشن نہیں لیا کرتے انہیں کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

چیلا۔ بتائیے کون سا کام کروں؟

جیوتشی۔ سر پھوڑ دو میرا۔ لاٹھی مار کے میری ٹانگیں توڑ دو — یہ کام کرو!

چیلا۔ آپ تو بے کار میں خفا ہو رہے ہیں

جیوتشی۔ خفا نہیں ہوں گا تو کیا مارے خوشی کے ناچوں گاؤں گا۔ گھر میں دال دیئے کا سامان نہیں اور تم بیٹھے باتیں بنا رہے ہو کہیں سے ......

(اسٹیج کے دائیں ونگ کی طرف دیکھ کر — رازدارانہ لہجے میں) راما نند!

چیلا۔ جی گورو جی!

جیوتشی۔ (آنکھ سے دائیں ونگ کی طرف اشارہ کر کے) وہ کون آ رہا ہے؟ — وہ عورت میرا خیال ہے اسی طرف آ رہی ہے۔

چیلا۔ جی گورو جی (جھٹ گورو جی کے پاؤں دبانے لگتا ہے)

جیوتشی۔ (رٹنے لگتا ہے) نمو نارائن، اوم نمو نارائن۔

(چیلا گورو جی کے پاؤں دبا رہا ہوتا ہے اور گورو جی نمو نارائن، نمو نارائن رٹ رہے ہوتے ہیں کہ ایک عورت دائیں ونگ سے داخل ہوتی ہے)

عورت۔ پرنام مہاراج!

جیوتشی۔ اشیر باد، بیٹھو

(عورت زمین پر بیٹھ جاتی ہے)

جیوتشی۔ بیٹی! تم کچھ پریشان نظر آتی ہو — تمہارا ماتھا بتا رہا ہے، بڑا ظلم ہوا ہے تم پر۔ تمہاری یہ حالت کسی مرد کے کارن ہوئی ہے۔

عورت۔ ہاں مہاراج! آپ نے بالکل ٹھیک جانا۔

جیوتشی۔ اوم نمو نارائن!

عورت۔ ایک ہفتہ پہلے ان کی چٹھی آئی تھی مہاراج کہ وہ آ رہے ہیں۔ ہفتہ بھر ان کا انتظار کرتی رہی مگر نہیں آئے۔ کوئی اُپائے بتائیے مہاراج! وہ دو مہینے کی چھٹی پر گھر آ رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔

جیوتشی۔ بڑا کٹھن کام کرتے ہیں تمہارے پتی، ایسا تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔

عورت۔ جی مہاراج۔ وہ فوج میں حوالدار ہیں۔ دو مہینے کی چھٹی دو سال کے بعد ......

جیوتشی۔ نمو نارائن، اوم نمو نارائن! بیٹے راما نند۔

چیلا۔ (اور بھی زور سے پاؤں دباتے ہوئے) جی گورو جی

جیوتشی۔ اس ابلا ناری پر اتیا چار ہو رہا ہے۔

چیلا۔ تو گورو جی، کوئی ودھی بتائیے نا۔ آپ تو سب کے دکھ ہرتا ہیں

جیوتشی۔ اس کا پتی نہیں آئے گا۔ وہ کسی دوسری ناری کے پھندے میں پھنس گیا ہے۔

---

۱ ترکیب ۲ بے چاری عورت ۳ ظلم ۴ علاج

عورت۔ نہیں مہاراج، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا مت ہونے دیجیے مہاراج۔ بھگوان کے لئے ایسا مت ہونے دیجئے۔ نہیں تو میں برباد ہو جاؤنگی، میں کہیں کی نہ رہوں گی مہاراج!

جیوتشی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے دیوی۔ ہونے والی بات اوشیہ[1] ہوگی۔

چیلا۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں گورودیو۔ ان پر دیا کیجئے۔ کوئی اُپائے بتا دیجئے۔ مجھ سے ان کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

عورت۔ ہاں مہاراج! بھگوان کے لئے کوئی اُپائے بتلیئے۔ ان پر ضرور کسی ڈائن نے جادو کر دیا ہے۔ پہلے تو وہ ایسے نہیں تھے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا مجھ سے۔

جیوتشی۔ اس میں دھن لگے گا دیوی اور دھن میرے وچار[2] میں تمہارے پاس نہیں ہے۔

عورت۔ (بے چینی سے) جو بھی لگے گا میں دوں گی۔ میں اپنا گھر بیچ دوں گی مہاراج اپنے سوامی کو اس کلموہی، کلنکی[3] سے بچانے کے لئے اپنا سب کچھ بیچ دوں گی مہاراج!

جیوتشی بیٹھے رامانند!

چیلا۔ جی گوروجی۔

جیوتشی۔ تمہارا کیا وچار ہے۔ اس دکھیا ناری کے کلیان کے لئے اکیاون روپے مارتنڈ پاٹھ پر خرچ کروانے چاہئیں یا نہیں؟

عورت میں اکیاون روپے دوں گی۔ میں ابھی اکیاون روپے آپ کو لا دوں گی مہاراج میرا گھر یہاں سے دُور نہیں۔ آپ میرے سوامی کو بچا لیجئے۔ بھگوان کے لئے مجھ ابھاگن پر دیا کیجئے

جیوتشی۔ تو جاؤ۔ لے آؤ۔ لیکن سنو، کاغذ کا دھن نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے مارتنڈ پاٹھ میں وگھن[4] پڑے گا۔ کھرے سکے کے روپے ہونے چاہئیں۔

عورت۔ جو آگیا مہاراج۔

چیلا۔ ماتاجی آپ چاہیں تو نوٹ ہی لے آیئے۔ مجھ سے آپ کی جو بھی سیوا ہو گی میں کرونگا .... مجھ سے آپ کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

عورت۔ ابھی لاتی ہوں۔ میں ابھی اکیاون روپے لاتی ہوں مہاراج۔

جیوتشی۔ چرنجیو رہو۔ تمہارا سہاگ بنا رہے۔ تم نارائن ادھم نرکا داش

(عورت جاتی ہے۔ دونوں تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں سپھیں)

جیوتشی۔ (ہنستے ہوئے) رامانند! یوں پیسہ آتا ہے رامانند۔ تم واقعی اپنا کام خوب کرنے لگے ہو۔ کافی مہارت ہو گئی ہے تمھیں ہم تم سے خوش ہوئے۔

چیلا۔ شکریہ گوروجی

جیوتشی۔ پھر وہی گوروجی!

چیلا۔ بات یہ ہے گوروجی کہ آج مجھے پیسے کی بڑی ضرورت ہے۔

جیوتشی ملے گا۔ ضرور پیسہ ملے گا۔

چیلا۔ مجھے پچیس روپوں کی ضرورت ہے گوروجی۔

جیوتشی۔ (چونک کر) پچیس! پچیس کس حساب سے؟ تمہارا کمیشن بارہ روپے بارہ آنے بنتا ہے وہ تمھیں مل جائے گا۔

چیلا۔ نہیں مجھے پچیس روپے چاہئیں۔ مجھے سخت ضرورت ہے۔

جیوتشی۔ لیکن کس حساب سے؟

چیلا۔ کسی بھی حساب سے! چار روز سے مجھے ایک پیسہ نہیں ملا۔

جیوتشی اس میں سب تمہارا قصور ہے۔

چیلا۔ میرا کیا قصور ہے؟

جیوتشی۔ تم گاہک نہیں لاتے۔ یہ بھی میں ہوں کہ خود آئے ہوئے گاہکوں کا کمیشن تمھیں دیتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ وکیل اپنے ایجنٹوں کو کبھی اس طرح کمیشن دیتے ہیں؟ انشورنس کمپنیاں دیتی ہیں؟

چیلا۔ ان کی بات دوسری ہے۔

جیوتشی۔ ان کی بات دوسری ہے تو جناب والا میری بات تیسری ہے۔ میرا پیشہ ان سے کم معزز نہیں۔

چیلا۔ آپ کا پیشہ — آپ کا پیشہ تو ٹھگ بازی کا ہے۔

جیوتشی۔ خاموش۔ گستاخ، نمک حرام! جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ پچیس نہیں تم پورے اکیاون لے جانا اور میری جان چھوڑنا۔ مجھے تم ایسے دغا باز ساتھی کی ضرورت نہیں۔

چیلا۔ دغا باز میں ہوں یا آپ جو معصوم اور مجبور لوگوں کو اُلو بنا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔

جیوتشی۔ میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ۔ خاموش ہو جاؤ رامانند!

(دائیں دنگ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں) خاموش ہو جاؤ۔ گاہک

---

[1] ضرور [2] خیال [3] خلل [4] لمبی عمر ہو تمھاری

آتا ہے۔

(جیوتشی جی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ چیلا ان کے پاؤں دبانے لگتا ہے۔ اتنے میں دائیں ونگ سے ایک مرد داخل ہوتا ہے)

مرد۔ (کھانس کر) کیوں جناب! گوسوامی پٹودھن شاستری یہیں رہتے ہیں!

چیلا۔ جی ہاں مہاشے (جیوتشی جی کی طرف اشارہ کر کے) گوسوامی جی آپ ہی ہیں دھیان میں مگن ہیں اس سمے — گورو دیو آنکھیں کھولیئے — آنکھیں کھولیئے گورو دیو!

مرد۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک عورت یہاں آئی تھی نا!

چیلا۔ ہاں مہاشے۔ بڑی دکھیا تھی بے چاری

مرد۔ اس نے آپ کے لئے اکیاون رُپے بھجوائے ہیں۔

جیوتشی (آنکھیں بند ہیں مگر چونک کر) کون؟ کون آیا ہے بیٹے رامانند؟

چیلا۔ آنکھیں کھولیئے گورو دیو! گورو دیو آنکھیں کھولیئے۔

جیوتشی۔ یہ سجن کون ہیں رامانند؟

چیلا۔ ابھی ابھی جو ماتا جی آئی تھیں — جن کے کلیان کا آپ نے وعدہ کیا تھا انھوں نے اکیاون رُپے بھجوائے ہیں۔

جیوتشی۔ رکھ لو۔ لیکن دھن جیب میں رکھنے کے بعد مجھے ہاتھ مت لگانا رامانند۔ دھن نامی وشتو مجھ سے ہمیشہ دُور رکھا کرو۔

مرد۔ بڑے سنیاسی دھرماتما ہیں آپ تو۔

چیلا۔ (تحسین طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) ہر سمے گیان دھیان میں مگن رہتے ہیں گورو دیو۔ موہ مایا تو چھو تک نہیں گئی۔

مرد۔ اس عورت کو کیا بتایا تھا آپ نے؟

چیلا۔ بڑی دُکھی تھی بے چاری — بے چاری کا پتی کسی پرائی ناری کے پنجے میں پھنس گیا ہے۔ رو رو کر بے چاری نے اپنا بُرا حال کر لیا۔ تب گورو دیو نے . . .

مرد۔ اچھا تو وہ یہاں رونے بھی تھی!

چیلا۔ آپ جانیئے مہاشے! بھارتیہ ناری کا سب کچھ، پرمیشور، پرماتما، ایشور، بھگوان اس کا پتی ہوتا ہے۔ اور اگر پتی ہی اس کا ہتیا رانمل آئے۔ بدمعاش، لچا لفنگا و فریبی ہو جائے تو . . . .

مرد۔ منھ سنبھال کر بات کیجئے۔

چیلا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مہاشے؟

جیوتشی۔ رامانند! یہ سجن کیا کہہ رہے ہیں؟

مرد۔ یہ سجن یہ کہہ رہے ہیں بگلا بھگت جی کہ یہ بھی ابھی آپ کا اور آپ کے اس چیلے چانٹے کا مارے چانٹوں کے حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے۔

جیوتشی۔ (چونک کر آنکھیں کھول دیتا ہے) نمو نارائن! اوم نمو نارائن (رٹتا چلا جاتا ہے)

مرد۔ یہ سوانگ بنا کر بھولی بھالی عورتوں کو ٹھگتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ سیدھی طرح جیب کاٹنے کا دھندا کیوں نہیں کرتے آپ لوگ . . . .

چیلا۔ وہ تو بڑی دکھیا تھی مہاشے! اس کا پتی . . . .

مرد۔ اس کا پتی چھٹی پر آنے والا تھا!

چیلا۔ ہاں مہاشے!

مرد۔ لیکن کسی دوسری عورت کے پنجے میں پھنس گیا۔

چیلا۔ بالکل ٹھیک! یہی بات ہوئی ہے مہاشے! گورو دیو نے . . . .

مرد۔ تمھارے گورو دیو کی ایسی تیسی . . . . .

(نمو نارائن کی رٹ تیز ہو جاتی ہے)

مرد۔ اس کا پتی دوسری عورت کے پنجے میں پھنس گیا تھا تو یہ تمھارا باپ کہاں سے آ گیا۔

جیوتشی۔ (گھبرا کر اور نمو نارائن کی رٹ چھوڑ کر) باپ! تو آپ ہی اس عورت کے . . . .

مرد۔ عورت نہیں ابلا ناری کہیئے۔ میں ہی اس ابلا ناری کا بدمعاش، لچا، لفنگا و فریبی ہوں اور آپ کو حوالات میں بند کرانے آیا ہوں۔

جیوتشی۔ (بُری طرح گھبرا کر) حوالات!

چیلا۔ کھشما! کھشما شریمان کھشما!

جیوتشی۔ غضب ہو گیا۔ ہے بھگوان بالکل غضب ہو گیا۔

مرد۔ غضب ابھی کہاں ہوا ہے دھرماتما جی۔ غضب تو اب ہو گا جب تم دونوں دھوکہ دہی کے الزام میں حوالات کی ہوا کھاؤ گے۔

جیوتشی، چیلا۔ (یک زبان ہو کر) کھشما مہاشے! شریمان جی کھشما!

مرد۔ اُٹھیے، چلیئے میرے ساتھ۔

جیوتشی۔ آپ کے ساتھ!

لہ چیز   تہ معافی

چیلا ۔ آپ کے ساتھ حوالات میں چلیں؟
مرد ۔ حوالات سے پہلے میرے گھر چلئے اور چل کر اس ابلا ناری کو بتا دیجئے کہ
آپ جیوتشی نہیں ٹھگ ہیں، اٹھائی گیرے ہیں۔
جیوتشی ۔ چلئے، ابھی چلئے شرمیان! ہم ابھی جاکر ۔۔۔ رام نند!
چیلا ۔ جی گورو جی
جیوتشی ۔ بہت بُرے گورو جی کی ۔ ستیا ناس ہو تمہارا! تم نے ہی گورو جی گورو جی کر کے
میرا بیڑا غرق کیا ہے ۔ خیر، تمہاری حجامت میں آکر کروں گا۔ ابھی ذرا
میرے ساتھ تم شرمیان جی کے گھر چلو۔
چیلا ۔ میں تیار ہوں گورو جی۔
جیوتشی ۔ چلنے کے لئے تیار ہو؟
چیلا ۔ چلنے کے لئے بھی تیار ہوں گورو جی اور واپس آکر اپنی حجامت کروانے اور
آپ کی حجامت کرنے کے لئے بھی۔

[دونوں اُٹھتے ہیں
پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

رُباعیاتِ عمر خیام کا انگریزی ترجمہ

..... لندن سے ایک رسالہ "سیٹرڈے ریویو" نکلتا تھا۔ اُس کے ایڈیٹر نے رُباعیاتِ عمر خیام کے انگریزی ترجمے کا ایک نسخہ خریدا۔ اس کے مطالعے سے متاثر ہو کر اس نے روسیٹی سے ذکر کیا۔ روسیٹی نے مشہور شاعر سوئن برن اور کارلائل سے بات کی، چنانچہ اگلے روز روسیٹی، سوئن برن اور کارلائل تینوں نے برنارڈ کوریچ کی دکان پر جاکر رباعیات خریدیں۔ دکاندار نے جب دیکھا کہ قدردانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو اس نے جھٹ کتاب کی قیمت ایک پنس سے بڑھا کر دو پنس کر دی۔

۱۸۶۸ء میں برنارڈ کوریچ نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور قیمت ۷ شلنگ مقرر کی۔ فٹز جیرلڈ اتنی گراں قیمت کا مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کتاب ہرگز اس قابل نہیں کہ لوگ اتنے زیادہ دام خرچ کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے۔ سرورق پر اس مرتبہ بھی مترجم کا نام نہیں تھا۔ تاہم لندن میں آہستہ آہستہ مترجم کی پُراسرار شخصیت پر سے پردے اُٹھنے لگے۔ اسی دوران میں رُباعیات کا چرچا امریکہ میں بھی پھیل گیا تھا اور وہاں بعض رسائل میں عمر خیام کی شاعری پر مقالے بھی چھپنے لگے تھے، چنانچہ امریکہ میں رباعیات کی دھڑا دھڑ مانگ ہوئی تو برنارڈ کوریچ کو دو نئے ایڈیشن طبع کرانا پڑے۔ فٹز جیرلڈ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس مقبولیت کو اپنی ہنرمندی کا ثبوت سمجھنے کی بجائے امریکی لوگوں کی عجوبہ پسندی پر محمول کرتا تھا۔

۱۸۷۰ء میں انگلستان کے بعض رسائل نے پہلی بار رُباعیات کو قابلِ توجہ سمجھ کر اُن پر تبصرہ کیا۔ کارلائل پہلا شخص تھا جس نے مترجم کی شخصیت کا صحیح پتہ چلانے میں کامیابی حاصل کی۔ رسکن نے رباعیات کا مطالعہ کرنے کے بعد فٹز جیرلڈ کو جو خط لکھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں:۔

"خدا کے لئے عمر خیام کی اور نظموں کا بھی ترجمہ کیجئے۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک رُباعیات سے بہتر شاعری نہیں دیکھی نہ پڑھی۔ اس میدان میں اپنا قلم ہرگز مت روکئے۔"

۱۹۳۰ء میں برنارڈ کوریچ نے رباعیات کا وہ نسخہ جو ایک زمانے میں سوئن برن کے مطالعہ میں رہ چکا تھا اور جس کے ایک صفحے پر سوئن برن کے ہاتھ کی تحریر بھی تھی ۹ ہزار ڈالر میں فروخت کیا۔ دوسرا نسخہ جو کسی زمانے میں ولیم موریس کی ملکیت تھی، ایک شخص نے ساڑھے چار ہزار ڈالر میں خریدا۔

فٹز جیرلڈ کا انتقال جون ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں رباعیات کی روز افزوں مقبولیت دیکھ لی تھی۔ امریکہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی تک فٹز جیرلڈ کے ترجمے نے عمر خیام کی شہرت پھیلا دی تھی۔ لیکن رباعیات کو جو عروج فٹز جیرلڈ کے مرنے کے بعد حاصل ہوا اُس کا تصوّر تو اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی نہ ہوگا۔ اب قدیم نسخے بادشاہوں کو تحفے کے طور پر پیش ہونے لگے۔ چاہنے والوں نے اپنی معشوقاؤں کو رباعیات کا ہدیۂ محبت نذر کیا۔ سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار اور توپوں کی گرج کے اندر بھی رباعیات کو سینے سے لگائے رکھا۔ اکثر نوجوانوں نے رباعیات سے متاثر ہو کر خودکشی کر لی۔ پولیس جب تفتیش کے لئے پہنچی تو لاش کے قریب جام و مینا کے ٹکڑے پڑے ہوتے اور ایک طرف رُباعیات کا نسخہ کھلا ہوتا تھا ....

(اقتباس از ادبی دنیا) عاشق حسین بٹالوی

محمد بشیر الحق دسنوی

حضرت اکبر داناپوری کی چند تضمینیں

سید شاہ محمد اکبر ابو العلائی داناپوری خلف سید شاہ محمد سجاد ابو العلائی (۱۲۹۸ھ - ۱۲۳۱ھ) بمقام داناپور محلہ شاہ ٹولی ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد بزرگوار کے وصال کے بعد خانقاہ داناپور کے سجادہ پر بیٹھے۔ آپ کو حضرت وحید الہ آبادی سے تلمذ تھا۔ حضرت اکبر نے ۱۳۲۷ھ میں انتقال کیا۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ نثر میں پچیس تیس کتابیں آپ کی تصنیف سے ہیں جس میں اشرف التواریخ کی تین جلدیں بہت مشہور اور مقبول ہیں مگر اب کم یاب ہیں نظم میں دو دیوان ہیں۔ تجلیات عشق مطبوعہ ۱۳۱۴ھ اور جذبات اکبر مطبوعہ ۱۳۲۹ھ

تضمین

ہے بحث کس کو کشف و کرامت میں آپ کی
اکبر تم اپنے وقت کے ابدال ہی سہی
لیکن یہ بیت آپ نے شاید نہیں سنی
بیرونِ گور لافِ کرامت چہ می زنی
ایماں اگر بگور بری صد کرامت است

ایضاً

بڑھتے یا زوں کے سے نکلے ہیں یہ سب کشف و شہود
آدمی وہ ہے جو ہو تابع حکم معبود
نور و زر ذات سے انساں کے نہیں ہے مقصود
شرفِ نفس بجود است و کرامت بہ سجود
ہر کہ ایں ہر دو ندارد عدمش بہ نہ وجود

ایضاً

اکیلے گھر میں پڑے رہتے ہیں جیسے کہ مرے
نہیں ہے اتنا بھی کوئی کہ ہاتھ دل پہ دھرے
ہمارے حال کی اس کو خبر یہ کون کرے
نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغِ نامہ برے
کسے ز بیکسیِ ما نمی برد خبرے

ایضاً

کفن کے واسطے کافی ہے دامن صحرا
بجائے شمع جلے گا یہ داغِ دل اپنا
ہماری قبر پہ کیا کام چادرِ گل کا
بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزارِ مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

ایضاً

زمین بچرخ رسد ایں چہ ہرزہ گفتار است
کہ نار جلوہ کند ہمچو نور دشوار است
محقق است دریں مسئلہ چہ تکرار است
میانِ ما و سگِ یار فرق بسیار است
چرا کہ من سگِ او ہستم او سگِ یار است

شری پاد جوشی

مراٹھی زبان میں خطوط نویسی

اگر ادب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُردو کو چھوڑ کر بھارت کی دوسری کسی زبان میں ادبی خطوط لکھنے اور انھیں شائع کرنے کا رواج اتنے بڑے پیمانے پر شاید ہی ہوگا۔ خطوط نویسی کو اُردو نے ایک فن کے طور پر فروغ دیا ہے۔ اس لئے اُس میں خطوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے ویسا ذخیرہ دوسری زبانوں میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ کم از کم مراٹھی زبان میں تو ادبی لحاظ سے اعلیٰ درجے کے خطوط کے مجموعے ابھی تک نہیں کے برابر تھے۔ مگر گذشتہ چند سال میں کچھ اچھی نوعیت کے دلچسپ خطوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مراٹھی میں خطوط شائع ہی نہیں ہوئے، ایسی بات نہیں ہے۔ مراٹھی زبان میں کئی افسانے، ناول، مضمون، سفرنامے خطوں کی صورت میں پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن ان خطوں کو صحیح معنی میں خط نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو اوپر سے پہنی ہوئی ایک پوشاک ہے۔ اُس کی رُوح الگ ہی ہوتی ہے۔ خطوط کی صورت میں بڑے اچھے ناول مراٹھی میں اب تک شائع ہو چکے ہیں جن میں مرحوم وامن ملہار جوشی کا ناول، آندر کالے اور اور سرلا بھولے، بہت مشہور ہے۔ کئی سفرنامے بھی خطوں کی صورت میں مراٹھی میں ملتے ہیں، جن میں مرحوم نرسنگھ چنتامن کیلکر کے 'ولایت پل یاتی پترین' (ولایت کے مراسلات) اور شری شری پاد رام چندر ٹکیکر کی کتاب 'مسلمانی ملکھا تیل مشا پھری' (مسلم ممالک کا سفر) مشہور ہیں۔ مگر ان کو ادبی خطوط کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔

خطوں کے کچھ مجموعے مراٹھی میں ایسے بھی موجود ہیں جو دراصل کسی دوسری زبان میں لکھے گئے تھے، مگر جن کے ترجمے مراٹھی میں شائع ہوتے ہیں، مثلاً مرحوم بپن چندر پال کے ولایت کے خطوط، مرحوم اربند گھوش کے اپنی بیوی کے نام لکھے ہوئے خطوط، شری ساورکر کے انڈمان سے لکھے ہوئے خطوں کا مجموعہ 'انڈمان چیا اندھیری تون' (انڈمان کی کال کوٹھری سے) گاندھی جی کے خطوط کا مجموعہ 'منگل پربھات'، سوامی وویکانند کے خطوط وغیرہ۔ ان میں سے گاندھی جی کے خطوں کا ایک مجموعہ ہے۔ 'پرساد دیکھنا'، اس کا مراٹھی میں بہت چرچا ہوا، اور گاندھی جی کے مخالفین نے اُس کی آڑ میں گاندھی، گاندھی واد اور گاندھی وادیوں پر بُری طرح اور گندے طریقے سے حملہ کیا اور کیچڑ اُچھالا۔ اس کے مرتب آچاریہ کاکا کالیلکر نے اُس کے دیباچے میں لکھا تھا کہ "سچے خطوط سماجی زندگی کی ایک اہم دستاویز ہوتے ہیں۔ اُن کی طرف ادب کی نظر کے عوض ذمہ دار سماجی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اُن کے پڑھنے سے صرف ادبی ذوق کو پورا کرنے کا خیال نہ رکھ کر اپنی زندگی کو پاک، مہذب اور شاندار بنانے کی کوشش ہمیں کرنی چاہیئے۔"

اسی قسم کا اور ایک مجموعہ مراٹھی میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے 'پتر ویوہار' (خط وکتابت) یہ مجموعہ مرحوم نرسنگھ چنتامن کیلکر کی آپ بیتی 'گت گوشٹی' (گذری ہوئی باتیں) کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوا ہے۔ اس میں ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک کی شری کیلکر جی کی خط وکتابت کو شامل کیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، لارڈ ولینگڈن، شوکت علی، عبدالقیوم خاں، لالہ لاجپت رائے وغیرہ دیش کے نامی گرامی لیڈروں کے تقریباً ایک ہزار سے بھی زیادہ خط اور ان میں سے چند خطوں کے کیلکر جی کی طرف سے لکھے گئے جواب اس میں شامل ہیں۔ یہ ساری لکھا پڑھی اصل میں انگریزی میں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کا مراٹھی ترجمہ اس میں دیا گیا ہے۔ پچھلے پچاس برس کی بھارت کی تاریخ لکھنے والوں کو اس مجموعے سے بہت کچھ مسالہ مل سکتا ہے۔

اصلی مراٹھی خطوں کے چند مجموعے زبان اور خیال کے لحاظ

بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ بھارت کے مشہور مورخ شری گووند راؤ سر دیسائی کے صاحب زادے مرحوم ڈاکٹر شیام کانت کے دوسو خطوں کا ایک مجموعہ 'شیام کانتا چی پتریں' (شیام کانت کے خطوط) کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سورگیہ رویندر ناتھ ٹاگور کا ایک بنگالی خط بھی خود انھیں کی لکھاوٹ میں چھپا ہے۔ اس مجموعے کا آخری خط مرحوم شیام کانت کا ہے، جو انھوں نے اپنے انتقال سے چند گھنٹے پہلے سوئٹزرلینڈ سے اپنے والد کے نام لکھا تھا، بہت ہی درد ناک ہے۔ ایسا آدمی شاید ہی ملے گا جس کی آنکھیں وہ خط پڑھتے وقت نہ بھر آئی ہوں۔ اصل میں دیکھا جائے تو یہ مجموعہ پوری طرح گھریلو اور ذاتی ڈھنگ کا ہے مگر پھر بھی اُس سے اُس زمانے کی سیاسی اور سماجی حالت کا پتہ اچھی طرح چلتا ہے۔ یورپ کی حالت کا کچھ اندازہ اس سے ہو جاتا ہے۔

تقریباً چھ سال پہلے شری کاکا صاحب کالیلکر کے خطوط کا ایک مجموعہ 'سپریم وندے ماترم' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں کرناٹک اور مہاراشٹر کے ایک بڑے کارکن شری 'پنڈلیک جی کاتگڑے' کے نام شری کاکا کالیلکر جی کے لکھے ہوئے خط شائع ہوئے ہیں۔ اس میں عوام کی دلچسپی کے سوالوں کا ذکر بہت کم ہے۔ زیادہ تر خطوط ذاتی معاملوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر اس مجموعے کا کالیلکر جی نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ بہت قیمتی ہے۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں۔

> ادب کی خدمت کے طور پر کئی لوگ خطوں کی شکل میں مضمون، سفرنامے یا کہانیاں لکھتے ہیں۔ یہ خط اصلی نہیں بلکہ اوپر سے پہنی ہوئی پوشاک ہوتی ہے۔ ان کی بھی اپنی ایک اہمیت اور شان ہوتی ہے۔ لیکن اصلی خط تو دلکش بات چیت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ ایسے خطوں میں تاریخی دستاویز کی اہمیت اور ادبی مزہ نہیں ہوتا۔ اُن میں زندگی کے معاملوں کی گہرائی ہوتی ہے۔ اگر لکھنے والا اچھا ادیب ہو تو ایسے خطوں میں کبھی کبھی ادبی جواہر پارے اور شاعرانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ مگر وہ سب قدرتاً آجاتا ہے۔"

مراٹھی کے مشہور و مقبول عام مصنف مرحوم سانے گروجی کا خط لکھنے کا ڈھنگ بڑا دلچسپ اور دلکش ہوتا تھا۔ مہاراشٹر کے کئی جوانوں کے پاس اُن کے خطوط ملیں گے۔ اپنے خطوں میں مناظرِ قدرت کی ہو بہو تصویریں کھینچنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے ہفتہ وار اخبار "سادھنا" میں اُن کے جو خط شائع ہوتے تھے وہ اب 'سُندر پتریں' (بڑھیا خطوط) کے عنوان سے تین حصّوں میں چھپ گئے ہیں، اور ان کے کئی ایڈیشن نکلتے جا رہے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مراٹھی ناظرین نے اُن کو کتنا پسند کیا ہے۔

اگست ۱۹۵۰ء میں مراٹھی میں 'جیون دیکشا' نام کا ایک مجموعۂ خطوط شائع ہوا ہے۔ یہ صحیح معنی میں مراٹھی خطوں کا مجموعہ ہے۔ کیوں کہ اس میں خالص مراٹھی زبان کا ہی استعمال ہوا ہے۔ مہاراشٹر کے ایک نامور ماہرِ تعلیم اور وردھا کے مہلا آشرم کے سابق پرنسپل مرحوم نانا آٹھولے نے اپنے ایک طالب علم شری یادو جوشی اور ایک طالبہ شانتا جوگدیو کو تقریباً بیس سال پہلے جو خط لکھے تھے اُن کا یہ مجموعہ ہے۔ بیس سال کا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی یہ خطوط اتنے تازہ معلوم ہوتے ہیں گویا ابھی ابھی لکھے گئے ہیں۔ ان خطوں میں طالب علموں کی زندگی کے غالباً سبھی پہلوؤں پر ایک ماہرِ تعلیم کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہندوستان کی کسی زبان میں اس قسم کے خطوں کا مجموعہ موجود نہیں ہے۔ پھر اس میں یہ خصوصیت ہے کہ جب یہ خط لکھے گئے تھے تب لکھنے والے اور پانے والوں کو یہ قطعی خیال نہیں تھا کہ کسی روز یہ خطوط کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوں گے۔ چنانچہ ان میں ایسی سادگی صفائی اور بے ساختگی آئی ہے کہ پڑھنے والا ان میں محو ہو جاتا ہے اور اُس کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا وہ خط خود اس کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں۔ مہاراشٹر کے نوجوانوں نے اس مجموعے کا بڑا اچھا استقبال کیا ہے۔

آج کل مراٹھی میں خط لکھنے والوں میں سب سے مشہور و مقبول ہیں آچاریہ دادا دھرما دھکاری، جو وردھا سے نکلنے والے ہندی "سرودیہ" ماہانہ رسالے کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اسی طرح پرجا سماج وادی پارٹی کے سابق جنرل سکریٹری اور آج کل گوا کے قید خانے میں دس سال کی سزا کاٹنے والے شری نانا صاحب گورے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط اکثر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شری دادا دھرما دھکاری کے خطوں کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن کے نام ہیں۔ "آپلیا گنزا جیاچی گھڑن" (ہمارے لوگ آج کی بناوٹ) "سنیہا چے جھرے" (پیار کے جھرنے) اور "انتریں چے اُمالے" (جذبات دل)

ان میں سے پہلی کتاب میں جو خطوط آئے ہیں وہ شری دھرما دھکاری نے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام اُس وقت لکھے تھے جب وہ بھارت کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی میں رہتے تھے۔ ان خطوں میں اُس زمانے کی اتنی چھوٹی موٹی باتوں کا ذکر آیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک مکمل تصویر کھڑی ہو جاتی ہے۔ "پیار کے جھرنے" میں شری دھرما دھکاری جی کے ایسے خطوط شامل ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً الگ الگ لوگوں کو لکھے تھے۔ اس میں زندگی سے تعلق رکھنے والے تقریباً سبھی مضمون آگئے ہیں۔ اُن کو پڑھتے وقت ناظرین کا دل کبھی کھلکھلا کر ہنس اُٹھتا ہے اور کبھی یکایک مایوس ہو جاتا ہے۔ اُن کے خطوں کا تیسرا مجموعہ "جذباتی ل" میں وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے اپنی منہ بولی بیٹی کماری وملا ٹھکار کو لکھے ہیں۔ اس میں لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے سبھی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ عورتوں کے سوالوں کے بارے میں شری دھرما دھکاری کے خیالات بڑے انقلابی ہیں۔ اتنے بنیادی اور انقلابی خیالات یورپ کے ترقی پسندوں میں بھی نہیں ملتے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔

شری نا۔گ۔ عرف نانا صاحب گورے نے بڑے اچھے خط اپنی بیٹی کے نام لکھے ہیں۔ شری گورے صاحب کا طرز تحریر بڑا دلکش ہے۔ وہ تصویریں بھی بڑی اچھی بناتے ہیں جس سے اُن کے خطوں میں ایک زندگی آجاتی ہے۔ پارٹی کے کام کے لئے اُن کو ملک بھر میں گھومنا پڑتا ہے۔ وہاں سے وہ خط لکھتے رہتے ہیں۔ اس لئے اُن میں نئی معلومات ہوتی ہیں۔ ان کے خط پڑھتے وقت ہم کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ان خطوں کی یاد آجاتی ہے جو انھوں نے اپنی بیٹی اندرا کے نام برسوں پہلے لکھے تھے اور جو "باپ کے خط بیٹی کے نام" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ مناظر فطرت اور الگ الگ شخصیتوں کے بارے میں بھی اُن میں بہت ذکر آیا ہے۔

ادھر چند ماہ پہلے مراٹھی کے ایک مشہور و نامور مصنف شری گوپی ناتھ تلولکر کے بھی خط بمبئی کے ہفتہ وار اخبار "نوُیگ" میں "ناتا پتر" (ناناکے خطوط) کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ مگر اُن میں وہ رنگینی و دلچسپی کہاں جو ساتنے گوروجی، دادا دھرما دھکاری اور نانا صاحب گورے کے خطوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر بھی اُن کے خطوں میں قسم قسم کے مضمون آجاتے ہیں جس سے خطوں کی شکل میں نفس مضمون کی حیثیت سے اُن کی اہمیت مزید ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل مراٹھی میں خطوط لکھنے اور شائع کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے اور لوگوں میں بھی خط پڑھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ مگر ابھی ایسے خطوط مراٹھی میں نہیں آئے ہیں جیسے غالب اور امیر مینائی نے اُردو میں لکھے تھے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مراٹھی میں بھی ایسے خطوط آئندہ شائع ہو جائیں گے۔

فولاد کے نئے کارخانے

دوسرے پنجسالہ منصوبے میں دو اور فولاد کے کارخانے وجود میں آئیں گے۔ ان دونوں کارخانوں کو اشیائے ضروری پہنچانے اور وہاں سے لانے کی بھی تمام تر ذمہ داری دکھن پوربی ریلوے پر ہوگی۔ ان میں سے ایک کارخانہ رورکیلا (اڑیسہ) میں اور دوسرا بھیلائی (مدھیہ پردیش) میں قائم کیا جائے گا۔

رورکیلا اور بھیلائی دونوں دکھن پوربی ریلوے کی ہاوڑہ۔ ناگپور مین لائن پر واقع ہیں۔ رورکیلا کلکتے سے ۲۵۷ میل کے فاصلے پر اور بھیلائی ۵۳۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فولاد کے ان کارخانوں کے لئے جگہ کا انتخاب حکومت نے ماہرین کی رائے کے بعد کیا ہے جنھوں نے اس انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ خام اشیا خصوصاً خام لوہا، چونا اور کوئلہ ان کارخانوں سے قریب تر مقامات پر فراہم ہو سکیں۔

رورکیلا کے لئے خام لوہا زیادہ تر نالدہ اور دو مارو سے آئے گا۔ اس مقصد کے لئے رورکیلا سے دوماردتک چالیس میل لمبی ایک برانچ لائن تعمیر کی جا رہی ہے۔ بھیلائی کے فولاد کے کارخانے میں لوہے کی سپلائی دلّی راجہرا سے ہوگی اور اس کے لئے ۔۔ میل لمبی ایک برانچ لائن تعمیر کی جا رہی ہے۔

محمد مصلح الدین احمد

انڈونیشیا میں شادی کے مراسم

انڈونیشیا اور ہندوستان میں نہ صرف گہرے سیاسی و معاشی تعلقات قائم ہیں بلکہ ثقافتی رشتہ اس قدر مستحکم ہے کہ اس کی مثالیں زندگی کے ہر شعبے میں ملتی ہیں۔ ان دونوں ممالک میں باوجود جغرافیائی دوری کے تاریخی قربت اور ثقافتی یگانگی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک کے عوام رسوم کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصاً ان ممالک میں شادی کے مراسم قابل دید اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں شادی کا مقصد دنیا کے ہر ملک میں وہی ہے لیکن مراسم جدا ہیں۔ ایک ملک کے مراسم دوسرے سے نہیں ملتے۔ اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک وہ باشندے ہیں جو سب سے پہلے آباد ہوئے۔ دوسرے جغرافیائی حالات اور تیسرے دیگر اقوام سے ربط۔ اسی وجہ سے ان تین عناصر کا انڈونیشیائی رسوم پر خاص اثر پڑا۔ چونکہ انڈونیشیا مجمع الجزائر ہے اس لئے اس کے مختلف علاقوں کے رسم و رواج میں فرق دکھائی دیتا ہے۔ ان رسوم کا تعلق بڑی حد تک ہندو دور سے رہا ہے۔ انڈونیشیائی شادی اور دیگر رسم و رواج کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ علاقے جہاں ہندو مت غالب تھا وہاں کے عوام پر اس کا اثر ہوا لیکن یہاں کے ہندو مراسم میں خود اختلاف ہے۔ دوسرا حصّہ وہ ہے جہاں مسلمانوں کا اثر تھا۔ ان علاقوں میں اسلامی مراسم قدیم رسوم کے ساتھ انجام دئے جاتے ہیں۔ تیسرا حصہ وہ ہے جو دُور واقع ہونے کے باعث ان دونوں اثرات سے محفوظ تھا لیکن بعد میں اس پر عیسائی اثر غالب آیا جس کے باعث مغربی رواج کا اثر ہوا۔ ملک میں معاشی و سیاسی انقلابات کے باعث قدیم رسوم ختم ہوتی جارہی ہیں

شادی کے مراسم کے ادا کرنے میں قابل برداشت جبر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا دلچسپ پہلو نمایاں ہوتا ہے اور یہ مراسم اس ملک کی تاریخی روایات مذہبی اثرات اور عوامی رجحانات کا مظہر ہوتے ہیں۔ ان مراسم میں زمانے کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے انڈونیشیا میں شادی کے رسم و رواج بھی جدید اثرات کے تحت بدل گئے ہیں۔ چونکہ انڈونیشیا میں سب سے پہلے ہندو آباد ہوئے اور بعد میں اسلام پھیلا اس لئے وہاں کے رسم و رواج خصوصاً شادی کے مراسم میں ان دونوں قوموں کی رسوم کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ فرد کی زندگی میں شادی اہم ترین واقعہ ہوتی ہے لیکن لوگوں کا تو کہنا یہ ہے۔ کہ شادی حقیقی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔

زمانۂ قدیم میں ہندوستان کی طرح انڈونیشیا میں شادی کا کل اختیار والدین کو تھا لیکن اب زمانے کی تبدیلی اور نئی نسل کے جدید رجحانات کے پیش نظر والدین رسمی فرائض انجام دیتے ہیں۔ رفیقِ حیات کے انتخاب کا معاملہ بالکل دولھا اور دلھن کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے بسول میرج کے عام ہونے کے باعث رسوم کم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سب مغربی اثر کے باعث ہے۔

انڈونیشیا میں شادی کے موقع پر جو رسوم انجام دی جاتی ہیں بہت دلچسپ ہیں۔ جب لڑکے کی عمر اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے تو والدین اس کے لئے موزوں لڑکی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جوں ہی پتہ چلے کسی معتبر آدمی کو لڑکی کے والدین سے بات چیت کے لئے بھیجا جاتا ہے، یہ درمیانی فرد رازدارانہ طور پر لڑکی کے والدین کا ردِعمل معلوم کر لیتا ہے۔ اگر جواب اثبات میں ملے تو طے کیا جاتا ہے کہ لڑکے کے والدین لڑکی کے مکان پر کس دن آئیں تاکہ لڑکی کو دیکھ سکیں۔

مقررہ دن لڑکے کے والدین دولھا اور چند معمر رشتہ دار (جن کا کام شادیاں کروانا ہوتا ہے) لڑکی کے گھر رسمی طور پر جاتے ہیں۔ لڑکی کے گھر پر اس وقت جو تماشہ ہوتا ہے وہ عجیب اور قابل دید ہوتا ہے جو

ہندوستان میں بھی رائج نہیں - انڈونیشیا میں مکانات کے عموماً دو حصّے ہوتے ہیں - اگلا حصّہ دیوان خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور پچھلے حصّے میں زنانخانہ رہتا ہے - دولھا کے گھر سے جو قافلہ آتا ہے وہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے - دیوان خانے میں مردوں کو بٹھایا جاتا ہے اور خواتین گھر کے اندرونی حصے میں چلی جاتی ہیں - اب احتیاط یہ کی جاتی ہے کہ دولھا والے اپنی آمد کے مقصد کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہیں - اس کے برخلاف ہندوستان میں اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد جو کسی نہ کسی کی شادی سے متعلق ہوتی ہیں اپنا مدّعا خاص الفاظ و خاص طرز میں بیان کیا جاتا ہے - اس میں درمیان کے لوگ زیادہ حصّہ لیتے ہیں - لیکن انڈونیشیا میں دونوں طرف سے پوری کوشش کی جاتی ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ اس پارٹی کی آمد کا مقصد محض دوستانہ ہے - یہاں ایک قید یہ ہے کہ دولھا والوں کی تواضع صرف خاص چیزوں مثلاً "چائے"، کافی، سگریٹ اور سرپھ سے کی جاتی ہے - اس موقع پر کوئی دوسری چیز نہیں رکھی جا سکتی - تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد میزبان (دلھن کے والد) مرد مہمانوں کو عقبی زنانہ حصّے میں بلاتا ہے - یہ بڑا اہم وقت ہوتا ہے - اس لئے کہ اس وقت دُلھن کو فوراً لایا جاتا ہے اسی وجہ سے بیچاری کسی کو دیکھ نہیں سکتی - دُلھن عجیب کشمکش میں ہوتی ہے زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا اور نگاہیں نیچی رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے برخلاف سب کی نظریں اس غریب پر مرکوز رہتی ہیں - اسی وجہ سے بیچاری کچھ پریشان سی ہو جاتی ہے - دراصل اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لڑکی کو اچھی طرح دیکھ لیا جاتا ہے - بالخصوص شخصِ متعلق (دولھا) ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے - لڑکی سرپھ ڈالنے کے بعد ہی تیزی سے چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اس لڑکے پر نظر تک نہیں ڈال سکتی جو بہت ممکن ہے مستقبل میں اس کا شوہر بن جائے - اس کے بعد لڑکے والے اپنے گھر واپس ہو جاتے ہیں - اس آمد کو انڈونیشیائی زبان میں "نون ٹونی" کہا جاتا ہے جس کے معنی ایک نظر دیکھنے کے ہیں -

لڑکے والے واپس آنے کے بعد دل کھول کر لڑکی کے عیب و ہنر صورت اور سیرت بلکہ اس کی ہر چیز پر بحث کرتے ہیں - ستم ظریفی یہ کہ اس اہم و دلچسپ گفتگو میں بیچارے لڑکے کو حصّہ لینے کی اجازت نہیں ہوتی جس کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے - بلکہ لڑکے کے ساتھ صرف اتنی رعایت کی جاتی ہے کہ بعض اوقات کسی معاملے میں اس کی رائے دریافت کی جاتی ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے - اس طویل بحث میں جس میں کہ لڑکے کے خاندان کے بیشتر افراد حصّہ لیتے ہیں اگر رشتے کو منظور کر لیا جائے تو اس کے بعد ہی ایک رسمی خط لڑکی کے والدین کو بھجوایا جاتا ہے جس میں اپنے لڑکے سے اس لڑکی کی شادی کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے - یہ خط حرفِ آخر نہیں ہے بلکہ فیصلے کا اختیار لڑکی کے والدین کو ہوتا ہے اگر خواہش مان لی جائے تو پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ شادی کی تاریخ ٹھیرائی جائے - چونکہ روزِ عروسی اہم ترین ہوتا ہے اس لئے لمبے چوڑے عمل کئے جاتے ہیں اور بعد میں کوئی موزوں دن کا انتخاب کیا جاتا ہے (ہمارے یہاں بھی شادی کی تاریخ بڑی احتیاط سے مقرر کی جاتی ہے اس ضمن میں جوتشیوں سے مدد لی جاتی ہے)

انڈونیشیائی مسلمان عموماً ذی الحجہ میں شادی کرتے ہیں - یاد رہے کہ شادی کے لئے خاص مہینوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جس میں موسم کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا - رسمی خط کی قبولیت کے بعد عموماً پوری کوشش کی جاتی ہے کہ جلد از جلد شادی ہو جائے - مگر بعض اوقات چند رکاوٹیں پیش آتی ہیں - مثلاً لڑکی کے والدین فوری شادی کا انتظام نہ کر سکتے ہوں یا دلھن کی بڑی بہنیں غیر شادی شدہ ہوں - مؤخر الذکر صورت میں دوڑ دھوپ کر کے ان کا مسئلہ پہلے حل کر دیا جاتا ہے - اس کام کے باعث لڑکی کی شادی کچھ عرصے کے لئے ملتوی کی جاتی ہے -

شادی کے لئے دونوں جانب کامل رضامندی کے بعد ہند میں عموماً منگنی کی جاتی ہے انڈونیشیا میں بھی تقریباً یہی طریقہ رائج ہے دولھا کے والدین لڑکی کے گھر تحائف بھیجتے ہیں - عموماً زیادہ سے زیادہ تحائف بھجوائے جاتے ہیں تا کہ منگنی نہ ٹوٹنے پائے اس لئے کہ منگنی ٹوٹنے کی صورت میں جرمانہ وصول کیا جاتا ہے - تحائف کی کثرت منگنی کو مضبوط کرتی ہے - یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ لڑکی کے والدین اس کے دوگنے تحائف واپس کرنے کے قابل ہی نہ رہیں - تحائف لڑکے والوں کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں مالدار لوگ بڑے قیمتی تحائف بھجواتے ہیں اور دیگر لوگ حسبِ استطاعت لیکن رواج کے لحاظ سے تین چیزوں کا بھجوانا لازم ہے - سونے کی ایک

خاص نمونے کی انگوٹھی جس میں دو ہیرے یا دو قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں دوسرے فراک جسے "بیلک کیبی" کہا جاتا ہے اور تیسرے چولی ہوتی ہے متمول افراد ان کے علاوہ زیورات اور کئی کپڑے دیتے ہیں جن میں کئی فراک اور چولیاں شامل ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں علیحدہ رکھا جاتا ہے اس لئے کہ اہم رسمی تحائف تو مذکورہ بالا ہی ہیں۔ ان تحائف میں نہ صرف کپڑے زیورات بلکہ اشیائے خورد و نوش جن میں پھل بھی شامل ہیں بھیجے جا سکتے ہیں۔

شادی سے چند روز قبل دولھا والوں کی طرف سے مزید تحائف بھجوائے جاتے ہیں جیسا کہ ہندوستان میں بھی کیا جاتا ہے۔ شادی کی تیاریاں زوروں پہ ہوتی ہیں۔ دولھن کے گھر کو کافی سجایا جاتا ہے۔ کھلے حصے میں بانس گاڑے جاتے ہیں ان پر لکڑی کے تختوں کی چھت ڈالی جاتی ہے ناریل کے پتے بھی لگوائے جاتے ہیں۔ ان پتوں سے مکان کے سامنے کمانیں بھی بنائی جاتی ہیں جس سے شادی کے گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو ایسا ہی کرتے ہیں۔

نکاح کے دن دولھن کو علی الصباح بیدار کر کے غسل کروایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے شاندار لباس عروسی میں ملبوس ہوتی ہے۔ دولھن کو سنوارنے کا کام بڑا مشکل اور طویل ہوتا ہے۔ یہ کام ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو اس کام میں ماہر ہوتی ہے انجام دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی شادی شدہ خواتین ہوتی ہیں جن میں بیشتر دولھن کی رشتہ دار اور قریبی سہیلیاں ہوتی ہیں۔ دولھن کے بالوں کو کنگھی کرنے کے بعد انھیں سلیقے سے جمایا جاتا ہے۔ اس قدر محنت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولھن بہت ہی حسین، دلکش، اور جاذب نظر بنے۔ اس کے بعد دو چار عورتیں دولھن کو لے جاتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی تعداد چھ اور اس سے زیادہ بھی ہوتی ہے۔ ان خواتین کو جو سیاہ پوشاک میں ملبوس ہوتی ہیں انڈونیشیائی زبان میں "اسپو مینڈرش" کہا جاتا ہے۔ یہ خاص قسم کا سرپوش پہنے رہتی ہیں۔ دولھن کو کمرۂ عروسی میں لے جاتی ہیں جہاں اسے خوبصورتی سے سجائے ہوئے پلنگ پر بٹھایا جاتا ہے۔ اب دولھن کے لئے بہت ہی روح فرسا لمحات شروع ہو جاتے ہیں جبکہ نوشہ یہاں آتا ہے۔ دولھا کو بھی ایک ادھیڑ عمر کی عورت لاتی ہے جس کا تعلق دولھن والوں سے ہوتا ہے۔ جوں ہی دولھا گھر میں قدم رکھتا ہے خواتین زرد چاول پھینک کر اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔

(ہندوستان میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے) مگر جدت یہ ہے کہ دولھا کے پیر بھی دھلائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دولھا کو دالان میں لایا جاتا ہے اور ساتھ ہی دولھن کو بھی وہیں لاتے ہیں۔ دولھا و دولھن دونوں سے صدق دلی سے مل کر رہنے کا عہد کروایا جاتا ہے۔ یہ دونوں تاحیات مل کر رہنے کی قسم کھاتے ہیں اور اس وقت تک کہ جب تک موت انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کرے۔ جب تمام مذہبی رسوم ختم ہو جاتی ہیں تو دولھا دولھن ایک دوسرے کے بازو میں بیٹھتے ہیں۔ اس موقع پر انھیں عزیز و اقارب، دوستوں کی جانب سے مبارکباد دی جاتی ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد رسوم کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو زیادہ مزاحیہ اور امتیازی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ مثلاً دولھا، دولھن کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہے اور انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوتا ہے

جاوا کی شادی کی رسم و رواج میں دولھا کی آمد سے لے کر نکاح تک اختلاف نمایاں رہتا ہے۔ جاوا میں دلچسپ رواج یہ ہے کہ دولھا کا خیر مقدم خود دولھن کرتی ہے۔ نوشہ کی آمد کی خبر سن کر دولھن اپنے رشتہ داروں کے ساتھ گھر کے باہر آتی ہے تاکہ دولھا کا خیر مقدم کر سکے۔ یہاں دو میٹر کے فاصلے سے ایک دوسرے پر پھول اور سربند (پان) پھینکتے ہیں۔ اگر سربند دولھا سب سے پہلے پھینکے تو اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کا ازدواجی زندگی میں ایک اچھا محافظ ثابت ہوگا اور اگر اتفاق سے دولھن سبقت لے جائے تو بد شگونی سمجھی جاتی ہے اس کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ دولھا عملی زندگی میں زن مرید ثابت ہوگا۔ اس دلچسپ رسم کا سب سے مزاحیہ و قابل دید منظر وہ ہوتا ہے جب کہ دولھن والوں کی جانب سے پوری کوشش کی جاتی ہے کہ دولھن پہلے پان پھینکے۔

اس کے بعد دولھن کو ایک اور رسم انجام دینی پڑتی ہے۔ فرش پر ایک برتن میں پانی رکھا جاتا ہے جس میں ایک رکابی اور انڈا ہوتا ہے اس پر پان پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس برتن کے سامنے دولھا کھڑا ہوتا ہے اور دولھن اپنے گھٹنوں کے بل جھکتی ہے اور دولھا کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتی ہے۔ اس کو انڈونیشیائی زبان میں "سمبھا" کہا جاتا ہے۔ انڈے کو توڑنے اور ہاتھوں کے دھونے کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس کے بعد دولھن گھٹنے کے بل کھڑی ہوتی ہے۔ اب دولھن دولھا کو اپنے گھر لے جاتی ہے مذہبی رسومات اس دن بہ نسبت دیگر دنوں کے دوسرے مراسم کے ساتھ

انجام دی جاتی ہیں۔

انڈونیشیا کے مختلف حصّوں میں دولھن کا سنگھار مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ سماٹرا کی دولھن کا لباس ملایا کی دولھنوں سے مشابہ ہوتا ہے جاوڈ میں ہندو اثر نمایاں ہے۔ یہاں اختلاف نہ صرف کپڑوں بلکہ چہروں کے میک اپ اور پگڑیوں کو دیکھنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سماٹرا کی دولھنیں چولی پہنتی ہیں جس کے دو حصّے ہوتے ہیں نچلے حصے کو "کین" کہا جاتا ہے یہ چولی بلاؤز کی مانند ہوتی ہے جس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور یہ گھٹنے تک لمبی ہوتی ہے اس پر سبز تاگے سے نقش و نگار کیے جاتے ہیں۔ ایک برقعہ جسے انڈونیشیائی زبان میں "سلنڈ رنگ" کہا جاتا ہے شانوں پر ڈالا جاتا ہے۔ کین اور سلنڈ رنگ دونوں چولی کی طرح سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں ان پر خوب صورت نقش و نگار کیے جاتے ہیں۔ دولھن کے سر کو بہت ہی اہتمام سے سجایا جاتا ہے اسے انگوٹھیاں نکلس اور کنگن پہنائے جاتے ہیں گلے اور کلائی میں بھی زیورات پہنائے جاتے ہیں۔ جاوا کی دولھنیں ارغوانی رنگ کا جاکٹ پہنتی ہیں جسے انڈونیشیائی زبان میں "کبایا" کہا جاتا ہے۔ اس کے حاشیے پر سنہری نقش و نگار ہوتے ہیں نچلا حصّہ کین بھی منقش ہوتا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے اس پر پیٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ دولھن کو تین نکلس اور ایک سُنہری کمر پیٹی پہنائی جاتی ہے جس کا بک بڑا ہوتا ہے اور اس میں جواہرات اور قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ دولھن کے لمبے بالوں کو گوندھ کر چنبیلی کے پھول لٹکائے جاتے ہیں۔ سنہری کانٹوں اور حسین پھولوں سے سر ڈھک جاتا ہے سونے پر سہاگہ یہ کہ چنبیلی کے پھولوں کا بہترین ہار ڈالا جاتا ہے۔ شادی کی رسوم کے اختتام پر یہ پھول دولھن جو اب سینیئر بن جاتی ہے اپنی جونیئر سہیلیوں یعنی غیر شادی شدہ لڑکیوں کو دیتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ جو یہ پھول لگائیں گی ان کی شادی جلد ہو جانے گی (ہندوستان میں بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے)۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

لطائف السعادت مرتّبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون۔ قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ: نمبر ۳۹۱-۳ فٹ عیدگاہ میسور
تقطیع ۱۸×۲۲ ضخامت ۱۸۰ صفحے۔ کتاب مجلّد ہے لکھائی چھپائی اوسط

انشاء اللہ خاں کی مشہور تصنیف "لطائف السعادت" کو جس میں انشاء اللہ خاں نے نواب اودھ سعادت علی خاں کے لطیفے جمع کر دئے تھے، ایڈٹ کرکے مرتّب کرنا اور حواشی و تشریح کے ساتھ شائع کرنا ایک اچھی ادبی خدمت ہے۔ اس کے لئے محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون کو بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ ایسے کاموں کے لئے بڑی دقّتِ نظر اور جانکاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کتاب سے انشاء کے متعلق مشہور مصنّفوں اور نقّادوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں بھی دُور ہوتی ہیں، اور اُس زمانے کے مذاق، معاشرت اور تمدّن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے قبل محترمہ آمنہ خاتون کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تحقیقی نوادر" اہلِ علم سے داد وصول کر چکا ہے۔

آبِ حیات، جلوۂ خضر، تذکرۂ گلشنِ بے خار وغیرہ میں انشاء کے باب میں جو غلط بیانیاں تھیں ان کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے اور جہاں تردید کی ضرورت ہے، قابلِ قبول اسناد اور دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب دکن کا ایک علمی تحفہ ہے۔

ہندستانی سماجیات ڈاکٹر جعفر حسن پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی یہ نادر تصنیف انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ تقطیع ۱۸×۲۲ صفحات ۲۶۴۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ کتاب مجلّد ہے اور جلد پوش کی ہوئی بھی۔

کتاب بھارت کی سماجی زندگی کی ایک تاریخ اور اس پر ایک صالح تبصرہ ہے۔ مختلف بابوں کے عنوانات یہ ہیں۔

ہندوستان کی سماجی زندگی، سماجی روگیات، ہندوستان میں سماج سدھارانہ کوششیں اور تجویزیں، بیسویں صدی میں سماج سدھارانہ کوششیں، منظّم سماج سدھار، ہم زمانہ سماجی تحریکیں (یعنی بیسویں صدی کی سماجی تحریکیں)

کتاب کی زبان فنّی کتاب ہونے کے باوجود مشکل نہیں۔ گو بہت سے اچھے الفاظ جگہ جگہ وضع کئے گئے ہیں۔ وضع الفاظ میں یہ بات پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ الفاظ عام فہم ہوں۔ مثلاً شوہرپن، بیوی پن، روگیات، پچھیاوا وغیرہ۔ جیسا کہ موضوعِ کتاب اور عنوانات سے ظاہر ہے، یہ کتاب ہمارے ملک کے سماجی مسائل پر ایک بہت اچھا تبصرہ ہے۔ ملک میں سماج سدھار تحریکیں پہلے اور دوسرے پنج سالہ پلان کا حصّہ ہیں۔ ایسے موقع پر ایسی گراں قدر کتاب کا شائع ہونا ایک فالِ نیک ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

صاحب جی منٹو، ندیم، شوکت، جگر، فراق، عابد اور احسان، یہ ہیں وہ سات ستارے جو اس آسمانی کتاب میں معلّق ہیں۔ محمد طفیل یا طفیل صاحب صورت سے تو ادیب نظر نہیں آتے، سیرت سے اگر ادیب واقع ہوئے ہیں تو بھی یہ بات ایک حادثے سے کم نہیں۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ سات خاکوں والی یہ طنز و مزاح کی سند انھوں نے پیش کر دی ہے۔ کنھیا لال کپور نے حال ہی میں نقوش میں اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ طفیل نے شخصیات کا ایک اسکول قائم کیا ہے جس کا نصب العین ہے کہ

پرکھ کر یہ محبت جائیں گے ایسے کہاں کے ہیں

کتاب ۱۸×۲۲ کے ۲۰۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ فروغِ اردو لاہور

نبضِ حیات

ڈاکٹر شفا گوالیاری کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ کردار بھوپال۔

کوثر چاندپوری کا ایک طویل دیباچہ شامل کتاب ہے۔ کتاب میں کچھ غزلیں ہیں اور کچھ رباعیاں۔ شفا صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہنے والوں میں سے ہیں۔ ذہنی کشادگی کے بھی بڑے اچھے آثار اس کلام میں ملتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

شفا یہ انقلاب اک امتحاں ہے اہلِ الفت کا — ہمیں یہ دیکھنا ہے کون کس کے کام آتا ہے
جہاں زندگی کو شکستوں کا ڈر ہے — وہیں زندگی کو سہارے ملیں گے

کوئی غم ہو شفا فطرت کا اک انعام ہوتا ہے
کہ اس سے زندگی کے سارے امکاں جاگ اٹھتے ہیں

شفا بھوپال میں مقیم ہیں اور کچھ اس طرح کہ گوشۂ گم نامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن یہ گوشہ ہی اکثر اچھی تخلیقات کا موجب ہوا کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اکابر نے شفا کے کلام کو سراہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس مجموعے کے بعد شفا صاحب کی مسیحائی اور بھی بڑھ جائے گی۔

اقبال

از مجنوں گورکھپوری۔ شائع کردہ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ اقبال پر مجنوں کے منتشر خیالات پر مشتمل ہے۔ جیسے مجنوں نے اپنے قول کے مطابق مربوط کر دیا ہے۔ طلباء کو یہ منتشر خیالات لکھوائے تھے، بعد میں انھیں کچھ پھیلایا اور کچھ مربوط کیا اور چھاپ دیا یا چھپوا دیا۔ مقبولیت اس سے واضح ہے کہ یہ دوسری بار چھپ رہا ہے۔ مجنوں اردو ادب کے مطلق اور صاحب مطالعہ نقادوں میں ہیں۔ ان کا دم اور اسی لئے ان کی دم سازی بڑی غنیمت چیز ہے۔ خواہ دم سازی اقبال کی ہو یا فراق کی۔ مجنوں نے تناقضات کے باوجود اقبال کے کلام میں ایک صالح فکری صلاحیت دیکھی ہے۔ لیکن ان کی بالغ نظری ان چیزوں کو کس طرح چھوڑ سکتی تھی۔

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی — سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی
جو کہے گا اقتباس نہ زنگ خوں بہٹ گیا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

نغمہ ہندی ہے مرا لے تو حجازی ہے مری

بہرحال اس قسم کے لطیف نکتوں سے یہ رسالہ بھرا پڑا ہے، اور مطالعے کی چیز ہے۔

حسرت کی سیاسی زندگی

عبدالقوی صاحب دیسنوی کی یہ تصنیف حلقۂ احباب دیسنہ (پٹنہ) نے شائع کی ہے۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۱۲؍ حسرت کی زندگی پر یہ شعر صادق تر ہے۔

بہ کفے جامِ شریعت بہ کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

حسرت ہماری سماجی، سیاسی اور ادبی زندگی پر نصف صدی تک چھائے رہے۔ اس فقیر دلق پوش کی جوانمردی بے خوفی، سلامت روی اور خوش ذوقی کچھ ایسے جوہر تھے جو ایک جگہ جمع ہوتے تو نہیں، لیکن ان میں جمع ہو گئے تھے، اس کے باوجود حسرت ایک ایسا مرکب تھے جو سب کو پسند تو ضرور تھا، لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ انگریزی تسلط کے بڑے دشمن تھے انھوں نے بڑے مصائب برداشت کئے۔ نام و نمود، جاہ و منصب، دولت و اموال سے ہمیشہ کنارہ کشی کی، لیکن اضطرابِ ذہنی میں بھی مبتلا رہے۔ جس جماعت سے ذرا غیر مطمئن ہوئے اُسے چھوڑا اور بخیالِ خود دنیا خبط اختیار کر لیا۔ مگر ان کا احترام ہمہ گیر تھا۔ ایسے مردانِ جری بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اس رسالے میں مرحوم کے سیاسی خیالات اور زندگی کا مختصر ذکر ملتا ہے۔ مُرتّب نے کمال صفائی سے جیسے حسرت تھے ویسی ہی تصویر اُن کی سیاست کی کھینچ دی ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تھانیدار

یہ ایک بہت ہی دلچسپ کتاب لالہ امرناتھ ملہوترہ ایک سابق پولیس افسر کی تصنیف ہے ۲۴۲ صفحوں پر مشتمل اس طویل کتاب میں پولیس کی تحقیقات سے متعلق بڑے دلچسپ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور مصنف کا قول ہے کہ یہ سب واقعات حقیقی ہیں، فرضی نہیں۔ اس کتاب میں تھانیدار کے فرائض اور اس کی کامیابی کے لئے اچھے اصول بھی درج ہیں۔ کتاب کی افسانوی حیثیت سے کتاب دلچسپ بن گئی ہے۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ یونائیٹڈ ٹریڈرز۔ پرانی منڈی جموں (کشمیر)

موصولات

اردو کریما مع ضمیمہ الموسوم بہ رحیما از صبر رضوی مخدوم آبادی ۔ کریما فارسی کا یہ منظوم ترجمہ ہے ۔ قیمت دس آنے ۔ ملنے کا پتہ ۔ نسیم احمد مقام وڈاک خانہ شیخ پورہ ۔ ضلع مونگیر

آسٹریلیا کی جھلک ۔ از تاج یٰسین علی خاں ۔ ملنے کا پتہ ۔ الہدیٰ بک ایجنسی مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ ۔ حیدرآباد دکن ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے پیش لفظ نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر طبابت حیدرآباد دکن ۲۷۴ صفحات پر مشتمل سفرنامہ

ہم وحشی ہیں ۔ کرشن چندر کے ان افسانوں کا مجموعہ جو فسادات کے زمانے میں لکھے گئے ۔ چوتھی بار یہ مجموعہ طبع ہوا ہے ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ ۔ کتابی دنیا نظیر آباد لکھنؤ

ساز ینہ ۔ احمد عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ حسین و دلکش چھپا ہے قیمت ۳ ؍ ۔ ملنے کا پتہ ۔ آزاد کتاب گھر جمشید پور ۲

کہانی اور اس کا فن ۔ از مغنی تبسم ام ۔ اے ۔ قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ ۔ شعور پبلی کیشنز ۶۹۹ عثمان پورہ حیدرآباد دکن ۔ یہ کتاب یس انتونوف کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے ۔

دوشیزۂ مصر ۔ ناول از اشرف بھوپالی بی اے ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ ۔ مکتبۂ چنگاری دہلی

شبنم کے موتی ۔ ناول ۔ از حسین علوی ۔ قیمت ۲ روپے ۔ ملنے کا پتہ کتابی دنیا لکھنؤ ۔

رسالے

ماحول ۔ ۱۳ ، ۱۴ ۔ ظفر ادیب کی سخت جانی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ معاشی تنگیوں دنیاوی مصیبتوں اور اپنوں کی چیرہ دستیوں کے باوجود ماحول کے ذریعے زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر عبدالعلیم ، ممتاز حسین ، کرشن چندر ، صالحہ عابد حسین ۔ چندر کرن سون رکسا دیویندر ستیارتھی اور کتنے ہی نوجوان ادیبوں کے تخلیقات شامل ہیں ۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ چار آنے ۔ ملنے کا پتہ ۔ ماحول دو ماہی اردو بازار دہلی

ادارۂ ادبیات اردو ۔ ۱۹۵۰ء میں ۔ قیمت آٹھ آنے (حیدرآباد دکن)

شفق ۔ زیر سرپرستی مولانا ناطق گلاؤٹھوی ۔ ملنے کا پتہ ۔ منیجر شفق بڑھئی پورہ ناگپور

ادارہ

ملاحظات

حال ہی میں مدیر نے متعدد اہل قلم کی خدمت میں قلمی اعانت کے لئے فرداً فرداً درخواست کی تھی ۔ اردو کے نہایت سربرآوردہ ادیبوں نے جلد از جلد توجہ فرمانے کا وعدہ فرمالیا ہے ۔ چنانچہ مولانا نیاز فتح پوری ، ڈاکٹر سید عابد حسین ، سید مسعود حسن رضوی ، کرشن چندر ، سردار جعفری ، پروفیسر سید احتشام حسین ، پروفیسر سید اعجاز حسین ، اپندر ناتھ اشک ، کنہیا لال کپور ، شوکت تھانوی ، سید علی عباس حسینی ، سکندر علی وجد اور دیگر اہل قلم میں سے بعض نے تو اپنے نگارشات ارسال فرمادئے ہیں اور بعض نے جلد بھیج دینے کا وعدہ فرمالیا ہے ۔

اس ضمن میں ایک ضروری گزارش کرنا ہے نظمیں اور غزلیں بالخصوص اور مضامین بالعموم بغیر طلب بڑی تعداد میں موصول ہو رہے ہیں ۔ ان میں بہت سی چیزیں معیاری بھی ہوتی ہیں لیکن ان سب کو آج کل میں جگہ دینا تنگ داماںی کی وجہ سے ممکن نہیں ۔ بعض کرم فرما اچھی چیز واپس پہنچنے پر نا خوش بھی ہو جاتے ہیں لیکن ادارے کی بے بسی کا اندازہ نہیں کرپاتے ۔ اس لئے بصد ادب اہل قلم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ بے طلب مضامین یا نظمیں بھیجنے سے پہلے ادارے کی مشکلات کا اندازہ ضرور کرلیا کریں ۔

ہمارے پرانے کرم فرما ڈاکٹر محمد تاج الدین احمد جو اپنے نام کے ساتھ آرزو لکھنا پسند نہیں کرتے ، یورپ اور مشرق وسطیٰ کے سفر سے واپس علی گڑھ تشریف لے آئے ہیں ۔ آپ نے لندن اور دوسرے مقامات پر ریسرچ کا کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے ۔ آج کل پر ان کی نظر عنایت ہر حال میں رہی ہے ۔ چنانچہ وہاں سے بھی آپ نے متعدد مضامین اور تعاون آج کل کے لئے بھیجے ۔ آپ کے بخیریت وطن آجانے پر ادارہ ان کا خیر مقدم کرتا ہے ۔

آج کل کی توسیع اشاعت ہر بہی خواہ اردو کا فرض ہے ۔ اس کو دل چسپ بنانے میں اہتمام کیا جا رہا ہے ۔ اگست کا شمارہ موسیقی نمبر ہوگا ۔ قیمت ایک روپیہ ہوگی ۔ بہت سے اچھے مضامین مل گئے ہیں ۔ امید ہے یہ شمارہ اپنی مثال آپ ہوگا ضخامت بھی ۱۲۰ صفحے ہوگی اس لئے جو حضرات ابھی سے گاہک بن جائیں گے ان کو یہ شمارہ چندے ہی میں مل جائے گا ۔

گرمی آئی

پرشوتم لال ضیا

دھول اڑاتی گرمی آئی — آگ لگاتی گرمی آئی
اتنا گرم ہوگیا پانی — یاد آگئی سب کو نانی
آنے لگے ہیں خوب پسینے — مہنگے ہیں مٹکے مٹکینے
برف نے کتنی دھوم مچائی — برف کی ہے ہر سمت دہائی
آج بھی جو چائے پیتے ہیں — پتہ نہیں کیسے جیتے ہیں
لوگ ترستے ہیں بادل کو — آج نہیں تو اچھا کل کو
کپڑوں سے آتی ہے بدبو — بھاپ لگی ہے اٹھنے ہر سو
کھانوں پہ اڑتی ہے مکھی — بھوک نہیں اب لگتی اچھی

کتھا سناؤں کیا گرمی کی
آہ زباں جلتی ہے میری

نذیر رحمانی

ایشور چندر ودّیا ساگر

بچو! دنیا میں وہی لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور تاریخ میں بلند درجہ پاتے ہیں جو دوسروں کے لئے بھلائی نیکی اور ہمدردی کر جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی نے کیا اچھا شعر کہا ہے۔ ؎

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ۔ پیو، چلے جاؤ

ہاں تو سنو! بنگال کے بیرسنگھ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایشور چندر پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اپنے دیش میں نہ تو تعلیم و تربیت کی روشنی تھی اور نہ بجلی کی۔ نہ ریل موجود تھی نہ ہوائی جہاز۔ آمد و رفت کے ذرائع اتنے کم اور مختصر تھے کہ ایک صوبے کے لوگ دوسرے صوبوں کے باشندوں کو نہیں جانتے تھے۔ ایشور چندر بچپن سے جوان ہوئے اور جوانی سے بوڑھے ہو گئے اور پھر جب ان کی وفات ہوئی ہے اس وقت ہمارے دیش کی حالت بدل چکی تھی اور خاص کر بنگال میں ایشور چندر کی کوششوں اور قربانیوں نے لوگوں کے سامنے ترقی کے بڑے بڑے اصول قائم کر دئے تھے۔

ایشور چندر نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک پاٹ شالہ میں حاصل کی۔ ان کے استاد شری کالی کانت چیٹرجی ان کی ذہانت سوجھ بوجھ اور سمجھ داری کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ انھوں نے اپنے شاگرد کے باپ ٹھاکر داس بینرجی سے کہا کہ وہ اس ہونہار تیز اور ذہین لڑکے کو کلکتہ لے جا کر اعلیٰ تعلیم دلائیں نو سال کی عمر تھی۔ ایشور چندر اپنے والد کے ساتھ بیرسنگھ سے کلکتہ آ گئے۔ یہاں انھیں سنسکرت کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی ذہانت اور لیاقت کے وہ جوہر دکھائے کہ کالج کے تمام پروفیسر اور پرنسپل حیران رہ گئے وہ انتہائی شوق، دلچسپی اور لگن کے ساتھ پڑھتے لکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ وہ سالانہ امتحان میں اول درجے پر پاس ہوتے اور سرکار ان سے خوش ہو کر انھیں وظیفہ دیتی۔

پندرہ سال کی عمر میں سنسکرت زبان پر وہ اس طرح قادر ہو گئے تھے کہ اس کو اپنی بنگالی زبان کی طرح نہایت آسانی اور صفائی سے بول سکتے تھے۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اسی سنسکرت کالج سے انھیں ودّیا ساگر کا اعلیٰ خطاب دیا گیا اور اسی نام سے وہ آج تک ہندوستان کی تاریخ میں یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ عزت مرتبہ اور کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں جتنی محنت اور مشقت کرنا پڑی تھی اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت ہی

غریب اور معمولی آدمی کے بیٹے تھے۔ انھیں صرف دس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے ساتھ ان کے دو بھائی اور بھی رہتے تھے۔ اس ذرا سی آمدنی میں مشکل سے گھر کی گزر بسر ہوتی تھی، نوکر کی تنخواہ بچانے کے لئے ایشور چندر اپنے ہاتھ سے خود ہی روٹی ترکاری پکاتے تھے اور دوسرے کام بھی وہ خود ہی کر لیا کرتے تھے۔

جب انھوں نے کالج کی تعلیم ختم کر لی تو پھر وہ فورٹ ولیم کالج میں پچاس روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے اور وہیں انھوں نے بابو سریندر ناتھ بینرجی کے والد بابو درگا چرن بینرجی کی مدد سے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور اس میں بھی کافی مہارت حاصل کی۔ آخر انھوں نے ترقی کرتے کرتے اسی کالج کی پرنسپلی حاصل کر لی۔ اب انھوں نے اور بھی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کام کیا۔ حکومت نے انھیں تین چار ضلعوں کے دیہاتی مدرسوں کا انسپکٹر بھی مقرر کر دیا۔ اس طرح ان کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار ہو گئی۔

قدرت کو اب ان سے اور دوسرے علمی و ادبی اور قومی کام لینا منظور تھا۔ آپ نے سرکاری ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنا ایک پریس قائم کیا۔ اس میں سنسکرت کی کتابیں چھاپی جاتیں اور بہت کم قیمت میں فروخت ہوتیں تاکہ کتابیں زیادہ فروخت ہوں اور بہت سے لوگ انھیں پڑھیں انھوں نے بنگلہ زبان کی ترقی اور اشاعت کے لئے بنگالی میں بھی کتابیں چھاپیں۔ وہ کتابیں اتنی اچھی ثابت ہوئیں کہ سرکار نے انھیں اسکولوں کے نصاب میں داخل کر لیا۔ ان کتابوں کی آمدنی ایشور چندر ودیا ساگر کو پانچ ہزار روپے ماہوار ہونے لگی۔ لیکن تم کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ وہ یہ ساری آمدنی اپنے ہم وطنوں اور غریب آدمیوں کی خدمت بھلائی اور اصلاح میں صرف کر دیا کرتے تھے

ودیا ساگر نے لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسے بھی کھولنا شروع کر دئے۔ کلکتہ میں میٹرا پالی ٹن اسکول اور جو کالج ہے وہ انھوں نے ہی قائم کیا تھا۔ اس کالج کی ایک خصوصیت اور بھی تھی اور وہ یہ کہ اس کا کل انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی فیس معلوم ہے کیا تھی صرف تین روپے ماہوار۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ غریب سے غریب لوگ بھی آسانی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۶۵ء بہت مشہور ہے۔ اس سال بنگال میں ایک بہت بڑا قحط پڑا تھا۔ اس زمانے میں ایشور چندر کے مکان پر دس بارہ آدمی دن رات کھانا پکاتے رہتے تھے تاکہ کوئی ان کے دروازے سے بھوکا نہ جائے۔ ہزاروں آدمی ان کے گھر سے کھانا کھا کر جاتے تھے۔ اس کے علاوہ قحط اور مصیبت کے مارے لوگوں کو سیکڑوں روپے انھوں نے امداد کے طور پر تقسیم بھی کئے۔

۱۸۶۸ء میں بردوان ضلع میں ایک بہت ہی خطرناک قسم کا بخار پھیلا۔ ودیا ساگر بھلا کب پیچھے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنا ذاتی شفا خانہ قائم کیا اور اپنے ڈاکٹر کے ساتھ خود گاؤں گاؤں کا دورہ کیا۔ اور مفت دوائیں تقسیم کیں۔ دسہرہ کے تہوار پر ان کے مکان پر پانچ ہزار روپے سے زیادہ کی دھوتیاں غریبوں کو دی جاتی تھیں۔ کبھی جب وہ اپنے گاؤں یا کلکتہ میں جاتے تو سیکڑوں روپے لوگوں کو خیرات کر دیتے۔ ان کی خوبیاں اور اچھائیاں کہاں تک گنائی جائیں مختصر یہ کہ وہ اپنی قابلیت۔ رحمدلی اور فیاضی کی وجہ سے سارے بنگال میں مشہور ہو گئے۔ اب لوگ انھیں ودیا ساگر کے بجائے "دیا ساگر" کہنے لگے۔

ودیا ساگر بڑے رعب داب کے آدمی تھے۔ بڑے بڑے

سرکاری افسران سے ڈرتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ انھیں ودیا ساگر کا دردمند دل غریبوں کے افلاس اور مصیبت کو دیکھ کر موم کی طرح پگھل جاتا تھا۔ ان کا دل اتنا دکھا ہوا کمزور اور حساس تھا کہ وہ غریبوں اور ناداروں کو بُرے حالوں میں دیکھ کر بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتے تھے۔ وہ علمیت اور قابلیت اور دولت و شہرت کے اعتبار سے بہت بڑے آدمی تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہت سادی اور معمولی زندگی گزارتے تھے پاؤں میں سلیپر اور بدن پر صرف دھوتی اور چادر۔ مکان بھی بہت معمولی سا۔ بعض اوقات لوگوں کو ان کے پہچاننے میں بڑی مشکل ہو جاتی تھی

ستّر سال کی عمر میں ایسی نیک نام زندگی بسر کرنے کے بعد جولائی ۱۸۹۱ء میں ودیا ساگر نے اس دُنیا سے کوُچ کیا بچو! تم بھی کوشش کرو کہ ایسے ہی بڑے لوگوں کی طرح تمھاری ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اور لوگ تم کو ہمیشہ یاد رکھیں۔

لطیفے

میزبان (مہمان لڑکے سے) ہاں ہاں! کچھ سموسے اور کھالو۔

مہمان لڑکا۔ جناب اب تو پیٹ بھر چکا ہے

میزبان۔ تو کچھ جیب میں ڈال لو۔ راستے میں کھا لینا۔

مہمان لڑکا۔ جیبیں بھی پُر ہیں جناب۔

ایک مُفت خورے نے اپنے کسی دوست کو مٹھائی کھاتے دیکھ کر پوچھا۔ کیا کھا رہے ہو۔

اس نے آزردگی سے جواب دیا "زہر"

مفت خورے نے فوراً اپنا ہاتھ طشت میں ڈال دیا اور یہ کہہ کر کھانے لگ گیا کہ "تمھارے بعد ہمیں بھی جینا حرام ہے"۔

حکیم۔ میرا علاج کامیاب رہا۔ اب کوئی شکایت تو نہیں ہے۔

مریض۔ ابھی مجھے کچے انڈے اور باسی روٹیاں اچھی طرح ہضم نہیں ہوتیں۔

راجہ نواب

بچّہ اور تیتری

اک پیاری پیاری تیتری گلزار کی ننھّی پری
پھرتی ہے اِتراتی ہوئی اور ناچتی گاتی ہوئی
اِس پھُول پر بیٹھی کبھی۔ اُس پھُول پر بیٹھی کبھی

وہ پیاری پیاری تیتری

اک بچّہ پیارا پیارا سا ہے اس کے پیچھے دَوڑتا
وہ اس کے ہاتھ آتی نہیں جی اس کا بہلاتی نہیں
بیٹھی کبھی اور اُڑ گئی۔ آئی کبھی اور مُڑ گئی

وہ پیاری پیاری تیتری

کہتا ہے وہ اللہ میاں میں کیا کروں جاؤں کہاں
مجھ کو بنا دے پھُول تو دے پھُول سا رنگ اور بُو
پھُولوں میں میں پھُولا کروں اور شاخ پر جھُولا کروں
یا پاس آجائے مرے۔ آپ اُڑ کے ننھے پھُول سے

یہ پیاری پیاری تیتری

محمد حمید اللہ شریف

خود غرض دوست

ایک دفعہ زاہد، امر اور بکر ایک باغ میں گئے اور مزے سے آم توڑ کر کھانے لگے۔ دھوپ بہت سخت تھی۔ مالی ایک درخت کی چھاؤں میں چارپائی پر لیٹا باغ کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اس کی نظر ان تینوں دوستوں پر پڑی تو وہ سوچنے لگا۔ کہ انھیں کس طرح پکڑا جائے۔

آخر ایک ترکیب سوجھی وہ اٹھا اور ان کی طرف بڑھا جوں ہی تینوں دوستوں کی نظر اس پر پڑی وہ بھاگنے لگے۔ مالی نہایت اطمینان اور پیار سے للکارا اور کہنے لگا "بچو ڈرو نہیں تم تو ہمارے محلے کے بچے ہو آؤ اور مزے سے جی بھر کر آم کھاؤ"۔ یہ سن کر تینوں قریب آئے اور آم توڑنے لگے۔

مالی نے زاہد سے کہا۔ "تم ہمارے بچے کے ماسٹر کے لڑکے ہو خوب جی بھر کر آم کھاؤ"۔ اور امر سے بولا "تم وکیل صاحب کے بیٹے ہو اور وکیل صاحب نے میرا مقدمہ جیتنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس لئے تم بھی دل بھر کر آم کھا سکتے ہو۔ لیکن یہ لڑکا معلوم نہیں کس کا ہے اور اس کے والدین نے میری کوئی مدد نہیں کی۔ یہ کہتے ہوئے مالی نے بکر کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا "اس لئے میں اسے ضرور سزا دوں گا"۔ دونوں خود غرض دوستوں نے بکر کی کوئی پروا نہ کی اور کہا "ہاں ہاں اسے ضرور سزا دو۔ اور خوب مزے لے کر آم کھانے لگے۔ مالی بکر کو ایک درخت سے باندھ آیا اور امر کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ "تمہارے باپ نے فریق مخالف سے رشوت لے کر میرے مقدمے کا ناس مارا ہے اس کے بدلے میں تمھیں ضرور سزا دوں گا"۔ اس طرح امر کو ایک درخت سے باندھ دیا گیا۔

زاہد ان دونوں کی حالت دیکھ رہا تھا لیکن خود غرضی کی وجہ سے ان کی کوئی پروا نہ کی اور آم کھانے میں مصروف رہا۔ مالی امر کو باندھ آیا اور زاہد سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ زاہد پھولا نہ سمایا تھا۔ مالی نے موقع غنیمت جان کر زاہد کو پکڑ لیا اور جھاڑ سے باندھ کر تینوں دوستوں کی خوب مرمت کرنے کے بعد دھکے دے کر تینوں کو باغ سے نکال دیا۔ اس طرح مالی نے ہوشیاری سے کام لے کر تینوں دوستوں کو پکڑ لیا۔ اگر یہ خود غرض نہ ہوتے تو زاہد اور امر مل کر بکر کو چھڑا سکتے تھے۔

نصیحت:۔ جس طرح ہم کو کوئی حق نہیں کہ دولت پیدا کئے بغیر اسے خرچ کریں۔ اسی طرح ہم کو کوئی حق نہیں کہ دنیا میں خوشی کا اضافہ کئے بغیر خوشی کو تصرف میں لائیں۔

فاضل کاشمیری

ہَرُد — خزاں

اصل

رُتھفاہ گو ہَرُد ژاد

جسہ ہے! ژہٕ کیاہ ناو　　رُتھفاہ گو ہَرُد ژاد

سلاما - کمالا

گپالا - جمالا

کلین ہِن ہران چھوی　　نووی رنگ بھران چھوی

اڈین خوش کران چھوی　　اڈین یژ کھران چھوی

ژہٕ تے امتحان چھوی

رُتھفاہ گو ہَرُد ژاہ

یاوان یرد نمہٕ سردی　　کلین پھیر زردی

اڈیو تراو وردی

سرخ - لاجودی

زمین تو تہٕ رنگین　　پیس پتھ پھوک شین

ٹھک شین - ڈلک شین　　سٹھاہ ژٹ نکان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

رُتھفاہ گو ہَرُد ژاد

پھہ گریس دانہٕ ساران　　پھلس ڈیر کھاران

ہمیں لار ہبایس

یس کاٹھ داس

گامت چھہ انبار　　گام گام سرشار

بہ بم تہٕ رت یار　　بوڑہٕ تام جوان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

ترجمہ

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

ارے او بھائی کیا نام ہے تمہارا ؟

سلام بھیا - او کمال - ارے گوپال اور جمال - کیا پٹی باندھے چلے ہو - درختوں سے جھڑی لگی ہے .... کیا کیا رنگ بکھر رہے ہیں مست ہو رہے ہیں کچھ اور اس منظر سے کچھ پست تمہارا بھی امتحان لے رہی ہے فطرت ... بتاؤ تم مسرور ہو کہ مجبور ؟ اب جواب دینا ہی ہوگا - کیوں کہ تمہارا بھی امتحان ہے -

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

اب جاڑا آنے کو ہے ... (اس خیال سے) درخت زرد پڑ گئے لیکن ابھی ابھی کچھ اپنی وردیاں بدل رہے ہیں ... اور کچھ لال اور کچھ لاجوردی رنگوں میں جھوم رہے ہیں -

زمین اب رنگین مزاج ہے - شاید ماہ پوس کی برف کا انتظار ہے اسکو - برف اونچے اونچے پربتوں کی گودیوں میں پل کر جھیل ڈل میں انوکھی جھلکیاں پیش کر رہی ہے - آخر تمہارا بھی امتحان لے رہی ہے

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

دہقان اپنے کھیتوں سے دھان کے گٹھے اٹھا کر لا رہے ہیں اور غلّے کے ڈھیر کھڑے کر رہے ہیں -

ایک لار بیول اور دوسرے نے کاٹھ دور کی قسموں کے دھان کے انبار کر دئے ہیں - گاؤں کا گاؤں سرشار ہے - ہر چھوٹا بڑا بے غم اور ہلکا نظر آ رہا ہے - یہاں تک کہ گاؤں کا ہر پیر مرد جوان نسال دکھائی دے رہا ہے

آخر تمہارا بھی امتحان ہے

اصل

رُتھاہ گوہُرد زاد

زریو تام شُنز کر   وندک پوٗرہ سنز کر

ژیٖوٹے جمع کر

جیو تے جمع کر

ژہ دامانہ خالی   ژہ چھوی بانہ خالی

ژہ چھوک پانہ خالی   پکان زمستان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

رُتھاہ گوہُرد زاد

دسہرک چھہ ایام   خوش خاص تے عام

دیوت جلوہ رامن

شہرن تہ گامن

ہیوند۔ سکھ۔ مسلمان   بنہ ساری یکساں

"ہے ایس چھہ انسان"   پرکھ کمنہ دنان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

رُتھاہ گو ہرد زاد

یہ سونتھاہ بہارہ   چھوزن لوکہ چارہ

چھو شرادن جوانی

نہ چانی یہ میہانی

ہر دتے خزانہ   چھو بجرک زمانہ

پتس اکہ بہانہ   یہ دنیا کران چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

رُتھاہ گو ہُرد زاد

یلہ میہانہ دہراڑ   بس روزہ کمنہ راتھ

اوہ تا پہ یارہ

دت میاں یارو

تراوت یہ گلشن   کوہ چشمہ تے دن

ژُل رتھ دیہ زن   عجیب آسمان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

ترجمہ

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

چڑیاں تک تیاریوں میں لگی ہیں - جاڑے سے نپٹنے کی
تیاریوں میں چیونٹیوں نے بھی انبار لگائے ... باقی سب
ذخیرہ اندوز ہو گئے ہیں - ایک تو ہی ہے جس کی جھولی بھی
خالی ہے اور خالی ظرف بھی - اتنا ہی نہیں بلکہ تو سراپا
خالی ہے - نہیں سمجھتے ہو؟ .... جاڑا آ رہا ہے - جاڑا
تمھیں بھی اس امتحان میں بیٹھنا ہوگا -

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

دسہرے کے ایام ہیں - ہر خاص و عام خوش ہیں
رام چندر جی مہاراج نے یہاں ہر جگہ شہروں
اور گاؤں میں درشن دئے ہیں - اس لئے یہاں ہر ایک
ہندو - ہر ایک سکھ اور ہر ایک مسلمان بھائی بھائی
ہونے کا گیت گا رہا ہے - اور صحیح معنوں میں انسان ہونے
کا اعلان کر رہا ہے - اس میں آخر تمھارا بھی امتحان ہے -

مہینہ بھر سے آمد ہے خزاں کی

موسم بہار! یا موسم بہار ... دل نشین اور رنگین بہار - یہ بچپن کی سی
حسین بہار ہے ... بہار یا بچپن بچپن یا بہار ... پھر ... ساون کے
دن - گویا دیوانی جوانی کے دن - یہ دن نہ تیرے ہیں اور نہ میرے - پت جھڑ
یا خزاں ... پیری ہے پیری اور بس یہ دنیا جس کیا کھلونے دے کر
بہلا رہی ہے - کھلونے سمجھو یا تقدیر کے رنگ میں رنگی ہوئی ... آخر
میں ایک بہانہ کرکے ہمیں رخصت کر دیتی ہے! پھر تمھارا بھی امتحان ہے

ایک مہینہ ہوا خزاں آئے ہوئے

جب ماہ ساون کی صرف چند راتیں باقی رہ گئیں تو یہاں کے
فصلی بٹیروں نے میرے ساتھ سرد مہری دکھائی ....
اور یہ گلشن - کوہسار - چشمے اور جنگلات

چھوڑ کر

یہاں سے اس طرح چلے گئے گویا وہ جانتے نہیں تھے کہ
یہ ان کی زود آسمان کی قدیم خو ہے - اس میں تمھارا بھی امتحان ہے

اصل

رشتقاہ گو ہُرُد ژاد

رہیہ سونتہ یہی یلور یم چل تہ کستور

کری نغمہ خوانی

وڈن آسمانی

بناون یہ گلشن برابر ارم ژن

امی برانژ توشن یہ میون گلستان چھوی

ژہ تے امتحان چھوی

ترجمہ

ایک مہینہ ہوا خزاں آئے ہوئے

آنے والی بہار میں پھر لوٹ آئینگے یہ جنڈول اور کستور

اور آکر سب نغمہ خوانی کریں گے

ہوا پر پر پھیلائے اڑیں گے

اور اس گلشن کو رشک جنّت بنائیں گے ۔ اس

امید پر یہ میرا گلستاں نازاں و شاداں ہے ۔

تمھارا بھی امتحان ہے

دھنیش ملک

کیا آپ جانتے ہیں

۱ ۔ سانپ کے کان نہیں ہوتے اور وہ مداری کی بین بالکل نہیں سُن سکتا ۔ اسے تو مداری صرف آپ ہی کو خوش کرنے کے لئے بجاتا ہے

۲ ۔ بیل لال رنگ نہیں دیکھ سکتا ۔

۳ ۔ زرافہ (جو کہ ایک لمبی گردن والا چوپایا ہے) اونٹ کی طرح ہفتوں بنا پانی پئے زندہ رہ سکتا ہے جس گھاس کی وہ جُگالی کرتا ہے اس میں سے پانی کھینچتا رہتا ہے ۔

۴ ۔ کئی قسم کی بھیڑیں بھی ایسی ہوتی ہیں ۔ جو کبھی کبھار ہی پانی پیتی ہیں ۔

۵ ۔ کنکھجورے کے ۱۰۰ پیر نہیں ہوتے ۔ اس کے تو ۲۱ ۔ ۳۰ یا ۲۰۰ پیر ہوتے ہیں ۔

۶ ۔ ہم چوہوں کا بولنا نہیں سُن سکتے ۔ ہم تو صرف چوں چوں کی بولی سُن سکتے ہیں ۔ جسے کئی لوگ چوہے کی بولی سمجھ بیٹھتے ہیں

۷ ۔ کسی کیڑے مکوڑے کی چھ سے زیادہ ٹانگیں نہیں ہوتیں ۔

۸ ۔ کسی کیڑے مکوڑے کے جسم میں خون نہیں ہوتا ۔ ان کے جسم میں تو ایک سفید رنگ کی سیّال شے ہوتی ہے جو خون کا کام کرتی ہے ۔

۹ ۔ دُنیا کا سب سے بڑا پرندہ شتر مُرغ ہے ۔ اس کا قد قریب ۸ فٹ اور وزن ۳۰۰ پاؤنڈ ہوتا ہے ۔ یعنی قد میں یہ عام آدمی سے لمبا ہوتا ہے ۔

۱۰ ۔ دُنیا کے سب سے چھوٹے پرندے کا نام "کیوبن" ۔ اسے "گانے والی پری" بھی کہتے ہیں ۔ اس کے ایک پر کی لمبائی ایک انچ اور اس کی کل لمبائی سوا دو انچ کے قریب ہوتی ہے ۔ یہ پھولوں کا رس تو پیتا ہی ہے لیکن چھوٹی چھوٹی مکھیاں اور مکڑیاں بھی کھاتا ہے آپ مانیں یا نہ مانیں یہ ایک سیکنڈ میں ۷۵ بار پر مارتا ہے ۔ سب حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ یعنی شتر مُرغ ۵۰ فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے تو دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ ۵۰ فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ سکتا ہے ۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ شتر مُرغ تو اڑ نہیں سکتا لیکن دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ نہ صرف آگے کی طرف اڑ سکتا ہے بلکہ پیچھے کی طرف بھی اُڑ سکتا ہے (جیسے کہ ریل کا انجن یا موٹر راستہ بدلتے وقت پیچھے کی طرف چل سکتی ہے) دیکھا گیا ہے کہ یہ پرندہ پھولوں سے رس چوستے وقت اپنے پر مارتا رہتا ہے رس پی کر بنا پیٹھ موڑے ہی پیچھے کی طرف اڑ جاتا ہے کیونکہ یہ پر اُلٹا کر بھی اُڑ سکتا ہے ۔

۱۱ ۔ زندگی کا اچھا سہارا ؟ مخلص دوست ۔

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اسی ملازمت اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اسی سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

اس شمارے کے چند لکھنے والے

جگر مرادآبادی	فراق گورکھپوری
کنھیالال کپور	امتیاز علی عرشی
ڈاکٹر محمد حسن	قاضی عبدالغفار

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اردو کی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت ہندستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دلچسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلندپایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پہ چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسین

"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خدوخال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسین

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

اُردو کا مقبولِ عوام معتبر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر — بال مکند عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر — مظفّر شاہ

جلد ۱۴ — نمبر ۱۲

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- دو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں - آٹھ آنے
پاکستان میں - آٹھ آنے (پاک)

جولائی ۱۹۵۶ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

سرورق:- برسات

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ادارہ

مُلاحظات

قاضی عبدالغفار مرحوم کے بعد پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب کا انجمن ترقی اُردو کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے باقاعدہ اور مستقل تقرر ہو گیا ہے۔ انجمن اور اُردو دوستوں کے لئے یہ ایک فالِ نیک ہے۔ انجمن کے بہت سے کام جو قاضی صاحب مرحوم کی مُسلسل ناسازیِ طبع کی بنا پر ادھورے پڑے تھے اب پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں اور انجمن میں اب سرگرمی اور حرارت نظر آ رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نئے انتظامات کے تحت انجمن ملک کی صحیح ادبی اور علمی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے گی۔

ایک دو کے سوا اُردو کا کوئی اچھا پبلشر اس ملک میں نظر نہیں آتا۔ اُردو لغات نا پید ہے اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نور اللغات، فرہنگِ آصفیہ، جامع اللغات اور انگریزی اردو، انگریزی فارسی، اُردو ہندی اور متعلقہ لغت کی امداد سے اُردو کا ایک جامع لغت مرتب کیا جائے۔ اگر یہ کام اس زمانے میں مشکل نظر آئے تو کم سے کم نور اللغات کو دوبارہ شائع کرنے کا انتظام تو ہو جانا چاہیئے۔ یہ کام مکتبۂ جامعہ یا انجمن کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ علمی طبقے اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

اُردو کے علمی اور ادبی رسالوں کی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ انھیں زندہ رہنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ نگار، معارف، برہان، نوائے ادب ایسے علمی رسالے ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی ہونا چاہیئے تاکہ سال ہا سال سے جو صالح اور مفید ادب یہ رسالے شائع کر رہے ہیں اس کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

۲۴ - مئی ۱۹۵۶ء کو ہندوستان میں بُدھ کے نروان کا ڈھائی ہزار سالہ سال منایا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی اپنی تقریروں میں مہاتما بدھ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مہاتما بُدھ واقعی ہندوستان کے سب سے بڑے فرزندوں میں سے ہیں۔ اُنھوں نے مصیبت اور دُکھ میں گھری ہوئی انسانیت کو شانتی اور سُکھ کا پیغام دیا تھا۔ اور وہ پیغام اتنا مؤثر تھا کہ آج بھی دنیا کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصّہ بُدھ کا پیرو ہے۔ بُدھ کے ایک سچے بھگت اشوک نے ہندوستان کو سب سے پہلے یک جہتی، اتحاد اور شانتی کی نعمتیں دی تھیں۔ ہندوستان نے یہ دن منا کر ساری دنیا کو امن اور شانتی کا پیغام دیا ہے۔ بالخصوص اس دور میں جب کہ جنگ و جدل سے گھبرائی ہوئی انسانیت اور ہوس و اقتدار کے بھوکے ممالک فوجی معاہدوں میں مصروف ہیں۔

"آج کل" کے ناظرین نے پچھلے چند شماروں کے باب میں بہت اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ترقی کی یہ رفتار صرف ادارے ہی کی طرف سے جاری نہیں رہے گی بلکہ خریدار بھی بڑھتے رہیں گے۔ ہندوستان کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اپنا دستِ تعاون بڑھایا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے افکار سے زیادہ سے زیادہ اہلِ علم کو بہرہ اندوز ہونا چاہیئے۔ ع

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

اس شمارے میں دو جگہ آپ کو سال نامے کی تفصیلات ملیں گی۔ اس سال نامے کی تیاری میں بڑی محنت کرنا پڑی ہے اور ادارہ ابھی ہفت خواں طے کر رہا ہے۔ تاکہ یہ محنت ناظرین کو پسند آئے۔ اہلِ فن سے بہت ہی اچھے مضامین موصول ہو چکے ہیں فنِ موسیقی پر یہ عجیب و غریب گلدستہ مستقل گاہکوں کو چندے ہی میں ملے گا۔ قیمت اس کی ایک روپیہ ہوگی۔

فراق گورکھپوری

غزل

گیسوئے مشکیں میں پل پر پل جو خود ظلمات کھائے
پیکرِ رنگیں میں صبحِ نو بہاراں لہلہائے

نرگسِ چالاک میں چنچل کرن سی مسکرائے
گیسوئے نمناک آپی آپ جیسے مُسکرائے

بات گویا سازِ بادِ صبح کلیوں کو جگائے
چال موجِ بادۂ سرجوش جیسے لڑکھڑائے

ایک پل بھر کو بھی کمھلائیں نہ پیشانی کے پھول
ہاں شگفتہ خاطری کو تیری آنچ آنے نہ پائے

تیری رعنائی کا اس دم کچھ تصوّر ہو سکے
جب جبینِ چرخ پر صرف اک ستارہ جگمگائے

آہ ایسے میں تری باتوں کے امرت کی پھوار
آبشاروں کو بھی وقتِ نیم شب جب نیند آئے

شوخی و سنجیدگی کا ایک ہونا دیکھ لے
جب دہن کی پنکھڑی بے مسکرائے مسکرائے

الاماں یہ بے پناہ اقرارِ اُلفت حسن کا
یہ تری چشمِ کرم اس طرح قسمیں تو نہ کھائے

داستاں در داستاں ہے داستانِ حُسنِ یار
لیکن ایسی جو بیاں ہو کر بیاں ہونے نہ پائے

پھر کہیں کا بھی نہیں رہتا جہاں میں آدمی
کھائے ہر دھوکا مگر اس آنکھ کا دھوکا نہ کھائے

بے نیازی کو تری کچھ اور کر دیں بے نیاز
گر کبھی شرطِ وفا ہے عشق میں تو یاد آئے

سوچ لے عقدہ کشائی اس نگاہِ نرم کی
ہر کلی کو صبح کی پہلی کرن جب گدگدائے

دیکھتا ہے لاگ نظروں سے مجھے ہر بزم میں
"ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے"

دیکھتے ہیں رند صف در صف تماشائے بہار
میکدہ کی خاکِ تر سے ساقیا شعلے اُگ آئے

انتشارِ عشق ہے کہ وہ جانستاں لمحات جب
بدحواسی بھی ہو طاری ہوش بھی کھویا نہ جائے

مختصر ہوتی ہیں یادیں گردشِ آفاق میں
ہاں سناؤ داستانِ عشق اگر کچھ یاد آئے

عمر تو وہ ہے جو شغلِ صبح دھڑکوں میں کٹے
زندگی وہ ہے جو بزمِ زیست کو مشعل دکھائے

پل رہا ہے بطنِ مستقبل میں یوں کچھ انقلاب
وقت کے سینے میں جیسے ایک لَو سی تھرتھرائے

یادِ جاناں کی بھی قسمت میں دوام اسے دل کہاں
جیسے مژگانِ سحر پہ ایک تارا جھلملائے

بڑھ گئی کچھ اور رہنے سے فضا کی تیرگی
اشک تو وہ جو حریمِ ہجر میں شمعیں جلائے

اک اکھاڑا بن گئی ہے ان دنوں بزمِ سخن
شاعرِ رنگیں نوا اب کیا سنے اور کیا سُنائے

عشق ایسے سے ہُوا، کیا کیجئے اب اے فراق
جس کو کھو کے جاں بلب ہو جس کو پا کے جی بھر آئے

محمد حسن

غالب کے چند اہم نقّاد

غالب کے نقّادوں میں سب سے پہلا نام تو غالب ہی کا ہے جس نے بڑی بے دردی سے اپنے ضخیم دیوان کو چند مختصر اوراق میں منتخب اور محدود کر دیا۔ یہ وہ غالب ہے جس نے دوسروں کے لئے بارہا "ایسے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور" کی دعائیں کی ہیں، اور جس کے تنقیدی شعور نے ایک نقطے پر ٹھہرنے کی بجائے کبھی "رنگ بیدل میں ریختہ لکھنے" ہی کو "قیامت" ثابت کیا تو کبھی اس قیامت زائی سے آگے بڑھ کر سادگی اور پرکاری کے وہ انداز اختیار کئے جو "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ یہی تنقیدی شعور غالب کی وہ دوسری شخصیت، جو تنقیدی شعور رکھنے والے غالب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی تخیل سے معرکوں میں، کبھی عرفی اور ظہوری کے اشعار کی ثنا کرنے میں اور کبھی آتش و ناسخ کے کلام میں "ورائے شاعری چیزے دیگر است" کی تلاش میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اگر تنقید و تخلیق کی ان دو دنیاؤں کو یکجا کیا جائے اور نقّاد غالب کے تنقیدی شعور کی روشنی میں شاعر غالب کے کلام، انتخاب کلام اور معیار شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں شخصیتوں کی یہ ملاقات مفید ہوگی۔ نقّاد غالب وہ ہے جو تخیل سے دست و گریباں ہوتا ہے جو خسرو کے سوا ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے ذوق پر ایمان نہیں لاتا (یہ اور بات ہے کہ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) اور مومن اور ذوق کے اچھے اشعار پر جھوم کر اپنا سارا دیوان ایک شعر پر نثار کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ خود اپنے دیوان کے معتد بہ حصے پر خط نسخ کھینچ دیتا ہے شاعر غالب وہ ہے جو مذاق شعر کا اس درجہ قدر دان ہے کہ شیفتہ کی داد اس کے لئے حاصل کلام ہے اور صہبائی اور فضل حق کا علم و فضل اس کے نزدیک مسلّم۔

شیفتہ غالب کے پہلے نقّاد ہیں جن کا شعری شعور غالب کے تخلیقی عمل میں بھی کسی حد تک کارفرما نظر آتا ہے۔ شیفتہ ہماری تنقید میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو سوقیانہ اور مبتذل قرار دینے پر بدنام ہوئے ہیں لیکن اس ایک بات ہی سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ "طریقۂ راسخۂ قدما" کے پابند ہیں، اور ان کا مذاق ثقات کا مذاق ہے جس میں روایت کا رچاؤ اور کلاسیکی نظم و ضبط کا شدید احساس ہے، وہ جدت اور تخیل کو صرف اس حد تک پسند کر سکتے ہیں جہاں تک وہ روایت کے قوس قزح کے باقی رنگوں سے ہم آہنگ ہو، وہ صرف متوازن لہجے اور معتدل رنگوں کے رسیا ہیں، شوخی اور بے باکی اُن کے ہاں روا نہیں۔

شیفتہ دور گذشتہ کی صدا و سط کے نمایندہ ہیں، ان کا مذاق شعر نہ صرف فارسی علم و ادب کی روایات کا پروردہ ہے بلکہ وہ مشرقی تنقید کے سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوئے اصول و ضوابط کے پاسبان بھی ہیں۔ شیفتہ نے غالب کے لئے اعلیٰ توصیفی کلمات استعمال کئے ہیں شیفتہ کی تعریف اس بنا پر حیرت ناک ہو تو ہو، کہ وہ ناقدر دانی کے دور میں غالب کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے قطعاً حیرت انگیز نہیں ہے کہ وہ غالب میں بھی عہد قدیم کی اعلیٰ ترین شاعری کی بنیادی خصوصیات تلاش کرتے ہیں اور غالب کو اسی معیار پر پرکھ کر ظہوری، خاقانی، حافظ اور نظیری کے پہلو بہ پہلو لا بٹھاتے ہیں۔

اس طرح شیفتہ غالب کے نقّاد نہیں کہے جا سکتے، ہاں وہ غالب کے دور کے نقّاد ضرور ہیں، اور غالباً اس دور کے مذاق سخن کے پاسبان بھی۔ غالبیات کی باقاعدہ ابتدا تو "یادگار غالب" ہی سے ہوتی ہے۔ حالی کی "یادگار غالب" معذرت سے شروع ہوتی ہے۔

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری

اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مرزا کی لائف ..... ان فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات سے اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو، لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو۔"

حالی سے اردو میں نئے تنقیدی شعور کی داغ بیل پڑی۔ حالی ہی نے باشعور طریقے پر اس بات کا اعتراف کیا کہ "خیال بغیر مادے کے پیدا نہیں ہوتا" اور اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے ادب اور شعر کی کیفیات اور خیالات کی بنیادیں سماجی زندگی کے رابطے میں تلاش کیں، پھر اسی دور میں جب پرانی بساط تہ ہو چکی تھی اور مغربی علوم سے وابستگی کی مدد سے نئے راستے کھل رہے تھے۔ نئی اصلاحی تحریکیں، تعلیمی اور معاشرتی قطع و برید کے محرکات رواج پا رہے تھے۔ حالی اور ان کے ساتھیوں نے نیچرل شاعری کی آواز بلند کی اور اپنی نئی مقصدیت اور مغرب کی اصلاح پسندی کے جوش میں ادب سے بھی اخلاقی تقاضے کئے۔

لہٰذا حالی کے سامنے غالب پر تنقید کا سوال بھی اسی شکل میں آتا ہے۔ کیا غالب کے کلام میں اخلاقی مضامین کی کثرت پائی جاتی ہے؟ کیا غالب کا کلام قوم کی اخلاقی اصلاح کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیا اُن کے اشعار نیچرل شاعری کے اس معیار پر پورے اتر سکتے ہیں جسے ملٹن کے الفاظ میں مولانا حالی نے "اصلیت، سادگی اور جوش" کی شکل میں ظاہر کیا تھا؟

مولانا نے غالب کے کلام میں اس "جدتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات" کا عکس دیکھا، جسے وہ متقدمین کی "نیچرل" شاعری کا خاصہ قرار دیتے آئے تھے۔ حالی لکھتے ہیں۔

"میر و سودا اور ان کے متقدمین کے کلام میں ایک قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں، اور اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے کلام میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔"

اس نئی طرز کے بارے میں خود ان کا یہ کہنا ہے کہ "نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو مجبور نہیں کرتیں" اور اسی بنا پر نئی طرز جو فارسی میں چار سو سال بعد ظہور میں آئی تھی، ریختے میں پچیس سال کے اندر اندر پیدا ہو گئی، اور مومن، شیفتہ، مالک، عارف، تسکین اور داغ نے اسے رواج دیا۔ لیکن جو سوال حالی کے عہد سے لے کر آج تک کے نقادوں کو الجھن میں ڈالتا رہا ہے وہ یہ ہے کہ آخر اس "جدتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات" کی نئی طرز کو جنم دینے والے ادبی اور عمرانی عناصر کیا تھے؟

حالی خیال پر مادے کی اوّلیت کے قائل ہیں، اور قائل ہوتے ہوئے بھی مرزا کے خیالات کے انوکھے پن، ان کی شوخی اور ظرافت، ان کے استعارات اور کنائے کے چونکا دینے کی حد تک والہانہ پن اور ان کے ذہنی اشعار ہی کے تذکرے پر اپنی تنقید ختم کر دیتے ہیں، انھیں دہلی کی آخری بہار کے لٹ جانے کا دل دوز احساس ہے۔ اور وہ اس جلوۂ آخریں کی یادگار بستیوں کی جیتی جاگتی تصویروں کو محفوظ کر لینے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ لیکن حالی کی نظر اس نئی فکر کو پیدا کرنے والے عناصر کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ غالب کے ہاں ایک نیا لہجہ اور انوکھا پن تو دریافت کر لیتے ہیں لیکن اس نئے موڑ کے سماجی عوامل تک پہنچنا ان کی دسترس میں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حالی کی کھینچی ہوئی تصویر غالب کے ذہنی پس منظر

کو تقریباً نظر انداز کر دیتی ہے ان کے سوانح اور علمی اور ادبی مشاغل کے بیان کے باوجود حالی، غالب کو سماجی پس منظر میں نہیں دیکھتے، وہ کہیں تقابلی تنقید کی مدد سے انھیں ظہوری، حافظ اور نظیری کے مقابل لا بٹھاتے ہیں، اور کبھی ان کے اشعار کو تصوّف، عاشقانہ اور اخلاق کے عنوانوں میں تقسیم کر کے ان میں مشرقی تہذیب کے نظامِ اقدار کی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میر نے اپنے عہد کے مذاق سے اپنی طرز کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

حالی نے یہی استفہامیہ غالب کے کلام کے بارے میں قائم کیا، انھوں نے غالب کے نغموں میں ایک نئی صوت اور نئے آہنگ کا پتہ لگایا۔ اس صوت و نغمہ کی انوکھی دلکشی کے مختلف عناصر گنوانے کی بھی کوشش کی، لیکن آخر غالب کے نغمے ہیں یہ تبدیلی، صوت و آہنگ کا یہ اختلاف آخر کیوں پیدا ہوا اور اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں ملتا۔

حالی کے بعد آزاد کے تبصرے کا ذکر عجیب بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے آزاد کا تبصرہ "یادگارِ غالب" سے پہلے آتا ہے، لیکن اہمیت کے اعتبار سے اس کا ذکر بعد میں ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو مرزا کے کلام میں "معنی آفرینی اور نازک خیالی" کی وہ خصوصیات کی تلاش زیادہ اہم نہیں، پھر بھی آزاد کا یہ فیصلہ کہ "غالب نے آتے ہی ایک چوب دورسے نقارے پر ماری کہ کچھ سمجھے اور کچھ نہ سمجھے۔ مگر سب کے منہ سے بے اختیار واہ نکل گئی" گویا غالب کے دور کے مذاقِ سخن کی غمازی کرتا ہے، جب جدّت طرازی کو قدامت نے شرفِ قبول نہ بخشا تھا، اور مرزا کا بانکپن اور بیدل پرستی طعن و تشنیع کا مورد بنی ہوئی تھی۔

زمانے کا مذاق بدلا اور اس تبدیلی کی پیش گوئی مولانا حالی و آزاد دونوں ہی کرتے آئے تھے۔ مغربی ادبیات کے مطالعے نے پہلے ذہنوں کو خیرہ کیا تھا، لیکن عرصے بعد مغرب کے معیاروں سے اخذ و دلنوازی کرنے کے بعد اپنے سرمائے پر بھی نظریں ڈالی جانے لگیں۔ کچھ اصلاح

کچھ جوش کی وجہ سے اور کچھ مغرب کے تصوّر کو محض دکٹوریَن عہد کے اخلاق پرست انگلستان کی معاشرت تک محدود سمجھنے کی وجہ سے جو افراط و تفریط کا سماں پیدا ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ دوسرے راستوں میں ڈھلنے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے فکری اور تنقیدی سانچے بدل رہے تھے، اب ہمارے نزدیک کمال کا معیار نظیری اور حافظ کے مقابلے پر نہ تھا، بلکہ اس عالم گیر "فلسفیانہ" میزان پر تولنے پر تھا جو مغرب اور مشرق کے علم کو کسی حد تک ایک ہی سلسلے میں پروتی تھی۔ مغرب کی روشنی اور حرارت کے ساتھ مشرق کی مابعد الطبیعات اور داخلیت نے مل جل کر ایک نور دماغی انداز نظر کو رواج دیا تھا جس میں احساس جمال ہی سب کچھ تھا اور خیال اور کیفیت کی پرچھائیاں ہی دراصل ان کی بنیادی خصوصیات تھیں۔

حالی کے اندیشوں کے خلاف غالب کا کلام امتدادِ زمانہ سے مٹنے کی بجائے ایک ایسے نقش کی طرح ابھرا جو واقعی "لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہ تھا"۔ نئی نسل نے غالب کے کلام میں نظیری، حافظ اور ظہوری کی استادانہ کاریگری کا عکس دیکھنے کی بجائے ان میں نئے علوم اور فلسفوں کا پرتو دیکھا۔ ان اشعار میں نئی نسل کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی تھی غالب کو اس آنے والی نسل کے مسائل کا علم نہ تھا، لیکن کم از کم ان کے کلام کی فضا نئی نسل کی ذہنی کیفیت کی غماز ضرور تھی۔ دونوں ایک ایسے دوراہے پر ملے تھے جہاں پرانی تہذیب غروب ہو رہی تھی اور نئی تہذیب طلوع نہیں ہوئی تھی۔

بجنوری کا مطالعۂ غالب دراصل اسی روحانی ہم آہنگی کی صدائے بازگشت ہے۔ مہدی افادی نے "یادگارِ غالب" کے بارے میں لکھا تھا: "ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگذشت لکھی ہے اور آشنائے فن ہو کر لکھی ہے"۔ یہ بات کسی حد تک بجنوری کے "محاسنِ کلامِ غالب" کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی وکالت کرنے کی کوشش کی ہے اور آشنائے فن ہو کر کی ہے "بجنوری کے علمی تبحّر، ان کی وسعتِ نظر" ان کے فلسفیانہ عمق اور جذباتی وفور کا انکار ممکن نہیں تھا، وہ غالب کے ہر شعر کو فکری کائنات میں تحلیل کر دیتے ہیں، یہ کائنات، آفتاب و ماہتاب، بہار و خزاں، گریہ

ابرِ بہار اور خندۂ برق سبھی سے آراستہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں کا ماہتاب مہِ نخشب کی طرح بناوٹی ہے، اور یہاں کے ابر و باد، بہار و خزاں، سب ایسی فضائے نامعلوم کے اجزا ہیں جن تک غالب کی فکر کی پوری طرح رسائی نہیں ہوئی تھی۔

غالب بجنوری کے موضوع نہیں ان کے ہیرو ہیں۔ ان کی اپنی ذات کی توسیع ہیں۔ ایک ایسا ماورائی اور روحانی تصور ہیں جس کی تخلیق بجنوری کے فلسفہ طراز ذہن نے کی ہے۔ بجنوری یہ چونکا دینے والا اعلان کرنے کے بعد کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک مقدس وید اور دوسرا دیوانِ غالب" اپنے کو غالب کے نقاد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُن کے مفسر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کا نفسِ ناطقہ یا ہمزاد تفسیر کرتے کرتے خود شاعر کی حد بندیوں سے بہت دور نکل جاتا ہے۔

"کتابِ فطرت ایک تاریک کتاب ہے اور اس پر صرف شاعر ہی روشنی ڈال سکتا ہے" بجنوری نے یہ خراجِ غالب کو پیش نہیں کیا۔ غالب کے اس تصور کو پیش کیا ہے، جسے ان کے ذہن نے پیدا کیا ہے اور ہیرو کی شکل دے دی ہے چنانچہ بجنوری کی تنقید تنقید نہیں تشریح، تفسیر بلکہ تاویل کا درجہ رکھتی ہے، اور اس تاویل کی کوشش میں وہ غالب کے دور، ان کی شخصیت اور ان کے فکری پس منظر کو سمجھنے کی بجائے شعر کے الہامی تصور اور خیال کی تاثراتی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں۔

بجنوری کا مقدمہ "تنقیدِ غالب" نہیں غالب کی خدمت میں نئی نسل کا خراجِ عقیدت ہے۔ بجنوری کے نزدیک کلامِ غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

"وہ کون سا نغمہ ہے جو ان تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں"

مضامین کا تنوع اور فکر کی وسعت ان کے نزدیک غالب کے کلام کا بنیادی آہنگ ہے۔ لیکن اس آہنگ میں وہ حالی کی طرح صرف غالب کی خوش طبعی اور زندہ دلی کا پرتو ہی نہیں دیکھتے بلکہ ان کے قہقہوں اور آنسوؤں میں کائنات کے فلسفیانہ ادراک اور انسانیت کے گہرے درد کی پرچھائیاں بھی تلاش کرتے ہیں، جو غالب کے قہقہوں کو حالی کی طرح ان کے "حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف ہونے" کے جواز میں پیش نہیں کرتے، بلکہ ان قہقہوں میں ایک مفکر کی سنجیدگی اور متانت کا پتہ لگاتے ہیں۔ بقول بجنوری، جو شخص دنیا کو دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پروا رہتا ہے وہ ہنستا ہے، اور جو قریب سے دیکھتا ہے اور اس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا۔ غالب کی طبیعت میں درد ہے، وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"ان کے لب ہنسی سے ناآشنا نہیں، لیکن ہنسی صرف
بر بچی تبسم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے
جس سے ان کا سارا کلام دو آتشہ بن جاتا ہے"

غالب کی عظمت کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ بجنوری کی شکل میں نئی نسل نے نہ صرف، ان سے عقیدت کا اظہار کیا بلکہ ان کی عظمت کو پرانے معیاروں کے بجائے نئے علمی معیاروں پر قائم کیا ہے۔ لیکن اس عظمت کا اس سے بھی زیادہ کامیاب اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ غالب کی مقبولیت بجنوری کے استدلال کے شکست ہو جانے پر بھی قائم رہی۔ ان اشعار کو پڑھئے۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ... خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ... پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ... ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ہم میں سے کتنے ہیں جو ان اشعار میں بجنوری کی طرح ڈارون کے فلسفۂ ارتقا یا چاند کی تشکیل اور اس کے اخذ نور کی سائنٹیفک حقیقتوں کا ادراک تلاش کریں اور یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ غالب انیسویں صدی کی مغربی سائنس کی تحقیقات سے واقف نہ تھے۔ ان اشعار کو پہلے ہی کی طرح عزیز نہ رکھیں۔

بجنوری نے غالب کے کلام میں ایک مغربی مفکر کے ذہن کی تلاش کی، اول تو یوں بھی غزل کے اشعار میں مختلف النوع اور متضاد بیانات کی کثرت ہوتی ہے، اور ان کی مدد سے ایک مربوط فلسفہ

کی ترتیب دشوار ہوتی ہے۔ دوسرے بجنوری غالب کا مطالعہ غالب کے دور کے ذہنی اور عمرانی پس منظر سے الگ کرکے پیش کر رہے تھے۔ غالب صرف ایک ماورائی وجود، محض ایک خیال مجرّد کی تجسیم نہیں تھے، ایک معاشرے کا نقطۂ عروج تھے، جن کی شخصیت نے اپنے دور کے فکری ذخیرے سے متاثر ہوکر اور اپنے تمدّن کی ساری قدروں کو اپنا کر انفرادی جوہر کی رونمائی کی تھی۔

بجنوری نے جس بلند سطح پر غالب کی عظمت کا ستون استوار کرنے کی کوشش کی تھی اُس سے ایک ہلکے کو نا امیدی اور بے اطمینانی کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا، ڈاکٹر عبد اللطیف نے غالب کے کلام میں اس "روحانی ہم آہنگی" کی تلاش کی جس کا عکس بجنوری نے جگہ جگہ پیش کیا تھا اور ان کی تحقیق نے صرف اس نتیجے تک پہنچایا کہ،۔

"بحیثیت ایک لفظی صنعت گر کے غالب تمام اُردو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے"

اور "غالب کے کلام میں روحانی ہم آہنگی کی کمی ہے ۔"

ڈاکٹر عبد اللطیف بھی در اصل غالب کو ایک متفکّر کی حیثیت سے "دریافت" کرنے کی سعی کر رہے تھے اور جب کچھ تو غزل کے آرٹ کی حد بندیوں کی بنا پر، کچھ غالب کے ذہنی ارتقا کی مختلف اور پُرپیچ منزلوں کی بنا پر، اور کچھ واقعی مربوط فلسفۂ فکر کی عدم موجودگی کی وجہ سے انھیں اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے اسے "روحانی ہم آہنگی" کی کمی سے تعبیر کیا۔

اسی "روحانی ہم آہنگی" یا "مربوط فلسفۂ فکر" کی تلاش کو مجرّد تصوّرات کی شکل میں جاری نہیں رکھا جا سکتا، ظاہر ہے کہ غالب یا اس دور کے عظیم ترین ادیب اور شاعر بھی ان معنوں میں متفکّر قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ جن معنوں میں گوئٹے، ڈارون یا خود اپنے ادب میں اقبال کو متفکّر کہا جاتا ہے لیکن کیا اس مربوط فلسفۂ فکر کا تصوّر غالب کے عہد میں واقعی اسی شکل میں موجود تھا جن معنوں میں آج ہم اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے اس دور کی ہندوستانی اور اسلامی فکر کی مکمل تصویر ابھی مربوط طریقے پر پیش نہیں کی گئی، اور اس عہد کی معاشی اور عمرانی زندگی کا خاکہ بھی ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ پھر بھی اگر اس دور کے ادبی ذہن کا تصوّر کیا جائے تو اس کے مختلف تضاد اور اختلافات نظر کے سامنے آتے ہیں، ایک طرف خود ہمارے تمدّن میں قدیم عناصر کی باہمی آویزش کے ساتھ ساتھ مغربی اثرات کا ایک نیا عنصر داخل ہوا تھا اور وہ سیاسی اور انتظامی اعتبار ہی سے اپنا جلوہ نہیں دکھا رہا تھا، بلکہ اس کے جلو میں نئے تہذیبی عناصر کی جھلکیاں بھی تھیں۔ پُرانی تہذیب اور اس کی اقدار کہیں کہیں سنبھالا لیتی نظر آتی تھیں، لیکن نئی زندگی کے تقاضوں سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو رہی تھیں۔

ایک طرف اسلامی تصوّف کی وہ روایت تھی جس نے اُردو شاعری کی فکر کو پروان چڑھایا ہے اور جس کے نشوونما میں اگر ایک طرف نو افلاطونی فلسفے، ایرانی اثرات، اور ہندو یوگیوں کے رابطوں کا حصّہ رہا ہے تو دوسری طرف اسلامی فکر کے مختلف عناصر خصوصاً معتزلہ فرقہ اور اس کے استدلال نے بھی کافی مدد بہم پہنچائی ہے، اس میں شک نہیں کہ اسلامی تصوّف اس دور کا غالب فلسفہ تھا، اور اُردو شاعری کو نہ صرف نفس مضمون کے اعتبار سے بلکہ علامتوں، اشاروں، اسالیبِ بیان حتّٰی کہ تشبیہ و استعارہ کے سارے ذخیرے تصوّف ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔

پھر یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ غالب عملاً صوفی نہ تھے، عقائد کے اعتبار سے جہاں وہ صوفیا کے بہت سے مروّجہ عقائد کو مانتے تھے، وہاں نہ تو وہ ان کی راہِ سلوک پر پوری طرح ایمان لاتے تھے اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی نیا فلسفۂ فکر پیش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہمیشہ تصوّف کو "برائے شعر گفتن خوب است" کا درجہ حاصل رہا۔ اس باوجود کہ وہ کہتے ہیں۔

"بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو، عزیز رکھتا ہوں، اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دوسرا مانے یا نہ مانے"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں،۔

"میں مؤحّد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ

"لا موجود الا اللہ - لا مؤثر فی الوجود الا اللہ"
وہ صوفی نہیں تھے، وہ زندگی سے دامن کش ہونے کے قائل نہیں۔ البتہ اس کے دُکھ درد کو رندی و قلندری کے انداز سے گزارنے کے مؤیّد ہیں۔ اسی بنا پر نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ:۔

"اگر غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ تفاول و مسرّت تھا۔"

ڈاکٹر عبداللطیف کی "روحانی ہم آہنگی" کی تلاش اگر انھیں اس دَور کے فکر اجتماعی کے تجزیے تک لے جاتی تو یقیناً وہ اس "سفید اور سادہ رنگ" تک پہنچ جاتے جس میں سارے آفتابی رنگ مضمر ہیں۔"

غالب میں اسی فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز محمد اکرام نے غالب نامے میں اس طرح پیش کیا ہے۔

"ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے، اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے معیار ہی میں انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے، لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انھیں لوگوں نے حاصل کی ہے جنھوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھیڑا۔ لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشو ونما کا ایسا سامان چھوڑ گئے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے . . .
ایک پہلو پر زور تو وہ دے جیسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔"

اکرام غالب سے فلسفۂ فکر تو درکنار ایک مربوط نقطۂ نظر کا بھی تقاضا نہیں کرتے بلکہ اسی کمی کو غالب کے فن کا سب سے بڑا حسن قرار دیتے ہیں۔ اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی ہے کہ اُن کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان ادوار کی بنیادی خصوصیات تلاش کیں۔ لیکن اگر واقعی ان غزلوں میں کسی مربوط نقطۂ نظر اور کسی باشعور شخصیت کا تصور نمایاں طور پر سامنے نہیں آتا تو پھر ان ادوار میں ہم ذہنی ارتقا کی تلاش ہی کیوں کرتے ہیں؟

اکرام غالب کے وسیع مشرب، انسان دوستی اور آزاد خیالی کو ان کے کلام کا بنیادی آہنگ قرار دیتے ہیں، اور اس وسعت اور ہمہ گیری میں وہ غالب کو بجنوری کے سے جوش و خروش کے ساتھ شیکسپیر کے پہلو بہ پہلو لا بٹھاتے ہیں۔ لیکن کیا حقیقتاً غالب کے بارے میں صحیح تنقیدی نقطۂ نظر یہی ہے کہ ہم ان کے کلام کے تنوع پر خراج تحسین پیش کریں، اور مبسوط نظام فکر کی تلاش کو غیر ضروری مان لیں؟ یہی نہیں اکرام نے جس طرح غالب کی ساری ترقی اور کامیابی کو نفسیات کی اصطلاح میں احساس کم تری کا نتیجہ قرار دے دیا ہے، کیا غالب کا کوئی سنجیدہ طالب علم اسے صحیح تجزیہ قرار دے سکتا ہے!

نفسیاتی ژرف بینی اکرام کی اپنی اصطلاح ہے، اور اس پردے میں وہ صرف ان کی آزاد خیالی ہی کو بیان نہیں کرتے بلکہ غالب کے "فلسفۂ تفاول و مسرّت" انسان دوستی، ظرافت، انسانی مجبوریوں پر رونے کی بجائے دردمندی کے ساتھ مسکرا دینے کی ادا۔ ان سب خصوصیات تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اور اسی بنا پر وہ مرزا کے کلام کی مقبولیت کے اسباب تنوع۔ تجربہ اور طرزِ نو کو قرار دیتے ہیں۔ اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے، وہ غالب کو نہ حالی کی طرح قدیم معیاروں میں گم کر دیتے ہیں نہ بجنوری کی طرح ان کے گرد گوئٹے اور الہامی کتابوں کا مقدس دائرہ بناتے ہیں، اور نہ لطیف کی طرح انھیں معمولی دنیا دار انسان اور معمولی سے کچھ ہی اعلیٰ شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اکرام نے غالب کا ان کی اپنی سطح پر مطالعہ کیا ہے۔ اکرام کی رسائی غالب کے فکری تجزیے تک نہیں ہوئی۔ آخر اس طرزِ نو اور طرفگیٔ ادا اس تنوع اور انسان دوستی کی بنیادیں کیا ہیں، اس سوال کا جواب اکرام کے پاس نہیں ہے۔

عہدِ جدید میں بھی غالب کا مطالعہ ہر مکتبۂ تنقید کے لکھنے والوں کے لئے دل کش موضوع رہا ہے ان میں فیض احمد فیض ہیں جنھوں نے غالب کے کلام میں ایک "واضح اور نمایاں وحدت" کی تلاش کی، اور اس بنیادی کیفیت یا مُوڈ کو اداسی کا نام دیا، یہ اداسی قنوطیت نہیں بلکہ ان کے الفاظ میں "کچھ ماضی کی یاد اور اس کے کھو جانے کا غم" "کچھ

حال کی بے کیفی اور ویرانی کا احساس اور کچھ مستقبل میں ماضی کے لوٹ آنے کی حسرت، "امید اور نا امیدی" سے مل جل کر تشکیل پاتی ہے، اس اداسی کو فیض نے ایک فرد کی ذاتی کیفیت کے بجائے "ایک نسل، ایک دور کی اجتماعی کیفیت قرار دیا ہے، اور یہ دور چونکہ ہمارے ماحول اور ہماری اجتماعی واردات سے بہت مختلف نہیں ہے۔ لہٰذا غالب کا جادو آج بھی چلتا جا رہا ہے۔

ہمارے اپنے عہد کے نقادوں میں ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار ہیں، جنہوں نے غالب کے جسم پر کم و بیش ایک انقلابی قبا آراستہ کر دی، اور غالب کے آرٹ کو محض آرٹ کی بجائے "ایک ایسے وجدان" سے تعبیر کیا "جو انہیں زندگی کے اس خارزار کی طرف لئے جا رہا تھا جہاں ہر کانٹے کی نوک ہماری قومی زندگی کے خون سے رنگین تھی" اسی دور کے نقادوں میں احتشام حسین اور آل احمد سرور کا نام بھی آتا ہے۔

احتشام حسین کا مقالہ "غالب کا تفکر" غالبیات میں ایک نیا باب کھولتا ہے، احتشام حسین دراصل غالب کے کلام میں "طرفگیٔ مضامین و جدت ادا" کی مادی بنیادوں کی تلاش کرتے ہیں ان کا استفہامیہ یہ ہے کہ غالب کے کلام میں جس ندرت کا احساس حالی کے دور سے لے کر آج تک برابر کیا جاتا رہا ہے، اس کے سماجی عوامل کیا تھے، جہاں وہ غالب کے ذہنی پس منظر اور اس دور کی فلسفیانہ روایت کا تجزیہ کرتے ہیں، وہاں اس جدید عنصر کو کم و بیش غالب کے سفر کلکتہ کا اثر قرار دیتے ہیں، کیونکہ کلکتہ سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا۔ اور کلکتے کے باہر بنگال کے دوسرے علاقوں میں وہ عوامی طبقاتی کش مکش بھی بہت غیر واضح شکل میں شروع ہو چکی تھی، جو کبھی وہابی تحریک کی صورت میں، کبھی فرائضی تحریک کی شکل میں، اور کبھی ڈاکوؤں، سنیاسیوں اور ٹھگوں کی شکل میں رونما ہوتی تھی"۔

کلکتے کا سفر کیا حقیقتاً غالب کی زندگی اور فن میں اس قدر عہد آفریں رہا ہے؟ کیا واقعی ان کے کلام میں طرفگی اور خیالات میں بانکپن کلکتے کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے زیر اثر ہی آیا ہے! یہ سوالات اس وقت تک پوری طرح حل نہیں ہو سکتے جب تک غزلیات کی صحیح تاریخ تصنیف اور غالب کی فکر کے مختلف ادوار کا صحیح تعین نہ کیا جائے۔

آل احمد سرور نے "صحت مند تشکیک" کو غالب کا سرمایہ قرار دیا یقیناً غالب صوفی نہ تھے، وہ فلسفی بھی نہ تھے۔ لیکن ان کے پاس ایک ایسے ہوش مند کا دل و دماغ ضرور تھا جو پرانے تصورات سے نہیں بہلتا اور روایات کے آئینہ خانے میں گم ہو جانے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ یہ صحت مند مگر تشکیک پسند ذہن نشاط و عیش میں بھی زندگی کی سنگین حقیقتوں کا عکس دیکھ لیتا ہے، اور اداسی، ناکامی اور نامرادی کے طوفانوں میں بھی تشکیک کے بل بوتے پر کبھی بے دلی اور کبھی رندی و قلندری اور کبھی فلسفیانہ سپردگی کی مدد سے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھ لیتا ہے۔

یہ چند اشعار شاید غالب کی ان مختلف پناہ گاہوں کی طرف اشارہ کر سکیں گے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک!
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم — لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ فرصتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اور پھر وہ معرکے کے شعر:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

لیکن آل احمد سرور بھی اس صحت مند تشکیک اور اس ذہنی رجحان کے اجزائے ترکیبی تک جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ وہ سوال جن کے جوابات عصری تنقید نے ہنوز نہیں دیے ہیں ان کے یہاں بھی تشنہ ہی رہ جاتے ہیں۔

بہرحال غالب کی فکر کے نقش و نگار گلستاں و گلستاں تنقید کی نظروں کے سامنے جلوہ فروش ہوتے آئے ہیں۔ شیفتہ اور حالی سے لے کر آج تک گو اس کے اسرار و رموز، اس کے دل نواز گوشے اور دل کش پہلو بے نقاب ہوتے رہتے ہیں، پھر بھی غالب کی فکر کا مکمل تصور ہنوز اپنے کو ملبس کے انتظار میں ہے اور یہ عظیم دریافت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک علوم متعلقہ کی مدد سے غالب کے عہد اور ان کے فن کے ارتقار کا ایک مربوط خاکہ تیار نہ ہو جائے۔

غالب نے کہا تھا :-

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

پھر دوسری جگہ پیشین گوئی کی تھی :-

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہ دونوں دعوے قدیم اور جدید دونوں زبانوں میں پورے ہوئے ہیں۔ غالب کے نقاد کب گنجینۂ معنی کے اس طلسم کی طلسم کشائی پر قادر ہو سکیں گے، اور کبھی غالب کے "شہرتِ شعر" کی مکمل توجیہہ ممکن ہوگی بھی یا نہیں ؟ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ کسی شاعر کے لئے یہ شرف معمولی نہیں ہے کہ اس نے عمرانی اور سیاسی انقلابات سے بے پروا ہو کر اپنی آواز سے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اور اس درجہ متاثر کیا ہے کہ آج بھی ہر نوجوان کے لئے نشاط و الم، تنہائی اور سرمستی کی ہر منزل میں غالب مونس، ہمراز، اور جلیس کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ سچ پوچھ اُن کے منہ پر یہ دعویٰ پھبتا ہے۔

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم

اور ان کے تقریباً ہر نقاد نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ :-

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

ایک خط کا اقتباس

.... والیہ صاحب کے مضمون میں دو ترکی پہلوانوں کے نام آئے ہیں ایک "مادر علی" اور دوسرا "بلی الدعلی"۔ "مادر علی" کے بارے میں بوثوق کہنا مشکل ہے کہ اس کی اصلی صورت کیا ہے۔ "مادر" فارسی میں ماں کو کہتے ہیں اور ترکی میں ماں کو "آنا" کہتے ہیں۔ لفظ "مادر" جو فارسی میں ماں کے معنوں میں بولا اور سمجھا جاتا ہے، نہیں معلوم ترکی میں کن معنوں میں بولا یا سمجھا جاتا ہے یا بولا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ کسی حرف کے تلفظ کے ادل بدل کی جادوگری نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ جسے ہم نے "مادر" پڑھا ہے وہ نادر یا بادر ہو اور کسی وجہ سے اوپر یا نیچے کے نقطے گر گئے ہوں۔ بہرحال حقیقت کیا ہے خدا جانے۔ البتہ دوسرا نام "بلی الدعلی" یقیناً غلط ہے۔ یہ بھی تلفظ کی شعبدہ بازی ہے۔ اور اس تلفظ کے ذمہ دار خود ترک ہیں۔ کوئی انگریز یا ہم ہندوستانی نہیں۔ لیکن طرفہ یہ ہے کہ ترک اس تلفظ کو غلط نہیں سمجھتے ہاں جب وہ عربی رسم الخط میں لکھیں گے تو اس ہائے ہوز کی شکل کی بجائے دوسری شکل کے حروف میں لکھیں گے۔ جیسے آپ کچھ اور پڑھیں گے اور ترک وہی "بلی الدعلی" پڑھیں گے۔ کیونکہ وہ اسی طرح بولتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہندوستان کے مختلف حصوں میں "خ" کو "کھ" یا "ق" کو "خ" یا "ک" یا "کھ" بولا جاتا ہے اسی "ق" کو ایران میں "غ" اور عرب کے بعض حصوں میں "گ" کی طرح بولا جاتا ہے یا بعض سرحدی لوگ "ح" کو "خ" کی طرح بولتے سُنے جاتے ہیں۔ اسی طرح ترک حرف "خ" کو ہائے ہوز کی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ آپ مشہور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم کے نام کا تلفظ ہر ترک کی زبان سے ہالدہ ادیب ہانم ہی سنیں گے۔ پس جس ترک پہلوان کا نام "بلی الدعلی" لکھا گیا ہے وہ دراصل "خالدعلی" ہے۔ ایک زبان کے لفظ کو دوسری زبان بولنے والے بولنے میں کس کس طرح بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ زبانوں کا بناؤ بگاڑ کہئے یا شکست و ریخت کسی دشمنی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ محض آب و ہوا اور ملکی یا جغرافیائی قدرتی مجبوریوں سے ہوتا ہے

راقم مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی۔ مقیم بمبئی

---

[1] دنیا کے مشہور پہلوان از گوردیال سنگھ والیہ مطبوعہ آجکل اپریل ۱۹۶۹ء

ناطق گلاوٹھوی

بادۂ کہن

سانس دینے کو ہوا آتشِ غم تک پہونچے
رُکتا کون ہے پہونچے مرے دم تک پہونچے

آئینہ داریِ آثارِ قدم تک پہونچے
نقشِ ہستی جو مرے نقشِ قدم تک پہونچے

خیریت چاہے تو کترا کے نکل جائے یہ دَور
سرہی پھرتا ہو جو ساغر کا تو ہم تک پہونچے

نیستی کا مری خاموشی میں اچھا ہے بیان
بات کھُل جائے تو ہستی کے بھرم تک پہونچے

عیش آوارہ ہے برگشتہ مزاجی سے مری
مُنہ لگا لوں تو کبھی جام نہ جم تک پہونچے

شیخ اب تو ہی سمجھ بوجھ کے کر عزمِ سفر
بُت تو انجام سے غافل تھے حرم تک پہونچے

لے کے برگشتہ پھری حسرتِ سامانِ وجود
جستجو تھی ہمیں عنقا کی عدم تک پہونچے

زیرِ پا مانندۂ فوّارۂ سر تھے آنسو
رسم ادا کرنے کو جو دیدۂ نم تک پہونچے

یہ بھی سب کچھ ہے کرے حسن جو پابندیٔ جَور
شیوۂ ظلم ہی آئینِ کرم تک پہونچے

زورِ طوفانِ حوادث ہو کہ ہو موجِ شراب
کس کی ہمّت ہے جو اربابِ ہمم تک پہونچے

ہند میں کیا نہیں خود اپنے قلم سے، ناطق
کیوں نصیب لے کے صنا دید عجم تک پہونچے

کنہیا لال کپور

ادبی مشیر

قریب قریب ہر ایک خاندان میں ایک بزرگ ایسا بھی ہوتا ہے جس نے عالم شباب میں کسی گمنام اخبار یا رسالے میں دو ایک مضامین لکھے تھے۔ شاید اُن میں بتایا گیا تھا کہ جگنوں کا بھرتا کس طرح بنانا چاہیئے یا کالی کھانسی کے لئے شربتِ بنفشہ اچھا رہتا ہے یا شربتِ بادام۔ اس کے بعد وہ کچھ اس لئے نہ لکھ سکے کہ خانگی یا کاروباری دھندوں نے انھیں لکھنے کے لئے فرصت ہی کب دی۔ پھر بھی انھوں نے متعدد بار کچھ لکھنے کی ناکامیاب کوشش ضرور کی۔ مثلاً انھوں نے ایک ناول "فاختہ کا گھونسلا" لکھنا شروع کیا لیکن دس صفحے لکھنے کے بعد بند کر دیا۔ ایک کتاب تنقید پر لکھنا چاہتے تھے۔ نام تھا "بال کی کھال" لیکن بُرا ہو کسی اور نقاد کا کہ اس نے اُن سے پہلے یہ کتاب لکھ ڈالی۔ اب اُن کا خیال ہے کہ یہی کتاب "بات کا بتنگڑ" نام سے لکھی جائے۔ لیکن کب؟ یہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ سب تو فرصت اور فراغت پر منحصر ہے۔ اگر کافی فرصت ملی تو ضرور لکھیں گے۔

یہ بزرگ خاندان کے اُن افراد کو جنھیں ادب سے مَس ہے، مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دراصل ان کی حیثیت دوست، رہنما اور فلسفی کی ہے۔ جونہی انھیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے خاندان کے کسی فرد نے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اسے اپنے ہاں بلاتے ہیں یا خود اس کے ہاں پہنچ جاتے ہیں اور اگر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں تو ایک مفصل خط میں لکھنے سے متعلق تمام ضروری باتیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ابھی پرسوں نلنی دیوی کے نام انھوں نے ایک خط لکھا:-

ڈیر نلنی دیوی!

جیتی رہو۔ کملیش نے مجھے بتایا کہ تم گھر والوں سے چوری چھپے گیت لکھا کرتی ہو اور کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت بھی کرتی ہو۔ لیکن تمھارے والدین کو تمھارا گیت لکھنا بالکل پسند نہیں تیرا فیصلہ میں سمجھا دوں گا۔ اوّل تو سمجھ جائیں گے۔ ورنہ سمجھیں تو تمھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ادیب کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری مثال ہی لے لو۔ میں نے اپنا پہلا مضمون بارہ برس کی عمر میں لکھا۔ عنوان تھا "شلغم کا اچار"۔ جب یہ مضمون میری والدہ نے پڑھا تو بہت ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ "اچار بنانے کا جو طریقہ تم نے لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اگر کسی عورت نے اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے اچار بنایا تو نہ صرف شلغم خراب ہو جائیں گے بلکہ وہ مرتبان بھی جس میں اچار بنایا جائے گا۔" میں نے اُن سے کہا "یہ طریقہ میرا اپنا طریقہ ہے اس لئے میں اس کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتا۔" اُن کی نکتہ چینی کی پروا نہ کرتے ہوئے میں نے اُسی دن ایک اور مضمون لکھ ڈالا۔ عنوان تھا "آلوبے کا مربّہ" اس مضمون کو پڑھ کر میرے والد صاحب سیخ پا ہو گئے کہنے لگے: "تو کچھ پڑھے گا لکھے گا بھی کہ اچار اور مربّے ہی بناتا رہے گا۔" میں نے اُن کے غصّے کی بھی پروا نہ کی اور برابر لکھتا گیا۔ آخر ایک دن سب کو ماننا پڑا کہ میں پیدائشی ادیب ہوں۔ تو کہنے کا مطلب یہ کہ تمھیں والدین کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم گیت اچھے لکھو۔ اچھے گیت لکھنے کا راز یہ ہے کہ تب تک گیت نہ لکھا جائے جب تک خوب پیٹ بھر کھانا نہ کھا لیا جائے۔ کچھ شاعر چائے کا ایک آدھ پیالہ پینے کے بعد گیت لکھنے لگتے ہیں۔ اس پیالے میں دودھ کے دو تین قطرے ہوتے ہیں اور چینی بالکل نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جیسی کڑوی چائے پیتے ہیں ویسے کڑوے گیت بھی لکھتے ہیں۔ تمھارے

پاس ہے اتنا لکھ دیا سب کچھ ہے۔ تم ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ گیت لکھنے کے متعلق دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ گیت ہمیشہ کسی اچھوتے موضوع پر کہا جائے۔ گل، بلبل یا بشر پر گیت لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان پر تو بڑے اعلیٰ شاعروں نے پہلے ہی گیت لکھ دئے ہیں۔ اس لئے تمہیں کسی ایسے پرند پر گیت لکھنا چاہیئے جس پر آج تک کوئی گیت نہ لکھا گیا ہو۔ مثلاً شتر مرغ۔ اب شاید تم پوچھو گی کیا شتر مرغ بھی گیت گاتا ہے۔ ہاں ہاں کیوں نہیں گاتا۔ کون سا پرند، جانور یا انسان ترنگ میں آکر گیت نہیں گاتا۔ تیسری بات جو تمہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیئے یہ ہے کہ گیت میں جذبات کی بجائے لَے کا ہونا زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے تمہیں ایسے گیت لکھنا چاہئیں جن میں جذبات کم ہوں لیکن جن کی لَے پر سر دُھننے کو جی چاہے۔ میرے خیال میں وہ گیت زیادہ مقبول ہو سکتا ہے جس میں جذبات بالکل نہ ہوں بس لَے ہی لَے ہو۔ ایسے گیت لکھنے کے لئے تمہیں کافی مشق کرنا پڑے گی۔ جذبات کو آہستہ آہستہ گھٹانا یہاں تک کہ وہ بالکل نہ ہونے کے برابر رہ جائیں۔ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن اگر شاعر ہمت نہ ہارے تو اتنا مشکل بھی نہیں۔ آخری بات جو تمہیں یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ گیت زیادہ لمبے نہیں ہونے چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن میں سات یا آٹھ سطور ہونی چاہئیں۔ چھوٹے گیتوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انھیں ہر شخص پڑھ لیتا ہے۔ لمبے گیت ایک تو کافی وقت لیتے ہیں دوسرے انھیں لکھتے وقت کئی بار شاعر اتنا اُلجھ جاتا ہے کہ گلاب کے پھول پر گیت لکھتے لکھتے گل قند پر لکھ ڈالتا ہے۔

ایک بات اور۔ آئندہ جو بھی گیت لکھو اُس کی ایک کاپی مجھے ضرور بھجواؤ تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد میں تمہیں اپنی رائے سے مطلع کر سکوں۔

میں ہوں تمہارا خیر اندیش

ایک بزرگ

یہ بزرگ نہ صرف گیت لکھنے کا ڈھنگ بتا سکتے ہیں بلکہ ناول کس طرح لکھنا چاہیئے اس کے متعلق بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان کا یہ خط پڑھئے جو تھوڑے دن ہوئے اُنھوں نے اپنے بھتیجے ابناش چندر کو لکھا۔

ڈیر ابناش چندر!

تمہارا نیا ناول "مدّوج کا چاند" ریلوے بک اسٹال سے خرید کر پڑھا۔ تم سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ ناول کی ایک کاپی ہی بھجوا دیتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ معاف کرنا۔ تمہارا ناول مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ بھلا "مدّوج کا چاند" بھی کوئی نام ہے۔ اگر چاند ہی یہ رکھنا تھا تو "چودھویں کا چاند" کیوں نہ رکھا۔ جو بات چودھویں کے چاند میں ہے وہ بھلا مدّوج کے چاند میں کہاں۔ ہیروئن کا نام تم نے "مالتی" رکھا ہے۔ "مدّوج کا چاند" کی ہیروئن کا نام چندر مکھی یا چاند رانی ہوتا تو مزہ آجاتا۔ ہیرو کے لئے چندر بھان کا نام بڑی آسانی سے چُنا جا سکتا تھا ـــــ تمہارے ناول میں ہیرو اور ہیروئن میں پہلی ملاقات ساتویں باب میں ہوتی ہے حالانکہ میرے خیال میں پہلے باب میں ہو جانی چاہیئے تھی۔ بارھویں باب میں ہیرو ہیروئن سے ناراض ہو کر بیکانیر چلا جاتا ہے۔ بیکانیر کے بجائے اگر تم اسے شملہ یا منصوری بھیج دیتے تو کتنا اچھا رہتا۔ وہاں اس کی ملاقات کسی اور لڑکی سے کرائی جا سکتی تھی۔ ملاقات نہ بھی ہوتی تو کم از کم اس کی صحت تو اچھی ہو جاتی۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ایک تندرست ہیرو ناول کے لئے کتنا ضروری ہوتا ہے۔ تمہارے ناول پر مفصل تنقید پھر کبھی کروں گا۔ اس خط میں تمہیں ایک پلاٹ بتانا چاہتا ہوں اس کا استعمال تم اپنے اگلے ناول میں کر سکتے ہو۔ دراصل یہ ایک سچا واقعہ ہے اور اتنا دلچسپ کہ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں خود اسے ناول کا موضوع بناتا۔ ہاں تو وہ واقعہ یہ ہے ـــــ

ایک بار میں کلکتے گیا۔ جس ہوٹل میں ٹھہرا وہاں میری ملاقات ایک نوجوان عورت سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا خاوند گھر سے بھاگ گیا ہے اور وہ ہوٹل میں برتن صاف کر کے اپنا گذارہ کر رہی ہے۔ مجھے اس نوجوان عورت پر بہت ترس آیا۔ میں نے اس کے گم شدہ خاوند کو ڈھونڈھ لانے کا تہیہ کر لیا۔ بنگال کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن اُس بھلے مانس کا پتہ نہ چلا۔ واپس کلکتے آیا اور اُس

عورت سے پوچھا کہ اس کا خاوند اس سے کس بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اُن کے گھر میں ایک بلّی تھی جسے وہ بے حد چاہتی تھی لیکن اُس کے خاوند کو اُس سے نفرت تھی —

"وہ بلّی اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ تو اب بھی میرے پاس ہے!" عورت نے جواب دیا۔ "وہ بلّی لاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔ بلّی لے کر میں اُس شخص کی تلاش میں دوبارہ روانہ ہوا۔ ایک دن بلّی کو اپنے کندھے پر بٹھا کر دہلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی جس نے جوگیوں کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بلّی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی تلاش میں میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا "سچ بتاؤ۔ تم پرتوش کمار گھوش تو نہیں ہو؟" پہلے تو اس نے مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہا لیکن جب میں نے اُس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ مارا تو اُس نے روتے روتے کہا۔ "میں پرتوش کمار گھوش ہی ہوں" میں نے اُس سے کہا۔ "فوراً میرے ساتھ واپس کلکتے چلو نہیں تو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔" وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اُس نوجوان عورت نے جب اپنے خاوند کو دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "بلّی ہی تمھارے خاوند کو تم سے دُور لے گئی اور بلّی ہی اُسے تمھارے نزدیک لے آئی۔"

تو یہ ہے وہ واقعہ، اسے تم اپنے دوسرے ناول کا موضوع بنا سکتے ہو۔ اس کا نام بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے "ایک عورت ایک بلّی"۔ اگر یہ نام پسند نہ آئے تو "بلّی کا معجزہ" رکھا جا سکتا ہے۔

تمھارا خیر اندیش

تمھارا امرل

لیکن آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ بزرگ مزاحیہ مضامین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزاحیہ مضامین کے متعلق بھی ان کی واقفیت کافی ہے۔ زیادہ مدت نہیں ہوئی انھوں نے اپنے ایک عزیز کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ پڑھا تھا۔ اس پر انھوں نے اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل خط میں کیا۔

ڈیئر اندر کمار،

سدا آنند رہو۔ یہ تم نے کیا کیا کہ افسانے لکھتے لکھتے مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کر دیا۔ مزاحیہ مضمون لکھنا تمھارے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وہ آدمی لکھ سکتا ہے جسے زندگی کا کافی تجربہ ہو۔ تمھاری عمر کیا ہے — جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ تمھیں مزاحیہ مضامین لکھنے کے لئے کم از کم تیس برس اور انتظار کرنا پڑے گا۔ میں اگر چاہوں تو کامیاب مضامین لکھ سکتا ہوں، کیونکہ میری عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، لکھنے کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب میں تمھارے دو ایک مضامین کی طرف آتا ہوں۔ تمھارا ایک مضمون ہے "ہم بہشت میں پہنچے"۔ پہلے تو عنوان ہی غلط ہے۔ جب تک تمھاری وفات نہ ہو جائے تم بہشت یا دوزخ میں جا کس طرح سکتے ہو۔ اور چلے بھی جاؤ تو پھر وہاں سے واپس کس طرح آ سکتے ہو۔ وہ بہشت ہی کیا جس سے لوٹ کر دُنیا میں پھر کوئی آنا چاہے۔ بہشت میں تم نے جن باتوں کو دیکھا اور جن کا ذکر اپنے مضمون میں کیا وہ بھی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ تم لکھتے ہو بہشت میں کوئی ہسپتال نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے وہاں جو لوگ بیمار ہوتے ہیں وہ علاج کہاں کراتے ہیں۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ بہشت میں کوئی بیمار نہیں ہوتا تو میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ جب کھانے پینے کو طرح طرح کی لذیذ چیزیں ملیں تو زیادہ کھا جانا قدرتی ہے۔ اور زیادہ کھا کر آدمی ضرور بیمار ہو گا۔ خاص کر جب وہ کسی قسم کی ورزش بھی نہ کرتا ہو۔ آگے چل کر تم نے لکھا ہے کہ بہشت میں زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ سردی یعنی موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے۔ کیونکہ اگر موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے تو گرمی کے موسم میں پیدا ہونے والے پھل اور ترکاریاں بہشت میں نہیں ہو سکتیں یعنی وہاں نہ آم ہو سکتا ہے نہ کریلے۔ بھلا وہ کیسی بہشت ہوئی جہاں کوئی کام کا پھل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ دراصل تم سے یہ غلطیاں اس لئے سرزد ہوئیں کہ تمھیں بہشت کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔

ایک اور مضمون ہے "ہم سسرال گئے"۔ مجھے یہ مضمون پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ابھی سگائی تو تمھاری ہوئی نہیں اور سسرال کے

خواب دیکھتے رہوگے یہ سماں کا جو نقشہ تم نے کھینچا ہے وہ حقیقت سے بعید ہے۔ تم لکھتے ہو کہ تمہاری ساس کے اتنے بچے تھے کہ جب تم نے اس سے ان سب کے نام پوچھے تو وہ ایک بچے کا نام ہی بھول گئی۔ یہ بات ناممکن ہے۔ کوئی ماں، چاہے اُس کے کتنے بچے ہوں اُن کا نام نہیں بھول سکتی۔ اسی طرح قریب قریب ہر مضمون میں تم نے بے شمار ٹھنیاں کھائی ہیں۔

اور پھر میں پوچھتا ہوں۔ اس قسم کے مضامین لکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ تمہیں ایسے مضامین لکھنے چاہئیں جو دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی ہوں۔ مثلاً "ہم نے دیسی صابن کیسے تیار کیا"۔ "ہم نے افیم کیسے چھوڑی" "ہم نے آلو کا اچار کس طرح بنایا" وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ کہ مضمون میں کام کی باتیں ہونی چاہئیں صرف طنز و مزاح ہی کافی نہیں۔ امید ہے آئندہ جب کبھی مزاحیہ مضمون لکھوگے ان باتوں کا خیال رکھوگے

خیراندیش

تمہارا ایک بزرگ

ملاحظہ فرمایا آپ نے اُن بزرگ کی ادب کے بارے میں کتنی واقفیت ہے۔ سچ پوچھئے تو ان کا دم غنیمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو نہ کوئی گیت لکھ سکے۔ نہ ناول اور نہ ہی مزاحیہ مضمون۔ یعنی "لکھنے" کا سارا کام ہی رک جائے اور بیچارے ادباء مایوس ہو کر خودکشی کر لیں!

موسیقی نمبر کی ایک جھلک

مندرجہ ذیل موضوعات پر مضامین شائع ہونے کی توقع ہے

- آگرہ گھرانے کی گائیکی
- کیرانہ گھرانے کی گائیکی
- رام پور گھرانے کی گائیکی
- قوالی
- امیر خسرو
- بڑے بڑے اساتذۂ سخن
- تان سین
- مغلیہ عہد کے بڑے بڑے موسیقار
- کرناٹک میوزک
- ساؤنڈ میوزک اور گوڈ ڈیوٹیسکور
- ہندوستانی موسیقی کا ارتقاء
- ہندوستانی موسیقی کا مستقبل
- ہلکے پھلکے گانے والے
- مشہور ماہر موسیقی خواتین
- راشٹرپتی کی طرف سے اعزاز یافتہ موسیقار
- ہندوستانی موسیقی کے ساز
- مشہور سازندے
- استاد اللہ دیا خاں

ان کے علاوہ اور کتنے ہی موضوعات پر ماہرانِ فن کے مضامین شاملِ اشاعت ہوں گے

ضخامت ۱۲۸ صفحے رنگین اور دوسری تصویروں کے ۱۶ صفحے

قیمت اور دوسری تفصیلات کے لئے اشتہار صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمایئے

سراج الدین ظفر

غزل

اصلاحِ اہلِ ہوش کا یارا نہیں ہمیں
اس قوم پر خدا نے اُتارا نہیں ہمیں

ہم بھی تھے اس جہاں میں سراپا سخا وجُود
اے شیخ شہر تو نے پکارا نہیں ہمیں

دل کے معاملات میں کیا دوسروں کو دخل
تائیدِ ایزدی بھی گوارا نہیں ہمیں

رندِ قدح گسار بھی ہیں بُت پرست بھی
قدرت نے کس ہُنر سے سنوارا نہیں ہمیں

اک وہ کہ سود و نمود و نمائش کے اہتمام
اک ہم کہ احتیاجِ نظارا نہیں ہمیں

ڈھونڈیں کہاں سحر کو تمھیں اے زوالِ شب
اب نام بھی تو یاد تمھارا نہیں ہمیں

آزادہ رو ہیں مسندِ عرشِ بریں سے ہم
اُترے ہیں خود کسی نے اُتارا نہیں ہمیں

حل کر رہے ہیں دورِ زماں کو سبو میں ہم
اب سعد و نحس کوئی ستارا نہیں ہمیں

گُم صُم ہے کس خیال میں اے روحِ کائنات
اب تو نے مدتوں سے پکارا نہیں ہمیں

اے زلف برہمی سے تری کیا مُراد ہے
کافی یہ مختصر سا اشارا نہیں ہمیں

اب کیا سنور سکیں گے ہم آوارگانِ عشق
صدیوں کے جبر نے تو سنوارا نہیں ہمیں

خوبانِ شہر آؤ کہ دُنیا سے کچھ لگاؤ
بے شاہدانِ انجمن آرا نہیں ہمیں

آغوشِ گل ہمارے لئے کائنات ہے
ارمانِ اصفہان و بخارا نہیں ہمیں

آغوشِ شوق میں انھیں کھینچو بقیدِ ہوش
منظور بے خودی کا سہارا نہیں ہمیں

ڈھونڈو کوئی نئی روشِ شاعری ظفر
اسلوب دوسروں کا گوارا نہیں ہمیں

قاضی عبدالغفار مرحوم

دو شخصیتیں

قاضی عبدالغفار جدید اُردو ادب کے ایک ایسے معمار تھے جن کے نقش ہائے زنگارنگ ادب و صحافت کی دیواروں پر بڑی تابناکی سے چمک رہے ہیں۔ اس قوم پرست صحافی نے اپنی زندگی ادب کی خدمت میں ختم کر دی۔ اُردو کو اس نے خونِ جگر سے سینچا۔ صحت جواب دے چکی تھی لیکن اُردو کا یہ مردِ بیمار علی گڑھ سے حیدرآباد تک کی طویل مسافتیں خدمتِ اردو کے لئے طے کرتا رہا۔ جہاں جہاں وقت کی ضرورت نے اشارا کیا، جہاں جہاں فرض نے آواز دی یہ مجاہدانہ ہمت سے وہاں پہنچا۔ تصنیف و تالیف میں بڑے بڑے کام کئے، طرزِ نگارش میں انفرادیت پائی، قوم پرستی کو شعار بنایا، سیاست کے بڑے بڑے پہلوانوں سے داؤ پیچ سیکھے۔ اپنی آخری کتاب "حیاتِ اجمل" میں ایک عہد کے کلچر اور سیاست کی پوری داستان رقم کر دی۔ اُردو بائیوگرافی میں ایک سنگِ میل نصب کیا۔ فلک کی ناہنجاری اور کج رفتاری کا لوگ گلہ کرتے ہی آئے ہیں۔ گلہ ہم سب کو ہے کہ ایسے ایسے لوگ بھی اُٹھا لئے جاتے ہیں۔ مرحوم کے دو غیر مطبوعہ تاحد مضمون اُن کے دو دوستوں جناب سری نواس لاہوٹی اور حبیب خاں صاحب سے موصول ہوئے ہیں۔ نہ جانے اس صاحب طرز انشاپرداز کی کتنی غیر مطبوعہ چیزیں ابھی باقی ہیں۔ ادارہ ہر دو اصحاب کا شکرگزار ہے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر انصاری اپنے زمانے میں قوم کے بہت بڑے لیڈر تھے، اپنی قوم کے محبوب تھے، اپنے رفقاء کا بہت بڑا سہارا تھے۔ لیکن اس کے علاوہ کیسے پیارے انسان تھے، وہ کیسے دردمند دوست تھے، وہ کیسے سدا بہار چمنستانِ محبت تھے — اس حقیقت کو تو اب صرف وہی چند ہم نفس بتا سکیں گے جنھوں نے خلوت اور جلوت میں انصاری کی صحیح انسانیت کو دیکھا تھا — وہ تمدح جس کے جلبسے اُن کے متبسم لبوں پر کھیلا کرتے تھے! پہلے دن سے انصاری کی عمومی اور شخصی زندگی کو دیکھا، دہلی کے رنج پوری بازار میں اُن کا مطب تھا۔ اس مطب کے کمروں کا وہ ہجوم اور ہنگامہ یاد ہے جو وہاں جنگ بلقان کے زمانے میں طبی مشن کی روانگی سے ہفتوں پہلے صبح سے شام تک برپا رہا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ایک قابل ڈاکٹر کی حیثیت سے انصاری اپنی شہرت قائم کر چکے تھے لیکن ایک سچے وطن پرست اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے محمد علی کے شانہ بہ شانہ ان کا پہلا قدم اُٹھ رہا تھا۔ میں اس زمانے میں "ہمدرد" کے اشاف میں تھا اور ہنوز ان سے اتنا قریب نہ آیا تھا، جتنا کہ بعد کو آیا۔ پھر بھی وہ ایک کشش جو اُن کے اندر تھی، مجھ جیسے چند نوجوان دیوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی —— پھر وہ زمانہ آیا کہ دہلی میں تمام ہندستان کے مسلمانوں کی سیاست کا ایک مثلث قائم ہو گیا جس کا ایک زاویہ محمد علی، ایک انصاری اور ایک اجمل خاں —— یہ وہ زمانہ تھا کہ جب زندگی کا آفتاب بہت گرم تھا!

ہمارے دلوں کے آتش خانے بھی گرم تھے حتیٰ کہ گویا اندھیری راتوں میں ہم سورج دیکھتے تھے۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں، مسلم لیگ کا وہ اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں انھوں نے اپنا مشہور خطبۂ استقبالیہ پڑھا، وہی خطبہ جو ضبط کر لیا گیا۔ جاڑوں کی رات اور علی مدیا گنج کے ایک کمرے کے فرش پر ہم تین چار آدمی کمبل اوڑھے پڑے ہوئے ہیں، مجھے (۱۰۲) ڈگری بخار ہے تین تین گھنٹوں بعد ڈاکٹر صاحب دوا کی خوراکیں پلاتے جاتے ہیں اور اس خطبے کے مسودے پر بحث ہوتی جاتی ہے، ہر ہر فقرے پر گفتگو ہوتی ہے، اسے یوں لکھتے تو بہتر تھا، اس لفظ کے عوض یہ لفظ ہوتا تو عبارت کے زور میں اضافہ ہو جاتا۔ اس حدیث کے الفاظ کی صحت ذرا مشتبہ ہے۔ دیکھنا ابھی قاضی ذرا تم مولانا کفایت اللہ سے دریافت کر کے آؤ —— اور اب آدھی رات گزر چکی ہے، صبح یہ مسودہ طباعت کے لئے جائے گا۔ پرسوں وہ لیگ کے اجلاس میں پڑھا جائے گا ایسا نہ ہو کر پڑھے جانے سے پہلے ہی ضبط ہو جائے۔ اس لئے اس کے مضامین کا راز ہر طرح سے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ صبح ہوتی ہے، اس محفل نیم شبی کا تھکا ہارا "قاضی" (وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارا کرتے تھے) مسودے کو پریس لے کر جاتا ہے، دوا کی شیشی ہاتھ میں ہے!! — یہ حال تھا — یہ عالم تھا —— انصاری کی اس نوجوان "فوج" کا! ہم لوگ اشاروں پر دوڑتے تھے اور نگاہوں سے ارادوں کا پتہ پاتے تھے! —— ہماری جوانی کا وہ قافلہ اس زمانے میں کس قدر تیز رفتار تھا۔

جب خلافت وفد کے لئے لندن کے حریم وزارت عظمیٰ سے دعوت آئی اور بہت ہی عاجلانہ مشورے ہونے لگے کہ کون جائے اور کون نہ جائے، میں دہلی میں تھا، سہ پہر کو تین بجے گھنٹی بجی۔ کسی نے کہا، ڈاکٹر صاحب ابھی بلاتے ہیں، گیا تو دیکھا کہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہوئے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مختصراً اس دعوت کا حال سنایا اور آخر میں کہا، تمھیں بھی چلنا ہے۔ میں نے جواب دینے سے پہلے حکیم صاحب کی طرف دیکھا، پہلے اس سے کہ حکیم صاحب کچھ کہیں وہ کہنے لگے، ادھر کیا دیکھ رہے ہو پہلے تو ان ہی کی رائے ہے کہ تم جاؤ! بھئی خدا جانے اس مرکب قافلے میں کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے، تھوڑا سا تریاق بھی ساتھ رہنا چاہئے۔ میں نے کہا کب؟ کہنے لگے کل صبح! کل صبح! — اور لندن کا سفر! جی ہاں! — اب فرمانے لگے —— آپ کچھ سیر و سیاحت کے لئے تو نہیں جا رہے ہیں کہ اس کے لئے کچھ ساز و سامان بھی مہیا کریں! تمھیں چلنا تو ہے قاضی! پھر صبح اور شام کی بحث کیا! —— اس طرح وہ اور حکیم صاحب چند گھنٹے پہلے بمبئی پہنچے اور ان کے سات آٹھ گھنٹے بعد میں پہنچا۔ صبح جہاز پر سوار ہونا ہے، شب بھر خلافت کے دفتر میں حکیم صاحب اور وہ اور مولانا شوکت علی اور میں، اور چند لوگ بیٹھے ہوئے منصوبہ بندی کر رہے ہیں —— وہ یہ کہیں گے تو ہم یہ جواب دیں گے، وہ یہ جواب دیں گے تو ہم یہ جواب دیں گے، ہم مطالبہ کریں گے، وہ جب مسترد کریں گے تو ہم اس کو یوں رد کریں گے، کس کس سے وہاں ملیں گے، ترکوں سے کیا باتیں کریں گے، آغا خاں سے کس طرح گذرے گی، سیٹھ چھوٹانی (خلافت وفد کے صدر) کو یہ باتیں کس طرح سمجھائی جائیں، قدوائی (مشیر حسین قدوائی) کو اس مجون مرکب میں کس طرح کھپایا جائے! غرض وہ رات آنکھوں میں گذری اور باتوں میں —— دیار مغرب کی طرف میرا یہ پہلا سفر تھا اور بڑا "شاندار" سفر تھا! دو جوڑے کھدر کے کپڑے لے کر جہاز پر سوار ہوا۔

مجھے خوب یاد ہے وہ واقعہ جو یورپ کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد پہلے ہی دن پیش آیا —— اس واقعہ میں دولت کی خود غرضی کے خلاف میری بغاوت اور انصاری کی شیریں Accommodating فطرت نمایاں ہوئی۔ ہوا یہ کہ مارسیلز پہنچ کر "ٹامس کک" کے نمائندے نے ہمیں بتایا کہ اسی رات کو پیرس جانے والی ٹرین میں شب خوابی کے ڈبے خالی نہیں ہیں، اس لئے رات بھر کا سفر بیٹھ کر طے کرنا پڑے گا۔ میری رائے تھی کہ ایسی حالت میں ایک شب مارسیلز میں گذار دیں اور صبح کو دن کی گاڑی سے روانہ ہوں۔ یہ بحث ہو رہی تھی کہ ٹامس کک کا نمائندہ پھر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شب خوابی کے ڈبے میں دو بستر مل سکتے ہیں اس لئے کہ وہ کسی راجہ صاحب کے لئے محفوظ تھے جنھوں نے آج شب میں اپنا سفر ملتوی کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی سیٹھ صاحب نے کہا کہ فوراً روانہ ہو جانا چاہئے اور اسی وقت اپنے آدمی کو ٹامس کک کے دفتر میں بھیج کر وہ دونوں بستر اپنے اور اپنے ایک ملازم کے لئے محفوظ کرا لئے! سیٹھ جی کی یہ ادا مجھے بہت ناگوار گذری، خصوصاً اس لئے کہ سیٹھ صاحب نے ڈاکٹر انصاری کی آسائش کا بھی خیال نہ کیا اور محض اپنی اور اپنے نوکر کی آسائش کا انتظام کر کے وفد کی روانگی کا فیصلہ کر دیا۔ بہت ہی غصے کی حالت میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا آپ ہرگز نہ جائیے، اس وقت ان ہی کو جانے دیجئے! وہ وقت تھا جب میں نے انصاری کے کردار کی رفعت کا پتہ پایا، فرمانے لگے: قاضی! اس قسم کی چیزوں کے لئے تیار رہ کر کام کرنا ہے! سیٹھ کو اگر اپنے آرام کا اس قدر خیال ہے تو رہنے دو [illegible]

ہیں اور اس سے زیادہ کی توقع ان سے کرنا ہی نہ چاہیئے، مگر میں اور تم سپاہی ہیں اور سپاہیوں ہی کی طرح ہمیں آرام و آسائش کے معاملات سے قطع نظر کرنی چاہیئے، میں نے کہا یہ آپ کی توہین ہے! کہنے لگے :- توہین ایک اضافی اصطلاح ہے — ! سیٹھ بیچارے میری کیا توہین کر سکتے ہیں؛ میں خود اپنی توہین کروں گا اگر اس ذرا سی بات کو وجہ شکایت بنالوں؛ خاموش رہو! ابھی تو آغاز کار ہے! ——

یہ فطرت تھی انصاری کی، یہ وسعت تھی اس فطرت کی! ——اس وسعت میں دوست اور دشمن سب سمیٹ لئے جاتے تھے۔ اس رات کو میں اور انصاری ایک بھرے ہوئے ڈبے میں بیٹھے ہوئے اور جاگتے ہوئے پیرس تک آئے ——میں چاء کی کیتلی کے پانی کی طرح کھول رہا تھا اور وہ مسکرا رہے تھے!! —— تقریباً ۲۵ سال کی دوستی میں انصاری کو غصہ آتے میں نے صرف اس وقت دیکھا، جب کوئی شخص ان کے قائد یا اصولوں پر نازیبا حملہ کرتا تھا، یا کوئی شخص ان کے مسلک سے غداری کرتا تھا، یا ان کا کوئی ساتھی کسی ایسی اخلاقی کمزوری کا ارتکاب کرتا تھا جو "تحریک" کو متاثر کرتی ہو —— ورنہ وہ وسیع میدان —— جو ان کا دل تھا —— ایک سخی کا دسترخوان تھا کہ "یہاں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست"!

اپنے اور پرائے سب ہی ان کی ہمہ گیر محبت سے اپنا حصہ پاتے تھے حتیٰ کہ سی آئی ڈی کے خفیہ نویس بھی جس کی حقیقت سے انصاری واقف ہوتے تھے، اور جو پھر بھی نیاز مندی کر ان کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی رواداری اور محبت کے اس خزانے سے اپنا حصہ پاتے تھے؛ ایک زمانے میں ان کے مطب کا ایک چوکیدار بڑا ہی محنتی اور مخلص ملازم تھا، وہ اسے بہت پسند کرتے تھے اور اکثر اس کو انعام و اکرام سے بھی نوازتے تھے۔ اس نے ایک دفعہ بیمار ہو کر بھی رخصت لی، مدت تک اس کا پتہ نہ چلا —— اس زمانے میں کسی طرح ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور اپنے متعلق اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رپورٹیں بھی انھوں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیں؛ چند روز بعد ایک دن مطب میں اس کی بیوی روتی ہوئی آئی اور اس نے کہا کہ اس کا شوہر اس قدر بیمار ہے کہ تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے یہ سن کر وہ فوراً ہی اس کے گھر پہنچے، دیکھا تو وہ لب گور تھا اور کم بخت آتشک کے مرض میں مبتلا تھا، اس کے لئے زندگی کا امکان سو حصے میں ایک حصہ بھی نہ تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے ہمت کی، اسی وقت اپنا سامان منگایا، ڈاکٹر بلوائے اور ایسا کامیاب عمل جراحی کیا کہ چند روز بعد وہ اچھا ہو گیا، صحت یاب ہو کر وہ جس دن مطب میں آیا تو میں موجود تھا، آتے ہی قدموں میں گر پڑا اور رو رو کر اس نے اپنی غداری کی تمام داستان ڈاکٹر صاحب کو سنائی، اور یہ بھی کہا کہ وہ اب اس ملازمت سے استعفیٰ دے چکا ہے۔ وہ بیٹھے ہنستے رہے اور سنتے رہے، اس کے بعد اس کی پنشن مقرر کر دی جو وہ عمر بھر پاتا رہا! —— یہ وہ ڈاکٹر انصاری تھے جو اس شب مارسیلز پیرس ایکسپریس کے ایک بھرے ہوئے ڈبے کے ایک گوشے میں رات بھر بیٹھے ہوئے مجھ سے مزے مزے کی باتیں کرتے رہے اور میں اس خیال سے کڑھتا رہا کہ ہم آرام سے سو سکتے اگر سیٹھ صاحب کے نوکر کو بھی شب بھر سفر کرنے کے لئے ایک نرم اور گرم بستر کی ضرورت نہ ہوتی!!

ایک دن میں لندن کے سوائے ہوٹل میں ترکی وفد کو لنچ دینے کا انتظام کر رہا تھا، میز کی نشستوں کا نقشہ بنایا جا رہا تھا، اتنے میں ڈاکٹر صاحب اور مشیر حسین قدوائی آ گئے، قدوائی صاحب نے نشستوں کو اس طرح بدلنا چاہا کہ ڈاکٹر صاحب کی نشست صدر سے دور ہو جاتی تھی، مجھے غصہ آ گیا، وہ قدوائی کو ہٹا کر لے گئے، رات کو مجھ سے کہنے لگے، تم کو غصہ کیوں آیا تھا؟ میں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کی نشست کو قدوائی کی نشست سے بھی نیچا کر دیا جاتا: کہنے لگے :- یہ فضول بات ہے تمھاری! نشستوں کے تقدیم و تاخیر سے کیا ہوتا ہے، ناحق تم لڑے قدوائی سے!! —— آج جو میں قائدین ملت کو جلوس کی ترتیب میں اور جلسوں کے پلیٹ فارموں کی نشستوں میں اگلی صف تلاش کرتے دیکھتا ہوں تو اپنے دل سے کہتا ہوں، کہاں گئے وہ انسان، جو نشستوں کو تلاش نہ کرتے بلکہ نشستیں اُن کو تلاش کرتی تھیں، کہاں گئے وہ مردانِ میدان جو بہت بڑی قیمت دے کر قوم سے عزت و اعتماد حاصل کرتے تھے۔

برخلاف عہد حاضر کے قائدین ملت کے جو یہ سودا مفت خرید رہے ہیں صرف باتوں ہی باتوں میں!! میں نے انصاری کو جیل خانوں کی کوٹھڑیوں میں دیکھا اور بڑے بڑے راجوں اور نوابوں کے عشرت کدوں میں بھی! —— وہی ایک انصاری تھا جو وہاں بھی اور یہاں بھی! —— زندگی کی سختیوں اور صعوبتوں میں بھی اور آسانیوں اور آسائشوں میں بھی! شرم سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ جب سوچتا ہوں کہ نہ میں خود آج تک اس شخص کی سوانح نگاری کا فرض انجام دے سکا اور نہ کسی اور کو اس کے عقیدت مندوں میں سے یہ توفیق نیک حاصل ہوئی —— غلاموں کے اس ملک میں ہم اپنے محسنوں کو کس قدر جلد بھول سکتے ہیں! یہ چند سطریں خراج عقیدت نہیں —— وہ خراج تو میں عمر بھر لکھتا رہوں تو ادا نہیں ہو سکتا —— میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور عمر کی اس منزل

سے بھی گذر چکا ہوں، جہاں انصاری کے لئے ان کے رب کا بلاوا آگیا تھا، لیکن جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ انصاری زندہ ہیں اور کل ہی ہم دونوں مل چکے ہیں ۔

(مرسلہ سری نواس لاہوٹی حیدرآباد دکن)

عظیم اللہ خاں

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک میں خدا جانے کتنے ہی ایسے جانبازوں نے حصّہ لیا تھا جن کے ناموں اور حالات سے آج ہم ناواقف ہیں۔ کہیں کہیں کوئی نام نظر آ جاتا ہے تو پھر ہم اس کے حالات کو پرانی کتابوں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ آج کل میں ۱۸۵۷ء کے ایک ایسے ہی جانباز کے حالات کی جستجو میں ہوں۔

ہندوستان کی تاریخ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (Indian War of Independence 1857) میں کچھ مختصر حالات ملے۔ پھر رسلز ڈائری Russel's Diary میں اس شخص کا کچھ ذکر آیا۔ یہ ۱۸۵۷ء میں لندن ٹائمز کا نامہ نگار تھا اور ہندوستان میں موجود تھا۔ پھر لارڈ رابرٹس کی کتاب "ہندوستان میں چالیس سال" Forty years in India میں کچھ اشارے ملے۔ اب فکر یہ ہے کہ عظیم اللہ خاں کے کچھ زیادہ حال معلوم ہو سکیں یہ مختصر اشارات صرف اسی لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ اگر اس زمانے کی تاریخوں میں دوسرے اہلِ نظر کو ان عظیم اللہ خاں کا کچھ نشان ملا ہو تو وہ اس سوانح کی تکمیل کر دیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں عظیم اللہ کا نام اس حیثیت سے آتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اس انقلابی تحریک کا نقشہ بنایا تھا اور وہ آخر تک اپنے منصوبوں کی تکمیل میں کوشاں رہے۔

بقول ساورکر کے عظیم اللہ خاں ایک بہت غریب باپ کے بیٹے تھے۔ وہ صرف اپنی ہی قابلیت کے زور سے آگے بڑھے اور بالآخر نانا صاحب کے سیاسی مشیر ہونے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ صرف اتنا تو معلوم ہو سکا کہ وہ اپنے ابتدائی زمانے میں کسی انگریز کے گھر میں ملازم تھے اور باورچی کا کام کرتے تھے۔ اس انگریز کا نام اور عظیم اللہ کی زندگی کے اس زمانے کا حال کچھ زیادہ معلوم نہیں سوائے اس کے کہ انھوں نے اسی زمانے میں بدیسی زبانیں سیکھیں اور انگریزی اور فرنچ دونوں زبانیں بولنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے انگریز کی ملازمت ترک کی اور کان پور کے ایک مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ پھر اپنی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر اسی مدرسے میں ٹیچر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی قابلیت اور علمیت کی خبر نانا صاحب تک پہنچی اور وہ برہم ورت کے دربار میں بلائے گئے۔ اس کے بعد تو نانا صاحب ان کے قیمتی مشوروں پر اس قدر عمل کرنے لگے کہ کوئی بڑا معاملہ ان کے مشورے کے بغیر طے نہیں ہوتا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ نانا صاحب اپنی وراثت کے لئے انگریزوں سے جھگڑ رہے تھے۔ جھگڑا یہ تھا کہ گورنر جنرل نے نانا صاحب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ باجی راؤ کے گود لئے ہوئے بیٹے کی حیثیت سے باجی راؤ کی پنشن کے حقدار ہیں۔ گورنر جنرل کے اس فیصلے کے خلاف پیروی کرنے کے لئے نانا صاحب نے عظیم اللہ خاں کو انگلستان بھیجا۔ انگلستان اور یورپ میں عظیم اللہ خاں کے سفر کے حالات بہت ہی کم معلوم ہیں اور بہت زیادہ تحقیق اور تلاش کے محتاج ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ انگلستان کی سوسائٹی میں وہ بہت ہر دل عزیز ہو گئے۔ حتّٰی کہ ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی انگریز عورتوں کے محبت آمیز خطوط اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ لیکن اس ہر دل عزیزی کے باوجود اُن کو اپنے مشن میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے صاف کہہ دیا کہ وہ گورنر جنرل کے فیصلے کی تائید کرتی ہے۔ اس کے بعد ہی عظیم اللہ خاں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے منصوبے تیار کرنے شروع کئے۔ اب بقول ساورکر ان کو یہ فکر ہوئی کہ اپنے ملک کے لوگوں کو کس طرح انگریز سے بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ ان خیالات نے عظیم اللہ خاں کے دل میں ایک نئی امید اور آرزو کا چراغ روشن کر دیا۔ اسی زمانے میں لندن میں ایک مرہٹہ برہمن یعنی ستارا کا رنگو باپوجی بھی بیٹھا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی بیخ کنی کس طرح کی جائے

انسان سے کس طرح انتقام لیا جائے۔ عظیم اللہ خاں اکثر باپوجی سے ملا کرتے تھے اور ان دونوں میں خفیہ مشورے ہوا کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں کا ذکر ساورکر نے اپنی کتاب میں تو کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کو یہ اطلاع کس طرح اور کہاں سے ملی۔ بہر حال گمان ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نے مل کر لندن ہی میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا نقشہ بنایا۔ لندن سے باپوجی تو سیدھے ستارا گئے لیکن عظیم اللہ خاں نے ہندوستان واپس ہونے سے پہلے یورپ کے بعض ممالک کا دورہ شروع کیا۔ یہ سفر غالباً اس لئے کیا گیا کہ یورپ کے بعض فرمانرواؤں سے انگریزوں کے خلاف امداد حاصل کی جائے۔ وہ اس مقصد کو لئے ہوئے سب سے پہلے سلطان ترکی کی راجدھانی میں گئے جو خلیفۃ المسلمین سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت روس اور ترکی کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور سبستاپول کے معرکے میں انگریزوں کو شکست ہو چکی تھی۔ بقول ساورکر عظیم اللہ خاں روس بھی گئے اور وہاں چند روز قیام کیا۔ گمان یہ ہے کہ وہ روس میں یہ کوشش کرنے گئے تھے کہ روس انگریزوں کے خلاف ایشیا میں بھی جنگ شروع کر دے۔ ساورکر نے ترکی اور روس میں عظیم اللہ خاں کی کوششوں کی طرف جو اشارے کئے ہیں اُن کے متعلق "تاریخی حوالے نہیں دئے ہیں۔ اس لئے یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ عظیم اللہ خاں نے کیا کوششیں کیں اور اُن کا کیا نتیجہ نکلا۔ البتہ ہندوستان میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ نانا صاحب نے روسیوں سے کوئی معاہدہ کر لیا ہے اور روسی ایشیا میں انگریزوں سے لڑنے کے لئے تیار ہیں۔

رسل کے روزنامچے کے حوالے سے ساورکر نے لکھا ہے کہ جب عظیم اللہ خاں روس گئے تو وہاں اُن کی ملاقات رسل سے جو لندن ٹائمز کا فوجی نامہ نگار تھا ہوئی تھی۔ رسل ہی نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ جس وقت ۱۸ جون کو انگریزی اور فرانسیسی فوجوں کو روسیوں کے مقابلے میں شکست ہوئی تو عظیم اللہ خاں انگریزی کیمپ میں پہنچ گئے۔ ان کا لباس ہندوستانی تھا اور بہت اچھے ریشم کا بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی رسل اپنے خیمے سے نکل کر آیا تو عظیم اللہ خاں نے اس سے کہا کہ "اس مشہور شہر اور ان رستموں یعنی روسیوں کو دیکھنے آیا ہوں جنہوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو ایک ساتھ شکست دی ہے۔" رسل نے عظیم اللہ خاں کو اپنے خیمے میں بلایا۔ اس وقت روسی توپوں کے گولے انگریزی کیمپ کے قریب گر رہے تھے اور بقول رسل ایک گولہ تو عظیم اللہ خاں کے قریب آ کر گرا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ [illegible] ہونے سے پہلے عظیم اللہ خاں نے رسل سے کہا کہ "مجھے شبہ ہے کہ تم کبھی اس مضبوط قلعے پر قبضہ کر سکو گے۔"

لارڈ رابرٹس نے اپنی کتاب میں ایک خط کا ذکر کیا ہے جو عظیم اللہ خاں نے اسی زمانے میں سلطان ترکی کو ہندوستان میں انگریزوں کے متعلق لکھا تھا۔ اسی سلسلے میں لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ ایک فرانسیسی کے دو خط ملے تھے جس کا نام لافان تھا۔ ان خطوں کی عبارت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لافان ان دعوت ناموں کا حسبِ مراد جواب لانے کی امید رکھتا تھا جو اس کے ذریعے سے کلکتے کے بعض لوگوں اور شاید چندر نگر کی فرانسیسی آبادی کے لوگوں کو بھی بھیجے گئے۔ ان خطوط میں انگریزوں کے مخالف لوگوں کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ انگریز کا جوا اُتار کر پھینک دیں۔ بقول لارڈ رابرٹس ایسے متعدد خطوط تھے اور بعض تو خود عظیم اللہ خاں کے قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ دو خط قسطنطنیہ میں عمر پاشا کے نام تھے جن میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں سپاہی بہت بددل ہوئے ہیں اور عام طور پر ہندوستان کی حالت بہت خراب ہے۔

یہ معلوم نہیں کہ عظیم اللہ خاں روس کے بعد کہاں گئے لیکن کانپور میں ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس میں یہ اشارا تھا کہ مصر سے بھی کچھ گفت و شنید ہو رہی ہے۔ کانپور واپس آنے کے بعد ساورکر نے برہم ورت میں عظیم اللہ خاں کی مصروفیات کا اس طرح ذکر کیا ہے:

> "مسند پر نانا صاحب جو انقلابی روح کے اوتار تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بھائی بابا صاحب اور بالا صاحب اور ان کے بھتیجے راؤ صاحب بھی موجود تھے اور اپنی جانیں قربان کرنے پر تیار تھے اور انہیں کے پہلو میں وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے ایک خانگی ملازم کی ادنیٰ حیثیت سے ترقی کر کے اپنے آقا کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور یورپ کی سیاست کا مطالعہ کر کے اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کا عزم کر چکا تھا۔ یہ شخص عظیم اللہ خاں تھا۔"

۵۷ء کی انقلابی تحریک شروع ہونے سے چند ہی روز پہلے تک عظیم اللہ خاں کانپور میں تھے اور ساورکر نے ان کا ایک لطیفہ لکھا کہ وہاں انگریز ایک پناہ گاہ بنا رہے تھے تو عظیم اللہ خاں نے ایک انگریز لفٹنٹ سے سوال کیا۔ "کیوں صاحب اس نئی عمارت کا کیا نام رکھنے والے ہیں"۔ لفٹنٹ نے کہا کہ "ابھی تک ہم نے کوئی نام سوچا نہیں ہے"۔ اس پر عظیم اللہ خاں نے آنکھ مار کر کہا۔ "کہ ابھی تم

اس مکان کا نام مایوسی کا قلعہ Castle of Despair کیوں نہیں رکھ دیتے۔"

اب معلوم نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہو جانے کے بعد عظیم اللہ خاں پر کیا گزری اور وہ کہاں گئے۔ ان کی زندگی کا یہ حصہ تاریخ کے صفحات پر بالکل موجود نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس زمانے کے لٹریچر کو زیادہ تلاش کیا جائے تو کچھ نہ کچھ پتا ضرور چلے گا۔ یہ مختصر مضمون ارباب فکر و نظر کے لئے ایک دعوت ہے۔ عظیم اللہ خاں کے وجود سے دو باتوں پر بہت تیز روشنی پڑتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ ۱۸۵۷ء کا غدر بلاشبہ آزادی کی ایک انقلابی تحریک تھی اور اس میں کام کرنے والے غلامی سے نجات پانے کے بڑے بڑے منصوبے بنا رہے تھے اور دوسرے یہ کہ اس تحریک کی بنیاد میں ہندو مسلمانوں کا کوئی فرقہ وارانہ امتیاز موجود نہ تھا مثلاً ایک کٹر ہندو لیڈر نانا صاحب — کا ایک بڑا مشیر کار ایک مسلمان ہی تھا جس طرح جھانسی کی رانی کے ساتھ آخر وقت باندے کے نواب نے داد شجاعت دی۔

اس انقلابی تحریک کے ان دو پہلوؤں پر تاریخ کی روشنی میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جو ابھی تک نہیں لکھا گیا۔ (درسالہ۔ جبیب خاں صاحب ہالی گڑھ)

ہندوستانی موسیقی نمبر

آج کل کا آئندہ شمارہ
"ہندوستانی موسیقی نمبر" ہوگا

یہ شمارہ سہ رنگی اور دوسری تصویروں کے ۱۶ اور مضامین کے ۱۱۲ صفحوں پر مشتمل ہوگا۔ ہندوستان کے مقتدر ماہران موسیقی کے سوانح اور موسیقی کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ مضامین شامل اشاعت ہوں گے

قیمت صرف ایک روپیہ ہوگی۔ یہ شمارہ خریداروں کو سالانہ چندے ہی میں ملے گا۔

آج ہی سے خریدار بن جائیے — تاکہ یہ شمارہ آپ کو عام شماروں کی قیمت پر مل جائے

آج کل کا سالانہ چندہ صرف ۱۰ روپے ہے

ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات کا آرڈر ابھی بھیج دیں۔ بعد میں تکمیل نہ ہو سکے۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸

امتیاز علی عرشی

جنتِ نو

ہمالا سے آتی ہیں ٹھنڈی ہوائیں
چلو اِس کے جنگل میں منگل منائیں
یہاں بستیوں میں درندوں کے بھٹ ہیں
جو موقع ملے سب کو یہ پھاڑ کھائیں
وہاں یہ رہے ہیں محبت کے چھینٹے
کسی جا پہ چھوٹی سی بستی بسائیں
پھریں ہر طرف ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
شب و روز اُلفت کی بنسی بجائیں
ہم جب ہنسیں گو نج اُٹھیں فضائیں
چمن کھل پڑیں، مل کے جب مسکرائیں
زمانے کے آلام سے دُور بھاگیں
فقط عیش و آرام کے گیت گائیں
جو دُکھ ہو کسی کو تو سب چیخ اُٹھیں
مسرت میں سب مل کے خوشیاں منائیں
اگر کوئی اپنی مدد کو پکارے
تو سب اُس کی آواز پر دَوڑ جائیں
کسی کے لئے جاں بھی دینا پڑے گر
تو ہرگز نہ اس کام سے جی چرائیں
گر اس جنتِ نَو میں عرشی نہ آئے
تو ڈھونڈ کر کے اُس رند کو بھی بلائیں

شکور جاوید

انجمنِ شوق

کیا قیامت ہے کہ اک بات کسی کے آگے
لب تک آتی ہے مگر دل میں رہی جاتی ہے
بھولتی ہی نہیں وہ صورتِ زیبائے خیال
دل سے مٹتی ہے تو آنکھوں میں کھنچی جاتی ہے
حُسنِ خود دار کی اللہ رے یہ مجبوری
میری ہر بات پسِ پردہ سُنی جاتی ہے
رفتہ رفتہ تری آنکھوں میں حیا کی تحریر
شوق کے پاؤں کی زنجیر ہوئی جاتی ہے
کانپنے لگتے ہیں جب رات کے گہرے سایے
کوئی آواز ہے پہروں جو سُنی جاتی ہے
میری باتوں کو تغافل سے نہ سننے والے
میری آواز تری بات ہوئی جاتی ہے
مجھ کو ہر لمحہ گماں ہوتا ہے جیسے دل میں
کچھ دُھواں اُٹھتا ہے اور آگ لگی جاتی ہے
جانے کون انجمنِ شوق میں آیا جاوید
خود بخود شمع کی لَو تیز ہوئی جاتی ہے

آنسہ عائشہ

ہماری شادیاں

شادی کی قسمیں اتنی ہی ہیں جتنی جلدی امراض کی۔ شادی جن کی ہوتی ہے، جن کے ذریعے سے ہوتی ہے، جو شروع سے بات چیت کرتے ہیں اور آخر وقت تک میاں بیوی کے جھگڑے چکاتے رہتے ہیں۔ ان میں ہر ایک باعثِ دلچسپی ہوتی ہے۔ شادی کی مثال اس چوہے دان کی سی ہے جس کے اندر کچھ چوہے بند ہیں اور کچھ باہر گھوم رہے ہیں۔ مگر دونوں چوہے دان کی سلاخوں سے سر ٹکراتے ملتے ہیں۔ اندر والے باہر آنے کے لئے اور باہر والے اندر پہنچنے کے لئے، مگر ایک دوسرے کو یہ سمجھانے سے مجبور ہیں کہ اندر کیا مصیبت ہے اور باہر کیا لطف۔

شادی میں چند بول، چند رسموں کے بعد مرد اور عورت ایک دوسرے سے جوڑ دئے جاتے ہیں اور عموماً اس رشتے کی بنا پر دو خاندان ایک دوسرے سے بندھ جاتے ہیں اور سمدھیانے کا نازک رشتہ بڑی بڑی خانہ جنگیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے، خیر

ایک کہاوت ہے کہ شادی کے بعد مرد اور عورت گھر یا گرہستی کی گاڑی کے دو پہیے بن جاتے ہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ دونوں پہیے ایک ناپ کے نہیں ہوتے جس کی وجہ سے خود سوچئے کہ گاڑی دھچکے کھاتی چلتی ہوگی اور یہ کہ بیچاری گاڑی پر کیا گذرتی ہوگی۔

میاں بیوی کی دقتوں اور مشکلوں کا اندازہ آسان نہیں، دونوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنا ممکن نہیں۔ سچ ہے کون کسی کی پریشانی سمجھ سکتا ہے، پھر بھی جب کبھی ہمارے سامنے آتے ہیں تو نمائشی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بہروپیا بن کر، اور اگر کبھی کوئی اپنے دل کی بات بتانے پر راضی بھی ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو اس قدر بے بس اور مظلوم بنا کر پیش کرتا ہے کہ ہم دوسرے ساتھی کو ظالم سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

تمام دنیا کی قوموں کی شادیوں کے طریقے گنانا کیسا خود ہندوستان میں شادی کے مختلف رسم و رواج پر نظر ڈالنا آسان کام نہیں اس لئے فی الحال مسلمانوں کی شادیوں پر سرسری نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ مذہب کے لحاظ سے شادی کے تین جزو اہم ہیں۔ پہلا ایجاب Offer دوسرا قبول Acceptance اور تیسرا مشتہری Publicity

آج سے پچاس سال قبل شادی ایک ڈھنگ سے ہوتی تھی۔ ماں باپ رشتے ناتے والے پہلے خود ہونے والے رشتے کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے۔ لڑکوں کے سر پر نکاح پڑھا دیا جاتا اور لڑکی بہت سے جہیز کے ساتھ سسرال والوں کے سپرد کر دی جاتی۔ ایسی شادیوں کے طے کروانے میں ایک درمیانی کیریکٹر کا ہونا ضروری تھا۔ مسلمان گھرانوں میں یہ خدمت "بی مشاطہ" کے ذمے تھی۔ اب تو کسی اصلی مشاطہ کو دیکھنے کا موقع شاید ہی ملے کیونکہ بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ یہ قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ سُنی سنائی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بی مشاطہ ادھیڑ عمر کی ناک نقشے سے درست، حافظہ کی اچھی، ہاتھ پاؤں سے مضبوط ہوتی تھیں۔ ان کا لباس تنگ پیجامہ، چکن کا لمبا کرتہ اور سفید دوپٹہ ہوتا جس کے چاروں کونوں میں رکھے پُڑے بندھے ہوتے، ہاتھ کان میں چاندی کا زیور، پاؤں میں گھسا گھسا یا سلیپر اور سر کے قریب تیل سے چپکٹ ٹیڑھی مانگ نما برقع پہنے محلوں محلوں گشت کرتیں، جب کبھی بی مشاطہ کسی گھر میں داخل ہوتیں تو گھر کی نوجوان لڑکیاں اندھیری کوٹھری میں جا چھپتیں اور سب دل ہی دل میں دعائیں مانگتیں کہ "یا اللہ اب کی ہماری باری ہو۔"

بی مشاطہ بڑی بی کے پلنگ کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کرتیں پھر جیسے جیسے بات بڑھتی کھسر پھسر شروع ہو جاتی، پان کھائے اور کھلائے جاتے، خاندانی شجرے دہرائے جاتے۔ لڑکے کے سیکڑوں عیوب

گنائے جاتے اور لڑکی کی خوش نصیبی کی پیشین گوئیاں ہونے لگتیں۔

بی مشاطہ (اپنی خاص آواز میں) "تمھارے سر کی قسم بڑی بی بی، ایسا لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہ ملے گا، بس سمجھو تو "لال محل والی" کئی بار منلانی کو بھیج چکی ہیں۔ کہتی ہیں کہ سونے کے کڑے اور پانسو نقد دیں گی اگر ننھے مرزا کا پیغام ان کی لڑکی کے لئے لے گئی۔ اے وہی خالدہ خانم، مگر لڑکی ہے کہ اچھال چھکا، میرا دل اس پر نہیں ٹھکتا، دوسرے میں کرلے نے کر کیا کروں گی۔ اب نگوڑی عاقبت بناؤں کہ سونے چاندی کی فکر کروں؟ میں نے سوچا پہلے تمھارے یہاں ہوتی چلوں، اللہ رکھے جس گھر میں بارہ چودہ بیاہنے والی لڑکیاں ہوں اُن کا فرض پہلے ادا ہونا چاہیئے۔"

بڑی بی بی۔ "اے اپنے گھر میں لڑکیوں کی کمی ہے۔ اب دیکھو منجھلی دلہن کے کیا ہوتا ہے۔"

بی مشاطہ۔ "اللہ رکھے مجھے تو تمھاری کلثوم پسند ہے۔ لڑکی جیسے بیلے کی کلی، خود میں بھی شرمائیں (آہستہ سے) اور اگر ننھے مرزا کو بیاہ گئی تو سونے سے پیلی اور موتیوں سے سفید رہے گی، اللہ نے چاہا تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے گی۔"

بڑی بی بی (قریب کھسکتے ہوئے) "اچھی بندی یہ بتا کہ لڑکا ہڈی سے کمزور تو نہیں، میرا کہنا ہے کہ خاندان میں کوئی خراب خون تو نہیں۔"

بی مشاطہ۔ (ہنستے ہوئے) "اے تو یہ کرو بی بی، کوئی میں دمڑی ٹکے کی تو ہوں نہیں کہ ــــ بی بی یہ کام کرتے بال سفید ہو گئے۔ آج تک تو کوئی ایسی بے تکی بات کی نہیں۔"

غرض کہ یوں جیسے ہی سلام و پیام کا سلسلہ جاری رہتا۔ جب بات پکی ہونے لگتی تو بی مشاطہ کو پیڑھی کی بجائے عزت کے ساتھ پلنگ پر بٹھایا جانے لگتا، اور اگر شادی میں دیر ہوتی تو بی مشاطہ لڑکی کے ارمانوں اور لڑکے کی جوانی پر ترس کھا کر دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع کرا دیتیں اور قدرتی بات ہے کہ دونوں جانب سے ان کو منہ مانگا انعام دیا جاتا۔ بی مشاطہ جہاں بھی بیٹھتیں اکثر چہک کر ایسی ایسی باتیں کرتیں کہ لڑکی شادی سے پہلے ہونے والے میاں پر ہزار جان سے فدا ہو جاتی اور لڑکا ہونے والی بی بی کو جنت کی حور سمجھ بیٹھتا۔

چونکہ بی مشاطہ کی روزی کا ذریعہ صرف یہی تھا اس لئے وہ اکثر وقت بے وقت سمدھیانوں میں کوئی ایسی چنگاری ڈال دیتیں کہ دونوں طرف کے لوگ ان کی خوشامد کرتے، ان کی جیبیں بھرتے کیونکہ دونوں طرف ڈر ہوتا کہ کہیں بات چیت نہ ٹوٹ جائے اور جگ ہنسائی نہ ہو۔ چونکہ اُس وقت لوگ زبان دے دینے کے بعد بات سے پلٹنا بہت بڑی بے عزتی سمجھتے، خاص طور پر لڑکی والے کیونکہ ایک جگہ طے ہوئی بات ختم ہو جانے پر لڑکی میں ہزاروں عیب نکالے جانے لگتے۔

برسوں پہلے جو شادیاں بی مشاطہ کے ذریعے سے ہوتیں اُن کی ایک قسم یہ تھی کہ میاں کی عمر بی بی سے بہت زیادہ ہوتی۔ ایسا تو اب بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ جب تک پردے کا رواج تھا تو یہ نامناسبت منظرِ عام پر نہیں آتی تھی۔ لیکن لوگ ایسے جوڑے کو اکثر باپ بیٹی سمجھ بیٹھتے اور بعد کو خوب شرمندگی ہوتی۔

سنتے ہیں جب حسن آرا، بارہ سال کی عمر میں بیاہ کر سسرال آئی تو گھر مہمانوں سے اُمڈ پڑا تھا۔ جب تک ساری رسمیں ختم نہ ہو گئیں حسن آرا زیور اور کپڑوں سے لدی پھندی تخت پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بے چاری بیٹھتی بھی کیوں نا، وہ سوتے جاگتے میکے کی نائن سر پر سوار رہتی۔ اللہ اللہ کر کے رسمیں ختم ہوئیں بیویاں اپنے گھروں کو سدھاریں، دیکھتے دیکھتے گھر خالی ہو گیا۔

دلارے میاں کی ماں کو مرے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، دونوں چھوٹی بہنیں ماں کی زندگی میں بیاہی جا چکی تھیں۔ ان کے کوئی بھائی بند بھی نہ تھا کہ گھر میں بھاوج آتی۔ ان کے بڑھاپے کی شادی کا ایک مقصد یہ تھا کہ کوئی گھر بار دیکھنے والا ہو جائے گا۔ مگر یہاں قصہ دوسرا ہوا۔

نائن کے چلے جانے کے بعد حسن آرا کچھ دن تو گڑیا گڈوں کو یاد کر کے روتی رہی، مگر کب تک کوئی سوگ مناتا۔ رفتہ رفتہ گلشن اس کی سہیلی بن گئی، اب کیا تھا گھروندا بنایا جانے لگا۔ جب میاں شام کو اندر آتے تو بیوی کو سوتا پاتے اور مسہری پر بہت سی گڑیا گڑیوں کو بھی محوِ آرام پاتے۔

میاں۔ "اری گلشن یہ گڑیاں۔۔۔۔"

گلشن "جی دلھن بیگم کی ہیں۔"

میاں (تعجب سے) "یہ کھواب کا پچامہ۔۔۔"

گلشن۔ "جی دلھن بیگم کے میکے سے آئی ہیں۔"

میاں چکرائے کہ جو ساس سسر سلامی کے پانچ روپے تک دے سکے اب بیٹی کی گڑیوں کو اس قدر مہنگے کپڑے بھیج رہے ہیں۔ مگر مروّت چُپ

ہو رہے اور گلشن نے اطمینان کا سانس لیا ان کو کیا معلوم کہ میں آنا نے ہاتھ کے کڑے گلشن کے حوالے کر دیے تھے۔ گلشن نے کچھ تیا پانچہ کیا اور گھر رنگ برنگی بانکی ترچھی گڑیوں سے بھر گیا۔

اب ہوتا یہ کہ باہر مردانے میں میاں دوائیں کھرل میں پیس رہے ہیں۔ جسم پر مالش ہو رہی ہے، سر میں تیل ڈالا جا رہا ہے اور اندر گڑیوں کا جہیز تیار ہو رہا ہے ڈھول دھپا کھیلا جا رہا ہے۔

ایک دن یہاں بیٹھک میں دیواں گڑگڑا رہے ہیں۔ کریم بخش پاؤں دبا رہا تھا۔ نائی سر سے سفید بال چن چن کر نکال رہا تھا کہ اندر سے خبر آئی۔

گلشن۔ (دروازے کی اوٹ سے) "کریم بخش میاں سے کہہ دو کہ حمیدہ کو ڈھی بیگم "گل شبو" کی شادی کر رہی ہیں۔ گڈے میاں کے لئے گھوڑے کا انتظام اور دعوتِ ولیمہ کے لئے چار بکرے آئیں گے۔"

میاں (چونکتے ہوئے) "چار۔۔۔ چار بکرے؟ ہائیں یہ گل شبو کون ہے؟"

گلشن "جی ان کی بڑی گڑیا۔۔۔۔"

میاں "کیا کہا۔۔۔۔"

شادی کی ایک قسم وہ تھی جس میں میاں دولت مند مگر بدشکل۔ بی بی غریب مگر خوب صورت ہوتی۔

سنتے ہیں جب "شہزادی بیگم" آخری چالے کے لئے میکے آئیں تو سہیلیوں نے گھیر لیا۔

ایک سہیلی۔ "شنزو پیاری! ہمیں بھی اپنے کوہ قاف کے شہزادے کا حال بتاؤ نا؟"

دوسری سہیلی۔ "کیا پوچھ ہو جین والو۔" (گاتے گاتے ایک دم رک کر) پیاری بڑا دماغ، جب سلامی کے لئے اندر آئے اور سہرا چہرے سے اُٹھایا گیا تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔"

تیسری سہیلی۔ "تو خود اپنے کو تو دیکھ۔ لگی باتیں بنانے، شکل چڑیلوں کی اور مزاج پریوں کا۔"

شہزادی بیگم (بل کر) "اللہ کرے جیسے تجھے بھی کوئی احمق کا بچہ ملے۔"

دوسری سہیلی۔ "اور شکل کا عنگور۔"

پہلی سہیلی۔ "اے جان اپنے ناخدا کو یہ باتیں۔"

تیسری سہیلی۔ "اجی چھوڑو بھی، اماں کہتی ہیں کہ مرد کی شکل صورت نہیں دیکھی جاتی، روپیہ اور خاندان دیکھا جاتا ہے۔"

شہزادی بیگم۔ "میں تو عمر بھر حمیدی کو دعا دوں گی۔ یہی پیغام لے کر آئی تھیں۔"

پہلی سہیلی۔ "لے یہ تو بتا کہ "ان" نے چاند سا مکھڑا دیکھ کر کیا کہا؟"

شہزادی بیگم۔ "یہ زنجیر ہے دیکھو، کہنے لگے اسے لاکٹ کہتے ہیں۔"

پہلی سہیلی۔ "ہائیں، اس کے اندر کیا ہے؟ اچھا، تصویر ہے۔"

دوسری سہیلی۔ "جیسے کوئی بیچارے کی شکل کو ایک بار دیکھ کر بھول سکتا ہے۔"

تیسری سہیلی۔ "اچھا ہے جی۔ میاں کا نقش بیوی کے دل پر رہنا چاہیئے۔"

اکثر بی مشاطہ گھر جنوائی شادیاں کرا دیتیں۔ اس قسم کی شادی میں بجائے اس کے کہ لڑکی رخصت ہو کر سسرال جائے خود لڑکا بیوی کے گھر میں آ کر رہنے لگتا۔ ہوتا یہ کہ غریب ہونہار لڑکا یہ سوچ کر کہ مالی امداد ہو جانے پر وہ آئندہ ترقی کر سکے گا۔ اپنے کو نک چڑھی بیوی اور دولت مند سسرال والوں کے سپرد کر دیتا، پھر عمر بھر بیوی کے طعنے، ساس کی جھڑکیاں اور سسر کی سخت و سست باتیں برداشت کرتا۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہوتا یہ ہے کہ۔

حمیدہ بیگم۔ "گلابو ـــ اری گلابو۔۔۔۔" دولہا میاں کو ناشتے کے لئے بلا لا۔"

گلابو۔ (جھلا کر) "میں تو صبح ہی صبح کہہ آئی تھی مگر انھوں نے نماز بھی جائی ہے نہ ابھی تک منہ دھویا ہے، بیٹھے کتاب پڑھ رہے ہیں۔"

حمیدہ بیگم۔ "اے بیٹی رفعت تم انھیں اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آتیں ناشتہ پڑا جھنک رہا ہے۔"

رفعت۔ "اماں کہتی تو ہوں مگر میری کہاں سنتے ہیں۔"

حمیدہ بیگم (بگڑتے ہوئے) اے تو کیا اسی دن کے لئے گھر جنوائی رکھا ہے۔"

اقبال۔ (آتے ہوئے) آداب عرض کرتا ہوں امی جان!

حمیدہ بیگم (اکتاہٹ سے) "جیتے رہو۔ خوش رہو۔"

رفعت۔ "بیٹھئے نا! کھڑے کیوں ہیں آخر۔"

حمیدہ بیگم (کھنکارتے ہوئے) "لو پہلے یہ گاجر کا حلوا کھاؤ، اور میاں تم ابھی

اپنے سسر کے غصے سے واقف نہیں ہو۔ کل کہہ رہے تھے۔"

اقبال۔ (نگاہیں کا جائزہ تیز کرتے ہوئے) "جی . . . . "

رفعت۔ "اماں ناشتہ تو کر لینے دو بے چارے کو۔"

حمیدہ بیگم۔ "اے بچی میں کیا جانوں۔ وہی رات کہہ رہے تھے کہ اقبال سے منع کر دینا کہ تافی کے لڑکوں کے ساتھ نہ گھوما کریں۔ بچے نفنگے دنیا بھر کے . . . . ."

اقبال۔ "جی . . . "

حمیدہ بیگم۔ اور جو یہ تم لایب ریلی . . . . "

رفعت۔ " لائبریری اماں۔"

حمیدہ بیگم۔ "اے میں کیا جانوں، ایب ریری، لایب ریلی کو۔ تم ایسی جگہوں پر نہ جایا کرو۔"

اقبال۔ "جی۔"

سنتے ہیں اکثر لڑکی پیدا ہونے پر پھوپھی، چچی یا خالہ میں سے کوئی نال کاٹنے والے کونڈے میں اپنے لڑکے کے نام سے چند پیسے ڈال دیتیں۔ یہ رسم کونڈے کی منگنی کہلاتی۔ یعنی لڑکی پیدا ہوتے ہی منگ جاتی، اور چار پانچ سال کے صاحبزادے بغیر کسی اطلاع کے منگیتر بن جاتے۔ یہ منگنیاں عام طور پر ٹوٹتی نہ تھیں۔ اس لئے جب کبھی لڑکے یا لڑکی کی بے وقت موت ہو جاتی تو شادی سے پہلے ہی رنڈاپا آجاتا۔

کونڈے کی منگنی کے بعد شادیاں کم عمری ہی میں ہو جاتیں۔ جہیز کا کیا کہنا وہ تو چھوچھک چھلے کے کپڑوں کے ساتھ ہی تیار کیا جانے لگتا۔ اس منگنی کا ایک فائدہ یہ ضرور تھا کہ لڑکا اور لڑکی بچپنے سے غیر شعوری طور پر آئندہ زندگی کے لئے تیار ہو جاتے۔ لڑکی شروع سے اپنے کو کسی کی ہونے والی بہو، کسی کی بیوی، کسی کی ماں سمجھنے لگتی۔ چونکہ پردے کا رواج عام تھا، اس لئے جب کم عمری میں لڑکی کا پردہ کرا دیا جاتا تو صاحبزادے ماں اور خالہ کی نظر بچا کر ہونے والی کو ایک نظر دیکھ لینے کی فکر کرنے لگتے۔ اور آخر کار جب شادی ہو جاتی تو بڑھاپے تک بچپن کے رنگین زمانے اور چوری چھپے ملاقاتوں کا لطف اٹھاتے۔

میاں۔ "اے میری جان کو کیا ہو گیا اگر عزیز نے شستا کی لونڈیا سے ذرا ہنس کر بات کر لی۔"

بیوی۔ "توبہ، کوئی تم سے کچھ کہہ تھے۔ بیٹھ گئے چو نچلے بگھارنے۔ میں کہتی ہوں تمھارا بس چلے تو بیٹے کو تباہ کر دو۔"

میاں۔ "دیکھو عزیز کی ماں۔ تم تو ہماری امنگوں پر پانی پھیر دیتی ہو۔ عمر بھر تمھاری غلامی کی۔ اب دو ٹوک پیار کے کہہ دو تو۔"

بیوی۔ "اے یہ وقت چہلیں کرنے کا ہے، چلو ہٹو بھی، تمھیں تو اسی وقت خبر ہوگی جب لڑکا . . . . "

میاں۔ "تم تو سٹھیا گئی ہو۔ لڑکا جوان ہے کوئی بچہ نہیں۔ (اگر یاد کرتے ہوئے) سوچو تو تم خود کیسا چھپ چھپ کر ہمیں جھانکا کرتی تھیں۔"

بیوی۔ (نرم ہوتے ہوئے) "لو اب اڑنے لگے پر کی۔ میں نے کبھی جھانکا تاکی نہیں کی۔ یہ تو تمھارے ڈھنگ تھے۔ یہی بیٹے میں عادتیں آئی ہیں۔"

میاں۔ (بیوی کے سفید بالوں کو چھوتے ہوئے) "یہ زلفیں اور یہ آنکھیں۔ بس جب کواڑ کی اوٹ سے جھانکتیں تو دل . . . . . "

بیوی۔ " پھر وہی۔ میں جھانکتی کہ تم، جہاں دیکھو شیطان کی طرح چھپے رہتے۔ بڑی بوبو کی شادی میں ایسا ڈرایا کہ اب تک تو اس کے خیال سے دل دھڑکنے لگتا ہے۔ "

میاں۔ "پتا ہے اس روز بڑے بھیا نے کیسی کان گوشی کی۔"

بیوی۔ "تبھی کان ہیں کہ چھاج "

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

پرانے سماجی ماحول کی وجہ سے جب نئی نویلی دلھن سسرال جاتی تو مہینوں پلنگ پر بیٹھے گزر جاتے یا پھر ساس کے پاس تخت پر سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتفاق سے سسر، جیٹھ یا نندوئی گھر کے اندر آجاتے تو بہو دوہری ہو کر کھڑی ہو جاتی۔ چار بالشت لمبے گھونگھٹ کی اوٹ سے سات بار جھک کر سلام کا اشارہ ہوتا۔ اور اگر کبھی کسی سسرالی رشتہ دار کے یہاں شادی یا عقیقے کی تقریب ہوتی تو بہو کو چوتھی کا جوڑا اور سر سے پاؤں تک کچھ جہیز کے اور کچھ مانگے کے زیورات پہنا کر لے جایا جاتا۔ پھر محفل میں تصویر کی طرح سجا کر بٹھا دیا جاتا۔ نکاح کی گھڑی سے لے کر بہت دیر تک دلھن نمت کی مصیبت کا شکار رہتی۔

عام طور پر پہلی اولاد کے ہونے پر دلھن کو کچھ آزادیاں مل جاتیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک سال میں دلھن ماں بن جاتی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے کی پوری آزادی ساس کے مرنے پر ملتی۔ کیونکہ گھر میں ایک نہیں ایک درجن بہوئیں آجاتیں مگر ساس

کے آگے کسی کی نہ چلتی۔

پُرانے زمانے میں "ادلے بدلے" کی شادیاں بھی ہوتیں۔ یعنی ایک گھر کی لڑکی دوسرے گھر کے لڑکے، اور دوسرے گھر کی لڑکی پہلے گھر کے لڑکے کو بیاہ دی جاتی۔ دُلہنوں میں نند بھاوج کا دُہرا رشتہ قائم ہو جاتا اور سمدھیانوں کی کمان زیادہ چڑھ جاتی۔ ایسی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کی جاتیں۔ گھر سے بیٹی رخصت ہوتے دُلہن کا ڈولا اُتارے جانے کے انتظامات شروع ہو جاتے۔ لیکن سمدھیانے والوں میں چوتھی چالے کی رسمیں ختم ہوتے ہی تُو تُو میں میں شروع ہو جاتی۔

چھوٹی بیگم۔ "میں نے تو پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ یہ شادیاں پروان چڑھنے کی نہیں ہیں۔"

دادی بی۔ "اے بچی، ہمارے وقتوں میں کتنی ادلے بدلے کی شادیاں ہوئیں مگر آج کل کا سا نہ دیکھا نہ سُنا۔ چالے ختم ہوتے ہی دونوں گھرانوں میں آگ لگ گئی۔"

چھوٹی بیگم۔ "دیکھ لینا آپا بی۔ کوئی دن جاتا ہے کہ جوتیوں میں دال بٹنے لگے گی۔ کوئی ٹھیک نہیں جو ہاشم بیگ کی لڑکی کو گھر بٹھا لیں۔"

دادی بی۔ "توبہ توبہ، جو اللہ نہ دکھائے تھوڑا ہے۔"

چھوٹی بیگم "مجھے تو سطا شبیر بیگ کی لڑکی کی معلوم ہوتی ہے۔ سسرال سے پہلی بار گھر گئی تو ماں سے نہ جانے کیا کہہ سُن آئی کہ اماں نے بیٹی کا بدلہ بہو سے نکالا۔ اس کا پانچ تولے کا گلوبند۔۔۔۔"

دادی بی۔ (پنا کتی میں پان کوٹتے ہوئے) "اے جو لڑکی کی نانی نے دیا تھا۔"

چھوٹی بیگم۔ "ہاں وہی، زیور کے ڈبے سے غائب کروا دیا۔"

دادی بی۔ "اللہ، اللہ۔ اندھیر ہے بی بی۔"

چھوٹی بیگم "یہی نہیں ابھی اس دن جو دونوں نند بھاوجیں بنے مرزا کی شادی میں آئیں تو وہ لڑائی ہوئی کہ جوتی پیزار تک نوبت آگئی۔ وہ تو کہو کہ"

دادی بی۔ "اللہ اللہ کیا وقت آن لگا ہے توبہ ہے۔"

اکثر دو بھائی، دو بہنوں کو بیاہ دئے جاتے۔ گویا ساتھ کی پلی بہنیں جو ہمیشہ یہ دعا کرتیں کہ خدا وہ دن کرے جب بڑی آپا سے چھپا چھپی، گھونگھٹ کھلنے تک بیٹھی آپا ہوتیں اور وہ پرانی بہنی کا ساتھ۔ اب ایک اور نئے رشتے کے ساتھ۔

بچوں کی چیخ پکار کے ساتھ گھر میں تھوڑی دیر کے لئے طوفان آگیا۔

دیورانی۔ "اے مردار کیوں مارے ڈالتا ہے۔ ذرا سی رنڈیا کو دھنک کر رکھ دیا بچہ ہے کہ شیطان۔"

جیٹھانی۔ "دیکھو چھوٹی بہو تم سے ہزار بار کہہ دیا کہ میرے بچے کو کچھ نہ کہا کرو۔ مگر تمھارا کلیجہ جلتا ہے۔"

دیورانی۔ "آپا تم تو سدا کی ظالم ہو۔ تمھارا کیا جائے گا۔ اگر رنڈیا لولی لنگڑی ہو گئی تو"

جیٹھانی۔ "اُف تمھاری یہ مجال۔ مجھے بھی گالیاں دینے لگیں۔"

دیورانی۔ (روتے ہوئے) "ہائے میری قسمت۔ اماں نے مجھے تمھارے ساتھ اسی گھر میں جھونک دیا۔ آنکھ کھولی تو نہیں پایا۔ نگوڑی کوکھ میں تمھارا بیک ڈلوائی۔ اور اب یہاں بھی تمھارا سایہ۔۔۔۔۔ آنہ دیتا دھرتا جا۔"

جیٹھانی۔ "کلیجے میں رکھ لو اپنی لاڈلی کو، نہ آنے دیا کرو میرے دالان میں، کوئی شنا ہوا اس کے بغیر۔"

دیورانی۔ "آپا تمھارا بس چلے تو بہری بوٹیاں کو۔۔۔"

ساس۔ (دور سے) "اے چھوٹی بڑی دُلہن کیوں لڑے جاتی ہو۔ کیسا زمانہ ہے۔ بہن بہن کو کھائے جاتی ہے۔"

دیورانی۔ (روتے ہوئے) "اللہ اماں کو جنت نصیب کرے جو مجھے اس جہنم میں ڈال دیا۔"

جیٹھانی۔ "اے اماں غریب کی روح کو کیوں تکلیف دیتی ہو۔ لکھونا اپنے خصم سے گھر الگ کر لیں۔"

دیورانی۔ "وہی اس قابل ہوتے تو اچھا دن ہوتا۔" سعدنگی سے۔

کبھی کبھی کچھ سرپھرے اپنی سماجی سطح سے ہٹ کر اپنی مرضی سے شادی کر بیٹھتے۔ مثلاً نواب خاں کے بیٹے نے خانم جان کو نکاح میں لے لیا۔ مگر باپ نے مرتے دم تک بیٹے کی صورت نہ دیکھی۔

یا پھر کسی روپے پیسے والی نے نوابی نواب کو شوہر بنا کر در جہ عطا کر دیا۔

ایک مرد۔ "یار کیسا ہاتھ مارا ہے اس تقیس کے بچے نے۔"

دوسرا مرد۔ "میاں اس نا معقول کی حرکت سے ہماری محفل میں تو عیب لگ گیا۔"

پہلا مرد۔ "سنتے ہیں اب تو خانم جان نے دنیا ہی تج دی۔"
دوسرا مرد۔ "یار سب چار دن کی باتیں ہیں۔ پھر دیکھنا۔"
تیسرا مرد۔ "اور کچھ سُنا وہ جو چھمی بیگم تھیں نا۔"
پہلا مرد۔ "ہاں ہاں وہ جو نکڑ والے مکان میں رہتی تھیں۔"
دوسرا مرد۔ "یہی جو نواب کے یہاں بھیروں گائی تھیں۔ کیا سماں بندھا تھا"
تیسرا مرد۔ "ہاں اُس نے لُٹّن نواب . . . . "
پہلا مرد۔ "اجی یہ تو پُرانی خبر ہے۔"
دوسرا مرد۔ "لاحول ولا قوۃ۔ دل بہلانے کے چند ذریعے تھے سو وہ بھی بند ہوئے جاتے ہیں۔"
پہلا مرد۔ "ان مردوں کو شریف عورت نہیں ملتی جو . . ."

بیوی کے مقابلے میں میاں اکثر زیادہ پڑھا لکھا ہوتا۔ کسی دفتر میں ملازم ہوگا اور انگریز افسروں کی مصاحبت میں کلب کی تفریح کا چسکا پڑ جاتا۔ بی بی شام کی ہنڈیاں بھگار کر میاں کے انتظار میں دروازے کی طرف تکا کرتیں گھنٹوں انتظار میں کٹ جاتے تو تھک کر پڑ رہتیں۔ اگر گھر میں بچے ہوتے تو انھیں تھپکا دیتیں۔ پھر جب بارہ ایک بجے میاں لوٹتے تو ان سے ایک آدھ جھڑپ ہو جانا لازمی تھا۔
میاں۔ "کیا سوگئیں . . . ."
بیوی۔ "میں سوؤں یا مروں، تم تو اپنے گلچھرے اڑایا کرو۔ سارے جہان کے دفتر چار بجے بند ہوجاتے ہیں۔ مگر . . . . "
میاں۔ "آہستہ بولو نا۔ بچے جاگ جائیں گے۔"
بیوی۔ "دھل کر، بڑے بچوں کے خیر خواہ ہو۔ ایک دن ہو دو دن ہو تو کوئی صبر کرے مگر یہ روز کا قرینہ . . . . "
میاں "تم تو اوندھی کھوپری کی ہو۔ سمجھتی ہو میں اپنی خاطر سینما یا کلب جاتا ہوں۔ آج بڑے صاحب کی میم کہنے لگیں کہ "ہم پکچر دیکھنا چاہتا ہے۔" کہہ دیتا کہ نہیں جاؤں گا۔"
بیوی "تو جاؤ نا کسی میم کو لے آؤ۔ مجھے تو کیوں بیاہ کے لائے ہو۔"
میاں "اجی اپنا تو گھر اس قابل ہی نہیں کہ کسی کو چائے پر بھی بلا لیں۔ تمہیں ہاتھ ملانا تک تو آتا نہیں۔ کتنی دفعہ میم صاحب نے کہا کہ "ام تمھاری بی بی سے ملے گا۔" میں کیا کروں۔"
بیوی۔ "رہنے دو ایسی میم کو۔ مجھے نہیں شوق ہے ملنے کا۔"
میاں۔ "یہی تو کہتا ہوں تم خود تو دقیانوسی ہو۔"
بیوی "ہاں ہاں۔ میں تو جاہل ہوں، دقیانوسی ہوں۔ اب تو مجھ میں سارے عیب ہوگئے۔" (رونے لگتی ہے)
میاں "لاحول . . . . "

ایک اور قسم ان میاں بی بی کی ہوتی جو پڑھے تو برائے نام ہوتے ہیں مگر مغربی تقلید میں ماہر۔ ان کا ابتدائی زمانہ خوش گوار گزرتا۔ سینما دیکھنے جاتے دوستوں کی دعوتیں ہوتیں۔ لیکن ان کے یہاں بدگمانیاں جلد شروع ہو جاتیں۔ بی بی نے دیکھا کہ میاں مس ٹلو کے آگے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جب دیکھو مس ٹلو لپ اسٹک تھوپے یا پاؤڈر کی تہ پر تہ جمائے مرد کو پھانسنے کی فکر کر رہی ہیں تو وہ جل بھن جاتیں —— پھر میاں کو شک ہوتا کہ جب دیکھو بیوی غزارہ پھڑ پھڑاتی اُن حضرت کے ساتھ ٹہل رہی ہیں۔ یا جب دیکھو وہ حضرت کلب میں کرسی گھسیٹ کر بیوی کے قریب آ بیٹھتے ہیں۔
ساس۔ "اللہ ماری مجھے کیا خبر تھی کہ پڑھی لکھی بہو ہر وقت میاں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوما کرے گی۔ نہ ساس سے مطلب نہ سسر کا لحاظ۔"
بیٹی۔ "اماں تم ہر وقت بھابھی کی جان لئے رہتی ہو۔ ہزار بار کہہ دیا کہ تم میری طرح ان کا اچار نہیں ڈال سکتیں۔ معلوم ہے شادی سے پہلے لڑکوں کے کالج میں پڑھتی تھیں۔"
ساس۔ "تبھی تو مردمار ہو گئی ہے۔ دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ اماں باوا اسی لئے پڑھاتے ہیں۔"
بیٹی۔ "اماں یہ بھی دیکھو کہ شروع میں بھیا کیسا ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے آخر کو آنے جانے لگیں۔"
ساس۔ "تو تو بڑی چاہنے والی ہے نا اُس کی۔ اگر سیدھے مُنہ بات کرتی ہوتی تو اللہ جانے تو کیا کرتی۔"
بیٹی۔ "اماں ایمان لگتی کہا کرو۔ پرسوں وہ کتنا کہتی رہیں کہ پارٹی میں نہیں جائیں گی مگر نہ مانے۔"
ساس۔ "اے بچی، ہمارے وقتوں میں جو ہم کہہ دیتے وہی ہوتا، مجال تھی

کہ تمھارے باپ میری مرضی کے خلاف "ہوں" جو کریں۔ یہاں جب
دیکھو میاں بی بی باہر ہیں یا پھر وہ ڈائن ٹلو موجود۔"
بیٹی۔ "اماں تمھارے میاں کوئی دوسری بار آیا نہیں کرتم۔"
ساس۔ "اے بچی! یہ شریفوں کے قرینے ہیں کہ جیٹھ سسر باہر بیٹھے ہیں اور
اندر دھاچوکڑی مچی رہتی ہے"
بیٹی۔ "تو کیا ہر وقت گھسر پھسر کیا کریں۔"
ساس "اور تو اور یہ ٹلو کی بچی حرامزادی پہننی کیا ہے؟ جھاڑ سا گلہ کھولے
پیٹ، پیٹھ دکھاتی مینھیں ساری پھینے گھومتی ہے۔"
بیٹی۔ "چھوڑو بھی اماں، تم سے کیا۔"
ساس۔ "اے یہ دلھن کا منہ کیوں پھولا تھا صبح؟"
بیٹی "پتہ نہیں شاید رات خوب روئیں تھیں بے چاری!"
ساس "دیکھ لینا اب کوئی گل کھلنے والا ہے۔"
بیٹی۔ "اماں تم تو اپنی سی کہتی ہو۔"
ساس۔ "اچھا دیکھ لینا یہ سر دودھ میں سفید نہیں کیا ہے۔"
بیٹی۔ "ہوں۔"

تو جناب یہ تھیں شادی کی چند جھلکیاں، بلکہ شادی شدہ زندگی کی
پرچھائیاں!

گھنشیام سیٹھی

پنجاب کا لافانی شاعر — وارث شاہ

قومی زبان کی اہمیت ظاہر ہے۔ لیکن عوام تک پہنچنے۔ اُن کی روح کی تھاہ لینے اور سماج کو جنم دینے والے مختلف طبقوں کے ذہنی رجحانوں تک پہنچنے کے لئے ہمیں علاقائی زبانوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ قومی زبان ان زبانوں کے جتنا قریب ہوگی۔ اتنا ہی قومیت کا جذبہ بڑھے گا۔ قومی زبان میں قومیت کا روپ نکھرے گا اور باہمی محبت بڑھے گی۔

پنجاب کو جو ہندوستان کی ڈھال ہے۔ سمجھنے کے لئے اور پانچ دریاؤں کے کناروں پر بسنے والوں کے جذبات کی عکاسی کے لئے پنجابی کا علم ہونا ضروری ہے اور پنجابی کا علم وارث شاہ کی "ہیر" کے بنا ادھورا ہے۔ جہاں پنجابی ادب خواجہ مرید شاہ حسین، احمد یار، قادر یار، مقبل، سلطان باہو اور بلھے شاہ اور دوسرے سکھ گوروؤں کی صوفی اور مذہبی شاعری پر فخر کرتا ہے۔ وہاں اسے وارث شاہ جیسے رومانی شاعر کی تخلیقات پر بھی ناز ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھیں تو وارث شاہ کی شہرت اور مقبولیت مندرجہ بالا سبھی شاعروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اور وہ ایک لافانی احترام، شہرت اور ہر دلعزیزی کا مالک ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو سکتی ہے کہ مندرجہ بالا شاعروں میں زیادہ تر بعید الفہم صوفی شاعر تھے۔ جن کی تخلیقات اپنی روحانی چھاپ اور تقویت کی اونچی اڑان کی وجہ سے عوام کی سمجھ سے باہر کی چیزیں تھیں۔ ان کے ہاں مذہبی بیان کی چاشنی تھی اور نہ اسلوب بیان کی رنگینی تھی۔ لیکن وارث شاہ نے عشق مجازی کو ایسا رنگ دے کر ابھارا کہ اس کے ڈانڈے "عشق حقیقی" سے ملا دیئے۔ وارث شاہ نے اپنی انتھک محنت سے پنجابی زبان میں تخیل، انداز، ہیئت، اسلوب بیان اور صنف کے بے شمار تجربے کئے۔ اور پنجابی زبان و ادب کے خزانے میں ایسے موتیوں کو بھر دیا جو نایاب نہیں کم یاب ضرور تھے۔ آج بھی جب ہم پنجابی کے نئے اور پرانے ادبی ورثے کو ایک نظر دیکھتے ہیں تو صدیوں پہلے ہو گزرا یہ شاعر جس کو موجودہ شاعروں کے مقابلے میں بہت کم سہولتیں میسر تھیں، پنجابی ادب اور کلچر کا واحد نمایندہ نظر آتا ہے۔ اس دھات اور پتھر کے زمانے میں وارث شاہ نے فن کے مجسمے کو جس لگن محنت اور دیانتداری سے تراشا اور سنوارا ہے۔ آج کی اس ترقی پسند مشینی اور ایٹمی دنیا میں بھی اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

وارث شاہ کے حالات زندگی صحیح طور پر معلوم نہیں۔ ان کے سن پیدائش اور سن وفات کی تحقیق بھی نہیں ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر کا جنم ۱۷۳۵ء میں جنڈیالہ ضلع شیخوپورہ (پاکستان) کے ایک معزز سید گھرانے میں ہوا[1]۔ خاندانی روایات کے مطابق اس نے قرآن مجید اور کچھ دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ گھر میں کیا۔ پھر مولانا حافظ مرتضٰے قصوری نے وارث شاہ کو اپنی درسگاہ میں داخل کر لیا۔ یہاں وارث نے فارسی اور عربی ادب کا مطالعہ کیا[2]۔ یہیں اس نے تصوف کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اور صوفی بننے کی ٹھان لی۔ اس بارے میں بھی پنجابی کے عالموں میں اختلاف رائے ہے۔ کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ وارث شاہ نے پاک پٹن شریف کے ایک بزرگ سے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ لیکن وارث شاہ کے مندرجہ ذیل شعر سے اس خیال کو تقویت نہیں

---

[1] پیدائش کے متعلق یہ ایک قیاس ہی ہے۔ لیکن تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ۱۷۷۵ء میں اس نے اپنی عظیم تخلیق "ہیر" کو پیدا کیا اور اس وقت وارث شاہ کی عمر چالیس سال تھی

[2] "ہیر" میں کئی جگہوں پر وارث شاہ نے "گلستان" "بوستان" "سکندرنامہ" "اللہ باری" "رزاق باری" کا ذکر کیا ہے۔

ملتی ہے

وارث شاہ وسنیک جنڈیالے دا　　　　شاگرد مخدوم قصور والے دا
(وارث شاہ جنڈیالے کا رہنے والا ہے اور مخدوم قصوری کا شاگرد ہے)

وارث شاہ کی ایک ہی تخلیق منظرِ عام پہ آئی ہے اور وہ ہے "ہیر" ممکن ہے اس نے کچھ اور بھی لکھا ہو۔ لیکن وہ منظرِ عام پر نہیں ہے۔ وارث کی شہرت کا باعث صرف "ہیر" ہی ہے۔ پنجابی کے کئی دوسرے مشہور شاعروں نے کئی کئی قصے قلمبند کئے ہیں لیکن وارث شاہ کی ایک "ہیر" ان سب پر بھاری ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہیر کی تخلیق کر دینے کے بعد کچھ اور کہنے اور لکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ "ہیر" کی کہانی وارث شاہ کے دماغ کی اُپج نہیں۔ یہ ایک صحیح حادثہ ہے جو مغل حکومت کے قائم ہونے سے کچھ برس پہلے ہوا تھا ہیرا اور رانجھا اسی حادثے کی لپیٹ میں آجانے والے دو کردار تھے۔

خیال کیجئے کہ اصل واقعے کے قریب دو سو برس بعد ایک شاعر اس بھولی بسری کہانی کو پھر زندہ کرتا ہے اور اس میں نئی زندگی کے رنگ بھرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے فردوسی نے "شاہنامہ ایران" میں۔ ایران کے یُگ دھرم کے کھنڈروں میں پھر زندگی کی ہر دوڑا دی تھی یا نظامی نے فرہاد اور شیریں اور لیلےٰ و مجنوں کے وقت کی گود میں سوئے ہوئے کرداروں کو پھر زندہ جاوید کر دیا تھا۔ یوں تو "ہیر" کا قصہ کئی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ لیکن پنجابی میں تو وارث سے پہلے اور اس کے بعد اس قصے پر بیسیوں شاعروں نے طبع آزمائی کی (اور اب بھی یہ سلسلہ بند ہوتا نظر نہیں آتا) خود وارث شاہ نے لکھا ہے

یاراں اساں نوں آن سوال کیتا　　　　قصہ ہیر دا نواں بنائیے جی
(دوستوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ "ہیر" کا قصہ پھر لکھوں)

یہاں ہیر کی کہانی کا مختصر ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ "ہیر" جھنگ (پاکستانی پنجاب) کے سیال خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ چوچک سیال خاندان کے سرداروں میں سے تھا۔ ہیر ابھی بچی ہی تھی کہ اس کی منگنی رنگپور کھیڑیاں (پاکستانی پنجاب) کے ایک رئیس سید سے ہو گئی تھی۔

رانجھا تخت ہزارہ کا رہنے والا تھا۔ وہ آٹھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور اپنے باپ کا لاڈلا تھا۔ بڑے بھائی اور بھاوج اس سے جلتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد اسی وجہ سے اُسے گھر چھوڑ دینا پڑا۔ گھومتا گھامتا وہ چناب کے کنارے آ نکلا۔ وہاں ایک خوبصورت بجرا دیکھا۔ اس میں داخل ہو کر وہاں بچھے ایک پلنگ پر سو گیا۔ آنکھ کھلنے پر اس نے دیکھا کہ بجرے کی مالکن غصے میں بھری ہوئی اُسے گھور رہی ہے۔ نظریں ملتے ہی دونوں عشق کے تیر سے گھائل ہو گئے۔ ہیر نے رانجھے کی کہانی سُن کر اُسے اپنے یہاں نوکر رکھوا دیا۔ ملاقاتیں ایک دن رنگ لائیں اور رانجھے کو نوکری سے نکال کر چوچک نے ہیر کی شادی سید سے کر دی۔ رانجھا ایک جوگی کے بھیس میں رنگپور پہنچا۔ ہیر اس کے ساتھ بھاگ نکلی۔ لیکن دونوں گرفتار کر لئے گئے۔ معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہوا پھر وہاں کے راجا کے سامنے رکھا گیا۔ اس نے [illegible] سے متاثر ہو کر ہیر کی شادی منسوخ کر دی اور اسے رانجھے کے ساتھ شادی کی اجازت دے دی۔ رانجھا برات کی تیاری کرنے اپنے گھر گیا۔ لیکن اسی دوران میں ہیر کے باپ نے اسے زہر دے دیا اور ہیر کی موت کی خبر لے کر قاصد ہزارہ پہنچا۔ رانجھا نے سُنتے ہی ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کی روح بھی ہیر سے جا ملی۔ اختصار کے ساتھ یہی ہے وہ کہانی جس کو سُن کر انشاء نے کہا تھا

سُنا یاران کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگ ہیر رانجھے کے قصے کو وارث سے پہلے بھی جانتے تھے۔ اور کئی شاعر اس پر طبع آزمائی کر کے اپنے شاعرانہ کمال کی دھاک بٹھانے کی کوشش کر چکے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وارث کی ہیر اتنی مقبول ہو گئی اور اونچے پائے کے شاعروں کی تخلیقات بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ محض اتفاق

لہ اندھے شاعر مقبل نے "جنگ نامے" کی تخلیق سے پہلے ۱۷۴۶ء میں سب سے پہلے "ہیر" کو نظم کیا تھا۔ گو وارث شاہ اور مقبل کی کہانیوں کے عناصر بہت حد تک ملتے جلتے ہیں لیکن وارث شاہ کی "ہیر" میں جو ڈرامائی کیفیت ہے وہ مقبل کی ہیر میں مفقود ہے۔

سے وارث کو جوانی میں خود بھی کچھ ایسے ہی حادثے کا شکار ہونا پڑا تھا کہتے ہیں کافی عرصے تک وارث نے پاک پٹن کے نزدیک ٹھٹھہ جاہد کے گاؤں میں صوفی بن کر قیام کیا۔ لوگ اسے ہر طرح ماننے لگے اور اس کی بڑی عزت اور احترام کرنے لگے تصنع اور تکلف سے پاک وارث انھیں معارف اور یوگ پر اپدیش دیتا۔ اس کے پاس آ کر بیٹھنے والوں میں ایک نوجوان لڑکی بھاگ بھری بھی تھی۔ جو دھیرے دھیرے وارث کے دل میں گھر کر گئی۔ ادھر بھاگ بھری کے دل میں بھی محبت کی آگ سلگ رہی تھی۔ سید ہونے کے ناتے وارث پر لوگوں کا بڑا اعتقاد تھا۔ لیکن جب بھاگ بھری اور وارث کے تعلقات کی یہ خبر اڑی تو لڑکی کے رشتہ دار بڑے برہم ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ نوبت وارث کی پٹائی تک پہنچی اور اسی محبت کے چکر میں وارث کی عزت آبرو بھی خاک میں مل گئی۔ بھاگ بھری کا نام "ہیر" میں کئی جگہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر جب رانجھا اور اس کی بھاوج میں چخ چخ ہوتی ہے، تو وارث بھاگ بھری کا ذکر چھیڑ دیتا ہے اور بڑے درد بھرے انداز میں کہتا ہے۔

وارث شاہ نوں نہ مارنی بھاگ بھریئے

آ نی سن دی پیاریئے واسطہ ای

(بھاگ بھری تو وارث شاہ کی جان نہ لے۔ آ میری محبوبہ تجھے واسطہ ہے)

ایسی جگہیں کئی اور بھی ہیں جس سے پڑھنے والے پر یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ بھاگ بھری صرف کوئی تخیل ہی نہیں تھا[1]۔ بلکہ کوئی جیتی جاگتی عورت تھی۔ جس سے وارث شاہ کو والہانہ عشق تھا۔ وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس فرقے اور خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور بھاگ بھری اور وارث شاہ کے قصے کی تفصیل کیا ہے۔ لیکن جہاں جہاں "ہیر" میں بھاگ بھری کا ذکر آیا ہے۔ اس سے قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رومانس ناکام رہا ہو گا۔ اس ناکامی نے وارث شاہ کی تخلیقی قوت پر کوئی ہنگامی اثر نہیں چھوڑا۔ ایک فائدہ اس سے ضرور ہوا کہ ایک شاعر اور انسانی دل و دماغ کے ایک صناع ہونے کی وجہ سے محبت کا یہ تلخ تجربہ بیش قیمت تھا۔ اگر وارث پر یہ حادثہ نہ گزرا ہوتا تو انسانی جذبات سے مطلق شاعر کا علم اتنا گہرا اور باریک بین

---

[1] بھاگ بھری کا "ہیر" کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

نہ ہوتا۔ جب "ہیر" میں وہ رانجھے کے دل کی کیفیت بیان کرتا ہے تو اصل میں اپنی آپ بیتی ہی پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کے الفاظ میں درد ہے۔ کسک ہے، بیان میں واقعیت اور سوز و گداز ہے۔ ایک عاشق صادق کے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ اسی لئے اس میں شدت کا تاثر پیدا کرنے کی بے پناہ قوت ہے۔ اور ہر ایک آدمی قدرتاً اس سے متاثر ہوتا ہے شروع سے لے کر اخیر تک "ہیر" میں جس درد، کسک اور واقعیت کی عکاسی کی گئی وہ اصل میں دین ہے اس کی اپنی ناکام محبت کی اور اسی نے وارث شاہ کی ہیر کو ایک امتیازی درجہ دیا ہے۔ "ہیر" میں واقعات کی تیزی کے ساتھ ساتھ جذبات کی عکاسی بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ "ہیر" دل و دماغ دونوں کو اپنے حسن فن کی گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ اور قاری کے دل و دماغ پر دیر تک اپنا تسلط قائم رکھتی ہے۔

وارث شاہ کی ہیر پنجابی کا ہی نہیں عالمی ادب کا ایک ورثہ ہے وارث کا اپنا ایک انداز بیان ہے۔ اپنی بھاشا ہے، اپنی پسند ہے۔ وہ عالم تھا۔ اس نے ادب کی ہر ایک مانگ کا لحاظ رکھا۔ اس نے جذبات و خیالات کی ترتیب کو ضروری سمجھا اور ایک ایسی تخلیق کی جسے پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ پنجابی گئی گزری اور مردہ زبان ہے۔ وارث شاہ کی ہیر کا ہر ایک کردار زندہ ہے اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہر کردار کی بات اسی کی زبان اور اسی کے خاص انداز میں پیش کرتا ہے[1]۔ "ہیر" میں وارث شاہ کے زمانے کا کوئی بھی سماجی اور تمدنی اہم پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ وارث شاہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے کرداروں کو اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ ان کی ادبی حیثیت کبھی بھی پرانی نہیں ہو سکتی۔ وارث نے انھیں فنی باریکیوں کی حد تک سجا کر ایک محدود دائرے سے نکال باہر کھڑا کیا ہے اور اس کے کردار اب صرف پنجابی شاعری یا پنجابی کے رومانی ادب کی روح ہی نہیں بلکہ عالمی ادب کی رومانی علامات کی شکل میں ڈھل چکے ہیں۔

"ہیر" کی زبان پنجابی رومانی قصوں کی بہ نسبت ٹھیٹھ پنجابی ہے جس

---

[1] اسے منظوم قصہ کی بجائے ایک رزمیہ ناٹک کہنا ہی زیادہ مناسب ہے جہاں جہاں کلام شاعر حالات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اگر ان جگہوں کو باہر نکال دیا جائے تو کرداروں کی بول چال ہی باقی رہ جاتی ہے۔

میں پنجابیوں کے دلوں کی دھڑکنیں سموئی رہتی ہیں۔ ان کے رسم و رواج، ان کے اندھے اعتقاد، ان کے مذہبی خیالات، ان کی دوستی، دشمنی۔ سب کچھ وارث شاہ کے یہاں ہمیں ملتا ہے۔ شاعر کی زبان میں اتنی مٹھاس اور اتنا لوچ ہے کہ جو واقعہ یا گتھی سامنے آتی ہے، چاہے کتنی ٹیڑھی ہی کیوں نہ ہو۔ بڑی آسانی سے وارث کے شعروں میں ڈھل جاتی ہے۔ "منٹو" اور "بیو" کی طرح اس کے پاس الفاظ کا کبھی نہ ختم ہونے والا ہے، شکسپیئر کی طرح اس کی کہانی میں روانی ہے اور کالیداس کی طرح اس کے پاس دل کی گہرائی تک اُتر جانے والی کشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم "ہیر" کو پڑھتے وقت پنجاب کی کھلی ہواؤں میں سانس لیتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں بھی نیموں کے وہ جھنناوے سرسرانے لگتے ہیں جہاں جھولوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں اور پگڈنڈیوں کے وہ موڑ جہاں جوان عورتیں اوڑھنیوں کے اور مرد پگڑیوں کے تکیے بنائے سستاتے اور گنگناتے ہیں اور ہریالی کے قلب میں چمکتے ہوئے کھلیان، جہاں اناج کے ڈھیروں کی اوٹ میں ماہیا، ڈھولا، بولیاں، کافیاں، دوہے، جھوک اور قصّوں کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ وارث کی "ہیر" کو پڑھ کر پنجاب کی زندگی کی ایک صحیح تصویر اور جھانکی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ "ہیر" اٹھارھویں صدی کے پنجاب کی سماجی، مذہبی، تمدّنی اور سیاسی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ اٹھارھویں صدی پنجاب میں بڑی افراتفری اور الجھنوں کا زمانہ گزرا ہے۔ مغل حکومت کا شاندار محل کھنڈر بن چکا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے پنجابیوں کی بہت بُری حالت تھی۔ وارث شاہ نے جو پنجابیوں کے دل کی دھڑکنوں کا سب سے بڑا نبّاض ہے۔ اس ہنگامی زمانے کے متعلق لکھا ہے۔

پیا ملک دے وچ ہے بڑا رولا ہر کسے دے ہتھ تلوار ہوئی
پردا شرم حیا دا اُٹھ گیا ہے ننگی ہو کے خلق بازار ہوئی
مجلس لا کے کرن بُری ایہہ ایکا ہتھ ظالماں دے تیز کٹار ہوئی
صوبیدار تے حاکم نہ شاہ کوئی رعیت ملک تے سب اجاڑ ہوئی

(ملک میں بڑا شور و شر کا عالم ہے ہر شخص کے ہاتھ میں تلوار ہے شرم و حیا کا پردہ اُٹھ گیا ہے اور دنیا ننگی ہو کر بازار میں آگئی ہے۔ بُرے لوگ ایکا کر کے بُرائی پر تُلے ہیں۔ نہ کوئی صوبیدار ہے نہ کوئی حاکم اور نہ ہی کوئی قانون ہے۔ رعایا اور ملک دونوں برباد ہو گئے ہیں)

عامل چور تے چوہدری جٹ حاکم سماں چوڑہی رب نے دکھایا ای
اشراف پٹھان تے مغل سید سب خاک در خاک سمایا ای

(عامل چور ہے اور اُجڈ جاٹ حاکم بن گیا ہے، خدا نے عجب سماں دکھایا ہے۔ اشراف، پٹھان، مغل اور سید سب خاک ہو گئے ہیں)

وارث شاہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، اُجڈ اور مہذب اور رحم دل و ظالم سب کے جذبات کی عکاسی بڑے قابل عکاس اور ماہرینِ فن کی طرح کرتا ہے۔ جب وہ پنجاب کی عورتوں کی تصویر کشی کرتا ہے تو ہو بہو ان کے اندازِ گفتگو، ان کے محاورے، ان کے لہجے اور ان کے جذبات کو اس نے اپنے اشعار میں موتیوں کی طرح ٹانک دیا ہے۔ جس سے اس کے کلام کی دلکشی اور دلآویزی بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہیر پہلے پہل جب ایک خوبرو نوجوان کو اپنے پلنگ پر دراز دیکھتی ہے تو سنگ دلی سے کہتی ہے۔

"اٹھ لے ہیری سیج پر، مریل کی طرح پڑے ہوئے منحوس انسان۔ میرا اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں ایک پہر گزر گیا، مگر تیری سمادھی نہیں ٹوٹی ... کیا کوئی لمبا سفر طے کر کے آیا ہے؟ کیا کوئی ریگستان پار کیا ہے۔ شاید رات بھر آنکھوں نے نیند نہیں دیکھی ..."

لیکن جب یہی ہیر گھبرو رانجھے پر فریفتہ ہو جاتی ہے تو اسی کے مطابق وہ لہجہ بھی بدل لیتا ہے اور ہیر کے منہ سے کہلواتا ہے۔

اجی پلنگ تے ہیرے سب تھاں تیری
کھول گھتیاں جیوڑا واریا ای
نہیں گال کڈھی ہتھ جوڑنی آں
ہتھ لائیں نینوں ماریا ای

(اجی یہ پلنگ، سیج اور یہ ہیر سب کچھ تمہارا ہے۔ میں اپنا دل بھی لٹا بیٹھی ہوں۔ خیر گزری کہ میں تم پر ہاتھ نہ اٹھا بیٹھی اور نہ ہی کوئی گالی ہی میری زبان سے نکلی)۔

ہیر کا حسن بیان کرتے ہوئے بھی اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کو وارث نے نہیں بھلایا اور اسی زندگی سے اس نے ہیر کے لئے ایک نادر تشبیہ ڈھونڈ نکالی

پھرے چھنکدی چا دے نال جٹی	چڑھیا غضب لے کٹک قندھار وچوں
تر لیا خ جلاد دا وار خونی	نکل دوڑھیا ہے اوڈیا تار وچوں

جنوری ۱۹۰۶ء

دہیر زلیدوں کو بجانے اور دکھانے کے لئے ایک پاؤں پر گھوم رہی ہے ۔
جیسے قندھار سے کمک ہوتا ہوا خونخوار حملہ آوروں (ابدالیوں) کا لشکر چڑھ آیا ہے یا جلاد خونی قزلباش لشکر گاہ سے نکل دوڑا ہے)

جب وہ جاٹوں کے مُنہ سے کوئی بات کہلواتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وارث شاہ خود ایک اکھڑ اور نڈر جاٹ ہے ۔ رانجھا جب جوگی بن کر ہیر کے سُسرال رنگ پور جا نکلتا ہے تو ہیر کی چہیتی سہیلی سہتی سے اس کی جھڑپ ہوتی ہے ۔ یہ نوک جھوک بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں کافی دیر چلتی ہے ۔ ترجمے میں اصل کا لطف تو ناممکن ہے لیکن پھر بھی کچھ شعروں کی بہار دیکھئے ؎

سہتی گج کے آکھدی چھڈ جٹا ، کھوہ سب نوالیاں سٹیاں نی
ہود سب جانان ٹھگ کھادیاں نی ، پر اس ویڑھے وچ جٹیاں نی
لے ڈھتر نال شنی ہے راولاں دی ، رناں جٹیاں ہور سب چھٹیاں نی
تیری پیری فقیری سب کھول دیئے ، ساڈے نال جے کریں لپٹیاں نی
کدی وید حکیم بن آونا ایں ، گلاں کرناں ایں بھناں کھٹیاں نی
اساں اسی گل معلوم کیتی ، ایسے جٹیاں ملک دی آن ڈٹیاں نی
گھر جٹاں دے منگ نہ ڈھیٹھ ہوئی ، منگ ڈھیٹھ نو کھو جیاں ہٹیاں نی
تاواں رفرداراں گلاں بریاں نی ، تندرے وانگ کھلار کے سٹیاں نی
کُتے کھیڑ کے ویہڑے دے مگر لاواں ، پھر ویہندا پٹیاں بیٹھیاں نی
جنہاں جٹیاں دے نال اڑی بدھی ، اونہاں کچھ نہ کھٹیاں کھٹیاں نی

(سہتی نے گرج کر کہا ۔ تم نے بہت سی جانوں کو لُوٹ کھایا ہے لیکن اس آنگن میں تمہارے چیلے کام نہ دیں گے ۔ کیونکہ یہاں جٹیاں رہاش عورتیں رہتی ہیں ۔ کیا تم نے بُڑھوں کی یہ بات نہیں سُنی کہ عورتیں تو صرف جٹیاں ہی ہیں باقی سب نام کی ہی عورتیں ہیں ۔ اگر تم ہمارے ساتھ ٹیڑھا چلنے کی کوشش کرو گے تو تمہاری پیری فقیری کا پول کھول دیا جائے گا ۔ کبھی وید حکیم کا بھیس بھر آتے ہو اور بھویں سکوڑ سکوڑ کر باتیں بناتے ہو ۔ ہم تو اتنی بات جانتی ہیں کہ ہم جٹیاں ہی اپنے ملک کی سچی بیٹیاں ہیں ۔ تم جاٹوں کے گھروں میں بھیک مت مانگو کیونکہ تم ان کی عورتوں کے مزاج سے واقف نہیں ہو تمہاری باتوں کا جال تیندوے کے تاریوں کی طرح ہے لیکن یہاں تم شکار نہیں کھیل سکو گے ۔ ابھی آنگن کے کتوں کو چھیڑ کر تمہارے پیچھے لگاتی ہوں ۔ تب جسم کے زخموں اور جوتوں کو دیکھ کے پچھتاؤ گے جنھوں نے جٹیوں کے ساتھ ہٹ کی انھوں نے ہمیشہ زک اٹھائی ۔ بات

جب جھگڑے اور طعنوں پہ پہنچتی ہے تو سہتی کہتی ہے ؎

سُن جوگیا لنڈ مشٹنڈ یا وے بے شرم کپتیا لوٹیا وے
دھرنا مار بیٹھا ہیں وچ کواریاں دے کسے ویڑھ ہی وارتے چوٹیا وے

(سنو اوہ پاکھنڈی ، آوارہ ، بے شرم اور جھگڑالو جوگی تم کنواریوں کے درمیان کیوں دھرنا مار کے بیٹھے ہو)

رنگ پور میں رانجھا جتی ستی جوگیوں کی سی باتیں کرتا ہے اور ایک جہاندیدہ جوگی کا جامہ پہن لیتا ہے ۔ ایک موقع پر جب رانجھا کا اتہ پتہ پوچھا جاتا ہے تو رانجھا جواب دیتا ہے ۔

رانجھے آکھیا خیال نہ پو میرے شیر ، سپ فقیر دا دیس کیہا
کونجاں وانگ ممولیاں دیس چھٹا اساں جات صفات تے بھیس کیہا
وطن دماں دے نال تے جاک جوگی ، ساڈا ساک کبیلڑا تے خویش کیہا
جیہڑا وطن تے ذات ول دھیان رکھدا دنیا دار ہے اوہ درویش کیہا
دنیاں نال ہے کی پیوند ساڈا ، پتھر جوڑنا نال سریش کیہا
جنہاں خاک ورخاک فنا ہونا ، وارث شاہ تے اونہاں نوں عیش کیہا

(رانجھے نے کہا میرا خیال چھوڑو ۔ شیر ، سانپ اور فقیر کا دیس کیسا ۔ ہم نے سفری پرندوں کی طرح گھر چھوڑ دیا ہے ۔ ہمارا ذات پات اور بھیس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ۔ دیس وہ ہے جہاں سانس چلے ہماری ذات جوگی ہے ۔ ہمارا ناتہ ، قبیلہ اور خویش کیسا ۔ جو وطن اور ذات پات کی طرف توجہ کرے وہ دنیا دار ہے ، درویش وہ نہیں بن سکتا ہمارا دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے ۔ پتھر کو سریش سے جوڑنے کے کیا معنی ہیں ۔ جنھوں نے ایک دن خاک بسر ہونا ہے انھیں عیش و آرام سے کیا غرض)

عورتوں پر رُعب جماتے ہوئے وہ کہتا ہے ۔

ہمیں لنک باسی چیلے اگستن منی دے ، ہمیں پچھی سمندروں پار دے جی
باراں ورہے ویندے باراں ورہے پھرنے منی والیاں ی دوحاں نوں تارنے جی

(ہم لنکا کے رہنے والے ہیں ۔ اگست منی ہمارے گرو ہیں ۔ بارہ برس تک ہم ایک جگہ پر رہنے والے اور بارہ برس تک گھومنے والے

ہم سمندر پار کے پنچھی ہیں جو کوئی ہماری پناہ میں آتا ہے ہم اس کا بیڑا پار کر دیتے ہیں) ۔

ہیر کو جب رانجھے کی آمد کی اطلاع ملتی ہے تو وہ درد سے بے حال ہو کر کہتی ہے ۔

رب جھوٹھ نہ کرے جے ہووے رانجھا' تاں چوڑ ہوئی مینوں کٹھیا سُو
اگے اِک فراق نے ساڑ سُٹی' سڑی جند نوں کیہوں ہن پٹیا سُو
ہیرے واسطے دُکھڑے بھرے کردا' لوہاتاں جیبے دے نال چٹیا سُو
نالے رن گئی نالے کن پاٹے' آکھ عشق توں نفع کی کھٹیا سُو
ایہہ رانجھا پھُل گلاب دا سی' میرے ہجر اندر جوبن پٹیا سُو
ہو یا چاک پنڈے ملی سواہ' رانجھے لاہ ننگ ونا موس نوں سٹیا سُو
مکا گھر اس چندرے دُکھڑے نوں' کن پاڑ شتر بر لوں پھٹیا سُو
وارث شاہ اس عشق دے ونج وچوں' بھفا جال کی کھٹیا دٹیا سُو

جب رانجھا جوگی کے بھیس میں ہیر سے ملتا ہے تو ہیر اسے پہچان نہیں پاتی ۔ وہ ہیر سے کہتا ہے کہ وہ بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتا ہے ۔ تب ہیر سراپا درد بن کر کہتی ہے ۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں' کون بچھڑے یار ملاوندا ای
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈھ تھکی' جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ای
ساڈی چاہ دیاں جگتاں کرے کوئی' کون جیو دا روگ مٹاوندا ای
میرا جیو جاما جیہڑا آن میلے' پھر سر صدقہ اس دے نام وا ای
بھلا موئے تے بچھڑے کون میلے' ایویں جیوڑا لوک جلاوندا ای
اِک باتنوں کا ماں کو بخ کھوئی ۔ دیکھن چپ ہے کی کرلاوندا ای
دُکھاں والیاں نوں گلاں سُکھ دیاں' سے جوڑ جہاں سناوندا ای
اک جٹ دے کھیت نوں اگ لگی' ویکھن آن کے کدوں بجھاوندا ای
دیاں چُوریاں گھیو دے وال دواں دیوتے' جے ساں رانجھا آوندا ای

(ہیر نے کہا جوگی جھوٹ بولتے ہو' کون بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتا ہے ۔ میں تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی پر ایسا کوئی نہیں ملا. جو گئے ہوؤں کو لوٹا لائے ۔ کون میرے دل کے روگ کو مٹا کر میری چاہ کی دوا کر سکتا ہے ۔ میرا ٹوٹا ہوا دل اگر جڑ جائے تو میں تمھاری بڑی شکر گزار ہونگی۔ مگر جوگی بچھڑے ہوؤں اور مرے ہوؤں کو کون ملاتا ہے' یہ سب جی کے جلانے کی باتیں ہیں ۔ زمانہ تو گرا کر تماشہ دیکھتا ہے ۔ ایک باز کے ہاتھ سے چڑیا نکل جائے تو یہ دیکھتا ہے کہ باز چُپ رہتا ہے یا تڑپتا ہے دُکھیارے دلوں سے متعلق خوشی کی باتیں اُڑاتا ہے ۔ ایک جاٹ کے کھیت کو آگ لگتی ہے (تو خود کوئی آگے نہیں بڑھتا) سب انتظار میں رہتے ہیں کہ کب وہ آکر کھیت کی بقا کا سامان کرتا ہے ۔
میں تو چُوریاں بانٹوں گی اور گھی کے چراغ روشن کر دوں اگر کوئی مجھے رانجھے کی آمد کی خبر دے)

مندرجہ بالا الفاظ ایسے ہیں جن کے لئے پنجابی قاری تعریف کے الفاظ نہیں ڈھونڈ پاتا "ہیر" کے ایسے ایسے بیسیوں حصے کسانوں اور دہقانوں کے گھروں میں اب لوک گیتوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں ۔

وارث شاہ صرف ایک کتابی عالم ہی نہیں تھا بلکہ زندگی کے ہر اہم اور فطری پہلو کی گہرائیوں تک اس کی پہنچ تھی ۔ اس کے الفاظ میں بے پناہ تاثر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصہ محض ہیر رانجھا کے عشق کی داستان ہی نہیں رہا بلکہ اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی رجحانوں کا آئینہ خانہ بن گیا ہے چونکہ اس آئینہ خانے میں جو بھی تصاویر ہیں وہ اصل زندگی سے لی گئی ہیں اور وارث نے اس تصویر کشی کے حسین پس منظر میں اپنے عینی مشاہدات اور قلبی تاثرات کا استعمال کیا ہے ۔ اس وجہ سے ان تصاویر میں اپنے جذبات و احساسات کو ناظرین یا سامعین تک پہنچانے کی پُرتاثیر قوت بدرجہ اتم موجود ہے ۔ دل کی ان داخلی کیفیات کا کامیاب اظہار قاری کے دل میں تقریباً انھیں کیفیات کو بیدار کر دیتا ہے جو مصنف نے تخلیق کرنے سے پہلے محسوس کی تھی ۔ وارث نہ صرف انسانی جذبات کا عکاس بھی ہے بلکہ پنجاب کی معاشرتی زندگی کی بھی ایک بڑی جاندار اور صحیح تصویر ہمیں "ہیر" میں ملتی ہے ۔

ہوئی صبح صادق جدوں آن روشن — سکھیں والیاں آن جگاونیاں نی
کاروبار وچ ہویا جہان شامل — چرخے کتدیاں اٹھ سوانیاں نی
چرخی چگدی نال اٹھ ٹرے پاندی — پیاں چاٹیاں وچ مدھانیاں نی
اِک نے اُٹھ کے رڑکنا پا دتا — اک دھوندیاں پھرن مدھانیاں نی
گھر بار نے چکیاں جوتیاں نی — جنھاں تنداں گنھ پکانیاں نی
لتیاں کڈھ ہر نالیاں ہالیاں نے — ستیاں اُٹھ تے جنھاں نے لانیاں نی

وضو عشاق کے زاہداں اذان دتی   تسبیح پھیاں ملوانیاں نی
اک غسل دے واسطے جاں دوڑے   سیجاں جنھاں نے رات نوں مانیاں نی
ہوئے قافلے کوچ سراں دچوں   کھڑکے ٹل پرہجات چلانیاں نی

(صبح ہوتی ہے شفق کی سرخی درختوں پر اپنی بہار دکھاتی ہے تو ہر کوئی اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ عورتیں چرخے چلانا شروع کر دیتی ہیں۔ جب چڑیاں چہکنے جاتی ہیں تو مسافر بھی اپنی منزل کی طرف چل دیتا ہے۔ سگھڑ بیویوں نے دودھ بلونے کے لئے چاٹیوں میں مدھانیاں ڈال دی ہیں۔ کچھ نے دودھ بلونا شروع ہی کیا ہے اور کئی دودھ بلو کر مدھانیاں دھو رہی ہیں۔ کچھ روٹی پکانے کے لئے گندم پیس رہی ہیں۔

ہل چلانے والوں نے ہل نکال لئے ہیں کیونکہ انھیں دھرتی کو از سر نو چیرنا ہے۔ وضو کے بعد زاہد نے اذان دے دی ہے اور خدا پرست تسبیح پھیر رہے ہیں۔ جن کی رات محبوب کی آغوش میں گزری ہے وہ غسل کے لئے بھاگے جا رہے ہیں۔ سرائے سے قافلے کوچ کر گئے ہیں اور پرہجات کی گھنٹیاں بج اٹھی ہیں)۔

وارث نے پنجاب کے ایک گاؤں کی صبح کا منظر زندۂ جاوید کر دیا۔ تفصیل سے بچتے ہوئے بھی اس نے ہر چیز کہہ دی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں جادو ہے، حرارت ہے، حُسن ہے، حرکت ہے اور بلا کی تاثیر۔ وارث کی قوتِ بصیرت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اندرونِ نفس کی لطیف و نازک لہروں کے باہمی عمل اور ردّعمل کا مشاہدہ بڑی آسانی سے کر لیتا ہے۔ اس قابلیت کی بدولت اس کے کلام میں ایک طرف زور و توانائی اور دوسری طرف باریکی و نفاست پیدا ہو گئی ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وارث شاہ تو صرف رومانی شاعر تھا۔ اس نے ہیر اور رانجھا کی عشقیہ داستان کو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا اور بس!

بلاشبہ "ہیر" ایک عشقیہ داستان ہے۔ لیکن وارث نے اس داستان کو جس طریقے سے پیش کیا ہے وہ اسے ایک عام عشقیہ قصے سے بہت اونچا اٹھا دیتا ہے۔ وارث شاہ نے ایک بڑے مؤثر اور آرٹسٹک انداز میں سمجھا دیا ہے کہ امیر کی بیٹی کی شادی غریب کے لڑکے کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ وارث شاہ نے غریبی اور امیری کا ذکر کئے بغیر ہی قصے کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ اس کا مقصد عشق کے چکر میں ہی فوت نہیں ہو جاتا۔ خود اس نے "ہیر" کے بارے میں لکھا ہے۔

گوشے بیٹھ کے "ہیر" کتاب لکھی   یاراں واسطے نال قیاس دے میں
پڑھن گبھرو دیش وچ خوش ہو کے   پھل سیجیا واسطے باس دے میں
ہور شاعراں چکیاں چھینیاں نی   قلّہ پیپیا وچ خراس دے میں
سمجھ بین عاقل غور و فکر کر کے   ہیر رکھیا وچ ھاس دے میں

وارث شاہ نے ہر ایک بات نازک اشاروں میں لکھی ہے۔ نوجوانوں نے اپنے آپ کو وارث کے مقام پر بٹھا کر اپنی محبوباؤں کو ہیر کے پیکر میں دیکھا اور کھیتوں کی مینڈھوں پر بیٹھ کر "ہیر" کے مدھر بولوں کے پس منظر میں اپنی محبت کی تانیں بکھیریں۔ صوفیوں نے ہیر رانجھا کو جسم اور روح سمجھا۔ ہر ایک نے "ہیر" کو اپنی من پسند کا جوڑا پہنایا —— وارث شاہ نے صرف اتنا کیا کہ ہیر اور رانجھا کے پیار کے مرجھائے ہوئے پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر لہلہایا۔ وارث شاہ بھاگ بھری کے ہجر میں جلتا رہا۔ رانجھا ہیر کو حاصل نہ کر سکا۔ دونوں کے درمیان سماج اور رواج کی دیواریں حائل تھیں۔ نڈر، بے باک اور حسین ہیر نے ہر طاقت سے ٹکر لی۔ کیدو، قاضی کھیڑے سیدا کوئی بھی ہیر کے اٹل ارادے کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ لیکن جنڈیالہ شیر خاں کے قطب شاہ کا بیٹا سید وارث شاہ اپنے فن کے برتے پر یہ دولت سمیٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس ہیر کو وارث شاہ، وارث شاہ بن کر نہ حاصل کر سکا۔ رانجھا بن کر نہ پا سکا۔ ہیر کے باپ کا نوکر اور جوگی بن کر نہ پا سکا۔ اس ہیر کو شاعر بن کر اس نے حاصل کر لیا۔ اب ہیر سیالوں کی نہیں رہی۔ اب ہیر رانجھے کی بھی نہیں رہی —— اب ہیر وارث شاہ کی ہے۔

مظفر شاہ

پنچ شیل

گزشتہ چند سالوں میں اُن "پانچ اصولوں" نے ہندوستان اور ایشیا کے لوگوں کو اپنی طرف بہت زیادہ متوجہ کیا ہے جنھیں "پنچ شیل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مختلف طریقوں سے ان اصولوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے مذاکرات، مباحثے اور کانفرنسیں ہوتی رہی ہیں۔ کیونکہ آج کی دنیا میں جہاں عدم اعتماد کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات اور امن و سلامتی کا دستور انھیں "پانچ اصولوں" کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔ یوں "پنچ شیل" کوئی نئی اصطلاح نہیں ہے، مگر آج اس کو ایک نیا مفہوم دیا گیا ہے۔ لفظ "پنچ شیل" یا "پنچ شیلا" کی اصل سنسکرت ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں: "چال چلن کے پانچ اصول یا قواعد"۔ قدیم بودھی ادب میں طریقۂ اخلاق کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مہاتما بدھ نے اخلاق کے جو پانچ اصول بتائے ہیں ان کو "پنت شیل" کہا جاتا ہے۔

اس وقت قومی یا بین الاقوامی آداب کے لئے جس معنی میں "پانچ اصولوں" کا استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب جداگانہ ہے۔ سب سے پہلے انڈونیشی ریپبلک کے صدر ڈاکٹر سوکارنو نے "پنچ شیل" کی اصطلاح کو سیاسی رنگ دیا — انھوں نے جون ۱۹۴۵ء میں انڈونیشیا کی آزاد ریاست کی بنیاد "پانچ اصولوں" پر رکھی اور اس طرح انڈونیشی زبان میں "پنچا شیلا" (پنچ شیل) کی اصطلاح وضع ہوئی۔

"پنچ شیل" کی اصطلاح جس معنی میں آج بین الاقوامی آداب اور امن و سلامتی کے دستور کی بنیاد بن گئی ہے، اس کی ابتداء ہند و چین کے اس معاہدے سے ہوئی جو تبت کے معاملے میں ان دونوں ملکوں کے مابین ہوا تھا۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور خود مختاری کا باہمی احترام۔

۲۔ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائی سے احتراز۔

۳۔ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے گریز۔

۴۔ مساوات اور باہمی مفاد۔ اور

۵۔ پُرامن بقائے باہمی (پُرامن طریقے سے مل جل کر رہنا)

انھیں پانچ اصولوں کی بناء پر حکومتِ ہند اور چین کی عوامی جمہوریہ کے مابین اپریل ۱۹۵۴ء میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے، جس کی رو سے تجارتی اور ثقافتی تعلقات اور ناشرین کے لئے مناسب سہولیات کا بندوبست کیا گیا۔ معاہدے کے فوراً بعد ۲۸ جون ۱۹۵۴ء کو ہند اور چین کے وزرائے اعظم نے ایک مشترکہ بیان میں ان اصولوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اگر ان اصولوں کو بین الاقوامی معاملات میں بھی برتا گیا تو امن و سلامتی کی مضبوط بنیاد تیار ہو جائے گی اور آج کل دنیا میں خوف اور عدم اعتماد کی جو فضا پائی جاتی ہے وہ ختم ہو جائے گی اور باہمی اعتماد پیدا ہوگا۔

ہندوستان نے ہمیشہ سے امن و سلامتی اور رواداری کا راستہ اپنایا ہے، اور آج بھی وہ اسی راستے پر گامزن ہے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں ملک کی تمام تر کوششیں اسی جانب مرکوز ہیں کہ دنیا میں امن و امان قائم رہے مختلف قوموں میں اتحاد اور اعتماد بڑھے اور ملکوں کے آپسی جھگڑے گفت و شنید کے ذریعے سے طے ہو جائیں۔ ہند چین معاہدے کے یہ پانچ آفاقی اصول ہندوستان کے دوستانہ رویہ اور امن پسندانہ عزائم کی زندہ مثال ہیں۔ بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ دنیا میں

امن وامان قائم رہے ۔ جنگ کے امکانات کو ختم کر دیا جائے ۔ ہندوستان کسی گروہ بندی میں شریک نہیں ۔ وہ سب کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتا ہے اور اسی لئے اس کو اقوام متحدہ پر بھی پورا بھروسہ ہے ۔

ہندوستان کی خارجی پالیسی جو "پنچ شیل" پر قائم ہے ۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں دیش کی جدوجہد آزادی کا منطقی نتیجہ کہلائی جا سکتی ہے ۔ ہندوستان نے عدم تشدد کی راہ پر چل کر آزادی کی لڑائی جیتی اور آج بھی وہ اسی راستے پر قائم رہ کر امن عالم اور دنیا کی مشترکہ فلاح و بہبود کے لئے کوشاں ہے ۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۷ء میں کہا تھا :

"اگر ہمیں زندہ رہنا ہے اور دنیا کی ترقی میں کوئی خاص اضافہ کرنا ہے تو یقیناً ہمارا راستہ عدم تشدد اور امن و سلامتی کا راستہ ہوگا ۔"

پنڈت جواہر لال نہرو شروع ہی سے قوموں کے باہمی اتحاد اور عالمی تعاون کے لئے کوشاں رہے ہیں اور دنیا کی مشترکہ ترقی کے لئے ایک ایسی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں جھگڑے فساد کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ رہے ۔ سب چھوٹی بڑی قومیں ایک دوسرے پر اعتماد رکھیں ۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا :

"اگر ہم امن چاہتے ہیں تو ہمیں امن پسند مزاج پیدا کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کے دلوں کو بھی جیت لینا چاہیئے جو ہمیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا خود کو ہمارے خلاف سمجھتے ہیں ۔ ہمیں اسی طرح دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے ۔ جس طرح ہم دوسروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں سمجھیں ۔"

ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام جھگڑے باہمی اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور افراد کی طرح قومیں بھی غلط فہمی کا شکار ہو کر برسر پیکار ہو جاتی ہیں اگر قومیں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور غلط فہمی سے دور رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مختلف العقیدہ ملک مل جل کر نہ رہ سکیں ۔ جس طرح معاشرے میں مختلف خیال لوگ مل جل کر رہتے ہیں یا جیسے ایک ریاست میں مختلف العقیدہ جماعتیں ہوتی ہیں، اسی طرح قومیں بھی باہمی اعتماد اور امن و سکون کے ساتھ مل جل کر رہ سکتی ہیں ۔ اور ان کا ایک دوسرے کے لئے فائدہ اور عالمی مفاد کے لئے مل جل کر رہنا ضروری ہے ۔

"پنچ شیل" کے اصولوں میں اسی حقیقت کو عملی طور پر پیش کیا گیا ہے ۔

ہندوستان اور چین کے وزرائے اعظم نے اپنے مشترکہ بیان میں ان پانچ اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا :

"ہم مانتے ہیں کہ ایشیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف سماجی اور سیاسی نظام موجود ہیں ۔ اگر یہ اصول مان لئے جائیں اور ان پر عمل کیا جائے اور کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے معاملات میں دخل نہ دے تو یہ اختلافات امن اور سلامتی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے اور نہ جھگڑے پیدا کر سکتے ہیں ۔ اس طرح ہر ملک کی علاقائی سالمیت اور خود مختاری کے احترام اور جارحانہ کارروائی سے پرہیز کی صورت میں متعلقہ ممالک کے مابین پر امن تعلقات باہمی اور دوستانہ مراسم کا رشتہ قائم ہو جائے گا جس سے دنیا کی موجودہ کشاکش کم ہوگی اور امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے میں مدد ملے گی ۔"

ہند و چین کے معاہدے کے بعد بین الاقوامی سطح پر اس قسم کے معاہدات ہندوستان و برما اور ہندوستان و انڈونیشیا کے مابین ثابت ہوئے اور تب سے برابر "پنچ شیل" کے اصولوں کی ہر طرف سے تائید ہو رہی ہے ۔ نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ کے ملکوں میں بھی ان اصولوں کو قوموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے ۔ امن کی بھوکی دنیا آج ایسا ہی راستہ اپنانا چاہتی ہے جس سے خوف و ہراس دور ہو اور باہمی محبت اور رواداری بڑھے ۔ تمام قومیں امن و سلامتی کے ساتھ مل جل کر رہیں اور اس دور کی ترقیات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ "پنچ شیل" کا پیغام ہر جگہ مقبول ہو رہا ہے اور دنیا کے وسیع تر معاملات میں ان اصولوں کو بروئے کار لانے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے ۔

سب سے پہلے ایشیائی ممالک نے ان اصولوں کی تائید کی جن میں برما، چین، انڈونیشیا، لاؤس، نیپال، ویت نام کی جمہوری ری پبلک اور کمبوڈیا شامل ہیں ان کے علاوہ یوگوسلاویہ پہلا یورپی ملک ہے جس نے "پنچ شیل" کے اعلان پر دستخط کئے ۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو اور ہند کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے مشترکہ بیان میں بتایا گیا تھا کہ اگر ان پانچ اصولوں پر عمل کیا گیا تو آپسی کھچاؤ کو کم کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور جو جھگڑے ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں وہ حل ہو جائیں گے ۔ اس طرح امن کا دائرہ وسیع ہوگا، باہمی اعتماد بڑھے گا اور عالمی تعاون کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم ہوں گے ۔

۱۰- اپریل ۱۹۵۵ء کو نئی دہلی میں ایک غیر سرکاری ایشیائی کانفرنس

ہوئی جس میں ۱۴ ملکوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں ایک تجویز منظور کی گئی جس میں "پنچ شیل" کی پوری حمایت کرتے ہوئے ان اصولوں کو قوموں کے باہمی اعتماد اور پُرامن بقائے باہمی کی یقینی بنیاد قرار دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۸۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو انڈونیشیا کے مقام بنڈونگ میں ایشیا اور افریقہ کے ۲۹ ملکوں کی کانفرنس ہوئی جو کل دنیا کی ⅗ آبادی کی نمائندہ تھی۔ اس کانفرنس نے نہ صرف ان پانچ اصولوں سے اتفاق کیا بلکہ کچھ اور اصول کا اضافہ کرکے "پنچ شیل" کو تقویت پہنچائی۔ کانفرنس کے منظور کردہ اصول یہ ہیں:

۱۔ بنیادی انسانی حقوق اور اقوامِ متحدہ کے منشور کے اصول و مقاصد کا احترام۔

۲۔ تمام قوموں کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کا احترام۔

۳۔ تمام نسلوں اور چھوٹی بڑی قوموں کی برابری کا اقرار۔

۴۔ دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت یا مزاحمت سے احتراز۔

۵۔ ہر ایک قوم کے اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنا دفاع کرنے کے حق کا احترام۔

۶۔ (الف) کسی مخصوص بڑی طاقت کے مفاد میں اجتماعی دفاعی انتظامات سے فائدہ اٹھانے سے احتراز۔

(ب) کسی ایک ملک کے دوسرے ملکوں پر دباؤ ڈالنے سے گریز۔

۷۔ کسی ملک کی سیاسی آزادی کی علاقائی سالمیت کے خلاف قوت استعمال کرنے یا جارحانہ کارروائی کی دھمکی دینے سے احتراز۔

۸۔ پُرامن ذرائع سے تمام بین الاقوامی جھگڑوں کا تصفیہ، مثلاً گفت و شنید باہمی سمجھوتہ، ثالثی یا قانونی فیصلہ۔ اس کے علاوہ فریقین اپنی مرضی سے اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق دوسرے ذرائع سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

۹۔ باہمی مفاد اور تعاون کی ترقی۔

۱۰۔ انصاف اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کا احترام۔

آج یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ دنیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں اپنے مختلف سیاسی اور اقتصادی نظاموں کے باوجود صلح و آشتی کے ساتھ رہیں اور مشترکہ مقاصد کے لئے مل جل کر کام کریں۔ اسی لئے "پنچ شیل" کے ہمہ گیر اصول امنِ عالم کی بنیاد قرار دئے گئے ہیں۔

گزشتہ سال دسمبر میں روسی وزیرِ اعظم کے دورۂ ہند کے بعد جو مشترکہ بیان شائع ہوا تھا، اس میں بھی "پنچ شیل" کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

"ان اصولوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ملک جو سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، باہمی احترام اور اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی بناء پر ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے ہیں اور انھیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ یہ ملک انسانی زندگی کی بہتری اور امن کے مقاصد کے لئے بقائے باہمی کی عملی اور پُرامن پالیسی پر چل سکتے ہیں۔ جب سے یہ پانچ اصول وضع ہوئے ہیں۔ بہت سے ممالک اُن سے تعلق یا اتفاق ظاہر کر چکے ہیں۔ بنڈونگ کانفرنس میں مختلف قوموں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر ایک اعلان کے ذریعے سے ان اصولوں کی تائید کی، جو کہ اب عام طور پر باہمی تعاون کے لئے مضبوط بنیاد سمجھے جا رہے ہیں۔"

ان معاہدات اور مشترکہ اعلانات کے علاوہ مختلف ملکوں کے سربراہ اور ذمہ دار لوگ "پنچ شیل" کے اصولوں سے کسی نہ کسی صورت میں اتفاق ظاہر کر چکے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں عرب کے شاہ سعود ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بنگلور میں میونسپل کارپوریشن کے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے "پنچ شیل" کے اصولوں پر پورا اعتماد ظاہر کیا۔ اس کے علاوہ شاہِ سعود اور وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کے مشترکہ اعلان میں بھی ان اصولوں سے اتفاق ظاہر کیا گیا۔ اس سے پہلے افغانستان کے نائب وزیرِ اعظم سردار محمد نعیم خاں نے بھی ان اصولوں سے اتفاق کا اظہار کیا کیونکہ ان کے ذریعے سے دنیا میں امن و سلامتی کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے۔

مضمون نگار حضرات سے

ماہ نومبر ۱۹۵۶ء کا شمارہ "بودھ نمبر" ہوگا۔ گوتم بدھ، اس کی تعلیمات اور بدھ مذہب سے متعلق مضامین اس شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔ ۲۵۔ اگست تک موصول ہونے والے مضامین پر غور ہو سکے گا۔ (ادارہ)

شیام سندر

امرناتھ کی یاترا

ہر سال کی طرح اس[1] سال بھی ملک کے طول و عرض سے ہزاروں یاتری امرناتھ کے درشن کرنے پہلگام میں جمع ہوئے۔ اس سال یاتریوں کی تعداد پچھلے سالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اس کی وجہ کشمیر گورنمنٹ کی وہ پبلسٹی تھی جس میں درج تھا کہ اس سال یاتریوں کو ہر طرح کی سہولیات دی جائیں گی۔ یوں تو یہ یاترا ستمبر تک جاری رہتی ہے لیکن امرناتھ کے درشن ہر سال ساون کی پورنماشی کو سلونو یعنی رکھشا بندھن کے دن ہوتے ہیں۔ یاترا پہلگام سے شروع ہوتی ہے جو سری نگر سے ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلگام نہایت خوش منظر اور صحت افزا مقام ہے چنانچہ بہت سے یاتری تو دو دو ہفتے پہلے یہاں آجاتے ہیں اور چند دن راستے کی تھکن اتار کر یاترا پر روانہ ہوتے ہیں۔ یاتریوں میں سادھو مہاتماؤں کے علاوہ ہر علاقہ و صوبہ کے آدمی ہوتے ہیں پہلگام سے یاتری سفر کے لئے ضروری سامان مثلاً ڈیرے تنبو اور سواری اور سامان کے گھوڑے وغیرہ لیتے ہیں۔ اس سال کشمیر گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے نرخ کے مطابق سواری کا گھوڑا چھبیس روپے اور سامان کا گھوڑا پچیس روپے میں آسانی سے مل گیا۔ یاتریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود طلب کرنے پر ہر آدمی کے لئے کسی نہ کسی طرح گھوڑے مہیا کر دئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ سو سو میل کی دوری سے گھوڑے منگوائے گئے جن لوگوں کو گھوڑے لینے کی استطاعت نہیں ہوتی وہ پیدل ہی روانہ ہوتے ہیں۔ البتہ سہولت کے پیش نظر لکڑی کی ایک یا دو چھڑیاں لے لیتے ہیں جن کے سروں پر نوک دار لوہا چڑھا ہوتا ہے۔ بوڑھے مردوں کے لئے ڈانڈیاں اور بوڑھی عورتوں کے لئے پالکیاں مل جاتی ہیں۔ چھوٹے بچے مزدوروں کی کمر پر لدے چلے جاتے ہیں۔

پہلگام سے امرناتھ تک تین پڑاؤ آتے ہیں۔ پہلا پڑاؤ چندن واڑی کا ہے۔ یہ جگہ پہلگام سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلگام سے چندن واڑی کا راستہ نہایت خوبصورت ہے۔ امرگنگا جسے وہاں کے لوگ لدمندری کہتے ہیں۔ پہلگام سے شروع ہوتی ہے اور امرناتھ تک ساتھ رہتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی راستے کے نشیب و فراز کی وجہ سے دور ہو جاتی ہے۔ لیکن چندن واڑی کا بیشتر راستہ امرگنگا کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ راستے میں اخروٹ کے درخت اور چنار اور دیودار کے جنگل ملتے ہیں۔ موسم نہایت خوشگوار رہتا ہے اور دھوپ میں چلنا بھی ناگوار نہیں گزرتا۔ چندن واڑی کا راستہ آگے کے راستے کے مقابلہ میں کافی کشادہ ہے۔ یاتری نہایت ہنسی خوشی سے ہنستے بولتے دلوں میں یاترا کی امنگ لئے قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس راستے کو طے کرتے ہیں۔ چندن واڑی پہنچنے پر امرگنگا کا پل پار کرکے ایک وسیع میدان ملتا ہے۔ یہاں یاتری ڈیرے تنبو گاڑتے ہیں اور تھکن اتار کر کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔ گھوڑے والے گھوڑوں کو گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ گھوڑے گھاس چرتے چرتے پہاڑ پر بہت بلندی پر پہنچ جاتے ہیں۔ نیچے سے پہاڑ پر بے شمار گھوڑے نظر آتے ہیں۔ یہ پڑاؤ سطح سمندر سے ساڑھے نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔

اگلے دن صبح ہر آدمی کوشش کرتا ہے کہ جلد از جلد روانہ ہو جائے چنانچہ منہ اندھیرے ہی یاتری پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ سواری کے

---

[1] اگست ۱۹۵۵ء

گھوڑے والے خصوصاً پہلے چلنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اگر سامان والے گھوڑے راستے میں مل جائیں تو آگے نکلنے میں دقت ہوتی ہے اور اُنھیں کافی دیر تک "ہوش ہوش" (ہوش کرو) چلانا پڑتا ہے۔ قریب دو میل چلنے پر پستو گھاٹی آتی ہے۔ اس کی چڑھائی بالکل کھڑی اور سخت ہے۔ اکثر گھوڑوں کی سواریاں اُتر جاتی ہیں کیونکہ گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چڑھائی ختم ہو جاتی ہے اور ایک وسیع میدان آتا ہے جسے چھوٹا موٹا پڑاؤ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں چونکہ اچھی گھاس کی فراوانی ہے اس لئے گھوڑے والے اس جگہ بھی گھوڑوں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں کھانے پینے کا سامان بھی ملتا ہے بھوج پتر کے درخت بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر چڑھائی کی تکان اتارنے کے بعد یاتری پھر سوار ہوتے ہیں۔ دو میل کے بعد پھر زوج پل کی سخت چڑھائی آتی ہے۔ راستے میں کئی جگہ برف بھی ملتی ہے۔ بلکہ چندن واڑی سے روانہ ہونے کے بعد تھوڑی دور پر ہی برف کا ایک پل ہے جس کے نیچے امر گنگا بہتی ہے۔ یاتریوں کو اس پل کے اوپر گزرنا پڑتا ہے۔ راستے کی برف توڑ کر کھاتے ہوئے یاتری شیش ناگ کے پڑاؤ پر پہنچتے ہیں۔ دو میل پہلے سے ہی پڑاؤ کی قیام گاہ بالکل سامنے نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن یاتری اس فاصلے کو دو فرلانگ سمجھتے ہیں اور جلدی پہنچنے کی امید میں چلنے کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔

شیش ناگ گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک جھیل ہے جس کا پانی سبزی مائل ہے۔ اس جھیل کے بارے میں بے شمار روایتیں مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جھیل کے بیچوں بیچ کئی پھن کا شیش ناگ رہتا ہے جو کسی کسی خوش نصیب کو ہی نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس جگہ کئی زہریلی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کے پاس سے ناک پر کپڑا رکھ کر گزرنا پڑتا ہے ورنہ زہریلی ہوا کے سانس کے ساتھ داخل ہونے پر انسان بے ہوش ہو جاتا ہے یا زبان گنگ ہو جاتی ہے اس بات کی تصدیق اس طرح ہو جاتی ہے کہ اگلے دن صبح کئی گھوڑے بے خبری میں زہریلی گھاس کھا کر مرے ہوئے ملتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان یہاں بھی دستیاب ہوتا ہے لیکن چندن واڑی کے مقابلے میں زیادہ مہنگا ملتا ہے۔ اس جگہ بہت تیز ہوا چلتی ہے۔

اگلے دن منہ اندھیرے ہی یاتری پھر روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں کئی جگہ برف ملتی ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو برف کی بہت دشوار گزرگاہ ہے۔ یاتری، مزدور اور گھوڑے سبھی بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہیں۔ اس جگہ بھی بہت سے یاتری گھوڑوں سے اُتر جاتے ہیں۔ آگے کا راستہ خشک لیکن تنگ ہے۔ کہیں کہیں تو اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ دو آدمی مشکل سے ایک ساتھ گزر سکتے ہیں۔ راستے میں ٹھنڈے پانی کے کئی چشمے ملتے ہیں۔ یاتری ہر چشمے پر تھوڑی دیر سستا کر دو چار گھونٹ پانی پی کر آگے چلتے ہیں اور پنج ترنی کے پڑاؤ پر پہنچ جاتے ہیں۔

پنج ترنی گنگا کے کنارے ایک میدان ہے۔ چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ یہاں کا موسم بڑا غیر یقینی ہوتا ہے۔ دن کو دھوپ برداشت نہیں ہو سکتی لیکن شام ہوتے ہی ٹھنڈ پڑنے لگتی ہے اور رات تک تو گرم کپڑے پہننے پڑ جاتے ہیں اور سوتے وقت لحاف لینا پڑتا ہے۔ رات کو تھوڑی سی دیر کے لئے نیند آتی ہے۔ یہی فکر ہوتی ہے کہ صبح جلد از جلد یہاں سے امرناتھ پہنچ کر جو یہاں سے پانچ میل رہ جاتا ہے جتنی جلدی ممکن ہو واپس لوٹ آئیں۔ صبح ہونے پر ڈیرے سے باہر نکلتے ہی برفانی ہوا کے سرد جھونکے منہ پر تھپیڑ مارتے ہیں۔ لیکن یاتری امرناتھ کے درشن کی اُمنگ میں ٹھنڈ کی پروا نہ کرتے ہوئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ راستے میں پولیس کا انتظام ہوتا ہے جس کے ماتحت پہلے پیدل چلنے والے گزرتے ہیں اس کے بعد گھوڑوں، ڈانڈیوں اور پالکی والوں کی باری آتی ہے۔ پنج ترنی سے امرناتھ کا فاصلہ پانچ میل ہے لیکن چڑھائی بیحد سخت ہے۔ چلتے چلتے اوپر پہاڑ کی چوٹی تک پیچ دار راستوں پر یاتری چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ یاتری جو رات کو دو بجے ہی روانہ ہو گئے تھے درشن کر کے واپس لوٹتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ آنے والے یاتریوں سے یہ خوشخبری کہتے ہوئے ان کی ہمت بڑھاتے ہیں کہ منزل قریب ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اُترائی شروع ہوتی ہے اور پھر امرناتھ تک ڈھائی میل پہاڑ کی تلہٹی میں جمی ہوئی برف پر چلنا پڑتا

ہے۔ برف پر بان سے بنے ہوئے جوتے پہن کر جو پہلگام میں ہی مل جاتے ہیں چلنے میں آسانی رہتی ہے۔ یہ برف سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صدیوں پرانی برف ہے جو سال کے بارہ مہینے جمی رہتی ہے اور کبھی نہیں پگھلتی۔ برف پار کرکے امرگنگا ملتی ہے جس کا پانی برف کی مانند اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ پانی میں رہ کر دس تک کی گنتی گننا مشکل ہوتا ہے۔ امرناتھ کے درشن کرنے سے پہلے امرگنگا میں نہانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کمزور جسم والے منہ ہاتھ دھونے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن جو لوگ نہاتے ہیں ان کے جسم کا رنگ بعد میں سیاہ پڑ جاتا ہے اور کھال سانپ کی کینچلی کی مانند اتر جاتی ہے۔

اس کے بعد برف پار کرکے امرناتھ جی کا غار سامنے نظر آتا ہے لیکن یہ غار اتنی بلندی پر ہے کہ پیدل چلنے والے یاتری دس دس قدم چل کر ہی سستانے بیٹھ جاتے ہیں۔ گھوڑے، ڈانڈیاں اور پالکیاں چھوڑ کر کم از کم دو سو قدم پیدل چلنا پڑتا ہے جو تھکن کی حالت میں بے حد دشوار معلوم ہوتا ہے۔ غار میں پہنچنے پر یاتری اطمینان کی ایک لمبی سانس لیتے ہیں۔ یہ غار چالیس پینتالیس فٹ اونچا اور پچاس فٹ چوڑا ہے۔ اندر سے کافی گہرا ہے۔ غار قدرت کی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ ہے کیونکہ راستہ میں یا اس کے آس پاس کوئی غار نظر نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان یہ غار کیسے بن گیا۔ روایت مشہور ہے کہ اس غار میں بیٹھ کر شو جی نے تپسیا کی تھی اور پاروتی جی کو امرکتھا سنائی تھی۔ غار میں کبوتروں کے دو تین جوڑے ہیں۔ کبوتروں کے درشن کا بھی بہت ثواب مانا جاتا ہے۔ یہ کبوتر بھی عجیب نظر آتے ہیں نہ تو جنگلی معلوم ہوتے ہیں نہ پالتو۔ ان کبوتروں کے بارے میں مشہور ہے کہ یاترا کے دن آتے ہیں اور یاترا کے بعد چلے جاتے ہیں۔ غار کے اندر برف کا بنا ہوا سات آٹھ فٹ اونچا اور تین چار فٹ چوڑا شولنگ ہے کہتے ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی سے پانی ٹپک ٹپک کر پورنماشی کے دن تک جم کر شولنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بعد اماوس تک پگھل کر لنگ غائب ہو جاتا ہے۔ شو جی کے علاوہ پاروتی جی اور گنیش جی کی بھی برف کی مورتیاں ہیں۔ یاتری ایک کٹہرے کے ایک سرے سے داخل ہو کر درشن کرتے ہیں، چڑھاوا چڑھاتے ہیں اور پرساد لے کر اور تلک لگا کر دوسرے سرے سے باہر آ جاتے ہیں۔ کٹہرے کے انتظام کی وجہ سے یاتری باری باری بہ آسانی اور جلدی درشن کر لیتے ہیں ورنہ بھیڑ اکھٹی ہونے پر درشن کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ درشن کرکے پرشاد کھانے کے بعد واپس لوٹنے کی جلدی ہوتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جلد از جلد کم از کم شیش ناگ کے پڑاؤ تک پہنچ جائیں۔ اس کوشش میں دن اور رات کی بھی پروا نہیں کی جاتی۔ کیونکہ موسم کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ بارش کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر یاترا کے دنوں میں دھوپ نکلی ہو تو برف پگھلنے کے باعث راستے میں جا بجا پانی بہتا ہوا ملتا ہے۔

اگلے دن شیش ناگ سے چل کر چندن واڑی ٹھہرتے ہوئے بیشتر یاتری ایک ہی دن میں شام تک پہلگام پہنچ جاتے ہیں۔

کشمیر گورنمنٹ نے جو آسانیاں بہم پہنچائی ہیں۔ ان سے یہ دشوار گزار راستہ بڑی حد تک آسان ہو گیا ہے اور اب امرناتھ کی یاترا جان جوکھوں کا کام نہیں۔ بلکہ ایک خوشگوار سفر ہے۔

ایک اہم قرارداد

جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ نے ہندوستان میں زونل کونسلوں کے قیام کی تجویز پر اور اس کے علاوہ اس بارے میں اپنے صدر بخشی غلام محمد کے بیان پر بھی غور کیا۔ اور اس حقیقت کا جائزہ لیا کہ مجوزہ زونل کونسلیں مشاورتی اداروں کی حیثیت میں تقسیم کی جا رہی ہیں۔ اور ان کی کوئی لیجسلیٹو یا ایگزیکٹو ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ یہ کونسلیں مشترکہ بین الریاستی مسائل حل کرنے اور خاص طور پر شریک اکائیوں کے ترقیاتی کاموں کو پورا کرنے میں مدد دیں گی ——— قرارداد میں کہا گیا ہے کہ مجلس عاملہ نے محسوس کیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے کتنے ہی مسائل اپنی ہمسایہ ریاستوں کے مسائل سے ملتے جلتے ہیں۔ خاص طور پر روڈ ڈویلپمنٹ، سیلاب کی روک تھام کی سکیموں اور دریا گھاٹی پراجکٹوں کے میدان میں ایک سے مسائل کا سامنا ہے۔ پس مجلس عاملہ نے محسوس کیا ہے کہ ہندوستان کی شمالی کونسل زون کی سرگرمیوں میں ریاست جموں و کشمیر کی شمولیت ریاست کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

ظفر علی سید

نیپا ملز

آج کل اخبارات، کتب و رسائل اور دیگر کاموں میں کاغذ کافی استعمال ہوتا ہے۔ تعلیم کی اشاعت اور توسیع کے ساتھ ساتھ کاغذ کی بھی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے ۔

دنیا میں تقریباً ایک کروڑ ٹن کاغذ استعمال ہوتا ہے جس میں سے کینیڈا دنیا کا ½ حصہ کاغذ تیار کرتا ہے ۔ ½ ۲ لاکھ ٹن استعمال کرتا ہے اور باقی دنیا کے مختلف ممالک کو بھیجتا ہے ۔ امریکہ ۹ لاکھ ٹن کاغذ بناتا ہے جب کہ اُسے ۴۷ لاکھ ٹن کی ضرورت ہوتی ہے ۔ باقی کینیڈا پورا کر دیتا ہے ۔ انگلینڈ ½ ۳ لاکھ ٹن کاغذ بناتا ہے ۔ باقی ۴ لاکھ ٹن باہر سے منگاتا ہے ۔ جرمنی ۔ فرانس اور جاپان ملا کر ۴ لاکھ ٹن کاغذ بناتے ہیں اور ان کو ضرورت ۵ لاکھ ٹن کی ہے ۔

ہندوستان میں ہر سال تقریباً ۹۰ ہزار ٹن کاغذ لگتا ہے جس کی قیمت تقریباً چھ کروڑ روپیہ ہے ۔ یہ سب کاغذ غیر ممالک سے منگایا جاتا ہے ۔ اس لئے کاغذ کے کارخانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تاکہ ملک ہی میں سستا کاغذ دستیاب ہو اور مزدوروں کو کام مل سکے ۔

اس لئے ملک کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میسرز نائر نے صوبہ مدھیہ پردیش میں اخباری کاغذ کا کارخانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا ۔ اور ضلع نماڑ میں سنٹرل ریلوے لائن پر بھساول اور کھنڈوہ کے درمیان مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر برہان پور سے ۱۷ میل کے فاصلے پر ۲۶ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اس کی بنیاد رکھی گئی ۔ یہ کارخانہ نیشنل نیوز پرنٹ اینڈ پیپر ملز کے نام سے ½ ۵ کروڑ روپے کی پونجی سے شروع ہوا اور نیپا ملز کے نام سے مشہور ہو گیا ۔

چونکہ یہ کارخانہ ابتداء میں شخصی طور پر جاری کیا گیا تھا اور گورنمنٹ کی کوئی اعانت شامل نہ تھی اس لئے جلد ہی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا مگر ملک کی صنعتی ترقی کے پیش نظر مدھیہ پردیش اور مرکزی حکومت نے فوراً ہی اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ۔ ذیل کے واقعات اور تاریخوں سے معلوم ہو گا کہ کارخانہ موجودہ حالت پر کیسے پہنچا ۔

۱۹۴۷ء میں کمپنی قائم ہوئی اور اس نے سرمایہ جمع کرنا شروع کیا ۷ جنوری ۱۹۴۸ء میں اس صنعت کو جاری کرنے کی اجازت مل گئی ۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں کمپنی نے بمبئی کے کینیڈین ٹریڈ کمشنر کی صلاح سے میسرز رانکن اینڈ کمپنی کو صلاح کار انجنیر مقرر کیا ۔ مسٹر رانکن نے جگہ منتخب کی ۔ اس کے بعد رانکن کی خدمات منقطع کی گئیں اور میسرز ایوسکو مرچنٹ انکورپوریشن آف نیویارک کو صلاح کار انجنیر مقرر کیا گیا ۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں جب کمپنی کے اراکین نے خود کو انتظام کے قابل نہ پایا تو مستعفی ہو گئے اور حکومت نے منتظمین کی کمپنی کو اس پر راضی کیا کہ ایک سرکاری نگران افسر حکومت کی طرف سے مقرر ہو گا ۔

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں یہ دیکھنے کے لئے کہ اب کمپنی کی حالت کیا ہے ؟ سرکار نے ٹاٹا اینڈ سنز لمیٹڈ کے مسٹر اے ۔ ڈی شراف کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی جس نے تحقیقات کے بعد سفارش کی کہ سرکاری افسر کے بجائے کسی صنعتی ادارہ کو اس کی ذمہ داری سپرد کی جائے ۔ فروری ۱۹۵۱ء تک اس سلسلے میں سرکار میسرز برلا برادرس سے بات چیت کرتی رہی جو ناکام ہوئی ۔ اس کے بعد کمپنی کے انتظام کے لئے ایک بورڈ آف ڈائرکٹرس قائم ہوا ۔

حکومت ہند نے حکومت مدھیہ پردیش کے توسط سے یونائیٹڈ سٹیٹس ٹیکنیکل کوآپریشن مشن کو اس کارخانہ کی تعمیر و توسیع وغیرہ کے لئے ۱۰۸ کروڑ روپیہ قرض دیا ہے ۔ اور حکومت مدھیہ پردیش

نے اس کمپنی کو ۱۹۵۱ء ۲ کروڑ روپیہ قرض دیا ہے۔ کمپنی کا کل سرمایہ جو اسے شیئر ہولڈروں سے وصول ہوا ہے ۴۷ء ۱۱ کروڑ روپیہ ہے۔

اس کارخانے کا خاکہ ایچ سکو سرودسز نے تیار کیا ہے۔ اور پورا کارخانہ مع دیگر دفاتر متعلقہ اور رہائش کے کوارٹروں کے، ۴۰۴ ایکڑ زمین پر ہے اور مزید توسیع کا امکان ہے۔

گراؤنڈ وڈ مل، کیمیکل پلپ مل، پیپر مشین اور ورکشاپ اس کارخانہ کے حصے ہیں۔

کارخانہ کی عمارتوں کو تیار کرنے کے لئے ۱۹۵۱ء میں ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ اس میں ذیل کی عمارتیں شامل ہیں۔

(۱) کاغذ کی مشین کی عمارت (۲) کاغذ کا گودام (۳) سٹیپنگ روم (۴) مشینی گودا رکھنے کا حصہ (۵) ورکشاپ (۶) کیمیکل مل کے لئے وسیع میدان اور (۷) ووڈ یارڈ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اور بھی عمارتیں ہیں

کارخانہ ایسے علاقے میں تعمیر ہوا ہے جہاں کاغذ کے لئے کافی مقدار میں بانس اور سلائی کی لکڑی مل سکتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا ان اشیاء سے عمدہ کاغذ تیار ہو سکتا ہے یا نہیں۔ کمپنی نے اپنے صلاح کار انجنیئروں کے پاس کچا مال بھیجا۔ یہ تجربہ ہرٹی فاؤنڈیشن لیبورٹریز سوانا میں کیا گیا اور کامیاب ثابت ہوا۔

کاغذ میں اصلاح اور صفائی پیدا کرنے کے لئے نیپا ملز کی لیبوریٹری میں تجربے ہو رہے ہیں۔ اس میں ذیل کی چیزیں ہیں۔

(۱) مشینی گودا تیار کرنے کے لئے ایک گرائینڈر
(۲) کیمیائی گودے کی صفائی وغیرہ کے لئے ایک بیٹر
(۳) ایک ہاؤ شیٹ بنانے کی مشین اور دیگر آلہ جات ہیں۔

اس لیبوریٹری میں کام شروع ہو گیا ہے اور اچھا کاغذ تیار ہو رہا ہے۔

سرکار نے ریزرو فاریسٹ سے کارخانہ کو ضروری خام اشیاء کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر سال ۳۰ ہزار ٹن کاغذ تیار ہوگا جس کے لئے ۳۰ ہزار ٹن سلائی اور ۳۰ ہزار ٹن بانس کی ضرورت ہوگی۔

کارخانے کے قریب ہی ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے جو ۱۲۵۰۰ کلو ویٹ سپاور (K.W) کا ہے۔ اس سے برہان پور شہر اور کھنڈوہ کو بجلی سپلائی کی جا رہی ہے۔ یہ کارخانے کے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔

کارخانے کی وجہ سے قریب ہی ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر بن گیا ہے۔ نیپا ملز کے نام پر اس کا نام نیپا نگر رکھا گیا ہے۔ سنٹرل ریلوے نے نیپا نگر میں ایک چھوٹا سا اسٹیشن بھی بنایا ہے۔ یہاں کارخانے کے منتظمین، افسران، کلرک، انجنیئر اور مزدوروں کی رہائش کے لئے نئی طرز پر بنگلے اور کوارٹر بنائے گئے ہیں۔ کمپنی نے ہسپتال، اسکول، ڈاک گھر، کھیل کے میدان اور کلب وغیرہ کا بھی انتظام کیا ہے۔

شہر اور کارخانے میں ہر روز تقریباً ۸ لاکھ گیلن پانی کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے تاپتی ندی سے دو میل کی دوری پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کارخانے کے قریب ہی حوض بنایا گیا ہے۔ پہلے یہاں کا پانی مضر صحت تھا مگر اب کیمیائی طریقہ سے پانی کو صاف کیا جاتا ہے۔ اور اب کوئی نقص نہیں رہا۔ چونکہ گرمی کے موسم میں ندی کا پانی بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ندی پر ۱۵ فٹ اونچا بندھ بنایا گیا ہے جو انی کٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰۰۰ فیٹ اور اونچائی ۱۵ فیٹ ہے۔ اس میں تقریباً ۸ کروڑ گیلن پانی جمع ہو جاتا ہے۔

اس کارخانہ میں تمام مشنری نئی ہے۔ اس میں اخباری کاغذ کے علاوہ دوسری قسم کا کاغذ بھی بنے گا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے ۳۰ ہزار ٹن سالانہ کاغذ تیار ہوگا جو ہندوستان کی ضرورت کا ½ حصہ ہوگا۔

بتایا گیا ہے کہ آج کل روزانہ ۶۰ ٹن کاغذ اس کارخانے میں بنتا ہے۔ مگر یہ صرف تجربہ کے طور پر ہی ہے۔ البتہ ۱۹۵۷ء میں اخباروں کو اس کارخانہ سے عمدہ کاغذ مل سکے گا۔ اس قدر وسیع پیمانے پر کاغذ بنانے کی ہندوستان میں یہ پہلی کوشش ہے۔

اس کی وجہ سے ہزاروں روپے کی بچت ہوگی۔ جنگلات میں اصلاح ہوگی اور (Afforestation) ہوگا۔ اس کے علاوہ بے کاروں کو کام ملے گا۔

نیپا ملز ہندوستان کے نئے قومی منصوبوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔

ڈال ڈال کے پات

غزل ———— جگر مراد آبادی

صیّاد پہ ظاہر ابھی یہ راز نہیں ہے
پرواز، اسیر پہ پرواز نہیں ہے

حالانکہ وہ اب مرحمتِ ناز نہیں ہے
خوش ہوں کہ مرا غم غلط انداز نہیں ہے

دل کش تو بہت نالۂ بلبل بھی ہے لیکن
وہ رس نہیں وہ شعلۂ آواز نہیں ہے

کیا قحطِ محبت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
دل باز بہت ہیں کوئی جاں باز نہیں ہے

آنکھیں ہوں تو وہ کون سا ذرّہ ہے جو آدوست
خود اپنی جگہ انجمنِ ناز نہیں ہے

میں طائرِ آوارہ و رُسوا تو ہوں لیکن
محدودِ چمن تک مری پرواز نہیں ہے

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم، خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

(ماہ نو)

اعلیٰ بُنائی
باوقار پوشاک

فیشن کے مطابق اپنی نئی پوشاک کھڈی کے کپڑے کے جدید ترین ڈیزائنوں میں سے منتخب کیجئے۔

قومی پوشاک درکار ہو چاہے مقامی، رسمی موقعوں کے لئے یا روزمرہ استعمال کے لئے، آرام دہ سوتی، ملائم ریشمی یا اونی اور سخت سردی سے بچنے کے لئے موٹے اونی، کھڈی کے بنے ہر طرح کے کپڑے ملتے ہیں۔ آسائش و زیبائش نیز خاص اوقات پر استعمال کے لئے مشرو، ہمرو، کمخواب اور بروکیڈ بھی دستیاب ہیں۔ ہر ٹکڑا جو آپ خریدتے ہیں بھارت کے کھڈی کا کپڑا بننے والوں کے روائتی ہنر اور بے نظیر کاریگری کا مثال پیش کرتا ہے۔
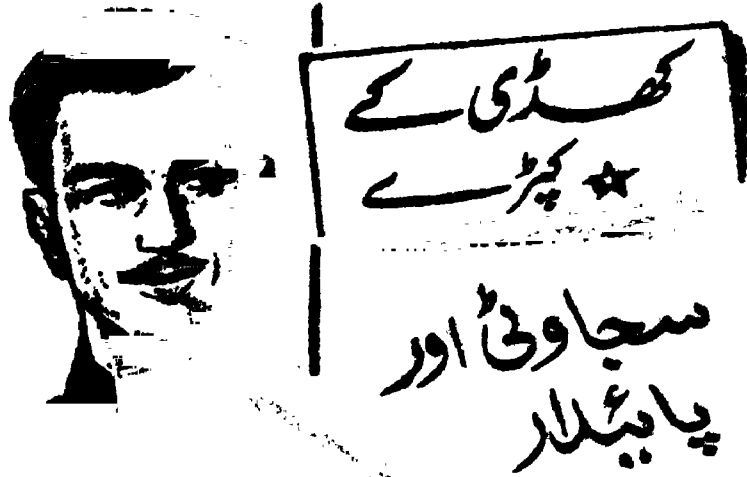
آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ

نجم آفندی
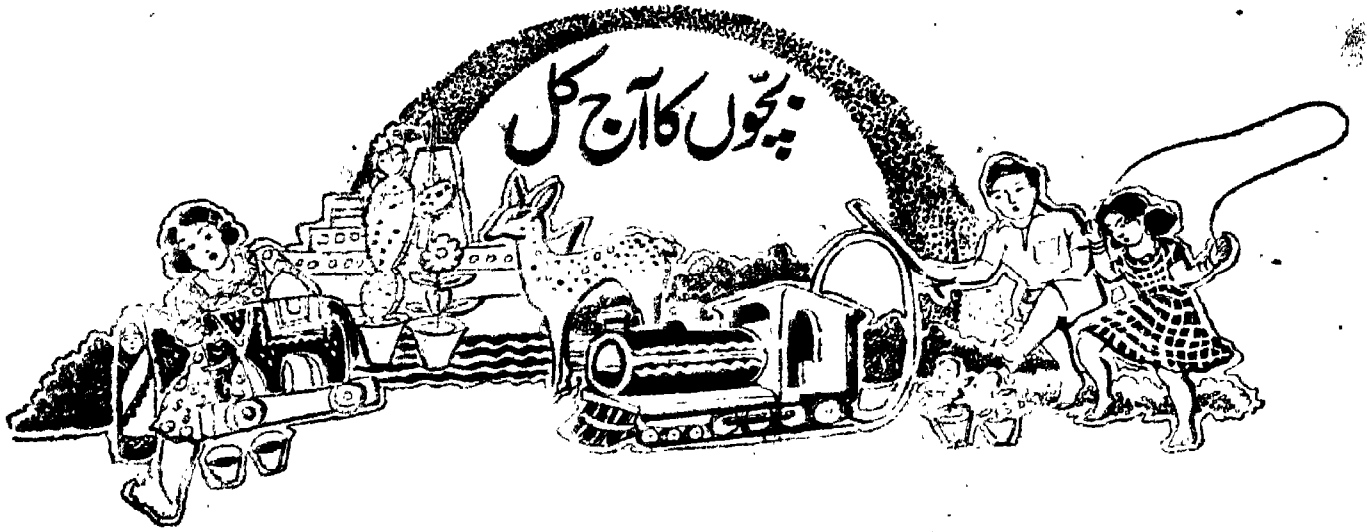
آج کل

کام جو آج کا ہے کل پہ نہ ہرگز ٹالو
یہ طریقہ ہے بُرا اس کی نہ عادت ڈالو

ٹل گیا کل پہ تو پرسوں پہ بھی ٹل جائے گا
بڑھ گئی بات تو ترسوں پہ بھی ٹل جائے گا

آج کا دن جو گیا کل کے سہارے پہ کہیں
کل بھی جی کام کو چاہے گا یہ اُمید نہیں

کاہلی میں جو دن اس طور گزارے دو چار
دل دہل جائے گا وہ کام کی ہو گی بھرمار

کام کرنا ہے تو پھر آج ہے کیا کل کیا ہے
آج اور کل میں خبر بھی ہے تمہیں بل کیا ہے

جو ہیں کاہل وہی لیتے ہیں سہارا کل کا
کس کو معلوم کدھر جائے گا دھارا کل کا

کل اسی ڈھنگ پہ سنسار رہے یا نہ رہے
یہ سمے اور یہ سماں چاہے رہے یا نہ رہے

کر لو کچھ آج کہ افضل ہے یہ ایک اک پل
کل کا دن آ کے کہیں تم کو نہ کر دے بے کل

اتنا کام سر پہ اور آنکھوں میں اندھیرا ہوگا
رات جب بیچ میں رہ جائے گی تب کیا ہوگا

عصمت جہاں

ناروے کی ایک لوک کہانی
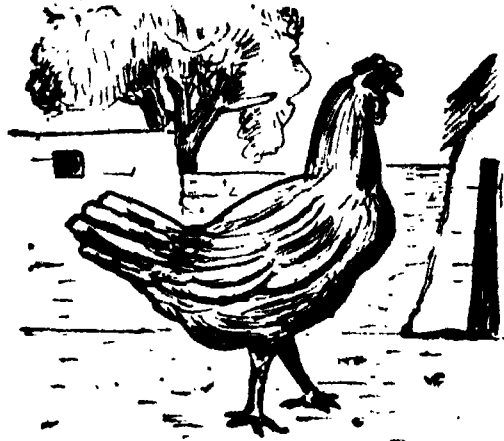
لال مُرغی

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کسی صاف ستھرے کھیت میں ایک مرغا اور ایک لال مرغی رہا کرتے تھے - ان دونوں میں گہری دوستی تھی - ایک دن مرغا مُرغی سے بولا - "چلو آج اخروٹ کے باغ میں چلیں - اب اخروٹ پک چکے ہیں اور گرنے لگے ہیں - جلدی سے ایک ٹوکری لے آؤ - باغ میں جاکر خوب اخروٹ اکٹھا کریں گے -"

چھوٹی لال مرغی ٹوکری لے آئی اور دونوں خوشی خوشی باغ کی طرف چل دئے - وہاں پہنچ کر دونوں نے اخروٹ اکٹھا کرنے شروع کر دئے - تھوڑی ہی دیر میں ٹوکری اخروٹوں سے بھر گئی - اس کے بعد مرغے نے کہا "آؤ اب بیٹھ کر کچھ اخروٹ کھائیں" - دونوں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے - اور وہ اخروٹوں کو توڑ توڑ کر کھانے لگے - مگر افسوس بیچاری لال مُرغی کے حلق میں پھندا لگ گیا اور اس کا سانس رُکنے لگا کیونکہ اخروٹ کا ایک چھوٹا سا چھلکا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا - یہ دیکھ کر مرغا پوری قوت سے چشمے کی طرف بھاگا - چشمے کے پاس پہنچ کر اس نے گڑگڑا کر

کہا - "بھائی چشمے! میری چھوٹی لال مرغی کے لئے تھوڑا سا پانی دے دو - وہ بے چاری اخروٹ کے باغ میں پڑی تڑپ رہی ہے - اس کے حلق میں پھندا لگ گیا ہے -" چشمے نے کہا - "بابا میں پانی تم کو تب ہی دے سکتا ہوں جب تم لیموں کے پیڑ سے کچھ تازہ ہری پتیاں مجھے لاکر دوگے -"

مرغا بے چارہ پھر اپنی پوری قوّت سے لیموں کے پیڑ کے پاس پہنچا اور ملتجیانہ لہجے سے کہنے لگا - "بھائی مجھے اپنی کچھ تازہ پتّیاں دے دو تاکہ میں انھیں چشمے کے پاس لے جاؤں - اس کے بعد چشمہ مجھے پانی دے گا اور میں اس کو اپنی پیاری لال مرغی کے لئے لے جاؤں گا - اس بے چاری کے حلق میں پھندا لگ گیا ہے اور وہ اخروٹ کے باغ میں پڑی تڑپ رہی ہے -" لیموں کے پیڑ نے جواب دیا - "میں تمہیں

اس صورت میں پتّیاں دوں گا جب تم ایک چھوٹا سا لال فیتہ لا کر میری ننھی ٹہنی میں باندھ دو گے۔" مرغا پھر دوڑا اور ایک گھر میں داخل ہو گیا جہاں بڑھیا رہتی تھی۔ بڑھیا کے سامنے رو کر بولا۔ "خدا کے لئے مجھے ایک لال فیتہ دے دو۔ اسے لے کر میں لیموں کے پیڑ کے پاس پہنچاؤں گا اس کے بدلے میں وہ مجھے تازہ ہری پتّیاں دے گا۔ جنہیں میں چشمے کے پاس لے جاؤں گا۔ چشمہ مجھے تھوڑا سا پانی دے گا۔ یہ پانی بے چاری چھوٹی لال مرغی کے لئے لے جاؤں جو اخروٹ کے باغ میں پڑی تڑپ رہی ہے۔ بڑھیا نے کہا۔ "نہیں بیٹا، میں تجھے فیتہ تبھی دوں گی جب تم میرے لئے ایک نیا جوتا لا دو۔ میرا جوتا پھٹ گیا ہے۔" مرغا بڑا پریشان ہوا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ بھاگا بھاگا موچی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا بھائی موچی! مجھے ایک جوتا دے دو۔ یہ جوتا میں بڑھیا کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ مجھے لال فیتہ دے گی۔ اس فیتے کو میں لیموں کے پیڑ کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ مجھے تازہ ہری پتّیاں دے گا۔ میں ان پتّیوں کو چشمے کے پاس لے جاؤں گا اور اس سے پانی لے کر چھوٹی لال مرغی کی جان بچا سکوں گا جو اخروٹ کے باغ میں پڑی تڑپ رہی ہے کیونکہ اس کے حلق میں پھندا لگ گیا ہے۔" موچی بولا۔ "نہیں بھائی میں چمڑے کے بغیر جوتا کیسے بنا سکتا ہوں۔ تم چمار کے پاس چلے جاؤ اور اس سے تھوڑا سا چمڑہ لے آؤ میں تمہارے لئے جوتا بنا دوں گا۔" پس مرغا دوڑتا دوڑتا چمار کے پاس آیا۔ اور اس کو تمام حقیقت کہہ سنائی۔ چمار کو بے چارے مرغے پر رحم آ گیا اور اس نے چمڑے کا ایک بڑا سا ٹکڑا اسے دے دیا۔ مرغا چمڑے کو اپنی چونچ میں دبائے ہانپتا کانپتا موچی کے پاس آیا اور چمڑا اس کے حوالے کیا۔ موچی نے فوراً ہی بڑھیا کے لئے جوتا بنا دیا۔ اب تو مرغے کے سب کام پورے ہونے لگے۔ بڑھیا نے مرغے کو لال فیتہ دیا جسے اس نے فوراً ہی لیموں کے پیڑ کے پاس پہنچا دیا۔ لیموں کے پیڑ نے خوشی خوشی اس کو تازہ ہری پتّیاں دے دیں۔ ان پتّیوں کو لے کر مرغا چشمے کے پاس آیا۔ چشمہ بولا۔ "تم بہت جلدی پتّیوں کا پیالہ بنا لو میں اس میں تمہیں پانی دے دوں گا۔" مرغے نے پتّیاں لے کر پیالہ بنایا چشمے نے اس کو پانی سے بھر دیا۔ مرغا پانی لے کر سیدھا باغ کی طرف بھاگا اور وہاں جا کر پانی چھوٹی لال مرغی کو دے دیا۔ لال مرغی نے پانی پیا تب کہیں اس کی جان میں جان آئی۔ اور وہ اخروٹ کے باغ سے چل کر اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے بعد لال مرغی اور اس کا دوست مرغا کبھی اپنا صاف ستھرا کھیت چھوڑ کر باہر نہیں گئے ۔
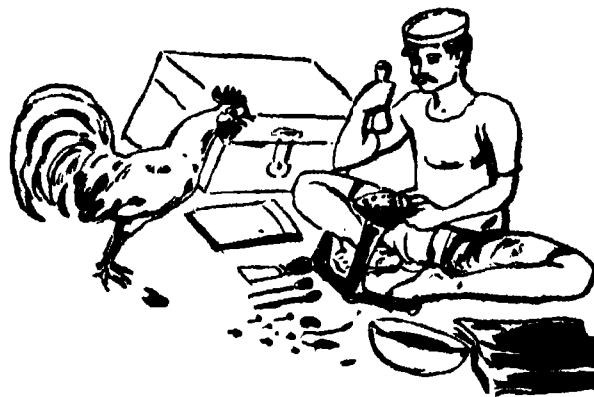
ایک صاحب (حجام سے) کیا تم نے کبھی گدھے کے بال کاٹے ہیں؟

حجام۔ جی نہیں! آج پہلا اتفاق ہے۔

حیدر عابدی

چھمّن خاں

چھمّن خاں ایک بہت ہی لمبے آدمی تھے اور شاید اتنے لمبے کہ شہر میں انھوں نے لمبائی کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ وہ جب کسی بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے ہوتے تو اسی کا ایک حصّہ معلوم ہوتے۔ اُن کے کندھے اُوپر سے اس طرح مُڑ گئے تھے جیسے کسی درخت کی موٹی شاخ آگے جا کر مڑ جاتی ہے اور گردن کچھ آگے کو نکلی ہوئی تھی داڑھی میں اس قدر کم بال تھے کہ اگر آپ گنتی کرنا چاہیں تو گن سکتے ہیں۔ سر پر دو پلّی ٹوپی بھی لگاتے تھے۔ ان کے لمبے جُوتے تو فٹ کو چھوڑ کر گز گز کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ کیونکہ لمبے آدمی کے پیر بھی لمبے ہوتے ہیں۔ اس حالت میں وہ بچوں کے لئے پورا کھلونا تھے۔ یہ لیجئے چھمّن خاں تو خود ہی چلے آرہے ہیں۔ انور انیکیل وغیرہ بھلا کب چوکنے والے تھے اور یہ اختر تو سب سے ہی شریر تھا۔ فوراً انور، شکیل اور کفور کو اشارہ کر دیا کہ ہوشیار ہو جاؤ۔

انور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "یہ چھمّن خاں روزانہ اس طرف کہاں جاتے ہیں؟"

"کہاں جاتے ہوں گے کہیں۔ ہمیں کیا۔ ہماری تو روزانہ اسی راستے پر ملاقات ہو جاتی ہے۔" انور نے پھر کہا۔ "لیکن آج کچھ دیر سے آئے ہیں۔ لو نزدیک آگئے۔"

چھمّن خاں جب نزدیک آگئے تو ان لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا "چھمّن خاں گھنٹہ گھر سے بھی اُونچے چھمّن خاں جی چھمّن خاں۔۔۔۔"

چھمن خاں بڑے زوروں سے چلّائے۔ "پاجی گدھے کہیں کے۔ ماں باپ نے ان کو خاک تمیز نہیں سکھائی۔ دن بھر گھومتے ہیں۔ اور یہ اختر اس کے باپ کے پاس تو ابھی جا رہا ہوں۔"

میں سڑک پر کنارے کھڑا ہوا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ کتنے شریر لڑکے ہیں۔ میں تو ان سے الگ رہتا ہوں۔ اسی لئے چھمّن خاں مجھ سے بہت خوش ہیں اور کبھی کبھی مجھے بسکٹ بھی دلا دیتے ہیں لیکن

ان سب باتوں کے باوجود آج پہلی بار میں ان لڑکوں میں شامل ہو کر چھمن خاں کو چھیڑنے لگا۔ ایں..... انھوں نے اپنا لمبا جوتا اُتار کر لڑکوں کی طرف مارا جو کہ سیدھا میرے سر پر اس زور سے لگا کہ میں چھمن خاں، اختر، اور سب کو بھول گیا اور وہیں سڑک پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں قریب قریب بے ہوش سا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ سب لڑکے جا چکے ہیں میں بھی اُٹھا اور گھر کی طرف ہو لیا۔

گھر پہنچ کر میں نے دیکھا۔ چھمن خاں ابا جان سے میری شکایت کر رہے ہیں۔ میں چپ چاپ اندر چلا گیا۔ ابا جان نے مجھے اندر جاتے دیکھ کر آواز دی۔ اور پوچھا "کیا بات تھی۔" میں نے جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ تو نہیں۔"

اس پر ان کو غصہ آگیا اور سامنے پڑی ہوئی لکڑی اُٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ تڑ تڑ کی آوازیں چار یا پانچ بار سن سکا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا بیتی جب آنکھ کھلی تو چارپائی پر دراز تھا اور سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ آنا پٹ گیا اور ابھی تک جان دُکھ رہی ہے۔

آج گو چھمن خاں اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی یاد میرے دل میں باقی ہے جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اسی کی وجہ سے میں امتحان میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوا۔ وہ یادگار ہے
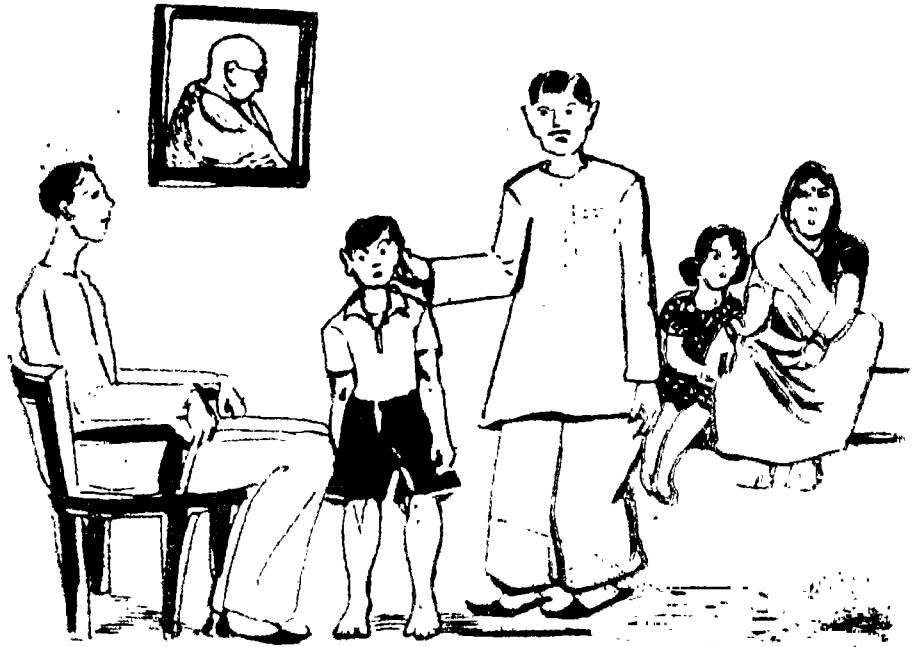
برُوں کی صُحبت سے دُور رہنا

اقوالِ زرّیں

حسد بُری چیز ہے اور رشک اچھی۔

چھوٹوں سے اچھا سلوک کرو اور بزرگوں کا ادب کرو۔

بات ایسی کہو جو سب کو بھلی معلوم ہو۔

کسی کو تکلیف میں دیکھ کر نہ ہنسو۔

جسم اور لباس کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھو۔

جگت سنگھ

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

موہن لال کو مڈل پاس کئے پانچ مہینے بیت چکے تھے اور باپ کا سایہ بھی دو مہینے ہوئے سر سے اُٹھ چکا تھا۔ موہن کی ماں کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ بیٹے کو آگے تعلیم دلا سکے — مفلسی اور لاچاری نے ہر طرف سے مجبور کر دیا تھا۔ موہن اپنی ماتاجی سے اصرار کر رہا تھا کہ مجھے اسکول میں داخل کراؤ۔ مگر ماں کہتی۔ بیٹا تمھارے شوق کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ تمھیں آگے تعلیم دلا سکیں۔

ماں کی مایوس کن باتیں سن کر اُس کا ننھا سا دل کمھلا گیا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گرے جنھیں اس نے بہت جلد اپنے دامن سے پونچھ لیا تاکہ اُس کی ماں دیکھ نہ لے ورنہ اس کا دل بھی بھر آئے گا۔

ایک رات جبکہ تمام بستی خاموش تھی اور رات کا زیادہ حصہ بیت چکا تھا۔ موہن اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی سے آہستہ سے اُٹھا تاکہ ماں کو خبر نہ ہو۔ کتابیں بغل میں دبائے ایک طرف کو چل دیا۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ منزل سے بے خبر چلا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک کالا بادل اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے آسمان پر چھا گیا۔ اندھیری رات اور کالے بادل بھی اس کے شوق کو متزلزل نہ کر سکے۔

صبح ہوئی۔ تو اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ یہ شہر کی فصیل کا سب سے بڑا پھاٹک تھا۔ موہن اس پھاٹک کے راستے شہر میں داخل ہوا۔ شہر کی عالی شان عمارتیں اور بازاروں کی رونق دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

آٹھ بجے کا وقت تھا۔ طالب علم کتابیں بغل میں دبائے سامنے سے گزر رہے تھے۔ موہن کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ ایک دن میں بھی اسی طرح مدرسے میں جایا کرتا تھا۔ لڑکے گپیں مارتے اسکول کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ موہن پھاٹک پر جاکر رک گیا۔ اسے اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اتنے میں اسکول کا چپڑاسی پھاٹک کا دروازہ بند کرنے

کے لئے آیا۔ موہن کو کھڑا دیکھ کر بولا۔ لڑکے تم کیا چاہتے ہو۔ موہن نے کہا۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر چپڑاسی ہنسنے لگا

موہن: "تم ہنستے کیوں ہو؟"

چپڑاسی: "اس لئے کہ تمھارے کپڑے بہت میلے ہیں۔ تمھارے سر پہ ٹوپی اور پاؤں میں جوتا بھی نہیں۔"

موہن: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "میں پڑھنے کے شوق میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

چپڑاسی کو اس پر بہت ترس آیا اور اُسے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گیا۔

ہیڈ ماسٹر: "تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو اور تمھارا نام کیا ہے؟"

موہن: "مجھے موہن کہتے ہیں۔ میں قریب کے گاؤں میں رہتا ہوں۔ ایک بوڑھی ماں کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ انھوں نے مجھے مڈل تک تو پڑھایا ہے۔ مگر آگے پڑھانے کی اُن میں سکت نہیں۔ اس لئے میں انھیں بغیر اطلاع دیئے یہاں آگیا ہوں۔ کیونکہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

ہیڈ ماسٹر: "بیٹا! میں تمھارے شوق کی قدر کرتا ہوں اور بہت خوش ہوں کہ تم میں پڑھنے اور ترقی کرنے کی بہت خواہش ہے۔ تم بڑی خوشی سے یہاں پڑھو۔ میں تمھاری والدہ کو خبر کر دوں گا تاکہ اُسے تسلی ہو۔"

رات کے کوئی تین بجے کا وقت ہوگا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہوسٹل کے تمام لڑکے اپنے بستروں میں مزے کی نیند سو رہے تھے۔ لیکن آخری کمرے سے روشنی باہر کی طرف آرہی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب دیکھ بھال کے لئے اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ اتفاق سے اُن کی نگاہ موہن کے کمرے کی طرف گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ موہن کتاب پڑھنے میں مستغرق ہے۔ ان کے دل میں موہن کی محبت اور زیادہ بڑھ گئی۔

دو سال کے بعد موہن وظیفہ لے کر میٹرک میں پاس ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے انھوں نے اسے کالج میں داخل کرا دیا اور فیس بھی معاف کروادی۔

موہن نے کالج میں بھی امتیازی شان کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی اور قانون پاس کر کے ایک کامیاب وکیل بن گیا اور بہت جلد اپنی قابلیت اور محنت سے جج کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوگیا۔

کسی نے سچ کہا ہے:-

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

نعیم کوثر

نادان بندر

ایک ندی کے کنارے کچھ بندر رہا کرتے تھے۔
وہ کچھ کام ہی نہ کرتے تھے سوائے دن بھر کھیلنے اور کودنے
کے ــــــ کسی مسافر کی روٹی اٹھا لاتے تو ندی پر
نہانے والوں کے کپڑے چھپا دیتے۔ بس ان کا تو
یہی کام تھا۔ ان کا گھر تو تھا ہی نہیں۔ گھر بنانے
کی فکر ہی نہیں تھی۔ کبھی اس ڈال پہ بسیرا کر لیا کبھی اس ڈال پر
اسی طرح وہ اپنے دن گزارتے تھے ــــ اس ندی کے کنارے
ایک درخت پر ایک طوطے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ جوں
جوں برسات قریب آنے لگی ــــــ طوطے نے اپنا گھر مضبوط
بنانا شروع کر دیا ــــ لیکن بندروں کو تو کچھ فکر نہ تھی۔ طوطے
نے انھیں سمجھایا تو ان کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی اور بارش بھی
آ گئی۔ خوب اولے برسے، بندر بری طرح نہا گئے اور سردی
سے ٹھٹھرنے لگے۔ طوطا مزے سے گھونسلے میں سو رہا تھا۔
پھر بارش رک گئی اور بندر زمین پر اتر آئے۔ سردی بری طرح
لگ رہی تھی۔ انھوں نے سوچا کیوں نہ آگ جلا لی جائے تاکہ تاپا
جائے۔ سامنے ہی گھونگھچیوں کا درخت تھا۔ بندر سمجھے ضرور یہ
آگ کی چنگاریاں ہیں۔ جھٹ انھیں توڑ لائے اور گیلی لکڑیاں
اکٹھی کر کے ان میں ٹھونس دیں اور لگے پھونک پہ پھونک مارنے
مگر انگارے ہوں تو آگ لگے وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ طوطے نے
جو یہ ماجرا دیکھا تو وہ بندروں کی بے وقوفی اور ناسمجھی پر دل
ہی دل میں خوب ہنسا اور پھر بندروں کو سمجھاتے ہوئے بولا۔
اے بھائیو! یہ کیا کرتے ہو ــــ ان گھونگھچیوں میں جن کو تم
چنگاریاں سمجھے ہو کچھ بھی گرمی نہیں ہے تم بلا وجہ پریشان ہو
رہے ہو ــــ اگر تم میرا کہنا مان لیتے اور اپنا گھر بنا لیتے۔ تو
آج یہ پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ بندروں کو بے حد غصہ آیا اور
وہ چلائے تو کون ہوتا ہے ہمیں سمجھانے والا ــــ بندر غصے
میں درخت پر چڑھ گئے اور طوطے کا گھونسلا توڑ پھوڑ ڈالا۔
بے چارہ طوطا چیختا رہا ــــ سچ ہے ایسے بیوقوفوں کو جو بالکل
کچھ نہ سمجھ سکتے ہوں سمجھانا بالکل بے کار ہے بلکہ نقصان ہی
اٹھانا پڑتا ہے۔

لڑکا:۔ یہ بکری اتنا کیوں چلّا رہی ہے!
باپ۔ قصائی اسے ذبح کرنے قصاب خانے لے جا رہا ہے۔
لڑکا۔ بس اتنی سی بات کے لئے چلّا رہی ہے۔ میں تو سمجھا
تھا کہ وہ اسے سکول لے جا رہا ہے۔

پبلیکیشنز کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

"یہ ایک بہت مفید کتابچہ ہے جس میں بے گھر لوگوں کو معاوضے کی درمیانی اسکیم کے بارے میں قیمتی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ معاوضے کی قطعی اور آخری اسکیم کے نفاذ سے پہلے ان ضرورتمندوں کو معاوضہ دیا جائے جو اپنا کاروبار چلانے کے لئے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت جو کچھ کرنا چاہتی ہے اس کی پوری تفصیل اس کتابچے سے معلوم ہو سکتی ہے۔" "الجمعیۃ" دہلی

پنج سالہ پلان (سوالات و جوابات)

"پلاننگ کمیشن نے جو پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ زیر نظر ۲۰ صفحات پر مشتمل کتاب میں تمام اہم مسائل اردو سوال و جواب کی صورت میں بیان کر دئے ہیں۔ کتاب مرتب کرتے وقت اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل پلان کا نچوڑ اس کتاب میں آ جائے ......"

قیمت چار آنے — "قومی آواز" لکھنؤ

نئے ہند کی تعمیر

"یہ توضیحی مفلٹ حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات نے شائع کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اُردو خواں بھی اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ حکومت کے کارناموں اور اسکیموں سے اُن کو واقف کرنا نہایت ضروری ہے۔

اس مفلٹ کی زبان نہایت سلیس اور دلنشیں ہے۔ تصویریں اور طباعت سب اعلیٰ درجہ کی ہیں۔"

قیمت آٹھ آنے — "سیاست" کانپور

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—400